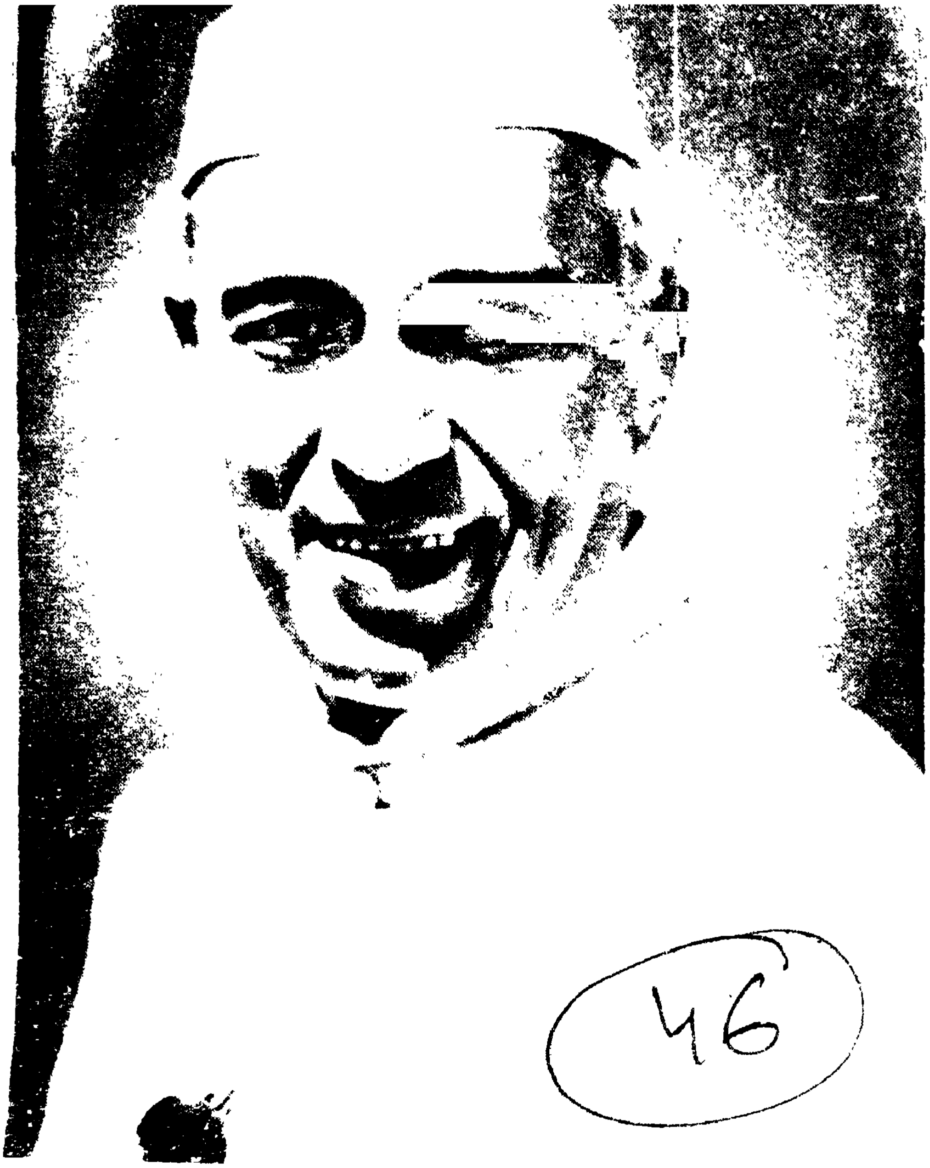


ایک

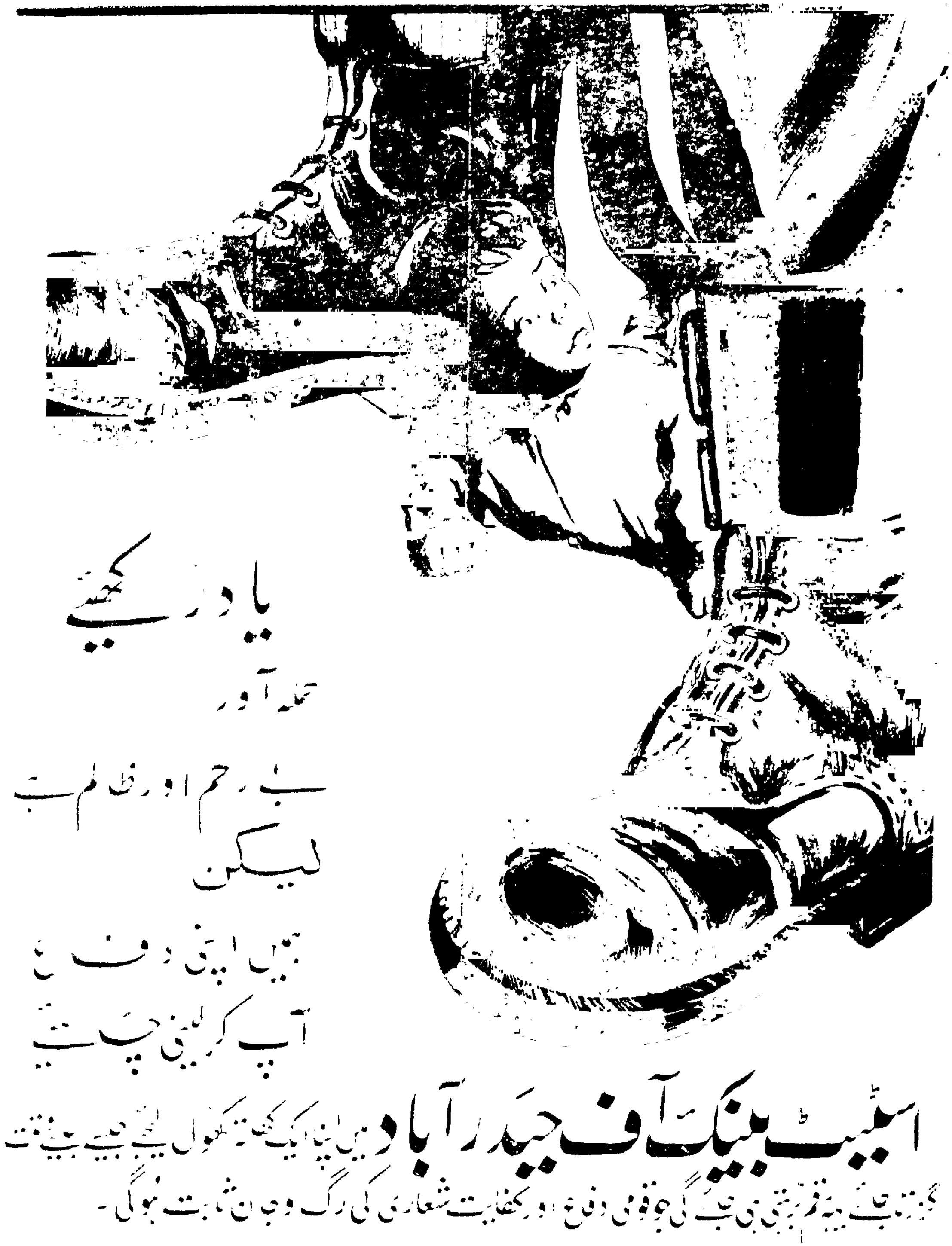
ملک میں اک

NTHLY

OONAM HYDERABAD

50 NP.

ماہنامہ


یاد رکھیے
حملہ آور
بے رحم اور ظالم ہے
لیکن
ہمیں اپنی دفاع
آپ کرلینی چاہیے
اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد میں اپنا ایک کھاتہ کھول لیجیے جیسے جیسے وقت
گذرتا جائے یہ رقم بڑھتی ہی جائے گی جو قومی دفاع اور کفایت شعاری کی رگ و جان ثابت ہوگی۔

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا
ماهنامه پونم
16 - 7 - 301
اعظم پورہ۔ حیدرآباد (۱)

قیمت فی پرچہ، (۵۰) پیسے
زرِ سالانہ، (۶) روپے
ششماہی، (۳) روپے
بیرونِ ہند، (۱۲) شلنگ

مُدیر

ناصر کرنولی ایم اے عثمانیہ

پونم

جلد (۱)

شمارہ (۲)

جُون
۱۹۶۴

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار حیدرآباد۔ فون: (۴۵۸۲۳۱)

ترتیب

آہ! نہرو	ادارہ	۳
تزئین	ادارہ	۴
آسکر وائلڈ کا نظریۂ تنقید	ابوظفر عبدالواحد	۵
پشکن اور اس کی شاعری	نریش کمار شاد	۹
فن موسیقی کی تدریجی ترقی اور ہندوستان	سید امین الدین جلالی	۱۷
مستقل نمبر		
اردو شاعری میں نئے تجربے	شاذ تمکنت	۲۰
فتنہ نظامی	خمار بارہ بنکوی	۲۲
اختر حسن	محمد پرویز شوق	۲۳
[illegible]	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۲۴
[illegible]	واجدہ تبسم	۲۵
خورشید یوسف پوری	نیاز شرما	۲۶
حزیں لدھیانوی	شکیل مظہری	۲۷
نئی کہانی	زینت ساجدہ	۲۸
رات کا گناہ	اختر ملیح آبادی	۳۱
سانحہ	نعیم زبیری	۳۶
[illegible]	شاذ تمکنت	۴۳
غزل (سانیٹ)	عزیز تمنائی	
بازگشت	حامدی کاشمیری	۴۴
یادیں، تتلیاں اور تم	راشد آذر	۴۵
آدم و آہن	بشر نواز	۴۶
ردِ عمل	محمد علوی	
صبح	عادل منصوری	۴۷
زہر خند (سانیٹ)	شاہین غازی پوری	
مستقل نمبر		
زعفران زار	کوہکن کے قلم سے	۴۸
— طنز و مزاح —		
تنقید نگاری کے جدید اصول	جیلانی بانو	۴۹
کنسٹین (مستقل نمبر)	بے تیر انداز	۵۲
— صنم کدے —		
شہر نامدار، چکاچک	سلیم الدین	۵۵
فلموں میں سس پنس کا عنصر	تماشائی	۵۹
خطوط		۶۳

٭ پونم میں شائع ہونے والے تمام ادبی نیم ادبی مواد میں نام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں، ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کیلئے ادارہ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی

٭ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر، مناصر کرنولی نے اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ پونم اعظم پورہ، حیدرآباد سے شائع کیا۔

آہ! نہرو

۲۷ مئی کا دن دُنیا کی تاریخ میں انتہائی منحوس دن کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ یہی وہ دن ہے جس نے ہم سے ہمارے ہردلعزیز وزیرِاعظم پنڈت جواہرلال نہرو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا کردیا۔ جواہرلال نہرو کی شخصیت بین الاقوامی اہمیت کی حامل تھی۔ ان کا انتقالِ پُر ملال نہ صرف ہندوستان کیلئے ایک المناک قومی حادثہ اور سانحۂ عظیم ہے بلکہ دُنیا کے سارے امن پسند ممالک کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ان کی پُرخلوص مساعی سے امنِ عالم اور جمہوریت کی صحت مند قدروں کو جو فروغ حاصل ہوا وہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں "پیامبرِ امن" اور "پُرامن بقائے باہم کے اصولوں کا علمبردار" کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔

پنڈت جی نے دیش کی آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیں اور حصولِ آزادی کے بعد اپنی زندگی ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کے لئے وقف کردی تھی۔ سچ پوچھیئے تو جواہرلال نہرو کو ہندوستان سے اور ہندوستان کو جواہرلال سے بے پناہ محبت تھی۔ قوم و ملک ان کے لئے جان سے زیادہ عزیز تھے یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا ملک شاہراہِ ترقی پر گامزن نظر آرہا ہے۔

پنڈت جی کو ملک کی سالمیت، قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد سے بیحد لگاؤ تھا۔ چین کے حملے سے ہندوستان کی آزادی کو جو خطرہ لاحق ہوگیا تھا، اس کا پنڈت جی نے جس دانشمندی، جرأت اور ہمت سے مقابلہ کیا اس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ غرض بقول صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن ؎

"جواہرلال نہرو کے بغیر ہندوستان کی عظمت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اُٹھ جانے سے ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک تابناک دَور ختم ہوگیا"۔

اب ہمارا فرض یہ ہے کہ جن تصورات اور نظریات کے وزیرِاعظم حامی تھے، ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کی رُوح کو شانتی حاصل ہوسکے۔

(ادارہ)

اداریہ

کرنیں

یہ بات ہمارے لئے حوصلہ افزا ہے کہ "پونم" کا پہلا شمارہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے کے ساتھ ساتھ علمی ادبی حلقوں کی پسندیدگی حاصل کرنے میں بھی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ بعض اہلِ ذوق حضرات نے "پونم" کے اجرا کو اردو صحافت کے حق میں فالِ نیک قرار دیتے ہوئے اس کے مستقبل سے کافی امیدیں بھی وابستہ کی ہیں۔ بعض اچھا لکھنے والوں کو "پونم" کی صوری و معنوی دلکشی نے اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے نہ صرف فوری طور پر اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ فرمائی ہیں بلکہ اپنے دوست شاعروں اور ادیبوں سے "پونم" کے لئے لکھوانے کا وعدہ بھی کیا ہے، جس کی بنا پر ہمیں امید ہے کہ "پونم" کے آئندہ شمارے خوب سے خوب تر ثابت ہوں گے۔ بعض احباب نے پہلے شمارے کے ادبی معیار کی ستائش کرتے ہوئے ادارے سے یہ سوال کیا ہے کہ آیا ہم مستقبل میں بھی یہی معیار برقرار رکھ سکیں گے؟ اس کے جواب میں صرف "پونم" کا دوسرا شمارہ پیشِ خدمت ہے جو "نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول" ــــ کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کے نکھرے ستھرے حقیقت پسندانہ ذوقِ ادب کو اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا۔

چند ادب نواز دوستوں نے اپنے پُرخلوص مشوروں سے ادارہ کو سرفراز فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ "پونم" کے صفحات کو عمدہ، معیاری اور دلچسپ رشحاتِ فکر سے آراستہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔

"پونم" کی طباعت آخری مرحلے میں تھی کہ اچانک ہمارے ہردلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کی منحوس اطلاع ملی۔ پریس، ان کے سوگ میں دو دن کے لئے بند رہا۔ یہی وجہ ہے کہ "پونم" کے منظرِ عام پر آنے میں چار دن کی تاخیر ہوگئی۔ (ادارہ)

پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد

"آسکر وائلڈ کا نظریۂ تنقید"

لوگ کہتے ہیں کہ آرٹ کے انتہائی عروج کے زمانے میں آرٹ
۔ نقادوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہ ایک مغالطہ ہے جس میں،
۔ب کا پورا بانکپن اور ایک سال خوردہ حبیب کی بیزار کن محبوبیت
۔ جو نوجوان یہ عقیدہ رکھے، سمجھ لینا چاہئیے کہ وہ کسی کھوسٹ ادیب
۔ذوق جرنلسٹ کے زیر اثر ہے۔ آجکل کی صحافت ڈارون سے مرکزی
۔ول، یعنی کشاکشِ شکم پر منحصر ہے۔ لیکن خیر، مجھے ادب اور آرٹ سے
۔ش کرنی ہے۔

یونان کے لوگ بہ حیثیت قوم آرٹ کے جوہری تھے۔ دیگر اشیاء
تنقید کی طرح وہ آرٹ کی تنقید کے بھی موجد تھے۔ اُن کے ہاں زندگی
۔ زندگی سے بھرپور اظہار کو بلند ترین مقام حاصل تھا۔ سوال اب
۔ہے کہ یونانی اپنے زمانے کے بہترین نقاد تھے، تو کس قسم کی فنکارانہ
۔ید کے نمونے وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں؟

چھاپے کی ایجاد کے بعد سے لوگوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو
۔نے اور آنکھوں کی وساطت سے معانی و مطالب کو گھورنے کا مرض
۔ل بڑھتا جا رہا ہے۔ یونانیوں کے ہاں ایسا نہ ہوتا تھا۔ وہ تحریر کو
۔نے واردات قلبی کے قلمبند کرنے کا محض ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ اُن کے
ہاں مطالب کے جوہری کان ہوتے تھے نہ کہ آنکھیں۔ ہر لفظ کا ترنم
اُس کی معنویت، آواز کے کانٹوں پر تُلتی تھی۔ آواز کسوٹی تھی اور کان
جوہری۔

ملٹن کے اشعار کی شان دار روانی اور لفظوں کے پُرشکوہ ترنم
کا راز اسی میں ہے۔ جب ملٹن لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گیا تو اُس
نے گنگنانا اور گانا شروع کیا۔ بصارت کھو کر اُس نے بصیرت پائی۔
ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی صوت و لحن کی طرف دھیان دیں۔ آواز کو
ہمیں بھی کسوٹی بنانا چاہئیے۔ یونانیوں کی جمالیاتی تنقید کی نزاکتیں جب
ہی ہم پر کھلیں گی۔

بہترین اور لطیف ترین آرٹ شعوری اور خود آگاہ ہوتا ہے۔
کوئی شاعر اس لئے نہیں گاتا کہ گانے پر وہ مجبور ہے، بلکہ اس لئے کہ گانا
اُسے مرغوب ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا یہ مقولہ کہ ادب زندگی کی تنقید
ہے، بہ لحاظ توصیف، جامعیت کا حامل نہیں۔ لیکن اس سے اتنا ضرور
واضح ہوتا ہے کہ آرنلڈ تخلیقی کارناموں میں تنقیدی جوہر کی اہمیت کا
معترف تھا۔

آرٹ کی نیرنگی، اسلوب کی وحدت اور یک رنگی سے ہے۔

اسلوب نہیں تو آرٹ نہیں۔ یک رنگی نہیں تو اسلوب نہیں۔ اور یک رنگی کیا ہے؟ آرٹسٹ کی انفرادیت۔ شیکسپیر نے بلاشبہ قدیم تاریخوں، ڈراموں اور ناولوں سے اپنا کچا مال اکٹھا کیا تھا۔ لیکن اُس نے انہیں لے کر ایک نئے رُوپ میں ڈھالا اور اسطرح اپنایا کہ سارا پرایہ مال اُس کا اپنا مال ہو گیا اور اُس میں ایک انوکھی دل کشی آ گئی۔

زندگی اور آرٹ کا مطالعہ جتنا گہرا ہو گا، اُتنی ہی شدت کے ساتھ یہ محسوس ہوتا جائے گا کہ ہر انوکھی شئے کے پیچھے کسی کی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ نیز یہ کہ انسان گھڑی اور آن کا آفریدہ نہیں ہوتا بلکہ زمانہ اُس کی تشکیل میں ہوتا ہے۔

میرا یہ ایقان ہے کہ "صحیفیات" (دیومالا) کی بیشتر کہانیاں اور داستانیں جو بظاہر کسی قوم کے خوف، استعجاب یا تخیل سے اُبھری ہیں، اصل میں کسی ایک ذہن رسا کی ایجاد اور خلاقی کا نتیجہ ہیں، اور خاص طور پر ان داستانوں کی کمی تعداد اس نتیجہ کی جانب میری نشان دہی کرتی ہے۔

بہرحال مجھے یہ جتانا ہے کہ جو زمانہ تنقید سے محروم رہے سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا زمانہ بلاشبہ جامد، بے حس اور روایتی اصناف کا محض نقالی تھا جس میں آرٹ معدوم رہا۔

آرٹ میں ایسے دور بھی آئے ہیں جبکہ تنقید ہی کا دَور دَورہ تھا اور تخلیق کا بازار سرد تھا۔ لیکن کوئی تخلیقی دَور ایسا نہیں آیا جو تنقید سے عاری رہا ہو۔ تنقید کا جذبہ ہی اصل میں نئی راہیں اور نئے سانچے تلاش کرتا ہے۔ اس کی بدولت فکر و اسلوب کے نت نئے مذاہب و مکاتب جنم لیتے ہیں۔

ہر نیا مذہب، ہر نیا اسکول، اپنے جنم کے ساتھ ہی تنقید کے خلاف چیخ و پکار مچاتا ہے۔ لیکن اُس کا وجود، تنقیدی جوہر ہی کا مرہون ہے۔ محض تخلیقی جذبہ، تجدد کا حامل نہیں ہوتا۔ تخلیق کا کام ہے محض جننا یا جنم دینا۔

آجکل لوگوں کو رسالوں اور ماہواری خرافات پڑھنے کا مرض ہے۔ ارباب صحافت کی یہ پیداوار سرے سے بے مایہ اور مہمل ہے۔

یہی حال جدید اَدب کا بھی ہے۔ تُٹ پونجیے اور تُٹ پونجیوں کو تنقید کی ترازو میں تول رہے ہیں اور نااہل نااہلوں کی قصیدہ خوانی میں مشغول ہیں۔ یہ ہے تماشہ جو انگلستان کی فن کارانہ سرگرمی گاہ و بے گاہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نقاد اُن فن کاروں سے زیادہ شائستہ ہوتے ہیں، جن کے کمال کا وہ جائزہ لیتے ہیں۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، اس لئے کہ تنقید، تخلیق سے زیادہ شائستگی اور ثقافت کا ہم سے مطالبہ کرتی ہے۔

آپ کہیں گے یہ کیسے؟ بات صاف ہے۔ کئی جلدوں میں ایک ضخیم ناول لکھ ڈالنا آسان ہے اس کے لئے صرف ضرورت ہے زندگی اور اَدب سے نابلد ہونے کی۔ اس لئے ایک تبصرہ نگار کو دشواری یہ آن پڑتی ہے کہ تبصرہ کرتے وقت کوئی معیار قائم رکھنا اُس کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ جہاں سرے سے اسلوب کا پتہ نہ ہو۔ کوئی تبصرہ نگار معیار کیسے قائم رکھ سکتا ہے؟ نتیجہ یہ کہ غریب تبصرہ نگار ادب کی پولیس کورٹ کا محض پیروکار، اور مجرمین فن کے اعمال کا پرچہ نویس بن کر رہ جاتا ہے۔

میں اس سے بھی بے خبر نہیں کہ ادب اور نقاشی کے بیشتر پُرخلوص خدمت گزار ایسے ہیں جو سرے سے تنقید کے شاکی اور اُس سے بیزار ہیں۔ اُن کی شکایت بجا ہے۔ اُن کا عمل (کام)، اپنے عہد کے ذہنی رُجحانات سے میل نہیں کھاتا۔ ہمیں اُس سے کوئی لذت نہیں ملتی۔ اُن کا کام حُسن، جذبات اور فکر کی نئی راہیں ہمیں نہیں سُجھاتا۔ تو کیا یہ مناسب نہیں کہ اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ اُن کا ذکر ہی کیوں چھیڑا جائے؟ اُنہیں طاقِ نسیاں میں رہنے دو جن کے وہ مستحق ہیں۔

آپ شاید کہیں کہ یُوں کہنا بہت آسان ہے، کرنا مشکل۔ میری گذارش ہے کہ کسی چیز کا کرنا آسان ہے، اُس کا ذکر اور بیان بہت مشکل۔ روزمرہ کے عام واقعات سے اس کا ثبوت ملے گا۔ مثلاً یہ کہ تاریخ میں آ جانا آسان ہے تاریخ لکھنا بہت مشکل۔

ں کچھ نہ کچھ گزرتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں آجاتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا مورخ ہی تاریخ لکھ سکتا ہے۔

عمل کا کوئی روپ، احساس کا کوئی سانچہ ایسا نہیں جس میں اور حیوان ہماری ہمسری نہ کرتے ہوں۔ لیکن نطق ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہم اُن کے اور خود اپنے ہم جنسوں کے آگے ممتاز نظر آتے ہیں۔ نطق کہیے یا زبان، یہی فکر کی پروردگار ہے۔ محض عمل ایک اندھی قوت ہے، جس کا انحصار خارجی اثرات پر ہے جن میں شعور اور نظم کا فقدان ہوتا ہے۔ عدم تخیل پر اس کی بنیاد ہے، اور یہ آخری سہارا ہے اُن لوگوں کا جن کی آنکھیں سہانے خواب نہیں دیکھ سکتیں۔ تاریخ کی بڑی خدمت ہو گی اگر ہم تاریخ کو پھر سے لکھ سکیں۔ اور یہ کام ہوگا اُن لوگوں کا جو بصیرت رکھتے ہیں اور تنقید کے تیکھے کیل کانٹوں سے لیس ہیں۔

بہرحال میرا کہنا ہے کہ ادب کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ روزمرہ کی زندگی اور زندگی کے کچے مال مسالے سے وہ ایک ایسی دنیا پیدا کرے جو اس سے انوکھی، بارونق، پائیدار اور سچی ہو تاکہ اس سے معمولی انسان اپنی سرشت کی تکمیل کر سکے۔

سوال ہوگا کہ یہ سب بحث تو زندگی اور آرٹ سے متعلق ہے اس کو تنقید سے کیا علاقہ؟ یقیناً ہے۔ تنقید بذات خود ایک آرٹ ہے اور جسطرح ہر فن کارانہ تخلیق اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تخلیق کے ساتھ ساتھ کسی فنکار نے اپنی تنقیدی صلاحیت سے بھی کام لیا ہے جس کے بغیر تخلیق ناممکن ہوتی، ٹھیک اسی طرح تنقید بھی تخلیق ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تنقید بیک آن تخلیقی بھی ہے اور بے نیاز تخلیق بھی۔

تنقید کو مشابہت کی نری نقل کے پست معیار سے جانچنا نہ چاہیے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک شاعر یا سنگ تراش کے عمل (کام) کو خارجی مشابہت کے معیار سے جانچا نہیں جاتا۔ نقاد کو کسی فن کارانہ عمل کی تنقید سے وہی نسبت ہے جو ایک فن کار کو مرئی دنیا کی اشیاء اور اُن کے روپ رنگ سے ہوتی ہے یا غیر مرئی دنیا کے محرکات اور افکار سے۔

اپنے آرٹ کی تکمیل کے لئے ایک نقاد کے پاس بہترین مال مسالے کا ہونا بھی لازمات سے نہیں اور جسطرح ایک دیہاتی طبیب کی کم سمجھ بیوی کی گھستاخی اور جذباتی چاہت سے فلوبیر نے ایک شاہکار بنایا اسی طرح ایک برگزیدہ نقاد اپنی ذہانت سے ایک حسین اور بے عیب چیز پیش کر سکتا ہے۔

تنقید اصل میں تخلیق سے بلند اور اُس سے کہیں زیادہ خلاق ہوتی ہے۔ تنقید انسان کے بطون اور اُس کی روح کا ماجرا ہے۔ اُس کی دل کشی تاریخ سے زیادہ دل کش ہوتی ہے، اس لئے کہ اُس کا تعلق واقعات سے نہیں بلکہ واردات سے ہے۔ وہ ایک طرح کی آپ بیتی ہے جسے اپنی ہی زندگی اور افکار سے واسطہ ہے۔ مجھے اُن مصنفوں اور فن کاروں پر ہنسی آتی ہے جو نقاد سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اُن کے گھٹیا درجے کے کام کو سراہے اور اُن کا پیامی بنے۔ جدید آرٹ کے بہترین نمونوں کے متعلق بس اتنا کہنا کافی ہے کہ عریانی، اور بے شرمی میں حقیقت سے وہ کچھ ہی پیچھے ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ تنقید کی اصلی غایت یہ ہے کہ ہم اشیا کو اُسی روپ میں دیکھنا سیکھیں جس میں کہ وہ اصلاً ہیں لیکن یہ ایک بھاری فریب ہے۔ تنقید اپنے اصلی روپ میں داخلیت کی حامل ہوتی ہے وہ اپنا بھید بتاتی ہے نہ کہ کسی اور کا۔ بلند ترین تنقید ایسے آرٹ سے متعلق ہے جو داخلی ہوتا ہے نہ کہ اظہاری۔

ایسی تنقید جسے میں تنقید کہتا ہوں، ایسا فن کارانہ عمل ہے جو یکسر نئی تخلیق کے لئے نقطۂ آغاز بن سکے۔ وہ اس تاک میں نہیں ہوتی کہ کسی فن کار کے کام کا بھید پائے یا اُسے حرف آخر سمجھ کر بس اُسی پر قناعت کر لے۔

میرے نزدیک آرٹ کے محاسبہ کے لئے یہی ایک مناسب روش ہے، اس لئے کہ ایک حسین تخلیق دیکھنے والوں کے بطون میں بھی اُتنی ہی رچی ہوتی ہے جتنی کہ بنانے والے کے تن من میں۔ دیکھنے والا تو بعض اوقات ایک حسین شئے میں بے شمار معانی و مطالب پیدا

کر دیتا ہے جو بنانے والے کی نگاہ میں نہ تھے۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایک فن کارانہ تخلیق سرانجام پانے کے بعد اپنا ایک منفرد وجود اور مقام حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ بنانے والے کی مرضی اور غایت کے خلاف وہ کوئی نیا سندیس سنائے۔ انسان کی قلبی واردات کی طرح حُسن کے معانی بھی اتھاہ ہوتے ہیں۔ حُسن کے نکتے نقطوں سے باریک ہوتے ہیں۔ حُسن سب کچھ ظاہر کرتا ہے، اس لئے کہ کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔

سوال ہوگا کہ یہ حُسن کارانہ عمل جس کا ابھی میں نے ذکر کیا، کیا حقیقت میں تنقید کہلانے کا مستحق ہے؟ یقیناً بلکہ ایک بلند پایہ تنقید۔ اس لئے کہ ایسی تنقید نہ صرف کسی منفرد اور بے مثل عمل، (کام) کو آنکتی ہے، بلکہ حُسن کا بھی محاسبہ کرتی ہے اور ایک پیکر کو جسے کسی آرٹسٹ نے مبہم انداز میں پیش کیا تھا، یا پورے طور پر سمجھنے سے قاصر تھا ایک انوکھی معنویت اور حیرت سے معمور کرتی ہے۔

حُسن کارانہ تنقید اسطرح تخلیق سے کہیں زیادہ خلّاق ہوتی ہے اور نقاد کا پہلا کام یہ ہے کہ کسی شئے کو ایسے رُوپ میں دیکھے جو بظاہر اُس کا رُوپ نہیں ہے۔

کسی حسین شئے کی خصوصیت خاص یہ ہے کہ ہم اُس میں وہ سب کچھ پاتے ہیں جس کی ہم تمنّا کرتے ہیں، اور اُس میں سب کچھ دیکھتے ہیں جس کی آنکھیں متلاشی ہوتی ہیں اور وہی حُسن جو تخلیق کو جہانگیری اور جمالیت عطا کرتا ہے، نقاد کو بھی ایک طرح کا خلّاق بناتا ہے اور اُس کے کانوں میں ایسے مطالب و معانی ڈالتا ہے جو آرٹسٹ کے حاشیۂ خیال میں نہ تھے۔

بعض تنقید ناآشناؤں کو اکثر کہتے سُنا ہے کہ نقاد عموماً ایسی تصاویر پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں جو ماجرائی ہوتے ہیں اور خطوط و رنگ کی آڑ میں ادب یا تاریخ کا کوئی مرقع پیش کرتی ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی تصویریں ضرورت سے زیادہ قریب الفہم ہوتی ہیں اور جس غرض سے وہ بنائی گئی ہیں، اُس کی بھی پورے طور پر عکاسی نہیں کرتیں۔ اُن سے تخیل کو کوئی تحریک نہیں ہوتی بلکہ اُن سے تخیل پابہ زنجیر ہو جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ نقاش کا میدان، ادیب اور شاعر کے میدان سے بالکل الگ اور مختلف ہوتا ہے۔ زندگی اپنی پوری جامعیت کے ساتھ شاعر کے سامنے آتی ہے۔ نہ صرف اُس حُسن کے ساتھ جس پر لوگوں کی نگاہیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اُس حُسن کے ساتھ بھی جو کانوں میں امرت ٹپکاتا ہے۔ چہرے مُہرے کے موقعتی بناؤ سنگھار اور رنگوں کی عارضی بانکپن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ احساس کی انتہائی شدت اور فکر کی پوری توانائی کے ساتھ۔

غریب نقاش اس لحاظ سے مجبور ہوتا ہے کہ جسم کی نقاب کے بغیر وہ رُوح کے اَسرار کو بے نقاب نہیں کر سکتا۔ رنگوں اور خطوط کی وساطت سے وہ خیالات کو چھُونے کی سعی کرتا ہے، اور جسم سے نفسیات کو پایاب کرنا چاہتا ہے۔ کتنا بھونڈا طریقہ ہے کہ ایک پھٹی پگڑی اور کچھ بکھرے ہوئے بالوں کو دکھا کر کوئی نقاش یہ سمجھے کہ اُس نے اُدتھیلو (Othello) کی غضب ناک برہمی کا نقشہ پُورے طور پر کھینچ دیا۔ کتنے ہی نقاش انگلستان میں ایسے ہوں گے جو شاعروں کی اقلیم میں اسطرح ڈاکے ڈالتے اور خود اپنی نکمی زندگیوں کا بھی خرابہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے کیفی فنون کو بے کیف بنا دیا ہے فن کی اس سے بڑھ کر بے حُرمتی اور تذلیل کیا ہو سکتی ہے۔

اکثر کہتے سُنا ہے کہ ایک آرٹسٹ کی زندگی کا حُزنیہ یہ ہے کہ وہ اپنا نصب العین نہیں پاتا۔ میری رائے میں کسی آرٹسٹ کا حُزنیہ یہ ہے کہ وہ اپنا نصب العین قطعیت کے ساتھ پالے۔ نصب العین جہاں پالیا گیا، اُس کی حیرت اور رنگونگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی آرٹ کا بھرپور نمونہ ہے۔ موسیقی اپنا آخری بھید کبھی نہیں بتاتی۔

آرٹ اپنے ادھورے پن ہی کی بدولت حُسن کا کمال پیش کرتا ہے اور عقل و ادراک سے زیادہ انسان کی جمالیاتی حس کو موہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی نقاد آرٹ کی اُن اصناف سے جو محض سطحی اور غیر ایمائی ہوتی ہیں سروکار نہیں رکھتا، اُسے ایسی چیز کی تلاش ہوتی ہے جو اپنی ایمائیت کی بدولت فکر و مراقبہ کا سامان فراہم کرے۔ جیسے حُسن کی بیشمار توجیہیں ہوں اور کوئی توجیہ آخری اور قطعی نہ

نریش کمار شاد

پُشکن اور اُسکی شاعری

اُنیسویں صدی کے شروع میں رُوسی قوم کو اپنی تہذیبی اور ثقافتی بے مائیگی کا احساس بخُوبی ہو چکا تھا اور اس احساس نے رُوس کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلابی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی۔

اس وقت روس کے سماجی اور معاشی نظام پر اگرچہ زارشاہی اپنی پُوری بربریّت اور بہیمیّت کے ساتھ مُسلّط تھی، لیکن اس بربریّت اور بہیمیت کی کوکھ سے روسی فوج اور رُوس کے تعلیم یافتہ طبقے کے شرفا میں حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات آفتاب تازہ کی کرنوں کی طرح پھُوٹ رہے تھے اور انہیں جذبات کے گہوارے میں پشکن کی زندگی پروان چڑھی اور جاگرتی اور بیداری کی انہیں شعاعوں نے اس کے ذہنی رُجحانات کو تابندہ و رخشندہ کیا۔

۶ جون ۱۷۹۹ء کو الگزینڈر سرگے یوچ پشکن نے ماسکو شہر کے ایک ادب دوست گھرانے میں جنم لیا۔ اس کے والد سرگے یوچ پشکن اور اس کے چچا وسیلی لووچ اس زمانے کے نامور شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے یہاں اس وقت کے بیشتر برگزیدہ اور مشاہیر شعرا ازکووسکی اور دیمتریف وغیرہ کی نشستیں بالعموم ہوا کرتی تھیں۔ پشکن بچپن ہی میں ان لوگوں کی باتیں اور ان کا کلام نہایت دلچسپی اور انہماک سے سنا کرتا تھا۔ لیکن پشکن کی ذہنی تربیت اور دماغی نشوونما میں ان صحبتوں سے بھی کہیں زیادہ اسکی آیا ارینا رُڈیونوونا کا ہاتھ تھا جسے رُوسی زبان کے لاتعداد تاریخی اور عوامی قصے حفظ تھے جنہیں وہ اکثر پشکن کو بھی سنایا کرتی تھی۔ انہی قصوں میں بعض کو پشکن نے بعد میں اپنی نظموں میں بھی منتقل کیا۔ علاوہ ازیں اس نے متعدد نگارشات میں بھی اپنی آیا کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ ارینا کے سنائے ہوئے قصوں میں فرانسیسی ادب سے بھی زیادہ شاعرانہ خصوصیات موجود تھیں اور ان ہی قصوں کے اثرات نے عالم سے اس کی محبت اور وابستگی کی بنیادوں کو گہرا اور پائدار کیا۔

پشکن کا بچپن ماں کی لاڈ پیار اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے بسر ہوا۔ وہ اس خاندان کا چشم و چراغ تھا جو روسی شرفا کے چند گنے چنے امیر گھرانوں میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ روسی تاریخ میں اس خاندان کا ذکر کئی بار آتا ہے۔ پشکن کا پرنانا ابراہیم حبشی ایک حبشی غلام تھا جسے ترکی کے سلطان نے تحفے کے طور پر پیٹر اعظم کو پیش کیا تھا۔ ابراہیم حبشی نے تھوڑی ہی مدت میں اپنی فراست اور معاملہ فہمی سے

...اعظم کو بیٹا گردیدہ بنا کر ساتھ ہی ممتاز سماجی مقام حاصل کر لیا
...بعد میں جنیبل نے ایک جرمن خاتون سے شادی کر لی تھی۔ پشکن
...نانا اسی خاتون کا بیٹا تھا۔ چنانچہ پشکن کی والدہ کی رگوں میں جرمن
...حبشی خون تھا۔ پشکن کو اپنے اس حبشی رشتے پر بڑا ناز تھا اور
...کے اپنے خدوخال میں بھی حبشی اثر موجود تھا۔ اپنی ایک نامکمل
...ناول "پیٹر اعظم کا حبشی" میں بھی اس نے اپنے پرنانا کا کردار پیش
...کرنے کی کوشش کی ہے۔

گیارہ برس کی عمر میں پشکن نے باقاعدہ طور پر شعر کہنے شروع
...کر دیئے تھے اور اپنی شاعری کی ابتدا کچھ اس قسم کی ہلکی پھلکی رومانی نظموں
...سے کی تھی ؎

میٹھے انگوروں کے حسیں خوشے
مجھ کو بھاتے ہیں میرے پیارے ہیں
کوہ کے برف پوش دامن میں
سیم گوں دھوپ میں جو پکتے ہیں
میری وادی کے ہیں جو آنچل پر
موتیوں کی طرح سے آویزاں
جن کے سائے کسی حسینہ کی
انگلیوں کی طرح دراز سے ہیں

(انگور)

پشکن کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے گھر ہی کے علمی اور ادبی
ماحول میں ہوئی، بعد ازاں ۱۸۱۱ء میں اسے زار کوئی سیلو کی درسگاہ
لیسیئم میں داخل کرا دیا گیا، جہاں صرف فرانسیسی زبان ہی میں تعلیم دی
جاتی تھی اور جس میں صرف امیر زادے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ درس و
تدریس کے علاوہ یہاں طلباء کو اپنے طبقاتی آداب سے بھی آگاہ کیا جاتا
تھا۔ یہ درسگاہ لینن گراڈ کے نواح میں ایک گاؤں میں واقع تھی، اور
آجکل اس گاؤں کو "پشکن" کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ پشکن نے
چھ سال تک یہاں تعلیم حاصل کی اور اس مدت میں اس نے سینٹ سائمن
...ال باخ، روسو اور والٹیئر جیسے انقلابی مفکروں کی تمام تصنیفات

کے علاوہ فرانس کے کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کیا اور یورپی فکر و اسلوب
کے زاویوں کی روشنی میں اپنے فنی شعور میں اندازِ فکر اور تیکھا پن پیدا کیا
اور اس دوران میں متعدد کلاسیکی شعرا کے کلام کو روسی زبان کے قالب
میں ڈھالا۔ اس کے ترجمہ شدہ کلام میں قرآن کی چند آیات کے تراجم
بھی موجود ہیں۔

اس زمانے میں روسی قوم پر ۱۸۱۲ء کے بورژوا انقلاب کے
اثرات کی بھی چھاپ پڑی جس کے ردِعمل کے طور پر ان کی سیاسی
اور سماجی جدوجہد نے واضح طور پر اپنا راستہ متعین کر لیا۔ چنانچہ اسی
سال سے روس کو مغرب کے جمہوری نظام کی ڈگر پر گامزن کرنے کی تاریخی
تحریک کا آغاز کر دیا گیا۔ زارِ شاہی کی مخالفت اور مروجہ نظامِ حکومت
کا قلع قمع، اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔ روسی شرفا اور متوسط
طبقے کے لوگوں میں اس تحریک کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ
پشکن بھی لیسیئم کے بیشتر طالب علموں کی طرح اس تحریک سے منسلک
ہو گیا اور اس وابستگی نے اس کے انقلابی ولولوں کی آگ کو اور بھی تیز کر دیا
۱۸۱۷ء میں جب اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کیا اس وقت تک
اس تحریک کی بھٹی میں تپ کر اس کے انقلابی نظریات بالکل نکھر چکے
تھے۔ اس کی آواز میں ایک مجاہدانہ پرشکوہ خروش پیدا ہو چکا تھا، اور
اس زمانے میں اس نے غلامی اور زار شاہی سے نفرت کا اظہار کرتے
ہوئے کہا تھا ؎

اے سیہ دل بادشاہو! نابکارو! ظالمو!
مجھ کو نفرت ہے تمہارے تخت سے اور تاج سے
اب تمہاری تیرہ بختی اور تمہاری موت پہ
سنگ دل انسان کے مانند خوش ہوتا ہوں میں

(آزادی)

اسی زمانے میں پشکن نے متعدد ایسی نظمیں کہیں جن میں کلیسا اور
ریاست کے اعلیٰ افراد کو جن میں زار بھی شامل تھا اپنے غصے اور اپنی حقارت
کا ہدف بنایا تھا۔ ان نظموں میں اس کی نظم "گاؤں" بہت مشہور ہے
یہ نظم نہ صرف زرعی نظام کی چکی میں پستے ہوئے روسی کسان کی زندگی کا

آئینہ ہے یعنی اس نظام کی اجارہ داری کے خلاف درد و کرب میں ڈوبا ہوا
احتجاج بھی ہے۔

لہلہاتے خوشنما کھیتوں، پہاڑوں، وادیوں کے درمیاں
لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے وہ انسان بھی
جان سے بڑھ کر جسے محبوب ہو انسانیت
دیکھتا ہے جب یہاں
ایک اک چہرے پر کندہ ہیں جہالت کے نقوش
اور ان کے خون سے پاتی ہے اب تک پرورش
سنگ دل، مغرور اور قانون سے بے بہرہ آقاؤں کی نسل
جو ہے اندھی دوسروں کے آنسوؤں کے واسطے
جو ہے بہری دوسروں کی آہ و زاری کے لئے
منتخب جس کو کیا ہے اس لئے تقدیر نے
کر سکے وہ دوسروں کی زندگی کو پائمال
چھینتی ہے اپنے ہاتھوں میں جو ہنٹر تھام کر
ایک محنت کش کی محنت، اس کا غلہ، اور اس کی زندگی
اور وہ بھوکا، جفاکش، تازیانے کا غلام
افتاں و خیزاں چلاتا ہے کرائے کا جو ہل
کھینچ دیتا ہے زمیں کے سینۂ خاموش پر
اپنے ان سفاک آقاؤں کی قسمت کی لکیریں جا بجا
جن کے پتھر دل پگھل سکتے نہیں
بے بسی کی التجاؤں سے کبھی
اور یہاں
عام انسانوں کے شانوں پر دھرا رہتا ہے بارِ درد و غم
اور دوشیزائیں بھی مجبور ہیں
اپنے دل کی آرزوئیں اپنے ہاتھوں سے کچلنے کے لئے
چاہیں بھی تو دے نہیں سکتیں محبت کا محبت سے جواب
ان پہ آتی ہے جوانی اس لئے
تاکہ وہ
اپنے آقاؤں کے سینوں میں ہوس کی آگ ٹھنڈی کر سکیں
اور یہاں
ایک محنت کش کا بیٹا، ایک تیرہ بخت کا لختِ جگر
اپنی ماں اور باپ کے اشکوں کا ساتھی اور بڑھاپے کا عصا
اس لئے ہوتا ہے پیدا تاکہ وہ
بادشاہِ وقت کے محلوں کی دربانی کرے
آہ کیا یہ ہو نہیں سکتا کہ میری شاعری
ان کے خوابیدہ دماغ و دل میں بیداری کے شعلے پھونک دے
میرا سینہ کیوں جلا جاتا ہے آخر آتشِ بے فیض سے
کس لئے میری زباں شعلے اُگل دیتی نہیں
دوستو!
کیا کبھی دیکھوں گا اپنی قوم کو آزاد اور بیدار میں
کیا زراعت کا اجارہ مٹ سکے گا حرفِ باطل کی طرح ؟
کیا مرے پیارے وطن میں پھر آزادی کبھی
دے سکے گا اک نئی اور خوبصورت صبحِ تاباں کو جنم ؟

۱۸۲۵ء میں پشکن نے "روسلان اور لُدمِلا" کی تخلیق کی.
اس طویل نظم میں اس نے اس وقت کی روسی زندگی کو پوری جدوجہد کے ساتھ آئینہ کیا اور اسلوب اور بیان میں مروجہ اور کھوکھلی روایات اور گھسے پٹے پُر تکلف محاوروں تشبیہوں اور استعاروں کو چھوڑ کر نہایت سادگی سے کام لیا۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد اسے روس کے عوامی ادب کا سنگِ بنیاد قرار دیا گیا۔ اسی سال پشکن کی اس نظم اور دوسری انقلابی نظموں کی بے پناہ مقبولیت کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اسے پیٹرسبرگ سے دو ہزار میل دور جنوبی روس میں جلاوطن کر دیا۔ جلاوطنی نے پشکن کے فن کو اور بھی تقویت بخشی۔ اس دوران میں اسے روس کے پسماندہ علاقوں میں گھومنے پھرنے کے مواقع میسر ہوئے اور تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس کی عملی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں اور اس نے اپنے فکر و عمل کا رشتہ باغیوں کی جنوبی انجمن سے قائم کر لیا اور اپنی آتشیں نظموں کے ذریعہ باغیوں کے

دونوں میں ایک نئی روح پھونکنی شروع کر دی۔ چونکہ پشکن کی ان نظموں میں مشرق کی شگفتگی اور تازگی کے ساتھ ساتھ نظریئے کا خلوص اور احساس کی شدت بھی شامل تھی اور ان کے پیچھے نئی اور ابھرتی ہوئی زندگی کا دھڑکتا ہوا دل بھی دھڑک رہا تھا اس لئے ان سے انجمن کے مقاصد اور اس کی تنظیم اور ہردلعزیزی کو بہت فائدہ پہنچا۔ ایسی نظموں میں اس کی مشہور نظم "خنجر" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جس میں پشکن نے غیر معمولی فن کارانہ گہرائی اور ذہانت سے روسی سماج کے اہم ترین معاشی اور اقتصادی مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔

انہی ایام میں پشکن کی شاعری پر کچھ مدت کے لئے بائرن کا اثر بھی پڑا اور اس نے اپنی مشہور طویل نظم "قفقاز کے قیدی" کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹی چھوٹی نظموں میں بائرن کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی لیکن جلد ہی دونوں شاعروں کے ذہنی اور طبعی رجحانات کا تفاوت آڑے آگیا۔ اسلئے یہ اثر دیرپا ثابت نہ ہو سکا اور بعد کی نظموں "نٹ" اور "یف گنے نی اونے گن" میں پشکن کی انفرادیت کے خدوخال بالکل واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔

جنوبی روس میں بھی اس کی سرگرمیوں سے خائف ہو کر حکومت نے ۱۸۲۴ء میں اسے جنوب سے شمالی روس کے دیہات میں منتقل کر دیا مگر حکومت کی توقع کے برعکس یہاں پہنچ کر پشکن نے اپنے آرٹ کو عوامی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی انتہا کر دی۔ اس نے دیہاتیوں ہی سا لباس پہننا شروع کر دیا۔ انہیں کی زبان اور کلچر کو اپنا لیا اور ان کے قصوں، کہاوتوں اور لوک گیتوں سے گہری واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ "روسی زبان کی خصوصیات کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لئے پرانے لوک گیتوں، محاوروں اور قصے کہانیوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔"

اور یہی حقیقت جب پشکن کی تخلیقی صلاحیتوں میں فروزاں ہوئی تو اس کی نگارشات کو تہذیبی اور سماجی دستاویزات کا رتبہ مل گیا، اور مارکس اور اینگلز کو روسی عوام کی روزمرہ زندگی اور روسی کسان کے اقتصادی اور معاشی پس منظر کو پوری اصلیت اور صداقت سے دیکھنے اور سمجھنے کیلئے پشکن کی تصانیف کی طرف رجوع کرنا پڑا، اور پشکن کی تصانیف سمجھنے کے لئے روسی زبان سیکھنی پڑی۔

پشکن نے ایسی نظموں میں اپنے مخصوص اور عام فہم اندازِ بیان اور طرزِ فکر کے خوش نما رنگوں سے اپنے فن کے پردوں پر روس کی دیہاتی زندگی کے مختلف نقش و نگار اجاگر کئے ہیں۔ ان نقش و نگار میں اس کی شاعرانہ عظمت اپنی پوری سج دھج اور آن بان سے جلوہ گر ہے اور ان نظموں کی گونج ابھی تک وہاں کے کھیتوں اور وہاں کی وادیوں میں لہرا رہی ہے۔ روسی بچے اور طالب علم آج تک انہیں نظموں کے آئینے میں ماضی کے بچھڑے ہوئے روس کی دیہاتی زندگی کے مظاہر دیکھتے ہیں اور انہیں نظموں کو گنگنا کر اپنے دیہات کے ماحول سے لطف اندوز ہونا سیکھتے ہیں اور اس طرح پشکن کی یہ نظمیں ان کی وطن پرستی کے جذبے کو گہرا اور پائیدار بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

پشکن شمالی روس کے انہیں دیہات میں نظر بند تھا جب نکولس اول نے بڑی سختی اور تشدد سے دسمبری بغاوت کو ناکام کر دیا۔ اس ناکامی کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اس کی باگ ڈور چند روسا کے ہاتھ میں تھی اور ویسے بھی اس کے اثرات زیادہ تر طالب علموں اور متوسط طبقے کے افراد تک ہی محدود تھے۔ روسی عوام پورے طور پر اس کے ساتھ نہیں تھے چنانچہ ۱۴ر دسمبر ۱۸۲۵ء کو سینٹ پیٹرز برگ میں اس تحریک کے پانچ اہم کارکنوں کو پھانسی دے دی گئی اور بہت سے دوسرے باغیوں کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ان جلاوطنوں میں پشچن اور کرچل بیچر ایسے پشکن کے ذاتی دوست اور لیسیئم کے ہم جماعت بھی شامل تھے اور اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کے قبضے سے پشکن کے لکھے ہوئے مسودات بھی برآمد ہوئے تھے۔

پشکن کی نظم "سائبیریا کے رفیقوں کے نام" انہیں جلاوطنوں سے متعلق ہے، جس میں وہ کہتا ہے:

۵

اے سائبیریا کے رفیقانِ انقلاب
تم ان عمیق کانوں میں ثابت قدم رہو

مغرور ہو کے دولتِ صبر و شکیب پر
کچھ اور دن یہ قید کے رنج و الم سہو

مجھ کو یقین ہے کہ تمہاری حیات پر
سایہ نہ پڑ سکے گا شکست و ملال کا
جائے گی رائگاں نہ تمہاری یہ جد و جہد
ختم ہو سکے گا سفر نہ تمہارے خیال کا

اُمید قید خانے کے تیرہ سکوت میں
دیتی ہے جگمگا کے یہ جرأت فزا پیام
"مطلوب دن تمہارا بہت جلد آئے گا
ہوگی تمہاری زیست بہر طور شادکام"

یوں چھن رہی ہے مہر و محبت کی روشنی
زندانِ ہولناک کی شب ہائے تار سے
جیسے پہنچ رہے ہیں مقید فضاؤں میں
میرے یہ پُر اُمید یہ آزاد زمزمے

ٹوٹیں گے ایک گونج سے زنداں کے بام و در
کٹ جائیں گے یہ طوق و سلاسل بھی ایک دم
اک سیلِ نور لے کے پھر آزادیٔ وطن
خوش آمدید تم کو کہے گی بہر قدم

اور پھر تمہارے بچھڑے ہوئے باوفا رفیق
بخشیں گے اک نشاط و طرب کا جہاں تمہیں
چھینا تھا جن کو اہلِ حکومت کے جور نے
لوٹائیں گے تمہارے وہ تیغ و سناں تمہیں

دسمبری بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد پشکن کو ۱۸۲۶ء میں ماسکو واپس بلایا گیا اور اسے اس شرط پر شاہی دربار میں ملازمت کی پیش کش کی گئی کہ صرف نکولس اول اس کی نظموں پر احتساب کیا کرے گا اور کوئی شخص اس کی آزادی میں مخل نہیں ہو سکے گا۔ پشکن نے دھوکے میں آکر یہ پیش کش قبول کر لی لیکن بعد میں جب اس کی معمولی سی معمولی نقل و حرکت پر بھی کڑی نگرانی ہونے لگی اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے راستے میں قدم قدم پر ترمیم و تنسیخ کی سنگین چٹانیں اُبھار دی گئیں تو وہ اُس ماحول سے بُری طرح بیزار ہو گیا اور اس بیزاری کا اثر اس کی شاعری پر بھی پڑا چنانچہ اس زمانے کی نظموں میں کشمکش، تذبذب، اُمید اور یاسیت کے ملے جُلے جذبات پائے جاتے ہیں، جیسے ؎

دیوانگی کے دَور کا بجھتا ہوا سرور
دل پر گراں ہے جیسے خمارِ شباب ہو
مانند مے ہی گزری ہوئی زندگی کا غم
جُوں جُوں پُرانا ہوتا ہے، ہوتا ہے تیز اور
سُنسان راستہ ہے مرا ۔۔۔ بارہا مجھے
مستقبلِ حیات کا بحرِ رواں دواں
دیتا ہے سیلِ درد و غم و یاس کا پیام

لیکن یاسیت کے ان گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں بھی پشکن کا شعور زندگی سے فرار نہیں کرتا اور زندہ رہنے کی شمع گُل نہیں ہوتی ؎

اے دوستو! مگر مجھے مرنا نہیں قبول
جینا ہے تاکہ نخلِ اُمیدوں کے بو سکوں
اور پھر مصیبتوں کے ثمر بھی میں چکھ سکوں
میں جانتا ہوں حسرت و آزردگی میں بھی
سامانِ عیش ہوگا فراہم مرے لئے

اسی ماحول میں رہتے ہوئے ۱۸ فروری ۱۸۳۱ء کو پشکن نے ایک روسی دوشیزہ نتالی سے شادی کر لی جو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت فضول خرچ اور خود سر بھی تھی اور اس کی فضول خرچی اور خود سری نے پشکن کی اقتصادی اور ذہنی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا

انہیں پریشانیوں کی وجہ سے اس نے بالآخر شاعری کو یکسر خیرباد کہہ کر سرکاری مورخ کا عہدہ قبول کر لیا لیکن زار نکولس کی منتقم مزاجی کو اس پر بھی قرار نصیب نہ ہو سکا اور وہ ان ناخوشگوار اور پریشان کن حالات میں بھی پشکن کو مختلف صورتوں سے ذلیل کرتا رہا۔ آخر اس کی رفیقۂ حیات کے خلاف افواہیں اُڑانی شروع کر دیں کہ ایک فرانسیسی جنرل سے اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ مجبوراً پشکن کو اپنے ناموس اور وقار کے لئے اس جنرل سے ڈویل لڑنا پڑی۔ یہ ڈویل انیسویں صدی میں یورپ کے شرفا کی ایک رسم تھی جس میں طرفین اپنے جھگڑے کا تصفیہ قانوناً نہیں بلکہ لڑ کر کیا کرتے تھے اور اس لڑائی کا نتیجہ بالعموم ایک فریق کی موت کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اس ڈویل میں پشکن کچھ اس بری طرح زخمی ہوا کہ ۱۰ فروری ۱۸۳۷ء کو اس کی موت واقع ہو گئی۔

پشکن کی یہ بے وقت موت دراصل نکولس کی منظم فریب کاری اور چال بازی کا نتیجہ تھی لیکن اس محبوب اور عظیم شاعر کی زندگی کا چراغ بجھا کر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ بیداری اور انقلاب کی چنگاری جسے پشکن نے اپنے اہلِ وطن کے دلوں میں روشن کیا تھا اس کی وفات کے بعد شعلہ بن کر بھڑکنے لگی اور نکولس کا یہ شیطانی انتقام اس کی پیشانی پر مستقل ذلت کا دھبہ بن کر رہ گیا۔ پیٹربرگ میں پشکن کے قریب المرگ ہونے کی خبر سنتے ہی سیر منتوف نے جو طویل ماتمی نظم "ایک شاعر کی موت" کہی تھی وہ اس کے انتقال کے فوراً بعد ہی شہر کے کوچے کوچے میں گائی جانے لگی۔ اس نظم میں کھلم کھلا زار کے اس اقدام پر انتہائی نفرت اور غصے کا اظہار کیا گیا تھا۔

پشکن کا جنم، درحقیقت روسی ادب میں ایک نئے ادبی دور کا جنم تھا۔ وہ پہلا حقیقت نگار ادیب ہے، جس نے نئے ادبی دور کی پیش روی کا عظیم تاریخی فرض سرانجام دیا۔ روسی ادب اور فن کو ایسی مستحکم بنیادوں پر استوار کیا جن پر روس کی جدید اور ترقی پسند نظم و نثر کے رنگ محل تعمیر کئے گئے۔ موجودہ روس کی ادبی زبان پشکن ہی کا عطیہ ہے۔ مشہور روسی نقاد بلینسکی کے بقول،

"پشکن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے جوش، توانائی حسن اور لچک پیدا کر کے روسی زبان کو ایک فطری زبان بنا دیا۔"

پشکن سے پہلے روسی شاعری کا زیادہ تر سرمایہ محض مغرب کی نقالی پر مشتمل ہے اور مجموعی طور پر اس میں زندگی کے منفی میلانات کی افراط ہے، لیکن پشکن نے اپنی بیس سالہ شاعری میں انفرادیت اور طبع زادیت کو بروئے کار لاتے ہوئے حقیقی روسی زندگی کی تصویر کشی کی اور ان تصویروں میں تشکیل اور تعمیر کے جذبوں کے رنگ ہر کہیں نمایاں ہیں۔ اس کے نغموں میں جہاں ایک باغی کے دل و دماغ کی تپش اور حرارت ہے وہاں ایک عام آدمی کی زندگی کا سادہ پن اور خلوص بھی ملتا ہے۔ اس نے اپنی تخلیقی قوتوں میں ماضی کے روس کی اعلیٰ و ارفع تہذیبی اور تمدنی روایات کو سمو کر عوامی ادب کا جامع خوبصورت اور عملی تصور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری انسانی سماج کے دردناک پہلوؤں کی نہایت کامیاب ترجمان ہونے کے باوجود اُمید اور عمل کی شاعری ہے اس میں کسک اور درد تو ہے لیکن اس کسک اور درد کے ڈانڈے انجام کار سماج کی مثبت اور ارتقائی اقدار سے ملتے ہیں۔ اپنے زمانے میں زار شاہی کے قہر و جبر کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی ہوئی تحریکِ آزادی اور عوام کی انقلابی جدوجہد کی لہریں اس کی شاعری کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں، جیسے ؎

شوخ خوابوں کے جال ٹوٹ گئے
زندگی اب اٹل حقیقت ہے
ہر نفس تند و تیز ہے جیسے
گردشِ وقت سے عبارت ہے

جاگ اُٹھا بڑے خروش کے ساتھ
اپنی کچلی ہوئی زمیں کا شعور
آگیا کام دردِ ناکامی
بس پڑا ظلم و جور کا ناسور

ایک اک نوجوان ہے سینہ سپر
آج آزادیِ وطن کے لئے

سب کے سینوں سے اُٹھ رہا ہے دھواں
سب کی آنکھوں میں جل رہے ہیں دیئے

اِک نئے انقلاب کی خواہش
ذرّے ذرّے کا دل اُبھارتی ہے
ہر گھڑی نغمۂ جرس کی طرح
اِک نئے دَور کو پکارتی ہے

وقت وہ اب زیادہ دُور نہیں
آئے گی جب رُخِ وطن پہ بہار
رُوس خوابِ گراں سے چونکے گا
منزلیں ہوں گی راستے کا غبار

ٹُوٹ جائیں گے سَطوتوں کے غُرور
تخت ٹوٹیں گے تاج ڈھلکیں گے
اور ان کے شکستہ ہیروں میں
سر فروشوں کے نام جھلکیں گے

(شادئیف کے نام)

پیام

اے دوست! یہ سکون سے ناآشنا حیات
ہے آرزوئے امن میں بے تاب و بے قرار
اُٹھیں گے کہ آج وقت ہے تحصیلِ امن کا
ہے تیز گام توسنِ ایامِ روزگار
اپنی اُمنگ اپنی اُمیدوں کی جان ہے
ارضِ وطن رہی ہے جو آلام کا شکار
آؤ حلف اُٹھائیں کہ زندہ رہیں گے ہم
اور ہوں گے لازوال مسرت سے ہم کنار

* * *

ہم بل کے جہل اور غلامی کا یہ نقاب
اس کے حسین رُخ سے اُٹھائیں جو ایک بار
لہرائے کائنات فضا جگمگا اُٹھے
ہو جائیں جلوہ ہائے مہ و مہر شرمسار

——(تلقینِ عمل)——

پشکن کی ادبی مقبولیت اور فنّی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ گزشتہ صدی کے تقریباً تمام رُوسی مشاہیر ادیبوں پر اس کا اثر نمایاں ہے اور روس کا موجودہ شعرو ادب بھی بہت حد تک پشکن ہی کے اثرات کا مرہونِ منّت ہے۔ تورگنیف نے اسے اپنی مشعلِ راہ اور ٹالسٹائی نے اپنا ذہنی رہنما قرار دیا ہے اور بلاشبہ ان دونوں تاریخ ساز ادیبوں کو پشکن کے طنز و لطافت میں ڈوبے ہوئے اسلوب کی جامعیت اور اختصار نے ناول نگاری میں بے حد امداد دی ہے اور نکولائی گوگول نے تو اس کی زندگی ہی میں اس کا اعتراف کر لیا تھا کہ میری تحریروں میں جو کوئی کام کی بات ملتی ہے وہ محض پشکن کا فیض ہے اور واقعی گوگول کا یہ اعتراف حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ گوگول کے نمایندہ شاہکار "انسپکٹر جنرل" اور "مُردہ رُوحیں" پشکن کے براہِ راست اثرات ہی کا نتیجہ ہیں۔ علاوہ ازیں پشکن کی تصانیف۔ بالخصوص "یوگونے رونیگن" "کاؤنٹ نیولین"۔ "کفن ساز" اور "اسٹیشن ماسٹر" بھی گوگول کے لئے رشد و ہدایت کا ذریعہ بنیں۔ پشکن کی موت پر اس نے بڑے قلق سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میری زندگی کی سب مسرتیں پشکن کے ساتھ نیست و نابود ہو گئیں۔ اس کے مشورے کے بغیر میں نے ایک قدم بڑھانے کی بھی جسارت نہیں کی تھی اور نہ اسے روبرو تصور کئے بغیر کبھی ایک سطر تک لکھی تھی۔"

میکسم گورکی نے تو پشکن کو رُوس ہی کا نہیں بلکہ دنیا بھر کا عظیم ترین

کا اعتراف کیا ہے۔ پشکن کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

"میرے خیال میں پشکن نہ صرف دنیا کی تمام ذی وقار
اور عظیم المرتبت ہستیوں کی صفِ اوّل میں کھڑا ہے
بلکہ ان سب میں ممتاز اور نمایاں دکھائی دیتا ہے"

گورکی نے اپنے بعض فن پاروں میں بھی پشکن کے ادبی تجربوں سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً اس کا قصہ "میکر چودرا" پشکن کے "جپسی" سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے اور گورکی کی "بڑھی خاتون ازرگل" کے بہت اہم کردار "ولیر دان کو" پشکن کی ایک نظم "پیغمبر" سے مستعار لیا گیا ہے۔

جدید روس کا نامور عوامی شاعر "مائیکا فسکی" بھی پشکن کا بے حد مداح تھا اور اس ضمن میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی میوزیم کے اسٹیج سے مائیکا فسکی کی نظم سنتے سنتے جب سامعین میں سے اچانک کسی نے سوال کر دیا کہ مائیکا فسکی تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ تو مائیکا فسکی نے اپنے مخصوص ظرافیہ انداز میں فی الفور جواب دیا "پشکن"۔

پشکن نے اپنے بارے میں خود ہی پیش گوئی کی تھی کہ ارضِ روس کا گوشہ گوشہ میری آواز سے گونج اٹھے گا اور ہر باشعور انسان کی زبان پر میرا ذکر بار بار آئے گا اور واقعی روس کے اس چہیتے شاعر کی دائمی مفارقت کے بعد اس کی یہ پیشن گوئی روس کی ادبی تاریخ کے سینے میں ایک جاوداں حقیقت بن کر جگمگا رہی ہے۔ ▲

سید امین الدین جلالی شاہجہانپوری

فنِ موسیقی کی تدوین قدامت اور ہندوستان

موسیقی کی بُنیاد ایک خود رو پودے کی طرح پڑی، جسطرح
ب خود رو پودا، مناسب آب و ہوا اور متوازن حرارت ونمی پاکر دنیا کے
دیندگی میں ایک شاداب مقام حاصل کرلیتا ہے، بعینہٖ رقص و موسیقی
ے تہذیب وتمدن کی پُر تکلف اور سدا بہار فضا میں پرورش پاکر منازل
رتقا طے کیں اور چونکہ تہذیب وتمدن کے آفتاب کی شعاعوں نے سب
سے پہلے مطلعِ ہند کو منور کیا اس لئے اُصول وضوابط کی ترتیب وتدوین
ے لحاظ سے ہندی موسیقی کو دنیا کے موسیقی میں ایک گونہ سابقت
حاصل ہے۔

ہندو میتھالوجی کے نقطۂ نظر سے موسیقی کے موجد اول مہادیوجی
ہیں۔ اس لئے یہ فن اہلِ مصر و بابل کی طرح جزوِ عبادت بھی بنا اور ہند
اس کی ترقی کا اصل راز اسی میں مضمر ہے، جس کی تصدیق رگ وید اور
زمانہ مابعد کے اُن بھجنوں اور گیتوں سے بھی ہوتی ہے جو پری جمال اور
نوروش دوشیزائیں مقدس دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے مندروں میں
گایا کرتی تھیں۔ اسی بنا پر اجودھیا، کاشی، متھرا اور جزیرہ کاٹھیاواڑ
کے ساحل پر واقع سومناتھ جیسے مقدس مقامات ہندی موسیقی کے اصل
مرکز رہے ہیں۔ سومناتھ کے بارے میں "تزدینی" کا بیان ہے کہ
اُس میں پانچ سو دوشیزائیں رقص و سُرود کے لئے مقرر تھیں جن کا گزارا
وقف کے اسّی ہزار دیہات کے مالیہ سے ہوتا تھا۔

یونانیوں نے بھی اس کی ساحرانہ اثر انگیزی سے دیوتاؤں کو
خوش کرنے کا کام لیا ہے۔ لیکن ہند میں رقص و موسیقی کو مکمل عبادت
کا درجہ حاصل رہا ہے۔ چنانچہ ہندو اوتاروں کے مجسموں کے بعض پوز
خود اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ان کی رُوحانی تعلیم کا خاص
ذریعہ رقصیہ صورت میں تھا۔ مدراس کے عجائب خانے میں شیوجی کا جو
مجسمہ رکھا ہوا ہے اُس میں وہ ٹانڈو رقص کی صورت میں نظر آتے ہیں
اسی بنا پر آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے رقص موسیقی کو ہندو طریقۂ عبادت
میں جزوِ اعظم کا درجہ دیا ہے۔ ہند کی قدیم مذہبی کتابوں پر نظر ڈالنے سے
بھی ہندی موسیقی کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ سام وید کا ایک
حصہ گیتوں پر مشتمل ہے جو سام گان کے نام سے مشہور ہے۔ ویدک زمانے
میں قربانی کے موقع پر سام گان کا عام رواج تھا۔

آزاد بلگرامی نے غزالانِ ہند میں ہندی رقص و موسیقی کی استنباطی
اولیت کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"جمہور اتفاق دارند کہ ہندیاں در فنِ رقص و موسیقی

پیش قدم اند، و ایں ہر دو فن را بجائے رسانیدہ فوق آں منصور نیست؛ و قواعدِ علم موسیقی و ضوابطِ رقص را، و انایان ولایت دیگر تا ایں زماں از نغمہ سرایانِ ہند اخذ کردہ اند کہ اختصاص ایں ہر دو فن تا حال بہ ہند مسلم است۔"

یعنی جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ اہلِ ہند رقص و موسیقی میں دوسرے ملکوں سے بہت آگے ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کو ترقی کی آخری حد تک پہونچا دیا اور اُن کے اصول و ضوابط دوسرے ملکوں کے فن کار، ہندی نغمہ سراؤں سے برابر حاصل کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ یہ دونوں فن ہندیوں کے ساتھ مخصوص سے ہو گئے۔ اسی کتاب میں دوسرے موقع پر آزاد موصوف نے لکھا ہے کہ:

"در آلام بریں کہ دانایانِ ہند در اختراعِ فنِ رقص و موسیقی
برخوردانند، ایشاں نہ از خرمنِ عرب خوشہ چیدہ، و نہ از
آبِ فرس قطرہ چشیدہ۔"

یعنی رقص و موسیقی ایک ایسا فن ہے کہ اہلِ ہند نے اس کے متعلقات و مبادیات کسی دوسری قوم سے حاصل نہیں کیے بلکہ وہ خود اس کے موجد و مخترع ہیں اور اس سلسلہ میں انہوں نے نغمہ سرایانِ عرب سے کچھ استفادہ کیا اور نہ رقاصانِ ایران سے کچھ حاصل کیا۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی "نہ سپہر" میں ایجادی مسابقت کے بیان میں رقص و موسیقی کی انبساطی اولیت کا سہرا اہلِ ہند کے سر باندھا ہے اور اکثر عرب و انگریز مورخین نے بھی ہندی موسیقی کے متعلق اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ مشہور عرب فلاسفر اور متکلم ابنِ جاحظ نے طبقات الامم کے صفحہ چودہ پر ہندی موسیقی کے ارکان ثلاثہ کی بحث کے ضمن میں لکھا ہے کہ

"اہلِ ہند کا فنِ رقص و نغمہ نہ صرف اثر میں ڈوبا ہوا ہے
بلکہ حقیقت میں وہ اس کے موجد و مخترع ہیں۔"

اسپین کے مشہور مورخ قاضی صاعد کا بیان بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ مسز ولسن کی رائے میں اگر اہلِ ہند اپنے رقص و نغمہ کی قدامت و جامعیت پر فخر کرتے ہیں تو یہ فخر ان کو زیب بھی دیتا ہے، کیونکہ ان کے

انداز رقص اور نشانات نغمہ سب سے قدیم ہیں (قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب۔ عرب و ہند کے تعلقات)

انگریز مورخین میں سر ولیم ہنٹر اور پروفیسر ویبر نے اس کی قدامت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ہندی رقص و نغمہ نے سب سے پہلے ایران میں قدم
جمائے اور بعد کو بالواسطہ سرزمینِ عرب میں قدم
رکھا اور عرب سے گیارہویں صدی عیسوی میں یورپ
تک رسائی حاصل کی۔"

ایران میں قدم جمانے کا زمانہ بہرام گور جیسے قدیم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے جس نے ہزاروں ہندی اساتذۂ فن کو ایران آنے کی دعوت دی تھی۔ (عہدِ قدیم مشرق و مغرب) اور ایران کے ذریعہ ہندی موسیقی کا عرب حلقوں میں پہونچنے کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی متعین کیا گیا ہے لیکن تلاش و تحقیق کے نتیجہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ہندی راگ راگنیاں انسانی نقل مکانی کے ذریعہ حضرت عیسیٰ سے صدہا سال قبل سرزمینِ عرب پہونچ چکی تھیں۔ ابنِ جاحظ نے کتاب الحیوان میں عرب کے قدیم شاعر کا ایک رجز نقل کیا ہے جس میں اُس نے مچھر کی آواز کو جاٹوں کے نغمہ سے تشبیہ دی ہے۔

اذا تغنین غناء الزط
یعنی مچھر جاٹوں کے نغمہ کی طرح گا رہے تھے۔

ہندیوں کے اسی قدیم ذوقِ نغمہ کے نتیجہ میں آج بھی جنوبی اور شمالی ہند کی فضا ساز و نغمہ کی گونج اور رقص کی جھنکار سے معمور نظر آتی ہے خصوصاً جاں فزا منظروں، لہلہاتے کھیتوں، اُبلتے چشموں اور مچلتے دریاؤں کی حسین سرزمین جسے عرفِ عام میں بنگالہ کہتے ہیں رقص و موسیقی کی تخلیقی سرگرمیوں کا خاص مرکز بنی ہوئی ہے اور موسیقی کی عظمی بھی اسی ذوقِ عام کی بنا پر ہمیشہ لائق صد احترام رہی ہے، و راجوں مہاراجوں کے علاوہ دیگر متعدد مشہور ہستیوں نے اس خدمت کو بڑی مسرت سے قبول کیا ہے۔ چنانچہ پانڈو خاندان کا مشہور موسیقی نواز راجہ اُدین، جب راجہ اُجین چند مہاسین کے ہاتھوں گرفتار ہوا تو اُس نے اپنی جان بچانے کے لئے اس کی جیتی

بیٹی "باسورتا" کو رقص و موسیقی سکھانے کی معزز خدمت قبول کرنے سے گریز نہیں کیا۔ درباروں میں بھی وہی شاعر رسوخ حاصل کر پاتا تھا جو رقص و موسیقی کا بھی مسلمہ استاد ہوتا تھا۔ چنانچہ راجہ کنشک کے دربار کا مشہور راج کوی — (ملک الشعرا) اشوگھوش رقص و نغمہ کا بھی یکتائے روزگار استاد تھا۔

ہند کی قدیم مجلسی زندگی میں رقص و موسیقی کو بڑا دخل رہا ہے، یہاں تک کہ صنفِ نازک کے لئے بھی اس کی تعلیم بسا ضروری خیال کی جاتی تھی۔ راجگان کے درباروں میں اس کا بڑا اہتمام رہا کرتا تھا۔ مہاراج کماروں کو بھی اس فن سے بیگانہ نہیں رکھا جاتا تھا، چنانچہ ہرش چرت کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ راج شری کے لئے رقص و موسیقی کی تعلیم کا بطور خاص اہتمام تھا۔

تاریخی اوراق کے مطالعہ سے موجودہ دَور کے رقصیہ اداروں کی طرح اُس دَور میں بھی رقص گاہوں اور سُرود خانوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ہرش کے دورِ جہاں بانی میں اس قسم کے اداروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ ہند کے موسیقی نواز راجوں مہاراجوں کے ذوقِ نغمہ کا ثبوت دیہات کے اُن ناموں سے ملتا ہے جو بعض حکمرانوں نے ہندی راگ، راگنیوں کے نام پر رکھے تھے چنانچہ پنجاب کی ایک سابق ریاست جنید میں اس قسم کے اٹھارہ گاؤں ملتے ہیں جن کے نام ہندی شاستریہ سنگیت کے راگوں پر رکھے گئے ہیں، جیسے مال کونس، کلیان، شام کلیان، بھاگیشوری اور بھیرویں وغیرہ۔

موسیقی تنہا گانے کا نام نہیں، اس میں رقص کے علاوہ مزامیر کی مشق مزاولت بھی شامل ہے، چنانچہ ہند قدیم میں کئی قسم کی بنیا، جھانجھ، بنسی اور مرونگ وغیرہ باجوں کے نام ملتے ہیں۔ کنھیا جی کی بنسی کے دل گداز نغمے آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں، مغربی محققین کے نزدیک تار کے سازوں کا استعمال عموماً موسیقی نواز اور نغمہ پرور قوموں میں ہوا کرتا ہے اُس عہد میں اس قسم کے سازوں کی عام مقبولیت ہند میں ساز نوازی کی ترقی کی مکمل نشاندہی کرتی ہے۔

ہندی موسیقی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اصول و ضوابط آج سے ہزاروں سال پہلے مرتب ہو چکے تھے اور موجودہ دَور کے واضعینِ فن نے رقص و موسیقی کے جو جدید اصول و ضوابط وضع کئے ہیں ان کے بنیادی ماخذ ویدک عہد کے اصول و ارکان ہیں۔ چنانچہ رگ وید، اتھر وید، کاتھک سنگھٹا اور تیتریہ سنگھتا کے اوراق سے بھی اس کی تصدیق و تائید ہوتی ہے:

ہند قدیم میں رقص و موسیقی کی ترقی کا پہلا راز اسے جزوِ عبادت سمجھنے میں مضمر ہے جس کی تفصیل سطور ما قبل میں کی جا چکی ہے، دوسرا سبب ہند کے ہنر پرور اور فن دوست حکمرانوں کا ذوقِ نغمہ ہے جس کی مثال میں بیجانگر کے حکمرانوں کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ ان کی قدردانیوں میں شہر بیجانگر کے موسیقاروں اور رقاصوں کی آمدنی اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اُن کی آمدنی کے ٹیکس سے محکمۂ پولیس کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔ (البرامکہ جلد اول۔ از، مولانا عبدالرزاق کانپوری)

ترقی کا تیسرا سبب ہند کی نزہت آگیں اور حیات بخش آب و ہوا اور یہاں کے سرسبز و شاداب ارضی خطوں کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن کی طرب انگیزی نے ہند کے ہر باسی کے دل میں موسیقی کی ایک لگن پیدا کر دی تھی ——— ▲

مسائل ہمارے

شاذ تمکنت

اُردو شاعری میں نئے تجربے

● ان دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظم آزاد اور نظم معریٰ کے ساتھ ساتھ ادھر کچھ شاعروں نے منثور نظم کے بھی تجربے کئے ہیں۔ ہئیت سے ہٹ کر مواد و موضوع میں بھی تنوع اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور نئی نئی علامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری خاص طور سے اُردو نظم آگے بڑھنے کے بجائے رُو بہ زوال ہوتی جارہی ہے۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے، جو پڑھنے والوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ کسی کا اندازِ بیان اتنا کاواک ہے کہ کسی عنوان بات پلّے نہیں پڑتی اور کوئی، ایسے دُور از کار خیالات کو 'بے سرو پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نظم چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اِس رُجحان کے اسباب اور اس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ — اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

☆ آپ کا سوال نامہ پڑھا، کئی باتیں ذہن میں اُبھر آئیں' — اِن گفتنی ناگفتنی، خوشگوار اور ناخوشگوار باتوں کو مختصراً بیان کرتا ہوں — آپ نے لکھا ہے کہ اُردو نظم آگے بڑھنے کے بجائے رُو بہ زوال ہوتی جارہی ہے — جیسا کہ میرے پیش رَو صاحبانِ علم نے اِس دَور کے متعلق لکھا ہے کہ' یہ دَور ہی ایسا ہے کہ ہر شئے گُریز پا اور ہر فن اُڑتے ہوئے بادل کی طرح لگتا ہے۔ یقیناً آج ہم جس دَور میں سانس لے رہے ہیں وہ اثبات و نفی کا دَور ہے' یہاں سخنِ مختصر کی قیمت لگانی مُشکل ضرور ہے، لیکن یہ سب کچھ بجا' — میں اس تشکیک و ابتلا کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ یہ سب کچھ دَور کا قصور نہیں ہے بلکہ کچھ آپ کا ہمارا مشترکہ قصور ہے' وہ یہ کہ آج پڑھنے والوں کو دلچسپی ہے نہ نقادانِ محترم کروٹ لینا چاہتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ نئے لکھنے والوں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے' جو پڑھنے والوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر سکے ایسا نہیں ہے میرے بھائی — بات دراصل یہ ہے کہ اب ڈھول پیٹنے والا کوئی نہیں ہے۔ ۱۹۳۶ء کے چند شعراء کے چند مقبول مجموعوں کو لیجئے — فیضؔ کا "نقشِ فریادی"۔ مخدومؔ کا "سرخ سویرا" راشدؔ کا "ماورا"۔ جعفریؔ کی "پرواز"۔ جاں نثار اخترؔ کی "سلاسل" کیفیؔ اعظمی کی "جھنکار"۔ علی جواد زیدیؔ کی "رگِ سنگ"۔ قیوم نظرؔ کی "قندیل"۔ ساحرؔ کی "تلخیاں"۔ مجازؔ کی "شب تاب"۔ جذبیؔ کا "فروزاں" اختر الایمان کا "گرداب" — اور دوسرے بہت سے مجموعوں کو اُٹھا لیجئے — ان میں دو چار شاعر تو واقعی کام کے مل جائیں گے، لیکن میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ آج کوئی نیا ذہین شاعر ایسا ایک بھی مجموعہ اپنے نام سے منسوب نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اول تو آج ان میں سے اکثر نظموں کی کسی ادبی رسالے میں اشاعت ہی ممکن نہیں ہے۔ جب نظمیں ہی نہ چھپیں گی تو مجموعہ کی ترتیب کا کیا سوال پیدا ہوگا؟ —

ان میں سے بیشتر مجموعے جب منظرِ عام پر آئے تو ادب پڑھنے والوں نے اور نقادوں نے آسمانی صحیفوں کی طرح خیر مقدم کیا اور آج بھی ان میں سے بعض شاعر انہیں پُرانے مجموعوں پر گزر اوقات کر رہے ہیں ۔ میں یہ بات کسی تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ پُورے وثوق کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ فیض، مخدوم، راشد، مجاز، جذبی وغیرہ کی ابتدائی نظمیں آج کے کسی بھی اچھے نئے شاعر کی نظموں سے کم تر درجہ کی ہیں ۔ مشکل تو یہ ہے اب کوئی سجاد ظہیر صاحب ہمارے سر پر نہیں جو کسی کیفی اعظمی صاحب کو سُرخ پھول، کا لقب دیکر ان کے سر پر عظمت کا تاج پہنا دیں ۔ پُرانے نقادوں کا تو ذکر ہی فضول ہے جو میر، مومن، اور غالب سے اُتریں گے تو جوش اور فراق تک آکر دم لیں گے اور ذرا دم سانس نے ساتھ دیا تو فیض، راشد اور مخدوم تک چلے آئے، اس کے بعد اللہ بس باقی ہوس ہے ۔ وہ احتشام حسین ہوں یا ڈاکٹر علیم، آلِ احمد سرور ہوں یا عبادت بریلوی، ان میں احتشام صاحب اور سرور صاحب نے کہیں کہیں نئے شاعروں کے وجود کو تسلیم کیا ہے ۔ دوسروں کو تو پتہ بھی نہیں ہے کہ کون آیا اور کون گیا۔ یہ حال تو ہمارے پُرانے نقادوں کا ہے جن کے اشارے پر قارئین کی بڑی تعداد چل رہی ہے ــــ خیر پُرانے نقادوں پر تبرہ بھیجئے، نئے نقادوں کا یہ حال ہے، خصوصاً پڑوسی ملک پاکستان میں آجکل نثر نگاری کی ہوا بھی وبا کی طرح ہے ۔ اِن ناتراشیدہ نقادوں کو اپنے دو چار دوست احباب کے ذکرِ خیر سے فرصت نہیں ہے ۔ ان کے نزدیک ماضی کا ورثہ بکواس اور حال کے دو تین شاعر اور ادیب جن میں ان کے حواری شامل ہیں، ادب و شعر کا باوا آدم ہیں ۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی سالمیت پر جو ضرب پڑی، اُس نے ادب کا شیرازہ بکھرا دیا اور قارئین بٹ گئے ۔ ان میں لگن باقی بھی ہے تو جدید ادب و شعر کے دھاروں سے بے بہرہ ہو کر رہ گئے ۔ اس طرح اگلا سا Response بھی نہ رہا ۔

آپ نے نئے تجربات کا ذکر کیا ہے ۔ تجربے ہمیشہ نیک فال ہوتے ہیں ۔ تجربوں کے عروج کے زمانے میں اگر شاعری کم کم نظر آئے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہوتی ۔ تجربے ہمارے ہاں تو بہت ہی کم نظر آتے ہیں اور یہ سارے تجربے پاکستان میں ہو رہے ہیں، ان تجربوں کے بطن میں عظیم شاعری کی ولادت ہو گی کہ نہیں، ــــ یہ پیش قیاسی ممکن نہیں ہے عظیم شاعری، فارم کی محتاج نہیں ہوتی ، شاعر اپنا مافی الضمیر بہرحال ادا کر لیتا ہے ۔ میر حسن ، میر انیس ، غالب یا اقبال بحور و قوافی کی میزان ٹھیک نہیں کرتے تھے، ان شاعروں نے مثنوی، مرثیہ، غزل اور نظم کے فارم کو لیا اور کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

آجکل ہمارے ہاں تجربہ ظاہری قطع و بُرید کا نام ہے کہ مصرعے کتنے لمبے کیئے جائیں اور کس قدر گھٹائے جائیں، انوکھی اور بے سرو پا باتیں اور زیادہ انوکھے اور بے سرو پا انداز میں کسطرح کہی جائیں، یہ سب کچھ تجربے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ میں کہوں گا، اِس دَور میں اِدھر چند برسوں میں ہمارے پیش رو شعرا میں فیض اور اختر الایمان نے واقعی تجربے کیئے ہیں اور کامیاب تجربے کیئے ہیں ۔ یہ تجربے خیال کے تجربے ہیں، ترسیلِ جذبات کے تجربے ہیں ۔ ان شاعروں نے پٹری سے ناپ کر نظم کو خطوطِ منحنی کی شکل نہیں دی ہے ۔

جدید شاعروں کی ایک اور دین کا ذکر کروں، ــ وہ ہے نظم طویل ــ مجھے اعتراف ہے کہ ابھی تک کوئی غیر معمولی طویل نظم نہیں آئی ہے ۔ پھر بھی آپ نے جعفر طاہر کو ضرور پڑھا ہو گا ۔ ان کے تجربے کو شاعری کہہ سکتے ہیں مگر ان کی شاعری کو تجربہ کہکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آپنے علامتی اور اشاراتی شاعری کا ذکر کیا ہے کہ نئے شاعر ایسی شاعری میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہیں ۔ اگر میں تھوڑی دیر کے لئے آپکے محاکمہ کو تسلیم بھی کر لوں تو یہ بھی سوچیئے کہ اس تجربے کی عمر ہی کیا ہے اور ابھی یہ لکھنے والے مسلسل لکھ رہے ہیں ، کل ان کے قلم سے کوئی شاہکار نکل جائے تو تعجب کی بات نہیں ہو گی ۔ جوش کا پہلا مجموعہ کلام "رُوحِ ادب" دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا خالق ایک بڑا شاعر سمجھا جائے گا ۔ اس مجموعہ میں کچھ ایسا کھلنڈرا پن، بلکہ بچکانہ پن ہے کہ مجھے آج بھی تعجب ہوتا ہے ۔

یہ ضروری نہیں کہ بڑی شاعری بڑے موضوعات سے جنم لے ۔ بڑی شاعری چھوٹے موضوع سے بھی پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ فنکار واقعی دیدہ ور ہو ۔ آپ ان نئے فنکاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیتے رہیئے اور پُرانے نقادوں کی طرح پاسنگ شعر نہ لگائیں تو یقیناً آپ کو مایوسی نہیں ہو گی ۔ ▲

فنا نظامی

★

○

جب میرے راستے میں کوئی میکدا پڑا
اِک بار اپنے غم کی طرف دیکھنا پڑا

ترکِ تعلقات کو اِک لمحہ چاہیئے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

اِک تیرے دیکھنے کیلئے بزم میں مجھے
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

کیا کیا ملی مجھے مری دیوانگی کی داد
جب اہلِ گلستاں پہ کوئی وقت آپڑا

یہ آسماں اتنا ستم گر کبھی نہ تھا
اِس پر بھی تیرا پرتوِ حسنِ ادا پڑا

رودادِ فصلِ گل نہ سُنا تو حساب دے
اے باغباں بتا مرے حصّہ میں کیا پڑا

آئے تھے پوچھتے ہوئے میخانہ کا پتہ
ساقی سے لیکن اپنا پتہ پوچھنا پڑا

دل کو ہوئی ہے اب تری بیگانگی کی قدر
دُنیا کے التفات سے جب واسطا پڑا

اِک تشنہ لب نے چھین لیا بڑھ کے جام سے
ساقی سمجھ رہا تھا سبھی کو گرا پڑا

یوں جگمگا رہا ہے ہر نقشِ پا فناؔ
جیسے ہر راستے میں کوئی آئینا پڑا

٭

خمار بارہ بنکوی

★

○

دل و نگاہ پہ روشن لبِ دہن سے دور
رموزِ حسن و محبت ہیں علم و فن سے دور

غلط کہ رنگ نہ لایا لہو شہیدوں کا
بہار آئی تو لیکن مرے چمن سے دور

خوشی سے جشنِ چراغاں منائیے لیکن
اندھیرا کیجئے پہلے تو اپنے من سے دور

فغاں کہ لوٹ لیا مل کے راہبر نے انہیں
وہ راہرو جو رہے دستِ راہزن سے دور

مجھے قبول دو عالم کی ظلمتیں یارب
اُجالا ہو نہ کبھی اُن کی انجمن سے دور

سلوکِ اہلِ وطن کا نہ پوچھ حال خمارؔ
وطن میں رہ کے بھی رہنا پڑا وطن سے دور

٭

اختر حسن

چند اشعار

دَر بہ دَر دیدہ و دل بچھاتے رہے، کُو بہ کُو دولتِ غم لٹاتے رہے!
آستاں آستاں سَر جھکاتے رہے، عاشقی جان و تن کا زیاں دوستو!

آگہی خاک بر سر خِرد رُو سیاہ، کم نگاہی کے ماتھے پہ تاجِ کُلاہ
ہوش اُڑتے جا رہے ہیں خدا کی پناہ! ابنِ آدم کی رُسوائیاں دوستو!

آرزو پا بگِل جستجو مُضمحل، وابستے منفعل، شوق منزل خجل!
جاں بہ جاں تن بہ تن لب بہ لب دِل بہ دِل، زندگی خستہ و سرگراں دوستو!

عافیت سَر برہنہ سکوں پرفشاں، دامنِ آشتی دھجّیاں دھجّیاں
بُجھ رہی ہیں نگاہوں کی مہتابیاں، اُٹھ رہا ہے دِلوں سے دھواں دوستو!

اُکھڑے اُکھڑے سے انفاسِ شام و سحر، دُھندلی دُھندلی سی ہر جلوہ گاہِ نظر!
غم کے کہرے میں ڈوبے ہوئے رہ گزر، لُٹ نہ جائے کہیں کارواں دوستو!

زُلف و رخسار کی بات اتنی بڑھی، چشمِ سرشار کی بات اتنی بڑھی
قامتِ یار کی بات اتنی بڑھی، زندگی بن گئی بیکراں دوستو!

نازپروردہ سایۂ برگِ گُل، بوئے گُل لے کے بازار تک آ گئے
کوئے دِلدار سے دار تک آ گئے، بات پہنچی کہاں سے کہاں دوستو!

کب سے بیٹھے ہوئے ہیں سرِ میکدہ، تیرے دیوانے اے دلبرِ میکدہ
کب کھلے گا الٰہی درِ میکدہ، کب ملے گی مئے ارغواں دوستو!

سمت پرکاش شوق

○

اتنے قریں ہو
کیسے یقیں ہو

نامِ خدا تم
دشمنِ دیں ہو

اُف رے تصوّر
جیسے یہیں ہو

ہم سے یہ پوچھو
کتنے حسیں ہو

ایسی بھی چُپ کیا
جیسے نہیں ہو

باہر چرچے
دِل میں مکیں ہو

شوق ہماری
رُوح تمہیں ہو

ہما شرر نانپاروی

مستحق وہ نہیں ہے خوشی کا
جس کو غم ہو غمِ زندگی کا

ڈالتا ہے فلک پر کمندیں
حوصلہ دیکھئے آدمی کا

آج کچھ لوگ تاریکیوں کو
نام دینے لگے روشنی کا

موت کے نام سے ہے یہ لرزاں
تجربہ خام ہے زندگی کا

اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہوں
کوئی دیکھے عروج آگہی کا

وقت آئے تو دامن بچا لو
اب یہ مفہوم ہے دوستی کا

دردِ ہستی کے لے کر سہارے
کٹ رہا ہے سفر زندگی کا

آرزو کا لہو پی رہا ہوں!
مل گیا ہے بدل تشنگی کا

ہوشیار آئی ہے موت پرویز
بھیس بدلے ہوئے زندگی کا

ڈاکٹر سلام سندیلوی

یارب! رہے سلامت، یہ برق کی ہنسی بھی
دل بھی بہل رہا ہے، ہوتی ہے روشنی بھی

یہ اس کی زلف و رخ کا، ادنیٰ سا ہے کرشمہ
بکھری ہوئی ہے ظلمت، پھیلی ہے چاندنی بھی

ناآشنا تھیں پہلے، انداز دلبری سے
کلیوں کو رفتہ رفتہ، آنے لگی ہنسی بھی

حق صرف چاندنی کا، گلزار پر نہیں ہے
سیرِ چمن کی خاطر، آئی ہے تیرگی بھی

کس کی طرف میں دیکھوں، کس کی طرف نہ دیکھوں
ہے سامنے گھٹا بھی، زلفوں کی برہمی بھی

بلبل کو دیکھنے کا، ہے اک حسیں بہانہ
کتنی فریب کن ہے، گل کی غنودگی بھی

اس مہر سے ہے الفت، جو ہے پیامِ رحلت
ہے کتنی کشمکش میں، شبنم کی زندگی بھی

ظلمت میں ڈھونڈتا ہے، ہر سمت چاندنی کو
بیگانۂ خرد ہے، نادان آدمی بھی

پھولوں کا تذکرہ ہے، کلیوں کی گفتگو ہے
کتنی سلام نازک، ہے میری شاعری بھی

پروفیسر تارا چرن رستوگی طاہرؔ

○

مکدّر اور غضب کو نہ کر ہوا سو ہوا
گزشتہ دور میں جو شور و شر ہوا سو ہوا
بھرم تو کھل ہی گیا آپ کی قیادت کا
ملی ملی نہ ملی رہ گزر ہوا سو ہوا
ہزار کوہِ الم بھی تو اس پہ ٹوٹ پڑے
کفیلِ بارِ امانت بشر ہوا سو ہوا
اندھیرے گھیر نہ لیں پھر کہیں اُجالوں کو
تعصّبات سے کر درگزر ہوا سو ہوا
وہ رہبری ہے کہاں جس پہ آپ نازاں تھے
جو اپنا حال ہوا سر بسر ہوا سو ہوا
یہ بات اور ہے ہم کچھ گلہ نہیں کرتے
ہٹاؤ ذکرِ شبِ منتظر ہوا سو ہوا
تصوّرات کی دُنیا میں بھی اندھیرا ہے
شبِ فراق کا دل پر اثر ہوا سو ہوا
ہمیں تو آپ پہ حیرت ہے حضرتِ طاہرؔ
زمانہ محوِ بُتِ سیم و زر ہوا سو ہوا

٭

واحد پریمی

○

ٹھنڈی چاندنی سے بھی میرا قلب جلتا ہے
کوئی یاد آتا ہے چاند جب نکلتا ہے
شامِ غم، مہ و انجم ہوں کہ بادہ و محفل ہوں
ان حسیں نظاروں سے دل کہیں بہلتا ہے
گردشِ جہاں کی بھی سانس رک [illegible]
اُن کا درد جب دل میں کروٹیں بدلتا ہے
قلبِ مُضطرب کا تم حال پوچھتے کیا ہو
آندھیوں کے دامن میں یہ چراغ جلتا ہے
جب سفینہ ہچکولے لیتا ہے تلاطم میں
جانے کیوں کنارے کا تب بھی دل دہلتا ہے
گلستاں میں آتا ہے انقلاب ایسا بھی
پھول پھول جب اپنے مُنہ سے خوں اگلتا ہے
قطرہ ہائے خوں واحدؔ کتنے خشک ہوتے ہیں
جب دماغِ شاعر سے شعر کوئی ڈھلتا ہے

٭

خرد غوث پوری

○

کب زمانے کو پتا ہے یارو
درد جو دل میں چھپا ہے یارو

بس یہی اپنی خطا ہے یارو
ظلم کو ظلم کہا ہے یارو

اپنے سائے سے بھی ڈرجاتا ہوں
کتنی غمناک فضا ہے یارو

میں نے سلجھائی تھی زلفِ دوراں
کتنا طوفان اٹھا ہے یارو

تم بھی چاک اپنا گریباں کرلو
چاک پھولوں کی قبا ہے یارو

زلزلہ آ گیا ایوانوں میں
ظلم ڈھانے کی سزا ہے یارو

جبر ہنس کر اسے سہنا ہوگا
جس کو بھی پاسِ وفا ہے یارو

☆

کیوں خرد کو ہو شکایت ان سے
پیکرِ صبر و رضا ہے یارو

☆

ضیائے شہا

○

کہنے کو اک چراغ تو ہوں، روشنی نہیں
جینے کو جی رہا ہوں مگر زندگی نہیں

ہاتھ آگیا ہے جب سے غمِ آرزوئے عشق
اب اس جہاں میں میرے لئے کچھ کمی نہیں

وہ بات ہی تو حاصلِ مرگ وحیات ہے
وہ بات جو جنوں نے خرد سے کہی نہیں

آنکھوں میں حرصِ زر تو لبوں پر حدیثِ شوق
اے نازنیں! فریب ہے یہ دل بری نہیں

اہلِ جہاں کو دیکھ کے ہوتا ہے یہ گماں
دنیا میں ہیں خدا تو بہت آدمی نہیں

اے دوست اب تو عشق سے بھی بے نیاز ہوں
اب تو تری بھی دل میں تمنا رہی نہیں

حزیں لدھیانوی

گھٹا چھائی ہوئی ہے، مے برستی ہے غزل چھیڑو
غزل ہی تو علاجِ فاقہ مستی ہے غزل چھیڑو
کچھ ایسی دھن میں گاؤ عام ہو جائے کرم اُس کا
کہیں آتش، کہیں رحمت برستی ہے غزل چھیڑو
بہا دو پھر غمِ ایام کو نغمات کی رَو میں
دلوں میں پھر ہجومِ شوق دستی ہے غزل چھیڑو
بھٹکتے پھر رہے ہیں راہرو رستہ نہیں ملتا
کٹھن منزل، سَروں پر بارِ ہستی ہے غزل چھیڑو
کرو آہ و فغاں کے شور پر نغمات کی بارش
پریشاں حال پھر بستی کی بستی ہے غزل چھیڑو
سخن ہی سے تو شب کی ظلمتیں کافور ہوتی ہیں
سخن ہی تو چراغِ بزمِ ہستی ہے غزل چھیڑو
وہ نغمے گاؤ، دلِ احساس سے معمور ہو جائیں
بشر ہے اور پھر پستی ہی پستی ہے غزل چھیڑو
سخن کے پھول بکھرا کر اسے رشکِ ارم کر دو
اُٹھو، اُجڑا ہوا گلزارِ ہستی ہے غزل چھیڑو
دلِ بیمارِ غم کو آج بہلاؤ کسی ڈھب سے
حزیں پھر تنگ دستی، فاقہ مستی ہے غزل چھیڑو

شکیل مظہری

تو ہی کچھ سہارا دے آج شامِ تنہائی
چھوٹ گیا ہے ہاتھوں سے دامنِ شکیبائی
کر رہے ہیں قاتل اب دعوائے مسیحائی
زندگی خدا جانے کیسے موڑ میں آئی
ان دنوں طبیعت کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں
انجمن سے متنفر، خلوتوں سے اکتائی
بولنے لگا ہے اب شامِ غم کا سناٹا
جانے چاہتی ہے کیا اور بھی یہ تنہائی
اتنی بات تھی جس سے لوگ ہو گئے بدظن
میرے غم کے قصے پر ان کی آنکھ بھر آئی
اُن کے دم سے لے کر تازگی بہاروں کی
اہلِ فن نکھارتے ہیں فکر و فن کی رعنائی
اک عجیب بے ربطی دھڑکنوں میں پاتا ہوں
جانے کیا ہوا دل کو جانے کس کی یاد آئی
خون بن کے ٹپکے ہیں ہم رگِ زمانہ میں
زندگی کے رخ پر ہے ہم سے ہی توانائی

کل شکیل خود تھے جو رازدارِ درد و غم
آج ان کی یادیں بھی بن گئی ہیں ہرجائی

زینت ساجدہ

★

نئی کہانی

آم ابھی بازار میں نہیں آئے ہیں ــــ چھوٹی چھوٹی کیریاں گرنے لگی ہیں، جنہیں بچے شوق سے کھاتے ہیں۔ موسم خاصا گرم ہوگیا ہے۔ فضا میں آم کی بُو مہک رہی ہے۔ اس سال میرے آنگن کے پیڑ میں بھی پھل لگے ہیں۔ پیڑ کی ڈالیاں میری کھڑکی تک آگئی ہیں اس کا بور تو تم دیکھ گئے تھے۔

شادی کی پہلی سالگرہ پر تم نے یہ پیڑ لگایا تھا۔ ہم دونوں اس دن اسی کام میں مگن رہے تھے۔ مجھے تو ہنسی آئی تھی، شادی کی سالگرہ بھلا یوں کوئی مناتا ہے۔ تم دیکھ بھال کر کسی پرانے شاہی باغ سے تخمی آم کا یہ پودا لائے تھے۔ کتنی تفصیلات سمجھائی تھیں، ایسا پھل ہوگا ایسی خوشبو ہوگی، یہ رنگ ہوگا۔ پھر خوش ہو کر کہا تھا، میرا بیٹا ان پھلوں کو کھا کر کتنا خوش ہوگا آنگن میں آم کا پیڑ لگا ہو تو گرمی کی دوپہر میں بچے اِدھر اُدھر مارے مارے نہیں پھرتے۔

"مگر بیٹا ابھی ہے کہاں"ــــ؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

بیٹا ــــ وہ تو ہوگا ــــ ضرور ہوگا۔ میں نے ایک سے ایک اچھی چرخ اُٹھا رکھی ہے اس کے لئے۔ پتنگیں اُڑانے اور لڑانے والا بیٹا ہوگا اپنا ــــ تم منع مت کرنا جیسے سبھی ماؤں کی عادت ہے۔ بڑا ہی شریر ہوگا میرا بیٹا ــــ میں کہے دیتا ہوں۔ بچپن میں، میں بھی بہت شریر تھا۔ اماں چلاتی تھیں تو ان کو ستانے کے لئے چھت پر چڑھ جاتا۔ میں ذہین بہت تھا۔ میرا بیٹا بھی ذہین ہوگا۔ تمہاری طرح بے وقوف قطعی نہیں ہوگا۔ سمجھیں نا"

"بالکل سمجھ گئی، پر تخمی آم تو بڑی دیر میں پھل دیتا ہے ــــ بارہ سال تو انتظار ہی میں گزر جائیں گے۔ گُڈے نے پھاندنے کی عمر سے بیٹا گزر جائے تب آم لگیں تو فائدہ کیا ہے؟" ــــ

"ارے ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے ــــ پھر کیا کریں ــــ؟

میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شادی ہوئے ایک سال نہیں گزرا کہ لوگ میری خیریت پوچھنے لگے۔ پہلے حیرانی پھر کچھ افسوس کے لہجے میں۔ مجھے پہلے پہلے ہنسی آئی، پھر چڑ ہونے لگی۔ جہاں جاؤ یہی سُن لو۔ پرانی قسم کی عورتیں ہوں کہ نئی۔ اس معاملہ میں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ پہلے شادی کو پوچھیں گی ــــ ہوئی تو کتنے بچے ہیں ــــ باپ رے باپ، اس رفتار سے پوچھنے پر اُتر آئیں ــــ اچھا ایک ہی سال ہوا ہے ــــ پر منو کی دولہن کو بھی سال بھر ہی تو ہوا ہے۔ خیریت سے مہینے بھر کی لڑکی گود

ہے ـــــ اور یہاں تو گویا آثار ہی نہیں ہیں ـــــ

سال دو سال تک تو مجھے قطعی فکر نہ رہی بلکہ خیال آتا تو وحشت ہونے لگتی ۔ سب کام جیسے وقت پر ہوجایا کرتے ہیں ۔ ایسے بچے ہوجائیں گے، ابھی کیا جلدی ہے ـــــ پھر کتنوں کا حشر میں دیکھ چکی تھی ۔ خاصی بھلی تھیں کہ شادی ہوئی ۔ پانچ سال میں چار کے حساب آبادی بڑھنے لگی ۔ گھر میں سدا چیخ پکار ـــــ اور تنگی ، اور پریشانی ـــــ ماں کا حلیہ اور باپ کا موڈ دونوں بگڑے ہوئے ـــــ گھر کی تباہی بڑھتی جاتی ـــــ عقل و ہمت کا دیوالہ نکل جاتا ـــــ کچھ دن تو آرام سے کٹیں، کچھ گھومیں پھریں ـــــ پھر تو سر کھجانے کی فرصت نہ ملے سال ـــــ !

سال کے بعد سال چپ گزرنے لگے ـــــ اب تو واقعی مجھے پریشانی ہونے لگی ۔ دل اس نکمی زندگی سے تھک گیا ۔ کہیں آنا جانا بھی میرے لئے دوبھر ہو گیا ۔ ہر ایک کی نظروں میں مجھے رحم جھلکتا نظر آتا ۔ میں اتنی بے بسی برداشت نہ کر سکتی ۔

آم کا پودا بڑا ہونے لگا ـــــ اسے دیکھ دیکھ کر الٹی جی کڑھتا ـــــ میں نے تو مارے جلن کے کتنے دنوں سے اُسے پانی دینا ہی چھوڑ دیا تھا کہ سوکھ جائے ـــــ جل جائے تو پاپ کٹے، مجھے کوفت تو نہ ہو گی ـــــ وہ تو میرا جی جلانے کو اور زیادہ اپنی چھتر پھیلا رہا تھا ـــــ کیوں نہ پھیلاتا ـــــ تم جو برابر آتے جاتے اُسے دیکھنے کو ٹھیر جاتے ـــــ چہرہ پہ کچھ کہنا تو نہ ہوتا، پر مجھے معلوم ہو جاتا، تم کیا سوچ رہے ہو ـــــ بھولنا چاہو بھی تو یہ کم بخت یاد دلانے کو موجود تھا ۔

پہلے پہل تو محسوس ہوتا تھا کہ وقت کم ہے، بھاگا بھاگا جا رہا ہے ـــــ تمہاری باتیں زیادہ ہیں ۔ ایک دوسرے سے جی ہی نہ بھرتا تھا ۔ پھر پھر یوں لگنے لگا کہ وقت بیکار پڑا ہے، کاٹے نہیں کٹتا ۔ ہم دونوں کتنی کتنی دیر چپ چاپ بیٹھے ہوتے، پر کوئی بات نہ سوجھتی ۔ کس کی شکایت کرتی ۔ کون مجھے ستا رہا تھا ۔ کس کی شرارت سے ناک میں دم تھا ۔ بس اپنی نیند سوؤ اور اپنی نیند جاگو ۔ جو چیز جہاں رکھی ہے بس وہیں پڑی ہے ۔ خاموشی سے اوب کر میں پاندان کھولتی اور چھالیہ کاٹنے لگتی ـــــ تو تم شیروانی پہن کر باہر جانے کو تیار ہو جاتے ۔ پوچھتے ہوئے ڈرتی تھی ۔ پوچھ لیتی تو کبھی تم چپ ہو جاتے ۔ کبھی کہتے کیا کروں، ذرا گھوم آؤں ہم دونوں شاید ایک ہی بات سوچنے لگے تھے، پر ایک دوسرے سے کہتے ڈرتے تھے ۔

میں چوری چھپے اپنے بس میں جو کچھ تھا کرنے لگی ۔ جس نے جو مشورہ دیا سن لیا ۔ ایک دو بار تمہیں بھی کہا ۔ تم ٹال گئے ـــــ کہہ سن کر کوئی تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو بڑی بے دلی سے گئے ۔ میں اپنی قسمت کو کوستی ۔ میری حیثیت تمہارے لئے بس اتنی رہ گئی تھی کہ گھر کی دیکھ بھال کر لیا کروں ـــــ نہ اپنی کہنا نہ میری سننا ـــــ

پھر تم نے کمائی لٹانی شروع کر دی ۔ روپے پیسے پر تکرار ہوتی تو تم بپھر جاتے ۔ کماتا اسی لئے ہوں کہ خرچ بھی کروں ۔ جوڑ جوڑ کر کس کے لئے چھوڑ جاؤں ـــــ ؟ گھر کی ہر چیز تمہیں کاٹنے لگی تھی دیر دیر سے گھر آتے ۔ ایک دو بار میں نے میکے جانے کی دھمکی دی ۔ ایک بار چلی بھی گئی ـــــ تم منانے نہ آئے ۔ گھر کی بربادی کا خیال کر کے مجھی کو آنا پڑا ۔ تلخی بڑھتی گئی ـــــ کتنے دن بات چیت کئے بغیر گزر جاتے، میں بھی بدمزاج ہو گئی تھی ۔ ہر بات پر جھنجلاہٹ ہوتی ۔ سخت سست سنانے لگتی ۔ تمہارا موڈ ٹھیک نہ ہوا، کچھ کہہ دیتے تو اچھی خاصی لڑائی ٹھن جاتی ۔

ہم دونوں چبھتے ہوئے فقرے کہہ کر ایک دوسرے کو گھائل کرتے اور یہ گھاؤ بہت دنوں تک ہرے رہتے ۔ کبھی کبھی میں حیران ہو جاتی ۔ یا اللہ کیا میں ہی ہوں ـــــ کیا ہم دونوں وہی ہیں یا ان دس بارہ سالوں میں اتنی تبدیلی ہو سکتی ہے ۔

ایک بار کسی بات پر بگڑ کر میں نے تمہیں بہت کچھ سنا دیا ۔ خوب شور مچایا ـــــ نہ تم چپ رہے نہ میں ـــــ دیر تک جھگڑا ہوتا رہا تم میری زبان سے ہارنے لگے تو بس پھٹ پڑے ۔ گھر میں رہ کر کیا کروں ۔ تمہاری صورت دیکھتا ہوں ۔ دل نہ لگے ویرانے میں تو آدمی آخر کہیں جائے کہ نہیں ـــــ یہ بات مجھے چپ کرنے کہہ ڈالی تھی ۔

مجھے معلوم تھا کہ بہت دنوں سے تمہارے خاندان والے دوسری

پر اصرار کر رہے تھے۔ اولاد کا نہ ہونا عورت کے سر ہی منڈھا جاتا ہے۔ کیا عورت کی خاطر آدمی اولاد جیسی نعمت سے محروم رہے —— تم نہ جانے کیوں راضی نہیں ہوئے۔ سخت سُست کہنے کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ مجھ کم بخت کے سوا تمہیں کسی سے لگاؤ نہیں —— اس لگاؤ نے تو تمہیں اس قدر بدمزاج اور تلخ بنا دیا تھا۔

پھر میں بیمار ہو گئی۔ قسم قسم کے وہم مجھے گھیرنے لگے۔ آجکل بیماریاں بھی تو بڑی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ بہت دنوں تک تو میں نے صبر ہی کیا۔ اچھا ہے مرجاؤں تو تمہارے سر سے بلا ٹلے۔ اب بھی کر کرنا کیا ہے ڈرتی بھی تھی کہ معذور بنی بیٹھی رہوں تو کوئی پانی کو بھی نہ پوچھے گا۔ ایک دو بار تم نے ہی کہا جا کر کسی کو دکھاتی کیوں نہیں۔ میں چپ کر گئی۔ جب تمہیں کو میری صحت کی پرواہ نہیں تو خاک اپنا علاج کرواؤں۔

ایک دن باورچی خانے میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ تمہیں شاید میری حالت پر ترس آیا۔ اس دن تم ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا پیٹ میں ٹیومر ہے آپریشن ہوگا —— نئی مصیبت پڑی۔ یہ بھی کہا کہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ بھی کرلیں، یہ بھی سہی —— پر آپریشن میں نہ کرواؤں گی چیر پھاڑ سے میرا جی لرزتا ہے۔ مرنا ہوگا مرجاؤں گی ——

مگر یہ کیا ہوا۔ سان ایسی خوش خبری کے لئے تیار نہ تھے۔ اس نے تو صرف شبہ سا ظاہر کیا اور تم یقین کے مارے پھولے نہ سمائے۔ میں تو تمہیں دیکھ رہی تھی۔ چہرہ سے کرختگی بالکل رخصت ہو گئی تھی اس کی جگہ وہی نرمی جھلکنے لگی تھی جو بہت سالوں پہلے تمہارے منہ پر میں نے دیکھی تھی —— نیا لہو تمہاری رگوں میں گردش کرنے لگا۔

پھر سے تم وہی بن گئے جو کبھی تھے۔ چہل، دل لگی۔ خوشی کے مارے بے حال رہتے۔ مجھے تو شرم سی آنے لگی۔ ہر چیز وقت پر اچھی لگتی ہے یہ لڑکوں جیسی باتیں مجھے بالکل نہ بھاتیں۔ مگر تم تھے کہ میری خاطرداری میں لگے رہتے —— گھر سے باہر جانا تو بالکل چھوٹ گیا تھا۔ آم کے پیڑ کو تم للچا کر دیکھنے لگے۔ اس سال ضرور اس میں پھل آئے گا۔ دیکھ لینا بور آیا —— ننھی ننھی کیریاں لگیں تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا —— میرا دل ہول کھانے لگا۔

تم نے پھر سے اپنی چرخیں نکالیں۔ قسم قسم کے چرخ، شیشے کی گولیاں چھوٹے بڑے لٹو —— اپنے بچپن کے سارے کھلونے اور سب سجا کر رکھ دیئے، جیسے سب کل سے ہی وہ کھیلنا شروع کر دے گا۔ ڈھیروں رنگ برنگی تصویریں —— ٹکٹ لگے البم —— تتلیوں کے پر —— غلیل، رن بلا —— اور باتیں بس اُسی کی باتیں۔ اُسے چھوڑ کر کام پر کیسے جاؤں گا تم بے احتیاطی کرتی ہو —— گر نہ پڑے۔ باتیں سیکھ جائے گا تو تمہاری شکایتیں کرے گا۔ پھر دیکھ لینا تمہیں کیسے دُرست کرتا ہوں ——

یا اللہ کہیں ان کے دماغ پر تو اثر نہیں ہو گیا؟

اچانک غیر وقت تم دفتر سے آئے نہیں لائے گئے —— میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا —— تمہیں کچھ ہو گیا ہے —— میں اُسے دیکھ نہیں سکوں گا —— ارے میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں —— آم کے پیڑ پر پھلانگتا —— کوٹھے پر پتنگ اُڑاتا —— گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتا —— میں اپنا بچپن لوٹانا چاہتا ہوں —— میں نہیں مروں گا ——

مگر تمہیں جینا نہیں تھا —— آم کے پھلوں کو چکھنا نہیں تھا۔ اُسی رات دواخانے لے جایا گیا اور دو چار گھنٹوں بعد ہی قصہ ختم ہو گیا دل کی بیماری تھی یا خوشی تم سے برداشت نہ ہوئی، یہ مجھے نہیں معلوم۔

میں آج ہی گھر آئی ہوں —— تمہارا بیٹا پہلو میں سو رہا ہے —— آم کی ٹہنیاں میری کھڑکی تک آگئی ہیں —— تم کتنے دنوں سے انتظار کر رہے تھے —— مگر آج بیٹے کو گھر میں خوش آمدید کہنے والا کوئی نہیں ہے —— میں مجرم و خطاوار کی طرح سر جھکائے آئی ہوں۔ تم نے بہت سے ظلم کئے —— پر یہ تو انوکھا ظلم ہوا —— سکھ دینے والا آگیا تو سکھ لوٹنے والا چلا گیا —— میری آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے ہیں —— اس ننھے بچے کو کیا معلوم کہ کیا باپ کھو گیا —— ہاں مگر یہ آم کا پیڑ شاید کہہ دے کہ یہ پیڑ —— یہ چھایا —— یہ ٹھنڈک وہ سب تیرے لئے چھوڑ گیا ہے۔

اختر ملیح آبادی

افسانہ 'رات کا گناہ' روانہ ہے۔ میری اپنی زندگی کی ایک جھلک ہے
پونم
کو
میرا
عطیہ
سمجھ
قبول
کیجئے!
اختر

رات کا گناہ

کوٹھری کے دروازے پر کوئی آیا اور رُک گیا تھا۔ متحرک سایہ سا چند لمحوں بعد کسی کے ہنسنے کی دھیرے دھیرے آواز کوٹھری تک شرماتی ہوئی پہنچی اور کسی نے ہلکے ہلکے گھٹی آواز میں کہا۔

"جاؤ! ـــــ جاتی کیوں نہیں ہو؟"

"ارے؟"

"کیا کر رہی ہو؟"

"نہیں ـــــ میں نہیں جاؤں گی ـــــ نہیں!"

"دیوانی ہوئی ہے کیا ـــــ جلدی کرو!"

وہ بچوں کی طرح ٹھنکتی رہی ـــــ اس لئے کہ وہ کوٹھری میں جہاں میں اس کا منتظر تھا، آنا نہیں چاہتی تھی، لیکن اسے مجبور کیا جا رہا تھا اس لئے وہ بچوں کی طرح ٹھنک رہی تھی۔ اس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ، نفسیاتی اُلجھن میں مبتلا تھی، دل مُنکر تھا، دماغ مصلحت آمیزی کے لئے مجبور کر رہا تھا ـــــ لیکن سب سے زیادہ اُسے جس بات کا خیال تھا، وہ تھی اپنی آبرو ـــــ!

ظاہر ہے کہ میں آج رات اُس کی آبرو کا گاہک بن کر آیا تھا۔ اسے کوٹھری میں میری موجودگی کا احساس تھا اور مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ دروازے تک آ چکی ہے اور اب کوٹھری میں آنے والی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں تخت پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے اس کی پرچھائیں اور آواز کا آنکھوں اور کانوں سے تعاقب کر رہا تھا۔

اچانک وہ لڑکھڑا کر اندر آ گئی ـــــ آئی نہیں بلکہ اسے اندر کی طرف ڈھکیل دیا گیا تھا ـــــ اگر وہ دروازہ نہ پکڑ لیتی تو شاید گر جاتی ـــــ اندر ڈھکیل دیئے جانے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گئی اور دروازے کی آڑ میں میری طرف سے پیٹھ کر کے اور مُنہ چھپا کے کھڑی ہو گئی ـــــ بالکل چپ چاپ ساکت ـــــ شاید سانس روک کر ـــــ!

ایک کوٹھری ـــــ ایک مرد ... اور ایک لڑکی ـــــ!

یہ تھی میرے تصور کی تثلیث! ـــــ اور میری نگاہوں نے اس کا جائزہ شروع کر دیا تھا ـــــ درمیانہ قد ـــــ گداز جسم ـــــ اُبھرے کولھے خمدار کمر، بھرے بازو اور گورے ہاتھ۔ چہرہ میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ البتہ سیاہ لباس لالٹین کی پیلی روشنی میں چمک رہا تھا ـــــ دوسرے پیرہنک سیاہ پوشش تھی ـــــ بالکل کالے گلاب کی طرح ـــــ!

کوٹھری میں سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے اچانک لمبی سانس لی تو کوٹھری کی گھٹی فضا میں ہلکی سی خوشبو کا احساس ہوا۔ وہ خوشبو لڑکی کے

ہم کی بھینی خوشبو سے ملتی جلتی تھی۔ اچانک میں نے آہستہ سے کہا۔

"آجائیے ــــ میرے پاس آجائیے!"

لیکن جیسے وہ پتھر کی بن چکی تھی ــــ سنگ مرمر کی مورت ــ!

"مجھے آپ کا بڑی دیر سے انتظار ہے، جناب ــــ تشریف لائیے!"

جواب ندارد، وہ جوں کی توں کھڑی تھی ہلی تک نہیں ــ تب میں نے ے جلایا اور پہلا کش لیتے ہوئے تخت سے اترا، اس کے قریب گیا اور پڑتے ہوئے کہا۔

"شرم چھوڑیئے ــــ آئیے ــ!"

اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور کسمسائی۔ میں ہنس دیا اور کہا۔

"اتنی نفرت؟ ــــ آخر میں نے کیا بگاڑا ہے؟"

اور جب دوبارہ میں نے اس کو گرفت میں لینا چاہا تو اس نے زور سے لی اور گھبرا کر کہا۔

"ہٹیئے ــــ دور رہیئے ــــ!"

میں آپ سے ملنے آیا ہوں ــــ باتیں کرنے!"

"میں بات نہیں کروں گی"

"کیوں؟"

"نہیں نہیں!"

"وجہ بتایئے ــــ وجہ معقول ہوئی تب میں یقیناً تعمیل کروں گا"

وہ چپ ہو گئی۔ شاید میرے وعدہ پر غور کر رہی تھی۔ میں نے سنتے ہوئے کہا۔

"میں افسانہ نگار ہوں ــــ آپ کو علم ہے کہ ہم لوگ انسان دوست رتے ہیں؟"

تب اچانک پہلی بار اس نے مجھے دیکھا اور پھر جلدی سے منہ پھیر لیا ــــ اس نے دیکھا اس لئے تھا کہ میرے الفاظ کی تصدیق ــ یا دم تصدیق میرا چہرہ دیکھ کر کرنا چاہتی تھی ــــ معلوم نہیں پہلی نظر میں س کی میرے متعلق کیا رائے تھی، لیکن میں ایک جھلک دیکھ کر ہی اس کا دیوانہ بن چکا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"مجھ پر اعتبار کیجئے ــــ میں زبان دیتا ہوں"

"جھوٹ تو نہیں کہہ رہے ہیں آپ؟"

"قطعی نہیں ــــ آیئے بیٹھیں اور باتیں کریں"

دوسرے لمحے وہ خود ہی تخت پر بیٹھ گئی ــــ جھجک اب کم ہو گئی تھی۔ منہ اس کا میری طرف تھا لیکن آنکھیں نیچی کئے وہ بیٹھی تھی۔ میں نے ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نام تو بتایئے؟"

اس نے آنچل سے منہ چھپا لیا۔ شرما گئی تھی۔

"میرا نام اختر ہے ــــ میں کہانیاں اور افسانے لکھتا ہوں ....!"

"جھوٹی کہانیاں!" وہ بیچ میں بول پڑی "آپ اسی لئے یہاں آئے تھے؟"

"میں سچی کہانی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں"

"یہ بھی جھوٹ ہے ــــ!"

"کیوں ــــ؟"

"گناہ کا اندھیرا ہر اجلا نقش چھپا دیتا ہے!"

بڑا تیکھا اور چبھتا ہوا جملہ تھا۔ مجھے لطف آگیا اور یہ لطف اس وقت اور بڑھ گیا جب اس نے تیکھے انداز سے مجھے استفسارانہ انداز سے اس طرح گھورا کہ جیسے اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا ــــ واقعی اس حقیقت کی تردید ممکن ہی نہیں تھی لیکن اس کی زبان سے چند اور ایسے ہی شیریں جملے سننے کی خاطر میں نے اس کے دل میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"کوٹھری میں جو ملگجا اندھیرا ہے وہ آپ کے نزدیک گناہ کی پیداوار ہے؟"

"جی ہاں!" ــــ

"آپ سے ملنا اور بات کرنا گناہ کیسے ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ تو خود گواہ ہیں!"

"میں اس بات کی گواہ ہوں کہ آپ نیت بدل کر یہاں آئے ہیں کیا آپ نہیں جانتے کہ نامحرم ہو کر کسی لڑکی سے اس طرح ہمکلام ہونا گناہ ہے؟"

"اگر پھولوں کو چومنا گناہ نہیں ہو سکتا، تب لڑکیوں سے بات کرنا

…ب کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "آپ
…ت میں بہہ رہی ہیں؟"

"آپ جذبات میں بہہ ہی نہیں گئے بلکہ ڈوب بھی چکے ہیں ۔۔۔ کچھ
…ے اپنی؟"

"میں اپنی خیر خیریت معلوم کرنے آیا ہوں سرکار!"

وہ ہنس دی ۔۔۔ بالکل کلی کی طرح لیکن دوسرے لمحے وہ پھر
…ہو گئی اور کہنے لگی:

"میں اس ملاقات کو جلدی ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"مجھے اُلجھن ہو رہی ہے۔"

"جبکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے رات بھر باتیں کروں۔"

"کیا کبھی کسی اور لڑکی سے ہمکلام ہونے کا موقعہ نہیں ملا آپ کو؟"

"اتفاق کم ہی ہوا ہے۔"

وہ آنچل سے کھیل نہیں رہی تھی بلکہ اُلجھ رہی تھی۔ میں سگریٹ
…رہا تھا۔ دھوئیں کی لکیر اُس کے چہرے پر جا پڑی لیکن وہ جس طرح کھوئی
…ی بیٹھی تھی، اسی طرح کھوئی بیٹھی رہی۔ میں نے بازو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا نیند آ رہی ہے؟"

"نیند اُڑ چکی ہے۔"

"کون لے گیا نیند چرا کر؟"

"آپ! ۔۔۔ اور کون؟"

"سرکار! ۔۔۔ میرا قصور؟"

"میں سوچ رہی تھی۔" اس نے قسطوں میں سانس لیتے ہوئے
…ہا ۔۔۔ "کہ دُنیا کی ہر شے اپنی اصلیت سے بے نیاز ہو چکی ہے!"

"ایسی بات تو نہیں جناب!"

"آپ میں اور تانگے والے میں اس وقت کیا فرق ہے ۔۔۔ بتائیے؟"

جب میں نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے سگریٹ کا کش لیا تو وہ اُبل
پڑی۔ کہنے لگی:

"اسی طرح ایک تانگے والا اپنے پہلو میں کسی لڑکی کو بٹھائے ہوگا
اور اسی طرح لڑکی کو تھما رہا ہوگا اور رُعب جما رہا ہوگا۔ جس طرح کہ آپ
اس وقت خود کو میرا آقا اور ولی سمجھ رہے ہیں ۔۔۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"بالکل درست فرما رہی ہیں آپ!" میں نے اس کی طرف جھکتے
ہوئے کہا۔ "لیکن یہ سب باتیں آپ نے اپنی والدہ سے کہی ہوتیں تو
زیادہ مناسب تھیں؟"

"اس لئے کہ میری باتوں کا آپ کے پاس جواب نہیں اور آپ کو
کھل رہی ہیں؟"

"نہیں! بلکہ لڑکی میری نظر میں کلی کے سوا اور کچھ نہیں جب کہ آپ!"

"اور آپ آئے ہیں کلی کو جوتے سے روندنے؟ ۔۔۔ افسانہ نگار
جو ٹھہرے!"

"افسانہ نگار میں ذوقِ جمالیات کی بہتات ہوتی ہے!"

"اسی لئے وہ زندگی میں بھی افضل ہوتے ہیں! کیوں جناب؟"

یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ اس کی مسکراہٹ میں نشتریت تھی۔ میں حُسن برہم کو
دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا ۔۔۔ کوٹھری میں چند لمحوں کے لئے سناٹا
اُبھر آیا تھا۔ اچانک اس نے پوچھا۔

"پان کھائیے گا؟"

"میرے پاس ہیں ۔۔۔ آپ کو کھلاؤں؟"

"شکریہ! میں پان نہیں کھاتی!"

"میرے کہنے سے کھا لیجئے!"

"آپ میرے ہیں کون؟"

میں نے چونک کر جب گھڑی دیکھی تو اس نے آہستہ سے کہا:

"کیا بجا ہے؟"

"دس!"

"بہت دیر ہو گئی!"

"واقعی دیر ہو گئی!"

یہ کہہ کر جب میں تخت سے اُترنے لگا تو اس نے گھبرا کر پوچھا:

"کہاں؟"

"اب چلا ۔۔۔!"

"آپ جا رہے ہیں کیوں؟"

وہ حیران تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ نام بتانے کی روادار نہیں ــــ پھر میں بیٹھ کر کیا کروں گا؟"

"آپ آئے کس لئے تھے؟"

"آپ سے ملنے کے لئے ــــ باتیں کرنے کے لئے ــــ!"

"آپ کی دونوں تمنائیں تشنہ رہیں!"

"آپ کی بدولت!"

ابتدا میں شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں یونہی جانے کا عزم واقعی کر چکا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مشکوک نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی لیکن جب مجھے جوتے کی ڈوریاں باندھتے دیکھا تو اُس نے کہا۔

"آپ کچھ عجیب ہیں ....!"

"آپ مجھے سمجھ نہیں سکتیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں خود کو نہیں سمجھ پایا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خود کو نہ سمجھتے ہوئے محض دھوکے میں آپ یہاں تک آ گئے تھے۔ کوٹھری میں میری طلبی اور خواہش بھی محض لاعلمی اور دھوکے میں ہوئی ــــ؟"

میں نے اس وقت تک جواب نہیں دیا جب تک کہ فیتے نہ باندھ لیے پھر کھڑے ہوتے ہوئے میں نے اُسے دیکھا وہ میری طرف دیکھ رہی تھی، اور کہا ــــ "فطرتاً نہیں، ضرورتاً میں یہاں آیا تھا آپ سے تاریکی اور تنہائی میں ملنے کے لئے، ــــ اس لئے کہ میری بیوی اپنے بھائی سے ملنے پاکستان گئی ہے جبکہ میں کئی دن سے جنسِ لطیف کی بُری طرح ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا آپ تک ایک دوست کے ذریعہ رسائی حاصل کر لی۔ میں بقول آپ کے لذّتِ گناہ کی تمنا لے کر آیا تھا۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں۔ آپ مجھے طعنہ نہ دیں اس لئے کہ جنسی ضرورت کے تکملہ کو میں گناہ نہیں سمجھتا۔"

"آپ کی ضرورت کا کیا ہوگا؟"

"وہ یونہی تشنہ رہے گی!"

"اسے آپ برداشت کر لیں گے؟"

"آپ کا اندازہ کیا ہے؟" میں نے اُسے ہنس کر دیکھا اور پوچھا۔

"مجھے آپ پر یقین کا شبہ ہو رہا ہے۔"

"محض شبہ!" میں نے پوچھا "خیر! جب میں چلا جاؤں گا تب آپکو یقین ہو جائے گا ــــ لائیے ٹوپی اُٹھائیے اور مجھے الوداع کہیئے۔"

وہ مُڑی۔ تکیہ پر ٹوپی رکھی تھی، اُٹھائی میں نے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے کہا:

"اجازت ہو تو میں ٹوپی پہنا دوں۔"

"مجھے اُمید تھی کہ آپ کے دربار سے نکلوں گا تو آپ پگڑی باندھ کر مجھے رخصت کریں گی؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ تخت پر کھڑے ہو کر اس نے ٹوپی مجھے پہنائی اور جب میں نے رخصت چاہی اور کہا۔

"اجنبی شناسا! خدا حافظ!"

تب وہ اچانک بول اُٹھی۔

"آپ کیوں آئے تھے اور کیوں جا رہے ہیں؟"

"آپ سے ملنے آیا تھا ــــ اور اب جا رہا ہوں۔"

"کوئی بات اور ہے!" اُس نے سوچتے ہوئے کہا "کیا مجھے نہیں بتائیے گا؟"

"میرے پاس اس قسم کا کوئی راز نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے پانچ کا نوٹ نکالا اور اُسے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے نذرانۂ حُسن!"

"دس روپے تو آپ اماں کو دے چکے ہیں۔"

"وہ فیس تھی ــــ یہ نذرانہ ہے۔"

لیکن نذرانۂ حُسن قبول کرنے پر وہ آمادہ نہیں ہوئی ــــ نوٹ میں نے جیب میں رکھ لیا ــــ اور خدا حافظ کہتے ہوئے چاہا کہ باہر نکل جاؤں کہ اُس نے پیچھے سے شیروانی کا کالر پکڑ لیا اور آہستہ سے مجھ سے کہا۔

"سُنیئے ــــ سُنیئے!"

"کہیئے!" میں نے کہا اور اس کی طرف مُڑ گیا۔ وہ قریب کھسک آئی چند لمحے مجھے گھورتی رہی اور پھر لمبی سانس لے کر کہنے لگی:

"میرا نام فرزانہ ہے"
"خوبصورت نام ہے ــــ بالکل آپ کی طرح ــ!"
اچانک فرزانہ نے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے ــــ اور اپنے ہونٹ ہونٹوں سے بادیئے ــــ ایک ساعت کے لئے ــــ پھر اس نے گلے سے بانہیں نکال لیں ــــ پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی اور بھرائی ہوئی بولی:

"خدا حافظ ــــ اختر ــ!"

اور میں باہر نکلا تو سردی نے سارے جسم میں بھالے چبھو دیئے۔ ست میری ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر مجھے یہاں تک لایا تھا، میرے ساتھ ا۔ اب تک وہ چوٹے سے چائے خانے میں بیٹھا رہا تھا۔ جب ہم نخاس ریہ کسٹونٹ پہنچے تو اس نے پوچھا۔

"کچھ بالائی یا نہیں؟"

چند لمحے اپنے دوست کو میں گھورتا رہا پھر اس سے ساری حقیقت ن کر دی اور آخر میں کہا۔

"ہم ادیب بڑے ذی حس ہوتے ہیں۔ جونہی کوٹھری کے ایک کونے میں امام باڑا نظر آیا، اس وقت میرے حس پر چوٹ لگی اور میرا ضمیر بیدار ہو گیا ــــ چند ٹکوں کے لئے میں افسانہ نگار ہو کر کسی غریب لڑکی کی آبرو خریدنے آیا تھا ــــ اس لئے کہ میرے پاس چند ٹکے تھے اور وہ غریب تھی ــــ کیا مسجد، مندر اور گرجا میں شہوانی خواہشات کا تکملہ جائز تھا، اس کا فیصلہ کوٹھری میں داخل ہوتے ہی اس وقت ہو گیا تھا جب میری نگاہ امام باڑے پر پڑی تھی اور اسی وقت باطنی طور پر میں بدل چکا تھا ــــ لیکن فرزانہ کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اس لئے کہ جس ماحول میں وہ مجھ سے مل رہی تھی اس ماحول میں اس قسم کی باتوں سے اس پر غلط اثر پڑتا ــــ لہٰذا تم سے بتا رہا ہوں کہ تم میرے جذبے کی قدر کرو گے ــ!"

لیکن میرا دوست مجھ سے ناراض تھا ــــ

ــــ بہت ناراض! ــــ

ــــ اس لئے کہ میں بغیر جنسی حظ کے چلا آیا تھا ــــ

ــــ بلکہ میں خوش تھا ــــ

ــــ اور ــــ زیرِ لب مسکرا رہا تھا ــــ !!! ▲

نعیم زبیری

سانحہ

دفتر میں داخل ہونے کے بعد معمول کے مطابق پہلے میں نے مُنہ دھویا ـــــ روز کی طرح اپنے عجیب و غریب بالوں میں کنگھا کیا جو دو ہی منٹ بعد پھر اسی طرح بکھر جانے والے تھے، جیسے جنگل میں جھاڑیں ـــــ پھر ایک لمحہ کے لئے اپنی پیشانی پر اُوپر کی طرف چپکے ہوئے زخم کے نشان کو گھُورا، جو گزشتہ بیس برس سے وہیں موجود ہے اور میرے "نشانِ شناخت" کی حیثیت سے اسکول میں داخلے کے فارم سے لے کر سروس بُک تک پر لکھا جاتا رہا ہے ـــــ لیکن ـــــ پتہ نہیں کیوں جب بھی میں آئینہ دیکھتا ہوں نیا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اور پھر ـــــ میں باتھ رُوم سے باہر نکل آیا۔

ہمارے باتھ رُوم کے عین سامنے ایک اور باتھ رُوم تھا جس وازے پر لکھا تھا۔

"صرف خواتین ـــــ اور گزیٹیڈ آفسرز کے لئے"

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ دفتر کے ایک تفریحی پروگرام میں میرے ساتھی نے چٹکلوں کا ایک دلچسپ آئٹم پیش کیا تھا۔ اس نے سوال پوچھا تھا:

"بتائیے ـــــ جب ایک سُپرنٹنڈنٹ کو ترقی ملتی ہے تو، ام وہ کیا کرتا ہے"؟

"وہ گزیٹیڈ آفسرز کے باتھ رُوم میں جانے لگتا ہے"! کسی ملے نے تڑسے جواب دیا۔

آج میں ذرا جلدی آفس پہنچ گیا تھا۔ نوّے فیصد کُرسیاں خالی پڑی تھیں ـــــ اپنی کُرسی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائر کھولی اور کچھ ٹٹول ہی رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں کے بالکل قریب کسی نے چوڑیاں چھنکائیں۔

میں بُری طرح چونک پڑا۔ مہندی رَچا ہوا ایک بڑا حسین ہاتھ میرے چہرے کے بالکل قریب کھُلا ہوا تھا ـــــ لمبی لمبی انگلیاں ـــــ نازک سی کلائی میں ہلکے رنگ کی چار شُبک سی چوڑیاں ـــــ اور ہلکے نیلے رنگ کا آنچل گُداز بانہہ پر پھیلا ہوا پنکھے کی ہوا سے تھر تھرا رہا تھا ـــــ میری آنکھیں پتہ نہیں کیوں اور آگے بڑھنے سے ہچکچا رہی تھیں ـــــ کہ اچانک ہاتھ پوری بے تکلفی سے خود ہی آگے بڑھا۔ اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا میری ٹھوڑی اس کی گرفت میں آچکی تھی۔

"بدھو!"

ایک جانی پہچانی آواز سُن کر میں نے اُوپر دیکھا۔ یہ فیلومینا
تھی جسے آج میں نے پہلی بار ساڑی میں دیکھا تھا۔ وہ نہ صرف ساڑی
پہنے ہوئے تھی بلکہ اس نے خود کو پوری پوری طرح مشرقیانے کی
کوشش کی تھی۔ وہ اس وقت کسی انتہائی مہذب ہندوستانی گھرانے کی
ایک باسلیقہ "بہو بیٹی" معلوم ہو رہی تھی ـــــ لیکن پھر اس کی آواز نے
اس کی شخصیت کا سارا طلسم توڑ دیا۔

"کیسی سا لگتا ہے؟"

اس نے اپنے مخصوص بمبئی والے کھُردرے لہجہ میں پوچھا۔

"ایکدم Provocative"۔ میں نے مختصر لیکن جامع
جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتا ہے Provocative؟" اُس نے وضاحت
طلب کر کے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا۔

"وہی Provocative۔ یعنی بس...."

"ہاٹ ـــ سالا" ـــ اس نے میری بات کاٹ کر دیتے
مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم کو مالوم ہے تم سالا مرد لوک کو لیڈیز کے جُوتے میں بھی
سیکس دِکھتا ہے۔"

اور پھر اپنے مذاق پر خود ہی زور زور سے ہنسی، اپنی میز کی
طرف چلی گئی جو سیکشن کے انتہائی سرے پر واقع تھی، اور اس لئے مشہور
تھی کہ اس پر فیلومینا اور اس کے سامنے والی میز پر اس کا گُوٹا چھوٹا
سینئر پلے بیٹھتا تھا۔

پلے بڑی شدت سے کالا تھا اور کچھ عجیب و غریب حُلیئے کا
مالک تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بعض ایسے سیاہ فام لوگ بھی دیکھے
ہیں جن کی موجودگی میں گورے بھی احساسِ کمتری میں مُبتلا ہو جاتے ہیں
لیکن پلے ان میں سے نہیں تھا۔ اس کی ناک آنکھوں کی درمیانی جگہ سے
تیر کی طرح نکلی تھی لیکن رستے ہی میں اچانک اسی تیزی سے سیدھی نیچے
کی طرف مڑ گئی۔ اور اسے سنبھالنے کے لئے دو دانت آگے کی طرف لپکے
اور وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ اس کی پیشانی اُونچی تھی بالکل دیوار کی
طرح اور اس کے پیچھے سر کچھ اس طرح بتدریج کم ہوا تھا جیسے باورچی
خانے پر ایسبسٹاس شیٹس کی چھت ہ ـــــ

فیلومینا کے سینئر کی حیثیت سے وہ بالکل زن مُرید شوہر جیسے
فرائض انجام دیا کرتا تھا۔

کبھی کبھی سیکشن کی خاموشی میں پلے کی گڑگڑاتی ہوئی آواز سنائی
تو لوگ سمجھ جاتے کہ پلے بڑے راز میں فیلومینا سے کوئی فائیل ڈھونڈنے کی
التجا کر رہا ہے۔

اور کبھی کبھی جواب میں فلومینا کی جھڑکی بھی سُنائی دے جاتی۔

"اوے ڈھونڈے گا بھائی ڈھونڈے گا ـــــ ہم کوئی اپنا
فادر کو بتانے گھر تھوڑا ہی گیا تمارا کھرا جیسا فائیل۔"

اور پھر مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتی۔

"ہُنہ ـــ سالا ـــ دُھت۔"

ایک دن پلے اپنی سرکاری قسم کی پریشانی میں غالباً اس سے کوئی
تیز بات کہہ گیا تھا ـــ فیلومینا نے اپنی کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے چلا کر
سپرنٹنڈنٹ سے پُوچھا۔

"یہ سالا کوا کو ہمارا سینئر کائیکو بنایا مسٹر سپرنٹنڈنٹ! یہ سالا
ہم کو گھر والی سمجھ کر آرڈر دیتا ہے۔"

سارا سیکشن قہقہوں سے گُونج گیا لیکن پلے رونکھا سا بیٹھا
آنکھیں جھپکاتا رہا ـــ اسے ملیالم اور انگریزی کے علاوہ اور کوئی
زبان نہیں آتی تھی۔

چار سال پہلے جب میں نے اس سیکشن میں رپورٹ کی تھی تو
فیلومینا سپرنٹنڈنٹ کے بعد سیکشن کی دوسری شخصیت تھی جس سے
متعارف ہوا تھا۔ اس نے ایک انتہائی بھچورا سا تاثر میرے ذہن پر
مرتب کیا تھا۔ میں ڈیوٹی رپورٹ سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھوں میں تھما کر
اس کے مصنوعی باوقار اشارے کی تعمیل میں اس کے سامنے پڑی ہوئی
کرسی پر بیٹھا تھا اور ذرا سا نروس ہو رہا تھا۔

بمبئی میں یہ میرا ساتواں دن تھا۔ اور اس تجربے بُرے اور

رونق دفتر میں قطعی پہلا دن ——— حیدرآباد کے قلعہ نما دفتر سے جس
ں دیواروں پر اُگے ہوئے سبزے اور سال خوردہ چھتوں کے درمیان
پند بوڑھے، کچھ ادھیڑ اور چند نوجوان خواتین وحضرات (جو صرف عُمر
کے اعتبار سے نوجوان کہلا سکتے تھے ورنہ ان کی پیدائش کا حادثہ ان کی
تاریخ پیدائش سے بہت پہلے واقع ہو چکا تھا) اُونگھنے اور زندگی کو کوسنے
یں دن گزارا کرتے تھے ——— بمبئی کے اس بارونق دفتر تک جہاں ہر
طرف گلیمر ہی گلیمر تھا ——— زندگی ہی زندگی تھی ——— کم از کم بیس پچیس
برس اور پانچ سو میل کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ میں نے چند ہی دنوں میں
طے کر لیا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ کی نگاہیں میری ڈیوٹی رپورٹ پر تھیں اور میں
اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک میرے
بالکل قریب سرسراہٹ سی ہوئی۔ میں نے چونک کر کنکھیوں سے دیکھا۔
میری کہنی کے قریب ایک بڑی خوبصورت سی سکرٹ تھی اور سکرٹ پر
سے پھسلتی ہوئی میری نظریں جب ایک نمکین سے چہرے پر رُک گئیں
تو اُس نے کہا۔

"ہلو ——— مسٹر ——— کیا نام ہے تمہارا؟"

پتہ نہیں کیوں ایک سکرٹ کو ——— وہ بھی بمبئی جیسے دیارِ
غیر میں اُردو بولتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے نام بتایا تو
اس نے تڑ سے دوسرا سوال پھینکا۔

"تم پونا سے آیا ہے کیا؟"

"نہیں ——— حیدرآباد سے"

"اُوہ ... اچھا .... تو تم سالا نجام ہے؟"

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ایک نمکین سی لڑکی کے مُنہ سے "سالا" سُن کر مجھے بالکل ویسا
ہی احساس ہوا جیسا کسی خاتون کو مردانہ جُوتے پہنے ہوئے دیکھ کر
ہوتا ہے۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی اور پھر یہ "نجام" کی کیا تُک تھی؟۔
مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ اس کے نزدیک ہر حیدرآبادی "نظام" تھا
بمبئی نے، اور اس دلچسپ سٹیشن نے مجھے بڑی جلدی اپنا لیا

دو ہی مہینہ میں مجھے یُوں محسوس ہونے لگا، جیسے میری میز اپنی جگہ
صدیوں سے بچھی ہوئی ہے، اور میں ابتدائے آفرینش سے یہیں بیٹھا
ہوا ہوں۔ قریب ہی بیٹھا ہوا موٹا، گورا لیکن بے وقوف صورت
حبیب پال میرا پُرانا یار ہے ——— بڑی بڑی آنکھوں والی سیاہ فام
لیکن "سیکسی" مس آگسٹائن سے میری برسوں کی جان پہچان ہے
سٹیشن کا چپراسی، بیری اسی طرح برسوں سے روزانہ مجھے سپارہ
دیکر اپنے پیٹ کے درد کے قصّے سُناتا رہا ہے اور رشیو داسانی
یونہی ایک عرصے سے مجھ سے قسمت کے بارے میں بحثیں کر رہا ہے
سپرنٹنڈنٹ کو مجھ سے اس لیئے لگاؤ ہو گیا تھا کہ بقول اس کے میں نے
اس کے دندان شکن تامل نام کا تلفظ پہلے ہی دن (غلطی سے) درست
ادا کیا تھا۔ وہ فرصت کے لمحات میں (جو ایسے وقت بھی اس کی میز
کے نزدیک پھٹکتے گھبراتے تھے جبکہ اس پر ایک فائیل بھی نہ ہوتی)
کبھی کبھار ٹھنڈی آہ بھر کر مجھ سے کہتا۔

"مجھے زندگی بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میرے والدین
نے مجھے ایک جاہل دیش میں جنم دے کر میرا اتنا خوبصورت نام رکھا
جس کا تلفظ میری بیوی بھی صحیح ادا نہیں کرتی"

لیکن مجھے اپنے طور پر اس بات کا رنج ہے کہ اس نے خود
میرے نام کے صحیح تلفظ کا کبھی خیال نہیں رکھا۔

بمبئی ایک طوائف ہے، جو اپنے پہلو میں ہر اجنبی کو جگہ دیدیتی
ہے لیکن اس سے جذباتی تعلق نہیں پیدا کرتی۔

بمبئی کے پاس ایک ماں کا دل ہے۔ اس کی گود ہر ایک کیلئے
کھلی رہتی ہے۔ خواہ وہ کیرالا سے آئے یا ہمالہ کی وادی سے۔ نئے
نئے لوگ روز صبح سے شام تک بڑے بڑے ڈیزل انجنوں کے پیچھے
لگی ہوئی لمبی لمبی ٹرینوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے آتے ہیں اور چیونٹیوں
کی طرح، دادر، بمبئی سنٹرل، بائیکلہ اور وی۔ ٹی کے اسٹیشنوں پر پھیل
جاتے ہیں۔ اور پھر بمبئی ایک محبت بھرے دل والی ماں کی طرح انہیں
پُسارتی ہے اور ان سب کو اپنی گود میں سمیٹ لیتی ہے۔

مجھے اس سے مطلب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کونسی

یادہ صحیح ہے ۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے بمبئی کی گلیوں میں
رد کو اجنبی محسوس نہیں کیا ۔

یہ صحیح ہے کہ بمبئی کی زندگی میں ایک دلچسپ قسم کا پھکڑپن
ور بعض لوگ اس پھکڑپن کو اپنا نہیں پاتے اور اسی لئے وہ خود
ں میں کھویا ہوا سا محسوس کرتے ہیں ـــــ مثلاً یہ کہ اگر آپ ان لوگوں
سے ہیں جو خود کو تہذیب کا ٹھیکہ دار سمجھتے ہیں اور ان نام نہاد اصولوں
روی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہیں شکم پرستم کے ماحول نے بڑی
ت میں تخلیق کیا تھا تو ظاہر ہے کہ آپ کو بمبئی کا خیر مقدم یقیناً برا کھلا
گا ـــــ کیونکہ یہاں معاملہ برعکس ہے ۔ یہاں تیز رفتار حالات نے
ق اور ایٹی کیٹ کے مصنوعی اصولوں کا اس بری طرح کچومر نکالا ہے
مام زندگی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے ہیں ۔

اور پھر ہم حیدرآبادی ـــــ تو ظاہر ہے کہ ایک حد تک "نجام"
بھی ـــــ

ہماری شرافت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر اتفاقاً آفس میں کوئی ـ
حساس اجنبی ہماری آمد سے لاپرواہ ہماری کرسی پر بیٹھا ہوا ہو اور خود
اٹھ نہ جائے تو ہم ایک کونہ میں کھڑے پیچ و تاب کھاتے رہیں اور اس
چلے جانے کے بعد گھنٹوں اسے گالیاں دیتے رہیں ـــــ لیکن ـــــ

"اے مسٹر ـــــ سپرنٹنڈنٹ کی کرسی کے ہینڈل پر بیٹھ جاؤ کہ
راکنوس ڈپارٹمنٹ ایکسٹرا کرسی نہیں دیا ہے ہم کو ـــ سوری ۔"

فیلومینا نے ایک شخص سے کہا تھا جو کسی سرکاری کام سے آیا ہوا
ا لیکن فیلومینا کی کرسی پر ڈٹا بیٹھا تھا ۔

بہرحال ـــــ فیلومینا ایک ایسی کتاب تھی ـــــ جو فحش تھی ـــــ
ن انتہائی دلچسپ انداز میں لکھی گئی تھی ۔

اس کے "بوائے فرینڈس" کا حلقہ بہت وسیع تھا ـــــ اور اس
قہ میں ہر رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے لوگ پائے جاتے تھے ۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا ۔

"بوائے فرینڈس کی اتنی ساری فوج کو کیوں پال رہی ہو ـــــ کسی
ـے پر کانسنٹریٹ کیوں نہیں کرتیں ۔"

"مسٹر" اس نے اطمینان سے میٹھے کر لیکچر دیا ۔

"تم فرانسس ہے ، اور بات اس کا پہلی کیٹ ہے ۔ مگر غیر ہم
سمجھتا ہے ـــــ پراکش ہینڈسم ہے لیکن بدھو ہے ' ٹیلے جیسا ـــــ"
اس نے کن انکھیوں سے پلے کی طرف دیکھ کر کہا جو ٹھیک اسکی سمت بنے
ایک موٹی سی فائیل سے گویا اختلاط تھا ۔

"ٹیلو ـــــ انٹیلیجنٹ ہے ، لیکن ـــ Crude ہے ـــ
ٹیلے جیسا" ـــــ اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی ـــــ "اسلم اسمارٹ
ہے ، لیکن ـــ جنگلی ہے" ـــــ

"ٹیلے جیسا" میں نے جملہ پورا کیا ۔

"دھت ـــــ ٹیلے جنگلی کدھر ہے ـــــ بیچارہ !!"
اس نے مصنوعی پیار سے ٹیلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھتی
ہوئی اپنی سیٹ کی طرف چلی گئی ۔

اس دن جس کا میں ذکر کر رہا ہوں فیلومینا نے کوئی کام نہیں کیا ـــــ
وہ بڑی جلدی میں معلوم ہوتی تھی ـــــ سارا دن اپنی چوڑیاں ، گھنگھرو اور
ساڑی کا آنچل سنبھالتی رہی اور وقت ختم ہونے سے کچھ پہلے ہی آفس سے
نکل گئی ۔

"کیا بات ہے مس Provocative " میں نے پوچھا "کسے
کاٹنے کا ارادہ ہے ؟"

"چپ" اس نے جلدی سے کہا " ابی جانے دو ـــــ بادمیں
بتائینگا ۔"

پھر تھوڑی ہی دیر بعد تیزی سے میری طرف آئی اور بڑے اضطراری
اشارے کر کے مجھے بلایا ۔

"جلدی آؤ ـــ جلدی ـــــ بڑا گڑبڑ ہوگیا ۔"

اس نے لفٹ کا بٹن دبایا ـــــ اور لفٹ کے آتے ہی اس
میں گھس گئی اور مجھے بھی پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا ۔ لفٹ بالکل خالی
تھا ـــــ اس نے ساتویں منزل والا بٹن دبایا ، اور پھر پلٹ کر مجھے
ایک سیفٹی پن دیا ـــــ میں حیران تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے کہ وہ اچانک
پلٹ پڑی ـــــ اس کے بلاؤز کی پیٹھ پر دو ہک ٹوٹ گئے تھے ۔

"جلدی ـــــ پن لگاؤ ـــــ جلدی" ـــ اس نے مجھے حکم دیا۔

میں نے بڑی سعادت مندی سے بلاؤز کے دونوں سروں کو ملا کر ان میں کانپتی ہوئی انگلیوں سے پن لگایا ـــــ اس کی پیٹھ پر رونگٹے سے کھڑے ہو گئے تھے۔

"ٹھیک ہے"۔ پن لگا کر میں نے اسے اسی سعادت مندی سے اطلاع دی۔

اس نے بٹن دبا کر لفٹ روک دی۔

"بدھو"! ـــ

اس نے کہا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی چلدی۔

اسی رات میٹرو سینما کے اندھیرے میں مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میری سیٹ کے بالکل سامنے، ایک حیدر آبادی شیروانی کے کندھے سے لگا ہوا سر فیلومینا کا ہے۔

مجھے ذرا سی حیرت ہوئی، کیونکہ میرا خیال تھا کہ فیلومینا......

"پروفیشنل سوسائٹی گرل" نہیں ہے ـــ اب تک میں نے اسے جتنے بوائے فرینڈس کے ساتھ دیکھا تھا، ان کا تعلق کسی نہ کسی صورت آفس یا اس کے قریبی ماحول سے تھا۔ لیکن یہ شیروانی کہاں سے آن ٹپکی انٹرول میں فیلومینا کی بے چینی سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ مجھے دیکھ چکی ہے۔

اور پھر جب دوسرے دن آفس میں اس سے ملاقات ہوئی تو وہ حسبِ دستور اسکرٹ پہنی ہوئی تھی اور ذرا کھسیانی سی تھی۔

"ہیلو، مس Provocative، میک اپ اُتار دیا ؟" میں نے کہا۔

اور وہ کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی میرے قریب پڑی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گئی اور کچھ سوچنے لگی اور پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے بولی۔

"وہ بھی ـــ نجام ہے !!"

"پتہ ہے"

"کیسا ـــ تم جانتا ہے اس کو"؟

"نہیں، شیروانی سے پتہ چلا"

"آپ .... چھا ـــــ وہ تو کل ہی پہنا اُس نے، ہم کو بھی ساری پہننے کو بولا تھا"

"بہت کہنا مانتی ہو اس کا ـــــ پُرانی دوستی ہے کیا ؟"

"بوہت پرانی"! اس نے بہت کو طویل کرتے ہوئے کہا "تین مہینہ پُرانی"

ٹھیک ہی تو کہا اس نے ـــــ اتنی لمبی دوستی تو اس نے پہلے کسی سے نہیں کی تھی۔

"ہم ـــ جُوا ـــــ کانسنٹریٹ کرتا ہے آجکل"! اس نے کچھ جھجکتے ہوئے انکشاف کیا۔ "تم بولا تھا نا ؟" اور یہ شناسا ہوئے اس نے پتہ نہیں کیوں مجھ سے ایک لمحہ کو نظریں چُرالیں اور اس کا یہ اعلان غلط نہیں تھا۔

میں نے بعد میں بھی کئی بار اسے "نجام" کے ساتھ دیکھا ـــ وہ بتدریج سنجیدگی میں مبتلا ہوتی جارہی تھی ـــــ اس کے بوائے فرینڈس کا ہجوم بھی ایک ایک کر کے چھٹ چکا تھا اور صورتحال سے سب سے زیادہ لُطف میں لے رہا تھا۔ کیونکہ فیلومینا نے اسے سب کے سامنے اُوبنانا چھوڑ دیا تھا، اور ٹافیاں وغیرہ دینے کے سلسلہ میں اب وہ زیادہ بور نہیں کرتی تھی۔ پانچ بجے سے کچھ پہلے وہ اپنی ڈرائر کھولتی جلدی جلدی میک اپ کو ٹھیک کرتی ـــ اور کھٹ پٹ کرتی جلدی جلدی سیکشن سے نکل جاتی ـــــ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر بھی ڈال لیتی اور مسکراتی۔ اسطرح خاموشی سے گویا وہ اس بات کی تصدیق کرتی تھی کہ اس کے ایک انتہائی قیمتی اور اہم راز سے صرف میں واقف ہوں !!

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اچانک اپنی ساری شوخی کو چھوڑ چھاڑ اتنی سنجیدہ اور کھوئی کھوئی سی کیوں رہنے لگی ہے۔ مانا کہ وہ کسی سے عشق کرنے لگی ہوگی، لیکن اس کی کیا تُک تھی کہ وہ جو سپرنٹنڈنٹ کے خاتانی نام کے تلفظ کی نت نئے طریقے سے مٹی پلید کرتے نہیں تھکتی تھی اب اکثر اسے "سر" سے مخاطب کرنے لگی تھی۔

میں سمجھتا ہوں وہ غالباً کچھ بوکھلائی ہوئی سی تھی۔

پھر ایک دن میں نے اس شیروانی کو ایک ٹیکسی میں دیکھا لیکن اس کے کاندھے پر ٹِکا ہوا سر فیلومینا کا نہیں تھا۔

"کیا حال ہے مِس Provocative؟" میں نے ایک دن اس کا
روک کر پوچھا۔

"حال؟"

اس نے پوچھا ـــــ اور میرے قریب والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی
کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر میری طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی لیکن
مسکراہٹ میں ذرا سا کھسیانا پن تھا اور مخصوص شرارت دُور دُور تک
نہ تھی۔

پھر اس نے عجیب بے ربط سی بات پوچھی۔

"ہم ـــ کیسی سی ہے؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی
سنجیدگی تھی۔ اور ہونٹ فیصلہ کن انداز میں مڑے ہوئے تھے۔

"کیسی سی ہے؟"

اس نے پھر زور دے کر پوچھا۔

"Provocative"

میں نے یونہی مسکرا کر جواب دے دیا۔

"بس؟"

اس نے کہا ـــــ اور کسی جواب کا انتظار کیے بغیر اُٹھ کر چل دی۔

میں حیران تھا، لیکن میں نے اس سے اور کچھ نہیں پوچھا ـــــ اُس
دن وہ آخر وقت تک آفس ہی میں رہی ـــــ اُٹھنے سے پہلے اس نے
ایک آپ بھی ٹھیک نہیں کیا ـــــ اور بھاری بھاری قدموں سے سیکشن سے
نکل گئی ـــــ اس نے میری طرف جان بوجھ کر نہیں دیکھا ـــــ وہ کچھ بجھی
بجھی سی تھی۔

دوسرے دن وہ آفس کافی دیر سے آئی ـــــ ہم دونوں میں کوئی
بات نہیں ہوئی اور وہ دن بھر بڑی خاموشی سے اپنے کام میں لگی رہی۔
میرے پاس کہیں سے اتنا سارا کام ٹوٹ پڑا تھا کہ میں سر بھی نہیں اُٹھا
سکا۔ میرے کانوں نے محسوس کیا کہ آفس کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ سیکشن
کے "سرکاری سناٹے" نے ایک ہموار قسم کی گڑبڑ کا رُوپ دھارا ـــــ
لوگوں نے اچانک باتیں شروع کر دیں۔ روز کی طرح آج بھی راجو میرے
قریب سے بڑبڑاتا ہوا گزرا۔

"بات اس کی ـــــ ہم نے ٹائم دیا تھا چھوکری کو، سارا وقت
اِدھر ہی گزر گیا۔"

پتہ نہیں وہ کون چھوکری تھی، جو گزشتہ چار مہینے سے اس کا
انتظار کر رہی تھی ـــــ اور پھر آہستہ آہستہ دوبارہ خاموشی طاری
ہو گئی ـــــ

میں نے ٹھان لی تھی کہ آج سارے کام کو ختم کر کے ہی دم لوں گا
اور میرا یہ ارادہ سُورج کو بھی لے ڈُوبا۔

آخر مکمل شدہ فائیلوں کا ایک ڈھیر میز پر لگا کر میں نے
کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی ـــــ ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کے پردے
سے لپٹ کر اٹھلایا ـــــ میری نظر کھڑکی کے باہر تیزی سے تعمیر ہوتی
ہوئی عمارت کے پرے ـــــ دُور کروٹیں لیتے ہوئے سمندر پر جا رکی
کوئی دن نہیں جاتا کہ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت ایک ظالم
ہاتھ کی طرح پوری بے رحمی سے میری آنکھوں کے آگے کھڑی
ہو جائے گی۔ اور سمندر ـــــ اُفق ـــــ اور کھجور کے پیڑ، سب
میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائیں گے۔

میں ایک لمحہ کو اُداس سا ہو گیا۔

اور پھر میری تھکی تھکی نظریں اچانک اس کونے میں رُک گئیں
جہاں نیلو مینا کی میز تھی۔

میز پر سر رکھے ہوئے کوئی سو رہا تھا ـــــ میں نے قریب پہنچ کر
دیکھا ـــــ یہ نیلو مینا تھی ـــــ لائٹ بھی بند تھی ـــــ اور دن کی
غائب ہوتی ہوئی روشنی میں اس کونے کا ماحول بڑا پُراسرار معلوم ہو رہا
تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں جو میز پر پڑا تھا ایک چھوٹی سی شیشی،
غالباً خواب آور گولیوں کی ـــــ دبی ہوئی تھی۔

آفس دُور دُور تک خالی تھا ـــــ لاپرواہ لیٹ ڈیوٹی والا
بھی شاید چائے پینے چلا گیا تھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ـــــ میں نے جھک کر دیکھا
اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں ـــــ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ

کو اس کے چہرے کے قریب کر کے یہ جاننے کی کوشش کی کہ سانس چل رہی ہے یا رک گئی ؟ ـــــ

کہ اچانک ـــــ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر میز پر رکھا اور اپنے گال کو میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

اس کا گال بھیگا ہوا تھا ـــــ پھر اس نے میری طرف دیکھا اس کی آنکھیں بوجھل بوجھل سی تھیں۔

"انجام"......

اس نے مسکرا کے آہستہ سے کہا۔

میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا ـــــ اور پوری تیزی سے سیکشن سے نکل آیا۔

شیشہ کا ایک گول پیپر ویٹ گولی کی طرح سَن سے میرے قریب سے نکل گیا۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے میں نے اس شیشی کی طرف دیکھا، جو میں اپنی بدحواسی کے باوجود اس کے ہاتھ سے نکال لایا تھا۔ شیشی بھری ہوئی تھی ـــــ میں نے جیب سے اپنی بیوی کا خط نکالا جو آج ہی آیا تھا اور شیشی کو اس میں لپیٹ کر پھر سے جیب میں رکھ لیا۔ ▲

شاذ تمکنت

ثالث

میں اور دُنیا سوچ رہے تھے
ہم دونوں میں کون بُرا ہے
ہنسی ہنسی میں ٹھن جاتی تھی
تم جو بیچ بچاؤ نہ کرتے
جانوں پر بھی بن جاتی تھی
کیسا جھگڑا ہو جاتا تھا!

عزیز تمنائی

خول

(سانیٹ)

گوشۂ عافیت میں سمٹا سکڑا ٹھٹھرتا ہوا
خوابِ فردا کی آغوش میں سو گیا، تھپتھپاتی رہیں
یادِ ماضی کی ٹھنڈی ہوائیں مجھے، جگمگاتی رہیں
میرے اطراف امید کی مشعلیں، تیز رو قافلے
آگے بڑھتے رہے، گرد اُڑتی رہی، اونگھتے راستے
چونک اُٹھتے چلے، نارسا منزلیں پاس آنے لگیں
شادیانے بجے، شور ہونے لگا "آفریں آفریں"
ہر طرف غلغلہ، ہر جبیں ولولہ، اور میں سوتا رہا!

اب بھی اس گوشۂ عافیت میں پڑا ہوں جہاں دیر سے
صرف میری ہی سانسوں کی آواز ہے، رات جب سے بسی
میرے ماحول کے سارے نو رستہ و خستہ لمحوں سے پژمردگی
خول بن کر ریشمیں خول بنتی رہی، جب کبھی صبح کے
دستِ سیمیں بڑھے، میری آنکھیں کھلیں اور پھر مُند گئیں
جیسے اُن ریشمیں خول کے ماسوا زندگی میں کوئی ہو رہا ہی نہیں!

حامدی کاشمیری

بازگشت

آج اِس جھیل پہ آیا ہوں میں دس سال کے بعد
وہی ہلدر کی پہاڑی پہ پھسلتی ہوئی دُھوپ
ہے وہی جھیل کی خاموش نگاہی کا فسُون
وہی گلپوش کنارے، وہی رنگوں کا طلسم
پھُول خاموش ہیں اور کلیاں ہیں تصویرِ سُکوں
جانبِ کوہ، صنوبر کی گھنی شاخوں پر!
سُرمئی اَبر کا آنچل ہے کہ لہرایا ہے
شاخساروں کی نم آلُود، خنک چھاؤں میں
کئی جلتے ہوئے لمحوں نے سُکوں پایا ہے
نُزہت و نوُر کا اِک آئینہ خانہ ہے یہ جھیل
اس کے ہر جلوے میں ہیں کتنے سویرے آباد!
بیدزاروں کے پُر اسرار خنک لمحوں میں
زندگی کرتی ہے خوابوں کے بسیرے آباد
رنگ اور نوُر مچلتے ہیں، گلے ملتے ہیں
جھیل کے سینے پہ مرمر کے کنول کھلتے ہیں
اور اِس تپتے ہوئے رستے کی اُڑتی ہوئی دھول
دُور تک دھان کے کھیتوں میں بکھر جاتی ہے

اپنی حالت میں ہے ہر شئے، یہ گماں ہوتا ہے
جیسے اس خطۂ فردوس بداماں سے کبھی
بھُول کر بھی نہ ہوا گردشِ دَوراں کا گزر
جگمگاتا ہی رہا یہ مرے خوابوں کا دیار
سایۂ گُل ہو کہ ہو سایۂ شمشیر و سناں
زندگی خوابوں کے افسانے بُنا کرتی ہے
سادہ خاکوں میں کئی رنگ بھرا کرتی ہے
تھک کے اِس کالی سی چٹّان پہ بیٹھا ہوں مگر
ایک بے نام خلش رُوح کو تڑپاتی ہے
اِک حسیں نغمۂ گم گشتہ کی یاد آتی ہے
سامنے تپتے دوراہے پہ کوئی سایہ نہیں
دُھوپ کی آگ سے ہر راہ گزر جلتی ہے
جھیل سے جب نظر اُٹھتی ہے، نظر جلتی ہے
اِس دوراہے کی خموشی یہ صدا دیتی ہے
آج اِس جھیل پہ تنہا ہی چلے آئے ہو!
کیوں بنے بیٹھے ہو افسُردہ دلی کی تصویر؟
جانے کس موڑ پہ آئے ہو لُٹا کر تقدیر!؟

راشد آذر

یادیں تتلیاں اور تم

جوڑے میں گجرے کی خوشبو
آنکھوں میں کاجل کے ڈورے
اس اُمید میں تم بیٹھی ہو
میں آؤں تو دن بھر کے دُکھ
دونوں آپس میں بانٹیں گے

تم کو مجھ سے یہ شکوہ ہے
چُھپی ہوئی، کاجل کے پیچھے
روئی ہوئی آنکھوں کی سُرخی
کل جو دیکھ لیا کرتی تھیں
اندھی ہو گئیں آج وہ آنکھیں
میں بھی ایک طوائف بن کر
لاج مُہر کی بیچ رہا ہوں

یادوں کے گھونگھٹ کے پیچھے
چُھپے ہوئے تھے جتنے چہرے
آنکھوں کی خاموش زباں سے
چُپکے چُپکے بُلا رہے ہیں
تمہیں گُماں ہے شاید میں پھر
اُن کی جانب لوٹ رہا ہوں

یا پھر تم یہ سوچ رہی ہو
نئے نئے چہروں کے پیچھے
میں بھی ایسے دَوڑ رہا ہوں
جیسے ہر تتلی کو پکڑنے
بچہ پَل دو پَل کو دَوڑے

تم میرے بچّے کی ماں ہو
سارے شِکوے سر آنکھوں پر
لیکن میں یادوں کے پیچھے
یا تتلی کے رنگ چُرانے
پاگل بن کر دَوڑ رہا ہوں
مجھ کو یہ اِلزام نہ دینا

بشر نواز

آدم و آہن

یہ کھڑکھڑاتی مشینیں یہ ہونکتے انجن
اُبلتی کھولتی سیّال دھات ہر لمحہ
بدل رہی ہیں نئی صُورتیں نئے قالب
ہر ایک چوٹ ہر اک ضرب سُرخیِ آہن کو
پیامِ مرگ بھی ہے مژدۂ حیات بھی ہے
یہ رستخیز یہ ہنگامہ ہائے شور و شر
ہر ایک آہ ہر اک قہقہہ مشینوں کی
گرجتی گونجتی چیخوں میں ہوگیا ہے گُم
کوئی تو مجھ کو سنبھالے کوئی تو بات کرے
کہ میں نہ آہن و فولاد ہوں نہ سیم و زر
ہزار بار جو بگڑے ہزار بار بنے !

محمد علوی

ردِ عمل

کُھلی کھڑکی پہ اک بوڑھا کبوتر
پَروں میں مُنہ لپیٹے سو رہا ہے
در و دیوار چُپ سادھے ہوئے ہیں
گلی کا شور بُجھ کر رہ گیا ہے
کوئی آواز اب آتی نہیں ہے
مرا کمرہ خموشی سے بھرا ہے
ابھی وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا
مگر اب دیکھئے تو جا چکا ہے !

عادل منصوری

صُبح

دُھول اُڑاتی موٹروں کے بوجھ سے
کچلی ہوئی سڑکوں کی آہیں
صف بہ صف بیٹھے ہوئے ٹوٹے مکانوں کی کراہیں
بجلی کے کھمبوں کی
پچھلی رات کے خوابوں کی متلاشی نگاہیں
قبر سے نکلی ہوئی
لاشوں کے وحشی قہقہوں سے
گونجتے بازار کے گھایل نظارے
جسم میں تحلیل ہوتے چاند تارے
اوس میں بھیگے ہوئے
پھولوں کی کمسن مسکراہٹ
دُور اُفق کے
بند دروازے کے پیچھے
خون میں لتھڑے ہوئے سورج کی آہٹ !

شاہین غازی پوری

زہر خند (سانیٹ)

مری نگاہِ تمنا میں رقص کرتا ہے
ترا جمال کہ جب ماہِ نیم شب کی طرح
نقوشِ درد میں رنگِ نشاط بھرتا ہے
ترا بیاں کسی نغمۂ طرب کی طرح

میں اپنی اُنگلیاں اُلجھا کے تیرے کاکل میں
بصد خلوص نظر سے نظر ملاتا ہوں
نکھرتی جاتی ہے جب شام موسمِ گل میں
بڑی لگن سے تجھے آئینہ دکھاتا ہوں

ترے لبوں کے اُفق سے جو پھوٹتی ہے سحر
دلِ فسردہ میں سو ولولے جگاتی ہے
تری نظر سے جنوں خیز [illegible]
حیا سے بادۂ منزل پہ بڑھتی جاتی ہے

کبھی کبھی مگر ایسا ہوا گماں مجھ کو
کہ جیسے کوئی ہماری ہنسی اُڑاتا ہو

کوہکن کے قلم سے

زعفران زار

شاہد صدیقی (مرحوم) کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، اور صحافی ہونے کے ساتھ بہترین طنز نگار بھی تھے۔ انہوں نے کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے "شیشہ و تیشہ" کے کالم کے ذریعہ طنز و مزاح کی جو گل کاریاں کی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں (ساہتیہ اکیڈیمی آندھرا پردیش بہت جلد ان کالموں کا انتخاب شائع کر رہی ہے) چنانچہ قارئین کی دلچسپی کے لئے "زعفران زار" کے عنوان کے تحت ہر ماہ ان کالموں سے اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔ "ادارہ"

فری اسٹائل:

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "فری اسٹائل" کی اصطلاح صرف پہلوانوں کی کشتیوں تک محدود ہے، وہ سخت غلطی پر ہیں اور ہمیں ان کا مستقبل خطرے میں نظر آرہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آجکل کی دنیا میں فری اسٹائل "رواج عام" کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور یہ اصطلاح زندگی کے بے شمار شعبوں میں اسی طرح استعمال کی جاسکتی ہے جسطرح کشتیوں اور اکھاڑوں کے سلسلہ میں استعمال کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں جب سے (Freedom) یعنی آزادی نے قدم رنجہ فرمایا ہے، لوگ جوق در جوق فری اسٹائل ہوتے جارہے ہیں اور آج صورت حال یہ ہے کہ ادب اور شاعری سے لے کر مصوری، موسیقی تک کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں فری اسٹائل کے بہترین نمونے نہ ملتے ہوں!

مثال کے طور پر ہمارے ایک دوست ہیں جو شاعری میں دُور دُور تک اپنا جواب نہیں رکھتے اور جہاں تک مصرعہ پر مصرعہ لگانے کا تعلق ہے ساری دنیا میں آپ کا کوئی حریف نہیں۔ ایک دن آپ انتہائی مُوڈ میں تھے اور ہم زندگی سے بیزار ہو چکے تھے، موصوف نے ہمیں اپنا یہ مطلع سُنایا ؎

شمع محفل میں جلا کرتی ہے پروانے کے ساتھ
مگر صحرا میں کوئی نہیں رہتا دیوانے کے ساتھ۔

ہم نے بصد ادب عرض کیا کہ دوسرا مصرعہ بحر سے بالکل ہی خارج ہے۔ اس پر پینترا بدل کر فرمانے لگے "جی ہاں دوسرا مصرعہ فری اسٹائل میں چلا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہم لاجواب ہوگئے۔

موسیقی میں بھی فری اسٹائل کا عمل دخل بڑھتا جارہا ہے اور اس فن سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں کی انگلیاں زمانے کی نبض پر رکھی ہوئی ہیں وہ لَے اور سُر کے مطابق گانا رجعت پسندی سے تعبیر کرنے لگے ہیں اور کہیں کہیں تو یہ عالم پیدا ہونے لگا ہے کہ اگر کوئی قدیم مکتبِ خیال کا پیرو قاعدے کے تحت گانے بجانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر انگلیاں اُٹھتی ہیں بلکہ پولیس کی نظریں بھی اُٹھتی ہیں۔

یہ صورت حال بھی موسیقی میں فری اسٹائل کے اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے!۔

اور مصوری میں فری اسٹائل کے نمونے تو خود آپ نے بھی دیکھے ہوں گے، ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایسی تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی، جنہیں دیکھنے کے بعد آپ کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ گئی ہوں گی اور آپ نے بے اختیار سوچا ہوگا کہ ؎ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

تصویریں اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ دیکھنے والے انہیں سمجھیں اور ان سے متاثر ہوں لیکن فری اسٹائل کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ آپ اسلوب کے مطابق بنی ہوئی ایک ہزار تصویریں دیکھ جائیے لیکن ایک تصویر کا مفہوم بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا، متاثر ہونا بہت دُور کی بات ہے۔

جب سے مصوری کے فنِ لطیف پر فری اسٹائل کا سایہ پڑا ہے عجیب طوائف الملوکی پھیل گئی ہے۔ ایک صاحب کاغذ پر چند لکیریں کھینچ دیتے ہیں پسِ منظر میں "شیر کا چہرہ" بنا دیتے ہیں اور اس تصویر کا نام رکھتے ہیں "حُسن بِیگم" ایک صاحب جیل سینڈ کے اُوپر آفتاب کو طلوع ہوتا ہوا دکھاتے ہیں اور تصویر کا عنوان ہوتا ہے "شبِ انتظار"۔ ہم نے خود ایک ایسی تصویر دیکھی ہے جس میں ایک سمندری جہاز طوفان کے حوالے ہو رہا تھا۔ سطحِ آب پر ایک وھیل مچھلی کی دُم نظر آرہی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا "کُوئے جاناں"۔ چنانچہ یہ تصویر دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ ▲

جیلانی بانو
★

تنقید نگاری کے جدید اصول

سائنس نے نام کمانے کے سیکڑوں ـ نسخے ایجاد کر ڈالے ہیں ـــــ لیکن غور فرمائیے کہ ان کے موجدوں نے اپنی بات منوانے کے لئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے! ـــــ کیونکہ اپنے نام کو گھس گھس کر چمکانے کی خواہش انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے ـــــ جس طرف دیکھئے ہر شخص اپنے چھوٹے سے دھندلے نام کو چمکانے میں لگا ہوا ہے، جن کے نام بڑے ہیں وہ مزید بڑے کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔

اگلے وقتوں میں لوگ آن کی خاطر جان پر کھیل جاتے تھے برسوں استاد کی جُوتیاں سیدھی کرنا پڑتی تھیں ـــــ اس کے بعد جو دَور آیا تو برسوں بلکہ یُوں کہیئے کہ زندگی کا سنہری دَور کالج کے جھاڑ میں جھونکنا پڑتا تھا، تب کہیں جاکر ہزاروں سال سے روتی ہوئی نرگس چُپ ہوتی تھی۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ جس چیز کی طلب بڑھ جائے تو اُس کے ہزاروں سستے اور آسان نُسخے مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔

ان باتوں پر غور کرنے کے بعد ہمیں بھی چند ایسے آسان نسخوں کی تلاش تھی جو آناً فاناً نام کو مشہور کرسکیں۔ بیٹھے بٹھائے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیں۔ ذرا اپنے آس پاس نظر ڈالیئے تو اللہ کے ہزاروں بندے شہرت کی ہوس میں طرح طرح کے عذاب سہتے ہوئے نظر آئیں گے ان حالات کے پیشِ نظر کچھ تیر بہدف نسخے پیش کیے جاتے ہیں جو قطعی بے ضرر ہیں اور ہزاروں بار آزمائے جاچکے ہیں۔

یعنی اگر ادیبوں اور شاعروں کے ریوڑ اپنے آس پاس دیکھنا ہیں، ایڈیٹروں سے خوشامدیں کروانا ہیں، جلسوں کی صدارت کرنا ہے تو نقّاد بن جایئے ـــــ ٹھہریئے ـــــ نقّاد کے نام پر تھر تھر کانپنے کی یا اپنی قابلیت کا پٹارہ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اگر آپ نے اپنی حماقت سے قابلیت کی کچھ ردّی گٹھری میں باندھ رکھی ہے تو اُسے فوراً دریا برد کر دیجئے کیونکہ جدید نقادوں کو اتنے محنت طلب کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ نقّاد بننے کے اَوزار صرف اتنے ہیں۔

(۱) ایک اُردو انگلش ڈکشنری۔ اور کچھ فرانسیسی تلفظ کے مشکل الفاظ۔

(۲) ایک کاپی جس میں آپ مشہور لکھنے والوں کے خوبصورت

ے نقل کریں گے تاکہ انہیں وقتاً فوقتاً اپنے مقالوں میں جڑ سکیں)

(۳) فرانس کے چند مشہور مصوّروں کے نام۔

(۴) ایلیٹ، فرائڈ، مارکس اور ایذرا پاؤنڈ (جسے آپ حسب ضرورت مذکر یا مونث بنا سکتے ہیں) ان کے علاوہ اُردو کے مشہور نقادوں کے گھریلو حالات اور اُن کی ذاتی کمزوریوں کا پلندہ۔

(۵) ایک خوبصورت سا پیڈ۔ اسٹامپ۔ کچھ معیاری رسالوں کے پتے اور چند ایسے مشہور مرحوم ادیبوں کے نام جو مرنے سے قبل آپ کے کان میں بہت سے زندہ ادیبوں کے ڈھکے چھپے راز کہہ مرے ہیں۔

(۶) ان سب شاعروں اور ادیبوں کا حساب کتاب، جن سے آپ کو انتقام لینا ہے یا جنہیں آپ کو جھنڈے پر چڑھانا ہے۔

اب گویا آپ نقاد بننے کے مکمل ہتھیاروں سے لیس ہو چکے ہیں، چنانچہ آستین چڑھائیے اور بسم اللہ کر کے سب سے پہلے فیضؔ پر چڑھائی کر ڈالیئے کہ نوخیز نقادوں کے لئے فیضؔ کی شاعری میں کیڑے ڈالنا بڑا مبارک ثابت ہوا ہے۔

لوگ باگ پاگل سمجھ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ یعنی مراد بر آتی ہے۔ بھئی اصل مقصد لوگوں کو متوجہ کرنا ہی تو ہے! یہ کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ آپ بڑے دعوے کے ساتھ اپنے گمنام شاعر دوستوں کی مدح بھی لگے ہاتھوں کرتے چلیئے اور ساتھ ہی ساتھ فیضؔ کو مہمل گو، فراڈ اور شاعری سے ناواقف ٹھہرا کے بحر سے خارج کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ پہلے فیضؔ کی شاعری پڑھ کر اس کے عیب ڈھونڈیں بات کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔ مثلاً فیضؔ کا یہ شعر لیجئے ؎

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

آپ چاہیں تو بآسانی اس شعر کو گُو سے نکال کر مُوت' میں ڈال سکتے ہیں مثلاً صبا سے شاعروں نے ہمیشہ نامہ بر کا کام لیا ہے۔ لیکن صبا کو ایک پوسٹ مین کے رُوپ میں دکھانا شاعر کی عجز بیانی کو ظاہر کرتا ہے۔ تجریدی اور مابعد التجریدی نظریوں سے جانچا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ شاعر کی جمالیاتی حِس قائم الذات ہو کر جس بے ترتیبی

انتشار اور انفعالیت کا شکار رہے وہ فرائڈ، ایلیٹ یا والٹیر کے الفاظ میں انسانی شعور و تحت الشعور تملیک و اجارہ داری، انحطاط اور تدریجی جمود کو ظاہر کرتی ہے۔

دوسرا گُر ہے، مشہور ایڈیٹروں کو خطوط لکھ کر اپنے نقاد ہونے کا ثبوت بہم پہنچانا۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ آپ دُنیا بھر کا ادب پڑھ کر کسی ایک رائے پر قائم ہوں۔ یا نئے اور پُرانے ادب کا آپ نے مطالعہ کیا ہو اور نئے لکھنے والوں کے نام اور کام سے آپ واقف بھی ہوں۔ یہ کام آپ بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں یعنی کسی خاص نمبر کو بک اسٹال پر دیکھ کر کسی ادیب کی بغل میں، کسی شاعر کی میز پر یا ٹرین کے کسی مسافر سے لیکر ایک نظر ڈال سکتے ہیں صرف مضامین کی فہرست اور لکھنے والوں کے نام یاد رکھنا کافی ہیں خط ہمیشہ نہایت بے تکلفی سے شروع ہو۔ چاہے اس ایڈیٹر کا نام بھی آپ نے پہلی بار سُنا ہو۔ آپ کی بجائے تم سے مخاطب کرنے میں کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں۔ مثلاً

یار چغد!

تم نے تو کمال کر دیا کہ "گُل قند" جیسا کھٹ مٹا پرچہ نیم پور جیسی کڑوی زمین سے شائع کر رہے ہو۔ تمہارے پرچہ کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ ابھی تک اس کی بھنک میرے کان میں نہیں پڑی تھی۔ فی الحال صرف دس مقالے بھیج رہا ہوں۔ تم ناراض نہ ہونا۔ آئندہ جو چیز لکھوں گا وہ صرف تمہاری ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس خوشی میں پاگل ہو اٹھو گے اور اسی پاگل پن میں آ کر مجھے "گُل قند" بھیجنے لگو گے۔

بھائی میرے! واہی تباہی کون نقاد ہیں۔ خدا کے لئے ان کی کوئی چیز آئندہ شائع مت کرنا۔ ورنہ میرے سر کا گنجا پن اور بڑھ جائے گا۔ کوئی میاں واہی سے پوچھے کہ یہ "جمالیاتی قدریں" کیا بلا ہوتی ہیں۔ کیونکہ خود ارسطو نے جب اپنے نظریہ شعر میں، لفظ "زندگی" استعمال کیا تھا تو اس کا مطلب زندگی نہیں بلکہ عالمِ نزع تھا۔ زندگی سے ایک طرف اس کی مُراد یونانی تہذیب سے تھی

ے نبیں بجاکے جلا ڈ الا تھا اور دوسری طرف "ہیلن آف
ی تی (جسے میں نے کسی انگلش پکچر میں دیکھا تھا)
بتہ محترمہ سیماب ماہ پارہ کی کہانی دیکھ کر مجھ پر شدید دُعائی
ہوگیا۔ ایسا افسانہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ (اندازہ یہ ہوا کہ
معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آنکھیں نشیلی اور ادائیں
ں۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ ان کی تعریف میں ایک ہفتہ واری
سلسلہ شروع کردوں۔

رپھر ـــــــ
ان شاعر سے کہو کہ وہ شاعری کو طلاق دیدے۔ مجھے اسکی
رخارش ہوگئی ہے۔ اگر آیندہ سرسام بھسوانی کا کوئی افسانہ
تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

٭ ٭ ٭

قالہ نگاری کا ایک مقبول انداز یہ بھی ہے کہ آپ نئے نئے
ے سے ادبی حلقوں کو چونکادیں۔ جیسے آپ نے مضمون لکھا
ر وحدت الوجود" اور مقالہ ان حیرت انگیز انکشافات سے

۔

غالب کا اصلی نام اسداللہ خاں تھا عرفیت نوشہ تھی۔ شاید
نہ جانتا ہو کہ غالب کا اصل پیشہ شاعری نہیں، سپہ گری تھا۔
ہور شاعر تھے۔ ان کی شہرت کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کے کلام
ت الوجود جا بجا ملتا ہے، ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑتی ـــ

اگر یہ کام بھی آپ کو مشکل لگ رہا ہے تو ایک اور نسخہ
آزما لیجئے ـــــ اس کے لئے ہلدی اور پھٹکری قطعی درکار
نہیں ہیں ـــــ آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ ہر حقیقت سے انکار
کرتے چلے جائیں ـــــ

منٹو افسانہ نگار نہیں بلکہ نبیا تھا ـــــ ترقی پسند تحریک
ادب کو ٹس سے مس بھی نہ کرسکی ـــــ عصمت کے ہاں زبان
کی خامیاں بُری طرح کھٹکتی ہیں ـــــ بیدی افسانہ لکھ ہی نہیں
سکتے ـــــ کرشن چندر نے اتنا کم لکھا ہے کہ وہ لکھنے میں شمار
ہی نہیں ہو سکتا ـــــ وغیرہ وغیرہ۔

مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ اب آپ ادب کا جہلم کرکے پلاؤ
کھا چکے ہیں۔ لیکن پڑھنے والوں کا دل رکھنے کے لئے اپنی موجودگی
سے انہیں تسلی بھی دیتے جائیے تاکہ وہ سچ مچ ادب کی موت پر صبر
کرکے نہ بیٹھ رہیں۔

اس مقالے کے شائع ہوتے ہی مخالفتوں کے ہزاروں دیپ
جل اُٹھیں گے ـــــ بڑے بڑے نقاد چونک کر قلم کی لاٹھیاں سنبھالے
دوڑیں گے۔ ہر رسالے اور ہر ادیب کی زبان پر آپ کا نام ہوگا ـــ
حوالوں کے لئے آپ فٹبال کی گیند بنا کر ادھر سے اُدھر اُچھالے جائیں
گے ـــــ اور آخرکار ـــــ وہ سورج طلوع ہوگا، جس کی روشنی
میں آپ کسی ڈائس پر کھڑے "میں اور میرا فن" جیسے بھاری بھرکم
عنوان پر نظر افروز مقالہ پڑھ رہے ہوں گے!!! ـــ

مستقل فیچر

کمندیں

تیر انداز

جاسوسی افسانچے

شادی:

جاسوسی ادب اور فلموں نے جہاں نوجوانوں کا کافی وقت برباد کیا ہے وہیں اُنہیں "سسپنس" کا عادی بنا دیا ہے، اور وہ سسپنس کے یُوں عادی ہو چکے ہیں، جیسے ایک افیونی، افیون کا عادی ہوتا ہے کسی سیدھی سادی سی بات کا اظہار بھی اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس میں "سسپنس" نہ پیدا کیا جائے۔

مُدتو یہ ہے کہ پرسوں ایک نوجوان کا عقد ہو رہا تھا۔ سارے براتی موجود تھے۔ دوست احباب اور عزیز و اقارب شادی کے انتظامات میں مصروف تھے کہ اتنے میں قاضی نے ضابطہ کی تکمیل کے لئے نوجوان سے پوچھا۔ "میاں! کیا یہ شادی تمہیں منظور ہے؟"۔ اس سوال کو سُنتے ہی نوجوان کے چہرے پر شکنیں پڑنے لگیں اور اُس نے اپنے خسر کے چہرے پر یُوں نظریں گاڑھ دیں کہ تھوڑی دیر بعد خود خسر کے ماتھے پر بھی شکنیں پڑنے لگیں۔ لوگ دم بخود رَہ گئے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اس پر قاضی نے دولہا میاں کو جھنجوڑتے ہوئے پُوچھا: "بھائی! کچھ تو بولو۔ یہ کیا چُپ سادھ رکھی ہے۔ بولو، کیا یہ شادی تمہیں منظور ہے؟"۔ اب کی بار نوجوان نے اپنے خسر کے چہرے پر سے نظریں اُٹھا کر قاضی کے چہرے پر گاڑھ دیں اور اُنہیں یوں گھُور گھُور کر دیکھنے لگا کہ بیچارے اپنا بستہ باندھتے باندھتے رَہ گئے۔ سارے براتیوں کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ قریب تھا کہ سارے براتی وہاں سے اُٹھ کر چلے جاتے کہ اتنے میں قاضی نے ہمت کر کے تیسری بار نوجوان سے کہا کہ "بھائی میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں، خدا کے لئے کچھ تو بولو کہ تمہیں یہ شادی منظور ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو براہ کرم مجھے دوسرے عقد میں جانے کی اجازت ہی دیدو۔"

اب کی بار نوجوان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُسکی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر اُس نے اپنی شیروانی کا کالر ٹھیک کیا اور اچانک قاضی صاحب سے لپٹ کر زور زور سے چیخنے لگا: "ہاں! قاضی صاحب مجھے یہ شادی منظور ہے، منظور ہے، منظور ہے، دل و جان سے منظور ہے"!

اس حرکت پر قاضی کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولے: "میاں! یہ کیا مذاق ہے، کیا تم مجھے "ڈرنری قاضی" سمجھتے ہو۔ شادی منظور تھی تو میرے دو ابتدائی سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

نوجوان پھر مسکرایا اور ایک شانِ بے نیازی سے بولا: "قاضی صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں براتیوں میں تھوڑا سا سسپنس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ بالکل الفریڈ ہچکاک کی فلموں کی طرح، کیا آپ کو سسپنس کی یہ تکنیک پسند نہیں آئی؟"

نم"

ہم نے غور کیا ہے کہ ہر سسپنس کے پیچھے ایک مضحکہ خیز چھپی ہوتی ہے، جس کے اطراف بلاوجہ سنجیدگی اور خوف دہراس بڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو ہم چھوٹے موٹے جاسوسی کے ذریعہ واضح کرنا چاہتے ہیں۔

ہینڈز آپ!

وہ ایک اندھیری رات تھی۔ رات تو ہمیشہ اندھیری ہی ہوتی ہے ن دن کے اندھیرے میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ سارے برقی کا بریک ڈاؤن ہو چکا تھا۔ میں ایک سنسان گلی سے گزر ۔ دور پولیس تھانے کے چوکیدار نے گھنٹے بجانے شروع یے۔ اس تھانے کے چوکیدار کو یہ عادت ہے کہ جب کبھی وہ بیکار نک آجاتا ہے تو گھنٹے بجانے لگتا ہے۔ کبھی چالیس کبھی پچاس! ن کی حرکت پر مسکرانے ہی والا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے لا دبوچ لیا ہے۔ میں خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا (کانپنے ب وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اُس رات کافی سردی پڑ رہی تھی) پھر وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا۔ پھر اچانک آواز آئی —— ڈز آپ" اور میں نے خوف کے مارے اپنے ہاتھ فوراً اوپر کو اٹھا ۔ پھر اندھیرے میں مختلف آوازیں آنے لگیں۔

"اسٹینڈ ایٹ ایز"

میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"اٹینشن"

میں پوری مستعدی کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

پھر آواز آئی۔ "اباؤٹ ٹرن"

میں اچانک گھوم گیا۔

"کوئیک مارچ"

میں نے موقع کو غنیمت جانا اور گھر کی طرف تیز تیز بھاگنے لگا ن ابھی تھوڑی دور بھی نہیں گیا ہوگا کہ اچانک حکم ملا "ہالٹ"! میں سہم کر ٹھہر گیا۔ "اباؤٹ ٹرن"۔ میں گھوم گیا۔ پھر آواز آئی "کوئیک مارچ" اور میں بوجھل قدموں سے پھر سایہ کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ابھی سائے کے قریب بھی نہیں پہونچا تھا کہ حکم ملا "اباؤٹ ٹرن"۔

غرض میں جب بھی سائے کے قریب پہونچتا تو حکم ملتا "اباؤٹ ٹرن" اور جب دوسری سمت میں کافی دور نکل جاتا تو تب بھی حکم ملتا "اباؤٹ ٹرن" اور یوں میں مکمل دو گھنٹوں تک گھر کی سمت "کوئیک مارچ" اور سایہ کی سمت "سلو مارچ" کرتا رہا اور وہ سایہ بدستور گلی کے نکڑ پر کھڑا مجھے ہدایتیں دیتا رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ برقی رو اچانک آن ہوگئی۔ پھر میں نے روشنی میں دیکھا کہ یہ تو ہمارے ڈرل ماسٹر صاحب تھے جو گزشتہ دو گھنٹوں سے مجھے گلی میں ڈرل کروا رہے تھے۔

دو سائے!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ گرمی کے دن تھے اور میں سالانہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اُس وقت رات کے دو بج رہے تھے اور میں کافی تھک چکا تھا۔ سوچا کہ تھوڑی دیر بالکونی سے گلی کا نظارہ کرنا چاہئیے۔ اور جب میں بالکونی میں پہونچا تو مجھے سنسان گلی کے ایک کنارے پر ایک سایہ نظر آیا۔ میں نے خوف کے مارے دوسرے کنارے پر نظر دوڑائی تو وہاں بھی مجھے ایک سایہ کھڑا ہوا نظر آیا۔ پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے ان دونوں سایوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے کیونکہ دونوں سائے اچانک رک گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ دونوں سائے چھپتے چھپاتے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی تو یہ کچھ دیر کی کھڑکیوں میں چھپ جاتے۔ کبھی کسی درخت کی آڑ میں چھپ جاتے۔ کبھی تیزی سے فاصلے کرتے اور کبھی دس دس منٹ تک ایک ہی جگہ چھپے بیٹھے رہتے۔ بالآخر وہ مرحلہ بھی آگیا جب دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب پہونچ گئے۔ صرف ایک دیوار بیچ میں حائل تھی۔ اچانک ایک سایہ دیوار پر سے کود گیا اور اُس نے دوسرے سائے کو دبوچ لیا۔

میں نے خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ اب ضرور کسی نہ کسی کا قتل ہوگا کہ اتنے میں نیچے سے آوازیں آنے لگیں۔

"ارے تم!"

"ہاں! میں!!"

"میں نے تو تمہیں چور سمجھا تھا"

"میں نے بھی تمہیں چور سمجھا تھا"

"یہ بھی خوب رہی" اور ہلکے سے قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔

پھر یہ دونوں سائے حرکت کرتے ہوئے الکٹرک پول کی جانب چل دیئے۔ میں نے روشنی میں دیکھا کہ یہ دونوں پولیس کے سپاہی تھے جو رات کی گشت میں مصروف تھے۔

خُون!

سیٹھ چونارام کے غیر متوقع قتل نے سارے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی (حالانکہ یہاں "غیر متوقع قتل" کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جو شخص بلیک مارکٹنگ کرے گا تو اُسے کوئی نہ کوئی ضرور قتل کر دے گا۔) گلی گلی سیٹھ چونارام کے قتل کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ یہ قتل کیسے ہوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ان کی نعش، برآمدے میں پڑی ہوئی پائی گئی لیکن شہر کے ممتاز سراغرسان، کیپٹن فریدی کا خیال تھا کہ اُن کا قتل "بیڈروم" میں ہوا تھا کیونکہ وہاں دیوار پر خون کے دھبے پائے گئے تھے۔ قاتل نے قتل کے بعد شاید نعش کو برآمدے میں لاکر پھینک دیا تھا۔ کیپٹن فریدی نے نہایت احتیاط کے ساتھ دیوار پر سے خون کے دھبّوں کو کھرچ لیا تھا۔ اور اس وقت شہر کے سارے سراغرسان اور عہدہ داران پولیس، کیمیکل اگزامنر کی رپورٹ کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

کیمیکل اگزامنر کے دفتر کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا کیپٹن فریدی نہایت بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ انسپکٹر شیام ناتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کیمیکل اگزامنر کے قریب جاتے اور پوچھتے "کیوں صاحب کچھ پتہ چلا؟" اور اگزامنر صاحب اُنہیں ڈانٹ کر بڑھا دیتے کہ "قبلہ! ذرا صبر سے کام لیجئے، آپ تو اسطرح بے چین ہو رہے ہیں جیسے سیٹھ چونارام کا خون آپ ہی کی رگوں میں دوڑ رہا ہے"۔

بڑی دیر کے بعد کیمیکل اگزامنر اپنی لیباریٹری سے باہر آیا۔ اُس کا باہر نکلنا تھا کہ سراغرسانوں اور عہدہ داران پولیس کے چہروں پر بے چینی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بالخصوص کیپٹن فریدی کی بے چینی اُس وقت انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ کیونکہ قتل کا سراغ اسی رپورٹ کی بنیاد پر لگایا جاسکتا تھا کیمیکل اگزامنر کچھ نہ بولا، بلکہ وہ صرف فرش کو گھورتا رہا۔ لوگوں کی بے چینی اور بڑھنے لگی اور وہ پوچھنے لگے۔

"اگزامنر صاحب! بتلایئے نا آخر آپ کی رپورٹ سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟" اگزامنر کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور اُس نے چیخ کر کہا "خاموش! بیوقوفو! جسے تم سیٹھ چونارام کا خون سمجھتے ہو وہ دراصل سیٹھ چونارام کے چبائے ہوئے پان کی پیک ہے"



یاد رکھو!

چوری کے پیشے میں ہمیشہ فائدہ نہیں ہوتا۔

ترجمہ: سلیم الدین

شوہرِ نامدار — ہچکاک

کئی سال قبل مجھ سے ایک بے وقوفی سرزد ہوئی تھی۔ بے وقوفی اس لئے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اپنے شوہر کی عادتوں سے بخوبی واقف ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میں نے اس کا خیال کیئے بغیر رات کے کھانے کے لئے سوفل (انڈے کی ایک ڈش) تیار کی تھی۔

انڈے کی سفیدی پھینٹنے میں میری مدد کرنے کے لئے ہچکاک اسٹوڈیو سے بروقت آگئے تھے۔ جس وقت میں چیز مکسچر تیار کر کے اسے برتن میں بند کر کے تنور میں رکھ رہی تھی وہ میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ میں نے تنور کا ہوئچ سیٹ کیا اور وہاں سے ہٹ گئی مگر ہچکاک کی نظریں بدستور تنور کی طرف لگی رہیں۔ آخر کار وقت پر میں نے تنور کھول کر دیکھا، سوفل تیار تھا۔ مگر اس اثنا میں میرے شوہر کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"اب اس وقت تک کبھی سوفل تیار نہ ہو گا۔ جب تک کہ ہمارے ہاں گلاس کے دروازوں والا تنور نہ آجائے۔"

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے شوہر کو تشویش و انتظار یا سسپنس سے کتنی نفرت ہے، ایک ایسے شخص کے متعلق جس نے اپنی ساری زندگی پردۂ فلم اور ٹیلی ویژن پر سسپنس کی تخلیق میں گزار دی ہو یہ بظاہر نرالی اور حیرت انگیز بات ہے۔ میں بھی ہوں کہ یہ بات ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہچکاک اس کا اعتراف کر لینے میں کچھ پس و پیش نہیں کرتے۔

ہماری شادی سے قبل وہ مجھے طویل خطوط لکھا کرتے تھے اور پھر وہ اپنے ہاتھ سے ہی میرے حوالے کر دیتے تھے کیونکہ انہوں نے بعد میں مجھ سے اقرار کیا تھا کہ وہ خطوط کے ڈاک کے ذریعہ مجھ تک پہونچنے کے انتظار کے سسپنس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

کبھی کبھار میں یہ سوچا کرتی تھی کہ سسپنس سے بیزارگی اس انوکھی شخصیت پر ایک دلچسپ طنز اور طعنہ ہے۔ مگر اب مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ یہ بات اس کی شخصیت کے لئے اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے کئی اشخاص سے جن کی زندگیاں سسپنس کے جذبے سے عبارت ہیں ملنے کے بعد میں بھی ہچکاک کے اس خیال سے متفق ہو گئی ہوں کہ جہاں افسانے میں سسپنس کی یہ کیفیت دلچسپی پیدا کرتی ہے وہیں ہماری حقیقی زندگی میں یہ بڑا اضرت رساں احساس ہے۔

ہچکاک کو اپنی نجی زندگی میں سسپنس سے محفوظ رہنے کا کہ حاصل ہے سسپنس سے بچنے کے لئے ہچکاک کا سب سے بہترین حر

ں کا جذبات سے عاری چہرہ ہے ۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے
پ ہمیشہ اپنے چہرہ پر مسکراہٹ کو برقرار رکھیں تو جلد ہی آپ یہ
ریں گے کہ واقعی آپ مسکرا رہے ہیں ۔ بالکل اسی طرح ہچکاک بھی
ے پر ہمیشہ ایسی سختی اور درشتی طاری رکھتے ہیں کہ شاید کسی قسم
ی احساس وہاں جگہ ہی نہیں پاسکتا ۔

یں وہ دن کبھی بھول نہیں سکتی جبکہ میں نے پہلی دفعہ وہ پُرسکون چہرہ
۔ یہ سنہ ۱۹۲۱ء کی بات ہے ۔ لندن کے جس اسٹوڈیو میں میں کام کرتی
چکاک وہاں نووارد تھے ۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ خاموش فلمیں
ں [illegible] لیے ٹائٹل کارڈس پر لکھے جاتے تھے جن کی تصویریں لیجاتی
ایک دفعہ جب ایک نوجوان آدمی بغل میں ایک بڑا سا پارسل دبائے
یں داخل ہوا تو میں نے یہی سمجھا کہ ہم نے کسی نئے آرٹسٹ کی خدمات
یں اور اس کے بغل میں دبے ہوئے اس پارسل میں ایسے ہی ٹائٹل
ہوں گے ۔ میں ہمیشہ ہر نئے آنے والا کا بغور مطالعہ کرتی تھی اور اسٹوڈیو
کا رنگ دُنیا میں آمد کا اُس پر جو ردِعمل ہوتا اس کا بڑی دلچسپی سے
کرتی تھی ۔

لیکن اس نوجوان کو دیکھ کر میں کچھ مُضطرب ہوگئی ، کیونکہ وہ اپنے
سے عاری اور پُرسکون چہرے کے ساتھ سیٹ پر سے اسطرح گزر
ے کوئی باغ میں چہل قدمی کرتا ہو ۔ وہ اپنی بغل میں کارڈس
اہنی یا بائیں جانب نظر ڈالے بغیر آفس میں غائب ہوگیا ۔

جُوں جُوں دن گزرتے گئے میری حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا ۔ میں
یو میں چار سال تک کام کرنے کے بعد کٹر (CUTTER) کے
رتی کرلی تھی اور نووارد میرا قد سے احترام کیا کرتا تھا ۔ مگر
ن نے کبھی مجھے خاطر میں نہیں لایا ۔ ہم نے اسی اسٹوڈیو میں دو سال
ساتھ کام کیا ۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے اس ساری مُدت میں
ے میری طرف نظر تک نہیں اُٹھائی ۔

ر پھر اسٹوڈیو بند ہوگیا ۔ میں کئی ماہ تک بیکار رہی ۔ ایک روز جبکہ
یو بند ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا ، اچانک میرے

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔

"مِس ریویلی ؟" (Miss Reville)

کسی مہذب مرد آدمی کی آواز نے دریافت کیا ۔

"میں الفریڈ ہچکاک ایک نئی فلم کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر بول رہا ہوں"

آواز بارُعب تھی ۔

"کیا آپ ہماری تصویر کے لئے کٹر (Cutter) کا عہدہ قبول کرلیں گی ؟"

بعد میں ہچکاک نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے دو سال کی مُدت میں اچھی طرح جاننے لگا تھا ، جب کہ ہم دونوں ایک ہی اسٹوڈیو میں کام کیا کرتے تھے ۔ "میں تمہیں ایسے وقت جبکہ تمہاری توجہ میری طرف نہیں ہوتی تھی تقریباً مسلسل تمہیں گھورا کرتا تھا ۔" چونکہ انگریز مرد یہ اعتراف نہیں کرتے کہ عورت کو اس کے مقابلے میں زیادہ اہم عہدہ حاصل رہے ۔ اس لئے ہچکاک نے مجھ سے بات کرنے کے لئے اس وقت تک کا انتظار کیا جب کہ اس کو مجھ سے کہیں زیادہ اہم عہدہ حاصل ہوگیا ۔

ٹیلیفون پر اس پہلی گفتگو کے بعد میں نے ہچکاک کے ساتھ کئی فلموں میں کام کیا ، لیکن ایک بار بھی میں نے ہچکاک کے چہرے کو اس افسانوی اور پُراسرار سکون و درشتی سے خالی نہیں دیکھا ۔ جب میں دوسرے ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا کرتی تھی تو جس دن فلم کی شوٹنگ ہوتی وہ بڑی ہی افراتفری اور ہنگاموں کا دن ہوا کرتا تھا ۔ مگر جب میں نے پہلی بار ہچکاک کے فلم کی شوٹنگ دیکھی تو ہر چیز ٹھیک ٹھاک باقاعدہ اور منظم تھی ۔ اور اس کے ساتھ ہی اعصابی کشیدگی اور وقت کے بچاؤ کیلئے ہچکاک کے ایک اور طریقہ کار کا بھی مجھے علم ہوگیا ۔ یہ طریقہ بالکل سیدھا سادا سا تھا اور وہ یہ کہ ہر چیز کی پہلے سے منصوبہ بندی کرلی جائے ۔ اس نے اپنی فلم کی معمولی سے معمولی تفصیل کو ہفتوں قبل تیار کر رکھا تھا ۔ کیمرے کے رُخ سے لیکر میز پر دستانوں کا جوڑا رکھنے تک اور جب شوٹنگ کا دن آیا تو فلم کا حقیقی کام تو پہلے ہی سے تیار تھا ۔ جس کی وجہ سے نہ صرف کیمرہ مین اور اداکاروں نے خاموشی اور سکون کے ساتھ اپنا کام انجام دیا بلکہ ہچکاک

رالیسی تھی جیسے اس پر غنودگی طاری ہو۔
ل از قبل منصوبے بنا لینے کے باوجود بھی بعض اوقات ہنگامی
را ہو جاتے لیکن، ان کا بھی ہچکاک اسی سکون اور خاموشی کے
بلہ کرتے۔ وہ خوفناک دن مجھے خوب یاد ہے جب ہچکاک کے
، ڈیو اینیل کرین ٹوٹ گیا تھا۔ کرین پر چھ آدمی سوار تھے مگر کسی
دس نہیں کیا کہ کتنا بڑا حادثہ ہو گیا ہے ۔ حتیٰ کہ خود ہچکاک کو
باسد جیسے لہجے میں کہنا پڑا۔
لیا آپ براہ مہربانی اپنا کرین ہٹالیں گے جو اتفاق سے اسوقت
بہ ٹوٹا ہے ؟"
ب ہچکاک کا پیر ٹھیک ہو گیا تو وہ ہمارے ساتھ جرمنی میں آشامل
ں ہمارا دوسرا فلم بن رہا تھا۔ ہم نے اس کو دسمبر میں مکمل کر لیا
یمس کی ایک شام کو ایک چھوٹے سے جہاز پر سوار برطانیہ کو
ہے تھے۔ وہ نہایت سرد و طوفانی رات تھی۔ بڑی بڑی لہریں
ں اور میں سمندر کی اسی کیفیت سے بیمار ہو گئی تھی۔ اسی عالم میں
بن میں زندگی و موت کی پرواکئے بغیر لیٹی ہوئی تھی کہ دروازہ
ہوئی اور پھر ہچکاک اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر بال
سے بکھرے ہوئے تھے اور کوٹ پر سمندر کے پانی کی بوندیں تھیں
ہے پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے کہا۔
لیا تم مجھ سے شادی کروگی ؟"
یں اسقدر شدید بیمار تھی کہ بمشکل تکیہ سے سر اٹھا سکی۔ مگر میں مجبتی
موت اسقدر بیمار نہیں ہوتی کہ وہ ایسے اہم سوال کا مفہوم بھی
۔

راسطرح میں نے اس سب سے پُرسکون انسان سے شادی
راس کے مذاق کے مطابق ایک ایسا گھر سجانے لگی، جو اس
اور خاموش جذبات کے عین مطابق ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے
ے گھر کی سجاوٹ کا تعلق ہے مجھے اپنے گھر کو بھی ہچکاک کی
بیٹ کی طرح صاف ستھرا، منظم اور باقاعدہ رکھنا پڑا۔ یہ کام
تھا کیونکہ ہچکاک کو صفائی کا خبط ہے۔ اس کے الفاظ میں

وہ ایک "ایش ٹرے" (Ash - tray) صاف کرنے والا ہے۔
اور وہ اُس وقت تک اپنا ہاتھ صاف نہیں کرتا جب تک کہ وہ چار تولیوں
سے جیمین دان اور نل کی ٹونٹی کو صاف نہ کر لے۔ لیکن اس کا مطلب
یہ بھی تھا کہ حالات کتنے ہی ناسازگار اور مشکل کیوں نہ ہوں اپنا
توازن اور ذہنی سکون برقرار رکھوں، یہ کام یقیناً مشکل تھا۔

ہماری شادی کے فوری بعد میں نے ہچکاک سے اُس کی خاموشی
اور سکون کا حقیقی راز جاننے کی کوشش کی۔ اس نے جواب دیا۔
"میں ہمیشہ حالات کو اس رُخ سے دیکھتا ہوں، جیسے میں انہیں
تین سال کے بعد یاد کر رہا ہوں"

میں کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس پر ہچکاک نے مجھے سمجھایا کہ اگر
حالات کو اس رُخ سے دیکھا جائے تو بہت سی باتیں تو بالکل یاد نہیں
رہتیں اور جو باتیں مجھے یاد رہتی ہیں وہ عام طور پر مجھے دلچسپ اور مضحکہ خیز
معلوم ہوتی ہیں"

یہ نسخہ درحقیقت مفید بھی ثابت ہوا۔ سوائے ان مواقع کے جبکہ
مجھے اس کی شدید ضرورت تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر گرہستی والی کے لئے کوئی
نہ کوئی ایسا کام ہوتا ہے جس میں وہ کامیاب نہیں ہو پاتی۔ میرے لئے یہ کام
ڈنر پر ہچکاک کا ساتھ انجام دینا ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے وقت جبکہ
ہچکاک ڈنر کے لئے جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ ایسے کسی بھی موقع پر میں
پہلے ہی سے پریشان ہو جاتی ہوں۔ اور بعد کو اپنی غلطی پر کف افسوس
ملتی ہوں۔

ایک شب ہمارے مہمانوں کے واپس لوٹنے کے بعد میں اپنے صوفہ
میں جا دھنسی اور گوشت کے سخت رہ جانے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے
کہا: "مجھ سے یہ نہ کہنا کہ گوشت اچھا تھا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ گوشت
بہت خراب پکا تھا اور میں یہ بھی بھول گئی کہ مادجوری (میگ سیلی) کو
انڈے پسند نہیں، اور مجھے یقین ہے کہ اس نے ضرور خیال کیا ہوگا کہ"...

ہچکاک نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا کہ ــــــ
"الما (ALMA) کیا تمہیں لارڈ میئر کا جلوس یاد ہے ؟"
میں نے اُس کی طرف حیرت اور پریشانی سے دیکھا اور جواب دیا ــــــ

"ہاں مجھے یاد ہے، ویسے لندن کا ہر باشندہ جسے منتخب شدہ کے اعزاز میں ہر سال جو شاندار پریڈ ہوتی ہے، اس سے واقف ہے ......"

ہچکاک نے کہا

"انسان کی زندگی بھی ویسی ہی ہے، یہ لارڈ میئر کا جلوس ہے اگر چہ تم نے مدتوں تک اس کی تراضیع انڈوں کی پڈنگ سے کی اگرچہ انڈے پسند نہیں ہیں ـــــ مگر یہ بات اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ اس شاندار جلوس میں شامل کسی بینڈ بجانے والے کا کسی مخصوص موقع پر کوئی غلط دھن بجانا بینڈ بجانے والا بھی اپنی حماقت کو محسوس کرتا ہے مگر پریڈ پھر بھی جاری رہتی ہے اور اس کے بعد بینڈ بجانے والا بھی جلد ہی اپنی غلطی کو بھول جاتا ہے۔"

مجھے ہچکاک کی یہ معنی خیز اور دلچسپ تشبیہ اتنی پسند آئی کہ میں اس کو آج تک نہیں بھول سکی۔

ـــــ (باقی آیندہ) ـــــ



بیوی: اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟
شوہر: وہی جو تم میری موت کے بعد کرو گی!
بیوی: مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم دوسری شادی ضرور کرو گے!!

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض خوشخط نہ ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ مضامین غیر مطبوعہ روانہ کیجئے۔ مضامین کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھ لیجئے۔ جواب طلب امور کے لئے اپنا نام اور پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور بھیجئے ورنہ ادارہ جواب دینے سے قاصر رہیگا۔ ترجمہ کی صورت میں اصل مضمون نگار کا نام اور دیگر حوالہجات ضرور تحریر کیجئے۔ "ادارہ"

تماشائی

فلموں میں "سس پنس" کا عنصر

کچ سے کئی سال قبل کسی نے اٹلی کے ممتاز ہدایت کار روڈ ریوڈی سیتا
فت کیا تھا کہ :
سپس ٹائپ کی فلمیں بنانا سب میں مشکل کام ہے ؟"
سس پنس فلم تو ڈی سائیکا نے جواب دیا تھا۔
بظاہر یہ جواب حیرت انگیز یا کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے
ں پنس فلمیں بنانے والے فلمساز جانتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست
ہندوستان میں عام طور پر سس پنس فلموں کی کوئی روایات نہیں ہیں
رگھی جتنی سس پنس فلمیں بنتی ہیں انہیں اس ٹائپ کی اعلیٰ درجہ
ہیں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہندوستانی فلمساز
ل اور حرکات پر پوری توجہ نہیں کرتے جن کی وجہ سے کسی فلم میں
پنس کا عنصر پیدا کیا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔
سس پنس کا سیدھا سادا مطلب خوف اور تشویش کی وہ کیفیت
انتظار اور غیر یقینی حالت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی بھی فلم میں
یفیت پیدا کرنے کے لئے فلمساز کو نہ صرف کہانی کے انتخاب بلکہ
ے بعد اسکرین پلے کی تیاری، مکالمہ نویسی، فوٹوگرافی اور فلمسازی کے
ے شعبوں میں بھی نہایت محتاط رہنا پڑتا ہے ورنہ فلم میں سس پنس

کا مطلوبہ عنصر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ سس پنس فلموں کو بھی عام طور پر تین
درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے پہلی فلمیں وہ ہوتی ہیں جن
میں اسرار (Mystery) کے ذریعہ سس پنس پیدا کیا جاتا ہے
ان کی اچھی مثالیں انگریزی فلمیں (VERTIGO) ____ اور ____
(HAUNTED HOUSE) ہو سکتی ہیں۔ دوسری فلمیں وہ
ہوتی ہیں جن میں جرم دسنسنی (Crime + Thrill) کے ذریعہ
سس پنس پیدا کیا جاتا ہے۔ ایسی فلموں کے لئے ____________
____________ یا (North by north west)
(Strangers On Train) کی مثال دی جا سکتی ہے۔
تیسری قسم جو عام طور پر زیادہ مقبول ہے ایسی فلموں کی ہے جن میں،
کرداروں کی نفسیات اور ان کے پس پردہ حرکات کو سس پنس پیدا
کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی ایک کامیاب مثال الفریڈ ہچکاک
کی ایک حالیہ فلم ' PSYCHO ' ہے۔ ہندوستان میں سس پنس کی
فلموں کا یہ فرق بظاہر اتنا واضح نہیں ہوتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی
فلمساز سس پنس فلموں کی ان تینوں اقسام کے فرق کو محسوس کیے بغیر
سس پنس پیدا کرنے کے لئے، ان تمام حربوں سے درست یا غلط

ں مجھے یاد ہے، دہلی سلطان کا ہر باشندہ جسے منتخب شدہ
راز میں ہر سال جو شاندار پریڈ ہوتی ہے۔ اس سے واقف ہوتا

..

ہچکاک نے کہا

انسان کی زندگی بھی ویسی ہی ہے، یہ لارڈ میئر کا جلوس ہے
کہ تم نے مادر جوری کی تواضع انڈوں کی پڈنگ سے کی اگرچہ انڈے
مذہیں ___ مگر یہ بات اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ اس شاندار جلوس
میں شامل کسی بینڈ بجانے والے کا کسی مخصوص موقع پر کوئی غلط دھن بجانا
بینڈ بجانے والا بھی اپنی حماقت کو محسوس کرتا ہے مگر پریڈ پھر بھی جاری
رہتی ہے اور اس کے بعد بینڈ بجانے والا بھی جلد ہی اپنی غلطی کو بھول
جاتا ہے"

مجھے ہچکاک کی یہ معنی خیز اور دلچسپ تشبیہ اتنی پسند آئی کہ میں
اس کو آج تک نہیں بھول سکی۔

___ (باقی آیندہ) ___



بیوی: اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟
شوہر: وہی جو تم میری موت کے بعد کرو گی!
بیوی: مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم دوسری شادی ضرور کرو گے!!

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض خوشخط نہ ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ مضامین غیر مطبوعہ روانہ کیجئے۔ مضامین کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھ لیجئے۔ جواب طلب امور کے لئے اپنا نام اور پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور بھیجئے ورنہ ادارہ جواب دینے سے قاصر رہیگا۔ ترجمہ کی صورت میں اصل مضمون نگار کا نام اور دیگر حوالجات ضرور تحریر کیجئے۔ "ادارہ"

فلموں میں سسپنس کا عنصر

آج سے کئی سال قبل کسی نے اٹلی کے ممتاز ہدایت کار وٹوریو ڈی سیکا سے دریافت کیا تھا کہ :

"کس ٹائپ کی فلمیں بنانا سب میں مشکل کام ہے؟"

"سسپنس فلم" ڈی سیکا نے جواب دیا تھا۔

بظاہر یہ جواب حیرت انگیز یا کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے سسپنس فلمیں بنانے والے فلمساز جانتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر سسپنس فلموں کی کوئی روایات نہیں ہیں جو چند گنی چنی سسپنس فلمیں بنتی ہیں انہیں اس ٹائپ کی اعلیٰ درجہ فلموں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہندوستانی فلمساز عوامل اور محرکات پر پوری توجہ نہیں کرتے جن کی وجہ سے کسی فلم میں سسپنس کا عنصر پیدا کیا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔

سسپنس کا سیدھا سادا مطلب خوف اور تشویش کی وہ کیفیت ہے جو انتظار اور غیر یقینی حالت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی بھی فلم میں ایسی کیفیت پیدا کرنے کے لئے فلمساز کو نہ صرف کہانی کے انتخاب بلکہ اس کے بعد اسکرین پلے کی تیاری، مکالمہ نویسی، فوٹوگرافی اور فلمسازی کے دوسرے شعبوں میں بھی نہایت محتاط رہنا پڑتا ہے ورنہ فلم میں سسپنس کا مطلوبہ عنصر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ سسپنس فلموں کو بھی عام طور پر تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے پہلی فلمیں تو وہ ہوتی ہیں جن میں اسرار (Mystery) کے ذریعہ سسپنس پیدا کیا جاتا ہے اس کی اچھی مثالیں انگریزی فلمیں (VERTIGO) ___ اور ___ (HAUNTED HOUSE) ہو سکتی ہیں۔ دوسری فلمیں وہ ہوتی ہیں جن میں جرم و سنسنی (Crime + Thrill) کے ذریعہ سسپنس پیدا کیا جاتا ہے۔ ایسی فلموں کے لئے ______ North by north west) یا ______ (Strangers on Train) کی مثال دی جا سکتی ہے۔

تیسری قسم جو عام طور پر زیادہ مقبول ہے ایسی فلموں کی ہے جن میں کرداروں کی نفسیات اور ان کے پس پردہ محرکات کو سسپنس پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی ایک کامیاب مثال الفریڈ ہچکاک کی ایک حالیہ فلم "PSYCHO" ہے۔ ہندوستان میں سسپنس فلموں کا یہ فرق بظاہر اتنا واضح نہیں ہوتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی فلمساز سسپنس فلموں کی ان تینوں اقسام کے فرق کو محسوس کئے سسپنس پیدا کرنے کے لئے، ان تمام حربوں سے درست یا

"ہاں مجھے یاد ہے، ویسے لندن کا ہر باشندہ نئے منتخب شدہ میئر کے اعزاز میں ہر سال جو شاندار پریڈ ہوتی ہے، اس سے واقف ہوتا ہے ....."

ہچکاک نے کہا

"انسان کی زندگی بھی ویسی ہی ہے، یہ لارڈ میئر کا جلوس ہے فرض کرو کہ تم نے مارچوری کی تواضع انڈوں کی پڈنگ سے کی اگرچہ انڈے اُسے پسند نہیں ــــ مگر یہ بات اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ اس شاندار جلوس میں شامل کسی بینڈ بجانے والے کا کسی مخصوص موقع پر کوئی غلط دھن بجانا بینڈ بجانے والا بھی اپنی حماقت کو محسوس کرتا ہے مگر پریڈ پھر بھی جاری رہتی ہے اور اس کے بعد بینڈ بجانے والا بھی جلد ہی اپنی غلطی کو بھول جاتا ہے۔"

مجھے ہچکاک کی یہ معنی خیز اور دلچسپ تشبیہ اتنی پسند آئی کہ میں اس کو آج تک نہیں بھول سکی۔

ــــــــــ (باقی آیندہ) ــــ



بیوی: اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟
شوہر: وہی جو تم میری موت کے بعد کرو گی!
بیوی: مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم دوسری شادی ضرور کرو گے!!

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں، بعض اچھے مضامین محض خوشخط نہ ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ مضامین غیر مطبوعہ روانہ کیجئے۔ مضامین کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھ لیجئے۔ جواب طلب اُمور کے لئے اپنا نام اور پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور بھیجئے ورنہ ادارہ جواب دینے سے قاصر رہیگا ترجمہ کی صورت میں اصل مضمون نگار کا نام اور دیگر حوالجات ضرور تحریر کیجئے۔ "ادارہ"

تماشائی

فلموں میں سسپنس کا عنصر

آج سے کئی سال قبل کسی نے اٹلی کے ممتاز ہدایت کار روڈریگوڈی ستیکا سے دریافت کیا تھا کہ :

"کس ٹائپ کی فلمیں بنانا سب میں مشکل کام ہے ؟"

"سسپنس فلم" ڈی سائیکا نے جواب دیا تھا۔

بظاہر یہ جواب حیرت انگیز یا کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے لیکن سسپنس فلمیں بنانے والے فلمساز جانتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر سسپنس فلموں کی کوئی روایات نہیں ہیں اور جو چند گنی چنی سسپنس فلمیں بنتی ہیں انہیں اس ٹائپ کی اعلیٰ درجہ کی فلموں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہندوستانی فلمساز اُن عوامل اور محرکات پر پوری توجہ نہیں کرتے جن کی وجہ سے کسی فلم میں سسپنس کا عنصر پیدا کیا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔

سسپنس کا سیدھا سادا مطلب خوف اور تشویش کی وہ کیفیت ہے جو انتظار اور غیر یقینی حالت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی بھی فلم میں ایسی کیفیت پیدا کرنے کے لئے فلمساز کو نہ صرف کہانی کے انتخاب بلکہ اس کے بعد اسکرین پلے کی تیاری، مکالمہ نویسی، فوٹوگرافی اور فلمسازی کے دوسرے شعبوں میں بھی نہایت محتاط رہنا پڑتا ہے ورنہ فلم میں سسپنس کا مطلوبہ عنصر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ سسپنس فلموں کو بھی عام طور پر تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے پہلی قسم میں وہ ہوتی ہیں جن میں اسرار (Mystery) کے ذریعہ سسپنس پیدا کیا جاتا ہے اس کی اچھی مثالیں انگریزی فلمیں (VERTIGO) ____ اور ____ (HAUNTED HOUSE) ہو سکتی ہیں۔ دوسری فلمیں وہ ہوتی ہیں جن میں جرم و سنسنی (Crime + Thrill) کے ذریعہ سسپنس پیدا کیا جاتا ہے۔ ایسی فلموں کے لئے ____ (North by north West) یا ____ (Strangerson Train) کی مثال دی جا سکتی ہے۔

تیسری قسم جو عام طور پر زیادہ مقبول ہے ایسی فلموں کی ہے جن میں، کرداروں کی نفسیات اور ان کے پس پردہ محرکات کو سسپنس پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی ایک کامیاب مثال الفرڈ ہچکاک کی ایک حالیہ فلم " PSYCHO " ہے۔ ہندوستان میں سسپنس کی فلموں کا یہ فرق بظاہر اتنا واضح نہیں ہوتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی فلمساز سسپنس فلموں کی ان تینوں اقسام کے فرق کو محسوس کیے بغیر سسپنس پیدا کرنے کے لئے، ان تمام حربوں سے درست یا غلط

طریقہ پر استفادہ کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں فلم نہ تو نفسیاتی سسپنس کی حامل رہتی ہے نہ جرم و سنسنی کی فلم۔

سسپنس فلموں کے متعلق مزید کسی بحث سے قبل یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ ایک خود ساختہ فلمی کہانی نویس بمبئی کے ایک فلمساز کے پاس پہونچا اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ایک سسپنس فلم کی کہانی لایا ہے فلمساز پہلے تو اسے تعجب سے دیکھتا رہا، پھر بڑی مشکل سے اس نے کہانی سننے پر آمادگی ظاہر کی۔ کہانی نویس نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی کہانی شروع کی:

"ہُو کا عالم ہے اور چاروں طرف سناٹا طاری ہے..... اچانک گھنٹے بجنے کی آواز آتی ہے"

"دیکھیے سسپنس شروع ہو گیا" کہانی نویس کے اس ریمارک پر فلمساز جھلا گیا اور پوچھا:

"بھلے آدمی اس میں سسپنس کیا ہے؟"

کہانی نویس نے جواب دیا "یہی سسپنس کہ اب کتنے گھنٹے بجیں گے اور اس کے بعد یہ سسپنس کہ اگر (۱۲) بجے ہیں تو یہ دن کے ہیں یا رات کے"!

ظاہر ہے کہ جہاں سسپنس کا تصور یہ ہو وہاں اچھی سسپنس فلمیں کس طرح بن سکتی ہیں۔!

سسپنس پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فلم کے عام واقعاتی بہاؤ کے ذریعہ تماشائی کی ذہنی کیفیت کو اس مخصوص حالت میں لایا جائے جہاں وہ کسی خاص اور اہم واقعہ کا منتظر ہو جائے، خواہ وہ واقعہ کوئی خطرناک جُرم ہو یا کسی کردار کی آمد یا کوئی حادثہ۔ جب تماشائی اس کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے اور اس انتظار میں اسطرح طوالت پیدا کی جائے کہ تماشائی اُکتا نہ جائے اور اس کے اشتیاق میں کمی نہ ہو تو اسطرح سسپنس کا حقیقی تاثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ الفریڈ ہچکاک نے "سائیکو" میں بھی یہی طریقہ استعمال کیا تھا۔ انتھونی پرکنس کے پُر اسرار مکان میں جب ایک موت واقع ہو جانے کے بعد سراغرساں اس کی تحقیقات کے لئے وہاں پہونچتا، اور دبے پاؤں اس پُر اسرار خالی مکان میں داخل ہوتا ہے تو تماشائی فوراً کسی اہم واقعہ یا حادثہ کا منتظر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہچکاک اس واقعہ کو ٹالتا رہتا ہے۔

سراغرساں پوری احتیاط کے ساتھ گھر کی تلاشی کا عمل شروع کر دیتا ہے اس تمام عرصے میں تماشائی پر سسپنس کی ایسی کیفیت طاری رہتی ہے، جس کو رونگٹے کھڑا کر دینے والی یا اعصاب میں کشیدگی پیدا کرنے والی کہا جا سکتا ہے سسپنس کا ایسا گہرا تاثر پیدا کرنے میں کامیابی کی وجہ سے ہی تماشائی اس کیفیت کے طوالت اختیار کرنے کے باوجود بور نہیں ہوتا۔ بالآخر سراغرساں دوسری منزل پر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیتا ہے اور اس کے ہر سیڑھی پر چڑھنے کا عمل، تماشائی کے سسپنس کو مزید گہرا کرتا ہے۔ بالآخر وہ واقعہ پیش آ جاتا ہے..... جس کا تماشائی اتنی دیر سے منتظر تھا..... یعنے قاتل اچانک پیچھے سے حملہ آور ہوتا ہے۔ اس سارے منظر اور مجموعی تاثر کے لئے فلم کا کہانی نویس ذمہ دار نہیں، بلکہ یہ صرف منظرنامہ لکھنے والے اور ہدایتکار کا کمال ہے۔ ہچکاک کی فلموں میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں، جن میں اس نے چھوٹے چھوٹے واقعات سے استفادہ کر کے سسپنس کی بڑی گہری کیفیت پیدا کی ہے۔ شاید اسی لئے اس کو "ماسٹر آف سسپنس" کہا جاتا ہے۔

امریکہ میں کچھ عرصہ قبل یہ بحث بھی شروع ہوئی تھی کہ ایسی سسپنس فلمیں بنانا اور تماشائیوں کی مخصوص ذہنی کیفیت یا لمحاتی کمزوری سے استفادہ کر کے انہیں دہشت زدہ کر دیں، صحت مند فعل ہے یا نہیں؟ اس بحث میں ایسی سسپنس فلمیں دیکھنے والے کمزور تماشائیوں پر ان کے امکانی نفسیاتی اثرات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا اور ایک نقطہ یہ تھا کہ ایسی فلمیں ان کے اعصاب کو مزید کمزور بنا دیں گے۔ اس سائنسی اور نفسیاتی نوعیت کی بحث میں اُلجھے بغیر، اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر سسپنس فلمیں بنانا ہی ہے تو، اسطرح بنانا چاہیئے کہ وہ واقعی سسپنس فلم کہلائی جا سکے اور "چوں چوں کا مربہ" بن کر نہ رہ جائے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہاں حالیہ عرصہ میں سسپنس فلم بنانے کی پہلی دیانتدارانہ کوشش فلم "نگینہ" کے ذریعہ کی گئی۔ اس فلم میں تہہ خانے میں قید، ایک پُراسرار بوڑھے اور اس کے ارد گرد بنے ہوئے اسرار و سنسنی کے جال کے ذریعہ سسپنس کا تاثر پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ اس کے بعد موتی محل، لال کنور محل، اپرادھی کون، بیس سال بعد، وہ کون تھی، کہرا، وغیرہ میں بھی ایسی

شش کی گئی۔ ان میں سے اکثر فلمیں یا تو انگریزی فلموں کا چربہ تھیں یا کم از کم ان کے اکثر حصے، انگریزی فلموں کی نقل تھے۔ بمل رائے کی فلم "مدھومتی" کا آغاز بھی اسرار و سنسنی کی ایک فلم جیسا ہوتا ہے، آگے چل کر وہ محبت کی ایک عام کہانی بن جاتی ہے جس میں تناسخ کی بات اور آواگون کے عقیدے کو استعمال کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں، سسپنس فلمیں بنانے کی کوشش کے عام طور پر کامیاب نہ ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ یہاں فلم میں سسپنس کے عنصر کو یا تو ضروری اہمیت نہیں دی جاتی یا پھر اتنی اہمیت دیدی جاتی ہے کہ تماشائی اس سے بیزار ہو جاتا ہے۔ "موتی محل" ایک اچھی سسپنس فلم ہونے کے باوجود اپنے درمیانی حصے میں ایک عام محبت کی کہانی بن کر رہ گئی ہے، اسکے مقابلہ میں نئی فلم "کہرا" ہے، جس میں سسپنس پیدا کرنے کے لئے موقع بے موقع ایسے حربے استعمال کئے گئے ہیں کہ سسپنس کا تاثر ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک تماشائی نے تو فلم دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ "فلم ختم ہو گئی لیکن سسپنس ابھی ختم نہیں ہوا"۔ اتنی مضحکہ خیز حد تک سسپنس پیدا کرنے کی کوشش بھی فلم کے لئے یقیناً نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

ہندوستانی فلمسازوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ ان کی فلموں میں عشق و محبت کا عنصر ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے وہ خالص سسپنس کی فلمیں نہیں بنا سکتے۔ ممکن ہے کہ باکس آفس پر فلموں کی کامیابی کی حد تک یہ بات درست ہو۔ لیکن ہندوستان میں خالص سسپنس فلمیں بنانے کے تجربات بھی کئے گئے ہیں اور وہ بے حد کامیاب رہے ہیں۔ ان میں ایک اہم مثال بی۔ آر۔ چوپڑا کی فلم "قانون" کی ہے۔ یہ فلم اگرچہ بنیادی طور پر ایک کورٹ روم ڈرامہ تھی، لیکن فلمساز نے سسپنس کے حربے کو اسطرح استعمال کیا تھا کہ آخر تک تماشائی فلم میں کھویا رہتا اور اسے ہر لمحہ کسی نئے واقعہ کا انتظار رہتا۔ اسی طرح بی۔ آر چوپڑہ کی نئی فلم "گمراہ" بھی ہے جو باکس آفس پر بھی بے حد کامیاب رہی۔ اس فلم میں عورت کے اپنے ازدواجی تقدس کو برقرار رکھنے کے لئے گھر کی چاردیواری سے قدم باہر نہ نکالنے یا "غیر مردوں" سے دور رہنے کا جو قدامت پسند نقطۂ نظر پیش کیا گیا تھا اس سے شاید بہت کم تماشائی اتفاق کر سکیں۔ اس کے باوجود اس فلم نے بہت زیادہ کامیابی حاصل کر لی، ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں گنہگار بیوی کو اپنے گناہ کا راز فاش ہو جانے کے خوف اور آخر میں تعاقب کے منظر کے ذریعہ سسپنس کا بڑا حقیقی اور گہرا تاثر پیش کیا گیا تھا، یہ دراصل ہدایتکار کی ذہانت اور چابکدستی کا کمال ہی تھا کہ اس نے آخر میں تعاقب کے منظر کو کافی طویل کیا اور اس کے باوجود اسمیں سسپنس کا ایسا عنصر باقی رکھا کہ فلم حقیقی معنوں میں سسپنس ڈرامہ نہ ہوتے ہوئے بھی عام فلموں سے مختلف نظر آنے لگی اور شاید یہی اس فلم کی کامیابی کی وجہ تھی۔

جرائم کی فلموں میں عام طور پر جو سسپنس پیدا کیا جاتا ہے وہ لمحاتی نوعیت کا ہوتا ہے بالخصوص ہندوستان میں تو جرائم کی فلمیں بھی اسی فارمولا کی بنیاد پر تیار کیجاتی ہیں کہ حیرت زدہ ہونے یا کسی واقعہ کے منتظر رہنے کے بجائے تمام واقعات کا قبل از قبل اندازہ کر لینا ممکن ہوتا ہے۔ جرائم کی ایسی فلموں میں زیادہ تر دو مواقع کو سسپنس پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلا تو ارتکاب جرم کا موقع اور دوسرا مجرم کی تلاش یا تعاقب کے مناظر۔ حالانکہ ایسی فلموں میں ڈائرکٹر کی تھوڑی سی کوشش اور (Craftsman Ship) پوری فلم میں سسپنس کا تاثر پیدا کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں پھر ایک بار الفرڈ ہچکاک ہی کی ایک فلم —— (The Rope) کی مثال دینی پڑیگی۔ اس فلم میں جرم (قتل، تماشائیوں کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ تماشائی مجرم کو جانتے ہیں وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ قتل کو کس طرح پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود بھی آخری لمحہ تک سسپنس برقرار رہتا ہے۔ ہچکاک نے اس فلم میں جرم کے افشا کے طریقہ کار کو سسپنس پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا تھا اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔

ہندوستان میں ایسی کامیاب سسپنس فلمیں کیوں نہیں بنائی جاتیں یہ یقیناً غور طلب سوال ہے۔ اگر ہندوستانی فلمساز محض رکتے رکتے قدموں کی چاپ گھنگھروؤں کی آواز، مکڑی کے جالوں اور دروازوں کے چرچراتے ہوئے کھل جانے کی آواز کو سسپنس سمجھنا چھوڑ دیں تو شاید وہ کامیاب سسپنس فلمیں بنا سکیں ہندوستانی فلمساز سسپنس فلمیں بنائیں یا نہ بنائیں، قارئین شاید اب مزید سسپنس برداشت نہ کر سکیں۔ اس لئے اس مضمون کو یہاں ختم کر دینا بہتر ہے۔

▲

پونم کے خطوط

کا پہلا شمارہ اہلِ قلم حضرات کی نظر میں

○ سلام مچھلی شہری ۔ دہلی

" پونم کا پہلا شمارہ ملا ۔ میں نے پڑھا اور پسند کیا ۔ خدا کرے آپکی ادارت میں یہ جریدہ ترقی کرتا رہے ۔ مستقل فیچر 'ہمارے مسائل' کے تحت اُردو شاعری میں نئے تجربات کے موضوع پر' دونوں حضرات کے خیالات کافی فکر انگیز ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر آپ چند اور ادیبوں کے خیالات شائع فرمائیں ۔ ابھی قدرے تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ آپ نے جو سوال اُٹھایا ہے بہت اہم ہے ۔ ہمیں نئی نسل کے حق میں بات کرتے وقت بھی بہت زیادہ جذباتی نہیں ہونا چاہیئے ۔"

○ کوثر چاندپوری ۔ بھوپال

" آپ نے پرچہ بہت اچھا نکالا ہے ، ظاہری حیثیت سے بھی حد درجہ دلکش اور جاذبِ نظر ہے اور معنوی حیثیت سے بھی حُسن و جمال کا حامل ہے ۔ اُمید ہے کہ آپ اسی توجہ اور محنت سے رسالہ پابندیٔ وقت کے ساتھ نکالتے رہیں گے ۔ مجھے اُمید ہے کہ پہلے ہی قدم پر آپ کو جو فن کار مل گئے ہیں ، آپ کو ان کا تعاون ہمیشہ حاصل رہے گا ۔"

○ ڈاکٹر سلام سندیلوی ۔ گورکھپور

" آپ کا ماہنامہ 'پونم' ملا ۔ نہ جانے کتنی دیر تک اس کے ٹائٹل پیج کے مناظر میں غرق رہا ۔ جب ہوش آیا تو اندر کی تخلیقات پر نظر ڈالی ۔ غزلیں ، نظمیں ، افسانے ، اور طنز و مزاح سبھی معیاری ہیں ۔ میری دُعا ہے کہ 'پونم' کی کرنوں سے اُردو ادب کی سرزمین زیادہ سے زیادہ روشن ہو ۔"

○ حامدی کاشمیری ۔ سری نگر

" پونم کا پہلا شمارہ ملا ۔ پرچہ دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی ۔ آپ نے اچھے مواد کو خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے ۔ رسالہ کی ترتیب و تزئین سے آپ کی محنت اور خلوص کا اندازہ ہوا ۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں ۔ ایک تازہ نظم پونم کے لئے ارسال کر رہا ہوں ۔ کوئی نیا افسانہ لکھوں گا تو آپ کی نذر کروں گا ۔"

○ عزیز تمنائی ۔ مدراس

" دلی مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ نے رسالہ اس اہتمام کے ساتھ نکالا ۔ کتابت ، طباعت ، مندرجات ، گٹ اَپ ، ہر چیز سے جی خوش ہوا ۔ خدا کرے پونم ہر ماہ اپنی بھرپور آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا رہے ۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے ہر مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرنے کی پُرخلوص کوشش کی ہے ۔ یہ بڑی اچھی بات ہے ۔ اس سے آپ کے رسالہ پر کوئی خاص لیبل نہ لگے گی اور اہلِ قلم بلا تکلف آپ کی محفل میں شریک ہوں گے ۔ علاوہ ازیں قارئین کو بھی یک رنگی کی اُکتاہٹ محسوس نہ ہوگی ۔ مجھے خوشی ہے کہ پہلے ہی شمارے نے پونم کو موجودہ رسائل میں ایک ممتاز حیثیت دلائی ہے ۔ خدا آپ کو مزید کامرانیاں نصیب کرے ۔"

○ نریش کمار شاد ۔ دہلی

" پُونم کا پہلا شمارہ موصول ہوا ۔ پرچہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے "

○ نثار احمد فاروقی ۔ دہلی

" پُونم کا پہلا شمارہ ملا ۔ اچھا ہے خدا نظرِ بد سے بچائے حیدرآباد تو اُردو کا گہوارہ اور گڑھ ہے ، آج بھی اسے مرکز کی حیثیت حاصل ہے ۔ آپ اپنے رسالہ کو اگر ذرا سا مُنفرد بنانا چاہیں تو یہ پُرانا ڈھرّا چھوڑ دیجئے ۔ اسے حیدرآباد کی ادبی ، ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کا آئینہ بنائیے ۔ ماضی کا بھی اور حال کا بھی ۔ حیدرآباد کی تمام علمی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں دلچسپ اور معلوماتی مضامین شائع کیجئے ۔ حیدرآباد کے شعراء کا تعارف کرائیے ، پُورے اعتماد کے ساتھ بغیر کسی معذرت کے ، وہاں کی انجمنوں ، اداروں اور کتب خانوں کی سرگرمیوں کا حال لکھیئے ۔ وہاں کی تہذیب اور ثقافت پیش کیجئے ۔ بڑے لکھنے والوں کے پیچھے نہ بھاگیئے ، یہ سب اُونچی دوکان اور پھیکے پکوان والے ہیں ۔ آپ اپنے گھر کی دولت سے کیوں غافل رہیں ۔ یقین کیجئے کہ اگر آپ یہ کام کر سکیں تو مستقبل کے مورخ کے لئے آپ بہت قابلِ قدر مواد چھوڑ جائیں گے "

○ قیصر تمکین ۔ دہلی

" اتنا خوبصورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے پُرخلوص مبارکباد جب پہلا شمارہ اتنا پاکیزہ اور اچھے مواد سے بھر پُور ہے تو یہ اُمید کرنا بالکل فطری بات ہے کہ آپ کی کوششیں اس کے معیار میں برابر اضافہ کرتی رہیں گی "

○ ستیہ پرکاش شوق ۔ دہلی

" پرچہ بے حد پسند آیا ۔ حصہ نظم ونثر دونوں ہی جاندار ہیں اور اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ میری دعائیں ہمیشہ پُونم کے ساتھ ہیں ۔ ' اُردو شاعری میں نئے تجربے ' اور کوہن کے قلم سے ، کا جواب نہیں "

○ یوسف ناظم ۔ بمبئی

" پونم کی رُونمائی ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوا کہ جو چاند سی بیٹی آپ کے گھر پیدا ہوئی ، میرے یہاں بیاہ کر آگئی ــــــ اور بہُو کی صرف تعریف کی جاسکتی ہے ۔ آپ نے پُونم شائع کر کے کمال کر دیا ۔ سرکس کا کمال نہیں بلکہ واقعی کمال ۔ حیدرآباد تو ادبی رسالوں کا گھر رہا ہے اور تاریخ شائد پھر اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے ۔ اس بات کا خیال رکھیئے کہ ادبی رسائل جس تیزی سے نکلتے ہیں اس سے زیادہ تیزی سے بند ہو جاتے ہیں لیکن پہلا شمارہ دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے اسے بند کرنے کے لئے نہیں نکالا ہے ' ــــــ ایک بات پُوچھوں ــــــ اس پرچہ میں کتابت کی غلطیاں کیوں نہیں ہیں ؟ یہ پرچہ تو یہ بھی اُردو ہی کا ہے "

○ اختر سلیم آبادی ۔ لکھنؤ

" پُونم ملا ۔ شکریہ ۔ افسانہ روانہ ہے ۔ میری اپنی زندگی کی ایک جھلک ہے ۔ پُونم کو یہ میرا عطیہ ہے قبول کیجئے ۔ اُمید ہے کہ نقش ثانی اول سے کہیں زیادہ حسین ہوگا اور اسطرح پُونم ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا ۔ خاص طور پر کتابت معیاری ہے "

○ راجہ مہدی علیخاں ۔ بمبئی

" پُونم نظر نواز ہوا ۔ ماشاءاللہ رسالہ صُوری و معنوی اعتبار سے بہت خوب ہے ۔ خاص طور پر ٹائٹل بے حد حسین ہے ۔ واقعی یہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ ویسے حیدرآباد ایک عرصے سے اُردو کی جو خدمت کر رہا ہے وہ واقعی قابلِ صد ستائش ہے ۔ خدا کرے پُونم خُوب سے خُوب تر صورت میں سامنے آتا رہے "

○ محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء ۔ ناگپور

" پُونم کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا ، اس کے نام میں جو آب و تاب لطف اور ٹھنڈک ہے ' وہی اس کے مضامین نظم ونثر میں پائی ۔ آپ کی کامیاب ادبی کاوشات پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔ امید ہے کہ اس پُونم کی تابانی موجودہ " لسانی اندھیروں " کو دُور کرنے میں مددگار ثابت ہوگی "

○ عشرت قادری ۔ بھوپال

"پونم بہت ہی پیارا رہا ۔ کتابت، طباعت، ترتیب ہر چیز بڑا سلیقہ ہے، پرچہ نکالنے کا آپ کو کتنا اچھا تجربہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے "پونم" میرے برسوں کے خواب کی تعبیر ہے، میں شروع بالکل ایسا ہی بنانے میں ایک عرصے سے کوشاں ہوں، مگر کچھ تی پریشانیاں اسطرح دامنگیر رہتی ہیں کہ اس طرف مکمل طور پر توجہ دے پاتا۔ بہرحال پونم کے اجرا سے مجھے واقعی دلی مسرت ہوئی ہے

○ سید حرمت الاکرام ۔ مرزاپور

"پونم کا شمارۂ اول نظر نواز ہوا ۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ بلاشبہ نم کے صفحات اچھے مواد کے حامل ہیں اور اس کی ظاہری ہیئت میں جاذبیت و دلکشی بھی پائی جاتی ہے جو رسائل کی کاروباری اہمیت فروغ دینے کے لئے لازمۂ صحافت بن چکی ہے ۔ آپ نے اچھے لکھنے الوں کا تعاون حاصل کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس فہرست میں خوشگوار اضافہ ہوتا رہے گا ۔ جس کی ابھی بہر اعتبار ضرورت ہے ۔

○ رئیس نجمی ۔ امروہہ

"پرچہ کو معیاری بنانے کے لئے آپ نے جو تخلیقات فراہم کی ہیں، وہ سب ہی معیاری ہیں ۔ کسی جریدہ کی ادبی حیثیت قائم کرنے کے لئے جس مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب ہی میں نے "پونم" میں پایا ۔ خدا آپ کے ارادوں کو ہمیشہ جوان رکھے ۔ میں نے اور چند اہل قلم حضرات کو "پونم" کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ مجھے خاص طور پر افسانوی حصے میں تنویر تمکین کی کونپل، نامۂ ابوالحسن کا دمدہ پسند آیا اور حصۂ نظم میں شفا گوالیاری، راز یوسفی، مد ضیا فتح آبادی نے متاثر کیا۔"

○ نسیم درانی ۔ کراچی

"ماہنامہ پونم کا پہلا شمارہ ملا ۔ آپ نے بڑا خوبصورت پرچہ شائع کیا ہے ۔ حیدرآباد سے ایک اچھے پرچے کے اجرا پر مبارکباد قبول فرمائیں۔"

○ رضا الجبار ۔ بمبئی

"پونم" کا یہ پہلا شمارہ دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی، ٹائٹل پیج، ترتیب، کتابت، لکھنے والے، غرض پرچے کے کسی گوشے پر کوئی جھول نہیں ہے ۔ پونم آپ کی صلاحیتوں اور کاوشوں کا آئینہ دار ہے ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ پہلا شمارہ نظر نہیں آتا ۔ پہلے ہی قدم پر یہ جست مار کر پونم بن گیا ہے ۔ مجھے توقع ہی نہیں بلکہ میں آپ سے امیدیں وابستہ کیے بیٹھا ہوں کہ آپ اس کے معیار کو کسی قدر بھی کسی قیمت پر نہیں گرائیں گے بلکہ بتدریج بلند سے بلند تر بنائیں گے میں ایسے پرچے کے لئے ضرور لکھوں گا ۔ میرے لئے انتہائی خوشی کا باعث ہوگا۔"

○ محمد مسیح الزماں امروہوی ۔

"سب سے پہلے تو پونم کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے پرچہ صوری و معنوی اعتبار سے بہت خوب ہے ۔ جس کا آغاز اتنا اچھا ہو اس کی انتہا ——— نقشِ ثانی، نقشِ اول سے زیادہ اچھا ہوگا ۔ جہاں ادبی جریدے دم توڑ رہے ہیں، وہاں پونم کی اشاعت اچھا شگون ہے۔"

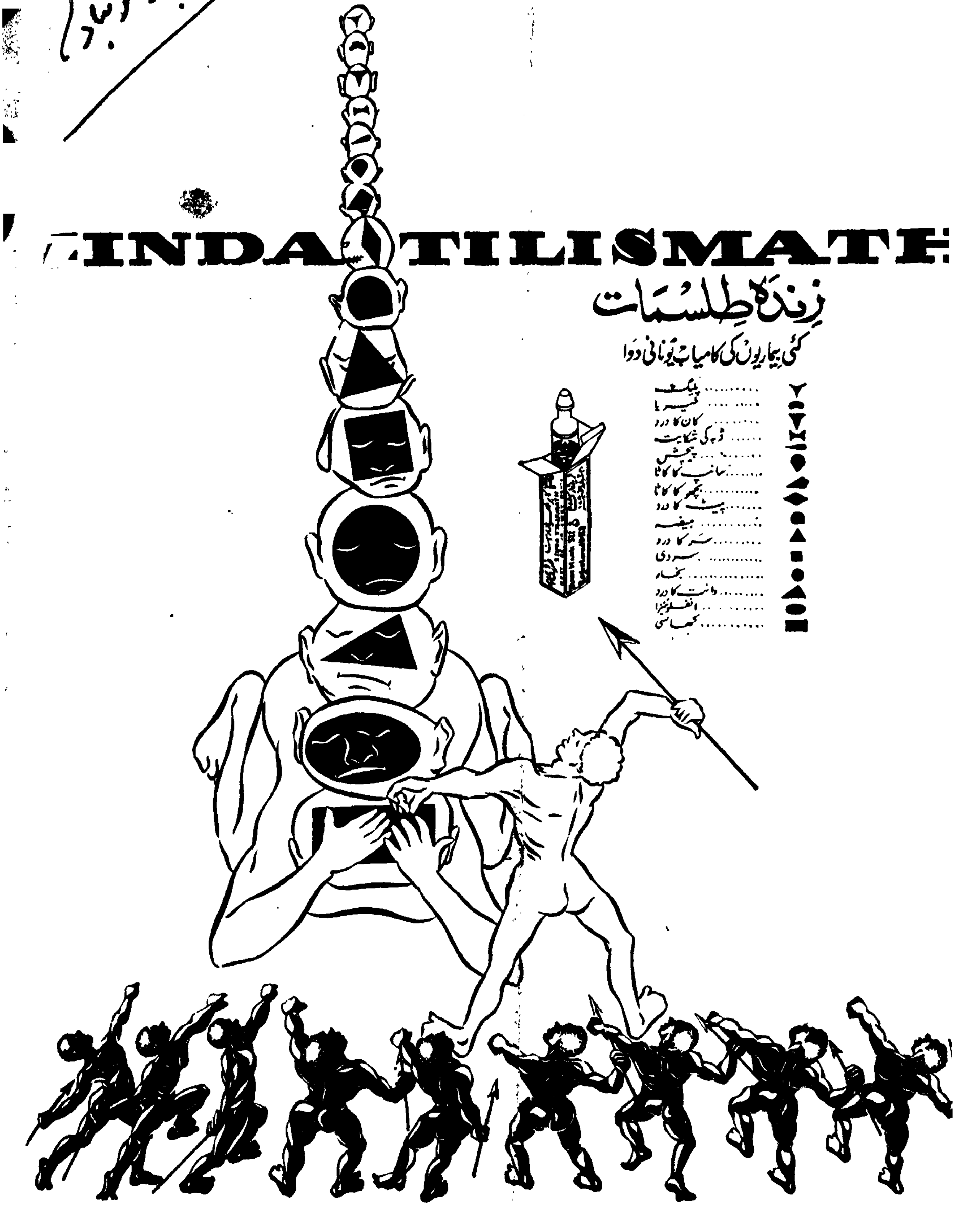
○ افتخار احمد اقبال ۔ حیدرآباد

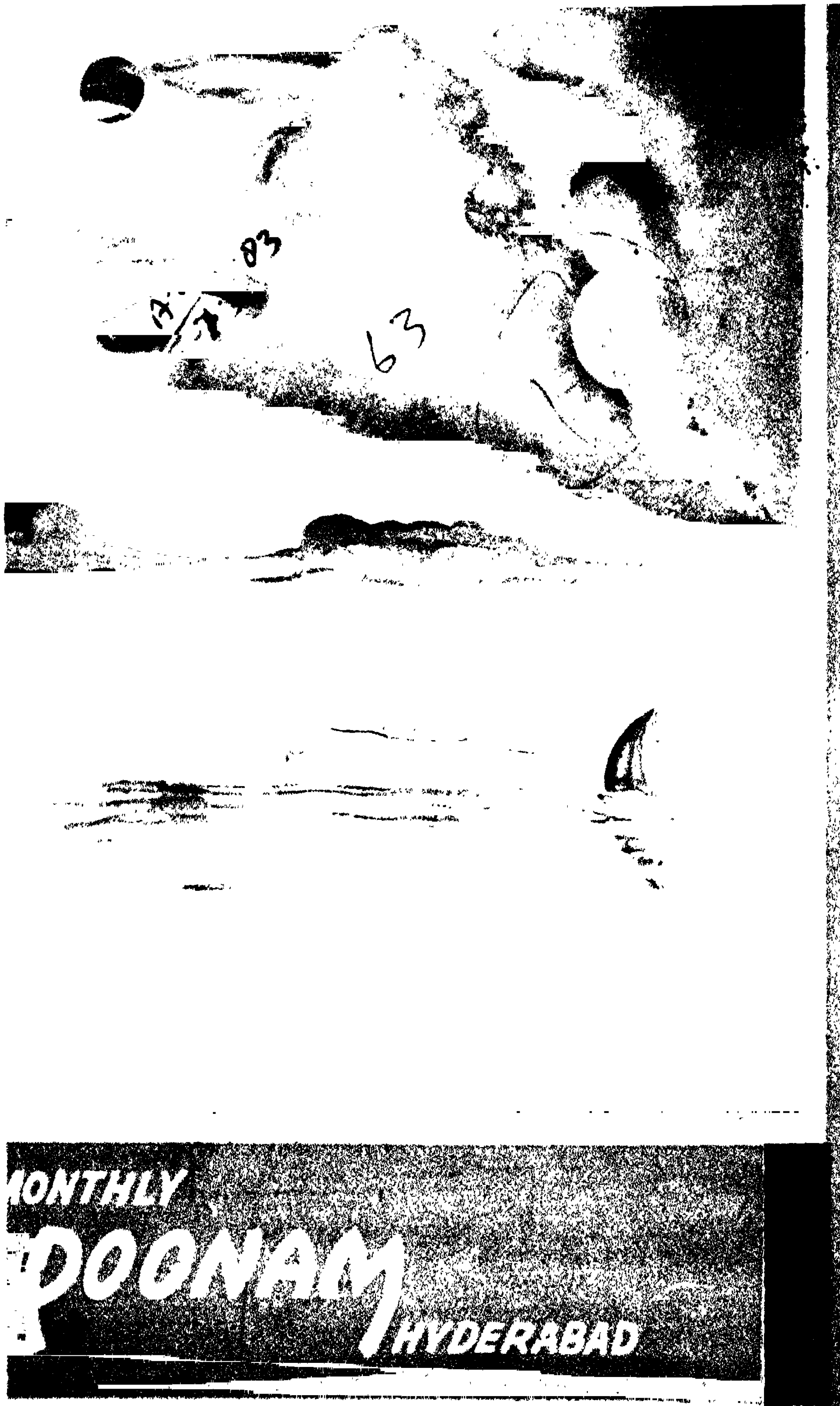
"پونم کے نقشِ اول کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ میں آپ کی جرأتِ رندانہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس دورِ انتشار میں آپ نے اردو کی خدمت کے جذبۂ صادق کے ساتھ، اتنا خوبصورت پرچہ نکالا ہے ۔ مانو 'پونم' کا چاند بدلیوں سے نکل آیا ۔ سرورق دیکھ کر مجھے تو یہی احساس ہوا ۔ جب مضامین پڑھے تو خاصے تھے ۔ حسنِ کتابت و طباعت نے بھی اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے ۔ بہرحال میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے اچھے رسالوں کی جو کمی گذشتہ کئی برسوں سے محسوس ہو رہی ہے، پونم کا اجرا، کسی حد تک اس کو پورا کرے گا خدا آپ کو اس کام میں بھی ناصر و کامران کرے۔"

Regd No.
H: 470

OONAM MONTHLY
AZAMPURA, HYDERABAD-A.P.

JU
19





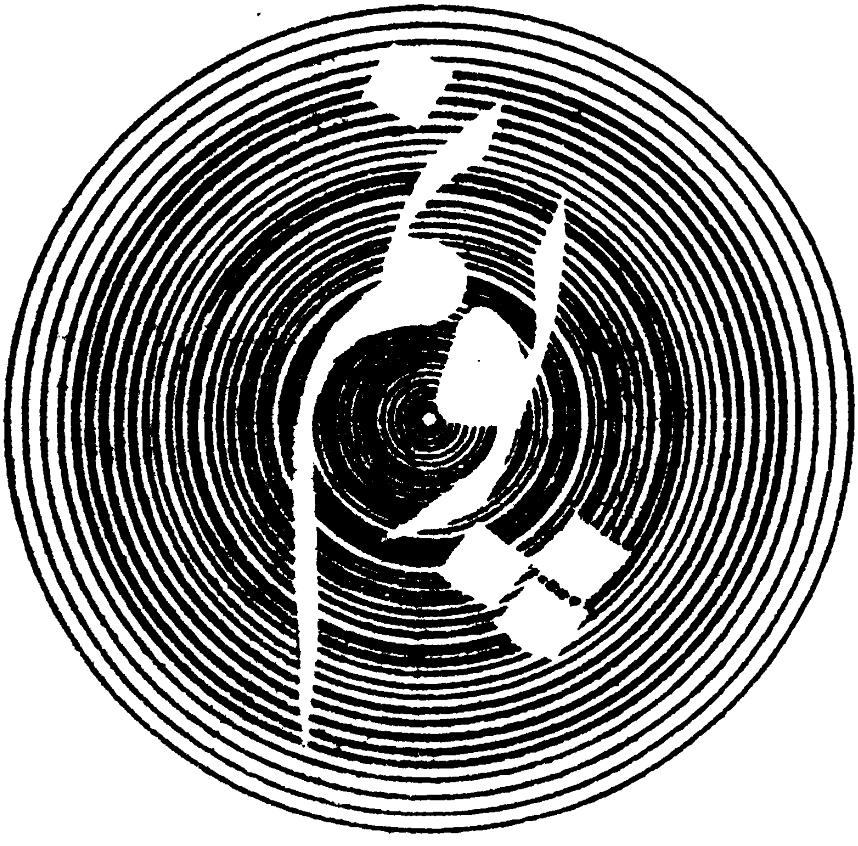
50 NP

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ پُونم
20-7-301
اعظم پورہ۔ حیدرآباد ۱-۲

قیمت فی پرچہ (۵۰) پیسے
زرِ سالانہ (۶) روپے
ششماہی (۳) روپے
بیرونِ ہند سے (۱۲) شلنگ

مُدیر
ناصر کرنولی ایم۔ اے عثمانیہ

جلد (۱)



شمارہ (۳)

جُولائی
۱۹۶۴

کتابت: محمد عبدالسلام خوشنویس
طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد۔ فون: (۴۵۸۷۳)

ترتیب

برتیں ـــــــ ادارہ ـــــ ۳
اردو، قومی یک جہتی کی آئینہ دار ـــــ پنڈت نہرو ـــ ۵
مولوی محمد اسماعیل میرٹھی ـــــ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ـــ ۷
ظریف لکھنوی کا تصورِ مزاح ـــــ پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی ـــ ۱۳
شکارنامہ حضرت بندہ نوازؒ کی توثیق ـــ نصیرالدین ہاشمی ـــ ۱۶

ـــ ہمارے مسائل ـــ مستقل فیچر ـــ
اردو شاعری میں نئے تجربے ٭ خلیل الرحمٰن اعظمی ٭ دانش فرازی ـــ ۱۹

غزلیں
ماہر القادری ـــ شفا گوالیاری ـــ ۲۱
خلیل الرحمٰن اعظمی ـــ شہریار ـــ ۲۲
محمد منشاالرحمٰن خاں منشا ـــ حُرمت الاکرام ـــ ۲۳
علی احمد جلیلی ـــ تابش اکرامی ـــ ۲۴

ـــ افسانے ـــ
سلوٹیں ـــ ایک تاثر ـــ جوگندر پال ـــ ۲۵
کرتب ـــ نریش کمار شاد ـــ ۲۹
ٹرنک کال ـــ راز یوسفی ـــ ۳۱
کرٹر کا اصلی تیل ـــ عاتق شاہ ـــ ۳۵

نظمیں
نہرو ـــ مخدوم محی الدین ـــ ۴۰
آہٹیں ـــ ڈاکٹر عزیز تمنائی ـــ ۴۱
آخری منزل ـــ محمود ایاز ـــ ۴۱
آئینہ ـــ حمید کاشمیری ـــ ۴۲
کشمکش، سکون ـــ پروفیسر اختر بخی ـــ ۴۳
درپن ـــ نصیر پرواز ـــ ۴۴

ـــ طنز و مزاح ـــ
زعفران زار ـــ مستقل فیچر ـــ کوہکن ـــ ۴۵
مومن کا بُت کافر ـــ یوسف ناظم ـــ ۴۶
کچھ شوٹنگ کے بارے میں ـــ وقار لطیف ـــ ۵۱
کمندیں ـــ مستقل فیچر ـــ بشیر اسد ـــ ۵۴

ـــ صنم کدے ـــ
شوہرِ نامدار ہچکاک ٭ الما ہچکاک ٭ ترجمہ: سلیم الدین ـــ ۵۶
ہندوستانی صنعتِ فلمسازی، ایک جائزہ ٭ نوشتہ انگریزی: جوگندر پال، ترجمہ: احسن علی مرزا ـــ ۶۰
آئینے ـــ (تبصرہ) ـــ مغنی تبسم ـــ ۶۳
عکسِ مہتاب ـــ خطوط ـــ ۶۴

پونم میں شائع ہونے والے تمام ادبی نیم ادبی مواد میں نام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں، ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ناصر کرنولی نے اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ پونم، اعظم پورہ ۳۰۱-۷-۱۶ حیدرآباد (اے پی) سے شائع کیا

کِرنیں

پُونم جولائی سنہ ۱۹۶۴ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے، جو شعری و ادبی تخلیقات کے معیار اور تنوع کے ذریعہ آپ کے ذہن و نظر کی تسکین اور ادبی ذوق کی طمانیت کا سامان فراہم کرنے میں یقیناً کامیاب رہے گا۔

پُونم کے دوسرے شمارے کا اہلِ ذوق حلقوں میں جس خلوص سے خیر مقدم کیا گیا اس نے ہمارے حوصلے بڑھا دیئے ہیں۔ اکثر ایجنٹوں نے پُونم کی غیر معمولی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے آیندہ شمارے کی مطلوبہ کاپیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے، جو ادارہ کے حق میں نیک شگون ہے۔ پُونم کا معیار و مزاج اور قارئین کی دلچسپ اور ادبی ذوق کی یہ خوشگوار ہم آہنگی اگر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہے تو مستقبل قریب میں پُونم کو ہندوستان کے ادبی رسالوں میں منفرد حیثیت حاصل ہو جائے گی۔

ہمارے مسائل کے مستقل فیچر کے تحت "اُردو شاعری میں نئے تجربے" کے سلسلے کے مضامین کو ادبی حلقوں نے بیحد پسند کرتے ہوئے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ اس موضوع پر ہند و پاک کے ایسے شاعروں اور ادیبوں سے بھی لکھوایا جائے، جو ان دنوں اُردو شاعری میں اس قسم کے نئے تجربے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، تاکہ اس موضوع کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑ سکے ــــ نئے تجربوں کے نام پر ہمارے بعض شعرا کی فکری صلاحیتیں ترقی کی منزلیں طے کرنے کی بجائے رُو بہ زوال ہوتی جا رہی ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ بعض نومشق شعرا اپنی ان خام کاریوں کو تجربہ کا نام دے کر خود فریبی کا شکار بھی ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو شاعری میں وُسعت اور گہرائی پیدا کرنے کے لئے تجربات ناگزیر ہیں لیکن

ایسے تجربے کس کام کے؛ جن سے اُردو شاعری کو فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان پہونچنے کا احتمال ہو!۔۔۔۔ بہرحال ہندو پاکستان کے اِس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں سے ادارہ خواہش کرتا ہے کہ وہ کسی ذہنی تحفظ کے بغیر کھُل کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں تاکہ اس کے فائدے اور نقصانات کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آسکے۔ کیونکہ اس موضوع کا صحیح تجزیہ اُردو شاعری کے حق میں یقیناً فالِ نیک ثابت ہوگا۔

بعض اہلِ قلم حضرات نے پُونم کے تعلق سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مستقبل قریب میں اپنی گراں قدر تخلیقات سے اس کے صفحات کو آراستہ کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا جو ہنوز شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکا۔ ادارہ کو ان قلمی معاونین سے قوی توقع ہے کہ ۔۔ وہ بعجلت ممکنہ وعدہ پُورا کرتے ہوئے اپنے فکر و نظر سے پُونم کے قارئین کو مستفیض ہونے کا موقع عطا کریں گے۔

پُونم کے صفحات ہر مکتبۂ فکر کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے حاضر ہیں اور خصوصی طور پر (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) ایسے نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع کرکے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہمیں خوشی ہوگی؛ جن میں اُبھرنے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔

آخر میں ہم اُن کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی تخلیقات نے پُونم کی معنوی خوبصورتی میں قابلِ قدر اضافہ کیا اور اُمید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی ہمیں ان کا قلمی تعاون حاصل رہے گا۔

—— ادارہ ——

پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال سے ہندوستان جہاں اپنے ہر دلعزیز وزیراعظم، عظیم رہنما اور پیامبر امن سے محروم ہو گیا، وہیں اردو زبان بھی اپنے ایک عظیم محسن سے محروم ہو گئی۔ موجودہ ناسازگار حالات میں اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لئے پنڈت جی کا دم بہت غنیمت تھا۔ پنڈت جی کو اردو سے جس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ذیل کے مضمون سے لگایا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

ت جواہر لال نہرو

دو قومی یک جہتی کی آئینہ دار

ان ہندوستان کی یک جہتی کے رجحانات کی آئینہ دار ہے اور اس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ نہ صرف زبان بلکہ انداز فکر، ادب اور تہذیب
ہ دار ہے۔ یہ ایک خالصتاً ہندوستانی زبان ہے اور اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ترقی دی جانی چاہیے۔
و زبان کی ترقی سے دلچسپی ہے۔ گزشتہ دس بارہ برس میں اردو نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں اردو کے (۳۵۰) اخبار تھے۔ اب
۲۰۷) ہے۔ زیادہ تر زبانوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریر اور بول چال کی شکل میں کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن اردو میں یہ فرق
اخبار والے یہ بھول جائیں کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے لکھتے ہیں تو اخباروں کی ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔ موجودہ دور عام پڑھنے والوں
یے تعلیم بڑھے گی پڑھنے والوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوتا جائے گا۔ انگلینڈ اور یورپ کے باقی سب ملکوں میں جیسے تعلیم پھیلی ہے
ایک انقلاب آگیا ہے۔ کروڑوں پڑھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہاں کے اخباروں کا طرز، الفاظ کا طرز سب بدل گئے۔ یہ سب
لئے تاکہ عوام سمجھ سکیں۔ یہی کچھ تھوڑا بہت یہاں بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوتا ہے کہ
یہ فرق بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر بنگالی زبان کو لیجئے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت اور ان کی کتابیں چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی مشہور
ں کی زبان اور گاؤں والوں کی زبان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اگر یہی بات اردو اور ہندی میں بھی آجائے تو دونوں کی ترقی کی رفتار
ئے۔ ہندوستان میں آج کل یک جہتی اور باہمی میل جول کا بڑا چرچا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ
کی کوشش کی۔ یہاں کی ہوا کی یہی خاصیت ہے کہ سب مل جل کر رہیں۔ اردو زبان اسی میل جول کا عظیم نمونہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ
ی زبانوں کا حصہ کس قدر ہے۔ غالباً ستر پچھتر فی صد، شاید ۸۰ فیصدی ہو۔ یہ حصہ ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کا ہے۔ شاید بیس
ی دوسری زبانوں کا حصہ ہے جو یہاں مروج ہوئیں۔ خاص طور پر فارسی، ترکی، عربی وغیرہ۔ زبان کی ترقی پذیری کا یہی اصول ہے
نے خود کو ایک چار دیواری میں بند کر دیا اور دوسری زبان کا داخلہ روک دیا تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ دنیا کی تاریخ بھی یہی سبق دیتی ہے کہ
نے خود کو علیحدہ رکھا وہاں نہ تو ان کے دماغ تازہ ہو سکے اور نہ جسم۔ میرے خیال میں اردو زبان کی ترقی کرنے کا راز یہی ہے کہ اس نے
ں سے فائدہ اٹھانے کی ڈگر اختیار کی۔ آجکل بھی ہندی کے مقابلے میں اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ زیادہ مروج ہو گئے ہیں اور
ان الفاظ کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا، وہ اس کا حصہ بن چکے ہیں۔ اردو ہندوستان کی یک جہتی کا ایک نمونہ ہے اور یہ نمونہ محض
ین بلکہ طرز فکر کا، ادب کا اور تہذیب کا بھی ہے۔ اردو خالصتاً ہندوستانی زبان ہے، اس لئے اسے اجنبی سمجھنا جہالت ہے۔ ہمیں
پہچاننا چاہیے اور اس زبان کو ترقی دینا چاہیے۔ ایک طرف تو ہندی اور اردو میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، لیکن جب دونوں زبانوں
پر نظر ڈالی جاتی ہے تو فرق نظر آنے لگتا ہے۔ دونوں زبانوں کے ادبیات میں اپنی اپنی خوبیاں ہیں۔ بعض خوبیاں مشترک بھی ہیں
دونوں زبانوں کی قربت دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اگر مجھے صرف ہندی کی فکر ہوتی تو بھی میں سمجھتا کہ ہندی کے لئے اردو کا

ایسے تجربے کس کام کے، جن سے اُردو شاعری کو فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان پہونچنے کا احتمال ہو! ـــــ بہرحال ہند و پاکستان کے اِس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں سے ادارہ خواہش کرتا ہے کہ وہ کسی ذہنی تحفظ کے بغیر کھُل کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں تاکہ اس کے فائدے اور نقصانات کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آسکے۔ کیونکہ اس موضوع کا صحیح تجزیہ اُردو شاعری کے حق میں یقیناً فالِ نیک ثابت ہوگا۔

بعض اہلِ قلم حضرات نے پُونم کے تعلق سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مستقبل قریب میں اپنی گراں قدر تخلیقات سے اس کے صفحات کو آراستہ کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا جو ہنوز شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکا۔ ادارہ کو ان قلمی معاونین سے قوی توقع ہے کہ ـــ وہ بعجلت ممکنہ وعدہ پُورا کرتے ہوئے اپنے فکر و نظر سے پُونم کے قارئین کو مُستفیض ہونے کا موقع عطا کریں گے۔

پُونم کے صفحات ہر مکتبۂ فکر کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے حاضر ہیں اور خصوصی طور پر (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) ایسے نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع کرکے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہمیں خوشی ہوگی، جن میں اُبھرنے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔

آخر میں ہم اُن کرم فرماؤں کا شکریہ اَدا کرتے ہیں جن کی تخلیقات نے پُونم کی معنوی خوبصورتی میں قابلِ قدر اضافہ کیا اور اُمید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی ہمیں ان کا قلمی تعاون حاصل رہے گا۔

ـــ ادارہ ـــ

پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال سے ہندوستان جہاں اپنے ہردلعزیز وزیر اعظم، عظیم رہنما اور پیامبرِ امن سے محروم ہو گیا، وہیں اردو زبان بھی اپنے ایک عظیم محسن سے محروم ہو گئی۔ موجودہ ناسازگار حالات میں اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لئے پنڈت جی کا دم بہت غنیمت تھا۔ پنڈت جی کو اردو سے جس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ذیل کے مضمون سے لگایا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

جواہر لال نہرو

اُردو قومی یک جہتی کی آئینہ دار

ندوستان کی یک جہتی کے رُجحانات کی آئینہ دار ہے اور اس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ نہ صرف زبان بلکہ انداز فکر، ادب اور تہذیب
ہے۔ یہ ایک خالصتاً ہندوستانی زبان ہے اور اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ترقی دی جانی چاہیئے۔
ن کی ترقی سے دلچسپی ہے۔ گزشتہ دس بارہ برس میں اُردو نے حیرت انگیز ترقی کی ہے ۱۹۵۰ء میں اُردو کے (۳۵۰) اخبار تھے۔ اب
ہے۔ زیادہ تر زبانوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریر اور بول چال کی شکل میں کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن اُردو میں یہ نستعلیق
والے یہ مجبول جائیں کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے لکھتے ہیں تو اخباروں کی ترقی کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔ موجودہ دور عام پڑھنے والوں
م بڑھے گی پڑھنے والوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوتا جائے گا۔ انگلینڈ اور یورپ کے باقی سب مُلکوں میں جب سے تعلیم پھیلی ہے
انقلاب آگیا ہے۔ کروڑوں پڑھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہاں کے اخباروں کا طرز، الفاظ کا طرز سب بدل گئے۔ یہ سب
عوام سمجھ سکیں۔ یہی کچھ تھوڑا بہت یہاں بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی رفتار بہت سُست ہے۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوتا ہے کہ
ن بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر بنگالی زبان کو لیجئے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت اور ان کی کتابیں چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی مشہور
بان اور گاؤں والوں کی زبان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اگر یہی بات اُردو اور ہندی میں بھی آجائے تو دونوں کی ترقی کی رفتار
۔ ہندوستان میں آج کل یک جہتی اور باہمی میل جول کا بڑا چرچہ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ
شش کی۔ یہاں کی ہوا کی یہی خاصیت ہے کہ سب مِل جُل کر رہیں۔ اُردو زبان اسی میل جول کا عظیم نمونہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ
انوں کا حصہ کس قدر ہے۔ غالباً ستر پچھتر فی صد، شاید ۸۰ فیصد ہی ہو۔ یہ حصہ ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کا ہے۔ شاید بیس
وسری زبانوں کا حصہ ہے جو یہاں مروّج ہو ئیں۔ خاص طور پر فارسی، ترکی، عربی وغیرہ۔ زبان کی ترقی پذیری کا یہی اُصول ہے
ود کو ایک چار دیواری میں بند کر دیا اور دوسری زبان کا داخلہ روک دیا تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ دُنیا کی تاریخ بھی یہی سبق دیتی ہے کہ
کو علٰحدہ رکھا وہاں نہ تو ان کے دماغ تازہ ہو سکے اور نہ جسم۔ میرے خیال میں اُردو زبان کی ترقی کرنے کا راز یہی ہے کہ اس نے
ہ فائدہ اُٹھانے کی ڈگر اختیار کی۔ آجکل بھی ہندی کے مقابلے میں اُردو میں انگریزی زبان کے الفاظ زیادہ مُروّج ہو گئے ہیں اور
الفاظ کو اُردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا، وہ اس کا حصہ بن چکے ہیں۔ اُردو ہندوستان کی یک جہتی کا ایک نمونہ ہے اور یہ نمونہ محض
طرزِ فکر کا، ادب کا اور تہذیب کا بھی ہے۔ اُردو خالصتاً ہندوستانی زبان ہے، اس لئے اسے اجنبی سمجھنا جہالت ہے۔ ہمیں
نا چاہیئے اور اس زبان کو ترقی دینا چاہیئے۔ ایک طرف تو ہندی اور اُردو میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، لیکن جب دونوں زبانوں
طرڈالی جاتی ہے تو فرق نظر آنے لگتا ہے۔ دونوں زبانوں کے ادبیات میں اپنی اپنی خوبیاں ہیں۔ بعض خوبیاں مشترک بھی ہیں
ں زبانوں کی قربت دونوں کے لئے مُفید ثابت ہو گی۔ اگر مجھے صرف ہندی کی فکر ہوتی تو بھی میں سمجھتا کہ ہندی کے لئے اُردو کا

ما اور اُردو سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہے اس سے ہندی مضبوط ہوتی ہے اور بڑھتی ہے اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی ہوا میں اُردو کی ترقی
ہندی کا جاننا اور ہندی سے رشتہ رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک جڑ سے نکلی ہیں، لیکن ان کو محض زبردستی ملانا ایک غلط بات ہے۔ ہر زبان دوسری
کے اشتراک سے ہمیشہ پھلی پھولی ہے۔ سائنس کی ترقی کے موجودہ دور میں ہمیں نئی نئی اصطلاحات کی ضرورت ہے۔ فنی تعلیم اور علم کی اب اتنی
ایں کھل گئی ہیں کہ پرانے الفاظ سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں لاکھوں نئے الفاظ سیکھنے اور سکھانے ہیں۔ غیر موزوں الفاظ کے ٹھونسنے سے زبان
ہوتی ہے۔ اکثر الفاظ محض تجربے سے چالو ہو جاتے ہیں۔ آپ کسی پیشہ ور آدمی کے پاس جائیے، اگر وہ میکانک ہے اور کسی بھی مشین
کرتا ہے تو آپ اس سے ایسے کئی نئے الفاظ سنیں گے جو کسی بڑی ڈکشنری بنانے والے نے نہیں بنائے۔ سائنسی اور ٹکنیکل اصطلاحات میں
زبانوں میں جتنا کم فرق ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ اس لئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں سائنسی اور ٹکنیکل
حات ایک سی ہوں۔ اور یورپین زبانوں کی اصطلاحات سے ملتی جلتی ہوں۔ یہ مشابہت اور یکسانی بہت مفید ہوگی۔ تاہم میرا مطلب یہ نہیں
قل ہی ملتی جلتی ہوں، کبھی کبھی کسی لفظ کو دوسری زبان میں سمونے کے لئے اس کی شکل ذرا بدلنی پڑتی ہے۔ سائنسی اصطلاحات کی یکسانیت
ون کے لئے دوسری زبانوں میں کتابیں پڑھنا اور سمجھنا آسان ہو سکتا ہے۔ یہ ایک غلط بات ہے کہ ان کا اُردو یا ہندی میں ترجمہ کر دیا جا
مال جو ہزاروں کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ہم ان کا ترجمہ کریں گے، ترجمہ تو ہونا چاہیئے، لیکن سب کا ترجمہ ہونا ناممکن سی بات ہے۔ البتہ
ئی کتابوں کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم جو بھی زبان لکھیں یا بولیں اس میں دوسری زبانوں کے
والیسے ڈھنگ سے لیں کہ وہ اس میں کھپ جائیں۔

انیسویں صدی میں کئی ایسے اخبار نکلتے تھے جو اُردو اور ہندی یا مراٹھی یا اُردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ اُردو ہندی میں
ن فرق پیدا ہوتا ہے وہ رسم الخط کا ہے ورنہ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کی مختلف زبانوں کا رسم الخط اتفاق سے ایک ہو جاتا
یسا کہ یورپ کی زبانوں کا رسم الخط ایک ہے تو ان کے سمجھنے میں ایک بھاری رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ رسم الخط کو بدلنا ایک مشکل مسئلہ ہے
یہ نہیں کہا کہ کسی رسم الخط کے بجائے دیوناگری کو رکھا جائے بلکہ ہم نے کہا کہ ساتھ ساتھ ناگری کو بھی رکھا جائے تو اچھا ہے۔ جو کچھ میں سمجھتا
ہ ہونا چاہیئے اور کچھ ہو بھی رہا ہے وہ یہ ہے کہ اُردو کی بعض مشہور کتابیں ناگری میں چھپنی چاہئیں اور ہندی کی اُردو میں، اس سے آپس میں
رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پھر وقت آنے پر دیکھا جائے گا کہ کون سی بڑھے گی اور کونسی نہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آزادی کے بعد تیرہ چودہ سال کے عرصے میں اُردو نے ترقی کی ہے۔ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم
چاہیئے۔ کیونکہ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اُردو نے اس عرصے میں نہ صرف ترقی نہیں کی بلکہ پیچھے رہ گئی ہے۔ اُردو ایک جاندار
ہے۔ واقعات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں ایک اندرونی جان ہے جو اپنی طاقت سے بڑھتی ہے۔ سرکاری فرمان سے بھی کوئی،
بڑھتی ہے، لیکن تھوڑی بہت۔ اصل میں یہ تبھی بڑھتی ہے جب اس میں جان ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُردو میں کافی جان ہے۔ یقیناً
ن گورنمنٹ نے بھی اس کی مدد کی ہے لیکن پھر جسقدر ہونی چاہیئے اتنی نہیں۔ اور زبانوں کی زیادہ مدد ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اُردو کا
کرنا اس کے کافی جاندار ہونے کا ثبوت ہے۔ اُردو کی جان ہندوستان کی جان کا حصہ ہے۔ جاندار ملک ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ہماری
ن جاندار ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔ اگر ہم غلط راستے پر چلے اور ہندی اور دوسری زبانوں کو ایک دوسرے سے اثر قبول نہ کرنے دیا تو ان کا
بنا ختم ہو جائے گا اور وہ سوکھتی جائیں گی۔ اگر ہمیں اپنی زبانوں کو مضبوط اور تازہ رکھنا ہے تو ہمیں اپنے دروازے اور کھڑکیاں کھلی رکھنی
ں۔ نہ صرف ہندوستانی زبانوں کے لئے بلکہ دُنیا کی زبانوں کیلئے بھی تاکہ ہم اپنا اثر ان پر ڈال سکیں۔ اسطرح ہماری زبانیں ترقی کرینگی اور ہمارا ملک بھی ترقی کریگا

—— مرقع اُردو ——

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

اُردو ادب کو جن بزرگوں نے تازگی، زندگی اور توانائی بخشی اور اسے دوسری تمام ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل بنایا مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام ان سب میں پیش پیش ہے بلکہ مولوی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ اردو میں سب سے پہلے مستقل طور پر آپ نے بچوں کا ادب پیش کیا۔

مولوی صاحب میرٹھ میں ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے ابتدائی ...میں حاصل کی۔ پہلے قرآن شریف پڑھا، اس کے بعد عربی ...یں پڑھیں اور فارسی میں کافی استعداد حاصل کی۔ ابھی آپ ...کے تھے کہ اٹھارہ سو ستاون کے انقلاب کا آفتاب حریت ...لوع ہوا۔ ہندوستانی سپاہی بدیسی حکمرانوں یعنی انگریزوں ...ہوگئے۔ قتل و خون کا بازار گرم ہوا۔ انقلاب کے آتش شعلے ...ن و اماں کو خاکستر کرنے لگے۔ مولوی صاحب بھی اس سے ...ے۔ پڑھنا لکھنا کیسا جان بچانی مشکل ہوگئی۔ معلوم نہیں ...بچ گئے۔ ۱۸۵۸ء میں جب تلوار کے زور سے امن قائم ہوا تو ...کی تھی۔ رہی سہی شاہی بھی ختم ہو چکی تھی۔ انگریزوں کی حکومت ...۔ لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے لگا۔ ہندوستان غلامی کی ...یروں میں جکڑ دیا گیا۔ قبضہ ہونے کے بعد مہذب نما درندوں ...ستانیوں خصوصاً مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ ایک ایک کو چن چن کر قتل کیا، سولی دی گئی، گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، شہر کے شہر ویران ہوگئے، محل سرائیں وحشت سرائیں بن گئیں، ناز و نعم میں پلے ہوئے در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے، دوسروں کو پناہ دینے والوں اور پرورش کرنے والوں کو کہیں بھی سر چھپانے اور پیر ٹیکنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ وہ خود دانے دانے کو محتاج ہوگئے۔ مفلسی، بھوک، پریشان حالی عام تھی۔ مولوی صاحب بھی مفلسی اور بیروزگاری کا شکار رہے، چودہ برس کی عمر ہی کیا، کھیلنے کھانے اور پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ مگر جب وقت پڑتا ہے تو اس عمر میں بھی پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرنا ہی پڑتی ہے۔ دو برس تلاش معاش میں بڑی دقتوں اور مشکلوں سے کٹے۔ آخر خدا خدا کر کے ۱۸۶۰ء میں آپ کو محکمۂ تعلیم کے دفتر میں ایک جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ تک دفتر میں کام کرتے رہے، اس کے بعد آپ کو ہیڈ مولوی کی جگہ مل گئی۔ سہارنپور اور میرٹھ میں تقریباً

ستائیس اٹھائیس برس تک اپنے فرائض بڑی خوبی اور مستعدی سے انجام دیئے آپ کی علمی قابلیت اور صلاحیت، محبت اور خلوص کا سکّہ آپ کے شاگردوں ساتھیوں اور افسروں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ سب آپ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ١٨٨٠ء میں آپ ترقی پاکر سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ نارمل اسکولوں میں پیوپل ٹیچر (استادوں) کو پڑھانا اور پڑھانے کا طریقہ بتانا ہوتا ہے۔ ابھی تک آپ بچوں کے استاد تھے اور ان کے رجحانات و خیالات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے اب آپ استادوں کے معلم مقرر ہوئے اور گیارہ برس تک مسلسل اس خدمت کو انجام دیتے رہے جس سے آپ کو تعلیم کے متعلق کافی تجربہ ہوگیا۔ گورنمنٹ نے کارکردگی کے صلہ میں آپ کو "خان صاحب" کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ ١٨٩٩ء میں آپ پنشن لے کر اپنے وطن میرٹھ چلے آئے اور بقیہ عمر علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کردی یکم نومبر ١٩١٧ء کو (٧٢) سال ١١ ماہ ١٢ دن کی عمر میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ باغیچہ دروازہ کے باہری حصہ میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

مولوی صاحب خوش اخلاق اور باوضع انسان تھے۔ سب سے خلوص اور محبت کے ساتھ ملتے تھے۔ شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ تعصّب۔ تنگ نظری اور ہٹ دھرمی سے آپ کو دُور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ سیدھے سادے اور دیندار انسان تھے۔ دوسرے مذاہب کا احترام دل سے کرتے تھے۔

مولوی صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے بچّوں کے لئے لکھنے کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی۔ چونکہ آپ کی تمام عمر درس و تدریس میں گزری اس لئے عملی طور پر آپ کا تعلق طلباً اور ان کی تعلیم سے رہا اور آپ کو بچوں کی نفسیات، خیالات اور رجحانات سمجھنے کا سب سے زیادہ موقع ملا۔ بچوں کا ادب پیش کرنے میں آپ کو جو کمال حاصل تھا، اس کا راز یہی تھا کہ آپ نے تعلیمی مسائل کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا۔ آپ کی لکھی ہوئی کتابیں کافی مقبول ہوئیں۔ اُردو میں اتنی مفید اور اچھی کتابیں کوئی دوسرا

نہیں لکھ سکا۔ آج تک ان کی مقبولیت اور افادیت میں کمی نہیں ہو[ئی] اگرچہ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے بہت کچھ بچّوں کے لئے لکھا، لیکن مولوی اسماعیل ان دونوں بزرگوں سے بڑھ[کر] لے گئے۔ آپ نے بچوں کے لئے متعدد کتابیں، سیکڑوں نظمیں ا[ور] کہانیاں لکھیں۔ دوسری زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ اُردو نظم و نثر دونو[ں] میں کیا۔ ابتدائی درجات سے لیکر مڈل تک آپ کی کتابیں نصاب [میں] داخل ہیں۔ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا انسان ایسا ہوگا جس نے یہ کتابی[ں] نہ پڑھی ہوں اور جس کو ان کے نصیحت آمیز اشعار یاد نہ ہوں۔ آ[پ کی] ریڈریں اسقدر مقبول اور مفید ثابت ہوئیں کہ ہندوستان ہی [نہیں] بلکہ دوسرے ملکوں ملایا، انڈونیشیا، برما وغیرہ میں بھی پڑھا[ئی] جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ ہندوستان کی کئی ریاستیں ار[دو] دشمنی میں مسلسل اور باقاعدہ جدوجہد کر رہی ہیں، ان کتابوں کی مقبو[لیت] میں کمی نہیں آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ریڈریں شیخ سعدیؒ کی گلستا[ں] بوستان کی طرح مقبول ہوئیں اور بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کر[نے] ان کے اخلاق و عادات سدھارنے میں انہوں نے بڑا کام کیا۔

معلّم کے ساتھ ساتھ آپ ادیب و شاعر بھی تھے۔ شا[عری] میں مرزا غالب کے شاگرد تھے اور خط و کتابت کے ذریعہ سے اصلا[ح] لیتے تھے۔ آپ کی نثر صاف سادہ اور دلچسپ ہوتی ہے۔ اندازِ بیا[ن] شگفتہ و پاکیزہ ہے۔ آپ نے دوسری زبانوں خاص کر فارسی زبا[ن] کی حکایتیں بڑی خوبی سے ترجمہ کی ہیں۔ ان حکایتوں میں کہیں کہ[یں] حسبِ موقع اپنے اشعار کا اضافہ کیا جنہوں نے عبارت کی دلچس[پی] اور افادیت میں چار چاند لگا دیئے۔ سادگی اور صفائی میں آپ ا[پنی مثال آپ] کامل تھے، آپ نے متعدد علمی و ادبی کتابیں لکھی ہیں۔ بعض کتا[بیں] ابھی تک شائع نہیں ہو سکیں، اگر ان کو شائع کر دیا جائے تو اُر[دو] ادب میں اچھا خاصا اضافہ ہو جائے۔

آپ کا مرتبہ شاعری میں کافی بلند ہے۔ آپ کی جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور بقول مولانا شبلی نعمانی "جدید میں مولانا حالی کے بعد اگر کسی نے سُننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولا

پوئم"

یل میرٹھی ہیں"

اُردو شاعری میں روزمرّہ کے معمولی معمولی عنوانات پر نظمیں لکھنے
مولوی صاحب نے ہی کی۔ تعلیمی، اخلاقی، ادبی، سماجی، نیچرل
ہر عنوان پر آپ نے سیدھے سادے انداز میں آسان اور عام فہم
یں نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سب نظمیں اپنا جواب نہیں رکھتیں، آنیوالے
دں نے آپ ہی کے چراغ سے چراغ جلائے ہیں اور آپ ہی کے
قدم پہ چلنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ قبولیتِ عام کی سند نہ
کرسکے۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل کو عملی طور پر
کے خیالات و رُجحانات، حرکات و سکنات، اخلاق و عادات کا
تجربہ تھا اور آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین بچوں کا ادب پیش
ابنا لیا تھا۔ آپ نے چھوٹی بڑی سیکڑوں نظمیں لکھیں۔ متفرق اشعار اور
عات بھی بکثرت لکھے لیکن سب دلچسپ آسان رواں اور نتیجہ خیز
پ کا کلام زیادہ تر مثنوی میں ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ مثنوی
لکھنے میں آپ کو قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ مثنوی کے علاوہ مثلث، مخمس،
مسدس اور قطعات وغیرہ لکھنے میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔

غزلوں میں آپ کا اندازِ بیان صاف ستھرا ہے۔ زبان شستہ
اور پاکیزہ اور شیریں اور دلکش ہے۔ خیالات بلند اور اعلیٰ ہیں۔ آپ
نے اپنی شاعری کا معیار بلند رکھا۔ زبان و خیال کو رکاکت سے آلودہ نہیں
کیا۔ اکثر غزلوں میں غالب اور مومن کا رنگ نمایاں ہے۔ زبان و بیان
پر قدرت اور جذبات و خیالات میں نُدرت ایک ایک شعر سے ظاہر
ہوتی ہے ؎

یا آنکھ اُٹھا کے چشمِ فسوں ساز کو نہ دیکھ
یا [illegible] جورِ مصائبِ دَورِ زماں اُٹھا
اب اور ڈھونڈیئے کوئی جولانگہِ جنوں
صحرا بقدرِ وسعتِ یک گام ہو گیا
یہ اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو
یعنی پلے ہوئے اسی آب و ہوا کے ہیں

* * *

بُلبل کے دل میں داغِ وداعِ بہار ہے
یارب کوئی نہ کیفیتِ رنگ و بُو نہ ہو
بتلا دیا ہے راہ نما نے مجھے پتا
دُنیا بھی اِک مقامِ ترانہ گزیں ہے
ہے آج رُخ ہوا کا موافق تو چل نکل
کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے
راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے
راحت طلبی موجبِ راحت نہیں ہوتی
کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے
پھر چمن اور آشیانہ اور ہے
شمع پھیکی، رات کم، محفل اُداس
اب شبِ مفلسی کا ترانہ اور ہے

مناظرِ قدرت کی سچی عکاسی آپ کی نظموں میں بدرجۂ اتم موجود ہے کہیں
وہ نسیمِ سحر، صبح کی آمد، شام کا جھٹ پٹا، وقت، آسمان اور ستارے
برسات، رات، گرمی کا موسم، کوہِ ہمالہ، تاروں بھری رات کا
بیان کرکے قدرت کے مناظر کی ہو بہو تصویر کھینچتے ہیں۔ کہیں بچے اور
جگنو، مور اور کلنگ، کچھوا اور خرگوش، دال اور چپاتی، سچ اور
جھوٹ، پودا اور گھاس، بجلی اور فضولی، کُتا اور بلی، گھوڑا اور سایہ،
جاڑا اور گرمی، بچہ اور ماں پر مکالمے کے انداز میں نظمیں اس انداز
سے لکھتے ہیں کہ ایک ایک بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہیں خدا کی
تعریف، خدا کی قدرت، ماں کی مامتا، ایماندار لڑکا، چھوٹی چیونٹی
میرا خدا میرے ساتھ ہے، کوشش کئے جاؤ، بارش کا پہلا قطرہ وغیرہ
جیسی نظمیں لکھ کر بچوں کے ادب و اخلاق کو سنوارتے ہیں اور ان کے
اندر عزم و حوصلہ، ہمت و استقلال، محنت اور جوانمردی پیدا کرتے
ہیں۔ ہماری گائے، ہوا، اُونٹ، بادِ مراد، طمع کی انگوٹھی، کاشتکاری
یہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں ہیں جن کا جواب اُردو شاعری میں مشکل
سے ملے گا۔ سیدھے سادے الفاظ میں بھولی بھالی اور مَن موہنی گائے
کی تعریف اتنی سلاست روانی اور سادگی کے ساتھ اُردو تو کیا ہندی

ہیں بھی مشکل (لے) چلے گی۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں
جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
سبحان اللہ دودھ ہے کیسا
تازہ گرم سفید اور میٹھا
دانا دنکا بھوسی چر کر
کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
کھا کر تنکے اور چھیچھڑے
دودھ دیتی ہے شام سویرے
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری
صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
پانی پی کر چارا چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر
ڈوری میں جو دن ہے کاٹا
بچے کو کس پیار سے چاٹا
گائے ہمارے حق میں ہے نعمت
دودھ دیتی ہے کھانے بنسبت
بچھڑے اس کے بیل بنائے
جو کھیتی کے کام میں آئے
رب کی حمد و ثنا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

مولوی اسماعیل کے بیشتر اشعار اور قطعات زبان زدِ خاص و عام ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، آج بھی بچوں اور بوڑھوں کو یہ اشعار یاد ہیں ؎

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں

راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا
بھلائی کرو تو کرو بے غرض
غرض کی بھلائی بھی ہے اک غرض
کرو تم نہ حاسد کی باتوں پر غور
جلے جو کوئی اس کو جلنے دو اور
دکاں بند کر کے رہا بیٹھ جو
تو دی اس نے بالکل ہی لٹیا ڈبو
ادب سے ہی انسان انسان ہے
ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے
بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب
یہ سچ بات ہے بے ادب بے نصیب
چھری کا، تیر کا، تلوار کا تو گھاؤ بھرا
لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا
جو بات کہو صاف ہو، ستھری ہو، بھلی ہو
کڑوی نہ ہو، کھٹی نہ ہو، مصری کی ڈلی ہو
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو
بدی کی صحبت میں مت بیٹھو بد کا ہے انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد کا ہے انجام برا

گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گل کے جویا ہیں انہیں کیا خار کا کھٹکا

یہ چند اشعار یادداشت سے تحریر کئے گئے ہیں ورنہ اگر ان کی ریڈروں سے متفرق اشعار کا انتخاب کیا جائے تو اچھا خاصا ایک

نصیحت تیار ہو سکتا ہے۔

متفرق اشعار کے علاوہ آپ کے قطعات بھی نہایت نصیحت خیز
ندگی کے تجربات کو جس طرح آپ نے بیان کیا ہے، مولانا حالی کے
ردو میں کوئی دوسرا شاعر مشکل سے نکلے گا۔ آپ کے قطعات
اخلاقی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد انسان میں عزم و حوصلہ ہمت و
کے جذبات بیدار ہوتے ہیں اور باکمال بننے کی لگن پیدا ہوتی ہے

کوئی پیشہ ہو زراعت یا تجارت یا کہ علم
چاہیے انسان کو پیدا کرے اس میں کمال
کاہلوں کی عمر بڑھ جاتی ہے خود کر لو حساب
باہنر کا ایک دن اور بے ہنر کا ایک سال

ے کام کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے، برائی کو فوراً ترک کر دینا چاہیے

نتیجہ کیوں کر اچھا ہو، نہ ہو جب تک عمل اچھا
نہیں بویا ہے تخم اچھا تو کب پاؤ گے پھل اچھا
کرو مت آج کل حضرت برائی کو ابھی چھوڑو
نہیں جو کام اچھا وہ نہ آج اچھا نہ کل اچھا

مولانا نے انقلاب آخر کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، مغربی
لیم و تہذیب کے اثرات بڑھتے جا رہے تھے۔ مشرقی تہذیب ختم ہوتی
ا رہی تھی۔ ساحرانِ افرنگ کا جادو اثر کر چکا تھا۔ صیاد کے اقبال کا
حر طائرانِ ہند کو مسحور کر چکا تھا، مغرب کی ہر برائی اچھائی اور مشرق
کی ہر اچھائی برائی بنتی جا رہی تھی۔ دردمند دل یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے
مولوی اسمٰعیل بھی اکبر کی طرح مدخولہ گورنمنٹ تھے۔ اکبر نے ظرافت کا
غلاف چڑھا کر طنز کے تیر چلائے۔ مولوی اسماعیل نے بھی مختلف انداز
میں مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے متاثر ہو کر نظمیں لکھی ہیں۔
"آثارِ سلف" کے تحت لکھتے ہیں ؎

وہ کسب مقصود تھے یا قبلۂ حاجات
کس منہ سے بزرگوں پہ کریں فخر و مباہات
سر اپنے گریباں میں ذرا ڈالیے ہیہات
اوصافِ اضافی سے نہیں کچھ شرفِ ذات

تم اور میں جب کوئی صفات کی شہرت
[illegible]
بندوق بدم صید گر اچھا نہ چلی ہو
مرغ مردہ ہے گر لیس و پریس میں وہ مٹی ہو

مولوی اسماعیل نے 'بلینک ورس' یعنی بے قافیہ والی نظم (آزاد نظم)
لکھنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس میں آپ نے اپنے خیالات نہایت عمدہ
طریقے سے ادا کئے ہیں۔ اُردو شاعری میں غالباً سب سے پہلے آپ نے
ہی غیر مقفیٰ نظمیں لکھیں، ان نظموں میں روانی و دلکشی، موزونیت
اور سلاست ہے۔ "تاروں بھری رات" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیّر
کہ تم اونچے آسماں پر
جو ہے کُل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے
کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

مذہبی تعلیم کا اثر بچپن سے آخر عمر تک رہا۔ حمد و مناجات
نعت و منقبت، آپ نے والہانہ انداز میں لکھی ہیں۔ تصوف
سے خاص لگاؤ تھا۔ حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے خاص عقیدت مندوں
میں سے تھے۔ فراقِ شیخ میں ایک دردناک نظم لکھی اور شیخ کے حالات
میں "تذکرۂ غوثیہ" لکھا۔ جنہوں نے آپ پر حقیقت کے اسرار کھول
دیئے تھے خود کہتے ہیں ؎

کھولا ہے مجھ پہ سرِّ حقیقت جنہوں نے
یہ پختگی جبھی ہے خیالاتِ خام کو
بزمِ [illegible] میں سب پہ وہ کرتے [illegible]
ہے یہ تیری [illegible]

یہں بے قرار منزلِ مقصود بے نشاں
رستے کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا

آپ نے ایک دلآویز نعت منقبت درود بر رسولِ محمود کے عنوان سے سات بندوں میں لکھی۔ یہ نعت ہیئت اور اسلوبِ زبان اور بیان کے اعتبار سے عام نعتیہ نظموں سے مختلف ہے۔ آخری بند پیش ہے[۵]

وہ فخرِ آدم امانِ عالم
امینِ محکم رسولِ اکرم
محیطِ اعظم زعیبِ ملہم
بوحی محرم شہِ مسلّم
عرب کے اندر وہی معظم
عجم کے اندر وہی مکرم
لگا کے آدم سے تا بہ ایں دم
ظہور اُس کا ہے بعدِ آدم
وجود اُس کا مگر مقدّم
وہ نورِ حق تھا ولے مجسّم
کیا مدینے کو سبز و خرّم
درود محمود بھیج پیہم
صلوٰۃ اُس پر سلام اُس پر
اور اس کی سب آلِ باصفا پر
اور اس کے اصحابِ باوفا پر
اور اس کے احبابِ اتقیا پر

مولوی اسمٰعیل عمر بھر درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی گراں مایہ ہستی اور بلند پایہ ادیب کی خدمات کو لوگ فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اور آج

ریڈروں کے علاوہ آپ کی ساری کتابیں کمیاب اور نایاب ہیں۔ ادبی و تعلیمی اداروں کا سب سے پہلا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اُس محسنِ علم و ادب کے علمی و ادبی کارناموں کو روشن کریں اور اُس بیش بہا خزانے کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ آپ نے حسبِ ذیل کتابیں لکھی ہیں، جن میں اکثر نایاب ہو چکی ہیں۔ اکثر گمنامی میں پڑی ہوتی ہیں۔

(۱) اُردو ریڈریں۔ قاعدہ پہلی سے پانچویں تک۔ یہ ریڈریں عام طور پر مل جاتی ہیں۔

(۲) سوادِ اُردو، سفینۂ اُردو، ادیبِ اُردو، کمکِ اُردو یہ کتابیں نایاب ہو چکی ہیں۔

(۳) ریزۂ جواہر۔ ۱۸۸۰ء میں یہ مجموعۂ نظم شائع ہوا۔

(۴) تذکرۂ غوثیہ۔ حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے حالات۔

(۵) کلیات۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کے کلام کا مجموعہ کلیاتِ اسمٰعیل میرٹھی کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں جملہ اصنافِ سخن موجود ہیں، اور جدید و قدیم دونوں رنگ کی غزلیں ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں دوبارہ 'حیاتِ اسمٰعیل' کے اضافے کے ساتھ سیفی میرٹھی نے شائع کرایا۔ اب نایاب ہے

(۶) تنقیدِ مثنوی قران السعدین۔ حضرت امیر خسرو کی مثنوی پر تنقید

(۷) لغاتِ اُردو، قواعدِ اُردو، سوانحِ عمری حضرت امیر خسرو یہ تینوں کتابیں اب تک شائع نہ ہو سکیں۔ معلوم نہیں ان کے مسودات بھی دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہے یا نہیں ——— افسوس!

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض خوشخط نہ ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ مضامین غیر مطبوعہ روانہ کیجئے۔ مضامین کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھ لیجئے۔ جواب طلب امور کیلئے اپنا نام اور پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور بھیجئے، ورنہ جواب دینے سے قاصر رہے گا۔ ترجمہ کی صورت میں اصل مضمون نگار کا نام اور دیگر حوالہ جات ضرور تحریر کیجئے۔

ادارہ

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی

ظریف لکھنوی کا تصورِ مزاح

ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے قوم کی اصلاح کی طرف توجہ ہے۔ لیکن بعض شعرأ، شاعر سے زیادہ ناصح اور مصلح بن گئے ۔ لانا حسین حالی ان شعرأ میں سرفہرست ہیں اور ادیبوں میں نا قدین انگلیاں نذیر احمد پر اٹھتی ہیں کہ ان کے سارے ناول اصلاح کا مد پیشِ نظر رکھ کر لکھے گئے۔ بعض ادیبوں اور شاعروں نے اپنی انیف نثر و نظم میں طعن و تشنیع کے نشتر چلا کر عوام کو بیدار کرنے کا ن ادا کیا۔ اس میں اخبار اودھ پنچ سب سے آگے ہے اور اس کے مون نگاروں اور شعرأ کا حلقہ محدود۔ اس کے پہلے دور کے آخری نے میں سید مقبول حسین ظریف کا نام نظر آتا ہے کہ وہ اس میں غزل گو حیثیت سے داخل ہوتے ہیں اور اپنے اشعار میں سماج کی برائیوں پہ ذکر کرتے ہیں ۔

ظریف ۲۴ر فروری ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی رت صفی لکھنوی کے زیرِ تربیت رہ کر بہت جلد فنِ شعر پر عبور ل کیا۔ طبیعت میں مزاح کا مادّہ تھا اس لئے اسی رنگ کی غزلوں ، انفرادیت پیدا کی۔

ان کا دور ایسے مفکرین کا تھا جنہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم چکے ہیں اور اب ان کا نکالنا آسان نہیں۔ اس لئے ہمیں زمانے کا ساتھ دیتے ہوئے انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو یاس و مایوسی کی زندگی گذار رہا تھا اور اس کے سامنے کوئی ایسی راہ متعین نہیں تھی، جو آزادی کی طرف لے جا سکے۔ وہ اپنے ماضی کی عظمت پر آنسو بہا رہا تھا۔ کچھ لوگ ماضی اور حال کو ملا کر مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ وہ گذرے ہوئے واقعات کو بھول لینے کے لئے تیار تھے لیکن انہیں تمدن کو زوال پذیر دیکھنا گوارا نہ تھا۔ یہ تصورات ان لوگوں کے تھے جو کانگریس میں شریک تھے اور سیاست سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے تھے۔ ظریف اسی کے نمایندہ تھے اور اپنے کلام میں اسی زوال آمادگی کے طرف چٹکیاں لیتے رہے۔ چنانچہ وہ اپنے موضوع کے متعلق کہتے ہیں ؎

ظرافت میں ہم اپنی قوم کا افسانہ کہتے ہیں
کھری کہتے ہیں جب کہتے ہیں آزادانہ کہتے ہیں

اسطرح وہ قوم میں پیدا ہونے والی ہر برائی کو ظرافت کے پیرایہ میں بیان کر کے اس کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظریف کے نزدیک

جو نقائص قوم میں پیدا ہو رہے ہیں، وہ مہلک اور تباہ کن ہیں اور اپنی وسعت اور ہمہ گیری سے ملک کو نقصان پہنچاتے جا رہے ہیں۔ مثلاً وہ دیکھتے ہیں کہ نئی تہذیب نے ذات پات کے جھگڑے ختم کر دیئے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور جاہل کا فرق مٹا دیا ہے۔ گدھا اور گھوڑا ایک تھان پر باندھے جا رہے ہیں۔ ادنیٰ ذات کے لوگوں کو خواہ وہ ناخواندہ ہی کیوں نہ ہوں کونسل کی رکنیت کا حق مل گیا ہے۔ یہ بات انہیں کھلتی ہے اور وہ اس طرح اس کا اظہار کرتے ہیں ؎

کونسلوں نے دونوں کو آنریبل بنا دیا
تھی جو صفت شریف کی اب ہے وہی چمار میں

یہاں لفظ آنریبل سے لغوی اور معنوی دونوں فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ ظریف کی شاعری کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ الفاظ کے در و بست سے وہ اپنے کلام کو سجاتے ہیں۔

عہدہ داروں میں عام طور پر ایک عیب پایا جاتا ہے کہ وہ کان کے کچے ہوتے ہیں۔ کسی ایک کی کہی ہوئی بات کو سچ سمجھ کر بلا تحقیقات کوئی نہ کوئی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

دیکھتے کچھ بھی نہیں سننے پہ ہے دار و مدار
آپ کے تو کان اے سرکار آنکھیں ہو گئیں

مشاعروں میں عام طور پر اکثر شعرا تحت اللفظ پڑھنے کی بجائے ترنم سے پڑھتے ہیں اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ بلا فرمائش ہر مصرع دوبار پڑھتے ہیں۔ اس اخلاقی عیب کو ظریف نے اس طرح پیش کیا ہے ؎

آج کل ہے ادبیت کا یہ معیار ظریف
وہی استاد ہے مشاق ہو جو گانے میں

لفظ استاد کا در و بست توجہ کا محتاج ہے کہ ارباب نشاط گویوں کو استاد ہی سے مخاطب کرتے ہیں۔ اسی مفہوم کو وہ ایک اور شعر میں اسطرح ادا کرتے ہیں ؎

مکرر ہم پڑھیں گے جب تو کوئی کیا بنائے گا
کسی جلسے میں جب پابندیٔ اشعار ہو جائے

ہمارے شعرا دوغزلہ اور سہ غزلہ سے نہیں چوکتے تو صدر جلسہ پابند کرنا چاہتے ہیں اور پابندی کا رد عمل اس شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وہ دور تھا کہ ثقہ اور قدامت پرست طبقہ نئی تہذیب اور تعلیم نسواں کا حامی نہ تھا۔ اکبر اور اقبال تک اسی خیال کا اتباع کرتے تھے۔ چنانچہ ظریف بھی ان کے ہمنوا ہیں۔

ہوائے مغربی تجھ میں ہے کتنا جذب پنہانی
دھرم ہندو کا غائب اور مسلماں کی مسلمانی
حیا جامے سے باہر ہو گئی اللہ رے آزادی
ابھی تھوڑی سی بڑھنے پائی تھی تعلیم نسوانی
مساوات اس کو کہتے ہیں نئی تہذیب کیا کہنا
کہ صورت ہو گئی یکساں زنانی اور مردانی

اس طرح وہ اس قصیدہ نما نظم میں ہمارے سماج کی اس دور کی خصوصیات کو پیش کرتے ہیں۔ اکبر کی طرح وہ سرسید کے خیالات کے بھی حامی نہ تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ کالج اور یونیورسیٹیاں صحیح علم پھیلانے میں معاون ثابت نہ ہونگی، بلکہ یہ قوم کو ضلالت اور گمراہی کی طرف لے جائیں گی۔ چنانچہ شاگردوں اور اساتذہ دونوں کے بارے میں ایک بند سنیئے۔ طالب علموں کی کیفیت اسطرح پیش کی ہے ؎

مشرقی کالج کی چل کر کیجئے کچھ دیر سیر
چل رہا ہے کتنی تیزی سے یہ پیروں کے بغیر
جائیں کالج یار ہیں شاگرد گھر ہی میں بخیر
پاس ہو جائیں گے سب تحصیل سے ہو جن کو بیر
علم میں جینگر سے بڑھ کر کامراں کوئی نہیں
چاٹ جاتا ہے کتابیں امتحاں کوئی نہیں

اب اساتذہ کے بارے میں ظریف کی رائے سنیئے ؎

علم کی تحصیل کے شاگرد ہی ہیں ذمہ دار
ہیں معلم اس ادارے کے فقط تنخواہ خوار
قوم کو ان کی لیاقت پر ہے پورا اعتبار
یہ ملازم کب ہیں ان کو خود ہے پورا اختیار

درس دیں چاہے نہ دیں کالج میں آئیں یا نہ آئیں
یاالٰہی پُرسدا پوتوں پھلیں دُودھوں نہائیں

ں طرح ظریف ہر معاملہ کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ قوم کی بُرائی ان کیلئے سوہانِ رُوح ہے لیکن وہ اس کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مُسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں، لیکن پڑھنے والا جب غور کرتا ہے تو اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ ظریف نے قوم کے کس رُخ پر وار کیا ہے۔

ظریف کے عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی سیاسی شاعری میں بعض جگہ ایسی تلخ نوائی بھی ملتی ہے جو مستقبل کے شعرا کا حصہ بنی۔ وہ سرمایہ دار اور مزدور اور زمیندار اور کسان کے جھگڑے سے واقف تھے۔ کہتے ہیں ؎

اے مہاجن پرور اے ہندوستانِ زیرِ بار
اے کسانوں کے وطن، سرمایہ داروں کے شکار
تیری آبادی میں کثرت ہے انہیں کی بے شمار
جن کے جسمِ ناتواں میں قرض کے دِق کا بخار

ظریف کے کلام میں ہمیں سماج کے ایسے ہی عیوب زیادہ نظر آتے ہیں جن کو عمومیت کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ وہ انہیں نقائص کو دُور کرنے کی طرف توجہ کرتے رہے۔ اسلیئے بعض وقت وہ شاعر سے زیادہ مُصلح بن جاتے ہیں اور یہ چیز ان کے معیارِ ظرافت کو گرانے والی ہوتی ہے لیکن انہوں نے اپنی امکانی کوشش کی ہے کہ تصنع اور تکلف کی شاعری سے اجتناب کریں۔ اگر انہوں نے غزل گوئی کو بُرا کہا تو خود کبھی اس انداز کی غزل بھی نہیں کہی۔ وہ بہت صاف باطن تھے۔ ان کے کلام میں کہیں ایسی شخصی اور انفرادی چپقلش نظر نہیں آتی۔ کلام چونکہ عمومیت لئے ہوئے ہے اسلئے اس میں دلکشی اور تاثیر بھی پائی جاتی ہے۔

ظریف نے اپنے کلام کو مقامی رنگ اور مکالماتی انداز سے بھی دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ رنگ گنواروں کی بولی کی شکل میں متعدد نظموں میں نظر آئے گا۔ یہ ایک خصوصیت ایسی ہے کہ ہمارے ادب میں ظریف کا کوئی جواب نہیں۔ ظریف نے ایک "شہر آشوب" لکھا ہے۔ اس میں کچھ گنوار شاعروں کے کلام کے متعلق تنقید کرتے ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں ؎

اِک گنوار یا سُن کے یوں کہنے لگا اظہارِ رائے
یہ تو شاعر تھا پھسڈی اور بڑھیا کوئی آئے
جو گجل میں "جُلف" کا "ماسُوک" کا "نکتہ" دکھائے
"شوقینوں" ہم سے سوکینوں کے دل پر کچھ رُعاب اپنا جمائے
ڈانٹ کے للکار کے ہر ایک "مجبل" میں پڑے
جو گجل "موکے" پہ کہہ ڈالے "مکابل" میں پڑے

بھائی "مولا بکس" جس بستی میں ہم آباد ہیں
اس جگہ شاعر بڑے بڑھیا ہیں "مادر جاد" ہیں
ان سُبھوں میں سیکھ بدلو اِک جگت استاد ہیں
ان کو ہر موقع کی گجلیں مُنہ جبانی یاد ہیں
جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
"ساعروں" نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

اس طرح ظریف کا کلام ظرافت کا لباس اوڑھے رہتا ہے اور کبھی مضحکہ خیز بننے نہیں پاتا۔ ظرافت نگاری آسان نہیں اور شعر میں ظرافت کے گُل کھلانا اور مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ظریف نے اپنے دور پر جو تنقید کی ہے خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو یا اخلاق سے، تعلیم سے ہو یا رسم و رواج سے، سفر سے ہو یا حضر سے، اور شہر سے ہو یا دیہات سے، وہ جیتی جاگتی اور بھرپور رہے۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً میونسپل الکشن، ہوسِ شہرت، اور سفرنامہ عراق بے مثال ہیں اور ہمارے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ▲

نصیر الدین ہاشمی ؒ

شکارنامہ

حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کی توثیق

"شکارنامہ" (مصنف خواجہ بندہ نواز حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز) کے چند قلمی نسخے ہمدست ہوئے ہیں ایک کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت صاحبہ نے شائع کر دیا ہے، لیکن بعض اصحاب کو اس کے خواجہ صاحبؒ کی تصنیف ہونے میں شُبہ ہے اور تحقیق کے ساتھ وہ اس کو خواجہؒ کی تصنیف قرار دینے میں پس وپیش کرتے ہیں۔

اس وقت ہم کو ایک مطبوعہ کتاب مصنفہ شاہ رفیع الدین دہلوی ہمدست ہوئی ہے۔ جس سے شکارنامہ کے متعلق ایک گونہ تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ دراصل خواجہ بندہ نوازؒ ہی کی تصنیف ہے۔

یہ مطبوعہ کتاب "حل معما" کے نام سے موسوم ہے اور اس کو شاہ رفیع الدین نے سنہ ۱۲۲۰ھ میں تصنیف فرمایا ہے اور سنہ ۱۳۱۴ھ میں مطبع کلاک محل دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

کتاب کے ٹائٹل پر مصنف کے متعلق حسب ذیل صراحت ہے:

"تصنیف حضرت مخدومی و مولائی وحیدی مولوی شاہ رفیع الدین صاحب خلف فانی فی اللہ باقی باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی"

اس مجموعہ میں جو نو رسالے شامل ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ حل معما ۲۔ شرح چہل کاف ۳۔ جوابات سوالات اثنا عشر ۴۔ مکتوب بجواب شاہ غلام علی صاحب ۵۔ نذر بزرگان ۶۔ رسالہ بیعت ۷۔ حملہ ؟ ۸۔ افعال نماز ۹۔ نوافل نماز۔

رسالہ "حل معما" کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہے، جس سے اس رسالہ کے مصنف شاہ رفیع الدین دہلوی ہونے کی توثیق ہوتی ہے:

"بعد از حمد حضرت اله و درود پیغامبر والا جاه بر آل و اصحاب دین پناه بندہ مسکین محمد رفیع الدین بن شیخ الاسلام زبدہ العرفان بالله سیدی سندی ولی اللہ ابن شیخ الاعظم مولانا عبدالرحیم سکنہما فی العلیین والحقہ سلفہ الصالحین مخاطب اند کہ بعض یاران حل مسمرے از اسیماء حضرت غریب نواز محمد گیسو دراز قدس اللہ سرہٗ درخواستند انچہ حاضر الوقتؒ شنیدن می آید"

یعنی بندہ مسکین محمد رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے، بعض دوستوں نے خواہش کی کہ حضرت غریب نواز سید محمد گیسو درازؒ کے بعض اقوال جو اس وقت پیش نظر ہیں، حل کیا جائے۔

اس کے بعد نفس مضمون شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ خواجہ گیسو درازؒ کے شکارنامہ کا نام درج نہیں ہے لیکن جس معما کو حل کیا گیا ہے وہ شکارنامہ کا مضمون ہی ہے۔ جیسا کہ ناظرین کو اس امر کی اطلاع

ہے کہ خواجہ صاحب کا شکار نامہ دکھنی یعنی اُردو میں ہے۔ مگر شاہ رفیع الدین نے اس کو فارسی میں حل کیا ہے۔ مختصر طور پر یہاں خواجہ صاحب کے شکار نامہ اور شاہ صاحب کے حل کی عبارت درج کی جاتی ہے :-

شکار نامہ

حضرت گیسودرازؒ

نو باپان کے سات ماوان کے
چار فرزند تھے۔ تین ننگے
یکس کون کپڑا چہ نہ تھا۔
آستین میں پیسے تھے چاروں
مل کر بازار کوں گئے اور بازار
چوپس جنسان کا تھا.....
..... جس کی آستین
پیسے تھے اون چلا ہور گوشہ
نیں سو کماکو کیا۔ چہار تیر
تھے۔ تین ٹوٹے یکس کون
سفالہ نہ تھا ہور میانہ نہ تھا
جے سفالہ ہور میانہ نہ تھا سو
تیر کون لے کر چلنے جانے لگ
اس بات میں چار ہرن تھے
اس مرے یکس کون جیو نہ
تھا اس ہرن کو سفالہ ہور
میانہ نیں مار کو تیر سون مارے
تھے۔

اس میں ایک جنا آکر ملیا۔ ہور بولیا۔
میرا بھی تقسیم دیو یا کو نفس شیطان کہتے ہیں اکون
دئے دودھ۔ اسکے ہاتھ نیں پڑیا اور خربوزے کا
بیج بیو اس بیج کون بیل ہوی اس بیل کو بنجالے لگے

حل معما شاہ رفیع الدین

قول تعالیٰ تلك الامثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون۔

بدانکہ چہار برادر بودیم یعنی کون وفساد چہار عنصر بودند از نہ رب یعنی در جوف نہ فلک سہ جامہ برداشتند یعنی نار ہور باد وسطح طون کہ از نفوذ نظر حائل باشد برداشتند بلکہ شفاف اند ویک برہنہ بود یعنی ارض در دید چشم اشکال بود آن برادر برہنہ درست زرد آستین داشت یعنی زمین فراوان صور نوعیہ وصیناً عرضیہ در استعداد۔ رابسوے بے کیف واصل محض نداشت وسیلہ وصول با نحضرت مجز معرفت اجمالی لحاظ صرف کہ ایمان بالغیب نام دارد نتوا بر بود چہار آمر ودیدیم یعنی بطفیل دوام توجہ بعالم اطلاق چہار حقیقی مشہور گشت۔

آن تیر بے پیر و پیکان تجرید و بطلب چند بصحرا شدیم یعنی بشرف ایمان صحیح مشرف گشتہ۔ بتائید آن طالب کشف حقیقت گشتہ وتحقیق این نکتہ آنست نوع علمی کہ بحصول صورت باشد حائل از کنعت و طلبیت نیست۔

بہ زرد آلو تعبیر رفت خربزہ کاشت بودند یعنی ثانیاً گرفتار لذت وحلاوت وعنک در لغومت و فریب کہ ہر وزخربزہ حاصل است کشتند بخلاف آب می دارند یعنی تقاضائے نفس وھوا ھا مانی وعقائد باطلہ

یعنی اسکون عورت بولیگے کہتے ہیں اونوکا پیٹ بھرلیا
دنیا کی گرفتاری میں پڑیا، یعنی پیٹ بھر کھایا سو دو
بھوکا رھیا۔

پریشان اجما بالغیب پرورشں مے کردند
ازان درخت با ز یجانہ فرود آبدیم۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مزید نمونہ نظرانداز کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور قلمی کتاب کُتب خانہ آصفیہ میں ایسی ہمدست ہوئی ہے، اس سے بھی شکارنامہ کی ثوثیق ہوتی ہے۔ یہ کتاب حضرت محمد حسینؒ معظم قادری کی تصنیف ہے۔ اس کا اقتباس حسبِ ذیل ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شکارنامہ کا شروع فقیر حقیر محمد حسین معظم قادری اپنے حوصلہ موافق فرماتے ہیں۔ اسواسطے کہ یو عاجز اس گھر حقیقت میں طالب ہوا ہے ہور امین الدین اعلیٰ خود کون سجدہ کیا ہے اون کے تصدیق سون یو فقیر حقیر اس راز کون پہونچا ہے۔ نو باپ یعنی حضرت خواجہ حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ نو باب اللہ تعالیٰ انوکون امامت ملوک کیا ہے سو سات طبق آسمان ہور عرش ہور کرسی مل کر نو طبق ہیں۔ یہ نو کو نو باپ قرار دیئے ہیں۔ ہور مادان سو سات طبق زمین ہے۔ ہور اللہ تعالیٰ نے اس بات سپطے انوکو کہا ہے .... (۲۱۱۷) جدید

یہ کتاب ناقص ہے اس لئے پورے شکارنامہ کی عبارت اس میں درج نہیں ہے۔ بہرحال، ان کتابوں سے شکارنامہ کے متعلق یہ تصدیق ہوتی ہے کہ دراصل شکارنامہ خواجہ سید محمد حسینی گیسو درازؒ ہی کی تصنیف ہے۔ ▲

خلیل الرحمٰن اعظمی
دانش فرازی

ہمارے مسائل

مستقل نمبر

اُردو شاعری میں نئے تجربے

☆ اِن دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظمِ آزاد اور نظمِ مُعرّیٰ کے ساتھ ساتھ، ادھر کچھ شاعروں نے منثور نظم کے بھی تجربے کئے ہیں۔ ہیئت سے ہٹ کر مواد و موضوع میں بھی تنوع اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور نئی نئی علامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری خاص طور سے اُردو نظم، آگے بڑھنے کے بجائے رُوبہ زوال ہوتی جا رہی ہے۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو پڑھنے والوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ کسی کا اندازِ بیان اتنا کاواک ہے کہ کسی عُنوان بات پلے نہیں پڑتی اور کوئی ایسے دُور از کار خیالات کو بے سر و پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نظم چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس رُجحان کے اسباب اور اس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے؟

آپ لوگ نئی شاعری سے مایوس ہیں، میں تو اب بھی نئے لوگوں میں زیادہ جان پاتا ہوں۔ پُرانے لکھنے والے تھک تھکا کر بیٹھ گئے۔ سوائے اختر الایمان، مختار صدیقی اور مجید امجد کے اب کسی کے یہاں امکانات نظر نہیں آتے لیکن ہندوستان و پاکستان کی نئی نسل میں پچاسوں نام ایسے نظر آئیں گے جن کی ہر نظم اور ہر غزل اپنے اندر قوتِ نمو رکھتی ہے۔ خود آپ کے دکن میں اس وقت شاذ تمکنت، وحید اختر، شفیق فاطمہ شعریٰ، قاضی سلیم، عزیز قیسی، مغنی تبسم، انور معظم، راشد آذر، بشر نواز، نفیس جعفری، حمید الماس، عزیز تمنائی، مصحف اقبال توصیفی اور ذرا سا ہٹ کر احمد آباد میں محمد علوی، عادل منصوری، سرشار بلند شہری وغیرہ یہ سب ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں مجھے بے حد امکانات نظر آتے ہیں

پورے ہندوستان کے شاعروں کی فہرست بنائی جائے تو کم از کم پچاس نئے شاعر ایسے مل جائیں گے جن کے یہاں دس دس پندرہ پندرہ نظمیں اور غزلیں ایسی مل جائیں گی جو ۱۹۳۶ء والے شعرا کی تخلیقات کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہوں گی۔ شاذ تمکنت نے صحیح لکھا ہے کہ اس زمانے کی شاعری کی ابھی چھان پھٹک نہیں ہوئی ہے، مناسب تجزیہ، اس دور کے مخصوص محرکات، اس دور کے مزاجِ شعری اور اسالیب پر جو نئے اور تازہ اثرات ہیں ان کی تشریح و تحسین کی ضرورت ہے لیکن یہ کام کون کرے۔ مدرّس قسم کے نقادوں کے بس کا یہ روگ نہیں اس کے لئے بنے بنائے فارمولے، اقوال اور تراشے نہیں ملیں گے! گھر کی عقل استعمال کرنی پڑے گی۔ جو نقادوں یا تنقیدی مضمون نگ

کے پاس ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ دراصل اس وقت ہمارے یہاں
ت زیادہ مایوس کن تنقید ہے۔ تنقید میں یا تو درسی نوعیت کے
ین اور تحقیق کی بھرمار ہے، یا پھر تبرک کے طور پر پرانے نقادوں
ی ریڈیو ٹاک یا کسی جلسے میں پڑھا ہوا مضمون کہیں چھپا ہوا مل جاتا
۔ ورنہ نئی تنقید کے نام پر یار لوگ پاکستان کے رسالوں میں نرٹ کا
نا دکھا رہے ہیں۔ تو حضرت شاعری اور افسانہ نگاری کا رونا تو بند
ہ کیونکہ یہ تو وہ دریا ہے جو ہمیشہ بہتا رہے گا اور اس میں نیا
آتا رہے گا۔ البتہ تنقید کا کچھ علاج کرنا چاہیے۔ اس وقت نقاد
مخلوق ہے جو خود بیمار ہے لیکن پڑوسی کا ذکر اس طرح کرتا ہے
۔ اس کے کفن دفن کی فکر نہ کی گئی تو قومی نقصان ہوگا۔

خلیل الرحمن اعظمی

○

مجموعہ ادبی مسائل پر مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا گیا
۔ لیکن مستقل طور پر کسی نے اتنی اہمیت نہیں دی۔ میری ناچیز رائے
ہے کہ ادبی مسائل پر خاص خاص لوگوں سے لکھوانے کی بجائے عام
بحث فکر دی جائے تاکہ بات کھل کر کہنے کا سب کو موقع ملے۔ جناب
تمکنت نے جچے تلے انداز میں واقعی کام کی باتیں کہی ہیں۔ یہ حقیقت
ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک نے ڈھول پیٹ کر چند فنکاروں
کو آگے بڑھایا۔ جن میں فیض، سردار جعفری، کیفی اعظمی، اور مجروح سلطانپوری
قابلِ ذکر ہیں۔ وامق جونپوری اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا پروپیگنڈے
کے باوجود اپنا پرچم بلند نہیں کر سکے۔ نیاز حیدر تو بھرپور شعری صلاحیت
اور مشقی کے باوجود تبرک بن کر رہ گئے ہیں۔ غالباً سجاد ظہیر نے
بھی زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مخدوم لال سویرا کے بعد گہری دھند
میں روپوش ہو گئے۔ کچھ کہا بھی تو اس انداز سے کہ ترقی پسند تحریک کی
بات ہوئی مبادا کہ زندہ رہ سکے۔

ترقی پسند تحریک کے دور میں خم ٹھونک کر کسی کو منوانے کا مرض
ہو چلا تھا۔ ہمارے یہاں (جنوب میں) صرف مخدوم ہی ایسے تھے کہ
جنہیں آگے پروفیسر احتشام حسین، عبدالعلیم اور دوسرے نقاد سر جھکا
دیتے تھے۔ حالانکہ دکن کی مردم خیز سرزمین نے بہترین ارباب فن پیدا
کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اس میں کچھ ہمارا بھی قصور ہے قصور
یہ ہے کہ ہم نے اپنے یہاں کے فنکاروں کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی کبھی
زحمت گوارا نہیں کی۔

شاذ، وحید اختر، خورشید احمد جامی اور عزیز قیسی کو بھی بڑی دیر
کے بعد پہچانا گیا۔ جنوب اور شمال کے فرق کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی
اجتماعی طور پر ہمارا ادبی مسئلہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے
کہ جنوب اور شمال کے ڈانڈے ملنے کے باوجود درمیان میں پھر کچھ خلا
رہ گیا ہے۔ قربت کے باوجود بُعد کا احساس اپنی جگہ قائم ہے۔

جدید نظم نگاری نے ترقی کی ہے یا روبہ تنزل ہے۔ یہ بڑا اہم مسئلہ
ہے۔ اب تک جدید نظم نگاری کی سمت کا تعین نہیں ہو سکا۔ بعض کہتے
ہیں کہ جدید نظم اسالیب اور موضوع کے اعتبار سے تجربے کے مراحل
طے کر رہی ہے، نئے نئے تجربے، جدید آہنگ اور انوکھے انداز بیان
یہ سب کچھ جدید نظم کے شاندار مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن
سوال یہ ہے کہ تجربہ کب تک ہوتا رہے گا۔ وہ دن کب آئے گا کہ جب
ہم کہہ سکیں کے جدید نظم نے ادب میں اپنا خاص مقام پیدا کر لیا ہے۔

ن۔م۔ راشد، اختر الایمان، مجید امجد، محمود ایاز اور ڈاکٹر
عزیز تمنائی نے بڑی خوبصورت نظمیں ہمیں دی ہیں۔ شاذ تمکنت کا لہجہ
تو خاصا جانا پہچانا ہے۔ مگر جدید نظم کے سلسلے میں جو بے اطمینانی تذبذب
اور تشنگی کی فضا پیدا ہوئی ہے، اس کی وجوہ کیا ہیں۔ کیا جدید نظم نگاری
میں اقبال والی شاعری کے امکانات ہیں، کوئی ایسا جدید شاعر ہمارے
درمیان موجود ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ اس نے عظیم شاعری کی ہے
یا کسی عظیم شاعر کے قدموں کی آہٹیں ہمیں محسوس ہوتی ہیں۔

دانش فرازی

ماہر القادری

٭

○

حُسن والو! تمہاری بھی کیا بات ہے
ہر مُلاقات ، پہلی مُلاقات ہے

میرے اشکوں سے بھیگی ہوئی رات ہے
دل کی دھڑکن نہیں ہے، مُناجات ہے

بے ارادہ مرے گھر جو آپ آ گئے
یہ مرے جذبِ دل کی کرامات ہے

حُسن اپنی جگہ چاہے کچھ بھی سہی
عشق کو بھی تو پاسِ روایات ہے

ہے تغافل مگر جور نا آشنا
ہے توجہ مگر بے مدارات ہے

پرسشِ دل وہ کرتے ہیں اس شان سے
جیسے یہ بھی کوئی راز کی بات ہے

شفا گوالیاری

٭

○

حجابوں میں کسی کی بے حجابی ہم نے دیکھی ہے
شبِ آخر گلوں کی نیم خوابی ہم نے دیکھی ہے
سوالِ دید پر کیا حشر اُٹھا ہم بتائیں گے
نگاہِ ناز کی حاضر جوابی ہم نے دیکھی ہے
مآلِ سوزِ اُلفت پر نہ کیوں کر اشک بھر آئیں
سحر کو شمع کی حسرت مآبی ہم نے دیکھی ہے
اِک ایسا دَور بھی گزرا تری چشمِ عنایت سے
کہ تاحدِ نظر ہر شئے گلابی ہم نے دیکھی ہے
جہاں سے چاند سورج کو بھی رنگ و نُور ملتے ہیں
محبت کی وہاں تک باریابی ہم نے دیکھی ہے
نہ جانے کیا معمّہ ہے کہ میدانِ محبت میں
ہمیشہ حُسن ہی کی کامیابی ہم نے دیکھی ہے
ہم ہی ترتیب دے سکتے ہیں اپنے غم کا افسانہ
دلِ بدبخت کی خانہ خرابی ہم نے دیکھی ہے
اُٹھی غنچوں کے لب سے گر گلوں کے قلب جاگ اٹھے
شفا اُن کی برانگندہ نقابی ہم نے دیکھی ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

پچھلے پہر کیوں جاگ رہے ہو سوتے سب سنسار
جو آنکھوں کی نیند اُڑا دے کیوں وہ کرو بیوپار

سانجھ سویرے ندی کنارے دُھواں اُٹھے ہر روز
پھر بھی بھیڑ وہی میلے میں، سب وہی کاروبار

جاتے جاتے مکھڑے پر سرسوں کا رنگ نچوڑے
دِل کے نگر میں آتی ہے ہر سال بسنت بہار

دُھوپ سمے کی لگتی ہے تو ڈھل جاتا ہے رُوپ
کرنا ہے تو اے البیلی کر لے آج سنگار

بھری پُری بستی میں لوگو پڑا یہ کیسا کال!!
ہم کو کوئی دو میٹھے بول بھی دیتا نہیں اُدھار

○

شمعِ دل، شمعِ تمنا نہ جلا مان بھی جا
تیز آندھی ہے، مخالف ہے ہوا، مان بھی جا

ایسی دُنیا میں جُنوں، ایسے زمانے میں وفا
اسطرح خود کو تماشا نہ بنا، مان بھی جا

کب تلک ساتھ ترا دیں گے یہ دھندلے سائے
دیکھ نادان نہ بن، میرا کہا، مان بھی جا

شہر پھر شہر ہے، یاں جی تو بہل جاتا ہے
شہر سے بھاگ کے صحرا کو نہ جا، مان بھی جا

زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی
زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا، مان بھی جا

پھر نہ کچھ ہوگا اگر بعد میں پچھتایا تو
وقت ہے اب بھی ذرا ہوش میں آ، مان بھی جا

سید حرمت الاکرام

٭

○

نچ پاتے ہی سوزشِ غم کی
ل کی تقدیر اور بھی چمکی

قلبِ مضطر میں آ گئی کالے دوست
ہر ادا تیری زلفِ برہم کی

ن کی رنگین یاد کا عالم
چاندنی رات جیسے پونم کی

زخم پر زخم ہی ملے ہیں ہمیں
آرزو جب بھی کی ہے مرہم کی

تم نے پایا مزاج شعلہ کا
ہم کو فطرت ملی ہے شبنم کی

زندگی اک بلا سہی لیکن
کس کو فرصت ہے اسکے ماتم کی

خندۂ لب پہ مرنے والوں کو
کیا خبر لطفِ دیدۂ نم کی

"بامِ ثروت کے خوش نشینوں سے"
ہم نے کی بات عظمتِ غم کی

ہم ہی اہلِ جنوں نے اے منشاءؔ
تربیت کی مذاقِ عالم کی

○

شعلہ نہ سہی ایک شرر بھی ہے بڑی چیز
رہرو کے لئے زادِ سفر بھی ہے بڑی چیز

اک نقشِ قدم ہے شبِ تیرہ میں درخشاں
یہ شمعِ سرِ راہگذر بھی ہے بڑی چیز

گر ہو کے نیرنگئ عالم سے ہم آہنگ
ان کی غلط اندازِ نظر بھی ہے بڑی چیز

آئینۂ ماضی تو کبھی مشعلِ فردا
جینے کے لئے داغِ جگر بھی ہے بڑی چیز

تاریکئ ماحول سے اک چھیڑ ہے پیہم
نادان! یہ اُمیدِ سحر بھی ہے بڑی چیز

اک ضرب تو ہے سلسلۂ تیرہ شبی پر
اک لمحہ کا یہ رقصِ شرر بھی ہے بڑی چیز

تخریب کے پہلو میں سنورنا جسے آجائے
وہ دل بھی ہے اک شئے وہ نظر بھی ہے بڑی چیز

گذرے ہوئے ہنگاموں کا مدفن سہی لیکن
بے رونقئ شام و سحر بھی ہے بڑی چیز

سرمایۂ تاریخِ تمنا ہے ہر آنسو
حرمتؔ یہ مرا دیدۂ تر بھی ہے بڑی چیز

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

پچھلے پہر کیوں جاگ رہے ہو سوئے سب سنسار
جو آنکھوں کی نیند اُڑا دے کیوں وہ کرو بیوپار

سانجھ سویرے ندی کنارے دُھواں اُٹھے ہر روز
پھر بھی بھیڑ وہی میلے ہیں، سب وہی کاروبار

جاتے جاتے مکھڑے پر سرسوں کا رنگ نچوڑے
دِل کے نگر میں آتی ہے ہر سال بسنت بہار

دُھوپ سمے کی لگتی ہے تو ڈھل جاتا ہے رُوپ
کرنا ہے تو اے البیلی کر لے آج سنگار

بھری پُری بستی میں لوگو پڑا یہ کیسا کال!؟
ہم کو کوئی دو میٹھے بول بھی دیتا نہیں اُدھار

شہریار

○

شمعِ دل، شمعِ تمنا نہ جلا مان بھی جا
تیز آندھی ہے، مخالف ہے ہوا، مان بھی جا

ایسی دُنیا میں جُنوں، ایسے زمانے میں وفا
اسطرح خود کو تماشا نہ بنا، مان بھی جا

کب تلک ساتھ ترا دیں گے یہ دھندلے سائے
دیکھ نادان نہ بن، میرا کہا، مان بھی جا

شہر پھر شہر ہے، یاں جی تو بہل جاتا ہے
شہر سے بھاگ کے صحرا کو نہ جا، مان بھی جا

زندگی میں ابھی خوشیاں بھی ہیں رعنائی بھی
زندگی سے ابھی دامن نہ چھڑا، مان بھی جا

پھر نہ کچھ ہوگا اگر بعد میں پچھتایا تو
وقت ہے اب بھی ذرا ہوش میں آ، مان بھی جا

محمد منشاء الرحمٰن خان منشاؔ

○

آنچ پاتے ہی سوزشِ غم کی
دل کی تقدیر اور بھی چمکی

قلبِ مضطر میں آگئی اے دوست
ہر ادا تیری زلفِ برہم کی

اُن کی رنگین یاد کا عالم
چاندنی رات جیسے پُونم کی

زخم پر زخم ہی ملے ہیں ہمیں
آرزو جب بھی کی ہے مرہم کی

تم نے پایا مزاج شعلہ کا
ہم کو فطرت ملی ہے شبنم کی

زندگی اک بلا سہی لیکن
کس کو فرصت ہے اسکے ماتم کی

خندۂ لب پہ مرنے والوں کو
کیا خبر لُطفِ دیدۂ نم کی

"بامِ ثروت کے خوش نشینوں سے"
ہم نے کی بات عظمتِ غم کی

ہم ہی اہلِ جُنوں نے اے منشاؔ
تربیت کی مذاقِ عالم کی

سید حرمت الاکرام

○

شعلہ نہ سہی ایک شرر بھی ہے بڑی چیز
رہرو کے لئے زادِ سفر بھی ہے بڑی چیز

اک نقشِ قدم ہے شبِ تیرہ میں درخشاں
یہ شمعِ سرِ راہ گذر بھی ہے بڑی چیز

گو ہو سکے نیرنگیٔ عالم سے ہم آہنگ
ان کی غلط انداز نظر بھی ہے بڑی چیز

آئینۂ ماضی تو کبھی مشعلِ فردا
جینے کے لئے داغِ جگر بھی ہے بڑی چیز

تاریکیٔ ماحول سے اک چھیڑ ہے پیہم
نادان! یہ اُمیدِ سحر بھی ہے بڑی چیز

اک ضرب تو ہے سلسلۂ تیرہ شبی پر
اک لمحہ کا یہ رقصِ شرر بھی ہے بڑی چیز

تخریب کے پہلو میں سنور نا جسے آجائے
وہ دل بھی ہے اک شئے وہ نظر بھی ہے بڑی چیز

گذرے ہوئے ہنگاموں کا مدفن سہی لیکن
بے رونقیٔ شام و سحر بھی ہے بڑی چیز

سرمایۂ تاریخِ تمنّا ہے ہر آنسو
حُرمت یہ مرا دیدۂ تر بھی ہے بڑی چیز

علی احمد جلیلی

٭

○

نَم ہوئی جاتی ہے چشمِ دلبراں
بات میرے غم کی پہنچی ہے کہاں
یہ دُھندلکے، یہ اندھیری بستیاں
مجھ کو لے آئی یہ صبحِ نو کہاں
آشیانوں کی اندھیری راہ میں
راستہ دِکھلا رہی ہیں بجلیاں
زُلفِ جاناں تیری ظلمت ہی سہی
صدقے اس پر سے ہزاروں کہکشاں
میرے اشکوں کی نہ قیمت پُوچھیے
ضَم ہے ان میں رات بھر کی داستاں
دام، ہر تنکا چمن کا بن گیا
اِس سے بہتر تھیں قفس کی تیلیاں
کون گُزرا دِل کی راہوں سے ستلی
ہر قدم دیتا ہے منزل کا نشاں

تابش اکرامی مرزاپوری

٭

○

یہ خامۂ زرکار و گُہر بار بہت ہے
مجھ کو مرا سرمایۂ افکار بہت ہے
ہے سایۂ گیسو کا طلب گار بھی لیکن
وحشی کو ترا سایۂ دیوار بہت ہے
فطرت سے ملے یا نہ ملے اور کوئی شئے
انساں کے لئے عظمتِ کردار بہت ہے
تم اپنی محبت سے کہو مجھ کو بچا لے
دُنیائے خرد درپئے آزار بہت ہے
میں کیسے قریب آؤں تمہارے کہ ابھی تک
اُونچی حَرم و دیر کی دیوار بہت ہے
شاید مرے دِل ہی کو بہلنا نہیں آتا
ورنہ یہ تصور ترا دِلدار بہت ہے
انسان ہے گُمراہ و خطاکار یہ مانا
تآبش مجھے انساں سے مگر پیار بہت ہے

جوگندر پال

ایک تاثر

سلوٹیں

میں ایک کہانی کار ہوں اور کہانیوں کو اپنا ذاتی خون دے کر لافانی بنانے کا جتن کرتا رہتا ہوں۔ انسانی زندگی کے سبھی واقعات کو سبھی لمحات کو پرو پرو کر اب میرے ماتھے پر اَن گنت شکن اُبھر آئے ہیں۔

میں اب بوڑھا ہو چلا ہوں اور عنقریب چل بسوں گا اور لوگ باگ بیچارے میری پیشانی کی گھنی سلوٹوں میں اُلجھے ہوئے بھید نہ پہچان پائیں گے اور روتے روتے مجھے جلا دیں گے اور اُن جلانے میں میرے فکرمند ماتھے کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کے اسرار تلف کر دیں گے۔

میری خواہش ہے کہ جیتے جی ہی اپنی افسانوی فکر کی یہ گتھیں کیوں کھول جاؤں: —— ہر انسان ایک بڑی سرگرم، پیچ در پیچ کہانی ہے اور چونکہ سب کہانیاں سرگزشتی ہوتی ہیں اس لئے انسان کی داستانِ حیات بھی گوناگوں واقعات کا ایک فطری بہاؤ ہے۔ اس کا ہر باب پچھلے باب کی ہی ایک ارتقائی صورت ہے اور یہ ارتقائی عمل تا دمِ آخر کارفرما رہتا ہے۔

ہمارا ماضی —— بھلا یا بُرا —— اپنی جگہ عین مناسب و موزوں ہے۔ ایک اٹل سچائی کی مانند واجب التعظیم ہے، کیونکہ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا حُسن ناقابلِ یقین معلوم ہونے لگتا ہے اور مستقبل کے برتر پہلو مُعنقا ہو جاتے ہیں۔ ہر حالیہ لمحے میں بیک وقت عہدِ گزشتہ کی ناکام جُہد بھی ہوتی ہے اور عاقبت کی عظیم تر خواہش بھی!۔

اوقات کی یہ سہ گوشہ سالمیت ہر تخلیق کار کے پیشِ نظر ہوتی ہے، خدا کے بھی جو زندہ کہانیوں کا جنم داتا ہے اور کہانی کار کے بھی، جس کی تخلیقات پر زیست کی دھڑکنوں کا گُماں ہوتا ہے۔

نوشتہ : البرٹ ماز
ترجمہ : نریش کمار شاد

ایک امریکی کہانی

کرتب

"اور پھر میں گاڑی سے کود پڑا"
"تم کچھ بھول گئے ہو"
"کیا کہا ــــ نہیں، میں کچھ بھی نہیں بھولا"

لڑکے کی بے داغ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس کی عمر دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ سردی کی شدت سے اس کا چھوٹا سا نکیلا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں اسطرح جلدی جلدی جھپکنے لگا جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو۔

"ہاں تو ، آگے کہو"
"مجھے کچھ یاد نہیں"!
"ابے گدھے تو گرفتار ہونا چاہتا ہے"؟
"میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ میں نے ایسے کئی کھیل کھیلے ہیں، یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے"
"مگر یہ سب کیوں کر کر سکو گے۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ تمہیں کرنا کیا ہے؟"
"اچھا یہ بات ہے تو آپ اب دیکھتے رہئیے"
"میں اب کچھ نہیں دیکھنا چاہتا، چلو گھر واپس چلیں"

"ارے خدا کی قسم اب ہم ایسے ہی گھر لوٹ جائیں گے"
"تم قسمیں کس لئے کھا رہے ہو۔ اس طرح تمہیں کچھ یاد تو نہیں آجائے گا۔ میں نے تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے تمہارا قسمیں کھانا بالکل پسند نہیں۔ تم بڑے ہو کر ضرور اوباش بن جاؤ گے"!

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر ادھیڑ عمر کے آدمی نے سرد آہ بھری۔ اس نے سوچا کہ اب اسے چلنا چاہئیے۔ گھر جا کر ناشتہ گرم کریں اور پھر اپنے ہاتھ میں روٹی کا ڈبہ لٹکائے ٹرالی کی طرف چل دیں۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنی سیاہ اور گھنی مونچھوں سے برف صاف کی اور لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا "او شریر نٹ کھٹ چھوکرے، تم بہت سویرے باہر نکل آئے ہو تمہیں اس وقت اپنے بستر میں ہونا چاہئیے تھا"

"ہوں ــــ" وہ از سر نو لڑکے سے مخاطب ہوا۔ "اب بھی کچھ یاد نہیں آیا تمہیں؟"

لڑکے کا چہرہ سکڑ سا گیا اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں، رو رہے ہو کیا؟"

"نہیں رو تو نہیں رہا" لڑکے نے جواب دیا۔ "آپ مجھے کیا سمجھے

ہیں، کیا میں دودھ پیتا بچہ ہوں؟‘‘

’’تمہارے سب کام ننھے بچوں جیسے ہی تو ہیں۔ جو کچھ میں بتاتا ہوں تمہیں بالکل یاد نہیں رہتا‘‘

’’آں ــــ‘‘ لڑکا باہر نکلا اور مٹھی بھر برف لے آیا۔

’’یہ کس لیئے لائے ہو؟‘‘

’’میں کچھ برف لایا ہوں‘‘

’’میں اندھا تو نہیں ہوں، یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے لیکن لائے کس لئے ہو؟‘‘

’’میں برف کی گیند بنانا چاہتا ہوں‘‘

’’تم ابھی تک اسی طرح کی باتیں سوچتے ہو۔ میرا خیال تھا تم اپنی چھوٹی بہن کے لئے سب کچھ کر رہے ہو‘‘

’’ہاں اسی کے لئے تو کر رہا ہوں!‘‘

’’ایسا مت کرو، ایسی حالت میں جب تمہارا دماغ ادھر اُدھر بھٹک رہا ہے، تم ایسا نہ سوچو۔ چلو اب اندر آجاؤ‘‘ یہ کہہ کر اُس نے لڑکے کے بازو کو زور سے پکڑا اور اسے اندر کھینچ لیا‘‘ تم وہ لفافہ گھر بھول آئے۔ ارے بدھو! تم سب سے زیادہ ضروری چیز بھول گئے۔ جب تم لفافہ ہی گھر چھوڑ آئے تو میں کیوں کر مانوں کہ تم سب کام ٹھیک کر لو گے‘‘

’’نہیں جی، میں اسے بھول تو نہیں آیا‘‘ لڑکے نے کہا ’’دیکھئے یہ میری جیب میں ہے۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ آپ پھر لفافے کا ذکر کریں گے‘‘ یہ کہہ کر لڑکے نے اپنی جیب سے ایک میلا سا لفافہ نکالا اور اپنے منہ سے ہوا بھر کر اُسے پھلا دیا۔

’’اچھا تو پھر تم کیا کرتے ہو؟‘‘

’’جب تک دودھ والا گھر کے پچھواڑے نہیں چلا جاتا، میں انتظار کرتا رہتا ہوں‘‘

’’کونسا گھر؟‘‘

’’وہ رہا ــــ وہ ــــ وہ دیکھئے‘‘

’’وہ سبز رنگ کا!‘‘

’’نہیں وہ اگلا‘‘

’’سبز کیوں نہیں؟‘‘

’’اُغ ــــ خاہ ــــ میں سب کچھ سمجھ گیا‘ مجھے ددا کی ضرورت نہیں ہے ابا!‘‘

’’اگر تم نہیں بتاؤ گے تو ہم سیدھے گھر لوٹ جائیں گے‘‘

’’ــــ کیونکہ وہ سبز رنگ کے ساتھ والے دروازے کی طرف سے جاتا ہے اور دوسرے گھر کے پچھواڑے کی طرف جاتا ہے۔ تہہ۔ تہہ۔ تہہ۔ ابا میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ آپ نہ گھبرایئے!‘‘

’’میں جانتا ہوں تم کافی چالاک ہو‘‘ اس نے جواب دیا ’’تاہم ہمیں پورا اطمینان کر لینا چاہئیے۔ تمہارے ہاتھوں کو ٹھنڈ لگ رہی ہے کیا؟‘‘

’’ہاں مگر زیادہ نہیں‘‘

’’اچھا تو لفافے کو اپنی بغل میں دبا لو‘‘ یہ کہہ کر اس نے اس کے چھوٹے چھوٹے سفید ہاتھ اپنے بڑے بڑے سرخ ہاتھوں میں لے لئے اور انہیں آہستہ آہستہ مسلنے لگا۔

’’ہاں تو پھر کیا ہوتا ہے؟‘‘

’’جب وہ گھر کے پیچھے والے موڑ پر مڑتا ہے تو میں لپک کر بوتل اُٹھا لیتا ہوں اور پھر اسے اپنے لفافے میں ڈال کر اپنی راہ لیتا ہوں‘‘

’’تم بھاگتے تو نہیں‘‘

’’نہیں اطمینان سے چلتا رہتا ہوں‘‘

’’اور جب وہ تمہیں دیکھ لیتا ہے اور تمہارے پیچھے بھاگتا ہے تو پھر تم بھی بھاگتے ہو کہ نہیں‘‘

’’نہیں نہیں، میں اسی طرح اطمینان سے چلتا رہتا ہوں، جب مجھے پکڑ لیتا ہے تو میں رونا شروع کر دیتا ہوں‘‘

’’کیا تمہیں یقین ہے کہ تم رو بھی سکتے ہو؟‘‘

’’کیوں نہیں۔ میں نے مشق کی ہے رونے کی۔ میں بالکل ایسے

سکتا ہوں ۔ جیسے سچ مچ پٹ رہا ہوں "

" ہش اتنی بلند آواز سے نہ بولو "

" میرے ہاتھ اب بالکل ٹھیک ہیں ابا "

" انہیں اپنی جیب میں ڈال لو، لفافہ میں پکڑ لیتا ہوں ۔ اچھا تو جب پکڑے جاتے ہو، پھر کیا ہوتا ہے ؟ "

" بس میں روتا رہتا ہوں اور پھر تم آجاتے ہو اور کہتے ہو کہ تم نہیں جانتے ہو کہ میں ایک غریب لڑکا ہوں "

" ہش " اس نے اپنا ہاتھ لڑکے کے منہ پہ رکھ دیا " کوئی آرہا ہے ۔ تم ایسے ظاہر کرو جیسے تمہاری آنکھوں میں کوئی چیز پڑ گئی ہے "

لڑکے نے ایک آنکھ جلدی سے بند کرلی اور دوسری کھلی رکھی اور اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے وہ لڑکے کی آنکھ کو بغور دیکھ رہا ہے ۔

اور اتنے میں کوئی بے گھر آدمی زور سے گرتی ہوئی برف کو اپنی دائیں سے چیرتا ہوا تیزی سے گزر گیا ۔ اس کا سر کینوس کی ایک ٹوپی میں لپٹا ہوا تھا ۔

" ہم اس آدمی سے تو کہیں اچھے ہیں " ادھیڑ عمر کے آدمی نے دل ہی دل میں کہا اور پھر وہ دونوں اس کی جانب دیکھنے لگے حتیٰ کہ وہ دُور برف میں ایک دھبہ سا بن کر رہ گیا ۔

" برف باری تیز ہوگئی ہے " لڑکے نے دبی زبان میں کہا " دودھ والا مجھے سڑک کی دوسری طرف سے نہیں دیکھ سکے گا ۔ اب میں ایک سے زیادہ بوتلیں بھی اُڑا سکتا ہوں "

" نہیں ایک ہی کافی ہے ـــــ اچھا تو جب میں کہتا ہوں کہ میں تمہیں جانتا ہوں تو پھر کیا ہوتا ہے ؟ "

" پھر تم کہتے ہو کہ میں ایک بیمار ماں کا غریب بیٹا ہوں ، اور میں یہ دُودھ اسی کے لئے لے جا رہا ہوں اور اگر وہ مجھے اس دفعہ معاف کردے تو تم اس بات کا خیال رکھو گے کہ میں آئندہ ایسی حرکت نہ کروں ، یہی ہوتا ہے نا ۔ کیوں ابا ! "

" یہی ہوتا ہے " اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا اور اپنی مونچھوں سے برف صاف کرنے لگا ۔ ایک لمحے کے تامل کے بعد پھر بولا ۔ " کیا تمہیں بھوک لگی ہے ؟ "

" ہاں معمولی سی "

اس نے لڑکے کے بازو کو زور سے جھنجھوڑا ۔ " کوئی بات نہیں بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے ۔ تم سڑک پر تھوک دو اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے رہو " اور یہ کہہ کر اس نے باہر برف پر تھوک دیا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا ۔ لڑکے نے بھی اس کی نقل کی اور پھر دونوں ہنسنے لگے ۔

" اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ابھی ابھی کھانا کھایا ہے اور تمہارا پیٹ خُوب بھرا ہوا ہے " اس نے لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا ـــــ

لڑکے نے کہا " کیوں نہیں ۔ میں نے ابھی ابھی دو انڈے اور کچھ روٹی جو کھائی ہے " اور اس جھوٹ پر وہ دونوں پھر ہنسنے لگے ـــــ

" کوئی بات نہیں ، جب ہم گھر پہنچیں گے تو کچھ کھا پی لیں گے "

ادھیڑ عمر کا آدمی چوکنا ہوگیا ۔ اس کا بدن دفعتاً اکٹھا ہوگیا

" لو وہ رہی دُودھ والی گاڑی ۔ یہ لو لفافہ ، جب تک میں نہ کہوں باہر نہ نکلنا "

" اچھا " ـــــ لڑکے کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا ۔ " آپ یہیں ٹھہریئے ، بالکل یہیں ۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا ۔ میں اس سے پہلے سیب بھی اُڑا چکا ہوں "

" ایک بات تمہیں اور بھی یاد رکھنی چاہیئے ۔ اگر کچھ گڑبڑ ہوگئی تو میرے اشارے کو سمجھنا ۔ میں اگر بھاگنے کا اشارہ کروں تو فوراً بھاگ جانا ۔ میں چاہے کچھ بھی کروں ۔ تم بھاگتے چلے جانا ۔ سمجھے "

" بہت اچھا "

" وعدہ کرتے ہو "

" ہاں "

" یاد رکھنا مجھ پر خواہ کچھ بھی گزرے "

" بہت اچھا "

دُودھ والی گاڑی دھیرے دھیرے سڑک کے دوسری
رینگنے لگی ۔ وہ دونوں دروازے میں سُکڑ کر بیٹھ گئے ۔

"جب گاڑی نل کے پاس پہنچ جائے ۔ ہاں ـــــ اب گھبراؤ
چھے بیٹے ۔ چلو ہاں چلو ۔"

لڑکا باہر نکلا اور سڑک پر نرم نرم برف میں اپنے پاؤں دھرتا
ستہ آہستہ چلنے لگا ۔

"مجھے چاہیئے تھا کہ اسے اپنی ٹوپی نیچے کر لینے کے لئے
یتا ۔ برف اس کی آنکھوں میں پڑ جائے گی ۔" وہ اپنے نیچے لٹکے
سے سانس لیتے ہوئے سوچنے لگا ۔ اس کی چھاتی کانپ رہی
ور اس کی ہر سانس میں اسے ایک ٹیس سی اٹھتی ہوئی محسوس
ی تھی ۔

دُودھ والا مکان کے پچھواڑے میں غائب ہو گیا ۔ لڑکے
گے کر چھلانگ لگائی اور گاڑی کے سامنے کے حصے سے کُود کر
پہنچ گیا ۔

"اتنی دیر کیوں ـــــ" وہ پھر سوچنے لگا ۔ "یا خدا اتنی دیر
؟"

لڑکا نرم نرم برف میں کُود پڑا ۔ اس نے دودھ کی بوتل لفافے
الی اور سڑک پر تیزی سے چلنے لگا ۔ دُودھ والا گلی میں سے
ا نظر آ رہا تھا ۔ ادھیڑ عمر کے آدمی نے دیکھا کہ وہ سڑک پر ساتھ
مکان کی طرف مُڑ گیا ۔

وہ مارا ـــــ اب سب کچھ ٹھیک ہے ـــــ وہ بالکل محفوظ
ـــــ اس نے اپنی مُونچھوں کو ایک دفعہ پھر جھاڑا ۔ کھانسا اور
بان کی سانس لی اور لڑکے کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔

لڑکا دوسرے چوراہے پر اس کا منتظر تھا ۔ اس کا ننھا
ہرہ چمک رہا تھا ۔ "دیکھا ابا ! میں نے کیسے سب ٹھیک کر لیا"
ا مسرت سے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا ۔

"یقیناً ـــــ شاباش بیٹے ۔" اس نے لڑکے کے سر کو
سے تھپکتے ہوئے کہا ۔ "لاؤ اس لفافہ کو میں اُٹھا لوں ۔"

"نہیں، ایسا ہی ٹھیک ہے ۔" لڑکے نے کہا ۔

"اچھا ۔"

"ابا ! یہ تو بہت آسان کام تھا ۔ میں دوسری بوتل بھی اُڑا
سکتا تھا ۔" برف میں سے کُودتا ہوا وہ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے
دوڑنے لگا ۔ "ابا ! ـــــ تو کل میں دو بوتلیں اُڑا لوں، کیوں ؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا ۔

"ابا ـــــ ارے ابا !" لڑکے نے اس کے کوٹ کا کالر
پکڑ کر اسے جھنجھوڑا ۔

"کیا ہے ؟"

"اُڑا لوں ۔"

"کیا اُڑا لوں ؟"

"میں نے ابھی ابھی بتایا نا ۔"

"میں نے نہیں سُنا ۔"

"کیا میں کل دو بوتلیں اُڑا لوں ۔ یہ بالکل آسان ہے، میں
بڑی خُوبی سے اُڑا سکتا ہوں ابا ۔"

"نہیں ۔"

"ہاں ہاں، میں دو بھی اُڑا سکتا ہوں ۔"

"نہیں ۔"

اور وہ دونوں خاموشی سے چلنے لگے ۔

"میں یہ سوچتا ہوں کہ میں اپنے یار دوستوں کو بھی یہ بات
بتا دوں ۔"

اس کا باپ چلتے چلتے رُک گیا ۔ "تم کسی کو بتاؤ تو سہی، میں
تمہاری گردن مروڑ دوں گا، ہاں تمہاری گردن مروڑ دوں گا ۔"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گا ۔ میں تو
یونہی کہہ رہا تھا ۔"

"یہ چوری ہے ۔" اس کے باپ نے کہنا شروع کیا ۔ "سُنا تم
نے یہ چوری ہے ۔"

"ہاں میں جانتا ہوں ۔ تہہ ۔ تہہ ۔ تہہ آؤ ابا ! اب چلیں

مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

وہ پھر چلنے لگے۔ برف سے بچنے کے لئے وہ اپنے سر جھکائے ہوئے تھے۔

"کیا تمہارے پاؤں گیلے ہوگئے ہیں؟"

"ہاں کچھ کچھ۔"

"جب مجھے کام مل جائے گا تو میں تمہیں ربڑ کے جوتے لے دوں گا۔ پھر برف میں چلتے وقت بھی تمہارے پاؤں خشک اور گرم رہیں گے۔"

"ممکن ہے ریلیف والے تمہارے لئے ربڑ کے جوتے دیدیں۔" لڑکے نے پُراُمید ہوکر کہا۔

"شاید ——— میں نے پہلے بھی انہیں کہا تھا۔ اب بھی یاد دلاتا رہوں گا۔"

"ویسے پاؤں گیلے ہوجانے سے مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی ابا!"

اس کا باپ اچانک پھر رُک گیا۔ "تمہیں معلوم ہے نا کہ چوری کرنا بُرا کام ہے۔"

"ہاں ابا! میں جانتا ہوں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی۔ میں نے زندگی بھر محنت کی ہے۔ میں ایک اچھا کاریگر ہوں۔ میں نے بہت کمایا ہے۔ تم اپنی ماں سے پوچھ سکتے ہو۔"

"کیا بات ہے ابا؟" لڑکے نے کہا۔ "آپ کو ایسی باتیں دل میں نہیں لانی چاہئیں۔ میں بڑا ہوکر چور نہیں بنوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ چوری کرنا بُرا کام ہے۔"

"تم نے ابھی ابھی بتایا نا کہ تم سیب بھی اُٹھا لئے تھے۔"

"ہاں ابا! یار دوستوں میں ایسی چیز کی کبھی کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔"

"ہُنہ۔"

"لیکن میں چوری نہیں کروں گا، میں بڑا ہوکر آپ جیسا طاقتور بنوں گا۔ کام کروں گا، کوئی اچھا کام۔"

لڑکے کی یہ بات سُن کر وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ——— "بالکل شیطان ہو تم" ——— اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"جب میں تمہاری عمر کا تھا تو تم سے کہیں زیادہ لمبا تھا ارے میرے چھوٹے سے بندر! تمہیں بڑے ہونے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔"

"ابا مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

اور وہ تازہ تازہ سفید برف میں خاموشی سے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ▲

راز یوسفی (لاہور)

ٹرنک کال

"کیا میں اندر حاضر ہو سکتی ہوں؟"

"ضرور تشریف لائیے۔"

"جی، میں کرسی پر بیٹھ سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ کرسی عزت افزائی کی منتظر ہے۔"

"کیا میں پوسٹ ماسٹر صاحب سے مخاطب ہوں؟"

"جی نہیں، سب پوسٹ ماسٹر سے، اور وہ میں ہی ہوں۔"

"پوسٹ ماسٹر اور سب پوسٹ ماسٹر میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"وہی جو افسر اور ماتحت میں ہوتا ہے۔"

"اس دفتر کا بڑا افسر کون ہے؟"

"خاکسار ہی کو سمجھ لیجئے۔"

"پھر تو آپ افسر ہوئے، ماتحت کیونکر ہوئے۔"

"آپ ایسا ہی سمجھ لیجئے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ افسر افسر ہی رہتا ہے اور ماتحت، ماتحت۔ پھول کو کسی نام سے پکاریئے اس کی خوشبو کم نہیں ہوتی۔"

"بہت خوب۔ آپ کا مزاج تو شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ کبھی تھا، لیکن اب تو میں صرف پبلک کا خادم ہوں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شاعری اپنی جگہ، خدمت اپنی جگہ۔"

"جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔ یہ اپنی اپنی جگہ تو رہ سکتی ہیں، لیکن ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔"

"آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟"

"مال روڈ تک!"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔"

"سمجھنے کی کوشش بھی نہ کیجئے۔ میں نے یونہی بے خیالی میں کہہ دیا تھا۔"

"آپ کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔ مجھے اصرار کرنے کا حق تو نہیں پہونچتا، لیکن اگر آپ اس کی وضاحت کر ہی دیں تو کیا برائی ہے؟"

"تو سن لیجئے۔ میری تعلیم بی۔ اے تک ہے، لیکن اس تعلیم سے مجھے اس کے سوا اور کوئی فائدہ نہ پہنچا کہ میں مال روڈ کے جی پی او کو اپنی آخری منزل سمجھ کر تھا، ت کی بھول بھلیاں میں گم ہو گیا۔"

"تو کیا آپ اپنی ملازمت سے خوش نہیں ہیں؟"

"اب خوشی اور ناخوشی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ماتحتے کی

تحریریں مٹائے نہیں مٹتیں۔ انسان تقدیر کے زبردست ہاتھوں میں بے بس کھلونا ہے یا سمندر میں وہ کمزور سفینہ جسے بے رحم موجیں جہاں چاہیں بہا کر لے جائیں۔"

"یہ تو واقعی بڑی افسوسناک بات ہے۔ میرے ڈیڈی صرف میٹرک ہیں، لیکن اب بہت بڑے افسر ہیں۔"

"ان کی پشت پر بہت بڑی سفارش بھی تو ہوگی۔"

"جی ہاں میرے نانا بھی بہت بڑے افسر تھے۔"

"ٹھیک ہے ملازمت میں یہ نسخہ بڑے کام کی چیز ہے۔"

"پھر آپ یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے ہے؟"

"مجھے خودکشی سے نفرت ہے۔"

"آپ اسے خودکشی کہتے ہیں"

"کہنا ہی پڑتا ہے۔ ملازمت کا مستقبل کتنا تاریک ہے، آجکل لگی ہوئی ملازمت کو چھوڑ دینا اور خودکشی کر لینا ہم معنی ہیں۔"

"خیر اسے چھوڑیئے، اور اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔"

"میرا نام ناصرہ شاہین ہے۔ بی۔ اے میں پڑھتی ہوں۔ میرے ڈیڈی اونچے مدجے کے افسر ہیں۔ ہم حال ہی میں کراچی سے ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں۔ آپ کے قریب ہی بنگلہ نمبر ۵۷ میں رہتی ہوں اور یہ میری چھوٹی بہن ہے، اس کا نام ہے ریحانہ شاہین۔ بڑی شوخ ہے۔"

"وہ تو صورت ہی سے ظاہر ہے۔ لیکن مزاج کی بڑی خاموش ہیں۔ جب سے آئی ہیں زبان تک نہیں ہلائی، ما نو گونگی ہیں؟"

"اسے چپ ہی رہنے دیجئے۔ بولنے پر آئے گی تو ریڈیو سیلون بن جائے گی جو کبھی خاموش نہیں ہوتا۔ دیکھئے نا، چٹکیاں بھر رہی ہے تاکہ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے مبالغہ کی حدوں کو نہ چھونے لگوں۔"

"آپ بھی تو زیادتی کر رہی ہیں، ایک خاموش فطرت بچی کو ریڈیو سیلون سے تشبیہہ دے رہی ہیں۔"

"ہاں! یہ آپ کی میز پر بہت سے رسالے پڑے ہیں، آپ مطالعے کے کافی شوقین معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ آج ہی کی ڈاک سے آئے ہیں۔"

"آپ کو تو خوب مزہ رہتا ہے۔ دوسروں کے رسالے مفت پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں محترمہ۔ یہ سب کے سب میرے نام آتے ہیں"

"پھر تو آپ مطالعہ کے لئے کافی رقم خرچ کرتے ہوں گے"

"نہیں یہ بات بھی نہیں، یہ سب کے سب اعزازی طور پر میرے نام آتے ہیں۔"

"اعزازی طور پر؟ میں سمجھی نہیں!"

"میں ایک معمولی سا افسانہ نگار ہوں، کبھی کبھی کسی رسالے میں میری کوئی کہانی چھپ جاتی ہے تو اس کے صلہ میں بہت سے رسالے والے میرے نام رسالے بھجواتے رہتے ہیں۔"

"خوب! تو آپ افسانہ نگار بھی ہیں، کیا میں آپ کا ادبی نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"خاکسار کے افسانے شاہد جمال کے نام سے چھپتے ہیں۔"

"اوہ! تو آپ شاہد جمال ہیں۔ میرے محبوب قلمکار، میں آپ کے افسانے بڑی دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا افسانہ "اپنی اپنی پسند اور "شرارہ" مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ آپ کا شمار تو ملک کے نامور افسانہ نگاروں میں ہونا چاہئے۔"

"آپ کا مطالعہ کافی وسیع معلوم ہوتا ہے۔"

"کچھ نہ پوچھئے۔ جی چاہتا ہے، دنیا کے سارے کام کاج چھوڑ کر دن رات پڑھتی رہوں اور ہاں "آخری ملاقات" آپ کی بڑی رومانٹک کہانی تھی۔ میں تو اسے پڑھتے پڑھتے کسی اور ہی دنیا میں کھو گئی تھی۔ آپ نے محبت کا کتنا صحیح تجزیہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے محبت کی ناکامی نے آپ کو اتنا قنوطی بنا دیا ہے۔"

"محترمہ! معاف کیجئے۔ محبت کے معاملہ میں میرا تجربہ بالکل صفر کے برابر ہے۔ میں سیدھا سادا انسان ہوں۔ محبت کی پیچیدگیوں کو کیا سمجھوں؟ قلم کو کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتا ہوں، اگر اس سے کوئی

سچی بات نکل جائے تو اسے بس اتفاق ہی سمجھئے۔"

"آپ بننے کی کوشش کر رہے ہیں یا بنانے کی؟"

"دونوں ہی نہیں۔"

"جب تک کسی قلمکار کو کسی موضوع سے متعلق کوئی ذاتی تجربہ نہ ہو وہ کبھی اس موضوع پر جچی تلی رائے نہیں دے سکتا۔"

"محترمہ! یہ اٹیمی دور ہے۔ ہم تجربات کی دنیا سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں رہا کہ ہم معمولی سے معمولی بات کے لئے بھی انفرادی طور پر تجربے کرتے رہیں۔ ہمارے بزرگ اتنے تجربے کر چکے ہیں کہ ہمارے لئے وہی مشعلِ راہ ہیں اور ہم کوئی ذاتی تکلیف اٹھائے بغیر ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ شاید محبت کے لطیف احساس کو سائنسی تجربات پر محمول کر رہے ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ محبوب کی بے اعتنائی، شبِ فرقت کی تلخی اور گھٹن اور رقیبِ سیاہ کی عیارانہ چالوں کو ایک عاشق کا دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ ہر کس و ناکس کو ان تلخ حقائق کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟"

"محبت کے موضوع پر آپ کی معلومات کافی وسیع معلوم ہوتی ہیں۔"

"جی دیکھئے نا، میں ایک ایسے کالج میں تعلیم پاتی ہوں، جہاں مخلوط طریقۂ تعلیم رائج ہے، اور جہاں یہ طریقۂ تعلیم رائج ہو، وہاں عملی نہ سہی، مشاہداتی تجربہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں اسی لئے ذاتی طور پر مخلوط طریقۂ تعلیم کے خلاف ہوں۔"

"پھر آپ ایسے کالج میں تعلیم کیوں پاتی ہیں؟"

"مجبوری ہے۔ میں نے جو مضامین لے رکھے ہیں، کسی اور کالج میں ان کا انتظام نہیں ہے۔"

"یہ بھی بڑی خوشگوار مجبوری ہے۔"

"آپ شاید طنز پہ اتر آئے۔"

"توبہ توبہ!! میں ایسی جرأت کیوں کر کر سکتا ہوں۔ میں دفتری ماحول میں کبھی یہ نہیں بھولتا کہ میں دفتری ملازم ہوں اور دفتری ملازم کو ایک اچھے بزنس مین کی طرح کبھی یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس کی معمولی سی غفلت اس کے کاروبار پہ برا اثر ڈالتی ہے۔"

"آپ کے ہونٹوں پر کھیلتا ہوا تبسم آپ کے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔"

"وہم کا کوئی علاج نہیں۔"

"خیر چھوڑئیے۔ آپ مشہور افسانہ نگار خاتون ناصرہ شاہین کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں! میں نے ان کے کئی افسانے پڑھے ہیں۔ اچھے لکھتی ہیں۔"

"پھر بھی آپ مجھے ابھی تک نہیں پہچانے۔"

"تو کیا آپ وہی ناصرہ شاہین ہیں — میرا مطلب ہے افسانہ نگار ناصرہ شاہین؟"

"جی، آپ کی دعا ہے۔"

"بہت خوب، خوب گزرے گی جو...."

"مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"دیوانے نہیں، افسانہ نویس کہیئے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ افسانہ نویسی اور دیوانگی میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دونوں "جذباتی پریشر" کے مریض ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ آپ کا یہ خیال کسی حد تک درست ہی ہے۔"

"آپ نے میرا افسانہ "جنم جنم کی پیاسی" تو پڑھا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ پڑھا تھا اور بہت پسند بھی کیا تھا۔ آپ نے ایک بڑے نازک موضوع پر قلم اٹھایا تھا اور ایک محروم محبت دوشیزہ کے جذبات کی عکاسی کی تھی جو کسی مرد کی منظورِ نظر نہیں بن سکی تھی۔"

"تحریر انسان کے ذاتی واردات کا عکس ہوتی ہے۔ آپ کا اس مقولہ پر کہاں تک ایمان ہے؟"

"میں حرف بہ حرف اس کی تائید کرتا ہوں۔ قلمکار جو کچھ سوچتا ہے، جیسے ماحول سے گزرتا ہے، جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے انہی باتوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔"

" اور جمال صاحب ! زندگی بڑی تلخ حقیقت ہے ۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے (سرد آہ بھر کر) خیر جانے دیجئے ۔ میں بھی موضوع لے بیٹھی "

" آپ بہت دُکھی معلوم ہوتی ہیں "

" نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ کر جانے کیا کچھ کہہ گئی ۔ آپ کے سامنے مجھے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں ۔ آپ میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے ؟ "

" کچھ بھی تو نہیں ۔ آپ کا دُکھ زمانے سے نرالا اور علیحدہ نہیں ہے کالج کے ماحول میں رومیو جولیٹ، شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں پیدا ہوتے ہیں ۔ ٹیڈی فیشن جنم لیتے ہیں ۔ اس میں آپ کا کیا قصور ہے ؟ "

" آپ کا نقطۂ نظر درست نہیں ۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے "

" ہو سکتا ہے، میرا خیال غلط ہو ۔ اس غلط اندیشی کے لئے معافی چاہتا ہوں "

" اوہ ! مجھے یہاں آئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی ۔ اور وہ کام ہی یاد نہ رہا، جس کے لئے میں یہاں آئی تھی "

" کوئی حرج نہیں ۔ اب یاد کر لیجئے "

" مجھے کراچی کے لئے ایک ٹرنک کال کرنا تھا ۔ اپنے ایک بوائے فرینڈ خالد بشیر سے ۔ ان کا ٹیلیفون نمبر ہے، ۶۵۷۸۲ ۔ مہربانی کر کے ذرا جلدی سے بلوا دیجئے ۔ ڈیڈی کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے "

" ابھی لیجئے "

(گھنٹی کی آواز) کون ۔۔۔ خالد ؟ میں ناصرہ شاہین بول رہی ہوں ..... ہاں ! ہاں !! خیریت سے پہنچ گئی ہوں ..... ڈارلنگ جب سے یہاں آئی ہوں، ایک دم بور ہو گئی ہوں ۔ یہاں کوئی اچھی کمپنی بھی تو نہیں ملی ..... ہاں ! ہاں !! ابھی میں نے کالج میں داخلہ بھی نہیں لیا ہے ..... بس ۔ ایک آدھ ہفتہ تک داخلہ لے لوں گی .... کیا کہا ..... کلفٹن کی سیر ..... اوہ ! ڈارلنگ، وہ رات کتنی بیوٹی فُل تھی، کتنی ونڈر فُل ۔ تم تھے، میں تھی ہنستاتی ہوئی ہوا تھی ..... ہر طرف رُومانس ہی رُومانس تھا ۔ ہاں ! ڈارلنگ راستے میں ایک بات بہت خراب ہوئی ۔ کسی نے میرا پرس اُڑا لیا ..... پھر کیا ہوتا ..... بہت پریشان ہوئی ۔ ممّی کے پیسے بھی اسی پرس میں تھے ..... وہ آجکل بے حد خفا ہیں ..... ہاں ! ہاں !! کچھ بھجوا دو، دو سو کافی رہیں گے .... اچھا، پھر ملیں گی .... گڈ بائی .... ٹاٹا ..."

" شکریہ جمال صاحب ! "

" اس میں شکریہ کی کیا بات ہے ۔ یہ تو میری ڈیوٹی ہے "

" پھر بھی آپ میرے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے آجکل انسانیت تو ایک ناپید خزانہ ہے "

" آپ کا حُسنِ ظن ہے ۔۔۔ یہ لیجئے ۔۔۔ رسید ۔۔ ٹرنک کال فیس صرف چوبیس روپے "

" چوبیس روپے ۔۔۔ ؟ "

" جی ہاں ! چوبیس روپے ۔ آپ نے چھ منٹ بات کی ہے نا ؟ "

" اوہ ۔ مگر میرے پاس تو اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں ! "

" یہ تو سرکاری فیس ہے ۔ ہر قیمت پر ادا کرنی ہوگی "

" کوئی بات نہیں ۔ ابھی ملازم کے ہاتھ بھجواتی ہوں، اور میرا پتہ تو آپ کو معلوم ہی ہے "

" جیسی آپ کی مرضی ۔ جاتے ہی بھجوا دیجئے، تاکہ سرکاری حساب میں فرق نہ آئے "

" آپ فکر نہ کریں، مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے ۔ آپ کا کام بڑا نازک ہے ۔ میں خوب سمجھتی ہوں "

" شکریہ "

" اچھا خدا حافظ "

" خدا حافظ ۔۔۔ "

دو دن تک ناصرہ شاہین کے ملازم کا انتظار کیا گیا ۔ مگر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ تیسرے دن رقم کا مطالبہ کرنے کیلئے جب سرکاری چٹھی بھیجی گئی تو وہ بلا تقسیم واپس آگئی ۔ ڈاکئے نے چٹھی کے پُشت پر لکھا تھا ۔

" بنگلہ نمبر ۵۷ میں اس نام کی کوئی عورت نہیں رہتی " ▲

عاتق شاہ

"کڑڑ کا اصلی تیل"

جیسے ڈالڈا گھی ہوتا ہے ویسے ہی اصغرالنسا تھی ۔ اس کے برخلاف زلیخا کڑڑ کا اصلی تیل تھی ۔ گرم گرم توے پر پڑا اور چڑ چڑ کی آواز آئی ۔ لیکن اس کے باوجود یوسف کو زلیخا ہی پسند تھی !۔

اصغری بیگم عرف شہزادی ، نشار احمد خان ایک باغ وبہار کنسٹرکشن کمپنی کے مالک کی بڑی لڑکی تھی ۔ اس کے بعد لگاتار انہیں سات لڑکیاں ہوئیں ۔ آٹھواں لڑکا تھا ۔ ظاہر ہے سب لڑکے کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ۔ لیکن اس کا اثر شہزادی پر نہیں پڑا ۔ شہزادی اپنی جگہ شہزادی تھی ۔ ایک تو اُس کے بڑپن کی وجہ سے ، اور دوسرے باپ کی آدھی مالکیت اُس میں آگئی تھی ، اور تیسرے اُس کے شہرہ آفاق حُسن کی وجہ سے ۔ کہتے ہیں نشار احمد خان کی سات پُشتوں میں ایسی حسین لڑکی پیدا نہیں ہوئی !۔

سُنا ہے جب وہ پیدا ہوئی تو اُس کے حُسن کی روشنی وارڈ سے ہوتے ہوئے پورے ہاسپٹل میں پھیل گئی ۔ !

نشار احمد خان ، بیوی کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایک مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے دواخانے کے اشاف پر نظر ڈال کر اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا ۔ دوسری مسکراہٹ انہوں نے اپنی بیوی پر پھینکی جو نیم مدہوشی کی حالت میں اپنے بستر پر چت پڑی تھی اور تیسری مسکراہٹ اپنی بیٹی پر نچھاور کرتے ہوئے انہوں نے بڑے چاؤ سے کہا ـــــ

میرے شہزادے ـــــ

لیکن شہزادے نے کچھ جواب نہیں دیا ۔ کیونکہ وہ شہزادہ نہیں تھا ، شہزادی تھی ۔

اُس وقت نشار احمد خان ، باغ وبہار کمپنی کے پروپرائٹر نہیں تھے اور نہ کسی آفس میں کلرک تھے ، بلکہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور ایم ۔ اے کے طالب علم تھے ۔ گریجویشن انہوں نے بڑی مفلسی میں کیا ۔ والد کے انتقال کے بعد وہ اپنی بڑی بہن عاقلہ کے نذیر پور شریف آگئے ۔ اور عاقلہ کا شوہر تحصیل آفس کا معمولی چوکیدار تھا اور معمولی چوکیدار ہمیشہ معمولی آدمی ہوتا ہے اور اس کے خیال کی پرواز بھی ہمیشہ نیچے ہی نیچے رہتی ہے ۔ وہ زمین پر ایک کیڑے کی طرح رینگنے کا قائل ہوتا ہے ۔ چنانچہ اُس کیڑے نے نشار احمد خان کی اعلیٰ تعلیم کی بڑی مخالفت کی ۔ اور اپنی بیوی سے اُس نے کہا ۔

ـــــ " اری بنو تو میری سُن اور اپنے بھائی سے کہہ کر

ری نوکری کرلے۔ کہیں اور نہیں تو اپنے دفتر ہی میں اُسے منشی کی جگہ رکھوا دیتا ہوں۔ صاحب بڑے غریب پرور آدمی ہیں۔"

لیکن تبو اپنی بات پر اَڑ گئی۔ اور جب عورت اَڑ جاتی ہے تو مرد اس قابل ہی نہیں رہتا کہ زندگی کی گاڑی کھینچ سکے۔ لہٰذا نثار احمد نے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ اور تحصیل آفس کے چوکیدار نے اُس بچی بچائی پونجی کو نثار احمد پر خرچ کرنا شروع کیا جو وہ اپنی بچی زلیخا کے لئے اُٹھا رکھا تھا۔

اس کے بعد وہ اکثر گُم سُم رہنے لگا۔ لیکن جس دن انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نکلا اور پہلے درجہ میں کامیابی کی وجہ سے نثار کی تصویر شہر کے اخبارات میں چھپی تو وہ جیسے خود کو بھول گیا۔ سب کو بھول گیا اور مارے خوشی کے ناچنے لگا۔ ضلع کی معمولی ہوٹل میں جب ایک ساتھی چوکیدار نے اُسے اخبار بتا کر کہا۔

"ارے دیکھ تو حمدو اخبار میں تیرے سالے کا فوٹو چھپا ہے"

تو حمید جو بگڑ کر حمدو بن گیا تھا، بڑی حیرت سے تصویر دیکھتا رہا۔ خوش ہوتا رہا اور بار بار ہوٹل میں بیٹھے ہوئے بابو لوگوں سے اخبار پڑھوا کر سنتا رہا۔ اور پھر دوست کے کندھے پر اپنا بھرپور ہاتھ مارتے ہوئے اُس نے کہا۔

"کیا بکتا ہے تُو ـــــ نثار میرا سالا نہیں، میرا بیٹا ہے بیٹا"!

کسی اور موقع پر حمدو ایسا زور دار ہاتھ مارتا تو یقیناً اس کا ساتھی اُس سے لڑ پڑتا۔ لیکن خوشی کا موقع تھا اور پھر ایسی خوشی کا موقع جو حمدو کو پاگل کر دیا تھا وہ اپنے کندھے کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"سچ مچ تو نثار کا باپ ہے حمدو ـــــ اور مجھ سے پوچھ تو باپ سے بھی بڑھ کر۔ بھلا باپ بھی کیا کرے گا جو تو اُس کے ساتھ کر رہا ہے۔ شاباش ہے تیری جان کو" ـــــ

اس کے بعد حمدو ساہوکار کے پاس گیا اور دس روپے اُدھار لے کر ضلع کی سب سے خوبصورت سڑک پر آیا جہاں ہوٹلیں اور دکانیں تھیں اور ایک بُک اسٹال بھی۔ اب تک وہ دفتر کے صاحب لوگوں کے لئے اخبار خریدنے جاتا تھا۔ لیکن اس بار وہ خود اپنے لئے اخبار خریدنے گیا۔ اُس نے اخبار ہاتھ میں لے کر بڑی طمانیت محسوس کی۔ پھر وہ کافی ہاؤس کے اندر بڑے ٹھاٹ سے گھسا اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ایک پیالی کافی کا آرڈر دیا۔ یہی نہیں بلکہ چلتے چلتے اُس نے بوائے کو دو آنے بخشش بھی دی۔ بوائے نے بڑے ہی مسکراتے ہوئے انداز میں اسے نیچے سے اُوپر تک دیکھا۔ لیکن حمید نے اس کی پرواہ نہیں کی۔

پھر اُس نے بڑے بازار سے تازہ مٹھائی، نثار کے لئے ایک شاندار بھرا بھرا پھُولوں کا ہار، اپنی ننھی مُنی زلیخا کے لئے چاکلیٹ اور اپنی بیوی کے لئے ایک خوبصورت گجرا خریدا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا جو اُس نے گجرا خریدا۔ اور پھر آج کا دن بھی تو شادی سے کچھ کم نہیں۔ اُس نے سوچا۔

راستہ بھر وہ کئی باتیں سوچتا رہا۔ ایسی باتیں جو اس کے لئے نئی بھی تھیں اور سمجھ میں نہ آنے والی بھی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نثار نے انٹر پاس نہیں کیا ہے بلکہ اُس نے کیا ہے۔ اخبارات میں نثار کی نہیں بلکہ اُس کی تصویر چھپی ہے۔ خیالوں کے اِس ہجوم میں اور بازار سے خریدی ہوئی اجناس کے بوجھ میں اُس کی گرفت اخبار پر مضبوط ہوتی گئی۔ سامان چلا جائے تو کوئی بات نہیں لیکن اخبار کو نہیں جانا چاہیئے۔ اور اخبار میں نثار کی تصویر کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ غرض وہ سارا راستہ اپنے ہی خیالوں کے بے پناہ بہاؤ پر بہتا ہوا، گھر میں داخل ہوا۔ بیوی پہلے سے منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر خوشی خوشی سامان لینے کے لئے پاس چلی آئی۔ نثار بھی تھا۔ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور ملنے کے لئے اُس کے قدموں پر جھک گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ نثار اُس کے پیروں کو چھُو لیتا، حمدو نے اسے اُوپر اُٹھا لیا۔ اور اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

" تُو فکر مت کر، بس علم پڑھتے جا۔ پڑھتے جا میں ادھر سب کچھ دیکھ لوں گا"

اڑوس پڑوس کی چند عورتیں بھی آ گھُسی تھیں۔ سب نے

مل کر کھانا کھایا۔ ڈھولک پر گیت گائے گئے۔ جیسے کسی بیاہ میں گائے جاتے ہیں۔ حمدو کی بیوی کا قلعہ لے اپنے بھائی نثار کو پھول پہنائے اور وہ دور مسکراتا ہوا گھڑا بیڑی کے کش کھینچتا رہا۔

بڑی رات گئے تک ہنسی اور خوشی کے پٹاخے چھوٹتے رہے، اور پھر میاں بیوی نہ معلوم خوابوں کو اپنی آنکھوں میں بسا کر سو گئے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ہر شخص اس سے بڑی عزت سے بات کرنے لگا ہے۔ یہاں تک کہ دفتر کے بڑے صاحب نواب شوکت یار خان نے اسے اپنے اجلاس پر بلا کر کہا۔

"مبارک حمدو ـــــ سنا ہے نثار تمہارا سالا ہے۔ یہ جان کر ہم کو بڑی خوشی ہوئی۔ ہم اس ذہین لڑکے کی اور تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جب کبھی تمہیں اس کی فیس اور کتابوں کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑے تو تم بلا کسی جھجک کے سیدھا ہمارے پاس چلے آؤ۔"

اس وقت حمدو کے دل سے نواب شوکت یار خان کے لئے ہزاروں دعائیں نکلیں۔ اور وہ مالک مالک جو حکم کا نعرہ لگاتا رہا۔ نواب صاحب نے آج تک کسی چوکیدار سے منہ بھر کر بات کی تھی اور نہ کسی کو اجلاس پر بلایا تھا۔ اس طرح حمدو پہلا چوکیدار تھا، جسے اجلاس پر جانے کی عزت نصیب ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ ساری چوکیدار برادری نے اس انٹرویو پر بڑے فخر سے اپنے سر کو اونچا کر لیا۔!

لیکن وہ نواب صاحب کے بنگلے پر کبھی نہیں گیا۔ صرف اس لئے کہ نثار کو پڑھا لکھا کر قابل بنانے کا سارا کریڈٹ وہ خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک آڑے وقت اس نے بیوی کی کلائیوں میں چمکتی ہوئی ان سونے کی چوڑیوں کو بیچ ڈالا جو اس کے گھر کی اور اس کی کمائی کی آخری یادگار تھی!

بیوی حیران تھی۔ ویسے اس نے پوچھا بھی۔ لیکن حمدو نے کچھ نہیں بتایا اور نہ کسی سے کچھ کہا۔ بلکہ ایک راز کی طرح اسے اپنے دل کے کسی گوشے میں محفوظ رکھا۔ یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا۔ ایک عمر بیت گئی۔ ایک دور ختم ہو گیا اور ایک نیا دور شروع ہوا۔ پھر سے اخبار چھپا۔ پھر سے اس نے بیٹے نثار کی تصویر اخبار کے کالموں میں مسکرائی اور پھر سے وہ بہاروں کا نغمہ گاتے ہوئے گھر میں قدم رکھا۔ بیوی دوڑ کر اس کے قریب پہنچی۔ اور اس کے ہاتھ سے پھول اٹھائی اور گجرا لیتی ہوئی مسکرائی۔ نثار بھی مسکراتا ہوا اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھا لیکن اس بار وہ قدم چومنے کے لئے جھکا نہیں۔ ایک لمحے کے لئے حمدو نے اس کمی کو محسوس کیا اور دوسرے لمحے اس پر غور کئے بنا اس نے نثار کو گلے سے لگا لیا۔ اور ایک منٹ تک ویسے ہی لگائے رکھا۔ سینکڑوں باتیں اور سینکڑوں دعائیں اس کے دل کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے آپ ہی آپ کہا۔ "میرے نثار، میرے بیٹے!"

اور پھر بڑی رات تک ڈھولک پر گیت بلند ہوتے۔ عورتیں جی بھر کر گائیں اور تھک کر اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ ساتھ ہی ایک سناٹا چھا گیا اور پھر دونوں میاں بیوی، ان جانے خوابوں کو اپنی اپنی آنکھوں میں بسا کر سو گئے!

لیکن جیسے ہی صبح ہوئی ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور ان کے خواب ٹوٹ گئے۔ انہوں نے محسوس کیا دنیا میں ان کا کوئی نہیں ہے۔ دونوں میاں بیوی تنہا ہیں۔ اگر ان کا کوئی ہے تو وہ ان کی بچی زنجلہ ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ نثار سے ان کا کوئی رشتہ تھا اور نہ ہے۔ اور اگر ہے تو یہی کہ وہ دفتر کے بڑے صاحب نواب شوکت یار خاں کا داماد ہے۔

شادی شہر میں ہوئی اور سنا بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ ویسے وہ بھی چاہتا تو شادی میں شریک ہو سکتا تھا، مع اپنی بیوی کے اور خاص طور پر نواب صاحب نے اسے کہلا بھی بھیجا تھا۔ لیکن اسے اس کے اندر کے آدمی نے اجازت نہیں دی۔ چنانچہ وہ نہیں گیا۔ ادھر شہر کی ایک بڑی کوٹھی میں نثار میاں، قاضی صاحب کے سامنے بیٹھے ایجاب و قبول کر رہے تھے۔ اور ادھر میلوں دور ٹھیک اسی وقت ایک معمولی سے ضلع کے معمولی سے کمپونڈ میں تحصیل آفس کا ایک معمولی چوکیدار تاڑی پی رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی تاڑی کو چھوا تک نہیں تھا اور اسے ایک بڑا گناہ سمجھتا تھا۔ لیکن آج وہ عجیب سی مسرت، اور

عجیب سی خود اعتمادی اپنے آپ میں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اب وہ پوری دنیا سے لڑ سکتا ہے!

بڑی رات گئے وہ نشہ میں دُھت گھر آیا۔ اور اپنی پریشان حال بیوی کو جو اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی، جھنجھوڑ کر کہا "زلیخا کی ماں تیرے بھائی کی شادی ہو گئی۔ میں اُس سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ تجھے بہت یاد کر رہا تھا۔ سُنا زلیخا کی ماں"

عاقلہ اس طنز کو نہ سہہ سکی۔ حالانکہ طنز سہنے کی معاملہ میں عورت بڑی عالی ظرف واقع ہوئی ہے۔ لیکن عاقلہ اپنے تھرڈ کلاس شوہر کی طرح تھرڈ کلاس عورت تھی۔ اس لئے اس نے اپنے چوکیدار شوہر کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ایک رات اپنی بچی زلیخا کو شوہر کے پہلو میں سُلا کر اس دُنیا سے فرار ہو گئی۔ اور پھر ایسی فرار ہوئی کہ اسے پھر سے کوئی گرفتار نہ کر سکا۔ مگر شوہر کیونکہ اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا، اس لئے وہ اس جُدائی کو برداشت نہ کر سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال کے اندر اُس نے خود اپنا مُنہ چُھپا لیا!

اور تین سالہ بچی زلیخا، نواب شوکت یار خان کے داماد نثار احمد کے زیرِ پرورش آ گئی، آ گئی کیا، اڑوس پڑوس کے لوگ اس بچی کو بنگلے کے اندر دھکیل کر چلے آئے۔ یہ کہتے ہوئے کہ نثار احمد کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ بن جائے، لیکن ہے تو زلیخا کا ماموں اور حمید چوکیدار کا سالا۔

O

ابھی تک اصغر النساء کا نام و نشان نہیں تھا اور نہ وہ کسی کے تصور میں مُسکرائی تھی۔ لیکن زلیخا کے آتے ہی وہ کسی کے وجود میں تلملائی، تڑپی، اور پھر دندناتی ہوئی کوٹھی میں دوڑنے لگی۔

"مجھے دیکھو ــــ میں شہزادی ہوں۔ اس گھر کی شہزادی، زلیخا کوئی نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے۔ میں ہوں۔ میں ــــ"

چنانچہ شہزادی چھا گئی ــــ زلیخا دب گئی ــــ شہزادی کی ٹوٹی پھوٹی باتوں پر اسے چاکلیٹ ملے۔ زلیخا کی باتوں پر ڈانٹ۔ شہزادی کو مدرسہ جانے کے لئے کتاب ملی۔ زلیخا کو کمرہ صاف کرنے کے لئے جھاڑو۔ شہزادی پھر اسکول سے کالج کی طرف مُڑی۔ زلیخا کمرے صاف کرنے کی ٹریننگ حاصل کر کے باورچی خانے کی طرف مُڑی۔ غرض شہزادی اپنی پٹڑی پر چلتی رہی اور زلیخا اپنی پٹڑی پر بھاگتی رہی۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ دونوں چچیری پھپھیری اور ممیری بہنوں کی حیثیت میں ملتیں۔ ان میں بلا کا فاصلہ تھا۔ اور دن بدن یہ فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور دونوں ایک دوسری کی مخالف سمت دوڑتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایک بار ٹکراؤ ہوا۔ بیچ میں پھیلے ہوئے میلوں کے فاصلے کھینچ کر سمٹ کر ایک دوسرے کو ایک دوسرے کا مقابل کھڑا کر دیئے ــــ

شہزادی نے پوچھا ــــ "تجھ میں کیا بات ہے؟"

اور زلیخا نے پوچھا ــــ "اور تجھ میں کیا بات ہے؟"

اور یوسف احمد نے کہا ــــ "تم دونوں نہیں جانتیں میں تمہیں بتاتا ہوں!"

O

یوسف رشتہ میں شہزادی کا بہت دُور سے خلیرا بھائی ہوتا تھا۔ لیکن اس طرح کوٹھی میں گھومتا پھرتا جیسے وہ اس خاندان کا ایک ممبر ہے۔ اگر وہ فوراً کسی وجہ سے ایک دن بھی نہ آتا تو نثار احمد یا ان کی مسز اُسے بُلانے کے لئے فوراً کسی آدمی کو دوڑاتے۔ یہی نہیں بلکہ اُس کے پہنچتے پہنچتے تک کئی بار ڈرائنگ رُوم میں رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی اس کے لئے بجتی۔ ہلو۔ ہلو کیا یوسف میاں ہیں؟

یوسف کا رنگ سانولا اور سینہ کشادہ تھا۔ وہ انجینئرنگ کا ایک اچھا طالب علم ہی نہیں تھا، بلکہ فٹ بال کا ایک اچھا کھلاڑی بھی! اور اس سے زیادہ اچھی بات اس میں یہ تھی کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا نثار احمد چاہتے تھے کہ کسی طرح شہزادی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیکر دونوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے سمندر پار بھیج دیں!

لیکن یوسف کو زلیخا پسند تھی۔ کڑوا کا اصلی تیل!

ایک صبح نثار احمد خان کو معلوم ہوا کہ نمک حرام
ن کے ہونے والے داماد کے ساتھ بھاگ گئی۔
بھاگ گئی بلکہ اس سے نکاح بھی پڑھا لیا۔
کچھ نہ کر سکے۔ ان کا بڑا پن اُن کا مُنہ دیکھتا
رہ گیا۔ اور انھوں نے اپنا خون پی کر ایک ہلکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہمیں یوسف کی پسند کا علم نہیں
ورنہ ہم اپنی زلیخا بیٹی کا بڑے دھوم دھام سے بیاہ کرتے
بھانجی ایک طرح سے بیٹی ہی تو ہوتی ہے!" ▲

تنہا

ہزار رنگ ملے اِک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے، گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گُل کا غبار، مُشتِ بہار
ہوا ہے وادیٔ جنّت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھُوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دُور، جستجو بن کر

(مخدوم محی الدینؒ)

ڈاکٹر منیر قتالی

آہٹیں

زندانِ ماہ و سال کی اُونچی فصیلوں کے پرے
پہنائیوں میں جادہ پیما قافلے
آواز دیتے ہیں مجھے

ہر حلقۂ زنجیر میں اِک جُنبشِ آتش فشاں
ہر سانس میں اِک شعلۂ عزمِ جواں
ہر موجۂ احساس اِک برقِ تپاں

میں لمحہ لمحہ جلتی بجھتی آگ میں لپٹا ہوا
اُونچائیوں کو حسرتِ پرواز سے چھُوتا ہوا
دُودِ پریشاں بن کے لہرا آ ملا

آوازیں آتی ہی رہیں
زنداں کی بُنیادیں ہلاتی ہی رہیں
اور جانے والی آہٹیں تیزی سے جاتی ہی رہیں

محمود ایاز

آخری منزل

تعلقات کا افسوں، کدُورتوں کا غبار
دِلوں کا بُغض، محبت کے دائروں کا حصار
مسرّتوں کا ہر اِک رنگ، غم کا ہر لمحہ
گُذرتی موج کی مانند اُبھر کے ڈوب گیا
نہ کٹنے والے کٹھن دن خیال و خواب ہوئے
نہ آنے والے جو دن تھے، وہ آکے بیت گئے
خلوص و مہر و عداوت کی ساری زنجیریں
پلک جھپکنے کی مُہلت میں جل کے راکھ ہوئیں
وہ لوگ، جن کے خط و خال دِل پہ کندہ تھے،
کچھ ایسے دُور ہوئے ہیں کہ چہرہ یاد نہیں

غم و نشاط، شبِ انتظار، صُبحِ وصال
بس ایک گردِ زمانہ محیط ہے سب پہ
یہ صُبحِ نَو ہے کہ شامِ حیات کی منزل
یہ اختتامِ سفر ہے کہ ابتدائے سفر!!

آئینہ

حامدی کاشمیری

رات کے پچھلے پہر، پت جھڑ کی عریاں چاندنی
آسماں کے آئنہ خانوں سے اتری، نور کے زینوں سے
چھم چھم!
جھیل کے آئینے میں اپنے خطوطِ مرمریں
کے خواب بکھراتی ہوئی،
اور میں تنہا، کنارے پر، سکوتِ بے کراں کی
کسمساتی سیمگوں پرچھائیوں میں محوِ نظارہ رہا۔
ایک خوابِ آتشیں آنکھوں میں لہراتا رہا
رات کے لمحے شراروں کی طرح اڑتے رہے
جانے کیوں آئنے کی خاموش نظروں نے کہا
کس کے افسوں نے اتاری، چاندنی کے مرمریں پیکر سے
کرنوں کی رِدا، اور اس کو عریاں کر دیا

سامنے بے خواب، افسردہ شجر
اپنی ننگی باہوں کا لُٹتا تقدس دیکھ کر
سوچتے ہیں
کب خزاں کا زنگ اِس کم بخت آئنے کی
آنکھوں کی بصارت چھین لے!

چاند برہم ہے
گھٹا بھی اس کے سائے سے گریزاں ہو گئی!
کس کے آنچل میں وہ چہرے کو چھپائے؟
یہ گناہوں کا دہکتا داغ، آنکھوں سے ذرا ہٹتا نہیں
کاش اِس آئینے پر بجلی گرے!
اور اک تاریک گہرے چاہ میں وہ دفن ہو!

پوچھتے ہیں دیوتا سا کوہسار
کس نے سنگستاں میں اِک آئنہ لا کر رکھ دیا؟
ہم نے مانا خون میں ڈوبی بہاروں کی جبیں
اور ہم پتھر تھے، پتھر ہی رہے
کون ہم سے مانگتا ہے خوں بہا؟
یہ آئینہ؟
سنگ بکھریں گے، تو اِس آئینے کے پرزے اڑائے جائیں گے

آئنہ سنتا رہا ـــــ سنتا رہا!
اس کے چہرے کا سکوں گہرا ہوا،
اس کی تابندہ جبیں پر ایک ہلکی سی شکن تک بھی نہ ابھری
اور میں آئینے میں ڈوبا رہا
عرق میں بھیگے ہوئے چہرے کے بگڑے خال و خط
عہدِ ماضی کی سیہ کاری کے دفتر کھولتے
پوچھتے ہیں
کیوں تمہارے ہونٹ گونگے ہو گئے؟
سوچتا ہوں، شہر کس منہ سے میں لوٹوں، کیا کروں؟ ▲

پروفیسر اختر نجمی

کشمکش

میرے دامن سے
خوشیاں ہیں لپٹی ہوئی
اِک تبسم کو لیکن
ترستا ہوں میں
وہ مرے ساتھ ہے
اور تنہا ہوں میں
کیفیت یہ جو ہے
اس کو کیا نام دُوں ؟
کِس کو الزام دُوں !

سکُون

ایک بے تاب سی رَہ گذر
ایک بے خواب سا راستہ
کب سے بے چین ہے ؟
مُضطرب کب سے ہے ؟
زندگی کی طرح
زندگی
جس کے سِینے میں سیماب ہے ،
زندگی
جس کی خاطر سُکوں خواب ہے !

نصیر پرواز

درپن

تنہائی کی رات بچاری برہن ہے
جب میں شعروں کی دنیا میں ہوتا ہوں
رو رو کے ہر دکھڑا مجھ سے کہتی ہے
تاریکی کے صحراؤں میں بہتی ہے
یاد کے ناوک نازک دل پر سہتی ہے

مجھ سے کہتی ہے شاعر! میٹھا سپنا
اک دن نینوں کی نگری میں آیا تھا
چنچل من میں آشائیں اٹھلاتی تھیں
ارمانوں کا بادل سا لہرایا تھا
اونچ نیچ کے سارے بندھن توڑ دیئے
میں نے پریم کا سندر راس رچایا تھا

پر نہ جانے کیسے مالا ٹوٹ گئی
بکھر گئے آشاؤں کے سارے موتی
میں بے بس سی ابلا خود ہی بلک اٹھی
جو پایا تھا میں نے وہ کیسے کھوتی

پاپی دنیا پریم کے بندھن کیا جانے
چھین لیا مجھ سے میرا میٹھا سپنا
دل کی دھڑکن بدل گئی خاموشی میں
اب کس کو سمجھوں میں دنیا میں اپنا
تم شاعر ہو تو مجھ کو سمجھا دوگے
میرا میٹھا سپنا واپس لا دوگے

کھو جاتا ہوں یہ سن کر گہرائی میں
برہن رات سے آخر میں کیسے کہہ دوں
میرا بھی ایک میت کہیں پر چھوٹ گیا
میرے بھی سپنوں کا درپن ٹوٹ گیا

زعفران زار

کوہکن کے قلم سے

شاہد صدیقی مرحوم نے کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ سیاست حیدرآباد کے "شیشہ و تیشہ" کے کالم کے ذریعہ طنز و مزاح کی جو گلکاریاں کی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ قارئین کی دلچسپی کے لئے زعفران زار کے عنوان کے تحت ہر ماہ ان کالموں سے اقتباسات پیش کئے جائیں گے۔ "ادارہ"

رشوت

کتنے رشوت خور خدمت سے معطّل ہیں مگر
کیسی کیسی رشوتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
کہہ رہا تھا کل سرِ بازار اِک اہلِ غرض
گرم بازاری ہے رشوت کی زمین و آسماں
کِس طرف جاؤں
کِدھر دیکھوں
کِسے آواز دوں
ہوں بہ فیضِ مفلسی دس سال سے بے روزگار
اور رشوت مانگتے ہیں صاحبانِ اقتدار
واقعہ یہ ہے کہ میری جیب میں پائی نہیں
اس لئے تصویرِ جاناں میں نے کھچوائی نہیں
آپ ہی فرمایئے رشوت کہاں سے لا کے دوں
اور اگر رشوت نہ دوں تو گھر میں بیٹھوں چُپ رہوں
گھر کا یہ عالم ہے بارش میں کہ جیسے کوئی جھیل
اِک طرف گنگ و جمن ہیں، اِک طرف دریائے نیل
گھر کے مالک نے لکھا ہے خط کہ ہم مجبور ہیں
آپ کے خرد و کلاں کی خیریت مطلوب ہے
اور ہاں فوراً کرایہ بھیجئے
ورنہ کوئی دوسرا گھر دیکھئے
جب کرایہ مانگنے آئے گا کوئی اہلِ ذوق
اس کو رشوت دے کے لوٹا دوں گا میں
اور وہ اِس پیسے سے دیکھے گا کوئی اچھا فلم
رشوت اِک ایسی چیز ہے جس سے بچ جاتی ہے جان
رشوت اِک ایسی ادا ہے جس سے چھُپ جاتا ہے جسم
مُسکرانا ہے تو رشوت دیجئے
گُنگُنانا ہے تو رشوت دیجئے
گھر بسانا ہو تو رشوت دیجئے
رات بھر گانا بجانا ہو تو رشوت دیجئے
آپ رشوت دیں تو حق باطل بنے
اور باطل حق کی مونچھیں نوچ لے
جب مریضوں سے بھی رشوت مانگتا ہے کوئی شخص
اپنے بستر پر بدل کر کروٹیں کہتے ہیں وہ
مژدہ باد اے مرگِ عیسیٰ! آپ ہی بیمار ہیں؛
کہہ چکے ہیں اپنے اِک دیوان میں استاد شادؔ
اِن دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت رشوت کا زور
کون جائے ذوقؔ پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر
صاحبانِ زر رشوت دے کے جو چاہیں کریں
اور غریب اپنی جگہ لیٹے ہوئے آہیں کریں
کب تمنّا کی کلی کھِلتی ہے رشوت کے بغیر
قبر کی بھی جا نہیں مِلتی ہے رشوت کے بغیر
اِس طریقے کو فرشتوں تک بھی پہنچائیں گے ہم
دے کے کچھ رشوت سُوئے جنّت چلے جائیں گے ہم

یُوسف ناظم

مومن کا بُتِ کافر

مومن خاں مومن کی ابھی اتنی ناقدری نہیں ہوئی ہے کہ ان کا کلام شریکِ نصاب کر دیا جائے اور پروفیسر صاحبان اس پر عملِ جراحی فرمائیں نہ ہی ان کا کلام بازار میں کوڑیوں کے مول بکتا ہے۔

مومن، جیسا کہ آپ کو علم ہوگا، ذوق اور غالب کے ہمعصر تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے "سہرا" نہیں کہا، ورنہ آج اردو کا سرمایۂ شعری، دو سہروں کی بجائے تین سہروں پر مشتمل ہوتا۔

مومن کے حالاتِ زندگی بھی، غالب کے حالاتِ زندگی سے ملتے جلتے تھے۔ وہ بھی اسداللہ خاں غالب کی طرح بے حد کمزور و ناتوان تھے، نہایت نحیف و نقیہ تھے اور بکثرت ضعیف تھے۔ اگر غالب کا یہ حال تھا کہ ؎

مر گیا صدمۂ یک جُنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

تو مومن نقاہت میں ان سے دو ہاتھ آگے ہی تھے:

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث میاں دُنیا سے اُٹھا جائے ہے

لہٰذا آپ فنِ کتاب بینی کے ماہر ہیں تو بیک وقت واحد اپنی دائیں آنکھ سے دیوانِ غالب اور بائیں آنکھ سے کلامِ مومن کا مطالعہ فرمائیں۔ اس مطالعہ سے فائدہ یہ ہوگا کہ آپ نہایت ہی قلیل مدت میں اُردو زبان کے دونوں ممتاز و منفکر شاعروں سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کر سکیں گے (مطالعہ کا یہ طریقہ ہمارے ایک اُستاد نے ایجاد کیا تھا، اور چند سال بعد ان کا دماغ روشن لیکن دونوں آنکھیں تاریک ہو گئی تھیں) غالب و مومن کے اس مشترکہ مطالعہ کے بعد پہلا نتیجہ جو آپ اخذ کر سکیں گے، یہی ہوگا کہ ناتوانی کے معاملے میں دونوں شعرا میں عمر بھر مستقل و مسلسل مقابلہ بلکہ مجادلہ جاری رہا ہے اور اس کے بعد ان عظیم المرتبت شاعروں کی صحت کی خرابی کے اسباب و علل کے بارے میں آپ یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وجہ خرابیٔ صحت سوائے عشق کے کچھ اور نہ تھی۔ عشق ہی نے غالب کو نکما اور مومن کو ادھ مُوا کر ڈالا۔

تفو بر تو اے عشق خوباں تفو

حملۂ عشق:

غالب اور مومن کے عشق کی داستانوں میں ایک فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ غالب اس معاملہ میں عجلت پسند واقع ہوئے تھے اور ان میں لڑکپن کے زمانے ہی سے عاشقی کے آثار پیدا ہو گئے تھے، ان کا بیان ہے ؎ ۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

لیکن مومن نے اس معاملہ میں ذرا سہولت اور میانہ روی سے کام لیا اور عنفوانِ شباب میں پہنچنے کے بعد، عشق و عاشقی کا آغاز فرمایا۔ وہ جس کسی پہ مرے، نوجوانی میں مرے۔ ان کا بیان ہے ۔۵

یوں کبھی نوجواں نہ مرتا میں
تیرے عہدِ شباب نے مارا

تھا عجب کوئی آدمی مومن
مرگیا کیا ہی نوجواں افسوس

مومن عاشق طبیعت، نوجواں ہی مرگیا
عشق طفلِ چند سالہ، دشمن صد سالہ تھا

لیکن چونکہ مومن نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد مناسب وقت پر عاشقی کی ابتدا کی تھی اس لئے انہوں نے پوری قوت سے عشق کیا اور اس قدر زور دکھایا کہ:

خاک اڑاتی میں نے کیا طرزِ جنونِ قیس کی
شہ جہاں آباد، سارا نجد کا بن ہوگیا

محبوب کا مقامِ رہائش:

مومن خاں جس بتِ کافر کے عشق میں مبتلا ہوئے، وہ بھی اس زمانے کے عام معشوقوں کی طرح بالاخانہ پر رہا کرتا تھا۔ پتہ نہیں، اس زمانے کے عشاق کو، مکان کی نچلی منزل پر رہنے والے مکینوں میں کسی سے عشق کرنے کا خیال کیوں نہیں پیدا ہوا۔ غالباً ان کی بلند نگاہی نے، انہیں ہمیشہ اوپر کی طرف دیکھنے کا عادی بنا دیا ہوگا۔ ہم نے تو جس کے بارے میں، یہی سنا کہ وہ بالاخانہ ہی سے چمکنے والی برق کا شکار رہا۔ ہمارا مطالعہ بتاتا ہے کہ عشق اہلِ بام کا سلسلہ، اقبالؔ کے دور تک بھی جاری رہا ہے:

آخر شبِ دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اس سے پہلے کسی کو "سرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید" کا عارضہ ہوا تو کسی کی کمند اس وقت ٹوٹی:

دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا ۲

مومن خاں کا بتِ کافر بھی دو منزلہ مکان پر رہا کرتا تھا۔ فرمایا ہے:

تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری
شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

اور جب مومن خاں نے بہت نوحہ زنی کی تو واقعی وہ بتِ کافر سرِ بام نمودار ہوگیا۔ ارشاد ہوا ہے:

آن بیٹھا کون کوٹھے پر کہ یوں حیران سے
خاک پر چپکے پڑے تکتے ہیں سوئے بام ہم

اس کے علاوہ مومن نے اپنے ایک شعر سے محبوب کے بالاخانہ پر رہنے کی تصدیق کی ہے:

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے
تھا بام پر کون جلوہ گر رات

اس کی طرزِ معاشرت:

وہ پردہ نشین تھا۔ لیکن یہ پردہ صرف، بہ پاسِ رسم و رواج تھا۔ ورنہ مومن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ بتِ کافر دوپٹہ اوڑھا کرتا تھا۔ اس کی پردہ نشینی کا چرچا مومن نے یوں کیا ہے:

یا الٰہی مجھ کو کس پردہ نشیں کا غم لگا
سینہ میں اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا ہے دل

شروع شروع میں مومن نے جب پیام و سلام کی ابتدا کی تو کچھ ڈرے بھی کیونکہ اس زمانے میں پردہ نشینوں کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا

ن نے ایک مرتبہ ایسا پیام بھجوایا اور خود ڈر کے خوف کے اِدھر اُدھر چھپتے پھرے :

تو خبر لا کیا کہا قاصد سے چھپتے پھرتے ہیں
ہمدم اُس پردہ نشیں کو بھیجکر پیغام ہم

ن جب ہمدموں اور غم خواروں نے اُنہیں بتایا کہ بُتِ کافر کا پردہ ونہی سا ہے تو مومن کی بھی ہمت بڑھی :

اے پردہ نشیں نہ چُھپ کر تجھ سے
پھر دل بھی یُونہی چُھپائیں گے ہم

محبوب کی "دوپٹہ پوشی" کا ذکر انہوں نے یُوں کیا ہے :

دشمنی دیکھو کہ تا اُلفت نہ آجائے کہیں
لے لیا مُنہ پر دوپٹہ ، حالِ میرا دیکھ کر

ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ مُنہ سے سوتے میں کہیں
شب یہاں رہنے کا تیرے سب میں چرچا ہوگیا

وہ بُتِ کافر اکثر و بیشتر مہندی بھی رچایا کرتا تھا :

تُو نے وہاں لگائی مہندی
یاں دل میں لگی نگار آتش

اُس کے عادات و اطوار :

مومن نے شاہجہاں آباد کو نجد کا بَن بنایا تو کس خاطر ؟ صرف اِک بُتِ ہرجائی کے لئے ، جس کی پردہ نشینی صرف دکھاوے کی تھی اور جس کی راتیں اغیار اور رقیبوں پہ صرف ہوتی تھیں۔ اس بُتِ کافر کی ان ناشائستہ حرکتوں کی اطلاع مومن کو ہمیشہ ہی مِل جایا کرتی تھی اور وہ خُوب جانتے تھے کہ ان کا محبوب چلتا پُرزہ ہے۔

غیروں کے مکان پر اس کی آمد و رفت ڈھکی چھپی نہ تھی :

گر غیر کے گھر سے نہ دلِ آرام نکلتا
دم کاہے کو یُوں اے دلِ ناکام نکلتا

مومن نے ازراہِ اخلاق اسے اس بات پر ٹوکا بھی ، لیکن

ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا
اے رشک میری جان گئی تیرا کیا گیا

رقیب کے گھر چلا جانا تو کوئی بات نہ تھی ، لیکن وہ بُتِ کافر تو رقیب کے گھر کے اندر چلا گیا۔ اس سے زیادہ معیُوب بات کیا ہوسکتی ہے۔

غیروں سے وہ اپنے بال بھی بندھوا لینے میں کوئی عار نہ سمجھتا تھا :

شاید کہ دستِ غیر رہا رات شانہ کش
اس زُلفِ تاب دار میں کچھ آج خم نہ تھا

غیروں کے مکان پر اور مکان کے اندر آنے جانے کی عادتِ قبیح کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے ، غیروں کو خود اُن کے مکان پر بھی آنے جانے کی کُھلی اجازت تھی بلکہ باضابطہ ٹرانک تھی۔ مومن یہ سب دیکھ دیکھ کر کُڑھتے ، لیکن کیا کرتے ، بُتِ کافر کا پاس تھا ، جو کچھ نہ کہتے کہا ہے :

کب پاس پھٹکنے دُوں رقیبوں کو تمہارے
پر پاس تمہارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اور ستم بالائے ستم ملاحظہ ہو کہ معشوق کے گھر والے یہی سمجھتے کہ وہ بُتِ کافر چُھپ چُھپ کر مومن ہی سے مِلا کرتا ہے۔ مومن نے اس بات کا اظہار یُوں کیا ہے :

چُپکے سے ترے مِلنے کا گھر والوں میں تیرے
اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ بُتِ ہرجائی ، زر و جواہر کا بھی دلدادہ تھا اور اس شوق کے ہاتھوں مجبُور تھا کہ غیروں سے تحائف پیش کرنے کی فرمائشیں کرتا :

دُر و یاقُوت کی پھر غیروں پہ فرمائش ہے
جوہری کی تُو دُکاں چشمِ گہر بار لگا

لفظ "پھر" قابلِ غور ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ فرمائشوں کا عادی رہا ہے۔ سابقہ واقعہ کلامِ مومن میں یُوں درج ہے :

رقیبوں پر ہوئی کب آج فرمائش جواہر کی
کہ ہیرا عاشق خطِ زمرد نام لیتا تھا

اور اُس کی بدزبانی :

اوروں سے تو وہ ہنس ہنس کر ہیرے موتیوں کی فرمائشیں کرتا ، ں عاشق صادق کے جھگڑے میں گالیاں ہی گالیاں بکی تھیں :-

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے مُنہ سے کیا بھلی
قربان تیرے، پھر مجھے کہہ دے اسی طرح

ن نے تو اس خیال سے کہ چلو گالیاں ہی سہی، معشوق سے بات تو ہوئی ں کی تعریف کی۔ لیکن مومن کی اس ہمت افزائی سے وہ بُتِ کافر اور شیر ہوگیا اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہوا کہ :

بات پوری بھی مُنہ سے نکلی نہیں
آپ نے گالیوں پہ کھولا مُنہ

یک دفعہ گالیاں زبان پر چڑھ جائیں تو پھر مشکل ہی سے یہ عادت چھوٹتی ہے۔ اس بُتِ کافر کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک دو گالیوں سے بات لاکھوں گالیوں تک جا پہنچی :

کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں
کس کا شب ذکرِ خیر تھا صاحب

مومن کا غم و غصّہ :

مومن نے یہ سب باتیں عرصہ تک سہیں، لیکن آخر کار ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک پڑا۔ انہوں نے محبوب کو رام کرنے کے لئے یہ تدبیر آزمائی۔ نصیحت کی، فلسفۂ عشق سمجھایا، زمانے کا دستور بتلایا۔ چمکارا اور آخر میں ڈرایا اور دھمکایا بھی۔ دستورِ زمانہ کے تعلق سے انہوں نے کہلا بھیجا :

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

انہوں نے پیار کی شدّت کو بھی دبایا کہ شاید اس طرح اس کا

کفر ٹوٹے :

معشوق سے بھی ہم نے نباہی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

لیکن عشق میں برابری نہیں چلتی۔ "تاریخ معاشقہ" بتلاتی ہے کہ اس کھیل میں پلّہ ہمیشہ معشوق ہی کا بھاری رہا ہے۔ مومن کا پیار کم ہوا تو وہ بُتِ کافر اور زیادہ رقیبوں سے گھلنے ملنے لگا۔ مومن نے دھمکی دی :

مجھ سے مل ورنہ رقیبوں سے میں سب کہہ دوں گا
دشمنی اب کی تری، اور وہ پہلا اخلاص

معشوق جانتا تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مومن کہاں یہ سب باتیں رقیبوں سے کہنے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے تعلقات غیروں سے منقطع نہیں کیے۔ مجبوراً مومن نے اس بُتِ کافر کو یاد دلایا کہ یہ نہ بھول کہ تیرے کتنے ہی خط میرے ہاں محفوظ ہیں اور وقت پڑنے پر منظرِ عام پر بھی لائے جا سکتے ہیں :

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا
جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

محبوب کی ہراسانی :

محبوب کتنا ہی بے باک سہی، لیکن ایک پردہ نشین کی ہمت ہی کتنی۔ وہ گھبرا گیا۔ اس سے ہٹ کر اس نے یہ بھی سوچا کہ اب اتنی لمبی مدّت درمیان میں گزر چکی ہے کہ اگر مومن پر نظرِ کرم کی جائے تو احسان انہی پر ہوگا، نقصان اپنا کچھ نہ ہوگا۔ نتیجتاً محبوب نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مومن اس کے دیوانے ضرور تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر بات کو سمجھتے خوب تھے۔ پہلے تو انہیں ایک شاعرانہ خیال گزرا :

کیا زخم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل
ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں تھا

لیکن صحیح صورتِ حال سے وہ روگردانی نہ کرسکے :

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

شکستِ نسخ :

معشوق عمر کی کسی منزل ہی میں کیوں نہ ہو، معشوق ہوتا ہے اذیت رسانی کی باتوں سے نہیں چوکتا۔ اس کے اقرار میں بھی ہزار انکار ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی منزل پر بھی حسن غمزے کی کشاکش سے نہیں چھوٹتا۔ رد و قدح کی اس منزل پر مجبوراً مومن کو کہنا پڑا:

شب وصل آپ کا عذر نزاکت
بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے

حالانکہ یہ بات ایسی نہ تھی جو کہی جاتی۔ وہ بُت کافر تو سب کچھ پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا۔ لیکن مومن کے اس اعتراف نے اس کا رہا سہا شبہ بھی دور کر دیا اور وہ بُت کافر ہنسی خوشی ان کے ہاں رہ گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کئی دن وہیں رہا۔ تاہم عادتاً وہ روز جانے کی بات کہتا اور مومن کہتے :

اتنا تو نہ گھبراؤ، راحت یہیں فرماؤ
گھر میں میرے رہ جاؤ آج اور کبھی کل جانا

اس کے بعد کے واقعات پر دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔

وقار لطیف

کچھ شیونگ کے بارے میں

جہاں تک شیونگ کے بارے میں ان کی رائے کا سوال ہے دُنیا کے تمام عظیم لوگ دو مخالف کیمپوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

کیمپ نمبر (۱) شیونگ کو ایک ایسی لعنت سمجھتا ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔!

کیمپ نمبر (۲) کے خیال میں شیونگ ایک ایسی لعنت ہے جس سے فرار ممکن ہے!!۔

پہلے کیمپ میں آئن سٹائن کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ روزانہ نہانے کے ٹب میں بیٹھکر نہانے کے ساتھ شیو بھی کر لیا کرتا۔ وہ تھوڑا سا جھاگ ٹب میں سے اُٹھاتا اور اُسے مُنہ پر مل لیتا۔ پھر ریزر سے جلدی جلدی شیو کرنے لگتا کہ کہیں چہرے کا صابن سُوکھ نہ جائے اُس نے زندگی بھر شیونگ کا صابن استعمال نہیں کیا۔ آئن سٹائن کا عقیدہ تھا کہ دو تین مختلف صابنوں کے استعمال سے زندگی کافی کٹھن بنائی جا سکتی ہے ــــ!

بہرحال آئن سٹائن بھی شیونگ سے اس قدر نالاں نہیں تھا اُس کا ایک ہم پیشہ ہوا کرتا اور کوئی پانچ چھ سو سال پیشتر نہانے کے ٹب میں بیٹھکر گھنٹوں سوچتا رہتا۔ "تیرنے" اور "ڈوبنے" کے مسئلے یونہی وجود میں آئے۔ اس کا نام آرشمیدس تھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ "ڈوبنے" کے مسئلہ کی دریافت کا سہرا تو آرشمیدس کے جسم کے سر ہے (جو ٹب میں ڈوب گیا تھا ــــ یوریکا!) ــــ آپ کو یاد ہو گا! مگر تیرنے کے مسئلے کی دریافت کی واحد ذمہ دار اُس کی ڈاڑھی ہی تھی!!

کیمپ نمبر (۲) یعنی آرشمیدس کے کیمپ میں ہمیں عظیم شخصیتوں کی اکثریت دکھائی دیتی ہے۔ چارلس ڈکنس، چارلس اول، کارل مارکس اور شاہ جہاں جیسی قدیم ہستیوں سے لے کر ارنسٹ ہیمنگوے، اجانج پنجم، برنارڈ شا، رابندر ناتھ ٹیگور اور دادا بھائی نوروجی تک داڑھیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بندھا ہوا ہے۔

مگر نہ جانے کیوں داڑھی عام طور پر پختہ عمر، تجربہ کاری اور کبھی کبھی عظمت سے منسُوب کی جاتی رہی۔ حالانکہ وین گوگ اور چیخوف جیسے بڑے فن کار بھی گزرے ہیں جو بارلیش ضرور تھے لیکن "بزرگ" قطعاً نہیں! ــــ اور پھر آپ برٹرنڈ رسل کو کیا کہیں گے۔ وہ اپنی ٹھوڑی اور گالوں پر نظر آنے والے ہر بال کا ازلی دشمن ہے۔ وہ پچھلے ساٹھ ستر برس سے حساب اور فلسفے کی گتھیوں میں اُلجھا ہوا ہے لیکن اُس کی داڑھی میں ایک تنکا بھی اُلجھ نہیں پاتا ــــ کہ اسکی داڑھی ہی نہیں

عظیم شخصیتوں سے ہٹ کر، دنیا کے عام لوگ بھی اکثر ان دو میں سے کا ایک مکتب خیال کے پیرو ہوا کرتے ہیں۔ ان معدودے چند زندہ دلوں یہ آسانی مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے جو شیونگ کو ایک خوشگوار شغل تصور تے ہیں۔ حال ہی میں ایسے حضرات کی تعداد میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

ہم نے تو کبھی تجربہ نہیں کیا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ برقی شیور، ہزار مصیبتوں ایک علاج ہے اور یہ کہ برقی شیور، ڈاڑھی پسندوں کے لئے ایک زبردست چیلنج ہے ۔۔۔ ہمارے خیال میں ڈاڑھی پسندوں سے کہیں زیادہ یہ متوسط طبقہ کے لئے چیلنج ہے۔ ممکن ہے کہ دس سال میں جو صرفہ بلیڈوں، برشوں صابن وغیرہ پر ہوگا اس سے کہیں کم اس نئی ایجاد پر ہوتا ہے۔ مگر سوال اب کا ہے جب کا نہیں ۔۔۔!

برقی شیور کی برکات سے مستفید نہ ہو سکنے والوں میں کچھ لوگ یسے موجود ہیں جو شیونگ کو ایک چھوٹی موٹی ورزش کا درجہ دیتے ہیں۔ ن کا خیال ہے کہ فی زمانہ جبکہ کشتی، ڈنگل اور مگدر پھیرنے کے مواقع ہیں ملتے، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھوں کی مسلسل حرکت گردش ون کا باعث بن سکتی ہے۔ اگلے زمانے میں جہاں چھرّوں کی خوبصورتی بہ خود پسندی کو ابھارتی تھی وہاں آج آئینہ میں ابھرتے ہوئے ایک حسین نسان کی صورت شیو کرنے والے کی انانیت کو تسکین پہنچا سکتی ہے اور پھر بی اعتبار سے بھی چہرے کے رگوں کی مالش تازگی اور فرحت کا احساس بخشتی ہے۔ لہٰذا ان کے خیال میں شیونگ ایک مفید مشغلہ ہے ۔۔۔ یونگ کی دلفریب اور پُر آہنگ آواز پر ہمارے ایک دوست فلمی گیت لہ ڈالتے ہیں۔ ان کی شیونگ یقیناً مفید ترین مشغلہ ہے!۔

ایک ڈاڑھی دشمن گروپ کا یہ کہنا ہے کہ ڈاڑھی رکھنا آرام بندی ہے۔ ڈاڑھی رکھنے والے محنت اور مشقت سے جی چراتے ہیں۔ تکلیفوں سے دور بھاگتے ہیں۔ جب وہ اتنی تھوڑی زحمت گوارا نہیں سکتے تو آگے قومی مہموں میں ان سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ ہ میدانِ جنگ میں کیا جوہر دکھائیں گے؟ سیلابوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے وقت ان کی کیا حالت ہوگی؟ شیونگ کے دوران لگنے الا ہر زخم انسان کو آنے والے شدید تر زخموں کے لئے تیار کرتا ہے خونیں مناظر کا عادی بناتا ہے ۔۔۔!

ادھر ڈاڑھی کے مداح سراؤں کی منطق یہ ہے کہ دراصل شیونگ ایک تعیش ہے۔ آدمی کو بناؤ سنگھار کی عادت ڈالتا ہے اور خواتین سے قریب کرتا ہے (یہ قریب نہ جانے وہ کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں؟) جو لوگ ہر روز ایک آدھ گھنٹہ شیو پر صرف کرتے ہیں ان سے قطعاً بعید نہیں کہ وہ مزید اوقات لباس پر، بالوں کی سجاوٹ پر اور جوتے کی چمک پر صرف کریں گے۔ ان سے کسی بھی بڑے کام کی امید فضول ہے۔ کیونکہ جمہوریت کے اس سنہرے زمانے میں یہ لوگ جاگیری نظام کی ایک بچی کھچی لعنت ہیں۔ وغیرہ وغیرہ!۔

(آجکل بہت سارے الزام جاگیری نظام کے سر تھوپے جاتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جاگیرداروں کے زرق برق لباس کا اہم ترین جز ڈاڑھی ہوا کرتا تھا!)

جیسے خچر کو گھوڑے اور گدھے کا اوسط کہا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو ڈاڑھی دشمنوں کو ڈاڑھی پسندوں میں خلط ملط کر کے دو سے تقسیم کرنے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طبقے کے دونوں مخالف انتہا پسند کیمپوں نے عاق کر دیا ہے۔ یہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ اس طبقے کے لوگوں کے رُوئے مبارک کہ نہ کوئی باقاعدہ ڈاڑھی دکھائی دیتی ہے جس سے کھیلتے ہوئے وہ اپنے زرّیں اقوال معتقدین تک پہنچائیں اور نہ ہی ایسے آثار (یا آثار کی کمی؟) جس سے آپ اندازہ کر سکیں کہ یہ حال ہی میں شیو کر چکے ہیں۔ سب سے بڑا عجوبہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چہرے پر ہمیشہ چھ سات روز کی فصل ہی نظر آئے گی۔ حالانکہ چھ سات روز بیشتر ہی غالباً بالکل یہی نقشہ دیکھ چکے ہیں۔ اس معمہ کا راز تو بس وہ خود جانیں یا پھر وہ لوگ جو کرکٹ "ٹرف" کی نگہداشت کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ لوگ شیو کرتے ہیں اور یقیناً کرتے ہیں لیکن زمانے کی آنکھ سے بچ کر! شیو کرنے کے کچھ روز بعد تک یہ سوچ کر گھر سے نہیں نکلتے کہ لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اِدھر وہ حضرات جو شاید شرط باندھے بیٹھے رہتے ہیں کہ فلاں صاحب کے چہرے پر اب کی بار تو ضرور ایک بال بھی نہیں ہوگا، اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے ہیں!

اس طبقے کے لوگ عموماً جینئس کہلایا جانا پسند کرتے ہیں۔ کلین شیو کرنے والوں کو وہ نہایت سطحی (!!) گردانتے ہیں (غالباً ذہنی افلاس ہے) اور ڈاڑھی پالنے والوں کو قدامت پرست اور تنگ نظر —— !

مختصراً یوں سمجھئے کہ چٹیل میدان اور گھنے جنگل دونوں کے لئے باعث وحشت ہیں اور وہ ہمیشہ "لان" کو ان دونوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی دنیا میں عام لوگوں کی ساری ہمدردیاں چکنے چہرے والوں سے وابستہ ہیں۔ چاہے شیونگ عذاب جان ہی کیوں نہ ہو۔ ساری دنیا آئن سٹائین کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ ڈاڑھی رکھنا رجعت پسندی کی علامت مانا جاتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اور فیشنوں کی طرح یہ بھی ایک فیشن ہے، جو وقت گزرنے پر اپنی موت آپ مرجائے گا اور پھر ایک بار ڈاڑھی پسندوں کا بول بالا ہوگا۔ چاروں طرف باریش اصحاب کا ہی طوطی بولے گا۔ کچھ اسطرح کی اصلاحات نافذ ہوں گی کہ حجام محض سر کی اصلاح پر گذر بسر کرسکیں گے۔ اخبارات و رسائل میں خواتین کے لباس اور بالوں کو سنوارنے کے سٹائلوں کے ساتھ ساتھ ڈاڑھیوں کے کٹ اور ان کے طول و ارض پر بھی مضامین نکلا کریں گے۔ ان مضامین میں گول چہرے والوں کو یہ رائے دی جائے گی کہ وہ نکیلی اور مقابلتاً لمبی ڈاڑھی رکھیں اور لمبوترے چہرے والوں کو گول ڈاڑھی کا مشورہ دیا جائے گا تاکہ تناسب قائم رہے۔ اس کے علاوہ بازار میں بیسیوں ایسی دوائیاں ملیں گی جو ڈاڑھی کو گھنی کرسکیں اور ان کی صحت برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ عورتوں کے بالوں کی طرح "پراڈکسائیڈ" وغیرہ کے استعمال سے ڈاڑھی کا رنگ بھی بدلوایا جا سکے۔ اور شوہروں کو اپنی بیوی کے بالوں کے رنگ میں رنگی ہوئی ڈاڑھی کی وجہ سے بہ آسانی پہچانا جاسکے۔

بہرحال ڈاڑھی پسندوں کو مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں آج نہیں تو کل انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ تب "ڈاڑھی کی آڑ میں شکار" اور ایسی ہی دوسری فضول کہاوتیں ممنوع قرار پائیں گی اور "چور کی ڈاڑھی میں تنکا" والی مثل وسیع پیمانہ پر استعمال کی جاسکے گی۔ شیو کرنے والوں کو دقیانوسی جانا جائے گا۔ اور وہ لوگ جو آج کچھ نہ رکھنے پر فخر کرتے ہیں کل کچھ رکھنے پر فخر کیا کریں گے!۔

زندگی نے وفا کی تو پھر "کچھ ڈاڑھی کے بارے میں" بھی کہیں گے۔ ▲

گمنام

تیر انداز

"پس و پیش منظر"

ایک فلمی رسالہ میں ایک مراسلہ نگار نے یہ شکایت کی ہے کہ ادھر چند دنوں سے ہمارے فلمساز اپنی فلمیں کشمیر اور شملہ کے پس منظر میں کیوں فلما رہے ہیں؟ ہماری روایتی غربت اور پسماندگی کے پس منظر میں کیوں نہیں فلما رہے ہیں؟ اور یہ کہ اگر خدانخواستہ ان فلموں کی بیرونی ممالک میں نمائش ہو تو وہاں کے باشندے ہمارے بارے میں کیا کیا نہ سوچیں گے؟۔

مراسلہ نگار نے یوں تو اور بھی بہت سے سوالات پوچھے ہیں لیکن موجودہ حالات میں فلمسازوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ مراسلہ نگار موصوف کے سوالات کا فرداً فرداً جواب دے سکیں کیونکہ وہ ان دنوں اپنی اگلی فلموں کی تیاری میں مصروف ہیں اور یہ فلمیں بھی یقیناً کشمیر اور شملہ کے پس منظر پر فلمائی جا رہی ہوں گی اور چونکہ ہم اس وقت بیکار ہیں اور خوش قسمتی سے اپنی روایتی غربت اور پسماندگی کے پس منظر میں بیکار ہیں اس لئے مراسلہ نگار موصوف کے سوالات کے جوابات دینے کو اپنا فرض سمجھ رہے ہیں ـــــ مراسلہ نگار نے پوچھا ہے کہ ہمارے فلمیں ہماری روایتی غربت اور پسماندگی کے پس منظر میں کیوں نہیں فلمائی جائیں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ جناب والا! ہماری روایتی غربت کوئی "پس منظر" نہیں بلکہ "پیش منظر" ہے۔ "پس منظر" میں تو صرف ہماری امارت ہے، دولت ہے، خوشحالی ہے اور اتفاق سے یہ امارت بھی چند افراد کی تجوریوں میں بند ہے، یعنی واقعی "پس منظر" میں ہے۔ اب بھلا بتایئے کہ "پیش منظر" کو کس طرح "پس منظر" اور "پس منظر" کو کس طرح "پیش منظر" بنایا جا سکتا ہے۔ ہماری غربت تو اتنی "پیش منظر" ہے کہ جب ہمارے فلمساز کشمیر اور شملہ میں بھی "امارت کے پس منظر والی فلموں" کی شوٹنگ کرتے ہوں گے تو شوٹنگ کے وقت متعلقہ منظر میں مستقلاً آباد رہنے والے غریبوں کی جھونپڑیوں کی جگہ مجبوراً خوبصورت مکانات تعمیر کروا دیتے ہوں گے، گندہ نالیوں کی صفائی کروا دیتے ہوں گے، بڑے بڑے میدانوں میں جھاڑو لگوائی جاتی ہو گی کہ کہیں ذرا سا بھی کوڑا کرکٹ رہ گیا تو فلم کی امارت کو ٹھیس لگ جائے گی اور اس گندگی کو تماشائیوں کی طبع نازک برداشت نہ کر سکے گی۔

دوسری بات جو مراسلہ نگار سے عرض کرنی ہے وہ یہ کہ صاحب ہماری زندگی میں جو روایتی غربت اور پسماندگی موجود ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے فلم کا وسیلہ تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر آپ ایسی فلمیں دیکھنا چاہتے ہوں تو کسی بھی گندہ بستی میں چلے جایئے اور کسی مفلس کو مبلغ ۰۶ نئے پیسے (برائے قیمت ٹکٹ) ادا کر کے اس کے گھر کا معائنہ فرمایئے۔ آپ کو غربت کے پس منظر میں فلمائی جانے والی ایسی فلم "پردۂ سیمیں" پر کہیں دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ اور یہ جو ہمارے فلمساز کبھی کبھار غربت کے پس منظر میں فلمیں تیار کرتے ہیں تو اس وقت بھی تکلف کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ یعنے اداکاروں کو ملازم کپڑے تو پہنا دیتے ہیں، اُن کی صحت تو اچھی رہتی ہے اور انہیں بالآخر کہیں نہ کہیں نوکری تو مل جاتی ہے، پھر اُن کی شادی بھی تو ہو جاتی ہے۔ یوں آپ نے کسی فلم میں اداکاروں کو ننگ دھڑنگ بھیک مانگتے تو نہیں دیکھا ہو گا۔ اور اگر آپ دیکھتے بھی ہیں تو بس پانچ دس منٹ کے بعد اداکار کی ملاقات کسی مالدار ہیروئن سے ہو جاتی ہے اور یوں غربت کا پس منظر اچانک امارت کے پس منظر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر خود تماشائی فلم کے منظر کی گندگی کو دیکھ کر اپنی ناکوں پر دستیاں رکھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ اپنی دستیاں نکال کر آزادانہ فضا میں سانس لینے لگتے ہیں۔ پھر گندہ بستی کے تعفن کی جگہ کشمیر کے مرغزار لہلہانے لگتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے فلمسازوں نے ملک میں سوشلزم کے قیام کا بڑا آسان طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ اور وہ یہ کہ مالدار عورت کو کسی بھکاری نوجوان سے محبت کرنی چاہیئے۔ اگر ملک میں سوشلزم قائم نہ ہوا تو سارا قصور محبت کا ہے، اس میں

سوشلزم کا کوئی وکش نہیں۔

مراسلہ نگار موصوف سے گذارش ہے کہ وہ ازراہ کرم ہمارے فلمسازوں کو ہماری غربت کی یاد نہ دلائیں کیونکہ غربت کے ذکر ہی سے اُن کا کلیجہ پسیج جاتا ہے۔ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے اور اسطرح اُن کی زندگی میں جو خوشگوار لمحات آتے ہیں تو اُن کا گلا دب جاتا ہے۔ یوں بھی غربت کے معاملہ میں ہمارے فلمسازوں کی یادداشت بڑی کمزور ہے۔ اُنہیں عوام کی غربت تو کجا فنکاروں کی غربت کا بھی احساس نہیں رہتا۔ وہ تو آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک فلمساز نے اپنی فلم کے لئے ایک مفلس وقلاش فنکار کا انتخاب کیا اور جب فنکار نے پوچھا "حضور! اس کا معاوضہ کیا ملے گا؟" تو فلمساز صاحب نے کہا تھا "بھئی پانچسو روپے ملیں گے"! فن کار بولا: "سرکار! پانچ سو روپے تو معمولی فن کار بھی کما لیتے ہیں"! تو فلمساز صاحب بولے: "میاں تم فکر نہ کرو۔ فلم میں ایک ڈنر اور ایک لنچ کے مناظر بھی شامل ہیں۔ اسطرح یہ جو میں تمہیں ۵۰۰ روپے دے رہا ہوں تو کھانا کھلا کر دے رہا ہوں۔ اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا چاہئیے۔ جاؤ فلم میں کام کرو اور عیش کرو"۔ غرض ہمارے فلمسازوں کو غربت کی یاد یُوں آتی ہے جیسے فرانس کی ملکہ میری انطونیت کو اپنے عوام کی غربت کے ذکر کے ساتھ ہی "کیک" یاد آگیا تھا۔

مراسلہ نگار صاحب نے یہ بھی پوچھا ہے کہ اگر کوئی غیر ملکی باشندہ کشمیر اور شملہ کے پس منظر والی فلموں کو دیکھے گا تو ہندوستان کے بارے میں کیا کیا تصورات قائم کریگا تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ غیر ملکی باشندہ جو کچھ بھی سمجھے گا، ٹھیک ہی سمجھے گا اور اُس کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے ہمارا کیا بگڑنے والا ہے۔ مثلاً وہ سوچے گا کہ ہندوستان میں تو سال کے ۲۴ مہینے برفباری ہوتی ہوگی۔ لوگ خوب اسکیٹنگ کرتے ہوں گے، جگہ جگہ آتشدانوں میں آگ جلتی ہوگی۔ ہر شہری کے پاس ایک عدد موٹر ضرور ہوگی اور جس کسی کے پاس موٹر نہیں ہوگی تو وہ کہیں موٹر ڈرائیور بن جاتا ہوگا۔ لوگوں کے پاس گرم کپڑوں کا اتنا سارا ذخیرہ ہوگا کہ وہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد اپنا لباس تبدیل کر دیتے ہوں گے۔ لیکن جب وہ سارا تصور قائم کرنے کے بعد جغرافیہ کی کتاب میں ہندوستان کو قطب شمالی یا قطب جنوبی میں تلاش کریگا تو خود بخود مایوس ہو کر بیٹھ جائے گا اور اپنے تصور کی تسلیم فرمائے گا کہ ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہمارے فلمساز کشمیر کے پس منظر میں فلمیں بنا کر ملک پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں کیونکہ کشمیر کے پس منظر والی فلمیں دیکھ کر غیر ملکی باشندوں کو یہ پتہ تو چل جاتا ہے کہ کشمیر واقعی ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اگر اٹوٹ حصہ نہیں ہے تو پھر یہاں ہندوستانی فلموں کی شوٹنگ کیونکر ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بعض مغربی ممالک سے حال ہی میں دنیا کے جو نقشے شائع ہوئے تھے تو اُن میں کشمیر کو ہندوستان سے جُدا کر دیا گیا تھا۔ اگر ان نقشوں کی تیاری کا کام انجام دینے والے اصحاب ایک بار ہماری فلمیں دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے تو ایسی غلطی نہ کرتے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے فلمساز کشمیر کے پس منظر میں فلمیں بنا کر ملک کی ایک اہم سیاسی خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہمارے بعض "سیاست دان" سیاست میں حصہ لے کر "اداکاری" کے فن کو اعلیٰ عروج پر پہنچا رہے ہیں۔

مصنف : الما ہچکاک
ترجمہ : سلیم الدین

(آخری قسط)

شوہرِ نامدار ہچکاک

بالآخر لندن کے ایک اسٹوڈیو نے ہچکاک کو ایک فلم کے لئے مکمل ہدایت کاری کا موقع دیا۔ اس نے خود ہی اس کی کہانی منتخب کی تھی۔ یہ ایک چھوٹے سے ایسے مکان کی رونگٹے کھڑا کر دینے والی کہانی تھی، جس میں رہنے والوں کو یہ شبہ ہوگیا تھا کہ اُن میں سے کوئی ایک جنونی قاتل ہے۔

اس تصویر میں ہچکاک نے وہ سب کچھ کیا جس کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہتا تھا۔ مثال کے طور پر وہ فلموں میں ٹائٹل کارڈز کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے فلم کی رفتار سست ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ہچکاک نے اپنی اس فلم میں، باوجودیکہ وہ خاموش فلم تھی، کم سے کم ٹائٹل کارڈز استعمال کئے اور اس کے بجائے اس نے کہانی کی رفتار کو متاثر کئے بغیر واقعات کے اظہار کے لئے اخبارات کی سُرخیوں، گھڑیوں اور کیلنڈرس کا استعمال کیا۔

جب اس نے فلم مکمل کر لی تو وہ اب تک بننے والی تمام فلموں سے مختلف تھی اور وہ اس کے متعلق اسٹوڈیو کے عہدہ داروں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے سخت بے چین تھے۔ لیکن جب ان کی فلم کو دیکھنے کا دن آیا تو وہ اپنے آپ کو اسٹوڈیو جانے کے لئے آمادہ نہ کر سکے۔ یہ اُنکی زندگی کا بہت ہی تشویش ناک اور تکلیف دہ دن تھا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ فلم دکھلائے جانے کے دوران اور اُس سے قبل میں اور ہچکاک، بلا مقصد شہر میں گھنٹوں کچھ دیکھے یا بات کئے بغیر یونہی گھومتے رہے۔ اچانک رُک کر ہچکاک نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا "میرے خیال میں اب تک وہ فلم دیکھ چکے ہوں گے، چلو اب واپس چلیں۔" انہوں نے ٹیکسی لی اور ہم اسٹوڈیو کی طرف چل پڑے۔ اسٹوڈیو پہنچکر ہم نے تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کیں اور پروڈکشن رُوم میں داخل ہوئے۔ وہاں کسی سے کچھ سوال کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی ہم نے خاموشی سے ہمارے اطراف کے تمام چہروں کا جائزہ لیا اور کسی کے بتلائے بغیر ہی ہم نے جان لیا کہ صورتحال کتنی خراب ہے۔ چنانچہ اس فلم کو ڈبہ میں بند کر کے رکھ دیا۔ الفریڈ ہچکاک کی ہدایت کار کی حیثیت سے زندگی شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کہانی کا انجام نہایت خوشگوار رہا۔ کئی ماہ تک اس فلم پر گرد کی تہیں جمتی رہیں اور پھر اچانک ایک دن محض اسلئے کہ اس کی تیاری پر کافی رقم صرف کی جا چکی تھی، اس کو ریلیز کر دیا گیا لیکن ریلیز کے لئے بھی لندن کے بعض گھٹیا درجے کے سینما گھروں کا

پہلے اس فلم کی نمائش کرنے والوں کو افسوس ہوا کہ وہ اس فلم کی نمائش کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں لوگ اسے دیکھنے لگے اور اس کی شہرت پھیلنے لگی اور ایک ہی سال کے عرصہ میں اس فلم کو ([illegible]) انگلینڈ میں تیار کردہ ساری فلموں میں بہتر قرار دیا جانے لگا۔

اکثر میں سوچا کرتی ہوں کہ انتظار اور سسپنس سے ہچکاک کے خوفزدہ ہونے کا سبب بڑی حد تک وہ ناخوشگوار دن ہیں جب کہ ہم لندن کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت کے بعد سے اب بھی جب کبھی سسپنس اور تکلیف دہ انتظار کا کوئی ایسا لمحہ آجائے جس سے وہ بچ نہ سکے تو وہ فوراً باہر نکل جاتا اور ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔

اس دن کو لیجئے، جب کہ ہمارا بچہ ہوا تھا۔ ہماری شادی ہوئے دو سال گذر چکے تھے اور ہم لندن کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ میں زچگی کے لئے گھر ہی پر تھی۔ جیسا کہ اب بھی لندن کی اکثر عورتیں کیا کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بچے کی پیدائش کے لئے بڑا طویل انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔ عموماً ایسے مواقع پر یونہی محسوس ہوتا ہے۔ میں پاس والے کمرے میں ہچکاک کے پیروں کی چاپ سن رہی تھی جو جلد ہی باپ بننے والے مضطرب انسان کی طرح خاموشی سے ٹہل رہا تھا۔ پھر میں نے اگلے دروازے کو کھلنے اور بند ہونے سنا اور میں سمجھ گئی کہ وہ انتظار اور سسپنس کی اس کیفیت کو برداشت نہ کر سکا اور فرار ہو چکا ہے۔

وہ بہت دیر تک باہر ہی رہا، جب واپس لوٹا تو میں ہماری پہلی لڑکی کو جنم دے چکی تھی۔ وہ میرے لئے ایک کنگن کا تحفہ لے آیا تھا اس نے خوبصورت کنگن کو ہاتھ میں پکڑ کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو تمہارا تحفہ، دراصل مجھے یہاں سے بھاگ نکلنے کا کوئی نہ کوئی تو بہانہ ملنا چاہیئے تھا۔"

میں نے کہا۔ "حقیقت میں یہ بہت خوبصورت ہے، مگر تمہیں باہر نہیں جانا چاہیئے تھا کیونکہ میں دراصل زیادہ تکلیف نہیں محسوس کر رہی تھی۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم زیادہ تکلیف نہیں محسوس کر رہی تھیں۔" اس نے کہا۔ "مگر میری حالت پر بھی تو غور کرو کہ مجھے کتنی تکلیف برداشت کرنی پڑی، میں تو اس سسپنس اور انتظار کے باعث تقریباً مر ہی گیا تھا۔"

جب ہچکاک کو فلموں کی تیاری کے سلسلے میں امریکہ آنے کی دعوت دی گئی تو اس وقت ہماری بیٹی پیٹریشیا دس برس کی تھی۔ ہمارے برطانوی دوستوں نے کہا کہ ہچکاک جیسا شخص ہالی وڈ میں بھی اپنا سکون اور خاموشی برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ انہوں نے کہا وہاں دیوانہ وار اور سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔ ہر کام تمہارے یہ ثابت کرنے پر منحصر ہے کہ تم اس کو بخوبی انجام دے سکتے ہو۔ تم کو ہمیشہ ایک شاندار مکان میں رہنا ہوگا اور اگر ہر سال تم اس سے بہتر مکان میں منتقل نہ ہو سکے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ تمہارا زوال شروع ہو گیا ہے۔

ہم نے ان کی باتوں کا یقین نہیں کیا۔ جب ہچکاک نے فیصلہ کر لیا کہ کام اس کو پسند ہے، تو ہم نے سب سے پہلے مکان کی تلاش شروع کی۔ بہت جلد میں نے اپنی پسند کا مکان دیکھ لیا۔ وہ بہت خوبصورت مکان تھا۔ میں نے بھی اس کو پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا وہ بہت ہی خوبصورت دیہاتی وضع کا یک منزلہ مکان تھا جو اپنے اطراف واکناف کے مکانات سے بہت چھوٹا تھا۔ مگر جب ہچکاک نے اس کی قیمت دریافت کی تو اس نے افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہم کبھی بھی اتنی استطاعت نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ میرا بھی خیال یہی تھا۔

ابھی ہم مکان ہی کی تلاش میں تھے کہ میری سالگرہ کا دن آپہنچا ہمارے گھر میں سالگرہ کے روز صبح میں ہم سب سے پہلے سالگرہ کا تحفہ دیتے ہیں۔ یہ بھی ہچکاک ہی کی ذہنی اختراع تھی تاکہ صبح ہی صبح تحفہ دیکر جھگڑا ختم کیا جائے اور شام تک انتظار کرنے اور سسپنس کا شکار ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس مخصوص صبح کو اس نے مجھے عام دنوں سے کچھ پہلے ہی بیدار کر دیا اور میرے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھما دیا۔ میں نے کچھ نیند کے خمار میں اس ڈبے کو کھولا اور ایک کالا دستی بیگ باہر نکالا

یقت میں وہ بہت خوبصورت بیگ تھا مگر مجھے سخت تعجب ہوا کہ
ا اس بیگ کا تحفہ دینے کے لئے مزید تھوڑی دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا
ما ۔ کم از کم سورج کے طلوع ہونے تک !۔۔۔۔ میں نے اپنے اندر
ج سے پہلے کا جوش و خروش اور سرگرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے
رتے اس بیگ کو اپنے ہاتھ پر اُلٹ دیا ۔ سونے کی ملمع کاری کی ہوئی
یک خوبصورت چابی میرے ہاتھ میں تھی اور یہ چابی اسی مکان کی تھی جس کو
ں بے حد پسند کرتی تھی ۔

یہ کوئی پندرہ سال قبل کی بات ہے ۔ ہم فوراً ہی اس مکان میں منتقل ہو گئے اور اُس وقت سے ہم وہیں مقیم ہیں ۔

ہمارا ایک دوست ہے جس کے ہاں ایک شاندار موٹر ، شاندار مکان اور ایک بڑی فلم کا کنٹراکٹ ہے ۔ مگر وہ ابھی تک سس پنس اور انتظار کی کیفیت میں مُبتلا ہے کیونکہ اب تک وہ اس بہت بڑے کلب میں شریک نہیں ہو سکا ہے جس کی اُسے بے حد خواہش ہے ۔ میرے خیال میں اگر میں اس سے کبھی یہ دریافت کروں کہ اس کی زندگی کی ایک سب سے اہم چیز کیا ہے تو میں نہیں سمجھتی کہ وہ اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے ہچکاک کا فارمولا یہی اور اسی سے تعلق رکھتا ہے :" اس ایک چیز کا پتہ چلاؤ جو سب سے اہم ہے اور باقی کو نظر انداز کر دو ۔"

ہچکاک نے آج سے کئی برس قبل ہی یہ دریافت کر لیا تھا کہ خوشی و سکون حاصل کرنے کا سب سے اچھا مقام اس کے لئے اس کا گھر ہی ہو سکتا ہے چنانچہ جب اس کو کوئی کام نہیں ہوتا تو آپ اس کو اس کے مکان پر بآسانی پا سکتے ہیں ۔ وہ کسی کلب کا رکن نہیں ہے اور کسی قسم کے کھیل کود میں شریک نہیں ہوتا بلکہ اپنی ساری چھٹیاں بھی گھر پر ہی گذارتا ہے ۔ خود اُس کے فارمولے کے مطابق وہ آپ کو یہ تک بتلا سکتا ہے کہ گھر کا سب سے اہم کمرہ کونسا ہے ۔ یہ کمرہ یقیناً باورچی خانہ ہے ۔ جہاں میں ہر روز مکمل نصف یوم گذارتی ہوں ۔ یہ بات بھی نہیں کہ ہمارے یہاں کھانے پر بہت سے مہمان آتے ہوں ۔ لارڈ میئر کا جلوس ہو یا نہ ہو ' مجھے اب تک بڑی دعوتوں کے لئے کھانا بنانا پسند نہیں ۔ مگر ہچکاک کے لئے بخوشی پکاتی ہوں ۔ اور یہاں میں یہ اعتراف بھی کروں گی کہ اس سلسلے میں مجھے غیر معمولی حوصلہ اور جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے ۔ کیونکہ کوئی شخص بھی اچھے اور مزے دار کھانوں کو اتنا زیادہ پسند نہیں کرتا جتنا کہ ہچکاک ۔ اس کی سب سے مَن پسند غذا بُھنا ہوا مُرغ اور اُبلا ہوا بام (سُور کا گوشت) ہے ' جو میز پر ایک ساتھ رکھے گئے ہوں ۔ ایک روز جبکہ میں یہی غذا تیار کر رہی تھی ' میری ایک سہیلی مجھے بغور دیکھ رہی تھی ۔ اُس نے پُوچھا ۔ " کتنے مہمان آنے کی توقع ہے ؟" میں نے جواب دیا ۔ " صرف دو ! " اور وہ مجھے حیرت سے گھُورتی رہی جیسے میں پاگل ہوں ۔

ہمارے مکان میں شام کے کھانے کے لئے ساری شام صرف ہو جاتی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ یہی کام پسند کرتے ہیں ۔ اسی لئے ہم اپنی ساری شام اسی کی تیاریوں میں صرف کر دیتے ہیں ۔ میری پکوان کی پچاس کتابوں میں سے کسی ایک میں ' میں نے بَط کے بھُوننے کی ترکیبیں دیکھی تھیں اور میں اس کو آزمانا چاہتی تھی ۔ ناشتہ پر میں نے اس سلسلے میں ہچکاک سے گفتگو بھی کی تھی (درحقیقت میں اچانک بط تیار کر کے اس کو حیرت زدہ کرنا چاہتی تھی ۔ مگر یہ صحیح ہے کہ وہ سارا دن اس بات کا انتظار ہی نہیں کر سکتا کہ ڈنر کے لئے کیا بن رہا ہے) جب وہ شام کے ساڑھے چھ بجے اسٹوڈیو سے واپس لوٹا تو بط کی بڑی اچھی اشتہا انگیز خوش بُو پھیلی ہوئی تھی ۔ اس نے جھٹ ایپرن پہنا اور پھلیاں چھیل کر میرا ہاتھ بٹانے لگا ۔ اس اثنا میں میں نے میز پوش اور جگمگاتے ہوئے نقرئی برتنوں سے کھانے کی میز سجا دی ۔ میں نے سوڈا ملانے کے نازک اور نفیس شیشے باہر نکالے اور ہم بحث کرنے لگے کہ کونسی شراب بط کے ساتھ مناسب ہو سکتی ہے ۔ پھر ہم شوربا پینے کے لئے بیٹھ گئے ۔ ہم نے کچھ جلدی نہیں کی ، کیونکہ ساری رات ہمارے لئے پڑی ہوئی تھی ۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہچکاک نے اپنی کافی کی پیالی تیار کی لیکن وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا ۔ پیالی پھسل جانے سے کافی اُس کے ایپرن پر گر گئی تھی ۔ یقین مانیئے اُس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ پانی سے کیتلی بھری اور اُس میں صابن کا چُورا ڈال دیا اور ایپرن

کو دھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے لئے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھے صاف کرنے کیوں نہیں دیتے، میں جانتی ہوں کہ تمہیں ایسے کام کرنا پسند نہیں ہے" لیکن اُس نے بڑے پُروقار لہجے میں کہا۔

"ہاں یقیناً یہ کام مجھے پسند نہیں، مگر مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ میں اطمینان سے ٹیک لگائے سگار پیتا ہوا تمہیں کام میں مصروف دیکھوں، اب جبکہ میں نے کام شروع ہی کر دیا ہے تو شاید میں برتنوں کی بھی صفائی کر دوں۔"

یقیناً بعض اوقات ہم کھانے کے لئے باہر بھی جایا کرتے ہیں کچھ دن قبل ہم پیرس کے ایک ریسٹورنٹ میں گئے، وہ بہت شاندار جگہ تھی۔ چھت میں فانوس لٹک رہے تھے اور کمرے کے ایک کونے میں آرکسٹرا نغمہ سرا تھا۔ اور ایک سیاہ کوٹ والا بیرا ہماری میز کے قریب گشت کر رہا تھا۔ آخر وہ ایک منٹ کے لئے ہماری طرف بھی پلٹا "مینا" آرڈر دی ہوئی چیزوں کو کاغذ کے ایک پُرزے پر نوٹ کر لیا، ہیچکاک نے میری طرف جھک کر دبی آواز میں کہا "اگر یہ بات گھر پہ ہو تو کیا مزا آئے گا؟"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

چند ہفتوں بعد کھانے کی میز پر وہی کھانے چُنے ہوئے تھے اور ہم نے اس کا دوہرا مزہ لیا۔ حتیٰ کہ سوفل تک بڑا عمدہ بنا تھا۔ ہیچکاک نے اس کو ہمارے نئے شیشے کے دروازوں والے تنور سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور بغیر خوف زدہ ہوئے یا بےبسی اور اضطراب کا شکار ہوئے اُس نے بڑے اطمینان سے سوفل پیا تھا۔■

نوشتہ: جوگندر پال
ترجمہ: لحسن علی مرزا

ہندوستانی صنعتِ فلمسازی

ایک جائزہ

ہندوستانی صنعتِ فلم سازی، اتنی عمر پا لینے کے باوجود ابھی نابالغ ہے۔ پرانے دور کے کسی یتیم اور بگڑے ہوئے راجکمار کے مانند ہے، جو بڑھاپے میں بھی طفلانہ حرکتوں سے باز نہیں رہتا۔ اس کے موٹے تازے اتالیق نہایت موٹی تنخواہیں پاتے ہیں مگر راجکمار کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی بجائے اُسے مزید نکما بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے لاڈلے شاگرد کی خرمستیوں میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ لیکن شہزادے کے غیاب میں وہ اس کی شکایت کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

اِس صُورت حال کی ذمہ داری آخر کس پر عاید کی جائے؟ کہانی نویس پر؟ وہ ہمیشہ اِس بات کا گلہ گذار رہتا ہے کہ ڈائرکٹر اسے اپنی ذہانت کے اظہار کا کوئی موقع ہی دینا نہیں چاہتا ــــ ڈائرکٹر پر؟ ــ وہ پروڈیوسر کا نوحہ خواں رہتا ہے ــــ پروڈیوسر پر؟ ــ وہ فینانسر کی بدمذاقی کو کوستا اور ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ اگر اس کی باتوں اور مشورو[ں] پر عمل کیا جائے تو کلاسیکی فلموں کے دور کا بہ آسانی احیاء ہو سکتا ہے۔ وہ غالباً اپنے عنفوانِ شباب میں تیار ہونے والی نام نہاد "اخلاقی اور عبرت آموز" فلمیں تیار کرنا چاہتا ہے۔ جہاں مختارِ کُل فینانسر کا تعلق ہے، وہ صرف ڈسٹری بیوٹرس کے مشوروں کو اہمیت دیتا ہے۔ جو اُس کی سڑی گلی پیداوار کی نکاسی کے لئے مارکیٹ فراہم کرتا ہے۔ رہ گیا ڈسٹری بیوٹر، سو آپ کسی تاجر کے بارے، اس بات کی شکایت کا کیا حق رکھتے ہیں کہ وہ ـــ بے شعور اور بدمذاق واقع ہوا ہے۔ وہ تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ اسے صرف ایسی چیز چاہیئے، جسے عوام پسند کرتے ہیں۔

"نگارخانہ" کے اِن بے بس اور مجہول کرداروں میں سے آپ کس پر یہ ذمہ داری عاید کریں گے کہ وہی فساد کی جڑ ہے۔ جب کوئی بھی اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دینے کے لئے تیار نہیں تو، کس پر تنقید کیجئے اور کسے ہدفِ ملامت بنایئے۔ لے دیکھ کر ہر شخص تماشائیوں کی بدمذاقی

سہارا لیتا ہے۔ لیکن کیا یہ درست ہے کہ پروڈیوسر ایسی ہی فلمیں تیار کرتے ہیں جو عوام کی سندِ پسندیدگی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس دور میں جبکہ فوٹوگرافی مصوری کا، اور جرنلزم ادب کا ایک شعبہ بن گئی ہے، ہمارے فلمساز جانے یا انجانے اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ آرٹ اور انڈسٹری میں حدِ فاصل قائم کریں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بلند پایہ فلم، آرٹ کے شعور کے بغیر تیار نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ہمارے بیشتر فلمساز صرف صنعت کار اور تاجر واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس بات کو مشکل ہی سے تسلیم کرتے ہیں کہ سینما، عوام میں نئی زندگی کی قدروں کا احساس پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ ان میں نہ تو فن اور آرٹ کا کوئی شعور ہے اور نہ ہی وہ دوسروں کی فنکارانہ صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کی اہلیت کے حامل ہیں۔ فلمی کہانیوں کے 'بدخو' اور 'بداطوار باپ کی طرح' جو اپنی لڑکی کے ترقی پسند رجحانات کا دشمن ہوتا ہے، وہ بھی کسی معقول فلمی کہانی کے متحمل نہیں ہو سکتے، فلموں کے روایتی باپ ہی کی طرح جو فلم کے اختتامی حصے میں عوام کو خوش کرنے کے لئے سپر ڈال دیتا ہے۔ فلمساز بھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے کسی بھی مرحلہ پر تماشائیوں کی خوشنودی کے نام پر کوئی بھی مصالحت کر لیتا ہے۔

اگر ہمارے پروڈیوسر اپنے پیشے کے اُتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف ہوتے تو انہیں فارمولا فلموں کی ذمہ داری تماشائیوں پر عائد کرنے کی جسارت نہ ہوتی۔ سچا آرٹسٹ عوام کی صلاحیتوں کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے نزدیک کوئی معیار عوام کے شعور کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی فلمساز یہ کہتا ہے کہ کسی خاص خیال پر تیار ہونے والی کوئی فلم عوام کے مذاق سے مطابقت نہیں رکھتی تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ اس خیال کو عام فہم اور موثر انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

جہاں تک تماشائیوں کا تعلق ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ، "ہالی ڈے موڈ" میں سینما دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ کسی بھاری بھرکم خیال کی نمائندگی کرنے والی فلم دیکھنے کی بجائے ہلکی پھلکی فلم دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لمحاتی مسرت حاصل کرنے کے لئے وہ قلیل آمدنی کا ایک حصہ ٹکٹ کی صورت میں خرچ کر دیتے ہیں۔ اس کے معاوضہ میں زیادہ سے زیادہ تفریح حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہی "موڈ" انہیں پروڈیوسر کی بدمذاقی کو برداشت کر لینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اس سے ہٹ کر وہ بھی اس کے گھٹیا مذاق کو پسند نہیں کرتے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جانا چاہیے کہ سینما کا بنیادی مقصد تفریح ہوتا ہے۔ لیکن ایک تفریحی فلم کے لئے بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہماری زندگی کی نمائندگی کرے۔ ہمارے تجربات و مشاہدات سے مشابہت رکھنے والی فلمیں عام طور پر پسند کی جاتی ہیں۔ اور ان میں تفریح و تفنن کا بھی کافی سامان ہوتا ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر اس بات کو باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ صاف ستھری اور معیاری فلمیں ہمارے ملک کے عوام کی سندِ پسندیدگی حاصل نہیں کر سکتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نگارخانوں کے ناخدا ہی کور ذوق اور بد ذوق واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہانی اور منظر نامہ کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ، دو چار چٹپٹے گانے، محبت کا ایک آدھ گھٹیا منظر ہی کسی فلم کو باکس آفس ہٹ بنانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہ رجحان گذشتہ پانچ سات برس سے بہت عام ہوتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں بیشتر ہندوستانی فلمیں، فارمولا فلموں کے معیار سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ کوئی پروڈیوسر ہمت کر کے، کوئی معیاری فلم، اور صاف ستھری فلم بنا لے بھی تو اسے اس بات کا یقین نہیں رہتا کہ اس فلم کی لاگت بھی نکل سکے گی۔ ایسی فلموں کو پروڈیوسر بھی لینا نہیں چاہتے ہندوستانی فلم انڈسٹری کو جس کی عمر اب ربع صدی سے زیادہ ہو چکی ہے اس دلدل سے نکلنے کی پُرخلوص کوشش کرنی چاہیے۔ اس کیلئے انڈسٹری میں صرف سرمایہ ہی کی آؤ بھگت کے عام میلان کے خلاف ایک ہمہ گیر جدوجہد چلائی جانی چاہیے اور ایسے پڑھے لکھے افراد و عناصر کو صنعت میں نمایاں مقام دیا جانا چاہیے جو سینما کی اہمیت و افادیت کا بھرپور شعور رکھتے ہیں اور اسے، زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کا ایک موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بات کچھ کم اُمید افزا نہیں ہمارے بعض اچھے دانشور، ادیب اور شاعر، انڈسٹری میں اچھی پوزیشن حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی آواز، ابھی اتنی موثر نہیں ہو سکی ہے کہ

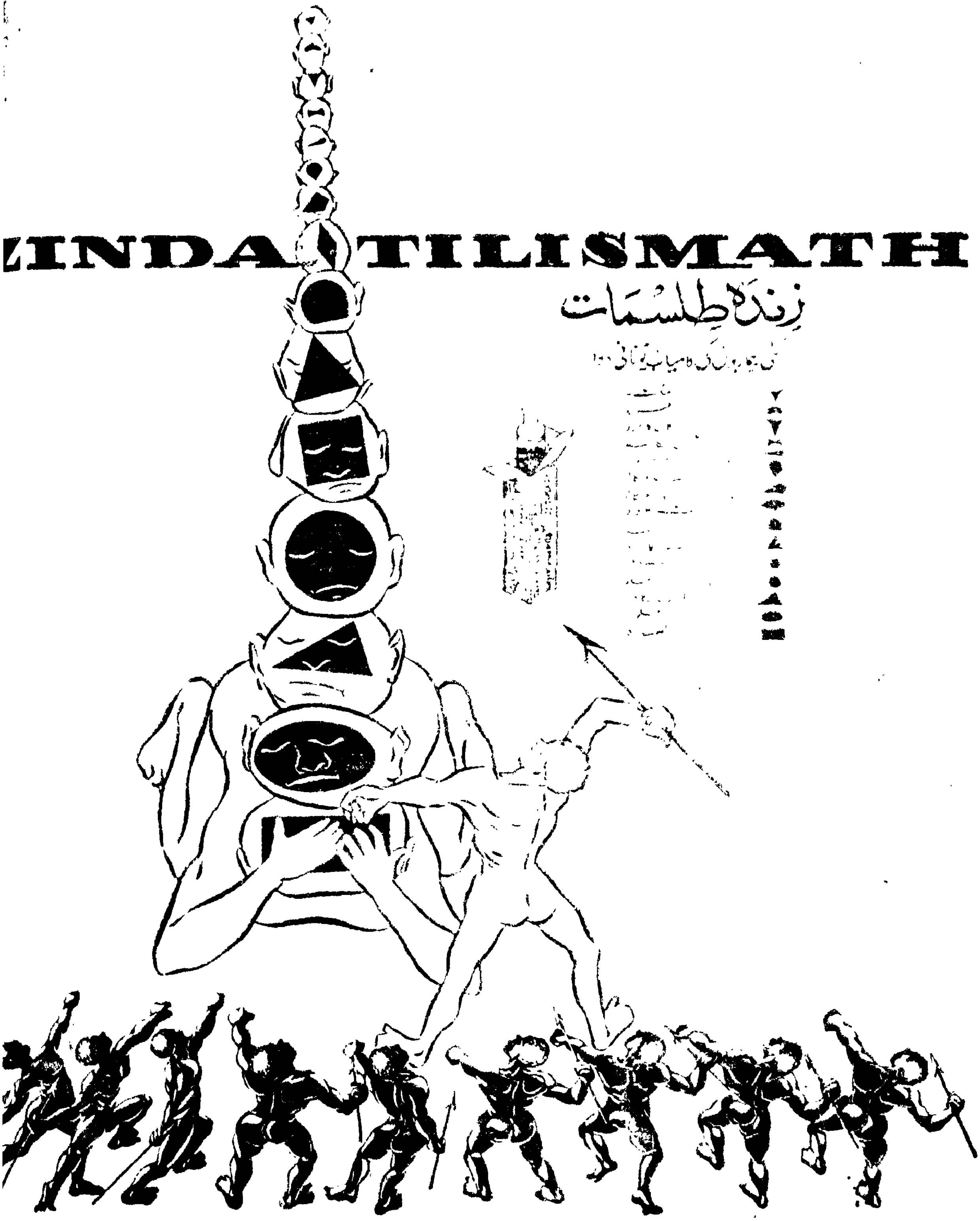
ان بے شعور عناصر وافراد کی نام نہاد تجاویز پر غالب آسکے جو محض سرمایہ کے ناتے، صرف اپنی ہی بات منوانے پر مُصر نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ فنیانسر کو اُس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تحفظ کی موثر ضمانت دی جانی چاہیئے۔ لیکن اسے اِس بات کا حق نہیں پہونچتا کہ وہ ادب اور فن کی باریکیوں کے شعور وادراک کے بغیر ہی فلم کی کاغذی تیاریوں سے لیبارٹری میں اس کے آخری مراحل طے کرنے تک، ہر مرحلہ پر اپنی ناقابل قبول رائے، متعلقہ افراد پر مُسلط کرتا چلا جائے۔

ہندوستانی فلموں کے گھٹیا معیار کو صرف عوام کی بدمذاقی کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے، ان تمام افراد کو جو، ہندوستانی فلمی صنعت میں ایک نئی رُوح پھُونکنا چاہتے ہیں، اِس اَمر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ فلم سازی میں سرمایہ کی مطلق العنانی ختم ہو۔ ▲

Regd No.
H: 470

POONAM MONTHLY
AZAMPURA, HYDERABAD-A. P.

JULY
1964





NTHLY

OONAM

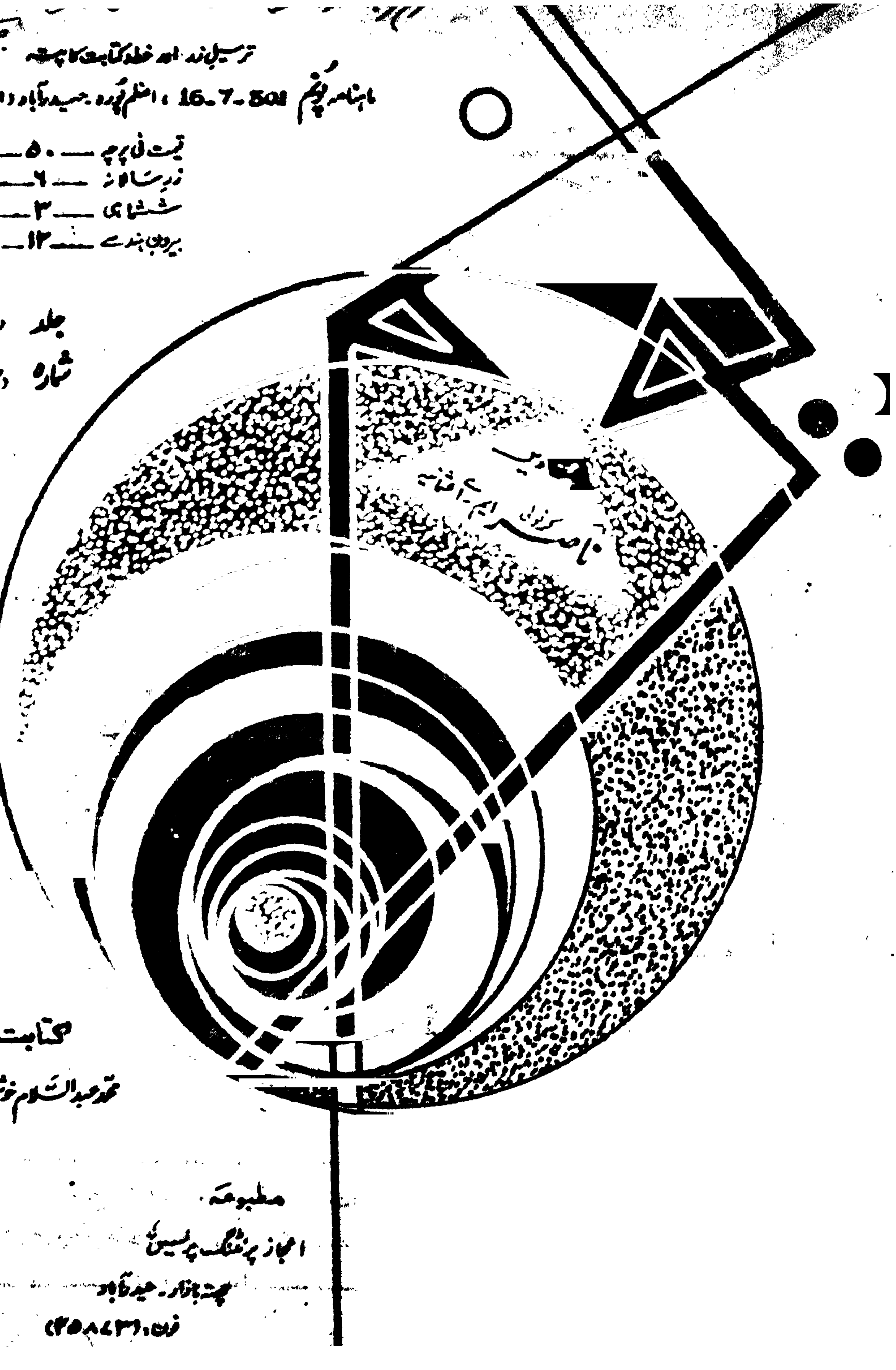
HYDERABAD



ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ پونم 501-7-16، اعظم پورہ، حیدرآباد (اے۔پی)

قیمت فی پرچہ — ۵۰ — پیسے
زر سالانہ — ۶ — روپے
ششماہی — ۳ — روپے
بیرون ہند سے — ۱۲ — شلنگ

جلد (۱)
شمارہ (۴)



کتابت
محمد عبدالسلام خوشنویس

مطبوعہ
اعجاز پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار۔ حیدرآباد
فون: ۴۵۸۲۳۱

ترتیب

کرنیں ——— ادارہ — ۳

قومی آزادی اور اردو شاعری — اختر حسن — ۵

آسکر وائلڈ کا نظریۂ فن — ابوظفر عبداللہ — ۱۱

ہند قدیم کا مشہور ڈرامہ نویس "راج شیکھر" — [illegible] — ۱۴

○ ہمارے مسائل (مستقل فیچر)

اردو شاعری میں نئے تجربے — مظفر حنفی — ۱۸

○ غزلیں

[illegible] لکھنوی — ۲۰

[illegible] مشہدی — ۲۱

[illegible] پرشاد کنول — ۲۲

[illegible] خواجہ شوق — ۲۳

[illegible] لدھیانوی — ۲۴

○ [illegible]

[illegible] چاند پوری — ۲۵

"کون" [illegible] — ۳۱

گھاؤ — [illegible] — ۳۶

پونم — نکہت اقبال — ۴۰

○ نظمیں

نقوشِ تازہ (رباعیات) — سید عصمت الاکرام — ۴۵

"موت" — نریش کمار شاد — ۴۶

ان گنت روپ کوئی روپ نہیں — دانش فراز — ۴۸

معتمد — ڈاکٹر عبدالعزیز خالد — ۴۹

بے نشاں — مغنی تبسم

حادثہ — حکیم یوسف حسین خاں — ۵۰

گردِ کارواں — ڈاکٹر عزیز تمنائی

حسنِ خوابیدہ، حسنِ سوگوار — پروین ناطقہ پرکاش — ۵۱

○ طنز و مزاح

زعفران زار (مستقل فیچر) — کوہکن — ۵۲

اورینٹ ہوٹل — یوسف ناظم — ۵۳

"کتنے پابندِ وقت ہیں ہم" — مجتبیٰ حسین — ۵۶

○ صنم کدے

سنگم ـ تنقیدی جائزہ ـ تماشائی — ۶۰

عکسِ مہتاب خطوط — ۶۴

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر [illegible] حیدرآباد [illegible]

کِرنیں

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے روزِ سعید کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش یادگار کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وہ دن ہے جس نے ہمیں حکومتِ برطانیہ کی غلامی سے نجات دلائی۔ ہم اپنے ملک کی آزاد فضا میں سانس لینے لگے اور لال قلعے پر فرنگیوں کے پرچم کی جگہ ہماری آزادی کا وقار ترنگے کی شکل میں لہرانے لگا۔

حصولِ آزادی کے بعد وقت اور حالات کے تقاضوں نے ہماری عمارتی توجہ تعمیری سرگرمیوں کی طرف منعطف کردی، ملک کی ترقی کے لئے پنج سالہ منصوبے بنائے گئے جن کی عملی صورت ہندوستان کے تابناک مستقبل کی ضامن ہے۔ نیز پنڈت جواہر لال نہرو کی رہنمائی نے ہندوستان کی عظمت کو جو توانائی بخشی وہ ایک روشن حقیقت ہے۔

پنڈت جی نے ملک کی سالمیت، قومی یکجہتی، اور فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم کو امن اور شانتی کی بیش بہا قدروں کا احترام کرنا سکھایا، دُنیا کو پُر امن بقائے باہم کے اُصولوں پر کاربند رہنے کی نہ صرف تلقین کی بلکہ جمہوریت کی صحت مند قدروں کو خلوصِ قلب و نظر سے اپنانے پر مجبور کیا۔

آج یومِ آزادی ہے! ہمارا اپنا قومی تہوار — !! اس خوشی کے موقعہ پر ہمارے ہر دلعزیز وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی کمی کا جس شدت سے احساس ہو رہا ہے اس کے اظہار کے لئے الفاظ کا وسیع تر دائرہ بھی محدود ہے۔ آج نشاطِ آزادی کے کیف آور لمحے غم کا احساس تازہ کر رہے ہیں۔ اس غم انگیز ماحول میں یکایک وہی پیغام فضا میں گونجنے لگا جس سے ہمارے کان مانوس ہیں۔

امنِ عالم کا پیغام — ! قومی یکجہتی کا پیغام — !! فرقہ وارانہ اتحاد کا پیغام — !!!

پیغام دے رہا ہے آواز کا لب و لہجہ بدلا ہوا ہے ۔ یہ آواز پنڈت جی کے حقیقی جانشین لال بہادر شاستری [illegible] کی
ہے جو ہندوستانیوں کو یقین دلا رہی ہے کہ آج پنڈت جواہر لال نہرو ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا پیغام ، ان کے
نظریات و تصورات ، ان کے انسانیت نواز اصول آج بھی ہماری رہنمائی کر رہے ہیں ۔

آئیے اب آج ہم یہ عہد کریں کہ جب تک زندگی ہے ، پنڈت جی کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش
کریں گے ، ان کے نظریات کو اپناتے ہوئے ملک کی سالمیت ، قومی یکجہتی ، فرقہ وارانہ اتحاد اور [illegible] کے
دوام کی تحریک کو پیش رفت میں ہمہ تن مصروف رہیں گے تا کہ پنڈت جی کی روح کو شانتی حاصل ہو سکے ۔

لیجئے اب " پونم " کا یہ تازہ شمارہ آپ کی ضیافت طبع کے لئے پیش ہے ۔ مجھے [illegible] ہے کہ یہ شمارہ قارئین
کے نکھرے ستھرے ذوق کے لئے صوری اور معنوی اعتبار سے اپنی روایتی برتری کا آئینہ دار ثابت ہوگا ۔

ہمارا خیال تھا کہ یوم آزادی کے سلسلے میں " پونم " کے اگست کے شمارہ کو خاص [illegible] کیا جا
چنانچہ اس خصوص میں ادارہ نے بعض مخلص اہل قلم حضرات سے مشورے بھی طلب کئے تھے [illegible]
کو بھی خاص نمبروں کی حیثیت دیتے ہوئے اس کی خصوصی اشاعت سے [illegible]
تھا کہ اس مختصر سے وقت میں ہماری کوششیں ان کی امیدوں کی تکمیل نہیں بن سکیں گی ، چنانچہ ادارہ نے فیصلہ کیا ہے
کہ پونم کے خاص نمبر سے جس قدر توقعات وابستہ کی گئی ہیں اس سے بھی شاندار صورت میں اسے منظر عام پر لانے
کی کوشش کی جائے گی ۔ اگر اہل قلم حضرات کا قلمی تعاون اور قارئین کی نیک تمنائیں شامل حال رہیں تو ادارہ
یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب رہے گا ۔

ناصر [illegible]
۱۵/۸/۶۴ء

ضروری

جولائی کے شمارے میں پروفیسر اختر نظمی
کی نظمیں 'کشمکش' اور '[illegible]' اختر نظمی
کے نام سے سہواً شائع ہو گئی تھیں ، قارئین
تصحیح فرما لیں ۔ (ادارہ)

اختر حسین

قومی آزادی اور اُردو شاعری

ہندوستان کی قومی آزادی کے دَوران میں اُردو شاعری نے متعدد ہموار و ناہموار راستے طے کیے ہیں، اور ہر منزل پر اپنے قدموں کے ایسے نشانات چھوڑے ہیں جن کی تابانی و درخشندگی لازوال ہے۔

ہندوستان کی قومی آزادی کے تصور نے جب ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور پھر اس تحریک نے جب عمل اور جد و جہد کے میدان میں قدم رکھا اُس وقت بھی اور حصولِ آزادی کے بعد بھی، اُردو شاعری میں "رُوحِ عصر" اپنی جلوہ گری کے کرشمے دکھاتی رہی۔

حالی کی اصلاحی شاعری سے جوش کی انقلابی شاعری تک ہر موڑ پر ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی زندگی کے ہزار در ہزار مسائل سے اُردو شاعری کا دامن معمور رہا ہے اور پھر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی قومی آزادی کے روزِ سعید سے لیکر آج تک جتنے نو بہ نو مرحلوں سے ہمارے وطن کو گزرنا پڑا ہے اُن سب کی آوازِ بازگشت اُردو شاعری کے ساز میں اس طرح محفوظ ہے کہ اگر اس دَور کے دوسرے تمام تاریخی ریکارڈ ضائع ہو جائیں اور اُردو شاعری کا سرمایہ باقی رہ جائے تو مستقبل کا مؤرخ اس کی مدد سے نئے ہندوستان کی تاریخ کو مُرتب کر سکتا ہے۔ اُردو شاعری ہمیشہ اتنی حسّاس اور اثر پذیر رہی ہے کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے تموّج کو بھی اُس نے اپنے اندر بڑی خوبی سے جذب کیا ہے اور اُس کی فطرت کا یہی نازک پہلو اُس کی شخصیت کو اتنا دلنشین بنائے ہوئے ہے کہ ناموافق حالات میں بھی وہ مقبول و کامران ہے۔

ہندوستان کی قومی آزادی کا تصور جب ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ایک زندہ تاریخی حقیقت بن گیا اور مُلک کی عنانِ اقتدار اہلِ ملک کے ہاتھوں میں آگئی تو کچھ ایسا طوفان و تلاطم برپا ہوا کہ کچھ مدّت کے لئے سچائی کا اُفق

نگاہوں سے اُوجھل ہوگیا اور اس کی جگہ نفرت، بے اعتمادی فسادات اور قتل و خُون کا زہرناک لاوا اُبل پڑا، دیس کے بٹوارہ نے فرقہ واریت اور عصبیت کو کھُل کھیلنے کا موقع دیا اور نواکھالی سے پنجاب تک قتل و خُون، لُوٹ مار، عصمت دری و غارتگری کا بازار گرم ہوگیا۔ اس آشوبِ حیات میں اُردو کے چھوٹے بڑے تمام شاعروں نے غصّہ و نفرت اور فساد و عناد کے انسانیت سوز شعلوں کا پُوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور اخُوّت و محبت کا پیام دیا۔ اور پھر جب اسی نراجی حالت میں بابائے قوم مہاتما گاندھی شہید ہوئے تو اُردو کے تقریبًا سبھی شاعروں نے اس حادثہ جانکاہ پر اپنی صدائے غم بلند کی۔

اور جب آہستہ آہستہ مُلک کے سیاسی و سماجی انتشار و اختلال میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا اور تعمیری اور ترقیاتی کام شروع ہوئے تو اِس منزل پر بھی اُردو کے شاعروں نے مختلف پیرایوں میں اِس نئے دَور کا خیر مقدم کیا، پچھلے سال ہندوستان کی شمالی اور شمال مشرقی سرحدوں پر چین کی ناگہانی یلغار نے پھر ایک مرتبہ اہلِ مُلک کے آگے اپنی آزادی کا تحفظ اور سالمیت کا سوال پیدا کر دیا اور پھر ایک بار امتحانِ آزمائش کا وقت آ گیا تو اُردو کے شاعروں نے پوری قوت کے ساتھ اپنے فکر و قلم کو جُنبش دی اور میدانِ کارزار کے ذہنی مورچہ کو سنبھال لیا۔

عبارت مختصر، پچھلے پندرہ سال کی قومی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ کے نمایاں خد و خال اُردو شاعری کے چہرہ میں مُنعکس نظر آتے ہیں۔ جن کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

ہندوستان کو جن حالات میں اور جس انداز سے آزادی حاصل ہوئی اُس کا عام طور سے ردِّ عمل یہ تھا کہ یہ آزادی ادھوری آزادی ہے۔ اس ردِّ عمل کا اظہار اُردو کے متعدد شاعروں نے بڑے دلکش اور پُر اثر انداز میں کیا۔ آزادی کے موضوع پر سیکڑوں نظمیں لکھی گئیں۔ یہاں تک کہ غزل نے بھی اس موضوع کو اپنایا اور غزل گو شاعروں نے بھی اشاریاتی انداز میں اپنے تاثرات پیش کئے۔ پُرانے مکتبِ خیال کے ایک شاعر سراج لکھنوی نے کہا کہ ؎

غبر رہائی کی مِل چکی ہے چراغ پھُولوں کے جل رہے ہیں
مگر بڑی تیز روشنی ہے قفس کا دَر سُوجھتا نہیں ہے

آزادی کے فوری بعد جن اندوہناک حالات سے ہمارا مُلک دوچار تھا اُس کا یہ ایک فطری ردِّ عمل تھا۔ اُردو کے بلند پایہ شاعروں نے بھی اسی ردِّ عمل کو اپنے لازوال نغموں میں جگہ دی۔ فیض نے اس آزادی کی تصویر "یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر" کے سحرکارانہ الفاظ میں پیش کی۔ فیض کی اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مِل جائیں گے کہیں نہ کہیں
فلک کے دَشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہُو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حُسن کی بے صبر خوابگاہوں سے
پکارتی رہیں راہیں بدن بُلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نُور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنّا دبی دبی تھی تھکن
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نُور

سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی اُمنگ، دِل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دِل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

"آزادی" پر فیض کی اس نمائندہ نظم کے علاوہ اُردو کے جن دوسرے شعرا نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اُن میں جوشؔ ملیح آبادی، جگن ناتھ آزادؔ، آنند نرائن مُلاؔ، علی سردار جعفری، نریش کمار شادؔ، جگرؔ مراد آبادی اور دوسرے بہت سارے شاعر شامل ہیں۔ اس نازک موڑ پر اُردو شاعری نے اپنی قوم پرستی اور وطن دوستی کا پُورا پُورا ثبوت دیا۔ وہ ۱۹۴۷ء کے خُوں چکاں واقعات پر ماتم بھی کرتی ہے اور بھرپُور درد مندی کے ساتھ اہلِ مُلک کو اتحاد و یگانگت کا درس بھی دیتی ہے۔

ایک طرف تو جگرؔ نے اپنے اشعار میں اِس انداز سے حالات کا ماتم کیا ہے کہ ؂

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل
دِل کی جراحتوں سے کھِلے ہیں چمن چمن
اور اِس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
کیسا خلوص کس کی محبت کہاں کا درد
خود زندگی شاہدِ گریزاں ہے آج کل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے اِن دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

لیکن دوسری طرف جگرؔ کی شاعرانہ بصیرت، ہندوستان کے خوشگوار مستقبل کی بھی بشارت دیتی ہے کہ ؂

چمن کے مالک اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے رُوٹھی بہار اب بھی

جگن ناتھ آزادؔ نے بھی ہندوستان کی آزادی کے سُنہرے سپنوں کو خاک و خُون میں آلُودہ ہوتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار یہ آواز بلند کی کہ:

خیال تھا کہ صُبحِ نو اُفق پہ جگمگائے گی
ہر اِک بلند و پست پر نشاط بنکے چھائے گی
قریب دُور تک ردائے نُور پھیل جائے گی
فلک بھی مُسکرائے گا زمیں بھی مُسکرائے گی
کچھ اپنا رنگ اسطرح سے صُبحِ نو جمائے گی

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے
جب آئے گی تو موجِ زہرناک ساتھ لائیگی
خزاں کی طرح آئیگی چمن میں پھیل جائے گی

ندیمؔ نے کہا ؂

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
جن کو ہم سمجھا کئے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے

نریش کمار شادؔ کی زبان سے بے اختیار یہ آواز بلند ہوئی کہ

اُفق سے تا اُفق ہیں زہر سے بھری سیاہیاں
نظر نظر لہو لہو، قفس قفس، دھواں دھواں
فغاں کہ لُٹ گیا ہے اپنی آرزو کا کارواں
بہار آگئی مگر فضائیں پُر ملال ہیں

بہار کی آمد کے اثبات کے باوجود فضا کی زہرناکی سے

اُردو کے حساس شاعر کس طرح نظریں چُرا سکتے تھے۔ اس ضمن میں شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کی دردمندانہ نظم گریۂ خاص کی چیز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

اے ہمنشیں فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
رُودادِ جام بخشیٔ پیرِ مغاں نہ پوچھ
ہر لب سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

کیا کیا نہ گُل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

شاخیں ہرئیں دو نیم جو ٹھنڈی ہوا چلی
گُم ہوگئی شمیم جو بادِ صبا چلی
انگریز نے وہ چال بہ جور و جفا چلی
برپا ہوئی برات کے گھر میں چلا چلی

خونِ چمن بہار کے آتے ہی بہہ گیا
اترا جو طوق اور بھی دم گھٹ کے رہ گیا

اپنا گلا خروشِ ترنم سے پھٹ گیا
تلوار سے بچا تو رگِ گُل سے کٹ گیا

پایا سبو تو عمر کا پیمانہ بھر گیا
پُرساں ہوئے مسیح تو بیمار مرگیا

بخیہ ہوا تو اور بھی چادر اُدھڑ گئی
بندھن کھلے تو جسم کی رگ رگ جکڑ گئی
بھرنے لگے جو شہر تو بستی اُجڑ گئی

ٹوٹی رسن تو عقل میں زنجیر پڑ گئی

طاقت ملی تو کرنی توانا نہیں رہا
برسا جو مینہ تو کھیت میں دانا نہیں رہا

بارش ہوئی زمین دہک کر اُبل گئی
اُودی گھٹا اٹھی تو ہری دوب جل گئی
اُبھری حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی
باہیں پڑیں گلے میں کہ تلوار چل گئی

آبِ بقا سے زہر کی لہریں اُبل پڑیں
بوسے لئے تو منہ سے زبانیں نکل پڑیں

سکھ نے گرو کے نام کو بٹہ لگا دیا
مندر کو برہمن کے چلن نے گرا دیا
مسجد کو شیخ جی کی کرامت نے ڈھا دیا
مجنوں نے بڑھ کے پردۂ محمل جلا دیا

اِک شوئے ظن کو قلقلۂ عام کردیا
مریم کو خود مسیح نے بدنام کردیا

سروِ سہی نہ ساز نہ سنبل نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جامِ جم نہ جوانی نہ جوئبار
گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گلعذار

اب بوئے گُل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

یہ صرف بیانیہ شاعری نہیں ہے اور نہ محض تبلیغ و پروپیگنڈہ ہے بلکہ اس میں فن اور شعریت کی تمام تر لطافتیں اور گہرائیاں بھی پنہاں ہیں اور "روحِ عصر" کی بھرپور جلوہ گری بھی ہے اور پھر شاعر مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔ وہ خاک و خون میں آلودہ انسانیت کو ان الفاظ میں مستقبل کی بشارت دیتا ہے ؎

نہ ہو ملول اِدھر سے وہ یار گزرے گا
اور ایک بار نہیں لاکھ بار گزرے گا
مچل رہی ہے جہاں زُلفِ پُر فریبِ سُراب
وہیں سے پیچ و خمِ جُوئبار گزرے گا
اسی گلی سے وہ گوہر جبین و آہو چشم
عنان بدوش و ختن در کنار گزرے گا
یہ ایک شب کی تڑپ ہے سحر تو ہونے دو
بہشت سر پہ لئے روزگار گزرے گا

ہر چند یہ ایک شبِ بیمار پہ بہت بھاری تھی، تاہم اُردو کے شاعروں کو یقین تھا کہ خُون آشامی اور فتنہ و فساد کے یہ لمحے گزر جائیں گے اور اس تاریکی کے بطن سے ایک نیا سُورج پیدا ہوگا۔ جذبی نے اسی نئی صبح کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج
ہمالہ کے اُونچے کلس جگمگائے
قدم چُومنے برق و باد آب و آتش
بصد شوق دوڑے بصد عجز آئے
مگر برق و آتش کے سائے میں اے دل
یہ صدیوں کے خود رفتہ ناشاد طائر
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے

علی سردار جعفری نے مادرِ ہند کے چہرہ پہ اُداسی اور غمگینی کے نقوش دیکھ کر بڑی بیقراری کے ساتھ کہا کہ ؎

میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرہ پہ اُداسی ہی رہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اُترنے کیلئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کیلئے

لیکن موت کے ان بھیانک سایوں کے عقب میں آزادی کا جو ستارہ چمک رہا تھا اُس کو مجاز نے اس نظر سے دیکھا کہ ؎

بصد غرور و بصد فخر و نازِ آزادی
مچل کے کھل گئی زُلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزلخواں ہے

راہی نے اپنی نظم 'اجنبی' میں محض تاریخی حقیقتوں کو شعر کا خوبصورت لباس پہنایا ؎

دوسری جنگ سے چودھری تھک گئے
اور جنتا کے تیور بھی کچھ اور تھے
راہبر بھی تجارت پہ راضی ہوئے
کالے بازار میں رام لگنے لگے
کچھ پرشن آئے مشقِ محبت ہوئی
کچھ شکایت ہوئی کچھ تجارت ہوئی
اور نتیجہ میں ہندوستاں بٹ گیا
یہ زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا
شاخِ گُل بٹ گئی آشیاں بٹ گیا
طرزِ تحریر طرزِ بیاں بٹ گیا
ہم نے سوچا کہ وہ خواب ہی اور تھا
اب جو دیکھا تو پنجاب ہی اور تھا

کتنی بہنوں کی میٹھی نگاہیں لُٹیں
پیار کی چھاؤں نظروں کی راہیں لُٹیں
کتنی آشاؤں کی گہری آہیں لُٹیں
مہ جبینوں کی وہ گرم باہیں لُٹیں

اُس کچے گھڑے کی طرح بہہ گئی
سوہنی بیچ طوفان میں رہ گئی
پانچ دریاؤں کا گیت بہنے لگا
اور کوہِ ہمالہ کا سر جھک گیا
عصمتِ زندگی پر کڑا وقت تھا
اور تمدّن کھڑا چیختا ہی رہا
رامؔ کے دیس میں کوئی سیتا نہ تھی
کرشن کے دیس میں کوئی رادھا نہ تھی
بھیڑ سڑکوں پہ ننگی پھرائی گئی
زخمی چھاتی سے محفل سجائی گئی
راوی میں ہر روایت بہائی گئی
دونوں ہاتھوں سے غیرت لٹائی گئی
کچھ لٹیرے بڑے آدمی بن گئے
اور ہم گھر میں شرنارتھی بن گئے

قومی آزادی کا یہ المیہ جتنا جاں سوز تھا، اُس کا پورا پورا درد و حزن اس وقت کے اُردو شاعروں نے اپنی شاعری کے دامن میں سمیٹ لیا، لیکن اس گھنگور تاریکی میں بھی اُردو کے شاعر کا دل انسانیت کے نورِ یقین سے روشن رہا اور مایوسی اور بے اعتمادی اُس کا راستہ نہ روک سکی۔ چنانچہ جب حالات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے اور ملک میں تعمیری اور ترقیاتی کام شروع ہوتے ہیں تو اُردو کا شاعر اپنے دیس کی رعنائی و برنائی کے گیت گاتا ہے اور ترقی و سربلندی کے ترانے سناتا ہے۔

اُردو کے نوجوان شاعروں میں زبیر رضوی کی زبان سے ایسا ہی ایک ترانہ سنیئے ؎

یہ ہے میرا ہندوستان، میرے سپنوں کا جہاں، اس سے پیار ہے مجھکو
ہنستا گاتا جیون اس کا، دُھوم مچاتے موسم
گنگا جمنا کی لہروں میں سات سُروں کا سرگم
تاج ایلورہ جیسے سُندر تصویروں کے البم

یہ ہے میرا ہندوستان.....
دن البیلے راتیں اس کی مستی کی سوداگر
دھرتی جیسے پھوٹ بہی ہو دودھ کی پی گاگر
اونچے اونچے پربت اس کے نیلے نیلے ساگر

یہ ہے میرا ہندوستان.....
بادل جھومے برکھا برسے پون جھکولے کھائے
دھرتی کے پھیلے آنگن میں یوں کھیتی لہرائے
جیسے بچّہ ماں کی گود میں رہ رہ کے مسکائے

یہ ہے میرا ہندوستان.....
رادھا، سیتا، چندرکانتے، شکنتلے اندربال
نینوں میں کاجل کے ڈورے سُرخ گلابی گال
زلفوں کی وہ چھایا جیسے شملہ نینی تال

یہ ہے میرا ہندوستان.....
ڈھولک جاگی مہندی لاگی رنگ رنگیلا ساون
سکھیاں مل مل ہولی کھیلیں سانوریا کے آنگن
گھونگھٹ میں گوری شرمائے رسیا ملن کے کارن
راجہ رانی گڈا گڈی اور پریوں کی کہانی
بچوں کے جھرمٹ میں سنائے بیٹھ کے بوڑھی نانی
لوری گائے ماتھا چومے ممتا کی دیوانی

یہ ہے میرا ہندوستان.....
البیلا پنجاب ہے اس کی رومانوں کی بستی
صبح بنارس شامِ اودھ اور شالامار کی مستی
بمبئی جیسے شہر اس میں دِلّی جیسی بستی

یہ ہے میرا ہندوستان.....
یہیں ہوا تھا سچائی کا گوتم کو احساس
یہیں لیا تھا ساتھ رامؔ کے سیتا نے بن باس
غالب اور ٹیگور یہیں کے، میرا تلسی داس

یہ ہے میرا ہندوستان..... ▲

ابوظفر عبدالواحد
★

آسکر وائلڈ کا نظریۂ فن

زندگی بڑا فن ہے جس کی خدمت میں جملہ فنون سرگرم نظر آتے ہیں خوش پوشی اور خوش نگاری، آرٹ اور حُسنِ اظہار کے مظاہر ہیں۔ آرٹسٹ کے پاس اظہار، اور صرف اظہار ہی زندگی کی آن ہے۔ اسی کے بَل پر ہم لوگ جیتے ہیں۔

آرٹ مُبالغے ہی کا ایک رُوپ ہے۔ اور انتخاب جو اصل میں آرٹ کی جان ہے، شدتِ تاکید کا ایک مبالغہ آمیز سانچہ ہے۔

انسان کو زندگی کی مسرتوں اور رنگینیوں سے ہمدردی رکھنی چاہیئے۔ زندگی کے گھاؤں کا دُکھڑا جتنا کم بیان کیا جائے اُتنا ہی اچھا۔

جہاں کہیں آرٹ کی حقیقی غایت سے منحرف ہو کر ہم نے بس زندگی ہی کا دامن تھاما ہے، ہمارا فن کارانہ عمل بیرسے سے بھونڈا، پھُس پھُسا، اور بے رس ہو کر رہ گیا ہے۔ آرٹ کا ذہن میں ورنگ حاصل کرنے کے لئے مُناسب درس گاہ خود آرٹ ہے نہ کہ زندگی۔

آرٹ کی تکمیل کا راز خود اُس کے اندر ہے نہ کہ اُس کے باہر۔ آرٹ کو کسی خارجی مُشابہت کی کسوٹی پر کَسنا نہ چاہیئے آرٹ حجاب ہے، نہ کہ آئینہ۔

کسی فن کار کا عمل دوام، اُس کی انوکھی سرشت کا انوکھا ثمر ہوتا ہے۔ عمل کی خوبی اِس میں ہے کہ اُس کا ایجاد کار دنیائے فن کاری کے سوا اور کسی شئے کی سُدھ نہیں رکھتا۔ جہاں فن کار اوروں کی مانگ اور پسند کا تابع ہوا، فن کار نہیں رہتا۔

زندگی اپنی حقیقت پسندی کی بدولت، فن کے موضوع کا ستیاناس کرتی رہی ہے۔ تخلیق کاری کی ساری لذت بالکل بس اس میں ہے کہ ایسی چیز سامنے لائی جائے جو پائی نہیں جاتی۔

آرٹ اُس سے بھی زیادہ مُجرّد ہے، جتنا کہ ہم نے اُسے سمجھ رکھا ہے۔ رُوپ رنگ، محض رنگ رُوپ ہے۔ دیکھا یہی گیا ہے کہ فن اپنے فن کار کا پردہ دار ہوتا ہے غمّاز نہیں ہوتا —

ہماری زندگی میں جو بھی کشش نظر آتی ہے، قدیم یونانیوں کا طفیل ہے اور ساری بدآہنگی، قرونِ وسطیٰ کا ظہورا۔

یہ سب اصطلاحیں مثلاً انگریزی آرٹ، فرانسیسی آرٹ ولندیزی آرٹ، سرے سے مہمل ہیں۔ آرٹ حُسن کا گیان ہے، ریاضی سچائی کا۔ دونوں قومیت اور ارضی حد بندیوں سے بالاتر ہیں۔

آرٹ انسانی اعمال کے دَرپے نہیں ہوتا۔ وہ خواہشِ عمل کو ناپید کر دیتا ہے۔ فن کی بڑی خوبی ہے، بے ثمری۔

فن کار، اخلاقی ہمدردی سے ناآشنا ہوتا ہے۔ نیکی اور بدی سے اُسے اس حد تک سروکار ہے جتنا کہ ایک نقاش کو آب و رنگ سے۔ اس سے زیادہ اِن کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ نیکی اور بدی سے ایک فن کارانہ اثر پیدا کیا جا سکتا ہے اور وہ کر گزرتا ہے۔

ایک حقیقت پسند اور کریہہ دَور میں فنون، زندگی سے کچھ اخذ نہیں کرتے، بلکہ ایک دوسرے سے۔

دُنیا کی تاریخ میں صرف دو دَور اہم ہیں۔ ایک وہ جس میں اغراضِ فن کے لئے کسی انوکھے اُصول کا انکشاف ہو۔ دوسرا وہ جس میں اظہارِ فن کے لئے کوئی انوکھی شخصیت سامنے آئے۔

کوئی فن کار، اشیاء کو ٹھیک اُسی طرح نہیں دیکھتا جس طرح کہ وہ ہوا کرتی ہیں۔ جہاں اُس نے ایسا کیا، فن کار نہیں رہتا۔

میری رائے میں ایک ناقدِ فن کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ کسی وقت، کسی موضوع پر، دراز نفسی سے کام نہ لے۔

مقبولیت ایک ایسا تمغہ ہے جو دُنیا نکمے فن کو عطا کرتی ہے۔ عام پسند چیز ہمیشہ سطحی ہوا کرتی ہے۔

خواہشِ اظہار پر زندگی قائم ہے، اور آرٹ کو نت نئے سانچوں کی تلاش رہتی ہے تاکہ اظہار کی تکمیل ہو سکے۔

جب زندگی آرٹ پر چھا جاتی ہے تو آرٹ کو کسی [illegible] میں منہ چھپانا پڑتا ہے۔ حقیقی تنزل یہ ہے جس کے سبھی آج کل شکار ہیں۔

وہ حسین اور عظیم جذبات جو آرٹ ہم میں بیدار کرتا ہے، سماج کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ سماج کے نزدیک فکر و مراقبہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ سماج مجرم کو بخش دیتا ہے لیکن خیال پرست کو کبھی نہیں بخشتا۔

ادب اور آرٹ میں نشانِ امتیاز، دِل کشی، حُسن اور بلند پروازی کی ہمیں تلاش رہتی ہے۔ ہمارا وقت اس لئے نہیں ہوتا کہ کوئی شخص گھٹیا درجے کے لوگوں کے احوال اور اُن کے بے رس اعمال سے ہمارا ناک میں دم کرے۔

کسی ناقابلِ وقوع واقعے کو بہ کمالِ صحت بیان کرنا مورخین ہی کا شیوہ نہیں، بلکہ ہر باکمال اور شائستہ فن کار کا پسندیدہ شعار ہے۔

قدیم مورخین نے حقائق کے رُوپ میں دِل کش افسانے دُنیا کے سامنے پیش کئے۔ ہمارے زمانے کا ناول نگار افسانے کے قالب میں بے رس حقائق پیش کرتا ہے۔

حقائق کی اِس ہولناک پرستش کی مُناسب روک تھام نہ کی گئی تو پھر آرٹ کبھی بار آور نہ ہوگا اور یہ سنسار ہمیشہ کیلئے حُسن سے محروم ہو جائے گا۔

آرٹ حقائق سے بے تعلق رہ کر ایجاد و تخلیق، اور خواب اور سپنوں کی ایک دُنیا آباد کرتا ہے اور اپنے اور حقیقت کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر فصیل کھڑی کرتا ہے۔

آرٹ اپنے سوا کسی شئے کو آشکارا نہیں کرتا۔ اُس کی اپنی آزاد زندگی ہوتی ہے، جس طرح افکار کی اپنی آزاد دُنیا ہوتی ہے اور اپنے طور پر بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

فطرت کوئی حاملہ ماں نہیں کہ جس نے ہمیں جنم دیا ہو۔

وہ خود ہماری تخلیق کاری کا نتیجہ ہے، اور ہماری ذہنی کاوش سے نکلی ہے۔ یہ سب اشیائے موجودات ہیں، اس لئے کہ ہم انہیں گاہ و بےگاہ دیکھتے رہتے ہیں۔ اور جو کچھ بھی ہم دیکھتے ہیں اور جس طرح بھی ہم دیکھتے ہیں، یہ سب فیضان ہے، اُن فنون کا جو ہم پر اثر انداز ہوئے۔ آجکل لوگوں کی نگاہیں کُہر پر اس لئے نہیں جمی رہتیں کہ کُہر کُہر ہے، بلکہ اس لئے کہ شاعروں اور نقاشوں نے کُہر آلود فضاؤں کی رنگینیوں سے اُنہیں آشنا کیا ہے۔

ادب اور صحافت میں فرق؟ ادب کوئی پڑھتا نہیں صحافت پڑھنے کے قابل نہیں۔

نری خودپسندی ادب میں بڑی بھلی لگتی ہے، ادب ہی پر کیا موقوف ہے، زندگی کے ہر رُوپ میں خودپسندی بے کشش کے نہیں ہوتی۔ لوگ جب اوروں کا ذکر چھیڑتے ہیں تو عموماً بےرس اور بیزارکُن ثابت ہوتے ہیں۔ اپنا ذکر چھیڑتے ہیں تو دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں۔ لوگوں کی "آپ بیتیاں" —— (خودنوشت سوانح) میں اسی لئے بڑی شوق سے پڑھتا ہوں۔

سوال ہوگا کہ ہر انسان آپ اپنا ڈفالی بنے تو پھر سوانح نگاروں کا کیا حشر ہوگا، وہی جو ساون کے اندھوں، اور موٹے نکمّوں کا ہوا کرتا ہے۔

اگلے زمانے کے سوانح نگار اپنے مشاہیر کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے، لیکن سوانح نگاری کا جدید ترین عمل دراصل یہ ہے کہ بڑوں کے دام گرائے جائیں۔ بڑی کتابوں کی سستی اشاعتیں خوب ہیں۔ لیکن بڑوں کی یہ سستی اور لنڈوری کہانیاں اُتنی ہی بےرس اور پھیکی۔

تذکرہ نگاروں کا ایک خاص گروہ اور بھی ہے۔ ادب کا کریاکرم ان لوگوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ جہاں کوئی نقاش یا ادیب مرا اور یہ لوگ غسالوں اور جنازہ برداروں کے ساتھ آدھمکے، کچھ خزف ریزے اور کچھ خاکستر ان لوگوں کے ہاتھ لگتی ہے۔ ادب کی رُوح تک اُن کی رسائی نہیں ہوتی۔

انگلستان کے اداکار ایکٹنگ (اداکاری) میں کمال دکھاتے ہیں لیکن اُن کا بڑا کمال اُن کی بین السطور ایکٹنگ میں ہے۔

ٹائپ کی مشین اگر سلیقے کے ساتھ چھیڑی جائے تو اُسکی آواز سامعے پر اتنی گراں نہیں گزرتی، جتنا کہ ایک پیانو جس کے نغمے پر کسی گھسیلو استری کی انگلیاں ہوں۔ ▲

جلالی شاہجہانپوری

ہند قدیم کا مشہور ڈرامہ نویس راج شیکھر

سرزمین ہند میں ڈرامہ کی تخلیق کو ویدوں جیسی عمری قدامت حاصل ہے، اور ہند کے اخلاقی معلمین نے اس سے بہت سے مفید کام بھی لیئے۔ بُدھ مذہب کے پیروؤں نے اس کو مذہبی تبلیغ و اشاعت کا خاص ذریعہ بنایا۔ سکندری حملے سے بہت پہلے ہی اگرچہ یہ فن اُصول و ضوابط کے تحت آچکا تھا لیکن اس حملہ کے بعد جب کہ ہند و یُونان میں تہذیبوں کا باہمی تبادلہ ہو رہا تھا، اس نے فنی حیثیت سے آگے قدم بڑھانا شروع کئے اور تیسری صدی عیسوی سے ترقی کی رفتار میں جو تیزی آئی وہ تقریباً نویں صدی عیسوی تک برابر قائم رہی۔ مصری تقدیم و تاخیر سے قطع نظر اس فن کو ترقی دینے والوں کی فہرست کافی طویل ہے لیکن اس میں کالی داس کا نام سرِفہرست ہے۔ اس کے بعد بھوبھوتی کا نام آتا ہے اور تیسرا ترتیبی نام راجہ ہرش وردھن کا ہے اور سلسلہ کی چوتھی کڑی راج شیکھر ہے بعض تذکرہ نویسوں کے نزدیک راج شیکھر کے ڈراموں کو ہرش کے ڈراموں پر ادبی فوقیت حاصل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہاراجہ ہرش کا مرتبہ ڈرامہ نویسی میں راج شیکھر سے بہت بلند ہے۔ راج شیکھر کے ڈرامے سماجی اور معاشرتی زندگی کے مکمل آئینہ دار ہیں اور ان کی ادبی حیثیت میں بھی کسی کو کلام نہیں، لیکن ہرش کے ڈراموں کی سماجی اور معاشرتی عکاسی اور اُن کی ادبی حیثیت راج شیکھر کے ڈراموں سے بہت بلند و ارفع ہے۔ ہرش نے اپنے ڈراموں کو طبقہ میں موثر بنانے کی خاطر زبان کی شُستگی، طرزِ بیان کی قدرت الفاظ کی حُسنِ ترتیب، فقرات کی بندش، عبارت کی برجستگی، اور خیالات و جذبات کی ہم آہنگی کا حق ادا کر دیا۔ جس کی بنا پر راج شیکھر کا ڈرامہ نویسی میں نمبر اس کے بعد ہی آتا ہے۔

راج شیکھر مہاراشٹر کے ایک علمی خاندان کا چشم و چراغ تھا لیکن قنوج کے فن پرور اور مسلم ہدست دربار میں پہونچ کر راجہ مہندر پال کے وظیفہ یابوں میں داخل ہو گیا۔ اس کی علمی اور فنی قابلیت سے متاثر ہو کر راجہ نے اس کو اپنا گرو بھی تسلیم کر لیا تھا۔ راج شیکھر

گرچہ ذات کا برہمن تھا لیکن اس کی بیوی چوہان نسل کی راجپوت شاہزادی تھی۔ نیز مذہب و عقیدہ کے لحاظ سے وہ پکا شیو ہونے کے باوجود جین مسلک پیروؤں کا بھی اس کے دل میں بڑا احترام تھا۔

نویں صدی عیسوی میں سنسکرت بحیثیت عوامی زبان مُردہ ہو چکی تھی اور علاقائی اور جغرافیائی حد بندیوں کے نتیجہ میں ماگدھی، شورسینی، اور مہاراشٹری زبانیں جن کو مقامی پراکرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا وجود میں آ چکی تھیں اور ان میں بھی مہاراشٹری زبان تصنیفی زبان کی حد تک پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ راج شیکھر نے بھی، سنسکرت کا جید عالم ہونے کے باوصف پراکرت کو تصنیفی زبان کی حیثیت سے اختیار کیا۔ بعض مورخین کی رائے میں راج شیکھر کے عہد میں سنسکرت کے ساتھ پراکرت بھی مُردہ زبان بن چکی تھی اور مقامی بھاشاؤں میں تصنیف و تالیف کا کام ہونے لگا تھا۔ لیکن "کپور منجری" کے (ڈرامہ) انگریزی مترجمین اسٹین کونو، اور سی ایچ لانمین اس سلسلہ میں قطعی خاموش ہیں۔ مگر ۱۸۸۳ء کے کپور منجری کے ہندی ترجمہ کے دیباچہ میں ہندی کے مشہور عالم پنڈت ہرش چندر نے اس ڈرامہ کا شدھ پراکرت میں تصنیف ہونا ثابت کیا ہے۔

راج شیکھر کی تصانیف کا سلسلہ طویل ہے، لیکن ڈرامائی ادب میں کپور منجری، بال رامائن، بال بھارت اور ودھ شال بھنجکا آپ اپنی نظیر ہیں۔

قنوج سرکار کی قدردانیوں کی وجہ سے راج شیکھر نے اگرچہ شمالی ہند میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، لیکن جنوبی ہند کی خوشگوار یاد اس کے صفحۂ دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ وہاں کے دلکش قدرتی مناظر، اور سادہ سماجی ماحول ہر وقت اس کے پیش نظر رہے، اور اس نہ مٹنے والی یاد کی بنا پر کپور منجری میں وطن مالوف کے حسین و دلکش مناظر اور عوامی معاشرہ کا ذکر بڑی دلچسپی سے کرتا ہے۔ دراوڑ عورتوں کے حسن معصوم کے بیان میں اس کے اعجاز نگار قلم کی رنگینیاں شباب پر آ جاتی ہیں۔ انہی رنگین بیانیوں کی بنا پر راج شیکھر نے ڈرامائی ادب کو ایسے نئے خاکے سے

تشبیہ دی گئی ہے جس کے شرف دیدار ہی سے ہزاروں رندان بادہ آشام بیک وقت آسودہ ہو جائیں۔

اس دور کے ادب میں سحر و ساحری پر عوامی اعتقادات کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں اور ڈرامہ نویس چونکہ سماجی ماحول کا سچا عکاس ہوتا ہے اس لئے کپور منجری میں حالات اور واقعات کی عنان ایک ساحر کے ہاتھ میں ہے اور ہیروئن کے جوہر ذاتی کی تعریف بھی اتنی سحر اثر ہے کہ اس کے ہاتھ لگتے ہی اشوک کے درخت میں پھل لگ آتے ہیں۔ اس سحر اثر ماحول کے اثرات کی انتہا یہ ہے کہ ڈرامہ میں انسانی شجاعت کے بجائے جادو کے ہتھیاروں اور اوزاروں سے میدان جنگ میں کام لیا گیا ہے، اور عشق و محبت کی سلسلہ جنبانی میں بھی شخصیت اور جوہر ذاتی کے اثرات کے بجائے پوشیدہ سُرنگوں اور مافوق الفطرت واقعات اور ساحر کے مسحور کن نام کا سہارا تلاش کیا گیا ہے۔

درباری خواتین کی فیشن پرستی اور بناؤ سنگار کے متعلق اس ڈرامہ سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان سے تعیش پرستی کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ جسم کو معطر اور تازہ رکھنے کے لئے زعفران آمیز اُبٹن اور رخساروں کو جاذب نظر بنانے کے لئے زعفرانی غازہ کا استعمال عام تھا۔ اس ڈرامہ میں ہیروئن کی تصویر کو جن زیورات و ملبوسات میں پیش کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اونچے طبقے میں نیلے رنگ کی ریشمیں ملبوسات کا زیادہ رواج تھا۔ ہاتھوں میں کنگن، گلوں میں آبدار موتیوں کے ہار اور کانوں میں رنگین آویزے استعمال ہوتے تھے، چمپا کی خوشبودار اور سنہری کلیوں کو بھی زلفوں اور کانوں کی آرائش کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ بادام نما آنکھیں جن کو فارسی ترکیب میں چشمان آہو سے تعبیر کر سکتے ہیں، حسن و خوبصورتی کا اعلیٰ معیار تھیں اور کاجل کے ذریعہ ان بادامی آنکھوں کو دشمن جان دلربا بنایا جاتا تھا۔ ہونٹوں اور چہرہ کو معطر اور رنگین بنانے کے لئے، خوشبودار رنگین موم استعمال

ہوتا تھا۔ اور نزلہ زکام کے دفاع کا کام زعفران چبانے سے لیا جاتا تھا۔ کمروں وغیرہ کو معطر رکھنے کے لئے لوبان اور اگر وغیرہ سلگایا جاتا تھا۔ تہواروں کو جوش و خروش سے منانے کی تفصیل بھی ڈرامہ کے کرداروں کی رنگ رلیوں سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ برسات کے بھیگے اور خوشگوار موسم میں جب عنبر فشاں ہوائیں دلوں میں رقصانی کیفیات پیدا کرنے لگتی تھیں تو جھولے کا شاندار تیوہار بڑی دھوم دھام سے شروع ہوتا تھا۔ شباب کی رنگین بہاروں میں چور، پری جمال دوشیزائیں اس اندازِ دلربائی سے جھولا کرتی تھیں کہ جڑاؤ پازیب کی جھنکار اور بیٹھکے کے گھنگھروؤں کا زیر و بم سامعہ نوازی کرنے لگتا تھا۔ متحرک ہاروں کی ضیا پاشیاں اور مرصع کنگنوں کی زیبائش نظروں کو خیرہ بنا دیتی تھی۔ اور اُن کے رنگا رنگ حسین ملبوسات دل کی معصوم دُنیا میں حشر سامانیاں پیدا کر دیتی تھیں اس قسم کی اور متعدد جشن افروزیوں کا پتہ بھی اس ڈرامہ سے ملتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے جشنوں کے موقعوں پر ڈرامہ نویس اپنے سرپرستوں کی تفریحِ طبع کیلئے مختصر ڈرامے اسٹیج کرتے اور انعام و اکرام سے نوازے جاتے تھے برہمن اگرچہ جماعتی حیثیت سے ارفع و اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے لیکن اس ڈرامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی نظروں میں خود غرضانہ حرکات کی بنا پر ان کا سابقہ مذہبی وقار باقی نہ رہا تھا۔ غرض کہ اِس دَور کے عوامی سماج میں جو تخیلات کارفرما تھے ان سب کی عکاسی اس ڈرامہ کی ہر سطر سے ہوتی ہے۔

ڈرامہ نویس کے لئے مورخ کی طرح سماجی اور معاشرتی ماحول کی جُزئیاتی تفصیل ضروری نہیں بلکہ وہ ایسی مثالی صُورتیں اور ایسے مناظر پیش کرتا ہے کہ جن سے عصری کیفیات کی مکمل عکاسی ہو جاتی ہے یا یوں سمجھئے کہ مورخ عصری تہذیب و ثقافت اور معاشرہ کی جُزئیاتی تفصیل کا نقشہ الفاظ کے ذریعہ کھینچتا ہے، اور ڈرامہ نویس عصری حالات، کرداروں کی صورت، پوشش اور وضع قطع سے منظرِ عام پر لاتا ہے اسی اُصول کے تحت کچھ دستیاب کے کرداروں کی وضع قطع سے اُس عہد کی زیب و زینت کے انداز اور سماج کی تمام کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بال رامائن، راج شیکھر کا دوسرا کامیاب ڈرامہ ہے جس میں رام اور سیتا کی جنسی محبت کی جس دل کش انداز میں ترجمانی کی گئی ہے وہ حقیقت میں جنسی محبت کی معراج ہے۔ اس میں فراق کے حُزنیہ پہلو کو وصل و یکجائی سے بدل کر طربیہ بنایا گیا ہے اس ڈرامہ کی دل کشی کا اصل راز طرزِ بیان اور اسلوبِ نگارش کی سادگی میں پوشیدہ ہے۔ راج شیکھر کو قدرت نے نقاش کی گہری نظر، شاعر کا سیماب وش دل اور فلسفی کا متفکر دماغ عطا کیا تھا، اس لئے اس کی فکری گہرائی فطرتِ انسانی کے پیچیدہ رازوں کا بڑی خوبی سے انکشاف کرتی ہے۔ اس کے حُسن پرستانہ تصورات کی وجہ سے یہ ڈرامہ حُسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر سا بن گیا ہے، چونکہ اس کے حساس دل اور تجسُس آشنا نظروں کے سامنے کتابِ دنیا کا ہر ورق ایک متکلم مرقع تھا اس لئے اس آب و گل کا ہر ذرّہ زبانِ بے زبانی سے اسرارِ عشق اور رموزِ محبت کی گرہ کُشائی کرتا نظر آتا ہے۔ چونکہ قدیم ڈراموں کے ماخذ زیادہ تر مہابھارت اور رامائن کی مقدس حکایات ہیں، اس لئے راج شیکھر کے تیسرے ڈرامہ بال بھارت کا سارا پلاٹ بھی انہی مقدس حکایات سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامہ کے طرزِ بیان میں وہ سامانِ دل کشی مُہیا ہیں کہ دل خود بخود اس کی طرف کھنچتا ہے۔ اپنی وسیع معلومات اور گہرے مشاہدہ کی بنا پر اس نے زندگی کی حقیقتوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان حقیقتوں کی جھلکیاں دوسروں کو بھی دکھانے کی اس نے پُوری کوشش کی ہے۔ راج شیکھر نے اس ڈرامہ میں جذباتِ قلبیہ کی منظرکشی کے لئے اشارتی پیرایہ اور مزید انداز اختیار کیا ہے جس سے ڈرامہ کی اثر انگیزی میں بڑا اضافہ

ہوگیا ہے۔ چونکہ فطرتِ انسانی نری متانت و سنجیدگی سے اکتا کر ظرافت کی چاشنی تلاش کرنے لگتی ہے۔ اس لیے ان سنجیدہ ڈراموں میں داج شیکسپیر نے اگرچہ ظرافت کا سہارا تلاش کیا اور بد وشک (مسخرے) کا کوئی پارٹ شامل کیا ہے اس کے باوجود "ودہ شال بھنجکا" کو ہم ایک مزاحیہ ڈرامہ کہہ سکتے ہیں۔

راج شیکھر چونکہ طبعاً سنجیدہ مزاج واقع ہوا تھا۔ اس لیے یہ طربیہ ڈرامہ بھی سنجیدہ ظرافت کا حامل کہا جاتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ظرافت میں اگر سنجیدگی کے انداز نمایاں رہیں تو وہ زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔

▲

مستقل نمبر

ہمارے مسائل

اردو شاعری میں نئے تجربے

ان دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظمِ آزاد اور نظم معرّیٰ کے ساتھ ساتھ، اِدھر کچھ شاعروں نے منشود نظم کے بھی تجربے کئے ہیں۔ ہئیت سے ہٹ کر مواد و موضوع میں بھی تنوّع اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور نئی نئی علامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری، خاص طور سے اُردو نظم، آگے بڑھنے کے بجائے رُوبہ زوال ہوتی جا رہی ہے۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو پڑھنے والوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ کسی کا اندازِ بیان اتنا کاواک ہے کہ کسی عنوان بات پلے نہیں پڑتی اور کوئی ایسے دُور از کار خیالات کو بے سر و پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اُس کی نظم چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس رُجحان کے اسباب اور اس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے؟

اُردو شاعری میں نئے تجربات کی افادیت اور معنویت رسانی پر ان مختصر آرا[1] سے کوئی روشنی نہیں پڑ سکے گی۔ اس مسئلے پر آزادانہ اور مفصل مضامین آنے چاہئیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے تنقید اور افسانہ نگاری وغیرہ کے نئے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن شاعری میں نئے تجربوں کے معاملے میں گول مول باتیں کر کے رہ گئے ہیں[2]۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر کھل کر بات چیت کی جائے۔

اعظمی صاحب نے نام گنواتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ ان کی ترتیب دی ہوئی فہرست[3] میں دو ایک کو چھوڑ کر سبھی فنکار اس نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو تقسیمِ ہند کے فوراً بعد منظرِ عام پر آئی۔ اس نسل نے بھی اُردو شاعری میں تجربے کئے لیکن اس نسل کی تخلیقی متوازن اور با مقصد ہیں۔ یہاں تو ہم اُس جدید ترین نسل کے بارے میں سوچنا ہے جو ادھر تین چار سال کے اندر اندر پیدا ہوئی ہے اور تجربات کے نام پر مہمل، بے مقصد

---

[1] ماہنامہ پونم حیدرآباد (جون، جولائی ۱۹۶۳ء) [2] ہمارے مسائل، پونم حیدرآباد (جولائی ۶۳ء) [3] ہمارے مسائل، پونم حیدرآباد جولائی ۶۳ء

اور گنجلک چیزیں تخلیق کر رہی ہے۔ احمد ہمیش، عبدالعزیز خالد سلیم احمد، شہریار، کرار نوری، قمر جمیل، وزیر آغا، ندا فاضلی اور ان جیسے بیسوں جدید تر شاعروں کی نظمیں اور غزلیں اُردو شاعری میں کیا اضافہ کر رہی ہیں؟ ایسی چیزیں جو خود فن کاروں کی سمجھ میں نہ آتی ہوں[۱]، عوام کو کس طرح متاثر کر سکتی ہیں؟۔ وہ تخلیق جس کا مفہوم برآمد کرنے میں ذہن کو قلابازیاں کھانی پڑیں، دل پر کیا خاک اثر انداز ہو سکتی ہیں؟ جو ادب متاثر ہی نہ کر سکے اُس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن وہاں تو نئی نسل کی طرف سے کھُل کر کہا جا رہا ہے کہ مقصد فن کو مجروح کرتا ہے[۲]۔ پھر ان بے مقصد تجربات سے اُردو شاعری کیا حاصل کرے گی، یہ خلیل الرحمٰن اعظمی ہی بتلائیں تو بہتر ہے کہ راہی معصوم رضا، اُن کا شمار[۳] بھی جدید ترین نسل میں کرتے ہیں اور وہ لبفضلہٖ ناقد بھی ہیں!۔

مختصر ترین' اور جدید تر نظموں میں جو گاڑھی قسم کی داخلیت زندگی سے فرار، یاس پسندی، گھبراہٹ، نفسیاتی اُلجھاؤ (frustration) اور اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر بیٹھ رہنے کا جذبہ ملتا ہے۔ اگر اُلجھی ہوئی علامات کا سہارا لئے بغیر اسے عام فہم انداز میں منظرِ عام پہ لایا گیا ہوتا تو اس منظم سازش کی پول اب تک کھُل چکی ہوتی جو دبے انحطاط ترقی پسند تحریک کے خلاف چل رہی ہے۔ وزیر آغا اُس قسم کے تجربات کے تجزیہ کے طور پر ایک سلسلہ چلا رہے تھے۔ کسی ایک جدید مختصر نظم کا تجزیہ اسی مکتبِ خیال کے مختلف فنکار کرتے تھے۔ نظم کا خالق بھی اس میں حصہ لیتا تھا لیکن وہ تمام بحثیں پڑھنے پر کوئی ایک نظم بھی ایسی نہیں ملتی جس میں کہیں دو فن کاروں نے ایک ہی نظم ایک جیسی وضاحت کی ہو بلکہ ہر فن کار اپنے طور پر ایک نظم کا دوسروں سے مختلف مطلب اخذ کرتا ہے۔ دراصل یہ تجربات نہیں، منظوم معمّے ہیں، حل کرتے رہیئے، لیکن انعام کی توقع قطعی نہ کیجئے کہ اُن کا صحیح حل نہ کسی بینک میں محفوظ ہے نہ کہنا کار کے علم میں ہے[۴]!

جہاں تک ناقدین کی جانبداری کا تعلق ہے میرے خیال میں جدید ترین نسل سے زیادہ اِس جانبداری کی شکایت اُس نسل کو ہونی چاہیئے، جو ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد سے لکھ رہی ہے، جس نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن جسے اُس کا حق اب تک نہیں ملا۔۔۔ وہ جدید ترین نسل جس کے پاس فرداً فرداً دو دو تین تین تخالیق ابھی نکلیں گی، ابھی پانچ دس سال اور تجربات کرنے کے بعد انصاف کا مطالبہ کرے تو کسی حد تک جائز بھی ہوگا۔

اِس دَور کے مخصوص محرکات اور مزاجِ شعری کا تجزیہ اور تشریح جو بھی چاہے کر لیجئے لیکن جدید نسل کی تخالیق جن اُلجھاؤ اور اِبہام کا شکار رہیں اُسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جا سکتا بے شک ترقی پسندی کے بہاؤ میں بہت سے فن کار محض نعرہ بازی پر اُتر آئے تھے لیکن اُس کا اُتار ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ فن میں مقصد کی اہمیت کے سرے سے مُنکر ہو جائیں۔ اِس دَور میں حسن عسکری تو اِس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ دیکھئے جدید ترین نسل کے حامی ناقدین کو کتنی کامیابی نصیب ہوتی ہے!!۔۔۔

۱ه "ادبی دُنیا" - لاہور (خاص نمبر ۶۳ء تا ۶۴ء)
۳ه نیا ادب پُرانی کسوٹی - "تلاش" - دہلی (خاص نمبر ۶۴ء)
۲ه "تاثرات و تعصبات" دیوندر اِسّر (تحریک - دہلی)
۴ه اداریہ" ادبی دنیا" لاہور (خاص نمبر ۶۲ء)

تبرکاتِ علامہ آرزو لکھنوی

اگر مکروہاتِ زمانہ نے مہلت دی تو استاذی علامہ آرزو مغفور کی غیر مطبوعہ غزلیں "نجم" کے صفحات پر پیش کرتا رہوں گا۔ ایک غیر مطبوعہ غزل غالب کی زمین میں پیش کر رہا ہوں، یہ غزل علامہ موصوف نے ۱۸ برس کی عمر میں کہی تھی۔ (نجم)

○

پاسِ رُسوائی کہاں تک، دِل جب اپنا جَل گیا
رازِ غم جس میں چھپاتے تھے وہ پردا جَل گیا

قطرہ اِک اِک اشکِ غم کا آتشِ سیّال تھا
بہہ کے جتنی دُور آیا اتنا چہرا جَل گیا

سبز قدمی کے اثر کی پیش قدمی دیکھئے
جس کی شادابی پسند آئی وہ صحرا جَل گیا

ساقیا نقصانِ جاں ہے، تیرا فیضِ بے حُصول
جتنے قطرے مَے کے ٹپکے خوں اتنا جَل گیا

اَلاماں اے سوزِ پنہاں، ہوگیا پانی بھی آگ
پھُوٹ کر بہنے کا وقت آیا تو چھالا جَل گیا

پہلے تھی فکر آگ حسرت خانۂ دِل کی بجھے
اب ہے اِس کی جُستجو کیا رہ گیا، کیا جَل گیا

برق نے کی ہر طرف میرے نشیمن کی تلاش
چار تنکوں کی بِنا پر باغ سارا جَل گیا

ہے نہ خاکستر نہ اصلی حال پر باقی ہے دِل
جتنا سوزِ غم سے جَل سکتا تھا اتنا جَل گیا

جان ڈالیں گے نہ پروانے ہیں آنسو شمع کے
ہوگا اِن چھینٹوں سے اب کیا جلنے والا جَل گیا

مُہر اپنے شوق نامہ کی ہے خود گرمئ شوق
نام تھا تحریر جس جا کاغذ اتنا جَل گیا

برقِ حسرت آرزو نخلِ تمنّا پر گری
تھی پھپکنے کی خوشی جس کے وہ پودا جَل گیا

الطاف مشہدی

○

کس شوق سے نظر کو جلاتے رہے ہیں ہم
جلوؤں کی آگ مانگ کے لاتے رہے ہیں ہم

اک تیرگی تھی راہ میں لیکن بفیضِ جام
ہر گام پر چراغ جلاتے رہے ہیں ہم

رہ کر اسیرِ حلقۂ گیسوئے عنبریں
دار و رسن سے آنکھ لڑاتے رہے ہیں ہم

گل کی صباحتوں کا تصرف بجا مگر
خود اپنے خون میں بھی نہاتے رہے ہیں ہم

انفاس کی دھڑکتی ہوئی شاہراہ پر
گلپاش نکہتوں کو سجاتے رہے ہیں ہم

کتنی حسین قربتیں حائل رہیں مگر
بارِ غمِ حیات اٹھاتے رہے ہیں ہم

قلب و نظر کی چھاؤں میں الطاف عمر بھر
شاداب حادثوں کو سلاتے رہے ہیں ہم

جرمؔ محمد آبادی

○

وفا کا ذکر، الفت کا چلن چھوڑا نہیں جاتا
کسی عالم میں بھی یہ بانکپن چھوڑا نہیں جاتا
از اوّل تا بہ آخر یہ حقیقت ہی حقیقت ہے
کہیں سے قصۂ دار و رسن چھوڑا نہیں جاتا
مخالف باغباں، بیگانہ سبزہ، ہر روش دشمن
کوئی اپنا نہیں پھر بھی چمن چھوڑا نہیں جاتا
مزہ جب ہے یہیں رہ کے فضا بدلو گلستاں کی
دورِ غم سے گھبرا کر وطن چھوڑا نہیں جاتا
یقیں کیونکر دلاؤں دل کو اُن کے عہد و پیماں کا
ہواؤں پر چراغِ انجمن چھوڑا نہیں جاتا
حسد کے خار دامن گیر ہیں ہر گام پر پھر بھی
پرستارانِ گلشن سے چمن چھوڑا نہیں جاتا
دیانت پر جنابِ شیخ کی تو شک نہیں لیکن
حریفِ مے پہ نظمِ انجمن چھوڑا نہیں جاتا
چمن میں پھول اپنی چاک دامانی پہ بھی خوش ہیں
عجب کیا ہے جو ہم سے بانکپن چھوڑا نہیں جاتا

زمانہ جُرمؔ کب کا ہو چکا باغی مگر اب تک
ہمیں سے دامنِ اربابِ فن چھوڑا نہیں جاتا

شفا گوالیاری

یاد جب آئی کسی کی جھوم کے
اشک اُبھرے دل کی دھڑکن چوم کے

دے رہا ہے لَو ہر اک نقشِ قدم
کہکشاں سے آئے ہو کس گھوم کے

چونک کر غنچوں نے آنکھیں کھولدیں
کس نے یہ انگڑائیاں لیں جھوم کے

ڈوبی ڈوبی سی ہے نبضِ کائنات
اشک ٹپکے ہیں یہ کس مظلوم کے

چھوٹ کے جب پہنچے گلستاں میں اسیر
رو دیئے خاکِ نشیمن چوم کے

ڈوبتے تاروں کی نیندیں اُڑ گئیں
جب کھلے غنچے لبِ معصوم کے

میکدہ بدلا گیا، اب بھی مگر
جام الگ ہیں خادم و مخدوم کے

وقت برہم، اُن کے ماتھے پر شکن
اے شفا کیا ہیچ ہیں مقسوم کے

○

کنول پرشاد کنول

حُسن نے ہر دَم لیا جگ میں جنم تیرے لئے
عشق نے کھویا سدا اپنا بھرم تیرے لئے

جس کا شیوہ مسکرانا، شدّتِ طوفان میں
اب مری اُس آن کی پلکیں ہیں نم تیرے لئے

آنکھ کے وہ اَن بندھے موتی، کہ جن پر ناز تھا
آب اُن کی بھی لُٹا بیٹھے ہیں ہم تیرے لئے

خود تماشہ بن گئے، ہم کو تماشہ کر دیا
سہہ رہے ہیں دل کے یہ سارے ستم تیرے لئے

اب تو غیروں تک کے آنسو دیکھکر روتا ہے دل
ہم نے اپنایا زمانے بھر کا غم تیرے لئے

دل کی ہر دھڑکن دعائیں مانگتی ہے رات دن
پھر بھی لگتا ہے کہ کچھ مانگا ہے کم تیرے لئے

○

اوجؔ یعقوبی

○

سفید پوشوں کے دل تیرہ، ذہن زرد ملے
بہ فیضِ گرمِ دماغی، دلوں کے سرد ملے

تمہاری بزم میں ہر لب پہ آہ لرزاں تھی
ٹٹولنے سے بمشکل کچھ اہلِ درد ملے

تری گلی کی مسافت کسی سے طے نہ ہوئی
ز فرق تا بقدم، لوگ گرد گرد ملے

چمن میں دیکھئے، جشنِ شگفتِ گل کیلئے
صبا کے ساتھ ہی ممکن ہے آہِ سرد ملے

یہ کیسی صحبتِ یاراں، یہ کیسی بزمِ جہاں
دلوں کے باب میں سب لوگ فرد فرد ملے

خلش، فراق، کسک، انتظار، محرومی
بنامِ عشق کئی خوشگوار درد ملے

بلا نہ اوجؔ سرِ منزلِ وفا کوئی
شروعِ راہ میں کتنے ہی رہ نورد ملے

خواجہ شوق

○

خدا جانے کہاں لائی تمنا جذبِ کامل کی
جہاں بھی پانو پڑتا ہے بنا پڑتی ہے منزل کی

نہیں اظہارِ غم ممکن، کروں کیا شرح مشکل کی
مجسم اک تڑپ ہوں درد میں ڈوبے ہوئے دل کی

ترا نقشِ قدم وہ نقطۂ آغازِ منزل ہے
کہ ہر بھٹکے ہوئے کو راہ مل جاتی ہے منزل کی

انہیں دیکھا مگر اس احتیاطِ شوق سے دیکھا
تمنائیں نکل کر بھی نہ نکلیں دیدہ و دل کی

نگاہِ تجربہ کیا، مفت ٹھوکر تک نہیں ملتی
کوئی دولت سبھی ہم نے بڑی محنت سے حاصل کی

اثر طوفان کا ہلکی سی موجیں بھی دکھاتی ہیں
ذرا کچھ ڈگمگا جاتی ہے جب امید ساحل کی

نہ جانے شوقِ تکمیلِ رہِ ہستی کہاں ہوگی
ہر اک منزل پہ ملتی ہے خبر اک اور منزل کی

باوا کرشن گوپال مغموم

○

زندگی حاصلِ غم ہو تو غزل ہوتی ہے
چشمِ رنجور میں نم ہو تو غزل ہوتی ہے

دل اگر سازِ اَلم ہو تو غزل ہوتی ہے
رُوح خود نغمۂ غم ہو تو غزل ہوتی ہے

ایک مُدّت سے ترستی ہوئی آنکھوں کے لئے
جلوۂ یار بہم ہو تو غزل ہوتی ہے

غیرتِ عشق کا ہر ناز لئے، کوئی جبیں
پائے محبوب پہ خم ہو تو غزل ہوتی ہے

رقص میں اُٹھے ہوئے پائے نگاریں سے بندھے
کسی گھنگھرو کی جو "چھم" ہو تو غزل ہوتی ہے

لبِ لعلیں پہ تبسّم کی ضیائیں لے کر
کوئی مائل بہ ستم ہو تو غزل ہوتی ہے

بادۂ عیش سے تخلیقِ غزل ہو توبہ!
بادۂ عیش میں سم ہو تو غزل ہوتی ہے

سوز سے ساز الگ ہو تو تغزّل کیسا
سوز اگر ساز میں ضم ہو تو غزل ہوتی ہے

ساری تفصیل کا اجمال یہی ہے مغموم
کیفیتِ دل کی رقم ہو تو غزل ہوتی ہے

حزیں لدھیانوی

○

دل سے خیالِ عظمتِ آدم مٹا نہیں
یہ دیپ تیز و تند ہوا میں بجھا نہیں

برسوں سے پُوجتا ہوں مگر بولتا نہیں
جیسے مرا خدا کوئی بُت ہے خدا نہیں

میں وہ خزاں نصیب امینِ بہار ہوں
جو ایک شب بھی سایۂ گُل میں رہا نہیں

تارے کی ضَو، چراغ کی لَو، چاند کی ضیا
سب کچھ ہے میرے اشکِ تمنّا میں کیا نہیں

ہاتھوں میں تیرے دامنِ گُل ہے سو چاک ہے
صیّاد تیرے بس میں قبائے صبا نہیں

کِھلتے ہیں برف زار میں کہسار پہ بھی پھُول
جوشِ نمُو پہ زور کسی کا چلا نہیں

اے ہمصفیر! یہ بھی دلیلِ بہار ہے
پتّے کھڑک رہے ہیں چمن میں صبا نہیں

اک روز رنگ لائے گی یہ رسمِ شہرِ حُسن
اہلِ وفا کو کوئی یہاں پُوچھتا نہیں

اُس میں حزیں کِھلے نہ کبھی روشنی کے پھُول
جس دل میں ابرِ غم کا اندھیرا گھرا نہیں

کوثر چاند پوری

میراں شاہ مکرانی

نیرا لنگڑا شہر بھر میں پاؤں گھسیٹتا پھرا، صبح سے شام
س صرف چار پیسے ہی ملے، گالیاں اَن گنت ملیں، اس نے
ڑوں دروازوں پر صدائیں لگائیں، ایک ایک دروازے پر
ا کئی منٹ ٹھہرا، کہیں سے آٹا ملا، کہیں سے پیسہ اور کہیں سے
رف گالی یا کوسنا، آٹا اس کے لئے بیکار تھا اسے نیرا نے نالی
یں ڈال دیا، ایک عورت نے دومنزلے سے چیخ کر کہا۔

"آگے جاؤ یہاں کیوں کھڑے ہو — دونوں وقت
ولیوں کے نام کا آٹا نکالا جاتا ہے دو مٹھی — مکان کا کرایہ
یتے ہیں، نل کا محصول ادا کرتے ہیں، مہترانی کی تنخواہ اور کپڑوں
ی دھلائی دیتے ہیں، تمہیں کہاں سے دیں؟ — جاؤ راستہ لو
بچہ سو رہا ہے اور تم کھڑے چیخ رہے ہو۔"

نیرا نے آگے بڑھ کر سوچا، سچ کہتی ہے غریب، مجھے
کہاں سے دے، جب میں گاؤں میں کھیتی کرتا تھا، کھلیان سے
مانگنے والوں کو اسی طرح ڈانٹ کر بھگا دیا کرتا تھا۔ میرے سر پر
لگان ہی کا بوجھ تھا، اس بیچاری پر کئی من وزن لدا ہوا ہے، دس
بارہ گھر چھوڑ کر اس نے پھر صدا لگائی۔ اندر کئی آدمی بیٹھے ہوئے
تھے اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے اقتصادیات کی بحث چھیڑ دی
اور ایک لڑکا باورچی خانے سے روٹیاں لے کر باہر جانے لگا تو کسی
نے روک کر کہا۔

"ہرگز نہیں"!

دوسرا بولا:

"لنگڑا ہے، مجبور معلوم ہوتا ہے۔"

"کسی لنگڑے، لولے یا مجبور آدمی کا ہمارے اوپر کوئی
حق نہیں، ہم ٹیکس دیتے ہیں، مال لینے دساور جاتے ہیں تو ریل کا
بڑھا ہوا کرایہ دیتے ہیں، پھر ہر چیز مہنگی ہے، اس زمانے
میں فقیروں کو میں سماج کا گھن سمجھتا ہوں وہ اپنا وجود قائم رکھنے
کے لئے دوسروں کا مغز چاٹتے ہیں۔"

"خیرات کرنے سے برکت ہوتی ہے۔"

" معلوم نہیں برکت سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ پہلے میں چار من گیہوں آتے ہیں اور اٹھائیس کو ختم ہو جاتے ہیں، آپ کی برکت سے کبھی ان کا وزن سوا چار من نہیں ہوتا، پہلے پہلے ان بھیک منگوں کو دینا شروع کیا تھا، بڑی بوڑھی عورتوں کے کہنے سے تو اناج دس دن پہلے ہی ختم ہو گیا تھا، مارکس کی اقتصادی تھیوری میں برکت نام کی کوئی چیز نہیں، ہم اکنامکس میں ڈاکٹریٹ لے چکے ہیں۔ برکت کا کہیں ذکر تک نہیں آیا، میں سچ کہتا ہوں آمدنی کے لحاظ سے آج کا معمولی گداگر ایل ڈی سے اچھا پڑ رہتا ہے۔"

نیرے بہت غور سے باتیں سنتا رہا، اس نے سوچا وقت کے تیور اچھے نہیں، یوں کام نہیں چلیگا، مجھے پیٹ بھرنے کے لئے راستہ بدلنا پڑے گا ــــ اور راستے اس کے سامنے ہزاروں تھے چوڑی چوڑی سڑکیں، اندھیری اور گندہ گلیاں، پیچدار پگڈنڈیاں ان سب پر لوگ چل رہے تھے، اسے بھی کسی سڑک، گلی یا پگڈنڈی کا اپنے لئے انتخاب کرنا ہی پڑے گا، اللہ سلامت رکھے ــــ بچے جیتے رہیں، خدا بہت دے، اور ایسی دوسری صداؤں میں اب دم نہیں رہا، دوسروں کی جیبوں سے پیسے نکالنا بڑی حکمت کا کام ہے، اس کے لئے پڑھے لکھے لوگ طرح طرح کے جتن کر رہے ہیں، خود سرکار ٹیکس لگانے میں بڑی دانائی سے کام لے رہی ہے، فقیروں کو کچھ اور ہی بننا پڑے گا، مگر کیا؟ اس وقت وہ اس کا کوئی فیصلہ نہ کر سکا، دروازوں کی طرف سے رُخ پھیر کر اس نے دوکانوں پر توجہ کی۔ پہلی ہی دوکان سے جواب ملا۔

" معاف کرو۔"

دوسرے دوکاندار نے کہا

" برکت ہے بابا۔"

تیسری دوکان سے آواز آئی

" آگے بڑھ ــــ نہیں گیا، بھاگ یہاں سے ورنہ سر توڑ ڈالوں گا بدمعاش! ــــ اُچکا " ــــ

نیرا کپڑے کی ایک دوکان کے سامنے ٹھٹک گیا۔ عمدہ عمدہ ساریاں لٹکی ہوئی تھیں اور تین چار خوبصورت عورتیں للچائی ہوئی نگاہوں سے ان کو دیکھ رہی تھیں، مالک نوجوان تھا وہ ہنس رہا تھا اور بڑی مستعدی سے ساریاں اُٹھا اُٹھا کر عورتوں کے سامنے ڈال رہا تھا نیرے کے مُنہ سے ابھی کوئی بات تک نہ نکلی تھی کہ نوجوان نے مُنہ بگاڑ کر کہا۔

" چل بے لنگڑے یہاں کیوں کھڑا ہو گیا؟"

اور نیرے کو ایسا لگا جیسے وہ شہر کی خوبصورتی کا داغ ہو کاروبار کے اُبھرتے ہوئے سورج کا گہن ہو، اس نے پورے بازار سے گزرنے کے بعد ایک ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو کر سوال کرنے کا ارادہ کیا، بہت سے آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے، میزوں پر پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں، کوئی خالی تھی کوئی بھری ہوئی، لوگ میزوں پر جھکے کھانے میں مصروف تھے، اس نے ایک آواز لگائی ایک بوڑھا جو سامنے ہی آلو کا قتلہ بندھ کر مُنہ کی طرف لے جا رہا تھا، جلدی سے پہلو بدل کر بیٹھ گیا، مطلب یہ تھا کہ فقیر کھاتے ہوئے نہ دیکھ لے ورنہ نظر لگ جائے گی، اور نظر لگنے کی یہ بیماری بہت پرانی ہے۔ شاید غریبی کے ساتھ ہی اس نے بھی جنم لیا تھا اور اس وقت تک سماج میں نظر لگنے کا وہم باقی رہے گا جب تک غربت کی جڑیں بالکل اکھاڑ کر نہ پھینکدی جائیں گی، نیرے نے زمین پر اچھی طرح پاؤں جما کر بینڈ بجانے والے سپاہیوں کی طرح پوزیشن لے کر دوسری آواز لگائی۔ وہ بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہونچی، ایک بیرا پلیٹ میں تھوڑی سی ہڈیاں لئے آیا اور باہر سڑک پر لوٹتے ہوئے کتوں کے آگے ڈالتے ہوئے بولا:

" آگے جاؤ یہ ہوٹل ہے۔"

" روٹی بابا!"

" ایک روٹی ایک آنے کی ہوتی ہے، کتنی لوگے؟"

" بابا!"

" بیٹا!" وہ ہنس کر بولا۔ "تجھے دینے کا نتیجہ ہی کیا؟ کتے تو رات کو ہوٹل کی نگہبانی کرتے ہیں تم جیسا لفنگا تالے کی طرف دیکھتا بھی ہے تو بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں

نیرے نے سوچا، معاملہ بہت بگڑ چکا ہے، یہاں کوئی کسی
نہیں سُنتا، اب اس نے راہ گیروں کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ ان میں
بھی کسی نے ترس نہ کھایا، جس سے مانگتا وہ کترا کر نکل جاتا
زدہ ایک ایسے شخص کے پیچھے لگ گیا جو اپنی بیوی اور دو بچوں
ساتھ لئے جا رہا تھا، نیرے نے انداز سے پہچان لیا کہ سینما جا رہا
ہے ۔۔۔ نیرے نے چُپکے چُپکے دانت پیس کر اپنے آپ ہی سے
ا، بھلا جس دیس میں ہزاروں بھوکے ننگے ہوں، وہاں سینما گھر
وں بنائے جاتے ہیں، محتاج خانے بننے چاہئیں، لوگ فقیروں سے
تراتے ہیں اور بے جان تصویروں کا ناچ دیکھنے سینما جاتے ہیں
برے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کا رُخ سینما ہی کی طرف تھا۔ وہ
ہٹ میں داخل ہو گیا۔ نیرے بھی سدھے ہوئے چیتے کی مانند اسکے
س قدم پیچھے چلتا رہا۔ سیٹھ نے کھڑکی پر پہونچکر ٹکٹ لئے، پھر
یک دوکان سے دس بارہ پان بنوائے، ایک ڈبیہ سگرٹوں کی لی
ور پھر پرس کوٹ کی جیب میں رکھ لیا، نیوز ریل شروع ہو چکی تھی
شاید نیفا کی پہاڑیوں اور وہاں لڑنے والے جوانوں کے متعلق تھی
سیٹھ کو اس سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ دن بھر دوکانداری میں سر
کھپانے کے بعد وہ حُسن و عشق کی فلم دیکھنے آیا تھا، باہر کھڑے کھڑے
سگریٹ پیتا رہا تاکہ نیوز ریل ختم ہو جائے تو اپنی سیٹ پر جا بیٹھے
نیرخاں نے قریب جاکر بڑی عاجزی سے کہا

"سیٹھ ایک پیسہ!"

"ہٹ بے پکچر شروع ہو رہی ہے۔"

اُس نے قدم تیز کئے، نیرے بھی اس کے پیچھے چلا، سیٹھ
کی بیوی آگے تھی۔ دونوں لڑکوں نے دائیں اور بائیں ہاتھ کی
انگلیاں پکڑ رکھی تھیں۔ نیرے نے بڑی صفائی سے سیٹھ کی جیب
سے پرس نکال لیا۔ اس نے پہلی مرتبہ یہ کام کیا تھا، وہ بالکل
اناڑی تھا مگر کامیاب رہا۔ سیٹھ کو پتہ بھی نہ چلا، اور اس نے
پرس نکال لیا۔ نیرے دھیرے دھیرے چلتا ایک پارک میں چلا گیا
اور بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھکر پرس کھولا۔ ایک خانے میں دو تین

پڑیاں تھیں، دوسرے میں سے چودہ روپے سات آنے نکلے نیرے
بہت خوش ہوا۔ سوچنے لگا زمانہ بھیک مانگنے کا نہیں، جیب
اور حلق میں ہاتھ ڈال کر پیسہ نکالنے کا ہے ۔۔۔ خوشی سے
سیٹھ پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتا، اس نے پرس نالی میں پھینک دیا،
اور سیدھا ہوٹل پہونچا، خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور بیڑی
پیتا ہوا سڑک پر آگیا۔ وہاں بڑی بھیڑ تھی، کئی سپاہی کھڑے
تھے۔ پتہ چلا کہ پولیس نے ایک جیب کترے کو پکڑ لیا ہے، نیرے
سر سے پاؤں تک کانپ گیا جیب اور حلق میں ہاتھ ڈالنے کا یہ
انجام دیکھ کر وہ بُری طرح سہم گیا اور جلدی سے ایک گلی میں مُڑ گیا
بار بار پیچھے مُڑ کر دیکھتا رہا، کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا۔ وہاں کوئی
نہ تھا، بس اُس کی پرچھائیں تھی جو ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی ۔۔۔
نیرے نے اس سے بھی بچنا چاہا اور دوسری اندھیری گلی میں پہونچکر
اس سے پیچھا چھڑا لیا۔ اب وہ اکیلا تھا۔ کوئی ساتھ نہ تھا۔ نیرے
نے چلتے چلتے طے کر لیا کہ وہ اس دھندے کو جاری نہیں رکھے گا
اس میں بڑے خطرے ہیں۔ وہ عمر بھر ایک ہی مرتبہ پکڑا گیا تھا
اس زمانے میں پاؤں بیکار نہیں ہوا تھا، اس نے گاؤں کی ایک بیوہ
کی آبرو برباد کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے شور مچانے پر پکڑ لیا
گیا، خوب پٹا اور دس دن حوالات میں بند رہا، ساری کمائی ٹھکانے
لگ گئی، اور جب ہی سے لگاتار مصیبتیں آتی رہیں، بیمار رہا،
ٹانگ ٹوٹی، کسانی ہاتھ سے گئی، گھر بکا اور اب وہ بھیک مانگ
رہا تھا۔ اب تک نیرے اسی سے پیٹ بھر رہا تھا۔ آج اتفاق کی
بات تھی کہ چار پیسے ہی ملے تھے، کچھ بھی ہو وہ کسی کام کو کرتا
رہے گا، اس میں محنت ضرور ہے، مگر پکڑ دھکڑ کا ڈر نہیں
نیرے نے روپے خوب سنبھال کر رکھ لئے تھے اور اب وہ دھیرے
دھیرے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ زبان پر اب تک گرم اور چٹ پٹے
گوشت کا مزہ تھا، لیموں کے کھٹے رس کا ذائقہ تھا اور ناک میں ہرے
پودینے اور پیاز کے لچھوں کی خوشبو بھری ہوئی تھی، وہ مطمئن تھا
کہ ہفتہ بھر بلکہ پندرہ دن تک بھی کچھ نہ ملا تو اطمینان سے ہوٹل میں

کھاتا رہے گا' دل ہی دل میں وہ شہر کی تعریف کرنے لگا' کتنی اچھی جگہ ہے' ہر طرف چہل پہل ہے' کہیں روشنی ہے کہیں اندھیرا ہے اور اس گنگا جمنی فضا میں سب کے دھندے چل رہے ہیں۔ کاروباری بلیک کر رہے ہیں' بابو لوگ رشوت لے رہے ہیں' جیبیں کاٹنے والے قینچیاں چلا رہے ہیں اور پولیس افسر انہیں پکڑ رہے ہیں' غرض سب کے کام چل رہے ہیں۔ گاؤں میں یہ سب کچھ نہ تھا اور یہاں قبرستان اتنے بڑے ہیں کہ پورا گاؤں ایک ہی میں سما جائے' ایک جگہ چلتے چلتے وہ ٹھٹکا' ایک قبر پہ گیس کے ہنڈے جل رہے تھے' لوبان کا دھواں اُڑ رہا تھا۔ بیچ میں ایک پیر صاحب بال بکھیرے بیٹھے تھے۔ نیرے فٹ پاتھ سے اُتر کر اُدھر ہی کو چلا گیا اور خاموش ایک پتھر پر بیٹھ گیا' وہ بالوں والا پیر بھی اس جیسا فقیر ہی تھا۔ وہ زور زور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ سامنے ایک کپڑا پھیلا ہوا تھا۔ آنے والے اس پر پیسے ڈالکر چلے جاتے تھے۔ بہت سے سکّے گیس کی دُودھیا روشنی میں چمک رہے تھے۔ ایک سندھی اس کی موجودگی ہی میں آیا اور دس روپے کا نوٹ پھینک کر کئی منٹ ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

"جاؤ سائیں کام ہو جائے گا۔"

"شاہ بابا! مقدمہ سب سے اُونچی کچہری میں ہے آگے اپیل کا موقعہ بھی نہیں۔"

"دیکھا جائے گا تم آرام سے گھر بیٹھو۔"

سندھی چلا گیا تو نیرے نے کھڑے ہو کر ادب سے سلام کیا۔

"سلام نے کم شاہ بابا۔"

"کیا چاہتے ہو؟" شاہ بابا نے پُوچھا

"کام!"

"کہیں جا کر مزدوری کرو' یہاں کام نہیں ملتا۔"

"لنگڑا ہوں۔"

"بھیک مانگو۔"

"مانگ رہا ہوں کوئی دیتا نہیں۔"

"پھر جیبیں کاٹو۔"

"ڈرتا ہوں' پکڑا جاؤں گا۔"

"اچھا جہنم میں جاؤ۔"

"زمین کی کوئی جگہ بتاؤ بابا۔"

"بھاگ یہاں سے"! بابا نے چمٹا اُٹھایا۔

"مار بھی ڈالو گے تو نہیں جاؤں گا' کچھ دلواؤ۔"

"یہاں کیا دھرا ہے؟"

"سب کچھ ہے۔"

"تیرے لئے نہیں ہے' جو کچھ دیکھ رہا ہے اس میں ہنڈوں کا کرایہ ہے' اُن تانگے والوں کا کمیشن ہے جو ہر جمعرات کو شہر کے لوگوں سے یہاں آنے کو کہتے ہیں۔ پھر چادر اور چڑھاوے والوں کے مصارف ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے اس میں سے چوتھائی کمیٹی کا ہے' وہی قبر کا مالک ہے' میں تو معمولی ٹھیکے دار ہوں۔"

"کسی قبر کا ٹھیکہ مجھے بھی دلوادو۔"

شاہ بابا نے ایک چونی دیتے ہوئے کہا۔

"چل رستہ ناپ' ٹھیکہ یُوں نہیں مل جاتا' برسوں ریاض کرنا پڑتا ہے۔"

نیرے نے چونی جیب میں ڈال لی مگر وہاں سے ٹلا نہیں بارہ بجے شاہ بابا نے چادر اُتار لی اور ہنڈے دوکان پر رکھ کے لوٹ کر نیرے سے کہا۔

"جاؤ۔"

"کہاں جاؤں' میں تو یہیں رہوں گا۔"

"پاگل ہوا ہے' یہاں کوئی نہیں رہ سکتا۔ رات کے سناٹے میں پیر صاحب کی سواری قبر سے نکلتی ہے۔"

"انہیں کے ہاتھ پاؤں جوڑوں گا۔"

"بڑا سنکی معلوم ہوتا ہے وہ نہیں سنیں گے جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔"

"میں یہی دھندا کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ دھندا نہیں ہے، ریاض ہے۔"

"میں بھی ریاض ہی کروں گا۔"

شاہ بابا نے بہت چاہا کہ نیرے کسی طرح ٹل جائے مگر وہ جما رہا۔ مجبور ہو کر شاہ بابا نے اسے چند دن اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دیدی، نیرخاں مزار پر جھاڑو دیتا رہا اور شاہ بابا کے پاؤں بھی دباتا رہا، ایک دن انہوں نے اسے قبرستان کی سیر کرائی، کیا کیا خوبصورت مقبرے تھے، ہزاروں پکی قبریں تھیں اور کچی قبروں کی تو گنتی ہی نہ تھی، شاہ بابا نے ایک مزار کے آگے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ نیرے نے پوچھا۔

"کیا تاج محل ہے؟"

"ایک جاگیردار کا مقبرہ ہے، دو گاؤں لگے ہوئے ہیں ان کی آمدنی سے حافظ نوکر رکھے جاتے ہیں۔ وہ رات دن یہاں بیٹھے پڑھا کرتے ہیں۔"

"یہاں تو کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"گھر گئے ہوں گے، بلیک ہر جگہ چلتا ہے۔"

شاہ بابا قبرستان سے نکل کر سڑک پر آئے، چوراہے پر ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ بیچ میں تعویذ کا نشان تھا۔

"نیرے!" وہ بولے۔ "یہ قبر خالی ہے، تیرے نصیب سے یہاں تجھے جمائے دیتا ہوں، بڑی اچھی جگہ ہے۔"

"جو آپ کی مرضی!"

"اس قبر کی مالک ایک بوڑھی عورت تھی، جس نے پرانے ٹھیکے دار کو بڑی مشکل سے بھگا کر جگہ خالی کرائی تھی، وہ خود ہی یہاں بیٹھنا چاہتی تھی۔" شاہ بابا نے اسے سمجھایا۔

"تمہارے بس کی بات نہیں ہے، ٹھیکہ پر ہی دو ایک اچھا آدمی آگیا ہے، اس سے سمجھوتہ کر لو۔"

بڑی مشکل سے بڑھیا راضی ہوئی، سو روپے نقد دیئے گئے اور دس روپے مہینہ مستقل طور سے دینے کا وعدہ کیا گیا نقد روپے شاہ بابا نے اپنے پاس سے ادا کر دیئے اور نیرے کو اچھی طرح سمجھا کر وہاں بٹھا دیا گیا، اس نے قبر پر نئی چادر چڑھائی چاروں کونوں پر مٹی کے عود دان رکھے، ان میں کوئلے دہکا کر لوبان جلایا گیا اور نیرے گیروا لباس پہن کر وہیں بیٹھ گیا، دو تین جمعراتیں سوکھی ہی گزر گئیں۔ چوتھی جمعرات کو نیرے نے روشنی کا معقول بندوبست کر کے قوالی کرا دی۔ اس ترکیب سے کام چل نکلا، لوگ آنے لگے اور آمدنی ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ آنے والوں کی تعداد اور اسی کے ساتھ آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ نیرے کا دل بڑھ گیا، اس نے عرس کرنے کا ارادہ کیا مگر عرس کرنے سے پہلے مزار کو کسی اچھے بزرگ کے نام سے مشہور کرنا ضروری تھا نیرے معمولی لکھا پڑھا تھا مگر اس دھندے میں اس کی طبیعت چلنے لگی تھی، اس کے حافظے میں نہ جانے کب سے ایک نام دبا پڑا تھا۔

"میراں شاہ مکرانی۔"

اسی نام سے پہلا عرس بڑی دھوم دھام سے کیا گیا دور دور سے قوالوں کی ٹولیاں آئیں، رات بھر قوال گاتے رہے اور سننے والوں کو حال آتا رہا، تھوڑے ہی دنوں میں میراں شاہ مکرانی کا نام ہر طرف مشہور ہو گیا۔ اور اگلا عرس پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہا۔

اسی طرح کام چلتا رہا، اور آہستہ آہستہ دس سال گزر گئے۔ نیرے کی حالت ہی بدل گئی۔ وہ لنگڑے کے نام سے موسوم ہوا، گرد و نواح میں اس کی شہرت پھیل گئی دنیا کی دوسری چیزیں بھی نیرے کی طرح ترقی کر رہی تھیں شہر میں میونسپل بورڈ ترقی کر کے کارپوریشن بن گئی، اور شہر کی وسعت اور آرائش کے لئے بہت بڑی اسکیم تیار ہوئی، سڑکیں چوڑی کرنے کی تجاویز ہوئیں۔ بہت سے قبرستان بند کر دیئے سڑک کے آس پاس جو چھوٹی موٹی قبریں تھیں انہیں برابر کر دیا گیا، ایک روز نیرے کو پتہ چلا کہ مکرانی شاہ بھی ٹوٹ میں آگئے

ایسا ہوا تو قیامت آجائے گی"، لسنگڑے پیر نے طیش
اکر کہا اور احتیاطاً بمرانی شاہ پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھکر
رادی۔ عرس میں قوالوں کی جگہ شاعر بلائے گئے، انہوں نے
نی شاہ کی تعریف میں نظمیں پڑھیں اور خراجِ عقیدت پیش
اُدھر کارپوریشن نے اس مزار کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی
ی، جس نے بڑی چھان بین کے بعد جو رپورٹ پیش کی اُس میں
نی شاہ کے وجود ہی سے اِنکار کیا گیا تھا، اور بتایا گیا تھا کہ
اصل میں ایک کرسچین عورت کی ہے جو پچیس برس پہلے
ہر کے اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھی۔ اُس نے نادانستگی
ایک مذہبی کتاب کو ردّی میں پھنکوا دیا تھا۔ اس پر شہر میں
شور مچا اور ایک نوجوان نے اسے اسکول کے راستے میں قتل
یا، وہی کرسچین عورت یہاں دفن ہوئی، کئی برس بعد اس کا
رت کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا، پھر نہ جانے کس طرح چبوترہ
ر ایک گورکن نے ہیڈ مسٹریس کی قبر کو ذرا قرینے سے بنایا

اور اُوپر موجودہ تعمیر بناکر قبرستان میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد بغیر کسی اطلاع کے چبوترہ توڑ دیا گیا، اندر پتھر کی صلیب برآمد ہوئی، اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، جس نے فساد کی شکل اختیار کرلی بہت سی گرفتاریاں ہوئیں، کرفیو نافذ ہوا۔ اس شوروشغب کے وقت نیرے یعنی لسنگڑا پیر اپنی جگہ سے غائب تھا۔ وہ شہر کے باہر اپنے بنائے ہوئے بنگلہ میں آرام سے مقیم تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اس نے کارپوریشن کے فیصلے سے اتفاق کرلیا تھا کارپوریشن نے اُسے کئی ہزار کی رقم معاوضے کے طور پر پیش کی تھی۔

نیرے اب کوئی کام نہیں کرتا، اس نے اپنے بنگلہ کا ایک حصّہ ایک مشہور رگلو کار کو کرائے پر دے رکھا ہے۔ اسی پر اُس کی معاش کا اِنحصار ہے۔

اس کے علاوہ اس کا بینک بیلنس بھی ہے!۔

لمنیٰ ابوالحسن

کون؟

میں اس نظر کے سہارے بہت دُور تک چلی آئی تھی جب مجھے احساس ہوا کہ میں دُور تک آ گئی ہوں تو میں رُک گئی۔

انسان کی ذاتی خوشیاں ذاتی اَلم ننھے ننھے بھنوروں کی طرح اس کی شخصیت کے گرد لپٹے ہوتے ہیں۔

وقت کبھی تو خود بخود گذر جاتا کبھی اسے گذارنا پڑتا ہے۔ ایسے کٹھن لمحوں میں مجھے ہمیشہ انسانوں کی ضرورت محسوس ہوتی۔ ہنستے بولتے، روتے بسورتے، خوش شکل، خوش وضع، دوست اور دشمن انسان

ہماری خاص بیٹھک "کے والٹی" کا ایر کنڈیشنڈ ہال تھا، شیشے کی دیوار سے نیچے جھانک جھانک کر ہم سڑک پر بہتا ہوا انسانوں کا سیلاب دیکھا کرتے۔

دلیپ سب سے زیادہ محظوظ ہوتا۔

"جی بھر کر قہقہے لگاؤ، نہیں تو دم گھٹ جائے گا۔" وہ ہر دم کہتا۔

مگر انیل سگریٹ ایش ٹرے میں مَسل کر سب کی ... میں جھانکنے لگتا۔

"یوں نہ ہنسو، یوں نہ ہنسو کہ ہنسی زندگی کا ایک خز... ہے، اُسے بے موقع بے محل لُٹانے والے محض فریبی ہیں ...!"

راج لمحہ بھر کے لئے گُم ہو جاتا۔ "واقعی زندگی کے ... کے ساتھ منزل پر پہونچنے تک ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ... جائے گا۔ ایک بھی موتی ایک بھی گُہر اور تہی دست منز... پر پہونچنے کا فائدہ ہ ...؟"

فضا تھوڑی دیر کے لئے اُداسیوں سے بھر جاتی ... یکلخت آرکسٹرا شروع ہو جاتا۔

دلیپ مُسکراتا۔ "سب بیکار محض ڈھونگ۔ مسرتو... انبار دوکان کی طرح سجا سجا کر رکھنا۔ انسان جہاں قدم رک... وہی اس کی منزل ہے۔"

اور میں سوچتی۔ دلیپ کا ہنسی سے پیار اس کے

جذبے کی تسکین ہے اور انیل اور راج کی خاموشی کس راز کا
مسکن ــــ ؟؟

لیکن ان سب سے مختلف وہ شبیہہ ؟ وہ اندھیرے
سے ہمکو تاکا کرتی ۔ وہ ہماری دشمن تھی یا ہماری محافظ ؟؟
سارا قصور فوراً مجھ پر ڈال دیا جاتا ۔

" اگر اس محفل میں تم نہ ہوتیں تو یہ شبیہہ بھی ہمیں اس
طرح پریشان نہ کرتی "

" دُنیا کا دوسرا نام عورت ہے ، شاید اسی لئے دوستو !"
بس فخر محسوس کرتی لیکن

دُنیا کو دیکھنے کا یہ طریقہ کتنا عجیب تھا ۔

کبھی کبھی جی میں آتا ۔ اندھیرے کے اس پراسرار
سے پُوچھوں ــــ تم کون ہو ــــ تم اُجالے میں کیوں نہیں
آتے ــــ سائے کے بھیس میں کیوں رہتے ہو ؟ ــــ

مگر میرا ہی کوئی جذبہ مجھے روک دیتا اور سب کہتے
لڑاکے پیچھے ڈرڈر ناجذباتی غیر عقلمندی اور جمالیاتی بدذوقی
کا سب سے بڑا ثبوت ہے لیکن ــــ

ایک دن جب ابھی کوئی نہیں آیا تھا ، میں وقت سے
پہلے پہونچ گئی تھی ۔ وہ اچانک میری میز پر آ بیٹھا ۔

" تمہارا نام کیا ہے بچی ؟"

" سنگیتا " میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش
کی ــــ

" بہت خوبصورت نام ہے بالکل تمہارے چہرے کی طرح
مگر ــــ "

" مگر ؟ " میں نے بیتابی سے پُوچھا ۔

" اتنا نہ ہنسا کرو بچی !"

" کیوں ؟ " میں جل گئی ۔ یہ کون ہوتا ہے مجھے روکنے
والا ۔ میں نے سوچا لیکن اس کی بزرگی نے مجھے کچھ کہنے نہ دیا ۔

" کیونکہ بے حد ہنسنے والے زندگی میں اکثر ناکام دیکھے
گئے ہیں "

وہ فوراً اُٹھا اور چلا گیا ۔

کچھ ہی دیر میں سب آ گئے ۔ کسی کو ہماری بات چیت کا
علم نہیں تھا ۔ لیکن واپس ہوتے وقت سیڑھیوں پر مجھے روک کر
چندر نے آہستگی اور رازداری سے پُوچھا ۔

" اس نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا ؟"

میں نے گھبرا کر چندر کی جانب دیکھا ۔ اس کی آنکھوں میں
شعلے تھے اور مقابلے کی خواہش ــــ مجھے بُرا لگا

" چندر " میں نے نرمی سے کہا ۔ " ایسی کوئی بات نہیں "
پھر جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر گئی ۔

راستہ بھر میں سوچتی رہی ۔ یہ کونسا جذبہ ہے جو مختلف
مزاج کے انسانوں کے درمیان بھی اسقدر مضبوط اور مشترک
ہے ۔ پھر میری ہنسی آپ ہی آپ کم ہوتی گئی ۔ ایک زرد
استخوانی چہرہ میری آنکھوں میں ہمیشہ گھومتا رہتا جیسے یہ
چہرہ اس کے خدوخال اس کی پتلی پتلی نوکیلی انگلیاں ہمیشہ
میرے گلے پر رکھی ہوئی ہوں ۔ میرا دم گھونٹ رہی ہوں میری
وحشت بڑھتی گئی ، جیسے یہاں جو کچھ بھی ہے ایک ڈوری کی مانند
میرے گرد لپٹا ہوا ذرا سا کھینچنے پر مجھے جھول اور بےبس
کر دینے والا ــــ

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ۔ " ہم کہیں اور بیٹھیں گے "

" واہ !" دلیپ احتجاجاً بولا " ہم یہاں مہینوں سے اکٹھا
ہو رہے ہیں اب یہ جگہ کیوں چھوڑیں " اس کے ہونٹ مسکرائے
" دُنیا کے اور ہمارے درمیان شیشے کی یہ دیوار " ... ایک لمحہ
کے لئے اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ۔ " ہم یہاں سے دُنیا کو
دیکھ سکتے ہیں اور دُنیا ــ ؟" وہ بڑے زور سے ہنسا ۔

راج نے پریشان ہو کر انیل کی جانب دیکھا ۔ انیل نے
سگریٹ مسل دیا ۔ غصّے میں وہ ہمیشہ یہی کیا کرتا ۔

" دُنیا سے چھپنے والے چور ہوتے ہیں ۔ دلیپ ! کیا ہم

پا رہیں ؟"

سوال دلیپ کے گرد لپٹنے لگا۔

"ہم کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں "

" ہاں "

مگر مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو سکا۔

میں جو دن بھر کالج کی دماغی محنت کے بعد شام کی تفریح اپنے لئے بے حد ضروری سمجھتی تھی۔ اب تفریح سے کترانے لگی۔ آنے جانے والوں کے تلنتے کے باوجود مجھے محسوس ہوتا جیسے دُنیا بھر کے جرائم اس نیم تاریک گوشے میں بڑے اطمینان سے سانس لے رہے ہیں اور کبھی کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

پھر تنہائی نے اسے ایک موقع اور دیا۔

" تم اپنے آپ سے لڑ رہی ہو بچی "

" نہیں" میں نے چڑ کر کہا۔ " میری اپنے آپ سے کوئی جنگ نہیں "

" تو پھر تین ساتھیوں کا مطلب ؟"

" وہ میرے دوست ہیں "

" دوست ؟" وہ پاتال سی آنکھیں زیادہ گہری زیادہ گمبھیر ہو گئیں۔ " ایک شئے کے تین ٹکڑے اس کی سالمیت پر حرف ہیں بچی "

وہ مُڑا اور چھلاوے کی طرح واپس ہو گیا —— میرے ساتھی آ رہے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اپنی مختصر زندگی میں، میں نے بیشتر آنسو لوگوں کی آنکھوں سے پونچھے، ان کی سنگت میں اپنی آنکھوں سے گرا لئے لیکن وہ ایک آنسو جو آج میرے دامنِ احساس میں مچل رہا تھا اُسے اپنی آنکھوں سے گرا دینے میں، اُسے پی لینے میں، میں کتنی ناکام تھی۔

میں نے شام کی تفریح بالکل ترک کر دی۔

انتظار سے تھک کر سب سے پہلے دلیپ میرے ہاں آیا۔

" دُنیا کا ڈر انسان کا اخلاقی نگہبان ہوتا ہے سنگیتا۔ اب اگر میں یہ اعتراف کر لوں کہ زندگی کے سارے لمحے، میں تمہاری معیت میں گزارنا چاہتا ہوں تو ؟"

وہ ہنستا ہوا اُٹھا اور چلا گیا۔

ٹک ٹک ٹک —— نظر نہ آنے والے لمحے پرواز کرتے رہے۔

پھر ایک شام جب تُند ہوائیں بند شیشوں سے ٹکرا ٹکرا کر سمندر کے تلاطم کا سماں پیش کر رہی تھیں، موسم سرما کی کپکپی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور آسمان سیاہ بادلوں کے پیچھے بالکل اوجھل ہو چکا تھا۔ چندر آیا۔

" گیت کس طرح گائے جاتے ہیں، کہانیاں کس طرح بنتی ہیں مجھے کچھ پتہ نہیں۔ دُنیا میری طاقت سے ڈرتی ہے میں غنڈوں کا دادا کہلاتا ہوں، لیکن سنگیتا! میں نے اپنی طاقت ہمیشہ بھلائی کے لئے استعمال کی ہے۔ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ؟"

بادل گرجے۔ میں آسمان کی طرف تکنے لگی حالانکہ آسمان کو تکتے رہنا مجھے قطعی پسند نہیں۔

چندر مایوسی سے اُٹھا اور خاموش چلا گیا۔

پھر انیل اور راج آئے۔

" کیا بات ہے مس آپ مستقل غیر حاضر ہیں "

میں مُسکرائی۔ " بچھڑ جانے کے بعد کی کیفیت انسان کی زندگی ہوتی ہے نا ؟"

" فلسفہ " وہ جھنجلائے۔

" صاف کیوں نہیں کہتیں دُنیا سے ڈر گئیں "

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جب چلے گئے تو مجھے محسوس ہوا زندگی یُوں ایک طویل تبسم سہی لیکن بعید ترین لمحوں میں ایک چیخ بھی بن جاتی ہے اور اس کی بازگشت ہم سے طالب ہوتی ہے —— مجھے ڈھونڈو —— مجھے ڈھونڈو ——

میں اپنے آپ کو بزدل محسوس کرنے لگی۔ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان وہ جو زندگی کا سفر طے کر رہے تھے جن کے پاس امنگیں تھیں آگے بڑھنے کا جوش اور ولولہ۔

اور وہ جن کا سفر قریب طے ہو چکا تھا، جنہیں منزل پر پہونچنے کی جلدی تھی۔ لیکن مسافرت کے کانٹے جن کے دامن سے اُلجھے راستہ روک رہے تھے۔

میں ان کانٹوں کو ایک ایک کرکے کیوں نہ چن ڈالوں۔

میری انسان دوستی مجھے بار بار کچھ کہے دیتی۔

دوسروں کے بوجھ کو ہلکا کر دینا خود اپنے کاندھوں کے وزن سے کتنا زیادہ آرام دہ اور تشفی بخش ہوتا ہے۔ حالانکہ چندر ہمیشہ یقین دلاتا رہا۔ بوڑھے کے بھیس میں وہ ضرور کوئی نوجوان ہے۔ عورتوں اور بچوں کو اغوا کر لیجانے والے کسی بدمعاش گروہ کا سرغنہ۔

اور سب کہتے رہے

"حد سے زیادہ پارسائی بجائے خود بہت خطرناک ہوتی ہے۔"

مگر میں کچھ یوں بھی سوچتی رہی۔

انسان کو سائے کے بھیس میں رہنے کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ جُرم اور انسانیت میں کسقدر فاصلہ ممکن ہے؟

جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے اُسی طرح فکر نے مسرت کو نگل لیا۔ حاصل شدہ طمانیت سے اُکتا کر میں اُس زخم کے پیچھے دوڑنے لگی جو میری شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو میں ضرور موجود تھا۔

اور ایک اندھیری رات اُونچے نیچے ٹیلوں کو لانگتے پھلانگتے جب ہم بہت دُور نکل گئے تو میں نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل اور اپنے خوف زدہ احساس کے مقابل اُسے بہت شانت اور مطمئن پایا۔ ارضی مخلوق سے ماورا ——
تب میں نے اُن سے پوچھا۔

"سچ بتاؤ تم کون ہو؟"

تبسّم اس کے چہرے پر جال کی طرح پھیل گیا۔ اس نے مجھے اسطرح دیکھا جیسے فن کار اپنی تخلیق کو دیکھتا ہے تب نرمی اور محبت سے بولا۔ "سنگیتا"۔۔۔۔۔

ٹھیک اُسی وقت کرپان چمکی اور اندھیرے میں بجلی کی طرح کوند گئی۔

"ڈرو نہیں، تمہارے پتاجی بھی میرے ساتھ ہیں۔"

چندر کی آواز پتھروں کی بوچھار کی طرح مجھ پر برسی۔

"چندر —— چندر ——" میں نے ہونٹ چبا ڈالے ماتھا پیٹ لیا، تبھی پتاجی وہاں آگئے۔

"ارے" انہوں نے حیرت اور خوف سے کہا۔

"چرن؟" پھر ان پر شدید جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔

نہیں معلوم اس کے بعد کیا کیا ہوا لیکن اگلے روز جب ہسپتال سے فون آیا۔

"وہ بچ نہیں سکا" تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پتاجی نے آہستہ سے مجھے تھپتھپایا۔ ان کا چہرہ زرد اور سوکھا ہوا تھا۔ سہمے ہوئے انداز میں بولے "تمہیں اپنی ماں یاد ہیں سنگیتا؟"

"ہاں" میں نے کہا۔ "وہ بے حد خوبصورت تھیں نا؟"

"بے حد۔ ہم نے انہیں پہلی مرتبہ گنگا مائی کے چرنوں میں دیکھا تھا، جیسے برف کی مورتی۔" چرن اس وقت برا ہنس مکھ تھا لیکن بدنام —— اس کی آوارگی کے چرچے شہر بھر میں تھے لیکن اچانک ہی وہ بالکل بدل گیا۔ وہ اُداس اور بے چین رہنے لگا کبھی کبھی مجھ سے پوچھ لیتا۔ "دل سے توبہ کرنے پر گنگا مائی اپنے پوتر تا انسانی جسم اور آتما کو بخش دیتی ہیں نا؟"

پھر وہ ہمارے ہاں باقاعدہ آنے لگا۔ رامائن کے پاٹھ اور پتاجی کی گیانی باتوں نے اس میں بے چینی اور افسردگی کی جگہ شانتی اور سکون پیدا کر دیا۔ ٹھیک انہی دنوں میرے شدید اصرار پر

مایا سے میری سگائی ٹھیر گئی۔ جب ان کے گرد پھیرے ختم ہوئے تو میں نے تعجب سے دیکھا، چترن واپس جا رہا تھا۔ چترن پھر مجھے کبھی نہیں ملا اور اب ——؟؟

بالکل ڈرامائی سین کی طرح دلیپ ہمارے کمرے میں داخل ہوا ——

"سنگیتا ——" اس کی آواز میں گرج اور آنکھوں میں نفرت تھی۔

"تم نے انہیں مار دیا، اب مجھے بھی مار ڈالو مجھے بھی..."

پتا جی ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے ——

اور میں نے وحشت پہلی بار، بالکل پہلی بار محسوس کیا۔ یہ دلیپ نہیں وہی سایہ ہے، باطنی شخصیت بے عادی ظاہری وجود —— گہرا مگر کھوکھلا ——

اور میں دوڑ کر دلیپ سے لپٹ گئی ——

دلیپ —— دلیپ ——!!

ہم دونوں رو رہے تھے ——

شاید مرنے والے کے لئے یا ——

اُس زندگی کے حصول کے لئے جو ——

اس دُنیا میں ہر ایک کو نہیں مل سکتی !! ▲

ھرچرن چاؤلہ

★

گھاؤ

بس کب آزاد نگر سے چلی۔ کب کنڈکٹر اُس کے ہاتھ میں ٹکٹ پکڑا کر اُس سے پیسے لے گیا اُسے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ اُس کے دماغ کے پردے پر ابھی کچھ دیر پہلے دیکھی ہوئی باتیں ایک فلم کی طرح چل رہی تھیں۔ لال صاحب کی پوتی کی توتلی توتلی میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں ابھی تک اُس کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں جب وہ اُن کے کُتے کو گود میں لئے بڑے پیار سے پُوچھ رہی تھی۔ "بلیتی۔ مجھے بتاؤ نا۔ تمہیں یہاں تکلیف تو نہیں، تمہیں کوئی مارتا نہیں، بولو نا بلیتی، مجھے بتاؤ نا، میرے بیٹے"۔

اُن کا کُتا جس کو کالے رنگ کی وجہ سے گھر کے سب لوگ بلیکی کہتے تھے، کُوں کُوں کرتا اپنے اگلے پاؤں کے سہارے اُس کے بازوؤں پر کھڑا ہو جاتا۔ اُس کے فراک کو چاٹتا۔ اُس کی کلائی کو دانتوں میں لے کر ہولے ہولے اتنے پیار سے دباتا کہ اُس کے تیز دانت بھی ننھی کٹی کے نازک بازوؤں پر کوئی نشان نہ چھوڑ سکتے۔ پیار اور عقیدت سے اُس کی دُم برابر ہلے جا رہی تھی۔ کٹی کی ممی دفتر سے تھکی ٹوٹی آکر کبھی کی پلنگ پر گہری نیند سو گئی تھی۔ اُس نے کٹی کو بھی اپنے ساتھ ہی سُلایا تھا۔ کیونکہ وہ دُھوپ میں اُسے باہر جا کر کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ مگر کٹی اندر اندر جاگتی رہی اور جونہی اُس کی ممی نیند کی آغوش میں لُڑھک گئی وہ آہستہ سے اُٹھ کر باہر بندے بلیکی سے کھیلنے لگی تھی۔ وہ کئی دِن سے ممی کو تنگ کر رہی تھی کہ وہ بلیکی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ آج اُس کی ممی اُسے اپنے ساتھ دفتر لیتی آئی۔ چار گھنٹے کا کام ڈھائی گھنٹے میں ختم کیا اور کٹی کے ساتھ اُن کے گھر چلی آئی تھی۔

یہ کُتا وہ لال صاحب کے گھر سے ایک سال پہلے لایا تھا۔ تب وہ تیس چالیس دن کا چھوٹا سا بچہ تھا۔ ان تیس یا چالیس دنوں میں کٹی نے اُسے ایک بچے کی طرح پالا تھا اپنے ہاتھوں نہلایا تھا۔ رات کو اپنے ساتھ سُلایا تھا ———

دونوں ٹائم وقت پر دُودھ پلایا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی ماں کا دُودھ بھی پی لیتا تھا مگر پھر بھی کٹّی کو اُس کی بھوک پیاس کی ہر وقت چنتا لگی رہتی تھی۔

اُس کے لئے حیران کُن بات یہ تھی کہ وہ کُتا جو اُن کے دروازے پر بندھا گلی کے کسی دوسرے کُتے کو تو کیا کسی بچے بڑے، محلہ دار یا واقف کار کو بھی اندر نہیں گھسنے دیتا تھا کیسے کٹّی کو ایک سال بعد ایک منٹ میں پہچان گیا۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ اندر چلی گئی تو وہ کُوں کُوں کرتا زنجیر کو کھینچ کھینچ کر اندر اُس کے پیچھے جانے کی کوشش کرنے لگا اور تب تک چُپ نہ ہوا جب تک وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ کر اُسے پچکارنے نہ لگی۔ ٹھیک ہے کبھی کٹّی نے اُسے اپنے ہاتھوں نہلایا سُلایا اور کھلایا پلایا تھا۔ آرام پہنچایا تھا۔ مگر اُس بات کو گزرے تو ایک سال بیت گیا جبکہ وہ اُس وقت ایک ننھا سا نا سمجھ تھا پھر اُسے کٹّی کیسے یاد رہی جب کہ خود اُس کے لڑکے برینیدر نے اُسے اور اُس کی بیوی (اپنی ماں) کو چند دنوں میں بھلا دیا تھا۔

چھ ماسے روتے روتے اُس کی بیوی برینیدر کی یاد میں اپنی آدھی بینائی گنوا بیٹھی تھی مگر برینیدر نے تو نوکری لگنے اور شادی ہو جانے کے بعد اُنہیں ملنا تو ایک طرف خط تک لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ برینیدر اُن کا اکلوتا بیٹا تھا یہ دُکھ اُن دونوں میاں بیوی کے دلوں پر گھُن کے لگایا کرتا تھا کہ اُنہیں خدا نے ایک اولاد دی مگر نالائق۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لال صاحب کے گھر سے یہ کُتا لائے تھے تاکہ اُن کا دل لگا رہے۔

بس جب کسی اسٹاپ پر رُک کر دوبارہ چلی تو اُس کے کانوں میں کسی کُتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ وہ پچھلے گیٹ کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اُس نے باہر دیکھا۔ ایک کُتا بھونکتا ہوا بس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ کُتا ساتھ دوڑتا رہا سب مسافر باہر دیکھنے لگے۔ جب وہ رُکا نہیں بھونکتا ہوا ساتھ چلا آیا تو ایک سردار جی سیٹ پر سے اُٹھ کر گیٹ سے لٹک کر

کُتے کو ہاتھ سے ڈراتے ہوئے چلایا۔ "بھئ تُر ——— جا بھاگ جا ——— جا گھر اپنے"

کُتا ایک منٹ کے لئے رُکا مگر دوسرے منٹ وہ پھر دوڑتا ہوا بس کے ساتھ دوڑنے لگا۔ سردار کچھ دیر تو ہاتھ لہرا لہرا کر اُسے ڈراتا رہا۔ پھر یہ کہہ کر "خود ہی چلا جائے گا تھک ہار کر" اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ کنڈکٹر نے پُوچھا۔

"سردار جی ٹکٹ؟"

"رنگیل کا دے دے یار"

ٹکٹ لے کر پینتیس پیسے سردار نے کنڈکٹر کو ادا کر دیئے کُتا ابھی تک بس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ بس کافی دُور نکل آئی تھی مگر وہ ابھی رُکا نہیں تھا۔ ایک جگہ سردار نے جب اُسے ہاتھ لہرا کر ڈرایا تو وہ پیچھے ہٹتے ہوئے سڑک کے کنارے کھدے ہوئے ایک کھڈے میں لُڑھکتا ہوا جا گرا۔ مگر کمال پھرتی سے کیچڑ سے اٹا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر بس کے ساتھ دوڑنے لگا جب وہ پلٹیاں کھاتا ہوا کھڈے میں گرا تھا تو اُس کا دل پسیج گیا تھا۔ اُس نے سردار سے کہا۔

"سردار جی۔ اُتر کر پہلے کُتے کو گھر چھوڑ آؤ۔ پھر دوسری کسی بس سے آ جانا"

(۲۵)

"واہ باؤ جی۔ تُسیں کمال کرتے ہو" سردار بولا۔ "میرا پینتیس پیسے کا ٹکٹ برباد نہ ہو جائے گا"

وہ چُپ ہو رہا۔ سردار نے اگلے اسٹاپ پر اُتر کر ایک پتھر اُٹھا کر کُتے کو دکھاتے ہوئے گالی دیکر کہا۔

"اوئے جا اوئے خنذیر دے پُتر آ اپنے گھر"

کُتا پتھر کو دیکھ کر ڈر کے مارے بس کے نیچے گھس گیا پھر اس سے پہلے کہ بس چل پڑے سردار لپک کر بس میں سوار ہو گیا بس کے چلتے ہی سب مسافروں کو ایسے لگا جیسے بس کے پہیے سے کسی چیز پر سے گزر گئی ہو۔ ایک مسافر نے مُڑ کر دیکھا تو چلا کر بولا۔

"ارے کُتا مر گیا"

اُس نے مُڑ کر دیکھا سڑک میں کُتا پڑا تھا اور اُس کے مُنہ سے خون کی لمبی سی لکیر سڑک پر بہہ رہی تھی۔ سب کی درخواست پر بس روک دی گئی اور سردار نیچے اُتر گیا۔ سردار کی آنکھوں میں ننھے ننھے آنسو چمک رہے تھے۔ وہ بھرآئی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرا بیٹا مر گیا اوے میں نے اُسے کتنے لاڈ سے پالا تھا۔"

بس دوبارہ چل دی۔ سب مسافروں کے چہروں پر دُکھ کی پرچھائیاں سی چھا گئیں۔ اُس کے آگے بیٹھی ہوئی لڑکی تو ایسا لگتا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔ سب کے دِل اُداس تھے۔ سب خاموش تھے۔ بس ابھی تیسرے اسٹاپ پر ہی رُکی تھی کہ وہی سردار بس میں آ سوار ہوا۔ اُس کے ساتھی دوسرے سردار نے پوچھا۔ "امریک سنہا۔ کُتا۔ بچا کہ مر گیا؟"

امریک سنگھ ہولے سے بولا۔ "مر گیا؟"

اُس سے رُکا نہ گیا تو اُس نے پوچھا۔ "سردار جی اُسے سڑک سے ایک طرف تو ڈال آتے؟"

سردار بولا۔ "باؤ جی۔ اب اُس میں کیا رکھا تھا؟"

وہ جل اُٹھا۔ ظالم اُس نے تیری محبت میں اپنی جان قربان کر دی اور تو نے اُس کی لاش کو دفنانا تو ایک طرف سڑک سے ایک طرف اُٹھا کر پھینک دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ صرف اس لئے کہ تم نے دوسری بس سے یہ بس پکڑ نی تھی تاکہ تمہارے پینتیس پیسے ضائع نہ ہو جائیں۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ "پھر بھی سردار جی ....."

سردار بولا۔ "باؤ جی۔ اگر اُس میں ذرا بھی دم ہوتا تو میں ٹیکسی کر کے بھی اُسے ہسپتال لے جاتا مگر وہ تو بالکل ختم ہو چکا تھا۔"

بس پھر چل پڑی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر اُس کے دوسرے ساتھی سردار نے کہا۔

"امریک سنہا، یہ سب ڈلیور کی شرارت ہے۔"

اُس سے رہا نہیں گیا۔ "سردار جی۔ کُتا تو بس کے پچھلے پہیئے کے نیچے آ کر مرا ہے۔ اس میں ڈرائیور کی کیا غلطی ہو سکتی ہے؟"

سب مسافر اُس کی بات کی تائید کرنے لگے تو امریک سنگھ ساتھی سے بولا۔

"ہاں اوئے جھلا سنہا، ڈلیور بچارے کا کوئی قصور نہیں۔"

اگلے اسٹاپ پر اُس سے آگے والی سیٹ سے جب ایک لڑکی اُتر گئی تو امریک سنگھ وہاں آ بیٹھا۔ پھر سوار جھلا سنگھ بھی اُس کے پاس آ گیا۔ جھلا سنگھ نے امریک سنگھ سے پوچھا۔

"کتنے میں لیا تھا؟"

"پچیس میں، سول واہگورو کی اصلی السیشن تھا۔"

"اور کتنا خرچ بیٹھا؟"

"یار جھلا سنہا۔ تو بھی بالکل جھلا (بدھو) ای ہے۔ قسم رب دی، پُتر دی طرح پالا سی۔"

"اوئے پھر تاں بڑا خرچہ ہویا تیرا۔ میری ایک بات سُن۔"

"کیا؟" امریک سنگھ نے پوچھا۔

"اوئے تو کنڈکٹر سے کمپلیٹ بُک مانگ لے اور لکھ دے پیسہ رل جاؤ وُ گا۔"

امریک سنگھ تھوڑی دیر چُپ رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اُسے شکایت کی کتاب کنڈکٹر سے مانگنی چاہیئے یا نہیں پھر جب بس ریگل پر سب مسافر اُتارنے اور نئے لینے کے بعد دوبارہ چلی تو امریک سنگھ نے مُڑ کر بس میں بیٹھے سب مسافروں کو دیکھا اور پھر لپک کر کنڈکٹر کے پاس پہنچا اور بولا۔

"مجھے کمپلیٹ بک دیدے۔"

کنڈکٹر نے حیران نظروں سے امریک سنگھ کی طرف دیکھا اور پُوچھا۔ "سردار، کمپلینٹ بک کس لئے؟"

"اوئے تم نے ہمارا کُتا مار دیا، ہم شکایت کرے گا۔

کمپنی سے قیمت وصول کرے گا۔ اور تم سمجھتا کیا ہے بو؟"

"مگر کُتا ہم نے نہیں مارا۔ اپنی آئی مرا ہے" سردار کی داڑھی مونچھ سے بھرے چہرے سے گھبرا کر کنڈکٹر نے کہا حالانکہ اُسے کہنا یہ چاہیئے تھا کہ وہ تمہاری لاپرواہی اور لالچ سے مرا ہے۔

"ہاں ہاں۔ اپنی آئی مرا ہے۔ تو سیدھی طرح کمپلینٹ بک دیتا ہے کہ نہیں"

اور پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر بک ساکٹ سے کمپلینٹ بک کھینچ لی۔ کنڈکٹر بےبسی سے بولا۔

"سردار جی۔ پہلے مانگتے تو میں بھی اپنی بچت کرلیتا دوسرے مسافروں سے سچا واقعہ لکھوا کر اور گواہی ڈلوا کر"

جب امریک سنگھ شکایت لکھ کر نیچے اُتر گیا اور بس دوبارہ چلی تو کنڈکٹر نے کتاب اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا

"بابو جی۔ دیکھنا تو ذرا۔ کیا لکھا ہے؟"

اُس نے پڑھا اُردو میں لکھا تھا "جناب افسر صاحب، تمہاری بس کے ڈلیور نے ہمارا کُتا مار دیا ہے۔ ہمارے ساتھ انصاف کیا جاوے اور سو روپے کا ہمارا کلیم دیا جاوے۔ ہمارا بہت نقصان ہوا ہے" امریک سنگھ بقلم خود

شکایت پڑھنے کے بعد اُس نے کتاب میں یہ ریمارک انگریزی میں اپنی طرف سے لکھ دیا۔

"کُتا بس کے پچھلے پہیئے کے نیچے آکر اپنی موت مرا ہے جس کو اسی سردار نے خود ڈرا کر بس کے نیچے گھسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس میں ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں۔ نہ صرف اُس کا بلکہ بس کے دوسرے سب مسافروں کا یہی خیال ہے۔ شکایت بہت دیر بعد لکھی گئی ہے ورنہ وہ سب مسافر امریک سنگھ کی بات کو جھوٹا بتاتے"

اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنا ٹکٹ نمبر، گھر کا پتہ اور دستخط کر دیئے۔ پھر اُس نے بھلا سنگھ کی طرف کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سردار جی آپ بھی کُتے کی موت کی گواہی میں دستخط کر دیجئے"

بھلا سنگھ نے اُس کے ریمارک کے نیچے دستخط کر دیئے اور اُس کے کہنے پر اپنا ٹکٹ نمبر اور پتہ بھی لکھ دیا۔ جس سے اُسے یقین ہو گیا کہ سردار بھلا سنگھ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اگلے اسٹاپ پر وہ یہ سوچتا ہوا نیچے اُتر گیا کہ ایک کُتے اور انسان میں کتنا فرق ہے۔ کُتا ایک ماہ کا کھایا ہوا زندگی بھر یاد رکھتا ہے اور انسان زندگی بھر کا کھایا ہوا ایک منٹ میں بھول جاتا ہے ▲

نکہت اقبال

پونم

پردہ ہٹا کر چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے ہوئے جوں ہی میں کمرے میں داخل ہوئی تو میرا افسانہ نگار شوہر اپنی لکھنے کی میز پر نہیں تھا ـــــ افسانہ نگار تو افسانہ نگار ! ـــ صاحب کے لئے میں چائے لائی تھی لیکن خود صاحب غائب تھے۔ میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ کھڑکی کھولے چاند سے آنکھیں لڑانے میں مشغول تھے !۔

"چائے حاضر ہے !"

میں نے آگے بڑھتے ہوئے آہستہ سے کہا ـــ اچانک وہ مڑے اور جذباتی انداز میں میرا بازو پکڑتے ہوئے بولے :

"میرا محبوب ! ـــ پونم !"

"کہاں ؟"

"وہ دیکھو ـــ پسند آیا ؟"

میں نے مسکرا کر نکھرے ہوئے چاند کو دیکھا۔ ہنس دی مجھے معلوم تھا کہ انہیں چاند سے عشق ہے ـــ بچپن میں چاند ان کا "چندا ماما" تھا جو آج ان کا محبوب بن چکا تھا ـــ لیکن میں غور کر رہی تھی کہ محبوب کا نام "پونم" ان کی زبان پہ کیسے آگیا ؟ ـــ میری نگاہیں ان کی طرف تھیں۔ وہ چائے کو شراب سمجھ کر پی رہے تھے اور مسکرا کر "پونم" کو تک رہے تھے۔ عجب تاثرات تھے ان کے چہرے پر۔ میں نے پوچھا۔

"یہ پورنیما کا تو چاند نہیں ؟"

"ہر چاند پونم ہوتا ہے !"

"چاند تو آپ مجھے بھی کہتے رہے ہیں .... !؟" میں نے یونہی پوچھ لیا ـــ میری طرف مسکرا کر انہوں نے دیکھا۔ تھوڑی چھوتے ہوئے بولے :

"تم پونم کا عکس ہو !"

"یعنی ـــ ؟"

"قدرت چاند کی تخلیق نہ کرتی تو چاند کا حسین تخیل ہمیں کہاں سے ملتا اور میں تمہیں چاند سے تشبیہہ ہی کیسے دیتا !؟"

وہ چائے پینے لگے اور میں سوچنے لگی کہ وہ افسانہ نگار نہ ہوتے تو مجھے چاند سے تشبیہ کون دیتا؟ —— دنیا کو حسین تخیلات کہاں سے ملتے اور کون عورت کی عظمت میں چار چاند لگاتا؟ اچانک میں چونک پڑی۔ وہ کہہ رہے تھے:

"چلو سیر کر آئیں پونم!"

"اس وقت؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "دس بج چکے ہیں، سردی بہت ہے!"

شاعرانہ ضد کے آگے میں ٹک نہ سکی۔ گرم کوٹ پہن لیا اور ان کے ساتھ ہولی —— باہر پہنچتے ہی انہوں نے خوش ہو کر کہا:

"میرے محبوب کو دیکھو! —— پونم ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی ہے ——!"

میں نے شرارتاً کہا۔

"آپ کا محبوب مرد ہے یا عورت ——؟"

وہ تلملا سے گئے اور قدرے محجوب ہو کر بولے:

"پونم! اگر میرا بس چلے تو اس ادبی ذخیرے کو جلا دوں جس میں محبوب کا تصور مرد کے سوا اور کچھ نہیں —— محبوب عورت ہی ہو سکتی ہے ....!"

"محبوب نہ کہہ کر محبوبہ کہیئے۔"

"پونم میری محبوبہ ہے —— واقعی تم ٹھیک کہتی ہو!" انہوں نے چاند کی طرف دیکھا اور کہا۔

ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ ایک جگہ اندھیرا ہونے کے باوجود اندھیرا نہیں تھا۔ اس لئے کہ بقول میرے شوہر کے ان کی محبوبہ پونم کے جلوے تاریکی کو ماند کئے دے رہے تھے۔ اچانک بائیں گلی سے کسی نے آتے ہی کہا۔

"اللہ کے نام پہ ——!"

پھیلے ہوئے ہاتھ نے مجھے چونکا دیا۔ میں ٹھٹکی تو انہوں نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"بھکارن!"

"پونم!؟"

اُن کے لہجے میں استفساریت تھی۔ میں نے دیکھا تو وہ زمین کی پونم میں کھوتے ہوئے تھے۔

"اللہ بھلا کرے —— بابوجی!"

"پونم ہو کر —— بھیک مانگتی ہو تم؟"

"بابوجی!"

وہ اور سکڑ گئی —— پہنے ہی کیا تھی بیچاری —— پرانے پھٹے کپڑے اور وہ بھی ناکافی۔ اس کا ایک ہاتھ پھیلا تھا، دوسرا بغل میں دبا تھا۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ گندی، میلی، کچیلی پونم!

"چلئے ——!"

میرے ٹوکنے پر وہ آگے بڑھ گئے —— میں نے محسوس کیا کہ وہ جیسے چپ ہیں، لیکن آنکھیں چاندہی پر لگی تھیں —— وہ شاید کچھ سوچ رہے تھے۔ شاعرانہ موڈ سے میں واقف تھی —— جب کوئی نیا خیال جنم لیتا تو وہ گم سم سے ہو جایا کرتے تھے۔ اُس وقت بھی ان کی یہی کیفیت تھی۔ وہ یقیناً کچھ سوچ رہے تھے کیا؟ مجھے معلوم نہ ہو سکا، لیکن میں یہ سوچ رہی تھی کہ ان کے تخیل کو برانگیختہ کرنے والی کونسی پونم تھی —— زمین والی پونم —— یا آسمان والی ——؟ لیکن یہ جاننا اس لئے مشکل تھا کہ وہ خاموش تھے اور یہ امر مسلمہ کہ "عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے"! —— تخیل کے دامن میں ساری کائنات سما جاتی ہے!۔

جب گھر پہنچے تو وہ اپنے کمرے کی طرف ہو لیئے جہاں وہ پونم سے باتیں کرتے جائیں گے اور لکھتے جائیں گے اور میں نے بستر کی طرف رُخ کیا اس لئے کہ سردی نے میرے تصور تک کو جما دیا تھا ——!

لحاف کی گرمی نے ذہن پر جمی ہوئی برف پگھلا دی اور مجھے وہ بھکارن یاد آ گئی جو اچانک بائیں گلی سے نکلی تھی اور جس نے

مجھے چونکا دیا تھا۔ اب میں "پُونم" کو عورت کی تنقیدی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ چہرہ اس کا گول تھا اور مجھے خیال آیا کہ گول چہرے کی مناسبت سے انہوں نے اس کو بھی "پونم" ہی کہا تھا —— مجموعی طور پر وہ اچھی کہی جاسکتی تھی۔ لیکن گندگی نے اُس سے سب کچھ چھین لیا تھا — پھر وہ "پُونم" کیسے ہوسکتی تھی؟ — گہنایا ہوا چاند تھی وہ پھر "پُونم" کیسے ہوسکتی تھی؟۔

میں نے کروٹ لی ہی تھی کہ آواز آئی،

"پُونم! تم نے مجھے ستایا کیوں؟"

کہنی ٹیک کر میں نے سر اُٹھایا۔ انہوں نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اُسے دیا کیوں نہیں؟"

"کیسے —؟"

"اُسے —— پُونم کو!"

میں ہنس دی تو وہ بھی ہنس دیئے، لیکن ان کی ہنسی بدلی ہوئی تھی —— حقیقی نہیں اِس میں کچھ کرب بھی شامل تھا۔ میں نے کہا:

"آپ کے کہنے سے میں سیر کے لئے چلی گئی تھی، پرس نہیں لے گئی تھی۔"

"اوہ! یہ بات ہے!" وہ بولے "میں سوچ رہا تھا کہ شائد تم نے کسی اور وجہ سے اس کی مدد نہیں کی —— یہ خیال مجھے لکھنے نہیں دے رہا تھا۔ سوچا اُلجھن دُور کرلوں۔ خود میری جیب بھی خالی تھی وہ دُکھی تھی اور میں پُونم کا درد برداشت نہیں کرسکتا ....!"

"چلے جایئے اور اُسے کچھ دے آیئے!"

انہوں نے مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھا اور بغیر کچھ کہے چلے گئے —— میں یہ سوچ کر ہنس دی کہ آج ہر شئے انکی نظر میں پُونم ہے۔ ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر میں نے تکیہ پر سر رکھ دیا۔ اب میں سو جانا چاہتی تھی —!

صبح ناشتہ کی میز پر انہوں نے کہا۔

"تنویر! میں دوبارہ آیا تھا۔ تم سو چکی تھیں....!"

میں ہنس دی اور جلدی سے پوچھا۔

"رات میں آپ مجھے پُونم کہہ رہے تھے۔؟"

"رات میں پُونم —— دن میں تنویر!"

ہم دونوں ایک ساتھ ہنس دیئے۔ اچانک میں نے پوچھا۔

"دوبارہ آپ کیوں آئے تھے —— چائے کے لئے؟"

"نہیں!" وہ بولے "میں تم سے مشورہ کے بعد پُونم کو کچھ دینا چاہتا تھا۔ تم کو سوتے دیکھا تو یہ سوچ کر کہ تمہاری مرضی بھی یہی ہے میں چلا گیا تھا....!"

"اس میں اجازت کی کیا ضرورت تھی؟"

مجھے دیکھتے ہوئے وہ بولے،

"واقعی کوئی ضرورت نہیں تھی، تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"

وہ کہہ رہے تھے اور میری نظریں فرش کی طرف جھکی تھیں مسکرا رہی تھی۔ وہ ٹوسٹ پر مکھن لگا چکے تھے اور اب جام لگا رہے تھے۔ میں نے نظریں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"رات آپ نے کیا لکھا؟"

"کہانی!" وہ چٹخارہ لیتے ہوئے بولے: "اس کا نام بھی پُونم ہے —— تم کو کہانی بہت پسند آئے گی۔ تم سُن کر بہت خوش ہوگی!"

"اچھوتا خیال ہے؟"

"پُونم وہی بھکارن لڑکی ہے کیا؟"

"محرک وہی ہے!"

"اور کہانی کا بُنیادی خیال؟"

یہ کہہ کر میں نے نگاہیں ان کے چہرے پر گاڑ دیں سگرٹ کا کش لیتے ہوئے اور کچھ کھوتے ہوئے انداز میں بولے،

"تنویر! دُنیا کی ہر لڑکی اور ہر عورت میری نظر میں پُونم ہے اس لئے کہ وہ تنویر، روشنی اور اُجالے کو جنم دیتی ہے۔ میری مُراد انسان سے ہے۔ لیکن کتنے ذی حس ہیں ایسے لوگ جو پُونم کو دیکھ

تڑپ جاتے ہوں؟ جس طرح سیاہ بدلی پُونم کو کھا جاتی ہے، اسی طرح بے حسی، غربت اور افلاس زمین کے ہر پُونم کو مٹا دیتی ہے۔ اس کے خلاف ہمیں نبرد آزما ہونا چاہیئے۔ پُونم اگر مر گئی تو اس کے معنی ہیں کہ روشنی مر گئی۔ پھر دُنیا میں اندھیرا پھیل جائیگا اور تم جانتی ہو کہ مجھے اندھیرے سے چڑ ہے ــــ میں اندھیرے کا دشمن ہوں....!"

"خیال تو نیا نہیں!" میں نے کہا "لیکن اندازِ تخیل نیا اور تیکھا ہے!"

وہ سگریٹ کے کش لینے اور دھویں کی لکیریں بنانے میں مشغول تھے اور زیرِ لب مُسکرا رہے تھے!۔

رات کی سیر روزمرہ کا اُصول بن گیا تھا۔ جب میں ناغہ کرتی تو وہ کہتے:

"تمنویر نہ ہو تو میں لکھ کیسے سکوں گا۔ خود سوچ لو؟"

"آپ تو چہل قدمی کے لئے جا رہے ہیں نہ کہ لکھنے؟"

"ہم لوگ چلتے پھرتے یہاں تک کہ سوتے سوتے لکھتے ہی رہتے ہیں!"

"پُونم تو موجود ہے!"

میں نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ انہوں نے بڑی معصومیت سے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑی حسرت سے بولے:

"آجکل پُونم فلک کی قید میں ہے!"

"زمین کی پُونم تو آزاد ہے!"

"اُسے روشنی کی ضرورت ہے ــــ وہ چمک سے محرُوم ہے"۔

رات اندھیری ہو یا بغیر پُونم کے ہو لیکن ہمیں "پُونم" ضرور ملتی تھی ــــ شاید اسے بھی ہم لوگوں کا اب انتظار ہی رہتا تھا کیونکہ ایک دن اس نے کہا تھا:

"آج آپ نے دیر کر دی بابو جی!"

"کیا تم ہمارا انتظار کرتی ہو؟"

"ہاں!" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"کیوں؟"

"بابو مجھے پُونم جو کہتے ہیں!" وہ ہنسنے لگی اور کہا: "سب مجھے پُونم ہی کہتے ہیں!"

"سب کو کیسے معلوم ہوا کہ تم پُونم ہو؟"

"سب جان گئے۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا "کیا تم نے سب کو بتا دیا؟"

"ہاں!"

"کیوں؟"

"یہ نام مجھے اچھا لگا اس لئے!"

وہ ہنس دی۔ ہم دونوں بھی ہنسنے لگے!۔

ایک رات میں تنہا سیر کو چلی گئی تھی۔ اُس نے مجھے تنہا پا کر ادھر اُدھر گھبرا کر دیکھا اور پوچھا۔

"بابو جی نہیں ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہاں ہیں؟"

"کیوں؟"

"اکیلے تو آپ کو بھی اچھا نہیں لگ رہا ہوگا؟"

وہ ہنس دی۔ اور میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"آپ کا چہرہ اُداس ہے....!"

"ایسی بات تو نہیں؟"

"مجھے ایسا ہی جان پڑ رہا ہے۔"

"اس لئے کہ تم اُداس ہو، کیوں؟"

وہ ایک لمحہ کے لئے رُکی۔ پھر اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

"بابو جی روز آتے ہیں۔ آج نہیں آئے تو کچھ اچھا نہیں لگا کہیں گئے ہیں؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "وہ کہانی لے کر بمبئی گئے ہیں۔"

"میری کہانی؟"

"تمہاری کہانی؟"

"بابوجی نے کہا تھا کہ وہ میری کہانی لکھ رہے ہیں!"

میں ہنس دی۔ اُس نے مجھے خاموش نگاہوں سے دیکھا اور چُپ ہو گئی!۔

ایک دن خود انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک کہانی "پونم" لکھ رہے ہیں اور وہ اس بھکارن لڑکی کی کہانی ہو گی جو زمانے کے ہاتھوں پونم نہ بن سکی۔ میرے لئے یہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں تھی، اس لئے کہ میں جانتی تھی کہ لکھنے والے شہزادی کی زندگی سے اگر افسانہ بنا سکتے ہیں تو ایک میلی کچیلی گندی بھکارن بھی ان کے افسانے کا موضوع بن سکتی ہے!۔

آجکل میں اپنے شوہر کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اسلیئے کہ بیمار تھی اور وہ تنہا رات کی سیر کے لئے جاتے تھے اور روزانہ صبح کو وہ مجھے اپنی افسانوی پونم کی زندگی کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتاتے تھے ___ پونم بہت دُکھی ہے ___ زمین نے اسے بہت ستایا ہے ___ کہتی ہے کہ زمین کی حدت نے اس کے تلوے ہی نہیں جلا دیئے بلکہ اس کے انگ انگ میں چھالے پیدا کر دیئے ہیں جو تپتے ہیں، کسکتے ہیں، جلتے ہیں، لیکن کوئی ان پر مرہم نہیں لگاتا ___ کوئی بھی نہیں ___ یہ دُنیا بھی ظالموں اور خود غرضوں کی بستی بن چکی ہے۔!

لیٹے لیٹے یہ اشارے مجھے زخمی کرتے تھے ___ ایک افسانہ نگار کی محبت نے مجھے بھی وہی حس عطا کر دی تھی جو اسکو قدرت کی طرف سے ملی تھی۔

ایک دن جب میں بال بنا رہی تھی کہ اچانک پونم آ گئی گھر پر اس کی موجودگی نے مجھے چونکا دیا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا

"بابوجی اب کہاں رہتے ہیں، سیر کو کیوں نہیں آتے؟"

"وہ باہر گئے ہیں اور ابھی وہیں رہیں گے۔"

وہ بڑی دیر تک چُپ رہی۔ آخر خود میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!"

"تم چُپ کیوں ہو گئیں؟"

اُس نے جلدی سے پوچھا۔ "میری کہانی لکھ دی بابوجی نے...؟"

"نہیں!"

اُس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کہہ رہے تھے لکھ لی...؟"

"کیا انہوں نے تم سے کہا تھا؟"

"ہاں۔"

میں ہنس دی اور کہا۔ "آج نہیں تو کل کہانی لکھی جائیگی ..... انتظار کرو۔"

"انتظار!" وہ بولی۔ "میں یہی کہنے آئی تھی کہ میرے مر جانے سے پہلے کہانی ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا اور پوچھا

"سفر پر ___ پونم کا سفر شروع ہونے والا ہے!"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی آہستہ آہستہ، جیسے کہ وہ بیمار ہو۔ آج نہ اسمیں وہ چمک تھی اور نہ وہ ہنسی۔ وہ بجھی بجھی سی تھی ___ اُس دیئے کی لَو کی طرح جس کا تیل ختم ہو چکا ہو اور لَو کی روشنی مدھم پڑ رہی ہو ___ ایک دن نوکر نے بتایا کہ بھکارن نے زہر کھا لیا اور مر گئی ___ پولیس پنچایت نامہ کیلئے آئی ہے ___ یہ تھا پونم کا سفر! ___

جب میں نے اپنے شوہر سے پونم کی موت کا ذکر کیا تو وہ بُت بنے بیٹھے رہے۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی اُن کی زبان سے نہ نکلا مجھے اچنبھا ہوا ___ آخر کیوں؟ پونم پر جان دینے والا ___ پونم کے غروب پر سکتے میں کیوں آ گیا تھا؟ اُس نے آہ کیوں نہیں بھری اس کی آنکھیں نم کیوں نہیں ہوئیں ___

آخر کیوں ___ ؟!

سید حُرمت الاکرام

نقوشِ تازہ

رم جھم کی صدا رُوح کو برماتی ہے — بُوندوں کی کھنک دل میں اُتر جاتی ہے
یادوں کے خرابے میں بھڑکنے لگی آگ — فریاد کے ہر لمحے سے آنچ آتی ہے

○

پرچھائیاں سرشار ملاقاتوں کی — رقصاں ہیں تپش لیے حسیں گھاتوں کی
مدہوش ہواؤں کے سبک رتھ پہ سوار — آتی ہے دُلہن بیتی ہوئی راتوں کی

○

میرے غم تنہائی پہ ہنستے بادل — رہ رہ کے مری رُوح کو ڈستے بادل
غربت میں بھی لینے نہ دیا چین مجھے — برسا گئے آنکھوں کو ترستے بادل

○

ہر وادی و کہسار پہ چھا کر برسو — اے بادلو! طوفان اُٹھا کر برسو
سر سے مرے ہو جائے نہ اُونچا پانی — اس کا بھی کچھ اندازہ لگا کر برسو

○

لب تشنۂ دوراں کو بھی سیراب کرو — وا مجھ پہ بھی عشرت کا کوئی باب کرو
برسو مگر اے بادلو! شرط اتنی ہے — مُرجھائے ہوئے دل کو بھی شاداب کرو

8

نریش کمار شاد

موت

ترکی کے مشہور انقلابی شاعر ناظم حکمت کی
ایک نظم کا منظوم ترجمہ

کیا نہیں بیٹھو گے تم اے میرے پیارے دوستو!
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
جانتا ہوں جب میں تھا سویا ہوا
خواب کی دُنیا میں تھا کھویا ہوا
جیل کی اس سرد و تیرہ کوٹھری میں بے خطر
آ گئے تم سامنے والی وہ کھڑکی پھاند کر
جانتا ہوں تم نے وہ شیشی دوا والی اُٹھائی تک نہیں
ارغوانی گولیوں والی وہ ڈبیہ بھی ہلائی تک نہیں
اپنے ہاتھوں میں لئے اک دوسرے کے ہاتھ کو
آ گئے تم میرے بستر کے سرہانے دوستو
ہے تمہارے سب کے چہروں پر ستاروں کی چمک
لالہ زاروں کا تبسم ماہ پاروں کی چمک
کیا نہیں بیٹھو گے تم اے میرے پیارے دوستو!
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
کیا یہ کم دلچسپ ہے اے ساتھیو!
میں سمجھتا تھا کہ تم مرحوم ہو
چونکہ جنت اور جہنم پر نہیں میرا یقیں
اور خدا سے بھی مری کوئی شناسائی نہیں
اس لئے یہ سوچتا تھا زندگی میں بارہا
پیش اک سگریٹ بھی تم لوگوں کو کب میں کر سکا
کیا یہ کم دلچسپ ہے اے ساتھیو!
میں سمجھتا تھا کہ تم مرحوم ہو

اور تم کھڑکی کے رستے کوٹھری میں آ گئے
میری آنکھوں پر غبارِ نور بن کر چھا گئے
اس لئے کیا اب نہیں بیٹھو گے میرے دوستو!
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
ہاشم اے بھائی مرے! عثمان کے لختِ جگر
کس لئے ہو تم زبوں حال و پریشاں اس قدر
سخت حیرت ناک ہے یہ واقعی
کھو چکے تھے تم تو اپنی زندگی
سنگ دل رنج و مصائب کی اندھیری راہ میں
شہرِ استنبول کی شاداب بندرگاہ میں
آہ وہ ظالم جہاز
فتنہ ساماں فتنہ ساز
جس پہ اک دن کوئلے ڈھوتے ہوئے
پاؤں پھسلا تم اچانک گر پڑے
ہائے کتنے رُوح فرسا تھے وہ لمحاتِ ملال
خُون میں بھیگا ہوا تھا جب تمہارا بال بال
ہولے ہولے ڈُوبتی جاتی تھی نبضِ زندگی
کون جانے تھی تمہیں کتنی اذیت اس گھڑی
اس لئے تم کیوں کھڑے ہو بیٹھ جاؤ میرے پاس
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید

اور تم یعقوب! اے آلامِ دُنیا کے شکار
اے پہاڑی گاؤں کے باسی اے میرے یارِ غار
میں سمجھتا تھا کہ تم بھی مر چکے ہو حلقۂ غم توڑ کر
اپنے بچوں کے لئے ورثے میں آفاتِ زمانہ چھوڑ کر
گرمیوں کی دوپہر کو ایک گورستان میں
ہم سبھوں نے مِل کے دفنایا نہیں تھا کیا تمہیں
لیکن اے یعقوب! تم زندہ ہو اور زندہ رہو
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
اور تم احمد جلیل
اے ادیبِ بے عدیل
میرے ساتھی! میں نے دیکھا اپنی آنکھوں سے تمہیں مرتے ہوئے
اور لوگوں کو تمہاری لاش کو تابوت میں دھرتے ہوئے
اور شدت سے مجھے، احساس یہ ہونے لگا
اپنے قد سے تو تمہیں تابوت بھی چھوٹا مِلا
نیچے رکھ دو چھیڑتے ہو میری اس بوتل کو کیوں
ہیں تمہاری وہ بُری عادات اب تک جُوں کی تُوں
نشہ آور شے نہیں
یہ دَوا ہے مے نہیں
زندگی کی تلخیوں کو بھُول جانے کے لئے
دَرد کی بڑھتی ہوئی شِدّت گھٹانے کے لئے
چاکِ دل سیتے تھے تم
کس قدر پیتے تھے تم
مار ڈالا تھا تمہیں گردشِ آلام نے
لیکن اب زندہ کھڑے ہو تم بھی میرے سامنے
آؤ آؤ میرے پاس آؤ میرے پیارے جلیل
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
اور اپنے شعر میں باافتخار و باجلال
کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال

"عادل و مُنصف ہے کتنی موت کی خُونیں نظر
ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر"
تم اے ہاشم کس لئے حیران ہو
کیا نہیں تم جانتے اُس شاہ کو
چند سکّوں چند لقموں کے لئے
مر گیا جو کوئلے ڈھوتے ہوئے
اور اپنے شعر میں باافتخار و باجلال
کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال
"عادل و مُنصف ہے کتنی موت کی خُونیں نظر
ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر"
اور تم یعقوب! اے بھائی مرے
آج یُوں خندہ بلب ہو کس لیے
کب ہوئے تھے شادماں تم زندگی میں اسطرح
مُسکراتے تھے کہاں تم زندگی میں اس طرح
اور تم احمد جلیل
اے ادیبِ بے عَدیل
چھوڑ دو بوتل دَوا کی چھوڑ دو
اپنے غصّے کی کلائی موڑ دو
اب یہ غصّہ کام آ سکتا نہیں
کیونکہ مجھ کو ہے یقیں
عادل و مُنصف ہے ظالم موت کی خُونیں نظر
تم تقاضا کر رہے ہو میرے ساتھی کیوں مگر
"کس لئے تخصیص ہے یہ موت ہی کے واسطے
زندگی بھی خُوگرِ انصاف ہونی چاہیئے"
اور اپنے شعر —— چھوڑو خیر اب یہ داستاں
یہ مگر کیا جا رہے ہو سب کے سب اب تم کہاں
مجھ سے کیا ناراض ہو اے دوستو!
جا رہے ہو کیوں رُکو اے دوستو! ▲

دانش فرازیؔ

اَن گنت رُوپ کوئی رُوپ نہیں

لوگ کہتے ہیں تو کہتے ہوں گے
وقت ہے چارہ گرِ دردِ مسیحِ دَوراں
وقت بھر دیتا ہے ہر سینۂ صَد چاک کے گھاؤ
وقت اشکوں کے سمندر کو بھی پی لیتا ہے

ہر نفس گردشِ ایام کے آئینے میں
وقت کے رُوئے نگاریں کا ہے اِک عکسِ لطیف
اور یہ عکس جو با وصفِ غبارِ مہ و سال
جلوہ ساماں ہے، درخشاں ہے جواں ہے اب تک
اَن گنت رُوپ تو رکھتا ہے کوئی رُوپ نہیں
وقت کا قافلۂ برق خرام
گُلِ نغمہ بھی ہے آواز کا سایہ بھی ہے آواز بھی ہے

لوگ کہتے ہیں تو کہتے ہوں گے
لوگ کیا کچھ نہیں کہتے اے دوست !
آمرے ساتھ ذرا دیکھ سُلگتے ہوئے ٹیلوں سے پرے
ایک میداں کے قریب
وقت کی لاش پہ منڈلاتے ہیں گِدھ
سُرمئی شام کے گہرے سائے
اپنے برگشتہ مقدر پہ لہو روتے ہیں

چند بے حس سی چٹانوں کی فصیلوں میں خموش
زندگی اپنے گریباں کی طرف دیکھتی ہے
اور ہر تارِ گریباں سے اُلجھ جاتی ہے حسرت سے نگاہ
آنکھیں روتی ہیں تو روتی ہی چلی جاتی ہیں
درد بڑھتا ہے تو درماں نہیں ہونے پاتا
نبض رُکتی ہے تو رُکتی ہی چلی جاتی ہے

عبدالعزیز خالدؔ

مُعتمدؔ[1]

ہے مرقدِ افسردہ کس آشفتہ جگر کا — اے وادیِ اغمات! یہ نیلوفری تخت؟

سیراب کرے تجھ کو سحابِ سحر و شام — اِس خاک میں خوابیدہ ہے اِک مردِ گزیدہ

وہ فارسِ میداں، گُلِ ایوان و شبستاں — جو بادشہِ سلطنتِ سیف و قلم تھا

گھولے مئے سرجوش میں جو لعل و زُمُرّد — وہ شیفتۂ شعر و ربابؔ و رُخِ رعنا

دوشیزۂ دہقاں تھی رمیکیہ کہ جس کو — اِک مصرعِ برجستہ نے شہ بانو بنایا

زنجیر کی جھنکار ہے آوازِ جرس ہے — زنداں کے دَر و بام سے اُٹھتا ہے دُھواں سا

مے اس کی ہے آمیختۂ زہرِ ہلاہل — دلکش ہے مگر فانی و غدار ہے دُنیا

ہے ذوقِ خودی حُسن کی شلتاقی و شوخی — کیوں پردے میں رُوپوش رہے طلعتِ غرّا

مُحِ خوابِ خوش آیند نہیں عہدِ غوانی — محزون و مولّہ ہے عبث عاشقِ اَبلہ

کرتے ہیں جُدا اُن سے سر سرمد و حلّاج — کہتے ہیں اسے رسمِ مواخات و مواسا

اِک شورِ قیامت ہے بپا کوئے جنوں میں — سُنتا ہے یہاں کون دلِ زار کا نالہ

کیوں معتمدِ خستہ سے اس کو نہ ہو اُلفت

ہم پیشہ تھا وہ خالدؔ آشفتہ نوا کا

[1] معتمد بن معتضد بن اسمٰعیل اندلسی (بنی عباد کا آخری شاعر فرمانروا ۱۰۴۰ء ، ۱۰۹۵ء)، جو یوسف بن تاشفین (چشم و چراغ مرابطین، ملک بادیہ) سے شکست کھا کر اقش کے مقام اغمات میں چار سال قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر وہیں پیوندِ خاک ہوا۔

مغنی تبسم

بے نشاں

بات یُوں ختم ہوئی
درد یُوں ڈُوب گیا جیسے کہ ساحل ہی نہ تھا
سارے الطاف وکرم بھُول گئے
جور فراموش ہوئے
رات یُوں بیت گئی جیسے کہ نکلا ہی نہ تھا
مطلعِ شوق پہ وہ ماہِ تمام
اشک یُوں سُوکھ گئے جیسے کہ دامن میرا
اس کا آنچل تھا
وہ پیمانۂ ناز
جانے گردش میں ہے یا ٹُوٹ گیا

میں زمانے کے کنارے یُوں کھڑا ہوں تنہا
جیسے اِک جست لگا ہی دُوں گا
اور کل بادِ سحر
یُوں مِٹا دے گی ہر اِک نقشِ قدم
جیسے اِس راہ سے پہلے کوئی گذرا ہی نہ تھا!

حکیم یُوسف حسین خاں

حادثہ

چلتے چلتے رُکی نسیمِ سحر
خم ہوئی شاخِ گُل کماں کی طرح
پھُول کا سر جھُکا تو اِک تتلی
حسنِ محبُوب چُومنے کے لئے
چھُپکے چھُپکے بڑھی گماں کی طرح

رُکتے رُکتے چلی نسیمِ سحر
تشنگی پھر بھی تشنگی ہی رہی!
شاخ لہرا کے دفعتاً لچکی
اور بکھرے پڑے تھے سبزہ پر
اوس کے اشک تیتری کے پَر

شام تک پھُول شاخ پر جھُوما
رات بھر پھُول بے قرار رہا
آخرِ شب ہوئی تو اُس کی بھی
پنکھڑی پنکھڑی زمیں پہ گری
نفسِ گُل کا انتشار ہی کیا
پھُول نے خود بھی خودکشی کرلی!

کیونکہ ہر صبحِ نو جو آتی ہے
تتلیاں اور ساتھ لاتی ہے

ڈاکٹر عزیز تمنائی

گردِ کارواں

آسماں اور خاکداں کے درمیاں
ان گنت زینے ہیں
جن پر مضطرب روحوں کی بکھری ٹولیاں
پیٹھ پر لادے ہوئے پشتارۂ عمرِ رواں
بھر رہی ہیں سسکیاں

سیڑھیوں پر مرتسم
وقت کے نقشِ قدم
کر رہے ہیں رہنمائی دم بہ دم
ہر اشارہ ہے گرفتِ فہم سے باہر ہنوز
ہر نظر مضطر ہنوز

سیڑھیوں کی چھاؤں میں
اک ہجومِ بے قرار
اپنی آنکھوں میں لیے تازہ لمحوں کے شرار
کب سے کوشاں ہے کہ طے کر جائے یہ زینے تمام
زیرِ پائے شوق ہو بالائے بام
ہائے یہ سودائے خام!

کب رکی رفتارِ وقتِ تیز گام؛
خاکداں سے آسماں تک سیڑھیاں
سب اسی رفتار کے دھندلے نشاں
اور ہم محوِ خرام
مثلِ گردِ کارواں! ★

پرکاش ناتھ پرویز

حسنِ خوابیدہ

سو رہی ہے ایک دوشیزہ شبِ مہتاب میں
آہ وہ جسمِ گداز
اس کے روئے دل نشیں پر
چاند کی کرنیں ہیں مصروفِ نماز
چھو رہی ہے گیسوؤں کو پیار سے بادِ لطیف
جو کسی ترتیب سے ہیں بے نیاز
رقص کرتے ہیں فرشتے مسکراتی ہے فضا
گیت گاتی ہے فضا

حسنِ سوگوار

مضمحل آنکھوں میں سائے یاس کے
خشک ہونٹوں پر سکوتِ بیکراں
ہر نظر میں نشترِ غم کی چبھن
ہر نفس میں مضطرب سوزِ ازل
قالبِ انساں میں فانی کی غزل

★

زعفران زار

کوہکن کے قلم سے

شاہد صدیقی مرحوم نے 'کوہکن' کے قلمی نام سے روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد کے 'شیشہ و تیشہ' کے کالم کے ذریعہ طنز و مزاح کی جو گل کاریاں کی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ قارئین کی دلچسپی کے لئے 'زعفران زار' کے عنوان کے تحت ہر ماہ ان کالموں سے اقتباسات پیش کئے جائیں گے

— ادارہ

طرحی غزلیں

۔ "چور اُلٹا کوتوال کو ڈانٹے"

چور اُلٹا کوتوال کو ڈانٹے
سوداگر دلال کو ڈانٹے

طاری ہو جب وَجد کا عالم
ہر سامع قوال کو ڈانٹے

پہلے اپنا ہاتھ دکھائے
پھر فوراً رمال کو ڈانٹے

آئے نہ جب تلوار چلانا
زخمی ہو کر ڈھال کو ڈانٹے

شیر کو سمجھ کر دشمن اپنا
خالی خولی کھال کو ڈانٹے

پھنس جاتی ہے قسمت اس کی
مچھلی کیوں کر جال کو ڈانٹے

چپراسی کو ڈانٹ رہے ہیں
جیسے کوئی کنگال کو ڈانٹے

بوجھ رکھے بازار میں اس پہ
گھر جا کر حمال کو ڈانٹے

وقت ہے اِک طفلِ مکتب کے
نثر لکھے اقبال کو ڈانٹے

٭ ٭ ٭

۔ "حُسن نے جب شکست کھائی ہے"

بس یہی رازِ نارسائی ہے
درِ جاناں پہ اُس کا بھائی ہے

غور سے دیکھ شیخ کی عینک
یہ خریدی نہیں چُرائی ہے

چور تم میری جیب میں آ جائے
میرا حق ہے مری کمائی ہے

جال ڈالا ہے میں نے دریا میں
کسی مچھلی کی موت آئی ہے

میری چوری کُھلے گی اب کیونکر
یعنی ہر چور میرا بھائی ہے

٭ ٭ ٭

چائے پینے کا مزا جاتا رہا
مُلک میں جب سے شکر کم ہوگئی

یہ گرانی اور بارش الاَماں
رفتہ رفتہ زندگی نَم ہوگئی

مِل گئی جواری کی روٹی بھوک میں
اور وہی مُرغِ مُسَلّم ہوگئی

شیخ جی سمجھے مقامِ انکسار
جب بڑھاپے میں کمر خم ہوگئی

قیس کی آہیں پیامِ عقد تھیں
سُن کے لیلیٰ اور برہم ہوگئی

یوسف ناظم (بمبئی)

اورینٹ ہوٹل

پہلے ایک بات سُن لیجئے ——

اِس مضمون کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے شروع سے آخر تک پڑھا جائے، اور تنہا بیٹھ کر پڑھا جائے۔ یُوں بھی کھڑے رہ کر کوئی مضمون نہیں پڑھنا چاہیئے۔ کھڑے رہ کر صرف الجبرا اور منطق پڑھی جا سکتی ہے۔ اِس مضمون کو نہایت پرائیوٹ طور پر خانگی صحبت میں بھی پڑھا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ صحبتِ صالح ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ مضمون اِشتہا انگیز بھی ہو سکتا ہے۔ اِسلیئے موجودہ گرانی کے زمانے میں اِسے بار بار نہ پڑھا جائے۔ یُوں بھی یہ صرف ایک مضمون ہے وظیفہ نہیں۔

اِس کے علاوہ ایک بات اور بھی سُن لیجئے۔ یہ اورینٹ ہوٹل کا اشتہار نہیں ہے اور نہ ہی اس کا قبالہ ہے۔ اورینٹ ہوٹل کا تو بس یُونہی خیال آ گیا۔

پُرانے حیدرآباد میں ایک عزیز کمپنی تھی، اور عزیز کمپنی میں جا کر آئسکریم کھانا، چائے پینا یا گپ اُڑانا، بڑے معرکہ کی بات سمجھی جاتی تھی۔ وہی عزیز کمپنی اب اورینٹ ہوٹل ہے۔ لیکن کیا مجال جو اس کی تعطیلاتی فضا، چھٹیانہ ماحول اور غیر کاروباری آب و ہوا میں کوئی فرق آیا ہو۔ استغنا، بے فکری اور افیونیت کا یہ رنگ، اِس چار دیواری کے سوا شاید ہی کہیں اور ہو۔ اورینٹ ہوٹل میں ہر شخص تجمل حسین خاں نظر آتا ہے۔ تجمل حسین خاں شاعر نہیں تھے۔ اگر وہ شاعری کرتے تو ضرور عیش تخلص کرتے۔ لیکن اُنہیں شاعری کرنے کی فرصت کہاں سے ملتی وہ تو عیش کرتے تھے۔ حیدرآباد کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کا پتہ غالباً یہی ہوٹل ہے۔ جیسے کہ اکثر شہروں میں غریب الوطن لوگ اپنے خط اور منی آرڈر، اُس شہر کے اسٹیشن ماسٹر کے حوالے سے منگواتے ہیں۔

حیدرآباد میں بھی اگر آپ کو کسی ادیب اور شاعر سے ملنا ہو تو آپ بلاتکلف اورینٹ ہوٹل جا سکتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ کیوں نہ اِس ہوٹل کو "دارالمصنفین حیدرآباد" کا نام دے دیا جائے اس طرح ایک طرف تو ایک اعلیٰ درجہ کی انجمن کی بُنیاد پڑ جائے گی

اور دوسری طرف —— پتہ نہیں دوسری طرف کیا ہوگا، کیونکہ یہ ایسی تصویر ہے، جس کا دوسرا رُخ نہیں۔ حالانکہ ہم شروع سے سُنتے آئے ہیں کہ ہر تصویر کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں۔ ویسے آپ ہم سے پُوچھیں تو دو رُخ والی تصویریں ہمیں پسند نہیں۔ تصویر کا ایک ہی رُخ ہونا چاہیئے۔ اور تصویر کسی ماہ رُخ یا کم سے کم لالہ رُخ کی ہونی چاہیئے۔ ایسی تصویروں کو تصویرِ بُتاں کہتے ہیں اور تصویرِ بُتاں کو آپ ایک ہی رُخ سے دیکھتے ہیں۔ اورینٹ ہوٹل کا بھی ایک ہی رُخ ہے۔ سامنے کے بڑے دروازے سے آئیے۔ ایک مرتبہ آجانے کے بعد پھر آپ کے واپس جانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ گھنٹوں یہاں بیٹھیے، ٹھنڈا پانی پیجیے، گرم چائے نوش فرمائیے یا شیرمال اور تاج کباب سے شوق فرمائیے یا پھر خالی بیٹھے رہیے۔ کوئی پُوچھنے والا نہیں کہ بھئی آپ کس مسرت میں یہاں اتنی دیر سے تشریف فرما ہیں۔ سامنے کے دالان میں بیٹھیے یا اندر کمروں میں۔ لاؤنج میں تشریف رکھیئے یا پچھلے کھلے احاطہ میں فضا ہر طرف ایک ہی ہے۔ اس کا بڑا دروازہ صبح ہی سے ادیبوں اور شاعروں پر کُھل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مزدور یونینوں کے لیڈر، نیم سیاسی جماعتوں کے سربراہ، الکشن کے اُمیدوار اخباروں کے کالم نگار، ادبی رسالوں کے مُدیر اور دیگر قسم کے خوش باش لوگوں کو اس ہوٹل کے تمام دروازے خوش آمدید کہتے ہیں۔ کیا تعجب چند دنوں بعد یہاں ادیبوں اور شاعروں سیاستدانوں اور سماجی کارکنوں کی رات میں بھی مُفت رہائش کا انتظام ہو جائے آخر دُنیا کو ترقی کرنا ہی ہے۔ وہ ہاسپٹل کا وارڈ ہو یا ریلوے کا یارڈ، گھر کا دالان ہو یا ہوٹل کا سائبان۔ ان سب مقامات پر آگے چل کر شاعروں، ادیبوں اور ایڈیٹروں ہی کا قبضہ ہوگا یہ طے ہے۔ ادیب اور شاعر عرصہ دراز تک دُنیا کی ناقدری کا شکار رہے ہیں اور اب مستقبل قریب میں ان سب باتوں کا ازالہ ہونے والا ہے۔ کیونکہ صبر کرنا عادت تو ہو سکتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں ہو سکتا۔ ادیبوں اور شاعروں نے کافی صبر کر لیا اور ایک

دن آئے گا، جب اِس ہوٹل پر "بزمِ شعر و ادب" کا بھی بورڈ لگا ہوگا۔

اُن لوگوں کے لئے جو اب حیدرآباد میں نہیں رہتے، اورینٹ ہوٹل بڑی سایہ دار جگہ ہے۔ یہاں وہ سایۂ دیوار بھی مِلتا ہے جس کی تلاش تھکے ماندے عاشقوں کو ہوتی ہے۔ آپ یہاں جائیے اور آپ کا کسی سے تعارف ہو یا نہ ہو، آپ کو یُوں معلوم ہوگا کہ ہر چہرہ جانا پہچانا سا ہے۔ گھنٹوں بیٹھے رہیئے اور مُطلق نہ اُکتائیے۔ کچھ نہیں تو لذّتِ شامّہ تو مُیسر ہی ہوگی۔ اور جب چہرے نظر آئیں گے تو ایک سے۔ ہر چہرہ پر تدبّر اور تفکّر کی چھاپ، بڑے پن کی پرچھائیں۔ پانچ سات آدمیوں کے بیچ میں بیٹھ جائیے تو ایسا معلوم ہو کہ آپ ہر طرف سے گھر گئے ہیں گویا محاصرہ ڈالنا ایسے ہی عمل کو کہا جاتا ہے۔ اور گفتگو کا موضوع شعر بھی ہوگا اور سخن بھی۔ کلچر بھی ہوگا اور فوا کہات بھی، سیاسیات بھی اور صنعتیات بھی، قوم بھی اور ذاتیات بھی۔ مختلف اور مخالف نقطۂ نظر، خیالات کا یہ مکسچر، نہایت مُفرّح مانا گیا ہے۔ اور اورینٹ ہوٹل میں دن رات سربراہ ہوتا ہے، جیسے برما شیل کے پٹرول پمپ سے گیس۔ مشہور یہ ہے کہ اورینٹ ہوٹل میں چند مہینے مسلسل بیٹھنے کی ریاضت کے بعد کئی لوگوں کو عملی زندگی میں منصبِ جلیلہ مِل گیا (اِس جلیلہ کا اُس جمیلہ سے کوئی رشتہ نہیں جس کی ڈیوڑھی اب بھی مشہور ہے۔)

اورینٹ ہوٹل میں ہر شخص خلا کا مسافر نظر آتا ہے۔ خروشچیف اگر اورینٹ ہوٹل میں آجائیں تو سمجھیں کہ یہی وہ خلائی اسٹیشن ہے جس کی اُنہیں فکر ہے۔ وہ اِسے دیکھ کر بہت خوش ہوں، اور واپس جانے پر شاید ہی راضی ہوں۔ ہم تو کہتے ہیں اگر اِس ہوٹل میں ایک بال رُوم بنا دیا جائے تو ہم سوکارنو کو بھی آنے کی دعوت دے دیں۔ سُنا ہے کہ وہ ڈانس خُوب کرتے ہیں ہم جب بھی اِن کی ڈانس کے عالم کی تصویر دیکھتے ہیں عش عش کر اُٹھتے ہیں۔ اِس ملک کی خوش نصیبی ہے کہ وہاں کا پریسیڈنٹ

خورڈانس کر سکتا ہے، ورنہ ہم نے دوسرے ملکوں کا حال تو یہی دیکھا ہے کہ پریسیڈنٹ کے اشارے پر دوسرے ناچتے ہیں یہ انصاف نہیں ہے!۔

اورینٹل ہوٹل میں اکثر و بیشتر پائے جانے والے لوگوں کی فہرست بڑی طویل ہے اور اس فہرست کا مرتب نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ لیکن اس ہوٹل کے باشندوں میں بعض کی شخصیتیں بڑی اہم ہیں اور ان کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو ایسا ہی ہوگا کہ کوئی بہت بڑا جلسہ ہوا اور بغیر شکریہ کی رسم کے ختم ہو جائے۔ ان صاحب کا نام میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ یہ بذات خود ایک تاریخ ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ سیکل کی سواری کرتے تھے اور ہر ماہ ایک سیکل گھستے تھے۔ یہ اب تک راز ہے کہ، وہ دوسری سیکل خریدتے کیوں تھے۔ جب حیدرآباد میں سنٹ کی سڑکیں ہر طرف بن گئیں اور سیکل کی سواری آسان ہوگئی تو انہوں نے سیکل چلانا چھوڑ دیا۔ ان کے سب کام اسی ڈھنگ کے ہوتے ہیں۔ اور ہر کام یہ بائیں ہاتھ سے کرتے ہیں۔ پتّے کھیلنا، سگریٹ پینا، کتابیں اٹھانا اور دوسرے خانگی کام بھی در اسی ہاتھ سے انجام دیتے آئے ہیں۔ یہ کوئی پچھلے تیس سال سے عابد روڈ آتے ہیں، اور مغل پورہ واپس جاتے ہیں پھر عابد روڈ واپس آتے ہیں اور مغل پورہ جاتے ہیں۔ دن میں تین مرتبہ آنا جانا مقرر ہے، ریاضی کے ایک شوقین دوست نے ہمیں بتایا کہ اگر پیمائش کی جائے تو یہ صاحب دُنیا کے سب سے بڑے سیّاح ثابت ہوں۔ ہر ماہ تقریباً ساڑھے چار سو میل چلنا وہ بھی صرف ایک اورینٹ ہوٹل کی خاطر، تاریخ عالم کا واحد واقعہ ہے۔ ایسی سخت پابندی اور اتنی شدید وفاداری کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ایسے ہی لوگ تحفۂ روزگار ہوا کرتے ہیں اور انہیں سہل نہیں سمجھا جا سکتا۔

نہایت سُلجھی ہوئی اور عالمانہ گفتگو کرنا ان کی کمزوری ہے بحث بڑی دل جمعی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن غصے میں پہلے آتے ہیں اور بحث بعد میں کرتے ہیں۔ بعض وقت صرف غصے میں آتے ہیں اور بحث مطلق نہیں کرتے، ہم نے کئی مالکوں کو دیکھا ہے لیکن اپنی مرضی کا مالک صرف اِنہی کو پایا ہے۔ ہم نے کئی اولڈ بوائز بھی دیکھے ہیں لیکن اصل اولڈ بوائے یہی معلوم ہوتے ہیں جو اب تک اولڈ نظر نہیں آتے۔ یُوں سمجھئے کہ یہ اولڈ اور بوائے کے درمیان کی کوئی چیز ہیں اور ایسی چیزیں بڑی نادر ہوا کرتی ہیں۔ یہ ایک اَن مِٹ نشان ہیں اور پچھلے تین چار دَہوں کی اَدبی، سماجی اور تہذیبی کارروائیوں کی چلتی پھرتی مثل ہیں۔ ہم اورینٹ ہوٹل جاتے کیوں ہیں؟ یہی مثلیں پڑھنے کے لئے۔ ہمارے لئے تو اورینٹ ہوٹل ریفرنس، لائبریری ہے۔

—ooo—

مجتبیٰ حسین

"کتنے پابندِ وقت ہیں ہم!"

بہت دنوں کی بات ہے کہ ہمیں اپنے ایک دوست کو وداع کرنے کے لئے طیران گاہ جانا تھا۔ طیارہ ٹھیک آٹھ بجے بمبئی روانہ ہونا تھا اور ہم ٹھیک ساڑھے سات بجے ایک بس میں سوار ہوئے۔ اس حسابی مفروضہ کے ساتھ کہ اگر ایک بس تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتی ہے تو وہ طیران گاہ تک دس میل کا فاصلہ یقیناً آدھے گھنٹہ میں طے کرے گی۔ لیکن آپ یقین کریں یا نہ کریں اس بس کو دھکے دیکر اِسٹارٹ کروانے ہی میں پندرہ منٹ ضائع ہوگئے اور بقیہ جو پندرہ منٹ بچ رہے تھے تو ان کا حشر یوں ہوا کہ ہر بس اسٹاپ پر یہ بس ٹھہرتی اور نئے مسافروں کو لے کر آگے کو نکل جاتی۔ ہم نے جو اپنی عمرِ عزیز کے قیمتی لمحات کو یوں ضائع ہوتے دیکھا تو ڈرائیور سے خواہش کی کہ "جناب والا! کیا آپ اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتے" تو وہ بولا۔" قبلہ! میں تو اس سے زیادہ تیز چل سکتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ جب بس کسی اسٹاپ پر رُکتی ہے تو مجھے بس کے ساتھ رُک جانا پڑتا ہے۔" ڈرائیور کا یہ معقول جو سُن کر ہم نے اپنے ہاتھ پر سے گھڑی اُتار لی اور اسے اپ کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور جب یہ بس رُکتے رُکا گاتے بجاتے، کھیلتے کودتے، طیران گاہ پر پہونچی تو معلو کہ ہمارے دوست کا طیارہ نہ صرف روانہ ہوچکا ہے، بلک بفضلِ تعالیٰ بمبئی کی طیران گاہ پر بھی اُتر چکا ہے اور ہمار دوست اس وقت بمبئی کی کسی ہوٹل میں ناشتہ تناول ف رہے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ وقت کی پابند کرنا کس قدر مشکل کام ہے کیونکہ یہ جو قدرت نے آپ وقت کی دولت سے مالا مال کیا ہے تو اس کی حیثیت ا کراسڈ چیک کی سی ہے جسے آپ خود بھنا نہیں سکتے اور نہ اس سے کوئی استفادہ کرسکتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے وقت

سینکڑوں افراد نے قبضہ کر رکھا ہے جو پندرہ منٹ کی دھکم پیل کے بعد اسٹارٹ ہوتی ہے۔ پھر آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ پر وہ مسافرین سوار ہیں جو بظاہر صرف بس میں سوار ہو رہے ہیں۔ آپ کا وقت اس ٹریفک کانسٹیبل کی مٹھی میں بند ہے جو صرف اسٹاپ کی تختی دکھا کر آپ کی زندگی میں سے پانچ منٹ یوں نچوڑ لیتا ہے جیسے آپ لیموں کا رس نچوڑتے ہیں۔ اور جب آپ اپنے وجود کو پانچ منٹوں کے بوجھ سے ہلکا کر کے آگے بڑھتے ہیں تو تب بھی وہ کہتا ہے "صاحب! ذرا موٹر آہستہ لے جائیے، ایسی بھی کیا جلدی ہے"۔ لیکن اسے کون سمجھاتے کہ اس نے ہمیں پانچ منٹ روک کر ہمیں موت سے پانچ منٹ قریب لیجا کر کھڑا کر دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جبکہ ہم وقت کے بڑے پابند تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ آتش جوان بھی نہیں ہوا تھا۔ ہماری پابندیٔ وقت اتنی مشہور تھی کہ لوگ ہماری علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیا کرتے تھے مثلاً ہمیں ادھر چھینک آگئی تو لوگوں نے اُدھر اپنی گھڑیوں میں آٹھ بجا لیئے ہم نے جماہی لی تو لوگوں نے نو بجا لیئے۔ ہم نے انگڑائی لی تو گھڑی کے کانٹے بھی انگڑائی لیکر بارہ کے ہندسے پر ٹھیر گئے۔ ہم نے سڑک پر ٹھوکر کھائی تو لوگوں نے ۹ بجا لیئے اور اگر ہم کبھی ٹھوکر کھا کر سڑک پر گر پڑے تو لوگوں نے کیلنڈر تبدیل کر ڈالے چنانچہ آج بھی بعض ناعاقبت اندیش لوگ ہماری علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیتے ہیں لیکن یہ وقت ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ گھڑیاں بلا وجہ گھڑی سازوں کے پاس بغرض درستگی چلی جاتی ہیں۔

اب ہمارے لئے پابندیٔ وقت اس لئے مشکل ہے کہ ہمارے سوائے اس دنیا میں کوئی بھی وقت کی پابندی کرتا نہیں جاتا۔ ہم ٹھیک چھ بجے بیدار ہونا چاہتے ہیں لیکن ہمیں تو بیدار ہونے کے بعد چائے کی ضرورت ہوتی ہے اور چائے کے لئے دودھ کا ہونا ضروری ہے۔ اب گوالن کے لئے کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ صبح چھ بجے ہمارے لیئے دودھ لے آئے کیونکہ وہ چھ بجے دودھ کیونکر لے آئے گی جب کہ ابھی علی الصبح تو نل بھی نہیں کھلتے۔ سات بجے صبح نل کھلیں گے تو گوالن دودھ نچوڑے گی۔ پھر ساڑھے سات بجے اس میں پانی ملائے گی اور آٹھ بجے دودھ کی بالٹی لے کر اپنے گھر سے نکلے گی۔ اور جب مختلف گھروں کے پھیرے لگاتی ہمارے در غربت پر پہونچے گی تو گھڑی نو بجا رہی ہوگی۔ ہم تو چھ بجے اُٹھنے کے خواہشمند ہیں لیکن محض گوالن کی خاطر ہمیں اپنی عمر عزیز کے تین گھنٹے بستر میں سو کر گزارنے پڑتے ہیں اور ایک معمولی گوالن جب ہمارے چوبیس گھنٹوں میں سے تین گھنٹوں پر قبضہ کر سکتی ہے تو دوست احباب چوبیس گھنٹوں میں سے اڑتالیس گھنٹوں پر قبضہ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں ہم کس منہ سے وقت کا پابند بننے کی کوشش کریں۔

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہماری شادی میں محض قاضی صاحب کی تاخیر سے آمد نے ہماری ازدواجی زندگی کے دو گھنٹے مستقلاً کم کر رکھے ہیں۔ انہی دو گھنٹوں کی تاخیر کے باعث ہم اپنی بیوی کے ساتھ اب وہ دو گھنٹے کبھی نہ گزار سکیں گے جو گزارے جا سکتے تھے لیکن گزارے نہ گئے۔ غور فرمائیے تو ان دو گھنٹوں کا خسارہ ہماری ازدواجی زندگی کا ایک لازمی جز بن گیا ہے۔ کیونکہ ہمیں ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ اگر قاضی صاحب نے تاخیر نہ کی ہوتی تو ہم دو گھنٹے پہلے ہی اپنی بیوی سے مل سکتے تھے۔ پھر دو گھنٹے پہلے ہی زندگی میں صاحب اولاد بن جاتے اور پھر عمر کے آخری حصہ پر پہونچ کر دو گھنٹے بعد اپنی بیوی سے رخصت ہوتے۔ بہرحال مستقبل میں جب کبھی ہم اپنی بیوی سے رخصت ہوں گے تو یہ قلق رہے گا کہ کاش ہم مزید دو گھنٹے اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ گزار سکتے۔

سچ پوچھئے تو ہم نے جب بھی وقت کا پابند بننے کی کوشش کی تو ہم پر بُرا وقت آن پڑا۔ اور آج ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے وقت کا پابند بننے کی کوشش میں وقت کو بے دریغ نہ کیا ہوتا تو آج ہم بھی کچھ کام کے آدمی ہوتے

...ضائع کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہمیں یاد ہے کہ ہم نے میٹرک کے امتحان کی تیاری کے لئے
...ٹائم ٹیبل مرتب کیا تھا وہ خود ایک مہینہ کی لگاتار محنت اور جانفشانی
...سے تیار ہوا تھا اور جب امتحان قریب آیا تو پتہ چلا کہ جب تک
...ٹائم ٹیبل پر عمل نہیں ہو پاتا اس وقت تک ہم امتحان میں شریک
...نہیں ہوسکتے۔ اس کے بعد سے پابندی وقت سے اتنی نفرت ہوگئی
...زندگی میں انٹرمیڈیٹ کی بس دو سال لیٹ پہنچی۔ اور بی۔ اے
...کا امتحان تو مکمل تین سال تک امتحان ہال میں نقل مار نے کے
...بعد کامیاب کیا۔

لیکن اب ہمیں وقت کی پابندی کا خیال اس لئے نہیں آتا
...کہ ہم نے ہم سے کہیں بڑے "بے نیازانِ وقت" دیکھے ہیں۔ مثلاً
...ایک دن ہم اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے سہ پہر میں ساڑھے
...تین بجے ان کے دفتر پہنچے۔ چپراسی سے پوچھا تو وہ بولا:
"حضور! صاحب موجود نہیں ہیں کیونکہ وہ ذرا دیر سے
...آتے ہیں۔"

...بتایئے، ساڑھے تین بجے دفتر آنے کو "کیا ذرا دیر سے دفتر
...آتے ہیں"۔ اس پر ہم نے کہا اچھا جب تمہارے صاحب آئیں
...تو کہہ دینا کہ ہم تھوڑی دیر بعد پھر آئیں گے۔ اس کے بعد ہم تھوڑی
...دیر تک ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے وقت کو برباد کرتے رہے
...اور جب ساڑھے چار بجے دوبارہ اپنے دوست کے دفتر پہنچے
...تو چپراسی کہنے لگا۔ "حضور! صاحب تو آئے تھے لیکن آپ نے کافی
...دیر لگا دی۔ کیونکہ وہ تو دفتر سے ذرا جلدی گھر واپس چلے جاتے ہیں"
...آپ ہی بتایئے کہ ہم وقت کی پابندی کریں تو کیونکر کریں۔

ایسے موقعوں پر ہمیں رہ رہ کر اپنی بیٹی راشدہ کا ایک
...جملہ یاد آتا ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ہم ایک دن بیٹی کو "وقت کی
...قیمت" والا سبق پڑھا رہے تھے۔ ہم نے اسے سمجھانے
...کے لئے کہا۔ "بیٹی! گراہم بیل کو تم نہیں جانتیں وہ ٹیلیفون کا موجد
وہ وقت کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ
بھی ضائع نہیں کیا اور وقت کی اسی پابندی کا نتیجہ ہوا کہ اس نے
ایک دن ٹیلیفون ایجاد کر لیا۔ بس بیٹی تمہیں بھی وقت کی قدر
کرنی چاہئے"۔ ہماری نصیحت کو سن کر راشدہ نے پٹاخ سے
کہا۔ "ابا جان! اب میں وقت کی پابندی کر کے کیا کروں جبکہ
گراہم بیل نے ٹیلیفون ایجاد کر کے میرے لئے ٹیلیفون کو دوبارہ
ایجاد کرنے کا کوئی موقعہ نہیں رکھ چھوڑا ہے۔ بس اسی بات پر
مجھے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دیدیجئے"۔ راشدہ
کا یہ جملہ ہمارے دل پر نقش ہے اور سچ پوچھئے تو ہم اس کے سہارے
اپنی ساری زندگی کو ضائع کر رہے ہیں۔ اب تو ہم نے اپنے ہاتھ
پر گھڑی لگانی بھی چھوڑ دی ہے، کیونکہ ہم جدید فیشن کے سخت مخالف
ہیں، البتہ گھڑی سازوں سے ضرور یہ عرض کریں گے کہ قبلہ! جب فیشن
کی خاطر گھڑیاں بنانا ہی مقصود ہے تو ان میں منٹوں اور گھنٹوں کے
کانٹے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی بجائے اگر ڈائیل میں کسی
خوبرو اداکارہ کی تصویر لگا دی جائے تو وقت کافی آسانی سے کٹ
سکتا ہے۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے پاس
اب منٹوں اور گھنٹوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے وقت کی کوئی،
اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ مثال کے طور پر پرسوں ایک صاحب نے
ہم سے پوچھا "صاحب! آج کونسی تاریخ ہے؟" ہم نے کہا "آج آٹھ
تاریخ ہے"۔ بولے "کونسے مہینے کی آٹھ تاریخ ہے؟" کہا "اگست کے
مہینے کی"۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ "اگست کا مہینہ کونسے سن کا؟" ہم نے
کہا "سنہ ۶۴ء کا اگست"۔ بولے "کونسی صدی کا ۶۴واں سن؟"
ہم نے کہا "بیسویں صدی کا ۶۴واں سن"۔

اس پر ان صاحب نے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔
"معاف کیجئے، میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا ہے"۔
غرض جب لوگوں کو صدیوں میں پھیلے ہوئے وقت کی کوئی قدر
نہیں تو پھر وہ منٹوں اور گھنٹوں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے
وقت کی کیا قدر کریں گے؟

بہرحال وقت ایک ایسا معمّہ ہے جو ہمارے وجود کو بڑھا بھی رہا ہے اور گھٹا بھی رہا ہے اور وقت کی اسی دھوکہ دہی کے سلسلہ میں شاعر نے عاجز آ کر کیا خوب کہا تھا ؎

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے "

شیشہ و تیشہ

شاہد صدیقی کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب

مرتبہ : مجتبیٰ حسین

اُردو کے صاحب طرز ادیب اور ممتاز شاعر شاہد صدیقی مرحوم، کرکن کے قلمی نام سے طویل عرصہ تک روزنامہ سیاست حیدرآباد کا مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ ان کے انہی جاندار اور مقبول عام کالموں کا انتخاب ساہتیہ اکیڈیمی آندھراپردیش نے شائع کیا ہے۔

"..... جب آپ شیشہ و تیشہ کے کالموں کا یہ منتخب مجموعہ پڑھیں گے تو اس جیتے جاگتے زندہ دل شاہد سے ملیں گے جو مرا نہیں ...." مخدوم محی الدین

ضخامت ۲۴۰ صفحات — — — — — — — — — قیمت (۳) تین روپے

اکیڈیمی کی — دیگر — اُردو مطبوعات

۱۔ حیدرآباد کے شاعر — (جلد اوّل) — مرتبہ : خواجہ حمید الدین شاہد ؛ قیمت غیر مجلد — چار روپے
۲۔ حیدرآباد کے شاعر — (جلد دوم) — مرتبہ : سلیمان اریب ؛ قیمت غیر مجلد — پانچ روپے
۳۔ حیدرآباد کے ادیب — (دو جلدوں میں) — مرتبہ : زینت ساجدہ ؛ قیمت فی جلد — چار روپے
۴۔ [illegible] افسانے — مترجم : دامشرمتی ؛ قیمت — تین روپے

ملنے کا پتہ : آندھراپردیش ساہتیہ اکیڈیمی ۔ تلک روڈ ۔ حیدرآباد

اُدبی ذوق کی آسودگی کے لئے حیات آمیز اور حیات آموز کتابوں کے مطالعہ کی یقیناً ضرورت ہے
اس کیلئے جنوبی ہند میں شعر و ادب کی بیش بہا کتابوں کا واحد مرکز

اسلامیہ بک ڈپو کرنول کا نام یاد رکھیے

تماشائی

سنگم — تنقیدی جائزہ

سنگم کسی آرٹسٹ کی ایسی تصویر ہے جسے جتنا دیکھتے جایئے اتنی ہی اس کی خوبیاں ابھرتی جاتی ہیں اور اس کی دلکشی بڑھتی جاتی ہے۔

راج کپور کی فلم سنگم کے متعلق ایک عام تماشائی کی اس رائے سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اتفاق نہ کریں اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ اگر کوئی فلم صنعتِ فلم سازی کی اقدار پر دوررس اثرات ڈالتی ہے تو اُن کا فوری طور پر اندازہ کرنا ممکن نہیں، البتہ اس فلم کے بعض اہم پہلوؤں کا جائزہ ضرور لیا جا سکتا ہے۔

کسی بھی فلم کے لیے کہانی وہی اہمیت رکھتی ہے جو کسی عمارت کے لیے بنیاد کا پتھر۔ اور یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ سب سے زیادہ اختلاف یا متضاد رائے اس فلم کی کہانی کے بارے میں ہی ظاہر کی گئی ہے۔ سنگم گنگا اور جمنا کے ملاپ کا نقطہ ہے جہاں نظر نہ آنے والی ندی، سرسوتی بھی ان میں مل کر الوپ ہو جاتی ہے۔ راج کپور کی فلم بھی کم و بیش علامتی طور پر اسی سنگم کو ظاہر کرتی ہے۔ سندر اور رادھا کے سنگم کے لیے گوپال بھی اپنی قربانی دے کر الوپ ہو جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک لڑکی اور دو لڑکوں کے درمیان محبت کے روایتی مثلث کی داستان معلوم ہوتی ہے لیکن اس کہانی میں دوستی اور قربانی محبت اور وفا کے جذبے کا جو (UNDER CURRENT) ہے وہ بڑی گہرائی لیے ہوئے ہے۔ اس فلم کا ہر کردار اپنی جگہ مکمل ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ "سنگم" چار گھنٹے طویل ہونے کے باوجود کہانی کہیں بوجھل یا سست رفتار بنتے نہیں پاتی۔

سندر ایک کھلنڈرا نوجوان سراپا محبت ہے۔ وہ ایک لڑکی کو دیوانہ وار چاہتا ہے اور محبت ہی کی طرح اس کی بھی آنکھیں نہیں کہ وہ یہ دیکھ سکے کہ اس کا دوست گوپال بھی اسی لڑکی سے محبت کر سکتا ہے۔ محبت کی طرح اس کی بھی ہٹ ہے اور اسے اپنے جذبے پر پورا اعتماد ہے اور وہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے بھی اس اعتماد کے سہارے کہتا ہے "میں واپس آؤں گا" کہتے ہیں کہ بڑے سے بڑا پہاڑ اور بڑے سے بڑا طوفان بھی محبت کی راہیں نہیں روک سکتا۔ اسی طرح کوئی پتھر سندر کی راہ کا روڑا نہیں بن سکتا وہ آگ اور خون کے دریاؤں کو پھلانگتا ہوا رادھا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جس کے دل کے پاس ہی اس کی منزل مقصود ہے۔ سندر کا یہ کردار کتنا بھرپور ہے اور محبت یا عشق کے جذبۂ بے اختیار کو کتنی خوبی سے واضح کرتا ہے؟ اس فلم کا دوسرا کردار گوپال ہے، خاموش سنجیدہ طبیعت نوجوان، جو دوستی کے لیے چپ چاپ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ یہ کردار دوستی، بے لوث و بے غرض دوستی کا ایک سمبل ہے اپنے دوست کے لیے وہ سب سے پہلے اپنے پیار کی قربانی دیتا ہے اور اس کے بعد اپنی جان بھی دوستی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ دوستی اور قربانی کی لازوال اقدار کی نمائندگی کرنے والا یہ ممکن ہے کہ آج کی دنیا میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے لیکن اس کا تصور کتنا حیات بخش ہے، ایک مغربی نقاد نے ہندوستانی فلموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان میں بے جان اور مردہ اقدار کو پیش کیا

ی ساری گرہ بندی جاتی ہے بے لوث دوستی اور قربانی کا یہ علامتی کردار یاسی تنقید کا جواب ہے۔ لیکن مغرب میں جہاں زندگی میکانکی اور ی سانچوں میں ڈھل چکی ہے، ایسی (Abstract) لیکن زندہ و ک قدروں کی نمائندگی کرنے والے اس کردار کی گہرائی و معنویت کو شاید ی طرح سمجھ نہ سکے۔ سنگم کا تیسرا کردار رادھا کا ہے، ایک عام ہندوستانی کی کا کردار۔ وہ گوپال سے محبت کرتی ہے، لیکن اونچی سوسائٹی کی ایک د ہونے کی وجہ سے سندر سے بھی ربط ضبط رکھتی ہے وہ سندر کی دوست ہے رکبھی کبھار دل بہلائی و تفریح کے لیے اس کے کھلنڈرے پن سے لطف اندوز ی ہوتی ہے۔ جب سندر اس سے اپنی حد جاننا چاہتا ہے تو وہ اسے ٹال تی ہے اور پھر حالات کے ایک موڑ پر وہ سندر کی بیوی بن جاتی ہے آگ کے گرد شادی کے پھیرے لگاتے ہوئے وہ اپنا ماضی بھی اس آگ کی نذر کر تی ہے یہ ایک عام ہندوستانی لڑکی ہی تو ہے جو اپنی ناکام محبت کا درد پنے سینے میں چھپائے چپ چاپ اپنے شوہر کے ساتھ چلی جاتی ہے ور جب ایک بار وہ اس انجانے مرد کو اپنا شوہر مان لیتی ہیں تو اسے دیوتا کا درجہ دے دیتی ہیں۔ رادھا بھی سندر سے محبت نہ کرنے کے باوجود سے اپنا شوہر اور دیوتا مان لیتی ہے۔ سنگم میں رادھا کا کردار شادی سے پہلے ایک عام دولت مند لڑکی اور شادی کے بعد ایک شوہر پرست ہندوستانی بیوی کی علامت ہے۔ اس کے باوجود رادھا کے کردار میں کوئی تضاد کوئی کھوٹ یا دھوکہ نہیں، وہ جانتی ہے کہ اس کی محبت گوپال ہے چنانچہ سندر کی بیوی بننے کے بعد بھی وہ اپنی اس محبت سے مسلسل لڑتی رہتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیتی بلکہ گوپال سے صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ "وہ اس کی زندگی سے چلا جائے۔ ورنہ اس کی ایک نگاہ ساری کہانی کہہ دے گی" رادھا کی یہ التجا محبت کو ایک مجبوری سمجھنے والی لڑکی اور شادی کو دھرم سمجھ کر اس کا پالن کرنے والی بیوی کی داخلی کشمکش کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ ابھارتی ہے۔

سنگم کی کہانی اور اس کے کردار ہیں۔ لیکن اس کی کہانی اور کرداروں کو صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے اور پردۂ سیمیں پر پیش کرنے میں بڑا فرق ہے،

فلم میں کرداروں کے ذہنی ہیجان اور بدلتی ہوئی کیفیتوں کو واضح کرنے کئی صفحات نہیں لکھے جا سکتے۔ فلم کے لیے واقعات کا تانا بانا ایسا ہونا ضروری ہے جس میں ہر کردار مقررہ (footage) میں اپنے آپ کو واضح کر سکے اور کہانی کے واقعاتی بہاؤ پر بھی اثر انداز نہ ہو، یہ دشوار کام منظر نامہ لکھنے والے کا ہوتا ہے۔ سنگم کا منظر نامہ اندر راج آنند نے لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سنگم اندر راج آنند کی کافی پرانی کہانی ہے۔ اور اس کو راج کپور نے اپنی پہلی فلم "آگ" کے بعد ہی "گھروندے" کے نام سے فلمانے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود اس کہانی کو فلمانے کا خیال راج کپور یا اندر راج آنند کے ذہن سے کبھی جدا نہ ہو سکا اور جب اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو اندر راج آنند نے اپنی پوری صلاحیتیں اور ذہانت صرف کر کے اس کا منظر نامہ تیار کیا اور مکالمے لکھے۔ کسی بھی فلم میں اس کے منظر نامے کی تیاری اور مکالمے ہی سب سے نازک مرحلہ ہوتے ہیں۔ اندر راج آنند نے جہاں اپنے منظر نامے کے ذریعے بولتے ہوئے کردار تخلیق کیے ہیں، انھوں نے کہانی کے ڈرامائی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ سنگم کا ہر کردار بڑے سلیقے سے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے واقعات بڑے فطری اور منطقی بہاؤ کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ سنگم کا تماشائی ابھی سندر کے کھلنڈرے پن اور گوپال کی سنجیدگی کا پہلو ہی دیکھتا ہے کہ سندر گوپال کو رادھا سے اپنی محبت کی کہانی سناتا ہے۔ اور گوپال اس کی وارفتگی کو دیکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اپنی محبت کی قربانی دے دیتا ہے۔ یہ کہانی کا پہلا ڈرامائی موڑ ہے۔ اور اس کے بعد (۴۰۰ ۶) فٹ کی فلم ختم ہونے تک ایسے کئی ڈرامائی موڑ آتے ہیں اور کہانی سرعت کے ساتھ نقطۂ عروج (climax) کی سمت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ نقطۂ عروج فلم کا آخری منظر ہے ——— جہاں فلم کے تینوں کردار ایک دوسرے کے سامنے عیاں ہو جاتے ہیں۔ کوئی راز راز نہیں رہتا۔ اس طرح اندر راج آنند نے فلم میں سسپنس کا ایسا عنصر بھی برقرار رکھا ہے، جو تماشائی کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ہر فلم میں کسی نہ کسی حد تک شامل ہونا ضروری ہے۔

سنگم کے پردے پر پیش کیے گئے ہوئے مناظر بھی، جنہیں بعض حلقوں میں فلم کی طوالت کا ایک سبب اور غیر ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ در اصل کہانی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ علاوہ رادھا کو روم، لندن اور پیرس گھمانے اور انجانی دنیاؤں کی سیر کروانے کے لیے سندر کی خواہش کو ظاہر کرتے ہیں، وہیں یہ مناظر ہندوستانی ازدواجی زندگی کے بعض دلچسپ پہلو بھی پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی وہ مخصوص شرم و حیا جو پیرس کے ایفل ٹاور میں دنیا والوں کی نگاہوں کے سامنے شوہر کو بیوی کا بوسہ لینے سے روک دیتی ہے اور ہندوستانی بیوی کا "گھر کی مالکہ" والا وہ انداز جس کے سہارے وہ اپنے شوہر کو اپنے لیے قیمتی بٹوہ خریدنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔۔ اور پھر آخر میں شوہر کے لیے بیگ پائپ خرید لاتی ہے۔ چھوٹا سا واقعہ رادھا کے کردار کا یہ پہلو بھی ظاہر کرتا ہے کہ سندر کی بیوی بن جانے کے بعد اب وہ اس کی وفادار ہے اور اس سے اپنا حق بھی مانگنا چاہتی ہے اور حکم بھی چلانا چاہتی ہے۔

ان زندہ و متحرک کرداروں اور پُر اثر کہانی کی بنیاد پر راجکپور نے "سنگم" کی جو عمارت تیار کی ہے اس میں مکالموں نے بھی ایک اہم ستون کا کام انجام دیا ہے۔ سنگم کا کوئی کردار اپنے اظہار میں (Loud) نہ ہونے کے باوجود پوری طرح واضح ہے اور اس کام میں اندر راج آنند نے کہانی کے واقعات کے علاوہ مکالموں سے بھی پوری مدد لی ہے۔ یہ مکالمے کرداروں کے درد کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور ان کی مسرتوں کو بھی، ان کے ذہنی کرب کو بھی اور ان کی گہری محبت کو بھی۔ ان مکالموں کے ذریعے کرداروں کو تقریر کل نہیں بنایا گیا۔ بلکہ ہر کردار کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتا ہے۔ سادگی اور برجستگی ان مکالموں کی خصوصیت ہے: "روئیں تو یار کے کندھے اور جائیں تو یار کے کندھے" جیسے چھوٹے موٹے فقرے ہوں یا آخری مناظر کے ۔۔۔۔ نہایت جذباتی مکالمے، اندر راج آنند نے اختصار اور معنویت کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے وہ اپنے مکالموں یا واقعات کے ذریعے سستی جذباتیت پیدا کر کے کسی کردار کے لیے تماشائیوں کی ہمدردی نہیں حاصل کرتے بلکہ پوری کہانی کا ماحول ایسا بناتے ہیں کہ تماشائی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس فلم کے کامیاب اور معیاری ہونے کی سب سے بڑی کسوٹی شاید یہی ہے کہ چار گھنٹے طویل فلم میں صرف تین کردار ہونے کے باوجود تماشائی کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ طویل فلمیں بنانے کے تجربے اس سے پہلے بھی کیے گئے ہندوستان میں بھی اور باہر بھی۔ لیکن ان کے لیے وسیع ترین منظر، تاریخی واقعات یا متعدد کرداروں والی کہانیاں منتخب کی گئیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ صرف تین کرداروں کو لے کر اتنی طویل فلم بنائی گئی۔

کہانی، منظرنامہ اور مکالمے لکھنے والے کا کام جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے فلم ساز اور ہدایت کار کی اصل ذمہ داری شروع ہوتی ہے۔ سنگم کی اس کہانی کو سیلولائیڈ پر منتقل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے بڑا جاندار تخیل، گہری جمالیاتی حس اور فنکارانہ نقطۂ نظر رکھنے والے کسی ماہر (Craftsman) کی ضرورت تھی۔ راج کپور نے برسوں کے انتظار کے بعد جب یہ فلم بنائی تو اس نے اپنے تمام تجربات اور صلاحیتوں کا نچوڑ اس میں پیش کر دیا ہے۔ فلم کے ابتدائی حصے میں بچوں کے کھیلنے کے منظر سے لے کر آخر میں گوپال کے خودکشی کرنے کے منظر تک، ہر اینچ پر پوری توجہ اور لگن کے ساتھ محنت کی گئی ہے۔ رادھو کرماکر کی بے مثال فوٹوگرافی کے قطع نظر، خود راجکپور نے جن زاویوں سے کیمرے کو استعمال کیا ہے۔ جن طریقوں سے واقعات کو پیش کیا ہے اور ہر واقعہ کے لیے جو مخصوص فضا تیار کی ہے، وہ ایک کارنامے سے کم نہیں۔ پارٹیوں اور دعوتوں کے مناظر اس سے پہلے کئی فلموں میں پیش کیے جا چکے ہیں، لیکن سنگم میں گوپال کی لندن سے واپسی پر پارٹی کا جو منظر فلمایا گیا ہے وہ ان سب سے مختلف ہے۔ اس موقع پر بھی تینوں کردار یکجا ہوتے ہیں اور ہر کردار اپنا گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ اکارڈین بجانے والا سندر جب پیار کرنے والے دل کا گانا سناتا ہے تو رادھا اور گوپال بھی اس کا ساتھ دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد جب اسی موسیقی کی دھن پر رقص شروع ہو جاتا ہے گوپال اور رادھا کے رقص اور اس پر سندر کے ردعمل کو نہایت فنکارانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے [illegible]

گرپال کو رادھا کے ساتھ رقص کرتا دیکھ کر مسرور ہے لیکن جب وہ رادھا کو بھی ویال کی باہوں میں مسرور دیکھتا ہے تو خود اس کی روح اس کے کان میں ل اٹھتی ہے۔ وہ ایک کرب و اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اکارڈین بجائے جاتا ہے۔ دل میں درد اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے تنہا رقص کرنے والے سندر کا چہرہ اس ایک لمحے میں سینکڑوں ہی درد بھری کہانیاں سنا دیتا ہے۔ اس موقع پر کیمرہ بھی پیچھے حرکت کرتا ہوا سندر کے چہرے پر کچھ دیر کے لیے رُکتا اور پھر وسیع تر ہال میں رقص کرنے والے مسرور جوڑوں کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح زندگی میں آنسوؤں اور قہقہوں کا تضاد ایک ہی منظر میں واضح ہو جاتا ہے۔ راج کپور نے اوٹی سے لے کر لداخ و نیفا تک اور پیرس و روم سے لے کر لندن تک کا سفر یوں ہی باکس آفس کے لیے نہیں کیا۔ اوٹی میں اور اس کے بعد آلپس کی برفانی چوٹیوں کے دامن میں جو دو گانے فلمائے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آرٹ ڈور کے ان (Locales) سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے

جشن جمہوریہ کے مناظر جنہیں بہتر سے بہتر طریقے پر فلمانے کے لیے راج کپور نے اپنے دو سال صرف کیے ذہانت کے ساتھ کیمرہ استعمال کرنے کی ایک مثال ہیں۔ اوپر سے لیے ہوئے ان مناظر میں مارچ پاسٹ کرتی ہوئی گزرنے والی افواج کو پیش کرنے کے بعد کیمرہ، فضاؤں میں پرواز کرنے والے ان طیاروں پر جم جاتا ہے جو سندر اور اس کے جملے "میں واپس آؤں گا" کی یاد دلاتے ہیں۔ ہدایت کار کی حیثیت سے راج کپور نے پورے فلم کے لیے ایک شاندار فضا تخلیق کی ہے۔ اس نے جہاں فلم کے جذباتی پہلو کو کمزور ہونے نہیں دیا وہیں اپنی مزاح کی حس کا بھی خوب استعمال کیا ہے تین نہایت جاندار کرداروں میں تین بڑے اداکاروں سے اتنے ٹھہراؤ اور اعتدال کے ساتھ کام لینا شاید اسی کا حصہ تھا لیکن راج کپور کا کام یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ فلم کی موسیقی، فوٹوگرافی، صدابندی، ایڈیٹنگ غرض ہر شعبے پر اس نے محنت کی ہے لیکن ان تمام پہلوؤں کا اس مختصر سے مضمون میں جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔ ●●

عکسِ [illegible]

الطاف شہیدی۔ پاکستان [illegible]

"گرامی نامہ باعثِ [illegible] ہوا اور ماہنامہ پونم بھی
آپ کی مساعیِ جمیلہ قابلِ تحسین [illegible] ارشاد کے مطابق ایک
تازہ غزل ارسالِ خدمت ہے۔"

سید حرمت الاکرام۔ مرزا پور

"میری نظر میں یہ بڑی خاص بات ہے کہ "پونم" کی اشاعت میں
پابندیِ وقت کا لحاظ کافی رکھا جا رہا ہے جس سے اُردو کے بیشتر ادبی
[illegible] محروم ہیں۔ ساتھ ہی مواد کے علاوہ اس میں ظاہری کشش بھی کم نہیں
اور یہ تمام چیزیں کسی جریدہ کو کاروباری استحکام دینے میں جید معاون
ہوتی ہیں۔ "اُردو شاعری میں نئے تجربے" کا باب وقت کے ایک اہم
تقاضے کی تکمیل کر رہا ہے، اس کے متعلق اَدبی حلقوں کی یہ رائے واقعی
توجہ طلب ہے کہ اس موضوع پر ہندوستان اور پاکستان کے ان شاعروں
سے ضرور لکھوایا جائے جو اس موضوع کے تجربات میں معروف ہیں میں
ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس استدلال سے متفق نہیں ہوں کہ پُرانے
لکھنے والے تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔ کیونکہ اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ
نئے لکھنے والے اس صورت میں جو کچھ لکھیں اُسے "غنیمت" تصور کرتے
ہوئے کوتاہیوں کی جانب سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ البتہ دانش فرازی
نے بڑے کام کی بات کہی ہے کہ تجربے کب تک ہوتے رہیں گے، نیز یہ
کہ کوئی ایسا جدید شاعر ہمارے درمیان موجود ہے جس کے متعلق یہ کہہ
سکیں کہ اس نے عظیم شاعری کی ہے!

پونم کی یہ خصوصیت بھی قابلِ قدر ہے کہ آپ ان شاعروں اور
ادیبوں کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جنہیں دَورِ نَو
نے مطلقاً فراموش کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں
ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ اس ضمن میں اسمٰعیل میرٹھی اور ظریف لکھنوی سے
متعلق مضامین پسند آئے اگرچہ انہیں اور بھرپور انداز سے لکھا جانا چاہئے تھا۔"

پشکر [illegible]

"[illegible] خوبصورت پرچہ آپ [illegible]
سے زیادہ خوبصورت بات تو یہ ہے کہ پرچہ پابندیِ وقت
سے شائع ہو رہا ہے۔ ایک پرچہ کی ساکھ اور وقار کیلئے
یہ بات بہت ضروری ہے۔ پرچہ ظاہری و معنوی خوبیوں
سے مالا مال ہے۔ میری مبارکباد قبول فرمایئے۔ میرا لکھا ہوا افسانہ بہت
جلد کے اندر اندر آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ مطمئن رہیئے۔"

ظ۔ انصاری۔ بمبئی

"جناب پونم آپ عمدہ نکال رہے ہیں، نام کتنا ہی شاعرانہ
سہی، مگر اس کے نام سے اسقدر سنجیدگی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا دیکھیے
کب تک آپ کی ہمت اور جیب ساتھ دیتی ہے! عرفی کا ایک غیر معروف
شعر سناؤں آپ کو؟

منم آں میوۂ او زندہ بہ بستانِ کمال
کہ بہ دست و دہن ذائقۂ ارزاں رفتم

اس میں اُوپر کا مصرعہ مجھ پر راس نہیں آتا، البتہ بند ہو جانے والے پرچوں
میں اتنا لکھا ہے، اتنا چھپا ہوں کہ اب جو خود اپنے مضامین جمع کرنے
بیٹھوں تو وہ ملتے ہی نہیں، اس طرح تاش تاش کر کے میں نے خود کو
یار لوگوں کی بھینٹ چڑھا دیا اور اس کا حاصل چار مجموعے تک نہیں ہیں
اب بھی لوگ مجھے آئینہ عبرت دکھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صبا، آندھرا پردیش
سیاست، دورِ حیات (بمبئی)، محور (دہلی)، شیرازہ (سری نگر)، میں خود
کو کیوں ضائع کرتے ہو، بولیئے کیا کیا جائے؟"

کوثر چاندپوری۔ بھوپال

"پونم کا دوسرا شمارہ وصول ہوا۔ شکریہ۔ پونم کا یہ شمارہ بھی بہت
اچھا ہے۔ آپ اس معیار کو قائم رکھ سکے (اور قائم رکھنے کی کوئی وجہ
نہیں) تو یقیناً یہ پرچہ جلد اُردو کے اچھے رسائل کی صف میں آ جائیگا۔"

Registered with the Registrar of News papers at R. N. No: 8285/64

D. **POONAM MONTHLY** AUGUST
AZAMPURA, HYDERABAD-A.P. 1964

Celebrating our freedom on **15th august**



People Rely upon

zinda tilismath

the unani medicine for cough, cold, fever, cholera & stomach troubles



A.D.V
23.2.83

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

(حسرت موہانی)

MONTHLY

POONAM

HYDERABAD

50. P.

مُدیر ــــ

ناصر کرنولی ایم۔اے عثمانیہ

قیمت فی پرچہ ــــ (۵۰) ــــ پیسے

زرِ سالانہ ــــ (۶) ــــ روپے

ششماہی ــــ (۳) ــــ روپے

بیرونِ ہند سے ــــ (۱۴) ــــ شلنگ

پونم

جلد ــــ (۱)

شمارہ ــــ (۵)

ستمبر ۱۹۶۴ء

کتابت:

محمد عبد السلام خوشنویس

غوث محمد کاتب

غوث الدین کاتب

محمد سبحان کاتب

طباعت:

اعجاز پرنٹنگ پریس - چھتہ بازار - حیدرآباد

فون نمبر: (۳۵۸۶۳)

ترسیلِ زر، خط و کتابت کا پتہ:

ماہنا پونم

16-7-301

اعظم پورہ - حیدرآباد - اے پ

ترتیب

ابتدائی تعلیم اور اُردو ـــــ اداریہ ـــــ ادارہ ـــــ ۳
فانی بدایونی ـــ اپنے فن کے آئینے میں ـــــ مغنی تبسّم ـــــ ۵
پھیرے ـــ ایک رپورتاژ ـــــ (تحقیقی مقالہ) ـــــ شمیم احمد ـــــ ۱۰
اُردو شاعری میں نئے تجربے ـــــ (ہمارے مسائل) ـــــ عمیق حنفی ـــــ ۱۷

غزلیں
ماہر القادری ـــ الطاف مشہدی ـــــ ۲۱
خلیل الرحمٰن اعظمی ـــ حُرمت الاکرام ـــــ ۲۲
ساحر ہوشیارپوری ـــ ضیا فتح آبادی ـــــ ۲۳
علی احمد جلیلی ـــ ثریا محمود نُدرت ـــــ ۲۴
فیروز نظر ـــ شاہد اختر ـــــ ۲۵

افسانے
ممتا کا خزانہ ـــــ صالحہ عابد حسین ـــــ ۲۶
فرشتوں کا جہنّم ـــــ رئیس نجمی ـــــ ۳۴
ایک سوال ـــــ عوض سعید ـــــ ۴۱

نظمیں
"کس می کو ئیک" ـــــ ڈاکٹر سلام سندیلوی ـــــ ۴۵
جذبۂ بیدار ـــــ علامہ بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی ـــــ ۴۶
روشنی کی موڑ پر ـــــ تاج مہجور ـــــ ۴۷
ایک لڑکی ـــــ آفتاب شمسی ـــــ ۴۷
ارادہ ـــــ نصیر پرواز ـــــ ۴۸

طنز و مزاح
ایک خاتون کے پرائیویٹ خطوط ـــــ ماجبہ مہدی علی خاں ـــــ ۴۹
"غذائی ادب" ـــــ (دکنیں) ـــــ تیر انداز ـــــ ۵۲

صنم کدے ـــــ فلمی صنعت اور کالا روپیہ ـــــ اعجاز قریشی ـــــ ۵۹

پونم میں شائع ہونیوالے تمام ادبی نیم ادبی مواد میں نام، کردار، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں، ان کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کیلئے ادارے پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ناصر کرنولی ★ مقام طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد ★ مقام اشاعت: ۱-۳۰-۷-۱۶ اعظم پورہ حیدرآباد ا-پ

اداریہ

ابتدائی تعلیم اور اُردو

● اُردو زبان کی بقا و ترقی کے لئے کئی سال سے کوششیں جاری ہیں، لیکن اس کو آج تک وہ مقام حاصل نہ ہو سکا، جس کی وہ مستحق ہے۔ ہندوستانی دستور کے تحت اُردو کو ایک مُرَوّجہ زبان کی حیثیت ضرور حاصل ہے لیکن اسے وہ مراعات اور قانونی تحفظات حاصل نہیں ہیں جن سے کہ دیگر زبانیں استفادہ کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں اُردو والے ایک دبے ہوئے احساسِ مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اور نتیجتاً ان کی وہ تہذیبی روایات جن کی عکاس اور نمائندہ یہ زبان رہی ہے، پس پُشت پڑ گئی ہیں۔ اور اُردو زبان کی بقا و ترویج سے تعلق رکھنے والے تعمیری اقدامات کی رفتار سست پڑ گئی ہے۔

اُردو زبان کے مسائل اتنے زیادہ ہیں کہ جب تک کوئی باقاعدہ پروگرام مرتب کر کے نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اس کی عملی صُورت گری کی طرف توجہ نہ دی جائے گی، اُردو زبان کا مستقبل خطرات سے دوچار رہے گا۔ موجودہ ناسازگار حالات کی روشنی میں اُردو کی زندگی کے لئے سب سے اہم مسئلہ نئی نسل کی اُردو تعلیم ہے، جب تک نئی نسل کے لئے اُردو میں ابتدائی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوگا، جب تک تحتانوی اور ثانوی مدارس میں مادری زبان میں تعلیم کی سہولتیں فراہم نہ کی جائیں گی، جب تک مُلک بھر میں اُردو مدرسوں کا جال نہ بچھا دیا جائے گا، اس وقت تک اُردو زبان کے مستقبل کے بارے میں اُمید افزا توقعات وابستہ کرنا محض خوش فہمی ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر سال اُردو طلباء کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے، جس کے نتیجہ میں اُردو کلاسوں کی برخواستگی عمل میں آ رہی ہے یُوں تو اس کی مختلف وجوہات ہیں لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر والدین اُردو کے

تعلق سے حکومت کے اعلانات اور اقدامات پر یقین نہ رکھتے ہوئے اس کے مستقبل سے مایوس ہوکر اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اور تلگو میڈیم کے اسکولوں میں شریک کروائے ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس مایوسی کی بڑی وجہ حکومت کے اعلانات کی عملی تصویر ہے، جس سے اُردو زبان کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ان ناانصافیوں کا تعلق راست حکومت سے کم ہے۔ بعض عہدہ دار اپنے عہدہ کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے محض تعصب کی بنا پر اُردو کو نقصان پہونچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں کہیں اُردو کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہو اس کی اطلاع فوری طور پر اُن انجمنوں کو دی جائے جو اُردو کی ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں، تاکہ اس خصوص میں مناسب نمائندگی کا موقع ملے۔ بعض لوگ خود اخبارات سے مرعوب ہوکر محض اپنے ذہنی تحفظات کی روشنی میں اُردو زبان کے مستقبل کے تعلق سے کوئی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں اور انتہائی افسوس اور ہمدردی کے ساتھ اس کا پرچار بھی کرتے ہیں، جس کی بدولت سُننے والوں کے حوصلے پست ہوجاتے ہیں اور ان کے دلوں سے جدّوجہد کا جذبہ مٹنے لگتا ہے اور اُردو کے حق میں کی جانیوالی ناانصافیوں کے ساتھ خاموش سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ اُن احباب کو ہمارا پُرخلوص مشورہ ہے کہ اگر وہ اُردو زبان کے لئے کچھ نہیں کرسکتے تو نہ کریں لیکن اس قسم کی گفتگو سے کم ازکم احتراز کریں جو نقصان رساں ہو۔

● یہ خبر ہمارے لئے موجبِ مسرت ہے کہ جے پور میں اکتوبر میں کُل ہند اُردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آرہا ہے۔ ہم دلی خلوص کے ساتھ کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ نئی نسل کی ابتدائی تعلیم کے لئے، اُردو مدارس کے قیام کے تعلق سے، کانفرنس کوئی باقاعدہ پروگرام مرتب کریگی تاکہ اُردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں ہر سال خاطر خواہ اضافہ ہوسکے۔

● 'پونم' کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ پونم کے معیار کو اس کی خصوصیت بنا دیا جائے۔ لیکن ہماری یہ خواہش اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہے گی جب تک کہ ہمیں اچھے لکھنے والوں کا مستقل قلمی تعاون حاصل نہیں ہوجاتا۔

● بعض اہلِ قلم حضرات معاوضہ کے بغیر لکھنا نہیں چاہتے۔ ان کا یہ مطالبہ یقیناً واجبی ہے۔ لیکن ابھی ہم اس قابل نہیں ہوسکے کہ تخلیقات پر معاوضہ دے سکیں ہم سنجیدگی سے نہ صرف غور کر رہے ہیں بلکہ ہماری پہلی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ اہلِ قلم حضرات کو ان کی تخلیقات کا معاوضہ ادا کیا جائے۔ اگر آپ کی گرانقدر تخلیقات سے پونم کی معنوی خوبصورتی میں ہر ماہ اضافہ ہوتا رہے اور اس کے مالی سرمایہ کی بنیادیں مستحکم ہوجائیں تو انشاءاللہ پونم ضرور معاوضہ پیش کریگا۔ (ادارہ)

فانی بدایونی
اپنے فن کے آئینے میں

چراغِ کشتۂ آرام گاہِ بے نشانی ہوں
میں رویائے پریشانِ فنا ہوں یعنی فانی ہوں
دیارِ نامرادی میں مری اِک عُمر گزری ہے
ابھی ناواقفِ رسمِ جہانِ کامرانی ہوں
خلوصِ ربطِ مرگ و عشق میں کچھ شک نہیں لیکن
عزیزِ خاطرِ نامہربانِ سخت جانی ہوں

حرفِ آغاز کے طور پر یہ اشعار اس مجبورِ شوق کی زندگی کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں جو دُنیا میں نامُرادی کر بھی اُمیدوار رہا۔ زندگی جس کے لئے ایک معمہ اور دیوانے کا خواب بنی رہی۔ جس نے ساری عُمر غم کی جستجو کی اور اس حقیقتِ عظمیٰ کو پاکر دُنیا کے ماتم کدۂ وفا میں سَر تاپا دلِ سوگوار بن گیا جسے " فنا " کہتے ہیں۔

فانی کی تمام شاعری اسی جستجو اور ریاضت کی منظوم کہانی ہے۔ خود انہیں کے الفاظ میں :

جو حال ہے عرضِ حال بھی ہے
میں آپ ہی اپنی داستاں ہوں

فانی شاعر تھے اور اپنے اظہار کے لئے اُس صنف کا انتخاب کیا تھا جو زمان و مکاں کی ظاہری اور خارجی حدبندیوں کو توڑ کر اپنے قاری کو اُس دُنیا میں اور اُس عالم میں پہنچا دیتی ہے جس میں خود شاعر سانس لیتا ہے۔ جب ہم فکر و تخیل، اور جذبات و احساسات کے اس آئینہ خانے میں داخل ہوتے ہیں تو شاعر بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ اس وقت وہ آئینہ دکھانے کے بہانے خود بھی بے نقاب ہو جاتا ہے۔ غزل سے ہٹ کر فانی کی اور تحریروں میں بھی ایسے ہلکے اور گہرے نقوش جا بجا بکھرے ہوئے مِل جاتے ہیں جن کو ترتیب دیا جائے تو ایک مکمل تصویر بن جائے گی جس میں ظاہری خط و خال کے ساتھ ساتھ شاعر کی شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلو بھی اُجاگر ہو جائیں گے۔

دُنیا نے فانی کو ایک صوفی منش، مفکر شاعر، ایک نامُراد عاشق اور ایک ایسے شریف النفس خوددار انسان کے رُوپ میں دیکھا جو آوارۂ وطن ہو کر عُمر بھر فکرِ معاش میں سرگرداں رہا۔ فانی نے ارضی، ذہنی اور رُوحانی سطح پر جو تین مختلف زندگیاں بسر کی ہیں وہ ان کی شخصیت میں اس طرح سمو گئی ہیں کہ انہیں جُدا نہیں کیا جا سکتا۔

جب ہم اس شخصیت کو ان کی تحریروں میں تلاش کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر فانی کے خود نوشت حالات پر پڑتی ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے مدیر نگار کی فرمائش پر لکھے تھے

فانی کے اب اوقات نہ پوچھو کہ وہ اس سال
بستی میں ملے گا نہ بیاباں میں ملے گا
محراب میں پاؤ گے نہ میخانے میں اس کو
مسجد میں نہ وہ حلقۂ زنداں میں ملے گا
البتہ وہ ناواقفِ اسرارِ حکومت
نانِ دیڑ کے اک گوشۂ ویراں میں ملے گا
دن رات وہ دیوانۂ خودداری و غیرت
آغوشِ غم و پہلوئے حرماں میں ملے گا

جب دیکھئے وہ طوقِ غلامی سے گراں بار
اندوہِ معیشت ہی کے زنداں میں ملے گا

یُوں کہنا تو دُرست نہ ہوگا کہ فانی کا یہ احتجاج صدا بہ صحرا بن کر رہ گیا۔ البتہ انہیں اندوہِ معیشت کے زنداں سے اسطرح رہا کر دیا گیا کہ وہ بیروزگاری کے بھیانک غار میں جا گرے۔ اس زمانے میں فانی نے فاقوں کی مصیبت بھی جھیلی، لیکن کسی کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلایا۔ وہ اپنی وضع پر اسطرح قائم رہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ ان پر کیا بیت رہی ہے۔ یُوں تو اس سے پہلے بھی فانی کو دوستی کے پردے میں مخالفت کے تجربے ہو چکے تھے لیکن آخری زمانے میں کچھ ایسے صدمے ان کے دل کو پہنچے کہ وہ کسی حد تک مردم بیزار ہو گئے تھے۔ فانی کی یہ رباعیاں انہیں احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

جب کوئی تڑپ دیکھنے والا نہ رہا
پھر لطف کوئی دل کی تڑپ کا نہ رہا
جس دل کو میسر نہ ہو غم خوار کوئی
اس دل میں کوئی درد رہا یا نہ رہا

آرام کے ساتھی ہیں فراغت کے شریک
البتہ نہیں گردشِ قسمت کے شریک
غم خوار خدا نخواستہ کیوں ہوتے
احباب کا مفہوم ہے راحت کے شریک

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہتے
بنتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے
ورنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے
شرم آتی ہے دشمنوں کو دشمن کہتے

غمِ روزگار کے ہاتھوں فانی کا جو انجام ہوا، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ ایک ایسے زمانے اور ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے تھے جس میں کسی شاعر کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ محض اپنے فن کے سہارے ڈھنگ کی زندگی بسر کر سکے۔ یُوں کہنے کو انہوں نے وکالت بھی کی اور صدر مدرسی بھی، لیکن یہ سب کچھ زندگی بسر کرنے سے زیادہ زندہ رہنے کی ایک رسم کو پُورا کرنا تھا۔ حقیقت میں انہیں ان پیشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے مرتبۂ شاعری سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی مناسب قدر افزائی ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ شاعری کو ان معنوں میں پیشہ بنانے کے لئے تیار نہ تھے کہ شاعر اپنی متاعِ ہنر کو بازار میں بیچتا پھرے۔ آج سے تیس برس پہلے نشرگاہ حیدرآباد سے "شعر و شاعری" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"جب کوئی حقیقی شاعر دُنیا کے سامنے آیا، دُنیا نے اسے کبھی نہیں پہچانا۔ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ دو طرح کا سُلوک ہوا کیا۔ بعضوں نے اسے آدمی تو سمجھا مگر ذلیل و حقیر، اسلئے کہ

الفاظ میں قلمبند کیے تھے۔

"میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دُنیا میں لایا گیا۔ اب تک کر دسمبر ۱۹۴۱ء سے زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصل وطن کابل ہے۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورثِ اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربارِ دہلی نے انہیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کیے جانے کے علاوہ جاگیرات، خطابات، منصب وغیرہ سے سرفراز کیا گیا۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پر دادا تھے، صُوبۂ بدایوں کے گورنر تھے تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں ...... پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت، غیرت اور جرأت کے ساتھ گذار دی ..... میں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی سنہ ۱۹۲۳ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد سنہ ۱۹۳۲ء تک آگرہ میں پیشۂ وکالت ذریعۂ معاش رہا۔ کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا سنہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک حیدرآباد دکن میں صدر مدرس رہا ۱۹۳۹ء کے بعد سے اب تک بیکار ہوں ......
مختصراً ننگِ خاندان ہوں اور بارِ زمین بھی میری ہستی کسی اور کے لیے تو کیا مفید ہوتی خود میرے لیے بھی نہیں ....."

اس بیان میں خاندانی امارت اور وجاہت کا تذکرہ برائے بیت نہیں ہے۔ عظمتِ رفتہ کی یاد سے ان کا دل کبھی خالی نہیں رہا۔

وہ بیسویں صدی کے دورِ بیداری میں سولھویں اور سترھویں صدی کے درباروں کے سُہانے خواب دیکھتے رہے اور زندگی گذارنے کا وہ ڈھب اختیار کیا جس کو نباہنا سماج سے خصوصی استحقاق اور مراعات حاصل کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ شرافتِ نسبی کے ساتھ جو غیرت اور خودداری انہیں ورثہ میں ملی تھی اس جنسِ کمیاب کا دُنیا میں کوئی مول نہیں تھا۔ فانی اپنی وضع پر اڑے رہے اور زمانے سے کوئی سمجھوتا کرنا قبول نہ کیا۔ وہ جس معیارِ اخلاق کے پابند تھے اوروں کو بھی اس کسوٹی پر جانچنا چاہا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ مختصر یہ کہ فانی دُنیا داری نہ کر سکے اور ان کی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کی دلخراش داستان بن کر رہ گئی۔

غالب کی طرح فانی بھی یارانِ وطن کی بے مہری پر شکوہ بر لب رہے ؎

زمینِ حشر فانی کیا قیامت ہے معاذاللہ
مجھے اپنے وطن کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

وطن سے نکل کر انہوں نے لکھنؤ، بریلی، اٹاوہ، آگرہ اور دوسرے شہروں میں قسمت آزمائی کی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترکِ وطن سے پہلے قرض خواہوں کے تقاضوں سے تنگ آکر فانی کو اپنی آبائی حویلی بیچ دینی پڑی جب یہ جائیداد قبضۂ غیر میں جا رہی تھی فانی کی تازہ ترین فکر، یہ شعر تھا

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب
درو دیوار دیئے اب انہیں ویرانی دے

غریب الوطنی کے ساتھ فانی نے اپنی خانماں بربادی کا ذکر بھی بڑے دُکھے ہوئے لہجے میں کیا ہے ؎

بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں، یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

٭

خاکِ وطن ہی راس نہ آئی، غربت تو پھر غربت ہے
فانی اپنی خانہ بدوشی، خانہ خرابی کیا کہیے

گھر ہے اب قفس فانی گھر کبھی وطن بھی تھا
ہاں کبھی وطن بھی تھا، اب کہاں وطن اپنا

آخر عمر میں فانی کو خاکِ دکن کی کشش حیدرآباد کھینچ لائی۔ یہاں انہیں مہاراجہ کشن پرشاد جیسا قدرداں مل گیا۔ اپنے مضمون "بہ یادِ شاد" میں مہاراجہ کے دربار کی تصویر کھینچتے ہوئے فانی نے لکھا تھا:

"میں نے ان خوابوں کی تعبیریں دیکھی جو میں نے
شاہانِ مغلیہ کے درباروں سے متعلق دیکھے تھے
اپنے اس خیال کو مجسّم ہوتے ہوئے پایا جو بارہا
میری قوتِ متخیلہ نے اُمرائے سَلف کے درباروں
کی نسبت میرے دل میں قائم کر رکھے تھے"

مہاراجہ کا حُسنِ سُلوک فانی کے لئے مرہم بن گیا۔ وہ فکرِ معاش سے کچھ عرصہ کے لئے بے نیاز ہو گئے۔ فانی لکھتے ہیں:

"مجھے ایسے لمحات، ایسی ساعتیں زندگی میں بہت
کم میسّر آئی ہیں، جن کا شمار اگر میری زندگی میں
کیا جائے تو مجھے کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ
لمحات تھے جو مہاراجہ بہادر کی خدمت میں گزرے
یہی وہ ساعتیں تھیں جنہیں میں اپنی عمرِ رفتہ کہہ
سکتا ہوں"

حیدرآباد میں فانی کو آسودہ حالی کا یہ زمانہ آسائش و فراغت کی ہلکی سی جھلک دکھا کر گذر گیا۔ ستم ظریف احباب نے انہیں ایک اور دربار میں پہنچا دیا جو بظاہر زیادہ ذی شان و زیادہ ذی حشم تھا۔ وہاں پہنچ کر فانی لُطف و کرم کی اُمید میں چشمِ انتظار بنے رہے۔ لیکن محرومیٔ قسمت نے انہیں تشنۂ دائم بنا کے رکھا۔ ہم فانی کے اُس وقت کے احساسات کی تصویر آج بھی ان اشعار میں دیکھ سکتے ہیں ؎

شکوۂ غم سے فائدہ شکرِ ستم بھی کیا ضرور
حُسن کے تعبدوں کا حال، شعبدہ گر سے کیا کہیں
دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ دردِ دل نہیں
بے خبروں سے کیا کہیں، اہلِ خبر سے کیا کہیں
حُسنِ جفا پسند سے حسرتِ عرضِ شوق کیا
تشنہ لبی کا ماجرا، آبِ گہر سے کیا کہیں

زندگی کے آخری چند برسوں میں فانی پر پے در پے مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اپنی خودداری کی وجہ سے بعض وقت فانی خوشامد پسند حکام کی نظروں میں کھٹکنے لگے تھے۔ لیکن مہاراجہ کشن پرشاد کی وجہ سے انہیں ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ فانی کے خلاف کوئی کارروائی کریں۔ مہاراجہ وزارتِ عظمیٰ کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے تو موقع پاکر فانی کا تبادلہ حیدرآباد کے ایک دور افتادہ ضلع ناندیڑ پر کر دیا گیا۔ فانی ایک خاص قسم کی شہری زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔ اس پیرانہ سالی میں جبکہ وہ بیمار بھی رہنے لگے تھے، ناندیڑ کی رہائش فانی کے لئے سزا سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے ایک قطعہ میں غمِ تنہائی ناندیڑ کی سرگذشت اسطرح رقم کی ہے۔

جس طرف دیکھیئے اک عالمِ ہُو کی تصویر
جس طرف جائیے وحشت سے فضائیں معمور
صبح سے شامِ غریبی کی بلاؤں کا نزول
شام سے گورِ غریباں کی خموشی کا ظہور
میں وہ معتوب ہوں جس پر نہ کُھلا رازِ عتاب
میں وہ مجرم ہوں کہ ثابت نہ ہوا جس کا قصور
میں کہ اک عُمر سے ہوں خادمِ اربابِ کمال
میں کہ اک عُمر سے ہوں جہل کے سائے سے نفور
میری سرگرمیٔ خدمت کی یہ ادنیٰ ہے دلیل
کہ ہے دُنیائے ادب میں مری خدمت مشہور
حیف جس سعی کو میدانِ عمل ہو درکار
اور تقدیر سے وہ سعی رہے نا مشکور

٭

ناندیڑ میں فانی کا نظام الاوقات بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

اس کا وجود دنیاوی اعتبار اور افادی نقطۂ نظر سے بیکار محض تھا۔ بعض جنہوں نے اس کی بلندیِ تخیل اور پروازِ خیال کی اپنے نزدیک بہت کچھ قدر افزائی کی، اسے آدمی سے بالا تر سمجھا۔ اسے کوئی فرشتہ یا کوئی مجسمۂ روح تصور فرمایا۔ ان کے نزدیک چونکہ اس کی زندگی صرف روحانی زندگی تھی، اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کو بھی کھانے پینے، سونے جاگنے، گرمی اور سردی سے محفوظ رہنے کے سامنے سے بے نیاز ہیں...... ان قدر شناسوں کے نزدیک اس کی زندگی ایک مقدس ستم کا تماشا تھا، جسے وہ دُور دُور سے دیکھ دیکھ کر دل ہی میں کچھ اثر لیتے رہے۔ اس کا دم نکلتے دیکھ کر سمجھے کہ اس پر تمام عمر نزع کی کیفیت طاری رہنا ضروری ہے..... ان کے نزدیک ان جاں گداز ازیتوں کے بغیر وہ حقیقی شاعر نہیں ہو سکتا.....“

فانی کا انتقال ۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو ہوا، اس سے سال بھر پہلے رفیقۂ حیات نے ان سے مفارقت کی۔ فانی اسی وقت محسوس کر لیا کہ اب ان کے چل چلاؤ کے دن بھی آگئے، چنانچہ انہوں نے اپنی وفات کی تاریخ آپ کہی جو درست ہے

او آں چناں بمرد کہ آخر خدا بنود
او ایں چنیں بزیست کہ گوئی خدا نداشت
طغیانِ ناز بیں کہ بہ لوحِ مزارِ او-!
ثبت است سالِ رحلتِ فانی ”خدا نداشت“

فانی کو بنانے یا بگاڑنے میں ستمِ روزگار کے علاوہ حیات کی ناکامیوں اور محرومیوں کا بھی بڑا حصّہ تھا۔ ان کی زندگی میں وصال کی چاندنی راتیں بھی آئیں اور ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی لیکن دلوں کے اس کاروبار میں خاندانی ناموس کا لحاظ اور حفظِ نفس کا خیال سنگِ راہ بن گیا۔ نتیجتاً عشق میں داغِ رسوائی فانی کے لئے باعثِ سرفرازی نہیں بن سکا اور آخر ایک رقیب کے ہاتھوں وصل کی گھڑیاں مختصر ہو کر رہ گئیں۔ نشۂ شباب کے ساتھ خمارِ عیش بھی اُتر گیا اور وہ زمانہ آگیا جس کو فانی اپنی عمر کے حساب میں شمار کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ فانی کے کلام میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے ایک داستانِ ہجر و وصال مرتب کی جا سکتی ہے، مثلاً

نصیب ہو بھی تو کیا لطفِ وصلِ یار میں ہے
سوائے عیش سو تقدیرِ انتظار میں ہے

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

اپنی زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں کی وجہ سے فانی تقدیر پرست بن گئے تھے؛ عقیدۂ جبر پر ان کا ایقان کامل تھا ان کی شاعری میں متصوفانہ خیالات اسی راہ سے داخل ہوئے فکر و خیال کی سطح پر وہ ایک صوفی اور فلسفی نظر آتے ہیں، لیکن ان کی واردات تمام تر شاعرانہ تھی۔ اُردو اور فارسی میں متصوفانہ شاعری کی کمی نہیں، لیکن فانی کے کلام میں جو شاعرانہ تصوف ملتا ہے اس کی مثالیں کمیاب ہیں۔ فانی نے شاعرانہ تجربے میں مایوسی کی انتہائی منزل پر پہنچ کر جو عرفان حاصل کیا تھا وہ صوفی کے خیال میں مرتبۂ فنا سے مشابہ ہے جس کو پانے کے لئے اس کو سلوک کی مختلف منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ فانی کہتے ہیں

شمع ہوں بے نیازِ ظلمت و نور
آئینہ ہوں بغیرِ صیقل و زنگ
میں ہوں عالم کو بے دلی کا پیام
خیر و شر مدعا نہ صلح نہ جنگ
رازِ نیرنگیٔ حقیقت ہوں
میں ہوں فانی حقیقتِ نیرنگ

شمیم احمد ایم اے (بھوپال)

—— تحقیقی مقالہ' صنف رپورتاژ اور اُردو کا ایک حصّہ ——

"پودے" ایک رپورتاژ

انجمن ترقی پسند مُصنفین کے مختلف اجلاسوں پر اردو میں جو چند اچھے اور خوبصورت رپورتاژ لکھے گئے ہیں' ان میں پودے وہ رپورتاژ ہے جس نے پہلی بار لوگوں کو چونکایا اور اس صنف کی جانب انہیں متوجہ کیا۔ یہ حیدرآباد میں کل ہند اردو کانفرنس (منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء) پر لکھا گیا ہے' اس میں کانفرنس کی روداد تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ لیکن کرشن چندر نے اپنے شوخ و طرار قلم' بے پناہ تاثراتی انداز' تیکھی اور طنز آمیز عبارت اور شاعرانہ زبان سے' اسے ایک بہترین ادبی شہ پارہ بنادیا ہے۔ پودے کے اس افسانوی حسن کو سید ابوالخیر کشفی نے عیب قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس میں وہ حقیقت نگاری نہیں جو رپورتاژ کا خاصہ ہوتی ہے اس میں افسانوی رنگ ابھر آیا ہے[1]"

حالانکہ یہ افسانوی رنگ 'پودے' کا عیب نہیں' بلکہ حسن۔ جس میں حقیقت اور تخیل (بہ لحاظ اسلوب) کے حسین امتزاج سے ایک دلکش فضا پیدا ہوگئی ہے۔ 'پودے' میں کرشن نے ترقی پسند نظریات کی پابندی بڑے حُسن اور سلیقہ سے کی ہے۔ معمولی معمولی واقعات پر بھی ایک ہمدردانہ صحتمند نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ کردار نگاری' منظر نگاری' جزئیات نگاری' اور جذبات نگاری' ہر ایک سے انہوں نے کوئی نہ کوئی اہم اور افادی نکتہ نکالا ہے۔ جو معاشرے اور سماج کی ترجمانی کا کام انجام دیتا ہے۔

'پودے' سفر کے واقعات —— کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ حیدرآباد کی کل ہند اردو کانفرنس میں شرکت کرنے کیلئے بمبئی کے ترقی پسند ادیب جن میں علی سردار جعفری'

[1] ماہنامہ "افکار" کراچی شمارہ نمبر سنہ ۱۹۵۹ء (مضمون اردو ادب کے دس سال)

حرلدھیانوی، اور کیفی اعظمی وغیرہ شامل ہیں بوری بندر
بن آتے ہیں اسٹیشن کے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں معروف
شن چندر کی نظر ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے پر ٹک جاتی ہے
ان کا ذہن اپنی حرکت سے طنز کا ایک ایسا بتر چھوڑ دیتا
جس کی چبھن کا احساس قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے

"تھرڈ کا ڈبہ نظام اسٹیٹ ریلوے کی ملکیت
تھا۔ اس وقت بوری بندر کے اسٹیشن پر کھڑا
تھا اور مسافر اس میں گڑ کی بھیلیوں کی طرح لدے
ہوئے تھے۔" [1]

یہ چھوٹا سا جملہ اپنے اندر ایک وسیع دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔
ب اچھوتی اور خوبصورت تشبیہ بھی ہے اور حقیقت نگاری کا
شل نمونہ بھی۔ تھرڈ کا ڈبہ ہندوستانی سماج میں زبردست
بت کا حامل ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندوں کی
بڑی اکثریت اسی ڈبے میں سفر کرتی ہے۔ دھکے کھاتی
لڑتی جھگڑتی ہے اس لئے کہ وہ غریب ہے۔ اس کی
تنگی حالت اُسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ فرسٹ یا سیکنڈ میں
ر کرے۔ چنانچہ تھرڈ کے ڈبہ کا نام آتے ہی وہ تمام واقعات
ن میں تازہ ہوجاتے ہیں جو کبھی اس میں سفر کرتے ہوئے پیش آچکے ہوں
اپسند ادیب بھی اس تھرڈ کے ڈبے سے سفر کرتے ہیں، اور
کا یہ کارواں زندگی کی صحت مند قدروں کا احترام کرتے
ئے ظلم و نفرت کے خلاف آواز بلند کرنے اور ادب اور سماج
بت نئے تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے کامل یقین
ساتھ حیدرآباد جارہا ہے۔ لیکن کرشن چندر کو اس وقت
س ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے اس عظیم مقصد کی راہ میں اکیلے
ان کا کوئی ہم سفر نہیں کیونکہ اس وقت اسٹیشن پر ــــ
باپ اپنے بیٹے کو الوداع کہہ رہا ہے تو کوئی محبوبہ بھیگی
ہوئی آنکھوں سے رومال ہلا ہلا کر اپنے عاشق کو رخصت کر رہی ہے

"لیکن ان ادیبوں کے لئے وہاں کوئی نہ تھا۔
نہ باپ نہ محبوب نہ مداح۔ بیچارے خود ہی ہاتھ
ہلا ہلا کے رہ گئے اور جب گاڑی پلیٹ فارم
سے باہر نکل گئی تو پھر اپنی سیٹوں پر آن بیٹھے
اور بے بسی کے عالم میں اونگھنے لگے۔" [2]

کرشن چندر کو ترقی پسند ادیبوں کی اس تنہائی کا احساس ضرور
ہے لیکن وہ اس سے مایوس اور دل برداشتہ نہیں ہیں۔ انہیں
اپنے ساتھیوں کے عزائم پر پورا بھروسہ ہے۔ انہیں اپنے ہم سفر
ادیبوں کے چہروں کے خد و خال اور نقوش میں حال کی سختیوں
سے ٹکر لینے کا زبردست حوصلہ۔ اور مستقبل کی امید افزا تابناکی
کی جھلک نظر آتی ہے۔ کرشن چندر نے ان ادیبوں کی شخصیتوں
کا بڑا دلچسپ اور معنی خیز جائزہ لیا ہے جس کی بدولت ان کی
شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس صنعت کی
ایک بڑی ہی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے کردار اپنی اصلی شکل و
صورت، اپنے روزانہ کے پروگرام، عادات و اطوار کے ساتھ
سامنے آجاتے ہیں۔ اور قاری کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے
جیسے اس کے اپنے جانے پہچانے ہیں۔ ایک اچھے رپورتاژ کے
لئے حقیقت نگاری بھی بیحد ضروری ہے۔

کرشن چندر نے اس رپورتاژ میں اپنی حقیقت نگاری
کو رومانی طرزِ بیان، بے پناہ جذبات اور طنز کے نشتروں سے
سجا کر جو دلکشی پیدا کی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ بات بظاہر
معمولی ہے کہ وقت گذاری کی خاطر مہندر ناتھ اور سبطِ حسن
شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں لیکن اس معمولی سی بات کو
کرشن چندر کے اسلوب نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے
"سبطِ حسن اور مہندر ناتھ نے دنیا کی بے ثباتی

---

[1] پورے ص ۲۱ [2] پورے ص ۲۴۹

اور موجودہ دور کی رجعت پسندی پر اچھی طرح
غور کرنے کے بعد شطرنج بچھائی تھی اور مہروں کو
پیٹنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ امیر لوگوں کو پیٹنے
سے تو یہ لوگ رہے۔" لہ

کرشن چندر کی حقیقت نگاری اور خلوص کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جس تحریک سے وابستہ ہیں جن نظریات کو وہ مانتے ہیں ان پر بھی کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ اس طرح خود ان کی ذات بھی اس تنقید اور طنز کی زد میں آجاتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک ترقی پسند ادیب کو محض نظریاتی طور پر ہی ترقی پسند نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ عملی طور پر بھی ترقی پسندی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ انہوں نے سفر کے دوران، سنگترے خریدے اور اپنے تمام ساتھیوں کو کھلائے۔ اس کے بعد انہیں سگریٹ پینے کی خواہش ہوتی ہے لیکن سگریٹ ان کے پاس ہے نہیں۔ کیونکہ وہ کبھی خود خرید کر نہیں پیتے۔ دوسروں سے مانگ کر پیتے ہیں۔ ان کے ساتھی ان کی اس عادت سے واقف ہیں، اس لئے پریشان کرنے کی غرض سے وہ انہیں سگریٹ نہیں دیتے لیکن ان کے پاس بیٹھا ہوا ایک بدصورت اور میلا کچیلا شخص جو نظام اسٹیٹ ریلوے میں مزدور ہے، انہیں سگریٹ پیش کرتا ہے۔ کرشن چندر اس سے سگریٹ لیتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس مزدور کو سنگترے نہیں دیئے تھے۔ اور وہ انہیں سگریٹ پیش کر رہا ہے یہ واقعہ انہیں اپنے اور اس مزدور کے اخلاق کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے، اور انہیں اپنا اخلاق کھوکھلا، روایات اور سماج کی اونچ نیچ کے بندھنوں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اس موقع پر وہ اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ بڑی بے باکی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

"کرشن چندر کو یاد آیا کہ سنگترے تقسیم کرتے
وقت اس نے اپنے ہمسائے کو سنگترے پیش
نہیں کیا تھا، کیونکہ اس کے کپڑے نیلے رنگ
کے تھے اور میلے کچیلے تھے اور اس کا رنگ
کالا تھا اور وہ بدصورت اور بے ڈول اور
کریہہ نظر تھا اور مزدور تھا۔ کرشن چندر نے
سگریٹ پیتے پیتے سوچا کہ وہ ابھی تک بلند
وائی اخلاق کے تضاد میں گرفتار ہے۔" ٹلہ

تھوڑی دیر بعد ہی سب ترقی پسند ادیب ناش
کرتے ہیں اور مکھن کا ڈبہ کھولنے کے لئے جب چاقو کی ضر
پیش آتی ہے تو وہی مزدور انہیں چاقو فراہم کرتا ہے۔ ا
بھی وہ لوگ اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

"اس مرتبہ بھی کرشن چندر اپنے ہمسائے کو
کھانے کے لئے پوچھنا بھول گیا۔ سب لوگ
جلدی جلدی انڈے، توس، مکھن اور پھل ڈکار
گئے، بہت عرصے کے بعد یکایک کرشن چندر
کو چندر کو خیال آیا اور اس نے چونک کر کہا۔
ارے بھئی! کچھ اسے بھی دیدیا ہوتا اپنے ساتھی
کو۔ مزدور مسکرایا۔ وہ ان کا ساتھی تھا انڈے،
توس، مکھن، پھل کھانے والا ساتھی نہیں، وہ
تو فرشِ خاک پر بیٹھ کر تقریریں سننے والا
ساتھی تھا۔" ٹلہ

کرشن چندر نے ایک اور مقام پر ترقی پسند ادیب
کے نظریے اور عمل کے تضاد کو بے نقاب کرنے کی کوشش
حیدرآباد پہونچ کر کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد

لہ پودے ص ۲۳ - ٹلہ پودے ص ۳۰ - ٹلہ پودے ص ۳۱

ادیب راجہ شام راج کے محل میں دی گئی ایک دعوت میں تو ضرور شرکت کرتے ہیں جہاں ان کے علم و ادب اور ان کے حیات افروز پیغام کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لیکن جب مخدوم محی الدین ان سے درخواست کرتے ہیں کہ ریلوے مزدوران کا خیر مقدم کرنا چاہتے ہیں تو یہی ترقی پسندی کا دم بھرنے والے ادیب جن میں خود کرشن چندر بھی شامل ہیں طرح طرح کے بہانے تراشنے لگتے ہیں۔

"بہت سے لوگ زکام اور ہیضہ اور بخار سے بیمار پڑ گئے . . . . کچھ لوگ بازار میں خرید و فروخت کرنے چلے گئے۔ کچھ لوگ P.E.N. کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے اسٹیشن سے جے پور کا ٹکٹ لانے کے لئے چلے گئے۔ کچھ لوگ بیمار ہو کر بستر پر دراز ہو گئے۔ مزدوروں کے جلسے کے لئے صرف کیفی، سردار، اور ساحر بچے تھے"[1]

کرشن چندر نے ہر موقع پر اجتماعی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے وہ انفرادی طور پر بھی کچھ سوچتے یا محسوس کرتے ہیں تو اس کا اجتماعی اور حقیقت پسند شعور کے ساتھ اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ وہ مسئلہ ان کا اپنا ہوتے ہوئے بھی پورے معاشرے اور ماحول کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس رپورتاژ میں سفر کے دوران ریل کے ڈبے میں جہاں وہ فرقہ وارانہ ذہنیت کا احساس پاتے ہیں وہاں محض سطحی نظر اختیار نہیں کرتے بلکہ ——————

—————— اس کا تجزیہ ہمارے معاشرتی اور اقتصادی نظام کے سانچوں میں تلاش کرتے ہیں جس کی بدولت اس رپورتاژ میں قومی یکجہتی کے رجحان کو تقویت دینے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

". . . . . اور کرشن چندر کو ایسا محسوس ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں ایک گہری خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ دو قوموں کے درمیان دو نظریوں کے درمیان دو زندگیوں کے درمیان، جیسے کوئی سویا ہوا احساسِ نفرت بیدار ہو گیا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا ہر چہرہ زہریلا تھا، اور کینہ اور بغض کا، جیسے وہ لوگ اپنی زندگی کی تمام تر مصیبتوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے ذمہ دار مخالف فریق کو ٹھہرانا چاہتے تھے اور اپنی بھوک اور پستی اور کمزوری اور نامرادی کا انتقام اس سے لینا چاہتے تھے"[2]

کرشن چندر نے اس مختصر سے اقتباس میں فرقہ پرست ذہنیت کا بڑا گہرا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے، یہ صرف سادھو اور فقیر کے فرقہ وارانہ اندازِ گداگری کا ہی سوال نہیں ہے، بلکہ اجتماعی طور پر سوال یہ ہے کہ فرقہ پرست ذہنیت کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اس کا محرک کون عمل ہے؟ اس کا جواب انسانوں کی غیر یقینی اور مفلوک الحال زندگی ہے جو اپنی خواہشات کی تکمیل خاطر خواہ طریقے سے نہیں کر پاتے چنانچہ ان میں ایک طرح کی تخریبی ذہنیت پیدا ہوتی ہے جو آگے چل کر فرقہ پرستی کی بھیانک صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ریل کے سفر کے دوران کرشن چندر نے اپنے ذہن اور فنکارانہ صلاحیتوں کو پورے طور پر بروئے کار لا کر زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں جہاں وہ اپنے ساتھی ادیبوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں وہیں نظام اسٹیٹ ریلوے کے مزدور کی پرولتاری اور اپنے بورژوائی اخلاق کا موازنہ کرکے اپنے آپ پر نفریں کرتے اور مزدور کو

---

[1] پودے ص ۱۰۵-۱۰۶۔ [2] پودے ص ۵۳-۵۴

کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سادھو اور فقیر کے فرقہ وارانہ اندازِ گداگری کا سہارا لیکر فرقہ پرست ذہنیت کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ کسانوں کی زندگی کی تصویر کشی کرنے میں کرشن چندر کو اپنے رنگین اسلوب اور اپنی مخصوص رومانیت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس میں قصور صرف کرشن چندر کا نہیں بلکہ اس تحریک کا بھی ہے جس سے وہ وابستہ ہیں۔ یہ شہروں، قصبوں اور صنعتی مرکزوں اور مزدوروں تک ہی محدود رہی، دیہاتوں اور کسانوں تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کا اعتراف خود سردار جعفری کو بھی ہے۔

"اردو کی ترقی پسند تحریک شہروں اور قصبوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ آج شہر اور گاؤں کے رشتہ کو دوبارہ قایم کرنے کی ضرورت ہے"۔ [1]

اس لئے کرشن چندر اگر کسانوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو اس کی وجہ مشاہدہ کی کمی کے سوا کچھ نہیں، لیکن یہ کیا کم بات ہے کہ ان کے دل میں کسانوں کے لئے تڑپ اور ہمدردانہ جذبات پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں جنہیں وہ اپنے مخصوص رومانی انداز میں ظاہر کر کے قاری کی ہمدردیاں کسان کی زندگی سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

"ہر دروازے پر مفلوک الحال کسان بوسیدہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے اور بلند آواز میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ کتنی عجیب باتیں تھیں وہ زمین کی باتیں، پٹواری کی باتیں جریب اور کھتونی کی باتیں، ہل کی باتیں، قحط کی باتیں، بیاہ کے واسطے بنئے سے سود پر رقم حاصل کرنے کی باتیں، گھر کو گروی اور زمین کو رہن کرنے کی باتیں، عجیب و غریب باتیں، نہ عشق و محبت کی باتیں، نہ حسن جہاں سوز کی باتیں، ساقی کی باتیں نہ شرابِ ناب کی باتیں، نہ مذہب کی باتیں نہ جنت کی باتیں۔ اک بے پناہ شور تھا، اک مسلسل ہنگامہ، ایک مستقل دوزخ، اک آگ، اک بو، اک سڑاند، جیسے وہ تھرڈ کا پورا ڈبہ انسانیت کا سنڈاس تھا!" [2]

اس اقتباس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کرشن چندر نے کسانوں کی زندگی کا گہری نظر سے جائزہ لینے کی بجائے محض زبان کے چٹخارے، اسلوب کی رنگینی اور رومانیت سے رپورتاژ میں جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس قسم کے بے شمار واقعات کے تذکرے کے بعد کرشن چندر کانفرنس کی جملہ کارروائیوں، تجاویز اور مباحثوں کا بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں جائزہ لیتے۔ کانفرنس کے بعد ترقی پسند ادیبوں کی مختلف مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے رپورتاژ کو ایک ایسے مقام پر لے جا کر ختم کرتے ہیں جہاں وہ بے پناہ تاثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس اعتبار سے ہم رپورتاژ کے اس حصہ کو "پودے" کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔ یہ نقطۂ عروج ایک افسانے اور ناول کے نقطۂ عروج کی طرح بے حد بھرپور، کھا اور شدید تاثرات کا حامل ہے۔ اس حصے میں کرشن چندر نے بے پناہ جذبات نگاری سے کام لیا ہے۔ نیز ان کی شاعرانہ زبان اور رومانی اسلوب نگارش نے اس کو گویا دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا ہے۔ کانفرنس کے بعد جب ترقی پسند ادیب بمبئی کیلئے روانہ ہوتے ہیں تو ان کے ہمراہ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی محبوب حیدرآبادی بھی ہیں، جو دو چار اسٹیشن تک ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ اپنی بیمار بہن کے علاج کی غرض سے، جس کی اطلاع انہیں پہلے ہی مل گئی

---

[1] ترقی پسند ادب ص ۱۸۶ طبع دوم۔ [2] پودے ص ۴۳، ۴۲

کی جا رہی تھے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے انہیں رک جانا پڑا، بہن کے علاج کے لئے کم از کم دو سو روپے درکار تھے جو وقت پر فراہم نہ ہو سکے اور جب کسی نہ کسی طرح انہوں نے پیسوں کا انتظام کر لیا تو یہ کانفرنس آ گئی۔ چونکہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک سرگرم اور باعمل رکن تھے اس لئے اس کی تیاریوں اور انتظامات میں مصروف ہو گئے جس کے نتیجہ میں ان کے دو سو روپے بھی کانفرنس کے انتظامات کی نذر ہو گئے۔ اب جب کہ کانفرنس بخیر و خوبی انجام پا گئی تو وہ بہن کی عیادت کے لئے خالی ہاتھ ہی روانہ ہو گئے۔ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو انہیں اپنی بہن کے انتقال کی خبر ملتی ہے۔ وہ یہ خبر سن کر بے تاب اور بے چین ہو جاتے ہیں اور کرشن چندر کو جس یاس انگیز لہجے میں اس المیہ کی خبر سناتے ہیں، اس سے کرشن چندر کے جذبات میں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ وہ جگر حیدر آبادی کی ذہنی کیفیت اور انتشار کا اندازہ لگا کر ساحر سے کہتے ہیں۔

"تم جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مر گئی؟" [1]

ساحر ہر قسم کے جذبات سے عاری تلخ اور اکھڑے ہوئے لہجے میں جو جواب دیتے ہیں، اس میں بلا کی تڑپ، معنی خیزی اور نشتریت ہے، جو پورے سماج اور معاشرے کی ناآسودگیوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس موقع پر کرشن چندر نے اپنے جذبات اور تاثرات کا اظہار ساحر کی زبان سے یوں کر دیا ہے۔

"اور جب اس نے دو سو روپے اکٹھے کر لئے تو یہ کانفرنس آ گئی۔ اور اس نے یہ روپے کانفرنس کیلئے دیدیے۔ اور اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہر جگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا۔ کسانوں سے مزدوروں سے، طلباء سے، غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا تاکہ کلچر زندہ رہے۔ اس کی بہن مر جائے لیکن تہذیب زندہ رہے۔ تمدن زندہ رہے۔ فنکار کا خیال زندہ رہے۔ اس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دیدے لیکن کتاب زندہ رہے۔ زبان زندہ رہے قوم کی روح زندہ رہے۔ اس کی پیاری پیاری املی کھانے والی، امرود توڑ توڑ کر چرا کر کھانے والی اس کے بچپن کی ساتھی بہن مر جائے لیکن ٹیگور زندہ رہے۔ غالب زندہ رہے۔ اقبال زندہ رہے۔ پریم چند زندہ رہے۔ موت اس کی بہن کے ہونٹوں کو یخ بستہ کر دے اور اس کی آنکھوں کو بے نور کر دے لیکن زندگی اور اس کا زندہ ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان سے لاکھوں دلوں کو روشن کر دے" [2]

کرشن چندر کی اس جذبات نگاری میں جہاں ایک انفرادی نقطۂ نظر ہے وہاں اس میں ایک بھرپور اجتماعی شعور بھی کارفرما ہے۔ یہ ایک جگر حیدر آبادی اور ان کی بہن کا ہی المیہ نہیں ہے، بلکہ یہ پورے سماج اور معاشرے کا المیہ ہے جو روز ہی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے سماج میں ایسے سیکڑوں، ہزاروں اور لاکھوں جگر حیدر آبادی ہیں جو اس طبقاتی کشمکش اور اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں، جو اپنی بہن کا علاج تک ٹھیک ڈھنگ سے نہیں کرا سکتے اور وہ "املی کھانے والی اور امرود توڑ کر چرا کر کھانے والی معصوم اور پیاری پیاری بہن سسک سسک کر مر جاتی ہے، لیکن ہندوستان کے "بیچارے" ادیب، ادب اور آرٹ کی خدمت پورے خلوص کے ساتھ کرتے ہیں، جس کا صلہ ان کی زندگی میں کبھی نہیں ملتا۔ موت کے بعد پوجے بھی جائیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ غرض کرشن چندر نے

---

[1] پودے ص ۱۲۵ - [2] پودے ص ۱۲۶

جن حقایق کو پیش کیا ہے وہ بجائے خود اس قدر تلخ اور ترش ہیں کہ قاری کا ذہن ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نیز کرشن چندر نے جو لہجہ، جو زبان، اور جو انداز اختیار کیا ہے وہ بڑا بھر پور، اچھوتا اور چبھتا ہوا ہے۔ اس میں ایک اصلاحی جذبہ اور ایک انقلابی کیفیت پوشیدہ ہے، لیکن کہیں "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک سبک اور دبیکھا لیکن جذباتی انگیز لہجے میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے، اور یہی انقلابی رومانیت ہے جو ترقی پسند تحریک کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ "پودے" کا مجموعی انداز اسی خصوصیت کا حامل ہے جو اسے اردو ادب میں کرشن چندر کے غیر فانی کارنامے کی حیثیت دکھتا ہے۔

ہمارے مسائل

عمیق حنفی

اردو شاعری میں نئے تجربے

اِن دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظمِ آزاد اور نظمِ مُعرّیٰ کے ساتھ ساتھ اِدھر کچھ شاعروں نے منثور نظم کے بھی تجربے کیے ہیں۔ ہیئت سے ہٹ کر مواد و موضوع میں بھی تنوّع اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور نئی نئی علامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری خاص طور سے اُردو نظم آگے بڑھنے کے بجائے رُو بہ زوال ہوتی جارہی ہے۔ نئے شاعروں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو پڑھنے والوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ کسی کا انداز بیان اتنا کاواک ہے کہ کسی عنوان بات پلّے نہیں پڑتی اور کوئی ایسے دُور از کار خیالات کو بے سرو پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نظم چیستاں بن کر رہ جاتی ہے۔ اس رُجحان کے اسباب اور اس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؛ اور کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

"اُردو شاعری میں نئے تجربے" — مفید ہو کہ نہ ہو ایک دلچسپ بحث ضرور ہے۔ ہر چند کہ "تجربے" کے ساتھ "نئے" کی صفت زائد اور محلِ نظر ہے۔ "تجربہ" ہمیشہ نیا ہی ہوتا ہے۔ اس بحث میں تجرباتی اور "نئی" شاعری بھی گڈ مڈ ہو گئی ہے۔ ہر تجرباتی نظم "نئی نظم" ہو گی یہ ضروری نہیں۔ علاقائی، بیرونی، غیر ملکی اور دیگر زبانوں کے فارموں اسالیب اور انداز کو اختیار کرنا تجرباتی نظم کو جنم دے سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس سے نئی نظم پیدا ہو۔ میں نے ہندوستانی راگ رنگنیوں کے رُوپ اور کیفیات کو نظم کیا ہے سنسکرت کی بحروں میں اور اُردو میں غیر مُروّج ہندی چھندوں کو اپنایا ہے۔ لیکن ان تجربات سے جو کچھ برآمد ہوا ہے اسے نئی نظم، نیا گیت یا نئی غزل نہیں کہا۔ اسی طرح مُعرّیٰ، آزاد منثور نظمیں، جاپانی طرز کی نظمیں، ثلاثی کے فارم میں کہی گئی نظمیں، سانیٹ، کینٹوز، لمرک (Limerick) وغیرہ محض اپنی جدّت و نُدرت کے باعث نئی شاعری کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے نئی شاعری کے مخالفین کا تجرباتی شاعری پر برہم ہونا محض جھنجھلاہٹ ہے۔ تجربات ہر دَور میں ہوتے رہے ہیں اور اگر نہ ہوں تو ادب میں جمود آجائے۔ امیر خسرو، وَلی دکنی، میر تقی میر، ناسخ، آتش، غالب، انیس، حالی، چکبست، اکبر الہ آبادی، اقبال، جوش، فراق، فیض، احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، مخدوم، ساحر، جاں نثار اختر، کیفی، سبھی اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے دائرے میں تجربے کر چکے ہیں اور ان کے تجربات نے اُردو کو گہرائی اور گیرائی عطا کی ہے۔ لیکن آج یہ کہنا کہ آخری تجربے کب تک

ہوتے رہیں گے بہت عجیب اور انتہائی انجماد پرستانہ بات ہے۔ تجربہ کار غالب نے اپنے ناقد سے کہا تھا ؎

لے کر تو محوِ سخن گستراں چینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

خانۂ ماتم میں جہاں کسی عزیز کی موت ابھی ابھی واقع ہوئی ہو یا جس میں کوئی نزاع کے عالم اور جاں کنی کی حالت میں ہو کسی نوزائیدہ بچے کا رونا گراں گذرتا ہے۔ روایتی نظم کے ماتم خانے پر نئی نظم کا جنم کیوں ناگوار و گراں نہ گزرتا لیکن فطرت کے نظام کو بدلنا کس کے بوتے کی بات ہے، جسے مرنا ہے وہ تو مرے گا، جسے پیدا ہونا ہے، پیدا ہوگا دوا زمانۂ او ست ہو یا در زمانۂ تست!

نئی شاعری نئے فن کی طرح مشینی نظام اور میکانکی عوامل کے خلاف فرد کی بغاوت کا ایک روپ ہے ——— Mass Production کی یک رنگی اور یکسانیت اور ایک ہی سانچے میں ڈھالی ہوئی ایک سی مصنوعات کے کے بجائے ایک انفرادی جدت اور ندرت کی تلاش میں نیا فنکار اور نیا ادیب سرگرداں ہے۔ مصوری اسی تلاش میں تجرید کی راہ اختیار کرنے پر مجبور رہوئی۔ ہماری کلاسیکل موسیقی نے میکانکی عمل کو روا، نہ رکھ کر بڑی دُور اندیشی کا ثبوت دیا ہے ایک ہی گویّا، ایک ہی راگ میں کوئی خیال ترانہ ٹپہ یا ٹھمری جتنی بار گائے گا ایک نہ ایک نئی بات پیدا کر کے گائے گا۔ لیکن ہماری شاعری میں یکسانیت، یک رنگی، یکسرا پن پیدا کرنے کی اتنی گنجائش رکھ دی گئی کہ ان حدود میں رہ کر نئی راہیں نکالنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ ضروری ہوگیا بلکہ ناگزیر ہوگیا کہ عروض، قواعد، صنائع بدائع، محاورے، clichés، تراکیب اور اصولِ بندش کی قیدوں کو توڑا جائے اور نئی بات نئے ڈھنگ نئے رنگ اور نئی زبان میں کہی جائے۔ یہی نہیں موضوعات کے دائرے کو بھی وسیع کیا جائے۔ نئے حالات میں نئے سماجی اور تہذیبی تغیرات سے نئے غیر مشروط ذہن کے ردِ عمل کو پیش کیا جائے۔ فطرت اور انسان، مشین اور انسان، مجمع اور انسان اور انسان اور انسان کے رشتوں پر نگاہ ڈالی جائے۔ شاعر کو مدبّر، سیاستداں، فلسفی، سائنٹسٹ، ریفارمر، آئین ساز وغیرہ کی طرح آزاد، خود مختار بنا کر ان کے ہم مرتبہ درجہ دلایا جائے۔ اب تک شاعری، سیاست، فلسفے، سائنس، اخلاق، آئین وغیرہ کی پچھ لگو بنی ہوئی تھی۔ تشریح، تعبیر، تنقید، ترجمانی یا وکالت کو نظم کر دینا شاعری بن جاتا تھا۔ نئی شاعری انسان کے جسم، دل دماغ اور روح کو منشور، محضر، اعلان نامے اور مختلف دینی اور دنیوی شریعتوں کی مطیع و تابعدار نہ مان کر ان کی کیفیات اور ردِ عمل کو ایک شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے پیش کرتی ہے، جو نہ پیمبرانہ ہے، نہ صوفیانہ، نہ لیڈرانہ اور نہ فلسفیانہ۔ انسان اور انسانیت کا ایک المیاتی احساس اس کا محرک ہے۔ ایک آفاقی لب و لہجہ ایک بین الانسانی لفظیات اور ایک عالمی انداز اختیار کرنا اس کا مطمحِ نظر ہے۔

رہ گئی سمجھنے سمجھانے کی بات، دل پر اثر کرنے کی بات اور مقصد کی بات۔ ابہام اور اہمال کا مسئلہ صرف نئی شاعری ہی کا نہیں بلکہ پورے ادب کا مسئلہ ہے۔ غالب کو بھی کہنا پڑا تھا "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"۔ یہ درست ہے کہ نئی نظم کے بعض شاعر انتہائی ذاتی اور شخصی علامتوں اور اشاروں کے الجھاؤں میں اپنا مافی الضمیر بری طرح چھپا دیتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو شاید خود بھی نہیں جانتے یا کم از کم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں یا محض چیستان پرست ہوتے ہیں۔ جو کچھ ہو ایسی شاعری خواہ نئی ہو خواہ پرانی، لائقِ تحسین ہے نہ قابلِ ذکر۔ رہی اور نئی نظموں کے سمجھ میں نہ آنے کی بات، میں یہاں اس سلسلے میں بلراج کومل کے استدلال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ نئی شاعری میں communicate کرنے کے ذرائع اور وسائل کتنے ہیں؟ کیا اسے نصاب میں شامل

کیا گیا ہے؟ کیا اس کے لوازم اور فن سے متعارف کرنے کے لئے اسکول اور استاد موجود ہیں؟ کیا پُرانی شاعری کے تاثر کا راز اس کے سامعین اور قارئین کی تعلیم و تربیت اور روایت سے واقفیت میں مضمر نہیں؟ جب تک آپ نئی شاعری کو سمجھنے کی پُرخلوص کوشش نہ کریں گے وہ سمجھ میں کیسے آئے گی اور دل پر کیا اثر کرے گی؟ ویسے نئی شاعری کا مقصد "دل پر اثر کرنے" کے تیر بہدف آسان نسخے تلاش کرنا نہیں ہے اور وہ جذبات کو نہیں گُدگُدانا چاہتی۔ جذبات کو ذہانت کا طابع رکھ کر مہذب کرنا چاہتی ہے۔ مقصد کی بحث بھی بہت پُرانی ہے اور فن برائے فن بنام فن برائے زندگی کے مباحثوں کے رُوپ میں پہلے بھی ہو چکی ہے۔ نئی شاعری کے مقاصد پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "مقصد" کو "نئی شاعری" سماجی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی حُدود تک محدُود نہیں مانتی۔ ہندی کے ایک مشہور شاعر وجے دیو نارائن ساہی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شاعری کرنا جب شہری فرائض میں شامل نہیں یعنی شاعر بحیثیت شہری کے تو شعر کہنے پر مجبور نہیں تو اس سے شہریت کے فرائض اور ذمہ داریوں کی بابت محاسبہ کیوں کیا جائے؟ ویسے دُنیا میں بے وجہ کچھ پیدا نہیں ہوتا اور جہاں وجہ ہوتی ہے وہاں مقصد بھی ہوتا ہے۔

عظمت کی تلاش ابھی نہ صرف قبل از وقت بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ ویسے یہ سوال کیا جائے کہ پوری اُردو شاعری میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ہم مرتبہ کتنے شاعر ہوئے ہیں تو کیا جواب دیجئے گا؟ اور پھر اقبالؔ سے زیادہ تو میرؔ و غالبؔ بھی عالمی شہرت نہیں رکھتے! حال ہی میں "ٹائم" میں ایک اطلاع چھپی ہے کہ ایک افغانی رئیس نے "فارسی کے دو کم معروف" شاعروں میر تقی میرؔ اور اسد اللہ خاں غالبؔ کی شاعری کے انگریزی میں ترجمے کئے جانے کے لئے لاکھوں ڈالر کی دولت وقف کر دی ہے! یہ ہیں امریکہ کے لئے آپ کے ہمارے عظیم شاعر میرؔ و غالبؔ! — "فارسی کے دو کم معروف شاعر"! اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارا عہد انفرادی عظمتوں کا نہیں اجتماعی عظمتوں کا عہد ہے۔ انفرادی سطح پر عظمت کا تصور اس وقت کیا جا سکتا ہے جب ایٹمی اُونٹ کسی کروٹ بیٹھ جائے، تہذیب کسی نہج پر پہنچ جائے اور تغیر و تبدّل کی رفتار قدرے سکون اختیار کرے۔ ویسے شاعرانہ عظمت کا جنم نئی شاعری کی کوکھ ہی سے ہوگا کیونکہ یہی وہ شاعری ہے جو رُوحِ عصر سے گہرا رابطہ رکھتی ہے اور ایک آفاقی رنگ و آہنگ بھی۔

شاعری اور عوام کی بحث فضول ہے۔ عوام نہ کالیداس کو سمجھتے تھے نہ شیکسپیئر اور ملٹن کو، نہ دانتے اور گوئٹے ان کی فہم و فراست کے دائرے میں تھے نہ میرؔ اور غالبؔ۔ اور اس کا برعکس بھی صحیح ہے۔ جو شاعر عوام کی سمجھ میں آتے تھے یا آتے ہیں ان میں سے کتنے ادب میں اپنا مقام بنا سکے؟ تلسی، سور، کبیر اور میرا اپنی شاعری سے زیادہ اپنی بھگتی کی وجہ سے مشہور و مقبول و محترم ہوئے!

جو لوگ نئی نظم کو رُو بہ زوال مانتے ہیں، انہیں واویلا مچانے کے بجائے اس کی فطری موت کا انتظار کرنا چاہیئے؟ آخر وہ اس زوال پذیر شاعری کے لئے اسقدر فکرمند کیوں ہیں؟ ان کے ذوق کی آسُودگی کے لئے ہزاروں نظمیں بنے بنائے سانچوں میں ڈھل کر روز بازار میں آ رہی ہیں۔ انہیں پڑھیں، ان میں دل لگائیں اور نئی نظم سے اپنا دماغ بچائیں۔ اسی شاعری کو پڑھیں اور پسند کریں جو بغیر دماغ سوزی کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نئی نظم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آزادی اور جمہوریت کے دَور میں نئی نظم کو بھی جینے کا حق تو ہے ہی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اکثر نئی نظمیں یاس و حرماں نامرادی و نا آسودگی اور گھٹن اور جھنجھلاہٹ میں ڈُوبی رہتی ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ اس دَور کی ذہانتوں اور متوسط طبقے کے باشعور ذہنوں کی حقیقی کیفیات ہیں۔ کہاں ہیں وہ وعدے جو اس دَور کے پیامبروں نے کیے تھے؟ کہاں ہیں وہ

خواب جو فیضؔ نے دکھائے تھے، کہاں ہیں وہ سبز باغ جو ہمیں نظر آتے تھے؟ انسان کے اس المیے سے نظر چرا کر آج بھی جھوٹی توقعات اور اُمید کے بہروپ بدلنا فرار اور خود فریبی ہے۔ لیکن نقالی اور فیشن کے طور پر نومیدی و نامرادی کا ڈھونگ رچانا بھی اتنا ہی مذموم ہے جتنا "سُرخ سویرے" کا کھوکھلا نعرہ، نئی نظم مارکس اور فرائڈ کے دلائل کے لئے شواہد پیدا یا جمع کرنے کا نام نہیں ہے۔ سچے احساس، سچے ادراک، سچے اظہار اور سچے بیان کا نام ہے جس کا سرچشمہ زندگی ہے نہ کہ کتابیں اور مشاعرے۔ کتابیں معلومات بہم پہنچاتی ہیں اور تجربے اور مشاہدے کو تقویت دیتی ہیں، ایک باقاعدگی بخشتی ہیں اور بس۔

حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ بعض احباب کو نئی نظم کا کوئی شاعر متوجہ نہیں کر سکا۔ میراجی، راشد سے، احمد ہمیش اور ندا فاضلی تک خواہ مخواہ روشنائی اور کاغذ ضائع ہوا (خونِ جگر کا حساب تو ان احباب کی سمجھ میں آئے گا نہیں) میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان احباب نے ان میں سے کتنے شاعروں کو سمجھنے کی اتنی ہی پُرخلوص کوشش کی جتنی ان لوگوں کو سمجھنے میں کی ہوگی جنھوں نے انھیں متوجہ کیا؟

اس بحث میں "ادبی دُنیا" کے تجزیاتی مطالعوں کو غلط رنگ میں اور غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کے اَدبی نظریات سے کُلیتاً اتفاق نہیں ہے لیکن ان کے اس 'سلسلے' میں ایک نظم کے متضاد معنی شاید ہی بیان کئے گئے ہوں۔ البتہ تجزیہ نگاروں نے ایک ہی نظم کے کئی پہلوؤں پر روشنی ضرور ڈالی ہے۔ اس سلسلے سے نئی نظم کے افہام و تفہیم میں کافی مدد ملی ہے لیکن افسوس کہ بعض احباب اپنے تعصب اور Prejudice کی وجہ سے اس سے منفی اثرات قبول کر کے ہی خوش ہیں۔ آخر میں صرف اتنا اور عرض کر دوں گا کہ ہم عصر ادب کی تقدیر و تخمین میں جلد بازی بہت خطرناک ہے اور ہمیں پچیس برس میں نئی نظم سے اتنے زیادہ مطالبے کرنا اتاولے پن کا ثبوت دینا ہے۔ ▲

ماہر القادری

محسوساتِ ماہر

نگاہوں کو چرا کر رہ گئے ہیں
وہ دل کی زد پہ آکے رہ گئے ہیں

جوابِ خط پہ وہ عذرِ مسلسل
لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں

ستم تمہید ہو شاید کرم کی
اسی دھوکے میں آکر رہ گئے ہیں

●

زوالِ ابنِ آدم ہو رہا ہے
یہ کیا دنیا کا عالم ہو رہا ہے

قدم رکھتے ہی بڑھ جاتی ہے منزل
بہ ظاہر فاصلہ کم ہو رہا ہے

تری پلکوں پہ لرزاں ہیں ستارے
یہ کس ظالم کا ماتم ہو رہا ہے

الطاف مشہدی

غزل

جب بھی گلشن میں کبھی کوئی کلی مرجھائی
ٹیس سینے سے اُٹھی اور لبوں تک آئی

نکہت و نور کی احساس پہ برہم جسم تو بہ
یاد آتے ہی سرِ بام تری انگڑائی

کوئی دلہن ہے شفق زار کی انگنائی میں
اوڑھنی جس نے سر دوشِ فضا لہرائی

کتنے بیدرد ہو پردیس میں رہنے والو
بھول کر بھی نہ تمہیں یاد ہماری آئی

جل اُٹھیں آنکھ میں اشکوں کی حسیں قندیلیں
کسی برہن نے ان اک غزل جب گائی

لوگ اب پھول سے بھی خون طلب کرتے ہیں
اُف چمن دوست زمانے کی کرم فرمائی

کاش الطاف ملے ہم کو بعوض ایماں
کسی دوشیزۂ انگور کی اک انگڑائی

غزلیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

خود چلے آؤ یہاں یا کہ صدا دو ہم کو
ہم گنہگار تمہارے ہیں دُعا دو ہم کو

کیا کریں ہم سے نہیں ہوتی یہ دنیا داری
ہم جو دنیا کے نہیں ہیں تو مٹا دو ہم کو

ہم تمہارے ہیں تمہارے ہی قریب آ بیٹھے
ہوں جو گستاخ تو محفل سے اٹھا دو ہم کو

دامنِ قیس سہی، دامنِ یوسف نہ سہی
اب تو یہ چاک ہے جو چاہے سزا دو ہم کو

اپنی ہی راکھ میں یہ آگ نہ کجلا جائے
اب لگائی ہے تو آنچل کی ہوا دو ہم کو

یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا
پوچھ کر گردشِ دوراں سے بتا دو ہم کو

یا ہمیں قید کرو محبسِ تنہائی میں
یا اُسی دشمنِ جانی سے ملا دو ہم کو

جن کو آنکھوں سے لگایا تو ہمیں چھوڑ گئے
انھیں چہروں، انھیں خوابوں کا پتہ دو ہم کو

سید حرمت الاکرام

رات کی شمع سا بسر تنہا
دل جلایا ہے تا سحر تنہا

خیریت پوچھنے کو آئی ہے
زندگی مجھ کو دیکھ کر تنہا

آفتِ جاں ہے وضعِ ہمسفری
وقت کی راہ سے گزر تنہا

حادثوں نے ہمیں کو تاکا ہے
تھے ہمیں اک دیدہ ور تنہا

دشت میں اپنی ہی تجلی کے
جھلملایا کیا قمر تنہا

کیسی ہمسائگیِ لالہ و گُل
ہے چمن کا شجر شجر تنہا

کچھ نہیں تو رفاقتِ غم تھی
زندگی کس نے کی بسر تنہا!

نقشِ پا بھی ترا نہیں ملتا
ہو گئی دل کی رہگزر تنہا

قتل گاہِ وفا ہی خالی
حرمت آئے ہمیں نظر تنہا

غزل

دوستی کی جو گل عذاروں سے
دشمنی ہو گئی بہاروں سے

ایک طوفاں سے کیا بچی کشتی
لاکھ طوفاں بڑھے کناروں سے

ہم کو اغیار سے گلہ کیا؟
زخم کھائے ہیں ہم نے یاروں سے

ماہ پاروں ہی سے وفا نہ ملی
کیا توقع کریں ستاروں سے

رہ گئے دل میں سینکڑوں ارماں
سینکڑوں غم ملے بہاروں سے

آنسوؤں سے ملا سکوں دل کو
آگ ٹھنڈی ہوئی شراروں سے

وقت آنے دے ہم بھی اے صیاد!
گل تراشیں گے خارزاروں سے

منزلیں خود ہی پاس آئیں گی
ہم نہ گزریں گے رہ گزاروں سے

عاقبت پر نظر ہو کیوں ساحر
دل کو فرصت نہیں نظاروں سے

ساحر ہوشیارپوری

تین غزلیں

دل کی دھڑکن سے نمایاں ہیں اگر تم سن لو
وہ محبت کے پیامات جو ہم تک پہنچے

ہم بلانوش ہیں عالمِ مستی و سرور
بابِ میخانہ سے محرابِ حرم تک پہنچے

شانِ شاہی کو قناعت بہ گدائی ہے شرط
کیوں مرا دستِ دعا دستِ کرم تک پہنچے؟

سست گام ایسے مسافر کو کہے کیوں کوئی
ایک جنبش میں جو ہستی سے عدم تک پہنچے

ہر آہ بے اثر ہے ہر نالہ نارسا ہے
منزل پہ راہی تیرا دیوانہ آ گیا ہے

کیا آمدِ سحر کی آہٹ ملی ہے دل کو
تاروں کی روشنی میں افسانہ بُن رہا ہے

بیگانۂ سکوں ہے جذبات کی یہ دنیا
سینے میں حشرِ ارماں شام و سحر بپا ہے

صحرانوردیاں کیوں مرغوب ہوں نہ دل کو
پھولوں میں رہنے والا کانٹوں سے کھیلتا ہے

غمِ الفت میں جان دی ہوتی
خضر کی عمر مل گئی ہوتی

طاقتِ انتظار تھی کہ نہ تھی
جراتِ انتظار کی ہوتی

نہ ہوا حُسن ملتفت ورنہ
دل کی دنیا بدل گئی ہوتی

گنگناتا کوئی ضیا کی غزل
اور فضا ساز چھیڑتی ہوتی

ضیا فتح آبادی

غم اپنا زمانے سے چھپانا ہی پڑا ہے
فریاد کا دم گھونٹ کے گانا ہی پڑا ہے

کیا چیز تھا گلشن ترے رخسار کے آگے
ہر پھول کو نظروں سے گرانا ہی پڑا ہے

کچھ تنکے سلیقے سے جہاں ہم نے جلائے
بجلی کو وہیں ٹوٹ کے آنا ہی پڑا ہے

عرفانِ گلستاں نہ ہوا صرف گلوں سے
کانٹوں کو بھی سینے سے لگانا ہی پڑا ہے

جن اشکوں کو پیتے رہے رسوائی کے ڈر سے
ان کو کبھی پلکوں پہ سجانا ہی پڑا ہے

گلشن کا اندھیرا تھا کہ بڑھتا ہی چلا تھا
گھبرا کے نشیمن کو جلانا ہی پڑا ہے

جب در جاناں ہم نے علی جام اٹھایا
بادل کو وہیں جھوم کے آنا ہی پڑا ہے

علی احمد جلیلی

کوئی مونس بھی نہیں ہے کوئی ہمدم بھی نہیں
پھر یہ غم کہ خلشِ دل مری پیہم بھی نہیں

شمعِ امید بجھاؤ نہ ابھی دامن سے
روشنی کم ہے مگر اتنی تو مدھم بھی نہیں

کیوں کھلے جاتے ہیں ٹانکے مرے زخموں کے بتا
اے صبا! لالہ و گل کا تو یہ موسم بھی نہیں

شکریہ بخششِ غم کا میں کروں کیسے ادا
دلِ برباد پہ احساں یہ ترا کم بھی نہیں

جانے کیوں دم تری الفت کا بھرے جاتا ہے
دل پہ اگلا سا ترے لطف کا عالم بھی نہیں

اُن سے وابستہ ہیں گزرے ہوئے لمحے اے دل
ورنہ گزرے ہوئے لمحات کا ماتم بھی نہیں

اُن کی یاد آئی ہے پھر مجھ کو رلانے ندرتؔ
جن کے بس میں کہ مرے زخم کا مرہم بھی نہیں

ثریا محمود ندرت

جو قسمتِ غمِ انساں بدل نہیں سکتے
ہمارے ساتھ تو وہ لوگ چل نہیں سکتے

یہ راستے کے خم و پیچ، قافلے والو
مزاجِ دیدہ وراں تو بدل نہیں سکتے

دوا نہیں تو ہمیں زہر ہی دو چارہ گرو
تسلیوں سے تو اب ہم بہل نہیں سکتے

وہ فاصلے ہوں کہ قربت میسر ہوں کہ غم
یہ راہزن تو مرے ساتھ چل نہیں سکتے

جلاؤ دل ہی کہ ٹوٹے غرورِ تیرہ شبی
دیئے تو ایسی ہواؤں میں جل نہیں سکتے

یہ دورِ نو کے خدا ہیں، بجا سہی، لیکن
یہ انقلاب کا رخ تو بدل نہیں سکتے

میں زندہ رہنے کے فن سے ہوں آشنا اے دوست
مجھے یہ اہلِ زمانہ کچل نہیں سکتے

کوئی بھی موڑ اب آئے رہِ طلب میں نظرؔ
ہمارے عزم کے تیور بدل نہیں سکتے

فیروز نظر

غزل

شاہد اختر

مہکا ہے گلِ خونِ وفا، جانیئے کیا ہو
جلتی ہے کوئی شمعِ حنا، جانیئے کیا ہو

بندش ہے لگا ہوں پہ، دل و جاں پہ ہیں پہرے
تعبیر تری خوابِ وفا، جانیئے کیا ہو

مدت سے کسی زلف کی خوشبو نہیں آتی
مصروفیتِ دستِ صبا، جانیئے کیا ہو

شعلہ سا لپکتا ہے کوئی روزنِ در سے
خنداں ہے پھر اک بنتِ حیا، جانیئے کیا ہو

ٹھہری ہے صبا، گردشِ افلاک رکی ہے
کستا ہے کوئی بندِ قبا، جانیئے کیا ہو

باقی ہے ابھی تلخیٔ زہراب لبوں پر
ہے پھر لبِ ساقی پہ "صلا" جانیئے کیا ہو

صالحہ عابد حسین

مامتا کا خزانہ

وہ بار بار بیوی کی نبض ٹٹول رہے تھے۔ چہرہ سفید آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے، ماتھے پر فکر و تردد کی لاتعداد شکن، دل میں کتنی یادیں، کتنے پچھتاوے۔ کتنی غیر آسودہ تمنائیں۔ کتنے تشنہ ارمان۔ مگر بیوی اس وقت ان کی پریشانی، بڑی بہن کی بدحواسی۔ چھوٹی بہن کی بے قراری۔ للّو کی بے چینی اور منظور کی تڑپ ہر چیز سے بے خبر، بے نیاز جانے کس حال میں تھیں، وہ جو ہر بے ہوشی کے بعد ہوش میں آکر مسکرا مسکرا کر سب کو دلاسا دیا کرتی تھیں، اس وقت جانے کیسی بے خبری تھی کہ آدھ گھنٹے سے کسی طرح ہوش نہ آرہا تھا۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد ماتھے پر پسینے کے قطرے نبض کا کہنیوں تک پتہ نہیں۔ سانس کی آمد و شد برائے نام۔

"بھائی جان۔ ڈاکٹر اب تک نہیں آیا؟" بے قراری کے عالم میں چھوٹی بہن نے کہا۔

"اب ڈاکٹر آکر کرے گا بھی کیا" میاں نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"نہیں نہیں بھائی جان ایسے نہ کہیئے" یہ چھوٹی چچازاد بہن انھیں اپنی ماں کی طرح چاہتی تھی۔

"بیٹی صبر کا وقت ہے۔ ہمت کا وقت ہے" ماموں جان نے باہر سے آتے ہوئے کہا، ان کی گوندوں کی پالی بھانجی آنکھوں کے سامنے جا رہی تھی، مگر کچھ اور زیادہ جھکی ہوئی "آواز کچھ اور زیادہ ٹوٹی ہوئی ۔ آنکھوں کی حسرت کچھ اور زیادہ گہری! خدا خدا کرو"

چھوٹی بہن کے آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ اندر بڑی بہن سجدے میں پڑی ماتھا رگڑ رگڑ کر خدا سے اپنی بیٹی کی طرح پیاری بہن کی جان کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

یکایک مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی شمع جھلملائی۔ ڈوبتی نبض واپس آگئی، چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلک آئی۔ پپوٹوں کے اندر پتلیاں تھرکیں، اور گہری شربتی آنکھوں کے دیپ دھیرے دھیرے وا ہوئے، پتلیاں ایک سے دوسرے پھر تیسرے کی طرف مڑیں۔ ہونٹوں کے کونے ذرا سے پھڑکے اور ایک اداس مسکراہٹ

ان پگلیوں کو کیوں کیا ہے۔ تم سب۔ اتنے پریشان ـــــ کیا سمجھے ـــ میں مرگئی ہوں ـــ" رک رک کر انہوں نے کہا "نہیں خدا نہ کرے۔ باجی۔ آپ بے ہوش ہوگئیں تھیں تو ہم سب ذرا پریشان ہوگئے" ـــ چھوٹی بہن نے خوشی سے کپکپاتے لہجے میں کہا اور باورچی خانے سے یخنی لینے بھاگ گئی ـــ ماموں ابا نے شکر کیلئے ہاتھ بلند کر دیئے میاں کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے غور سے بیوی کی طرف دیکھا ـــ یہ کیسی بدلی بدلی لگ رہی ہیں ـــ آنکھوں کی یہ غیر معمولی چمک، ہونٹوں کی یہ معصوم مسکراہٹ! اسفید بالوں کا یہ ہالہ ـــ آج ان کے چہرے پر یہ کیسا ملکوتی حسن ہے؟

کیا وہ انہیں چھوڑ کر جا رہی ہیں ـــ ان کے سارے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی۔

" ارے آپ تو کانپ رہے ہیں ـــ آئیے ذرا میرے پاس بیٹھ جائیے"۔

بیوی نے التجا آمیز لہجے میں میاں سے کہا۔ کتنی حسرت کتنی آرزو تھی ان کی آواز میں ـــ

وہ ان کے پلنگ کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے اور بیوی کے پتلے زرد سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ زندگی میں پہلی بار سب کے سامنے یہ ہاتھ انہوں نے تھاما تھا۔ آہ پرانی تہذیب کی یہ بندشیں و رسم و رواج کی جکڑ بندیاں اور ان دونوں کی اپنی شرمیلی طبعیتیں! وہ کبھی کھل کر گھل مل کر ایک دوسرے سے بات نہ کرسکے، جس تہذیب میں میاں کا فرض بیوی کی ضروریات پوری کرنا اور بیوی کا اس کی خدمت اور اطاعت تک محدود رہتا ہے۔ اُف یہ رسمیں جن کی بدولت محبت کا خزانہ سینے کی گہرائیوں میں مدفون رہتا ہے۔ وہ ہستی کی نعمت ہاتھ آنے پر بھی کھو جاتی ہے

"آپ تو بہت پریشان نظر آرہے ہیں؟" ان کے لہجے میں مسرت کی ہلکی سی جھلک تھی۔

"ہاں۔ نہیں۔ تو میں ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا ـــ" میاں نے بات بنانی چاہی ـــ

" میں ـــ میں بے ہوش نہیں تھی ـــ سو بھی نہیں رہی تھی، جانے کیسی کیفیت تھی ـــ خواب بھی نہ تھا ـــ بیدار بھی نہ تھی ـــ کوئی بڑا شاندار ـــ خوبصورت محل تھا ـــ کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنیاں تھیں۔ اس میں ـــ بڑا خوبصورت باغ۔ رنگ رنگ کے پھول ـــ اور پرندوں کی آوازیں ـــ اتنی پیاری اتنی پیاری ـــ جیسے میرے بچوں کی آوازیں ـــ میں ـــ سفید چمکدار عجیب سا لباس پہنے ایک چاندی جیسے سفید تخت پر بیٹھی تھی ـــ اور میرے ہر طرف سفید پھولوں۔ سفید موتیوں کی لڑیاں سی لٹک رہی تھیں، اور اتنے میں ـــ اتنے میں .... میرے سارے بچے ـــ سب کے سب ہنستے بولتے کھلکھلاتے آکر میرے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ بھائی صاحب کے بچے، بھائی جان کے بچے، آپا اور باجی کے بچے ـــ اور بٹیا کے بچے ـــ منجھلی، جنو اور ہدایت کے بچے، اور ـــ یہ میرا منظورا، اور للوا۔ اور بٹیا ـــ سبھی تو وہاں تھے ـــ سفید ریشمی کپڑے پہنے ـــ میرے گلے میں بانہیں ڈال رہے تھے ـــ میرا منہ چوم رہے تھے ـــ مجھے ستا رہے تھے ـــ میرے ہاتھ سے چیز لے لے کر کھا رہے تھے ـــ" وہ دم لینے کو رکیں ـــ میاں حیرت مجسم بنے بیوی کا چہرہ تک رہے تھے، اور چھوٹی بہن کا ہاتھ میں یخنی کی پیالی کانپ رہی تھی ـــ

" مگر ـــ مگر ـــ ایک عجیب بات تھی صاحب ـــ یہ سب کے سب بڑے چھوٹے، یہ چار چار بچوں کی مائیں اور باپ ـــ یہ سب میرے بچے ـــ سب ہی تو چھوٹے چھوٹے تھے معصوم فرشتوں کے سے چہرے ـــ جیسے اس وقت تھے ـــ جب میں انہیں پالتی تھی۔ یہ سب اتنے چھوٹے کیسے ہوگئے تھے ـــ کیا یہ خواب تو نہ تھا؟

" مگر نہیں ـــ نہیں ـــ یہ خواب نہ تھا ـــ میرے سب بچے میرے پاس آئے تھے ـــ کام چھوڑ کر امتحان چھوڑ کر ـــ گھر چھوڑ کر میں ان سے مل لی ـــ سب سے مل لی صاحب!"

باجی ذرا سی یخنی پی لیجئے، بہن نے اصرار کر کے چند چمچے یخنی کے پلائے اور پھر کوراہین کی ایک اور خوراک بھی پلادی۔

اب آپ سو جائیے باجی۔ تھک گئی ہیں۔

"بیٹا۔ میں تو بہت سو چکی۔ اب۔ اب تو سونا ہی سونا ہے۔ آج ان سے باتیں کروں گی۔ جی بھر کر باتیں کروں گی۔"
انہوں نے میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں ضرور" بمشکل وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

"لکھنؤ سے آج بھی کوئی نہیں آیا؟" انہوں نے ذرا رک کر پوچھا۔

"نہیں" اور یہ کہتے کہتے میاں کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں اپنے سسرالی عزیزوں کا کتنا انتظار ہے۔

"خیر نہ آئیں۔ خوش رہیں۔ آپ رنج نہ کیجئے۔ ہمارا کیا۔ ہم تو خدمت گذار تھے۔ اب ان کو ہماری کیا ضرورت ۔۔۔ زندہ رہیں سب۔ ہم اپنا سفر پورا کر چکے۔ میاں لاکھ کوشش پر بھی ضبط نہ کر سکے۔ آنسو ان کی سفید داڑھی پر ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح مسلسل گر رہے تھے۔

"باجی بڑے بھائی جان کا خط آیا۔ کل وہ آ رہے ہیں"۔ میں نے بات کا رخ بدلنا چاہا۔

"بھائی جان کل آ رہے ہیں۔؟ ارے بیٹا۔ کل تو بہت دور ہے ۔۔۔ لمبا سفر ہے"۔
وہ خلا میں جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ بڑی آپا جانماز سے اٹھ کر ان کے برابر آ کھڑی ہوئی۔ مگر شدتِ غم سے بید کی طرح کانپ رہی تھیں۔

"آپا۔ ہائے آپا ۔۔۔ تمہارا کیا ہوگا۔" منہ ہی منہ میں انہوں نے کہا اور آنسوؤں کے سفید قطرے اُن کی آنکھوں سے نکل کر تکیئے میں جذب ہو گئے۔ بچپن سے انہوں نے اپنی آپا کی ماں کی طرح خدمت کی تھی۔ کتنا سہارا تھا آپا کو ان سے۔

"تم ذرا آرام نہیں کرو گی؟" میاں نے کہا۔
آرام۔ ہاں ہاں۔ اب تو آرام ہی آرام ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر جیسے ہی میاں نے اُٹھنا چاہا انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں نہیں آپ جائیے نہیں۔ جانتی ہوں آپ کی نماز کا وقت ہے۔ آپ جیسا باخدا اور کون ہوگا بھلا۔ مگر آج تو خدا معاف کر دے گا۔ مجھے کبھی نماز میں بھولنا نہیں۔ دعا میں یاد رکھنا۔ میں بہت گنہ گار ہوں۔ کچھ بھی تو نہ کیا اس دنیا میں۔ جی بھر کر آپ کی خدمت بھی تو نہ کی" لہجے میں وہ خلوص جس میں بناوٹ کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا "آپ کو یاد ہے ۔۔۔ جب ہم نے اس جا نماز کے بعد۔ منجھلی کو گود لیا تھا۔ کتنی ننھی سی کمزور تھی وہ ۔۔۔ پر کتنی پیاری۔ افوہ۔ کس مصیبت سے پلی ہے۔ اور اب چار بچوں کی ماں ہو کر اپنے کو بہت بڑا سمجھنے لگی ہے۔ باؤلی۔" آواز میں ایسی جھنکار جیسے جل ترنگ بج رہا ہو۔" اور میری بہن ہائے کتنا چاہتی تھی مجھے۔ وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ بھی تو تھی وہاں ۔۔۔ اس محل میں ۔۔۔" اور اپنی مرحومہ بھاوجی کی یاد میں وہ پھر کھو سی گئیں۔

"رانی۔ رانی ۔۔۔ کہاں ہے ۔۔۔ ہاں ہاں ۔۔۔ وہ تو پڑھ رہی ہے ۔۔۔ اور میرا راجہ بیٹا ۔۔۔ بیٹا دیکھنا تم میرے بچوں کو کبھی کچھ مت کہنا ۔۔۔ نہیں تو ۔۔۔ نہیں تو میں خفا ہو جاؤں گی" ۔۔۔ اور چھوٹی بہن کے لاکھ کوشش کرنے پر بھی اپنی ہچکیوں کا گلا نہیں گھونٹ پا رہی تھی ۔۔۔ کتنا چاہتی ہیں وہ اس کے بچوں کو۔

ان کی آنکھیں اب بند تھیں۔ جانے کن تصورات میں کھو گئیں تھیں۔ اور میاں ٹکٹکی لگائے ان کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ اور کان میں ان کا یہ جملہ گونج رہا تھا۔ میں نے کچھ بھی تو نہ کیا اس دنیا میں۔ آپ کی جی بھر کر خدمت بھی تو نہ کر سکی"۔

"کچھ بھی نہ کیا" باجی کا مرجھایا ہوا جھریوں پڑا چہرہ سفید بال، بے رنگ ہونٹ اور بیماریوں کا مارا ہوا جسم دیکھتے دیکھتے ۔۔۔ وہ جانے کس دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ بوڑھا بیمار

چہرہ جس پر سکتے ہی دکھوں کی پرچھائیں تھیں ماند پڑ گئی، یہ بیمار و نحیف جسم غائب ہو گیا۔۔۔

ایک گلاب کے پھول کی سی رنگت، سرو کے سے قد بھرے بھرے جسم والی شرمیلی نازنین سیاہ بالوں کی لٹیں چہرے پر سے ہٹاتی ان کے سامنے تھی ـــ حسن و جوانی کا ایک دلکش مرقع۔

"بھائی جان ڈاکٹر آ گیا" وہ ایک دم چونک پڑے۔

ڈاکٹر آیا۔ دیکھا بھالا۔ کچھ دوا دی۔ ایک انجکشن لگایا اور بے کچھ کہے سنے باہر چلا گیا۔ ان سے اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ پھر آ کر بیوی کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے، جو شاید انجکشن کے اثر سے سو گئی تھیں۔

آہ۔ ان کی خدمت میں یہ پھول سی رنگت مرجھا گئی۔ سیاہ بال سفید ہو گئے۔ گدرایا جسم سوکھ گیا۔ وہ حسن و جوانی خواب و خیال ہو گئی! مگر ـــ مگر ان کی سیرت کا حسن۔ کتنا نکھر گیا ان کی شخصیت کی دلکشی کتنی بڑھ گئی ہے"۔

آج پہلی بار یہ ادراک ان کے اندر جاگا تھا کہ ان کی بیوی کیسی شخصیت اور کیسی سیرت کی مالک تھی ـ خاندان بھر کی محبوب ـ گاؤں بھر میں ہر دل عزیز، بچوں کی سرپرست و خدمت گذار مردوں کے لئے، قابلِ احترام اور عورتوں کے لئے قابلِ رشک ہستی ـــ یہ ان پڑھ قصبائی شریف زادی، جو نئی تعلیم نئی تہذیب اور کلچر سے ناآشنا تھی۔ یہ سیدھی سادی معمولی ذہن و دماغ کی عورت کیسے اتنی محنت اتنی عزت، اتنی عقیدت کا مرکز بن گئی کیسے؟ کیسے؟

ان کے ذہن کے پردے پر چالیس سالہ بیاہتا زندگی کی تصویریں بن اور بگڑ رہی تھیں۔

نئی نویلی دلہن ساس سسر اور بھرے کنبے کی دن رات خدمت کر رہی ہے، بڑی نند اور جیٹھ کے لڑکے لڑکیوں سے جو عمر میں تھوڑے ہی چھوٹے ہوں گے۔ یوں گھل مل گئی ہے جیسے ان کے ساتھ کی کھیلی ہو۔

میاں کے لئے طرح طرح کی چیزیں پکا رہی ہے، چھپ چھپ کر اصرار کر کے کھلا رہی ہے۔ اور ہر کام کے لئے دن رات مستعد رہتی ہے۔

وہ یار دوستوں میں سے رات گئے واپس آئے ہیں تو۔ بیوی کو دیکھتے ہیں جو گرمی میں چولھے کے آگے بیٹھی اونگھ رہی ہے تاکہ انھیں گرم کھانا کھلا سکے۔

سب لوگ دسترخوان پر بیٹھ کر دنیا بھر کی نعمتیں کھا رہے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتی۔ اُن کے کان میں لوگوں کے فقرے پڑتے ہیں: "انھیں کسی کے ساتھ کھانا پسند نہیں" اور وہ سوچتے ہیں۔ شاید چھپ کر زیادہ اچھا کھاتی ہو۔۔۔۔۔

وہ باورچی خانے میں جاتے ہیں تو ملتے ملازم عورتوں اور لڑکوں کے درمیان بیٹھے موٹے اناج کی روٹی دال، اور بچا کھچا سالن کھاتے پاتے ہیں، ان کی خفگی پر وہ ہنس کر کہتی ہے "مجھے تو یہی پسند ہے"۔ اور سب کی باتیں شیر و شکر کی طرح حلق سے اتار لیتی ہے۔

اڑوس پڑوس کی غریب عورتیں، دائی، بیوہ بڑھیا، میاں کی ستائی بیویاں، سسرال کی ماری لڑکیاں آتی رہتی ہیں اور اس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں، اپنا دکھ درد اس سے کہتی ہیں اس کی خدمت دل و جان سے کرتی ہیں، اور محبت کے میٹھے بول سے دل کا درد کم کر کے واپس جاتی ہیں، اور اکثر یہی نہیں ان کی جھولی یا مٹھی میں کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

یہ عالی نسب شریف سیدانی ان میلی کچیلی گنوار عورتوں میں یوں گھل مل کر بیٹھی ہے کہ اس میں اور ان میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔ دوسروں کا کیا ذکر انھیں خود بعض وقت یہ برا لگتا ہے کہ لوگوں کے طنز و فقرے وہ تیکھی چتون کے ساتھ سہہ جاتی، کبھی کبھار الجھ پڑتی۔ اس معاملے میں وہ شوہر تک کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرتی۔ حالانکہ ویسے اس کا ہر حکم پورا کرنا وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی تھی۔

سے لئے کسی اور بچے کی [illegible]

آج ان کے [illegible] اس
خوفناک [illegible] کا احساس
ہو رہا تھا جس کا ساتھ [illegible] دل کو چھتیس سال
تک کرید رہا تھا۔ [illegible] کی
دولت لٹائی اور بدلے میں کچھ نہ پایا۔

انھوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، آنکھیں بند کر لیں ــــ انھیں ایسا لگا جیسے ان کا تین برس کا تندرست و حسین بچہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھا ہے...

اور بیوی کی وہ مسرور و مطمئن صورت ان کی نظروں میں پھر گئی، جب وہ شاخِ تمنا کے بار سے بوجھل حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ان کے سامنے آئی تھی۔ ماں بننے کی امید کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے پہلے یہ شرف نہ کسی اور عورت کو ملا ہے نہ آئندہ ملے گا... اور پھر جب انھوں نے اپنے پیارے بچے کے چہرے پر پہلی نظر ڈالی تو دونوں کے دلوں میں محبت کی ایک نئی کرن جگمگائی امید کا ایک سنہرا سورج طلوع ہوا۔ دوستی کا ایک اٹل احساس پیدا ہوا۔

آج ــــ آج وہ زندہ ہوتا تو چھتیس برس کا کڑیل جوان ہوتا۔ ماں کا سہارا باپ کی ضعیفی کا آسرا۔ مگر ــ یہ تندرست بچہ وبا کی بیماری میں یوں چٹ پٹ ختم ہو گیا جیسے کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا، اور ان کی بیوی ــ نوجوان، شگفتہ مزاج تندرست لڑکی۔ ایک دم بالکل بدل گئی۔

اس کا غم کتنا گہرا، کتنا سخت تھا! مگر اس کی بے پناہ قوتِ برداشت اور صبر کی وجہ سے اس کا پورا اندازہ کسی اور کا کیا ذکر وہ خود بھی نہ لگا سکے۔ وہ تو خود غم کے ساگر میں یوں ــــ ڈوب گئے کہ جیسے کسی اور کی خبر ہی نہ رہی۔ ممتا کی اس بھڑکتی آگ کی لپٹ بھی انھیں نہ پہنچی جس نے نوجوان ماں کے دل میں آبلے ڈال دیئے تھے۔

رہا ہے۔

وہ چھپ چھپ کر ہر ضرورت مند کی مدد کر ہر دکھی کا درد کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا اب تو سونا بچی پونجی ہی کیا۔ کم حیثیت ماں باپ کی بیٹی، معمولی حیثیت [illegible] کروں گے شوہر کی بیوی۔ اور ساتھ ہی اتنی خوددار کہ باپ بھائی یا [illegible] شوہر کسی سے [illegible]ت نہیں بتائی۔ مگر کبھی کچھ نہ مانگا، کوئی حق نہ جتایا، ضرور[illegible] نہیں سکتی، جو بھی پاس ہوتا مصیبت زدہ کی مصیبت وہ دیکھ نہ[illegible] سے کا اناج، اپنی ضرورت کے چند پیسے، نیا نئی تن کے کپڑے [illegible] کسروں کی نذر کر دیتی، اور پھر کیسے کیسے بہانے بنا کر اپنے اس "عیب" کو چھپاتی ــــ وہ کبھی الجھ پڑتے، کبھی ہنس دیتے اس کی اس سادہ لوحی پر۔

ان کی نماز کا وقت کب کا نکل چکا تھا۔ ایک اداس مٹیالی شام کی پرچھائیاں در و دیوار پر کانپ رہی تھیں چھوٹی بہن اپنی باجی کے پاؤں دباتے دباتے وہیں پائیں پہ سر رکھ کر اونگھ گئی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے یوں ہی دن رات جاگتے اور خدمت کرتے۔ بڑی آپا ہاتھ میں تسبیح لیے تخت پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں۔ ان کے آنسو خشک تھے مگر چہرہ ایک مجسم آہ بن گیا تھا۔

اس نے سوتے سوتے کروٹ بدلی اور کراہ کے ساتھ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی "للو ــ رانی ــ ننھی ــ منجھلی ــ راجا"

آہ! اس وقت بھی اسے اپنا نہیں اپنے پالے بچوں کا خیال ہے۔ للو، راجا، رانی، منجھلی، ننھی ہی کیا، خاندان پڑوسی اور گاؤں کے کتنے بچوں کو اس نے ماں کا پیار اور خدمت بخشی تھی۔ ممتا کا یہ سرچشمہ جو دریا کے کنارے پیاسا رہا۔ جسے خود اولاد کی والہانہ محبت کی نعمت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ جس کو وہ خدمت، وہ پیار، وہ اپنائیت نہ مل سکی جو ہر ماں کا حق ہوتا ہے کسی نے سچے دل سے اسے ماں نہ سمجھا۔ بچے پل جاتے، بڑے ہو جاتے تو اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاتے ــ کبھی کبھی بے دردی سے اس سے چھین لیے جاتے اور وہ اپنی زخمی ممتا پر پھایا رکھے

اور پھر —— برسوں —— جیسے یہ آس لگائے رہے کہ
اس کی شاخ تمنا پھر سے ہری ہوگی۔ اس کی گود اور ان کا دل
پھر آباد ہو سکا۔ مگر آس بندھتی اور ٹوٹ جاتی۔ ماں کی گود
خالی اور باپ کا دل سونا ہی رہا —— لوگوں نے بہت چاہا
وہ دوسری شادی کرلیں مگر انہوں نے حقارت بھری مسکراہٹ
کے ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا۔ خدا کی مرضی اور مشیت میں کس
کو دم مارنے کی مجال ہے! ایک بے گناہ کو اس قصور کی سزا
کیوں دی جائے جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں —— اور انہوں نے
اپنی مایوسی اور غم کو خدا کی عبادت اور محبت میں ڈبونے کی کوشش
کی اور غیر محسوس طور پر بیوی سے دور ہوتے گئے۔ دوستی اور محبت
کا جو پودا اس ننھے فرشتے کے سائے میں پروان چڑھ رہا تھا
اس کی باڑھ ماری گئی۔

مگر بیوی؟ اس نے کیسے اس غم اس محرومی کے
درد کو جھیلا؟

آج پہلی بار ان کو درد کی ان ٹیسوں کا احساس
ہو رہا تھا جو اس خاموش بے زبان ہستی کے سینے میں اٹھتی رہی
تھیں۔ اس نے ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کوئی خواہش نہیں کی۔
اس طرح ان کی خدمت اور دلداری میں لگی رہی۔ وہ تو الٹی
احسان مند تھی کہ میاں نے اسے سوکن کے روح فرسا جلاپے
سے بچا لیا۔ وہ اسی کے ہیں۔ یہ فخر و مسرت کیا کم تھا؟ لیکن
کبھی کبھی انہیں اس کی آنکھوں میں کوئی التجا، کوئی بھوک، کوئی
تڑپ نظر آتی - - - - - - - - - -
- - - - - - - - مگر وہ اس طرف
کوئی خاص توجہ نہ دیتے کہ کیا آرزو ہے۔ جو ان آنکھوں میں
تڑپ رہی ہے۔ اور پھر اس کی آنکھوں کی یہ بھوک اور تڑپ
دھیرے دھیرے آسودہ ہونے لگی۔ انہوں نے خدا کی محبت و
عبادت میں اپنے غم کو ڈبو دیا اور بیوی نے انسانوں کی خدمت
اور محبت کے مرہم سے اپنے زخم کا علاج کیا۔

لالٹین کی دھیمی زرد روشنی بیوی کے بے رنگ چہرے
پر پڑ رہی تھی —— گھر میں سب بے کھائے پیئے چپ چاپ
ادھر ادھر بیٹھے یا لیٹے اونگھ رہے تھے —— اور وہ ٹکٹکی لگائے
بجھتے ہوئے چراغ کی مدھم لَو کو دیکھے جا رہے تھے۔

اس کے اندر سے عورت کا کیسا سچا کتنا سندر
روپ نکھر کر سامنے آیا۔ اس کا دل ممتا کا خزانہ لٹاتا۔ اس
کے کوئی بچہ نہ تھا مگر وہ سب کی ماں تھی۔ خاندان میں محلے پڑوس
میں گاؤں میں جس کسی کے بچہ ہونے والا ہوتا اور اس کی مدد اور
سہارا ڈھونڈتا تو کس ولولے، کس شوق اور جوش سے وہ اس
عزت کو قبول کرتی تھی۔ اپنوں اور غیروں کے کتنے بچے اس نے
کروائے، کتنے ننھے بچوں کی دن رات خدمت کی۔ زچہ خانے میں
ماں اور نانی دادی پیر پھیلا کر سوتیں اور ساری رات ننھے یا
ننھی کو گود میں لئے بیٹھی رہتی۔ اور جب مائیں اپنے نوزائیدہ
بچوں کو گود میں لے کر میکے سے سسرال، یا اسپتال سے گھر واپس
جائیں تو وہ خالی ہاتھ اپنے گھر آجاتی اس وقت اس کے چہرے
پر جو حسرت اور بے بسی ہوئی تھی اس کو کوئی بھی نہ سمجھا۔
کسی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

پھر خاندان کے کتنے بچے اس نے پال پوس کر
بڑے کئے۔ دس دس پندرہ پندرہ برس تک ان کو کلیجے سے
لگا کر دن رات خدمت کرتی، پال پوس کر بڑا کر دیتی۔ پھر
کوئی پڑھنے چلا جاتا۔ کسی کے ماں باپ بلا لیتے، کسی لڑکی کی
شادی ہو جاتی —— مگر ان کی محبت بدستور باقی رہتی۔
وہ کہیں ہوں، کہیں رہیں، اپنے اس کے بچے "میرے بچے" وہ
بڑے فخر سے کہا کرتیں۔ مگر خود اس نے کسی پر احسان نہیں رکھا
حق نہیں جتایا۔ سورج کا کام ہے روشنی اور گرمی پہنچانا۔ اس
کا کام تھا خدمت کرنا اور محبت کی کرنیں بکھیرنا۔ بس اس کے
سیوا اور پریم کا بدلہ صرف ایک لفظ تھا "اماں بی" جس
سے ہر بڑا چھوٹا اسے مخاطب کرتا تھا۔ اس بیماری میں بھی

وہ چپ چاپ کچھ ضرورت مند کی مدد کر رہی ہے۔

ہر دکھ کا مداوا کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس بیچاری نے اپنی پوری زندگی یہی کیا۔ کم حیثیت ماں باپ کی بیٹی، معمولی حیثیت کے شوہر کی بیوی۔ اسے تنہا اتنی مجبوروں اور کہ باپ بھائی، شوہر کسی سے کبھی کچھ نہ مانگا، کوئی حق نہ جتایا، ضرور نہیں بتائی۔ مگر مصیبت زدہ کی مصیبت وہ دیکھ نہ سکتی، جو بھی پاس ہوتا تن کے کپڑے ہوں یا اپنی ضرورت کے چند پیسے، فیاضی سے دوسروں کی نذر کر دیتی، اور پھر کیسے کیسے بہانے بنا کر اپنے اس عیب کو چھپاتی ——— وہ کبھی الجھ پڑتے، کبھی ہنس دیتے ان کی اس سادہ لوحی پر۔

ان کی نماز کا وقت کب کا نکل چکا تھا۔ ایک اداس مٹیالی شام کی پرچھائیاں در و دیوار پر کانپ رہی تھیں چھوٹی بہن اپنی باجی کے پاؤں دباتے دباتے وہیں پائیں پہ سر رکھ کر اونگھ گئی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے یوں ہی دن رات جاگتے اور خدمت کرتے۔ بڑی آپا ہاتھ میں تسبیح لیے تخت پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں۔ ان کے آنسو خشک تھے مگر چہرہ ایک مجسم آہ بن گیا تھا۔

اس نے سوتے سوتے کروٹ بدلی اور کراہ کے ساتھ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی "للو —— رانی —— ننھی —— منجھلی —— راجا"

آہ! اس وقت بھی اسے اپنا نہیں اپنے پالے بچوں کا خیال ہے۔ للو، راجا، رانی، منجھلی، ننھی ہی کیا، خاندان، پڑوس اور گاؤں کے کتنے بچوں کو اس نے ماں کا پیار اور خدمت بخشی تھی۔ ممتا کا یہ سرچشمہ جو دریا کے کنارے پیاسا رہا۔ جسے خود اولاد کی والہانہ محبت کی نعمت کبھی نصیب نہ ہوئی۔ جس کو وہ خدمت، وہ پیار، وہ اپنائیت نہ مل سکی جو ہر ماں کا حق ہوتا ہے کسی نے سچے دل سے اسے ماں نہ سمجھا۔ بچے پل جاتے، بڑے ہو جاتے تو اپنے ماں باپ کے پاس چلے جاتے —— کبھی کبھی بے دردی سے اس سے چھین لیے جاتے اور وہ اپنی زخمی ممتا پر پھاہا رکھنے کے لیے کسی اور بچے کی خدمت میں لگ جاتی۔

آج ان کو پہلی بار اس بھیانک سناٹے، اس خوفناک خلا، اس دلدوز محرومی کا، اس پیار کی بھوک کا احساس ہو رہا تھا، جس کا سامنا محبت سے بھرپور اس دل کو بیتیس سال تک کرنا پڑا تھا۔ جس نے اپنی لٹی ممتا کی یاد میں عمر بھر محبت کی دولت لٹائی اور بدلہ میں کچھ نہ چاہا، کچھ نہ پایا۔

انھوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، آنکھیں بند کر لیں —— انھیں ایسا لگا جیسے ان کا تین برس کا تندرست و حسین بچہ ان کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھا ہے۔

اور بیوی کی وہ مسرور و مغرور صورت ان کی نظروں میں پھر گئی، جب وہ شاخِ تمنا کے بار سے بوجھل حیا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ان کے سامنے آتی تھی۔ ماں بننے کی امید کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے پہلے یہ شرف نہ کسی اور عورت کو ملا ہے نہ آئندہ ملے گا۔۔۔ اور پھر جب انھوں نے اپنے پیارے بچے کے چہرے پر پہلی نظر ڈالی تو دونوں کے دلوں میں محبت کی ایک نئی کرن جگمگائی، امید کا ایک سنہرا سورج طلوع ہوا۔ دوستی کا ایک اٹل احساس پیدا ہوا۔

آج —— آج وہ زندہ ہوتا تو چھتیس برس کا کڑیل جوان ہوتا۔ ماں کا سہارا، باپ کی ضعیفی کا آسرا۔ مگر۔ یہ تندرست بچہ وبا کی بیماری میں یوں چٹ پٹ ختم ہو گیا جیسے کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا، اور ان کی بیوی —— نوجوان، شگفتہ مزاج تندرست لڑکی۔ ایک دم بالکل بدل گئی۔

اس کا غم کتنا گہرا، کتنا سخت تھا!! مگر اس کی بے پناہ قوتِ برداشت اور صبر کی وجہ سے اس کا پورا اندازہ کسی اور کا کیا ذکر وہ خود بھی نہ لگا سکے۔ وہ تو خود غم کے ساگر میں یوں —— ڈوب گئے کہ جیسے کسی اور کی خبر ہی نہ رہی۔ ممتا کی اس بھڑکتی آگ کی لپٹ بھی انھیں نہ پہنچی جس نے نوجوان ماں کے دل میں آبلے ڈال دیے تھے۔

اور پھر ـــــ برسوں ـــ بس یہ آس لگائے رہے کہ
ی شاخ تمنا پھر سے ہری ہوگی۔ اس کی گود اور ان کا دل
آباد ہوسکا۔ مگر آس بندھتی اور ٹوٹ جاتی ۔ ماں کی گود
ں اور باپ کا دل سونا ہی رہا ـــــ لوگوں نے بہت چاہا کہ
دوسری شادی کرلیں مگر انہوں نے حقارت بھری مسکراہٹ
ساتھ اس تجویز کو رد کر دیا۔ خدا کی مرضی اور مشیت میں کس
دم مارنے کی مجال ہے! ایک بےگناہ کو اس قصور کی سزا
ں دی جائے جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ـــ اور انہوں نے
، مایوسی اور غم کو خدا کی عبادت اور محبت میں ڈبونے کی کوشش
وہ غیر محسوس طور پر بیوی سے دور ہوتے گئے۔ دوستی اور محبت
جو پودا اس ننھے فرشتے کے سائے میں پروان چڑھ رہا تھا
ں کی باڑھ ماری گئی۔

مگر بیوی؟ اس نے کیسے اس غم اس محرومی کے
رد کو جھیلا؟

آج پہلی بار ان کو درد کی ان ٹیسوں کا احساس
در ہا تھا جو اس خاموش بےزبان ہستی کے سینے میں اٹھتی رہی
ہیں۔ اُس نے ان سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کوئی خواہش نہیں کی۔
ں طرح ان کی خدمت اور دلداری میں لگی رہی۔ وہ تو الٹی
حسان مند تھی کہ میاں نے اُسے سوکن کے روح فرسا جلاپے
سے بچالیا۔ وہ اسی کے ہیں۔ یہ فخر و مسرت کیا کم تھا؟ لیکن
ہی کبھی انہیں اس کی آنکھوں میں کوئی التجا کوئی بھوک، کوئی
ڑپ نظر آتی ـــــ - - - - - - - - - -
- - - - - - ـــــ مگر وہ اس طرف
وئی خاص توجہ نہ دیتے کہ کیا آرزو ہے۔ جو ان آنکھوں میں
ڑپ رہی ہے۔ اور پھر اس کی آنکھوں کی یہ بھوک اور تڑپ
دھیرے دھیرے آسودہ ہونے لگی۔ انہوں نے خدا کی محبت و
عبادت میں اپنے غم کو ڈبو دیا اور بیوی نے انسانوں کی خدمت
اور محبت کے مرہم سے اپنے زخم کا علاج کیا۔

لالٹین کی دھیمی زرد روشنی بیوی کے بےرنگ چہرے
پر پڑ رہی تھی ـــــ گھر میں سب بےکھائے پیئے چپ چاپ
اِدھر اُدھر بیٹھے یا لیٹے اونگھ رہے تھے ـــ اور وہ ٹکٹکی لگائے
بجھتے ہوئے چراغ کی مدھم لَو کو دیکھے جا رہے تھے۔

اس کے اندر سے عورت کا کیا سچا کتنا سندر
روپ نکھر کر سامنے آیا۔ اس کا دل ممتا کا خزانہ لٹاتا۔ اس
کے کوئی بچہ نہ تھا مگر وہ سب کی ماں تھی۔ خاندان میں محلے پڑوس
میں گاؤں میں جس کسی کے بچہ ہونے والا ہوتا اور اس کی مدد اور
سہارا ڈھونڈتا تو کس ولولے کس شوق اور جوش سے وہ اس
عزت کو قبول کرتی تھی۔ اپنوں اور غیروں کے کتنے چلے اس نے
کروائے، کتنے ننھے بچوں کی دن رات خدمت کی۔ زچہ خانے میں
ماں اور نانی دادی پیر پھیلا کر سوتیں اور ساری رات ننھے یا
ننھی کو گود میں لئے بیٹھی رہتی۔ اور جب مائیں اپنے نوزائیدہ
بچوں کو گود میں لے کر میکے سے سسرال یا اسپتال سے گھر واپس
جائیں تو وہ خالی ہاتھ اپنے گھر آجاتی اس وقت اس کے چہرے
پر جو مسرت اور بےبسی ہوتی تھی اس کو کوئی بھی نہ سمجھا۔
کسی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔

پھر خاندان کے کتنے بچے اس نے پال پوس کر
بڑے کئے۔ دس دس پندرہ پندرہ برس تک ان کو کلیجے سے
لگا کر دن رات خدمت کرتی، پال پوس کر بڑا کر دیتی۔ پھر
کوئی پڑھنے چلا جاتا۔ کسی کے ماں باپ بلا لیتے، کسی لڑکی کی
شادی ہو جاتی ـــــ مگر اُن کی محبت بدستور باقی رہتی۔
وہ کہیں ہوں، کہیں رہیں، اپنے آپ کو "اس کے بچے" "میرے بچے" وہ
بڑے فخر سے کہا کرتیں۔ مگر خود اس نے کسی پر احسان نہیں دکھا
حق نہیں جتایا۔ سورج کا کام ہے روشنی اور گرمی پہنچانا۔ اس
کا کام تھا خدمت کرنا اور محبت کی کرنیں بکھیرنا۔ بس اس کے
سیوا اور پریم کا بدلہ صرف ایک لفظ تھا" اماں بی" جس
سے ہر بڑا چھوٹا اُسے مخاطب کرتا تھا۔ اس بیماری میں بھی

وہ اپنے ہر ہر بچے کو یاد کرتی رہیں۔ مگر کبھی شکایت نہیں کی کہ وہ انھیں دیکھنے کیوں نہیں آتے، بلکہ ان کی طرف سے عذر کرتیں "کیا کریں نوکری ہے"۔ "پڑھائی ہے"۔ "بچے ہیں اپنی ہی پریشانیاں ان کو کیا کم ہیں"۔ کتنا وسیع قلب ہے اِس دبلے پتلے جسم میں!!

للّو ایک دم سوتے سے چونک اٹھا۔ "اماں بی ـــــ اماں بی ـــــ کیسی ہیں" اس نے روتے ہوئے کہا ـــ وہ اٹھے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "سو جاؤ بیٹا" بھرے گلے سے کہا اور اس چھ برس کے بچے کا بھرا بھرا سیاہ چہرہ دیکھنے لگے۔ ان کی محبت کی آخری بر کھا سے یہی ننھی جان سیراب ہوئی تھی۔ للّو کی آواز میں انھیں اِن بیسیوں غریب، یتیم، بے سہارا بچوں کی آوازیں گونجتی سنائی دے رہی تھیں جو آج ـــــ شاید پھر بے ماں کے ہو جائیں۔ "ماں بی۔ اماں بی ـــــ"

جو بچہ محلے یا گاؤں یا خاندان میں ماں کی آغوش سے محروم ہو جاتا ـــــ اور جس کو ـــ غریبی، بیماری یا کسی اور وجہ سے کوئی دوسرا پالنے کی زحمت گوارا نہ کرنا چاہتا وہ بے تکلف لا کر ان کی گود میں دیدیا جاتا "ایسے تو تم ہی پال سکتی ہو" اور وہ اُسے یوں چھاتی سے لگاتیں جیسے اس سعادت کے انتظار میں تو آج تک زندہ تھیں۔ اور پھر کبھی مہینوں، کبھی سالوں یہ بے ماں کا بچہ ان کی آغوش میں پروان چڑھتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ "ان کے بچے" کو ٹیڑھی نظر سے دیکھ سکے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـــــ آج تیس سے لے کر پانچ چھ سال کی عمر تک کے یہ سب بچے۔ اپنے، غیر، امیر، غریب، ماں باپ والے، بے ماں باپ کے ـ کیا یہ سب آج بے ماں کے ہو جائیں گے؟

درد کی ایک تیز لہر ان کے سینے میں اُٹھی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا اور وہ پھر پلنگ کے پاس آ بیٹھے۔

جانے کب اور کیسے ـــــ وہ خود بھی اس کے ساتھ

ان بچوں کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت، اور دیکھ بھال میں دلچسپی لے کر انھیں اپنے دل کا خلا کچھ بھرتا محسوس ہوتا۔ وہ اکثر بھول جاتے کہ یہ بچے ان کے نہیں کسی اور کے ہیں یہ تلخ حقیقت اس وقت یاد آتی جب کوئی بچہ انھیں چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا۔ گذشتہ چند سال سے بڑھاپے کے سائے میں اکثر ایسے موقع آئے جب گھر میں بقول ان کے "صرف بڈھا بڈھی رہ گئے"۔ ہاں وقت سے پہلے ہی غم نے ان دونوں کو بوڑھا کر دیا تھا۔ جب بچوں کی معصوم صورتیں آنکھوں کو تراوٹ نہ بخشیں، جب ان کی توتلی باتیں کانوں میں رس نہ گھولتیں۔ جب گھر کا آنگن ویران ہوتا ـــــ تو وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا ڈھونڈتے اور ایک دوسرے کے دل کے درد کو محسوس کرتے ـــــ وہ اب مشکل سے کبھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے۔ بیوی نے مدتوں سے میکہ جانا چھوڑ دیا تھا" انھیں کون دیکھے گا؟" وہ اپنے علاج دوا کے لئے بھی انھیں چھوڑ کر جانا گوارا نہ کرتیں۔ وہ خود کہیں جاتے تو دو چار دن سے زیادہ نہ ٹھیر سکتے۔

" وہ اکیلی ہوں گی"۔ "بڑھاپے میں میاں بیوی ہی ایک دوسرے کا سچا سہارا ہوتے ہیں" ابھی چند سال سے ان کو اس کا احساس ہوا تھا۔ مگر اس محبت اور دوستی کا جو چپکے ہی چپکے پروان چڑھ گئی تھی انھیں ابھی دو مہینے پہلے اندازہ ہوا ـــــــ جب وہ سخت بیمار پڑے ہوئے تھے اور ان کی کمزور اور بیمار بیوی ان کی تیمار داری میں یوں لگی رہتی تھیں کہ نہ دن کو دن کہتیں نہ رات کو رات۔ جیسے سچ مچ ہو گئی تھیں۔ اور اٹھتے بیٹھتے بس ایک ہی دعا ان کی زبان اور دل سے نکلتی "الٰہی ان کو صحت دے ـــ ان کی بلا مجھے آ جائے۔ یہ بچ جائیں اور اپنے ہاتھوں مجھے قبر کو سونپیں"۔

جانے کیسے وقت یہ دعا مانگی گئی تھی کہ ان کے پلنگ سے اٹھتے ہی بیوی بیمار پڑ گئیں۔ قلب کا سخت دورہ پڑا۔ چھوٹی بہن دور دراز کے بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آئی اور

تیمارداری اور گھرداری سنبھال لی۔ وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اس کے علاج پر خرچ کرتے رہے۔ ڈاکٹر، حکیم، ہومیوپیتھ بلائے گئے، انجکشن لگے، دوائیں دی گئیں مگر کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا ــــ وہ بار بار روکتی رہیں، "اتنا خرچ کیوں کر رہے ہو" جس نے عمر بھر خدمت کی ــ اپنے کو ان کے لئے تج دیا ــــ اب بھی اُسے یہ فکر ہے کہ اس پر اتنا خرچ ہوگا تو میاں کو پریشانی اٹھانی پڑے گی ــــ مگر آہ ــــ وہ کیا نہیں کرسکتے اپنی اس چالیس سالہ رفیق کی جان بچانے کے لئے؟ کیا خدا ان کی دعا نہ سنے گا؟ اس نے بیوی کی دعا قبول کرلی؟ کیا وہ سچ مچ اس پہ نثار ہوگئیں؟

رات گہری ہوچکی تھی ــ کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے چلانے کی بھیانک آوازیں رات کے سناٹے کو اور مہیب بنا رہی تھیں ــ آسمان پر ساتویں کا چاند ڈوب چکا تھا ــ کہکشاں کی دودھیا سڑک اور تابناک ہوگئی تھی ــ

"میرا لال ــ میرا چاند ــ تو آگیا میرے بچے"

بیوی کی تیز جاندار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی

چونک کر وہ کھڑے ہوگئے۔

"کون آگیا؟ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ اس پر جھکے۔

بیوی بند آنکھیں ہاتھ سے بستر پہ کچھ ٹٹول رہی تھیں ــــ

"باجی ــ باجی کون آگیا؟" بہن نے گھبرا کر کہا۔

"میرا کبن ــــ دیکھو ــــ ابھی ــــ یہ بیٹھا تھا نا یہاں ــ کبن ــــ"

وہ تڑپ کر کھڑے ہوگئے۔

"کیا ہوا بھائی جان ــــ باجی یہ کیا کہہ رہی ہیں"

روتے ہوئے بہن نے پوچھا۔

"بی بی تمہاری باجی کا بچہ انہیں لینے آگیا ہے" ایک چیخ کی طرح ان کے منھ سے نکلا۔

بہن تڑپ کر باجی پر جھکی، آپا لڑکھڑاتی ہوئی بڑھیں

"باجی ــ باجی ــــ باجی" بہن چلا رہی تھی ــــ

"بی بی ــــ بٹیا ــ آنکھیں کھولو" آپا بلک رہی تھیں ــ

"اماں بی ــ اماں بی" منظور چلا رہا تھا۔

"اماں ــــ اماں ــــ" للو رو رہا تھا۔

آسمان پر ایک ستارہ ٹوٹا اور تیزی سے روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا فضا میں کہیں غائب ہوگیا۔

"وہ سدھار گئیں" بہت آہستہ سے ان کے منھ سے نکلا اور جھک کر اپنے ہاتھ سے انہوں نے بیوی کی شربتی آنکھیں بند کردیں

ممتا کا سرچشمہ خشک ہوگیا۔ محبت کی تصویر مٹ گئی۔

خدمت کی دیوی نے دم توڑ دیا۔

فرشتوں کا جہنم

رئیس نجمی امروہوی

اس آدمی کو کافی دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد جب میں نے اپنے ذہن میں اپنے ماضی کی یادوں کو سمیٹا تو مجھے یہ پہچاننے میں غلطی دیر نہ لگی کہ وہ جے ہی ہے۔ جے کا خیال آتے ہی میرے تصور میں اب سے آٹھ سال پہلے کا اپنا کالج کا وہ منچلا ہیرو گھوم گیا جو ہر روز نت نئے فیشن کے کپڑے بدل کر کالج آیا کرتا تھا پڑھائی کے علاوہ جس کی ہابی صرف یہ تھی کہ وہ کالج کی لڑکیوں کے چہروں پر مختلف زاویوں سے تنقید کرے اور چلتی ہوئی لڑکیوں پر طرح طرح کے ریمارکس پاس کرے، اس وقت وہ ایک انگریزی دوا فروش کی دوکان پر کھڑا ہوا کسی آدمی سے بات چیت کر رہا تھا اور میں کانپور اپنے آفس کے ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ اس کی موجودہ حالت ایک ہی نظر میں میرے لئے بڑی تشویشناک بن گئی اور مجھے سکتہ سا طاری ہو گیا کیونکہ وہ پہلا جے نہ تھا۔ میرے سامنے جو جے کھڑا ہوا تھا، اس کے بال تیل سے عاری تھے۔ جسم پر ایک ہلکے نیلے رنگ کی معمولی کپڑے کی بشرٹ تھی جو خاکی رنگ کی پرانی پتلون کے ساتھ بالکل میچ نہیں کر رہی تھی، میں اپنی جگہ پر کھڑا لمحہ بھر کے لئے یہی سوچنے لگا کہ اس قدر زبردست تبدیلی ان آٹھ سالوں کے درمیان اس میں کیوں؟ اور کیسے؟ پیدا ہو گئی۔ نیلما سے شادی کرنے کے بعد تو اس کی زندگی بڑی خوشگوار گذرنی چاہیئے تھی۔ نیلما کالج کی سب سے زیادہ حسین وہ لڑکی تھی جس کے متعلق زیادہ تر لڑکوں کا یہ خیال تھا کہ اس کی ایک مسکراہٹ ایک جنت سے کم نہیں ہوتی، لیکن جے کو یہ جنت بغیر کسی عبادت کے ملگئی تھی۔

گذرے دنوں کے گندے واقعات گڈمڈ ہو کر میرے ذہن میں دھیرے دھیرے آئے اور جلدی جلدی گذر گئے۔

وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا، میں نے اس کے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں غلطی تو نہیں کر رہا ہوں"

وہ ایک دم چونک پڑا اور پلٹ کر میری جانب دیکھا پھر چند لمحوں کے لئے خیالات کے عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا دھیرے

ولا "تمہارا خیال اگر غلط ہے تو میں غلط ہوں، اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو میں بھی صحیح ہوں"۔ یہ کہتے ہی اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور مجھے گلے سے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ یہاں کیسے آئے؟

"ادھر سے اسٹیشن تک ٹرین سے، اور اسٹیشن سے ہوٹل تک رکشہ سے اور ہوٹل سے یہاں تک اپنے پیروں سے" میرا یہ مزاحیہ جواب سنکر وہ مسکرا دیا۔

جس شخص سے وہ بات چیت کر رہا تھا وہ اب اس سے اجازت طلب کر کے جا چکا تھا۔

"اپنے بارے میں کچھ بتاؤ کہ تم یہاں کب سے ہو" اور نیلا کہاں ہے؟ میں نے اس کے حالات شدت سے جاننے کے جذبے کو بیدار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"میں یہاں کیوں ہوں؟ اس بارے میں اسوقت میں خود نہیں بتا سکتا"۔ اس نے خلاف توقع مجھے بڑا روکھا سا جواب دیا۔

"میرے سوال کا یہ جواب تو نہیں"

"بہت سے سوال لاجواب بھی تو ہوتے ہیں کیا ضروری ہے کہ تم میری باتوں کو اپنے سوال کا جواب سمجھو"۔

"بات کو معمہ بنانے کی عادت شاید تم نے اب تک نہیں چھوڑی ہے" میں نے اس کے ماضی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بات کہنے سے پہلے تم خود اپنے بارے میں بھی سوچتے کہ تم اپنے بچپن کی کتنی عادتیں چھوڑ چکے ہو"۔

"کیا تمہارا موڈ اس وقت بحث کرنے کا ہے"؟

"موڈ کی میری زندگی میں کبھی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی موڈ اس دنیا میں صرف ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کی زندگی کو ہر آسائش میسر ہوتی ہے، یہاں اگر موڈ نہ ہو تو بھی وہی کرنا پڑیگا جو موڈ ہونے پر کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ باتیں فرصت میں کرینگے ہیں۔ تم سب سے پہلے یہ بتاؤ مجھے موڈ پر بات یاد آئی اپنا ساتھی سردار من موہن سنگھ ان دنوں کہاں پر ہے۔ جس سے تمہاری کافی گہری دوستی تھی اور اس دوستی کے بارے میں پروفیسر موتی نے ایک بار پوری کلاس کے سامنے تم سے کہا تھا" یا تو تم دونوں کی دوستی غلط ہے یا پھر ہندوستان کی تاریخ"۔ اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے حالات پر پردہ ڈالدیا اور میرے ماضی کی کتاب کا ایک صفحہ میرے سامنے آگیا۔

"من موہن نے کئی ٹرک مول لئے ہیں اب تو وہ ہزاروں کا آدمی بن گیا ہے"۔ میں نے من موہن کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

میں نے دیکھا ہزاروں کا لفظ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگا، کچھ وقت کچھ نصیب کی باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کیا اس کی شادی سرجیت سے ہوگئی تھی، جس کا وہ ان دنوں دیوانہ تھا، یا وہ عاشق نامراد یونہی ناکام رہا؟

"اس نے تو اب تک شادی نہیں کی لیکن سرجیت کی شادی ہو چکی ہے، ویسے اس نے شادی نہ کرنے کی قسم نہیں کھائی ہے" یہ سن کر اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ایک بات اور بتاؤ گے۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے پھر بولا

"وہ اپنا لانگ فیلو سہیل سنا ہے سول جج ہو گیا ہے، مجھے دو سال پہلے ضمیر نے لکھنؤ میں بتایا تھا، کیا یہ صحیح ہے؟"

"تم نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی سنا جج بننے کے علاوہ اس نے اپنی زندگی کے لئے کوئی اور خواب ہی نہ دیکھا تھا میں نے اس کی سنی ہوئی بات کو یقین کی حدوں تک پہنچا دیا۔

"اور اپنے دوسرے ساتھی کہاں کہاں ہیں؟ تمہیں تو کافی لوگ ملتے رہتے ہوں گے، میں تو اب بہت لوگوں کے نام بھی بھول گیا ہوں" "کچھ بیکار ہیں تو کچھ باکار ہو گئے ہیں۔ کچھ باہر چلے گئے کچھ وطن میں ہی رہ کر اپنے باپ کی روٹیاں کھا کر کسرت کر کے اپنے جسم بنا رہے ہیں یا تو انھیں نوکری ملتی نہیں یا پھر وہ نوکری کو نہیں ملتے"۔

میں نے گفتگو کے اس موضوع کو مختصر کرنا چاہا لیکن بچپن کا ساتھی تھا بہت سے خوابوں کی تعبیریں ہم دونوں نے ایک ساتھ دیکھی تھیں، میرے ماضی کی کچھ یادوں کا وہ بھی برابر کا شریک تھا، کئی واقعے میں نے اُسے سنائے کئی قصے اس سے سنے آخر میں وہ بولا "یہاں کب تک رہو گے؟ اور کہاں کون سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو؟

"ہوٹل بلیو اسپاٹ میں" میرا قیام ہے اور میں یہاں کل تک رہوں گا"۔ میں نے اُسے بتایا۔

"تمہارے پروگرام میں اگر کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ پڑے تو ایک بات کہوں جب تک تم یہاں رہو کیا حرج ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھاؤ"

"میرے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، اس وقت یونہی گھومنے کے لئے نکل آیا تھا جب قسمت سے تم نظر آگئے اب بھی مجھے ایک کام سے ہی جانا ہے" میں نے اپنے آفس کے کام کی کئی مجبوریاں اس کے سامنے رکھیں لیکن اس نے میری ہر مجبوری کو اپنی ضد کا نشانہ بنا دیا وہ مجھے کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ ہو رہا تھا وقتی تواضع کے لئے زبردستی قریب کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے گیا ہوئے کو چائے کا آرڈر دینے کے بعد ہم ہوٹل کے ایک پُرسکون گوشہ میں آبیٹھے اس نے اپنی جیب سے چار مینار سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ساتھ ہی ساتھ ماچس نکالکر میرے سامنے پیش کرتے ہوئے ایکدم بولا،

"سگریٹ تو ضرور پیتے ہو گے"۔

میں نے پیکٹ اور ماچس واپس کرتے ہوئے انکاریہ انداز میں گردن ہلا دی۔

پھر اس نے خود ہی پیکٹ سے سگریٹ نکالکر سلگایا اور پہلا ہی کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے ہوٹل کی محدود فضا میں اڑا دیئے۔ میں پھر سے اس کی آٹھ سالہ زندگی کے بارے میں جاننے کے لئے بے حد مضطرب اور بے تاب ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن میں یہی نہیں سوچ پا رہا تھا کہ اس سے اس کی زندگی کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے دوبارہ بات کا کون سا سرا پکڑوں جو وہ ٹھیک ٹھیک مجھے سب کچھ بتا دے اور کوئی جملہ میرے منہ سے ایسا نہ نکل جائے جسے وہ اپنی موجودہ زندگی پر طنز سمجھ لے یا پھر مجھے الٹا جواب نہ دیدے۔ کئی بار کئی سوال اُبھرے اور ذہن کی وسعتوں میں ڈوب گئے۔ وہ نہ جانے کیوں خاموش تھا شاید کچھ سوچنے لگا تھا۔

آخرکار ضبط کی حدود سے باہر نکل کر میں نے اپنے ذہن میں کئی بار اُٹھنے والے اسی ایک سوال کا جواب اس سے پوچھا اور بولا "تم اِن دنوں ان حالات میں کیوں ہو؟ پتا جی کہاں ہیں؟ ماتا جی کہاں ہیں؟ وہ اپنی چھوٹی چنچل سیما کہاں ہے؟ جو ہرا تو ار کو ہم سب لوگوں کو چائے بنا کر پلایا کرتی تھی، اور وہ میں کالج نیلما کہاں گئی؟ جس کو تم نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنا لیا تھا"؟

یہ سنتے ہی وہ کچھ لمحوں کے لئے کھو سا گیا اور پھر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "کیا ایک دم سب باتیں جان لو گے یہ ایک لمبی داستان ہے اِسے سنانے کے لئے وقت چاہیئے، اور وقت جب ملے گا جب تم میرے گھر آؤ گے۔

چائے آئی اور ختم ہو گئی۔ اچانک گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے وہ ایک دم بولا" میری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے اور اب مجھے چلنا چاہیئے۔ کرسی سے اُٹھتے ہوئے اس نے کچھ سوچا اور اپنی پینٹ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اندر ہی اندر اپنی انگلیاں چلائیں، اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

"ایک بات کہوں محسوس بالکل مت کرنا تم میرے اپنے ہو اِس لئے بے تکلفی سے کہہ رہا ہوں، ہوٹل کا بل تمہیں ہی ادا کرنا ہے آج مہینے کی پہلی تاریخ ہے، اور میرے پاس ہے ــــــ!"

میں نے اس کے چہرے پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، اس کے چہرے پر ندامت کا کوئی بھی نشان نہ تھا مجھے اس وقت اس کی یہ بات عجیب سی لگی پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی موجودہ حالت پر ترس آیا اور میں نے اپنی جیب سے پرس نکالکر پانچ روپے کا ایک نوٹ اسکے

ین تھما دیا۔

ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بعد باقی بچے ہوئے پیسے اس کے ہاتھوں میں تھے اور ہم ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ـــ "پانچ روپے نوٹ تمہیں آج ہی شام کو واپس کر دونگا' اتنا کہتے ہی اس نے روپیہ اور ریزگاری بھی اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالدی۔ نے جاتے بولا "تمہارے ساتھ یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے کافی دیر ہوگئی اور میں بغیر رکشہ کے ڈیوٹی پر نہیں پہنچ سکوں گا' آج شام حالت میں تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہے' اور ہر قیمت پر بجے تک میرے گھر آجانا ہے۔ کام تو زندگی کے ساتھ لگے ہی تے ہیں" اس نے ایک پرچے پر اپنا پورا پتہ لکھ کر میرے وں میں تھما دیا' پھر سڑک پر آ کر ایک رکشہ والے کو آواز اور اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔

اور میں اپنے ہوٹل کی طرف چلدیا جہاں سے مجھے ضروری ذات لینا تھا اور سیدھا ڈائریکٹریٹ آف انڈسٹریز کے آفس تھا' اُس سے جدا ہونے کے بعد میرے ذہن میں اُسکی شخصیت عجیب سوالیہ نشان بنکر ابھرنے لگی اور ڈوبنے لگی' میں نے تصور میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ زندگی کے کسی دوراہے پر برسوں کا سنگی ساتھی یوں مجھے اچانک اس حالت میں کانپور ل جائے گا' کیونکہ یہ اب سے کچھ ہی سال پہلے کی بات ہے جب ڈگری کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ جب ہی وہ پہلا لڑکا تھا سے میں وہاں کے ماحول میں پہلی بار متعارف ہوا تھا اُن دنوں کی شخصیت پورے کالج کے لئے بڑی پُرکشش تھی وہ گورے اور لمبے قد کا بڑا خوبصورت اور خوش مزاج نوجوان تھا نے اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کو کبھی غائب نہ دیکھا وہ بیک کالج کی کئی کئی لڑکیوں سے رومانس لڑا لیتا تھا اور اُن میں دوسرے لڑکوں کی طرح اُس کی قسمت پر رشک کیا کرتا لیکن یہ بات اُس کے مزاج میں تھوڑا دیر تک رہی اور جب وہ فورتھ ایئر میں آیا تو نہ جانے کیوں اس کی طبیعت میں یکایک سنجیدگی آگئی' اور اس سنجیدگی نے کالج کی سب سے زیادہ حسین اور چنچل لڑکی نیلما کو اُسے اپنانے پر مجبور کر دیا۔

وہ مظفر نگر کے کسی نواحی علاقہ کا رہنے والا تھا' اس کے باپ ہمارے یہاں کی تحصیل میں رجسٹرار تھے' فورتھ ایئر پاس کر لینے کے بعد اُن دونوں نے ہی کالج چھوڑ دیا تھا شادی کے بعد کچھ دنوں تک وہ مجھے ملتا رہا لیکن نہ جانے اس کے حالات کیا بنے بگڑے کہ وہ مدتوں شہر میں دکھائی نہ دیا ادھر میں بھی دو تین ماہ باہر رہا' لیکن واپس وطن آنے پر مجھے یہ معلوم ہوا کہ کافی دنوں پہلے اس کے والد کا تبادلہ لکھنؤ کے قریب کسی جگہ پر ہوگیا ہے۔ دھیرے دھیرے وقت کی گرد یادوں پر جم گئی اور وہ میرے ذہن کے کسی کونے میں جا کر چھپ گیا۔ اتنی قربت ہونے کے باوجود بھی اس کا کبھی کوئی خط میرے پاس نہ آیا۔ لیکن آج اس کا کانپور میں مجھے یوں مل جانا میرے لئے ایک حیرت ناک بات سے کم نہ تھا۔ اچانک مجھے اپنا نوٹ یاد آیا۔ اور نوٹ کی یاد آتے ہی مجھے اس کی شخصیت محض ایک فراڈ معلوم ہونے لگی' اور اُس کے لئے نفرت کا گہرا جذبہ میرے دل میں ابھر آیا۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ سب کچھ سچ ہو جو کچھ اُس نے مجھ سے کہا ہے ممکن یہ بھی ہے کہ اُس کا کوئی گھر ہی نہ ہو اور ممکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے مجھے گھر بلانے کے لئے نوٹ کی زنجیر میرے پاؤں میں ڈالدی ہو کیونکہ میں بھی تو کسی طرح اُس کے گھر آنے کو تیار نہ ہو رہا تھا۔ یہی بات درست ہو سکتی ہے میرے دل نے تائید کی اور اس تائید نے میرے دل میں اس کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز جاننے کی بڑی بے تابی پیدا کر دی اس نے بھی جو کچھ تجسس میرے ذہن کے لئے اپنی گفتگو کے دوران چھوڑا تھا اب میں اُسے جاننے کے لئے بے حد بے چین ہونا شروع ہوگیا تھا۔

جلدی جلدی اپنے آفس کا کام ختم کرنے کے بعد میں نے

میں نے گفتگو کے اس موضوع کو مختصر کرنا چاہا لیکن بچپن کا ساتھی تھا بہت سے خوابوں کی تعبیریں ہم دونوں نے ایک ساتھ دیکھی تھیں، میرے ماضی کی کچھ یادوں کا وہ بھی برابر کا شریک تھا، کئی واقعے میں نے اُسے سنائے کئی قصے اس سے سنے آخر میں وہ بولا "یہاں کب تک رہو گے؟ اور کہاں کون سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"ہوٹل بلیو اسپاٹ میں" میرا قیام ہے اور میں یہاں کل تک رہوں گا"۔ میں نے اُسے بتایا۔

"تمہارے پروگرام میں اگر کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ پڑے تو ایک بات کہوں جب تک تم یہاں رہو کیا حرج ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھاؤ"

"میرے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، اس وقت یونہی گھومنے کے لئے نکل آیا تھا جب تم تم نظر آ گئے اب بھی مجھے ایک کام سے ہی جانا ہے" میں نے اپنے آفس کے کام کی کئی مجبوریاں اس کے سامنے رکھیں لیکن اس نے میری ہر مجبوری کو اپنی ضد کا نشانہ بنا دیا وہ مجھے کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ ہو رہا تھا وقتی تواضع کے لئے زبردستی قریب کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے گیا! بوائے کو چائے کا آرڈر دینے کے بعد ہم ہوٹل کے ایک پُرسکون گوشہ میں آ بیٹھے اس نے اپنی جیب سے چارمینار سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ساتھ ہی ساتھ ماچس نکالکر میرے سامنے پیش کرتے ہوئے ایکدم بولا،

"سگریٹ تو ضرور پیتے ہو گے"۔

میں نے پیکٹ اور ماچس واپس کرتے ہوئے انکاریہ انداز میں گردن ہلا دی۔

پھر اس نے خود ہی پیکٹ سے سگریٹ نکالکر سلگایا اور پہلا ہی کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے ہوٹل کی محدود فضا میں اڑا دیئے۔ میں پھر سے اس کی آٹھ سالہ زندگی کے بارے میں جاننے کے لئے بے حد مضطرب اور بے تاب ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن میں یہی نہیں سوچ پا رہا تھا کہ اس سے اس کی زندگی کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے دوبارہ بات کا کون سا سرا پکڑوں جو وہ ٹھیک ٹھیک مجھے سب کچھ بتا دے اور کوئی جملہ میرے منہ سے ایسا نہ نکل جائے جسے وہ اپنی موجودہ زندگی پر طنز سمجھ لے یا پھر مجھے الٹا جواب نہ دیدے۔ کئی بار کئی سوال اُبھرے اور ذہن کی وسعتوں میں ڈوب گئے۔ وہ نہ جانے کیوں خاموش تھا شاید کچھ سوچنے لگا تھا۔

آخرکار ضبط کی حدود سے باہر نکل کر میں نے اپنے ذہن میں کئی بار اُٹھنے والے اسی ایک سوال کا جواب اس سے پوچھا اور بولا "تم اِن دنوں ان حالات میں کیوں ہو؟ پتا جی کہاں ہیں؟ ماتا جی کہاں ہیں؟ وہ اپنی چھوٹی چنچل سیما کہاں ہے؟ جو ہر اتوار کو ہم سب لوگوں کو چائے بنا کر پلایا کرتی تھی، اور وہ حسن کا لعل نیلما کہاں گئی؟ جس کو تم نے سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنا لیا تھا؟"

یہ سنتے ہی وہ کچھ لمحوں کے لئے کھو سا گیا اور پھر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "کیا ایک دم سب باتیں جان لو گے، یہ ایک لمبی داستان ہے اسے سنانے کے لئے وقت چاہیئے، اور وقت جب ملے گا جب تم میرے گھر آؤ گے۔

چائے آئی اور ختم ہو گئی۔ اچانک گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے وہ ایک دم بولا "میری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے اور اب مجھے چلنا چاہیئے۔ کرسی سے اُٹھتے ہوئے اس نے کچھ سوچا اور اپنی پینٹ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اندر ہی اندر اپنی اُنگلیاں چلائیں، اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

"ایک بات کہوں محسوس بالکل مت کرنا تم میرے اپنے ہو اس لئے بے تکلفی سے کہہ رہا ہوں، ہوٹل کا بل تمہیں ہی ادا کرنا ہے آج مہینے کی پہلی تاریخ ہے، اور میرے پاس ــــــ!

میں نے اس کے چہرے پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، اس کے چہرے پر ندامت کا کوئی بھی نشان نہ تھا مجھے اس وقت اس کی یہ بات عجیب سی لگی پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی موجودہ حالت پر ترس آیا اور میں نے اپنی جیب سے پرس نکالکر پانچ روپے کا ایک نوٹ اسکے

تھ میں تھما دیا۔

ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بعد باقی بچے ہوئے پیسے
ب اس کے ہاتھوں میں تھے اور ہم ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے
ں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ــــ" پانچ روپے
یہ نوٹ تمہیں آج ہی شام کو واپس کردونگا' اتنا کہتے ہی اس
بقیہ روپیہ اور ریزگاری بھی اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالدی۔
اتے جاتے بولا" تمہارے ساتھ یہاں بیٹھے بیٹھے مجھے کافی دیر ہوگئی
ہے اور میں بغیر رکشہ کے ڈیوٹی پر نہیں پہنچ سکوں گا' آج شام
ہر حالت میں تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہے' اور ہر قیمت پر
چار بجے تک میرے گھر آجانا ہے۔ کام تو زندگی کے ساتھ لگے ہی
رہتے ہیں" اس نے ایک پرچے پر اپنا پورا پتہ لکھ کر میرے
ہاتھوں میں تھما دیا' پھر سڑک پر آکر ایک رکشہ والے کو آواز
دی' اور اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔

اور میں اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا جہاں سے مجھے ضروری
کاغذات لینا تھا اور سیدھا ڈائریکٹریٹ آف انڈسٹریز کے آفس
جانا تھا' اس سے جدا ہونے کے بعد میرے ذہن میں اسکی شخصیت
عجیب عجیب سوالیہ نشان بنکر ابھرنے لگی اور ڈوبنے لگی' میں نے
کبھی تصور میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ زندگی کے کسی دوراہے پر
برابرسوں کا سنگی ساتھی تجے مجھے اچانک اس حالت میں کانپور
میں مل جائے گا' کیونکہ یہ اب سے کچھ ہی سال پہلے کی بات ہے جب
وہ ماڈگری کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ تجے ہی وہ پہلا لڑکا تھا
جس سے میں وہاں کے ماحول میں پہلی بار متعارف ہوا تھا اُن دنوں
اس کی شخصیت پورے کالج کے لیے بڑی پُرکشش تھی وہ گورے
رنگ اور لمبے قد کا بڑا خوبصورت اور خوش مزاج نوجوان تھا
میں نے اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ کو کبھی غائب نہ دیکھا وہ بیک
وقت کالج کی کئی کئی لڑکیوں سے رومانس لڑا لیتا تھا اور اُن
دنوں میں دوسرے لڑکوں کی طرح اُس کی قسمت پر رشک کیا کرتا
تھا۔ لیکن یہ بات اُس کے مزاج میں تھرڈ ایئر تک رہی اور جب وہ

فورتھ ایئر میں آیا تو نہ جانے کیوں اس کی طبیعت میں یکایک
سنجیدگی آگئی' اور اس سنجیدگی نے کالج کی سب سے
زیادہ حسین اور چنچل لڑکی نیلما کو اُسے اپنانے پر مجبور کر دیا۔
وہ مظفرنگر کے کسی نواحی علاقہ کا رہنے والا تھا' اس کے باپ
ہمارے یہاں کی تحصیل میں رجسٹرار تھے' فورتھ ایئر پاس
کر لینے کے بعد اُن دونوں نے ہی کالج چھوڑ دیا تھا شادی کے
بعد کچھ دنوں تک وہ مجھے ملتا رہا لیکن نہ جانے اس کے حالات
کیا سے بگڑے کہ وہ مدتوں شہر میں دکھائی نہ دیا ادھر میں
بھی دو تین ماہ باہر رہا' لیکن واپس وطن آنے پر مجھے یہ معلوم
ہوا کہ کافی دنوں پہلے اس کے والد کا تبادلہ لکھنؤ کے قریب
کسی جگہ پر ہو گیا ہے۔ دھیرے دھیرے وقت کی گرد یادوں پہ
جم گئی اور تجے میرے ذہن کے کسی کونے میں جاکر چھپ گیا۔ اتنی
قربت ہونے کے باوجود بھی اس کا کبھی کوئی خط میرے پاس
نہ آیا۔ لیکن آج اس کا کانپور میں مجھے یوں مل جانا میرے لئے
ایک حیرت ناک بات سے کم نہ تھا۔ اچانک مجھے اپنا نوٹ یاد آیا۔
اور نوٹ کی یاد آتے ہی مجھے اس کی شخصیت محض ایک فراڈ معلوم
ہونے لگی' اور اُس کے لئے نفرت کا گہرا جذبہ میرے دل میں ابھر
آیا۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا ہو سکتا ہے وہ سب کچھ سچ ہو جو
کچھ اُس نے مجھ سے کہا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اُس کا کوئی گھر ہی نہ ہو
اور لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے مجھے گھر بلانے کے لئے نوٹ کی
زنجیر میرے پاؤں میں ڈالدی ہو کیونکہ میں بھی تو کسی طرح اُس
کے گھر آنے کو تیار نہ ہو رہا تھا۔ یہی بات درست ہو سکتی ہے
میرے دل نے تائید کی اور اس تائید نے میرے دل میں اس کی
زندگی اور اس کے نشیب و فراز جاننے کی بڑی بےتابی پیدا کر دی
اس نے بھی جو کچھ تجسس میرے ذہن کے لئے اپنی گفتگو کے دوران
چھوڑا تھا اب میں اُسے جاننے کے لئے بےحد بےچین ہونا شروع
ہو گیا تھا۔

جلدی جلدی اپنے آفس کا کام ختم کرنے کے بعد میں نے

جے کے گھر کا رخ کیا۔ کافی پوچھ تاچھ کے بعد آخر میں نے اس کا گھر پا ہی لیا۔ اس کے بتائے ہوئے دروازے پر پہونچ کر میں نے دھیرے سے دستک دی۔ "جے پال صاحب" جواب میں اندر سے ایک بیمار اور لاغر عورت دروازہ پر آئی ایک بچہ اسکی گود میں تھا' اور دوسرا اس کی ساری کا دامن پکڑے ہوئے رو رہا تھا' اسے میں عورت ہرگز نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ عورت نہیں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ جے کے گھر میں سوائے نیلما کے اور کوئی عورت نہیں ہو سکتی لیکن اس عورت کو دیکھ کر میں سراپا حیرت بن گیا اور میں سوچنے لگا نیلما کے ساتھ جے کی زندگی خوشگوار نہ گذر سکی' اور وہ دھوکہ دیکر اُسے چھوڑ کر چلی گئی ہے یا پھر وہ مرگئی ہے' اب جے نے کسی اور لڑکی کو اپنا لیا ہے اور یہی اس کی برباد زندگی کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جے نیلما سے بے حد محبت کرتا تھا۔ میرے سوال کا جواب میرے سامنے تھا' اب جے پال کو بھی بتانے کی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی لیکن ایک لمحہ بعد جب میں نے ذہن پر زیادہ زور دیکر اس عورت کے چہرے میں نیلما کے نقوش تلاش کئے تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کا چھپا ہوا چہرہ ابھر آیا۔ وہ تو نیلما ہی تھی ـــ میں ہی غلطی پر تھا۔ میرا سوال میرے ذہن میں پھر پلٹ آیا اور میں اُلجھ کر رہ گیا۔

"جے پال صاحب یہیں پر رہتے ہیں؟" میں نے اُلجھن کے بھنور سے نکلتے ہوئے بے ساختہ اس سے سوال کیا۔

"جی ہاں" لیکن اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں"۔ وہ دھیرے سے بولی۔

اب وہ بھی شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مجھے ایسا یاد پڑتا ہے جیسے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور کہا میں آپ ہی کے ساتھ کچھ سال پہلے ۔ جی۔ ایس۔ کالج کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں میں اپنے آفس کے ایک کام سے کل یہاں آیا تھا آج اچانک میری ملاقات جے سے راستے میں ہوئی تھی' اُس نے ہی مجھے گھر کا پتہ بھی دیا تھا اور چار بجے ملنے کو بھی بلایا تھا اور آپ ـــ!

میں ابھی اپنی بات پوری بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی اور یہ کہتے ہوئے وہ فوراً اندر چلی گئی "میں کمرہ کھول رہی ہوں آپ تشریف رکھئے" اس نے کمرہ کھولدیا اور چلی گئی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ابھی صرف پونے چار بجے کا وقت تھا اور جے نے مجھے چار بجے کا وقت دیا تھا۔ کمرے میں بیٹھتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ ان دنوں اسکی مالی حالت اچھی نہیں ہے کیونکہ کمرے کے اندر اچھے فرنیچر کی بجائے دو مونڈھے تھے' ایک ٹوٹی ہوئی کرسی' اور ایک چھوٹی سی میز تھی' جس پر میز پوش کی جگہ پرانا اخبار پڑا ہوا تھا' کمرے کی چھت اور دیواروں سے معلوم ہوتا تھا کہ کمرے کی سفیدی برسوں سے نہیں ہوئی ہے۔ سچ ہے ہم کتنی حسین اور سنہرے مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں اسکے سامنے جب حالات کے سیاہ اندھیرے ہی ہو سکتے ہیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بری عادت کا شکار ہو گیا ہو۔ کالج چھوڑنے کے بعد اُسے کوئی غلط سوسائٹی مل گئی ہو اور اس سوسائٹی نے اس کی زندگی کو تاریک راہوں پر ڈالدیا ہو' اور ان بری حرکتوں کی وجہ سے اس کے باپ نے اُسے گھر سے نکالدیا ہو اور اب وہ دربدر مارا پھر رہا ہے۔ لیکن اُس نے اُس وقت یہ سب مجھے بتانا مناسب کیوں نہیں سمجھا؟ اور میرے سامنے اپنی زندگی کو ایک معمہ کیوں بنا دیا؟ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو ـــــ!

یکلخت میری سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ جے کمرے میں داخل ہوا۔ آتے ہی بولا "میں سمجھتا ہوں میرے آنے میں زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ہے تم کتنی دیر پہلے کے آئے ہوئے ہو"۔

"میں خود ابھی ابھی آیا ہوں تم بھی وقت پر آئے ہو"۔

"گھر تو آسانی سے مل گیا؟ یا تلاش کرنے میں کوئی دشواری پڑی"۔

"دشواری اگر پڑی بھی ہو تو اس کا تمہارے اوپر کیا اثر

پڑ سکتا ہے"۔

وہ مسکرایا اور اندر گھر میں چلا گیا۔ چند ہی منٹ کے وقفے کے بعد وہ واپس آ گیا اور آتے ہی بولا "تم کیا سوچ رہے ہو؟"۔

"تمہاری زندگی اور تمہارے حالات کے بارے میں" میں نے ایک دم جواب دیا۔

"کچھ زیادہ بے چین ہے"

"تو سنو! میری مختصر سی زندگی سا خاکہ بھی ہے اور تمہاری ہوٹل والی باتوں کا جواب بھی۔ میں نے ہوٹل میں تمہیں یوں نہیں بتایا کہ تمہیں ان حالات کا وہاں صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ پتاجی کا تبادلہ امروہہ سے فتح پور کو ہوا تھا، تم مجھے جاتے وقت نہیں مل سکے تھے۔ جس کا مجھے بے حد افسوس رہا تھا، صرف ایک ماہ فتح پور رہنے کے بعد اچانک دل کا دورہ پڑنے سے پتاجی کا انتقال ہو گیا، ان کی سروس کے اس وقت تک کئی سال اور باقی تھے، وہ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا بیمہ تھا نہیں جو مجھے کچھ مل جاتا اور میرے مستقبل کے لئے روشنی کی کرن بن جاتا جو کچھ پاس تھا وہ سب سیتا کی شادی میں لگا دیا ماتاجی اب سے ایک سال پہلے مر چکی ہیں اب میں ہوں، نیلما ہے اور بچے ہیں"۔ اس نے تھوڑی دیر تک کچھ اور سوچا، اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی زہرخند مسکراہٹ ہونٹوں پہ لاتے ہوئے کہنے لگا: "پتاجی کی موت کے بعد بڑی دوڑ دھوپ کرنے پر مجھے ایک معمولی سی پرائیویٹ نوکری ملی تھی جس کو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کیا لیکن کچھ دنوں بعد وہ نوکری میرے باس کی چڑچڑی عادت کی نذر ہو گئی پچھلے کچھ دنوں سے ایک ٹریننگ لیکر اسی شہر میں ملازم ہو گیا ہوں میرے دماغ کے مہینے بھر کے عرق کی قیمت کل ایک سو پچاس روپے ہیں"۔ اس نے سارے نوٹ میرے سامنے ڈال دئیے۔ نوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مختصر طور پر اپنے مہینے بھر کے خرچ کا حساب مجھے اپنی انگلیوں پر گن کر بتایا اور کچھ نوٹ الگ بچا کر پچپن روپیہ میرے سامنے گن ڈالے اور بولا "آج مہینے کی پہلی تاریخ ہے ادھر ادھر کے قرض ادا کرنے کے بعد کل پچپن میری جیب میں ہیں اور ابھی پورے تیس دن باقی ہیں، میری بیوی ان دنوں بیمار ہے میرے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں"۔

اس کے حالات سنکر میرا دل بھر آیا" ان پانچ بچوں میں ہر مہینے کوئی بیمار ضرور رہتا ہے نہ اچھا کھانے کو ملتا ہے اور نہ اچھا پہننے کو میسر آتا ہے، اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں یہ میری حالت سے ہی اندازہ لگا سکتے ہو"

"تم سروس کس ڈیپارٹمنٹ میں کرتے ہو؟" میں نے اس سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے معلوم کیا۔

اس نے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے شرماتے شرماتے لہجے میں کہا "کیا کروگے؟ یہ پوچھکر!

"ہو سکتا ہے کوئی نئی راہ تمہارے لئے تلاش کروں"۔

"نئی راہ تو میں جب اپناؤں گا جب میں پرانی راہ چھوڑوں اور پرانی راہ میں چھوڑنا نہیں چاہتا کہ اس راہ پر کھڑا ہوا میرا وجود اندھیروں کا ایک مینار ہوتے ہوئے بھی بہت سے دوسرے لوگوں کو راستہ دکھاتا رہتا ہے"۔

"لیکن اس راہ کو مجھے بتانے میں تمہارا کیا حرج یا کیا نقصان ہے؟"

"حرج تو کچھ بھی نہیں اور نہ ہی کوئی نقصان ہے میری ذاتی زندگی اور میری ملازمت جب بہ یک وقت کسی شخص کے سامنے آتی ہیں تو مذاق کی صورت بن جاتی ہیں، اور مجھے یہ یقین ہے کہ تم بھی یہ سنکر ہنسوگے"۔

"ہنسنا گناہ تو نہیں یہ تو ٹھیک ہے لیکن جب میرے حالات پر ہنسی آتی ہے تو وہ طنز بن جاتی ہے اور طنز مجھ سے برداشت نہیں ہوتا"۔

میں نے جب اس سے زیادہ اصرار کیا تو عجیب سے لہجے میں اس نے مجھے بتایا۔

"میں فیملی پلاننگ میں سوشل ورکر ہوں اور ـــــ !! اس نے بات پھر بھی ادھوری چھوڑ دی۔

میں نے حسرت بھری نگاہیں اس کے چہرہ پر مرکوز کردیں اور کہا "فیملی پلاننگ کا سوشل ورکر ہوتے ہوئے تمہارے اس قدر بچے"۔

وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا "میری زندگی اور اس کے حالات میں سب سے زیادہ ڈرامائی بات یہی ہے کہ مجھے یہ نوکری بعد میں ملی اور بچے پہلے"

میں اس کی دلچسپ لیکن پر درد اور دکھ بھری زندگی کے بارے میں سوچنے لگا اور وہ بھی چند لمحوں کے لئے کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا۔

کمرے میں اب مکمل سکوت چھا گیا تھا۔

اُس نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے میز پر رکھے ہوئے نوٹوں میں سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس لمحہ اندر سے کئی بچوں کی ایک ساتھ رونے کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ وہ ایک سرعت کے ساتھ کرسی سے اٹھا اور شاید بچوں کو سنبھالنے کے لئے اندر چلا گیا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بچے اس پانچ روپیہ کے نوٹ کے لئے ایک ساتھ چیخ پڑے ہیں جو بے جا طور پر میرے ساتھ خرچ ہوگیا تھا۔

چراغ کے نیچے اِس گھور اندھیرے کو دیکھ کر میرا دِل گھبرا گیا اور نہ جانے میں کس جذبے کے تحت پانچ روپے کا وہ نوٹ وہیں چھوڑ کر کمرے سے ایک دم باہر نکل آیا۔ اور راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ بچے فرشتوں سے کم نہیں ہوتے لیکن ان کی زیادتی ایک اِنسان کے جنّت جیسے گھر کو جہنّم بنادیتی ہے۔

عوض سعید

ایک سوال

آج خلافِ معمول میرا نوکر قاسم باورچی خانے کی چوکھٹ پر بیٹھا منہ لٹکائے سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس کی جھیل ایسی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں کی خشکی میں جذب ہو رہے تھے۔ حالانکہ ابھی ابھی اس نے مجھے تازہ مکھن لگے ٹوسٹ کھلائے تھے اور پولسن کی ذائقہ دار کافی پلائی تھی۔ اور میں نے اسے جاتے وقت چند آنے انعام بھی دیئے تھے۔ لیکن بازار جا کر آنے تک یہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیوں رو رہے ہو قاسم، کس نے مارا ہے تمہیں؟" لیکن وہ کوئی وجہ بتلائے بغیر یونہی روتا رہا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے ۔۔۔

"روتا کیوں ہے بے ایمان، ذرا طمانچہ کیا لگا یا ہے کہ آنکھوں سے گنگا جمنا بہا دی" میرے ساتھی جنگل کشور نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے گردن نکالتے ہوئے کہا۔ میں نے قاسم کے گالوں پر اپنے ساتھی کی انگلیوں کو دیکھا جو بیل بوٹوں کی طرح اس کے گالوں پر منقش تھیں۔ اور پھر اپنے ساتھی کے جملے پر غور کرنے لگا۔ میرے دل میں ہمدردی کا جذبہ امڈ آیا۔ یہ عجیب جنگلی ہے! فضول نوکروں سے لڑتا ہے۔ ایک سال میں اس نے کئی نوکر یہاں سے بھگا دیئے۔ اور اس قاسم بیچارے نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ قاسم کی دلجوئی کی خاطر میں اپنے ساتھی کے دل کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے زبان سے خفگی کے دو بول بھی نہیں نکالے۔ لیکن جاتے جاتے قاسم سے میں نے صرف اتنا کہا کہ آئندہ تمہیں کوئی نہ مار سکے گا قاسم!

دوسرے دن صبح جنگل کشور گھر سے غائب تھا، اور قاسم بھی۔ میں حیران تھا، میں نے قاسم کو کئی آوازیں دیں لیکن قاسم گھر میں نہیں تھا۔ قاسم بازار میں نہیں تھا ... وہ قاسم ایرانی کے خدا داد رسٹورنٹ میں بھی نہیں تھا۔ جس کے سیٹھ کی سختیوں سے تنگ آ کر اس نے میرے ہاں نوکری کر لی تھی۔ میرے دوست کے چلے جانے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے نوکر کی حمایت کی تھی۔ لیکن قاسم کے

بھاگ جانے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ مجھے اپنے ساتھی کے اس طرح روٹھ کر چلے جانے کا بڑا رنج تھا۔ جنگل کشور کے چلے جانے سے گھر سونا سونا معلوم ہو رہا تھا اور پھر قاسم کے یکایک غائب ہو جانے سے تو گھر کاٹ کھانے کو آ رہا تھا۔ نہ تو اب باورچی خانے سے پیاز چھیلنے کی آواز آتی تھی، اور نہ اس کی میٹھی بو۔ مٹی کے چولھوں میں ادھ جلی لکڑیاں خاموش پڑی تھیں، جیسے وہ قاسم کے آنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ جنگل کشور کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ اور وہ کتاب اوندھی پڑی تھی، جسے چند دن سے جنگل کشور بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ وہ کتاب پوری بھی نہ پڑھ سکا کہ چلا گیا۔ جیسے وہ کتاب کے انجام سے واقف ہو گیا ہو۔

دو مہینے گزر گئے نہ جنگل کشور ہی آیا اور نہ قاسم ہی میں نے مجبوراً ہوٹل میں کھانا شروع کر دیا۔ پھر ایک رات میں اپنی مسہری پر پڑا نیند کے مزے لے رہا تھا کہ دو نرم اور ملائم ہاتھ میرے پیروں پر پھسلنے لگے کوئی میرے پیروں پر دھنکی ہوئی روئی کے گالے رکھ کر آہستہ آہستہ اٹھا رہا ہو، اور پھر رکھ رہا ہو۔

میں نے آنکھ کھولی تو میرے سامنے قاسم بیٹھا تھا۔ قاسم کو اتنی رات گئے اپنے پلنگ پر بیٹھا دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ پھر میں نے بہ مشکل اپنے ہوش درست کیے۔ "قاسم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز کو اگلنے کی ناکام کوشش کی۔ قاسم اب پلنگ سے پرے ہٹ کر سر جھکائے ہوئے میرے سامنے کھڑا تھا۔

"جنگل کشور کہاں ہے"

"مجھے نہیں معلوم صاحب"

"کیا تم جنگل کشور کے ساتھ نہیں گئے تھے۔

"نہیں۔ جس وقت صبح میں اٹھا تھا۔ اس وقت جنگل کشور صاحب کپڑے پہن رہے تھے۔ جنگل کشور صاحب کا کوئی پتہ نہیں۔ اس دن میں ناشتے کے سامان کے لیے باہر جا رہا تھا، خداداد ریسٹورنٹ کے نوکروں نے مجھے پکڑ لیا، اور سیٹھ کے پاس لے گئے، پہلے تو سیٹھ نے مجھے کام کرنے کو کہا۔ میں نے انکار کیا۔ اس پر ایرانی سیٹھ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ پہلے اس نے مجھے ایرانی زبان میں موٹی گالی دی۔ پھر چھوٹتے ہی اس نے میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ میری ناک سے خون بہنے لگا۔ اور ناک کی ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ خداداد ریسٹورنٹ کے سارے نوکر سہمی سہمی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی سیٹھ کو دیکھ رہے تھے۔

"میں تھانے جاؤں گا — میں تھانے جاؤں گا"۔

میں چیخ رہا تھا۔ ایرانی سیٹھ میرے اس جملے پر قہقہے لگا لگا کر ہنس رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو — تم کہاں جاؤ گے؟ پولیس تو میری ہے۔ پولیس کے جوان تو روزانہ میرے ہاں سے آٹھ آنے لے جاتے ہیں۔ انسپکٹروں کی تو میں نے تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں اب تم سیدھے کسی ہسپتال میں جاؤ اور اپنی ناک کا علاج کراؤ۔ میرا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں تمہاری بے ایمانی کا مزا چکھا دیا ہے۔

پھر میرے چند ساتھی مجھے چپکے سے ہسپتال لے گئے۔ جہاں دو ماہ تک میرا علاج ہوتا رہا۔ پھر بھی یہ نگوڑی ناک ذرا ٹیڑھی ہی رہی۔ کیونکہ یہ جنگل کشور صاحب کا طمانچہ نہیں تھا خداداد ریسٹورنٹ کے مالک کا تھپڑ تھا"۔

قاسم یہ کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ قاسم کی دلگیر آواز رات کو اور بھی اداس بنا رہی تھی۔ اب میں سوچتا ہوں قاسم جو نہایت شریف نوکر ہے۔ قاسم جو بلا کا محنتی ہے جو رات دن اپنے مالک کی غلامی کرتا رہتا ہے۔ اس کو اس کی خدمت کا کیا صلہ ملا۔

گالی۔ گھونسے — طمانچے —

قاسم کا رنگ گہرا سانولا تھا، اور اس کی آنکھیں جھیل کی طرح گہری اور نڈھال تھیں۔ اس کی آنکھیں جتنی نڈھال تھیں، وہ اتنا ہی چست تھا۔ وہ بات کرتے وقت نچلے ہونٹ کو

اوپر کے دانت سے یوں دباتا جیسے وہ ہونٹوں کو دبا کر کسی بات پر پچھتا رہا ہو۔

وہ کام کرنے سے ذرا بھی نہیں تھکتا تھا۔ قاسم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ میری ہر بات کو سنتا تھا۔ اگر اس سے میں کہتا، قاسم تم نے آج سالن میں نمک بہت زیادہ ڈالا ہے؟ تو وہ شرمندہ ہو کر کہے گا۔ "حضور غلطی ہوئی معاف کر دیجیے۔" کل ایسا نہیں ہوگا۔ حالانکہ سالن میں نمک برابر ہوگا۔ وہ بڑے چٹ پٹے اور لذیذ سالن پکانے میں ماہر تھا۔ خصوصاً آلو، گوبھی پکانے میں اس کا جواب نہ تھا۔ اگر اس کی ذات میں کوئی برائی تھی (اگر اُسے برائی کہا جا سکے) تو یہ کہ وہ ہفتہ میں دو بار فلم دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ اس سلسلے میں جھوٹ بھی بولتا تھا۔ میں نے اسے اکثر چونی والی کلاس میں بیٹھے تالیاں بجاتے دیکھا تھا میری اور اس کی کلاس میں کافی فاصلہ تھا۔ جس طرح کہ اس کی ذات میں اور مجھ میں تھا۔ وہی ڈی کلاس اور اے کلاس کا فرق۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی میری نگاہ اس سے ٹکرا جاتی تھی۔ فلم ختم ہوتے ہی وہ تیز تیز گھر آ جاتا۔ دوسرے دن جب میں اس سے پوچھتا قاسم کل رات والی فلم کیسی تھی وہ تو شرمندہ ہو کر اپنے دانت نچلے ہونٹ میں گاڑ دیتا، اور کہتا اس ہفتہ میں نے صرف یہی فلم دیکھی ہے صاحب کیا آپ نے بھی فلم دیکھی ہے صاحب؟

"ہاں ہم نے بھی فلم دیکھی ہے اور چونی والی کلاس میں تمہیں بھی دیکھا ہے"۔ اس پر وہ مسکرا کر برتن مانجھنے یا کوئی اور کام کرنے چلا جاتا۔

کبھی کبھی میں جنگل کشور کو یاد کر کے ٹھنڈی سانس بھرتا تو وہ میری توجہ ہٹانے کے لیے کہتا۔ "آج ریگل میں بڑی اچھی فلم شروع ہو رہی ہے صاحب، آج آپ فلم دیکھنے ضرور جائیے۔ جیسے وہ گفتگو کا رُخ پھیر کر میرے دل سے جنگل کشور کی یاد کو مٹانا چاہتا ہو۔

جنگل کشور جب تک میرے ساتھ رہا میری زندگی کنول کے پھول کی طرح شاداب رہی۔ وہ میری زندگی کے افق پر سورج کے مانند چمکتا رہا لیکن جب سے وہ چلا گیا تھا میری زندگی ایک گہرے کھڈ میں گر چکی تھی۔ اگر قاسم جیسا فرض شناس، ہنس مکھ نوکر مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میں جنگل کشور کے غم میں گھل گھل کر مر جاتا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ وہ اتنی ذرا سی بات پر روٹھ کر کیوں چلا گیا۔ حالانکہ اس کے اور میرے درمیان بڑی بحثیں ہوتی تھیں لیکن جھگڑا تو ایک طرف کبھی شکررنجی کی نوبت بھی نہ آئی تھی، ہماری تہذیب کی اس بھاری منڈی میں جہاں پڑھے لکھے لوگ چند سکوں کے عوض فروخت ہو جاتے ہیں وہاں جنگل کشور ابھی فروخت نہیں ہوا تھا، وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے سے پہلے اپنی ذات سے جنگ کر رہا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بنک میں کلرکی کر سکتا تھا لیکن وہ ادبیات کا ایم۔ اے ہو کر یوں بھاڑ جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ وہ ایک صحافی بنے ——— بلند پایہ صحافی۔ لیکن وہ صحافت کی دنیا سے دور ہی رہا۔ وہ اس دنیا میں داخل نہ ہو سکا کیونکہ صحافت کے اجارہ داروں اور اس کے ideals میں کافی بُعد تھا۔

پھر ایک دن قاسم نے مجھے بتایا کہ جنگل کشور چور تھا، فریبی تھا۔

"ابے حرامی کیا بکتے ہو" میں نے چیخ کر اپنے دانت ہونٹوں میں پیوست کر دیے، اس نے بے جھجک کہا "قاسم حرامی ٹھیک کہتا ہے صاحب۔ آپ کے نام کا منی آرڈر جنگل کشور صاحب نے جعلی دستخط کر کے حاصل کر لیا تھا، وہ تو کہیے کہ پوسٹ مین نیا تھا۔ ورنہ انھیں نہ دیتا ———" پھر مجھے اس منی آرڈر کا خیال آیا، جو تین ماہ سے مجھے نہیں ملا تھا۔

قاسم کے بیان نے میرے کان کھڑے کر دیے تھے۔ لیکن شاید قاسم جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ جنگل کشور صاحب نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس بات کا تذکرہ آپ سے نہ کروں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے پانچ روپے دینے کی بھی کوشش کی تھی تاکہ وہ راز فاش نہ ہونے پائے۔ لیکن جب میں نے یہ لالچ قبول نہیں کیا تو

پہلے وہ جھنجلائے' پھر گالیاں دیں اور بعد میں مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اس دن کی لڑائی کا شاخسانہ یہی تھا۔ اور ان کے چلے جانے کی وجہ بھی شاید یہی ہو"۔

میں سوچنے لگا جنگل کشور جسے میں آج تک اپنا عزیز دوست سمجھتا رہا وہ تو چور نکلا۔ اس نے میرے ساتھ اس قسم کی کمینگی کیوں کی! لیکن پھر میں سوچتا کہ شاید وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو۔ جبھی تو اس نے ایسی حرکت کی!

ایک دن جب میں انڈیا کافی ہاؤس میں داخل ہوا تو کئی اشخاص کو ایک انگریزی اخبار بڑے انہماک سے پڑھتے پایا۔ دور سے مجھے اخبار کے حروف تو صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے' البتہ ایک نوجوان کی دھندلی سی تصویر نظر آ رہی تھی ۔۔ مضمون کا عنوان تھا "دائمی امن کیلئے ایٹم کا استعمال ضروری ہے"۔ میں جنگل کشور کی تصویر کو بت بنا دیکھتا رہا۔

کمبخت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہی گہری لکیر تھی جسے آج سے دو سال پہلے میں نے دیکھا تھا۔ مگر آج کے جنگل کشور اور دو سال پیشتر کے جنگل کشور میں بہت بڑا فرق تھا۔

وہ جنگل کشور جس کی زبان پہ جمہور کا نعرہ تھا آج وہ زبان ساکت تھی۔ کسی بھی قیمت پر فروخت نہ ہونے والا انسان آج صحافت کی منڈی میں چند چاندی کے سکوں کے عوض فروخت ہو چکا تھا۔

میں تمہیں کل تک صرف چور ہی سمجھتا رہا۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ تم ضمیر فروش بھی ہو"۔ میں نے جنگل کشور کی تصویر پر کپ کی بچی ہوئی کافی انڈیل دی۔ بازو کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک اپٹوڈیٹ نوجوان مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

جب میں گھر لوٹا تو رات کافی بھیگ چکی تھی' اور قاسم اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ پھر کہیں قاسم جنگل کشور کی طرح غائب نہ ہو گیا ہو۔ جب جنگل کشور جیسے پختہ شعور انسان کو بدلتے دیر نہیں لگی تو یہ تو پھر ایک ادنیٰ ملازم! لیکن قاسم غائب نہیں ہوا تھا۔ وہ باورچی خانے میں پڑا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ انگیٹھی میں آگ روشن تھی اور اس نے سردی سے بچنے کے لئے پیروں سے ٹاٹ کے کئی ٹکڑے باندھ رکھے تھے اور آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ کندن کے مانند چمک رہا تھا۔

پھر یکایک اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ بڑبڑانے لگا ۔۔۔ "مجھے چھوڑ دو ۔۔۔ مجھے چھوڑ دو ۔۔۔ میں اس بھرتی کے دفتر میں خود سے نہیں آیا ۔۔ میں اپنے آپ کو جنگ کی اس بھٹی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

میں قاسم کے چہرے کی شکنوں کو پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں تھیں دوسری طرف جنگل کشور کی مسکراہٹ تھی۔

اب میرے سامنے دو تصویریں ہیں ایک جنگل کشور ہے جو میرا عزیز دوست ہے۔ ایک قاسم ہے جو میرا نوکر ہے۔

ایک اندھیرا ہے ۔۔۔ دوسرا اُجالا ۔۔۔
ایک گہرا کھڈ ہے' دوسرا حسین و شاداب باغ۔ ایک موت کا نوحہ ہے' دوسرا زندگی کا نغمہ۔

اب آپ ہی بتائیے میں کس کا ساتھ دوں ۔۔۔ ؟

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں، بعض اچھے مضامین محض خوشخط نہ ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ مضمون غیر مطبوعہ روانہ کیجئے اور مضمون کی ایک نقل اپنے پاس رکھ لیجئے۔ جواب طلب اُمور کیلئے اپنا نام اور پتہ لکھا ہوا لفافہ ضرور بھیجئے۔ ورنہ ادارہ جواب دینے سے قاصر رہے گا۔ ترجمہ کی صورت میں اصل مضمون نگار کا نام اور دیگر حوالہ جات ضرور تحریر کیجئے۔ (ادارہ)

کس می کوئک

(Kiss Me Quick)

اک حسیں پھول ہے کہتے ہیں جسے کس می کوئک
کس زباں سے میں کروں اس کی نزاکت کا بیاں
سرخ رنگت میں ہے پوشیدہ قیامت کی کشش
جان و دل کھینچے لیے جاتی ہیں دو پنکھڑیاں

ننھے سے پھول کی رعنائی کا کیا ذکر کروں
شاخ پر بیٹھ گئی جیسے بہوٹی کوئی
پھول کے نیچے مچلتی ہوئی ڈنٹھل کی لکیر
یا کرن عارض مہتاب سے پھوٹی کوئی

کسی صناع نے سورج کی کرن کے اوپر
دو چمکتے ہوئے یاقوت جڑے ہیں شاید
کسی شیریں کی کلائی پہ شکایت بن کر
کسی فرہاد کے دو اشک پڑے ہیں شاید

غزۂ وے کے لبوں کی ہے نزاکت اس میں
اس کی سرخی میں ہے رودابہ و عذرا کا جمال
منجمد ہو گیا دو احمریں پنکھڑیوں میں
کسی نقاش کا جذبہ، کسی شاعر کا خیال

اس قدر نازک و خوش رنگ ہے یہ پھول مگر
کھلتا ہے کانٹوں بھری شاخ پہ یہ گلشن میں
اس حسیں پھول کے دل میں یہ تمنا بھی نہیں
کہ چھپائے کوئی محبوب اسے دامن میں

بلکہ عشاق کو دیتا ہے مسلسل یہ صدا
"مرے پاس آؤ ذرا، جلد مجھے پیار کرو"
"عشق سچا ہے تو کانٹوں کو لہو دو اپنا"
"مجھ کو لپٹاؤ ذرا، جلد مجھے پیار کرو"

اس کی آواز پہ لبیک کہوں گا میں ضرور
دل کھنچا جاتا ہے اس لے کے تسلسل کی طرف
کانٹے چبھتے ہیں تو چبھ جائیں مجھے فکر نہیں
لب بڑھاؤں گا بہرحال میں اس گل کی طرف

خوں بہانے ہی سے کھلتی ہے کلی دل کی سلامؔ
در مقصود نہیں ملتا ہے ہمت کے بغیر
چومنا ہے مجھے اس پھول کے ہونٹوں کو ضرور
زندگی بن نہیں سکتی ہے محبت کے بغیر

کس می کوئک ایک سرخ رنگ کا خوشنما پھول ہے جس میں صرف دو پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ پھول ایک خاردار درخت کی شاخ پر کھلتا ہے۔ بعض اوقات [illegible] یہ نظم اس پھول کے ذاتی مشاہدے کے بعد لکھی گئی ہے۔

ڈاکٹر سلامؔ سندیلوی

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

جذبۂ بیدار

ہم نے مانا کہ بڑی چیز ہے سرمایۂ فکر
ہم نے مانا کہ یہ اک گنج گراں مایہ ہے
کم نہیں منزلتِ جذبۂ بیدار بھی کچھ
چشم ادراک میں اس کا بھی بڑا پایہ ہے

ہے یہی گرمیٔ ہنگامۂ ہستی کی بنا
ہے اسی جذبۂ بیدار سے تعمیرِ حیات
رنگ و روغن نہ اگر اس سے میسر آئے
نقشِ موہوم بہر شکل ہو تصویرِ حیات

بے کراں جذبۂ بیدار سے عاری ہے اگر
آدمی کام بہ مشکل کوئی کر سکتا ہے
وادیٔ شوق میں ناواقفِ آدابِ جنوں
جی نہ سکتا ہے سلیقے سے نہ مر سکتا ہے

اس سمندر کا تلاطم ہے تحفظ کی سبیل
ہر سفینے کو یہ ساحل سے لگا سکتا ہے
تنِ مردہ میں بھی جان اس سے پلٹ آتی ہے
روح خوابیدہ کو دم بھر میں جگا سکتا ہے

خوش نصیب اس سے زیادہ کوئی ہو سکتا ہے
جس کو ہے جذبۂ بیدار کی نعمت حاصل
مری نظروں میں سزاوارِ پرستش ہے وہ شخص
جس کو قسامِ ازل سے ہے یہ دولت حاصل

کہیں اس جذبۂ بیدار کا پایاں ہی نہیں
اس کے دامن میں تو کونین سمٹ آتے ہیں
اس سے مستقبلِ خاموش بھی بول اٹھتا ہے
اور گزرے ہوئے لمحات پلٹ آتے ہیں

کامراں جذبۂ بیدار سے ہوتا ہے بشر
یہ جو ہو پاس تو ہر کام مرا بن جائے
ابدی زیست کے نغمات سے مسرور رہوں
جام صہبائے ازل جام مرا بن جائے

تاج مجور

روشنی کی موڑ پر

کتنی سیاہ کتنی المناک تھی وہ شب
جس تیرگیٔ شب میں تمہیں میں نے کھو دیا
ہاتھوں کا لمس برف کے مانند سرد تھا
جسموں کی آنچ تھی کوئی شعلۂ خموش
دھڑکن، نگاہ، پیار کی سرگوشیاں اسیر
سینوں میں تھی رُکی ہوئی ہر آرزو کی سانس

اور آج۔ رات کتنی حسین و جوان ہے
نظروں پہ احتساب نہ سرگوشیاں اسیر
پھوٹی ہیں کُنج کُنج محبت کی تتلیاں
جھکے ہوئے ہیں پھول تبسم کے ڈال ڈال
اُڑتے ہیں آرزوؤں کے جگنو ڈگر ڈگر
ذہنوں میں تیرتے ہیں تمنا کے راج ہنس
ہاتھوں کی نرم آنچ سے مہندی دمک اٹھی
گھونگھٹ ہٹا تو ماتھے کی بندیا چمک اٹھی

کل تیرگیٔ شب میں جدا ہو گئے تھے ہم
آج اس حسین شب میں ہماری نظر کے نور
کھیتوں سے کانجوں سے ملوں سے خوشی خوشی
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے نکلیں گے ساتھ ساتھ
اک روشنی کی موڑ پہ مل جائیں گے گلے

آفتاب شمسی

ایک لڑکی

ظلمتِ شب میں رواں ہیں ہر طرف
موٹریں راہوں کو چمکاتی ہوئی
شہر کی گردن میں ہے
جھلملاتے قمقموں کا ایک ہار
سارے دن کی محنت و کاوش کے بعد،
زندگی آرام کرنے جا رہی ہے
کتنے دل ہیں دستکوں کے منتظر
کتنے دل ہیں وصل کی راحت سے شاد
اور ایسی خوب صورت رات میں،
کوئی لڑکی چپکے چپکے رو رہی ہے
اپنے ہاتھوں میں لیے،
اک دیا،
جو شام ہی سے بجھ گیا ہے

ارادہ

نصیر پرواز

کل مجھ کو الزام نہ دینا
کل میں شب کی تاریکی کے
پیچ وخم میں کھو جاؤں گا
یاس کی پتھریلی دھرتی پر
درد کی جلتی چٹانوں پر
کل میں جا کر سو جاؤں گا

آج تلک دیوانہ بن کر
میں نے جگ کو پیار کیا ہے
آشا کے سندر گہنوں سے
سپنوں کا سنگار کیا ہے
شعر وسخن کے پھول کھلا کر
جگ کو خوشبو دیتا آیا
شمع طرب کی جوت بڑھا کر
نورِ طلب برساتا آیا

دنیا نے جب درد دیا ہے
میں نے دی مسکان کی دولت
صبر کا کڑوا جام پیا خود
جگ کو بخشا پیار کا امرت
لیکن میرے کومل من پر
طنز کے کنکر ہی برسے ہیں
چاہت کے گہرے ساگر میں
اک اک بوند کو لب ترسے ہیں
اپنوں بیگانوں کی باتیں
کانوں میں رس گھول چکی ہیں
ڈھونگی ہے یہ پاپی دنیا
آنکھیں گرہیں کھول چکی ہیں
دل میں کھوٹ کا گندہ پانی
چشم دفا میں جھوٹے آنسو
سچائی کے سب دشمن ہیں
جلتے ہونٹ مہکتے گیسو

میں ایسے تاریک جہاں میں
کب تک دیپ جلاتا جاؤں
صبر وتحمل کے پتھر سے
اپنا سر ٹکراتا جاؤں
دنیا یوں ہی ڈھونگ رچے گی
دنیا کی یہ ریت پرانی
سارے رستے دیکھے بھالے
شکلیں سب جانی پہچانی
جاتے جاتے اس دنیا سے
مجھ کو بس اتنا کہنا ہے
جس کا جو ہو مجھ سے لے لے
پھر نہ کہنا فن جھوٹا ہے
کل میں شب کی تاریکی کے
پیچ وخم میں کھو جاؤں گا
کل مجھ کو الزام نہ دینا
کل میں جا کر سو جاؤں گا

راجہ مہدی علی خان

★

ایک خاتون کے پرائیویٹ خطوط

محبوب کے نام!

باندھ کر مکتوبِ اُلفت اپنی بلّی کے گلے
مُنتظر ہوں تیرے کُتّے کی، صنوبر کے تلے
نامہ بر کُتّا ترا آیا نہیں ہے اب تلک
پیٹ دوں کُتّے کمینے کو جو میرا بس چلے
اپنی محبوبہ سے ہمگا راہ میں محوِ کلام — !
کہہ رہی ہوگی ٹھہر جا اے مرے نازوں پلے
اور وہ بلّی کی بچّی بھی نظر آتی نہیں
مِل رہی ہوگی کسی بدنام بلّے کے گلے
لے لیا ہوگا اُسے بلّے نے جھٹ آغوش میں
کہہ رہا ہوگا کہ "تُو جُگ جُگ جیئے پوتوں پھلے"
تیرے بندر کو دیا ہے لکھ کے یہ خط آخری
مجھ سے مِلنا گُلستاں میں رات جب آدھی ڈھلے
میری شادی کی خبر سُننے میں ہے آئی ہوئی
دِل مرا پژمُردہ ہے اور رُوح گھبرائی ہوئی

محبوب کے نام دُوسرا خط!

مرے محبوب! میری کل ہے شادی
مری شادی میں شامل تم بھی ہونا
وہیں گھر میں پڑے سڑتے رہو گے
یہیں آکر پُلاؤ کھا کے، رونا
ہر اِک ارمان کو دے دے کے دھکّے
مرے غم کے سمندر میں ڈبونا
میں دیکھوں تم کو زردے کی طرح زرد
نظر آؤں میں پیلی جیسے سونا
ضُرور آنا تمہیں میری قسم ہے
نہ اپنی عاشقی کی لاج کھونا!
لپٹ جانا مرے دُولہا سے آکر
گلے مِل مِل کے یہ کہہ کہہ کے رونا
"سپردم بہ تو مایۂ خویش را!
تو دانی حسابِ کم و بیش را"

سہیلی کے نام!

مری شادی کا ہے چالیس واں دن
یہاں اِک پارٹی ہے تم بھی آنا!
نہ آؤ تم جو اس چالیس دن پر
کیا تم نے کوئی حیلہ بہانہ
تمہاری کاٹ دُوں گی آ کے چٹیا
سُنوں گی میں نہ باتیں صوفیانہ
مرے "عشرت کدے" پر چھ بجے کل
مٹھائی اور چائے ٹھونس جانا
بوقتِ الوداع آخر میں پیاری
یہ کہہ کر قہقہہ اِک تم لگانا
"لوگ غم خواری میں تیری سعیٔ فرمائیں گے کیا
سعیٔ فرمانے تلک نیچے نہ ہو جائیں گے کیا؟"

ایک دوسری سہیلی کے نام!

دِل سے تو آہ آہ کیئے جا رہی ہوں میں
ہونٹوں سے واہ واہ کیئے جا رہی ہوں میں
یُوں زندگی گزار رہی ہوں میں اُن کے ساتھ
"جیسے کوئی گناہ کیئے جا رہی ہوں میں"
قسمت کے حکم سے مسزِ اُلّو میں بن گئی
اُلّو سے بھی نباہ کیئے جا رہی ہوں میں
اب سوچتی ہوں تجھ کو سکھی اُن سے دُوں بیاہ
ہموار تیری راہ کیئے جا رہی ہوں میں
مٹّوں کے ساتھ ہی نہیں رغبت مجھے سکھی
چانٹوں سے بھی نباہ کیئے جا رہی ہوں میں
دیتے ہیں پہلے زور سے میری کمر پہ لات
اور اس کے بعد کہتے ہیں شانوں پہ رکھ کے ہات
"کمر کو کر بلند اتنا کہ ہر اِک لات سے پہلے
میاں بیوی سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟"

بہت سی سہیلیوں کے نام!

میرے میاں کی شادی خانہ بربادی!
پرسُوں رات کے آٹھ بجے طے پائی ہے
خیر سے اُن کے ساتھ ہی کل کلکتے سے
نئی نویلی دُلہن بھاگ کے آئی ہے
اے سکھیو! سب ٹیکسیاں لے کر آ جاؤ
میرے انگنا باج رہی شہنائی ہے
آ کے تسلّی دے جاؤ بے چاری کو
میں ہنستی ہوں روتی بی ہمسائی ہے
ابھی ابھی اُف اس برہن کے آنگن سے
مرے کانوں میں یہ آواز آئی ہے
"یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور مرتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔"

سہیلیوں کے نام ایک اور خط

میرے ننھے عظمت اللہ خاں نے پہلی مرتبہ
اُلّو کا پٹھا کہا ہے آج اپنے باپ کو
اور میری ساس اس تقریب پہ
اِک عظیم الشان دعوت دے رہی ہے
نو بجے کل رات کو
آپ ازراہِ کرم
اپنے بچّوں اور ظالم شوہروں کے ساتھ ساتھ
حاضر آکر تناول کیجئے
اور بھی اِک بات ہے
آپ میں سے گر کسی کو ہو مرا شوہر پسند
بے تکلّف دیجئے پیغامِ عشق
میں بہت ممنون ہوں گی آپ کی!

محبوب کے نام

شوہرِ نامدار نے مجھ کو — !
آج دیدی طلاق آخر کار
ہنس رہے ہیں تمام گھر کے لوگ
رو رہی ہوں مگر میں زار و قطار
کار لے کے یہاں چلے آؤ،
مجھ کو لے جاؤ اب مرے دلدار
جب تم آؤ گے تو مجھے مِل کے
تم سے شاید کہیں مرے سرکار
"عظمت اللہ اور اُسکی امّاں کو،
ساتھ لے جاؤ اپنے میرے یار
جو تم چاہتے تھے سو میں دے رہا ہوں
میں اِنٹ لے کے اب تم کو دو دے رہا ہوں"!

☆

آخری گیٹ موٹر میں

گائے جا گیت مِلن کے، تو اپنے وطن کے سجن گھر جانا ہے
پیاسے ہیں لوگ وطن کے، مرے درشن کے سجن گھر جانا ہے

● آئندہ شمارے میں راجہ مہدی علی خاں کی ایک اور دلچسپ نظم پیش کی جا رہی ہے۔

کمندیں

مستقل فیچر

شیر انداز

غذائی ادب

ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ اور بے چارہ ادیب صرف فوٹوگرافر ہوتا ہے۔ زندگی میں جب بھی کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو ادیب، ادب کا کیمرہ زندگی کے سامنے لے کر کھڑا ہوجاتا ہے اور کہتا ہے "ریڈی ـــ ذرا مسکرایئے۔ تھینک یو" ـــ گویا زندگی میں جو کچھ بھی ہوگا، وہی ادب میں بھی ہوگا۔ اگر زندگی کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہوں تو ادب کے پیٹ میں بھی چوہے دوڑیں گے۔ اگر زندگی ایڑیاں رگڑ رہی ہو تو ادب کو بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانا چاہیئے۔ اگر نہیں مرتا تو ایسا ادب بڑا بے ادب ہے۔

تو حضرات ان دنوں ہمارے ملک میں ادب کے بحران کے ساتھ ساتھ "غذا کا بحران" بھی آچکا ہے۔ اور ان دونوں بحرانوں نے مل کر ایک ایسی "بحرانی کیفیت" طاری کر دی ہے جو ایک دن "غذائی ادب" کو عالم وجود میں لا کر ہی رہے گی۔ اور اس دن سے ہماری ساری ادبی سرگرمیاں، غذائی سرگرمیوں کے تابع ہو جائیں گی۔ مثلاً کسی شاعر صاحب کی ادبی [خدمات] کا اعتراف کیا جائے گا تو اس کی خبر اخبار میں یوں چ[ھپے گی]

"ملک کے ممتاز شاعر جناب مراد مراد آبادی [کی] خدمات کے اعتراف کے لیے آج یہاں ایک جلسہ منعقد کیا گ[یا جس] میں حضرت مراد مراد آبادی کو پندرہ کیلو کیسہ گندم پیش [کیا گیا]۔ حضرت مراد مراد آبادی نے کیسہ گندم کو قبول کرتے ہو[ئے کہا] کہ "آج میری مراد پوری ہوگئی ہے۔ اور مجھے میری اد[بی خدمات] کا صلہ مل گیا ہے۔ اگر آپ لوگ اسی طرح میری خدمت [کرتے] رہیں تو میں بھی ادب کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کیوں کہ کس[ی نے] کیا خوب کہا ہے "کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے [اس] ہاتھ لے۔" حضرت مراد مراد آبادی نے پیچھے چل کر کہا [کہ] چلنے کی ان میں سکت نہیں تھی "حضرات! میں آپ کا ز[یادہ وقت] نہیں لینا چاہتا کیوں کہ آپ سب کو سستے غلے کی ڈکا[ن پر] جانا ہوگا اور مجھے بھی یہ غلہ لے کر جلد از جلد گھر پہنچنا ہے

، بچے بھوک سے بلک رہے ہوں گے ۔۔۔ اس کے بعد یہ خوشگوا
سی شکریہ کے بغیر اختتام کو پہنچی !

ادبی خدمات کے اعتراف کی بات تو چھوڑیئے ۔ آئندہ
وں اور اخبارات کے سالانہ چندے بھی جنس کی شکل میں
ں کیے جائیں گے ۔ مثلاً کسی ماہوار رسالہ کا سالانہ چندہ دس
گندم یا پندرہ کیلو چاول مقرر کیا جاسکتا ہے ۔ ہفتہ وار اخبا
ی شمارہ قیمت نصف کیلو شکر مقرر کی جاسکتی ہے ۔ اور ان رسائل
داروں کی جانب سے اپنے خریداروں کو اس قسم کی دھمکیاں
دی جاسکتی ہیں :

" ادھر چند دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ بعض خریدار سالانہ
یں مینے چاول میں زیادہ کنکر ملانے لگے ہیں جس کی وجہ سے
ے ایڈیٹر صاحب کو اس ماہ "پتھری" کی شکایت لاحق ہو گئی
نچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس بار ہم اپنا شمارہ تاخیر سے شائع
رہے ہیں ۔ لہٰذا خریداروں سے التماس ہے کہ وہ آئندہ سے
ئی اجناس میں ملاوٹ سے احتراز کریں ورنہ ان کے نام رسالہ کی
ی بند کر دی جائے گی "

ادبی انجمنیں جب "غذائی بحران" کے باعث اپنے جلسے
دنہ کر سکیں گی تو ان کی جانب سے اس قسم کے اعلانات
ئع کیے جائیں گے ۔

" ہم نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ
ستہ تین ماہ کے عرصہ میں "انجمن تفریح ادب" کا کوئی اجلاس
مد نہ ہو سکا کیوں کہ ان دنوں انجمن کے سارے ہی ارکان سستے
، کی دکانوں پر ٹھہرنے لگے ہیں اور دوسری طرف خود انجمن کے عہدیدار
، کا کاروبار کرنے لگے ہیں (بہ شمول بلیک مارکٹنگ) اسی لیے
کان کی سہولت کیلئے انجمن کا آئندہ ' ادبی اجلاس ' سستے غلے
ی دکان نمبر ۲۰۴ موقوعہ شانتی نگر کے سامنے منعقد ہو گا ۔
س میں پروفیسر جناب ابنِ فلاں "ادب برائے غذا" کے

موضوع پر اپنا مقالہ سنائیں گے ۔ مسٹر چخ پکاروی اپنا تازہ
افسانہ ۔۔ "اور سستے غلے کی دکان کھلتی رہی" ۔۔ سنائیں گے ۔
حضرت فاقہ کش مفلسی اپنی تازہ نظم سنائیں گے ۔ ارکان سے خواہش
کی جاتی ہے کہ وہ مقررہ وقت پر سستے غلے کی دکان پر چلے آئیں
اور غلہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تخلیقات سے بھی
محظوظ ہوں ۔

ہم نے تو یہاں صرف ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے کہ کس
طرح ہماری موجودہ "غذائی سرگرمیاں" ہماری ادبی سرگرمیوں
کو متاثر کر سکتی ہیں ۔ جیسے جیسے ہماری "بھوک" وسیع ہوتی چلی
جائے گی غذائی ادب کا تصور بھی وسیع ہوتا چلا جائے گا اور ایسی
ادبی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں گی ۔ جنھیں ہم "غذائی ادب" کے
اعلیٰ نمونوں میں شمار کر سکیں گے ۔ چنانچہ ہم ذیل میں "غذائی ادب" کے
دو نمائندہ افسانے پیش کر رہے ہیں ۔

غذائی افسانے

نمونہ نمبر (۱) :

بحرانِ عشق + بحرانِ غذا

تین ماہ پہلے کی بات ہے کہ سریش اور نرملا ایک دوسرے
کو نہیں جانتے تھے ۔ وہ ایک دوسرے سے اتنے ہی دور تھے جتنے
دریا کے کنارے دور دور رہتے ہیں ۔ لیکن جب ملک کے غذائی
بحران میں انقلاب آیا تو ان دونوں کی زندگی میں بھی ایک نیا
انقلاب چپکے سے آگیا ۔ کیوں کہ سریش نے نرملا کو سب سے پہلے
سستے غلے کی دکان پر دیکھا تھا جب وہ ہاتھ میں تھیلی لٹکائے
کیو میں کھڑی تھی ۔ اس کی پیشانی پہ بال بکھرے ہوئے تھے جو
ہوا کے جھونکوں سے بار بار اڑ رہے تھے ۔ لیکن چونکہ ان بالوں
کی جڑیں مضبوط تھیں ، اسی لیے ہوا انھیں اڑانے جانے میں
بار بار ناکام ہو رہی تھی ۔ جب بھی ہوا کا جھونکا ان بالوں کو

بکھیر دیتا تو نرملا ان بالوں کو سمیٹ لیتی اور انھیں پھر اپنے بازوؤں پر ڈال لیتی (ایک بار تو اس نے غفلت میں اپنے بال سامنے والے نوجوان کے بازو پر بھی ڈال دیئے تھے) پھر وہ بہت شرمائی اور ڈرتے ڈرتے بولی "آیم ویری سوری ـــ مجھے بہت بھوک لگی ہے اور بھوک نے میرا دماغ ماؤف کر دیا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ یہ بال میرے ہی ہیں آپ کے نہیں۔"

سریش کیو میں سب سے آگے کھڑا تھا۔ اُسے نرملا کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ اس کی بھوکی اور پیاسی آنکھوں میں اچانک ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔ انسانیت کا ایک سمندر اس کے سارے وجود میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس نے سوچا "اگر آج مجھے غلہ نہ ملا تو کیا ہوگا۔ میں آج بھی بھوکا رہ سکتا ہوں کل بھی بھوکا تھا پرسوں بھی بھوکا رہوں گا۔ اپنے لیے نہیں تو کم از کم ایک معصوم لڑکی کے لیے مجھے بھوکا رہنا چاہیئے۔" صبح کے چھ بجے تھے اور سستے غلے کی دکان کے کھلنے میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ کیو شیطان کی آنت کی طرح بڑھ رہی تھی۔ سریش جانتا تھا کہ نرملا کو آج غلہ نہیں ملے گا کیوں کہ جب تک کیو میں اس کی باری آئے گی ـــ اس وقت تک غلہ ختم ہو جائیگا۔

اس خیال کے آتے ہی سریش کیو سے باہر یوں نکلا جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چل کر نرملا کے قریب پہنچا اور بولا "مس! آپ کا نام کیا ہے؟"

"آپ کو اس سے کیا مطلب؟" نرملا غصے سے بولی۔

"مجھے اس سے یہ مطلب ہے کہ میں کیو میں اپنی جگہ آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میرے گھر میں کافی غلہ موجود ہے۔ اور میں آج صرف احتیاطاً کیو میں کھڑا ہوگیا تھا۔"

نرملا کو جب سریش کی اسپورٹس مین اسپرٹ کا اندازہ ہوا تو اس کے کھوئے ہوئے ہوش و حواس بحال ہوگئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ہونٹ فرط مسرت سے تھرتھرانے لگے ـــ اور وہ بھوک سے مغلوب ہوکر بولی "اے دیالو انسان تمھارا نام کیا ہے؟"

"سریش" سریش نے اپنا اصلی نام بتلاتے ہوئے کہا۔

نرملا نے کہا "سریش بابو آپ انسان نہیں دیوتا ہیں دیوتا۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی۔"

اور سریش اس کے جواب میں صرف مسکرا دیا۔ پھر نرملا کیو میں سریش کی جگہ جاکر کھڑی ہوگئی۔ اور سریش نرملا کی جگہ کھڑا رہ گیا۔ وہ بار بار سریش کی جانب مڑ کر دیکھتی اور سریش کے دل میں عشق کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا، لیکن پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے۔ وہ بھی اسے دیکھ کر زبردستی مسکرا دیتا۔ اُسے بڑی خوشی تھی کہ آج اس نے زندگی میں پہلی بار ایک معصوم لڑکی کی صدق دل سے مدد کی ہے۔ وہ خیالوں میں کھوگیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہے اور نرملا اس کے سامنے بچھے ہوئے دسترخوان پر پنکھا جھل رہی ہے۔ اس نے ایک نوالہ نرملا کو کھلانے کی کوشش کی۔ اور نرملا نے منہ بسور کر کہا "چلو۔ ہٹو بھی۔ میں ملاوٹی اشیا کا کھانا پسند نہیں کرتی" اس پر سریش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا "پیاری نرملا! اب زیادہ نہ ستاؤ۔ ذرا سوچو تو سہی کہ دنیا کے اس بھرے بازار میں مجھے خالص اشیا کہاں سے مل سکتی ہیں ـــ تم میرے عشق کا امتحان نہ لو کیوں کہ میرا عشق تاجروں کے عشق کے تابع ہے۔" نہ جانے وہ کب تک خیالوں میں کھویا رہا۔ لیکن جب اس کے ہوش واپس آئے تو اس وقت تک نرملا دکان سے غلہ لے کر جا چکی تھی۔

دوسرے دن سریش رات میں بارہ بجے ہی سستے غلے کی دکان پر پہنچ گیا۔ اور کیو میں پہلا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسرے دن جب نرملا ہاتھ میں تھیلی لٹکائے اٹھکتی ٹھمکتی دکان پر آئی تو سریش کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ لپک کر کیو سے

ااور حسب معمول نرملا سے بولا" مس! آپ کی جگہ کیو میں
، سے ریزرو ہوچکی ہے"! نرملا شرم سے پانی پانی ہو گئی۔
نی اس لیے بھی ہوی کہ اس دن خوب بارش ہوی تھی (
" سریش بابو! آج میں آپ کی جگہ نہیں ٹھہروں گی کیونکہ
آپ کی جگہ کھڑی رہ جاؤں تو پھر آپ کیا کھائیں گے؟"
سریش بولا" نرملا! تم دیوی ہو ـــــ لیکن میں کہتا ہوں
ے گھر میں کافی غلہ موجود ہے۔ اگر تم میری جگہ نہیں کھڑی
ذمیں ابھی جاکر خودکشی کروں گا"!
سریش کا یہ جواب سُن کر نرملا پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔
رش کے چرن چھونا ہی چاہتی تھی کہ سریش نے اپنے چرن
اور سرگوشی کے انداز میں بولا ــ

میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
سستے غلے کی دُکانوں سے بہلنے والی
میرے ذی شان محل کو بھی تو دیکھا ہوتا

نرملا نے اچانک سریش کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی ــ
بابو! یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں"
سریش بولا" کیوں قابل نہیں ہو تم تو گریجویٹ ہو"!
اور نرملا اس مذاق پر ہنستی ہوی کیو میں آگے جا کر کھڑی

●

ر آج سریش کی بھوک کا پانچواں دن تھا۔ اس نے
ں اپنی جگہ نرملا کو دے دی تھی۔ ساری کیو میں ان
کے چرچے عام ہو گئے تھے۔ لیکن بے چارہ سریش
۔ ایک طرف تو اس کے دل میں عشق کی آگ بھڑک
ور دوسری طرف پیٹ کی آگ" اس کے سارے وجود
کر رہی تھی۔ آج اس کے لیے کیو میں ٹھہرنا بھی دو بھر
۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ آنکھیں اندر

کو دھنس گئی تھیں۔ پیٹ دب کر پیٹھ سے پیچھے نکل گیا تھا۔ نرملا نے جب اس سے پوچھا" کیوں سریش بابو آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے"! تو سریش بولا" نرملا دیوی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کل رات سے بدہضمی کی شکایت ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نے مرغن غذائیں کھانے سے منع کیا تھا۔ لیکن ہمارے گھر کا رکھ رکھاؤ کچھ ایسا ہے کہ مجھے مرغن غذائیں کھانی ہی پڑتی ہیں"!

نرملا نے کہا" سریش بابو آپ میرے گھر آجایئے آپ کو بدہضمی کی شکایت کبھی نہ ہوگی"۔

سریش بولا: اسی لیے تو میں کیو میں آکر کھڑا رہتا ہوں۔ نرملا دیوی میرے لیے یہ کیو سستے غلے کی دُکان کے سامنے نہیں لگی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو تمہارے گھر کے سامنے لگی ہوی ہے جس میں سے گزر کر میں تمہارے گھر میں داخل ہوسکتا ہوں"!

نرملا نے ہنستے ہوے کہا" آپ بڑے خوش مذاق ہیں"

سریش بولا" جب آدمی کو پیٹ بھر کھانا ملتا ہے تو وہ خوش مذاق ہی ہوتا ہے"!

اس کے بعد سریش نے نرملا سے کہا" ـــــ نرملا! آج میں تم سے ٹیولی سینما میں ملنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار کیوں کہ بار بار ملنے کی اب مجھ میں سکت باقی نہیں رہی ہے"!

نرملا نے شرماتے ہوے کہا" سریش بابو! میں ضرور آؤں گی۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے"!

پھر نرملا کیو میں آگے جاکر کھڑی ہوگئی۔ لیکن عین اسی وقت فلک کج رفتار ان دونوں کی بے وقوفی پر مسکرا رہا تھا اچانک سریش کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے کہا "بتی جلاؤ بتی جلاؤ"۔ بازو کھڑے ہوے لوگوں نے اسے تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کا سانس اُکھڑ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور نحیف و نزار آواز میں بولا" نرملا! نرملا!" ـــــ نرملا اب تک اس کے قریب آچکی

ی۔ سرتش نے آخری بار اپنی آنکھیں کھولیں اور بولا " نرملا دیوی
ں جا رہا ہوں۔ اس ستے غلے کی دکان سے بہت دور ــــ
نت میں ــــ ! جہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔
ناج کے گودام ہوں گے۔ باغوں میں پھلوں سے لدے ہوئے
رخت جھول رہے ہوں گے۔ وہاں کوئی کیو نہ ہوگی۔ کوئی
اشن کارڈ نہ ہوگا۔ کوئی تاجر نہ ہوگا۔ کوئی چور بازاریا نہ ہوگا
ملا! میرا پیار سچا تھا۔ اور میں نے عشق کی قربان گاہ" عرف ستے
لے کی دُکان پر اپنی جان بھینٹ کردی ہے۔ میری زندگی کا مقصد
ورا ہوگیا ہے۔ اب میں جا رہا ہوں۔ زندگی میں اگر کبھی تمھیں میری
د آئے تو دو آنسو بہا لینا (ایک آنسو سیدھی آنکھ سے اور
وسرا آنسو بائیں آنکھ سے) اور یاد کرنا کہ اس دنیا میں تمھارا ایک
سا پرستار بھی تھا جس نے "عشق کی آگ" کے سامنے "پیٹ کی آگ"
کو بھی کچھ نہیں سمجھا۔ پھر سرتش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور نرملا
ھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب کی بار سرتش نے بڑی مشکل سے
ننے کی کوشش کی اور نرملا کو یوں دلاسا دینے لگا " نرملا رو مت
میں ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر نہیں رونا چاہیئے۔ پگلی کہیں کی
ے ہاں دیکھو میری جیب میں ٹیولی سینما کے دو ٹکٹ رکھے ہیں
ہ نکال لینا۔ یاد رکھو یہ فرسٹ شو کے ہیں۔ شام میں تم اور
ماری والدہ سینما چلی جانا۔ اس طرح غم کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا"
رتش نے یہ جملہ کہا ہی تھا کہ نرملا کے زانو سے اس کا سر ڈھلک گیا
ر اس کی روح "قفسِ شکم" سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئی۔
رملا کے ہاتھ سے غلّے کی تھیلی چھوٹ گئی اور گندم کے دانے
ڑک پر بکھر گئے۔ اور دور کسی ہوٹل میں ریکارڈ بج رہا تھا:

دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام
لینے والے کروڑ دینے والا ایک ــــ رام

اور سرتش مرچکا تھا ــــ ایک افسانے کا اختتام۔ زندگی
نکھیں پھاڑ پھاڑ کر سرتش کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔

اور ــــ اور پھر شام میں لوگوں نے دیکھا مغموم و اداس
نرملا۔ اپنی ماں کے ساتھ ٹیولی سینما کی جانب جارہی تھی اور اس
وقت بھی کسی ہوٹل میں یہ ریکارڈ بج رہا تھا۔

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہونگے

(غذائی افسانہ۔ نمبر ۲)

"آہ راشن کارڈ"

سندر شیاما کو بہت چاہتا تھا۔ یہ دونوں آپس میں یوں گھل مل گئے تھے جیسے مصالحے میں گھوڑے کی لید مل جاتی ہے اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ مسالا کون سا ہے اور گھوڑے کی لید کون سی ہے۔ شیاما کا رنگ گندمی تھا، اس کے گال سیب کی طرح سرخ تھے۔ اس کے ہونٹ متھرا کے پیڑوں کی طرح رسیلے تھے۔ اس کی آنکھیں بادام کی طرح بڑی بڑی تھیں۔ اس کی ناک پر مکھی بیٹھتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے برفی پر مکھی بیٹھی ہوئی ہے (اور اکثر مکھیاں تو محض غلط فہمی میں اُسے تنگ کیا کرتی تھیں) اس کی پیشانی راشن کارڈ کی طرح وسیع و کشادہ تھی۔ اس کے بال ریشمی سوئیوں کی طرح لہراتے تھے۔ وہ بات کرتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے منہ سے "رس گلے" جھڑ رہے ہیں۔ وہ ہنستی تو یوں معلوم ہوتا جیسے پوریاں گرم گرم تیل میں ناچ رہی ہوں۔ غرض شیاما کا حسن ایک "مرغوبِ حسن" تھا جسے دیکھتے ہی لوگوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی ــــ ایسے میں بھلا سندر کی رال کیوں نہ ٹپکتی

لیکن بے چارہ سندر بہت غریب تھا، اس کے گال یوں پچک گئے تھے جیسے سوکھی کھجور پر جھریاں پڑی ہوتی ہیں اُس کا رنگ دال کی طرح پیلا تھا۔ وہ جب کھوکھلی ہنسی ہنستا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اناج کے خالی ڈبے آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود شیاما سندر کو بہت چاہتی تھی دن

گزر گئے۔ محبت پروان چڑھتی رہی۔ لیکن ایک دن سندر کو معلوم ہوا کہ شیاما کی شادی کی بات چیت کسی دوسرے گھرانے میں چل رہی ہے۔ شیاما نے سندر کو ساری بات بتادی اور بولی "سندر اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو آج ہی میرے پتا جی سے صاف صاف کہہ دو کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

شام کا وقت تھا سندر بڑی ہمت کر کے شیاما کے گھر پہنچا۔ اس وقت شیاما کے پتا جی برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کا کتا بھی ان کے ساتھ ساتھ ٹہل رہا تھا اور ان کی نقل اتار رہا تھا۔ سندر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شیاما کے پتا جی نے کہا "کون ہے؟"

سندر بولا: "جی میں سندر ہوں۔"

اس پر شیاما کے پتا جی نے کہا: "تم تو پھاٹک کی اوٹ میں کھڑے ہو، مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ تم سندر ہو یا بندر؟"

یہ سن کر سندر فوراً پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوگیا اور بولا: "جی میں واقعی سندر ہوں۔ اور مجھے شیاما سے محبت ہے اور شیاما کو بھی مجھ سے محبت ہے۔ لہٰذا مجھے شیاما سے شادی کرنے کی اجازت دیجیے۔"

اس پر شیاما کے پتا جی نے کہا: "کیا تمھیں واقعی شیاما سے محبت ہے؟"

"جی ہاں مجھے واقعی شیاما سے محبت ہے" سندر بولا۔

"تو پھر اپنا راشن کارڈ دکھاؤ" شیاما کے پتا جی بولے۔

سندر بولا "سسر جی! میرے پاس اس وقت راشن کارڈ تو نہیں ہے۔ بلکہ میں نے ابھی تک اپنا راشن کارڈ نہیں نکالا ہے۔"

شیاما کے پتا جی بولے "نکل جاؤ میرے گھر سے اسی وقت۔ کیا تم مجھ سے مذاق کرنا چاہتے ہو؟ میں اپنی بیٹی کا بیاہ کسی ایسے شخص سے نہیں کرسکتا جس کے پاس راشن کارڈ نہ ہو۔ تم شیاما کو اپنے گھر لے جاکر کیا کروگے۔ جب تمھارے پاس راشن کارڈ ہی نہیں تو تم اُسے کیا کھلاؤ گے کیا پلاؤ گے؟"

سندر بولا: "سسر جی! میں شیاما کے لیے بلیک مارکٹ سے اناج خریدوں گا۔ میں اسے حاصل کرنے کے لیے سارے ملک میں تاجرین کے خلاف احتجاجی مہم شروع کروں گا۔ میں شیاما کی خاطر حکومت سے لڑوں گا اور غذائی اجناس کی قیمتیں کم کراؤں گا میں ذخیرہ اندوزوں کے خفیہ گوداموں پر چھاپے ماروں گا اور ان گوداموں میں سے شیاما کے لیے اناج نکال کر لاؤں گا۔ سسر جی مجھ پر وشواس کیجیے۔"

اس پر شیاما کے پتا جی بولے: "سندر تم نے اپنے شخصی غذائی بحران کو دور کرنے کے لیے جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ ایک سیاسی لیڈر کو زیب دیتی ہیں۔ اور میں اپنی لڑکی کی شادی کسی سیاسی لیڈر سے کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ اس طرح نہ صرف میری لڑکی کا مستقبل تاریک ہو جائے گا بلکہ ساری قوم کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔" سندر یہ سن کر چپ چاپ کھڑا رہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ پھر اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور بولا:

"سسر جی! ٹھیک ہے مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ میں آپ کے گھر کے دروازے پر اس وقت تک نہیں آؤں گا جب تک کہ راشن کارڈ نہ حاصل کرلوں۔ یا تو میں اس دنیا سے راشن کارڈ کے بغیر نکل جاؤں گا یا پھر آپ کے گھر میں راشن کارڈ کے ساتھ داخل ہوں گا۔" شیاما کے پتا جی بولے "میں تمھارے لیے زیادہ دنوں تک انتظار نہیں کرسکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں راشن کارڈ ملنے تک میری بیٹی کی جوانی ڈھل جائے اور اس پر بڑھاپا نازل ہو جائے۔ لہٰذا اگر تم شیاما سے شادی کرنا چاہتے ہو تو ایک مہینے کے اندر راشن کارڈ لاکر شیاما کے قدموں میں ڈال دو۔"

سندر پورے اعتماد کے ساتھ مسکرایا اور پھاٹک کے باہر نکل

گیا۔ پھر دن گزرتے گئے۔ ایک، دو، تین ـــــ پچیس۔۔ اور ستائیس ـــــ اور اٹھائیسویں تاریخ کو مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ کیوں کہ فروری کا مہینہ تھا۔

سندر نے اب تک سیول سپلائیز کے دفتر کے ہزاروں چکر کاٹے تھے۔ عہدیداروں کو اپنی پاک محبت کا واسطہ دیا تھا۔ انھیں یہ بھی بتلایا تھا کہ اگر اسے راشن کارڈ نہ ملا تو ایک معصوم لڑکی کی محبت گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ لیکن اسے راشن کارڈ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اور آج اٹھائیسویں تاریخ کو شیاما کی شادی نریندر سے ہو رہی تھی۔ جو غلے کے ایک بیوپاری کا بیٹا تھا۔ سندر کو یوں لگا جیسے اس کی امیدوں کا محل گرتا جا رہا ہے۔ وہ سیول سپلائیز کے دفتر میں بے چینی سے یوں پھر رہا تھا جیسے اُسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ وہ کلرک کے پاس بھاگا۔ اس کے پاؤں پکڑ لیے اور بولا "مائی باپ! مجھے آج صرف ایک دن کے لیے کسی کا راشن کارڈ مستعار دے دیجئے میں کل اسے واپس کر دوں گا۔" لیکن سندر کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ اسے آخر وقت تک توقع تھی کہ اسے راشن کارڈ مل جائیگا۔ اور وہ شیاما کی شادی کے منڈپ میں پہنچ کر اعلان کرے گا:

"ٹھہرو! یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ میں راشن کارڈ لے کر آگیا ہوں۔" اور پھر شیاما ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جائے گی۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ قسمت کو یہی منظور تھا۔ اتنے میں چار بج گئے۔ اور نریندر کے ساتھ شیاما کی شادی کا وقت آچکا تھا۔ گھڑی چار بجا رہی تھی اور بیچارے سندر کی زندگی کے بارہ بج سے گئے تھے۔ اتنے میں کلرک نے پکارا:

"مسٹر سندر! اپنا راشن کارڈ لے جائیے۔"

وہ کلرک کی طرف لپکا اور راشن کارڈ اس کے ہاتھ سے چھین کر شیاما کے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔ اور ـــــ اور جب سندر شیاما کے گھر کے سامنے پہنچا تو اس وقت نریندر اپنے دوستوں سے گلے مل رہا تھا اور شیاما نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں یوں پکڑ رکھا تھا جیسے اس نے راشن کارڈ پکڑ رکھا ہو۔

سندر کی آنکھوں میں چمکنے والے ہزاروں برقی قمقمے اچانک گل ہو گئے۔ اس نے راشن کارڈ کو اپنی مٹھی میں مسل دیا اور الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

اور دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر چھپی:

"پولیس نے آج ایک اندھے کنویں سے ایک نوجوان کی نعش برآمد کی ہے۔ اس کی جیب سے ایک راشن کارڈ بھی ملا ہے۔ اس کا نام سندر بتایا جاتا ہے۔ کیوں کہ راشن کارڈ پر یہی نام لکھا ہوا ہے۔ پولیس نے خودکشی کی اس واردات کی تفصیلات جاننے کے لیے تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔"

نوٹ:

"ان افسانوں کے کردار اور واقعات اصلی ہیں۔ لہٰذا حقیقی کرداروں اور واقعات سے ان کی مطابقت اتفاقیہ نہیں بلکہ حالات کا تقاضہ یہی ہے۔"

فلمی صنعت اور کالا روپیہ

اعجاز قریشی

جناب اعجاز قریشی صاحب معتمد "فلم اسٹڈی سرکل" نے "فلمی صنعت اور کالا روپیہ" کے موضوع کا سماجی اور معاشی پس منظر میں کامیاب جائزہ لیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مضمون قارئین کے لئے موجب دلچسپی ہوگا۔ (مدیر)

ان دنوں "تشویشناک غذائی صورتحال" کے بعد دوسرا بڑا موضوع کالا روپیہ اور فلمی ستارے بنا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو غذائی مسئلہ کے مقابلہ میں فلمی ستاروں کے مکانوں پر دھاووں سے متعلق اطلاعات اور تفصیلات میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ بات فطری بھی ہے۔ جس مُلک میں خوراک کا بُنیادی مسئلہ ہی حل نہیں ہوا، لوگ یا تو اپنی اس بنیادی ضرورت کی تکمیل کے لئے مجبوراً گھنٹوں سستے غلہ کی دوکانوں اور کوآپریٹیو اسٹورس پر لگی ہوئی قطاروں میں کھڑے رہ سکتے ہیں یا پھر خوراک کے نہ ملنے اور مہنگائی کے زیادہ بڑھ جانے کے "غمِ روزگار" کو بھُولنے کے لئے خوشی خوشی سینما گھروں میں لگی ہوئی قطاروں میں نظر آسکتے ہیں۔ فلموں بالخصوص فلمی ستاروں میں اپنے پسندیدہ ہیرو، زیادہ پُرکشش اور خوبصورت ہیروین اور مقبول موسیقاروں سے متعلق باتیں کرنے سے پیٹ تو نہیں بھرتا، لیکن دل و دماغ کو تازگی ضرور حاصل ہوتی ہے، جس سے آدھا پیٹ کھانے کے بعد بھی نیند آجاتی ہے۔ اس تفریح، اس لُطف، سکون راحت اور مسرّت کے حصُول کے لیئے ہمارے مُلک میں فلم ہی سب سے سستا اور سب سے زیادہ مقبول ذریعہ ہے۔ اور پھر گپ شپ کے لئے تو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ جس دن فلم نہیں دیکھی، اُس دن فلموں اور فلمی ستاروں کے بارے میں گپ شپ سے بھی دل بہل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ مہینے (اگست) کے آخری ہفتے میں جب بمبئی میں چند فلمی ستاروں کے مکانات پر غیر محسُوب رقم برآمد کرنے کے مقصد سے دھاوے کئے گئے تو مُلک بھر کے اخباروں

میں ان کی تفصیلات نمایاں طور پر شائع کی جانے لگیں۔ فلمی رسائل اور اخبارات میں اس تعلق سے تفصیلی بیانات اور تبصرے شائع ہو رہے ہیں۔ ان حالات کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ ملک میں کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔

جب ایک بات پھیل جاتی ہے تو پھر اس کی اشاعت کو روکنا بھی مزید پھیلانے اور اس بات کی زیادہ اشاعت کرنے کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ فلمی ستاروں سے [illegible] کروڑوں لوگوں کو جو دلچسپی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے فلمی ستاروں کی سرگرمیوں اور اُن سے متعلق معمولی معمولی باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ "بلیک منی" (کالا روپیہ) سے متعلق مسئلہ جب عام موضوع بحث بن جائے تو اس بات کی بہت کم توقع کی جاسکتی ہے کہ معاشیات سے ناواقف عام لوگ اس مسئلہ کے صحیح خط و خال کو سمجھ سکیں۔ اسلئے فلمی صنعت اور غیر محسوب رقم (کالا روپیہ) کے مسئلہ کے مختلف معاشی مالیاتی اور سماجیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قیمتوں میں مسلسل اور تدریجی اضافہ اور حالیہ عرصہ میں غذائی اجناس کی مصنوعی اور غیر مصنوعی ہر دو قسم کی قلت اور کمی اور قیمتوں کے غیر معمولی طور پر بڑھ جانے کی وجہ سے، حکومت، ماہرین معاشیات سیاسی اور سماجی کارکن اور منصوبہ ساز سبھی پریشان نظر آتے ہیں قیمتوں میں اضافہ کے اس رجحان کے اسباب مختلف ہیں۔ ان میں ایک بڑی وجہ "غیر محسوب" رقم ہے۔ غیر محسوب رقم یا کالا روپیہ اس آمدنی کو کہتے ہیں جو یا تو ناجائز ہوتی ہے یا پھر محاصل سے بچنے کے لئے پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔ جس کا حساب کتاب بھی پوشیدہ رہتا ہے۔ یہ رقم کھلے طور پر نہ تو سرمایہ کاری میں شامل کی جاسکتی ہے اور نہ ہی بنکوں میں محفوظ کرائی جاسکتی ہے۔ اسے کھلے طور پر حکومت یا سماج کے علم میں بھی نہیں لایا جاسکتا۔ ہمارے ملک میں کالا روپیہ ایک "متوازی مارکیٹ" قائم کیئے ہوئے ہے غیر محسوب رقم کا تعین اور اندازہ اس کے "غیر محسوب" ہونے کی وجہ سے ممکن ہی نہیں۔ اس لئے اس تعلق سے مختلف اندازے کئے گئے ہیں۔ کچھ لوگ تین سو کروڑ [illegible] مبالغہ سے [illegible] اور اس کے برخلاف دالستہ طور پر بھی اس رقم کو [illegible] جاتا ہے۔ حکومت بھی اس خیال سے کہ اس رقم کو زیادہ [illegible] کی صورت میں اس کی کمزوری پر حرف آئے گا اور اس کی [illegible] متاثر ہوگی، اس رقم کا صحیح اندازہ لگانے کے معاملہ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ ہمارے ملک میں ۴۰۰ کروڑ روپے کی بلیک منی گشت کر رہی ہے۔ دوسری طرف فلمی صنعت میں مشغول جملہ سرمایہ خود سرکاری اعداد کے بموجب صرف گیارہ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے۔ اگر یہ بات بھی تسلیم کرلی جائے کہ اس رقم کا ایک اہم حصہ "غیر محسوب" ہے تب بھی یہی نتیجہ نکلے گا کہ ملک میں گشت کرنے والی جملہ غیر محسوب رقم اور فلمی صنعت سے متعلق غیر محسوب رقم میں ایک اور ایک ہزار کا تناسب ہے۔ اس مفروضہ کے بموجب تمام فلمی ستاروں، پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں اور فلمی صنعت سے متعلق مختلف فنون، پیشوں اور کاروبار سے وابستہ تمام افراد کے مجموعی بلیک سرمایہ سے ایک ہزار گنا بلیک رقم کہیں اور معاشی سرگرمی کے دوسرے شعبوں میں بسی ہوئی ہے۔

حالیہ برسوں میں، قیمتوں میں جو غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اس کی بنیادی وجہ (Reckless Expenditure) ہے۔ یہ بیدردانہ صرفہ صرف غیر محسوب رقم کا صرفہ ہی نہیں بلکہ غیر معاشی صرفہ ہے۔ ایسا صرفہ درست بھی ہے جو پیداآور نہیں۔ ایک ترقی پذیر معیشت میں زیادہ مصارف ناگزیر ہوجاتے ہیں اور زیادہ مصارف کے لئے افراط زر بھی ضروری بن جاتا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں، پراجکٹ اور اسکیموں پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جارہا ہے۔ مقررہ وقت پر منظورہ وقوعات کے صرفہ کے لئے مصارف بے ہنگم بھی بن جاتے ہیں اور بیدردی کے ساتھ بھی روپیہ پانی کی طرح بہادیا جاتا ہے [illegible] خرچ کی شکایات بھی ہیں اور [illegible] کی وجہ سے [illegible] مصارف ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے قیمتوں میں [illegible]

ہو رہا ہے۔ اس معاشی بحث کی تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے، میں صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ قیمتوں میں اضافہ کے رُجحان کو روکنے کیلئے حکومت کو جو ٹھوس اقدامات کرنے چاہئیں ان کی بجائے ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں جن سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ ملک کے موجودہ معاشی سماجی اور سیاسی ڈھانچہ میں ٹھوس اور انقلابی اقدامات ممکن نہیں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ممتاز کمیونسٹ لیڈر مسٹر ڈانگے نے جو ملک کے معاشی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بُنیادی مسئلوں سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے فلمی ستاروں کو نشانہ بنایا گیا ہے، ورنہ اتنی سنسنی نہیں پھیلائی جاتی، اتنی تشہیر نہیں کی جاتی۔ ان دھاؤں کو سخت راز میں رکھا جاتا۔ یہ دھاوے اس وقت کئے گئے جب کہ مُلک میں فوڈ ایجی ٹیشن زوروں پر تھا۔

میری اس بحث سے یہ تاثر بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ میں فلمی صنعت اور فلمی ستاروں کی مُدافعت کر رہا ہوں اور اس صنعت سے وابستہ افراد اور فن کاروں کے کالے روپیہ کو میں "کالا" نہیں سمجھتا۔ چنانچہ میں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اس بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ حقایق کا جائزہ لیتے وقت ہمارا نقطۂ نظر بھی حقیقت پسندانہ ہو۔ اس حقیقت کے باوجود کہ فلمی صنعت سے متعلق عمومی غیر محسُوب رقم ساری ملک میں پھیلی ہوئی مجموعی غیر محسُوب رقم کا بہت ہی تھوڑا حصّہ ہے۔ ہر ذمہ دار شہری یہی چاہے گا کہ اس غیر محسُوب رقم کا بھی حساب لگایا جائے اور اس رقم کو بھی پیداآور کاموں میں لگایا جائے۔ انکم ٹیکس اور دوسرے محاصل کی جو چوری ہوئی ہے اس کا بھی پتہ لگایا جائے اور ملک کے قانون کے تحت ٹیکس چوروں کے خلاف کارروائی کیجائے لیکن ہر ذمہ دار شہری کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ فلمی صنعت سے غیر محسُوب رقم برآمد کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، آیا وہ مناسب ہے؟۔ چند فلمی ستاروں کے مکانات پر دھاؤں کی اطلاعات کی سنسنی خیز اور ڈرامائی انداز میں تشہیر اور اشاعت کے ذریعہ ان تمام لوگوں کو چوکنا کر دیا گیا ہے جن کے پاس ہزاروں گُنا زاید غیر محسُوب رقم موجود ہے۔ جن فلمی ستاروں کے مکانات پر دھاوے کئے گئے ان کے قبضہ سے ۳۰ تا ۴۰ لاکھ روپے ہی برآمد ہو سکے ہیں۔ ڈیفنس آف انڈیا رُولز کے سہارے یہ طریقۂ کار اختیار کیا گیا کہ ان فلمی ستاروں کو اپنی مُدافعت اور حساب کتاب پیش کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔ تیس چالیس لاکھ روپے کی اس رقم میں کتنی رقم غیر محسُوب ہے، یہ ثابت ہوئے بغیر ہی فلمی ستاروں کے مکانات اور بینک لاکرس سے برآمد کی گئی تمام رقومات اور زیورات وغیرہ کو "بلیک منی" کے نام سے شہرت دی گئی۔ حکومت کی طرف سے اختیار کردہ طریقوں کے نقائص کی وجہ سے بعض فلمی ستاروں نے اس معاملہ کو عدلیہ سے رُجوع کرایا ہے۔ دوسری طرف ڈھنڈورا پیٹنے کی وجہ سے دیگر لوگوں نے اپنی پوشیدہ رقومات کو اس درجہ پوشیدہ کر دیا ہے کہ مستقبل قریب میں نہ تو ان رقومات کو برآمد کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ پیداآور معاشی سرگرمیوں میں مشغول کی جا سکتی ہیں۔

اس طرح ان دھاؤں سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو رہا ہے۔ ان دھاؤں سے فلمی سرگرمیوں پر بھی ناموافق اثر پڑا ہے اور مقررہ سرگرمیوں کے التوا، تنسیخ، تبدیلیوں اور تالہ بندیوں کی وجہ سے اس صنعت میں لاکھوں روپے کا گھاٹا محض دھاؤں کی غیر ضروری تشہیر کے نتیجہ میں ہوا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ ان دھاؤں کے راز کو صحافت نے افشا کیا ہو۔ دھاوے کرنے والوں نے خود اپنے نام کی پبلسٹی، اپنے کارنامہ کی تشہیر اور اپنی ترقی اور نیکنامی کے لئے بھی اخباری نمایندوں کو ان دھاؤں کے معمولی معمولی تفصیلات سے واقف کرایا ہے۔ گذشتہ ماہ کے آخری ہفتے میں جو دھاوے کئے گئے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئے نہیں تھے۔ آمدنی، دولت اور مصارف وغیرہ پر ممکن قسم کے جو محاصل عاید ہیں ان محاصل کی وصولی کے سلسلہ میں اس سے قبل بھی فلمی ستاروں، پروڈیوسروں، فینانسروں کے خلاف کارروائیاں ہو چکی ہیں، دھاوے کئے گئے ہیں، تلاشیاں لی گئی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کبھی اتنی تشہیر نہیں کی گئی۔ فلمی ستاروں سے محاصل وصول کرنے سے متعلق بعض عہدہ داروں کے تبادلے کر کے اور حکومت نے اس

تعلق سے اپنی دیرینہ پالیسی کو تبدیل کر کے ڈرامائی انداز میں جو — کارروائیاں حال ہی میں کی ہیں، ان کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ڈر اور خوف پیدا ہو۔ اور جن کے پاس غیر محسوب رقومات ہیں وہ خود اپنے طور پر انہیں ڈکلیر کر کے بھاری جرمانوں اور قانونی کارروائیوں سے بچیں۔ سب سے زیادہ اہمیت تو اس بات کو حاصل ہے کہ اس طرح وہ بدنامی اور رسوائی سے بھی بچ جائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ مقصد بھی کس حد تک پورا ہوتا ہے!

جہاں تک فلمی صنعت سے غیر محسوب رقم کی لعنت کی وابستگی کا سوال ہے یہ ایک کھلا راز ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں ذخیرہ اندوزی اور مصنوعی قلت کی مدد سے اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے ذریعہ جن سرمایہ داروں نے کروڑوں روپے ناجائز طور پر کمالیے تھے۔ وہ اپنی ناجائز آمدنیوں کو فلمی صنعت میں مشغول کرنے لگے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں ہی معاشی سرگرمیاں اچانک بہت زیادہ تیز ہوگئیں، قیمتیں بڑھنے لگیں اور مصارف بڑھنے لگے۔ فلمی ستاروں میں "فری لانسنگ" کا رجحان ترقی کرنے لگا اور انہیں بلیک منی کے پیشکش ملنے لگے۔ ہمارے موجودہ فلمی ستاروں میں سب جانتے ہیں کہ ان کے پیش رو فلمی ستارے جو اپنے اپنے دور میں — بے انتہا مقبول اور ہردلعزیز تھے اپنی فنی قابلیت، دیرینہ تجربہ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود اپنا وقت گذر جانے کے بعد باعزت زندگی گذارنے کے قابل بھی نہیں رہے۔

ایک زمانہ تھا، جب ماسٹر نثار کی کوئی فلم لگتی تھی تو تھیٹروں پر اتنا ہجوم رہتا تھا کہ ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے سر پھٹ جاتے تھے۔ لیکن آج ماسٹر نثار جو اپنے زمانے کا مقبول ترین اور کامیاب فن کار تھا، اپنا سر جھکا کر بھی ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی اور اپنے افراد خاندان کی گذر بسر کے لئے پریشان ہے۔ ماضی کے ایسے کئی ہیرو اور ہیروئن، موسیقار، ہدایت کار اور دوسرے مسلم فن کار گذشتہ پندرہ بیس سال کے دوران میں بھوک، فاقہ کشی افلاس اور بیماری کے شکار دیکھے گئے ہیں۔ موجودہ دور کے فلمی ستاروں نے ان کی امداد کے لئے متعدد بار لاکھوں روپے کے چندے جمع کئے۔ اور خود بھی لاکھوں روپے امداد کے طور پر دے چکے ہیں۔ فلمی ستاروں کی شہرت کا دور مختصر ہوتا اور ان کا مستقبل غیر یقینی رہتا ہے۔ ایک عام فلم بین بتا سکتا ہے کہ چند سال پہلے کے فلمی ستاروں میں سے کئی ایک اپنی چمک دمک کھو چکے ہیں۔ کل کا کوئی مشہور ہیرو، جس سے شوٹنگ کی تاریخیں لینے کے لئے بڑے بڑے پروڈیوسر اور فنانسر اس کی خوشامدیں کرتے پھرتے تھے آج اپنی شہرت اور 'اسٹار ویلیو' کھو دینے کی وجہ سے انہی پروڈیوسروں کے گھروں اور دفتروں کے چکر لگاتا نظر آئے گا۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ برسوں کی محنت، ریاضت اور برسوں کے انتظار، صبر و ضبط اور ایثار کے بعد کسی فن کار کی قسمت چمکتی ہے۔ اور 'اسٹار ویلیو' پیدا ہونے کے بعد فطری طور پر وہ کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا اور جمع کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اسے اندیشہ لگا رہتا ہے کہ چند روزہ بہار کے بعد پھر خزاں کا موسم آئے گا۔ فلمی ستارے نقلی دوائیں تیار کر کے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ لوگوں کو بھوکا پیاسا مار کر یا ملاوٹ کے ذریعہ آنکھوں میں دھول جھونک کر "بلیک منی" حاصل نہیں کرتے۔ اُن کی بلیک منی نہ تو پیشگی تجارت کے لئے مشغول ہوتی ہے نہ غذائی اجناس اور دوسری ضروری اشیا کی ذخیرہ اندوزی میں۔ وہ بلیک منی اپنے فن کی زیادہ قیمت حاصل کر کے کماتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے فن کی جو طلب ہے وہ کتنی ہے۔ اگر وہ بلیک منی نہیں لیں گے تو ان کے فن کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا لاکھوں روپیہ دوسروں کی جیب میں چلا جائے گا اس لئے وہ بھی حقدار اور حصہ دار بن جاتے ہیں۔ چند مشہور فلم اسٹار، چند میوزک ڈائرکٹر پلے بیک سنگر، اور چند دوسرے مشہور فلمی نام ایسے ہیں جن میں سے صرف دو تین کے ایک فلم میں ایک ساتھ جمع ہو جانے سے ہی اس فلم کی قیمت جملہ مصارف کی پابجائی کے بعد لاکھوں زیادہ ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ فلم معیاری ہو یا نہ ہو۔

فلمی ستارے بلیک منی میں لاکھوں روپے ضرور لیتے ہیں لیکن انہیں اپنی "اسٹار ویلیو" کو برقرار رکھنے اور فلمی سوسائٹی

ہیں اپنے مقام اور مرتبے کی حفاظت کے لئے بھی لاکھوں روپے صرف کرنے پڑتے ہیں۔ چیاریٹی امداد، عطیوں، قرضوں، چندوں وغیرہ کے لئے ان کے گھروں پر لوگوں کا تانتا بندھا ہوا رہتا ہے فلمی معاشرے کے رہن سہن کے معیار کی وجہ سے اور مکان، فرنیچر ملبوسات، دعوتوں، تقاریب، موٹروں اور اپنے ذاتی عملہ پر بھی انہیں بے دریغ روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے بھی اور شہرت میں اضافہ اور شہرت کی برقراری کے لئے باقاعدہ حساب کتاب رکھے بغیر جو رقومات صرف کرنی پڑتی ہیں وہ بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ فلمی ستاروں کے کام کی علٰحدہ اور مخصوص نوعیت، ناپائیداری، غیر یقینی مستقبل اور دوسرے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کے تعلق سے انکم ٹیکس کی شرحوں اور شرائط وغیرہ میں تبدیلی ضروری ہے تاکہ خود فلمی ستارے بھی کالے روپے کی لعنت سے نجات پاکر زیادہ پُرسکون اور پُرمسرت زندگی گذار سکیں —— اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ فلمی ستارے تو اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور ان کی طرف سے بلیک منی، وصول اور محفوظ کرنے کا کام کرنے والے سکریٹری اور "چمچے" غیر محسُوب رقم کے ایک اہم حصّہ دار بن جاتے ہیں۔ بعض مشہور ایکٹریسیں تو اتنی پریشان رہتی ہیں کہ ان کی کمائی ہوئی ساری دولت کے مالک ان کے بعض رشتہ دار بن بیٹھتے ہیں اور ان خطرناک رشتہ داروں سے ناچاقی کی صورت میں لاکھوں روپے کی دولت اور جائیداد کو چھوڑ کر ایکٹریس کو خالی ہاتھ نکل جانا پڑ جاتا ہے تاکہ اسے ذہنی سکون حاصل ہو۔ کئی بیرونی ملکوں میں فلمی ستاروں کی آمدنی میں سے ۲۵ فی صد حصہ کو اخراجات کے طور پر علٰحدہ ?? کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی بجا مالی رعایات اور سہولتیں ہمارے ملک میں فلمی ستاروں کو حاصل نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک مشہور فلم اسٹار لاکھوں روپے ضرور کماتا ہوگا لیکن اس ملک میں ایسے بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار بھی موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس اتنی دولت ہے کہ جس کے مقابلہ میں فلمی صنعت میں مشغول مجموعی سرمایہ بھی حقیر معلوم ہوتا ہے۔ ارب ہا روپے کے غیر محسُوب رقومات رکھنے والے چند بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار آج بھی — — — — — — ملک کی معاشی اور صنعتی سرگرمیوں پر قابض اور اجارہ دار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بنکوں میں عوام جو امانتیں محفوظ کراتے ہیں وہ بھی انہی کے کنٹرول بلکہ تصرف میں آتی ہیں۔

ڈیون بوس کمیشن اور مہالنوبس کمیشن کے نتیجہ میں ان بڑے سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کی پبلک دشمن سرگرمیاں بے نقاب ہو چکی ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ حکومت نے ان کے خلاف کوئی بڑا اور جرأت مندانہ قدم کیوں نہیں اُٹھایا؟۔

ان بڑے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں نے خانگی بنکوں میں اپنا صرف (۲۹) کروڑ روپیہ مشغول کرکے بنکوں میں عوام کی طرف سے محفوظ کی گئی (۱۴) ارب (۲۸) کروڑ روپے کی امانتوں پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عوام کے گاڑھے پسینے کی اس کمائی اور اس محسُوب رقم کا جو استعمال ہو رہا ہے، اسے روکنے کی جانب زیادہ توجہ دی جانی چاہیئے کیونکہ' ذخیرہ اندوزی ——

اسٹاک اکسچینج ——

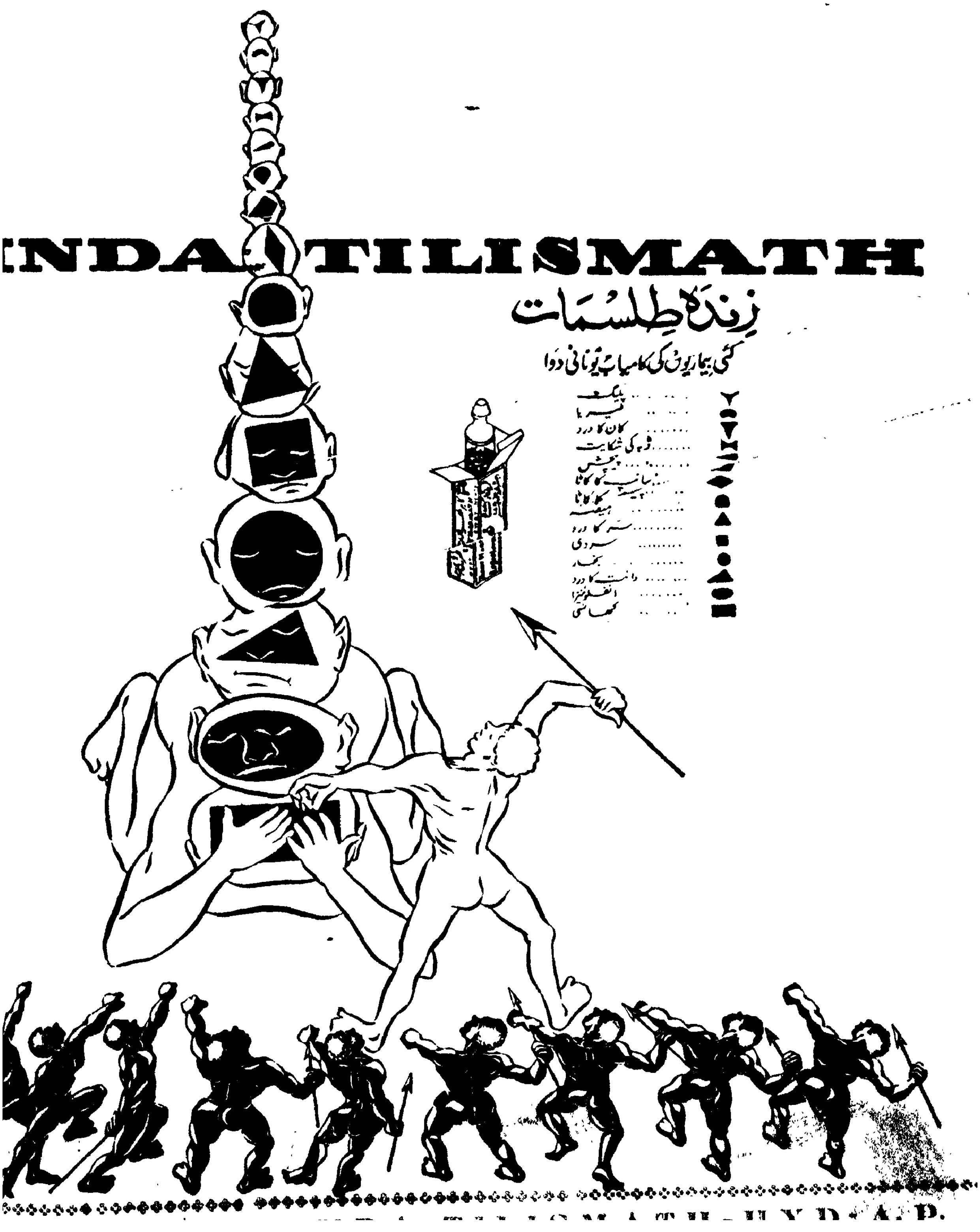
اور دوسری غیر سماجی ——

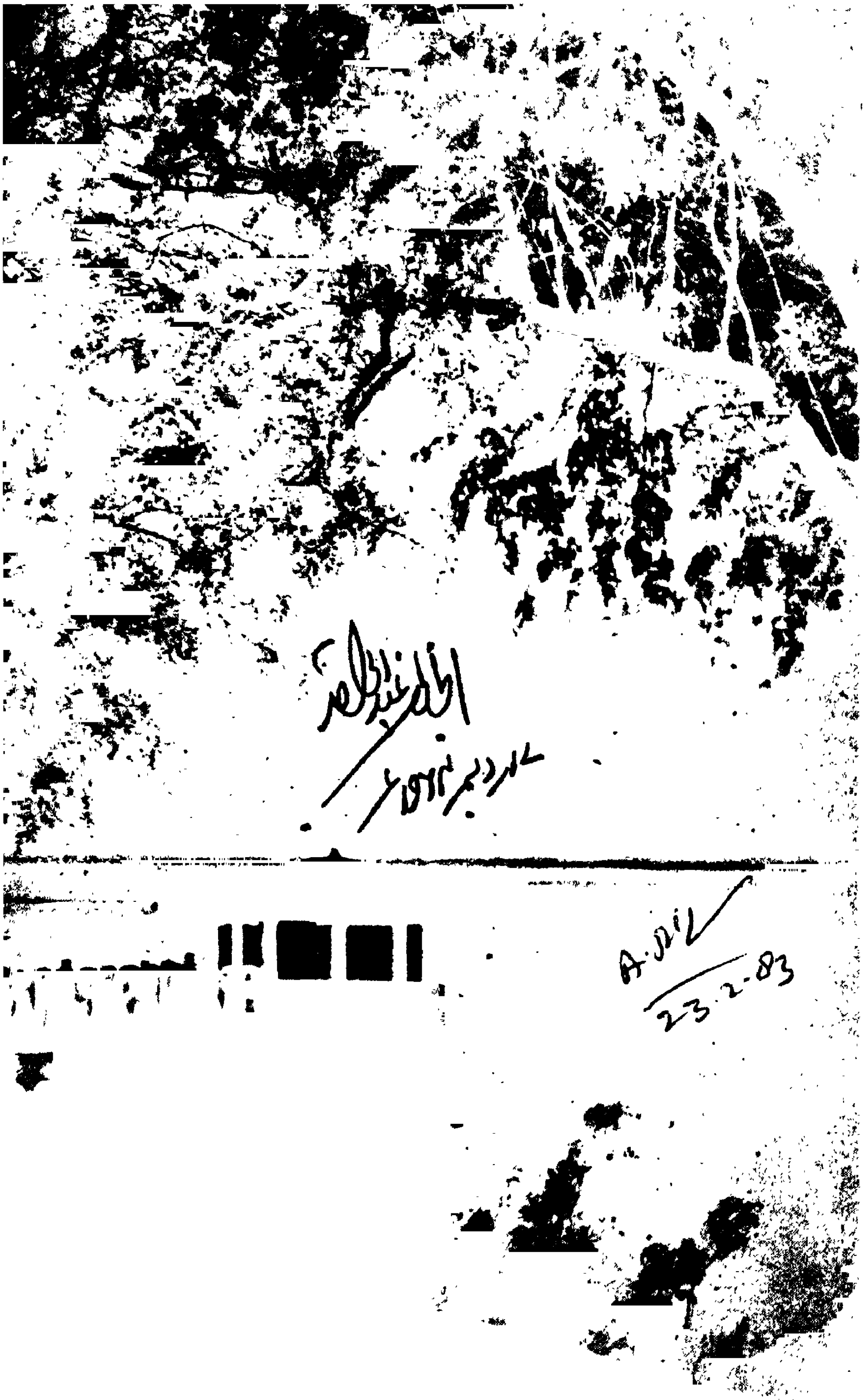
اور ملک دشمن سرگرمیوں کے لئے ——

بنکوں کی اُن رقومات کو استعمال کیا جا رہا ہے، جن کے نتیجہ میں قیمتیں بھی بڑھ رہی ہیں اور چند بڑے سرمایہ دار اور صنعت کاروں کے ہاتھوں میں ملک کی معاشی دولت کا بڑا حصّہ کھِچا چلا آرہا ہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۶۰ء کے دوران میں منظم صنعتوں کا منافع (۷۰) کروڑ روپے سے بڑھ کر (۲۰۰) کروڑ ہو گیا ہے۔ ملک کے صرف (۲۶)، بنک، ملک میں بنکوں میں محفوظ امانتوں میں سے

(۵۸) فی صد امانتوں پر کنٹرول کرتے ہیں ـــــ انہی حقایق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ممتاز ٹریڈ یونین لیڈر مسٹر ڈانگے نے حکومت پر زور دیا تھا کہ وہ اصل مجرمین کی خبر لے۔ فلمی ستارے بہرحال فن کار ہیں۔ انکم ٹیکس کے سلسلے میں فلمی ستارے ہی نہیں دوسرے سبھی فن کار، خصوصی سلوک اور رعایتوں کے مستحق ہیں۔ ماضی میں ان فن کاروں نے جو بلیک منی کمائی ہے، اسے ایک سمجھوتے کے تحت تمسکات، ترقیاتی پراجکٹس، بانڈز وغیرہ میں بھی مشغول کیا جا سکتا ہے، تاکہ اس طرح چھپی ہوئی دولت برآمد بھی ہو اور ملک اور سماج کے کام بھی آ سکے۔ یہ توقع کہ صرف دعاؤں کے ذریعہ ساری چھپی ہوئی دولت باہر لائی جا سکے گی، قرینِ قیاس نہیں۔ اس لئے کوئی نہ کوئی قابلِ عمل فارمولا تلاش کرنا پڑے گا۔ ▲


NDA TILISMATH
زِندہ طِلسُمات
کئی بیماریوں کی کامیاب یونانی دوا
کان کا درد
ہیضہ
سر کا درد
سردی
بخار
دانت کا درد
انفلوئنزا
کھانسی



MONTHLY **POONAM**

— «(آرٹ)» —

ارہ« پونم » نے آندھرا پردیش کے ممتاز
ٹوں کی پنٹنگس شائع کرنے کا فیصلہ کیا
- چنانچہ اس بار گوری شنکر کی تین
ندہ پنٹنگس پیش کی جارہی ہیں - اُمید
کہ قارئین کو یہ سلسلہ ضرور پسند آئیگا)



گوری شنکر

پیدائش:
سنہ ۱۹۳۶ع

اوارڈز:
سنہ ۱۹۵۴ع حیدرآباد اشا سوسائٹی
سنہ ۱۹۵۸ع میسور دسہرہ اگزیبشن
سنہ ۱۹۶۲ع حیدرآباد آرٹ سوسائٹی
سنہ ۱۲۶۳ع آندھرا پردیش للت کلا اکیڈیمی
سنہ ۱۹۶۴ع آندھرا پردیش للت کلا اکیڈیمی
گجرات اسٹیٹ للت کلا اکیڈیمی
گرافک اوارڈ کلکتہ



ہم آغوشی



ابدی ملاکت



مقدس ماحول

پونم

مدیر: ناصر کرنولی ایم۔اے (عثمانیہ)

قیمت فی پرچہ: — (۵۰) — پیسے
سالانہ: — (۶) — روپے
ششماہی: — (۳) — روپے
بیرون ہند سے: — (۱۲) — شلنگ

جلد (۱)

شمارہ ۷، ۸

نومبر دسمبر ۱۹۶۴ء

کتابت: ...... (خوشنویس)

ترسیل زر و خط کتابت کا پتہ:
ماہنامہ پونم 16-7-301
اعظم پورہ، حیدرآباد (اے۔پ)

مقام اشاعت: ماہنامہ پونم ۳۰۱-۷-۱۶ اعظم پورہ، حیدرآباد (اے۔پ)

★ پونم میں شائع ہونے والے تمام ادبی نیم ادبی مواد میں نام، کردار و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی، جس کے لئے ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار، حیدرآباد۔ صفحات: (۳ تا ۴۵)

ترتیب

گزارش ــــــ اداریہ ــــــ ادارہ ــــــ ۳

مضامین
تحقیق ــــ آپ اپنی نظر میں ــــــ عالم خوندمیری ــــــ ۵
آسکروائلڈ کا اسلوبِ خوش نگاری ــــــ ابوظفر عبدالواحد ــــــ ۸
حیدرآباد کا عوامی شاعر ــــ سرور ڈنڈا ــــــ مغنی تبسم ــــــ ۱۱

ہمارے مسائل
اُردو شاعری میں نئے تجربے ــــ سید حرمت الاکرام، عشرت شاہدی ــــ ۱۵

غزلیں

میرے اپنے پسندیدہ شعر ؛ فراق گورکھپوری ــــ ۱۹
خورشید احمد جامی ؛ شاذ تمکنت؟ نذیر بنارسی ــــ ۲۰
لوح یعقوبی ؛ خولجہ شوق ــــ ۲۱
ایم اے حفیظ بنارسی ؛ خلش دہلوی ــــ ۲۲
مفتون کوٹوی ؛ آفتاب شمسی ــــ ۲۳
نصیر پرواز ؛ صدیق نظر ــــ ۲۴

نظمیں

تمہارے ہاتھ ــــ نریش کمار شاد ــــ ۴۳
دو نظمیں، ایک غزل ــــ ساحل معصوم رضا ــــ ۴۵
تو عالم الغیب ہے ــــ دانش فرازی ــــ ۴۶
رقیب سروساماں نکلا ــــ کیلاش ماہر ؛ ایک سانیٹ ــــ آزاد گلاٹی ــــ ۴۷
مہرے ــــ چندر پرکاش ؛ دو فنکار ــــ تاج مہجور ــــ ۴۸

افسانے
خدا کی ذات ــــ کوثر چاند پوری ــــ ۲۵
دل پہ اعتبار کیا ــــ جے پال ــــ ۲۸
ٹارنگ ــــ اختر علی ابادی ــــ ۳۳
کا وا نا ــــ مظفر حنفی ــــ ۳۹

مستقل نمبر "کہکشاں"
ایڈیٹر کے نام ادیبوں کے پریم پتر ــــ تیرلند انہ ــــ ۴۹
اسم اعظم ــــ واحی ــــ ۵۴
ماما ــــ مناجیب ــــ جاوید لطیف ــــ ۵۵

طلاق، دنیا کی نظر میں ــــ مترجم م۔ع۔ باسط ــــ ۵۸
آئینے ــــ تبصرہ ــــ وقار خلیل ــــ ۶۳

اداریہ :

کِرنیں

پونم کا یہ تازہ شمارہ ابھی کتابت کا لحاظ رکھنے میں بعض دشواریوں اور مجبوریوں کے باعث ہر چند تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، لیکن ہمیں اُمید ہے کہ اس کا معیار گیٹ اَپ اور معنوی خوبصورتی قارئین کے ذوق کی آسودگی کا سامان فراہم کرنے میں یقیناً کامیاب رہے گی۔

پُونم کے اکتوبر کے شمارے نے اُدبی حلقوں میں جو مقبولیت حاصل کی ہے اس سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہوگئے ہیں۔ کسی نے اسے اُردو کے حق میں فال نیک قرار دیا ہے تو کسی نے موجودہ سائنٹیفک دور کا "اُدبی اسپٹنک" کسی نے ہندوستان کا منفرد خوبصورت ادبی رسالہ کہا تو کسی نے اُردو ادب کی آبرو گردانا ہے۔ بعض ایجنٹوں نے اکتوبر کا شمارہ نومبر میں پہونچنے کے باوجود یہ اطلاع بھیجی ہے کہ پُونم کی کاپیاں صرف ایک گھنٹے میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں اور ساتھ ہی ادارہ کو مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر پُونم مہینے کے پہلے ہفتہ میں پہونچ جایا کرے تو اس کی اشاعت دگنی بلکہ چوگنی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان پُرخلوص مشوروں کی روشنی میں ہم نے پیشِ خدمت شمارے کو نومبر اور دسمبر کا مشترکہ شمارہ بنادیا ہے تاکہ آئندہ پُونم ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں ایجنٹوں تک پہونچتا رہے۔

★ چونکہ ہم نے کاروباری سہولت کے پیشِ نظر 'پونم' کے اس شمارہ کو مشترکہ بنایا ہے اس لیئے ہم پُونم کے سالانہ خریداروں کو ایک شمارہ اضافہ دے دیں گے تاکہ اُنہیں کوئی شکایت نہ رہے۔

★ ہم قارئین سے وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ پُونم کو وقت پر شائع کرنے کی امکانی کوشش کی جائے گی۔ اگر قارئین پُونم کی پسندیدگی کے ساتھ ساتھ اس کے حلقۂ اشاعت کی توسیع کی طرف بھی متوجہ ہو جائیں تو ہم مستقبل قریب میں پُونم کو ایک منفرد، خوبصورت، دلچسپ اور وقیع اُدبی ماہنامہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

—— ادارہ ——

سرور ڈنڈا

ابھی دکنی زبان کے محقق نصیر الدین ہاشمی صاحب کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے قلم کی سیاہی کا بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ موت کی تیز آندھیوں نے دکنی زبان کے ایک اور روشن چراغ کو گل کردیا اور الحاج غلام سرورخاں ڈنڈا بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئے۔

۲۰ر نومبر کی شام کو ان کے انتقال کی خبر بن کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی ادبی اور ثقافتی تقریبات ملتوی کردی گئیں۔

سرور ڈنڈا حیدرآباد کے مقبول ترین شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں عوامی اور سماجی مسائل طنز و مزاح کی ایسی چاشنی لیے ہوئے تھے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس پر ان کا مخصوص ترنم سونے پر سہاگہ کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ادبی مجلسوں اور مشاعروں میں سرور ڈنڈا کی شرکت ان محفلوں کی کامیابی کی ضامن تھی۔

★ شاعری کے علاوہ سرور ڈنڈا کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی منکسر المزاجی ملنسار طبیعت، انسان دوستی خلوص اور کردار کی پاکیزگی ہے۔ غرض ڈنڈا کے انتقال سے حیدرآباد ایک ایسے شاعر سے محروم ہوگیا جس کی عام فہم مزاحیہ شاعری سماجی ناانصافیوں کے خلاف ایک بھرپور طنز تھی۔

★ ادارہ ساہتیہ اکیڈمی و انجمنِ ترقی اُردو دونوں سے اُمید کرتا ہے کہ وہ جلد ہی اس محبوب شاعر کے کلام کی اشاعت کا انتظام کرے تاکہ ڈنڈا کا وہ پیغام جو اس نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام تک پہونچایا ہے، ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے۔ (ادارہ)



شاق سب کو تری جدائی ہے
ہائے کس وقت موت آئی ہے
زندگانی کی اپنی ڈنڈے نے
نامکمل غزل سنائی ہے

علی صاحب میاں

عالم خوندمیری

مجاز

" آپ اپنی نظر میں "

مجاز کی زندگی ایک نقش تھی جو نا تمام رہا ——
ایک نغمہ تھی جو نغمہ نواز کے گلے میں اٹک گیا —— ایک تصویر تھی جو ادھوری رہی اور ایک خواب تھی جس کا آغاز رنگین لیکن انجام ڈراؤنا رہا۔ وہ ایک " جنسِ اُلفت کے طلبگار " کی حیثیت سے شعر اور عشق کی محفل میں داخل ہوا۔ رونقِ انجمنِ یار بننا چاہا۔ ماہ و انجم کی خریداری کے وَلولے دل میں جگاتا رہا۔ انقلاب تازہ تر پیدا کرنے کے خواب دیکھے، اور دَہر پر اس طرح چھا جانے کی تمنا کی کہ ساری دُنیا حیرت زدہ بَن جائے۔ "شمشیر، ساز" اور جام تینوں کو نباہنے کی کوشش کی، لیکن بالآخر اس تثلیث میں خود کھو گیا۔ شمشیر تو وہ اُٹھا نہ سکا، ساز بہت جلد ہاتھ سے چھُوٹ گیا اور اس تثلیث کے تیسرے رُکن یعنے جام میں اسے زندگی تو نہ مل سکی بلکہ شکستِ زِیست کے سارے اسباب فراہم ہو گئے۔ غالبؔ نے شاید صرف سخن سرائی کے لیئے کہا تھا ؎

مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

لیکن مجاز نے مئے کو اپنے لیئے ذریعۂ نجات بنانا چاہا۔ وہ شعر کو ذریعۂ نجات نہ بنا سکا۔ کیونکہ شعر اسی صورت میں ذریعہ نجات بنتا ہے، جب اس کا کوئی شریک نہ ہو۔ عشق بھی نہ ہو اور حُسن بھی نہ ہو۔ مئے تو حُسن اور عشق کی طرح لطیف نہیں۔ شعر مئے میں غرق ہو سکتا ہے لیکن دریائے مَے میں غرق ہونے کے بعد دوبارہ اُبھر نہیں سکتا شعر حُسن کے سمندر سے اُبھر سکتا ہے اور عشق کی آگ اس کے لیئے گلزارِ خلیل بن سکتی ہے لیکن مئے کی آگ اس کو صرف جلا سکتی ہے۔ مجاز کے لیئے خود اس کی اپنی شخصیت کی آگ کافی تھی۔ جذبے کی اس آگ میں جَل کر اس کا شعر زندگی کا رازداں بن سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی شخصیّت کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور خارج کی آگ سے گرمی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خارج کی آگ شخصیت کو جلا کر راکھ بنا سکتی ہے لیکن ہیرا نہیں بنا سکتی۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں بہت کم ایسے شاعر ملیں گے جو مجاز کی طرح

دُھوم دھام سے محفلِ شعر میں داخل ہوئے اور اسی طرح تیز رفتاری کے ساتھ جن کا شعلہ بجھ ہی گیا ہو۔

مجازؔ کی شعری کائنات مقدار کے لحاظ سے بہت مختصر ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے بھرپور، اس کی اوّلین شاعری زندگی کے لیئے بے پناہ اضطراب کی آئینہ دار ہے۔ صہبا کی تندی کا یہ عالم ہے کہ آبگینہ کے پگھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور بالآخر اس کا آبگینۂ حیات اس تندیٔ صہبا کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی تقدیر تھی محفلِ عیش و طرب کا راز داں بنے۔ لیکن اس کا شعورِ زیست اتنا گہرا تھا کہ عین مستی میں اس کی جوان نگاہیں اجل کا وحشیانہ رقص دیکھتی رہتی تھیں۔ موت کی قربت کا احساس زیست کے شعور کو اعتبار بخشتا ہے۔ مجازؔ نے جب جوانی کی آنکھیں کھولیں تو زندگی کے وَلولے رقص کر رہے تھے، لیکن زندگی کی اسی طرب انگیز محفل میں اس نے بہت دُور آسمانوں سے موت کو آواز دیتے ہوئے سُنا زندگی کے مختصر ہونے کے احساس نے اس کے مزاجِ طرب آشنا کو غمگین بنا دیا۔ وقت مجازؔ کے لیئے موت کا پیامبر تھا اور وقت کی اس گردش میں اس نے موت کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ بدبختی سے موت کی قدموں کی آہٹ نے اس کی شخصیت کو زیر و زبر کر دیا اور موت کی قربت کا احساس اس کے شعورِ زیست کو معتبر نہ بنا سکا۔ عمل اور کسی مقصد سے وابستگی ہی — — — — سے رائیگاں زندگی کو مفہوم مل سکتا ہے۔ مجاز ہر زنجیر کو توڑنا چاہتا تھا۔ کفر، تثلیث، الحاد اور اسلام، ان سب زنجیروں کو توڑ کر وہ آزادی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آزادی کا یہ منفی تصوّر، آزادی اور جبر کے تضاد کو سُلجھا نہیں سکتا۔ ان زنجیروں کو توڑنے کی سعیٔ ناکام میں وہ موت کے اندیشے میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اور جب موت اپنے بھیانک چہرے کے ساتھ اس کے شعور پر چھا گئی تو پھر وہ اندھیری رات کا ایک ایسا مسافر بن گیا جو اپنے بے مقصد سفر کو منزل کی جانب یا مقصد سفر سمجھتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ خود اس کی منزل کیا ہے۔ اس سفر میں اس نے فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ سُنی۔ اجل کے قہقہے سُنے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ محسوس کی، اس اندھیری رات میں تخریب کے پورے سامان دیکھے۔ چراغِ دَیر اور فانوسِ حرم دونوں اسے بے نور نظر آئے۔ یہ اندھیرا اس کی رُوح پر اس شدّت کے ساتھ چھا گیا کہ اب یہ مسافر اپنے سفر میں اُلجھنے لگا۔ جیسے مجذوب، ایک ایسا سالک ہو جو رُوحانی سفر کے ایک مقام میں کھو جائے، اور آگے نہ بڑھ سکے۔ ویسے ہی آوارہ ایک ایسا مسافر جس نے اپنی منزل کو بھلا دیا ہو اور جس کے لیئے سفر اور گردش ہم معنی بن جائیں۔ مجازؔ کے لیئے سفر ایک دلکش اور دلفریب تصور تھا۔ اس کے مائلِ پرواز تخیّل نے رات کی تاریکی میں جنگلوں کا سینہ چاک کرنے والی ریل گاڑی میں بھی حُسن کی تلاش کی۔ ریل گاڑی کی تیز رفتاری میں اس نے ایک "رخشِ بے عنان" کی برق رفتاری دیکھی، شاید اس نے اس رخشِ بے عنان میں اپنے شعور کے اضطراب کی ایک تصویر دیکھی — شاعر عالمِ خارج کی اس شئے یا اس مظہر کو چُن لیتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنا رُوحانی رشتہ محسوس کرتا ہے۔ شعور کا اضطراب اس منزل پر پہونچ جاتا ہے جہاں وہ اپنی متاعِ عزیز یعنی صُورتِ جاناں کو بھول جاتا ہے — زُلفِ پریشاں اب نظروں میں لہراتی نہیں اور دیدۂ گریاں کی تصویر نگاہوں سے اُوجھل ہو جاتی ہے۔ حقیقت سے سارے رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں اور اب وحشتِ زیست شاعر کے فکر و تخیل کا واحد موضوع بن جاتی ہے۔ اب اس تخیلی کیفیت میں فکر کا دامن بھی چھوٹ جاتا ہے اور سرکش تخیل شاعر کو موت کی وادیوں کی سیر کرانے لگتا ہے۔ وہ شاعر جس نے نوجوانی میں کائنات کے ہر ذرّہ میں حُسن کی جلوہ گری دیکھی تھی اور جس نے حُسن اور عشق کے انوکھے نغمے سُنائے تھے اور جس کے بیمار لبوں نے بھی کانپتے اور تھرتھراتے ہوئے شرابِ محبت کے جامِ رنگیں کو چھین لیا تھا اور جس کی قربت سے شمعِ حیا بھی جھلملا کر رہ جاتی تھی، اب اپنے وجود سے بیگانگی محسوس کرنے لگا۔ اب اس کے لیئے حسین یادوں کی دُنیا یادوں کا خوفناک جہنم بن چکی تھی اور اس جہنم میں جلنا اس کا مقسوم ہو چکا تھا۔

...' اور 'دیل' پڑھتے ہوئے، حسّاس پڑھنے والے کا دِل
...یاتا ہے اور شاعر کے مستقبل کے بارے میں اندیشے پیدا ہونے
...یں۔ 'آوارہ' میں یہ اندیشے حقایق میں بدل جاتے ہیں۔ اپنے
...دے گریبان پر یکدم اُس کی نظر رُک جاتی ہے، اب اپنا گریبان
...ی اس میں طاقت نہیں۔ شوق کی فراوانی دِل کی وحشت میں بدل
...ہے اور صنم کدہ کائنات، وحشت کدۂ زیست میں تبدیل
...ا ہے۔ عالمِ خارج حُسن سے محروم نظر آنے لگتا ہے اور کائنات
...نے میں شاعر اپنی وحشت اور اپنے اضطراب کی تصویر دیکھتا
...زندگی کا تقاضا ہے کہ مسافر راستے میں رُک کر دم لے۔
...حشت کا تقاضا ہے کہ شاعر انسان اور کائنات سے اپنے
...شتے توڑ لے۔ نظم ایک عجیب پُراسرار اور ہیبت ناک ماحول
...ر دیتی ہے اور خود پڑھنے والے کے دِل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی
...ر جب قاری اس بند پر پہونچتا ہے ؎

"جی میں آتا ہے کہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں"

تو نظم ایک ڈراؤنے خواب کی تصویر بن جاتی ہے اب شاعر کا جلال اپنی انسانی حدوں سے گذر جاتا ہے اور ایک بے مقصد لامحدودیت کی تمنا شخصیت کے انتشار کو اس اَلمناک منزل پر پہونچا دیتی ہے جہاں جنون اپنا شاعرانہ مفہوم کھو دیتا ہے اور ایک ہیبت ناک حقیقت میں بدل جاتا ہے۔ اب شاعر کے شعورِ زندگی پر عدم کا سایہ پھیلنے لگتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کائنات میں ایک ایسا مسافر تصور کرنے لگتا ہے جس کو صرف ایک رات یہاں رہنا ہے۔ آسودگیٔ ذوقِ نہاں اور تسکین شورشِ جذبات کے اسباب فراہم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن شعور کی دہلیز پر موت کا لانبا سایہ نظر آتا ہے اور پھر ذوقِ پرواز دَم توڑ دیتا ہے۔ اس حسرت ناک موڑ پر وہ سنجیدگی سے کسی بلند سماجی یا انسانی مقصد سے وابستگی کی فکر کرتا ہے لیکن منتشر شخصیت کے عناصر کو مجتمع کرنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔

اب بھی خواب تو یہی ہیں کہ دستورِ جہاں بدل جائے اور ہر آنکھ میں عشق و فراغت کا سُرور ہو، لیکن شاعر کی نظر اپنے گریبان پر پڑتی ہے جو تار تار ہے اور پھر یہ خواب ایک بے نام حسرت میں بدل جاتا ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

ابوظفر عبدالواحد

آسکر وائلڈ کا افسونِ خوش نگاری

زندگی کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ آدمی جہاں تک بن پڑے بناوٹی بنے۔ دوسرا فریضہ کیا ہے؟ یہ ابھی تک کسی نے معلوم نہیں کیا۔

حقائق کی نٹ کھٹ، بازی گروں کا کھیل ہے۔ رسّی کا تناؤ جتنا زیادہ ہوگا، یہ کھیل اُتنا ہی دلفریب نظر آئے گا۔

ہم ہر ایک کا بھلا اس لیئے چاہتے ہیں کہ خود ہمیں اپنے بارے میں دھڑکا لگا رہتا ہے۔ رجائیت کی بنا خوف پر ہے۔

خوش کلامی کا مزہ اس میں ہے کہ آدمی ہر شئے کو چھپکے سے چھیڑے، لیکن کسی شئے پر اپنی نگاہیں مرتکز نہ کرے۔

• جذبات سے فائدہ یہ ہے کہ جذبات ہمیں گمراہ کر دیتے ہیں اور سائنس سے فائدہ یہ ہے کہ ہم جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں۔

عشق کی ابتداء، خود فریبی۔ اس کی انتہاء آشنا فریبی۔ یہ ہے وہ عریاں حقیقت جس کو جدید لغت میں "رومان" کہتے ہیں۔

نقاب، چہرے سے زیادہ غماز ہوتا ہے۔ بہروپ سے شخصیت نکھرتی ہے۔

انسان جب کوئی احمقانہ حرکت کرتا ہے، اُس کی نیت ہمیشہ نیک ہوتی ہے۔

صرف دو طرح کے آدمی کشش رکھتے ہیں۔ ایک وہ، جو سب کچھ جانتے ہیں۔ دوسرے وہ، جو کچھ نہیں جانتے۔

برطانوی چہروں کی کشش خاص یہ ہے کہ پہلی ہی نظر میں وہ اُتر جاتے ہیں۔ اُنہیں دوبارہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

بعض لوگ [illegible] کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ تعیش پسندوں کی یہ آخری منزل ہے۔

انسان کو چاہیے کہ زندگی [illegible] اللہ

تفصیلات میں نہ اُلجھے۔ تفصیلات بے رس ہوتی ہیں۔

آرٹ کی اوّلین شرط ہے کاہلی۔ اور اس کی غایت و شباب شباب حاصلِ حیات ہے۔

آدمی وہی جس کے دن بے پر کی باتوں میں بسر ہوں، اور راتیں بعید الفہم مشاغل میں۔

جو ہوا سو ہو چکا۔ گزشتہ گیا ہے۔ وہی گذاشتہ، سطحی لوگ ہی وارفتۂ ماضی ہوتے ہیں۔

بعض شہری خالص دہقانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سویرے اُٹھتے ہیں، اس لیے کہ بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور سویرے ہی سو جاتے ہیں، اس لیے کہ کچھ ہونا نہیں ہوتا۔

کھلے میدانوں سے بند مکان مجھے زیادہ پسند ہیں۔ گھر کے اندر ہر شئے ایک مقام رکھتی ہے اور ہر شخص اپنے حقیقی تناسب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ گھر سے باہر انسان کا وجود یکسر مجرّد اور غیر شخصی بن جاتا ہے۔

کبھی یہ نہ کہو کہ زندگی میں کچھ نہیں رہا۔ اس سے یہی گمان گذرتا ہے کہ تم میں کچھ نہیں رہا۔

زندگی کے ساتھ انسان کی روش فن کارانہ ہو تو دماغ سمٹ کر دل بن جاتا ہے۔

لوگ بڑھاپے کے بھید میں چھید اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کا اپنا بھید ڈھکا رہے۔

سگریٹ ایک بھرپور فن کا بھرپور نمونہ ہے۔ ہر کش وہ دل کشی رکھتا ہے جس سے جی سیر نہیں ہوتا، یہی تو انسان چاہتا ہے۔

جوانی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھوں گا، ہاں، کسرت کرنا، سویرے اُٹھنا، باعزت بننا، یہ مجھ سے کبھی نہ ہو سکے گا۔

زندگی کبھی رائیگاں نہیں جاتی، بشرطیکہ آدمی کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کسی کو بگاڑنا چاہتے ہو تو اُس کی اصلاح کرو۔

جب افلاس دروازے کا رُخ کرتا ہے، چاہت کھڑکی پھاند کر اندر داخل ہوتی ہے۔

بہتیرے لوگ جب زندگی کی نثر پر سب کچھ لگا دیتے ہیں، تو کسی کا شاعری یا عاشقی کے شوق میں دیوالیہ ہو جانا یقیناً بڑی منزلت رکھتا ہے۔

راست بازی آخری مورچہ ہے اُن لوگوں کا جو تخیّل سے عاری ہوتے ہیں۔

انسان کو کوئی نہ کوئی مشغلہ رکھنا چاہیے۔ کچھ نہیں تو قرض ہی سہی۔ قرضے نہ ہوتے تو میرے پاس غور و فکر کے لیے کچھ نہ رہ جاتا۔

تجربہ کار ہونے کے لیے جوان ہونا لازم ہے، نہ کہ بوڑھا ہونا۔ تجربہ، زندگی سے باخبری کی علامت ہے۔ بڑھے غلطیوں کو تجربہ سمجھتے ہیں۔

آن بان سے بدتر بس ایک ہی چیز ہے، یعنی ایسا نیا پن جس کے بس میں تلوار نہ ہو۔ وہ حق نہیں، وہ بے بس ہے۔

جب صَرف کرنے کے لیے ہاتھ میں پیسہ ہو، اُسے صَرف نہ کرنا اِتلاف ہے۔

جوانی کی خام کاریوں کا یہ شکوہ بڑی زیادتی ہے، ایسے لوگ جن کی باتیں کرنے میں ادب و احترام سے سنتا ہوں، وہی ہیں جو سن میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ اُنہیں میں اپنے آگے رکھتا ہوں۔ وہ زندگی نے اپنے لطیف اسرار اُن پر منکشف کیے ہیں۔

میں عام طور پر وہی کہتا ہوں، جو شب و روز سوچتا ہوں، بڑی زیادتی کرتا ہوں۔ لوگوں کو اس بات سے مجھ سے عناد ہے۔

کوئی شخص اگر اتنا غبی واقع ہوا ہے کہ جھوٹ کی صفائی میں اُسے شہادت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو پھر ایسے مرد کے لیے سچ یوں ہی بہتر ہے۔

فرض: ایسا کام جس کی اوروں سے توقع کی جاتی ہے، جو کام اپنی مرضی سے کیا جائے اُسے فرض نہیں کہتے۔

اپنی پسندِ خاطر زندگی بسر کرنا، خود غرضی نہیں ہے، خود غرضی

...ایک آدمی دوسروں کو اپنی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے ۔ اصل بے غرضی یہ ہے کہ کوئی کسی کی راہ میں حائل نہ ہو اور اُسے اپنے حال میں مگن رہنے دے ۔

دوست کے مصائب سے ہمدردی ہر ایک شخص کر سکتا ہے لیکن دوست کی کامرانیوں کے ساتھ ہمدردی کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے ۔

کتنی اَلمناک داستان ہے کہ دُنیا کی نصف آبادی خدا سے منحرف ہے اور بقیہ لفظ پرست ہے ۔

آلامِ ہستی سے نجات پانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کا تماشائی بنے ۔

اعمال ، زندگی کا پہلا المیہ ہیں ۔ الفاظ دوسرا ۔ فطری زندگی وہی جو آگہی اور شعورِ نفس سے عاری ہو ۔

مغنی تبسم

حیدرآباد کا عوامی شاعر

سرور ڈنڈا

سرور ڈنڈا کا انتقال ہوگیا اور آج ہم اس کی موت پر اشکبار ہیں۔ ہم لوگ خود بھی اسی راستے پر گامزن ہیں اور جلد یا بدیر مرنے والے ہیں، پھر ہمارے یہ آنسو کیا معنی رکھتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں اور آپ اپنے ماتم گسار ہیں؟ اگر ہمارا غم اتنا سطحی نہیں ہے تو ہمارے اظہارِ تعزیت کو ایک رسم سے سوا کچھ اور بھی ہونا چاہیئے۔ سرور ڈنڈا کی موت کا غم ایک رفیقِ سفر کی جدائی کا غم ہے۔ سرور ڈنڈا ایک مخلص ہم سفر تھا، اپنے عزیز و اقارب کا، دوست احباب کا اور ان بے شمار مداحوں کا جو اس کا کلام بار بار سنتے، پھر بھی طبیعت سیر نہ ہوتی۔ حیدرآباد میں کوئی مشاعرہ ہو، کوئی محفل ہو، سرور ڈنڈا کی موجودگی اس بات کی ضمانت تھی کہ اختتام پر سامعین ایک خوشگوار تاثر لے کر وہاں سے اٹھیں گے۔ یہی نہیں، نجی اور گھریلو تقاریب میں تک لوگ اسے پکڑ کر لے جاتے اور وہ مروت اور شرافت کا مجسمہ تیوری پر بل ڈالے بغیر ان کی فرمائش پوری کرتا۔ انسانیت کی کسوٹی یہی تو ہے کہ تم نے کتنے غم خریدے اور کتنی مسرتیں تقسیم کیں۔ آج ہم ان راحتوں اور مسرتوں سے گراں بار ہیں جو ایک شاعر، فنکار، عزیز اور دوست بن کر اس نے ہمیں دیں۔ ہم یہ قرض اسے لوٹا نہیں سکتے۔ لیکن اس کی یاد، اس کے نغموں اور مترنم کی ترادشوں کو محفوظ رکھ کر ہم اپنے اور دوسروں کے لیئے ان مسرتوں کو جاودانی بنا سکتے ہیں۔

سرور ڈنڈا ایک زندہ دل اور یار باش انسان تھا۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ اس کی زندگی بہت ہی مطمئن اور پرسکون ہے حالانکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ اس نے اوروں کے دکھ اپنائے لیکن اپنے غموں کو رسوا ہونے نہیں دیا۔ زندگی کے مصائب و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کیا، شکستیں بھی اٹھائیں، لیکن سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا۔ زندہ رہنے اور خودداری کو قائم رکھنے کے لیئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے۔ اسکول آف فائن آرٹس سے پینٹنگ اور کمرشیل آرٹس کے ڈپلوما لینے کے بعد وہ کمرشیل آرٹسٹ یا عرفِ عام میں پینٹر بن گیا۔ وہ ایک اچھا فن کار تھا لیکن فن کو پیشہ بنانا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کا زیادہ وقت مشاعروں اور محفلوں کی نذر ہو جاتا جس کی وجہ سے وہ اپنے پیشے کی مصروفیات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس زمانے

سرور ڈنڈا نے عاتق شاہ، قمر ساحری اور راقم الحروف کے ساتھ مل کر ایک دو ماہی رسالہ "شور" جاری کیا تھا۔ اس دیدہ زیب رسالہ کی تزئین و تہذیب میں سرور ڈنڈا کا بڑا حصّہ تھا۔ وہ "شور" کا مینیجنگ ایڈیٹر تھا اور خیال تھا کہ وہ اپنے تعلقات اور وسائل کو کام میں لاکر اس رسالے کو کاروباری اساس پر چلالے گا لیکن کچھ تو ہماری کوتاہیاں تھیں اور کچھ اس کے مزاج کی سیمابیت عزائم کی تکمیل میں مانع رہی۔ وہ اب پبلشنگ کا کام بھی چھوڑ چکا تھا اور بے کار تھا۔ بیکار اس لیے کہ اُردو کے شاعر کو صرف داد ملتی ہے پیسہ نہیں ملتا اور جو کام پیسہ نہ دلاسکے وہ کام ہی کیا ہوا۔۔۔۔

بھابی ڈاکٹر مہرالنساء کی آمدنی سے گذر بسر ہوجاتی تھی اور انہیں کبھی اصرار نہیں رہا کہ وہ کچھ کما کر ہی لائے، لیکن سرور ڈنڈا کی حمیت اسے گوارا نہیں کرتی تھی۔ اس نے گتہ داری شروع کردی۔۔۔۔

چیف انجینیر سے لے کر معمولی مزدور تک اس کی شاعری کے مدّاح تھے۔ یہ کام چل پڑا۔ گتہ داری اور شاعری کا ساتھ ساتھ چلنا مشکل تھا۔ کبھی وہ ہفتوں حیدرآباد کی محفلوں سے غائب رہتا۔ معلوم ہوتا کہ صبح سے شام تک sites پر مصروف رہتا ہے اور کبھی اس کے دم سے سونی محفلوں میں یکبارگی جان پڑ جاتی۔ وہ کہتا آجکل کام بڑا مندا ہے ـــــ اور پھر وہ حج کرنے چلا گیا۔ وہاں سے لوٹا تو اس میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔

سرور ڈنڈا ـــــ اپنے ترقی پسند نظریات کے باوجود بعض معاملات میں قدامت پسند اور کسی حد تک توہم پرست واقع ہوا تھا وہ برسوں سے دل کا مریض تھا، حساس بھی بہت تھا۔ شاید یہی اسباب تھے کہ ادھر کچھ دنوں سے شکست خوردگی کے احساس کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی یہی تمنا تھی کہ ہجرت کرکے مدینۂ طیبہ میں جا رہے۔ اسبابِ سفر سب مہیا ہوچکے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی اور یہ معصوم حسرت وہ اپنے دل ہی میں لیئے اس جہان سے چلا گیا۔ ہم سرور ڈنڈا سے جدا ہوگئے ہیں یا وہ ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ کہتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وقت ہر زخم کو مندمل کردیتا ہے۔ یہ زخم بھی ایک نہ ایک دن بھر جائے گا۔ لیکن سرور ڈنڈا کے ساتھ گذارے ہوئے لمحوں کی یاد ایسی نہیں کہ فراموش ہوسکے۔ کیونکہ ایسے انسان اور ایسے رفیق زندگی میں کم ہی ملتے ہیں۔ بات یہ نہیں کہ وہ کوئی فرشتہ تھا اگر فرشتہ ہوتا تو شاید اس کی جدائی کا اتنا ملال بھی نہ ہوتا۔ اس کی شخصیت تو ان خطاؤں اور لغزشوں کی وجہ سے پیاری ہوگئی تھی جو ہر اچھے انسان میں ہوتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس جھگڑا جھگتی کے اس دور میں اس کا دامن ریاکاری سے آلودہ نہیں ہوا تھا۔ وہ زود حس اور زود رنج تھا۔ کسی کی کوئی بات ناگوار گذرتی تو اس کے منہ پر کہہ دیتا۔ غصّہ آتا تو لڑنے کے لیے بھی تیار ہوجاتا۔ لیکن پھر ساری باتوں کو بھول کر بہت جلد دوست بن جاتا تھا۔ کینہ پروری اس کی فطرت میں نہیں تھی۔

سرور ڈنڈا کی موت نے نہ صرف ایک عزیز دوست کو چھین لیا ہے بلکہ ایک ایسے شاعر سے ہم کو محروم کردیا ہے جو اپنے فن میں حقیقتاً منفرد تھا اور جس کی جگہ کبھی پُر نہیں ہوسکے گی۔۔۔

سرور ڈنڈا کی شاعری کی ابتدا ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ہوئی۔ جب وہ اسکول آف فائن آرٹس میں زیر تعلیم تھا اس کی ایک ہم جماعت طالبہ کو جس کی مادری زبان اُردو تھی اپنی انگریزی دانی پر بڑا فخر تھا اور یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ اُردو میں ٹھیک سے گفتگو نہیں کرسکتی اس کا یہ انداز سرور ڈنڈا کو بہت کھلتا تھا اس نے اور اسی کے کہے ہوئے اس فقرے کو ٹیپ کا مصرع بنا کر ایک مزاحیہ نظم لکھی ـــــ

آئی ڈونٹ نو اُردو
پلیز آئی ڈونٹ نو اُردو

ساتھی اس نظم کو لے اُڑے۔ اس طالبہ کی ایسی دُرگت بنی کہ ساری انگریزی دانی ہوا ہوگئی۔ اب سرور باضابطہ شاعر بن گیا تھا طالب علم اسے ہر وقت گھیرے رہتے اور فرمائشیں کرکے اس کا کلام سنتے۔ اس زمانے میں اس نے کئی مزاحیہ نظمیں کہی تھیں جو بعد میں

خود اسے بھی یاد نہیں رہی تھیں۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد جب وہ آلامِ حیات کی تلخیوں سے آشنا ہوا تو اس کی شاعری میں مزاح کے ساتھ فکر کی گہرائی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اشتراکی تحریک اور ترقی پسند نظریات سے اس نے براہِ راست اثر قبول کیا۔ ابتدا ہی سے اس کی ہمدردیاں پس ماندہ اور کچلے ہوئے عوام کے ساتھ وابستہ رہیں۔ (سرور ڈنڈا ایک باشعور فن کار تھا۔ اس کا سیاسی اور سماجی شعور مطالعے سے زیادہ مشاہدے اور تجربے کی دین تھا) اس نے عام لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی۔ ان میں رس بس کر ان کے مسائل سے آشنا ہوا اور ان کے گونگے جذبات و احساسات کو ایک زبان عطا کی۔

سرور ڈنڈا کو دہقانی یا دکنی زبان کا شاعر کہنا میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ اس کی زبان نذیرؔ دہقانی، کھٹاؔ اور علی صائب کی زبان سے مختلف ہے، جنہوں نے دیہاتوں میں بولی جانے والی زبان میں شاعری کی اور ایک دہقان بن کر کبھی شہری زندگی کا مذاق اُڑایا اور کبھی دیہاتی عوام کے سادہ و معصوم جذبات و خیالات کی ترجمانی کی۔ سرور ڈنڈا کی زبان قلی قطب شاہ یا ولی کی قدیم دکھنی بھی نہیں ہے جس کو سلیمان خطیب نے اپنی بعض نظموں میں برتنے کی کوشش کی ہے، وہ حیدرآباد کے عوام کی زبان ہے جو اس شہر کے بازاروں، گلی کوچوں اور گھروں میں عام طور پر سنائی دیتی ہے۔ زبان کے علاوہ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ ڈنڈا نے متذکرہ شعرا کی طرح اپنی شاعری کو چند مخصوص سماجی مسائل تک محدود نہیں رکھا۔ اس کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس نے پہلی بار مقامی زبان میں مسائلی اور سیاسی نظمیں لکھیں۔ سرور ڈنڈا کا ایک اہم کارنامہ جو شاید آئندہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اس کے نام سے منسوب کیا جائے گا یہ ہے کہ اس نے تلگو لوک گیتوں کے بعض مقبول سانچوں کو پہلی بار اُردو میں روشناس کرایا۔ ان میں سے ایک "بورا کتھا" ہے جو تلگو بولنے والے عوام میں بے حد مقبول ہے۔ اسی طرح ہولی کے موقع پر گائے جانے والے ایک گیت کے طرز پر اس نے "شانتی بت کما" لکھا۔ ان کے علاوہ اس کی بعض نظمیں ڈھولک کے گیتوں کی دھن پر ہیں جو حیدرآباد میں شادی بیاہ اور دوسری تقاریب کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ سرور ڈنڈا نے اپنے گیتوں اور نظموں میں کہیں کہیں تلگو زبان کے الفاظ اور فقرے بھی بڑی برجستگی کے ساتھ استعمال کر کے اس امکان کی نشاندہی کی ہے کہ صوبائی زبانوں کے الفاظ بھی ہماری زبان کا جزو بن سکتے ہیں۔ سرور ڈنڈا نے غزلیں بھی کہی ہیں جن میں سیاسی اور سماجی مسائل کے تعلق سے بڑے معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔ عشقیہ مضامین بھی باندھے ہیں لیکن روایتی انداز میں نہیں۔ کہیں کہیں میاں بیوی کی محبت اور ان کے آپسی جھگڑوں کو بھی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

سرور ڈنڈا کو اُردو زبان سے بے حد پیار تھا۔ اس کی شاعری کی ابتدا اسی اُردو پرستی کے جذبے سے ہوئی تھی۔ بعد کو بھی اس نے چند ایسی نظمیں لکھیں جن میں خلوصِ عشق کے ساتھ اُردو زبان کی شیرینی، لطافت اور ہمہ گیریت کے گُن گائے ہیں۔

سرور ڈنڈا نے کبھی قلم ہاتھ میں لے کر شعر نہیں کہا اور نہ کبھی شعر کہہ کر ضبطِ تحریر میں لانے کی فکر کی۔ ابتدائی زمانے کی بہت سی نظمیں خود اس کے حافظے سے محو ہو چکی تھیں۔ ایک بار اسے اپنے مجموعہ کی اشاعت کا خیال آیا تھا۔ چند نظمیں مجھے لکھوائی تھیں۔ پھر وہ کچھ ایسے خانگی افکارات میں اُلجھ گیا کہ یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔ بڑی بدبختی ہوگی اگر سرور ڈنڈا کا کلام جس کا بڑا حصہ سامعین کی یادداشت میں محفوظ ہے فوراً یکجا کر کے شائع نہ کیا جائے ...

ساہتیہ اکیڈمی آندھرا پردیش سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ حیدرآباد کے اس مقبول عام شاعر کا کلام خاص اہتمام کے ساتھ شائع کرے گی۔ اور یقین ہے کہ فائن آرٹس اکیڈمی جس نے سرور ڈنڈا کے کلام کو یکجا کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے، اس کے گائے ہوئے گیتوں کو ٹیپ ریکارڈز سے ڈسک ریکارڈز میں منتقل کرنے کا بندوبست بھی کرے گی۔

غلام مسعود خاں ڈنڈا

دو غزلیں — ایک نظم

ان کی وہ اَوندھی چال ہے سو ہے
جیتنا اپنا محال ہے سو ہے
گاڑی اپنی اُلال ہے سو ہے
دل کو اپنے مَلال ہے سو ہے
ہو گو برباد اُن کے ہاتھوں سے
اب بھی اُن کا خیال ہے سو ہے
تھپّڑ ایسا اُنوں رسید کریں
اب تلک سُرخ گال ہے سو ہے
اُن کی قسمت میں مُرغی اور مچھی
میری قسمت میں دال ہے سو ہے
جب بھی چاہیں گے رنگ بدلیں گے
یِتّا ہم میں کمال ہے سو ہے
ایسے روشن زمانے میں ڈنڈے
اپّو اُلفت کا کال ہے سو ہے

/

لہ اِتنا

جب دل میں آیا دُنیا میں کچھ نام کمانا
ہم سیک لیئیں[1] آنکھیاں سے کاجل کا چُرانا
بھاگاں میں اُن کے لکھیا ہے کمخواب و مشجّر
بھاگاں میں اپنے لکھیا ہے بس پھٹّا پُرانا
چورستے پو پہنچے جو سیاست کی تو بولیئیں
اندھاہوں، مائی باپ، ہمنے رستا بتانا
تعریف سیاست کی صرف اِتّی ہے یارو
جس کو بلیا موقع اُنّے[2] ڈھول جمانا
قانون نرالا یچ ہے محفل میں اُن کی آج
کمزوروں، ناتوانوں کو اُٹّھ بیٹ[3] کرانا
کیا ہم پو گذر گئی ارے پاشا تو نکو پوچ
پا پڑ کے نادَ بیل[4] دیا ھم کو زمانا
جو اچھی بُری مانتے نئیں چُپکے اکڑتیں
ایسوں کو صُبوں شام فقط ڈنڈا ابجانا

لہ لیتے ہیں
ٹہ اُن
ٹہ اُٹھ بیٹھ
ٹہ طرح

اِدے نا مادیشم

(یہ نہ ہمارا دیس ہے؟)

سدّاں[1] میرے گاؤں، پو غربت کا موسم
نہ فاقوں سے فرصت نہ دم میچ ہے دم
یاں لنگی بی گت نئیں واں اُن کو ہے ریشم
اِدے نا مادیشم، اِدے نا مادیشم
جاں[2] جینے پو ٹُنڈ مال، یاں مرنے پو ٹکساں
جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انساں
جاں بلنا بی مشکل ہے بیڑی کے دو دم
اِدے نا مادیشم، اِدے نا مادیشم
بڑا پاپ ہے یاں کو ہنسنا ہنسانا
سداں ریت ہے یاں کی رونا رُلانا
چُپیچ لڑکو مرتیں گھُرڑو ونکیشم
اِدے نا مادیشم، اِدے نا مادیشم
جاں دو دلّاں آپس میں ملنے تو ستیں
جُرا غانچو کر تیچ ڈنڈے برستیں
جاں آدمیاں کے بھیساں میں رہتے ہیں دیّم
اِدے نا مادیشم، اِدے نا مادیشم

لہ ہمیشہ لہ جہاں ... شیطان ...

ہمارے مسائل

اُردو شاعری میں نئے تجربے

★ سید محمد رحمت الاکرام

★ عشرت قادری

★ ان دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظمِ آزاد اور نظمِ مُعرّیٰ کے ساتھ ساتھ ادھر کچھ شاعروں نے منثور نظم کے بھی تجربے کیے ہیں ہیئت سے ہٹ کر مواد اور موضوع میں بھی تنوّع اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور نئی نئی علامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے' لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری خاص طور سے اُردو نظم' آگے بڑھنے کے بجائے رُوبہ زوال ہوتی جارہی ہے۔ نئے شاعروں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو پڑھنے والوں کو پُوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ کسی کا اندازِ بیان آتنا کاواک ہے کہ کسی عُنوان بات پلّے نہیں پڑتی اور کوئی' ایسے دُور از کار خیالات کو بے سَر و پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نظم چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس رُجحان کے اسباب اور اس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

شاعری ہی نہیں، انسانی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں تجربات کی اہمیت سے انکار خلافِ دانشمندی ہے' بشرطیکہ تجربات کی بنا اخلاص مندی، دیانت داری اور ذمہ داری پر استوار کی گئی ہو۔ ہماری نئی شاعری ان اُمور کی تکمیل پورے طور پر نہیں کرتی، کیونکہ اس کی فہرست میں سہل انگاروں اور کم سوادوں کی تعداد زیادہ ہے جو خونِ جگر کی متاع رکھتے ہی نہیں اور رکھتے ہیں تو معمولی۔ وہ "نئی شاعری" کو محض بطور "لیبل" استعمال کرتے ہیں اور اس طرح اپنے کو ریاضت، ارتکاز اور تبحر ... کی صعُوبتوں سے بچا لیتے ہیں۔

کسی بھی "نئی چیز" کو ہر دَور میں ہدفِ اعتراض بنایا جاتا ہے اور اس کا استقبال کرنے کے لیے لوگ اپنے کو آمادہ نہیں کر پاتے یہ مقولہ غور طلب ضرور ہے لیکن لازمی نہیں کہ یہ ہر دَور، ہر موقع اور ہر واقعہ کے مختلف پہلوؤں کا ساتھ دے سکے اور چونکہ "نئی شاعری" کا خیر مقدم پوری گرمجوشی سے نہیں ہو رہا ہے لہٰذا اسے "نئی شعر" کی خامیوں اور کوتاہیوں کا پردہ بنایا جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر نئی چیز اچھی ہی ہو؟ ترقی پسند مصنفین نے اپنی تحریک کے دورِ آغاز میں جو راہ اختیار کی تھی، اس کے جواز کے لیے وہ بھی اسی مقولہ کو استعمال کرتے تھے لیکن کیا یہ سانحہ عبرت ناک نہیں کہ کچھ ہی دنوں کے بعد انہیں اپنے طریقِ کار پر خود ہی متاسف ہونا پڑا جس کے ردِّ عمل کی پرچھائیاں "نئی شاعری" کے پس منظر میں جھلملاتی ہوئی ملتی ہیں۔ چنانچہ محض یہ سمجھ کر یا کہہ کر کہ اس پر تنقید یا

الغرض بیزاری کا سبب صرف اس کا نیا ہونا ہے، اپنے معائب سے غافل، تنہا اس پر پردہ ڈالنا کم از کم شاعروں کے لیے "تحسین ناشناس، قوم کی آنکھ" تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خوش فہمی یا غلط فہمی دوسروں کے لیے نہیں بلکہ خود "نئی شاعری" کے لیے ضرر انگیز ہے۔ تاویل، ہر خامی اور کوتاہی کی کی جا سکتی ہے، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن تاویل، کسی خامی یا کوتاہی کا تدارک نہیں بن سکتی۔

"نئی شاعری" کو میر کی بے روح نقالی، علائم کے بے سروپا استعمال اور نیا پن پیدا کرنے کے جنون نے زبردست ٹھیس لگائی ہے۔ شاعری نئی ہو یا پرانی، اس کے کچھ ضابطے یقیناً ہوتے ہیں اور لازماً ہونے چاہئیں، جن کا تعلق فن اور زبان دونوں سے ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے قدامت پرستی اور روایت پرستی قرار دیا جائے لیکن کوئی بھی شعری و ادبی تحریک مخصوص ضوابط کی پابندی اور صالح روایات کے احترام کے بغیر ان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی جو مقصودِ فن ہیں۔ "نئی شاعری" کو خود بینی سے زیادہ خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ یہ اس کی بھلائی کی بات ہے اور میں یہ باتیں کسی غیر متعلق شخص کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس خیال کے تحت کہہ رہا ہوں کہ اہلِ ادب کسی نہ کسی نہج سے مجھے بھی "نئی نسل"[1] کا ایک فرد متصور کرتے ہیں۔

"نئی شاعری" کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیئے، ان تفصیلات کا احاطہ چند پیراگرافوں میں ممکن نہیں۔ بہتر ہے کہ اس موضوع پر ذمہ دار نقادوں اور شاعروں کو قدرے مبسوط اور بے لاگ اظہارِ خیال کی دعوت دی جائے۔

سید حرمت الاکرام

[1] راقم الحروف کا ایک مضمون "نئی نظم اور نئی نسل" کے زیرِ عنوان "الشجاع" کراچی (اکتوبر ۱۹۶۲ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

"اُردو شاعری میں نئے تجربے" عصرِ حاضر کا اہم ترین سنجیدہ ادبی مسئلہ ہے، جس پر مستقبل کی اُردو شاعری کا انحصار ہے، حیرت ہے کہ یہ لوگوں کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بن گیا ہے، ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر ذاتی تعصبات، انفرادی تاثرات اور احباب نوازی سے بالاتر ہو کر اجتماعی افادیت کے مدِ نظر بحث کی جائے۔

اب تک اس موضوع پر ایک دو کو چھوڑ کر جو آرا نظر سے گذری ہیں اُن سے ایسا یقین ہوتا ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے پر اپنی انفرادی برتری ظاہر کرنے کے لیے بحث کو اور اُلجھانے کے درپے ہے۔ یہی نہیں بلکہ پُورا مضمون پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ بھی مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا زیرِ بحث موضوع سے کہاں تک تعلق ہے؟

اس کے برعکس یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ اُردو شاعری کی طرح اس قسم کے مضامین یا اُردو مقالات میں بھی تجربات کیے جا رہے ہیں، پڑھتے رہیے اور سوچتے رہیے کہ آخر لکھنے والا کہنا کیا چاہتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے خونِ جگر سے جس اُردو شاعری کو سینچا ہے اور جس پودے کی آبیاری کی ہے وہ آج اپنی مقصدیت، افادیت، خوش آہنگی نیز مخصوص لب و لہجہ کی بنا پر مقبولِ خاص و عام ہے اور سنِ بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ نا آسودہ حال دوستوں کو وہی اُردو شاعری "جانکنی کے عالم میں" نظر آ رہی ہے۔ جدید ترین نسل میں مشکل تو یہ ہے کہ تجرباتی شاعری کرنے والے خود بھی اس صنف کے بارے میں کوئی واضح تصور یا خوش آیند توقع نہیں رکھتے۔

گوشے گوشے سے انتہائی علامتی نظموں کے خلاف آواز بلند کی جا رہی ہے۔ اس بحث میں وہ نئی نظم کہاں سے

گئی جس کی عمر عمیق حنفی صاحب ۱۵ سال متعین کرتے ہیں۔ جس صنف سخن میں عظمت کی تلاش ابھی قبل از وقت ہے معلوم نہیں پھر اسے نصاب میں کیوں کر داخل کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس میں مقصدیت، سیاست، سائنس، اخلاق اور فلسفہ قطعی بیکار اور غیر ضروری قرار دیئے جاتے ہیں۔

چند روز پیشتر ہی بھوپال میں احتشام حسین صاحب سے تجرباتی اور خصوصاً علامتی شاعری کے بارے میں متعدد سوالات کیے گئے تھے، جس کے جواب میں موصوف نے کہا کہ اس قسم کی نظمیں اب تک سمجھ میں نہیں آسکی ہیں، کچھ عرصہ اور ہمیں غور کرنا ہے۔ اگر یہی روش رہی اور اسی طرح گنجلک شاعری کی جاتی رہی تو ناقدین اس کے خلاف رائے دینے پر مجبور ہوجائیں گے۔ احتشام صاحب جیسے لوگوں کے لیے عمیق صاحب نے ایک اور تحقیق کرلی ہے کہ کالیداس شکسپیر، ملٹن، دانتے، گوئٹے، غالب اور میر، عوام کی فہم و فراست کے دائرے میں نہ تھے اور یہی "بظاہر" ان کے عظیم ہونے کا راز تھا۔ (ورنہ بقول عمیق صاحب وہ عظیم ہی نہیں) میر غریب نے یہ شعر شاید اسی قسم کے موضوع پر کہا ہوگا۔

شعر میرا ہے گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

قدیم روایات سے بغاوت، مہذب اور متمدن دور کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ حرکت، فکر و عمل اور ارتقاء، زندگی اور انسانی فطرت کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن تخلیقی عمل کے لیے مناسب نئے سانچے بھی ضروری ہیں۔ مافوق الفطرت ہیولیٰ سازی کا نام جدت، تجربہ یا روایت سے بغاوت نہیں، بلکہ ذہنی پسماندگی اور فکری کم مایگی کی مثال ہے۔

ستمبر کے شمارے میں عمیق صاحب اردو علامتی شاعری کی عمر ۲۰ سال بتاتے ہوئے بھی اس بات کے مخالف ہیں کہ ابھی اس سے زیادہ مطالبے کرنا اتاؤلے پن کا ثبوت ہوگا۔ حالانکہ اس صنف کی عمر کسی صورت چار پانچ سال سے زائد نہیں پھر اس صنف سخن کے علمبرداروں اور حامیوں کی جانب سے اگر میر و غالب اور جوش و فراق کی جگہ چار پانچ سالہ ادبی عمر رکھنے والوں کو عظیم شاعر تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور مخالفت کرنے والوں کو طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جائے تو یہ کہاں تک زیب دیتا ہے؟

خود عمیق صاحب نے جہاں ایک امریکی اخبار کا حوالہ دیکر میر و غالب کو "کم معروف" شاعر قرار دیا ہے، وہیں یہ پیشگوئی بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ شاعرانہ عظمت کا جنم اسی قسم کی علامتی شاعری سے ہونے والا ہے۔

عمیق صاحب نے یہ مضمون کافی ذہانت کے ساتھ پہلو بدل کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود وہ کوئی منفی یا مثبت رائے نہیں دے سکے۔ بلکہ تمام مضمون میں اپنی ہی باتوں کی نفی کرتے رہے ہیں۔ انہیں علامتی نظموں کا گنجلک ہونا بھی تسلیم ہے اور یہ بھی کہ نئی نظمیں یاس و نامرادی، ناآسودگی، گھٹن اور جھنجھلاہٹ میں ڈوبی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ اس عہد کو انفرادی عظمتوں کا نہیں، اجتماعی عظمتوں کا عہد کہتے ہیں۔ جس کا مندرجہ بالا خصوصیات کی حامل نظموں میں نشان تک نہیں ملتا۔ بلکہ ہر شاعر خود اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر بیٹھ رہنے کا متمنی ہے۔ اجتماعی جدوجہد کی تو ساری بحث ہے! جس شاعری میں مقصدیت، عصری تقاضے اور سیاسی و سماجی مسائل غیر ضروری ہیں اس میں اور کلاسیکل شاعری میں فرق ہی کیا نہ جاتا ہے اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بڑے بڑے اہل قلم مصلحت پسندی کا شکار ہوگئے ہیں۔

تجرباتی شاعری کے علمبرداروں میں زیادہ تعداد ایسے افراد کی ہے جو تجزیہ طور پر خود کو ترقی پسندوں کی صف میں شامل کیے ہوئے تھے وہ آج مقصد برآری کے بعد پوری تحریک کے خلاف زہرافشانی پر آمادہ ہیں، اور بے مقصد و بے ضرر شاعری کرنیوالوں کے گروہ میں سب سے آگے نظر آرہے ہیں۔

ظاہر ہے جو بات سامع یا قاری کے پلے ہی نہیں پڑیگی

اتھلے تنقید یا معزت رساں اثمات کے بارے میں کوئی رائے بھی کیونکر دی جاسکتی ہے۔ کسی بھی مسئلے پر دو رائیں ہوسکتی ہیں — منفی یا مثبت، لیکن عام طور پر اس بحث میں الجھاؤ پیدا کرکے ہر شخص اپنے آخری فیصلے سے گریز کررہا ہے۔ کسی کو ناقدین کی عدم توجہی کی شکایت ہے اور کوئی دو چار سال ہی کی شاعرانہ عمر کے ساتھ مقام اور مرتبے کے تعین کا خواہشمند ہے۔

کسی بھی فن میں ترقی اور توانائی کی راہیں ہموار کرنے کیلئے خود تنقیدی کا شعور بھی بہت ضروری ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدا میں بھی ابہام گوئی اور نعرے بازی کچھ عرصے تک ماند رہی۔ میراجی اور ن۔م۔راشد کی شاعری کا بڑا حصہ اسی لیے مذموم قرار پایا اور مقاصد کی اہمیت، ادب کی ترقی، ترویج، معنی و مطالب اور پھیلاؤ کے مدنظر سخت سے سخت تنقید کے ذریعہ ایسے ایسے عناصر پر پابندی لگائی گئی اور الجھی ہوئی بے معنی تحریروں کو خارج کردیا گیا۔

اگست ۶۲ء کے "پونم" میں "ادبی دنیا" لاہور کے تجزیاتی مطالعوں کا تذکرہ مظفر حنفی نے حقیقت کی روشنی میں کیا ہے جس کیلئے "ادبی دنیا" کے خاص نمبر [illegible] تا [illegible] دیکھے جاسکتے ہیں۔ جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامتی نظمیں لکھنے والے خود ایک دوسرے کی نظموں کے معنی اور مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس بحث میں کسی مخصوص شاعر سے نظم کے کسی مخصوص پہلو پر غور کرنے کا مطالبہ ہرگز نہیں کیا جاتا تھا بلکہ مکمل نظم تجزیے کے لیے مختلف علامتی نظموں کے شاعروں کو روانہ کی جاتی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ ہر شاعر کی بیان کردہ تشریح دوسرے شاعر، حتیٰ کہ نظم کے خالق کی تشریح سے بھی مختلف ہوتی تھی۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے "میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کی کاواک اور گنجلک چیزوں کے بطن سے بڑی شاعری برآمد ہوگی۔

ویسے خاموشی سے یہ تجربات کرنے والوں کا انجام دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ وہ ابھی سے بلند و بانگ دعوے اور ناقابلِ قبول مطالبات ہمارے سامنے نہ رکھیں جب تک کہ ان کے ہاتھ میں ٹرمپ کا پتہ نہ آجائے ▲

عشرت قادری

اوجؔ یعقوبی

دل سلگتا ہے پیئے اشکوں کے کم جلتے ہیں
اس طرح ضبط کی نرم آنچ میں ہم جلتے ہیں

آپ کا دامنِ احساس نہ سلگے کیوں کر
پیار کی آگ سے پتھر کے صنم جلتے ہیں

گرمیٔ حسنِ طلب کا تمہیں اندازہ نہیں
دستِ سائل سے بھی دامانِ کرم جلتے ہیں

سرد آہوں سے سلگ جاتا ہے ویرانۂ دل
گرم اشکوں سے کبھی دیدۂ نم جلتے ہیں

نہ تو آہوں کا دھواں ہے نہ تو اشکوں کے چراغ
ہائے کیسی آتشِ خاموش میں ہم جلتے ہیں

بے دلی ڈھونڈتی ہے اجنبیوں کی محفل
کوچۂ یاراں میں محبت کے قدم جلتے ہیں

اوجؔ تخئیل کے شعلوں کا پرونا ہے غزل
شعر کہتے ہوئے ہم اہلِ قلم جلتے ہیں

خواجہ شوقؔ

اے ذوقِ نظر پہلے وہ بات تو کر پیدا
ہر جلوۂ پنہاں ہو تا حدِّ نظر پیدا

تنظیمِ گلستاں میں دونوں کا بھی حصہ ہے
کانٹے ہوں کہ گل بوٹے ہوتے ہیں مگر پیدا

ہر دورِ کشاکش سے انسان گزرتا ہے
برسوں میں کہیں جا کر ہوتی ہے نظر پیدا

دیکھیں گے حوادث میں کتنی ہے سکت آخر
ہمت ہے تو کیا غم ہے کر لیں گے جگر پیدا

جو سامنے رہ کر بھی نظروں میں نہیں بھرتے
اکثر انہی جلوؤں سے ہوتی ہے نظر پیدا

تاریخ کو بھی جن سے اک روشنی ملتی ہے
ہر دور میں ہوتے ہیں کچھ لوگ مگر پیدا

گم ہو گئیں امیدیں جو ظلمتوں کے اندھیروں میں
اے شوقؔ ہوئے جب بھی آثارِ سحر پیدا

ایم اے حفیظ بنارسی

لہو کی مے بنائی دل کا پیمانہ بنا ڈالا
جگر داروں نے مقتل کو بھی میخانہ بنا ڈالا

ہمارے جذبۂ تعمیر کی کچھ داد دو یارو
کہ ہم نے بجلیوں کو شمع کاشانہ بنا ڈالا

ستم ڈھاتے ہو لیکن لطف کا احساس ہوتا ہے
اسی انداز نے دنیا کو دیوانہ بنا ڈالا

بھری محفل میں ہم نے بات کر لی تھی ان آنکھوں سے
بس اتنی بات کا یاروں نے افسانہ بنا ڈالا

مرے ذوقِ پرستش کی کرشمہ سازیاں دیکھو
کبھی کعبہ کبھی کعبہ کو بتخانہ بنا ڈالا

شکایت بجلیوں سے ہے نہ شکوہ بادِ صرصر سے
چمن کو خود چمن والوں نے ویرانہ بنا ڈالا

بھلا اچھا ہوا دنیا حفیظ اب دور ہے ہم سے
محبت نے ہمیں دنیا سے بیگانہ بنا ڈالا

خلش [illegible]

جب تک نہ کوئی حشر نمودار دیکھتے
ہم اے زمانے کیا تری رفتار دیکھتے

بڑھتا جنوں کہ عشق کے اسرار دیکھتے
حسرت تھی جلوۂ رخِ دلدار دیکھتے

اچھا ہوا لیا نہ وفاؤں کا امتحاں
کس کس کو وہ نہ جانے گنہگار دیکھتے

مشکل ہے یوں بھی سب کے لیے راہِ عاشقی
لیکن کچھ اور بھی اسے دشوار دیکھتے

دیر و حرم ہو کوئے بتاں ہو کہ میکدہ
اے زندگی کہیں ترے آثار دیکھتے

آخر کو آرزوؤں کی ہر قید توڑ دی
خود کو کہاں تک ان کا گرفتار دیکھتے

ہوتا نہ دل میں اُن کے سوا نا سوا کا غم
اس گل کے ساتھ ہم نہ کوئی خار دیکھتے

پاتے مزاج اگر دلِ بے مدعا کا ہم
دم بھر کسی کے بن کے طلبگار دیکھتے

جن کو نہیں غزل کی بلندی کا اعتراف
وہ لوگ اے خلش مرے اشعار دیکھتے

مفتوں کوٹوی

○

اشکِ خونیں سے مدارات کہاں تھی پہلے
میرے دامن میں یہ سوغات کہاں تھی پہلے

اتنی دلکش مری ہر رات کہاں تھی پہلے
ان سے اُمیدِ ملاقات کہاں تھی پہلے

تم نے یوں جلوہ دکھایا ہے کہ ہم ہوش میں ہیں
عشق کی ایسی مدارات کہاں تھی پہلے

تُو نے بدلیں جو نگاہیں تو مقدّر بدلا
مجھ پہ یہ یورشِ آفات کہاں تھی پہلے

خیر سے تم ابھی آمادۂ خفگی تو ہوئے
ورنہ یہ طرزِ عنایات کہاں تھی پہلے

میں زباں سے نہ کبھی جرأتِ شکوہ کرتا
نظروں نظروں میں ملاقات کہاں تھی پہلے

زخمِ کاری اگر آیا ہے جگر پر شاید
لبِ مفتوں پہ مناجات کہاں تھی پہلے

آفتاب شمسی

○

ہجومِ یاس نہیں، آہِ نارسا بھی نہیں
وہ زندگی نہیں جو غم سے آشنا بھی نہیں

جو چل سکو تو چلو آج بہرِ پرسشِ حُسن
سُنا ہے عشق سے اب اُن کو کچھ گلہ بھی نہیں

نہ بھولنا دمِ سجدہ یہ رہروانِ شوق
ہر ایک نقشِ قدم اُس کا نقشِ پا بھی نہیں

نہ دے سکے گا وہ مر کے کسی کو درسِ وفا
جو دوسروں کے لیے چار دن جیا بھی نہیں

ابھی سے وحشتِ دل مجھ کو کر رہی ہے ملول
ابھی تو زہرِ غمِ زندگی پیا بھی نہیں

نصیر پرواز

مانا کہ اعتبارِ زمانہ بُرا نہیں
میں نے مگر یہ قصّہ ابھی سُنا نہیں

اب کس سے پوچھئے خیالوں کی تیرگی
وہ آفتاب بار حیا سے اُٹھا نہیں

یہ دیکھ کر تو موجِ صبا کس طرح چلے
ہمراہ اس سفر میں کوئی نقشِ پا نہیں

آئینۂ تخیّلِ احساس توڑ دو
دل وہ غزل ہے جس کا کوئی قافیہ نہیں

ہم تو سمجھ رہے تھے مکمل ہوئی حیات
دیکھا تو زندگی کی ابھی ابتدا نہیں

کب سے دل و نگاہ کی شمعیں خموش ہیں
دُنیا میں جیسے اپنا کوئی آشنا نہیں

خوش فہمی خیال کے زنداں میں قید تھے
آنکھیں کھُلیں تو کوئی ہمیں دیکھتا نہیں

پھُونکی ہے کس نے جسمِ فسردہ میں رُوحِ نور
میری نظر سے دیکھو زمانے میں کیا نہیں

پرواز اُن کے سامنے کھُلتی نہیں زباں
جیسے دلِ حزیں کا کوئی مُدّعا نہیں

صدیق نظر

ان پر مرے وجود کا سایہ پڑا تو ہے
دل کو فریب کھانے کا موقع ملا تو ہے

آبادیوں کا شہرِ طرب بدگماں سہی
تنہائیوں کا دیس مرا ہمنوا تو ہے

یہ اور بات ہے کہ زمانہ نہ سُن سکا
لیکن ترے خلوص نے رُسوا کیا تو ہے

اے تیرگیٔ شوق ذرا تو قیام کر
میرے غموں کے ساتھ ترا سلسلہ تو ہے

گر مہرباں نہیں نہ سہی وہ نگاہِ شوق
کوئی وہ دن تھا میں مرا آشنا تو ہے

وہ شمعِ انجمن نہ سہی داغِ دل سہی
اس بزمِ زندگی میں اُجالا ہوا تو ہے

یکسانیٔ روزگارِ غمِ زندگی ہوں میں
یہ بھی مرا خیال سہی پر بھلا تو ہے

مبہم سہی وجودِ تمنّا کی روشنی
بربادیوں کی رات میں اک آسرا تو ہے

یہ اور بات چُوم نہ پاؤں جبینِ یار
لیکن مری حیات کا مقصد بڑا تو ہے

وہ مرف کائنات ہو یا وقفِ ابتذا
ناکام زندگی کا کوئی مُدّعا تو ہے

ممکن نہیں کہ دہر میں سب کو ملے نظرؔ
ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں غم ملا تو ہے

کوثر چاندپوری

خلا کی ذات......

یہ نشان کیسے ہیں بیگم؟

اوصاف حسین سکریٹری ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ اپنی حسین اور محبوب بیوی بیگم گلنار کی لمبی اور پتلی انگلیوں پر چھوٹے چھوٹے سفید دھبے دیکھ کر ایکدم چونک پڑے جن انگلیوں کے ناخن سُرخی لگانے کے بعد قندھاری انار کے دانوں اور یاقوت کے ریزوں کی مانند چمکنے لگے تھے۔ آج ان پر بالکل سفید نشان نظر آرہے تھے۔

بیگم گلنار نے دلفریب انداز سے مسکراتے ہوئے انگلیاں سیفون کے دوپٹے میں چھپالیں۔ بیگم گلنار کی مسکراہٹ خوشی کی نہ تھی، وہ غم کی اندھیری سے اُبھر کر آئی تھی، جیسے کالے بادلوں کی اوٹ سے چاند چمک اُٹھتا ہے۔ اس سوال پر انہیں رو دینا چاہیئے تھا۔ رونے کو جی بہت چاہا، لیکن آنسوؤں کی جگہ نہ جانے کیوں آنکھوں میں چمک آگئی اور ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہ سکیں۔

اوصاف حسین پہلے آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اب ترقی کرکے سکریٹری ہوگئے تھے۔ ان میں اہلیت تو زیادہ نہ تھی، چاپلوسی کا آرٹ خوب آتا تھا، موقعہ پرستی میں بھی ماہر تھے۔ جب کبھی وہ دفتر میں آتے تو کلرکوں کے ساتھ کئی حسین اور نوجوان ٹائپسٹ گرلس بھی کھڑی ہوجاتیں، انہیں لگتا چاند اور ستارے سان کی تعظیم کو زمین پر اُتر آئے ہیں۔ وہ ایک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالتے اور بیگم گلنار کو یاد کرکے فخر کرنے لگتے۔ کسی ٹائپسٹ گرل کی آنکھیں اتنی بڑی اور پلکیں اتنی لمبی نہ تھیں، جتنی گلنار کی تھیں، قد بھی کسی کا ان کے برابر نہ تھا، چھریرا، لمبا اور متناسب، وہ اپنے اسسٹنٹ اور دفتر کے بابوؤں کے سامنے دو چار مرتبہ اپنے عہدے اور اختیارات کا ذکر ضرور کردیا کرتے تھے۔

میں سکریٹری ہوں!

اپنے ڈپارٹمنٹ میں سب سے زیادہ اختیارات رکھتا ہوں۔ ڈسپلن کی ذرا سی خلاف ورزی پر عبرت ناک سزا کا نمونہ بنا دوں گا۔

اور جب میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاکر،

کان سے لگاتے تو سب سے پہلا جملہ یہ ہوتا

"Yes Mr Aosaf Secretary is speaking."

اور پھر فوراً ترجمہ بھی کر ڈالتے۔

جی ہاں، مسٹر اوصاف سکریٹری بول رہے ہیں۔

یوں بھی وہ اپنے نام کے ساتھ سکریٹری ضرور بولتے اور لکھتے تھے۔ جب سے ان کے اندر یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں، بیگم گلنار ان سے بہت ڈرنے لگی تھیں۔ وہ نوکرانی کو ڈانٹتے تو گلنار بری طرح سہم جاتیں ان کی ترقی کے وقت بیگم گلنار کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے یہ بہت بڑا عہدہ ہمالہ بن کر دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا ہے، اوصاف حسین بیوی کے ساتھ بھی ضابطہ برتنے لگے تھے وہ انہیں بھی ڈسپلن کا پابند دیکھنا چاہتے تھے۔

اس سوال پر بیگم گلنار ڈر گئیں، دل دھڑکنے لگا، انگلیاں باریک دوپٹے سے صاف نظر آ رہی تھیں اور اوصاف حسین سکریٹری غور سے انہیں دیکھ رہے تھے، جیسے کسی اہم فائل پر یوں ہی چھٹے پڑ گئے ہیں!

"یوں ہی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی، یہ سائنس کا دور ہے، ہر چیز کی ایک وجہ ہوتی ہے۔ کیوں اور کیسے کی دنیا بہت وسیع ہو گئی ہے"

بیگم گلنار نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے جیسے التجا کر رہی ہوں۔

"میں بیمار نہیں"

"داغ کسی وٹامن کی کمی سے ہو گئے ہوں گے"

اوصاف نے آنکھوں پر عینک لگائی اور بیگم کی دونوں کلائیاں ذرا اوپر سے پکڑ لیں۔ وہ ڈر رہے تھے گویا سانپ کی دم پکڑ لی ہے، اوصاف انگلیاں آنکھوں کے قریب نہیں لائے دور ہی سے دیکھتے رہے، بیگم گلنار کی مسکراہٹ بغیر تیل کے دیئے کی طرح بجھنے لگی، ان کے ہاتھ شوہر کی گرفت میں نہیں اژدہے کے منہ میں تھے۔ بیگم گلنار کے دل میں گھپ اندھیرا تھا امید کی ساری کرنیں دم توڑ چکی تھیں۔ گاڑھے دھوئیں کے مرغولے اندر سے اٹھ کر آتے اور آنکھوں کے آگے چادر سی تن جاتی، منظر تاریک ہو جاتا، خود ان کا مستقبل بھی ـــــ انگلیوں پر سفید چٹوں کا پڑ جانا بہت بڑا جرم تھا۔

"یہ لیپرسی (Leprosy) ہے اور آپ (Leprous) ہیں"

"نہیں نہیں، ایسا نہ کہیئے ـــــ" بیگم گلنار کے ہاتھ سچ مچ اژدہے نے چبا ڈالے تھے۔ وہ رونے لگی تھیں۔ مسکراہٹ کی کوشش اب مذاق معلوم ہونے لگی تھی، رخساروں پر آبشار سے بہنے لگے اور کانوں میں عجیب قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔

"عبرت ناک سزا کا نمونہ بنا دی جاؤ گی"!

"یہ بہت بڑی غلطی ہے"

"معاف نہیں کی جا سکتی"

اوصاف نے اسی وقت حکم دے دیا کہ بیگم ان کے لیئے پان نہیں بنائیں گی اور ان کے کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکیں گی۔

یہ کہہ کر انہوں نے گلنار کی وہ انگلیاں توڑ ڈالی تھیں، جن میں سے کسی انگلی پکڑ کر وہ شروع شروع میں "ذہنی ہنی مون" کے دوران میں دور تک چلے بھی تھے۔

یہ سن کر بیگم گلنار نے آنسو پونچھ ڈالے۔ انہیں یقین آ گیا کہ زندگی کی ناؤ بھنور میں آ گئی ہے اسے رو کر نہیں نکالا جا سکتا ـــ ہنس کر ڈبویا جا سکتا ہے۔ اس وقت بیگم گلنار کو دس سال پہلے کا اوصاف یاد آیا، جو ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ پر جان دیتا تھا، اور ان انگلیوں کو دن میں دسیوں دفعہ ہونٹوں سے لگا لیا کرتا تھا، ان کے رخساروں کو گلاب کے شاداب پھولوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔ اس وقت وہ کچھ نہ تھا صرف ایک نوجوان تھا جو آنکھیں بند کیئے محبت کی رنگین وادیوں میں

دوڑ رہا تھا۔ کسی نشیب و فراز اور خشک و تر کی پرواہ کیے بغیر انہیں حسین وادیوں میں اس نے مس گلنار کی انگلی پکڑلی تھی جو آزاد فضا میں ایک شوخ تتلی کی مانند اُڑتی پھر رہی تھی۔ وہ پھولوں کی مہک ہی سے مگن تھی۔ کسی پھول کا رس چوسنے کی خواہش سے بھی واقف نہ تھی اور پھر اوصاف حسین بڑی آرزوؤں اور اُمنگوں کے ساتھ اسے اپنے گھر کی شمع بنا کر لے آئے تھے، تب سے وہ ان کے گھر میں روشن تھی، آج اس چراغ کو اوصاف حسین کی پھونکوں نے بجھا دیا تھا۔ بیگم گلنار طوفان میں ہاتھ پاؤں مارتی رہیں۔ ساحل دور اور دور ہوتا گیا۔ انگلیوں کے داغ بہت بڑے ہوگئے۔ چہرے پر بھی کئی دھبّے پڑ گئے۔ پھر ہونٹ سفید ہونے لگے۔ دونوں آنکھوں کے گرد سفیدی کا بڑا سا حلقہ بن گیا، اوصاف حسین نے گھر میں آنا بند کردیا۔ ان کا کھانا باہر ہی پکنے لگا۔ باورچی کو اندر جانے کی سخت ممانعت تھی۔

تھوڑے دنوں بعد وہ ایک سرکاری بنگلہ میں چلے گئے اور پھر اسے ایک خوبصورت دوشیزہ نے جگمگا دیا۔ اوصاف حسین انصاف کے قائل تھے۔ بیگم گلنار کو گزارے کے مطابق امداد دیتے رہے بیماری کی طویل بلکہ کبھی نہ ختم ہونے والی چھٹی پر چلتی رہیں... نئی بیگم کے ساتھ رہتے ہوئے دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ اوصاف حسین کے ہونٹوں پر دو بے ترتیب نشان اُبھرے جیسے سگریٹ کا باریک کاغذ چپٹ گیا ہو، نئی بیگم نے انہیں دیکھا وہ بہت ڈریں اور اوصاف حسین کو متوجہ کرتے ہوئے بولیں: ہونٹوں پر داغ کیسے ہیں آپ کے ؟"

"داغ نہیں ہوسکتے۔ میں سکریٹری ہوں، میرا جسم کیا سروس نکسبے داغ ہے!"

"جی ہاں وہ تو میں جانتی ہوں ـــ ایسا لگتا ہے کہ بیگم گلنار نے اپنی بیماری آپ کو دے دی"

"نہیں نہیں، مجھے کوئی بیماری نہیں۔ میرے بدن میں وٹامن کافی ہیں، میں سکریٹری ہوں، میری غذا کا پروگرام ڈاکٹر بناتا ہے"

"کچھ بھی ہو، آپ کے ہونٹوں پر دھبّے ضرور ہیں ـــ آدمی مجھے ڈر لگتا ہے" نئی بیگم نے آنچل سے مُنہ ڈھانپ لیا۔ ان کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں جھپکتی رہیں۔

اس روز اوصاف حسین نے سنگار میز کے آئینہ میں مُنہ دیکھ کر ہونٹوں پر لپ اسٹک لگالیا۔ ان کی دیکھا دیکھی بابو لوگ بھی لبوں پر سُرخی لگانے لگے۔ انہیں دیکھ کر اوصاف حسین کو بڑی ڈھارس ہوتی۔ وہ سوچتے لیپرسی بہت عام ہوچکی ہے۔ دفتر کے سارے کلرک اس میں مُبتلا ہیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں اوصاف حسین کے سارے بدن پر دھبّے ہی دھبّے دکھائی دینے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ بالکل ہی سفید ہوگئے۔ بدن کا رُواں بھی دُودھیا ہوگیا۔ ایک روز انہیں دیکھ کر ایک ٹائپسٹ گرل نے مسکراتے ہوئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے بابو سے کہا۔

"بابو اپنا باس "وہائٹ لیگھارن" کی نسل کا معلوم ہوتا ہے"

بابو ہنسکر بولا۔

"اب کسی کو لپ اسٹک لگانے کی ضرورت نہیں"

داغ پھیلتے رہے لیکن اوصاف حسین نے اپنے کھانے پینے کا الگ بندوبست نہیں کیا، ایک دن ان کی نئی بیگم نے بہت دُور کھڑے کھڑے کہا۔

"میں آپ کے پاس نہیں آؤں گی، ڈر لگتا ہے، پلکیں تک سفید ہوگئیں آپ کی" اوصاف حسین نے اس وقت عہدے کی آڑ نہیں لی، اپنے آپ کو سکریٹری بھی نہیں کہا، وہ محسوس کر رہے تھے بیگم ڈسپلن توڑ رہی ہیں لیکن میں انہیں کوئی عبرتناک سزا نہیں دوں گا، بس اپنے پاس رکھوں گا، اتنی دُور نہیں رہنے دوں گا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس سے زیادہ عبرتناک سزا دُنیا میں کوئی اور نہ تھی۔

اوصاف حسین نے ڈسپلن کی سپر پھینک دی اور پہلی مرتبہ مذہب کا حربہ استعمال کیا جس کو کام میں لانے کی ان کو بالکل مشق نہیں تھی۔

"آپ کو میرے مقابلے میں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ اسپرٹ مذہب کے خلاف ہے۔ میں آپ کا شوہر ہوں ـــ مجازی خدا ـــ اور خدا کی ذات....."

نئی بیگم جلدی سے ہنسکر بول پڑیں۔

"....بے عیب ہوتی ہے!" ▲

حجاب

"دل پہ اعتبار کیا"

یکم جنوری ۱۹۶۴ء ــــــ

آج سالِ نو کی پہلی رات ہے۔ آج صبح صبح ارونا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا ـــــ "دیدی! نیا سال نہیں تمہارے من کا ہو کر ملے" اور میں سوچ رہی ہوں کہ کیا ایسا ممکن ہے ؟ اُف! ـــ زندگی کس قدر ویران سی نظر آتی ہے ـــ کتنی ساکت سی ـــ بوجھل بوجھل تھکی ہوئی سی۔ یہ زندگی آخر کب تک میرے وجود پر سوار رہے گی اور کب تک میں اسے برداشت کر سکوں گی ـــ ؟ میری روح کا یہ کیسا خلا ہے جس کے اندر میں بھٹک رہی ہوں۔ مجھ پر یہ کیسا جمود طاری ہو رہا ہے' جیسے میں ان دنوں کچھ چاہتی ہوں مگر کیا چاہتی ہوں ؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ـــ یہ تنہائیاں ـــ یہ خاموشیاں ـــ کون ہے جو مجھے یہاں سے لے جائے گا ؟ ان تنہائیوں کو نغمے بخشے گا۔ ان خاموشیوں کو قہقہے عطا کرے گا' اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے یہاں سے لے جائے گا ـــ نہ جانے تم کب آؤ گے ؟ ـــ تم کون ہو ؟ ـــ کہاں ہو ؟ ـــ مجھے کچھ نہیں معلوم' ـــ مگر پھر بھی میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں' ـــ بہت پہلے' جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ میں نے تمہیں آواز دی تھی' تمہیں پہچانا تھا۔ اور اب تو یہ شناسائی دس بارہ سال پرانی ہے۔ ایک طویل مدت سے میں تمہاری منتظر ہوں۔ تمہارے سپنے دیکھتے ہوئے میری جوانی کی ہر رات گذرتی ہے۔ مگر تم اب تک نہیں آئے اور میں اپنی روح کے خلا میں بھٹک رہی ہوں ـــ اب تو آجاؤ ساتھی! دیکھو بیلے کا کنج پھولوں سے بھر گیا ہے اور اس کی خوشبو فضا میں رچ گئی ہے۔ دیکھو کتنی کلیاں کھل کر پھول بن گئی ہیں اور بھنوروں کو رس پلا کر کتنی مسرور دکھائی دیتی ہیں ـــ بیلے کی کلیاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ گلاب کی مہک تمہیں پکار رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ کلیاں یوں ہی راہ دیکھتے دیکھتے مرجھا جائیں اور ان کی مہک تنہائیوں میں تحلیل ہو کر رہ جائے اور تم نہ آؤ ـــ مگر نہیں شاید تم آ گئے ہو' میں تمہارے قدموں کی آہٹ پہچان رہی ہوں ـــ آنے والے تم کمل تو نہیں ؟! ـــ

۴ر جنوری ۱۹۶۴ء ــــــ

میرے دل و ذہن پر عرصے سے جو جمود سا طاری تھا یکلخت نہ جانے کیوں اس میں یہ کیسا ارتعاش پیدا ہو گیا ہے : وہ یاسیت جو مجھے

خاموشں رکھتی تھی۔ وہ اب کسی نغمے میں ڈھلنے کے لیئے بے چین ہے۔ کل شام آرونا بھی تو کہہ رہی تھی —— "دیدی! ایسا لگتا ہے جیسے تم کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کہہ نہیں پاتیں، شاید تم اندر ہی اندر گھُٹ رہی ہو"—— اب میں اُسے کیا بتلاتی، اسے کس طرح سمجھاتی کہ میری باتیں، میرے گیت، میرے قہقہے، بہت دنوں پہلے بہت پیچھے رہ گئے۔ میں بھی جب تیری عُمر کی تھی تو تیری طرح ہر وقت خوش رہتی تھی گنگناتی تھی، میں بھی تیری طرح نئے انداز سے بال بناتی اور رنگین کپڑے پہنتی تھی اور کل جس طرح تو کمل کو چور نگاہوں سے دیکھتی تھی اور آج جس طرح اس میں دلچسپی لیتی ہے۔ ہاں کبھی میں بھی کسی کو ایسی ہی چور نگاہوں سے دیکھتی تھی مگر ویران زندگی میں کبھی وہ لمحہ نہ آیا۔ جہاں کیف کی وسعتیں اور پیار کی سکون آفریں بلندیاں سرنگوں ہوتی ہیں —— میں اندر ہی اندر سُلگتی رہی اور وقت گذرتا رہا۔ اور آج میں زندگی کے اندھیروں میں جلنے والی ایسی شمع ہوں جو آدھی پگھل چکی ہے —— بھگوان تجھے سلامت رکھے میری بہن —— تیرے ہونٹوں کے گیت، تیری آنکھوں کی چمک، تیرے بالوں کے خم —— یہ تیرے لباس پر ٹنکے ہوئے ستارے تا ابد یُوں ہی رہیں، جیسے آج ہیں —— مگر کاش! میں تجھ سے کچھ کہہ سکتی، مگر کیسے بتاؤں کہ تو میری بہن ہے اور تیرے میرے بیچ، لحاظ کی ایک دیوار ہے۔

۱۷ر جنوری ۱۹۶۴ء ——

آج دن بھر میرا ذہن پریشان رہا ہے۔ شام ڈوب چکی ہے اور تھوڑی دیر گذرے گی کہ رات کی سیاہی چاروں طرف محیط ہو جائے گی۔ میرا ذہن اب بھی پریشان ہے۔ نہ جانے یہ کونسی آگ ہے جو میرے وجود کو جلا رہی ہے۔ یہ کیسی کاہش ہے کہ جس کے تحت میں آج تمام دن گھر سے باہر ہی گھومتی رہی —— بے مقصد بازاروں میں پھری اور تا دیر خاموش پارکوں میں بیٹھی رہی۔ نہیں نہیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتی —— یہ میں نے کیا دیکھا ایسا کیوں ہوا —— ایسا پہلے بھی ہوا ہوگا۔ ہوتا رہا ہوگا اور ہوتا رہے گا۔ یُونہی آرونا کمل کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اُن پر اپنا چہرہ رکھتی رہے گی۔ اور کمل خاموشی کے ساتھ اُس کے چہرے کو تھامے رہے گا۔ پھر وہ کبھی اپنا ہاتھ نہیں ہٹائے گا اور آرونا کبھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑے گی کیونکہ وہ اُس سے محبت کرتی ہے اور کمل اسے پیار کرتا ہے —— یہ سب ہوتا رہے گا۔ مگر کیوں ہوتا رہے گا، میں برداشت نہیں کرسکتی۔ میں کمل کو یہاں آنے سے روک دوں گی۔ مگر میں اُسے کیسے روک سکتی ہوں؟ شاید غیر شعوری طور پر اسی سوال کے جواب سے فرار کے لیئے دن بھر بھٹکتی ہوں۔ بازاروں اور ویران راہوں سے گذری ہوں —— اگر کمل نے آنا بند کر دیا تو —— تو کیا ہوگا بھگوان میں کیا کروں —— میں کیا کروں؟ یہ کیسی خلش پیدا ہو رہی ہے۔ یہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں، یہ میرے قدم کس طرف بڑھ رہے ہیں کہ میں روک نہیں پاتی —— بھگوان مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ان قدموں کو روک سکوں، خود کو سنبھال سکوں۔

۲۶ر جنوری ۱۹۶۴ء ——

آج آرونا کے کالج میں کوئی فنکشن تھا۔ وہ بہت صبح کالج چلی گئی تھی۔ اُس کی غیر موجودگی میں صبح کمل میرے کمرے میں آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اُس دن اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے اس کے ہاتھوں میں آرونا کا چہرہ دیکھا ہے۔ شاید وہ مجھ سے معافی مانگنے آیا ہوگا۔ مگر میں نے اس سے بات نہیں کی، مصروفیت کا بہانہ کر دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔ ہُونہہ بزدل کہیں کا —— محبت تو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور فطرت کی نقل و حرکت پر معافی کی ضرورت نہیں پھر وہ کیوں آیا؟ ضرور اس کے دل میں کوئی چور ہوگا، جو اسے یہاں لایا تھا۔ لیکن ہنوز میں یہ نہ سمجھ سکی کہ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیوں کیا۔ اس کی موجودگی میں میرا جسم کیوں کانپ گیا تھا میرے مالک! یہ کونسے جذبے ہیں، جن کے تحت میں کمل کی

موجودگی میں پتھر بن جاتی ہوں ـــــ آخر کیوں؟ ـــــ میں کہیں پتھر تو نہیں ـــــ؟!

۴ر فروری ۱۹۶۴ء ـــــــ

شام ہوگئی ہے، اور ارونا اب تک نہیں آئی۔ کالج سے تو وہ ۳ بجے ہی فارغ ہوگئی ہوگی، پھر اتنی دیر کیوں؟ شاید وہ کمل کے ساتھ کہیں ہوگی ـــــ یقیناً ہوگی، کسی پارک کے تنہا گوشے میں، کسی ریسٹورنٹ کے ایک کیبن ـــــ یا پھر شاید کالج کی فیلڈ میں ہوگی۔ اُس نے کمل کے ہاتھوں میں اپنا چہرہ رکھا ہوگا اور کمل نے اُس کے جوڑے میں گلاب کا پھول لگایا ہوگا۔ تھوڑی چائے پی کر انہوں نے پیالیاں آپس میں بدل لی ہوں گی ـــــ میں یہ سب ہرگز نہیں ہونے دوں گی ـــــ یہ کیا واہیات ہے، کیا محبت کیلئے یہ ضروری ہے؟ محبت تو رُوح کی پیاس ہوتی ہے۔ جیسے پُر زور دریا کی گرج کی ضرورت نہیں ہوتی، شبنم کی پُرسکوت نمی درکار ہوتی ہے۔ محبت تو شمع کی طرح خاموشی کے ساتھ جلنے کا دوسرا نام ہے۔ محبت جوڑے کا پھول نہیں، دل کی تپش ہے۔ ریسٹورنٹ کا کیبن نہیں، کمرے کی تنہائی ہے۔ محبت تو سینے کی ہوک ہے بے چینی ہے، خاموش آنسو ہے ـــــ وہ ارونا کا قہقہہ نہیں میں اس قہقہہ کا گلا گھونٹ دوں گی ـــــ یہ سب بکواس ہے، یہ سب کچھ بازاری فلموں کا اثر ہے۔ رُومانی کہانیوں کی کرامت ہے۔ جذباتی ہیجان ہے اور میں یہ ہیجان روک دوں گی، قہقہہ کچل دُوں گی۔ میں کمل کو اب کبھی یہاں نہ آنے دوں گی۔

۸ر فروری ۱۹۶۴ء ـــــــ

نہ جانے کمل دُو دن سے کیوں نہیں آیا۔ میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اُس کی موجودگی اُس دن بھی مجھے پتھر بنے رہنے کا پیغام بنی رہی، اُس دن مجھے ناحق بدگمانی ہوگئی تھی، جب ارونا کو کالج میں دیر ہوگئی تھی۔ مگر اس بدگمانی کا میں نے کمل یا ارونا پر اظہار تو نہیں کیا تھا۔ پھر وہ کیوں نہیں آیا ـــــ ارونا بھی خاموش خاموش ہے ـــــ یہ سوچ کر کہ وہ کہیں ارونا سے کسی شکایت کی بنا پر ناراض نہ ہوگیا ہو، میں نے چاہا ارونا سے کچھ دریافت کروں مگر نہ جانے کیوں میں جھجک گئی۔ میں ارونا کی بڑی بہن ہوں، اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ میں اُسے کس طرح یہ بات سمجھاؤں کہ محبت زندگی پر ایک گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ مجھے اُس کی زندگی پیاری ہے۔ مجھے حق ہے کہ میں اُس سے معلوم کروں مگر میں اپنا یہ حق اب تک استعمال کیوں نہیں کرسکی! ـــــ

۱۰ر فروری ۱۹۶۴ء ـــــــ

ارونا کے کالج جانے کے بعد آج کمل آیا تھا۔ پچھلے دِنوں وہ شاید کہیں باہر چلا گیا تھا۔ وہ کچھ پریشان سا نظر آتا تھا... دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا رہا اور دیر تک میری میز پر رکھے پیپر ویٹ سے کھیلتا رہا۔ اُس نے بہت کم بات کی اور جو کی وہ رسمی سی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی لکیریں بن کر مٹ رہی تھیں شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی ـــــ میں جانتی ہوں وہ ارونا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب دو آدمی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو زندگی بھر کا ساتھ چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے شاید ڈر رہا تھا ـــــ اُف! محبت بھی کیسی شئے ہے، انسان اظہار کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور اظہار کر بھی گذرے تو دُنیا سے اپنے محبوب کو مانگتے ہوئے ڈرتا ہے ـــــ بات ہی کچھ ایسی ہے صرف کمل ہی نہیں، سب ہی بُزدل ہوتے ہیں۔ اور میں بھی تو سب کی طرح انسان ہوں۔ میں بھی تو ڈرتی ہوں۔ اگر ڈرتی نہ ہوتی تو آج تک کمل سے وہ سب کچھ نہ کہہ دیتی جو میرے اندر گھٹ رہا ہے۔ مگر میں نہیں کہوں گی کیونکہ ارونا میری بہن ہے۔ بہن ہے۔ بہن ہے ـــــ کاش! وہ میری بہن نہ ہوتی ـــــ کاش! کمل اُس سے محبت نہ کرتا۔

۳ر مارچ ۱۹۶۴ء

یہ میں نے کیا کیا ـــــ اُف! ـــــ یہ اندر کی آگ مجھے اپنی لپک دکھانے پر کیوں مجبور کردیتی ہے ـــــ میں نے ارونا کو کیوں

ڈانٹ دیا ــــ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آخر وہ کمل سے جھگڑ رہی تھی تو کیا بُرا تھا ــــ وہ اُس کو چاہتی ہے اُس کو ہر شکایت کا حق ہے۔ میں کیوں برداشت نہ کر سکی جب کمل اس کی ہر بات کے جواب میں خاموش تھا تو میں خاموش کیوں نہ رہ سکی مجھے تو کوئی حق نہ تھا مگر میں کیا کروں، کیا کروں؟؟ ــــ

۸ر مارچ سنہ ۱۹۶۴ء

کل شام کے واقعہ کے بعد اب تک مجھے ایک لمحہ کو سکون نہیں ملا ہے۔ میرا دل، میرا ضمیر، مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ غلط ہے۔ وہ بد اخلاقی تھی، زیادتی تھی۔ مگر میں کیا کروں مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود کہ میں ایک عرصہ سے جانتی ہوں اردونا اور کمل کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ میں نے اپنی تنہائی میں اردونا کی دھڑکنیں سُنی ہیں، جو اُس کے کمرے میں کمل کی موجودگی میں پیدا ہوئی ہیں۔ پھر آخر کمل کے نام اردونا کا خط پڑھ کر یہ مجھے کیا ہو گیا ــــ میں کیوں برہم ہو گئی۔ میں نے آخر کونسے جذبے کے تحت اُس کے خط کے پُرزے کر دیئے۔ میں نے کیوں بُری طرح اردونا کو ڈانٹ دیا۔ آخر کیوں میں نے کمل کو اس گھر میں نہ آنے کے لیئے کہہ دیا اور جب وہ کچھ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا کمرے سے اُٹھ کر خاموشی کے ساتھ باہر جانے لگا تو میری اخلاقی طاقت کیوں سلب ہو گئی۔ میں اُسے کیوں نہ روک سکی اُف! یہ میں نے کیا کر ڈالا۔ آخر کیوں کر ڈالا۔ کوئی مجھے بتلائے کہ ہم ٹھوس حقیقتوں کو نہیں بدل سکتے۔

۱۶ر مارچ سنہ ۱۹۶۴ء

اگر انسان خود کو بھی [illegible] سکتے تو میں اپنے آپ کو بھی وہی بتاتی جو اردونا کو بتایا ہے۔ لیکن اپنے اندر کی پیاسی عورت کا گلا میں نہیں گھونٹ سکتی۔ اُس عورت کو ختم نہیں کر سکتی میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں کوشش کروں گی، کمل میری غلطی معاف کر دے، بھلا دے ــــ اور پھر یہاں آنے لگے۔ چاہے اُسے اردونا کے ساتھ دیکھ کر میرے دل میں ہوک اُٹھے۔ ہاں میرا ذہن برہم ہو گا۔ ایک پُر سکوت، ایک پُر شور طوفان میرے اندر بپا ہو گا مگر میں اُسے دیکھ تو سکوں گی۔ وہ سب کچھ محسوس تو کر سکوں گی جو اُس کی موجودگی سے کرتی ہوں۔ لیکن نہیں یہ ایک طوفان، برہمی سہی ایک زلزلہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جس کے تحت میں چاہتی ہوں کہ کمل یہاں نہ آئے۔ اور میں اس کی آمد و رفت بند ہونے پر مطمئن ہوں ــــ مگر یہ خلش، جو اب ہے، یہ دُکھ، یہ فکر، یہ انتظار، یہ بے چینی جو اب ہے، اور جو حقیقت ہیں، جو کمل کی اس گھر میں موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں، اور جن کے تحت اس کی آمد و رفت بند ہونا میرے لیئے بہت گراں ہے ــــ بھگوان یہ کیسا تضاد ہے ــــ میں چاہتی ہوں کمل آتا رہے اور وہ روز آتا ہے اور میں یہی چاہتی ہوں کمل نہ آئے کبھی نہ آئے ــــ مگر یہ تضاد کب ہے، حقیقت تو یہی ہے کہ میں چاہتی ہوں کمل آئے مگر صرف میرے پاس آئے ہمیشہ کے لیئے میری رُوح کے خلا میں آ جائے ــــ اور یہ ممکن نہیں۔ اب تو کچھ بھی ممکن نہیں ــــ اردونا کا پیار جیتے گا ایک دن وہ ہمیشہ کے لیئے آئے گا، مگر اردونا کے لیئے ــــ اور مجھے یہ سب برداشت کرنا ہو گا۔

۱۹ر مارچ سنہ ۱۹۶۴ء

صبح میں نے چاہا اردونا سے کہوں، وہ کمل کو بُلا لائے مگر نہ کہہ سکی۔ آج دوپہر میں نے چاہا خود جا کر بُلا لاؤں مگر نہ جا سکی۔ میں کمل سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ مجھے اُس کا انتظار ہے ــــ کاش! میں اردونا سے کہہ سکتی، کاش! میں خود جا سکتی، کاش! کمل خود آ جاتا۔

۲۴ر مارچ سنہ ۱۹۶۴ء

آج اپنی تمام ہمتیں یکجا کر کے میں نے اردونا کو بھیجا ہے کہ وہ کمل کو بُلا لائے ــــ وہ ابھی نہیں آیا ہے اور فضا میں چاروں طرف عجیب سی لرزشیں ہیں۔ اور کچھ دیر گذرے گی وہ آئے گا۔ اور اسی کمرے میں اپنی اس تنہائی میں، میں اردونا کے دل کی دھڑکنیں سُنوں گی پھر وہی ہوک، پھر وہی دُھواں سا سینے میں گھٹے گا۔ کاش! وہ نہ آئے کاش! وہ کبھی نہ آئے ــــ مگر نہیں اُسے آنا ہو گا۔ اُسے آنا چاہیئے

موجودگی میں پتھر بن جاتی ہوں ــــ آخر کیوں؟ ــــ میں کہیں پتھر تو نہیں ــــ ہوں؟

۸ر فروری سنہ ۱۹۶۴ء ــــ

شام ہو گئی ہے، اور ارونا اب تک نہیں آئی۔ کالج سے تو وہ ۳ بجے ہی فارغ ہو گئی ہو گی، پھر اتنی دیر کیوں؟ شاید وہ کمل کے ساتھ کہیں ہو گی ــــ یقیناً ہو گی، کسی پارک کے تنہا گوشے میں، کسی ریسٹورنٹ کے ایک کیبن ــــ یا پھر شاید کالج کی فیلڈ میں ہو گی۔ اُس نے کمل کے ہاتھوں میں اپنا چہرہ رکھا ہو گا اور کمل نے اُس کے جوڑے میں گلاب کا پھول لگایا ہو گا۔ تھوڑی تھوڑی چائے پی کر انہوں نے پیالیاں آپس میں بدل لی ہوں گی ــــ میں یہ سب ہرگز نہیں ہونے دوں گی ــــ یہ کیا واہیات ہے، کیا محبّت کیلئے یہ ضروری ہے؟ محبت تو رُوح کی پیاس ہوتی ہے۔ جیسے پُرزور دریا کی گرج کی ضرورت نہیں ہوتی، شبنم کی پُرسکوت نمی درکار ہوتی ہے۔ محبت تو شمع کی طرح خاموشی کے ساتھ جلنے کا دوسرا نام ہے۔ محبت جوڑے کا پھول نہیں، دل کی تپش ہے۔ ریسٹورنٹ کا کیبن نہیں، کمرے کی تنہائی ہے۔ محبّت تو سینے کی ہُوک ہے بے چینی ہے۔ خاموش آنسو ہے ــــ وہ ارونا کا قہقہہ نہیں میں اس قہقہہ کا گلا گھونٹ دوں گی ــــ یہ سب بکواس ہے یہ سب کچھ بازاری فلموں کا اثر ہے۔ رُومانی کہانیوں کی کرامت ہے۔ جذباتی ہیجان ہے اور میں یہ ہیجان روک دوں گی، قہقہہ کچل دوں گی۔ میں کمل کو اب کبھی یہاں نہ آنے دوں گی۔

۱۴ر فروری سنہ ۱۹۶۴ء ــــ

نہ جانے کمل دو دن سے کیوں نہیں آیا۔ میں نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اُس کی موجودگی اُس دن بھی مجھے پتھر بنے رہنے کا پیغام بھی دی، اُس دن مجھے ناحق بدگمانی ہو گئی تھی، جب ارونا کو کالج میں دیر ہو گئی تھی۔ مگر اس بدگمانی کا میں نے کمل یا ارونا پر اظہار تو نہیں کیا تھا۔ پھر وہ کیوں نہیں آیا ــــ ارونا بھی خاموش خاموش ہے ــــ یہ سوچ کر کہ وہ کہیں ارونا سے کسی شکایت کی بنا پر ناراض نہ ہو گیا ہو، میں نے چاہا ارونا سے کچھ دریافت کروں مگر نہ جانے کیوں میں جھجک گئی۔ میں ارونا کی بڑی بہن ہوں، اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ میں اُسے کس طرح یہ بات سمجھاؤں کہ محبت زندگی پر ایک گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ مجھے اُس کی زندگی پیاری ہے۔ مجھے حق ہے کہ میں اُس سے معلوم کروں مگر میں اپنا یہ حق اب تک استعمال کیوں نہیں کر سکی! ــــ

۱۰ر فروری سنہ ۱۹۶۴ء ــــ

ارونا کے کالج جانے کے بعد آج کمل آیا تھا۔ پچھلے دنوں وہ شاید کہیں باہر چلا گیا تھا۔ وہ کچھ پریشان سا نظر آتا تھا... دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا رہا اور دیر تک میری میز پر رکھے پیپر ویٹ سے کھیلتا رہا۔ اُس نے بہت کم بات کی اور جو کی وہ رکی سی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی لکیریں بن کر مٹ رہی تھیں شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی ــــ میں جانتی ہوں وہ ارونا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب دو آدمی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو زندگی بھر کا ساتھ چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے شاید ڈر رہا تھا ــــ اُف! محبت بھی کیسی شئے ہے، انسان اظہار کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور اظہار کر بھی گذرے تو دُنیا سے اپنے محبوب کو مانگتے ہوئے ڈرتا ہے ــــ بات ہی کچھ ایسی ہے صرف کمل ہی نہیں، سب ہی بزدل ہوتے ہیں۔ اور میں بھی تو سب کی طرح انسان ہوں۔ میں بھی تو ڈرتی ہوں۔ اگر ڈرتی نہ ہوتی تو آج تک کمل سے وہ سب کچھ نہ کہہ دیتی جو میرے اندر گھُٹ رہا ہے۔ مگر میں نہیں کہوں گی کیونکہ ارونا میری بہن ہے۔ بہنا ہے۔ بہن ہے ــــ کاش! وہ میری بہن نہ ہوتی ــــ کاش! کمل اُس سے محبّت نہ کرتا۔

۳ر مارچ سنہ ۱۹۶۴ء

یہ میں نے کیا کیا ــــ اُف! ــــ یہ اندر کی آگ مجھے اپنی لپک دکھانے پر کیوں مجبور کر دیتی ہے ــــ میں نے ارونا کو کیوں،

ڈانٹ دیا ــــ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آخر وہ کمل سے جھگڑ رہی تھی تو کیا بُرا تھا ــــ وہ اُس کو چاہتی ہے اُس کو ہر شکایت کا حق ہے۔ میں کیوں برداشت نہ کر سکی جب کمل اس کی ہر بات کے جواب میں خاموش تھا تو میں خاموش کیوں نہ رہ سکی مجھے تو کوئی حق نہ تھا مگر میں کیا کروں، کیا کروں؟؟ ــــ

۸ر مارچ ۱۹۶۴ء

کل شام کے واقعہ کے بعد اب تک مجھے ایک لمحہ کو سکون نہیں ملا ہے۔ میرا دل، میرا ضمیر، مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ غلط ہے۔ وہ بد اخلاقی تھی، زیادتی تھی۔ مگر میں کیا کروں مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود کہ میں ایک عرصہ سے جانتی ہوں ارونا اور کمل کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ میں نے اپنی تنہائی میں ارونا کی دھڑکنیں سُنی ہیں، جو اُس کے کمرے میں کمل کی موجودگی میں پیدا ہوئی ہیں۔ پھر آخر کمل کے نام ارونا کا خط پڑھ کر یہ مجھے کیا ہو گیا ــــ میں کیوں برہم ہو گئی۔ میں نے آخر کونسے جذبے کے تحت اُس کے خط کے پُرزے کر دیئے۔ میں نے کیوں بُری طرح ارونا کو ڈانٹ دیا۔ آخر کیوں میں نے کمل کو اس گھر میں نہ آنے کے لیئے کہہ دیا اور جب وہ کچھ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا کمرے سے اُٹھ کر خاموشی کے ساتھ باہر جانے لگا تو میری اخلاقی طاقت کیوں سلب ہو گئی۔ میں اُسے کیوں نہ روک سکی اُف! یہ میں نے کیا کر ڈالا۔ آخر کیوں کر ڈالا۔ کوئی مجھے بتلائے کہ ہم ٹھوس حقیقتوں کو نہیں بدل سکتے۔

۱۶ر مارچ ۱۹۶۴ء

اگر انسان خود کو بھی مکمل کر سکتے ہیں اپنے آپ کو بھی وہی بتاتی جو ارونا کو بتایا ہے۔ لیکن اپنے اندر کی پیاسی عورت کا گلا میں نہیں گھونٹ سکتی۔ اُس عورت کو ختم نہیں کر سکتی میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں کوشش کروں گی، کمل میری غلطی معاف کر دے، بھُلا دے ــــ اور پھر یہاں آنے لگے۔ چاہے اُسے ارونا کے ساتھ دیکھ کر میرے دل میں ہوک اُٹھے۔ ہاں میرا ذہن برہم ہوگا۔ ایک پُر سکوت، ایک پُر شور طوفان میرے اندر بپا ہوگا مگر میں اُسے دیکھ تو سکوں گی۔ وہ سب کچھ محسوس تو کر سکوں گی جو اُس کی موجودگی سے کرتی ہوں۔ لیکن نہیں یہ ایک طوفان، برہمی ایک زلزلہ بھی ایک حقیقت ہے جس کے تحت میں چاہتی ہوں کہ کمل یہاں نہ آئے۔ اور میں اس کی آمد و رفت بند ہونے پر مطمئن ہوں ــــ مگر یہ خلش، جو اب ہے، یہ دُکھ، یہ فکر، یہ انتظار، یہ بے چینی جو اب ہے، اور جو حقیقت ہیں، جو کمل کی اس گھر میں موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں، اور جن کے تحت اس کی آمد و رفت بند ہونا میرے لیئے بہت گراں ہے ــــ بھگوان یہ کیسا تضاد ہے ــــ میں چاہتی ہوں کمل آتا رہے اور وہ روز آتا رہے اور میں ہی چاہتی ہوں کمل نہ آئے کبھی نہ آئے ــــ مگر یہ تضاد کب ہے، حقیقت تو یہی ہے کہ میں چاہتی ہوں کمل آئے مگر صرف میرے پاس آئے ہمیشہ کے لیئے میری رُوح کے خلاء میں آجائے ــــ اور یہ ممکن نہیں۔ اب تو کچھ بھی ممکن نہیں ــــ ارونا کا پیار جیتے گا ایک دن وہ ہمیشہ کے لیئے آئے گا، مگر ارونا کے لیئے ــــ اور مجھے یہ سب برداشت کرنا ہوگا۔

۱۹ر مارچ ۱۹۶۴ء

صبح میں نے چاہا ارونا سے کہوں، وہ کمل کو بُلا لائے مگر نہ کہہ سکی۔ آج دوپہر میں نے چاہا خود جا کر بُلا لاؤں مگر نہ جا سکی میں کمل سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ مجھے اُس کا انتظار ہے ــــ کاش! میں ارونا سے کہہ سکتی، کاش! میں خود جا سکتی، کاش! کمل خود آجاتا۔

۲۴ر مارچ ۱۹۶۴ء

آج اپنی تمام ہمتیں یکجا کر کے میں نے ارونا کو بھیجا ہے کہ وہ کمل کو بُلا لائے ــــ وہ ابھی نہیں آیا ہے اور فضا میں چاروں طرف عجیب سی لرزشیں ہیں۔ اور کچھ دیر گذرے گی وہ آئے گا۔ اور اُس کمرے میں اپنی اس تنہائی میں، میں ارونا کے دل کی دھڑکنیں سُنوں گی پھر وہی ہوک، پھر وہی دُھواں سا سینے میں گھُٹے گا۔ کاش وہ نہ آئے کاش! وہ کبھی نہ آئے ــــ مگر نہیں اُسے آنا ہوگا۔ اُسے آنا چاہیئے

ورنہ بیلے کی ان کلیوں کی مہک اس گھر سے فرار ہو جائے گی۔ گلاب کی ساری کلیاں مُرجھا جائیں گی ـــــ سارے بھنورے اُڑ جائیں گے اور رُوح کا یہ خلا اسقدر بڑھ جائے گا کہ پھر کوئی خود فریبی بھی مجھے اِس خلا میں زندہ نہ رکھ سکے گی۔

۱۹ راپریل ۱۹۶۴ء ـــــ

کل رات آرزونا کے ساتھ کمل آیا تھا۔ وہ بہت دیر تک آرزونا کے کمرے میں بیٹھا رہا۔ میں نے چاہا کہ وہاں جاؤں اور اُس سے معذرت چاہوں، مگر میں نہیں جا سکی ـــ اور نہ وہ میرے پاس آ سکا۔ وہ میرے پاس آیا ہی کب؟ وہ تو بُزدل ہے۔ وہ تو ہمیشہ خاموش خاموش بُجھا بُجھا، سہما سہما سا رہتا ہے۔ آنکھیں یُوں جیسے اَن گنت خوابوں کی تعبیریں تلاش کر رہی ہوں، ہونٹ یُوں جیسے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ ہاتھ یُوں بے چین جیسے ہر وقت کسی چیز کو تلاش کر رہے ہوں، پکڑنا چاہتے ہوں، قدم اسطرح جیسے راستہ بھول گئے ہوں اور واپس بھی نہ ہو سکتے ہوں۔ آگے بڑھنا نہ چاہتے ہوں اور بڑھ رہے ہوں ـــ اُونہہ ـــ بُزدل کہیں کا ـــ!!

۲۰ راپریل ۱۹۶۴ء ـــــ

بھگوان کیا یہ سچ ہے ـــ یہ کیا ہو رہا ہے ـــ یہ کمرہ کیوں گھوم رہا ہے، یہ میں خلا میں کیوں لڑکھڑا رہی ہوں، یہ کیا ہے کیا یہ سب سچ ہے؟ یا میں کسی خواب سے جاگی ہوں ـــ یہ میرے ہاتھ میں کمل کا خط ہے۔ جو وہ ابھی کچھ دیر پہلے خاموشی کے ساتھ پکڑا کر چلا گیا ہے۔ یا کسی کہانی کا کوئی ورق ہے۔ یہ میرے سامنے تحریر کی سطور ہیں، یا کسی فلم کا کوئی منظر ـــ میں جاگ رہی ہوں یا سو رہی ہوں ـــ کمل نے لکھا ہے ـــــ

"میں آپ کو کسی بھی نام سے مخاطب نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ سکا۔ اور اب میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں انتہائی مجبوری کے عالم میں ـــــ اگر میرے اندر ذرا بھی قوتِ برداشت باقی رہتی تو میرا یہ خط آپ کو آج بھی نہیں ملتا۔ شاید کبھی نہیں۔ ہمیشہ آپ یہی سمجھتی رہتیں کہ میں آرزونا سے محبت کرتا ہوں اور صرف اُسی کے پاس آتا ہوں۔ میں کیوں آتا تھا، کس کی خاطر آتا تھا، یہ سب بتانے کے لیے میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں اپنی رُوح کی خلش اور کشمکش کو ظاہر کر سکوں۔

صرف اتنا کہوں گا کہ میں آرزونا سے محبت نہیں کرتا، اب تک میں اُس پر حقیقت واضح نہیں کر سکا، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جس روز حقیقت ظاہر ہوتی اس گھر کا دروازہ میرے لیے بند ہو جاتا اور میں اس دروازہ کو کھلا رکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ احساس مل جائے وہ ـــــ مگر آرزونا نے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا ہے اور وہ کہہ رہی ہے اندر آؤ کہ وہاں پیار کی جوت جل رہی ہے اور اگر میں اندر چلا گیا تو نہ صرف میری بلکہ آرزونا کی زندگی میں ایک آگ لگ جائے گی اور اس کی تپش سے آپ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گی۔ آپ جو بے خبر ہیں۔ بے قصور ہیں ـــ میں جا رہا ہوں اور اب کبھی یہاں نہ آؤں گا ـــــ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے دھوکہ باز نہ سمجھ کر اس حق گوئی کی قدر کریں گی جو بہت دردناک ہے۔ میں آپ کو پیار کر کے شرمندہ نہیں ہوں کہ دل پر اختیار کیسے ـــ؟

ـــ کمل ـــ

کیا یہ سچ ہے؟ یہ میرا دماغ سُن کیوں ہو گیا ـــ کیا واقعی زلزلہ آ گیا ہے ـــ زمین پھٹ گئی ہے ـــ اور میں اس میں سمائی جا رہی ہوں ـــ تنہا نہیں، آرزونا میرے ساتھ ہے!! ▲

اختر ملیح آبادی

ڈارلنگ

چاند بالکونی کے پیچھے اُونچے پیڑ کی شاخوں سے جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت رات گئے کیا کر رہی ہے؟

"ڈارلنگ!" وہ کاغذ پر پھیلتی ہوئی چاند کی کرنوں سے بے نیاز اپنے دُور اُفتادہ شوہر کو حسبِ معمول خط لکھنے میں مُنہمک تھی۔

وہ لکھ رہی تھی :۔

ڈارلنگ! چاند نکلا ہے۔ چاندنی کے دھارے ہر طرف پھُوٹ رہے ہیں۔ ہوا مست خرام ہے رات کی جملہ سامانیاں فراہم ہیں، اگر کوئی کمی رہ رہ کر محسوس ہوتی ہے اور "شب کے حریمِ ناز" میں کوئی بے کیفی محسوس ہوتی ہے تو جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ ہے تمہاری غیر موجودگی!

کاش کہ تم اتنے دُور نہ ہوتے بلکہ میرے قریب ہوتے تو یہ خوبصورت رات کتنی حسین ہو جاتی اس کا اظہار ممکن نہیں۔ ڈارلنگ یہ رات نصف گزر چکی ہے۔ میں کوٹھے پر بالکونی پر بیٹھی تمہیں روز کی طرح خط لکھ رہی ہوں، کیونکہ جانتی ہوں کہ اگر میں تمہیں خط نہ لکھوں تو سو نہیں سکتی...!"

اچانک اس کا قلم رُک گیا —— دل دھڑکا —— اور اس نے گھبرا کر چاند کی طرف دیکھا —— اور اس وقت خون کی گردش کے ساتھ ایک خیالی رو بھی اس کے سارے جسم میں دَوڑ گئی اور وہ سوچنے لگی کہ وہ اپنے شوہر کو دھوکہ دے رہی ہے... اس خیال نے قلم ہاتھ سے رکھا دیا اور وہ شوہر کو خط لکھنے کے بجائے ٹہلنے لگی۔ چاند اس کی فطری پریشانی کو بھانپ رہا تھا اور یہ خیال اس کے لیے اور سوہانِ رُوح تھا۔ اچانک اس نے چاند کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم جاؤ —— مجھے تمہاری ضرورت نہیں"

لیکن چاند نہیں گیا اور پھر وہ خط لکھنے بیٹھ گئی کہ خط کا سلسلہ بیچ سے ٹوٹنا نہیں چاہیئے اور اُسے یاد آیا کہ جب اس کا شوہر اپنی ملازمت پر دُور دراز جا رہا تھا تو جاتے وقت اس نے

بیوی کو سینے سے لگاتے ہوئے اور بیوی کا حسین چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے کہا تھا ۔

" وعدہ کرو کہ مجھے خط لکھو گی ؟"

" لکھوں گی "

" روز ایک خط لکھوں گی تاکہ روز ملاقات ہوتی رہے" بولا وعدہ کرتی ہو ؟"

" وعدہ کرتی ہوں ڈارلنگ !"

" اومائی ڈارلنگ !" یہ کہہ کر شوہر نے اس کے ہونٹوں کو بوسہ دیا تھا، جس کا لمس اسے اب تک یاد تھا ۔ وہ پھر دوسرا خط لکھ رہی تھی :۔

" ویسے بھی نیند تو تم اپنے ساتھ لیتے گئے ... میں سوؤں تو کیسے ؟ تم ہی بتاؤ ؟ کیا یہ غلط ہے ؟ جب میں نے کہا تھا کہ تم میری نیند لئے جاتے ہو تو تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری مسکراہٹ کے لئے بہت دور جا رہا ہوں، لیکن اب میری حالت خود دیکھ لو کہ نہ تو مجھے نیند آتی ہے اور نہ مجھے مسکرانا آتا ہے ــــ اب میں اسی وقت مسکراؤں گی جب تم میرے قریب ہو گے ! بتاؤ میں تمہاری راہ کب تک دیکھوں ؟ تم کب تک میرا امتحان لو گے ؟ کب آؤ گے آخر ؟ آتے کیوں نہیں ــــ اب ابھی آجاؤ "

اس کا دل پھر دھڑکا اور اس بار زور سے، جس کے شور ہی شور کی وجہ سے اس نے پھر قلم رکھ دیا ۔ ساتھ ہی خون کی گردش پھر زور و شور سے ہونے لگی اور ٹیس نے پھر جنم لے لیا ۔ چاند باہر سے گھور رہا تھا اور وہ اس خیال کو دل سے نکال دینے کے درپے تھی کہ "جب وہ خط میں شوہر سے مخاطب ہوتی ہے تو کیا رُوئے سخن واقعی شوہر سے ہوتا ہے ؟!"

وہ چاند سے آنکھیں چار نہیں کر سکی اور اس کی طرف سے پیٹھ کر لی ــــ پیٹھ کرتے ہی اس کی نظر دروازے پر پڑی ۔ وہ کھلا تھا اور انداز بتا رہا تھا کہ جیسے کوئی دروازہ کھول کر آیا ہو !! کھلے ہوئے دروازے کے دیئے ہوئے خیال نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ۔

آرکسٹرا کی دُھنوں میں وہ ڈوب گئی : اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ آرکسٹرا کی دُھنوں پر رقص نہیں کر رہی ہے بلکہ کسی ہمالائی جھرنے کے نیچے نہا رہی ہے !

" ڈارلنگ !" اس کے ہم رقص نے پوچھا ۔

" ہوں "

" کیا سوچ رہی ہو ؟"

" مجھے نیند آرہی ہے !"

ہم رقص مسکرایا اور اس نے کہا " تم یہاں آنے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہی تھیں ۔ اگر نہ آتیں تو زندگی کی ایک حسین رات اپنے حُسن سے محروم ہو جاتی "

" تم نے مجھے واقعی خوشی اور حسن دیا ہے "

" گھبراؤ نہیں، ہمیشہ پاتی رہو گی ڈارلنگ !"

اسے یاد آرہا تھا کہ وہ آخر وقت تک خوشی اور حُسن سے ہمکنار ہوتی رہی تھی اور پھر راؤنڈ میں وہ ناچی تھی اور ابھی تھوڑی دیر قبل وہ گھر واپس آئی تھی ۔ اس کا ہم رقص اسے پہنچا گیا تھا اور جاتے جاتے اس نے مسکرا کر کہا تھا ۔

" اب سو جاؤ ڈارلنگ !"

" نہیں ! میں ابھی خط لکھوں گی !"

" کسے ؟" ہم رقص نے مسکرا کر پوچھا تھا ۔ وہ مسکرا دی تھی ۔ اور وہ ہنستا ہوا اسی دروازے سے چلا گیا تھا ۔ دروازہ اسی لئے کھلا تھا ۔

اس نے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر خیالات سے دل بہلانے لگی ۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے شوہر کے سوا اور کسی کے ساتھ اس طرح گھومنے اور رقص کرنے نہیں جانا چاہیئے ۔ ایکبار اس خیال کا اظہار اُس نے اپنے ہم رقص کے سامنے کیا تو وہ مسکرایا

اور اس نے کہا تھا کہ :

"کیوں ؟ اس میں کیا بُرائی ہے ؟"

"اس لیے کہ لوگ مجھے بے وفا کہیں گے ۔"

"تم اپنے شوہر کو باوفا سمجھتی ہو کیا ؟"

"کیا شوہر باوفا نہیں ہوتے ؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"سوال تمہارے شوہر کا ہے"! اس نے زور دے کر کہا۔ "کیا تم یقین رکھتی ہو کہ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ رقص نہیں کرتا شراب نہیں پیتا اور گلچھرے نہیں اُڑاتا ؟ غلط فہمی میں نہ رہو۔ کیا وہ اپنی راتیں اندھیری کرتا ہوگا ؟ غور کرو۔ وہ مرد ہے اور آزاد مرد! —"

"انہیں مجھ سے محبت ہے"!

"مجھے کب انکار ہے ؟"

"میں ان کی ڈارلنگ ہوں"!

"وہ تمہارے ڈارلنگ ہیں!" وہ ہنس کر بولا۔ "لیکن اس کے باوجود جو کچھ میں نے کہا غلط نہیں۔ گھومنا پھرنا، ناچنا اور ہنسنا بولنا ڈارلنگ کا بھی حق ہوتا ہے"!

لیکن ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اسے یہی یقین تھا کہ اس کا شوہر ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے نامکمل خط کی طرف دیکھا اور قلم اُٹھا لیا۔ اس بار وہ عزم کے ساتھ خط ختم کر دینا چاہتی تھی۔ وہ لکھ رہی تھی۔

"مجھ سے کہا جاتا ہے کہ تم مجھے نہیں، کسی اور کو پیار کرتے ہو — یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تمہاری کوئی اور ڈارلنگ بھی ہوگی۔ لیکن میں ہمیشہ اس خیال کی تردید کرتی ہوں۔ سچ جانو کہ جو کوئی ایسا کہتا ہے تو میں اُداس ہو جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ الزام لگانے والے کا مُنہ نوچ لوں — کہتے ہیں کہ تم مرد ہو، بغیر سیر و تفریح اور کسی اور کو پیار کیے بغیر کیسے رہ سکتے ہو ؟ میں سمجھتی ہوں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حاسد ہیں محبت کے حاسد!

میں تمہیں فرشتہ سمجھتی ہوں ڈارلنگ!

مجھے تم پر اعتماد ہے۔ کیونکہ تم میرا فخر ہو — تمہاری راتیں میری یاد ہی میں بسر ہوتی ہوں گی۔ اس کا مجھے یقین ہے اور ہمیشہ میں یقین کرتی رہوں گی لیکن اتنی التجا سن لو کہ اب تم آ جاؤ۔ چاندنی راتوں کے بیتنے سے پہلے۔ بولو کب آ رہے ہو ڈارلنگ ؟"

— تمہاری اپنی ڈارلنگ —

خط لکھ کر وہ اُٹھی اور سیدھی اپنے بستر کی طرف ہولی اور کروٹ بدلتے ہی سو گئی — چاند نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا تھا — رات بھیگ رہی تھی اور تارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے اور چاندنی کا تقدس کچھ اور نکھر آیا تھا۔

چاند دوسری طرف دیکھ رہا تھا اور مسلسل گھور رہا تھا۔

"ڈارلنگ"! اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہی اپنی بیوی کو حسبِ معمول خط لکھنا شروع کیا۔ وہ لکھ رہا تھا۔

"رات بھیگ چکی ہے اور رات کا سفر تمام ہونے والا ہے لیکن میں ابھی تک جاگ رہا ہوں، اسلیے کہ سونے لیٹا تو تمہارا خیال روز کی طرح آج بھی آ گیا۔ خیال نے تمہارے خوبصورت خد و خال اُجاگر کر دیئے اور میں تم سے باتیں کرنے لگا، یہ بھی بھول گیا کہ علی الصباح اُٹھنا ہے، لیکن میں نے تمہارے مقابلہ پر کس کی فکر کی ہے۔ تمہیں احساس ہوگا ڈارلنگ!؟

جب میں چاند کو دیکھتا ہوں تو اس میں تمہارا ہنستا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاند کی طرف بہت دیکھتا ہوں۔ اور مجھے یاد ہے کہ ایک بار تم نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ چاند چونکہ مجھے اپنی ڈارلنگ کی یاد

بیوی کو سینے سے لگاتے ہوئے اور بیوی کا حسین چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے کہا تھا۔

"وعدہ کرو کہ مجھے خط لکھو گی؟"

"لکھوں گی۔"

"روز ایک خط لکھوں گی تاکہ روز ملاقات ہوتی رہے۔ بولو وعدہ کرتی ہو؟"

"وعدہ کرتی ہوں ڈارلنگ!"

"او مائی ڈارلنگ!" یہ کہہ کر شوہر نے اس کے ہونٹوں کو بوسہ دیا تھا، جس کا لمس اسے اب تک یاد تھا۔ وہ پھر ادھورا خط لکھ رہی تھی:۔

"ویسے بھی نیند تو تم اپنے ساتھ لیتے گئے... میں مرؤں تو کیسے؟ تم ہی بتاؤ؟ کیا یہ غلط ہے؟ جب میں نے کہا تھا کہ تم میری نیند لیئے جاتے ہو تو تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری مسکراہٹ کے لیئے بہت دور جا رہا ہوں، لیکن اب میری حالت خود دیکھ لو کہ نہ تو مجھے نیند آتی ہے اور نہ مجھے مسکرانا آتا ہے ۔۔۔ اب میں اسی وقت مسکراؤں گی جب تم میرے قریب ہوگے! بتاؤ میں تمہاری راہ کب تک دیکھوں؟ تم کب تک میرا امتحان لوگے؟ کب آؤ گے آخر؟ آتے کیوں نہیں ۔۔۔ اب ابھی آجاؤ۔"

اس کا دل پھر دھڑکا اور اس بار زور سے، جس کے شور ہی شور کی وجہ سے اس نے پھر قلم رکھ دیا۔ ساتھ ہی خون کی گردش پھر زور و شور سے ہونے لگی اور ٹیس نے پھر جنم لے لیا۔ چاند برابر سے گھور رہا تھا اور وہ اس خیال کو دل سے نکال دینے کے درپے تھی کہ "جب وہ خط میں شوہر سے مخاطب ہوتی ہے تو کیا روئے سخن واقعی شوہر سے ہوتا ہے؟"

وہ چاند سے آنکھیں چار نہیں کر سکی اور اس کی طرف سے پیٹھ کرلی ۔۔۔ پیٹھ کرتے ہی اس کی نظر دروازے پر پڑی۔ وہ کھلا تھا اور انداز بتا رہا تھا کہ جیسے کوئی دروازہ کھول کر گئے ہوئے دروازے کے دیکھتے ہوئے خیال نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

آرکسٹرا کی دھنوں میں وہ ڈوب گئی: اسے محسوس وہ آرکسٹرا کی دھنوں پر رقص نہیں کر رہی ہے بلکہ کسی چالاک کے نیچے نہا رہی ہے!

"ڈارلنگ!" اس کے ہم رقص نے پوچھا۔

"ہوں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"مجھے نیند آ رہی ہے!"

ہم رقص مسکرایا اور اس نے کہا۔ "تم یہاں آنے کے آمادہ نہیں ہو رہی تھیں۔ اگر نہ آتیں تو زندگی کی ایک حسین ر اپنے حسن سے محروم ہو جاتی۔"

"تم نے مجھے واقعی خوشی اور جشن دیا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں، ہمیشہ پاتی رہوگی ڈارلنگ!"

اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ آخر وقت تک خوشی اور حسن سے ہوتی رہی تھی اور پھر راؤنڈ میں وہ ناچی تھی اور ابھی تھوڑی د وہ گھر واپس آئی تھی۔ اس کا ہم رقص اسے پہنچا گیا تھا اور جا جاتے اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"اب سو جاؤ ڈارلنگ!"

"نہیں! میں ابھی خط لکھوں گی!"

"مجھے؟" ہم رقص نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ وہ مسکرا دی تھ اور وہ ہنستا ہوا ابھی دروازے سے چلا گیا تھا۔ دروازہ ابھی کھلا تھا۔

اس نے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر خیالات سے د بہلانے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے شوہر کے سوا اور ک کے ساتھ اس طرح گھومنے اور رقص کرنے نہیں جانا چاہیئے۔ ایک اس خیال کا اظہار اس نے اپنے ہم رقص کے سامنے کیا تو وہ مسکرا

اور اس نے کہا تھا کہ :

"کیوں ؟ اس میں کیا بُرائی ہے ؟"

"اس لیے کہ لوگ مجھے بے وفا کہیں گے ۔"

"تم اپنے شوہر کو باوفا سمجھتی ہو کیا ؟"

"کیا شوہر باوفا نہیں ہوتے ؟" اُس نے گھبرا کر پوچھا ۔

"سوال تمہارے شوہر کا ہے !" اس نے زور دے کر کہا ۔ "کیا تم یقین رکھتی ہو کہ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ رقص نہیں کرتا شراب نہیں پیتا اور گلچھرّے نہیں اُڑاتا ؟ غلط فہمی میں نہ رہو ۔ کیا وہ اپنی راتیں اندھیری کرتا ہوگا ؟ غور کرو ۔ وہ مرد ہے اور آزاد مرد !" —

"انہیں مجھ سے محبت ہے !"

"مجھے کب انکار ہے ؟"

"میں ان کی ڈارلنگ ہوں !"

"وہ تمہارے ڈارلنگ ہیں !" وہ ہنس کر بولا ۔ "لیکن اس کے باوجود جو کچھ میں نے کہا غلط نہیں ۔ گھومنا پھرنا ، ناچنا اور ہنسنا بولنا ڈارلنگ کا بھی حق ہوتا ہے !"

لیکن ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اسے یہی یقین تھا کہ اس کا شوہر ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے ۔ یہ سوچ کر اس نے نامکمل خط کی طرف دیکھا اور قلم اُٹھا لیا ۔ اس بار وہ عزم کے ساتھ خط ختم کر دینا چاہتی تھی ۔ وہ لکھ رہی تھی ۔

"مجھ سے کہا جاتا ہے کہ تم مجھے نہیں ، کسی اور کو پیار کرتے ہو — یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تمہاری کوئی اور ڈارلنگ بھی ہوگی ۔ لیکن میں ہمیشہ اس خیال کی تردید کرتی ہوں ۔ سچ جانو کہ جو کوئی ایسا کہتا ہے تو میں اُداس ہو جاتی ہوں ۔ جی چاہتا ہے کہ الزام لگانے والے کا منہ نوچ لوں —

کہتے ہیں کہ تم مرد ہو ، بغیر سیر و تفریح اور کسی اور کو پیار کیے بغیر کیسے رہ سکتے ہو ؟ میں سمجھتی ہوں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں ۔ اس لیے کہ وہ حاسد ہیں محبت کے حاسد !

میں تمہیں فرشتہ سمجھتی ہوں ڈارلنگ !

مجھے تم پر اعتماد ہے ۔ کیونکہ تم میرا فخر ہو ۔ تمہاری راتیں میری یاد ہی میں بسر ہوتی ہوں گی ۔ اس کا مجھے یقین ہے اور ہمیشہ میں یقین کرتی رہوں گی لیکن اتنی التجا سن لو کہ اب تم آجاؤ ۔ چاندنی راتوں کے بیتنے سے پہلے ۔ بولو کب آرہے ہو ڈارلنگ ؟"

— تمہاری اپنی ڈارلنگ —

خط لکھ کر وہ اُٹھی اور سیدھی اپنے بستر کی طرف ہو لی اور کروٹ بدلتے ہی سو گئی — چاند نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا — رات بھیگ رہی تھی اور تارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے اور چاندنی کا تقدس کچھ اور نکھر آیا تھا ۔

چاند دوسری طرف دیکھ رہا تھا اور مسلسل گھور رہا تھا ۔

"ڈارلنگ !" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہی اپنی بیوی کو حسبِ معمول خط لکھنا شروع کیا ۔ وہ لکھ رہا تھا ۔

"رات بھیگ چکی ہے اور رات کا سفر تمام ہونے والا ہے لیکن میں ابھی تک جاگ رہا ہوں ، اسلئے کہ سونے لیٹا تو تمہارا خیال روز کی طرح آج بھی آ گیا ۔ خیال نے تمہارے خوبصورت خدوخال اُجاگر کر دیئے اور میں تم سے باتیں کرنے لگا ، یہ بھی بھول گیا کہ علی الصباح اُٹھنا ہے ، لیکن میں نے تمہارے مقابلہ پر کس کی فکر کی ہے ۔ تمہیں احساس ہوگا ڈارلنگ !؟

جب میں چاند کو دیکھتا ہوں تو اس میں تمہارا ہنستا ہوا چہرہ نظر آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاند کی طرف بہت دیکھتا ہوں ۔ اور مجھے یاد ہے کہ ایک بار تم نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ چاند چونکہ مجھے اپنی ڈارلنگ کی یاد

دلاتا ہے۔ اس لیئے وہ مجھے عزیز ہے۔ اس وقت بھی میں چاند کی طرف دیکھ رہا ہوں اور تم سے محو گفتگو ہوں لیکن اس خیال کے ساتھ کہ کہیں تم بیدار نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ تم سو رہی ہوگی۔ اسی لیئے میں نے چاند سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ دھیمے دھیمے چلے ایسا نہ ہو کہ میری ڈارلنگ کی نیند اُچاٹ ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ میں نے چاند کو منع کر دیا کہ وہ تمہارے رُخ تاباں کا بوسہ نہ لے مبادا تمہاری آنکھ کھل جائے!

تم بہت یاد آتی ہو ڈارلنگ! سچ کہتا ہوں کہ تمہارے بغیر مجھے زندگی بے کیف سی نظر آتی ہے اور میں زیر لب یہی کہا کرتا ہوں کہ ؎

"تم جو نہیں کنار میں ——— خاک نہیں بہار میں!"

اور بہار آ بھی کیسے سکتی ہے؟ جب کہ تم بہار ہو۔ مجسم بہار اور پھر دُور ہو تو بہار کا کیا سوال؟ بہار تو وہیں ہوگی جہاں تم ہو نہ کہ یہاں ——— تم نے اپنے خط میں بہار کا ذکر بھی کیا ہے ——— تم خوش قسمت ہو ڈارلنگ!

تم نے لکھا ہے کہ تمہیں چاند سے نفرت ہوتی جاتی ہے اس لیئے کہ چاند نکل کر گردو پیش کو حسین بنا دیتا ہے اور تمہارے دل کو ٹھیس لگتی ہے! یہ شاید تم نے اُداس ہو کر لکھ دیا ورنہ دو محبت کرنے والے جو ایک دوسرے سے دُور ہوں انہیں چاند کا بڑا انتظار رہتا ہے اسلیئے کہ دونوں اُبھرتے ہوئے چاند میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ بہر کیف مجھے چاند کا بڑا انتظار رہتا ہے۔ اس میں مجھے تمہارا جمال نظر آتا ہے اگر میرا بس چلتا تو میں چاند کو ڈوبنے ہی نہ دیتا لیکن کیا کروں مجبور ہوں!؟

اچھا ڈارلنگ! اب تم سو جاؤ اور مجھے اپنے تصور میں محو رہنے دو۔ یہاں تک کہ یہ دُوری یہ فاصلہ ختم ہو جائے اور تم میرے پہلو میں آجاؤ۔ اتنے قریب کہ پھر ہم دونوں جُدا نہ ہو سکیں ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں ——— خدا حافظ ڈارلنگ!

تمہارا اپنا ——— جسے تم ہمیشہ ڈارلنگ کہتی ہو!

اپنی بیوی کو خط لکھ کر اس نے سگریٹ جلایا اور چاند کو دیکھنے لگا جو پیچھے سے اُوپر مُنہ نکالے نہ جانے کتنی دیر سے اسے گھور رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ جیسے چاند اسے دیکھ کر مُسکرا دیا ہو۔ اُس نے تڑپ کر پوچھا:

"کیوں ہنس رہے ہو؟"

"خط لکھ لیا ہے؟"

"ہاں!"

"کسے لکھا ہے؟" چاند نے پوچھا۔ اُس نے فوراً جواب دیا اور کہا

"اپنی ڈارلنگ کو اور کسے؟"

"تمہاری ڈارلنگ ہے کون؟"

"میری بیوی اور کون؟"

"تم جھُوٹ بولتے ہو!" اچانک اسے محسوس ہوا کہ جیسے شاخوں سے جو ہوا چھن کر چل رہی ہے وہ یہی وِرد کر رہی ہے "تم جھُوٹ بولتے ہو۔ تمہاری بیوی تمہاری ڈارلنگ نہیں بلکہ وہ حسینہ ہے جس کے ساتھ تم دیر تک رقص کرتے رہے ہو تم اپنی ڈارلنگ کو ہی نہیں بلکہ خود کو بھی بہت بڑا دھوکہ دے رہے ہو....!"

اور وہ سگریٹ کا کش ہی لگانا بھُول گیا۔ سگریٹ انگلیوں میں دبا جل کر راکھ ہو رہا تھا اور وہ کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر بیوی کو خط لکھنے کے بعد تصوری طور پر وہ ان ازخوانی زلفوں کا اسیر بن چکا تھا جو ناگن کی طرح اسے جکڑ لیتی تھیں!

"ڈارلنگ!"

"ہوں!"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"مجھے نیند آرہی ہے!"

وہ مسکرادیا اور اس نے کہا، "تم یہاں آنے کے لیئے آمادہ نہیں تھیں اگر نہ آتیں تو زندگی کی ایک حسین رات اپنے حُسن سے محروم ہو جاتی"

"تم نے مجھے واقعی خوشی اور خوبصورتی دی ہے"

"گھبراؤ نہیں، ہمیشہ پاتی رہو گی ڈارلنگ!"

اسے یاد آرہا تھا کہ وہ آخر تک خوشی اور حُسن سے ہمکنار ہوتا رہا تھا اور ابھی تھوڑی دیر قبل تک وہ رقص کرتا رہا تھا۔ اپنی ارغوانی زلفوں والی ڈارلنگ کے ساتھ۔ وہ گھر پہنچانے آئی تھی۔ جاتے وقت اسکی ڈارلنگ نے کہا تھا۔

"اب سو جاؤ ڈارلنگ!"

"نہیں! میں ابھی خط لکھوں گا!"

"مجھے؟" ارغوانی زلفوں والی ہم رقص حسینہ نے مسکرا کر پوچھا تھا وہ مسکرادیا تھا۔ اور تب وہ ہنستی ہوئی چلی گئی تھی۔ دروازہ اسی لیئے اب تک کھلا تھا۔ اس نے اچانک چونک کر دروازہ بند کیا اور سوچنے لگا کہ بیوی کو ڈارلنگ بنانے کے بعد اس کو کسی اور کے ساتھ گھومنے اور رقص کرنے نہیں جانا چاہیئے ـــــ اسے یاد آیا کہ ایک بار اس نے ارغوانی ڈارلنگ سے اس خیال کا اظہار کیا تھا تو وہ بڑے زور سے ہنسی تھی اور اس نے کہا تھا۔ "اس میں کیا برائی ہے؟"

"اس لیئے کہ دُنیا مجھے بے وفا کہے گی"

"کیا تم اپنی منکوحہ کو باوفا سمجھتے ہو ڈارلنگ؟"

"کیا بیوی باوفا نہیں ہوتی؟"

تب اس نے ارغوانی زلفوں کو چہرے پر سے سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔ "کیا تم اُمید کرتے ہو کہ جوان اور حسین بیوی شوہر کے انتظار میں سُہانی شام تنہا دیتی ہوگی؟"

"مجھے یقین ہے"

"جس طرح سے اسے تمہارے متعلق یقین ہے کیوں؟" یہ کہہ کر وہ بہت تمازت سے ہنس دی اور جھوم اٹھی اور جذبہ حسد سے مجبور ہو کر

کہنے لگا، "میری بیوی میری ڈارلنگ ہے!"

"کیا ڈارلنگ بن کر کوئی بیوی تارک الدنیا بن جاتی ہے؟ کیا ڈارلنگ کو زندگی سے لُطف اندوز ہونے کا حق نہیں؟"

ارغوانی زلفوں والی ڈارلنگ کے جاتے ہی گھبرا کر اُس نے خط میں یہ سطور نہ جانے کن جذبات کے تحت بڑھا دیں۔

"میرے کان بھرے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ تم مجھے پیار نہیں کرتیں ـــــ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تم نے کسی اور کو ڈارلنگ بنالیا ہوگا۔ لیکن مجھے اس کا یقین نہیں۔ لوگ حاسد ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ڈارلنگ کو بھی زندگی سے لُطف اندوز ہونے کا حق ہے۔ کتنی غلط بات کہتے ہیں لوگ! وہ کیا جانیں میری ڈارلنگ کو! میری ڈارلنگ فرشتہ ہے ـــ فرشتہ ـــ کیا یہ غلط ہے ڈارلنگ ـــ نہیں ہرگز نہیں ـــ!"

"میں بہت جلد آؤں گا اپنی ڈارلنگ کے پاس ـــ اپنی ڈارلنگ سے اب میں ایک لمحے کے لیئے بھی جُدا نہیں رہ سکتا ـــ!"

صبح ارغوانی زلفوں والی حسینہ کی نظر خط پر پڑ گئی۔ اُس نے خط اٹھالیا۔ پڑھنے لگی۔ وہ نہا رہا تھا اور وہ خط پڑھ کر مسرور ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ روزانہ ملنے، ساتھ تفریح کرنے اور رقص کرنے کے باوجود جب چند گھنٹوں کے لیئے وہ جُدا ہوتی ہے تو اسے نیند نہیں آتی بلکہ یہ وقفہ وہ اسے خط لکھنے میں گذارتا ہے۔ یقیناً یہ خط اُس نے اپنی دُور افتادہ بیوی کو نہیں بلکہ اسے لکھا ہے ـــ اور اس نے شرارتاً ایک طرف لکھ دیا؛

"ڈارلنگ، دن بھر میں صرف چند گھنٹے میں تم سے الگ ہوتی ہوں، پھر تم اتنا حسرتناک خط کیوں لکھتے ہو؟ کیا تمہاری محبت میری ایک لمحہ کی جُدائی برداشت نہیں کرسکتی ـــــ تمہاری ڈارلنگ"

اور جب صبح کو وہ اپنی ڈارلنگ سے ملنے آیا تو اس کی نظر خط پر پڑی۔ اس کے بھی وہی جذبات تھے جو ارغوانی زلفوں والی حسینہ کے تھے۔ اس نے بھی خط کے کونے پر لکھ دیا۔

"ڈارلنگ! دن بھر یکجا رہنے کے بعد بھی تم چاہتی ہو
کہ میں تم سے ایک لمحہ کے لیے جدا نہ ہوں! کتنی شدید
ہے تمہاری محبت ڈارلنگ —— تمہارا ڈارلنگ!"

دونوں خط جلدی اور گھبراہٹ میں پوسٹ ہو گئے — اس نے اپنی بیوی کا خط پڑھا تو کونے والی تحریر پڑھ کر اس کا سر چکرا گیا — اپنی ڈارلنگ کا بھرم ٹوٹنے کے بجائے اس کو فکر یہ تھی کہ کہیں اس کی ڈارلنگ نے تو اسی طرح کوئی تحریر اس کے خط میں تو نہیں لکھ دی... دن بھر وہ اپنا پول کھل جانے کی فکر میں گھلتا رہا اور شام کو جوں ہی ارغوانی بالوں والی حسینہ ہنستی ہوئی آئی تو اس نے گھبرا کر استقبال کرنے کے بجائے پوچھا:

"ڈارلنگ! کیا تم نے اس خط میں کوئی تحریر تو نہیں لکھی جسے تم پڑھ رہی تھیں؟" ارغوانی زلفوں والی حسینہ نے مسکرا کر بڑے دلربا انداز سے کہا:

"وہ جملہ تم نے پڑھ لیا ہوگا — کیا نہیں پڑھا تھا؟"

"اوہ مائی ڈارلنگ!" یہ کہہ کر وہ گھبرا گیا۔ اور اس گھبراہٹ اور ندامت میں بھی اس نے اپنی ڈارلنگ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اس کی ڈارلنگ اسے گھبرا کر دیکھ رہی تھی اور کچھ سمجھ نہیں سکی کہ اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟ —— دوسری طرف اس کی بیوی جو اس کی ڈارلنگ تھی، نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنے ہم رقص کی گود میں پڑی تھی اور وہ حیران تھا —!!

▲

مظفر حنفی

آٹا

"پاپا! لوٹی نیں ــــ آٹا تم!"
بڑے لوگوں کے سکریٹری شارٹ ہینڈ میں لکھتے ہیں ــــ
ہمارا تین سالہ بچّہ شارٹ ہینڈ میں بولتا ہے! چنانچہ میں
یا کہ اس نے روٹی نہ پکنے کی وجہ آٹے کا ختم ہونا بیان کی
کلرک آدمی مہینے کے بالکل ابتدائی دور میں ہی اس قسم
بلے ذرا کم برداشت کر پاتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اُسے ہاتھ
ایک طرف ہٹیں دیا اور چشمہ اُتار کر احتیاط سے ٹیبل پر رکھا
سے پھینکنے میں ٹوٹ جانے کا احتمال تھا۔

عصو، میری بیوی، باورچی خانے میں برتن بجا رہی تھی۔
"کیوں ــــ کھانے میں کیا دیر ہے؟" میں نے اُس سے
پوچھا۔

وہ بدستور برتن مانجھتی رہی۔
"عجیب عادت ہے تمہاری؟" میں نے دفتر کی تھکان اُس پر
نی چاہی۔ "جانتی ہو ساڑھے نو بجے کا گیا ہوا اس وقت لوٹتا ہوں
ہیں ایک پیالی چائے تک نصیب نہیں ہوتی اور تم ہو کہ وقت
......

"کھانا تک نہیں تیار کر سکتیں ــــ" اُس نے میرا جملہ خود پورا
کر دیا اور برتن اَدھ دُھلے چھوڑ کر اُٹھ آئی۔
"میں نے صبح ہی تبلا دیا تھا کہ ....."
"آٹا ختم ہو گیا ہے" اس بار میں نے اُس کا جملہ مکمل کر دیا۔
وہ ہنسنے لگی۔
"اچھا اب، ہنسی کا انٹرول کر کے بتاؤ ــــ" میں نے اپنا بگڑا ہوا
موڈ سنبھالنے کی کوشش کی "کہ آٹا منگوایا کیوں نہیں؟"
"اشفاق بیچارہ تین دن سے تو دوڑ رہا ہے" اس نے جواب
دیا۔ "پرسوں سے روزانہ دوپہر کے بعد اسکول سے چھٹی لے کر آجاتا ہے
اور آٹا لانے کی کوشش کرتا ہے، آج بھی راشن گیا ہوا ہے"
"لیکن سرکاری غلّے کی دوکان سے گیہوں کیوں نہیں منگوا لیے
صرف چھننے اور پسوانے ہی کی تو زحمت ہوتی؟"
"وہاں گیہوں ختم ہو گئے، دوکان چار دن سے بند ہے"
"بازار سے منگوا لیے ہوتے" ــــ
"وہاں تیس پینتیس روپے من بک رہے ہیں ــــ

سوا سو روپیوں میں مہینہ بھی تو چلانا ہے۔"

"یعنی بھوکے رہ رہ کر...."

"اُفوہ!" اس نے مجھے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ "شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ سالن وغیرہ سب تیار ہے۔ اشفاق، آٹا لے کر آتا ہی ہوگا۔ تب تک آپ تھوڑا سا بُھس لیجئے نا!"

میں ہنسنے لگا۔

لیکن میں زیادہ دیر تک نہ ہنس سکا، تھوڑی ہی دیر بعد اشفاق بے نیل و مرام واپس آیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"کیوں ــــ؟ آٹا آج بھی نہیں ملا؟"

"وہ بچوں کو نہیں دیتے۔"

"پاپا!" فیروز نے بیچ میں لقمہ دیا ــــ [illegible]

"آپ اپنے ہونٹوں کے پھاٹک فی الحال بند کیجئے۔" میں نے اس کے گال پر تھپکی دی۔ "اشفاق تم میرے ساتھ چلو۔"

چشمہ لگا کر چلنے کو ہوا تو معصو پوچھ بیٹھی۔

"کہاں جائیے گا؟"

"آٹے والے کے پاس۔"

"لیکن اب تو وقت ختم ہوگیا۔" اشفاق نے کہا۔ "شام کو چار بجے سے چھ بجے تک ملتا ہے بس۔"

"تم آؤ تو۔" میں جھنجلا کر بولا۔

معصو نے کہا۔

"دیکھئے لڑیئے گا نہیں کسی سے۔ اس وقت آپ کا مزاج عام طور پر چڑچڑا رہتا ہے۔"

"تم نصرٌ من اللہ کا وظیفہ پڑھو، میں ابھی آتا ہوں۔"

لپکتا ہوا سرکاری آٹے کی دوکان پر پہنچا۔ کچھ لوگ ڈھائی ڈھائی کلو آٹے کی تھیلیاں لیئے ہوئے اب تک دوکان سے نکل رہے تھے، حالانکہ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ دوکان میں داخل ہوا تو گدی پر سیٹھ جی دو نیموں کے ساتھ براجمان تھے اور مونڈھے پر ایک ہیڈ کانسٹبل صاحب تشریف فرما تھے۔

"ہاں تو وہ کل کا بقایا رہ ہی گیا۔" ہیڈ صاحب کہہ رہے تھے۔ ادھر سے میں چالو ہوگیا۔

"کیوں صاحب؟ یہ کیا دھاندلی ہے آخر.... ؟"

"ذرا ایک منٹ...." سیٹھ جی نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا اور سامنے ٹرے میں پڑے ہوئے نوٹوں کے انبار سے پانچ کا نوٹ نکال کر ہیڈ صاحب کو تھماتے ہوئے بولے....

"باقی حساب کل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ــــ" ہیڈ صاحب نے نوٹ تہہ کر کے جیب کے حوالے کیا اور رخصت ہوگئے۔

"جی! ــــ اب کہیئے؟" سیٹھ جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"کہنا کیا ہے؟" میں غرّا کر بولا ــــ "میں محکمہ جنگل میں ملازم ہوں، صبح ساڑھے نو بجے دفتر جاتا ہوں اور چھ بجے لوٹتا ہوں۔"

"چچ چچ ــــ" سیٹھ جی نے ہمدردی کا اظہار فرمایا.... "بڑی محنت کرتے ہیں آپ۔ لیکن میں اس سلسلہ میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"آپ آٹا دے سکتے ہیں مجھے۔ یہ میرا بھانجہ ہے اشفاق تین دن سے واپس لوٹ رہا ہے۔ ایک فرلانگ لمبی لائن میں آکر تین بجے سے لگتا ہے اور جب اُس کا نمبر آتا ہے تو آپ کے ہاں سے جواب ملتا ہے بچوں کو آٹا نہیں ملے گا۔"

"صاحب! وہ تو قانون ہی ایسا ہے۔"

"ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے میں سرکاری ملازمت میں ہوں نہ صرف بارہ دن کی رخصتِ اتفاقیہ مجھے سال بھر میں ملتی ہے۔ ایک وقت میں آپ صرف ڈھائی کلو آٹا دیتے ہیں جو ایک دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ روزانہ چار سے چھ کے درمیان چھٹی لے کر آپ کے پاس آٹا خریدنے کے لیئے نہیں آسکتا۔ میرا بچہ یا بھانجہ آتا ہے، آپ کو

دینا چاہیے۔"

"دیکھئے! آٹا ہماری دوکان پر آکر براہِ راست مِل والے فروخت کرتے ہیں، ہمیں تو صرف کچھ فیصد کمیشن ملتا ہے۔ وہ لوگ شروع شروع میں بچے بوڑھے سب کو دیتے تھے، لیکن اب قانون بنا دیا ہے کہ بچوں کو نہیں دیں گے۔"

"کس نے یہ قانون بنادیا ہے، سرکار نے؟"

"جی نہیں مِل والوں نے۔"

"بہت خوب!" میں نے مُنہ بنا کر کہا۔ "وہ قانون بنانے والے کون ہوتے ہیں؟"

"بچے آٹا پھینک دیں، پیسے گم کردیں یا کوئی گڑبڑ نہ کریں اس لیے انہوں نے یہ قاعدہ بنا دیا۔"

"یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے، میرے ہاں کوئی لانے والا نہیں ہے۔ میں ہوں تو دفتر میں رہتا ہوں۔ ہمیں آٹا کون لاکر دے گا۔ اسے بھی اسکول سے چھٹی لے کر آنا پڑتا ہے۔"

"عورتیں آکر لے جائیں۔"

میں جھنجھلا گیا۔

"سیٹھ جی! دراصل ہم جاہلوں کے گھروں میں پردہ ہوتا ہے عورتیں نہیں آسکتیں۔ بالفرض آ بھی جائیں تو دو ڈھائی کلو آٹے کے لیے دو روپے تانگے والے کو دینا پڑیں۔ پھر گھر کا کام کاج کون کرے گا۔ آپ کے ہاں تو یہ لمبی لائن لگتی ہے۔"

"تب پھر مجبوری ہے۔"

"مجبوری کیسی؟ آپ اس بچے کو آٹا دیا کیجئے۔"

"اچھی بات ہے۔" سیٹھ جی نے لہجے میں کچھ لچک پیدا کی۔ "آج تو دوکان بند ہو چکی ہے، کل دیدیں گے۔"

"اور پرسوں بھی ــــ" میں نے ہمیشہ کا جھنجھٹ ختم کرنا چاہا۔

"جی اگر آپ اس دن آکر کہہ گئے تو پرسوں بھی دیدیں گے"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"صاحب، آپ تو بحث کرنے لگے۔ مجھے دوسرے کام بھی دیکھنے ہیں۔ نمستے!" سیٹھ جی نے کہا اور گردن جھکا کر ٹرے میں پڑے ہوئے نوٹ جمانے لگے۔ بڑے نوٹ الگ، چھوٹے نوٹ الگ۔

"چلو اشفاق!"

میں وہاں سے نکل کر سیدھا قریبی تھانے پہنچا۔ لیکن وہاں معلوم ہوا کہ جواہر چوک، جس علاقے میں وہ دوکان ہے ہنومان گنج پولیس اسٹیشن میں لگتا ہے جو وہاں سے کم از کم نصف میل دُور تھا۔ مزید چلنے کی تاب نہ تھی۔ چنانچہ تانگہ کیا اور متعلقہ پولیس اسٹیشن پر آیا۔ تھانیدار صاحب اس وقت کسی عورت کا بیان لینے میں مصروف تھے۔ میرا نمبر آنے تک آٹھ بج گئے۔ بہرحال میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو بولے۔

"فرمائیے آپ کی تعریف؟"

میں نے انہیں اپنا نام بتلایا۔ یہ بھی بتایا کہ شاعری اور افسانہ نگاری بھی کرتا ہوں لیکن وہ مرعوب ہونے کی بجائے اور بھڑک گئے۔

"تم کرتے کیا ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں کلرکی کرتا ہوں محکمۂ جنگلات کی۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے بیٹھ جائیے۔"

میں نے سوچا ابتداً اچھی ہوئی ہے، چنانچہ مناسب پہلو سے بیٹھ کر بڑے رقّت انگیز لہجے میں اپنا بیان شروع کیا

"انسپکٹر صاحب! میں ملازم آدمی ہوں، صبح کا گیا چھ بجے کے بعد دفتر سے لوٹتا ہوں۔ خود سودا سلف خریدنے نہیں جاسکتا محلہ کی سرکاری غلہ کی دوکان چار دن سے بند ہے کہ اسٹاک ختم ہوگیا۔ شہر میں سرکاری آٹے کی صرف دو دکانیں ہیں، وہاں ایک دن میں صرف ڈھائی کلو آٹا ملتا ہے۔ میرے گھر میں پانچ چھ نفر کھانے والے ہیں، ایک دن میں آٹا ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ساتھ ملے تو کسی دن چھٹی لے کر کبھی خرید کر رکھ دوں۔ دو روز تو چھٹی

سوا سو روپیوں میں مہینہ بھی تو چلانا ہے۔"

"یعنی بھوکے رہ رہ کر ....."

"اُفوہ!" اس نے مجھے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ "شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ سالن وغیرہ سب تیار ہے۔ اشفاق، آٹا لے کر آتا ہی ہوگا۔ تب تک آپ ذرا سا ہنس لیجئے نا!"

میں ہنسنے لگا۔

لیکن میں زیادہ دیر تک نہ ہنس سکا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اشفاق بے نیل و مرام واپس آیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"کیوں ___؟ آٹا آج بھی نہیں ملا؟"

"وہ بچوں کو نہیں دیتے۔"

"پاپا!" فیروزہ نے بیچ میں لقمہ دیا ___ "آپ بچے تھا"

"آپ اپنے ہونٹوں کے پھاٹک فی الحال بند کیجئے۔" میں نے اس کے گال پر تھپکی دی۔ "اشفاق تم میرے ساتھ چلو۔"

چشمہ لگا کر چلنے کو ہوا تو معصو پوچھ بیٹھی۔

"کہاں جائیے گا؟"

"آٹے والے کے پاس۔"

"لیکن اب تو وقت ختم ہوگیا۔" اشفاق نے کہا۔ "شام کو چار بجے سے چھ بجے تک ملتا ہے بس۔"

"تم آؤ تو۔" میں جھنجھلا کر بولا۔

معصو نے کہا۔

"دیکھئے لڑیئے گا نہیں کسی سے۔ اس وقت آپ کا مزاج عام طور پر چڑچڑا رہتا ہے۔"

"تم نصرٌ من اللہ کا وظیفہ پڑھو، میں ابھی آتا ہوں۔"

لپکتا ہوا سرکاری آٹے کی دوکان پر پہنچا۔ کچھ لوگ ڈھائی ڈھائی کلو آٹے کی تھیلیاں لیئے ہوئے اب تک دوکان سے نکل رہے تھے، حالانکہ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ دوکان میں داخل ہوا تو گدی پر سیٹھ جی دو نیموں کے ساتھ براجمان تھے اور مونڈھے پر ایک ہیڈ کانسٹبل صاحب تشریف فرما تھے۔

"ہاں تو وہ کل کا بقایا رہ ہی گیا۔" ہیڈ صاحب کہہ رہے تھے۔ ادھر سے میں چالو ہوگیا۔

"کیوں صاحب! یہ کیا دھاندلی ہے آخر.....؟"

"ذرا ایک منٹ....." سیٹھ جی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور سامنے ٹرے میں پڑے ہوئے نوٹوں کے انبار سے پانچ کا نوٹ نکال کر ہیڈ صاحب کو تھماتے ہوئے بولے..

"باقی حساب کل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ___" ہیڈ صاحب نے نوٹ تہہ کر کے جیب کے حوالے کیا اور رخصت ہو گئے۔

"جی! ___ اب کہئے؟" سیٹھ جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"کہنا کیا ہے؟" میں غرّا کر بولا ___ "میں محکمہ جنگ میں ملازم ہوں، صبح ساڑھے نو بجے دفتر جاتا ہوں اور چھ بجے لوٹتا ہوں۔"

"چچ چچ ....." سیٹھ جی نے ہمدردی کا اظہار فرمایا... "بڑی محنت کرتے ہیں آپ۔ لیکن میں اس سلسلہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ آٹا دے سکتے ہیں مجھے۔ یہ میرا بھانجہ ہے اشفاق تین دن سے واپس لوٹ رہا ہے۔ ایک ذرا لمبی لائن میں کھڑا تین بجے سے لگتا ہے اور جب اُس کا نمبر آتا ہے تو آپ کے ہاں سے جواب ملتا ہے بچوں کو آٹا نہیں ملے گا۔"

"صاحب! وہ تو قانون ہی ایسا ہے۔"

"ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ظاہر ہے میں سرکاری ملازمت میں ہوں، صرف بارہ دن کی رخصت اتفاقیہ مجھے سال بھر میں ملتی ہے۔ ایک وقت میں آپ صرف ڈھائی کلو آٹا دیتے ہیں جو ایک دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ روزانہ چار سے چھ کے درمیان چھٹی لے کر آپ کے پاس آٹا خریدنے کے لیے نہیں آ سکتا۔ میرا بچہ یا بھانجہ آتا ہے، آپ کو

دینا چاہیئے۔"

"دیکھئے! آٹا ہماری دوکان پر آکر براہِ راست مِل والے فروخت کرتے ہیں، ہمیں تو صرف کچھ فیصد کمیشن ملتا ہے۔ وہ لوگ شروع شروع میں بچے بوڑھے سب کو دیتے تھے، لیکن اب قانون بنا دیا ہے کہ بچوں کو نہیں دیں گے۔"

"کس نے یہ قانون بنا دیا ہے؟ سرکار نے؟!"

"جی نہیں مِل والوں نے۔"

"بہت خوب!" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "وہ قانون بنانے والے کون ہوتے ہیں؟"

"بچے آٹا پھینک دیں، پیسے گم کر دیں یا کوئی گڑبڑ نہ کریں اس لیئے انہوں نے یہ قاعدہ بنا دیا۔"

"یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے، میرے ہاں کوئی لانے والا نہیں ہے۔ میں ہوں تو دفتر میں رہتا ہوں۔ ہمیں آٹا کون لا کر دے گا۔ اسے بھی اسکول سے چھٹی لے کر آنا پڑتا ہے۔"

"عورتیں آکر لے جائیں۔"

میں جھنجھلا گیا۔

"سیٹھ جی! دراصل ہم جاہلوں کے گھروں میں پردہ ہوتا ہے عورتیں نہیں آسکتیں۔ بالفرض آ بھی جائیں تو دو ڈھائی کلو آٹے کے لیئے دو روپے تانگے والے کو دینا پڑیں۔ پھر گھر کا کام کاج کون کرے گا۔ آپ کے ہاں تو یہ لمبی لائن لگتی ہے۔"

"تب پھر مجبوری ہے۔"

"مجبوری کیسی؟ آپ اس بچے کو آٹا دیا کیجیے۔"

"اچھی بات ہے۔" سیٹھ جی نے لہجے میں کچھ لچک پیدا کی۔ "آج تو دوکان بند ہو چکی ہے، کل دیدیں گے۔"

"اور پرسوں بھی ـــــ" میں نے ہمیشہ کا جھنجھٹ ختم کرنا چاہا۔

"جی اگر آپ اس دن آکر کہہ گئے تو پرسوں بھی دیدیں گے۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"صاحب، آپ تو بحث کرنے لگے۔ مجھے دوسرے کام بھی دیکھنے ہیں۔ نمستے!" سیٹھ جی نے کہا اور گردن جھکا کر ٹرے میں پڑے ہوئے نوٹ جمانے لگے۔ بڑے نوٹ الگ، چھوٹے نوٹ الگ۔

"چلو اشفاق"!

میں وہاں سے نکل کر سیدھا قریبی تھانے پہنچا۔ لیکن وہاں معلوم ہوا کہ جواہر چوک، جس علاقے میں وہ دوکان ہے ہنومان گنج پولیس اسٹیشن میں لگتا ہے جو وہاں سے کم از کم نصف میل دُور تھا۔ مزید چلنے کی تاب نہ تھی۔ چنانچہ تانگہ کیا اور متعلقہ پولیس اسٹیشن پر آیا۔ تھانیدار صاحب اس وقت کسی عورت کا بیان لینے میں مصروف تھے۔ میرا نمبر آنے تک آٹھ بج گئے۔ بہرحال میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو بولے۔

"فرمایئے آپ کی تعریف؟"

میں نے انہیں اپنا نام بتلایا۔ یہ بھی بتایا کہ شاعری اور افسانہ نگاری بھی کرتا ہوں لیکن وہ مرعوب ہونے کی بجائے اور بھڑک گئے۔

"تم کرتے کیا ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں کلرکی کرتا ہوں محکمۂ جنگلات کی۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے بیٹھ جایئے۔"

میں نے سوچا ابتداً اچھی ہوئی ہے، چنانچہ مناسب پہلو سے بیٹھ کر بڑے رقّت انگیز لہجے میں اپنا بیان شروع کیا

"انسپکٹر صاحب! میں ملازم آدمی ہوں، صبح کا گیا چھ بجے کے بعد دفتر سے لوٹتا ہوں۔ خود سودا سلف خریدنے نہیں جا سکتا محلّہ کی سرکاری غلّہ کی دوکان چار دن سے بند ہے کہ اسٹاک ختم ہو گیا۔ شہر میں سرکاری آٹے کی صرف دو دکانیں ہیں، وہاں ایک دن میں صرف ڈھائی کلو آٹا ملتا ہے۔ میرے گھر میں پانچ چھ نفر کھانے والے ہیں، ایک دن میں آٹا ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ساتھ ملے تو کسی دن چھٹی لے کر یکجا خرید کر رکھ دوں۔ روز روز تو رخصت

بلنے سے رہی ۔ یہ میرا بھانجہ میرے ساتھ رہتا ہے ، دسویں میں پڑھتا ہے ۔ تین دن سے اسکول سے چھٹی لے لے کر آٹے کی دوکان پر لائن لگتا ہے ، لیکن دوکاندار اسے آٹا نہیں دیتے اور یہ کہہ کر لوٹا دیتے ہیں کو بچوں کو نہیں ملے گا ۔"

" کبھی کبھی پولیس والے بھی لائن سے نکال دیتے ہیں ۔" اشفاق نے بیچ میں کہا ۔

" کیا مطلب ؟ " تھانیدار صاحب نے تیوریاں بدل لیں ۔

" جی ہاں صاحب ! " اشفاق نے جواب دیا " پولیس والے بھی اکثر بچوں کو لائن سے نکال دیتے ہیں ۔"

" کیوں نکال دیتے ہیں جی ؟ "

" کہتے ہیں بچوں کو آٹا نہیں ملے گا ۔"

" نہیں نہیں ۔ " داروغہ جی نے میز پر گھونسہ مارا ۔ " پولیس والے ایسی خلاف قانون بات نہیں کہہ سکتے ۔ تم اپنے نمبر سے آگے جانے کی کوشش کرتے ہو گے ۔"

" یہ بات نہیں ہے انسپکٹر صاحب ! " میں نے انہیں سمجھانا چاہا ۔ " دوکاندار صریحاً بچوں کو آٹا نہ دینے کا قانون بنا کر بیٹھا ہے ۔ میں ابھی اس سے مل کر آرہا ہوں ۔ وہیں میں نے آپ کے ہیڈ کانسٹبل صاحب کو سیٹھ جی سے روپے وصول کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے " !

" کیسے روپے ؟ "

" بچوں کو لائن سے نکال دینے کا معاوضہ ۔"

" کیوں ؟ "

" تاکہ وہی آٹا بلیک میں فروخت کیا جاسکے ۔"

تھانیدار صاحب بوکھلا کر اُٹھ کھڑے ہوئے ۔

" آپ میرا وقت ضائع نہ کیجئے ۔ فوراً تھانے سے باہر چلے جائیے ۔ اگر آپ سرکاری ملازم نہ ہوتے تو ..... "

" لیکن تھانیدار صاحب ! ہم تین دن سے لگاتار چاول کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں ، اوّل تو نزلہ اور زکام پیدا کرتے ہیں دوسرے مہنگے بھی ۔"

" آپ جاتے ہیں یا میں ..... "

میں لپک کر تھانے سے باہر آگیا ۔ پہلے سوچا کسی سیاسی لیڈر کے پاس جاؤں ، لیکن خیال آیا ، ملازم سرکار ہوں ، پھر ارادہ کیا چیف منسٹر کے بنگلے پر پہنچوں ، لیکن اپنے چھوٹے آدمی ہونے کا احساس ہوا ۔ چنانچہ اشفاق کے ساتھ گھر پلٹ آیا ۔

اندر داخل ہوتے ہی فیروز نے شارٹ ہینڈ شروع کردی ۔

" پاپا ! آتا بوت ـــــ امّی لوتی ایں ۔" (پاپا آٹا بہت سا آگیا ہے امّی روٹی پکا رہی ہیں ۔)

" لیجئے آپ خالی ہاتھ آگئے اور ہم نے آٹا منگوا بھی لیا ۔" عصّو نے آنکھیں گھما کر فاخرانہ انداز میں کہا ۔

" کہاں سے ؟ "

" پڑوسن کا بچّہ چکّی پر سے لایا ہے ۔"

" کتنا ؟ "

" دس کلو ، دس روپے کا ! "

میں کافی تھک چکا تھا ۔ پھر بھی لپک کر کنستر میں جھانکنے لگا جو لبالب کسی سیاہ رنگ کے سفوف سے بھرا ہوا تھا ۔ ہاتھ ڈال کر دیکھا تو وہ کالا کالا سفوف تمام ہاتھ میں لتھڑ گیا ۔ میں سر تھام کر تخت پر بیٹھتے ہوئے بولا ۔

" عصّو ! یہ آٹا اِتنا کالا کیوں ہے ؟ " ▲

نریش کمار شاؔد

*

تمہارے ہاتھ

(ترکی کے مشہور شاعر ناظم حکمت کی ایک نظم کا آزاد منظوم ترجمہ)

اے لوگو! یہ ہاتھ تمہارے
پتّھر کے مانند بہت گمبھیر ہیں لیکن
افسردہ اور غمگیں بھی ہیں
زنداں کے نغمات ہوں جیسے
بوجھ اُٹھانے والے جانوروں سے بڑھ کر
باہمّت ہیں اور قوی ہیں
شہد کی مکھی جیسے ہُنرمند اور جفاکش
بھاری بھرکم ـــــ دُودھ بھرے سینے ہوں جیسے
اور بہادر ـــــ جیسے فطرت
ان ہاتھوں کی ساری نرمی
چھپی ہوئی ہے
اپنی سخت اور کھُردری کھال کے اندر
گائے کے سینگوں پر یہ دُنیا کھڑی نہیں ہے
ہاتھ تمہارے تھامے ہوتے ہیں اس کو

اے بدقسمت سادہ لوگو!
جھُوٹ کے دسترخوان ہمیشہ
تم کو پیش کیئے جاتے ہیں
جبکہ تمہارے پیٹ ہیں خالی
روٹی کے اِک اِک ٹکڑے کو
ترس رہے ہو
ہر دم تم کو بھُوک کے شعلے
جھُلس رہے ہیں
اور تم اس پھیلی دُنیا کو
اور اس کے خوش رنگ پھلوں کو
یُونہی چھوڑ کے مرجاتے ہو
اے بدقسمت سادہ لوگو!
ایشیا، افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے اے لوگو!
اور اے میرے وطن کے رہنے والو!

تم جو سب سے بڑا حصّہ ہو اس دُنیا کا
اپنے ہاتھوں ہی کی طرح ہو
سوچ میں ڈوبے بوڑھے
پھر بھی اپنے ہاتھوں کے مانند ہو پُرجوش اور جوان تم
[illegible] لوگو! یورپ اور امریکہ والو
تم ہو بہادر اور پھرتیلے
پھر بھی اپنے ہاتھوں کے مانند ہو سیدھے سادے سے تم
جلد ہی دھوکا کھا جاتے ہو
آسانی سے مکر کے جال میں پھنس جاتے ہو
اے لوگو اے سادہ لوگو
بول رہے ہیں جھوٹ اگر یہ چھاپے خانے
بول رہے ہیں جھوٹ اگر اخبار کتابیں اور رسالے
بول رہی ہیں جھوٹ اگر ان گرجا گھروں کے
پادریوں کی نیک دُعائیں
بول رہی ہیں جھوٹ اگر ان سیمیں پردوں پہ لہراتی
چھم چھم کرتی
ماہ وشوں کی ننگی ٹانگیں

بول رہے ہیں جھوٹ اگر سب خواب تمہارے
بول رہے ہیں جھوٹ اگر میخانے کے مدہوش مغنّی
بول رہی ہے جھوٹ اگر وہ چاندنی شب بھی
آتی ہے جو ایک اذیّت دینے والے دن کٹنے پہ
بول رہے ہیں جھوٹ اگر الفاظ لغت کے
بول رہی ہیں جھوٹ اگر دلکش آوازیں
بول رہے ہیں جھوٹ اگر دن رات تمہارے ہاتھوں کی محنت کے ڈاکو
اور اگر ہر چیز ہے جھوٹی
اور اس جھوٹ کے اندھیارے میں
صرف تمہارے ہاتھ صداقت کی شمعیں ہیں
تو پھر اس کا مطلب یہ ہے
چاہتے ہیں وہ ـــــ ہاتھ تمہارے
مٹّی جیسے بے قیمت بے حس بن جائیں
اور اندھیرے کے مانند یہ بے نُور اور اندھے ہو جائیں
دُور رہیں یُوں عقل و خرد سے
جیسے تعاقب میں بھیڑوں کے دوڑنے والے جاہل کتّے
تاکہ نہ بھڑکیں ان میں بغاوت کے انگارے
اور ان میں احساس کی کوئی لہر نہ دوڑے
تاکہ اس ہر لمحہ بدلتی
نَو انگیز حسیں دُنیا میں
جہاں ہماری زیست کی مُہلت نہیں زیادہ
سرمائے کے جبر و تشدّد کی زنجیریں ٹوٹ نہ جائیں

سید الہی معصوم رضا

دو نظمیں ایک غزل

دِیوالی

وہ آئی
چپکے سے بولی
آنکھوں کی اندھی محرابوں میں آنسو کے دیپ جلا لو

نئی پرانی بات

بڑی بڑی رُد سیاہ آنکھیں مجھے شرارت سے دیکھتی ہیں
یہ پوچھتی ہیں
وہ بات تم کب کہو گے آخر
جو بات منت کشِ لغاتِ کہن نہیں ہے

غزل

اسی شوخِ شعلہ رو سا کوئی انتخاب لاؤ
شبِ غم گذارنی ہے، کوئی آفتاب لاؤ
کسی چہرۂ کتابی کا سُناؤ کوئی قصّہ
وہی لہجۂ تمنّا، وہی آب و تاب لاؤ
یہ چراغ جیسے لمحے یونہی رائیگاں نہ جائیں
کوئی خواب دیکھ ڈالو، کوئی انقلاب لاؤ

کاوش فرازی

تو عالم الغیب ہے

اے خداوندِ کون و مکاں
تُو نے کس شہر میں مجھ کو پیدا کیا
یہ بھرا شہر اور اس کے ہنگامہ ہائے شب و روز میں
تیری آواز سے ملتی جُلتی کوئی دلنشیں گُونج
صدیوں سے اُٹھی نہیں

اس بھرے شہر میں
دھند میں لپٹی تنہائیوں کے سوا
گوشۂ عافیت اور کوئی نہیں
شہر کی صبح کتنے ہی ارمان سے کتنی اُمید سے
روز بنتی ہے اُجلا سا اِک پیرہن
روز وہ پیرہن چاک ہو ہو کے اُڑتا ہے سُوئے اُفق
اور منڈلاتی رہتی ہیں پرچھائیاں
شہر کی رات کتنی فسُوں ساز ہے

دن کے ایوانِ صد رنگ و زرپوش سے چند بیزار لمحے چُراتی ہے
روشنی اور پُراسرار ماحول کے درمیاں
جاگ اُٹھتا ہے انسان کا وہ وجود
دن کو جو چشمِ عالم سے روپوش تھا
روشنی تیز ہے

لیکن اے مالکِ بحر و بر
بُجھ گئے ہیں وہ سارے چراغ آج کیوں
وہ جنہیں تیرے ہاتھوں نے روشن کیے
مطمئن ہیں غزالانِ دشتِ ہوس
ان کی خلوت کے تہ دار اسرار سے
کوئی واقف نہیں
کیا انہیں یہ خبر تک نہیں
کب سے خود ساختہ روشنی کی طرف
بڑھ رہی ہے بھیانک اندھیرے کی رَو
جانے کیا ہوگا تو عالم الغیب ہے
تیری آنکھیں سراپردۂ زیست میں بے حجابانہ ہر چیز کو دیکھتی ہیں!

کیلاش ماہر

"رقیبِ سر و ساماں نکلا"

لاکھوں قسمیں کھائی ہیں!
سانجھ ڈھلے ہی دفتر سے گھر آنے کی
گڈن، ببّو، بچّن کو بہلانے کی
دیوانے فنکاروں کی ٹولی میں جام نہ چھونے کی
اپنے ہنگامی کمرے میں جو ٹوٹی سی میز پڑی ہے اُس کونے میں
رات گئے شعری پیراہن سپنوں کو پہنانے کی!
لاکھوں قسمیں کھائی ہیں!

ابھی دیر ہے دو بجنے میں
ابھی رات رقصاں ہے گھر آنگن میں
آؤ شبلہ، روحنہ، کامنی
مجھے ندامت کی گہری دلدل سے باہر کھینچو
آؤ دیکھو!
مُلکِ ادب کا یہ شہزادہ فن کی بازی ہار چکا
یہ سولن کے قطرے ہیں!
جو آنسو بن کر ٹپکے ہیں
آج نشے میں ہے دیوانہ!
آج کے وعدے سچے ہیں،
آج کے وعدے سچے ہیں!

▲

انعام گلانی

ایک سانیٹ

اے گورے گالوں، کالے بالوں والی بھڑکیلی لڑکی
تو اپنی مُسکان کی کلیاں یُوں ہر اِک پر مت چھینکا کر
ورنہ تیرے رُوپ پہ جلدی چھا جائے گی رُت پت جھڑ کی
پیاسی نظروں کو نظروں کی مدرا سے یُوں مت سینچا کر

ہر یُگ میں اِن کی نظروں میں آئی ہیں کتنی نورس کلیاں
پھر بھی پیاسے کے پیاسے ہیں اِس نگری میں بسنے والے
ان کی پیاس سے سُوکھ گئی ہیں حُسن کی رستی بستی گلیاں
پھر بھی ہوس کا زہر لیئے پھرتے ہیں نظر سے ڈسنے والے

تُو الھڑ چنچل بالا ہے، تُو ان کے بَل چھَل کیا جانے
اپنی مُسکانوں، اپنی نظروں کو کچھ قابُو میں کر لے
تیرے بالوں کے کُنڈل سے اُلجھ نہ جائیں یہ دیوانے
اپنے حُسن کی ہر خوشبُو کو کچھ دن اور سنبھال کے دھر لے

وقت آنے پر اس کی مہک سے مہکے گا اِک نہ اِک آنگن
اور تمہارے دِل میں نہ ہو گی بیتے دنوں کی کوئی اُلجھن

▲▲

چندر پرکاش شاد

مُہرے

مجھے یاد ہے وہ دیوالی کی شب
تُو نے اپنے مکاں کے جھروکے میں جب
دو چراغوں کو روشن کیا تھا مجھے دُور سے دیکھ کر!
جانے اُس وقت کیا کیا خیال آ گئے تھے میرے دل میں
دِیوں کی زباں سے مجھے تُو نے کیا کچھ کہا تھا!

میں عرصے تک اُسی لمحے کی راہ تکتا رہا
جب مرا دل ترے دل کے پہلو بہ پہلو دھڑکتا
مگر وہ تو لمحہ مرے پاس سے ہو کے گزرا نہیں ہے!

میں آج اپنی اِس منزلِ زندگی پر پہنچ کر
عجب سوچ میں مُبتلا ہو گیا ہوں
یہ لمحات مُہرے ہیں شطرنج کے
جن کو اِک قوتِ غیر فانی اِدھر سے اُدھر کرتی رہتی ہے
اپنی خوشی کے لیے، نہ ہی بہتری کے لیے!

غیر فانی ہے وہ قوتِ بیکراں،
پھر بھی، ضدّی ہے وہ کس قدر لالچی ہے!!

▲

تاج مہجور

دو فنکار

تُو خالق ہے
مہکے مہکے پھول لجاتی شرماتی نورس کلیوں کا
تُو خالق ہے
بادل برکھا چاند ستاروں کے مُکھڑوں کا
بَل کھاتی اٹھلاتی گاتی ساگر کی چنچل لہروں کا
تُو خالق ہے
پیار بھرے معصُوم دِلوں اور پتّھر دِل انسانوں کا
تیری ہر تخلیق کو موت کے ظالم ہاتھ مَسَل دیتے ہیں
لیکن تُو باقی رہتا ہے
میں خالق ہوں ______
شعر و نغمہ بن کر دل میں
آپ ہی آپ سما جانے والی نکہت کا
موت کے ظالم ناگ مجھے بھی انجانے میں ڈس لیتے ہیں
لیکن میری یہ تخلیقیں
دِل میں پیار کی دھڑکن بن کر
رہتی دُنیا تک رہتی ہیں
ہم دونوں میں کون بڑا ہے؟!

▲

پونم ——— تیر انداز

ایڈیٹر کے نام

ادیبوں کے پریم پتر

★ اس بار "تیر انداز" آپ کی خدمت میں ادیبوں کے خطوط بنام ایڈیٹر پیش کر رہا ہے، چونکہ یہ نجی خطوط ہیں اسی لیے یقین ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

پروفیسر فرحت ایم۔ اے

ڈیر مسٹر ایڈیٹر!

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور خیریت سے اس لیے بھی ہوں گے کہ گزشتہ چھ ماہ سے آپ کا رسالہ بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ خیریت سے نہ ہوتے تو رسالہ اس قدر پابندی سے کیوں کر شائع کر سکتے۔ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کے رسالے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھوں، کیونکہ مجھے آپ کا رسالہ بہت پسند ہے۔ چنانچہ جب بھی سودا سلف خریدنے بازار جاتا ہوں تو دوکاندار سے کہہ دیتا ہوں کہ 'میاں خشخاش، زیرہ دھنیہ' غرض ہر شئے آپ ہی کے رسالے کے اوراق میں باندھی جائے۔ اگر کبھی اس کے پاس پوڑیاں باندھنے کے لیے آپ کے رسالے کے اوراق نہیں ہوتے تو دوسری دوکان سے سودا خریدتا ہوں۔ اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجھے آپ کے رسالے سے کس قدر پیار ہے۔ میرا اسی پیار کا نتیجہ ہے کہ میرا دوکاندار اب صرف میرے گھر کا سودا سلف باندھنے کے لیے آپ کے رسالے کا مستقل خریدار بن گیا ہے۔ چنانچہ وہ صفحات کے تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف اشیاء باندھتا ہے اور آخر میں اشیاء کی فہرست یوں مرتب کرتا ہے کہ "صفحات ایک تا دو، دھنیہ ایک چھٹانک"۔ "زیرہ دو چھٹانک" (ملاحظہ ہو صفحات ۳ تا ۴، شمارہ ۱۰، جلد ۹) ۔۔ ہلدی پاؤ سیر ——— "نوٹ: صفحات ۵ تا ۶ کے ورق میں ہلدی اس لیے نہیں باندھی گئی کہ اس پر ایک آزاد نظم شائع ہوئی تھی۔ اس ورق کو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر تلف کر دیا گیا ہے۔" (میرا دوکاندار بڑا ادب شناس ہے) اس تفصیلی فہرست کو لے کر گھر آتا ہوں۔ سامان بیوی کے حوالے کرتا ہوں، اور آپ کے رسالے کے "اوراقِ پارینہ" کا مطالعہ شروع کر دیتا ہوں۔ جب یہ صفحات ختم ہو جاتے ہیں تو بیوی سے پیسے لیتا ہوں اور پھر سودا لانے کے لیے بازار چلا جاتا ہوں۔ گویا آپ کے رسالے سے میری والہانہ محبت کے باعث یہ کہنا پڑتا ہے کہ ع

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یہ تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے کہ مجھے تمہید کو لپیٹنی نہیں آتی

لیکن اس کا مقصد آپ پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں آپ کے لیئے اور آپ کے رسالے کے لیئے اپنے دل میں بڑا خلوص رکھتا ہوں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ میں اپنا تازہ افسانہ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس افسانہ کو اپنے رسالے میں جگہ دیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاسکتا ہوں کہ اس افسانہ کی اشاعت کے ساتھ ہی آپ کے رسالہ کی تعداد اشاعت میں پچاس کاپیوں کا اضافہ ہوگا۔ کیونکہ یہ پچاس کاپیاں میں خود خریدوں گا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے پاس روانہ کروں گا تاکہ وہ مستقبل میں میرا احترام کرنے لگیں۔ ▲

نیاز بے نیازی۔ بی۔ اے۔ ال ال بی

ادب کے بے تاج بادشاہ!

یہ بندہ آپ کی خدمت میں ایک افسانہ "فرسٹ اِن فرسٹ" روانہ کر رہا ہے۔ اس افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر اعتبار سے "فرسٹ اِن فرسٹ" ہے۔ کیا بلحاظ عنوان اور کیا بلحاظ متن۔ میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ اس افسانے کو اُردو ادب میں کئی اعتبار سے "کوتلین" اہمیت حاصل ہوگی۔ مثلاً یہ میرا پہلا افسانہ جو پہلی مرتبہ میرے نام سے شائع ہو رہا ہے، اس افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیک وقت ..۲ کردار موجود ہیں جن میں سے ۹۴ فیکٹری مزدور ہیں، ۲ سپروائزر ہیں، ایک منیجر ہے، ۹۴ سیلس گرلز، پندرہ گھوڑے، پندرہ گھڑسوار، دو بندر چار گتے، ایک عدد طوطا (خورد) اور ایک عدد طوطا دکاں، ایک دھوبی، ایک حجام، ایک سیاسی لیڈر، دو سماجی کارکن اور باقی متفرق کردار ہیں۔ آپ کی نظر سے صرف چار صفحات پر مشتمل ایسا افسانہ نہ گذرا ہوگا جس میں بیک جُنبشِ قلم ..۲ کردار ٹھونسے گئے ہوں۔ گویا افسانہ کیا ہے ایک اچھی خاصی بس ہے جس میں اتنے سارے کرداروں کو بند کر دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑے سے بڑے ناول میں بھی کسی نے اتنے بہت سے کرداروں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اگر جمع بھی کیا ہو تو کوئی نہ کوئی کردار نظر بچاکر بھاگ گیا ہوگا۔ یہ تو صرف میری فنکارانہ چابکدستی کی دلیل ہے۔ "چابکدستی" اس لیئے کہ اس افسانے میں [illegible] کیا جو بار بار افسانہ کے پلاٹ سے بھاگ [illegible] تھے، لیکن میں نے ایسی چابکدستی دکھلائی [illegible] کہ راہ راست پر آگئے اور ڈلکی چال چلنے لگے۔ آپ کو افسانے میں ان کی چال یقیناً پسند آئے گی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے یہ اُردو کا واحد مختصر افسانہ ہے جس میں ..۲ کردار موجود ہیں اور اس اعتبار سے اُردو ادب کا یہ پہلا افسانہ ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کو یہ احساس ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی آبادی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ آبادی میں اضافہ کے موضوع پر بھی غالباً یہ پہلا افسانہ ہے اب آپ اس افسانے کو شائع کریں تو آپ کا رسالہ بھی غالباً ملک کا پہلا رسالہ ہوگا جسے ایسا "عجیب الخلقت افسانہ" شائع کرنے کا شرف حاصل ہوگا۔ اُمید ہے کہ آپ ایسے زرین موقع کو ضائع نہ ہونے دیں گے اور نہایت ہی قریبی اشاعت میں اسے جگہ دیں گے۔ مطلع فرمائیے کہ آپ کی سب سے قریبی اشاعت کب شائع ہو رہی ہے! ▲

زرّین بخت کمبخت۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جناب ایڈیٹر صاحب!

مجھے یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ آپ اپنا رسالہ بند کر رہے ہیں اور یہ کہ آیندہ ماہ سے آپ کے رسالہ کا کوئی شمارہ شائع نہ ہوگا مجھے یہ صدمہ اس لیئے بھی ہو رہا ہے کہ دو سال پہلے میں نے آپ کی خدمت میں جو افسانہ روانہ کیا تھا وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے اب اگر آپ کا رسالہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے بند ہو جائے تو بتائیے اب میں کہاں جاؤں۔ کس کا در کھٹکھٹاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں کس کی منت سماجت کروں۔ ہائے میں تو لُٹ گیا، تباہ ہو گیا کسے معلوم تھا کہ آپ کا رسالہ عین عالم شباب میں داعئ اجل کو لبیک کہہ بیٹھے گا اور یوں مجھے یتیم و یسیر بنا کر چھوڑ دے گا۔ اگر میرے افسانہ کی اشاعت کے بعد آپ کا رسالہ دم توڑ دیتا تو کم از کم لوگوں

حیدرآباد

علوم ہو سکتا کہ آخر رسالے کے بند ہونے کی اصل وجہ کیا تھی لیں
ے بتائے اس کا بند ہونا بُری طرح کھٹک رہا ہے۔ لہٰذا
ب میرے ذہن میں آئی ہے کہ آپ اپنے رسالہ کا ایک
صورت شائع کریں، جس میں میرا افسانہ شامل ہو۔ اس شمارہ
لنے میں جو بھی مصارف آئیں گے وہ میں برداشت کروں گا۔
بلغ دو سو روپے بطور پیشگی آپ کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر
یے جا رہے ہیں۔ افسانہ کی وصولی کی تو آپ نے کوئی اطلاع نہیں
۔ کم از کم منی آرڈر کی وصولی کی اطلاع تو ضرور دیجئے۔ فقط

اگلے شمارے میں اپنا افسانہ دیکھنے کا متمنی

کمبخت

▲

راز افشاں آبادی بی۔ اے

شریمان ایڈیٹر جی!

اگر آپ اپنا رسالہ پڑھتے ہوں تو آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ
میں میری ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ اس کے معاوضہ کے
رمیں، میں نے آپ سے خط و کتابت کی تھی تو پتہ چلا کہ آپ کو
ں اور شعرا کو ان کی تخلیقات کا معاوضہ ادا کرنے کی عادت
ہے۔ (گو یہ بڑی اچھی عادت ہے) لیکن اب میں آپ پر ایک
انکشاف کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ مجھے معاوضہ کی چنداں ضرورت
ہے۔ کیونکہ مجھے اصل میں اپنی غزل کا معاوضہ مل چکا ہے۔ اگر
پوچھیں کہ مجھے یہ معاوضہ کس طرح ملا ہے جبکہ آپ نے معاوضہ
نہ ہی نہیں کیا تو اس کے لیے آپ کو ایک داستان سننی پڑے گی
یوں تھا کہ میرا ایک دوست آپ کے رسالے کا بڑا مداح ہے
کا دعویٰ ہے کہ آپ کے رسالہ میں کوئی غیر معیاری غزل
ئع نہیں ہوتی۔ مجھے اس سے اختلاف تھا اور میں نے دعویٰ کیا
کہ آپ کے رسالہ میں غیر معیاری غزل بھی شائع ہو سکتی ہے۔
پھر اس بات پر میرے اور میرے دوست کے درمیان سو روپوں کی
رط بندھی تھی۔ اور اسی شرط کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے
سانے اپنی وہ غزل روانہ کی تھی جسے یہاں کے مقامی شعرا نے

تسلیم کر لیا تھا کہ یہ ایک غیر معیاری غزل ہے۔ چنانچہ وہ غزل آپ
کے رسالہ میں نہ صرف شائع ہوئی بلکہ آپ نے ادارہ کی جانب سے
اس پر ایک تعریفی نوٹ بھی لکھ دیا۔ اسطرح اب میں شرط
جیت چکا ہوں اور مجھے اس غزل کا معاوضہ سو روپوں کی شکل
میں مل چکا ہے۔ آپ نے اس غزل کو شائع کر کے مجھ پر بڑا احسان
کیا ہے کیونکہ جس مہینے کے شمارے میں یہ غزل شائع ہوئی ہے
اُس مہینے میں مجھے روپیوں کی شدید ضرورت تھی۔ اور سُنئیے
کیا حال ہے۔ ادھر چند دنوں سے کسی دوست نے مجھ سے شرط
نہیں باندھی ہے ورنہ اپنی کوئی تازہ تخلیق آپ کی خدمت میں
ضرور روانہ کرتا۔ خدا سے دُعا کیجئے کہ کوئی دوست مجھ سے شرط
باندھے اور میں آپ کو اپنی کوئی "غیر معیاری غزل" روانہ کر سکوں
مجھے اُمید ہے کہ اس معاملہ میں آپ کا تعاون مستقبل میں بھی برقرار
رہے گا تاکہ میرا مستقبل تابناک ہو سکے۔ خدا حافظ۔

نوٹ: میں آپ کی خدمت میں ذریعہ منی آرڈر پچاس روپے
روانہ کر رہا ہوں۔ یہ دراصل اُس شرط کی نصف رقم ہے جو میں نے
جیتی ہے۔ لہٰذا آئندہ سے اسے ایک "خفیہ معاہدہ" سمجھئے کہ جب
بھی میں کوئی غزل روانہ کروں تو یہ "ایک غیر معیاری غزل" ہوگی جس پہ
میں نے شرط باندھی ہے اور آپ اسے شائع فرما دیں تو شرط کی
آدھی رقم آپ کی اور آدھی میری۔ اسطرح ہم دونوں اپنے حریفوں
کو اُلّو بنا کر اپنے اُلّو سیدھے کر لیں گے۔ ▲

ریاض احمد۔ پٹنہ

مکرمی ایڈیٹر صاحب!

آپ کی خدمت میں "جُوتا" روانہ کر رہا ہوں (جُوتا افسانے
کا عنوان ہے) اُمید ہے کہ آپ کے معیار کے پاؤں میں فٹ
بیٹھے گا۔ اگر آپ کے معیار کے پاؤں سے بڑا ہو تو براہِ کرم اس میں
روئی ٹھونسیئے اور آئندہ اشاعت میں اس سے کام چلائیے۔ اس
سے پہلے میں نے ایک "ٹوپی" بھی روانہ کی تھی جو ابھی تک شائع
نہیں ہوئی ہے۔ قیاس اغلب ہے کہ یہ آپ کے سر پر نہ آ سکی۔

[illegible] میں شاید تو الگ بات ہے، کہیئے تو سائز بدل کر ایک اور ٹوپی روانہ کروں۔ غرض اس وقت میرا ایک عدد "جوتا" اور ایک عدد "[illegible]" آپ کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ اگر آپ انہیں شائع نہ کریں تو آیندہ مہینے "شیروانی" روانہ کروں گا۔ دیکھیں آپ کب تک ان اشیا کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ نیازمند

ستار جھنجھانوی ▲

ایڈیٹر صاحب!

آپ کا تازہ شمارہ ابھی ملا ہے۔ یہ تو اتنا تازہ اور گرما گرم ہے کہ لفافہ کھولتے ہی ہاتھوں کو جُڑ کے لگنے لگے۔ سوا اسے پڑھنے سے پہلے مجھے اسے "ریفریجریٹر" میں رکھنا پڑا۔ اس میں آپ نے میرا مضمون "تغزل حیدرآبادی سے ایک انٹرویو" بھی شائع کیا ہے رسالے کے ساتھ ہی آپ نے ایک خط بھی روانہ کیا ہے، جس میں یہ خواہش کی گئی ہے کہ میں ایک اور فاضل ادیب کو تلاش کروں اور اُس سے انٹرویو لے کر آپ کی خدمت میں روانہ کروں۔ قبلہ آپ نے تو میری حیثیت صرف "پوسٹ مین" کی بنا رکھی ہے۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر، اور یہ بھی دُرست ہے کہ مجھے انٹرویو کے لیئے کئی فاضل ادیب مل سکتے ہیں لیکن میں نے انٹرویو لینے سے توبہ کر لی ہے اور زندگی باقی رہی تو آیندہ کبھی کسی سے انٹرویو نہ لوں گا آپ کو نہیں معلوم کہ ان انٹرویوز کے باعث میری حیثیت کتنی گھٹیا اور کمتر ہو گئی ہے۔ مثلاً پرسوں ہی ایک بزرگ آئے تھے پہلے تو میرے انٹرویوز کی بڑی تعریف کرتے رہے، پھر کہنے لگے "اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا آپ مسٹر خورشید حسین، ایم ایس سی کا انٹرویو لے سکتے ہیں جو ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں کام کرتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "یہ صاحب کون ہیں، کیا کرتے ہیں اور آپ مجھے ان سے انٹرویو لینے پر کیوں مجبور کر رہے ہیں؟" تو وہ بزرگ شرماتے لجاتے بولے "بھئی بات دراصل یہ ہے کہ میری بیٹی کا رشتہ ان سے طے ہوا ہے، لیکن اب تک انہوں نے اپنی "اسم نویسی" روانہ نہیں کی۔ اگر آپ ان سے انٹرویو لے لیں تو مجھے بآسانی پتہ چل جائیگا کہ ان کے والدین کون ہیں، بچپن کہاں گزرا، بہن بھائی کتنے ہیں، کتنی بہنیں ہیں۔ ان کے مشاغل کیا ہیں وغیرہ وغیرہ"۔ تو صاحب دیکھ لیا نا۔ ہماری کیا حیثیت ہو گئی ہے لوگوں کی نظروں میں۔ لہٰذا میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ مجھے انٹرویوز لینے پر مجبور نہ کریں ورنہ میں کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاؤں گا اور پھٹے ہوئے کپڑوں کا پارسل آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ اُمید کہ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ ▲

شفیقہ پروین۔ لکھنؤ

ایڈیٹر بھیا!

ارے ہے، کیا خوبصورت نمبر نکالا ہے آپ نے کہ دیکھتے ہی طبیعت باغ باغ ہو گئی اور اس باغ میں جو ہنسی کے پھول کھلنے لگے جو اب تک تر و تازہ ہیں۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ ابھی تک معطر ہے۔ لیکن ایڈیٹر بھیا، آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے میرا افسانہ اس سالنامے میں بھی شائع نہیں کیا حالانکہ میں نے اسے پانچ سال پہلے کے "سالنامہ" کے لیئے روانہ کیا تھا۔ نہ تو آپ کا کوئی "گرامی نامہ" ملتا ہے اور نہ ہی وہ "سالنامہ" جس میں میری کہانی مجھے نظر آ جائے۔

آپ بڑے کٹھور ہیں بلکہ بڑے وہ ہیں۔ آپ کو یہ اندازہ ہی نہیں کہ میں نے وہ افسانہ کتنی محنت سے لکھا تھا۔ ہائے پانچ سال پہلے کا وہ دن، اب بھی یاد آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں جب کہ میں افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ اُس دن میں نے کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ گھر میں جھاڑو تک لگانا بھول گئی تھی۔ چنانچہ میرے شوہر اُس دن خالی پیٹ ہی دفتر چلے گئے۔ بچے بھوک سے بلکتے رہے، روتے رہے چیختے چلاتے رہے لیکن میں افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ کیا بتاؤں کہ کیسی ریماینٹک اسپرٹ میں وہ افسانہ لکھا تھا، جسے لکھنے کے بعد میں نے اپنے گھر کے سارے نظام کو تہس نہس کر دیا تھا لیکن آپ کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں۔ [illegible]

ہوتے ہیں۔ آپ کو اگر میرا افسانہ پسند نہیں آیا تھا تب بھی
کو کم از کم میرے شوہر پر رحم کرنا چاہیئے تھا کہ میں نے انہیں
فسانے کی خاطر خالی پیٹ ہی دفتر روانہ کر دیا تھا۔ ہائے اُس
ب وہ شام میں گھر واپس ہوئے تھے تو اُن کے چہرے پر
ہوائیاں اُڑ رہی تھیں (ایسی ہوائیاں میں نے آج تک اُن کے
ے پر نہیں دیکھیں) سوچتی ہوں تو دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔
پ کسی نہ کسی وجہ سے میرے شوہر سے رقابت محسوس کرتے ہیں

تو آپ کو کم از کم ان معصوم بچوں کا خیال کرنا چاہیئے تھا جنہیں روتا اور بلکتا چھوڑ کر میں افسانہ لکھنے میں مصروف تھی۔ میں نے یہ ساری باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ آپ کے اندر "انسانیت" کا جذبہ بیدار ہو اور اتنا بیدار ہو کہ آپ ایک دن میرا افسانہ شائع کر بیٹھیں۔ خیر۔ یہ میرا پریم پتر پڑھ کر کر تم ناراض نہ ہونا۔

فقط

آپ کی مُنہ بولی بہن

واہی

اسم اعظم

جو لوگ ہیں مخالفِ رسمِ مشاعرہ — اُن سے ہے میری عرض، سُنیں ایک واقعہ
ہوگی مشاعرہ کی عیاں جب افادیت — ہرگز کریں گے پھر نہ وہ اس کی مخالفت
اِک میرے دوست جن کو ہے سودائے شاعری — ہے جن کے دم سے شہر میں غوغائے شاعری
رہتے ہیں رات دِن جو فِدائے مشاعرہ — بس وہ ہیں اور مدح و ثنائے مشاعرہ
اِک بار سخت طور سے بیمار جب پڑے — بہرِ علاج آئے معالج بڑے بڑے
ممکن تھا جو علاج وہ فوراً کیا گیا — حد تو یہ ہے کہ آکسیجن بھی دیا گیا
لیکن مرض نے طُول وہ کھینچا کہ اَلاَماں — منکا ڈھلا غریب کا ہونٹوں پہ آئی جاں
بس اب وداعِ رُوح کا ہنگام تھا قریب — پڑھنے لگا تھا سورۂ یٰسین ہر طبیب
اِتنے میں ایک نبض شناس و محل شناس — آیا قریبِ شاعرِ بیمار و گُم حواس
اور جُھک کے اس نے کان میں چُپکے سے کچھ کہا — بس دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ بدل گیا
نبضِ مریض چلنے لگی اعتدال سے — جھلکی حیات جسم کے ہر خد و خال سے

انگڑائی لی جناب نے اور آنکھ کھول دی
جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا آپ کو کبھی!

حیرت تھی حاضرین کو اِس انقلاب پر — تھی عقل گُم، معالجۂ کامیاب پر
کچھ لوگ یہ سمجھنے لگے معجزہ ہوا — اور کچھ تو یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ کیا ہوا
کچھ دیر بعد میرا تجسس ہوا جو کم — اُس صاحبِ کمال سے پوچھا کہ محترم!
فرمایئے وہ اسمِ حیات آفریں ہے کیا — جس سے ہمارا شاعرِ بیمار جی اُٹھا
واللہ اُس نے موت کو دی ہے شکستِ فاش — ورنہ یہ وقت وہ تھا کہ اُٹھتی یہاں سے لاش
اُس مردِ خوش مذاق نے ہنس کر دیا جواب — ترکیب میرے ذہن کو سُوجھی یہ لاجواب
شاعر کے کان میں یہی جُھک کر کہا فقط — حضرت! مشاعرہ کا ہے آیا کہیں سے خط

فی الفور بزمِ شعر میں جانا ہے آپ کو
اُٹھئے بھی اب کلام سُنانا ہے آپ کو!

جاوید لطیف

ماما

ماما ایک باربر ہیں، لیکن انہیں اپنے پیشے سے کہیں زیادہ لبابت اور سیاست سے دلچسپی ہے۔ جس کی بدولت ان کی دوکان پیرس ہیر کٹنگ پر کبھی کبھی دواخانہ سرکاری یا پھر اسمبلی ہال کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نہ جانے ماما نے کبھی لفظ پیرس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کی بھی یا نہیں، لیکن اپنی دوکان کو پیرس سے متعلق کر کے ماما نے واقعی کمال کر دیا ہے۔ لکڑی کا ایک کھوکا سیلون میں داخل ہونے کی پہلی اور آخری سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ لوگ اتفاقاً صحیح سلامت واپس بھی ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ جو بے احتیاطی اور جلد بازی سے چڑھنے یا اترنے میں پیرس ہیر کٹنگ سیلون کے اندر یا باہر گر کر منہ کی کھا چکتے ہیں تو ماما ان سے ہمدردانہ لہجے میں فرماتے ہیں ..... "ارے ارے ..... کیا ہوا، گر گئے، ذرا سنبھل کے ..... ہوں کوئی بات نہیں، دیکھو وہ کھوکا ٹھیک سے جما دو، بس کوئی بات نہیں ....."

اور گرنے والے کو ہی، اپنے کپڑے جھاڑنے سے پہلے ماما کی دوکان کا کھوکا سلیقے سے جما دینا بھی پڑتا ہے۔ یہ تو ماما کے سیلون کی سیڑھی کا حال تھا، اب ماما کی دوکان کے بورڈ سے بھی واقفیت حاصل کر لیجئے۔ بورڈ تین زبانوں میں ہے، جس کی تحریر راجہ رانی صابن یا بندر چھاپ منجن کے اشتہار کی یاد دلاتی ہے۔ بورڈ کو جن رسّیوں سے باندھا گیا ہے ------------------- وہ بارش کے موسم اور تند و تیز ہواؤں کے وقت اچانک بورڈ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور بورڈ اس راہ سے گزرنے والوں کے سروں پر زخموں کے دو ایک نشان اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ دیتا ہے۔

دوکان میں ماما، دھوتی، کرتے میں ملبوس رہتے ہیں، اور ان کے کلین شیو چہرے پر بیزاری کا احساس جگانے والی کیفیت طاری رہتی ہے۔ آنکھوں پر چھوٹے بیضوی دائروں والی ٹوٹے فریم کی عینک اور ہونٹوں پر بھونڈے تبسم کا رقص گاہکوں کا خیر مقدم کرتا رہتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ماما اپنی مخصوص اصطلاح میں فارغ البال ہیں۔ یعنی ان کی چندیا بالکل صاف اور اس پر ہمیشہ تیل کی چمک سے چکناہٹ برقرار رہتی ہے۔



[illegible] ڈریسنگ ٹیبل بھی [illegible] ہے
[illegible] یہ ہے کہ اس کے نیچے خانے موجود ہیں
[illegible]۔ اگر کسی زور سے دھکیل دی جائے تو وہ
[illegible] ہو جاتی ہے۔ صرف ایک خانہ سلامت ہے
جس میں ماما اپنے قیمتی اوزار محفوظ رکھتے ہیں۔ کرسیاں دو ہیں
اور اتنی اونچی کہ پستہ قد گاہکوں کو گود میں اٹھا کر ہی ان پر بٹھایا
جاتا ہے۔ آگے پیچھے کے دونوں آئینے کئی جگہ سے شق ہیں اور
اندھے بھی ہیں۔ ان میں کوئی بھی آدمی مشکل سے اپنی شکل پہچان
سکتا ہے۔ بعض اوقات تو کرسی پر بیٹھتے ہی یہ شبہ ہوتا ہے کہ
پیچھے کوئی دوسرا آدمی آن کھڑا ہو گیا ہے۔ دیوار پر سلسلے
دیوی دیوتاؤں کی پرانی تصویروں کے علاوہ بعض ایسی تصویریں
بھی آویزاں ہیں جن پر مکھیوں نے سالہا سال سے جالا تان رکھا
ہے۔ ایک تصویر کے نیچے یہ تحریر ہے "حجامت سے پہلے اور
حجامت کے بعد۔" لیکن ماما کے گاہک تصویر کے بالکل برعکس نظر
آتے ہیں اور حجامت کے بعد گاہکوں کی خوبصورتی، بدصورتی میں
تبدیل ہو جاتی ہے۔

ماما کے تمام اوزار آخری جنگِ عظیم کی یادگار معلوم ہوتے
ہیں۔ ٹین کا بنا ہوا ایک کنگھا ہے جس کے دانت اس قدر
مضبوط اور نکیلے ہیں کہ جب ماما سر میں کنگھا پھیرتے ہیں تو ایسا
معلوم ہوتا ہے، جیسے سخت زمین میں ہل چلایا جا رہا ہے۔ بال
کاٹنے کی مشینیں دونوں ہاتھوں سے چلتی ہیں اور ان سب کا
نمبر شاید ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرشی باریک مشین کے
فرق کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ یوں سمجھیے کہ وہ بال کم کاٹتی ہیں اور
نوچتی زیادہ ہیں۔ اُسترے دیتا نوسی اور خام دھات کے بنے ہوئے
ہیں، جن کی دھار کے بارے میں گاہکوں کی شکایت کو دور کرنے
کے لیے ماما اکثر یہ جملہ دہراتا ہے "بھائی یہ وہ نہیں جو استر
میں دھار کم ہے، میرے ہاتھوں میں تو طاقت ہے، پہلوانی [illegible]
[illegible] پہلوانی ہاں.....!"

[illegible]
[illegible] ہے، جو [illegible] سانس پچ
ہے، تم سے ہمیشہ بال کٹواتے وقت میں نے یہی شکایت سُنی
کیا کروں، میرے پاس کا چھدن ختم ہو گیا ہے، ورنہ دم بھر میں آرام
ہو جاتا، لیکن تم واپس جاتے ہوئے اپنے بازو کی دوکان والے حکیم جی
سے گیس کو دور کرنے والی دوا ضرور لیتے جانا بھے۔"

اور جب کوئی گاہک بال کٹواتے وقت ان سے سوال کرتا کہ
"ماما تم کتنا کیوں چلتے ہو، تمہارا اُسترا گاہکوں کو ڈرانے
انداز میں کاٹتا رہتا ہے؟" تو ماما ہنس کے کہتے ہیں۔
"بھائی اس لیے کہتے ہیں کہ میری ناک کٹوانے ہی کی ٹھان
رکھی ہے۔ میری قینچی سے کبھی کبھی غلطی سے لوگوں کے ناک کان کٹ کے
گر جاتے ہیں اور اس کٹ کٹ کر ایسی کھٹنے کا چسکا پڑ گیا ہے، بس
آپس لگتے کترتا رہتا ہے!"

ماما شیو بناتے وقت گالوں پر [illegible] اور اتنی زور
سے صابن رگڑتے ہیں کہ ان کے بال اس قابل ہے کہ اپنی جڑیں چھوڑ دیتے
ہیں۔ صابن لگاتے ہوئے ماما کی نظر کبھی گاہک کے چہرے پر نہیں ہوتی
چنانچہ صابن کا کچھ حصہ گاہک کی ناک اور منہ میں گھس کر اپنا ذائقہ
چھوڑ جاتا ہے۔ [illegible] کے بعد ماما کے قوت بازو کی
کشش جب کسی [illegible] ہے تو ماما نہایت اطمینان سے
پھٹکری [illegible] زخم [illegible] چھونک دیتے ہیں۔ کبھی
کبھی [illegible] ہو جاتے ہیں اور
کبھی ماما [illegible] سے درست کرتے
[illegible] کان ہو لگتا ہے؟



[illegible] کر ماما انتہائی لاپروائی [illegible]

ایک [illegible] نگ کران کی دکان میں [illegible] آیا اور کہنے لگا ..... [illegible] ش ار کے [illegible] بنا دیں [illegible] ماما نے کہا ۔ " ہاں ہاں کیوں نہیں ، مگر [illegible] جب نوجوان کرسی پر بیٹھ گیا تو ماما نے حسب عادت اسے بھی گنج پن کا مریض قرار دیتے ہوئے پوچھا " کہو کیسے [illegible] پسند کرتے ہو " تو نوجوان نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا ۔ " جو آپ کے دل میں آئے ، بنا دیجئے " ماما نے پھرتی سے نوجوان کا سر مونڈھ دیا اور مسکراتے ہوئے فرمانے لگے : " لیجئے میرا فیورٹ کٹ ، آپ میرا منپسند کٹ بنا دوں گا ۔ ٹھیک ہے نا "

ایک مرتبہ کوئی [illegible] صاحب اپنی حجامت بنوانے کی غرض سے پیرس ہیر کٹنگ سیلون میں داخل ہوا تو ماما ان کے گنجے سر کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا :

" سیٹھ صاحب ! آپ کے سر پر تو بال ہی نہیں اگتے ۔ ان دنوں میں نے بال اگانے والی بہترین دوا تیار کی ہے ۔ [illegible] حکیم صاحب ہیں نا ، وہ تو دن رات خوشامدیں کرتے ہیں کہ مجھے بھی یہ نسخہ بتا دو ، لیکن آپ ہی بتائیے میں نے ایک [illegible] کی سیوا کر کے جو نسخہ حاصل کیا ہے اسے دوسروں کو مفت بتا دوں " اور پھر اس سے میرا بزنس بھی تو [illegible] ہے بال صاف کرنے کا برش جو آپ دیکھ رہے ہیں [illegible] تمام بال جھڑ چکے تھے میں نے اس دوا کے چند [illegible] دوا کی تاثیر نے [illegible] زندہ مثال آپ کے سامنے [illegible]

لیکن ماما ..... یہ تمہارے چمکدار تالو کے بارے میں تمہاری [illegible] لئے ہے بڑا سیٹھ سے دہاڑ گیا ۔

" یہی تو کمال ہے سیٹھ صاحب ! شاید آپ کو علم نہیں کہ میں نے بال صفا پوڈر بھی ایجاد کیا ہے ، یہ میرا سر اسی کا اشتہار ہے ، اس کی بھی قیمت ..... "

ماما اپنی فرصت کے اوقات میں پڑوسی دوکانداروں کو بھی اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ ان کے مشوروں ہی کے نتیجہ میں ایک پڑوسی تاجر پارچہ نے اپنی دوکان کا اشتہار جلی حروف میں یوں لکھوایا ہے ،

" خوشخبری ! خصوصی اعلان ۔ دو بڑے کفن خریدنے والے کو ایک چھوٹا کفن مفت دیا جائے گا ۔ موقع سے فائدہ اٹھائیے اور شوق سے تشریف لائیے ۔ نوٹ ؛ عیدبرات اور تہواروں کی مسرت میں رعایتی سیل ہوتا ہے اور ڈسکاؤنٹ بھی دیا جاتا ہے پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی "

غرض ماما کی شخصیت اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں ان کی خصلتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ، اس کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی ۔ اس لئے اب اجازت دیجئے ۔

خدا حافظ

ماما کی دوکان کا ڈریسنگ ٹیبل بھی اپنی نظیر آپ ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے جتنے خانے موجود ہیں وہ صرف آدھے ہیں۔ اگر کنگھی زور سے ڈھکیل دی جائے تو وہ فوراً زمین بوس ہو جاتی ہے۔ صرف ایک خانہ سلامت ہے جس میں ماما اپنے قیمتی اوزار محفوظ رکھتے ہیں۔ کرسیاں دو ہیں اور اتنی اونچی کہ پستہ قد گاہکوں کو گود میں اٹھا کر ہی ان پر بٹھایا جاتا ہے۔ آگے پیچھے کے دونوں آئینے کئی جگہ سے شق ہیں اور اندھے بھی ہیں۔ ان میں کوئی بھی آدمی مشکل سے اپنی شکل پہچان سکتا ہے۔ بعض اوقات تو کرسی پر بیٹھتے ہی یہ شبہ ہوتا ہے کہ پیچھے کوئی دوسرا آدمی آن کھڑا ہو گیا ہے۔ دیوار پر سلسلے دیوی دیوتاؤں کی پرانی تصویروں کے علاوہ بعض ایسی تصویریں بھی آویزاں ہیں جن پر مکھڑیوں نے سالہا سال سے جالا تان رکھا ہے۔ ایک تصویر کے نیچے یہ تحریر ہے "حجامت سے پہلے اور حجامت کے بعد"۔ لیکن ماما کے گاہک تصویر کے بالکل برعکس نظر آتے ہیں اور حجامت کے بعد گاہکوں کی خوبصورتی، بدصورتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ماما کے تمام اوزار آخری جنگِ عظیم کی یادگار معلوم ہوتے ہیں۔ ٹین کا بنا ہوا ایک کنگھا ہے جس کے دانت اس قدر مضبوط اور نکیلے ہیں کہ جب ماما سر میں کنگھا پھیرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سخت زمین میں ہل چلایا جا رہا ہے۔ بال کاٹنے کی مشینیں دونوں ہاتھوں سے چلتی ہیں اور ان سب کا نمبر شاید ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موٹی یا باریک مشین کے فرق کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ یوں سمجھیے کہ وہ بال کم کاٹتی ہیں اور نوچتی زیادہ ہیں۔ اُسترے دقیانوسی اور خام دھات کے بنے ہوئے ہیں، جن کی دھار کے بارے میں گاہکوں کی شکایت کو دور کرنے کے لیے ماما کو اکثر یہ جملہ دہرانا پڑتا ہے "بھائی پروا نہیں جو استرے میں دھار کم ہے، میرے ہاتھوں میں تو طاقت ہے، پہلوانی کر چکا ہوں پہلوانی ہاں.....!"

قینچیاں ایسی خطرناک ہیں کہ جن سے نرم و نازک بال تو کجا درختوں کی سخت ٹہنیاں بھی آسانی سے کٹ سکتی ہیں۔

ماما کے حجامت بنانے کا انداز بھی سب سے مختلف ہے۔ وہ گاہک کے گلے کے اطراف کپڑا کس کے کچھ اس طرح لپیٹ دیتے ہیں کہ گاہک کی سانسیں پھول جاتی ہیں اور ماما اطمینان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ "نہیں بابا، کپڑا کسا ہوا نہیں ہے، دراصل تمہیں گیاس کی شکایت ہے، جس کی وجہ سے تمہاری سانس پھول جاتی ہے، تم سے ہمیشہ بال کٹواتے وقت میں نے یہی شکایت سنی ہے کیا کروں، میرے پاس کا چورن ختم ہو گیا ہے، ورنہ دم بھر میں آرام ہو جاتا، لیکن تم واپس جاتے ہوئے اپنے بازو کی دوکان والے حکیم جی سے گیاس کو دور کرنے والی دوا ضرور لیتے جانا۔ سمجھے۔"

اور جب کوئی گاہک بال کٹواتے وقت ان سے سوال کرتا کہ "ماما تم کتا کیوں پالتے ہو، تمہارا کتا گاہکوں کو ڈراونے انداز میں تکتا رہتا ہے۔" تو ماما ہنس کے کہتے ہیں۔

"بھائی اس کمینے کتے نے تو میری ناک کٹوانے ہی کی ٹھان رکھی ہے۔ میری قینچی سے کبھی کبھی غلطی سے لوگوں کے ناک کان کٹ کے گر جاتے ہیں اور اس کمبخت کو انہیں کھانے کا چسکا پڑ گیا ہے، بس آس لگائے گھورتا رہتا ہے۔"

ماما شیو بناتے وقت گالوں پر اس قدر دیر تک اور اتنی زور سے صابن رگڑتے ہیں کہ آدھے بال اس عمل سے ہی اپنی جڑیں چھوڑ دیتے ہیں۔ صابن لگاتے ہوئے ماما کی نظر کبھی گاہک کے چہرہ پر نہیں ہوتی چنانچہ صابن کا کچھ حصہ گاہک کی ناک اور منہ میں گھس کر اپنا ذائقہ چھوڑ جاتا ہے۔ اُسترے کی ناکافی دھار اور ماما کے قوتِ بازو کی کشمکش جب کوئی چرکا لگا دیتی ہے تو ماما نہایت اطمینان سے پھٹکری کُل کے زخم میں گویا مرچیں سی جھونک دیتے ہیں۔ کبھی کبھی مونچھیں رکھنے والے اپنی مونچھوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ماما مونچھوں کی نوک پلک کچھ اس انداز سے درست کرتے ہیں کہ گاہک کو اپنے آپ پر شنکر دیال کے کارٹونوں کا گمان ہونے لگتا ہے!

شیو کے شروع سے اختتام تک ماما گاہک کو، ڈاکوؤں،
ں، بھوتوں، چڑیلوں کے ڈراؤنے اور خوفناک قصے سُناتے
ہتے ہیں، جس کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر محسوس طور پر گاہک کے
بت اور خوف سے رُونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ داڑھی کے
ں کی کھونٹیاں خود بخود باہر نکل آتی ہیں جن کو ماما انتہائی لاپروائی
سان کرتے جاتے ہیں۔

ایک بار ایک فلم زدہ نوجوان جھٹک کر ان کی دکان میں
س آیا اور کہنے لگا .... "کیا آپ فلم سٹار کٹ بال بھی بناتے ہیں؟"
نے کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں، مزے سے بناتے ہیں" جب نوجوان کرسی
بیٹھ گیا تو ماما نے حسب عادت اسے بھی گیا بس کا مریض قرار دیتے
ہوئے پوچھا۔ "کہو کونسے فلم سٹار کٹ کو پسند کرتے ہو؟" تو نوجوان نے
ی لاپرواہی سے جواب دیا۔ "جو آپ کے دل میں آئے، بنا دیجئے"
ماما نے پھرتی سے نوجوان کا سر مونڈھ دیا اور مسکراتے ہوئے
نے لگے: "لیجئے یہ یول برنر کٹ، آئندہ راجکپور کٹ بناؤں گا۔
ب ہے نا؟"

ایک مرتبہ کوئی موٹا آسامی اپنی حجامت بنوانے کی غرض سے
ں ہیر کٹنگ سیلون میں داخل ہوا تو ماما نے اس کے گنجے سر کا استقبال
تے ہوئے فرمایا:

"سیٹھ صاحب، آپ کے سر پر تو بال ہی نہیں اُگتے۔ ان
میں نے بال اُگانے والی بہترین دوا تیار کی ہے۔ بنجل دالے
صاحب ہیں نا، وہ تو دن رات خوشامدیں کرتے ہیں کہ مجھیا ہمیں
اور نسخہ بتا دو، لیکن آپ ہی بتلایئے میں نے ایک سنیاسی کی سیوا
سے جو نسخہ حاصل کیا ہے اسے دوسروں کو مفت بتا دوں، اور
اس سے میرا بزنس بھی تو متاثر ہوتا ہے۔ یہ بال صاف کرنے کا
جو آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے تقریباً تمام بال جھڑ چکے تھے
نے اس دوا کے چند قطرے برش پر ٹپکا دیئے، پھر کیا تھا
ی تاثیر نے وہ جادو کیا کہ دوسرے ہی دن برش بالوں سے بھر گیا
مثال آپ کے سامنے ہے، قیمت .... قیمت ......"

لیکن ماما ..... یہ تمہارے چمکدار تالو کے بارے میں تمہاری
کیا رائے ہے؟" سیٹھ سے رہا نہ گیا۔

"یہی تو کمال ہے سیٹھ صاحب! شاید آپ کو علم نہیں کہ میں
نے بال صفا پوڈر بھی ایجاد کیا ہے، یہ میرا سر اسی کا اشتہار ہے،
اس کی بھی قیمت ......"

ماما اپنی فرصت کے اوقات میں پڑوسی دوکانداروں کو
بھی اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے
مشوروں ہی کے نتیجہ میں ایک پڑوسی تاجر پارچہ نے اپنی دوکان کا
اشتہار جلی حروف میں یوں لکھوایا ہے:

"خوشخبری! خصوصی اعلان۔ دو بڑے کفن خریدنے والے
کو ایک چھوٹا کفن مفت دیا جائے گا۔ موقع سے فائدہ اُٹھایئے
اور شوق سے تشریف لایئے۔ نوٹ: عید برات اور تہواروں کی
مسرت میں رعایتی سیل ہوتا ہے اور ڈسکاؤنٹ بھی دیا جاتا ہے
پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"

غرض ماما کی شخصیت اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک مختصر
سے مضمون میں ان کی خصلتوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، اس کے لئے
تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے اب اجازت دیجئے۔

خدا حافظ

از: آر۔ ایل۔ گپتہ
ترجمہ: م۔ ع۔ باسط

طلاق

دُنیا کی نظر میں

ایک رومن نوجوان کو جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اس کے دوستوں نے بُرا بھلا کہا اور مختلف سوالات کیے۔ "کیا وہ پاک دامن نہیں تھی؟ — "کیا وہ خوبصورت نہیں تھی؟ کیا وہ وفادار نہیں تھی" جواباً اس نے اپنا جوتا اُتارا اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ نیا اور عمدگی سے بنا ہوا نہیں ہے۔ لیکن تم میں سے کوئی بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ میرے پیر کو کس مقام پر کاٹتا ہے؟"

جب شادی کا مقدس بندھن پھانسی کا پھندہ بن جاتا ہے تو صرف ایک مُصیبت زدہ شوہر یا ستم رسیدہ بیوی کو ہی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ "جوتا کہاں کاٹ رہا ہے؟" پلاٹارچ کی بیان کردہ اس کہانی میں طلاق کے ایک کیس کا مختصراً لیکن جامع طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ شادی بیاہ کو سماج میں باقاعدہ اور با اُصول جنسی زندگی گزارنے کا لازمی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ ناقابلِ برداشت ہو جائے تو اس کا واحد علاج طلاق ہے۔

اگر ہم ساری دُنیا میں طلاق لینے کے طریقوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ طلاق کن وجوہات کی بنا پر لی اور دی جاتی ہے۔ بعض صُورتوں میں طلاق کی [illegible]

سنجیدہ اور معقول! طلاق کے عام رواج اور مقبولیت کے باوجود آج بھی ایسی قومیں ملتی ہیں، جن میں طلاق کا طریقہ رائج نہیں سیلون کے قدیم ودا قبائل، کانگو کے باہوانا قبائل، برازیل کے بعض سُرخ ہندی قبائل، بحرالکاہل کے جزیرے چیاتم کے لوگوں اور ہند چینی کے لی سو قبائل میں طلاق کا قطعاً رواج نہیں ہے۔

ہسپانیہ، ایری، مالٹا، برازیل، چلی اور کولمبیا میں بھی طلاق مُروّج نہیں ہے۔ جن ممالک میں طلاق کا طریقہ رائج ہے ان میں انگلستان کا نام بیحد اہمیّت کا حامل ہے۔ یہاں طلاق کے قوانین برخلاف دوسرے ممالک کے بہت ہی سخت ہیں مثال کے طور پر یہاں خاوند یا بیوی فریقین میں سے کسی کے ناجائز جنسی تعلقات کی بنا پر تین سال تک ایک دوسرے سے علٰحدہ رہنے کی بنا پر یا ۵ سال تک جبر و تشدّد اور پاگل پن کو برداشت کرتے رہنے کی وجہ سے طلاق حاصل کی جا سکتی ہے۔ نیز صرف بیوی ہی کو اپنے شوہر پر وحشیانہ سلوک کرنے اور اغلام بازی کا مرتکب ہونے کے الزامات عائد کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ شادی ہونے کے بعد تین سال تک کی مُدت تک طلاق کی

درخواست قبول نہیں کی جاتی۔ مختلف ممالک میں طلاق کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ میں طلاقوں کی شرح دیگر ممالک سے نسبتاً زیادہ ہے۔

ملک کا نام	طلاقوں کی شرح فی ہزار
عدن	۷٫۷۱
جاپان	٫۸۷
ہوائی	۲٫۴۱
فرانس	٫۶۷
مغربی جرمنی	٫۹۵
سویڈن	۱٫۲۰
ترکی	۱٫۴۳
انگلستان اور ویلز	٫۴۳
مصر	۳٫۲۴
اسرائیل (صرف یہودی)	۱٫۴۳
ڈنمارک	۱٫۵۲
سوئٹزرلینڈ	٫۹۰
آسٹریا	۱٫۳۲
ممالک متحدہ امریکہ	۲٫۳۵
جزیرہ ورجین	۲٫۳۵

مسلمانوں میں طلاق دینے کا حق صرف مردوں ہی کو حاصل ہے کسی بیوی کے لیئے اپنے شوہر کو طلاق دینا قطعی ناممکن ہے چونکہ مسلم سماج میں بڑی ہی آسانی سے طلاق دی جاسکتی ہے اس لیئے مسلم ممالک میں طلاقوں کی شرح نسبتاً اونچی ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں جس کی آبادی تقریباً ۲۳ ملین ہے ۱۹۵۲ء میں ستر ہزار طلاقیں دی گئیں۔

موجودہ زمانے کے بیشتر غیر ترقی یافتہ قوموں میں طلاق کا رواج بہت عام ہے۔ ان میں جزائر مالدیو کے لوگ، شمال مغربی بورنیو کے سی ڈیاک، کراچی کے پاپون، بحرالکاہل کے جزائر مارشل کے باشندے، بولیویا کے بعض سرخ ہندی قبائل، سائبریا کے چک چی قبائل، بحرالکاہل کے مجمع الجزائر، سالمنس کے دو جزیروں یوکا اور یوگین ولی کے باشندے اور جنوبی سوڈان کے نوبا قبائل شامل ہیں۔

لیکن دنیا میں کچھ ایسے غیر ترقی یافتہ قومیں بھی موجود ہیں جن میں طلاقوں کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ ان میں سکم کے لپ چا قبائل، آسام کے پہاڑی قبائل جیسے ناگا اور کرکی، مادری اور شمالی امریکہ کے بعض سرخ ہندی قبائل اور مسائی کے افریقی قبائل شامل ہیں۔ ان قوموں میں جہاں آسانی سے طلاق دی جاسکتی ہے، ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج بھی پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے کسی کی بیوی کے دوسرے مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور یہ طلاق کا سب سے عام سبب ہے۔ بعض قوموں میں عملی طور پر اس طرح کے امکانات نہیں پائے جاتے اور نہ ہی زندگی بھر ایک دوسرے کے ہی ہو کر رہنے کا معاہدہ کیا جاتا ہے۔

طلاق کی عموماً دو وجوہات ایسی ہیں جنہیں تقریباً ساری دنیا میں تسلیم کر لیا گیا ہے اور وہ ہیں بانجھ پن اور ناجائز تعلقات۔ ان کے علاوہ طلاق لینے کی بعض عام وجوہات بھی ہیں جن کی مختصر سی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کسی مذہبی تنظیم میں شریک ہو کر ترک دنیا کرنا	ہندوستان
جنسی بیماری	ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستیں الیانس اور کنکٹی، برطانیہ ڈنمارک، ناروے، ہندوستان
برگی	برطانیہ، ناروے، ہندوستان
جزام	ہندوستان (زہریلی اور ناقابل علاج شکل)
بانجھ پن	ناروے، پرتگال، جرمنی

	سوئٹزرلینڈ، ہندوستان پاکستان۔
اولاد کو جنم دینے سے انکار (معنوی بانجھ پن)	فرانس، بلجیم، ہالینڈ، کنکٹی کٹ کی ریاستیں، الاس، منی سوٹا، مسی سی پی، نبراسکا، نیوجرسی اور اوہیو
جنسی کمزوری	کناڈا کے بعض حصے، نووا اسکوشیا، نیوبرنزوک، آسٹریلیا، ممالک متحدہ امریکہ (بیشتر ریاستیں)
فریقین میں سے کسی ایک کی مخصوص وقفہ کیلئے جدائی	برطانیہ اور نیوزی لینڈ (۳) سال، ڈنمارک (۲) سال، ہندوستان (۳) سال
ظلم و تشدد (بُرا سلوک)	یورپ کے ایسے بیشتر ممالک میں جہاں طلاق کا رواج ہے، ممالک متحدہ امریکہ، ہندوستان
عادتِ شراب نوشی	برما کی ریاست شان، ممالک متحدہ امریکہ کی ۴۹ میں سے ۳۰ ریاستیں، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ
تبدیلی مذہب	ہندوستان، کنٹکی اور نیو ہیمپشائر (ممالک متحدہ امریکہ)
اغلام بازی اور وحشیانہ سلوک	آسٹریلیا، کناڈا کے بعض صوبے، ہندوستان

ہندوستان، بلجیم، ناروے، سویڈن، یونان، نیوزی لینڈ اور پناما میں فریقین کو ایک دوسرے کی مرضی سے طلاق حاصل کرنے کا حق ہے۔ باہمی رضامندی سے طلاق لینے کے طریقہ کی اس بنا پر مخالفت کی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے طلاقوں کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے گذشتہ ساٹھ برسوں کے دوران میں طلاقوں کی تعداد میں بیحد اضافہ ہوتا رہا ہے۔ مغربی ممالک میں تو طلاقیں کسی متعدی مرض کی طرح عام ہو گئی ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان میں ۱۹۱۴ء میں (۸۵۹) طلاقیں ہوئیں، ۱۹۲۱ء میں ۳۵۲۲، ۱۹۲۸ء میں چار ہزار اور ۱۹۴۰ء میں ۴۷،۱۷۴۔ غالباً یہ بیمار اور اخلاقی اعتبار سے زوال پذیر معاشرہ کی علامتیں ہیں۔

طلاقوں کی تعداد میں اضافہ کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ موجودہ دَور کی عورتیں معاشی طور پر زیادہ سے زیادہ خود مختار ہوتی جا رہی ہیں۔ معاشی خود مختاری کے ساتھ ساتھ عورتوں کی سماجی آزادی میں بھی دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جس کے نتیجہ میں موجودہ دَور کی عورت شادی شدہ زندگی میں مرد کے برابر رتبہ حاصل کرنے کے لیئے کوشاں ہے۔ اگر اسے یہ رُتبہ نہ ملے تو وہ طلاق لینے کی کوشش کرتی ہے۔ طلاقوں میں اضافہ کا ایک سبب کم عُمری کی شادیاں اور جنسی کمزوری بھی ہے۔ جن کے نتیجہ میں خاوند اور بیوی ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتے۔

طلاق کی وجہ سے سب سے زیادہ فریقین کی اولاد متاثر ہوتی ہے۔ وہ بے قصور رہتے ہوئے بھی ماں باپ کے پیار اور شفقت سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ ان بدقسمت بچوں کا مسئلہ دوہری نوعیت کا ہے یعنی معاشی اور جذباتی۔ طلاق کے قوانین میں طلاق حاصل کرنے کے بعد قصوروار فریق سے مصارفِ زندگی حاصل کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ ان کا مستقبل تاریک نہ ہو۔ فرانس میں قصوروار شوہر یا بیوی کے لیئے اپنی آمدنی کا ایک تہائی حصہ دینا لازمی ہے۔ برطانیہ میں اس معاملہ کو عدالت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں عدالتیں اس رقم کا تعین کیس کی نوعیت کے اعتبار سے کرتی ہیں۔ زیکوسلواکیہ میں یہ قانون ہے کہ اگر طلاق کی وجہ سے چھوٹے بچوں کے مفادات متاثر ہوتے ہوں تو طلاق کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ پیراگوئے کے منگوا قبائل سے تعلق رکھنے والے*

* سُرخ ہندیوں اور برما کے کیرن قبائل میں بچہ پیدا ہو جانے کے بعد زن و شوہر کو طلاق کی اجازت ہی نہیں دی جاتی۔ ▲

مدیونم۔ حیدرآباد

اعجاز قریشی

فلم
دوستی پر ایک نظر

نئے زاویئے سے

ہمارے ملک میں روایتی اور فارمولہ فلمیں بنانا تجارتی مقصد ہوا ہے۔ تجارتی مقصد کے لیئے ہی فلم بینوں کا ذوق خراب کیا جاتا ہے لو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور تفریحی بنانے کے لیئے ڈرامہ آرٹ اور نٹ کے تقاضوں پر توجہ کرنے کی بجائے بکس اپیل پر زیادہ زور دیا جاتا ہ، خواہ وہ رومانی منظر کو غیر ضروری تفصیل کے ساتھ پیش کر کے اور فلم یکھنے والوں کے جنسی جذبات کو مشتعل کیا جائے یا سطحی قسم کی جذباتیت ر پند و نصایح یا تقاریر کے انداز ہیں، مکالمہ بازی کے ذریعہ مسلط کی ئے۔ اس صورتحال کے لیئے کون کس حد تک ذمہ دار ہے، فن اور یارت کے تقاضوں میں ٹکراؤ کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟ فلم بنانے والوں کی اپنی کیا مجبوریاں اور دشواریاں ہیں اور دیکھنے والوں پر کس حد تک وش عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک علحدہ بحث ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا بلکہ یقین کیا جاتا ہے کہ نامور فلمی ستاروں کے بغیر اور روایتی انداز، روایتی لوازمات اور عناصر کے بغیر کوئی فلم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لیکن ستین بوس ور تاراچند برجیہ نے دوستی پیش کر کے روایت کے اس بت کو توڑا ہے۔ یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ اس طرح کا جرأت مندانہ اقدام کامیاب ہوا ہے۔ بلند حوصلگی کی یہ کوئی پہلی مثال نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی چھی اور معیاری بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دوستی سے زیادہ اچھی، زیادہ ستھری اور زیادہ معیاری فلمیں بھی بے حد مقبول ہوئی ہیں لیکن دوستی کے تعلق سے خاص بات یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ اس میں فلمساز اور فیناانسر نے بڑے فلمی ستاروں کے بغیر ایک غیر روایتی اور پاک صاف فلم کو کامیاب بنانا اپنا تجارتی مقصد بنا لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض تجارت اور منافع پر ہی نظر رکھ کر فلم بنانے والے اور فلم کی سرمایہ کاری میں حصہ لینے والے اگر اس قسم کی ستھری اور مقصدی فلموں کو کامیاب بنانا اپنا تجارتی مقصد بنا لیں تو اس سے ہندوستانی فلمی صنعت کو فائدہ پہنچے گا اور ارٹ پٹانگ قسم کے بے ہنگم روایتی فارمولہ تفریحی فلموں کے ہجوم میں ایسی فلمیں بھی دیکھنے کو ملیں گی، جو روایتی چمک دمک نہ ہونے کے باوجود متاثر کر سکتی ہیں، جو ہیرو ہیروئن کی روایتی اچھل کود اور روایتی رومانی مناظر اور ہیرو ہیروئن کی مختلف زاویوں سے عکاسی نہ ہونے کے باوجود محض زندگی کے واقعات اور انسانی جذبات کو سچے خلوص، محنت اور لگن کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے فلم دیکھنے والوں پر گہرے نقوش چھوڑ سکتی ہیں۔

ہمارے ملک میں اچھے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں کا کال نہیں ہے۔ فلم سے متعلق مختلف فنی شعبوں میں تو ایک سے ایک بڑا فن کار موجود ہے۔ لیکن اچھی ستھری اور غیر روایتی فلمیں بنانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فیناانسر ڈسٹری بیوٹر اور اکثری ثابت ہوتے ہیں۔ تاراچند جی کے سامنے یہ مسئلے نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے ڈسٹری بیوٹر ہیں۔ بھاری سرمایہ مشغول کرنا ان کے لیئے معمولی بات ہے۔ نمائش کا بہترین سے بہترین انتظام کرنا ان کے لیئے

نسبتاً بہت آسان ہے۔ ان سہولتوں اور مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ایک پاک صاف اور غیر روایتی فلم کو کامیاب بنانا اپنا تجارتی مقصد بنالیا۔ دوستی کی نمائش کو شروع ہوئے ابھی چند ہی ہفتے گذرے ہیں لیکن یہ فلم کامیابی کی راہ پر چل نکلی ہے۔

دوستی میں بڑے فلمی ستارے نہیں ہیں نئے یا غیر معروف اداکار ہیں۔ دوستی کی کہانی لڑکا لڑکی کی کہانی نہیں، اس میں کوئی روایتی ویلن نہیں۔ اس کے باوجود اس فلم میں جو کردار ہیں وہ ایک عام فلم بین کو متاثر کرتے ہیں۔ فلم دیکھنے کے بعد ہیرو ہیروئن کے عشقیہ مناظر نہ ہونے کے باوجود تشنگی کا احساس نہیں رہتا۔ فلم کے ایک کردار اندھے لڑکے کو اپنے دوست لنگڑے ہونہار لڑکے سے عشق کی حد تک دوستی ہے شرافت، ایثار، ——— سچی انسانیت اخلاص اور معقولیت پسندی کا یہ کردار اچھا نمونہ ہے۔ اس کردار کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنوعی پن بہت کم ہے اور یہ ایک زندہ کردار معلوم ہوتا ہے۔ دوستی کی کہانی میں بہت سی خامیاں ہیں۔ کردار سازی میں لکھنے والے اور پیش کرنے والوں نے جگہ جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن فلم کا مجموعی تاثر اتنا گہرا ہے کہ یہ تمام خامیاں اور کوتاہیاں پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور ایک عام فلم بین بھی گہرے اثر کو قبول کئے بغیر سینما ہال سے واپس نہیں ہوتا۔ دوستی کی ایک اہم خصوصیت اس کی موسیقی ہے۔ نئے لیکن ابھرتے ہوئے موسیقار لکشمی کانت پیارے لال نے اس فلم کو اپنے لئے بھی شہرت اور کامیابی کی بلندی تک پہنچنے کے لئے ایک زینہ تصور کر کے بہت محنت کی ہے۔ گانے عام طور پر موقع محل کے مطابق ہیں۔ بعض دھنوں پر اتنی محنت کی گئی ہے کہ وہ گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔ "آواز میں نہ دوں گا" بلاشبہ اس سال کے چند بہترین فلمی گانوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ مزید دو تین گانے بہت اچھے ہیں۔ دھنیں ترتیب دینے والوں اور گانے والوں نے ان گانوں پر جو توجہ کی ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ توجہ شاعر مجروح سلطان پوری نے بھی کی ہے اور موقع و محل اور دھنوں کی مناسبت سے بہت مناسب لفظوں میں انہیں شعری جامہ پہنایا ہے اتنی کامیاب فلمی شاعری کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس فلم کی کامیابی کا کچھ اور ہی راز ہے۔ یہ وہ گر ہے جس سے ہر اچھا اور ایماندار تاجر کو واقف ہونا چاہیے۔ تاراچند برجاتیہ نے بڑے ستاروں پر پانی کی طرح روپیہ صرف نہیں کیا۔ عالیشان اور پر تکلف سیٹس پر اپنی دولت پانی کی طرح نہیں بہائی۔ انہوں نے نئے اور کم شہرت رکھنے والے اداکاروں اور فن کاروں کی خدمات حاصل کر کے ایک ایسے تجربہ کار اور معیاری ہدایت کار کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جو اس ٹائپ کی فلموں کے لئے اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہدایت کار ہے ستین بوس، جس کی اسی ٹائپ کی فلم جاگرتی بھی باکس آفس پر بے حد کامیاب رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا جانا چاہیئے کہ دوستی، جاگرتی کا چربہ ہے۔ دوستی اور جاگرتی میں بہت فرق ہے۔ دوستی کی فلمبندی مکمل کرنے تک صرف ۶ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ ان دنوں ایک مشہور فلم اسٹار کے لئے ہی اتنی رقم صرف کی جا سکتی ہے لیکن چھ لاکھ روپے میں وہ فلم تیار ہو گئی، جسے تقسیم کنندوں اور نمائش کنندوں نے سارے ملک کے بیسیوں مراکز میں ایک اے ون فلموں کی طرح بہت بڑے پیمانے پر نمائش کے لئے پیش کیا۔ فلم کے نگیٹیو پر تو فلمساز کو صرف ۶ لاکھ روپے صرف کرنے پڑے لیکن اتنے بڑے پیمانہ پر اور بہت زیادہ مقامات پر ایک ساتھ نمائش کے لئے پیش کرنے کی غرض سے زیادہ تعداد میں پرنٹ نکلوانے ضروری تھے جن پر مزید ۷ لاکھ روپے صرف ہو گئے۔ اگر صرف اسی اہتمام کو کافی سمجھا جاتا اور فلم ریلیز ہو جاتی تو (۱۳) لاکھ روپے بھی ہاتھ سے نکل جاتے۔ چنانچہ اس فلم کی پبلسٹی پر مزید (۱۲) لاکھ روپے صرف کئے گئے۔ ان تمام تفصیلات کی وجہ سے ہی میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فلم بنانے والوں نے ایک صاف ستھری اور غیر روایتی فلم ضرور بنائی لیکن اسے تجارتی اساس پر کامیاب بنانے کو بھی اپنا مقصد بنا لیا۔ اگر ہمارے دوسرے بڑے فلمساز اور فینانسر اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے بڑے ستاروں کے بغیر معیاری ستھری اور مقصدی فلمیں بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ فلمیں کامیاب نہ ہوں۔ اس قسم کی فلمیں نئے اور ابھرتے ہوئے ستاروں اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی کا باعث بھی نہیں گی اور "اسٹار سسٹم" کو بھی ان سے کاری ضرب پہنچے گی یہ فلمیں جہاں اچھے مقاصد کو آگے بڑھائیں گی وہیں ان کی وجہ سے فلمی صنعت کو در پیش معاشی بحران اور مشکلات میں بھی کمی ہو سکے گی۔ اچھے موضوع اور اچھے مقصد سے دوستی

* مہنگی ثابت نہیں ہو سکتی لیکن بشرطیکہ ہے کہ اس قسم کی ہر مساعی اپنے طور پر مکمل جاندار اور مخلصانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طرح سے منظم اور منصوبہ بند بھی ہو ▲

آئینے

تبصرے کے لیئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

نوائے ظہیر

سید ظہیر جعفری کی دس غزلوں، دو متفرق اشعار اور پانچ قطعات کے علاوہ اُن کے والد قہر جعفری مرحوم کے ایک یدہ در تہنیت حضرت علی کرم اللہ وجہٗ ایک قطعہ چہر چھ فارسی رباعیات پر مشتمل "نوائے ظہیر" جو صرف اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مرکز ادب رحوارہ) بھوپال سے شائع ہوا ہے، جس کی قیمت ایک روپیہ بہت زیادہ ہے۔ یہ مجلد تعارفی انتخاب سید محمود الحسینی کے پیش لفظ کے علاوہ چند سطری ؤ پانچ اہلِ قلم حضرات کی آراء سے عبارت ہے۔ جس میں کوثر چاندپوری، محمد علی تاج، شفا گوالیاری وغیرہم شامل ہیں۔ ظہیر صاحب نے آخر میں کچھ اپنے بارے میں زیر عنوان بھی ارقام فرمایا ہے۔ سب سے آخر میں ایک منظوم قطعہ تاریخ بھی مندرج ہے۔ غرض استقدر شعری و نثری نیرنگیوں اور نو رنگیوں کے باوصف نوائے ظہیر وہ آب وتاب نہیں ملتی جو قارئین کے شعری ذوق کو جگمگا سکے۔ یوں تو ظہیر صاحب کے کلام میں جذبات کی آنچ اور لہجے کی کسک دُور دُور تک نہیں ملتی۔ کے باوجود اُن کے نکھرے ہوئے ادبی شعور اور شعری صلاحیتوں سے مستقبل میں اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ظہیر کے دو اچھے شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ رنگِ رُخ پہ تقدس، یہ مصحفِ عارض ؎ مری نظر میں خدا کی کتاب ہے ساقی
ہم ہیں صُورت گرِ حیاتِ ظہیر ؎ ہم سے باقی ہے زندگی کا وقار

(وقار خلیل)

سہ ماہی نخلستان

ساہتیہ اکیڈمی راجستھان نے اُردو کا ایک رسالہ سہ ماہی "نخلستان" اودے پور جاری کیا ہے جس کا پہلا شمارہ یل و جولائی ۱۹۶۴ء ایک سو چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر پریم شنکر سریواستو اور عابد حسین ادیب مجلسِ ادارت میں شامل ہیں۔ رسالہ بیک نظر اچھی تحریروں سے ارستہ ہے۔ مضامین نظم و نثر مجموعی طور پر معیاری خصوصیات کے حامل ہیں۔ ستیہ پرکاش شوق کا انٹرویو جو فراق گورکھپوری سے لیا گیا تھا قریب قریب نصف درجن ائل میں چھپ چکا ہے۔ شوق صاحب سے التماس کروں گا کہ انٹرویو کی بجائے فراق صاحب کے فن کے تعلق سے کوئی فکر انگیز مضمون سپرد قلم فرمائیں تا کہ فراق صاحب شاعری کے مختلف گوشے سامنے آسکیں۔ ثاقب لکھنوی کی شاعری، اختر شیرانی کی نثر نگاری اور راجستھان کے قدیم اخبارات پر جو مضامین نخلستان میں شامل ہوگئے ہیں وہ ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ رسالے میں ایک ڈرامہ اور تین افسانے ہیں جو کسی حد تک ٹھیک ہیں۔ نظموں کے باب میں راجستھان کے شعراء افکار معیاری اور ترقی پذیر رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ خصوصاً رئیس اجمیری، جمیل قریشی، خلیل تنویر، کیف بھوپالی، راجہ مہدی علی خاں، اور محمود سعیدی جالا کی نگارشات خوب ہیں۔ البتہ غزلوں کا حصہ بیحد کمزور ہے۔ صرف حرمت الاکرام اور خواجہ شوق کی غزلیں عمدہ ہیں۔ ہمارے فن کار کے زیر عنوان متون کرتری نے سید فضل المتین کا تعارف کرایا ہے اور ان کے فنِ سخن پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ادبی خبرنامہ سے پہلے روایاتی اور تہنیتی خطوط ہیں ہیں۔ جب کہ اداریہ میں نخلستان کے اجراء کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ "نخلستان کی اشاعت کا مقصد اُردو ادب کی خدمت اور یندگی ہے اور ساتھ ہی ساتھ راجستھانی ادیبوں کی تخلیقات کی نشر و اشاعت کا مسئلہ بھی اہم ہے۔" اس لیئے ادارہ کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اُردو ادب کی خدمت اور نمائندگی کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال ضرور رکھے کہ رسالہ کا ادبی معیار گھٹنے نہ پائے۔ (وقار خلیل)

(٨) برس بیت گئے — اور اب

آٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر لڑکی ... کہلاتی ہے ....

...... لیکن وہ دور گذر چکا جب کہ بچپن کی شادی کا رواج تھا۔ آج کل آٹھ برس کی ذہین لڑکی تحتانی تعلیم مکمل کر لیتی ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کی عمر بھی آٹھ برس کی ہو چکی ہے اور اب یہ منصوبہ بندی کا ابتدائی مرحلہ طے کرتی ہوئی اس مرحلے میں داخل ہو رہی ہے جسے ہم "وسطانی درجہ" کہہ سکتے ہیں، اس عزم کے ساتھ کہ آئندہ منصوبوں کے تحت اعلیٰ سے اعلیٰ تر مدارج طے کرلے، لیکن آئیے اس وقت ہم اس کی پہلی کامیابیوں پر ہی ایک نظر ڈال لیں :

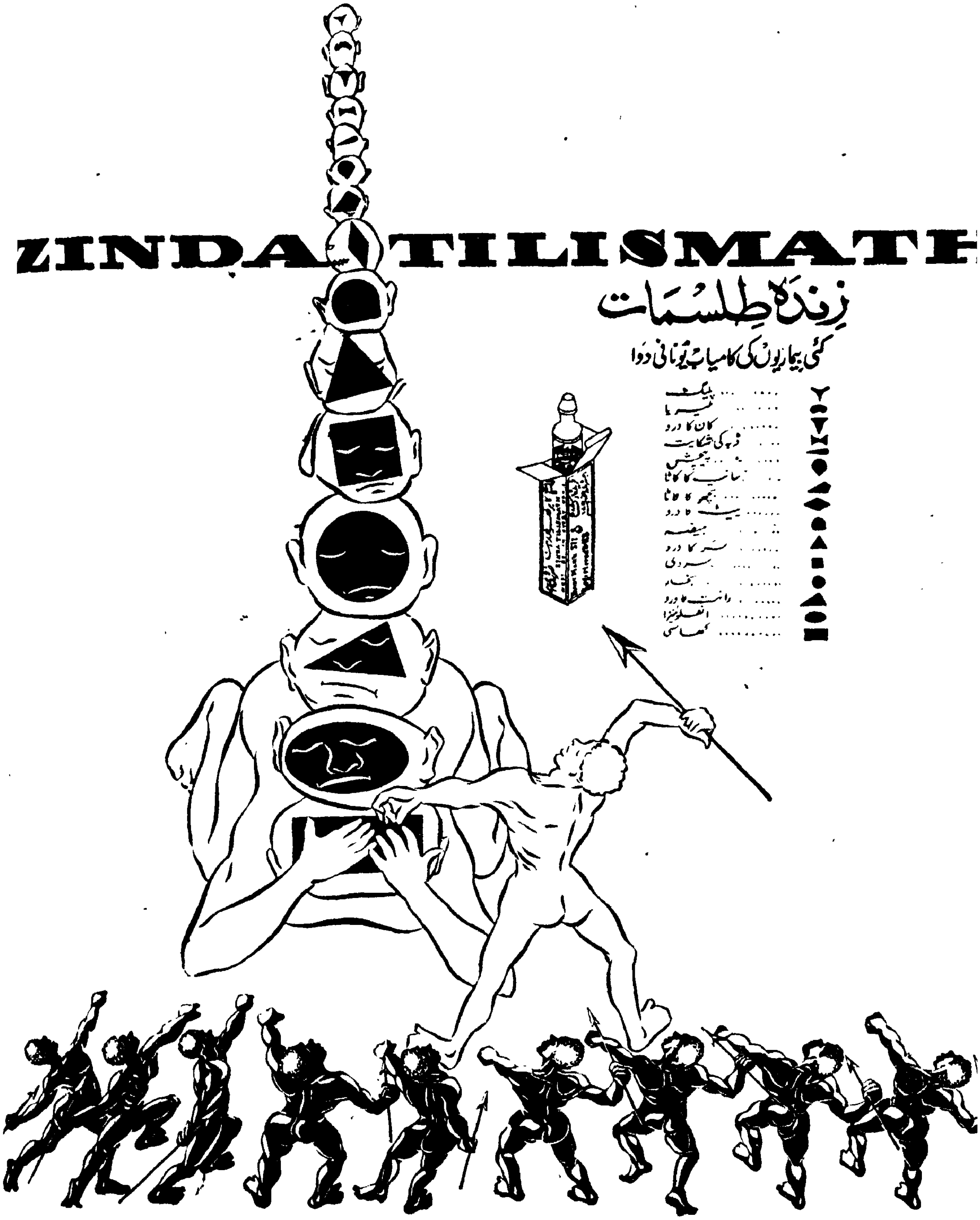
○

	یکم نومبر ١٩٥٦ء کو	٨ سال بعد
ریاست کی آمدنی	(٨٥٠ء٦١) کروڑ روپے	(١٣٢٣ء٣٠) کروڑ روپے
فی کس آمدنی	(٢٥٥ء٨٥) روپے	(٣٥٤ء٣١) روپے
منصوبے تحت رقمی خرچ	(١٨٠ء٥٩) کروڑ روپے	(٣١٢ء٦٦) کروڑ روپے
ریاستی موازنہ	(٦١ء٨) کروڑ روپے	(١٣٦ء٠٠) کروڑ روپے
اناج کی پیداوار	(٥٤ء١) لاکھ ٹن	(٧٩) لاکھ ٹن
برقی قوت سے مستفید ہونے والے دیہات اور قصبوں کی تعداد	(٦٨٥)	(٤٣٢٩)
تعلیمی اداروں کی تعداد (عام اور پیشہ وری)	(٣٠٠٠٥)	(٣٨٠٤٧)
کالجوں کی تعداد	(٩٨)	(١٣٢)
پرائمری ہیلتھ سنٹروں کی تعداد	(٣٦)	(٢٨٥)
کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاکوں کی تعداد	(٥٥)	(٣٢١)
دیہات میں نصب شدہ کمیونٹی ریڈیو سٹوں کی تعداد	(١٧٦٣)	(١٠٦٤٩)

- ○ ١٩٦٤ء۔٦٥ میں ایک زرعی یونیورسٹی قائم ہوگئی۔
- ○ نظم و نسق میں کارکردگی کو برقرار رکھتے ہوئے خرچ میں کفایت کی خاطر یکم جولائی ١٩٦٤ء سے ترقیاتی بلاکوں کی جدید تنظیم عمل میں لائی گئی۔
- ○ پنچایت راج کے شعبہ میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ (١٥٢٢٣) پنچایتوں میں سے (١٧٧٠) پنچایتوں کے انتخابات بلا مقابلہ عمل میں آگئے۔ یہ تعداد پنچایتوں کی مجموعی تعداد کی (٤٧) فیصد ہے۔ (١١) پنچایتیں صرف خواتین پر مشتمل ہیں جو بلا مقابلہ منتخب ہوئی ہیں۔
- ○ (١٣٩) کروڑ روپیہ کے خرچ سے تعمیر ہونے والے ناگ ارجن ساگر پروجکٹ پر تیزی کے ساتھ مسلسل کام جاری ہے اور بند کی تعمیر کا (٦٢) فیصد کام مکمل ہو چکا ہے۔
- ○ صنعتی شعبے میں بھاری برقی آلات اور دواسازی کے کارخانوں کے علاوہ ہندوستان میں ٹولس کا پانچواں یونٹ بھی حیدرآباد کے قریب قائم کیا جا رہا ہے۔
- ○ آپ ممکن ہے کہ اسی کو نمایاں ترقی کہیں، لیکن ابھی تو ابتدا ہے۔
- ○ آئیے ہم سب مل کر پانچ سالہ منصوبوں کے تحت اس سے بہتر اور بڑھ چڑھ کر کارگذاری پیش کریں۔

محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش

Regd. No. 740 **POONAM MONTHLY** Nov. & 19
AZAMPURA, HYDERABAD-A.P.



KARKHANA ZINDA TILISMATH-HYD-A.P

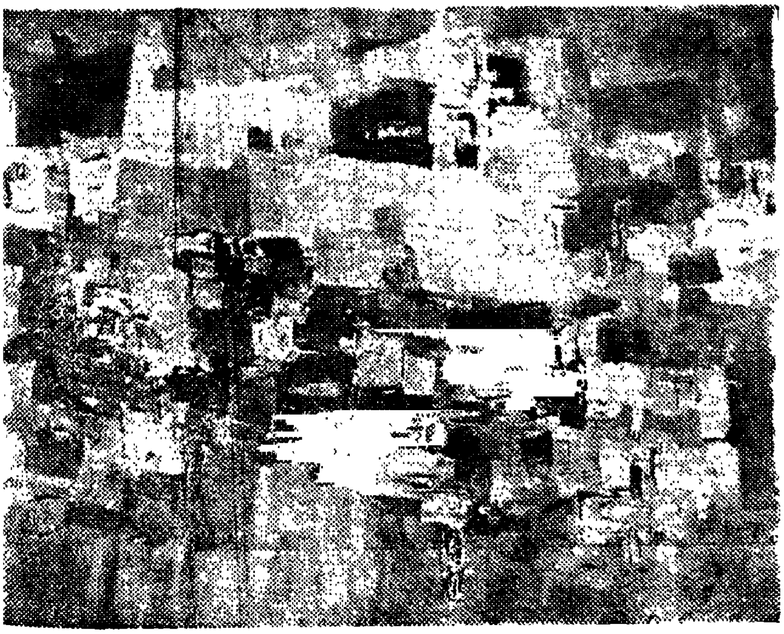


NTHLY

POONAM

مسٹر سوریا پرکاش آندھرا پردیش کے اُن آرٹسٹوں میں سے ہیں جن کے آرٹ کی عمر، اُن کی اپنی عمر سے بس چھوٹی ہے - پرکاش نے اس کم عمری میں اپنے فن میں جو پختگی پیدا کی ہے وہ بہت کم آرٹسٹوں کے حصہ میں آتی ہے - اُن کی پینٹنگس میں رومانی عنصر زیادہ ہوتا ہے اور وہ جدید آرٹ کے نام پر «جمالیات» کا حلیہ بگاڑنا پسند نہیں کرتے - «لینڈاسکیپ» اُن کا خاص موضوع ہے - وہ کنیوس پر اپنے احساس کو پوری شدت کے ساتھ رنگوں میں بکھیرتے ہیں - رنگوں کے استعمال میں بھی وہ بہت محتاط ہیں اور ہمیشہ ایسے رنگ استعمال کرتے ہیں جو احساس کی لطافت پر گراں نہیں گزرتے -

مسٹر سوریا پرکاش ۱۹۴۰ع میں پیدا ہوئے - ۱۹۵۶ع سے ۱۹۶۱ع تک کالج آف فائن آرٹس حیدرآباد میں زیر تعلیم رہے - ۱۹۶۱ع میں اُنہیں اقبال ڈے اکیڈیمی نے «علامہ اقبال» کا بہترین پوٹریٹ بنانے پر «پوٹریٹ انعام» دیا - ۱۹۶۲ع میں اُنہوں نے آندھرا پردیش للت کلا اگزیبیشن کا «پوٹریٹ انعام» حاصل کیا - حیدرآباد آرٹ سوسائیٹی نے بھی اُنہیں ۱۹۶۲ع میں انعام عطا کیا - ۱۹۶۳ع میں اُنہیں آندھرا پردیش للت کلا اکیڈیمی کی جانب سے «گولڈ مڈل» عطا کیا گیا - پرکاش نے ۱۹۶۲ع اور ۱۹۶۴ع کے درمیانی عرصہ میں حیدرآباد، نئی دہلی اور بمبئی کی کئی «گروپ اگزیبیشن» میں حصہ لیا - آندھرا پردیش کے آرٹسٹوں کی جانب سے دہلی، حیدرآباد، کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں جو نمائشیں ہوئیں اُن میں پرکاش کی پنٹنگز بھی شریک تھیں - ۱۹۶۳ع میں اُنہوں نے اپنی پنٹینگز کا «پہلا انفرادی» شو کیا تھا - حال ہی میں اُنہوں نے آندھرا پردیش کے دیگر تین نوجوان آرٹسٹوں ذاکر، واسدیو اور لکشمن گوڑ کے ساتھ اپنی پنٹینگز کا «گروپ شو» کیا تھا جس میں اُن کی پنٹینگز کی بیحد ستائش کی گئی -



★

سرورق: یمنی کرشنا مورتی
کچی پوڈی رقص کا ایک پوز

جنوری سنہ ۱۹۶۵ء

پونم

مُدیر
ناصر کرنولی ایم۔ اے عثمانیہ

کتابت
محمد عبدالسلام خوشنویس

جلد (۱) شمارہ (۹)

قیمت فی پرچہ — ۵۰ — پیسے
زرِ سالانہ — ۶ — روپے
ششماہی — ۳ — روپے
تا عمر خریداری — ۱۰۰ — روپے

بیرونِ ممالک (۱۰) شلنگ

طباعت۔ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد۔ فون (۴۵۸۷۳)
مقامِ اشاعت۔ ماہنامہ پونم ۳۰۱۔۷۔۱۶۔ اعظم پورہ۔ حیدرآباد اے۔ پی

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ پونم
16.7.501.
اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

پونم میں شائع ہونے والے مقالہ، ادبی، غیر ادبی، افسانوں، نام، کردار، واقعات اور افسانوی نظموں میں اگر کسی سے مطابقت ہو تو محض اتفاق ہوگی جس کے لیے

ترتیب

مقالات

ظفر کی شاعری میں وطنیت	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲
پرویز شاہدی کا شعری شعور "رقصِ حیات" کی روشنی میں	سید حرمت الاکرام	۹
ہمارے مسائل اُردو شاعری میں نئے تجربے	عتیق تابش	۱۸

غزلیں

اشہد ولکھنوی	علیم حیدرآبادی	۲۰
نشور واحدی	پرویز شاہدی	۲۱
شہریار	حسرت سہروردی	۲۲
حزیں لدھیانوی	قیصر قلندر	۲۳
مظفر حنفی	ناصر کرنولی	۲۴

افسانے

انجان	امینہ ابوالحسن	۲۵
دامن نچوڑ دیں تو ……	ثمانہ یوسفی	۳۰
ہارے ہوئے لوگ	الیاس احمد گدی	۳۴
صبح کا بھولا	نصیر اختر صدیقی (لندن)	۴۰

نظمیں

بہت قریب ہو تم	سردار جعفری	۴۶
مہر و مہتاب کی دُختر اولیں	شاذ تمکنت	۴۷
شکستِ نغمہ	عبدالعزیز خالد	۴۹
روز کی بات	مخمور سعیدی	۵۰
تلاش	حسین مشیر علوی	۵۰

طنز و مزاح

زعفران زار	کوہکن کے قلم سے	۵۱
زعفران کی سرگزشت	احمد جلیس	۵۲
غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی (پرائیویٹ لمیٹڈ)	تیر انداز	۵۸

۱۹۶۴ء کی فلمیں۔ ایک تنقیدی جائزہ	اعجاز قریشی	۶۲

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

ظفر کی شاعری میں وطنیت

آخری تاجدار ہند ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کا کلام حسرت و یاس، درد و غم، کرب و اضطراب اور سوز و گداز کا مجموعہ ہے۔ جس میں ظفر نے اپنی آپ بیتی، مادرِ وطن کی غلامی، اہلِ وطن کی بے بسی، زمانے کی بے مہری اور تہذیب کہن کی تباہی بیان کی ہے انہوں نے یہ حکایاتِ خونچکاں، گل و بلبل، قفس و دام، زنجیر و زندان محتسب و میخانہ، صیاد و باغباں، چمن و آشیاں اور بہار و خزاں جیسی معروف و متداول علامات' شاعری کے پردے میں لکھی ہے شاعری کی یہ علامتیں دوسرے شعرا کے یہاں اتنی موثر، جاندار اور حقیقت بداماں نہیں ہیں جتنی کہ ظفر کے یہاں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ظفر کے یہاں یہ تمام علامتیں تخلیقی واردات اور جیتی جاگتی ہیں۔ انہوں نے ان میں وسعت و ندرت پیدا کی۔ مادرِ وطن کے لیئے وہ گلستان، چمن، باغ، میخانہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور اس کے بدخواہوں نیز دشمنوں کو گلچیں، صیاد اور محتسب کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ان کے بے پناہ مظالم پر آنسو بہاتے ہیں۔

درحقیقت ظفر کی شاعری اپنے عہد کے حالات و انقلابات کی ترجمان ہے۔ ظفر نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ اپنی ہلاکت خیزیوں اور ستم رانیوں کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ تاریک اور خون آشام دور تھا۔ ہندوستان بیرونی حملہ آوروں سے تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اندرونی سازشوں نے اس کے دامانِ عافیت کو تار تار کر دیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے جاہ و جلال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ پورے ملک میں طوائف الملوکی اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ انتشار، بے چینی اور بدامنی سے فرنگی تاجروں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزند تجارت کرتے کرتے حکومت پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ وہ تاجرانہ لباس اتار کر حکومت کا تاج پہن چکے تھے۔ اکبر و جہانگیر شاہجہاں و عالمگیر کے جانشین کی حیثیت "شاہِ شطرنج" سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی غیرت و حمیت، طاؤس و رباب کی نذر اور نئے ناؤ میں غرق ہو چکی تھی۔ خود غرض افراد اور ارکینِ سلطنت میں، میر جعفر اور میر صادق سے بڑھ چڑھ کر غدار موجود تھے جو سفینۂ نظام

اور مہذب نما درندوں سے ساز باز کرتے رہتے تھے اور جن کی سازشوں کا انجام یہ ہوا کہ کشمیر سے لے کر، راس کماری تک اور افغانستان سے لیکر بنگال تک پھیلی ہوئی وسیع و عظیم سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اندر اس کا محدود اربعہ سمٹ سمٹا کر "از دلی تا پالم" رہ گیا۔ ظلِ سبحانی کو تاجرانِ افرنگ کا وظیفہ خوار ہونا پڑا۔ پھر بھی اس کو چین نصیب نہیں تھا۔ قلعہ معلی سازشوں کا گہوارہ اور فتنوں کا مسکن تھا۔ جھوٹے اقتدار کے لیے شہزادوں کی باہمی کشمکش انسانیت سوز بھی اور ہلاکت خیز بھی۔ ان پر فرنگی ساحروں کا سحر اثر کرچکا تھا اور آلِ تیمور اپنی تباہی کے سامان خود فراہم کرتے جارہے تھے۔

اپنی منقاروں سے خود کُستے تھے پھندا جال کا
طائروں پر سحر تھا صیّاد کے اقبال کا

بہادر شاہ ظفر اسی انقلاب بداماں عہد اور پُر آشوب زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا اسی کشمکش وکشاکش میں گذرا۔ بچپن سے لے کر ولیعہدی کے زمانے تک انہیں محرومیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ساتھ مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ تخت نشینی کے زمانے تک وہ اسی طوفان میں گھرے رہے ۱۸۳۷ء میں جب وہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئے اس وقت بھی اُنہیں سکون و اطمینان نصیب نہیں تھا۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک مسلسل جاری رہا۔ یہ سازشوں اور غداریوں ہی کی برکت تھی کہ ہندوستان کو آزادی کی پہلی جنگ میں شکست فاش ہوگئی اور اس کی رہی سہی آزادی بھی غلامی اور محکومی سے بدل گئی۔ مادرِ وطن کو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اس کے سپوتوں پر ظلم وستم کی انتہا کردی گئی۔ شہنشاہ ہند کو الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں کی غداری کی وجہ سے اسیرِ فرنگ ہونا پڑا۔ ہندوستان کا والی اس کا سب سے بڑا مجرم، غدار اور باغی قرار دیا گیا۔ اب اُس کا دیس اُس کا دیس نہیں رہا جس دیس کی آزادی کے لیے اُس نے جدوجہد کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے (۸۲) برس کی عمر میں سالارِ کارواں

آزادی بنا۔ جس کے لیئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو قربان کردیا اور تیسرے فاقہ میں بھی اپنے بیٹوں کا سَر خوان میں پیش کیئے جانے پر، تیموری آن کو قائم رکھا۔ وہ لال قلعہ جہاں اس کے آباء واجداد نے تین سو برس تک اپنی عظمت وجلال کا پرچم لہرایا، جن کی بدولت ہندوستان کا وقار دُنیا میں سَربلند ہوا، وہ دِلی جو فردوس البلاد اور جہاں آباد کے نام سے موسُوم کی جاتی تھی اور جس کی نسبت کہاجاتا تھا کہ ؎

اگر فردوس بر رُوے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

اسی رشکِ فردوس سَرزمیں سے اس کو نکالا جارہا ہے، مادرِ وطن کی آزادی کی جدوجہد کو بغاوت قرار دیا گیا۔ شہنشاہِ ہند کو مجرم بناکر مقدمہ چلایا گیا۔ حُبِ وطن کی پاداش میں جلا وطنی کی سَزا دی گئی۔ ۳۰ رستمبر ۱۸۵۷ء کی منحوس تاریخ تھی، جب ظفر کو دِلی سے ہمیشہ کے لیئے رخصت کردیا گیا ؎

اے وائے انقلابِ زمانہ کے جور سے
دِلی ظفر کے ہاتھ سے پَل میں نکل گئی

اور وہ ایک ایک چیز کو حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے رنگون چلے گئے ؎

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

رنگون میں اسی عالمِ بے چارگی اور کسمپرسی کے ساتھ چار برس تک جلا وطنی کی زندگی گذارتے رہے۔ آخر ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو فرشتۂ موت کو رحم آیا اور اُس نے ظفر کو قیدِ فرنگ اور قیدِ حیات دونوں سے نجات دے دی۔ وطن کے اس فدائی کی تاریخ بھی "بُجھا ہے چراغ دہلی" سے نکلی۔ پُورا قطعہ یہ ہے

سراج الدین بظفر مسافر ، وہ سوئے جنت ہوا روانہ
کہ جس کے باعث ہے خوشی سے چمک رہا تھا ایاغ دہلی
چراغ دہلی جلوس کا ہے سو اب بھی دیکھو مطابق اس کے
سروش غیبی نے سالِ رحلت کہا بجھا ہے چراغِ دہلی

ان دل گداز حادثات میں ظفر کی عمر گذرے اور ان کا دل متاثر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے ؟ وطن کی محبت کا جذبہ تو فطری جذبہ ہوتا ہے۔ کون ایسا انسان ہے جس کا دل اس جذبے سے خالی ہے؟ انسان تو انسان حیوان بھی اس سے خالی نہیں۔ کیا وطن کا ذرّہ ذرّہ سورج سے زیادہ روشن اور چاند سے زیادہ حسین نہیں معلوم ہوتا ؟ کیا وطن کے کانٹے بھی پردیس کے پھولوں سے اچھے اور پیارے نہیں معلوم ہوتے ؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
خاکِ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر

کیا ایک محبِ وطن کی دلی تمنا یہ نہیں ہوتی ؟

ٹھوکریں کھاؤں پر چمن میں رہوں
کانٹے چُنتا ہوا چمن میں رہوں

کیا وطن کی محبّت ایمان کا جزو نہیں ہے ؟ اور کیا اس میں کوئی مبالغہ ہے ؟

تیری اک مُشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

کیا اس حقیقت سے کسی کو انکار ہے ؟

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی میکرد
می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

پھر بہادر شاہ ظفر تو بہرحال اپنے ملک کے بادشاہ تھے۔ ان سے تخت و تاج چھینا گیا، ان کو شہر بدر نہیں ملک بدر کیا گیا۔ ان کے سامنے ان کے جگر کے ٹکڑوں اور ان کی محبوب رعایا کو قتل کیا گیا اور وطن کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ یہ ظلم و درندگی ہو، یہ خون آشامی و غارت گری ہو، وطن اور وطن والوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹیں اور ظفر کا دل متاثر نہ ہو ؟ یہ ناممکن ہے ؛ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے، پھر یہ کیوں تسلیم کرلیا جائے کہ،

" واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں شکوۂ غمِ روزگار اور گلۂ ستمِ آسمان ضرور ملتا ہے مگر کسی سیاسی جذبے کی تلاش ان کے یہاں نہ کرنی چاہیئے "

جن کی گھٹی میں سیاست پڑی ہو، جنھوں نے سیاست کے گہوارہ میں پرورش پائی ہو، جن کی پوری عمر سیاست اور سیاسی کشمکش میں گذری ہو، کیا ان کے احساسات و جذبات، خیالات و رجحانات پر سیاست کے گہرے اثرات نہ ہوں گے ؟ ان کے کلام میں، اشاروں و کنایوں میں بھی ان کی ترجمانی نہ ہوگی، سیاست کے ساتھ کیا وطنیت کا رجحان نہ پایا جائے گا ؟ ذوقِ سلیم کو یہ یقین نہیں آتا۔

درحقیقت یہ غلط فہمی اندازِ بیان کی وجہ سے پیدا ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کلامِ ظفر کے فن پر تو زیادہ توجہ کی گئی لیکن ان کی شخصیت اور نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ بہت کم کیا گیا۔ کوئی شک نہیں کہ " کلام الملوک ملوک الکلام " کی مثل ظفر کے کلام پر صادق آتی ہے۔ قلعۂ معلّٰی کی ساختہ و پرداختہ حوضِ کوثر سے دُھلی ہوئی دلّی کی ٹکسالی زبان ظفر کی زبان ہے ان کی زبان میں جو لطافت و پاکیزگی، سلاست و روانی، دلکشی و رعنائی ہے، ان کے لہجے میں جو حلاوت و شیرینی اور جذبات میں جو صداقت اور گہرائی ملتی ہے وہ دوسرے باکمال شعراء کے یہاں کہاں ؟ اسی لیئے ان کا اندازِ بیان دلکش اور موثر ہے زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ کی بدولت ظفر نے اپنے جذبات کا اظہار رمز و کنایہ میں سیکڑوں طریقوں سے کیا ہے۔

پاسکے رمز و کنائے کو ہی کیا اس کے ظفر
جس کی اک بات میں سو طرح کا پہلو نکلے

ظفر کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی تک

شاعری کے صرف چند پہلو اُجاگر کیئے گئے۔ خصوصیت سے
المیہ شاعری، اخلاقی و ناصحانہ شاعری، مذہبی اور صوفیانہ
ی، نیز ان کے تغزل پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے، زبان و
کے محاسن ظاہر کیئے گئے۔ لیکن کیا ظفر کی شاعری صرف انہیں
سیات اور محاسن پر مشتمل ہے؟ کیا شکوۂ غم روزگار اور
ستم آسمان میں اُن کی آپ بیتی اور جگ بیتی شامل نہیں ہے۔
نے غزل کو اپنے سخن کا پردہ بنایا اور اسی صنف میں اپنے
جذبات اور قلبی واردات بیان کیئے۔ غزل کی زبان رمز و
کی زبان ہے۔ اس میں وضاحت کے ساتھ صاف صاف
بیان کیا جاتا۔ غالب نے اسی لیئے تو کہا تھا کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اقبال نے بھی یہ تسلیم کیا کہ

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جُز بہ رمز و ایما نیست

رنے بھی رمز و ایما، اور کنایہ و اشارہ میں بات کہنے کا دعویٰ
ہے اور ایک ایک اشارہ میں سو سو طرح کے پہلو بتائے
۔ پھر کیا یہ اشارے صرف حُسن و عشق ہی کے اشارے
؟ کیا ان میں خود ان کی اور ان کے وطن کی محبت پوشیدہ
ہے؟۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ظفر بہرحال بادشاہ
۔ تیموری جاہ و جلال کی آخری یادگار تھے۔ عام انسانوں کے
مقابلہ میں ان کی تہذیب و معاشرت بلند تھی۔ سنجیدگی و کم آمیزی
دیئے رہنے کے اُصول کے پابند تھے۔ اسی لیئے وہ ایک
تک مجبور تھے کہ اپنے خیالات اشاروں اور کنایوں میں
بیان کریں۔ ان میں سے ایک اشارہ 'وطنیت' بھی ہے
جس میں ہندوستان کی عظمت اور وطن سے بے پناہ محبت کے
نغمے موجود ہیں۔ یہ نغمے بھی وطن کی بے کسی و مجبوری پر دُکھی کی
پکار بن جاتے ہیں اور کبھی وطن کی آزادی کے لیئے سعی و عمل کی

دعوت دیتے ہیں۔ ظفر کے لیئے وطن کے نغمے نئے بھی نہیں تھے
انہوں نے اپنے اسلاف سے بھی وطن کی عظمت و شان کے راگ
سُنے۔ ہندوستان کی غلامی و محکومی پر دلدوز صدائیں سُنیں۔ مادرِ وطن
کی تباہی و بربادی پر خُون کے آنسو بہتے ہوئے دیکھے اور وہ اس
سے بھی واقف تھے کہ

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
وہ بھی فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
(مصحفی)

اور ان کے کانوں میں یہ پُرسوز آواز بھی پہنچ چکی تھی،

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنُوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گُذری
(راجہ رام موزوں)

میر اور سودا کی یہ دردناک آواز بھی سُن چکے تھے،

دِلّی کے نہ تھے کُوچے اَوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

دِلّی جو یک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لُوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اِسی اُجڑے دِیار کے

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کس نے رکھا یاں قدم نہیں معلوم

ظفر کے معاصر شعرا میں بھی وطنیت پائی جاتی ہے۔ غالب نے
عالمِ جُنوں میں حکایاتِ خونچکاں لکھی۔ اگرچہ ان کے ہاتھ قلم
کیئے گئے ؎ لکھتے رہے جُنوں میں حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اسی طرح مومن نے بھی اپنے گھر کی ویرانی پر آنسو بہائے ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد شہر آشوب بکثرت لکھے گئے، جن کو پڑھنے سے بعد کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

جب ان تمام شعرا میں وطنیت کی جھلک پائی جاتی ہے تو ظفر کے کلام میں ان سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ اگر کلامِ ظفر کا مطالعہ سرسری طور پر کیا جائے تو سینکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو حبِ وطن میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ کلامِ ظفر میں وطنیت، اپنی پوری توانائی اور رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں وطنیت کا مفہوم وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ آج کے نظریۂ وطنیت کی روشنی میں اُس زمانے کی وطنیت کو پرکھنا مناسب نہیں ہے۔ تاہم اس وقت بھی یہ تو تھا ہی کہ اپنے وطن کی فلاح و اصلاح اور تعمیر و ترقی، بے لوث خدمت، اور ایثار و قربانی سچی حب الوطنی سمجھی جاتی تھی۔ ظفر کے کلام میں یہ تمام اشارے واضح طور پر موجود ہیں۔

ظفر کے کلیات میں چار دیوان ہیں۔ یہ چاروں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہیں۔ زمانۂ اسیری کا کلام کلیات میں شامل نہیں ہے اور متعدد رسائل و کتب میں منتشر طور پر پایا جاتا ہے۔ کلیات میں غزلوں کے علاوہ مستزاد، مخمس، مسدس، قطعہ، تضمین، نعتیہ قصائد، شہر آشوب، مرثیہ، سلام، مجرا، سہرا، پنکھا، ہولی، ٹھمری، بھجن، گیت سبھی کچھ موجود ہے۔ فارسی، بھاکا اور پنجابی زبان میں بھی متعدد غزلیں اور گیت ہیں۔ ان سب میں سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں وطنیت پورے طور پر نمایاں ہے۔ وطن کی عام تباہی و بربادی اور اغیار کے ظلم و ستم کا نقشہ کس قدر موثر انداز میں بیان کر رہے ہیں۔

ہزار حیف کہ بلبل اسیر گلشن میں
نہ چھوڑا ایک بھی صیاد نے نشاں نہ ہو
کیسی ہوا چلی کہ ہوا دل [illegible]
[illegible]

چمن ہے گر یہ خزاں سے شکستہ دامن
مگر دکھی کہ ہے لطافتِ چمن کا ہوش
بُرا ہو محتسب کا ایک دن میں کر دیئے ویراں
وہ جو آباد تھے اس شہر میں میخانے برسوں
ہزار افسوس ہے بلبل چمن میں
رہا میرا نہیں اب ایک پر تک
کہیں ٹوٹے ہوئے شیشے پڑے ہیں اور کہیں ساغر
خرابی میکدہ میں آج اے پیرِ مغاں کیا ہے
اک گل بھی دیکھئے تو نہیں اے صبا کہیں
ویراں کیا خزاں نے یہ گلشن کو لوٹ کے
توڑے ہیں شیشے میکدہ میں محتسب مدام
ساقی پڑے خدا کا غضب اس پہ ٹوٹ کے
میکشوں کے حال پر روتے ہیں کیا کیا مے فروش
محتسب نے جو لگایا ہر دکاں پر قفل ہے
جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفر
ہزار حیف کہ وہ آشیان زاغ بنے

کسی ایک شاعر کے کلام میں وطن سے اس والہانہ محبت کا اظہار اردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔

حسرت ہے اس اسیرِ قفس پہ کہ جس کے پر
اُڑتے پھرے ہیں بعدِ فنا بھی چمن کے گرد
خاک بھی ہو گی ترے کوچے میں اپنی برباد
ہم کو منظور بھی یہاں سے نہیں جانے والے
[illegible]
[illegible] گلستاں سے دور
[illegible] عاشق کی اگر برباد ہو جاتی
[illegible] تو دی ہوتی
[illegible] نہیں مرغانِ قفس
[illegible] تو لے جا

احساں کرے اسیرِ قفس پر نسیمِ صبح
اک برگِ گل جو لائے چمن سے قفس تلک

ایک مدّت سے مری خاک کی مٹی تھی خراب
بارے اس کوچے میں اے بادِ سحر پہنچ گئی

قفس کے چاک میں گل رکھ کے مت اٹھا صیاد
کہ بہرِ بلبلِ شیدا ہے یہ چراغِ قفس

اے صبا یہ بھی غنیمت ہے قفس سے پر برگ
اُڑ کے دو چار چمن میں مرے پَر، جا پہنچے

نظر آتی ہے جانِ بلبل میں
جب قفس میں سے بوئے گل آئی

اور اسیری میں وطن کی یاد بے طرح ستاتی ہے۔ ایک طرف قفا بیشہ ہے، جس کی سختیوں نے اسیرِ قفس سے طاقتِ پرواز چھین لی۔ دوسری طرف دیدارِ وطن کی تمنا ہے جس کے لئے دن رات تڑپ رہا ہے۔ حسرت و یاس کی یہ کشمکش ظفر کے ہاں انتہائی کرب پیدا کر دیتی ہے اور اس کو سوز و گداز حسرت کا مرقع بنا دیتی ہے۔

حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اُڑ نہ سکے
گر کے پھڑکا کئے دیوارِ گلستاں کے تلے

اسیرانِ قفس کا دم نکلتا ہوتا ہے حسرت سے
چمن سے کیا کوئی جھونکا نسیمِ صبح کا آیا

یا کبھی رہتے تھے گلشن ہی میں یا مدت سے
ہم قفس میں ہیں صبا، گل کی خبر کے محتاج

چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا
کہ پہنچی اُڑ کے نہ مجھ تک گل چمن کی بُو

تا باغ ہم نہ پہنچے، قفس ہی میں مر گئے
کہہ کر کے ہائے ہائے [illegible] ہائے ہائے باغ
مر گئے آخر پھڑک [illegible] کے ہم
دل کی دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی

دے اگر پروانگی صیاد تو دل کھول کر
اور بھی دو چار نالے ہم قفس میں کھینچ لیں

آزادی کے لئے جد و جہد کی ترغیب اور مادرِ وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے سعیِ پیہم بھی ظفر کے کلام میں مفقود نہیں ہے۔

قفس کے ٹکڑے اُڑا دوں پھڑک پھڑک کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں!

شہر آشوب، بھجن، اور ہندی کے گیتوں میں بھی وطن کے اس غلامی کی پکار موجود ہے۔

بادِ صبا اُڑائے چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دمبدم کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہوئے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کرتی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آگیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

اور یہ تو پوری غزل اسی درد انگیز داستان کی ترجمان ہے۔

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آبادیاں گھر تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے، کبھی بستے بشریاں تھے

ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

اسی طرح مومن نے بھی اپنے گھر کی ویرانی پر آنسو بہائے ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد شہرآشوب بکثرت لکھے گئے، جن کو پڑھنے کے بعد کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔

جب ان تمام شعراء میں وطنیت کی جھلک پائی جاتی ہے تو ظفر کے کلام میں ان سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ اگر کلامِ ظفر کا مطالعہ سرسری طور پر کیا جائے تو سینکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو حُبِ وطن میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ کلامِ ظفر میں وطنیت، اپنی پُوری توانائی اور رعنائی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں وطنیت کا مفہُوم وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ آج کے نظریۂ وطنیت کی روشنی میں اُس زمانے کی وطنیت کو پرکھنا مناسب نہیں ہے۔ تاہم اس وقت بھی یہ تو تھا ہی کہ اپنے وطن کی فلاح و اصلاح اور تعمیر و ترقی، بے لوث خدمت، اور ایثار و قربانی سچی حُب الوطنی سمجھی جاتی تھی۔ ظفر کے کلام میں یہ تمام اشارے واضح طور پر موجود ہیں۔

ظفر کے کلیات میں چار دیوان ہیں۔ یہ چاروں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہیں۔ زمانۂ اسیری کا کلام کلیات میں شامل نہیں ہے اور متعدد رسائل و کتب میں مُنتشر طور پر پایا جاتا ہے۔ کُلیات میں غزلوں کے علاوہ مستزاد، مخمس، مسدّس، قطعہ، تضمین، نعتیہ قصائد، شہرآشوب، مرثیہ، سلام، مُجرا، سہرا، پنکھا، ہولی، ٹھُمری، بھجن، گیت سبھی کچھ موجود ہے۔ فارسی، بھاکا اور پنجابی زبان میں بھی متعدد غزلیں اور گیت ہیں۔ ان سب میں سینکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں وطنیت پُورے طور پر نمایاں ہے۔ وطن کی عام تباہی، بربادی اور اغیار کے ظلم و ستم کا نقشہ کس قدر موثر انداز میں بیان کر رہے ہیں۔

ہزار حیف کہ بُلبل کا صحنِ گلشن میں
نہ چھوڑا ایک بھی صیّاد نے نشانِ پر

کیسی ہوا چلی چمن دل میں اے ظفر
سب برگ و بار نخلِ تمنّا کے جھڑ پڑے

چمن ہے گریہ گُزیں ہے شگفتہ دامن
دگرگوں کر ہے نظارۂ چمن کا ہوش

ہوا ہو محتسب کا ایک دن میں کر دیئے ویراں
وہ جو آباد تھے اس شہر میں میخانے برسوں

ہزار افسوس ہے بُلبل چمن میں
رہا میرا نہیں اب ایک پر تک

کہیں ٹوٹے ہوئے شیشے پڑے ہیں اور کہیں ساغر
خرابی میکدہ میں آج اے پیرِ مغاں کیا ہے

اِک گُل بھی دیکھنے کو نہیں اے صبا کہیں
ویراں کیا خزاں نے یہ گلشن کو لُوٹ کے

توڑے ہے شیشے میکدہ میں محتسب مدام
ساقی پڑے خدا کا غضب اس پہ ٹوٹ کے

میکشوں کے حال پر روتے ہیں کیا کیا مے فروش
محتسب نے جو لگایا ہر دکاں پر قفل ہے

جہاں چمن میں نشیمن تھے بُلبلوں کے ظفر
ہزار حیف کہ وہ آشیان زاغ کے بنے

کسی ایک شاعر کے کلام میں وطن سے اس والہانہ محبّت کا جواب اُردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔

حسرت ہے اس اسیرِ قفس پر کہ جس کے پر
اُڑتے پھرے ہیں بعدِ فنا بھی چمن کے گرد

خاک بھی ہو گی ترے کُوچے میں اپنی برباد
ہم تو مر کر بھی یہاں سے نہیں جانے والے

کوششِ گلچیں کی تک مری فریاد تو پہنچے صیّاد
رکھ قفس کو مرے ظالم نہ گلستاں سے دُور

ملتی خاک عاشق کی اگر برباد ہو جاتی
نہ اس کُوچے میں آباد ہو کر پہنچا تو وہی ہوتی

اُڑ کے جا سکتے چمن تک نہیں مُرغانِ قفس
اے صبا اُن کا اُڑا کر کوئی پَر تو لے جا

احساں کرے اسیرِ قفس پر نسیمِ صبح
اک برگِ گل جو لائے چمن سے قفس تلک

ایک مدت سے مری خاک کی مٹی تھی خراب
بارے اس کوچے میں اے بادِ سحر پہنچ گئی

قفس کے چاک میں گل رکھ کے مت اٹھا صیاد
کہ بہرِ بلبلِ شیدا ہے یہ چراغِ قفس

اے صبا یہ بھی غنیمت ہے قفس سے پس مرگ
اڑ کے دو چار چمن میں مرے پر جا پہنچے

ظفر آتی ہے جان بلبل میں
جب قفس میں سے بوئے گل آئی

اور اسیری میں وطن کی یاد بے طرح ستاتی ہے۔ ایک طرف فضا بیشہ ہے، جس کی سختیوں نے اسیرِ قفس سے طاقتِ پرواز چھین لی۔ دوسری طرف دیدارِ وطن کی تمنا ہے جس کے لئے دن رات تڑپ رہا ہے۔ حسرت و یاس کی یہ کشمکش ظفر کے ہاں انتہائی کرب پیدا کر دیتی ہے اور اس کو سوز و گداز، حسرت و درد کا مرقع بنا دیتی ہے۔

حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے
گر کے پھڑ کا کیئے دیوارِ گلستاں کے تلے

اسیرانِ قفس کا دم ہوا ہوتا ہے حسرت سے
چمن سے کیا کوئی جھونکا نسیمِ صبح کا آیا

یا کبھی رہتے تھے گلشن ہی میں یا مدت سے
ہم قفس میں ہیں صبا، گل کی خبر کے محتاج

چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا
کہ پہنچی اڑ کے نہ مجھ تک گل چمن کی بو

تا باغ ہم نہ پہنچے، قفس ہی میں مر گئے
کہہ کر کے ہائے ہائے چمن ہائے ہائے باغ

مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم
دل کی دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی

دے اگر پروانگی صیاد تو دل کھول کر
اور بھی دو چار نالے ہم قفس میں کھینچ لیں

آزادی کے لیئے جد و جہد کی ترغیب اور مادرِ وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیئے سعی پیہم بھی ظفر کے کلام میں مفقود نہیں ہے۔

قفس کے ٹکڑے اڑا دوں پھڑک پھڑک کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم قفس یوں ہے

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں!

شہر آشوب، مخمس، اور ہندی کے گیتوں میں بھی وطن کے اس فدائی کی پکار موجود ہے۔

بادِ صبا اڑائے چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دمبدم کفِ افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہوئے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آ گیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

اور یہ تو پوری غزل اسی دردانگیز داستان کی ترجمان ہے۔

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آبادیاں گھر تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے، کبھی بستے بشر یاں تھے

ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

کتنے ہی بنا کے شہر کے اور گاؤں کے نشاں
یوں ہٹ گئے زمیں پہ کہ جوں پاؤں کے نشاں
گر نخلِ خشک کوئی کہیں رہ گیا ظفر
پائے نہ اس کے پاؤں تلے چھاؤں کے نشاں

نجمن کی اس پُرسوز لے سے پتھر کا دل بھی پگھل جاتا ہے ۔

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں ہیں سونی پڑی وہ گلیاں تھیں
روز بہاراں لوٹتے تھے وہ جا جا کر جس باگن میں
شوقؔ رنگ اب جو دیکھا داں نا پھول نہ کلیاں تھیں

اسیری کے زمانے کا کلام تمام تر دکھنی کی پکار ہے ۔ اس میں جو شدید کرب اور بے چینی پائی جاتی ہے ، عالم غربت میں بے کسی و بیچارگی اور کسمپرسی کا جو غم انگیز احساس پایا جاتا ہے ، وطن کی بے پناہ محبت کا جو جذبہ ملتا ہے ، سخت سے سخت دل بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا کہ ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ شہر دہلی تھا اک چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے
شب و روز پھول میں جو تُلے کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں کہو گُل کے بدلے یہ ہار ہے
نہ دبایا زیرِ چمن انہیں ، نہ دیا کسی نے کفن انہیں
نہ ہوا نصیب وطن انہیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے

نہ غنچہ ہے نہ سنبل ہے ، پڑا ہے باغ ویرانہ
نہ گُل ہے اور نہ بلبل ہے نہ ساقی ہے نہ پیمانہ
نکل جائے اگر دم بھی اُسی گُل کے تصوّر میں
پسِ دیوارِ گلشن اے ظفر اب ہم کو دفنانا

لیکن افسوس ظفر کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور انہوں نے پہلے جو پیش گوئی کی تھی کہ

نہ ہوا نصیب وطن انہیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے

وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی ۔

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

ظفر کی حبِ وطن کی یہ داستان سادہ اور نامکمل رہ جائے گی اگر ان کی ہولی سے اس کو رنگین نہ بنایا جائے ۔

ہند میں کیسو پھاگ مچو ری   جورا جوری
پھول کا تخت ہند بنا تھا   کیسر کی سی کیارا
کیسو پھوٹے پھاگ ہمارے   لُٹ گئی باگ بہارا
لُٹ گئی سب پھلواری
گولن کے گُلال بنائیو   توپن کی پچکارا
آئے رہی سگری مکھ پہ   ایسی تک تک مارا
شور دنیا میں مچو رہی
گنگا رام یہودی نے   تخت کا ناس کیو را
اور کو دنے کا ہے   ایسا پاپ کیو را
سرا پا سب کا لیو ری
بہادر شاہ درگا جی مردنے   دین کا ساتھ دیو را
مرتے دم تک اس پرمی نے   دین ہی دین کیو را
نام اس رب کا لیو ری
ہند میں کیسو پھاگ مچو ری
جورا جوری

سید حرمت الاکرام

پرویز شاہدی کا شعری شعور

"رقصِ حیات" کی روشنی میں

پرویز شاہدی اُردو کے ان شعراء میں ہیں، جنہوں نے ترقی پسندی کو جی جان سے اپنایا، مگر اسے اپنی جان کا آزار بننے نہیں دیا۔ انہوں نے محض اپنی شاعری ہی کے ذریعہ اشتراکی نظریۂ حیات کی ترجمانی نہیں کی اور نہ اپنی جد و جہد کو گفتار تک محدود رکھا بلکہ زندانِ بلا کی سلاخوں سے بھی کھیلا اور فیض احمد فیض کی طرح، ہر حلقۂ زنجیر میں زبان رکھنے کا فرض بھی ادا کیا، لیکن وہ فقط "مجاہد" بن کر نہیں رہ گئے اور نہ اپنے شاعرانہ منصب سے تجاہل برتنے میں کوئی خوشی یا خوبی محسوس کی۔ انہوں نے اشتراکی تحریک کو پروان چڑھانے میں عملاً جس بلند حوصلگی اور سخت کوشی کا ثبوت دیا، وہ ان کی شاعری میں بھی کارفرما رہی اور پرویز اپنے دوسرے ہم سخنوں کی طرح تن آسانی اور سہل انگاری کا شکار نہیں ہوئے بلکہ سماجی اُمور میں روایات کے خلاف زبردست جذبۂ بغاوت رکھنے کے باوجود شاعری کی دُنیا میں انہوں نے روایات کا کما حقہٗ احترام کیا۔

نظم اور غزل کے علاوہ انہوں نے اُردو کی نہایت حوصلہ آزما صنفِ سخن، رباعی کو بھی ایک حد تک اپنایا، لیکن ان کی سلامت روی ہر مقام پر یکساں رہی اور اس دورِ انتہا پسندی میں بھی جو نظم کی نومعروف اصناف، آزاد اور مُعرّیٰ کی ترویج کے باب میں افراط و تفریط سے مغلوب تھا، اپنی نظم نگاری کو پابند شاعری کی مقتدر روایات سے ہم رشتہ رکھا، جس سے فنی و لسانی تقاضوں کے باب میں ان کے جذبۂ احترام و احتیاط کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ امر موجبِ حیرت ہے کہ انہوں نے کچھ دنوں سے نظم آزاد اور نظم معرّیٰ کو بھی اپنے دائرۂ فن میں شامل کر لیا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اقدام کے پس پشت کونسے اسباب و عوامل محرکِ کار ہیں اور انہوں نے اپنی شاعرانہ وضع میں ترمیم کی ضرورت کیوں محسوس کی، لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پرویز نے ادب کے تغیر پذیر میلانات کا اندازہ کیا ہوگا۔

پابند شاعری کی وہ ہیئتیں جو ترقی پسند حلقوں نیز نئی نسل کے لئے لائقِ التفات رہیں، تبدیل شدہ رجحانات کی ترجمانی کیلئے کارآمد اور کافی ہیں یا نہیں، اس سے قطع نظر آزاد اور معریٰ کو مطلقاً غیر ضروری یا ناقابلِ اعتنا بھی نہیں کہا جا سکتا اور ان کی بعض خصوصیات کا منکر ہونا قرینِ دانشمندی ہے بشرطیکہ انہیں برتنے میں بعض اہم تر ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جائے جن کا ایک فنکار کی حیثیت سے

شاعر کو واجباً پابند ہونا چاہیئے ۔ یہ ضرور ہے کہ ان اصناف کی ہنگامہ خیز ترویج کے پس منظر میں بیشتر شاعروں کی سہل انگاری اور ریاضت سے پہلو تہی کو زیادہ دخل ہے ۔ جو ایک طرف آزاد اور معریٰ کی صنفی حیثیت کے لیئے ضرر رساں ہے تو دوسری جانب ان کی افادیت واہمیت کو ناقابلِ اعتماد بنا دیتی ہے ۔ چنانچہ اپنی شاعرانہ زندگی کا ایک طویل تر وقفہ گزارنے کے بعد پرویز کا ان اصناف کی جانب ملتفت ہونا جہاں ان کی دُور بینی اور دُور رسی کا غماز ہے، وہیں اس کٹر پن کی بھی نفی کرتا ہے جو فن کے بارے میں ان کے طریقِ عمل سے ظاہر ہوتا رہا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت میں کافی لچک رکھتے ہیں، البتہ ان کا اسلوب کار جُدا گانہ ہے اور وہ ہر معاملے میں اپنے بانکپن کو برقرار رکھنے کے قائل ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آزاد نظموں پر وہ الزامات عائد نہیں کیئے جا سکتے، جن سے اس قبیل کی بیشتر نظمیں ملوّث ہیں نیز جس طرح اس سے قبل انہوں نے اپنی شاعری میں ماضی کی خوشگوار روایتوں کو جگہ دی، اُسی طرح اِن نظموں کو بھی فکر و فن کے متوازن تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے ۔

پرویز نے بھی شعر گوئی کی ابتدا رسمِ عام کے مطابق غزل ہی سے کی اور مشق و ریاضت کے وہ تمام مراحل طے کیئے جنہیں قدیم دبستانِ شاعری کے لوازمِ فن میں شمار کیا جاتا ہے ۔ انہوں نے بڑی جرأت طلب اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی، چنانچہ ان کے یہاں جو ناسخیت پائی جاتی ہے، وہ اسی رُجحان کا نتیجہ ہے اور یہ کیفیت ان کی شاعری کے لیئے خُوبی و خامی دونوں کا حکم رکھتی ہے ان کی شاعری جس فنّی استحکام کی حامل ہے، وہ بھی اِسی کی دین ہے اور ان کے یہاں کہیں کہیں جو سپاٹ پن جھلکتا ہے، اس کا سبب بھی اس کے سوا کچھ اور نہیں ۔ اپنے گھر کے کٹر مذہبی ماحول کے پیشِ نظر پرویز کا قول ہے کہ وہ مولوی اکرام حسین بننے سے بال بال بچ گئے جسے سماجی زندگی کے ایک خوشگوار پہلو سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ دوسری جانب ان کی شاعرانہ زندگی کا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ وہ ناسخ بننے سے بال بال بچ گئے اور اس کی پُشت پر وہ ذہنی و فکری تغیرات ہیں جنہیں اشتراکی نظریۂ حیات سے منسوب کیا جائے گا ۔ وہ فکر و فن کی صالح روایات کے امانت دار ہیں اور یہ وجہ ہے کہ نظمِ آزاد کے ناہموار راستے میں بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے بلکہ ان کی رفتار میں کافی استواری ہے ۔

پرویز نے ۱۹۱۰ء میں بہار کی راجدھانی پٹنہ میں جنم لیا لیکن وہ پچیس برس کے سن سے مغربی بنگال کی راجدھانی کلکتہ میں بر اجمان ہیں ۔ پٹنہ جو دُنیائے ادب میں عظیم آباد کے تاریخی نام سے معروف ہے، اپنی پُشت پر علم و ادب کی بڑی گراں بہا روایات رکھتا ہے اور بایں اعتبار اسے بہار کی ادبی دُنیا کا بھی پایۂ تخت تصور کیا جا سکتا ہے ۔ عظیم آباد نے جو شاد جیسے سخنور کی جنم بھومی ہے کتنی ادبی و علمی شخصیتوں اور محفلوں کو پروان چڑھایا، اور یہ ظاہر ہے کسی شخص کا جسے فطرت نے شاعر کا ذہن و قلب دے کر خاکدان ارضی پر بھیجا ہو، ایسے ماحول میں آنکھیں کھولنا بڑی خوش بختی کی بات ہے کیونکہ عظیم شخصیتوں کی تعمیر میں جہاں دوسرے متعدد عوامل اپنا اثر دکھاتے ہیں، وہیں ماحول کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے محرکات بھی پُوری شدت اور قوت سے کام کرتے ہیں ۔

پرویز آٹھ سال کی عُمر میں شعر کہنے کی ابتدا کر چکے تھے اور انہوں نے نہ صرف طفلی اور عنفوان کے ادوار کلیتہً اسی سرزمین کی آغوش میں گزارے بلکہ شباب کا بھی ایک حصہ اس کے سایۂ عاطفت میں کاٹا لیکن "لغزشِ مستانہ" کا یہ عہد عظیم آباد کی گلیوں سے اپنا رشتۂ مؤانست استوار نہیں رکھ سکا اور ایک جذباتی حادثہ انہیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا ۔ قطعاً یہ مزید سوچا جا سکتا ہے کہ اگر گھرانہ علم و ادب میں پرویز کی پُوری زندگی یا زندگی کا بیشتر حصہ گزرتا تو ان کے حق میں بہتر تھا ۔ لیکن حقیقتاً پرویز جیسے شاعر کے لیے جسے رسمی سخن طرازی کی حدود سے نکل کر اپنی آواز کو آفاقی قدروں سے مربوط کرنا تھا یکسر وہ تر فضا کی ضرورت تھی ۔ پرویز کی نظموں کو جو ایک طرف جدید میلانات سے ہم آہنگ اور دوسری جانب

یر ادبی و ثقافتی تحریکات سے متاثر ہو چکا تھا، ایسا ماحول ہوگا جس کی پہنائیوں میں مشاہدات و تجربات کے نئے سوتے اور نئے رے ذرات رواں دواں ہوں۔ کلکتہ کے ماحول میں یہ سب کچھ تھا جس سے ز کے شعور و وجدان کی اکتسابی صلاحیتوں نے اپنے شعری امکانات لیے شادابی و زرخیزی اور فروغ و نمو کے بھرپور عناصر حاصل کیے۔ ۔ اچھے اور بڑے شاعر کی خصوصیات رکھنے کی بنا پر پٹنہ کی زندگی بھی ت و شہرت سے ہمکنار ہونے میں ان کی خاطر خواہ معاونت کر سکتی ، لیکن ان کی فکری و نفسیاتی گرہ کشائیوں نیز ان کے ذہن و تخیل لسی آذر کے تیشۂ فن کی راہ دیکھنے والی چٹانوں کی صورت گری کلکتہ کے ماحول اور اس کی رنگا رنگیوں نے کس قدر اہم کردار ادا کیا ، اس کی تشریح و تفہیم کے لیے ان کی مندرجہ ذیل نظموں کا مطالعہ ری ہے۔

"بنتِ ہمالہ"۔ "پال رابسن کے نام"۔ "یانگسی کو سلام"۔ رقصِ حیات"۔ "ماضی کا قید خانہ"۔ "خوش آمدید"۔ "دعوت"۔ رانی ہمارے وطن میں"۔ "ضیافت"۔ "روشنی کو ووٹ دو" اور "لوس"۔

ان نظموں کے لہجہ کا تیکھا پن اور ان کے باطن میں کروٹیں لیتے لا پُرخروش مد و جزر، ذہن و فکر کے عہد بہ عہد ارتقا کا غماز ہے اور بتاتا ہے کہ کلکتہ کی نرم و گرم، متنوع، ہنگامہ آفریں، رومان طراز رشینی دنیا نے اس ارتقائی عمل کو بڑا سریع، وسیع اور پُرکار بنا دیا ہے نا ہی نہیں بلکہ یہ کیفیت، فرق و امتیاز کی اس حدِ فاصل کو واضح کرتی ہے جو پٹنہ اور کلکتہ کے سماجی، معاشی اور تمدنی حالات و ماحول کے رمیان پائی جاتی ہے اور جو آج سے پچیس تیس سال قبل اپنے اثرہ کار کے لحاظ سے زیادہ وسیع الاثر تھی۔ کلکتہ محض ایک ذی شان رعظیم شہر ہی نہیں، ایک دنیا ہے، ایک بحرِ ذخار ہے جس کے اور چھور ا کوئی تعین جغرافیائی حدود سے علاحدہ ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمدنی ہذیبی اور ثقافتی دھاروں کا ایک سنگم ہے، جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ یہ رنگ و نور کی ایک وادی بھی ہے اور ایک لق و دق صحرا بھی۔ س کی ہر رہ گذر ایک انجمن ہے اور اس کا ہر پارک ایک شبستاں۔

پٹنہ کا قیام محض ایک شہر کا قیام تھا، لیکن کلکتہ ان کے لیے جامِ جہاں نما بن گیا اور اس نے انہیں ایک قطرہ اٹھا کر نبضِ طوفاں دیکھنے کا سلیقہ دیا جو معمولی بات نہیں۔ پرویز فطرتاً اور طبیعتاً گوشہ نشین آدمی ہیں۔ لیکن کلکتہ جو اپنے دامن میں سب کچھ رکھنے کے باوجود "خلوت" نہیں رکھتا، گوشہ نشینی کو بھی کسی نہ کسی حد تک انجمن آرائی میں ڈھال دیتا ہے۔ کلکتہ کی زندگی جس قدر ہنگامہ خیز ہے اتنی ہی حیرت انگیز بھی ہے جو ذہن کو خوابوں کی دنیا سے نکال کر حقائق کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے اور شاعر کو دکھ درد کے ان شعلوں کی آنچ محسوس کرنا سکھاتی ہے جو غمِ جاناں سے پرے سلگتے اور بھڑکتے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ زندگی کے متنوع حقائق ہر مقام پر انسان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کے دیدۂ بینا و دلِ بیدار کو دعوتِ تماشا دیتے ہیں، لیکن حیاتِ انسانی کے جدید میلانات و اقدار کو کما حقہٗ سمجھنے کے لیے ان مناظر و مظاہر کا قریبی مطالعہ ناگزیر ہے جن کی آئینہ داری ادب برائے حیات کا مقصودِ اوّل ہے۔ پرویز نے اس عظیم درسگاہ میں حیات کے ٹھوس اور تلخ حقائق کا گہرا مطالعہ کیا۔ انہوں نے ایک معلم کی حیثیت سے کتنے بچوں اور نوجوانوں کی تدریس کا فرض ادا کیا اور فطرت کے ایک طالب کی شکل میں اپنے گرد و پیش سے بڑے قیمتی درس لیے اور ان کی شاعری کے آبگینے میں مسائلِ حاضرہ کی جو قدِ آدم پرچھائیاں ملتی ہیں وہ اسی مطالعہ کی راہ سے در آئی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف محنت کشوں کے زرد و بے رونق چہروں، تنگ و تاریک مکانوں نیز ان کی عورتوں اور بچوں کے پژمردہ اجسام کا مذاق اڑانے والے چیتھڑوں کو دیکھا ہے، ان کے جلوسوں اور جلسوں میں شرکت کی ہے، ان کے خشک ہونٹوں پر مچلنے والے نعروں کو سنا ہے، بلکہ ان کے دلوں میں اترنے کی زحمت کی ہے اور ان کے دکھ درد کو ہر زاویے سے پرکھا ہے۔ پرویز نے سیاسی لیڈروں کی محض تقریریں ہی نہیں سنی ہیں، ان کی عیاشانہ کھدر پوشی ہی کا جائزہ نہیں لیا ہے ان کے دمکتے چہروں پر لہراتی ہوئی تعیش پسندیوں اور عشرت نوازیوں کے عکس ہی نہیں دیکھے ہیں بلکہ گفتار سے کردار تک ان کے ہر عمل کا

نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور قوم کے غم میں ڈنر کھانے کے لذت فروز "رموز" کو ٹٹولا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا مزدور جب پرویز کی زبان میں "بونس دیجئے" کی آواز بلند کرتا ہے تو اس کے پس منظر میں وہ رُوداد پوری شرح و بسط کے ساتھ ملتی ہے، جسے شاعر کی آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا، لیکن جس کی اندرونی کسک اور گھٹن کو شاعر نے اتنی ہی دل سوزانہ و دردمندانہ شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے جو اپنے رنج و غم کے لیئے ممکن ہو سکتی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیئے ان کی نظم "بونس دیجئے" کے بعض بند ملاحظہ ہوں:

ہاں منافع کے بنائے کتنے پربت آپ نے
اپنی چاندی پر جمائی برف دولت آپ نے
آبشارِ زر بہائے کرکے حرفت آپ نے
قید کر لی مٹھیوں میں روحِ صنعت آپ نے
کیا دیا لیکن ہمیں انعامِ محنت آپ نے
جو بہا، ماتھے سے اس پانی کا بونس دیجئے

برتری دیتے ہیں جو، ان کمتروں کو دیکھئے
ماؤں، بہنوں، بیویوں کو، شوہروں کو دیکھئے
گھر کی عزت جن سے ہے ان دختروں کو دیکھئے
جن پہ آنچل تک نہیں ہے، ان سروں کو دیکھئے
آیئے آکر ذرا اُجڑے گھروں کو دیکھئے
اب ہماری خانہ ویرانی کا بونس دیجئے

ہمارا ملک ہر پانچ سال کے بعد ایک نہایت دلچسپ ہنگامہ سے متصادم ہوتا ہے جسے انتخاباتِ عامہ کا نام دیا جاتا ہے اور جن کی تیاریوں سے متعلق جلسوں، جلوسوں، تقریروں اور بیانوں کی شکل میں بچھائے جانے والے دامِ ہمرنگِ زمیں کے لاتعداد پھندے بڑی تیزی سے بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عیاریوں اور اقتدار پسندانہ سازشوں کے جادو پوری قوت سے چلنے لگتے ہیں۔ پرویز نے ان ہنگامہ آرائیوں کو بڑی عمیق نگاہوں سے دیکھا ہے اور اس جنگ زرگری میں استعمال ہونے والے ہتھکنڈوں کی اذیت ناک کاٹ پورے طور پر محسوس کی ہے۔ انہوں نے عوام اور عوامی مسائل کے نام پر ووٹ کی خیرات طلب کرنے والوں کے باطن کو پرکھا ہے اور ان کے عجز و انکسار کے نمائشی لبادوں میں چھپے ہوئے بے رحم پندار کے تیور بھانپے ہیں۔ اس سے کون واقف نہیں کہ محنت کشوں، مفلسوں اور فاقہ کشوں کے یہ غمخوار حسین وعدوں کے جال پھیلا کر کتنی لجاجت آمیزی کے ساتھ عرضِ مُدعا کے لیئے زبان کھولتے ہیں اور حصولِ مقصود کے بعد لوحِ ذہن سے ہر اس نقش کو کھرچ دیتے ہیں جس کا تعلق ادائے فرض سے ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔ پرویز کی نظم "روشنی کو ووٹ دو" کے بعض حصے ملاحظہ فرمایئے اور ان کی نکتہ ورانہ حق گوئی کے معیار کا اندازہ کیجئے:

بھری ہوئی تجوریاں تمہیں پکارتی رہیں
سفید پوش چوریاں تمہیں پکارتی رہیں
ہوس کی سینہ زوریاں تمہیں پکارتی رہیں
کہ میٹھی میٹھی لوریاں تمہیں پکارتی رہیں
مگر یہ وقتِ شب نہیں کہ تیرگی کو ووٹ دو

شریکِ کارواں ہو تم امیرِ کارواں بنو
زمیں کو روح بخش دو، حریفِ آسماں بنو
کہو فسانہ نور کا سحر کی داستاں بنو
نظر بنو، ذہن بنو، زباں بنو، بیاں بنو
سنو پیامِ روشنی کا، روشنی کو ووٹ دو

یہ اور اس نوع کی دوسری نظمیں جن کی تعمیر میں ہنگامی واقعات کا آب و رنگ جزواً یا کلیتہً پایا جاتا ہے، نہ صرف یہ ظاہر کرتی ہیں کہ موضوع کے مختلف واقعاتی پہلوؤں، ان کی اندرونی تہوں، نیز ان کی گہرائیوں تک پہنچنے میں پرویز کا شعور بڑی سُبک رفتاری اور چابکدستی دکھاتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ ان کی فنکارانہ صناعیاں ہنگامی موضوعات کے پیکر میں دوامی اقدار کی روح پھونکنے کا پورا پورا سلیقہ رکھتی ہیں۔ ان نظموں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے فن کی دنیا کسی حد، کسی دائرے کی پابند نہیں اور ایک شاعر اپنے قلم کے

ہر شعبۂ حیات سے موضوع و مواد حاصل کرسکتا۔ بشرطیکہ وہ اپنے منصب کی عظمتوں اور فن کی نزاکتوں کا عرفان رکھتا ہوں۔ چنانچہ یہ ضرور کہا جائے گا کہ پرویز نے اپنے منصب کی بھی حفاظت کی ہے اور فن کی آبرو بھی بچائی ہے اور یہ بھی کہا جائے گا کہ پرویز کی وہ نظمیں جن کے موضوعات ہنگامی نوعیت رکھتے ہیں، زیادہ پُر وقار، خروش انگیز، نیز وَلولہ آفریں ہیں اور اپنی خارا گداز شعلہ نوائیوں کے دوش بدوش فنی ندرتوں اور رعنائیوں سے بھی معمور ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اس کے جواب میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ غالباً پرویز ہنگامی واقعات کو اتنی ہی شدت سے محسوس کرنے کے عادی ہیں جس قدر شدت ان واقعات میں اصلاً ہوتی ہے۔ وہ فطرتاً ہنگامہ پسند نہیں لیکن یہ بھی اقتضائے فطرت سے بعید نہیں کہ شاعر کسی واقعہ کی شر انگیزی سے خواہ اس کی نوعیت وقتی ہی کیوں نہ ہو، زیادہ متاثر ہو، البتہ پرویز ایسے موضوعات کو بھی جذبہ کی تیز آنچ دے کے پورے طور پر تپا دیتے ہیں۔ وہ موضوعات و واقعات کی سنگینیوں کو فکر میں حل کرنے کے فن سے آگاہی رکھتے ہیں اور اس فن کو پورے خلوص کے ساتھ برتتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے بعض ہم عصروں کی طرح خام مواد کا گودام نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا فن "نعرہ" اور "لیبل" سے پاک ہے، لیکن ان کی کائنات، "نعرہ" اور "لیبل" تک محدود نہیں بلکہ یہ صرف ان کے نظریۂ فن کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور اپنے اصولی حدود سے متجاوز نہیں ہوتے پرویز کی شاعری ان تمام عصری تقاضوں کی نمائندہ ہے جن کی تکمیل کی توقع کسی شاعر سے کی جاسکتی ہے، وہ شاعر جو اہلِ فکر و نظر ہو۔ اسکی تصدیق کے لیے ان کی نظمیں "ایلچی کو برٹینیا کی بیوہ کے نام"۔ "رجز انقلاب"۔ "یا نگسی کو سلام"۔ "ہم نوجواں ہیں"۔ "ضیافت" اور "خوش آمدید" وغیرہ کافی ہیں۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان ایک عظیم سیاسی انقلاب سے دوچار ہوا اور اپنے طویل اور کٹھن سفر کے اس مرحلہ تک جا پہنچا جسے "آزادی" کہتے ہیں۔ اس انقلاب نے خیر و برکت کے نئے خزینوں کی طرف نشاندہی کی، جن کی کھوج میں ہمارے قافلے کو تازہ دم ہوکر آگے بڑھنا تھا، لیکن یہ بھی دورِ نو کا ایک المیہ ہے کہ ہمارے راہبر مرحلے کو منزل تصور کر بیٹھے جس نے قطعِ سفر کی صورت پیدا کردی وہ اس سیاسی آزادی کو جو معاشی و معاشرتی ڈھانچے کی تشکیلِ نو کے بغیر سعیٔ رائیگاں کے مترادف ہے، قرنوں کی مساعی کا منتہا سمجھ بیٹھے۔ اس خوش فہمی نے جہاں ارتقائی عمل کی صالح اور ٹھوس تحریکیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا، وہیں ایک اندرونی کرب کی بھی تخلیق کی جس نے ہندوستان کے مستقبل کو دھندلاہٹوں میں گم کر دیا۔ علم اور دانش ورول کے دوش بدوش ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس المیہ کو محسوس کیا اور ان کے احساس میں مقابلتہً زیادہ شدت اور اخلاص مندی تھی، جس کا ان کی نگارشات میں جھلکنا لازمی تھا۔ یہ جھلکیاں روز بروز زیادہ واضح اور گہری ہوتی گئیں اور ان کا احاطۂ اثر بھی بڑھتا گیا۔

مخدوم، سردار جعفری اور کیفی وغیرہ کی طرح پرویز نے بھی ان حالات پر بیباکانہ تبصرہ کیا اور جہاں رہنماؤں کو سختی کے ساتھ ٹوکا وہیں جمہور کے حوصلوں کو بھی بڑھایا۔ پرویز کے احساس میں کتنی شدت اور گہرائی ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ان کی بعض نظموں کے اقتباسات مندرج ذیل ہیں۔

ابھی بھوک کی بھٹیوں میں جوانی جلی جا رہی ہے
دَمکتے سے گالوں پہ غربت کی ہلدی ملی جا رہی ہے
ترقی کی ہر آرزو بے دِلی میں ڈھلی جا رہی ہے
مسرت ابھی تک غزلخواں نہیں ہے ہمارے وطن میں

سبق درسگاہوں میں بیچارگی کا دیا جا رہا ہے
پلاکر شرابِ ہوس خونِ دل کا پیا جا رہا ہے
جنونِ محبت سے کارِ تجارت لیا جا رہا ہے
ابھی لطفِ چاکِ گریباں نہیں ہے ہمارے وطن میں
"جوانی ہمارے وطن میں"

یہ سلاخیں، یہ پہرے، یہ تالے
کالے قانون کی یہ زنجیریں

یہ ہوا، یہ پہاڑ، یہ بن باسی
یہ فضا کی مہیب تصویریں
یہ نظر بندیاں طویل و دراز
سر پہ تھوپی ہوئی یہ تقصیریں
جھوٹ کی یہ ذلیل سی سازش
جھوٹے الزام، بھونڈی تقریریں
پر بریدہ سے نامہ و پیغام
باتیں مجروح، زخمی تحریریں
"بربط دل"

لیکن "بھوک کی بھٹیوں میں جوانی کے جلنے" اور "کالے قانون کی زنجیروں" کے باوجود پرویز ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں اور نہ مایوس ہونا ان کا شیوہ ہے۔ ان کی نگاہیں ہمیشہ تصویر کے دونوں رخوں کا جائزہ لیتی رہتی ہیں اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ وہ تاریک پہلو پر بڑی عمیق نظر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ان کے شعوری عمل کا ایک جزو ہے جس کا مقصد اد عائے تال اندیشی کے مثبت پہلوؤں کو مستحکم تر کرنا ہے غیر یقینی حالات میں تصویر کے اس رخ پر عمیق تر نظر رکھنی چاہیے جو غیر روشن یا تاریک ہو۔ پرویز بھی اس پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن نہ وہ حوادث کے سامنے سپر انداز ہونا جانتے ہیں نہ فردا کے خوش آیند لمحات کو نذر یاس کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی رجائیت پسندی اور حوصلہ مندی انہیں ہر حال میں پر امید اور سینہ سپر رکھتی ہے۔ وہ محاذ حیات پر کامل جوش مجاہدانہ کے ساتھ ڈٹے رہنا چاہتے ہیں اور اس سے گریز یا فرار کی صورت نہیں سوچتے۔ وہ کہتے ہیں:

پامال گردنوں کی بلندی کے واسطے
خوش ہو رہا ہوں رکھ کے ہتھیلی پہ سر کو میں

پرویز کی شاعری میں خارجی واقعات و حقائق کی عکاسی زیادہ ہے جسے کوئی غیر شعوری یا نادانستہ عمل نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی پشت پر شعور و قصد کی بھرپور طاقت کام کرتی ہوئی ملتی ہے، جس کے سینے میں انقلاب کی تند خو دھڑکنوں کا آتشیں تلاطم ہے۔ پرویز کے مجموعۂ کلام "رقص حیات" کی نظمیں ہوں یا غزلیں، ان کا طائرانہ جائزہ بھی اس انکشاف کے لیے کم نہیں کہ شاعر عقیدہ، فن کی افادیت و مقصدیت پر بڑا مستحکم اور راسخ اور یہ بات زیر بحث نہ لائی جائے کہ شاعری کو مقصدیت کا پابند بنانا کہاں تک درست ہے، تو نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل خارجیت کی درآمد سے نہیں جس کی رو میں داخلی عناصر کا تناسب از خود گھٹ جاتا۔ شاعر کا سوچا سمجھا ہوا عمل ہوگا، جس کو شاعرانہ منصوبہ بندی تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن معمولی اور غیر معمولی شاعر کے درمیان حد امتیاز یہ ہوتی ہے کہ ایک، شاعری کو تبلیغی داؤ پیچ یا پارٹی مینی فسٹو بنا کر رکھ دیتا ہے اور دوسرا خشک موضوع کو بھی جمالیات کا رنگ و روغن دے کر چمکا دیتا ہے۔ پرویز کی انفرادیت کو اجاگر کرنے والی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری ہر موضوع سے کھیلی ہے، لیکن خود کھیل نہیں بنی۔ ان کے اسلوب میں جا بجا قدرے کرختگی اور خشکی ضرور ہے مگر اسی کے ساتھ یہاں رچاؤ، انوکھے پن، شستگی اور نفاست کی جو کیفیات ہیں وہ بڑی خوبصورتی سے اس کی تلافی کر دیتی ہیں۔

شاعری کو مقصدیت کا آلۂ کار بنانے والوں نے جمالیاتی پہلوؤں نیز فن کی حسین قدروں کو بڑا نقصان پہنچایا "خرابیٔ بسیار" کے بعد خود انہیں کے لیے شرمساری و تاسف ہوا، لیکن پرویز نے سیاسی اور ادبی نظریے کے اشتراک و ہمنوائی کے باوجود اپنے کسی پیش رو یا ہمعصر کی بے راہ روی سے کوئی ناخوشگوار اثر قبول نہیں کیا اور نہ طوفانی محرکات کی انگیزی ان کے استحکام کو جنبش میں لا سکی بلکہ انہوں نے ثابت قدمی کے ساتھ اپنے اسلوب کو محفوظ و برقرار رکھا۔ ہمعصروں اور ہم مشربوں کی طرح زندگی، دھرتی اور آدم پر پرویز نے بھی عمیق لگاؤ کا اظہار کیا، لیکن اس لگاؤ کو شہرت آسانی کا حیلہ نہیں بنایا۔ انہوں نے مفلسی و بیروزگاری، طبقہ واریت، سماجی و معاشی عدم مساوات جیسے مسائل کو

رُوپ دینے کے لیے پُر زور تیشہ آزمائی کی۔ بیشتر شعرا نے صرف پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر بلند آہنگ نعروں کے بَل بُوتے پر "عظیم" بننے کے وسائل پیدا کئے، لیکن پرویز نے کوہ کنی کا فرض ادا کیا۔

ان کی شاعری میں نظریاتی حصاربندی یقیناً ہے جو ان کے دائرۂ فکر کو سمٹنے اور پھیلنے سے روکتی ہے۔ لیکن ان کے شاعرانہ تیور یہ بتاتے ہیں کہ ان میں حیات و کائنات کے ہر موضوع کی چٹانوں کو تراشنے اور انہیں اپنی آذری کے ذریعہ سانچے میں ڈھالنے کی قدرت موجود ہے، جس کے اشارے خود ان کی نظموں اور غزلوں سے ملتے ہیں۔ وہ اپنے موضوعات کو خواہ وہ کتنے ہی غیر شاعرانہ اور بے رس ہوں، فکر و فن کی لطافتیں دے کر ادبِ عالیہ کا جُزو بنا دیتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے یہاں "رُوحِ عصر" کے پہلو بہ پہلو کلاسیکی ادب کی رُوح بھی اپنی تمام تر توانائی، وسعتوں اور گیرائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری، آفاقی قدروں سے بہ آسانی ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور ان کے یہاں جہاں کہیں بھی اس نوع کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں ان میں بڑی فکری کجکلاہی اور نیرنگی ہے۔

گذشتہ رُبع صدی کے متواتر تجربات کی تلخ انجامی اور مشاہدات کی عبرت سامانی نے جہاں متعدد انتہا پسند شعرا کو جھنجھوڑا ہے، وہیں کسی نہ کسی حد تک ہی، پرویز کو بھی اپنی "نظریہ پرستی" پر متاسف ہونا پڑا ہے جو، ان کے ذہن کو کسی بُنیادی تغیر تک نہ ہی لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے فن کے بعض پہلوؤں پر نگاہِ ثانی کی منزل تک ضرور لایا ہے، جس سے خوش آیند توقعات کے روشن دریچے کھلتے ہیں۔ یہ تغیر پرویز کو نئی سمتوں میں لے جائے گا جہاں تازہ تر موضوعات کے شاداب جزیرے ان کے منتظر ہیں اور اس امکان کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ وہ آیندہ "شیروانی" جیسی اور بھی نظمیں تخلیق کر سکیں گے جنہیں دوسری زبانوں کی بلند پایہ نظموں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکے۔

پرویز نے بقول خود یہ نظم اپنی گرم شیروانی کی بیسویں سالگرہ پر لکھی تھی۔

تیری طلب میں دل نے کیا آفتیں اُٹھائیں
۔۔ آرزوئیں کچلیں، سو خواہشیں دبائیں
کتنی ضرورتوں کی خود دھجیاں اُڑائیں
کتنے جری تقاضوں کی گردنیں جُھکائیں
کتنی "ریاضیاتی" گلیوں کی خاک چھانی
اے میری شیروانی!
یاد ہیں مجھ سے اپنی کتنی ضیافتوں کی
کتنے مشاعروں کی، کتنی صدارتوں کی
کتنی نوازشوں کی، کتنی عنایتوں کی
پہلو نوازیوں کی، تپتی محبتوں کی
تھی طرزِ میہمانی میں شانِ میزبانی
اے میری شیروانی!
میں بیسواں جنم دن تیرا منا رہا ہوں
پھر نغمہ رفو کا بربط بجا رہا ہوں
پیہم نوازشوں کے پھر گیت گا رہا ہوں
ہر چاک رفو سے تیرے آنکھیں لڑا رہا ہوں
دے سکتا کاش تجھ کو میں عمرِ جاودانی
اے میری شیروانی!

خواجہ احمد عباس اس باب میں مشہور بھی ہیں اور رُسوا بھی کہ وہ اخباری مواد پر نہ صرف افسانوں کی اساس ہی استوار نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات ان کی تشکیل و تعمیر میں بھی اس مواد کی جُزئیات کو صرف کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ پرویز نے اپنی شاعری میں بھی بعض مواقع پر اس تکنیک سے کام لیا ہے اور اس ضمن میں ان کی وہ نظمیں خصوصیت کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں جن کا تعلق "تحریکِ نظریہ" سے بڑا واضح اور مضبوط ہے۔ مثلاً "پال رابسن کے نام" "یانگسی کو سلام" "خوش آمدید" "والگا کو سلام" "استالن" "ضیافت" اور "ایلچی کو بریتا کی بیوہ کے نام" وغیرہ۔ لیکن پرویز محض ان نظموں کے موضوعات کے لیے اخباری رپورٹوں کے منت کش ہیں جن کی

[illegible] جاپان کا ایک [illegible]

تعبیر کیے ہیں۔ آخری اشعار نظم کے [illegible] ہیں:

[illegible] تیرا [illegible] سے رخصت ہوا

[illegible] آفت ہوا

[illegible] آسمان زمیں [illegible] قیامت ہوا

[illegible] تیرا سر [illegible] تند ہلاکت ہوا

سرخ غلطہ چھپا تیرے سینہ میں تھا، ناگہاں بھی گمانِ فساد ہوا

اے بہن! یوں اکیلی نہ آنسو بہا

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

اے بہن! تیرے ہونٹوں کی کلی کی شفق اپنے ہونٹوں کو رنگیں بناتا تھا

تیرے رخسار سے لیکے شادابیاں اپنی آنکھوں میں گلشن کھلاتا تھا وہ

چوم کر ننھے بچوں کی پیشانیاں آرزوؤں کی محفل سجاتا تھا وہ

مچھلیاں گیت گا کر پکاتی تھی تو اور کھاتے ہوئے گنگناتا تھا وہ

جب بھی روتی تھی تو آہ بھرتا تھا وہ، جب بھی ہنستی تھی تو مسکراتا تھا وہ

یہ تبسم اسی کا تبسم نہ تھا

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

اس تبسم میں ہے زندگی کی تڑپ اس تبسم سے ڈرتی ہیں سلطانیاں

اس تبسم میں ہے امن کی آرزو آرزو میں امنگوں کی طغیانیاں

لہلہاتے ہوئے کھیت کی شوخیاں ندیوں کی طرب خیز جولانیاں

ساگروں کے مچلتے ہوئے زمزمے ان میں ہچکولے کھاتی جاپانیاں

اس تبسم سے شاداب آبادیاں اس تبسم کی حسرت میں ویرانیاں

اس تبسم کا رنگین ہے سلسلہ!

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ اکیچی کوبزیما جاپان کا وہ ماہی گیر تھا جو جزیرہ بکنی میں ہائیڈروجن بم کے تجربے کا اولیں شکار تھا۔ اس نظم کی ہیئتی تعمیر ہی میں نہیں بلکہ اس کی روح میں خلوص نہ درد مندی اور پورے انسانی معاشرے سے ربط غائبانہ کی بڑی تاثر انگیز کسک موجود ہے جس میں عالمی امن اور بقائے باہم کی نشاط آگیں

[illegible] کے بھی حامل ہیں

[illegible] کی تعداد قریبا چالیس ہے، ان میں سے بیشتر رباعیاں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ جن میں ایک نئی دنیا کی تعمیر اور نئے نظام کی تشکیل کے خواب انگڑائیاں لیتے ہوئے ملتے ہیں۔ پرویز کی شاعری کا وہ پہلو جو انقلاب کی آہٹ اور سحر کی جھلملاہٹ رکھتا ہے رباعیات میں بھی پوری قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے اور قاری [illegible] پوری قوت سے جھنجھوڑتا ہے۔ چند رباعیوں میں رومانی و عمرانی عناصر کی بھی چاشنی ہے مگر فی الاصل ان کی تمام رباعیوں کے تیور وہی ہیں جن سے ان کے شاعرانہ مزاج کا خمیر اٹھا ہے۔ رباعیوں کا وجود قلم کا ذائقہ بدلنے کی سی ہی کسی کیفیت کا نتیجہ کیوں نہ ہو، لیکن ان کی رباعیوں میں ایک انوکھی آن بان ضرور ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے، پرویز اور فیض دونوں غزل کو خارجی حقائق کی عکاسی کے لیے استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ ان حقائق کے احاطے میں وہ تمام موضوعات سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق سیاسی، سماجی اور معاشی امور سے ہے لیکن دونوں کی غزل گوئی میں جہاں پہلا اور بنیادی فرق معیار کا ہے، وہیں قدم پر دونوں کا لہجہ بھی مطلقاً جداگانہ اور متضاد ملتا ہے۔ غزل کی روایات کا احترام، پرویز اور فیض دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن فیض کی غزل دل کو درد و سوز میں ڈبو دیتی ہے تو پرویز کی غزل رجزیہ جذبات کو بیدار کرتی اور مہمیز کرتی ہے۔ فیض غزل پر رات کے المناک سناٹے میں ابھرنے والی کسی مدھم حزن انگیز نے کا گمان ہوتا ہے تو پرویز کی غزل یہ احساس پیدا کرتی ہے، جیسے کوئی برق رفتار قافلہ اپنی منزل کی جانب پورے جوش و خروش سے بڑھ رہا ہو۔ پرویز کے یہاں لسانی اور تخیلی تعمیر و تزئین کا جو بانکپن اور استحکام ہے فیض کے یہاں مفقود ہے اور فیض کے یہاں دل کے نازک گوشے کو نوکِ نشتر سے چھیڑنے والی جو خلش انگیز کیفیت ہے، وہ پرویز

[illegible] پرویز کی غزلیہ شاعری ظاہری طنطنہ و دبدبہ سے
[illegible] توانائی و گیرائی، صلابت و
[illegible] ہے وہ اُسے اچھے
[illegible]
پرویز کی غزلوں کے چند اشعار [illegible] ذیل ہیں۔

⁂

تضادات سرمایہ داری نے [illegible] کی نغمہ سرائی نوازا
زمیں مرکز سطوت زندگی تھی آسمانِ شہریاری نے مارا

ہے تابناک تیرگی سیم و زر ابھی
آیا نہیں ہے وقتِ طلوعِ سحر ابھی
جلوے ہیں محسنِ حسن سے طوقِ گلوئے زر
زندانیوں میں ہے نگہِ معتبر ابھی

بوئے گل، موجِ صبا، ذوقِ نوا، سب پابند
ایک شعلہ ہے جو آتا ہے، معلوم نہ تھا
آشیانے کو سجاتا ہے چمن میں مالی!
یہ بھی سازشِ صیاد ہے، معلوم نہ تھا

قوت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے
آدمی کے دشمن کو، آدمی نہیں کہتے

توڑ تو پاؤں کی زنجیر کو آزادیٔ شوق
سایۂ زلفِ گرہ گیر تک آ پہنچی ہے
گیت ہریالی کے گائیں گے سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غارتِ جاگیر تک آ پہنچی ہے

دیئے گرہی نے مجھ کو سبقِ خود اعتمادی
میں پہنچ گیا ہوں منزل پہ بچھڑ کے رہنما سے

دل کی دھڑکنوں سے اِک داستاں بنانا ہے
آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بنانا ہے

مری ہمت نے توڑی ہیں یہاں انگڑائیاں جتنی
انہیں تاریخ میں محفوظ کر رکھا ہے دنیا نے

ذرا بیدار تو ہو جائے غیرت تشنہ کامی کی
لبِ میخوار کو خود چوم لیں گے بڑھ کے پیمانے

ناخدائی کی بھلا آپ کو زحمت کیا دیں
ہم ہیں طوفان کو سمجھے ہوئے، طوفاں ہم کو

اب ضامن رسائی منزل ہے ہر قدم
لے کر چلا ہوں ساتھ شعورِ سفر کو میں
اپنے نقوشِ پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصابِ سفر کو میں

⁂

پرویز کے یہاں دو ایک مقامات کے علاوہ، جنہیں اسلئے دستی تصور کیا جائے گا وہ ترقی پسند تحریک کے بعض انتہا پسندانہ رجحانات، نیز اس دور کے ایک ہمہ گیر "ادبی فیشن" کے نمائندہ معلوم ہوتے ہیں۔ محبوب یا محبت سے بیزاری کا اظہار کہیں نہیں ملتا بلکہ وہ محبوب کو اپنی خلوت و جلوت کا شریک اور سفرِ حیات میں اس کو اپنا ہم قدم بنانے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ غزل میں وہ محبوب اور محبت کا ذکر کم از کم لانا چاہتے ہیں جس کا سبب غزل کی فرسودہ اقدار کا شدید ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ قدیم غزل کی ان فرسودہ روایات کے شدید احساس نے ہی حالی، چکبست اور اقبال کو غزل کا رُخ دوسری سمتوں میں موڑنے پر مجبور کیا۔ ان تینوں شعرا کے یہاں شاعری کو مقصدیت اور افادیت دینے کی شعوری و نظریاتی کوشش نمایاں ہے۔ پرویز نے بھی اسی ڈگر کو اپنایا اور نظم کے دوش بدوش غزل کو بھی ان عناصر سے معمور کرنے کی سعی کی جن سے زندگی و شاعری کی جدید اقدار کو فروغ دینے میں مدد مل سکے۔ یہ ضرور ہے کہ پرویز کی غزل پر سیاسی محرکات و عوامل کی چھاپ بڑی گہری ہے جو ان کی جولانِ نگاہ و فکر کی احاطہ بندی کرتی ہے۔ لیکن ایک باشعور اور ہوشمند فنکار ہونے کے ناطے وہ غزل کی فضا کو کشادہ تر کرنے پر کامل توجہ صرف کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی غزل گوئی جلد ہی حیات و کائنات کے دوسرے موضوعات کو بھی اپنی آغوش میں لے لے گی۔

بنیاد پر ان کی تخلیق و ابلاغی جہتر مثنویوں نے بڑے نظر فریب شیش محل تعمیر کیے ہیں۔ آخری الذکر نظم کے اقتباسات حاضر ہیں :

اے بہن! جانتا ہوں کہ شوہر ترا الچی آج دنیا سے رخصت ہوا
ہائیڈ روجن کے سفاک طوفان میں پیسفک کا سکون غرقِ آفت ہوا
ریڈیائی شعاعوں کے ہیجان سے آسمان رقص گاہِ قیامت ہوا
ایٹمی لہر کے سانپ نے ڈس لیا، تیرا سرتاج نذرِ ہلاکت ہوا
سُرخ خطرہ چھپا تیرے سیندور میں تھا، مانگ بھی گمانِ بغاوت ہوا
اے بہن! یُوں اکیلی نہ آنسو بہا
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا
اے بہن! تیرے ہونٹوں کی مَل کر شفق اپنے ہونٹوں کو رنگیں بناتا تھا وہ
تیرے رخسار سے لیکے شادابیاں اپنی آنکھوں میں گلشن کھلاتا تھا وہ
چُوم کر ننھے بچوں کی پیشانیاں، آرزوؤں کی محفل سجاتا تھا وہ
مچھلیاں گیت گا کر پکاتی تھی تُو اور کھاتے ہوئے گنگناتا تھا وہ
جب بھی روتی تھی تو آہ بھرتا تھا وہ، جب بھی ہنستی تھی تُو مسکراتا تھا وہ
یہ تبسم اسی کا تبسم نہ تھا
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا
اس تبسم میں ہے زندگی کی تڑپ، اس تبسم سے ڈرتی ہیں سلطانیاں
اس تبسم میں ہے امن کی آرزو، آرزو میں اُمنگوں کی طغیانیاں
لہلہاتے ہوئے کھیت کی شوخیاں، ندیوں کی طرب خیز جولانیاں
ساگروں کے مچلتے ہوئے زمزمے، ان میں ہچکولے کھاتی جہاں بانیاں
اس تبسم سے شاداب آبادیاں، اس تبسم کی حسرت میں ویرانیاں
اس تبسم کا رنگین ہے سلسلہ!
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ الچی کوبوئیما جاپان کا وہ ماہی گیر تھا جو جزیرہ بکنی میں ہائیڈروجن بم کے تجربے کا اولیں شکار تھا۔ اس نظم کی ہیئتی تعمیر ہی میں نہیں بلکہ اس کی روح میں مخلصانہ درد مندی اور پورے انسانی معاشرے سے ربط غائبانہ کی بڑی تاثر انگیز کسک موجزن ہے۔ جس میں عالمی امن اور بقائے باہم کی نشاط آگیں

آرزو میں غلطاں بھی ہیں۔

"رقصِ حیات" کے چند صفحات رباعیوں کے بھی حامل ہیں جن کی تعداد تقریباً چالیس ہے۔ ان میں سے بیشتر رباعیاں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ جن میں ایک نئی دنیا کی تعمیر اور نئے نظام کی تشکیل کے خواب انگڑائیاں لیتے ہوئے ملتے ہیں۔ پرویز کی شاعری کا وہ پہلو جو انقلاب کی آہٹ اور صبحِ نو کی جھلملاہٹ رکھتا ہے رباعیات میں بھی پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے اور خوابیدہ ذہنوں کو پوری قوت سے جھنجھوڑتا ہے۔ چند رباعیوں میں رُومانی و خمریاتی عناصر کی بھی چاشنی ہے مگر فی الاصل ان کی تمام رباعیوں کے تیور وہی ہیں جن سے ان کے شاعرانہ مزاج کا خمیر اُٹھا ہے۔ رباعیوں کا وجود قلم کا ذائقہ بدلنے کی سی ہی کسی کیفیت کا نتیجہ کیوں نہ ہو، لیکن ان کی رباعیوں میں ایک انوکھی آن بان ضرور ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے "پرویز" اور فیض دونوں غزل کو خارجی حقائق کی عکاسی کے لیے استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ ان حقائق کے احاطے میں وہ تمام موضوعات سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق سیاسی، سماجی اور معاشی اُمور سے ہے لیکن دونوں کی غزل گوئی میں جہاں پہلا اور بنیادی فرق معیار کا ہے، وہیں دوسرے قدم پر دونوں کا لہجہ بھی مطلقاً جداگانہ اور متضاد ملتا ہے۔ غزل کی روایات کا احترام، پرویز اور فیض دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن فیض کی غزل دل کو درد و سوز میں ڈبو دیتی ہے تو پرویز کی غزل رجزیہ جذبات کو بیدار کرتی اور بھڑکاتی ہے۔ فیض کی غزل پر رات کے المناک سناٹے میں اُبھرتے والی کسی مدھم اور حُزن انگیز نے کا گمان ہوتا ہے تو پرویز کی غزل یہ احساس پیدا کرتی ہے، جیسے کوئی برق رفتار قافلہ اپنی منزل کی جانب پورے جوش و خروش سے بڑھ رہا ہو۔ پرویز کے یہاں فنی لسانی اور تخیلی تعمیر و تزئین کا جو بانکپن اور استحکام ہے وہ فیض کے یہاں مفقود ہے اور فیض کے یہاں دل کے نازک گوشوں کو نوکِ نشتر سے چھیڑنے والی جو خلش انگیز کیفیت ہے، وہ پرویز

لتی لیکن پرویز کی غزلیہ شاعری ظاہری طنطنہ و دبدبہ کے
بے باطن میں آگہی و تازگی، توانائی و گیرائی، صلابت و
ور شوکت و سطوت کے جو عناصر رکھتی ہے، وہ اُسے اچھے
ف میں جگہ دیتے ہیں۔
پرویز کی غزلوں کے چند اشعار سپرد ذیل ہیں:

٭

تضادات سرمایہ داری نے مارا اشتراکی کو آخر شہنشاہی نے مارا
زمیں سرکر سطوت زندگی تھی اُسے آفتِ شہریاری نے مارا

ہے تابناک تیرگیٔ سیم و زر ابھی
آیا نہیں ہے وقتِ طلوعِ ہنر ابھی
جلتے ہیں محنِ جمن کے طوقِ گلو نے ترق
زندانیوں میں ہے نگہِ معتبر ابھی

رنگِ گل، موجِ صبا، ذوقِ نوا، سب پابند
ایک ضرب ہے جو آنا ہے، معلوم نہ تھا
آشیانے کو سمجھتا ہے چمن میں مالی!
یہ بھی سازشِ صیاد ہے، معلوم نہ تھا

موت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے
آدمی کے دشمن کو، آدمی نہیں کہتے
توڑتی پاؤں کی زنجیر کو آزادیٔ شوق
سایۂ زلفِ گرہ گیر تک آپہنچی ہے
گیت ہریالی کے گاتیں گے سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غارتِ جاگیر تک آپہنچی ہے

بہکے گمرہی نے مجھ کو سبقِ خود اعتمادی
میں پہنچ گیا ہوں منزل پہ بچھڑ کے رہنما سے
دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بنانا ہے
آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بنانا ہے
مری ہمت نے توڑی ہیں یہاں انگڑائیاں جتنی
اُنہیں تاریخ میں محفوظ کر رکھا ہے دُنیا نے

ذرا بیدار تو ہو جائے غیرت تشنہ کامی کی
لبِ میخوار کو خود چوم لیں گے بڑھ کے پیمانے
ناخدائی کی بھلا آپ کو زحمت کیا دیں
ہم ہیں طوفان کو سمجھے ہوئے، طوفاں ہم کو
اب ضامن رسائیٔ منزل ہے ہر قدم
لے کر چلا ہوں ساتھ شعورِ سفر کو میں
اپنے نقوشِ پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصابِ سفر کو میں

٭

پرویز کے یہاں دو ایک مقامات کے علاوہ، جنہیں اسلئے
رسمی تصور کیا جائے گا وہ ترقی پسند تحریک کے بعض انتہاپسندانہ
رُجحانات، نیز اُس دَور کے ایک ہمہ گیر "ادبی فیشن" کے نمایندہ
معلوم ہوتے ہیں۔ محبوب یا محبت سے بیزاری کا اظہار کہیں نہیں
ملتا بلکہ وہ محبوب کو اپنی خلوت و جلوت کا شریک اور سفرِ حیات میں
اس کو اپنا ہم قدم بنانے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور
مترشح ہوتا ہے کہ غزل میں وہ محبوب اور محبت کا ذکر کم از کم لانا
چاہتے ہیں جس کا سبب غزل کی فرسودہ اقدار کا شدید ردِ عمل ہو سکتا
ہے۔ قدیم غزل کی ان فرسودہ روایات کے شدید احساس نے ہی —
حالی، چکبست اور اقبال کو غزل کا رُخ دوسری سمتوں میں موڑنے
پر مجبور کیا۔ ان تینوں شعرا کے یہاں شاعری کو مقصدیت اور افادیت
دینے کی شعوری و نظریاتی کوشش نمایاں ہے۔ پرویز نے بھی اسی
ڈگر کو اپنایا اور نظم کے دوش بدوش غزل کو بھی ان عناصر سے معمور
کرنے کی سعی کی جن سے زندگی و شاعری کی جدید اقدار کو فروغ
دینے میں مدد مل سکے۔ یہ ضرور ہے کہ پرویز کی غزل پر سیاسی محرکات
و عوامل کی چھاپ بڑی گہری ہے جو ان کی جولانیٔ فکر کی احاطہ
بندی کرتی ہے۔ لیکن ایک باشعور اور ہوشمند فنکار ہونے کے ناتے
وہ غزل کی فضا کو کُشادہ تر کرنے پر مائل توجہ صرف کر رہے ہیں
توقع ہے کہ ان کی غزل گوئی جلد ہی حیات و کائنات کے دوسرے مسائل کو بھی اپنی آغوش میں لے لیگی۔

بنیاد پر ان کی تخلیقی و ابلاغی ہنر مندیوں نے بڑے نظر فریب شیش محل تعمیر کیے ہیں۔ آخری الذکر نظم کے اقتباسات حاضر ہیں :

اے بہن! جانتا ہوں کہ شوہر ترا اِلچی آج دُنیا سے رخصت ہوا
ہائیڈروجن کے سفاک طوفان میں پیسفک کا سکون غرقِ آفت ہوا
ریڈیائی شعاعوں کے ہیجان سے آسمان رقص گاہِ قیامت ہوا
ایٹمی لہر کے سانپ نے ڈس لیا، تیرا سرتاج نذرِ ہلاکت ہوا
سُرخ خطرہ چُھپا تیرے سیندور میں تھا، مانگ بھی گُمان نیاوت ہوا
اے بہن! یُوں اکیلی نہ آنسو بہا
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا
اے بہن! تیرے ہونٹوں کی کن کر شفق اپنے ہونٹوں کو رنگیں بناتا تھا وہ
تیرے رخسار سے لیکے شادابیاں اپنی آنکھوں میں گلشن کھلاتا تھا وہ
چُوم کر ننھے بچّوں کی پیشانیاں، آرزوؤں کی محفل سجاتا تھا وہ
مچھلیاں گیت گا کر پکاتی تھی تُو اور کھاتے ہوئے گنگناتا تھا وہ
جب بھی روتی تھی تو آہ بھرتا تھا وہ، جب بھی ہنستی تھی تُو مسکراتا تھا وہ
یہ تبسّم اسی کا تبسّم نہ تھا
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا
اس تبسّم میں ہے زندگی کی تڑپ، اس تبسّم سے ڈرتی ہیں سلطانیاں
اس تبسّم میں ہے امن کی آرزو، آرزو میں اُمنگوں کی طغیانیاں
لہلہاتے ہوئے کھیت کی شوخیاں، ندیوں کی طرب خیز جولانیاں
ساگروں کے مچلتے ہوئے زمزمے، ان میں ہچکولے کھاتی جہاں بانیاں
اس تبسّم سے شاداب آبادیاں، اس تبسّم کی حسرت میں ویرانیاں
اس تبسّم کا رنگین ہے سلسلہ!
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ الچی کو بوتیما جاپان کا ماہی گیر تھا جو جزیرہ بکینی میں ہائیڈروجن بم کے تجربے کا اوّلیں شکار تھا۔ اس نظم کی ہیئتی تعمیر ہی میں نہیں بلکہ اس کی روح میں مخلصانہ دردمندی اور پورے انسانی معاشرے سے ربط غائبانہ کی بڑی تاثر انگیز کسک موجزن ہے جس میں عالمی امن اور بقائے باہم کی نشاط آگیں آرزوئیں غلطاں ہوتی ہیں۔

"رقصِ حیات" کے بیشتر صفحات رباعیوں سے بھی حامل ہیں جن کی تعداد قریباً چالیس ہے۔ ان میں سے بیشتر رباعیاں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ جن میں ایک نئی دنیا کی تعمیر اور نئے نظام کی تشکیل کے خواب انگڑائیاں لیتے ہوئے ملتے ہیں۔ پرویز کی شاعری کا وہ پہلو جو انقلاب کی آہٹ اور صبحِ نو کی جھلملاہٹ رکھتا ہے رباعیات میں بھی پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے اور قاری کے ذہنوں کو پوری قوت سے جھنجھوڑتا ہے۔ چند رباعیوں میں رُومانی و خمریاتی عناصر کی بھی چاشنی ہے مگر فی الاصل ان کی تمام رباعیوں کے تیور وہی ہیں جن سے ان کے شاعرانہ مزاج کا خمیر اُٹھا ہے۔ رباعیوں کا وجود قلم کا ذائقہ بدلنے کی سعی ہی کسی کیفیت کا نتیجہ کیوں نہ ہو، لیکن ان کی رباعیوں میں ایک انوکھی آن بان ضرور ہے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے "پرویز اور فیض دونوں غزل کو خارجی حقائق کی عکاسی کے لیے استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ ان حقائق کے احاطے میں وہ تمام موضوعات سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق سیاسی، سماجی اور معاشی امور سے ہے لیکن دونوں کی غزل گوئی میں جہاں پہلا اور بنیادی فرق معیار کا ہے، وہیں دو قدم پر دونوں کا لہجہ بھی مطلقاً جداگانہ اور متضاد ملتا ہے۔ غزل کی روایات کا احترام، پرویز اور فیض دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن فیض کی غزل دل کو درد و سوز میں ڈبو دیتی ہے تو پرویز کی غزل رجزیہ جذبات کو بیدار کرتی اور بھڑکاتی ہے۔ فیض کی غزل پر رات کے المناک سناٹے میں اُبھرتے والی کسی مدھم حزن انگیز لَے کا گمان ہوتا ہے تو پرویز کی غزل یہ احساس پیدا کرتی ہے، جیسے کوئی برق رفتار قافلہ اپنی منزل کی جانب پُورے جوش و خروش سے بڑھ رہا ہو۔ پرویز کے یہاں فنکارانہ لسانی اور تخیلی تعمیر و تزئین کا جو بانکپن اور استحکام ہے فیض کے یہاں مفقود ہے اور فیض کے یہاں دل کے نازک گوشے کو نوکِ نشتر سے چھیڑنے والی جو خلش انگیز کیفیت ہے، وہ پرویز

یں ملتی لیکن پرویز کی غزلیہ شاعری ظاہری طنطنہ و دبدبہ کے
پنے باطن میں آگہی و تازگی، توانائی و گیرائی، صلابت و
، اور شوکت و سطوت کے جو عناصر رکھتی ہے، وہ اُسے اچھے
ل صنف میں جگہ دیتے ہیں۔

پرویز کی غزلوں کے چند اشعار سپردِ ذیل ہیں۔

٭

تضاداتِ سرمایہ داری نے مارا شکستہ کی کڑا غوغائی نے مارا
زمیں سرکر سطوتِ زندگی تھی اُسے آفتِ شہریاری نے مارا

ہے تابناک تیرگیٔ سیم و زر ابھی
آیا نہیں ہے وقتِ طلوعِ ہنر ابھی
جلوے ہیں حسنِ عشق کے طوقِ گلوئے فرق
زندانیوں میں ہے نگہِ معتبر ابھی

بوئے گل، موجِ صبا، ذوقِ نوا، سب پابند
ایک غنچہ ہے جو آزاد ہے، معلوم نہ تھا
آشیانے کو سجاتا ہے چمن میں مالی!
یہ بھی سازشِ صیاد ہے، معلوم نہ تھا

موت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے
آدمی کے دشمن کو، آدمی نہیں کہتے

توڑتی پاؤں کی زنجیر کو آزادیٔ شوق
سایۂ زلفِ گرہ گیر تک آ پہنچی ہے
گیت ہریالی کے گائیں بھی سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غارتِ جاگیر تک آ پہنچی ہے

دیتے گرہی تے مجھ کو سبقِ خود اعتمادی
میں پہنچ گیا ہوں منزل پہ بھٹک کے رہنما سے

دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بناتا ہے
آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بناتا ہے

مری ہمت نے توڑی ہیں یہاں انگڑائیاں جتنی
اُنہیں تاریخ میں محفوظ کر رکھا ہے دنیا نے

ذرا بیدار تو ہو جائے غیرت تشنہ کامی کی
لبِ میخوار کو خود چوم لیں گے بڑھ کے پیمانے

ناخدائی کی تھی آپ کو زحمت کیا دیں
ہم ہیں طوفان کو سمجھے ہوئے، طوفاں ہم کو

اب ضامن رسائی منزل ہے ہر قدم
لے کر چلا ہوں ساتھ شعورِ سفر کو میں
اپنے نقوشِ پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصابِ سفر کو میں

٭

پرویز کے یہاں دو ایک مقامات کے علاوہ، جنہیں استثنیٰ تصور کیا جائے گا وہ ترقی پسند تحریک کے بعض انتہاپسندانہ رُجحانات، نیز اُس دَور کے ایک ہمہ گیر "ادبی فیشن" کے نمائندہ معلوم ہوتے ہیں۔ محبوب یا محبت سے بیزاری کا اظہار کہیں نہیں ملتا بلکہ وہ محبوب کو اپنی خلوت و جلوت کا شریک اور سفرِ حیات میں اس کو اپنا ہم قدم بنانے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ غزل میں وہ محبوب اور محبت کا ذکر کم از کم لانا چاہتے ہیں جس کا سبب غزل کی فرسودہ اقدار کا شدید ردِ عمل ہو سکتا ہے۔ قدیم غزل کی ان فرسودہ روایات کے شدید احساس نے ہی — حالی، چکبست اور اقبال کو غزل کا رُخ دوسری سمتوں میں موڑنے پر مجبور کیا۔ ان تینوں شعرا کے یہاں شاعری کو مقصدیت اور افادیت دینے کی شعوری و نظریاتی کوشش نمایاں ہے۔ پرویز نے بھی اسی ڈگر کو اپنایا اور نظم کے دوش بدوش غزل کو بھی ان عناصر سے معمور کرنے کی سعی کی جن سے زندگی و شاعری کی جدید اقدار کو فروغ دینے میں مدد مل سکے۔ یہ ضرور ہے کہ پرویز کی غزل پر سیاسی محرکات و عوامل کی چھاپ بڑی گہری ہے جو اُن کی جولانیٔ فکر و نظر کی احاطہ بندی کرتی ہے۔ لیکن ایک باشعور اور ہوشمند فنکار ہونے کے ناتے وہ غزل کی فضا کو کثافت سے پاک رکھنے پر کاربند ہیں اور توجہ صرف کر رہے ہیں توقع ہے کہ انکی غزل گوئی جلد ہی حیات و کائنات کے دوسرے موضوعات کو بھی اپنی آغوش میں لے گی۔

ہمارے مسائل

عتیق تابش

اُردو شاعری میں نئے تجربے

ان دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظمِ آزاد اور نظمِ مُعرّیٰ کے ساتھ ساتھ اِدھر کچھ شاعروں نے منثور نظم کے بھی تجربے کیے ہیں۔ ہیئت سے ہٹ کر مواد و موضوع میں بھی تنوّع اور انوکھاپن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور نئی نئی علامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری، خاص طور سے اُردو نظم آگے بڑھنے کے بجائے رُو بہ زوال ہوتی جا رہی ہے۔ نئے شاعروں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے، جو پڑھنے والوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر سکے کسی کا اندازِ بیان اِتنا کاواک ہے کہ کسی عُنوان بات پلّے نہیں پڑتی اور کوئی ایسے دُور از کار خیالات کو بے سر و پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نظم چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس رُجحان کے اسباب اور اُس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے؟

نئے اَدب اور نئے ادیبوں کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے خالص جمالیاتی میزان کی ضرورت ہے، جس کے تحت ایک ناقد پر ہم بہ آسانی Universal intellect کا لیبل لگا سکتے ہیں اور اس ہمہ آشنا غور و فکر کا تانا بانا High Seriousness کا فطری جنم داتا ہوتا ہے۔ جب تک ہمارے ناقدین اضطراری محرکات و عوامِل خصوصی سے غیر جانبدارانہ رابطہ و میزان کا ایک سنجیدہ نظریہ نہیں رکھتے اُس وقت تک نیا اَدب ان کے لیے چیستان اور ایک گورکھ نفسیاتی اُلجھاؤ ہی نظر آئے گا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ نئے اَدب کو ذاتی حال پرکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہوتا آیا ہے کہ نئی بات شروع میں

کسی کے پلّے کم ہی پڑتی ہے۔ ہمارے ذہن جیسے اوائلِ عمری ہی یا ہوش کے زمانے سے دیکھتے، سنتے اور پڑھتے آتے ہیں۔ اس میں تر توضیح کسی بھی طرح مکمل نہیں معلوم ہو سکتی۔ جب تک ہم نفسیاتی نقطۂ سے اپنے میں سنجیدہ ترین پرکھ کا مادہ نہیں پیدا کر لیں۔ آج کے تجربات شعری کورانہ میکانی محرکات یا نفسیاتی اُلجھاؤ کا Over conc... نہیں بلکہ ان کے پس پشت بھی وہی معیاد وہی قدریں اور وہی صلاحیت اور شعوری نظام کار فرما ہے جو کبھی میر، کبھی انیس اور کبھی غالب جنم دے چکا ہے۔ آج کی اس پٹری پر آج ہی کی نسل کا کوئی نما ذہن حرفِ آخر کی طرح گمراہ کُن لیبل نہیں لگا سکتا۔ یہ تغیّر یہ تبدیلیاں کچھ صرف اَدب سے ہی وابستہ نہیں بلکہ دنیا کے ہر ا اور ہر شعبے میں، اور میں تو یہ کہوں گا کہ ہر دائرہ عمل میں رونما

ے۔ جو دماغ، عبدالعزیز خالد، احمد ہمیش، سلیم احمد، کوثر نقوی،
، وزیر آغا اور ثناء اللہ خاں کو ایک سانس میں شمار کر کے دعوت تحریر
ہے، اس پر قلم اٹھانا بھی حماقت ہے۔ میں یہ بھی نہیں سمجھا
ن جدید تر" شاعروں سے انہیں کیا امید ہے۔ خدا کے
رم سے یہ بانجھ نہیں۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ معزوات
ے Frustrated واقع ہوئے ہیں۔ ان میں Frankness
صلاحیت موجود ہے اور یہ اردو شاعری کو وہ سب کچھ دینا
ہیں جو اسے اب تک میسر نہیں آیا۔ سمجھئے بات ختم ہو گئی، جی
بھی اسی جملہ کا استہزائی ردِ عمل تھا جس میں لفظ "افسانے"
ت آئی ہے۔

بہرحال میں تو یہی کہوں گا کہ یہ بحث کافی قبل از وقت ہے
م از کم اس کے لئے ابھی اور پندرہ بیس سال انتظار کرنا
۔ جیسے ترقی پسند ادب کا نتیجہ آج ظاہر ہے۔ پھر بھی میں
طور سے اُن تحریکات کو لبیک کہتا ہوں، جن میں نئی تلاش
ب نامیاتی قوت کی روشنی نظر آتی ہے۔ ہر اُس تجربے کو
امید کہنا چاہیئے جو ہمارے لیے غور و فکر کی راہیں کھولے
۔ فالج زدگی و کابوس زدگی سے کیا حاصل؟ یہ تبدیلیاں، یہ
یں، یہ نت نئے تجربے ہمارے Active ذہن، اور
ی صلاحیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہم دُنیا کے ہر ترقی یافتہ
ے ادب سے آنکھیں ملا سکتے ہیں۔ وہی ادب زندہ رہے گا
یں نئے اضافے ہوتے رہیں گے۔ یہ اضافے وہ نہیں جو....
ز صاحب نے سوچ رکھے ہوں گے بلکہ یہ اضافے جن کے دائرے
طق نہ ہوں گے بلکہ انہیں ہمارے شعور، اُلجھاؤ اور نظام کی
ندگی ہو گی جس سے آفاقی عوامل دوچار ہیں۔ ان میں ژرف نگاہی
ں باطن، ارتقائی جذبہ، خالص ذہنی عمل اور ہر چیز کو کریدنے
مجھنے والے میکانکی دماغ کا پتہ چل سکتا ہے۔ یہ اضافے جہاں
ان دبیان کو ایک نئے مزاج اور نئی لذت سے آشنا کراتے ہیں
ہاں اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ آج کا جدید شعری

ذہن روایتی ردِ عمل پر ایمان رکھتے ہوئے تخلیقی قوتوں کو یونہی گنوا دینا
نہیں چاہتا بلکہ وہ اپنے نفسیاتی شعور و بیدار دماغ اور تنقیدی
ذہن سے زبان کو مالا مال کر دینا چاہتا ہے۔ نظم میں Prosaic
انداز بیان و الفاظ کی شمولیت ہماری نظم کو داخلی اور خارجی طور سے
مثبت اور ایجابی امکانات سے رُوشناس کراتے ہیں۔ نظم جس قدر
نثر سے قریب ہو گی اتنی ہی زبان میں اور شعری اقدار میں اضافہ ہو گا
وہ الفاظ جنہیں نثر سے خاطر خواہ زبان دُور کا درجہ نہیں مل سکا، نظم
اُسے آسانی سے پُورا کر سکتی ہے اور اسی لیے ہمارے مافی الضمیر کو کسی طور
سے ادا کرنے کے لیے نئے پیرائے اور خالص نثری قسم کے الفاظ کی
ضرورت در پیش آتی ہے۔ یہ رونا بھی بڑی حد تک غلط ہے کہ
ہمارے ذہن مفلوج ہو گئے ہیں اور آج کا ادیب یا نیا شاعر موجودہ
افراتفری ماحول اور ہمت شکن حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں
رکھتا اور یہ اس کی شکستِ فاش یا
شکست شعری ہے، جس بنا پر ادب میں یہ اُلجھاؤ، یہ پیچیدگیاں،
یہ بے ادبیاں اور فراری رُجحانات کا غلبہ اثر جیسے مسائل کا سامنا
کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ کہنا بذاتِ خود ایک ذہنی اور تنقیدی بصارت کے
کے فقدان کا غیر سنجیدہ نظریہ ہے۔ میر، آتش، غالب، حالی اور
اقبال کا زمانہ کسی طرح بھی سازگار نہیں کہا جا سکتا اور ایسے زمانوں میں
انہوں نے بڑے ادب کی تخلیق کی۔ شیکسپیر، براؤننگ اور ملٹن نے
بھی کس قدر غیر اطمینان بخش زمانے میں آنکھیں کھولیں اور ایسے تخلیقی اضافے
کیے جنہیں آج کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔
میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، آج ہم اس صدی سے ہمیں بڑی
توقعات رکھنا چاہیئے۔ یہ انتہائی عہدِ تاریخ و تمدن و تہذیب کا
زرین دَور ہے۔ یقیناً اس زمانے ہی میں اُردو ایسے فنکاروں کو جنم
دے چکی ہے اور دے گی جو غالب اور انیس سے کہیں بڑھ کر کارنامے
انجام دیں گے۔ غالب یا انیس یا کالی داس وغیرہ ہمارے
سنگین میزانات نہیں ہیں۔ یہ معیارات بھی ہمارے ذہنی اور بصارتی
کمزوری کی دلالت کرتے ہیں۔

بادۂ کہن

علامہ آرزو لکھنوی

ظرفِ خالی کو ٹھوکر دے کے کھنکانے سے کیا
مدعا بھی جب ہو کچھ، پوچھو گے دیوانے سے کیا

بھاگتی ہے ہر قدم میری ہوا سے اُڑ کے گرد
اب نکل جائے گی ویرانی بھی ویرانے سے کیا

یوں جما ہی پر جما ہی، توبہ توبہ کیا کہوں
ابر ہے یہ یا دھواں، اُٹھا ہے میخانے سے کیا

منہ سے کہنا اور شے ہے کر گزرنا اور بات
ختم ہے قصہ کہے گی شمع پروانے سے کیا

اک پہیلی ہے جسے سمجھا کرو، بوجھا کرو
بات کچھ، مطلب ہے کچھ، پوچھو گے دیوانے سے کیا

آتے آتے آنکھ تک، پانی ہوا، دل کا لہو
شیشے سے اُنڈلا تھا کیا، ٹپکا ہے پیمانے سے کیا

لہر پھر دل سے اُٹھی، رگ رگ میں کوندیں بجلیاں
دیکھئے کہتی ہے اب زنجیر دیوانے سے کیا

مانگنا اپنے قدح کی خیر، ہے دستورِ خلق
خُم لنڈھے ساقی تو ہم کو تیرے میخانے سے کیا

اُن کو جلدی آرزو، میں دم بخود اِس سوچ میں
سب ہے کہنے کا، کہوں کم کر کے افسانے سے کیا

(غیر مطبوعہ۔ مرسلہ جوہر محمد آبادی)

عظیم حیدرآبادی

بیٹھے بیٹھے ناصحا اب اُس کو بہکانے سے کیا
یہ تو کہئے آپ کو مطلب ہے دیوانے سے کیا

زحمتِ پند و نصیحت یوں بھی فرمانے سے کیا
مہرباں! کچھ اُس سے اپنی بات منوانے سے کیا

ہوش اُڑا دے گا اگر کچھ ہوش کی باتیں کریں
اب یہ بیہوشِ خودی کو ہوش میں لانے سے کیا

بن کے میکش ہو جو ساقی کی جلو میں رات دن
پھر غرض اُس کو رہے گی مئے و میخانے سے کیا

چشمِ میگوں کے تصور ہی سے جو بدمست ہو
پی سکے گا وہ کسی صورت بھی پیمانے سے کیا

کوئی اُس کا مدعا ہو، یہ سمجھنا بھی غلط
کام دیوانے کو پڑ سکتا ہے فرزانے سے کیا

ضد جو آئے، چاک کر ڈالے گا دامانِ خرد
اُس سے اے نادان! تجھ کو یوں اُلجھ جانے سے کیا

رکھ دیا ہو سر اطاعت میں جو پائے ناز پر
واسطہ اب اُس کو ہو مسجد سے بتخانے سے کیا

آرزوئے دُنیا کی ہے کیوں، تجھ کو اپنی کیجئے
اے عظیم ایسی ہوس میں خود کو بہکانے سے کیا

نشورؔ واحدی

○

ہستی بھی شرار ہو گئی ہے
مستی بھی خمار ہو گئی ہے

ساحل پہ ہے رہزنوں کا خطرہ
کشتی ہے کہ پار ہو گئی ہے

سب نقد خریدتے ہیں دوزخ
جنت جو اُدھار ہو گئی ہے

بدلی ہوئی اُس نظر کو دیکھا
بے قول و قرار ہو گئی ہے

کیا لکھوں کہ چشمِ تر ہی میری
افسانہ نگار ہو گئی ہے

خوشیوں کی برات چلتے چلتے
اشکوں کی قطار ہو گئی ہے

اس دور کی زندگی نہ پوچھو
تلوار کی دھار ہو گئی ہے

تھی پھول کی اِک کلی محبت
کانٹوں میں شمار ہو گئی ہے

اُس رُخ سے ہر اِک نظر پلٹ کر
تنقیدِ بہار ہو گئی ہے

شیشے کی پری نشورؔ توبہ!
دِل لے کے فرار ہو گئی ہے

یقینؔ شاہدی

○

جلتے رہنا کام ہے دِل کا، بجھ جانے سے حاصل کیا
اپنی آگ کے ایندھن میں ہم ایندھن کا مستقبل کیا

ڈوبنے والو دیکھ رہے ہو تم تو کشتی کے تختے
دیکھو دیکھو غور سے دیکھو دَوڑ رہا ہے ساحل کیا

بولو نقوشِ پا کچھ بولو، تم تو شاید سنتے ہو
بھاگ رہی ہے راہ گذر کے کان میں کہہ کر منزل کیا

اَن پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
"اندر آنا منع ہے" لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

قتل و قارِ عشق کے مجرم جہلِ ہوس کا راں ہی نہیں
ننگے اِس حمام میں سب ہیں، عالم کیا اور جاہل کیا

پروانے اب اپنی اپنی آگ میں جلتے رہتے ہیں
شعلوں کے بٹوارے سے تھا مقصدِ شمع محفل کیا

ٹوٹی دھنک کے ٹکڑے لے کر بادل روتے پھرتے ہیں
کھینچا تانی میں رنگوں کی سورج بھی ہے شامل کیا

شہریار

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

ہر ایک نقش تمنا کا ہو گیا دھندلا
ہر ایک زخم مرے دل کا بھر گیا یارو

بھٹک رہی تھی جو کشتی وہ غرقِ آب ہوئی
چڑھا ہوا تھا جو دریا اتر گیا یارو

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اُسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

حسرت سہروردی

پھول نکہت چمن بھی ہوتے ہیں
راہبر راہزن بھی ہوتے ہیں
ایسے بھی لوگ ہیں زمانے میں
جو خود اک انجمن بھی ہوتے ہیں
دیکھ ان کو نہ تو حقارت سے
اہلِ دل اہلِ فن بھی ہوتے ہیں
آدمی آدمی سبھی لیکن
آدمی آہرمن بھی ہوتے ہیں
عاشقی درد بھی، دوا بھی ہے
اس میں کچھ مکر و فن بھی ہوتے ہیں
مسکرا دیں تو زندگی رک جائے
ایسے نازک بدن بھی ہوتے ہیں
ذوقِ بزمِ شاعری اے دوست
شاعرانِ دکن بھی ہوتے ہیں
پھر کرو اہتمام دار و رسن
ہم سے اہلِ وطن بھی ہوتے ہیں
حسرت اپنی غزل کے دامن میں
جلوہ ہائے دمن بھی ہوتے ہیں

حزیں لدھیانوی

جس نگری میں اپنا من ہے نہ اپنا تن ہے
اُس نگری میں زندہ رہنا بھی اک فن ہے

تیرے بس میں نازکی دولت، حُسن کا دھن ہے
پاس ترے دیوانوں کے دیوانہ پن ہے

دِل کے نگر تک کرنیں کب آنے دیتے ہیں
جن کے بس میں چاند ستاروں کا خرمن ہے

جگمگ کرتے شیش محل کیا چیز ہیں یارو
سوچ کی اس کٹیا میں جب تک اک جوگن ہے

فصلِ گُل میں دو دن پھول ہنسے تھے لیکن
پھر پت جھڑ کی دیر آئی گلشن گلشن ہے

کل جس کو محبوب تماشائے قامت و گیسو
وہ دیوانہ آج حریفِ دار و رسن ہے

عرش نشینو! میری پستی ہی تو نہ دیکھو
یہ بھی دیکھو کتنا اونچا میرا فن ہے

مایا نگر میں وہ ہی چاند سے پھرتے ہیں
جن لوگوں کا اُجلا تن ہے، میلا من ہے

قیصر قلندر

یادوں کے شفق زار کے انداز نرالے ہیں
آنکھوں کے دیئے شمع کی مانند جلے ہیں

یہ ہجر کا صحرا ہے، کہاں آب و فا ہے!
اِس راہ میں گلزارِ تمنا کے جلے ہیں

خاموش نگاہوں میں تبسم کی کرن ہے
ہم صورتِ پیمانہ، اشاروں پہ چلے ہیں

شعروں میں نکھرتی ہے ترے حسن کی نزہت
پھولوں کی طرح میرے خیالات ڈھلے ہیں

ہر لحظہ ڈھلے رات، تمنا کے شگوفے
دل تاروں کے ہمراہ بہر رنگ جلے ہیں

وہ عارض و لب مہکے ہوئے شعر؛ جواں رنگ
اُس کاکُلِ شب رنگ کی چھاؤں میں پلے ہیں

سو بار روایت نے دکھائے ہیں قرینے
ہم اس کے اشاروں پہ کبھی بھی نہ چلے ہیں

اس شہر کی بستی میں ہے تماشہ انوکھی
کس کس طرح سانچوں میں یہاں لوگ ڈھلے ہیں

ہر بار اُمیدوں کے چمن زار میں قیصر
احساس کے دل، صورتِ پروانہ جلے ہیں

مظفر حنفی

جس میکدے میں جام مرے روبرو نہ آئے
اس میکدے کا نام مرے روبرو نہ آئے

مجھ سے نہ ہو سکے گا روایت کا احترام
زُلفِ سیاہ فام مرے رُوبرو نہ آئے

کُھل جائے گی بہار کی "مٹھی بندھی ہوئی"
پھر باغباں کا نام مرے رُوبرو نہ آئے

یارب! مرے قیام کا امکان ہو جہاں
ایسا کوئی مقام مرے رُو برو نہ آئے

میری کسی کے ساتھ کوئی دوستی نہیں
اب نامہ و پیام مرے رُوبرو نہ آئے

لوگو "چراغِ شام" مجھے ناپسند ہے
دیکھو چراغِ شام مرے رُوبرو نہ آئے

پردہ جو بیچ میں تھا، مظفرؔ نہ اُٹھ سکا
بڑھ کر وہ چند گام مرے رُوبرو نہ آسکے

[illegible]

برساتا ہے تقدیسِ محبت کے گگن پھول
جس وقت پہن لیتی ہے شرمیلی دلہن پھول

شرم سے بادل میں چھپتے ہیں ستارے
یہ کس کے پسِ زُلف چمکتے ہیں کرن پھول

یاد آتا ہے، جب اُن کا خیار ریزِ تبسم
محسوس یہ ہوتا ہے چراتے ہیں بدن پھول

شاید تجھے معلوم ہو، اے فصلِ بہاراں!
کہلاتے ہیں اِس دَور میں کیوں زخمِ چمن پھول

یاد آتی ہے جب تازگیٔ عہدِ محبت
بن جاتا ہے ماضی کا ہر اِک زخمِ کہن پھول

واعظ تری محفل میں کیوں چبھتے ہیں کانٹے
میخانے میں بنتے ہیں اگر تشنہ دہن پھول

اللہ رے گلشن کی بہاروں کے تقاضے
کانٹوں کو بھی کہنا ہی پڑا مصلحتاً پھول

ناصرؔ کو نہ راس آئیں محبت کی بہاریں
کھلتے ہی بُجھا دیتے ہیں سینے کی جلن پھول

امتہ ابوالحسن

اپنا

دنیش کا موڈ آج بے حد خراب تھا۔ باہر سے لوٹ کر اسنے دروازہ
بند کیا تو کمرے کی ساری تنہائی اور اداسی ایک دم اس کے دل میں سمٹ آئی اور
ناگن کی طرح پھنکار پھنکار کر ڈسنے لگی۔

بہار چارپائی پر سکڑی ہوئی پڑی تھی۔ چونک کر اس نے اونگھنا
بند کر دیا۔ سر اٹھا کے دنیش کو دیکھا پھر چارپائی سے کود کر اسکے پیر دم
ہلا ہلا کر چاٹنے لگی۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ کئی آنسو دنیش کی آنکھوں سے ٹپک گئے

زندگی کے بے پناہ اندھیرے میں بہار کا وجود روشنی کی ایک ہلکی
سی کرن تھی۔ محبت اور اپنائیت کا ایک ذرا سا سرور۔ اگر بہار نہ ہوتی۔ اگر
بہار اسے اتنا نہ چاہتی تو ——— ؟؟

دنیش کو اپنا وجود اس پتھر کی طرح لگا جس پر زمانے کے سمندر
کی لہریں ٹکرا کر بکھر گئی ہوں۔ ساری کائی جما دی ہو۔

کائی جس پر پیر پڑتے ہی آدمی پھسل کر دور جا گرے۔

اس نے بہار کو گود میں اٹھا لیا۔ اسکی ملائم پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتے
ہوئے اسے لمحہ بھر کے لیئے قرار آ گیا۔

بہار کی آنکھیں محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسی محبت سے
جو اسے دنیا میں کسی انسان سے نہیں ملی۔ دیر تک وہ اسے سہلاتا چومتا رہا
پھر یکلخت بے چین ہو کر باہر نکل گیا۔

اگر بہار کے ساتھ اس کمرے میں اسکے ماں باپ بھی ہوتے ——!
اسکی ایک گھر والی بھی ہوتی —؟؟
اسکے بچے بھی ہوتے تو۔؟؟؟
تو یہ زندگی کیسی خوبصورت کیسی حسین کتنی قیمتی ہوتی۔

اسے اپنے بچپن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ عقل آنے پر اس

خود کو بہت سے بچوں کے ساتھ کھیت میں پھول چنتے ہوئے پایا۔ دو وقت کا کھانا اور کپڑا اسے وقت پر ملتا تھا۔ رہنے کے لئے ایک بڑا سا کھپریل کا کمرہ تھا۔ پھول چننے والے بچوں میں سے کچھ تو اپنے گھر چلے جاتے اور کچھ اس بڑے کمرے میں آکر جمع ہو جاتے۔ شاید اسکی طرح کے بچے جن کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ لڑتے جھگڑتے۔ گاتے ناچتے۔ سبھی جھوٹی بھونڈی اور معصوم نقلیں اتارا کرتے پھر پڑ کر سو جاتے۔

انکا مالک ایک تو ندیل آدمی تھا۔ فرصت کے اوقات میں بچوں کو داؤں سکھانا اور کمزور کو بہادر سے چت کروا دینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بہت سے بچے محض اسکی ذرا سی تعریف کے لئے گھنٹوں مٹی میں لڑتے رہتے۔ ہاتھا پائی کرتے پھر اپنی تعریف سنکر اسطرح مسکراتے جیسے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر آئے ہوں۔

دنیش کو پہلے تو مالک سے پھر ایسے تمام تعریف کے بھوکے بچوں سے شدید چڑ ہو گئی۔ وہ چاہتا بچے مالک کا حکم ماننے سے انکار کر دیں لیکن یہ بات اسکے ذہن میں گھٹ کر رہ جاتی وہ اسے کسی پر ظاہر نہ کر سکتا اور کم ہمتی کے باعث اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔

پھر جب وہ ذرا اور بڑا ہو گیا تو مالک نے اسے کھیت سے ہٹا کر اپنے گھر کام کرنے پر رکھ لیا۔

مالک کی کئی بیٹیاں تھیں۔ کئی بیٹے سب کے سب ضدی اڑیل اور کاہل۔ وہ اس سے طرح طرح کے کام لیتے پھر بھی مطمئن نہ ہوتے اور دن بھر جتے رہنے کے باوجود جب مالکن مالک سے شکایت کرتیں۔ یہ لونڈا بڑا کام چور ہے صرف کھانا کھانا جانتا ہے تو دنیش کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اسکے کان کی لویں جلنے لگتیں۔ اگر وہ کھانا نہ کھائے تو کام کسطرح کرے۔ اسے کھانے پینے کی چیزوں پر کڑی رہنے والی نگاہیں پسند نہ تھیں اس لئے ایک روز چپ چاپ وہ مالک کا گھر الگ کر گیا اور کسی فیاکٹری میں ملازم ہو گیا۔

پہلے پہل وہ صرف وزن ڈھوتا رہا پھر ساتھیوں کی کرپا سے مشین چلانا بھی سیکھ گیا اور یہیں سے اسکی ایک مستقل مربوط زندگی شروع ہوئی۔ لیکن یہ زندگی ایسی ہی تھی جیسے بند کمرے کی گھٹی ہوئی ہوا۔

ٹھنڈک اور سرور سے بے بہرہ

وہ ہر وقت اپنے آپکو اکیلا محسوس کرتا۔ ہنسی اس کے ہو[نٹوں] کو چھو چھو کے گذر جاتی۔ قہقہہ نہ بن پاتی۔ فیکٹری والے اسکی محنت ا[ور] ایمانداری سے خوش تھے لیکن ساتھی اسکی علحدگی پسندی اور خاموشی[] وہ پوچھ پوچھ کر ہار چکے تھے۔ لیکن دنیش کے پاس ا[ن] سوالات کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اُن سے کسطرح کہتا۔ اسے اپنے ما[ں باپ] کا حال معلوم نہیں۔ ماں باپ نے اسے بیچ دیا۔ کسی ناگہانی میں بچھ[ڑ گئے] یا مر کھپ گئے۔

یا —— یا ——

ایک اور خیال جو اسکے کلیجے میں کانٹا بن کر چبھ جا[تا] کہیں وہ "ایسی ویسی اولاد" تو نہیں۔ سڑک یا کسی کونے کھدرے [میں پڑی] ہوئی؟ لیکن ایک دن ایک بوڑھے بنواڑی نے اسے پہچان کر [بتایا کہ] وہ بالکل اپنے باپ سے ملتا جلتا ہے۔ اسکی پیدائش ہی اسکی ماں [کی موت] کا سبب بنی تھی اور باپ بھی کچھ دن بعد کسی وبا کا شکار ہو کر ختم [ہو گیا] تھا۔ تب محلے والوں نے اسے پھول والے کے حوالے کیا تو آگے سننے ک[ی] کو خواہش نہ رہی۔ اس بات کے سکون کے باوجود کہ وہ ایک جائ[ز اولاد] ہے۔ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ناخوشگوار حادثات کی بات نے ا[س] کو اس حد تک جکڑ لیا کہ وہ کسی سے ملتے جلتے کسی کی خوشیوں میں حصہ [لیتے] کسی کی ہنسی میں شریک ہوتے ڈر محسوس کرنے لگا کوئی اسے منحوس [نہ سمجھے] اس خوف نے اسے دنیا سے بہت دور پرے کھینچ لیا۔ فیکٹری کے ایک سا[تھی نے] سفارش کر کے کمرہ دلوا دیا اور وہ نہایت خاموشی سے اس کمرے کی فضا میں بھرپور جوانی کی دبی دبی سانسیں لینے لگا۔

ایک روز جب وہ فیکٹری سے لوٹ رہا تھا اس نے ا[یک عورت] کو دیکھا جو کندھے پر تھیلا لادے تیز تیز جا رہی تھی۔ تھیلے کی ہلچ[ل نے] دنیش کو پریشان کر دیا۔ وہ خود کو عورت کے تعاقب سے باز نہ [رکھ سکا] کافی آگے بڑھ کر عورت نے تھیلے کا منہ کھولا اور اسے الٹ دیا۔

یہ بہار تھی جو ادھ موئی ہو گئی تھی جسے چلنا بھی دو[بھر تھا] دنیش نے اسے اٹھا لیا۔ نکڑ کے حلوائی سے دو آنے کا دودھ خر[یدا]

یقین تھا دودھ پی کر وہ بھاگ جائے گی۔ لیکن بھاگنے کی بجائے
وہ اسکے قدموں میں بیٹھ گئی اور دنیش نے اسکا نام بہار رکھدیا۔

اسے بہار اسلئے بھی پسند تھی کہ بہار کے منہ سے کوئی کڑوی بات سننے کا کبھی بھی گمان نہ ہو سکتا تھا۔ وہ پابندی سے دنیش کے ساتھ کھانا کھاتی جائے بیٹھی پھر اسکی چارپائی یا پیروں میں لوٹتی رہتی۔ دنیش اسکی وفاداری کی اتنی ہی قدر کرتا جتنی ہمسایہ اچھے ہمسائے کی کرتا ہے تب سے وہ اسکی مستقل ساتھی تھی جبکہ لوگ اس سے مل ملکر بچھڑ چکے تھے۔

یہ سب سوچتے سوچتے دنیش اس بلندی تک پہونچ گیا جہاں اپنی منسان شامیں گذار کر اسے ایک گونا سکون حاصل ہوتا۔ چٹانوں کے سینے میں بسایا گیا باغ جہاں پہونچکر شہر بالکل کھلا نہ لگتا اور انسان قطعی تنہا۔ دنیش کام سے لوٹ کر اکثر یہاں آیا کرتا۔ یہاں اسے وہ زندگی ملجاتی جسے گھریلو زندگی کہا جاسکتا۔

وہ اکیلا ہوتا لیکن آنے والوں کے ساتھ لڑکیاں بچے اور ان کی کھلکھلاہٹیں ہوتی۔ دنیش خود کو ان میں شامل سمجھکر اپنے آپ کو بہلاتا رہتا اور خوش ہوتا رہتا۔

کوئی لڑکی اسے دیکھکر مسکرا دیتی یا کوئی بچہ کھیلتے کھیلتے اسکی گود میں آجاتا تو دنیش کی شخصیت سمٹ کر ایک نقطہ سے کائنات بن جاتی۔ وہ اس ننھے بچے کی طرح شوخ اور چنچل بن جاتا جسے ڈھیر ساری نعمتیں خلاف توقع ملجاتیں۔

ایسی چھوٹی موٹی خوشیوں نے اسے مرنے سے بچائے رکھا۔ اسکے پاش پاش ریزہ ریزہ وجود کو اپنی مضبوط گرفت سے باندھ کر لیکن زندگی کے کرشے چالیس برس اچانک ہی اس گرفت سے کھس کر تنکوں کی طرح بکھر گئے۔

نینو اجو دنیش کی پڑوسن تھی جسے دنیش صبح شام اپنے کمرے کی دراز سے جھانک کر دیکھتا اور خوش ہوا کرتا تھا۔ ہفتہ بھر قبل اسکی مسرتوں کے منہ پر طمانچہ مار کر ہنستی کھیلتی اپنے کنہیا کے گھر سدھار چکی تھی۔ اور دنیش بہت بے قرار تھا کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح شانتی کی تلاش میں تھا مگر شانتی کہیں نہیں تھی۔ اتنے بڑے آفاق کے کسی کونے کسی گوشے میں۔

بہار کی رفاقت نے اسے بہت سہارا لیکن بہار انسان تو نہ تھا وہ دفعتاً بے حد تھک گیا۔ آدمیوں کے ہجوم سے کھسک کر سبزے کی چھتری کے نیچے آگیا۔

نیچے بہت نیچے گہرائی میں اسکے گھر جانے والی سڑک کسی دوشیزہ کی صاف ستھری مانگ کی طرح جگہ جگہ چمک رہی تھی۔ اس ایک کمرے کا راستہ جس پر برسوں وہ چپ چاپ تھکا ماندہ چلتا رہا اور جسکی تنہائی میں گھٹ گھٹ کر زندگی گذارتا رہا۔

پھر دور اسے وہ ہوٹل نظر آیا جہاں ایک مرتبہ سنگھ اسے لے گیا تھا۔ سنگھ کے ساتھ للیتا تھی ـــــ للیتا گیہوں کے دانے کی گندمی تھی۔ اسکے چہرے پہ دھوپ جیسی تپش تھی۔ اس کا جسم اسی طرح سخت تھا اسکی آواز اس ڈرم کی طرح تھی جسے بچے مسلسل بجا رہے ہوں اور آنکھیں ان بیجوں کی طرح ماند ماند جن میں کسی کا عکس بے معنی تھا۔ لیکن بہرحال للیتا ایک لڑکی تھی ـــ ایک ـــــ اور سنگھ کا کہنا تھا۔ بغیر ساتھی کے جیون اس سڑک سے ہوتا ہے جسے دن بھر میں ہزاروں قدم چھو دیں لیکن آہٹ ختم ہوتے ہی ہر طرف سناٹا چھا جائے۔ سڑک کا سینہ خالی ہو جائے۔

سنگھ نے اسے ساتھی حاصل کرنے کے گر بھی بتائے تھے وہ ازل کا ڈرپوک آگے رکھی ہوئی چیز چھوتے ہوئے بھی ڈرتا کہیں کوئی ٹوک نہ دے۔ کہیں نینوا برا نہ مان جائے۔ نینوا جس سے اس نے بات نہ کی۔ کبھی اسکے لیے ہنسی مسکراہٹ نہیں کبھی اسے ہنسی نہیں کیا۔ اس سے دو قدم دوری کوٹھری میں چپ چاپ رہتی وہ خود ہی صبح شام اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

پھر دور اسے بینڈ کی روشنیاں نظر آئیں۔ بینڈ پر اسے لالو لے گیا تھا۔ لالو گرمی میں قلفی ٹھنڈے دنوں میں کباب کلیجے بیچا کرتا۔ لالو نے زمانے دیکھے تھے۔ لالو کی آنکھیں بجو کی طرح مکار اور زہر بھری تھیں اس ساری زندگی کا عکس موجود تھا جو جھوٹ اور دھو

...بہارے گذار دی گئی ۔

لالو محنت کرتا تھا لیکن اسکے اندر کا انسان زمانے سے ہار کر
...ت ہوئی اپنا ضمیر بیچ چکا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے قلفی اور کباب
...وں میں الم غلم چیزیں ملاتا اور اسی بڑی بلڈنگ کی نچلی منزل میں ہا کرتا
...یاں دوسرے مالے پر دنیش رہتا تھا ۔

اس بلڈنگ کے پچاسوں کمرے تھے اور ہر کمرے میں محنت کش
...گ بسے ہوئے لیکن لالو ان میں ایک تھا۔ اسکی ساری بلڈنگ والوں بلکہ
...نیا جہاں سے شناسائی تھی ۔ اسکے گھٹے ہوئے کمرے میں قریب قریب رات بھر
...راغ جگا کرتے اور سویرے سویرے بجھ جاتے۔ لالو کا کہنا تھا۔ زندگی ایک
...ل ہے جس میں بکھرا ہوا دانہ چننے کے لیئے بھی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ۔

صرف ایک شام وہ لالو کے ساتھ گیا تھا۔

بلند پر روشنیاں تھیں ۔ تفریح کی دلدادہ لڑکیاں تھیں
سایہ دار درخت تھے اور موٹروں کی ریل پیل تھی مگر یہ سب کچھ دنیش
...ی ہستی سے کتنی دور کتنا پرے ۔

دنیش کا کرچی کرچی وجود وہاں پہنچ کر بھی ایک سالم ٹکڑا
...نہ بن سکا تھا اور لالو کے روکتے روکتے وہ لوٹ آیا تھا۔

پھر اسے ریل کی وہ پٹری نظر آئی جو ناگن کی طرح لہراتی
...بل کھاتی۔ دور تک زمین کی چھاتی پر رینگتی چلی گئی تھی ۔

جسکی دوسری طرف گھروندوں جیسے مکانات تھے جن میں لوگ
...کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتے آئے تھے ۔

جہاں ایکبار اسے مانی لے گئی تھی ۔ مانی نے اسے شربت
پلایا تھا اور اسکے لیئے مسکرائی بھی تھی لیکن جانے کیوں دنیش کو یہ مسکراہٹ
...زہر لگی اور وہ شربت دو گھونٹ پی کر مارے تاؤ کے چلا آیا۔

پھر مانی اس سے ہمیشہ کہتی رہی۔ "تو دیر نہیں ہے زندگی
کے کولہو میں جتا ہوا ہمیشہ اپنی گردن جھکائے رکھنے والا "

مانی اس بلڈنگ میں صفائی پر متعین تھی جہاں وہ رہتا تھا۔
مانی کی لالو سے دوستی بھی لیکن لالو کا کہنا تھا۔ مانی عورت نہیں ڈائین ہے
...وہ عورت ہیں انیوں لاتی ہے اور جو شخص اُس کی مار میں آجائے اُس کا

اللہ ہی حافظ ہووے ۔

دنیش نے کئی مرتبہ سنجیدگی سے سوچا تھا۔ کیا ہر عورت مانی ہوتی...
لیکن عورت کے متعلق اسکے نظریات اٹل تھے ۔

عورت اسکے پاس اوتار تھی ، ماں تھی ، سیتا تھی ، ساوتری تھی
مہارانی جھانسی تھی ، چاند بی بی سلطانہ تھی اور اس کے دور کی عورت تو
ویلنیٹنا ترشکووا بھی تھی ۔

مانی تو محض ایک ایسی شکل تھی جسے بیچاریوں نے بگاڑ دیا۔ اس لیئے
اس نے کبھی مانی کے کہنے کا برا نہ مانا۔ نہ اس پر اپنا دیر ہونا ثابت کرنا چاہا بلکہ
اس نے کبھی کبھی مانی کو سمجھایا۔

" عورت کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے اپنے رتبہ کو سمجھ —— "

لیکن کوڑا کرکٹ اور غلاظت صاف کرنے والی مانی اپنے من میں
موتی نہ پال سکی ۔ اور بیچاریوں سے انتقام لے کر خوش ہونے لگی۔

پھر اسے بے شمار انسان' درخت ' موٹریں' جانور' گاڑیاں
نظر آئیں ۔ اس بڑے کینوس کی طرح جو کسی مصور کے ذہن میں پھیلا ہوا ہو
تخلیق کے لمحے کا انتظار کرتا ہوا ۔

لیکن یہ لمحہ ؟

دنیش کو یقین ہو گیا ۔

مصور کے ذہن میں دور دور تک اسکا شائبہ نہیں اس وسیع
و عریض کینوس میں اسکے لیئے کہیں کوئی موزوں مناسب جگہ نہیں تب...
زندگی کا فائدہ ہی کیا جو کوڑے کچرے کی طرح ایک گھورے سے دوسرے
گھورے پر منتقل ہوتی رہے ۔

امید کہ معیت میں اس نے برسوں کی مسافت آنسو پونچھتے طے
کر ڈالی تھی لیکن اب ——

نینوا کے بچھڑ جانے اور تنہائی کے مستقل ہو جانے کے احساس
نے زندگی کی آخری خواہش بھی اس سے چھین لی ۔

ہجوم بڑی حد تک چھٹ چکا تھا۔ بچوں کی قلقاریاں ا...
دوشیزاؤں کی تجلی بھری مسکراہٹیں خلا کے غار میں گم ہو چکی تھیں...
لوگ البتہ مسکراتے تھے ۔ یہ بھی چلے جاتے تب ——

یدرآباد

تب ——— !

ذراسا آگے سرک کر دنیش نے پھر نیچے جھانکا۔

گہرائی اسے بڑی پرکشش محسوس ہوئی۔ اپنی گود پھیلائے ہوئے

دالے کو خوش آمدید کہنے۔ اسکے پاس نامیدی نہ تھی، انکار نہ تھا

) رتھا۔ دنیش کی زندگی کی طرح مسلسل انتظار۔

خوشی کی لہر چاندی کی طرح اسکے وجود میں اندر ہی اندر پھیل گئی

نگہ۔ للیتا۔ لالو۔ مانی اور وہ سارے ملنے والے یاد آئے جو کبھی نہ

ندگی اچھی بری طرح تھوڑی بہت دیر کے لیئے اسکی زندگی میں آئے اور

ستدان سے نکھر کر آگے بڑھ گیا۔ تصور ہی تصور میں بڑے خلوص سے

سب کے آگے جھکا۔

دستو ——— میں نے تمہیں چھوڑ دیا لیکن تم مجھ سے بھلا نہ گئے۔

زندگی ——— تو ہر بار آگے آ آ کر الجھن ہوتی رہی لیکن کبھی کہیں اسکی

پر مجھ سے بغلگیر نہ ہو سکی لے اب اپنا ڈرامہ ختم کر۔ دنیش جا رہا ہے تجھے

کر، تجھے تج کر۔

زندگی کو دھکا کر اسے بے حد سکون حاصل ہوا۔ وہ مسکرایا اور

ھڑا ہوا۔

ایک قلابازی۔ ہمت کا ایک شاندار فاتح لمحہ۔

اس نے ایک بھرپور نظر دنیا پر ڈالی۔ اپنے اطراف وجوانب پر

ڈالی پھر جھکا۔

پھر اچانک اسے خیال آیا۔

بہار جھکی ہے ——— !

بہار اسکی منتظر ہے ——— !!

بہار مقفل ہی تو ہے ——— !!!

جیسے کسی زبردست ہاتھ نے دنیش کو یکایک پیچھے کھینچ لیا۔ وہ دوڑتا ہوا بلندی سے اترا اور دیوانہ وار کمرے پر پہنچا۔ ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں انجن کی طرح چلتے ہوئے دل سے اس نے تالے میں چابی ڈالی۔

کواڑ چرچرائے پھر اسے ایک لمبی جھرجھری آگئی۔

باہر نکلنے کی جدوجہد میں بہار نے اپنا سر کواڑوں کی درز میں پھنسا لیا تھا اور اب زندگی سے عاری بے جان اسکے پیروں پر آپڑی تھی۔

وہ کانپتا رہا۔ کانپتے کانپتے چارپائی پر گر گیا۔

کیسی ہولناک۔ دہلا دینے والی شریر بات ——— زندگی کے خاتمے کا احساس ——— ؟

آنسو اسکی آنکھوں میں منجمد ہو گئے۔ پھٹی ہوئی آنکھوں سے وہ خلاؤں میں اس طرح گھورتا رہ گیا جیسے کوئی شئی نہ سمجھ میں آنے والی بات آہستہ آہستہ سمجھ رہا ہے ——— !!!

ثمانہ یوسفی

دامن نچوڑدیں تو

جان سے پیاری شہناز!

میں جانتی ہوں، تم مجھ سے بہت زیادہ خفا ہو اور سا تھ ہی یہ بھی جانتی ہوں کہ اس خفگی کی وجہ کیا ہے؟ بس یہی نا کہ میں نے تمہیں خط لکھنے کیوں بند کر دیئے؟ مگر میری پیاری کسی مجرم کو صفائی پیش کرنے سے پہلے ہی سزا دے دینا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ایک بے گناہ ملزم کو اپنی بارگاہ سے انتہائی سزا دے کر اس سے ناراض ہو چکی ہو، میں اپنی صفائی پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم میرا بیان سن کر نفرت سے منہ پھیر لو، یا اپنی روایتی فراخ دلی کے ساتھ مجھے معاف کر دو۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب تمہاری منگنی ہو چکی تھی، اور تم آنے والی خوشگوار زندگی کے رنگین خواب دیکھ رہی تھیں۔ تمہارے دل و دماغ میں ایک نئی اور رومانی دنیا کا ایک حسین و شاداب تصور رچ بس گیا تھا۔ جس میں مسرت و سرخوشی تھی۔ فارغ البالی اور خوشحالی تھی۔ بیش قیمت ملبوسات، کلب، پارک، سینما اور سہیلیوں کے جھرمٹ تھے اور ان سب سے زیادہ حسین تو سامران کا تصور تھا۔ اس کے دلکش خدوخال، مضبوط بازو اور چوڑے چکلے سینے کا خیال تھا۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد تم ہنستی کھیلتی مجھ سے کچھ عرصہ تک تمہارے اور میرے درمیان خط وکتا جاری رہا اور میں تمہاری خوشحال زندگی کے بار خبریں سن سن کر مسرور ہوتی رہی۔ لیکن حالات نے ایک کروٹ لی اور میں ایسے مصائب میں گرفتار ہوئی کہ گئی۔ اپنے تن من کی ہوش نہ رہی۔ اب بے درد ز سے کچھ فاضل ہوا ہے تو سب سے پہلے تمہیں یاد کر میرے خوشگوار ماضی کی ایک حسین یادگار ہو۔

تم میرے ماموں زاد بھائی آصف سے تو و بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اور اس کی پرورش کا ڈیڈی کے شانوں پر آ رہا تھا۔ ڈیڈی بڑے بردبا تھے۔ انہوں نے آصف کی پرورش اور تعلیم و تربیت نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازم ہو گیا تو جیسے ڈیڈی کے سر سے ایک اتر گیا اور وہ بہت خوش خوش نظر آنے لگے، اور

نظر نہ آتے ؟ ہر نیک مقصد کی کامیابی انسان کو لازوال مسرتوں سے ہمکنار کر دیتی ہے ۔

آصف جوان تھا ، خوبرو تھا ، برسرِ روزگار تھا ۔ اِدھر میں بھی جوان تھی ۔ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی اور شادی بیاہ کے لایق ہو چکی تھی ۔ رشتہ گھر میں موجود تھا ۔ ایسی صورت میں مجھے کب تک برداشت کیا جاتا ۔ چنانچہ گھر کی بات گھر میں رہی اور ایک روز مجھے آصف کے سپرد کر دیا گیا ۔ میں ذاتی طور پر اس رشتہ سے مطمئن نہیں تھی ۔ مگر لڑکیاں تو بے زبان جوان ہوتی ہیں ۔ شادی بیاہ کے بارے میں ان کی ذاتی پسند و ناپسند کی کون پرواہ کرتا ہے ۔ ؟

میں شادی کے بعد آصف کے بنگلے میں منتقل ہو گئی اور چند دنوں بعد ہی اس نتیجہ پر پہونچ گئی کہ آصف کے بنگلے میں ذہنی سکون کے سوا کسی دولت کی کمی نہیں تھی ۔ دولت کی فراوانی تمام بُرائیوں کا پیش خیمہ ہے ۔ سچ پوچھو تو اس بنگلہ میں میری حیثیت ایک " شو پیس " سے زیادہ نہ تھی ۔ آنے جانے والے مہمانوں کی دیکھ بھال ، بنگلے کی نگہداشت اور ملازموں کی نگرانی کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا ۔ آصف دن بھر باہر رہ کر رات گئے بنگلہ پر پہنچتا تھا ۔ اس کے اور میرے درمیان کوئی ذہنی سمجھوتہ نہیں تھا ۔ ابتدا میں تو مجھے اس کے اس رویے سے بڑا ذہنی صدمہ پہنچتا تھا ۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اس ماحول کی عادی ہو گئی اور میں نے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا کہ مجھے اس بات پر اختیار تھا ۔

ابھی شادی کو پورے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک روز اچانک ڈیڈی کو دل کا دورہ پڑا ۔ اور طبّی امداد کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ اس جانکاہ حادثہ سے مجھے دلی صدمہ پہنچنا ایک فطری اَمر تھا ۔ مگر قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے ۔ درد و کرب نے صبر شکر کر لیا ۔

غم کی لہر آئی اور گذر گئی ۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا ۔ بلکہ اس کے برعکس غم کی لہر نے میرے گھر میں کچھ ایسا پڑاؤ ڈالا کہ ایک بار آ کر واپس جانا بھول گئی ۔ ڈیڈی کی زندگی میں تو آصف کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ میرے ساتھ کُھلم کُھلا کوئی زیادتی یا ناانصافی کر سکتا ۔ لیکن ڈیڈی کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے حوصلے کُھل گئے ۔ اور وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مجھے آنکھیں دکھانے لگا ۔ اس کے حوصلے یہاں تک بلند ہوئے کہ اب بنگلے میں بڑی آزادی کے ساتھ غیر عورتیں آنے جانے لگیں ۔ اور آصف مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں ان کی خاطر مدارات کروں ۔ میں لاکھ کمزور عورت سہی ، لیکن اپنی یہ توہین کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ کچھ عرصہ تو میں بھی آنکھیں دکھاتی رہی اور تنہائی میں اس سنگین ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی ۔ مگر آصف چٹان کی طرح بے حس اور بے درد تھا ۔ میری دبی دبی چیخیں ، سلگتی ہوئی آہیں اور برستی ہوئی آنکھیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں ۔ میں اس دوران میں دو بچوں کی ماں بھی بن گئی ۔ مگر اس کے باوجود آصف کے رویہ میں کوئی فرق نہ آیا ۔ وہ اپنے لیئے جو راہ متعین کر چکا تھا اس پر سرپٹ بھاگتا چلا جا رہا تھا ۔

دن گذرتے رہے ۔ پھر ایک روز ہمارے گھر میں کچھ نئے مہمان آئے ، جن کی خوب خاطر تواضع ہوئی ۔ ان کے سامنے بیش قیمت کھانے چُنے گئے ۔ دو تین مرد تھے اور دو تین عورتیں ، میں ایک جوان لڑکی بھی تھی جو خوب بن ٹھن کر آئی تھی اور کھانے کے دوران ہنس ہنس کر آصف کے ساتھ باتیں کرتی رہی ۔ کھانے بیٹھتے ہی آصف نے اس لڑکی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ۔

" ان سے ملیئے ، یہ ہیں میری منکوحہ مسرت جہاں ، مگر نام کی مسرت ۔ بیچاری جوانی ہی میں بیوگی کا شکار ہو گئی ہیں ! "

میں نے یہ کلمات سُنے تو میرا کلیجہ دَھک سے رہ گیا اور ایک سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ ہاتھ کا نوالہ مُنہ میں جانے سے پہلے ہی میز پر گر گیا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئیں ۔

" چچ ، چچ ، بڑی بدنصیبی کی بات ہے " اس لڑکی نے جتاتے ہوئے کہا ۔ " ارے آپ تو رونے لگیں " وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ۔

ثمانہ یوسفی

دامن نچوڑ دیں تو.....

جان سے پیاری شہناز!

میں جانتی ہوں، تم مجھ سے بہت زیادہ خفا ہو اور ساتھ ہی یہ بھی جانتی ہوں کہ اس خفگی کی وجہ کیا ہے؟ بس یہی نا کہ میں نے تمہیں خط لکھنے کیوں بند کر دیئے؟ مگر میری پیاری! کسی مجرم کو صفائی پیش کرنے سے پہلے ہی سزا دے دینا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ایک بے گناہ ملزم کو اپنی بارگاہ سے انتہائی سزا دے کر اس سے ناراض ہو چکی ہو، میں اپنی صفائی پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم میرا بیان سن کر نفرت سے منہ پھیر لو، یا اپنی روایتی فراخ دلی کے ساتھ مجھے معاف کر دو۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب تمہاری سگنی ہو چکی تھی، اور تم آنے والی خوشگوار زندگی کے رنگین خواب دیکھ رہی تھیں۔ تمہارے دل و دماغ میں ایک نئی اور رومانی دنیا کا ایک حسین و شاداب تصور رچ بس گیا تھا۔ جس میں مسرت و سرخوشی تھی۔ فارغ البالی اور خوشحالی تھی، بیش قیمت ملبوسات، کلب، پارک، سینما اور سہیلیوں کے جھرمٹ تھے اور ان سب سے زیادہ حسین تر سامران کا تصور تھا۔ اس کے دلکش خدوخال، مضبوط بازو اور چوڑے چکلے سینے کا خیال تھا۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد تم ہنستی کھیلتی مجھ سے جدا ہو گئیں۔ کچھ عرصہ تک تمہارے اور میرے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور میں تمہاری خوشحال زندگی کے بارے میں نت نئی خبریں سن سن کر مسرور ہوتی رہی۔ لیکن حالات نے ایک دردناک کروٹ لی اور میں ایسے مصائب میں گرفتار ہوئی کہ سب کچھ بھول گئی۔ اپنے تن من کی ہوش نہ رہی۔ اب بے درد زمانہ میری طرف سے کچھ غافل ہوا ہے تو سب سے پہلے تمہیں یاد کر رہی ہوں کہ تم میرے خوشگوار ماضی کی ایک حسین یادگار ہو۔

تم میرے ماموں زاد بھائی آصف سے تو واقف ہو، جو بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اور اس کی پرورش کا سارا بوجھ میرے ڈیڈی کے شانوں پر آ رہا تھا۔ ڈیڈی بڑے دور اندیش انسان تھے۔ انہوں نے آصف کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر بطور انجینیر سرکاری ملازم ہو گیا تو جیسے ڈیڈی کے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا اور وہ بہت خوش خوش نظر آنے لگے، اور وہ کیوں خوش

نظر نہ آتے ؟ ہر نیک مقصد کی کامیابی انسان کو لازوال مسرتوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

آصف جوان تھا، خوبرو تھا، برسرِ روزگار تھا۔ اِدھر میں بھی جوان تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی اور شادی بیاہ کے لایق ہو چکی تھی۔ رشتہ گھر میں موجود تھا۔ ایسی صورت میں مجھے کب تک برداشت کیا جاتا۔ چنانچہ گھر کی بات گھر میں رہی اور ایک روز مجھے آصف کے سپرد کر دیا گیا۔ میں ذاتی طور پر اس رشتہ سے مطمئن نہیں تھی۔ مگر لڑکیاں تو بے زبان جوان ہوتی ہیں۔ شادی بیاہ کے بارے میں ان کی ذاتی پسند و ناپسند کی کون پرواہ کرتا ہے۔؟

میں شادی کے بعد آصف کے بنگلے میں منتقل ہو گئی اور چند دنوں بعد ہی اس نتیجہ پر پہونچ گئی کہ آصف کے بنگلے میں ذہنی سکون کے سوا کسی دولت کی کمی نہیں تھی۔ دولت کی فراوانی تمام بُرائیوں کا پیش خیمہ ہے۔ سچ پوچھو تو اس بنگلہ میں میری حیثیت ایک "شو پیس" سے زیادہ نہ تھی۔ آنے جانے والے مہمانوں کی دیکھ بھال؛ بنگلے کی نگہداشت اور ملازموں کی نگرانی کے سوا مجھے اور کوئی کام نہ تھا۔ آصف دن بھر باہر رہ کر رات گئے بنگلہ پر پہنچتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان کوئی ذہنی سمجھوتہ نہیں تھا۔ ابتدا میں تو مجھے اس کے اس رویے سے بڑا ذہنی صدمہ پہنچتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میں اس ماحول کی عادی ہو گئی اور میں نے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا کہ مجھے اس بات پر اختیار تھا۔

ابھی شادی کو پورے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک روز اچانک ڈیڈی کو دل کا دورہ پڑا۔ اور طبی امداد کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس جانکاہ حادثہ سے مجھے دلی صدمہ پہنچنا ایک فطری امر تھا۔ مگر قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ رو دھو کر سب نے صبر شکر کر لیا۔

غم کی لہر آئی اور گذر گئی۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس غم کی لہر نے میرے گھر میں کچھ ایسا پڑاؤ ڈالا کہ ایک بار آکر واپس جانا بھول گئی۔ ڈیڈی کی زندگی میں تو آصف کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ میرے ساتھ کھلم کھلا کوئی زیادتی یا ناانصافی کر سکتا۔ لیکن ڈیڈی کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے حوصلے کھل گئے۔ اور وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مجھے آنکھیں دکھانے لگا۔ اس کے حوصلے یہاں تک بلند ہوئے کہ اب بنگلے میں بڑی آزادی کے ساتھ غیر عورتیں آنے جانے لگیں۔ اور آصف مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں ان کی خاطر مدارات کروں۔ میں لاکھ کمزور عورت سہی، لیکن اپنی یہ توہین کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ عرصہ تو میں بھی آنکھیں دکھاتی رہی اور تنہائی میں اس سنگین ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہی۔ مگر آصف چٹان کی طرح بے حس اور بے درد تھا۔ میری دبی دبی چیخیں، سلگتی ہوئی آہیں اور برستی ہوئی آنکھیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ میں اس دوران میں دو بچوں کی ماں بھی بن گئی۔ مگر اس کے باوجود آصف کے رویہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنے لیئے جو راہ متعین کر چکا تھا اس پر سرپٹ بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

دن گذرتے رہے۔ پھر ایک روز ہمارے گھر میں کچھ نئے مہمان آئے، جن کی خوب خاطر تواضع ہوئی۔ ان کے سامنے بیش قیمت کھانے چُنے گئے۔ دو تین مرد تھے اور دو تین عورتیں، جن میں ایک جوان لڑکی بھی تھی جو خوب بن ٹھن کر آئی تھی اور کھانے کے دوران ہنس ہنس کر آصف کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ کھانے پر بیٹھتے ہی آصف نے اس لڑکی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ان سے ملیئے، یہ ہیں میری مجازی مسرت جہاں، مگر صرف نام کی مسرت۔ بیچاری جوانی ہی میں بیوگی کا شکار ہو گئی ہیں۔"

میں نے یہ کلمات سُنے تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا اور مجھ پر ایک سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہاتھ کا نوالہ منہ میں جانے سے پہلے ہی میز پر گر گیا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہو گئیں۔

"چچ، چچ، بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔" اس لڑکی نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "ارے آپ تو رونے لگیں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

[…] سب کچھ برداشت نہ ہو سکا، اور میں کھانے کی میز سے اُٹھ کر اندر بھاگ گئی۔

"بیچاری"! میں نے بھاگتے ہوئے سُنا۔ شاید اسی لڑکی نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا تھا۔ میرا ماتھا اسی روز ٹھنک گیا تھا کوئی بہت ہی غیر معمولی حادثہ جنم لینے والا تھا۔

اور کچھ دنوں بعد میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہی لڑکی آصف کی نئی نویلی دُلہن بن کر گھر میں آگئی۔ میں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اس حادثے کا مقابلہ کیا اور دو چار روز کے بعد اپنی امّی کے ہاں چلی آئی کہ اب آصف کے بنگلے میں مجھ جیسے ٹوٹے پھوٹے "شو پیس" کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

چھ ماہ گذر گئے۔

اور پھر ایک روز میں نے سُنا کہ آصف کی دوسری بیوی، جو چولہے کے پاس بیٹھی تھی، اچانک شعلوں کی نذر ہو گئی۔ نائیلون کے ریشمی لباس نے اس کی جان لے لی تھی اور اس طرح جس آگ میں ایک عورت نے دوسری عورت کو جلایا تھا خود بھی اس میں جل کر راکھ ہو گئی۔

اب ایک مرتبہ پھر میری قسمت جاگ اُٹھی۔ آصف کو پھر میرا خیال آیا۔ اپنے بچوں کا خیال آیا اور وہ مجھے منا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ میں بھی زیادہ عرصہ اپنی بیوہ ماں پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیئے آسانی سے رضامند ہو گئی۔

کچھ عرصہ تک تو آصف کا دماغ ٹھکانے سے رہا۔ لیکن پھر اس کے ضبط کے بند ٹوٹنے لگے اور وہ پھر شیطانی حرکتوں پر اُتر آیا۔ مگر میں نے کبھی اسے کسی بات پر نہ ٹوکا کہ جو قافلہ سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے، پھر وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ اب وہ نہ صرف جُوا ہی کھیلتا تھا بلکہ شراب بھی پینے لگا تھا اور اس کی اس بُری عادت سے مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ کیونکہ شراب پی کر وہ بُری طرح بہکتا تھا۔ جس رات وہ شراب پی کر آتا، اُس رات جیسے گھر میں طوفان سا آجاتا تھا۔ نہ صرف شراب کے بھبکوں سے میرا دماغ چٹخنے لگتا تھا، بلکہ گالی گلوچ سے بھی تمام گھر میں تعفّن بکھر جاتا۔

اگر وہ اسی پر اکتفا کرتا، تو میں برداشت کر لیتی، لیکن اب پھر کسی نئی عورت کا تصوّر اس کے ذہن میں کھلبلی مچانے لگا تھا اور پھر ایک دن ایک بڑی فیشن ایبل عورت اس کے دوست کی بیوی کے بہانے گھر میں داخل ہوئی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ کچھ دنوں بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اس کے دوست کی بیوی نہ تھی بلکہ میری سوت تھی اور میں سوت کا جلاپا برداشت نہ کرتے ہوئے پھر اپنی امّی کے ہاں پناہ گزیں ہو گئی۔ اب تیسرا بچہ میری گود میں تھا۔

کچھ دنوں اسی طرح حالات کی چکّی میں پستی رہی۔ اب میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ پیش آئیں میں آصف کے ہاں نہ جاؤں گی۔ میں کافی عرصہ تک اس عہد پر قائم رہی لیکن ایک روز میں نے سُنا کہ آصف سکوٹر چلاتے ہوئے کسی ٹیکسی سے ٹکرا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بھاگتی ہوئی ہسپتال پہنچی اور کئی روز تک اس کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ جب اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا گیا اور وہ کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو میں اس کے اصرار کے باوجود اس کے بنگلے پر نہ گئی اور اپنی امّی کے ہاں چلی آئی، کہ مجھ میں سوت کا جلاپا برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔

کچھ دن اور اسی طرح بیت گئے۔ پھر مجھے خبر ملی کہ..... رشوت ستانی کے الزام میں آصف گرفتار ہو گیا ہے، لیکن اس سے بڑی قیامت یہ گذری کہ جب میری سوت کو یہ پتہ چلا کہ آصف گرفتار ہو کر حوالات کی چار دیواری میں پہنچ گیا ہے تو وہ بنگلے کا تمام ساز و سامان، کپڑے، لتّے اور مال و دولت سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو گئی۔ آصف کے لیئے یہ چرکہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر خود کردہ را علاج نیست، وہ اپنی تباہیوں کا آپ ذمہ دار تھا۔ اس نے جَو بوئے تھے، گیہوں کیسے کاٹتا؟ میں نے بھی جب یہ خبر سُنی تو دل تھام کر رہ گئی۔ مگر میں بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ پھر اس خیال سے دل کو تقویت ملی کہ جب آصف ہی میرا کچھ نہیں تو اس کے لائے ہوئے سامان پر میرا کیا حق ہے۔

کچھ عرصہ بعد آصف ضمانت پر رہا ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بدنصیبیوں اور محرومیوں کا دور شروع ہو گیا۔ وہ بنگلہ جس میں ایک انجینئر کی حیثیت سے وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا اس سے چھین لیا گیا۔ کچھ دنوں تک مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی، خدا جانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ میں بہت بے چین رہی پھر ایک دن وہ اپنی نظریں نیچی کیئے ہوئے میری امّی جان کے پاس آیا اور ان کی منّت سماجت کرنے لگا۔ اس نے رو رو کر اپنے بُرے اعمال کی معافی مانگی۔ میری امّی بہت سخت دل ہیں۔ انہیں اس کے حال پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکیں

"اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ دولت تم پر لُٹا دی، اور اپنے دل کا ٹکڑا تمہارے حوالے کر دیا۔ اب میرے پاس سلگتی ہوئی آہوں اور برستی ہوئی آنکھوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ کیا تم مجھ سے یہ دولت بھی چھین لینا چاہتے ہو؟ معافی مانگنا چاہتے ہو تو نجمہ بیٹی کے پاس جاؤ کہ اسی سے تمہارا کوئی ٹوٹا پھوٹا تعلق ہے۔ میرے تم کیا لگتے ہو۔ معافی مانگنا چاہتے ہو تو اپنی جھولی اپنے تین معصوم بچوں کے سامنے پھیلاؤ، جن کے تم مجرم ہو، جنہیں تم بھوک، غریبی اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکے۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور روتے روتے ان کی گھگی بندھ گئی۔

آصف پر کچھ دیر تک سکتہ کی کیفیت طاری رہی۔ شاید وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ مجھ سے معافی مانگے یا نہ مانگے۔ پھر وہ نہ جانے کیا سوچ کر اُٹھا اور اس نے لپک کر اپنا سر میرے قدموں میں رکھ دیا۔ میں اس صُورت حال کے لیئے ہرگز تیار نہ تھی۔ آسمان زمین پر جُھک گیا تھا۔ شیر بکری کے سامنے زمیں بوس تھا اور فرعون موسیٰ کے سامنے اعترافِ شکست کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیئے میں نے یُوں محسوس کیا جیسے زمین و آسمان کی گردش کچھ دیر کے لیئے رُک گئی ہو یا کسی، قیامت خیز زلزلے نے کائناتِ اَرضی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ لیکن چند ثانیوں کے بعد میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور میں سمجھ گئی کہ یہ سب کچھ آصف کی چال بازی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار مکاری سے اعتماد میں لے کر مجھے دھوکا دے چکا ہے۔ پھر جانتی ہو شنو، میں نے کیا کیا؟ یہی ناکہ میں نے اسے دھتکار دیا؟ اس کے احساسِ ندامت کو ٹھکرا دیا؟ تم ٹھیک سمجھی ہو ـــ ارے پگلی۔ تم بھی کتنی بھولی ہو، میری باتوں میں آگئیں۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُن کے سینے سے لگ گئی اور اتنا روئی کہ اُن کے شانے میرے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ میں نے انہیں سچے دل سے معاف کر دیا۔ شہناز، میں مشرقی عورت ہوں، جو سُسرال میں زندہ جاتی ہے اور میّت بن کر نکلتی ہے۔ ہم مشرقی عورتوں کا یہی طرّۂ امتیاز ہے۔ اور ہم اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ وہ عورتیں بھی تو ہماری بہنیں تھیں جو مُردہ شوہروں کی لاشوں پر ستی ہو جاتی تھیں۔ آصف تو خدا رکھے، زندہ سلامت ہیں۔ میں ان کی جُدائی کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟۔

آصف صاحب اپنے کیئے پر نادم ہیں۔ انہوں نے تمام بُرے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔ شراب پینا ترک کر دیا ہے۔ پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ شاید اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ وہ پھر اپنی ملازمت پر بحال ہو گئے ہیں میں پھر اپنے بنگلے میں اُٹھ آئی ہوں اور خوش و خرم ہوں۔ طبیعت ٹھکانے لگی ہے، تو سب سے پہلے تمہیں یاد کیا ہے ـــ اُمید ہے یہ تلخ رُوداد پڑھ کر تم مجھے معاف کر دو گی۔ میں جانتی ہوں تم بڑی رحم دل بھی تو ہو۔ اپنے اُن سے میرا آداب کہہ دینا۔

تمہاری سہیلی
نجمہ

* نمونہ کے پرچے کے لیئے (۵۰) پیسے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کیجئے، ورنہ ادارہ پرچہ روانہ کرنے سے قاصر رہے گا۔ (مینیجر)

مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا، اور میں کھانے کی میز سے اُٹھ کر اندر بھاگ گئی۔

"بیچاری!" میں نے بھاگتے ہوئے سُنا۔ شاید اسی لڑکی نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا تھا۔ میرا ماتھا اسی روز ٹھنک گیا تھا کہ بہت ہی غیر معمولی حادثہ جنم لینے والا تھا۔

اور کچھ دنوں بعد میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہی لڑکی آصف کی نئی نویلی دُلہن بن کر گھر میں آگئی۔ میں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اس حادثے کا مقابلہ کیا اور دو چار روز کے بعد اپنی امّی کے ہاں چلی آئی کہ اب آصف کے بنگلے میں مجھ جیسے ٹُوٹے پھُوٹے "شو پیس" کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

کچھ ماہ گذر گئے۔

اور پھر ایک روز میں نے سُنا کہ آصف کی دوسری بیوی، جو چولہے کے پاس بیٹھی تھی، اچانک شعلوں کی نذر ہو گئی۔ نائیلون کے ریشمی لباس نے اس کی جان لے لی تھی اور اس طرح جس آگ میں ایک عورت نے دوسری عورت کو جلایا تھا خود بھی اس میں جل کر راکھ ہو گئی۔

اب ایک مرتبہ پھر میری قسمت جاگ اُٹھی۔ آصف کو پھر میرا خیال آیا۔ اپنے بچّوں کا خیال آیا اور وہ مجھے مَنا مُنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ میں بھی زیادہ عرصہ اپنی بیوہ ماں پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیئے آسانی سے رضامند ہو گئی۔

کچھ عرصہ تک تو آصف کا دماغ ٹھکانے سے رہا۔ لیکن پھر اس کے ضبط کے بند ٹوٹنے لگے اور وہ پھر شیطانی حرکتوں پر اُتر آیا۔ مگر میں نے کبھی اسے کسی بات پر نہ ٹوکا کہ جو قافلہ سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے، پھر وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ اب وہ نہ صرف جُوا ہی کھیلتا تھا بلکہ شراب بھی پینے لگا تھا اور اس کی اس بُری عادت سے مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ کیونکہ شراب پی کر وہ بُری طرح بہکتا تھا۔ جس رات وہ شراب پی کر آتا، اُس رات جیسے گھر میں طوفان سا آجاتا تھا۔ نہ صرف شراب کے بھبکوں سے میرا دماغ جھنجھنے لگتا تھا، بلکہ گالی گلوچ سے بھی تمام گھر میں تعفّن بھر جاتا۔

اگر وہ اسی پر اکتفا کرتا، تو میں برداشت کر لیتی، لیکن اب پھر کسی نئی عورت کا تصوّر اس کے ذہن میں کھلبلی مچانے لگا تھا اور پھر ایک دن ایک بڑی فیشن ایبل عورت اس کے دوست کی بیوی کے بہانے گھر میں داخل ہوئی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ کچھ دنوں بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اس کے دوست کی بیوی نہ تھی بلکہ میری سوت تھی اور میں سَوت کا جَلاپا برداشت نہ کرتے ہوئے پھر اپنی امّی کے ہاں پناہ گزیں ہو گئی۔ اب تیسرا بچّہ میری گود میں تھا۔

کچھ دنوں اسی طرح حالات کی چکّی میں پِستی رہی۔ اب میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ پیش آئیں میں آصف کے ہاں نہ جاؤں گی۔ میں کافی عرصہ تک اس عہد پر قائم رہی لیکن ایک روز میں نے سُنا کہ آصف سکوٹر — چلاتے ہوئے کسی ٹیکسی سے ٹکرا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں بھاگتی ہوئی ہسپتال پہنچی اور کئی روز تک اس کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ جب اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا دیا گیا اور وہ کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو میں اس کے اصرار کے باوجود اس کے بنگلے پر نہ گئی اور اپنی امّی کے ہاں چلی آئی، کہ مجھ میں سوت کا جلاپا برداشت کرنے کی ہمّت نہ تھی۔

کچھ دن اور اسی طرح بیت گئے۔ پھر مجھے خبر ملی کہ..... رشوت ستانی کے الزام میں آصف گرفتار ہو گیا ہے، لیکن اس سے بڑی قیامت یہ گذری کہ جب میری سوت کو یہ پتہ چلا کہ آصف گرفتار ہو کر حوالات کی چار دیواری میں پہنچ گیا ہے تو وہ بنگلے کا تمام ساز و سامان، کپڑے، لتّے اور مال و دولت سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو گئی۔ آصف کے لیئے یہ چرکہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر خود کردہ را علاج نیست، وہ اپنے کیا ہوں کا آپ ذمہ دار تھا۔ اس نے جَو بوئے تھے، گیہوں کیسے کاٹتا؟ میں نے بھی جب یہ خبر سُنی تو دل تھام کر رہ گئی۔ مگر میں بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ پھر اس خیال سے دل کو تقویت ملی کہ جب آصف ہی میرا کچھ نہیں تو اس کے لٹے ہوئے سامان پر میرا کیا حق ہے۔

کچھ عرصہ بعد آصف ضمانت پر رہا ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بدنصیبیوں اور محرومیوں کا دَور شروع ہو گیا۔ وہ بنگلہ جس میں ایک انجینیئر کی حیثیت سے وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا اس سے چھین لیا گیا۔ کچھ دنوں تک مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی، خدا جانے وہ کہاں گُم ہو گیا تھا۔ میں بہت بے چین رہی پھر ایک دن وہ اپنی نظریں نیچی کیئے ہوئے میری امّی جان کے پاس آیا اور ان کی منّت سماجت کرنے لگا۔ اس نے رو رو کر اپنے بُرے اعمال کی معافی مانگی۔ میری امّی بہت سخت دل ہیں۔ انہیں اس کے حال پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکیں

"اب میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ دولت تم پر لٹا دی اور اپنے دل کا ٹکڑا تمہارے حوالے کر دیا۔ اب میرے پاس سلگتی ہوئی آہوں اور برستی ہوئی آنکھوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ کیا تم مجھ سے یہ دولت بھی چھین لینا چاہتے ہو؟ معافی مانگنا چاہتے ہو تو نجمہ بیٹی کے پاس جاؤ کہ اسی سے تمہارا کوئی ٹوٹا پھوٹا تعلق ہے۔ میرے تم کیا لگتے ہو۔ معافی مانگنا چاہتے ہو تو اپنی جھولی اپنے تین معصوم بچّوں کے سامنے پھیلاؤ، جن کے تم مجرم ہو، جنہیں تم بھوک، غریبی اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکے۔"

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور روتے روتے ان کی گھگی بندھ گئی۔

آصف پر کچھ دیر تک سکتہ کی کیفیت طاری رہی۔ شاید وہ دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ مجھ سے معافی مانگے یا نہ مانگے۔ پھر وہ نہ جانے کیا سوچ کر اُٹھا اور اس نے لپک کر اپنا سَر میرے قدموں میں رکھ دیا۔ میں اس صُورتِ حال کے لیئے ہرگز تیار نہ تھی۔ آسمان زمین پر جُھک گیا تھا۔ شیر بکری کے سامنے زمیں بوس تھا اور فرعون موسیٰ کے سامنے اعترافِ شکست کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیئے میں نے یُوں محسوس کیا جیسے زمین و آسمان کی گردش کچھ دیر کے لیئے رُک گئی ہو یا کسی قیامت خیز زلزلے نے کائناتِ اَرضی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ لیکن چند ثانیوں کے بعد میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور میں سمجھ گئی کہ یہ سب کچھ آصف کی چالبازی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار اسی طرح مجھے اعتماد میں لے کر مجھے دھوکا دے چکا ہے۔ پھر جانتی ہو شہناز، میں نے کیا کیا؟ یہی نا کہ میں نے اسے دھتکار دیا؟ اس کے احساسِ ندامت کو ٹھکرا دیا؟ تم ٹھیک سمجھی ہو ـــ ارے پگلی۔ تم بھی کتنی بھولی ہو، میری باتوں میں آگئیں۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ میں نے اُنہیں اپنے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا اور اُن کے سینے سے لگ گئی اور اتنا روئی کہ اُن کے شانے میرے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ میں نے اُنہیں سچے دل سے معاف کر دیا۔ شہناز۔ میں مشرقی عورت ہوں، جو سُسرال میں زندہ جاتی ہے اور میّت بن کر نکلتی ہے۔ ہم مشرقی عورتوں کا یہی طرۂ امتیاز ہے۔ اور ہم اس پر فخر بھی کرتی ہیں۔ وہ عورتیں بھی تو ہماری بہنیں تھیں جو مُردہ شوہروں کی لاشوں پر ستّی ہو جاتی تھیں۔ آصف تو خدا رکھے، زندہ سلامت ہیں۔ میں ان کی جُدائی کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟۔

آصف صاحب اپنے کیئے پر نادم ہیں۔ انہوں نے تمام بُرے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔ شراب پینا ترک کر دیا ہے۔ پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ شاید اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ وہ پھر اپنی ملازمت پر بحال ہو گئے ہیں میں پھر اپنے بنگلے میں اُٹھ آئی ہوں اور خوش و خرم ہوں۔ طبیعت ٹھکانے لگی ہے، تو سب سے پہلے تمہیں یاد کیا ہے ـــ اُمید ہے یہ تلخ رُوداد پڑھ کر تم مجھے معاف کر دو گی۔ میں جانتی ہوں تم بڑی رحم دل بھی تو ہو۔ اپنے اُن سے میرا آداب کہہ دینا۔

تمہاری سہیلی
نجمہ

الیاس احمد گدّی

”ہارے ہوئے لوگ“

”۔۔۔ اپنے موتی، سُوّروں اور کُتّوں کے آگے مت ڈالو ایسا نہ ہو کہ وہ ان کو پاؤں تلے رَوندیں اور پلٹ کر تم کو پھاڑ دیں..!“

ایک چھوٹے خوبصورت پلاسٹک کے پرس کو بائیں ہاتھ میں جھلا کر چلتی ہوئی جوزیہ یُوں چونک گئی، جیسے کسی نے اس کا دامن پکڑ لیا ہو۔ اس نے ٹھٹھک کر دیکھا۔ سڑک کے کنارے چار چھ آدمی جمع ہیں، ایک سیاہ فام پادری واعظ کہہ رہا ہے :

”یسُوعِ مسیح نے فرمایا' اے عورتو !.......“

وہ جلدی سے فٹ پاتھ سے نیچے اُتر گئی ۔۔۔ نہیں نہیں، یہ جھُوٹ ہے ! اس نے سوچا، ہم نے کب اپنے موتی سُوّروں اور کُتّوں کے آگے ڈالے ہیں !۔ وہ تو کوئی انجانی طاقت ہے جو ہمیں ان خونخوار وحشی کُتّوں کے پنجرے میں دھکیل دیتی ہے اور باہر سے تماشہ دیکھتی ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم پہ کیا گذرتی ہے.....

اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ لیکن جیسے سیاہ فام پادری کے الفاظ برابر اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خود یسُوعِ مسیح اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اے لڑکی!

اے لڑکی ! ۔۔۔ اپنے موتی سُوّروں اور کُتّوں کے آگے مت ڈالو اے لڑکی ! ..... سُنتی ہو ..... اے بدبخت گمراہ لڑکی سنتی ہو...؟

آواز مدھم، رحم دل، مشفق آواز اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ ایسی آواز جو دھیرے سے' نرمی سے ایکدم دل میں اُتر جاتی ہے، مگر دل ۔۔۔!

تم نے وہ کہانی نہیں سُنی کہ جب ایک قبیلے کے افراد اندھیرے گھنے جنگل میں راستہ بھُول کر دَلدل میں پھنسنے لگے تو لوگوں نے اس کو طعنے دیئے۔ بُرا بھلا کہا کہ وہی شخص تمام بربادی کا ذمہ دار ہے۔ تب اُس آدمی نے کہ جو' ان کا سردار تھا اور ان سے محبت کرتا تھا، اپنی چھاتی چیری اور اپنے دل کو اپنے ہاتھوں میں نکال لیا، جو آفتاب کی طرح دَمک رہا تھا۔ اس دل کی سُرخ خوبصورت روشنی میں لوگوں نے اپنا راستہ تلاش کیا اور جب جنگل سے باہر نکل آئے تو.......

اس کا باپ کہتا ہے جوزی، یہ سب لوگ مر جائیں گے، یہ تمہاری اَپاہج بہن، یہ فرشتوں جیسا معصوم بھائی' یہ بُڈھا باپ جو بھیک مانگنے نکلتا ہے تو بھیک تک نہیں ملتی .... کیا تمہیں

ان سب پر ترس نہیں آتا ہو۔ پھر وہ سسکتا ہے۔ اور اپنے کندھے اور ہونٹوں کے پاس ہاتھ گھما کر صلیب کا نشان بناتا ہے اور ایسے کہتا ہے جیسے اپنے گناہوں کے احساس سے کانپ گیا ہو۔

"خدا مجھے معاف کرے.....!"

خدا، جو غریبوں کے لیئے بڑا عظیم ہے کہ جب ہم ہار جاتے ہیں اور کتے اور سُوّر ہمارے جسم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر دیتے ہیں اور ہم گر پڑتے ہیں تو کہتے ہیں یا خدا ہمیں معاف کر دو۔ اور خدا جو بڑا عظیم اور رحیم ہے ہمیں معاف کر دیتا ہے اور ہمارے سارے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ اور ہمیں نئی توانائی اور تازگی بخشتا ہے کہ ہم پھر اپنا جسم کتوں سے نچوا سکیں۔

وہی جسم جسے مٹی کا تودہ اور گناہوں کا مسکن کیا گیا ہے وہی جسم جو آج ہے تو کل نہیں رہتا۔ وہی جسم جس پر زمانہ اتنی خراشیں ڈالتا ہے کہ بعد میں پہچانا نہیں جاتا۔ مگر موٹا سیٹھ رال بہتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"تمہارا جسم تو ریشم کی پوٹ ہے۔ گنگا اور سندھ کی کیوال مٹی سے بنا ہوا یہ جسم اس قدر گداز اور مخملیں ہے کہ اس کو چھوتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ ہم دُنیا کی عظیم ترین لذّت سے آشنا ہو رہے ہیں!"

اس کے موٹے بھدے سیاہ چہرے پر بھکاریوں ایسی منت جھلکنے لگتی ہے۔ پلنگ کے اُوپر گھومتا ہوا پنکھا ایک خاموش گواہ کی طرح تکتا رہتا ہے اور امریکن سینٹ کی خوشبو، اور نرم ڈنلپ کا گدّہ اور بڑا سا آبنوس کا پلنگ حجلۂ عروسی کی یاد دلاتا ہے۔ وہ حجلۂ عروسی جس کے متعلق اب وہ سوچتی تک نہیں۔ کیونکہ جب کبھی اس کی شادی کی بات آتی ہے تو اس کا بوڑھا باپ کسی نامعلوم خوف سے کانپنے لگتا ہے۔

"نہیں، ابھی میری بچّی تو بالکل بچّی ہے، ایک دم معصوم، کمسن بچّی ——!"

وہ آہستہ سے ہاتھ گھما کر صلیب کا نشان بناتا ہے اور اپنی اپاہج بیٹی ماریہ کو حسرت سے دیکھنے لگتا ہے۔ جس کو بون ٹی.بی ہے اور جسے ڈاکٹروں نے پلاسٹر کرکے بستر پر ڈال دیا ہے اور جس کے دونوں پاؤں سُوج گئے ہیں اور جو بات کرتی ہے تو گمان ہوتا ہے جیسے رو رہی ہو۔ اور جو، جوزیہ کو ایسے رشک سے تکتی ہے کہ جوزیہ لرز لرز جاتی ہے۔ اس کو ایسا لگتا ہے، جیسے ماریہ سب کچھ جانتی ہے۔ وہ سب کچھ بھی جسے وہ اپنے آپ تک سے چھپائے رکھتی ہے حالانکہ مائیکل کا دیا ہوا رومال وہ باہر ہی پھینک آتی ہے۔ کبھی اسے اپنے گھر لانے کی اجازت نہیں دیتی۔ کبھی اس کے ساتھ بازار میں اس ڈر سے نہیں گھومتی کہ کہیں کوئی آدمی ماریہ سے کہہ نہ دے۔

اس دو کمروں کے چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں ہر آدمی خوف زدہ ہے۔ جوزیہ، ماریہ کی نگاہوں سے خوف کھاتی ہے، اس کا باپ جوزیہ کی شادی سے خائف رہتا ہے۔ اور ماریہ اپنی موت سے ڈرتی ہے اور وقت سہما ہوا، ڈرا ہوا ان کے قریب سے گذرتا ہے، جیسے وہ بھی خوف زدہ ہو کہ کہیں یہ نازک ترین رشتے ٹوٹ نہ جائیں۔ ایک مشکوک، غیر معتبر خاموشی سارے گھر پر چھائی رہتی ہے اور اس خاموشی میں جب جوزیہ کا چھوٹا بھائی مقدس انجیل لے کر پڑھنے لگتا ہے تو یوں گمان ہوتا ہے، جیسے ہم بہت پیچھے لوٹ گئے ہیں سینکڑوں، ہزاروں سال، پیچھے۔

"لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی پر نظر کی وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا۔ پس اگر دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر پھینک دے۔ کیوں کہ تیرے لیئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے.....!"

مائیکل کی آواز بڑی درد انگیز ہے۔ سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے اس کی آواز ایسا فسوں پھونکتی ہے کہ چند لمحوں تک آدمی وارفتہ ہو جاتا ہے۔ کہیں کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ ہر آدمی الگ الگ سوچنے لگتا ہے۔ تب جوزیہ آہستہ سے ماریہ کے بستر پر بیٹھ جاتی اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگتی ہے۔

"جوزی ڈارلنگ، جوزی ڈارلنگ! بولو تو کیا اس جہنم کے

ادھ بھی کوئی جیتا ہے؟

جوزیہ اس کو کوئی جواب نہیں دیتی، صرف دُکھ سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ جو چھت کی میلی کڑیاں اور شہتیر گننے لگتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے کہ اسے مفلوج کر کے بستر پر ڈال دیا گیا ہے کہ نہ وہ چل سکتی ہے نہ کروٹ لے سکتی ہے۔ صرف چت لیٹ کر چھت کو تکے جاتی ہے، یُونہی، بے مقصد، بیکار ..... اور اسے ایسا گمان ہوتا ہے جیسے کوئی بار بار اس سے پُوچھ رہا ہو، بتاؤ کیا تم زندہ ہو؟ بتاؤ کیا تم زندہ ہو؟؟ اور وہ جواب میں ہاں کہتی ہے نہ نا کہتی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات اُسے خود محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرچکی ہے اور یہ کمرہ دراصل اسی کا تابُوت ہے۔ ابھی ذرا دیر میں لوگ آئیں گے اور اس تابُوت کو اُٹھا کر لے جائیں گے ایک جہنم سے دوسرے جہنم کی طرف ـــــ شاید ان بہت سارے اجنبی انجان جنازہ برداروں میں مائیکل بھی آجائے۔ وہ تمنا کرتی ہے۔

لیکن جوزیہ جانتی ہے کہ مائیکل اب نہیں آئے گا۔ کیونکہ آجکل وہ خود اس کے پیچھے گھومتا ہے اور اس کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہے، جیسے اس پر فدا ہوجانا چاہتا ہے۔ کتنی ہی بار اس نے باردوں اور رقص گاہوں میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہر بار وہ ٹال جاتی ہے۔ کیونکہ ہر بار اس کو ایسا لگتا ہے، جیسے کہیں کہیں سے ماریہ اس کو دیکھ رہی ہے ..... ہاں یہ وہی ماریہ ہے، جس سے مائیکل نے کہا تھا کہ وہ دُنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہے اور وہ اس سے شادی کرے گا اور اسے شملہ لے جائے گا جہاں وہ پہلے بھی ایک آدھ بار اپنے والدین کے ساتھ جا چکا تھا۔ پھر ایک گاڑی خریدے گا اور دونوں سارے ہندوستان کی سیر کریں گے۔ مہنگے ہوٹلوں میں کھانا کھائیں گے اور شاندار کلبوں میں ڈانس کریں گے۔ اور مسرتیں اُن کے آگے پیچھے گھومیں گی ....!

مگر یہ تب کی بات ہے جب ماریہ ابھی بیمار نہیں پڑی تھی۔ اور اُس کے خوبصورت اور معصوم چہرے پر ایک عجیب طرح کی مسرت جھلکتی رہتی تھی اور جو سارا دن اس قدر اُودھم مچاتی کہ بعض اوقات کالونی والے شکایت کرنے آجاتے۔ تب اس کا باپ جو ایک پرائیویٹ فرم میں مُلازم تھا، اور اس کی بینائی ختم نہیں ہوئی تھی، صرف پیار سے مُسکراتا اور جب کالونی والے چلے جاتے تو بڑے پیار سے مدہم لہجے میں کہتا۔

"ماریہ تو بالکل اپنی ماں پر گئی ہے!"

پھر اس کی کمر میں درد رہنے لگا اور آخر ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے بون ٹی بی ہے۔ اور اس کو پلاسٹر کر کے بستر پر ڈال دیا گیا اور اس اُچھل کُود کی ماریہ کو بڑی مہنگی قیمت چکانی پڑی۔ اور اب ماریہ بڑے شرمیلے لہجے میں بالکل ہندوستانی لڑکی کی طرح جوزیہ سے پوچھتی ہے:

"ڈارلنگ، مائیکل تمہیں نہیں ملتا؟"

"مائیکل؟" وہ کانپ جاتی ہے۔ مگر اسے نہیں بتاتی کہ مائیکل اسے اکثر ملتا ہے۔ کیونکہ اَن جانا خوف اس پر حاوی ہونے لگتا ہے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ماریہ سب کچھ جانتی ہے، سب کچھ ......

ماریہ اس کی طرف دیکھے بغیر پُوچھتی ہے۔

"جوزی، کیا ایک بار، صرف ایک بار تم اسے یہاں نہیں لاسکتیں؟ ڈارلنگ! اس سے کہنا کہ کم از کم ایک بار مجھ سے مل لے شاید اب میں زیادہ دن زندہ نہ رہوں گی!"

جوزیہ کچھ جواب نہیں دیتی۔ مگر ایک تیز مہین سُوئی اس کے دل میں دُور تک اُترتی چلی جاتی ہے اور کئی گھنٹوں تک ایک بے نام کسک اس کو بے چین کیئے رہتی ہے ......!

جوزیہ کے پیچھے چلنے والی آواز اب مدہم ہوتی جارہی تھی۔

"لڑکی، اے لڑکی، اے بدبخت گمراہ لڑکی سُنتی ہو....؟"

پھر اچانک ایسا لگا، جیسے کوئی ایک دم اس کے پیچھے آگیا ہے، وہ کانپ گئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ مگر وہ یسوع مسیح نہیں مائیکل تھا۔ وہی خوبصورت کھلنڈرا تیز و طرار مائیکل! ......

"ہلو، بہت پریشان سی ہو، کیا بات ہے؟"

"اوہ کچھ نہیں!" وہ ہینڈ بیگ سے رُومال نکال کر گردن کا پسینہ پونچھنے لگی۔

"تم آج ایسی گھبرائی سی لگ رہی ہو جیسے کوئی بھوت دیکھا ہو!"

"بھوت!" وہ کھِل کھلا کر ہنسی۔ "یہ بھوتوں ہی کی تو بستی ہے!"

مائیکل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا آؤ، اس بھوتوں کی بستی کا کولڈ ڈرنک تمہیں پلائیں!"

وہ اس کا بازو تھام کر قریب کے ہوٹل میں گھس گیا۔

لیمن اسکوائش ٹھنڈا تھا، فرحت بخش تھا۔ جب گلے سے اُترتا تو سارے جسم میں ایک تازگی اور طراوٹ پہنچاتا جاتا۔ مگر یہ بچوں کے لیئے ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ کوئی اور مزہ چاہتی تھی۔ ذرا تیز، تلخ اور ترش۔ جیسے جیسے......

"آج میٹنیز میں ڈانس ہے، چلو گے؟"

"ضرور، تمہارے ساتھ ڈانس کرنا، میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ دراصل تمہارے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ تم ان لڑکیوں سے بلند تر ہو جو ہم رقص ہونے کے باوجود، اُکھڑی اُکھڑی سی، الگ الگ سی رہتی ہیں۔ تمہارے یہاں جو مکمل مفاہمت ہے وہ......"

"کچھ اس مت کہو، ڈانس کے بعد میرے گھر چلو گے؟"

مائیکل ایک دم سے چُپ ہو گیا۔ جیسے لمحہ بھر رُک کر سوچنے لگا۔

"تمہیں وہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا..... ماں بھی نہیں!"

"چلوں گا۔" اس نے جوزیہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ "مگر سارا وقت تمہیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ تم اکثر مجھے جُل دے جاتی ہو حالانکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بے پناہ محبت....."

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی مائیکل کے چہرے کی طرف دیکھا جو سفلی جذبات سے بھبک اُٹھا تھا۔ وہ ویسے ہی چپ چاپ گھونٹ گھونٹ لیمن اسکوائش پیتی رہی۔

آرکسٹرا تیز اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والا تھا— دلکش اطالوی ٹیون پر پیر آپ ہی آپ تھرکنے لگتے تھے۔ مارچ کی ٹھنڈی رات، دن بھر کی تپش کے بعد بڑی خوبصورت اور نکھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور سارے ہال میں خوشبو اور رنگ برنگے لباس اور وہسکی کا گہرا سرور چھایا ہوا تھا۔ اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتا ہوا مائیکل، اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے تیز دھارے والے دریا میں بے بسی سے بہتے بہتے اچانک کسی نے اس کو تھام لیا ہے اور اب آہستہ آہستہ اسے کنارے کی طرف لیئے جا رہا ہے۔ ابھی یہ انجان، اجنبی شہزادہ اس کے لیئے کتنے ہی لوگوں سے ڈوئل لڑے گا اور پھر اسے جیت کر اپنے شاندار محل میں لے جائے گا۔ جہاں بجلی کے بلبوں کی بجائے بڑی بڑی موم بتیاں جلتی ہیں۔

"ڈارلنگ، جوزی ڈارلنگ! جی چاہتا ہے، یہ رات رُک جائے ساری زندگی یہ رقص یونہی ہوتا رہے.....!" مائیکل نے اس سے سرگوشی کی۔ میں نے سر اُٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ گہری سیاہ آنکھیں، بالکل ہندوستانی شہزادوں کی سی، اس پر آویزاں تھیں... اس کا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اور اس کے سانس کی گرم لپٹیں وہ اپنے رخساروں پر محسوس کر رہی تھی۔

"جوزی ڈارلنگ! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟"

جوزیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اپنا سر اس کی چھاتی سے لگا دیا۔ جیسے اس کی محبت کا اقرار کر رہی ہو۔ مائیکل کی گرفت اس کی کمر کے گرد سخت ہو گئی۔

"تم دراصل جگنو کی روشنی میں جیتی ہو، دم بھر کو جگنو چمکتا ہے اور ایک جگمگاہٹ چھوڑ کر پھر اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔ گھڑی بھر کی یہ مسرت دُکھوں کو اور ناقابلِ برداشت بنا دیتی ہے۔ جیسے روشنی کے ایک چھپاکے کے بعد اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے!"

وہ نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ ہارتی جا رہی تھی۔ یہ مائیکل تھا یہ اس کا گاہک نہیں تھا، جسے نپٹا کر وہ جلد سے جلد فراغت حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ دراصل مائیکل تھا۔ خوبصورت، کھلنڈرا، ہینڈسم!

"چلو باغ میں چلیں، یہاں بہت گھٹن ہے۔"

موسیقی تیز ہوگئی تھی اور ساتھ ہی رقص کرنے والے جوڑوں کی
تار بھی تیز ہوگئی تھی۔ ہال کا فرش کانپ رہا تھا اور ملی جلی سرگوشیوں
ر ہلکی ہلکی پُراسرار ہنسی سے فضا کھنک رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب
یں دیا۔ یُونہی آنکھیں نیم وَا کیئے اُسے دیکھتی رہی۔

"چلو۔"

وہ اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے آیا۔ پھر دونوں آہستہ
سے دروازے کے باہر ہوگئے۔

باہر مارچ کی رات ریشمی خنکی میں ملفوف تھی۔ آسمان، وسیع
نیلا آسمان جگمگا رہا تھا۔ چاند جو رقص کے آغاز تک ایک بڑے
سے سونے کی تھال کی طرح مشرقی گوشے میں آویزاں تھا۔ اب اُوپر
اُٹھ آیا تھا۔ اور ہوا جیسے اطالوی آرکسٹرا کی لَے پر ہَولے ہولے
بہہ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے باغ میں دُور تک نکل گئے
ان کے پیچھے موسیقی کی لہریں اُٹھ رہی تھی، جیسے وہ خواب کے جزیروں سے
آرہی ہوں۔

رات کی رانی کے سائے میں لیٹی ہوئی ایک سنگِ مرمر کی بینچ
پر مائیکل نے اُسے بٹھالیا۔

"ڈارلنگ! کبھی کبھی ہم اتنی مسرت پالیتے ہیں کہ اس کے
بعد اور کسی مزید خوشی کی ضرورت نہیں ہوتی.....!"

وہ چُپ رہی۔ اُس نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کی
آنکھوں کے سامنے تو ایک اور ہی منظر تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے
اس شہزادے نے اس کو دریا کی ہولناک موجوں سے نکال لیا تھا۔ اور
اب وہ دونوں کنارے پر تھے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میری زندگی کو جس ساحل کی تلاش
تھی، وہ مجھے مل گیا ہے".....وہ اس کی طرف جُھک آیا۔ جوزیہ نے
نیم وَا آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ پیچھے ہال سے موسیقی کے ساتھ
ملا جلا ایک تیز سُریلا قہقہہ ان پر رنگ اُچھالتا گزر گیا۔

"سچ کہتا ہوں جوزی ڈارلنگ، تمہیں پاکر میں ساری دُنیا کو
چھوڑنے کے لیے تیار ہوں..... میں تم سے..... میں تم سے شادی
کرنا چاہتا ہوں.....!" اُس نے جذبات سے مغلوب ہوکر اس کو بھینچ
لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کردیئے۔ ایک لمحہ
کے لیئے روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ پیچھے سرسراتی ہوئی موسیقی ایک گونج
بن گئی۔ دُور جگمگاتی ہوئی روشنیاں ایک دَم سے نزدیک آگئیں۔
ایک دم آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ کتنے ہی رنگ اِدھر اُدھر کانپے
لرزے.... اور اس کا سارا وجود گویا تڑخ تڑخ کر ٹوٹنے لگا.......

...."اُس سے کہنا کم از کم ایک بار وہ مجھ سے مل لے۔ شاید اب میں
زیادہ دن زندہ نہ رہوں۔"!

ایک دم سے جوزیہ چونکی، جیسے اچانک دریا کے کنارے چلتے
چلتے اس کا پاؤں پھسلا ہو۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر اپنے کپڑے ٹھیک
کرنے لگی۔

وہ ویسے ہی لیٹا رہا۔ مُسکراتا رہا۔

"تم مجھے ناپسند تو نہیں کرتیں ڈارلنگ! بولو نا؟ میں تم سے
شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

جوزیہ نے محسوس کیا، جیسے شہزادہ اس سے کہہ رہا ہو، میں
تمہیں اپنے محل میں لے چلوں گا۔!

"ماریہ تم سے ملنا چاہتی ہے!" جوزیہ نے اپنے جملہ کا ردِ عمل
دیکھنے کے لیئے اس کی آنکھوں میں گہرائی تک دیکھا۔

"ماریہ!" مائیکل بڑے زور سے چونکا۔

"وہ شاید اب زیادہ دن زندہ نہ ہے"!

مائیکل ایک دَم سے چُپ ہوگیا۔ ایک پُراسرار اُداس خاموشی
چھاگئی۔ آرکسٹرا کی مدھم، دلکش، مسرور کُن آواز اس خاموشی کے
پس منظر میں اور بھی خوبصورت ہوگئی۔

"ڈارلنگ! کیا اور کسی وقت کے لیئے ان باتوں کو نہیں اُٹھایا
جاسکتا۔ ؟"

"نہیں ڈارلنگ! یہ اس بات کے لیئے مناسب ترین وقت ہے"
جوزیہ ایکدم ہوش میں آگئی تھی۔ موسیقی کا افسوں، وہسکی کا نشہ اور
مائیکل کی قُربت کا سُرور اُتر چکا تھا۔

" بڑی مضحکہ خیز بات ہے ڈارلنگ، ہم ایک چھوٹی سی مسرّت کی کشتی میں تیر رہے تھے کہ اچانک وہ کشتی اُلٹ گئی۔ ۔ ۔ ۔"

جوزیہ بڑی دل فگاری سے، بڑے طنز سے ہنسی "کس کی مسرّت کی کشتی اُلٹی، کون ڈوب رہا ہے۔ تمہیں کیا معلوم؟"

" ڈارلنگ، میری درخواست کو ٹالو نہیں.....!" مائیکل نے اسے بہلایا۔

" سُنو، وہی بات تو میں تم سے کھُل کر کرنا چاہتی ہوں، ماریہ تم سے محبت کرتی ہے۔ بے پناہ محبت۔ وہ تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیئے تڑپتی رہتی ہے۔ تمام آنے جانے والوں سے تمہارے متعلق پُوچھتی رہتی ہے۔ اس کا سارا وجود تم سے عبارت ہے۔ تم سے اور صرف تم سے.....!"

" لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ جوزی ڈارلنگ..... تم خود سوچ کر دیکھو اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں......؟"

" ایک بات کہوں؟"

وہ چُپ رہا۔ استفہامیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

" تم اس سے شادی کر لو!"

" تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟"

" سنو، تم اس سے صرف نام کے لیئے شادی کر لو، تم جب بھی، جس وقت بھی، دن کو یا رات کو مجھے چاہو گے، میں تمہارے پاس رہوں گی، میں اپنی رُوح کا ذرّہ ذرّہ، اپنے جسم کا انگ انگ اور اپنی مسرّت کا ایک ایک لمحہ تم پر سے وار دوں گی....."

" تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟" وہ تنک کر کھڑا ہو گیا۔

" دیکھو ڈارلنگ! خدا کے لیئے خفا مت ہو۔ بس ذرا سی قربانی اگر ایک آدمی کو مسرّتوں سے مالا مال کر سکتی ہے تو کیا تم اس قربانی سے گُریز کرو گے؟"

" سُنو، میں قربانی سے گھبراتا نہیں ہوں۔ میں مسرّت چاہتا ہوں اور اسی مسرّت کے لیئے میں شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔ میں ایک مستقل عذاب نہیں پال سکتا۔ ماریہ تمہارے لیئے اہم ہو گی کہ وہ تمہاری بہن ہے مگر میرے لیئے..... مگر میرے لیئے اس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھیں؟ تم ہر جگہ سودا کرنا چاہتی ہو۔ اپنے اس جسم کو کہاں کہاں بیچو گی!" وہ تلخی سے بولا۔

جوزیہ ایک دم تڑپ اُٹھی۔

" شٹ اَپ یو سوائین!"

وہ حقارت سے ہنسا۔ " گالی مت دو، کہو تو آج کے اس عیش کی قیمت بھی چُکا دوں.....؟"

" قیمت!" اُس نے تڑپ کر مائیکل کا گریباں پکڑ لیا۔

مگر مائیکل کے ہاتھوں کا ایک زوردار، بے رحم دھکا کھا کر فرش پر گر پڑی۔ سنگِ مرمر کے بنچ سے ٹکرا کر اس کا سَر لہولہان ہو گیا گرم گرم خون کا نمکین ذائقہ اُس نے اپنے ہونٹوں پر محسوس کیا اور بکھرتے ہوئے حواس پرے جاتے ہوئے مائیکل کے بُوٹوں کی آواز سُنتی رہی۔

اُوپر کھلا نیلا آسمان ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور مشفق ہے۔ آرکسٹرا آخری بار چیخ کر ختم ہو چکا ہے۔ خوبصورت جوڑے رنگین لباسوں میں جگمگ مستیوں سے سرشار ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے، واپسی کے لیئے سیڑھیاں اُتر رہے ہیں۔ کاریں اسٹارٹ ہو رہی ہیں اور تیز تیز باتوں کی آواز رفتہ رفتہ دُور ہوتی جا رہی ہے۔ رقص ختم ہو چکا ہے۔ اس نے سوچا، زندگی کا سارا میک اَپ اُتر چکا ہے۔ جھوٹی مسرتوں کی تلاش میں ساری رات سرگرداں رہ کر اب ہم تھکے ہارے لوگ اپنے گھروں کو لَوٹ جائیں گے اور کوئی ماریہ ہمیں مسرّت سے تکے گی اور کوئی بوڑھا باپ التجا کر یگا اور کوئی اَن جانا ہاتھ ہمیں خونخوار وحشی کُتّوں کی طرح پنجرے میں دھکیل دے گا، اور وحشی کُتّے ہمارا سارا جسم نوچ نوچ کر لہولہان کر دیں گے اور دُنیا کے اس جہنم میں ہمارا بے گُناہ جسم اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائے گا۔ اور کوئی بڑے پیار سے بڑی شفقت سے کہے گا۔

" اے لڑکی، سُنتی ہو!..... اے بدبخت گمراہ لڑکی سُنتی ہو.......!"



صبح کا بھولا

نصیر اختر صدیقی (لندن)

دِل کی دَھڑکنوں کے بَڑھ جانے پر وہ ٹھٹک سا گیا۔

دُور تک شاہراہ خاموش اور اجنبی سی پڑی ہوئی تھی، لگتا تھا جیسے بہار کا موسم ہو اور سبز سبز پھُولوں کے درخت کلیوں کی شوخیوں سے محرُوم ہوں۔ الف لیلیٰ کی داستانوں کی مشہور و معروف شہرِ بغداد کی شاہراہ الارشید کھوئی کھوئی سی انجان اور خالی خولی، بے جان سی نظر آ رہی تھی۔ موسم گرما کی سہ پہر خُنک تھی، اجنبی شہر کی رعنائیاں تھیں اور تصورات و توقعات کا جَھمگٹا سا تھا، ماحول یکدم سے بور معلوم ہو رہا تھا لیکن دل کی دَھڑکنیں تیز تھیں۔

دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتا ہوا وہ کازینو میں داخل ہوا اور تھکا ہارا سا نرم نرم سی کرسی پر دھنس گیا۔ کچھ سینڈوِچ اور کافی کا آرڈر دیکر وہ اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کنکھیوں سے آس پاس نظر دوڑانے لگا۔ اطراف میں کچھ عراقی اُونگھ رہے تھے۔ اس شہر کے سارے باشندوں کو قیلولہ کی لت سی پڑی ہوتی ہے، سہ پہر کو کوئی بھی کسی کام دبار کے قابل نہیں رہتا۔

سب ہی اُونگھتے رہتے ہیں۔ کچھ مُنہ بناتے ہوئے وہ دوسر
جانب دیکھنے لگا، جہاں چند غیر مُلکی سیّاح فارن سگریٹو
مرغولے چھوڑتے ہوئے پریسیڈنٹ ناصر اور مشرقِ وسطیٰ۔
حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان کی باتیں بھی ایک طرح
اُونگھی آمیز تھیں۔ اپنی پُشت پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پ
دو انتہائی خوبصورت لڑکیاں میز پر چند کتابیں اور کا پیاں
ہوئی ہلکے ہلکے کافی کے گھُونٹ لے رہی تھیں۔ اس نے پہل
عراق کا اس قدر صاف سُتھرا، پاکیزہ سا اور غیر معمولی سا حُسن
تھا، جس کے بارے میں اُس نے سُن رکھا تھا کہ وہ خُود در
کم نہیں ہوتا ہے۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے وہ اس غیر متوقع
کے بارے میں سوچنے لگا۔ کافی کی ٹرے آتے ہی اُس نے
نشست بدل دی اور بازو کی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ ا
لڑکیوں کا نظارہ کر سکتا تھا۔ چند منٹ تک نظروں کا تبا
رہا اور اُس نے پُوری جرأت و ہمّت کو سمیٹنے کی کوشش ک
سینڈوِچ زہر مار کیا اور کافی چڑھاتے ہی وہ بانکے میز پ

اور بڑی نرمی سے "السلام علیکم" سے مخاطب کر کے انگریزی میں بڑی تہذیب کے ساتھ وہ ان کے ساتھ چند لمحے بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھتی رہیں، حیرت کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور پھر یکدم کھل کھلا کر معصومیت اور شوخی سے ہنس دیں۔ اس نے اجنبیت کے اس ہلکے سے مظاہرہ پر گھبرا کر بولنا شروع کیا کہ وہ ہندوستان سے تحصیلِ علم کی غرض سے نکلا ہے اور انگلستان میں زیرِ تعلیم ہے، چھٹیوں کے دوران اس نے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخی وطلسماتی سرزمین کے معلوماتی سفر کا پروگرام بنایا ہے اور اس کو کمپنی نہیں مل سکی ہے کہ یہ سفر یادگار اور کبھی نہ بھلانے والا ہو جائے۔ چند لمحوں کے بعد رُک کر اُس نے دیکھا کہ ردِ عمل معلوم ہو، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لڑکیوں نے اسکی کوئی بھی بات سمجھ نہیں پائی ہے۔ اس کا ہاتھ پچھتاوے میں پیشانی تک جاتے جاتے رہ گیا۔ چند لمحے وہ بیوقوفوں کی طرح بیٹھا رہا اور پھر رخصتی کے چند رسمی کلمے کہتا ہوا اُٹھ گیا۔ تھوڑی دور جاتے ہی لڑکیاں کھل کھلا کر ہنسنے لگیں، اس کے کانوں میں آواز پڑی "Silly" جو بڑی شوخی اور صفائی سے کہہ گئی تھی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ عربوں کی اس مہمان نواز سرزمین پر ایک اجنبی مسافر کی یہ درگت محسوس کر کے اس کو سخت کوفت ہوئی اور وہ اسی جھنجھلاہٹ میں ایک درہم ٹیبل پر رکھ کر نکل گیا۔ بیرا عربی زبان میں کچھ کہتا ہی رہ گیا لیکن وہ کازینو سے باہر آگیا تھا۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور باب المعظم پر واقع ہندوستانی سفارت خانہ کی راہ لی۔ سارا راستہ اس کو کوفت رہی اور وہ اپنے پائپ کو دھونکنی کی طرح پھونکتا رہا، تمباکو بھرتا رہا۔ اُس کے دل میں حسین ترین غیر ملکی لڑکیوں سے دوستی کی تمنا شکست کھا کر تڑپ رہی تھی۔ اس نے ہندوستان کے ایک سرسبز دیہات میں پہاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے پھولوں سے ڈھکے ہوئے مکان میں رہنے والی اپنی نازک سی، سانولی سلونی، بھولی بھالی محبوبہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ وہ کتنی سیدھی سادی ہے

ہر ایک سے کس پیار اور لگن سے بات کرتی ہے۔ ہر ایک کی خدمت کرنے اور انہیں Tolerate کرنے کا کس قدر پاکیزہ جذبہ اس میں ہے۔ لیکن وہ اپنے ملک کی اپنی ہی جیسی لڑکی ہے اس۔ اس میں زیادہ Charm اس میں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے میں شروع ہی سے غیر ملکی اجنبی لوگوں سے دوستی کرنے اور ان کی حاصل کرنے کا جذبہ تھا لیکن بغداد کے اس کازینو میں یہ چند لمحو شکست نے اُس کی ہمت پست کر دی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہ یہ مشرق ہے اور ایک جدید مغرب زدہ شہر ہے، جہاں کے مغرب کی چمک دمک سے لرزاں و حیراں ہیں اس لئے انہیں ہندوستانی اتنا کچھ جچتا نہیں ہے۔ ابھی اس کے لئے کئی مراحل ترکی، رُوم اور پیرس ..... وہ تصورات میں کھو گیا۔

ہندوستانی سفارت خانے میں اس کو پاسپورٹ اور کے سرکاری کام تھے، جن سے نپٹنا تھا۔ وہاں بھی اس نے لو اس شہر سے اُکتائے ہوئے پایا اور اس کے بعد اس کو یہاں وحشت سی ہونے لگی۔ وہ فوری واپس جانے کی تیاریاں کر سفارت خانے سے وہ پیدل ہی واپس ہوا۔ راستے میں سفارت خانے کی شاندار عمارت تھی، جہاں چند منٹ ٹھہر بعد وہ آگے بڑھا، اچانک سامنے کی موڑ سے ایک بے ڈ امریکی اپنے ساتھ دو لڑکیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے اس نے غور کیا تو وہ لڑکیاں وہی تھیں، جنہوں نے کازینو کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک لڑکی کی میں چمک دیکھی جو کسی کو پہچاننے پر پیدا ہوتی ہے اور بڑھ گئی۔ اس نے دھیمے سُروں میں پھر سے "Silly" بڑبڑا کر رہ گیا کہ کسی طرح سے کوئی انتقام لے۔ لیکن وہ دو سے اس بے ڈھنگے امریکی کے ساتھ امریکی سفارت خانہ کی شاندار عمارت میں داخل ہو گئیں۔

اسی رات اس نے متعقل انٹرنیشنل ریلوے اسٹیشن انقرہ کی ٹرین پکڑی اور اپنے ایرکنڈیشنڈ کیبن کے دروازے

کوئی دوسرا اندر نہ آسکے، اس کے بعد وہ اپنے صاف ستھرے
پر لیٹ گیا اس کو اپنی ہندوستانی دیہاتی سیدھی سادی
رح یاد آرہی تھی۔
ع جب وہ بیدار ہوا تو ٹرین شام کی سرحد سے نکل کر ترکی کی
خل ہورہی تھی اور نُصیبین کا سرحدی اسٹیشن قریب آرہا تھا
م سے مُنہ ہاتھ دھو کر کاریڈر میں کھڑا ہو گیا۔ بازو کے کیبن
ے کے آگے دو خواتین کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک
، سا نوجوان بھی تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ
لی ہیں۔ اس کا دل ان سے دوستی کرنے کے لیئے بے چین
اور اس کے لیئے اس نے خوامخواہ کاریڈر کے دوسری جانب
۔ درمیان میں وہ لوگ کھڑے تھے۔ اس کو آتا دیکھ کر انہوں
تہ دے دیا اور وہ یونہی چُپ چاپ سا کاریڈر کے دوسری
ل گیا، چند منٹ بعد واپس ہوتے ہوئے اس نے چند لمحے
لیا۔ اس کو خیال آیا کہ ممکن ہے ان لوگوں کو صرف ترکی زبان
ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہی انگریزی میں دریافت کیا
ی نُصیبین کا اسٹیشن آنے میں کتنی دیر ہوگی۔ اُن لوگوں میں
بران مرد نے بڑی صاف ستھری انگریزی میں جواب دیا کہ پندرہ
منٹ بعد ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس نے پھر اپنا تعارف کروایا
ے جواب میں اس نوجوان نے بتایا کہ وہ استنبول میں میڈیکل
ں کرتا ہے اور یہ اس کی ماں اور بہن ہے جن کو لے کر وہ بغداد
مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو گیا تھا اور اب چند دن استنبول میں
نے کے بعد یہ لوگ یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ بہت
سب سے اچھی دوستی ہو گئی۔ نوجوان لڑکی کا نام فاطمہ عدنان تھا
بزنس ایڈمنسٹریشن کی طالبہ تھی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتی
ی۔ اس کی بات چیت سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اونچے خیالات
ور ذوق کی ٹھیک ٹھاک سی لڑکی ہے، جس کو ہر طرح سے اس کی پی
محبوبہ پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ اس کی ماں بہت مُہذب خاموش سی
اور علیحدگی پسند خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ اگلا اسٹیشن آنے تک وہ ان

لوگوں سے بات چیت کرتا رہا اور اسٹیشن آنے پر وہ ترکی کے
انتہائی لذیذ، سُرخ اور رسیلے انگور و سنترے لے کر واپس آیا،
اور پھر ان سے بات چیت شروع کر دی۔ وہ ان کے کیبن ہی میں
بیٹھ گیا اور پھر ساری ہی باتیں ہونے لگیں جن سے دوستی بڑھتی ہے
خلوص اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ نوجوان کا نام حشمت تھا۔ وہ امریکہ
ہو آیا تھا اور ہر بات میں وہاں کی مثالیں دیتا تھا جو بعض وقت
بڑی بور معلوم ہوتی تھیں۔ انقرہ اور پھر استنبول کے حیدر پاشاہ
اسٹیشن آنے تک وہ ان کے ساتھ ہی رہا۔ اس بات چیت میں یہ
بھی طے ہو گیا کہ وہ استنبول میں ان کے ساتھ ہی ٹھہرے گا —
اور یورپ کے سفر میں بھی رُوم تک وہ لوگ ساتھ رہیں گے جس کے
بعد ان کا ارادہ اسپین جانے کا تھا۔ اتنی اچھی کمپنی اجنبی ممالک
میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ وہ اپنے کو بہت ہی خوش نصیب سمجھنے
لگا۔ استنبول میں وہ لوگ صبح کے چار بجے پہونچے تھے اس لیئے
سب کے سب مکان پہونچتے ہی بستروں میں گھس گئے۔ دوسرے
دن کوئی دو بجے وہ اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اس کو ڈرائنگ روم
میں فاطمہ اخبار پڑھتی نظر آئی۔ اس کو دیکھ کر وہ فوری اُٹھ آئی
اور اس نے نہانے کے لیئے اس کو ضروری ہدایتیں دیں۔ اس لیئے
کہ باتھ رُوم میں ہیٹر تھا اور گرم پانی حاصل کرنے کے لیئے ایک
میکانزم سمجھنا تھا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ وہ یورپ سے قریب
ہے، اس لیئے ہی رہن سہن میں اتنا فرق شروع ہو گیا ہے، جو
یورپ پہونچنے کے بعد معلوم ہوگا۔ مشرق اور مغرب کا فرق۔
اس شام وہ اور فاطمہ استنبول کی سیر کے لیئے نکلے
Marmara Sea کے کنارے گھومے، سلیمانیہ مسجد
استنبول یونیورسٹی اور ساری مشہور و تاریخی عمارتیں دیکھ ڈالیں۔ ہر جگہ
فاطمہ اس کو اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تفصیلات سمجھا رہی تھی۔
وہ اس کے قریب ہر وقت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتی رہی اور اس نے
محسوس کیا کہ حاصلِ سفر اس کو یہیں مل گیا ہے۔ اس قدر خوبصورت
شہر میں اتنے خوبصورت حادثہ سے وہ بے حد مسرور و شاداں تھا۔

دونوں نے اسی خوشی میں تقسیم (Taksim) جیسے استنبول کے اُونچے درجے کے مشہور علاقے کے ایک بار میں دو دو پیگ بھی پی لیئے جس کے بعد فاطمہ نے سگریٹ سلگایا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ تکلف محسوس کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد فاطمہ نے ہی بتایا کہ وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ ہی شراب اور سگریٹ پیتی ہے اور اس کو ہر بار ہی تکلف محسوس ہوتا ہے۔ ویسے وہ کافی بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔

اس رات ہی اس نے فاطمہ کے لیئے اپنے دل میں بہت کچھ محسوس کیا وہ اس کے ساتھ اپنی آیندہ زندگی کے منصوبے باندھنے لگا اور اس کی اچھائیوں، خوبصورتی اور اس کی نرم نرم دلآویز باتوں کو خُوب خُوب یاد کرنے لگا۔ اس جھگڑے میں کبھی کبھی اس کو اپنی ہندوستانی سیدھی سادی محبوبہ کا خیال بھی آتا تو وہ فوری اس کو بھُلا دیتا۔ ہُوں' وہ بھی کوئی چیز ہے، بالکل ہی Unsophisticated' سیدھی سادی ہاتھی دانت کے مجسمے کی طرح!۔

چار پانچ روز وہ استنبول میں خُوب گھُومتے رہے درمیان میں چند گھنٹوں کے لیئے وہ بذریعہ موٹر انقرہ بھی گھُوم آئے موسم بہت اچھا تھا اور انہوں نے جی بھر کر لُطف اٹھایا۔ اتوار کے روز انہیں یورپ کے لیئے روانہ ہونا تھا اور وہ لوگ استنبول کے ..... انٹرنیشنل ریلوے اسٹیشن سرکیچی (Serkechi) سے میلانو (اٹلی) جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے۔ اس قدر لوگ تھے کہ جگہ ملنی دشوار تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے اور ڈاکٹر حشمت بے نے ایک کیبن میں سامان رکھا اور خواتین کے لیئے جگہ نکالی۔ وہ دونوں باہر کاریڈر میں کھڑے ہوگئے اور ترکی کی سیاسیات پر آزادانہ تبصرے کرتے رہے۔ وہ باربار کنکھیوں سے فاطمہ کی جانب دیکھتا جو ویسے تو کوئی ناول پڑھ رہی تھی، لیکن اس کی ہی جانب متوجہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑا ہی پیار جھلک رہا تھا جس کو دیکھ دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور وہ عصمت انونو کی سیاست سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی حشمت بے کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اس میں بحث کی ہمت نہیں تھی۔ بلغاریہ کے اسٹیشن صوفیہ پر گاڑی کافی دیر رُکی رہی اور وہ فاطمہ کو ساتھ لے کر اسٹیشن پر ٹہلنے لگا اور بلغاریہ کے لوگوں اور ان کی زندگی کی جھلک دیکھنے میں دونوں مصروف رہے۔ فاطمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہی تھا اور دونوں کے جسموں سے پیار، محبت اور لگاوٹ کی لہریں نکل رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا' بے حد خوش!۔

جب ٹرین چلنے لگی تو وہ دونوں واپس آگئے۔ اس قدر عوام کا ہجوم ہوگیا تھا کہ وہ ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ فاطمہ بڑی مشکل سے اپنی کیبن میں چلی گئی اور حشمت بے کاریڈر کی دوسری جانب کھڑا ہو رہا تھا۔ رات دیر گئے بلگریڈ کا اسٹیشن آیا اور وہ اکیلا ہی گھُومتا رہا اپنے تصورات میں ڈُوبا شاداں و فرحاں رہا۔ دوسرے دن میلانو کا اسٹیشن آرہا تھا اور وہ فاطمہ اور اس کے خاندان سے ملنے بے چین تھا' یہاں سے وہ ایکدوسرے سے جُدا ہو رہے تھے۔ لیکن اس کی ملاقات، ہجُوم کی وجہ سے نہ ہوسکی۔ البتہ اسٹیشن آنے پر وہ کسی طرح کیبن تک پہونچ گیا۔ وہ لوگ سب تیار تھے۔ اس نے فاطمہ کی جگہ پر اپنا سامان رکھ دیا اور ان سب کو لے کر ٹرین سے نیچے اتر آیا سب کے چہرے تھکن سے پژمُردہ ہو رہے تھے۔ اس نے فاطمہ سے بات کرنا چاہی لیکن وہ مصروف تھی۔ حشمت بے نے اس کو استنبول آنے کی دعوت دی اور انگلستان سے واپسی پر ضرور مہمان رہنے پر اصرار کیا۔ اس کی خاموش اور مقدس سی ماں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور ترکی میں کچھ الفاظ کہے' جس کا ترجمہ حشمت بے نے کیا کہ' تم ہمارے اچھے ہندوستانی دوست ہو اور ہم تمہارا استنبول میں انتظار کریں گے۔ اب وہ لوگ روم سے پہلے لوزان جانے والے تھے' جہاں کچھ میڈیکل ایڈوائز انہیں اپنی ماں کے لیئے لینا تھا۔ وہ سب سے رخصت ہوکر واپس ہوا۔ فاطمہ کی آنکھوں میں اُداسی اور رنج تھا، جس کو دیکھ کر وہ تڑپ گیا اور سوچنے لگا کہ ان کے ساتھ ہی رُک جائے۔ لیکن اب بہرحال یہ ناممکن تھا۔ فاطمہ نے بڑے پیار سے اس کو خدا حافظ کہا۔ اس نے آہستہ سے کہا "سین چاک، اُزیل سین" یعنی تم بڑی خوبصورت ہو'۔۔۔

جس پر وہ مایوس مسکراہٹ میں "شکریہ" کہنے لگی۔ وہ اس سے خط لکھنے اور دوبارہ جلد ملنے کے وعدے لے کر چلا آیا۔

اس کے بعد روم اور پیرس میں نائٹ کلبوں اور پارکوں میں گھومتے ہوئے ہر وقت اس کو فاطمہ ہی یاد آتی رہی۔ اس نے اب اپنی ہندوستانی محبوبہ کو مکمل طور پر بھلا دیا تھا۔ پیرس میں دریائے سین میں کشتی رانی کرتے ہوئے، شانزالیزے پر گھومتے ہوئے، یا ایفل ٹاور اور آرکسدی ٹرامپ دیکھتے ہوئے ہر جگہ ہر گھڑی اس کو فاطمہ یاد آتی رہی۔ پیرس میں اس نے تین چار فرانسیسی اور..... خوبصورت ترین لڑکیوں سے کافی دوستی بھی پیدا کرلی، لیکن اس کی رُوح فاطمہ کے لیئے ہی بے چین رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنم جنم کے انتظار کے بعد اس کو فاطمہ ملی ہے وہ ساری جذباتیت سے اور ہندوستانی ادب وشاعری کے سارے استعاروں وتشبیہات کے ساتھ فاطمہ کے بارے میں سوچتا رہتا۔ ہر جگہ سے اُس نے فاطمہ کے نام خطوط لکھے۔ اور ان کو کئی بار پڑھتا رہا۔ انگلستان پہونچنے پر وہ اپنی تعلیمی مصروفیات میں گم ہوگیا۔ لیکن ہر روز برابر فاطمہ کو خط لکھتا رہا، جس میں اس کے بغیر پیکاڈلی کی رعنائیاں، چیرنگ کراس کے شور و ہجوم اور انگلستان کے سارے مزے بے لطف و بے نور ہونے کا ذکر کرتا رہا اور فاطمہ کو لکھتا رہا کہ وہ یہاں آجائے اور اس کے ساتھ تعلیم حاصل کرے۔ اس نے اپنی ساری محبت تحریروں میں سمو دی تھی۔ ایک عرصہ تک فاطمہ کا جواب نہیں آیا، اور وہ بے چین و بیقرار ہوتا رہا۔

انگلستان میں اس کی آدھی درجن گرل فرینڈز تھیں لیکن وہ محض فلرٹ کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک جینن تو بڑے سنجیدہ طور پر اس سے محبت کرتی تھی اور وہ اپنے دل میں بھی اس کے لیئے جگہ محسوس کرتا لیکن فاطمہ کے خیال نے اس کو آگے بڑھنے سے باز رکھا۔ چند ماہ بعد ہی جینن اس سے ملنے کے لیئے بہت کم آنے لگی اور پھر اسے اطلاع ملی کہ وہ آجکل ایک امریکی نیگرو طالب علم کے ساتھ Tottenham court کے تھیٹروں میں دیکھی جا رہی ہے

بالآخر وہ اس سے بالکل انجان ہوگئی اور اس نے یکدم سے اپنی ساری گرل فرینڈز سے قطع تعلق کرلیا اور کرسمس کی چھٹیوں میں دوستوں سے قرض لے کر ہوائی جہاز کے ذریعہ استنبول روانہ ہوگیا۔ اس نے تار کے ذریعہ ڈاکٹر حشمت بے کو اطلاع دی تھی۔

استنبول کے ہوائی اڈہ پر اس کو لینے کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر اوتیل ادغول پاشا چلا گیا، جہاں اس نے ساری رات بڑی مشکل سے گذاری اور صبح ہوتے ہی ٹیکسی لے کر حشمت بے کے مکان پہونچ گیا۔ پورٹیکو ہی میں اس کو فاطمہ مل گئی۔ جس کی خاطر اس نے اتنے مہینے اسقدر بے چینی و کرب سے گذارے تھے اور جس کے لیئے اس نے یہ سفر کیا تھا۔ ٹیکسی سے سامان لے کر وہ پورچ میں آگیا فاطمہ نے اس کا بڑی سرد مہری سے خیر مقدم کیا اور کافی لانے چلی گئی۔ وہ سر چکرا رہا کہ کسی اجنبی کے لیئے جو چند روز کا ہی دوست رہا ہو اس قدر سرد مہری سے خیر مقدم کرنا، کیا مطلب رکھتا ہے۔ لیکن فاطمہ اس کے لیئے اتنی اجنبی نہیں تھی، وہ تو گذشتہ چند مہینوں سے اس کے ساتھ اس کے خیالوں میں ہر گھڑی ساتھ رہی ہے۔ پندرہ بیس منٹ بعد فاطمہ کافی کی ٹرے اور کچھ خشک میوے لیکر آئی وہ خاموش خاموش انجان سی تھی۔ وہ غور ہی کرتا رہ گیا، اس کو حیرت ہوئی کہ وہ دو کی بجائے تین کافی کی پیالیاں تیار کر رہی ہے، شاید اس کا بھائی آنے والا ہو جس کے بارے میں وہ ابھی پُوچھنے ہی کو تھا کہ ایک دُبلا پتلا سُرخ وسفید نوجوان مارننگ سُوٹ پہنے آگیا۔ اس کے آتے ہی فاطمہ کھِل گئی اس نے مسکراتے ہوئے بڑی مسرت کے ساتھ تعارف کروایا کہ یہ اس کا اطالوی بوائے فرینڈ ہے، جس کے فلورنس میں دو شاندار ہوٹلیں ہیں اور دونوں چند ماہ بعد شادی کرنے والے ہیں۔ اس تباہ کُن اطلاع پر وہ اپنے آپ کو سمیٹتا ہی رہ گیا اور بڑی مشکل سے مسکرانے کی کوشش کرتا رہا۔

بات چیت میں معلوم ہوا کہ حشمت بے اور اس کی ماں دونوں علاج کی غرض سے دوبارہ سوئٹزرلینڈ گئے ہوئے ہیں ان کی واپسی پر ہی فاطمہ کی شادی ہونے والی ہے۔

یہ ساری وحشت ناک اور تباہ کن خبریں اس کا دل دہلاتی رہیں وہ اندر ہی اندر بے چین و مضطرب ہوتا رہا۔ بالآخر اس نے جھوٹ بولنا شروع کیا کہ ہندوستان واپس جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیئے وہ استنبول میں ٹھیرا ہے اور اب اس کو چلنا چاہیئے، پلین کا وقت ہو رہا ہے فاطمہ اور اس کے ساتھی نے بھی ٹوکن کے لیئے ہندوستان اور جاپان کے کا ارادہ ظاہر کیا، جن کو دیکھنے کی دونوں کو بڑی تمنّا ہے اور اس نے قصداً جھوٹ موٹ سا اپنا پتہ دے دیا اور انہیں خوش آمدید کہا۔ فاطمہ اور اس کا ساتھی دونوں اس کے ساتھ ہوائی اڈہ تک آنے پر اصرار کرنے لگے، جس پر وہ کسی طرح بہانہ نہیں کرسکا۔ فاطمہ اپنی اسپورٹنگ کار نکال لائی اور وہ سب ہوائی اڈہ کے لیئے روانہ ہوگئے جہاں ابھی ہانگ کانگ، ہندوستان کی راہ سے جانے والا بی۔اے۔او۔سی کا طیارہ روانہ ہونے کے لیئے دو گھنٹے کی دیر تھی۔ اس کے لیئے ایک ایک لمحہ گذارنا مشکل تھا۔ اس نے فوری طہران جانے والے طیارہ کا ٹکٹ لیا اور ان سب سے خدا حافظ ہوا۔ فاطمہ بالکل انجان سی رہی اور وہ جذبات کے طوفان کو دباتا اور سنبھالتا رہا۔ طیارہ میں اپنی نشست پر بیٹھتے ہی اس نے بازو کی کھڑکی کا پردہ کھینچ دیا۔ اب وہ فاطمہ اس کے ساتھی اور استنبول شہر کا آخری نظارہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا وہ دل ہی دل میں تلملاتا رہا، روتا رہا۔ اپنے جذبات کی اتنی بھیانک شکست اور اپنی تمنّاؤں کے اس طرح تباہ ہوجانے پر وہ دیوانہ سا پاگل سا بیٹھا رہا۔

طہران سے ہوکر وہ ایک لمحہ رُکے بغیر ہندوستان آگیا۔ اسکی رُوح مجروح تھی، تڑپ رہی تھی۔ اس کو سکون، اطمینان، سچی محبّت اور خلوص کی بے انتہا پیاس تھی اور اس کے ہونٹ خشک تھے۔ زبان پر کانٹے اُگ گئے تھے۔

ہلکی ہلکی شام ہو رہی تھی۔ وہ ہندوستان کے ایک دُور دراز دیہات کی سرسبز و شاداب پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا تیز تیز جارہا تھا دوسرے دیہات سے بیل گاڑیاں واپس ہو رہی تھیں اور بیلوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیوں کی میٹھی سی مترنم آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ چرواہے اپنے جانوروں کو لے کر واپس آرہے تھے۔ گاؤں کے درمیان سے بہتی ہوئی بھرپور ندی کے بہاؤ میں بڑی موسیقیت تھی۔ سارا سماں انتہائی نیچرل، حسین ترین اور پیارا پیارا سا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیئے اپنے غم بھلا بیٹھا۔

سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے درمیان واقع پھولوں سے ڈھکے چھپے ایک چھوٹے سے مکان میں وہ داخل ہوا۔ شام ہوگئی تھی دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی، اس نے دیکھا کہ اس کی سیدھی سادی معصوم سی محبوبہ آنگن میں بیٹھی کچھ کاڑھ رہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے سر پر آنچل ڈال لیا اور مسکرانے لگی۔ اس کا رواں رواں خوشی و مسرت سے کھِل اُٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی اور انتظار کا کرب ختم ہوگیا تھا وہ جلدی سے بھاگ کر مکان کے پچھواڑے میں چلی گئی۔ وہ سامان رکھ کر آرام سے فرش پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی محبوبہ کچھ چیزیں لیکر آئی اور پھر اس کا صدقہ اُتارا جانے لگا۔ وہ ہنس پڑا کتنی سادہ سی لڑکی ہے، جس کو میری واپسی کا کس قدر انتظار اور بھروسہ تھا اور اب وہ مسرت و خوشی سے کتنی دیوانی ہو رہی ہے۔

اس نے اپنی اس نرم و نازک سی، سانولی سلونی محبوبہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کو قریب کرلیا وہ سمٹ کر اس کے سینے سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اسقدر آنسو کہ اسکی آنکھوں کا رنج و غم اور انتظار کی بے چینی و تکلیف سب کچھ ان آنسوؤں میں بہہ گئی۔ اس نے پہلی بار اسکی محبت کی اسقدر پاکیزگی، استحکام اور نفاست کو محسوس کیا اور اس نے اسکے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے انتہائی جذبات میں کہا کہ "ساری دُنیا میں تم جیسا میرے لیئے کوئی نہیں ہے، تم مجھے اب مل گئے ہو اب کچھ نہیں چاہیئے، لیکن تم مجھے پھر چھوڑ کر تو نہ جاؤ گے نا؟"

اس سوال کے ساتھ ہی اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، ان آنکھوں کی جھلک میں اس کو فاطمہ، جین اور دوسری درجنوں لڑکیوں کی آنکھیں گھوم گئیں لیکن ان آنکھوں میں جو سچائی، استقامت، اعتماد، بھروسہ اور پاکیزگی تھی وہ اس نے کہیں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے جذبات سے بے قابو ہوکر ان آنکھوں کو چوم لیا۔

▲

سردار جعفری

بہت قریب ہو تم!

بہت قریب ہو تُم، پھر بھی مجھ سے کتنی دُور
کہ دِل کہیں ہے نظر ہے کہیں، کہیں تم ہو
وہ جس کو پی نہ سکی، میری شعلہ آشامی
وہ کوزۂ شکر و جامِ انگبیں تم ہو
مرے مزاج میں آشفتگی صبا کی ہے
ملی کلی کی اَدا، گُل کی تمکنت تم کو
صَبا کی گود میں پھر بھی صبا سے بیگانہ
تمام حُسن و حقیقت، تمام افسانہ

وَفا بھی جس پہ ہے نازاں، وہ بیوفا تُم ہو
جو کھو گئی ہے مرے دِل کی وہ صَدا تُم ہو
بہت قریب ہو تُم، پھر بھی مجھ سے کتنی دُور
حجاب جسم ابھی ہے، حجاب رُوح ابھی
ابھی تو منزلِ صد مہر و ماہ باقی ہے
حجاب فاصلہ ہائے نگاہ باقی ہے
وصالِ یار ابھی تک ہے آرزُو کا فریب!

▲

شاذ تمکنت

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں
دودمانِ چراغاں کی نورِ نظر

یہ سراپا یہ فوّارۂ ہفت رنگ
یہ بدن شاخِ ممنوعِ ارضِ بشر
یہ مدوّر خمِ جسم یہ زاویے
جیسے تقدیس و عصیاں ہوں دامن نگر
لب، شفق زار کے احمریں حاشیے
آنکھ سانجھ اور سویرے کے نیلے بھنور

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں
دودمانِ چراغاں کی نورِ نظر

میں فنکار ہوں، آئینہ ساز ہوں
تیرے گیسو کی نسبت سے نافہ بجاں
تیری قامت کا صدقہ سرافراز ہوں
تیرے ابرو کے معبد کا ہوں معتکف
مصحفِ شوق کا حرفِ آغاز ہوں
دھیان ہوں تیری گُل کا تنہائی کا
سوچ کی گونج ہوں تیری آواز ہوں
تیرے پیکر کے کُندن کی ہوں روشنی
تیرے ہونٹوں کے یاقوت کا راز ہوں

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں
دودمانِ چراغاں کی نورِ نظر

یہ جھجک یہ لگاوٹ یہ بارِ حیا
مُو بہ مُو آرزومندِ اظہار ہے
بہرِ دستِ رسا انتظارِ حیا
یہ مہکتا شلوکا بھبکتا بدن
یہ چٹکتی رگیں، یہ مسکتا بدن

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں
دودمانِ چراغاں کی نورِ نظر

تجھ کو معلوم ہے عشق کیا چیز ہے!
جیسے دریا کی تاریک شب میں کوئی
سطحِ گرداب پر شمع روشن کرے

یا کوئی نارِ سمندر کا پٹ کھول کر
یوں چلے یوں قدم دھیرے دھیرے دھرے
کوئی گھونگھرو نہ بولے نہ گھونگھٹ کھلے
اپنی جھانجھن کی جھن جھن سے پگ پگ ڈرے

تجھ کو معلوم ہے عشق کیا چیز ہے
پَو پھٹے جیسے جگنو کی لَو کانپ اُٹھے
شاخ سے ٹوٹ کر جیسے کوئی کلی
دستِ گل چیں کو حسرت سے تکتی رہے
جیسے میداں میں زخمی سپاہی کا غم
چھوڑ کر جس کو تنہا، کمک چل پڑے

تجھ کو معلوم ہے عشق کیا چیز ہے
جیسے صحرا کو گھر میں بلا لے کوئی
چیختے شہر کے ہونکتے شور میں
زہر خاموشیوں کے بلا لے کوئی
نار کو آنسوؤں سے بجھاتے ہوئے
نور میں جیسے آنکھیں گنوا لے کوئی

آپ اپنی رقابت کا سودا لیئے
زندگانی کے لمحے چرا لے کوئی
اپنی سانسوں میں نشتر چھپائے ہوئے
عمرِ وارستہ جیسے گھٹا لے کوئی

مہر و مہتاب کی دخترِ اوّلیں
دودمانِ چراغاں کی نورِ نظر

کون ماضی کے افسانے دہرائے گا
کون بچھڑے گا پھر کون یاد آئے گا
نجد کی گرد میں قیس کیوں کھو گیا
کوہکن سو گیا بے ستوں کھو گیا
کس کو فرصت کہ غم کا اعادہ کرے
اپنا اپنا نشاں چل ذرا ڈھونڈ لیں
جوئے شیر آج بھی گنگناتی ہوئی
بہہ رہی ہے کہاں چل ذرا ڈھونڈ لیں

عبدالعزیز خالد

★

شکستِ نغمہ

—۱—

دیکھا جو آسمان پہ اُڑتے قطا کا جھنڈ
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے
دل خوش ہوا تفاوتِ پست و بلند سے
ہو کتنے خوش نصیب اے آزاد پنچھیو!
بیغم فریبِ طالعِ ناارجمند سے
آشوبِ اخترِ بد و بختِ نژند سے
آزاد قید و بند سے، سوزِ پسند سے
اے سیر مست طائرو! زنداں کی شام کے
رنج و فشار و کرب سے تم آشنا نہیں،
کافور پاش چاندنی کے زہر خند سے
محشر تمہارے سینے میں برپا ہوا نہیں
تم ہو بلند بال، تمہیں اس کی کیا خبر
ظالم ہے کس قدر شبِ مہجورِ بے سحر
دروازہ بند ہونے کی آواز سننے پر
اُٹھتی ہے کیسی ہُوک دلِ دردمند سے!

—۲—

گانا سناتی ہیں دف و مزمار و چنگ پر
جب تک یہ نازِ مست حسیں گانے والیاں
یارانِ بزمِ مے! پیو بھر بھر کے جامِ مے
انگور کا عرق بھی ہے کیا دلنوازِ شئے
یہ ہو تو رنج و راحت، سُود و زیاں کہاں!

—۳—

مکناسہ جاتے طنجہ سے، اثنائے راہ میں
دیکھے جو لوگ مینہ کی دُعا مانگتے ہوئے
میں نے کہا: تمہاری دُعا مُستجاب ہے
جاری ہیں اشک دیدۂ خُوننابہ بار سے
یہ جوشِ گریہ، ریزشِ ابرِ بہار ہے
بولے وہ لوگ: آپ جو فرماتے ہیں بجا
لیکن بلا ہوا ہے لُہو برشگال میں
اللہ بچائے خُون کی برسات سے ہمیں!

معتمد شاہِ اشبیلیہ

مخمور سعیدی

روز کی بات

دِن ڈھلتے ہی گھر سے نکلے تم جھولی پھیلائے
رُوپ نگر میں تمہیں بھی شاید کچھ بھکشا مِل جائے
کوئی تمہارے خشک لبوں کو موجِ تبسّم دیدے
مُہر بہ لب دل کی دَھڑکن کو اذنِ تکلّم دیدے
قیدِ تنہائی سے چُھڑا دے کسی نظر کا جادُو
بڑھ کے مشامِ جاں مہکا دے کسی بَدن کی خوشبُو
جلتی ہوئی آنکھوں پر کوئی زُلف کی چھایا کر دے
حُسن کی ٹھنڈک سے کوئی کشکولِ نظر کا بھر دے
گھٹی گھٹی مایوس صَدا پر لُطف کوئی فرمائے
بامِ کاہکشاں سے تم پر موسیقی برسائے
بالک بن کر، گئے سَمے کی گود میں جُھولا جھُولو
جُھکے تمہاری جانب چندا، اور تم بڑھ کر چھُو لو!

لیکن اب تو اُفق اُفق ہے تاریکی کا پہرہ
نگل گئی جو دھیرے دھیرے چاند کا پیلا چہرہ
پلک جھپکتے تاروں کی بھی بند ہوئی سرگوشی
عالم عالم سنّاٹا ہے، جہت جہت خاموشی
اب نہ کھُلے گا کوئی دریچہ لاکھ آواز لگاؤ
یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو گھر جا کر سو جاؤ

▲

حسین مشیر علوی

تلاش

میں شبنم چُن رہا ہوں نوکِ مژگاں سے چمن زارِ جوانی میں
پگھلتے جا رہے ہیں آبگینے پھر مرے نازک خیالوں کے
سُبک رَو آرزُو کے خواب آسا مَرمَریں سائے
چھلکتے مُسکراتے رقص کرتے، شوخ رنگوں میں،
اشاروں سے کنایوں میں کوئی افسانہ کہتے ہیں
تھپکتا جا رہا ہوں گو انہیں احساس کی میں نرم پوروں سے
مگر لفظوں کی میناؤں میں ڈھلنے سے بہت پہلے
میں خائف ہوں کہیں یہ مُندلیں پیکر نہ جل جائیں
کہ جیسے عطر کی شیشی ہجومِ اطلس و کمخواب میں یکسر اُلٹ جائے
یہی آوارہ جُگنو قید کر لینے کی حسرت میں
چراغ اب تک نہ جانے کتنے خود میں نے بجھائے ہیں

▲

نغمہ انداز

کوہکن کے قلم سے

آموں کا موسم شباب پر ہے اور ہمیں بے اختیار مرحوم غالب یاد آرہے ہیں جو عین بڑھاپے کے عالم میں انتقال فرماگئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ موصوف کو آم بے حد پسند تھے اور جب کسی محفل میں آموں کے موضوع پر بات چیت ہوتی تھی تو آپ کے مُنہ میں پانی بھر آتا تھا، جسے آپ اُگالدان میں تھوک دیتے تھے اور بصد حسرت و یاس وہ مطلع موزوں کرنے میں مصروف ہو جاتے ؏ آم سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا ــــ آم سے غالب کی شیفتگی اور فریفتگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ آپ ہر اُس شخص سے مُناظرہ کرنے پر تیار ہو جاتے تھے جو آموں کا مخالف ہو، چنانچہ جب ایک دوست نے طنز اور اعتراض کے لہجہ میں آپ پر یہ انکشاف کیا کہ گدھا آم نہیں کھاتا، تو آپ نے فی البدیہہ فرمایا کہ "جی ہاں گدھے آم نہیں کھاتے" ظاہر ہے کہ معترض اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا، بعض محققین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غالب کو چند دن کے لیے جیل کی سزا ملی تھی، اس کے پیچھے بھی آموں کا شوق کام کر رہا تھا۔ شاعر اپنے محبوب کو ہمیشہ موضوعِ سخن بناتا ہے، چنانچہ غالب مغفور نے بھی آم پر ایک نظم سپردِ قلم فرمائی ہے، شروع کے بول ہیں ؏ بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ــــ آپ اِس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمایئے کہ جس طرح غالب کو آموں کا بہت زیادہ شوق تھا اسی طرح کوہکن بھی آم کے موسم میں آم کھائے بغیر نہیں رہ سکتے، صرف یہی نہیں بلکہ آج جب آپ دفتر تشریف لائے تو آموں کی ٹوکری میں ایک نظم بھی رکھی ہوئی تھی، ہم نہیں چاہتے کہ آپ اس کی لذت سے محروم رہیں۔ اسلئے ملاحظہ ہو ــ

★ یہ نظم شاہد صدیقی مرحوم نے کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ سیاست حیدرآباد کے مزاحیہ کالم شیشہ و تیشہ کے لیے لکھی تھی جو ۱۲ جون ۱۹۶۱ء کو شائع ہوئی تھی۔

آم اور غالب

رکھ کے ایک آم کفِ دست پہ غالب نے کہا
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے
نہ ملے بادۂ انگور تو کچھ فکر نہیں
آم تقدیر سے مِل جائیں تو پھر کیا کہیئے
یہی اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ غالب
سخت بدبخت ہے جو معتقدِ آم نہیں
آم ہے میوۂ فردوس
نشانِ جنّت
آم سے ہوتی ہے افزائشِ خون!
آم کھاتے تھے بہت شوق سے لیلیٰ مجنوں!
آم کے فیض سے نام ان کے ابھی زندہ ہیں!
صفحۂ دہر پہ تابندہ ہیں!
اپنی رُوداد کو تاریخ جو دہراتی ہے
آم کھاتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے
شام کے وقت میرے خواب میں آم آتے تھے
یاد آیا مجھے آموں کا مزہ آخرِ شب
رس گوارا ہے مجھے آم کی گھٹلی نہ سہی
غیب سے آتے ہیں آموں کے مضامیں اکثر
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
آم کے جھاڑ پہ غالب کی نظر تھی اِک دن
دیکھتے دیکھتے اِک بار ظفر سے بولے
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے
قبرِ غالب پہ جو اِک دن میں سرِ شام گیا
سارے ماحول میں آموں کی بسی تھی خوشبو
قبر سے کان لگایا تو یہ محسوس ہوا
اِک غم ناک سی آواز چلی آتی ہے
رُوحِ غالب نے کہا مجھ سے کہ اے سوختہ جاں
مجھ کو معلوم ہے کیا حال رہا میرے بعد
آم کھانے سے جو اس کو کبھی فرصت نہ ملی
حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

احمد جلیس

★

" رسالہ نکالنا ایک ایسا فعل ہے جس کے لیئے کچھ سرمایہ وغیرہ بھی درکار ہوتا ہے !۔۔۔۔ نوّمی کو جس وقت میں نے یہ مشورہ دیا تھا اس وقت
یر" وغیرہ" کو اس نے دُودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا اور سینہ تان کر کہا تھا۔" دولت ! بس دولت ہی سب کچھ ہے اور وہ میں نے
ندار میں حاصل کر لی ہے اکچھ بھی ہو
ں رسالہ نکالنا ہی ہوگا" !۔

زعفران کی سرگزشت !

" وہ تو ظاہر ہے"۔ میں نے قطعیت
تھ جواب دیا تھا اور وہ ظاہر یوں
پچھلے دنوں سے ہم اور نوّمی اَدب
بل سے بڑے مایوس ہوتے جا رہے
فصوصًا جب سے بعض بڑے بڑے رسالوں نے " ناقابلِ اشاعت"
یر کے ساتھ نوّمی کے افسانے واپس بھیجے تھے ۔ اور ایک دن
ہی ایک افسانہ کو وصول کر کے نوّمی نے اُس کے لفافے کو چاک
ہوئے کہا تھا ۔" ہمیں اَدب میں اجارہ داری کے رُجحانات
م کرنا ہی ہوگا "۔
" بالکل ، بالکل "۔ لالہ صحرائی بولے ۔" ہماری صحافت پر یا تو
ام نہاد ترقی پسندوں کا قبضہ ہے یا سرمایہ داروں کا ۔۔۔۔
یہ جسے چاہیں آسمان پر چڑھا دیں اور جس کی چاہیں پگڑی
ل دیں "۔!
" اور کیا صاحب" ! میں نے لُقمہ دیا ۔" نوّمی کی بیڑیوں کا
ہار سب چھاپتے ہیں ، افسانے کوئی نہیں چھاپتا ۔ اب یہی
ئے کہ ہمارے شہر میں ہر سال ترقّی اُردو کا مشاعرہ ہوتا ہے
صحرائی کو کوئی مدعُو نہیں کرتا ۔"!
" خیر ۔۔۔ ہم تو اس وقت قومی مفاد کی بات کر رہے ہیں"
نے جھینپتے ہوئے کہا ۔
" تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے" ؟ ادب کے مستقبل اور نئی نسل کی

حوصلہ اَفزائی کا یہ قومی مسئلہ ہم سب کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔ اچانک
خلا میں گھُورتے گھورتے نوّمی کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔ اس کے
چہرے کا رنگ وفُورِ جذبات سے سُرخ ہو گیا ۔ غالبًا مہاتما بُدھ
پر بھی نروان مِلنے سے قبل ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی ہو گی
چنانچہ نوّمی نے بڑے الہامی انداز میں کہا ۔
" اس کا صرف ایک ہی حَل ہے ..... اور وہ یہ کہ ہم سب
اپنا ایک ذاتی رسالہ نکالیں" !
پُر جوش تالیوں کی گُونج میں سب نے نوّمی کی اس تجویز
کا استقبال کیا تھا ، لیکن اس وقت میں نے کہا تھا ۔" رسالہ
نکالنا ایک ایسا فعل ہے جس کے لیئے کچھ سرمایہ وغیرہ بھی
درکار ہوتا ہے" ! اور نوّمی نے سینہ تان کر جواب دیا تھا ۔" دولت
بس ، دولت ہی سب کچھ ہے اور وہ میں نے کافی مقدار میں حاصل
کر لی ہے کچھ بھی ہو اب ہمیں رسالہ نکالنا ہی ہو گا" !
اس قطعی فیصلے کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ رسالہ کا نام
کیا ہو ؟ ہم میں سے ہر شخص اتنی گہری سوچ بچار کر رہا تھا جیسے
اُن کا نومولود جھُولے میں گمنام پڑا ہے اور صبح اُس کی چھٹی ہے !۔

آخر کار رجسٹریشن کے فارم پر سرِ فہرست ہم نے " ماہنامہ زُلف " لکھا اور اس کے علاوہ چار پانچ نام بے سوچے سمجھے لکھ مارے ۔ اس کے بعد رسالہ کی بُنیادی پالیسیوں کے بارے میں گرما گرم بحثیں شروع ہوئیں ۔ مثلاً کسی نے کہا' صرف ایسے ہی رُومانی افسانے شائع کئے جائیں جن کا پس منظر کشمیر کی دلفریب وادیاں ہوں ۔ کوئی " بے لاگ " فلمی تبصروں کے لیئے مُصر تھا، کہیں " آزاد ۔ آزاد نظمیں " شائع کرنے پر اصرار ہو رہا تھا ۔ لالہ صحرائی کا خیال تھا کہ ترقی پسندی اور ترقی پسندوں پر لعنت بھیجے بغیر ہم عوام کو اپنی جانب متوجہ نہیں کروا سکیں گے ۔ ویسے ان کی ایک اور تجویز بھی تھی کہ رسالہ کا ایک دفتر سوڈان میں بھی وہ قائم کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے بھائی جان کی غزلیں چھپتی رہیں جو وہاں مقیم ہیں ۔ نومی نے فوراً یہ شرط قبول کر لی کیونکہ رسالہ پر کسی مغربی ملک کا پتہ درج ہو تو عوام سخت مرعُوب ہوتے ہیں ۔ اور پھر اگر کسی غزل پر " سوڈان سے " تحریر ہو تو عوام کو اپنی زبان زیادہ پیاری معلوم ہونے لگتی ہے ۔ غرض ہم اور نومی بڑے ٹھنڈے دل سے سب تجویزوں پر غور کر رہے تھے رسالہ کے بعض مستقل عُنوان ہم نے اپنے ساتھیوں میں لکھنے کے لیئے بانٹ دیئے ۔ دولت چونکہ نومی کی تھی اس لیئے دفتر ان ہی کے گھر میں قائم کیا گیا' جہاں صبح سے شام تک ہم سب چائے پی پی کر ادب اور زبان کے مسائل اور مستقبل پر غور و خوض کرتے رہتے کیونکہ اب ہمارا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارے مستقبل سے ہی زبان کا مستقبل وابستہ ہے ۔ اسی اثنا میں رجسٹریشن آفس سے ہمیں ایک خط وصول ہوا ۔ اس انگریزی خط کا ترجمہ ہمارے ایک شوقین ترجمہ نگار دوست نے یُوں کیا ۔

" پیارے دوست ! ہم وفورِ مسرت کے ساتھ آپ کو
یہ مژدۂ جانفزا سُنا رہے ہیں کہ آپ کے منتخبہ ناموں
میں سے آپ کو ماہنامہ " زعفران " کی اشاعت کی اجازت
دی جاتی ہے ۔ براہ کرم ہر رسالہ کی تین کاپیاں پابندی
سے کمشنر پولیس کے آفس بھیجا کیجئے تاکہ بوقت ضرورت
آپ کی گردن ناپی جا سکے ..... آپ کا وفادار :

نومی نے خط پڑھ کر سر پکڑ لیا " بھلا یہ کیا بے تکا نام ہوا ۔ زعفران ؟ "

" نام میں کیا دھرا ہے " ۔ ہم سب نے اسے یقین دلایا کہ اوّل تو نام میں کچھ دھرا ہی نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو زُلف " سے مقابلہ میں " زعفران " میں زیادہ خوشبُو ہے ۔

بہر حال اب رسالہ کی کاغذی تیاریاں زور شور سے شرُوع ہو گئیں مثلاً ہم نے سب سے پہلے ایک کاغذ پر لکھا " بھارت کا واحد نیم فلمی اَدبی رسالہ " ۔ لیکن بات کچھ جمی نہیں کسی نے کہا " قومی مفاد کا بیباک ترجمان " ۔ لیکن اس سیاست کی بُو آتی تھی ۔ اس بار پھر لالہ صحرائی بولے " شروع میں کوئی جملہ لکھنے کی بجائے کیوں نہ ہم آخر میں ایک جملہ لکھیں ۔ مثلاً : ماہنامہ " زعفران " (جسکی ترقی پسند قدر نہیں کرتے) اس مرحلہ کے بعد پرچے کی ترتیب کے لیئے ان تمام لوازمات کی ضرورت پیش آئی جن کے بغیر کوئی اُردو رسالہ مکمل نہیں سمجھا جاتا ۔ یعنی نظمیں، غزلیں، افسانے اور ڈرامے وغیرہ ۔ اوّل تو ہر صنف اَدب پر قلم اُٹھانے والے ہمارے حلقہ میں ہی موجود تھے لیکن پھر بھی پُرانی نسل والوں کو خوش رکھنا ' بہر حال ضروری تھا ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم شہر کے ایک بزرگ مُحقق پروفیسر لُطفی سے رُجوع ہوئے ۔ یوں تو ہم نے ان کا نام کافی سُن رکھا تھا ۔ لیکن سچ پُوچھئے تو ان کے کام سے زیادہ واقف نہ تھے ۔ اپنا کارڈ اندر بھجوا کر ہم دونوں دیر تک ان کے ڈرائنگ رُوم کا جائزہ لیتے رہے جس میں کتابوں اور الماریوں کی کثرت سے عجیب پُراسرار اندھیرے اور گھُٹن کا احساس ہوتا تھا ۔

بھلا اس اندھیرے کمرہ میں روشن اَدب کیسے پیدا ہو سکتا ہے ؟ ۔ ناممکن ۔ نومی نے اپنا قطعی فیصلہ سُنا دیا ۔ تھوڑی دیر میں لُطفی صاحب " مجسم مخطُوطہ " بنے ہوئے اندر سے برآمد ہوئے ۔ ان کا لباس کسی دکنی مخطوطہ کے وَرق کی طرح خستہ اور میلا نظر آتا تھا اور صُورت شکل بھی کوئی چھ سات صدی سے قبل والی معلوم ہوتی تھی ۔ کیونکہ ان کے خد و خال کے رُجحانات عصرِ جدید میں تو کہیں نہیں ملتے تھے ۔ ہمارے مقابل کے صوفہ پر وہ اس طرح بیٹھے کہ اپنے دونوں پاؤں میز پر پھیلا کر ان کا رُخ انہوں نے عین ہمارے سامنے کر دیا بیٹھنے کے بعد ہاتھ کو اشاروں کے انداز میں نچا کر انہوں نے فرمایا :

"کُکُوں کُکُوں کُکُوں"؟

ہم دونوں حیران تھے کہ اس کا کیا جواب دیں اور موصوف کو رکیا تکلیف ہے۔ اتنے میں وہیں سے بیٹھے بیٹھے لطفی صاحب نے انہ لگا کر ہمارے قریب رکھے اُگالدان میں پیک تھوکی جو عین نوتی ، سُوٹ پر گری اور جہاں نشانہ خطا ہوا وہاں تھوڑی سی اُگالدان ں بھی! خود اپنے چہرے اور کپڑوں کے "متاثرہ حصّوں" کو ہاتھوں ے پونچھتے ہوئے انھوں نے شرمندگی کے انداز میں کہا "معاف فرمایئے ں پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"جی فی الحال تو ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا سَر توڑ دیں اور جلد سے بلد گھر واپس بھاگ جائیں" نوتی کا بس چلتا تو یقیناً وہ یہی کہتا یونکہ وہ چہرے پر بھرپور سنجیدگی طاری کیئے بڑی حسرت سے پنے مرحوم سُوٹ کو گھور رہا تھا۔ تاہم میں نے بڑے نصیح انداز میں کہنا شروع کیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ ہم چند نوجوانوں نے مل کر زبان و اَدب کی خدمت کا بیڑہ اُٹھایا ہے"......

"جی....؟" پروفیسر صاحب نے چشمہ کے اُوپر سے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔ "کیوں صاحب، یہ بیڑہ آپ کو پیش کس نے کیا؟"
اس غیر متوقع سوال پر میں تو بوکھلا گیا۔ لیکن نوتی نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "جی خدا کے فضل سے ہم پان وان نہیں کھاتے۔ ساری بات یہ ہے کہ ہم ایک رسالہ نکال رہے ہیں ماہنامہ "زعفران"۔ بس اسی سلسلہ میں آپ سے ایک مضمون لینے آئے تھے۔"

"اوہ اچھا!" لطفی صاحب نے سنبھل کر پوچھا۔ "کیوں صاحب کس قسم کا مضمون چاہیئے آپ کو؟"

"جی، یہی کوئی تحقیقی قسم کا۔ مثلاً اُردو کی ابتداً اور آغاز کے متعلق"....

"سُنو میاں!" لطفی صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "اگر میں اُردو کی انتہا اور انجام پر ایک مضمون لکھ دوں تو کیسا رہے؟"... اتنا کہتے کہتے پروفیسر لطفی نے اپنے تیور بالکل بدل ڈالے اور اُٹھتے ہوئے گرج بولے۔ "صاحبزادے ہو ابھی، شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔

مسیں پوری طرح بھیگی نہیں، چلے ہیں ایڈیٹر بننے۔ خبردار پھر کبھی۔ اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔"

ہم دونوں مُدیرانِ زعفران بڑے دل گرفتہ ہو کر وہاں سے نکلے۔ خصوصاً مُدیرِ اعلیٰ کی حالت تو قابلِ رحم تھی اس کے چہرے پر زندگی سے نفرت کے تمام تر آثار پھیل چکے تھے اور جب یہ علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو ایک شریف انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔ توجہ ہٹانے کے لیئے میں نے کہا۔

"پیارے چیف ایڈیٹر! یہ تو ہماری آزمائش کی پہلی منزل تھی، ہماری راہ میں تو ایسی سیکڑوں دشواریاں پیش آئیں گی، پھر تمہارے یوں ملول ہونے کا سبب؟"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے ان کے سلوک کی کوئی شکایت نہیں، میرا سارا غم تو اپنے مرحوم سُوٹ پہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو تمہاری غلطی ہے، اُردو رسالہ کے ایڈیٹر سوٹ کبھی نہیں پہنتے بلکہ قمیض پاجامہ ہی بڑی مشکل سے پہنتے ہیں، کیونکہ اکثر و بیشتر ان کا سابقہ لطفی صاحب جیسے مصنفین سے ہی رہتا ہے۔ اب اگر تم نے بد احتیاطی برتی تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

مدیرِ اعلیٰ نے غالباً اس کا کوئی جواب مناسب نہیں سمجھا لیکن وہ راستہ بھر بڑے فکر انگیز انداز میں پلکیں جھپکاتے رہے۔ یہ زخم اس وقت مُندمل ہوا جب ہفتہ عشرہ بعد ہی مُلک کے کونے کونے سے ہماری ڈاک میں در جنوں "تازہ ترین" تخلیقات آنی شروع ہو گئیں اور یہ محض دو ایک اخباروں کی پبلسٹی کا ردِ عمل تھا۔ قارئین اور لکھنے والوں نے پہلا شمارہ دیکھے بغیر نوتی اور ادارۂ زعفران کو "ادب کے بے لوث خدمت گذار" کے لقب سے یاد کیا تھا۔ ان خطوط کو پڑھ کر نوتی نے کہا "ہم واقعی ایک عظیم نصب العین کی طرف جا رہے ہیں کیوں صحرائی؟" نوتی کے اس سوال کا بالکل ایسا ہی انداز تھا جیسے کوئی پیغمبر کہے۔ "اے خدا! مجھے طاقت عطا کر کہ میں اس بھٹکی ہوئی قوم کو راہِ راست پر لا سکوں"! بہرحال، چونکہ اس نصب العین کی جانب ہمارے علاوہ اس کے ابا میاں کی دولت بھی سفر کر رہی تھی اسلیئے

نے اُس کے اس سوال کو "قلمی فطری" سمجھ کر ٹال دیا۔ پہلے شمارے
لیئے ہم نے چند مضامین ڈاک میں چُننے اور باقی اپنی کاوشیں رکھیں
کے بعد ایک تجربہ کار ایڈیٹر صاحب کی نشان دہی پر ہم ایک ایسے
ب سے رُجوع ہوئے جو ان دنوں شہر کے اکثر بڑے بڑے رسالے
تے تھے۔

گھر میں سے جب یہ برآمد ہوئے تو مجھے کاتبوں کے روایتی حُلیے
قدرے مختلف نظر آئے۔ اچھے خاصے اُونچے پُورے اور خوش لباس
ہے۔ رسمی تعارف کے بعد رسالہ کے مختلف مضامین اور نظموں غزلوں
بڑے تردّد سے گھُور کر کہنے لگے۔ "ہوں۔ بڑا گھٹیا سا رسالہ
کال رہے ہیں آپ!"

نومی نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "جی وہ کیسا ہی ہو، یہ بتلایئے
کہ آپ اُجرت کیا لیں گے؟"

اس پر ہمارے ہونے والے کاتب صاحب نے تیور بدل کر کہا
"اجی جناب! اُجرت کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا فی الحال تو
یہ اچھی طرح سُن لیجئے کہ میں کبھی لالہ صحرائی کی غزلیں، عاجزہ خاتون کے
افسانے اور پروفیسر غوری کے مضامین کی کتابت نہیں کرتا اور ان سب
کی چیزیں آپ کو پرچے سے نکالنا پڑیں گی!"

"عجیب بات ہے؟" نومی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں
"کیوں حضرت، آپ کو اُجرت سے مطلب ہے یا مَواد سے؟"

"بے شک، صَد فیصد مَواد سے" پھر انہوں نے بڑے فلسفیانہ
انداز میں فرمایا۔ "آپ لوگ کیوں بھُولتے ہیں کہ کاتب بھی آخر ایک
آرٹسٹ ہوتا ہے اور اس کے جذبات اور احساسات بھی بڑے
نازک ہوتے ہیں۔ بھلا بتایئے کہ وہ کیسے آنکھیں بند کر کے لالہ صحرائی
کی بحر سے خارج غزلیں لکھ سکتا ہے؟ اور پھر پروفیسر غوری کے
اس مضمون کو تو گذشتہ بارہ برس سے میں اتنی بار لکھتا رہا ہوں کہ کمبخت
مضمون مجھے حفظ ہو گیا ہے۔ نہیں صاحب! مجھ سے آپ کا یہ کام
نہیں ہو سکے گا۔"

"دیکھئے جناب!" میں نے خوش آمدی انداز میں کہا۔ "شہر کے
تمام بڑے بڑے رسالے چونکہ آپ ہی لکھتے ہیں، اس لیئے ہم
بڑی آرزوؤں سے آپ کے پاس آئے تھے۔ اس وقت تو
کوئی صُورت ممکن نہیں، البتہ آئندہ شمارہ میں آپ کی خوشنودی
کا خاص خیال رکھا جائے گا۔"

شاید ہماری اس درخواست کا ان کے دل پر بڑا اچھا
اثر ہوا۔ چنانچہ انہوں نے نرم ہو کر کہا۔ "خیر! نئی نسل کی حوصلہ
افزائی بھی بہرحال ضروری ہے، اچھا تو میں اس شمارہ کے لیئے
بھی آپ کو ایک تدبیر بتاتا ہوں۔"

"وہ کیا؟" ہم نے مجسم اشتیاق بن کر پُوچھا۔

"ماہنامہ کرن کے آخری شمارہ کا بہت سا معیاری مَواد
میرے پاس کتابت شدہ موجود ہے، رسالہ چونکہ بند ہو چکا ہے
لہٰذا اس کے چند جُزو "قابلِ فروخت" ہیں لگایئے دام!"

غرض اس "ریڈی میڈ رسالہ" کا ہراج چھڑا کر ہم اور
نومی آفس آئے۔ آفس میں نومی نے سنجیدگی سے ایک کاغذ پر
حساب کر کے کہا۔ "½ حصہ رسالہ دوستوں کے مضامین پر مشتمل
ہے اور ½ سے کچھ زیادہ کاتب کی مرضی پر، بچا کیا؟ تقریباً
½ حصہ جس کے لیئے میں یہ ساری دَوڑ دھوپ کر رہا ہوں"!

ایسے خطرناک پہلوؤں کی طرف جب بھی نومی کا دماغ
دَوڑتا ہے ہم اُس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ
اس وقت بھی میں نے فوراً کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ "حضرات!
اب ہمارے ماہنامہ زعفران کے فلم ایڈیٹر" دیدہ وَر "سے وہ
معرکتہ الآرا فلمی تبصرہ سُنیئے جو ہمارے پہلے شمارے میں شائع
ہو رہا ہے" دیدہ وَر کی ایک خصوصیت تو مشہور ہی تھی کہ وہ۔
"نرگس" کو آٹھ آٹھ آنسو رُلا کر ہزاروں برس بعد پیدا ہوتے
ہیں۔ ان کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ فلم دیکھتے وقت تین گھنٹوں
تک فلم کی عام غلطیوں کے باریک سے باریک نکتے ڈھونڈتے رہتے
فلم کی کہانی، مکالمہ، گیتوں اور ڈائرکشن سے انہیں بحث نہ تھی۔
ساری فکر انہیں یہ تھی کہ حوض میں اُترتے وقت ہیروئن کا جو لباس تھا

وہ کیا ہوگیا اور باہر نکلتے ہی وہ دوسرے لباس میں کیسے آگئی .....

زیرِ بحث فلم میں بھی انہوں نے ایک اسی قسم کا نکتہ عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہ ایک ایسی فلم تھی جس میں سماج کے بعض اہم مسائل پر جرأت انگیز طنز تھا۔ لیکن ہمارے دیدہ وَر کے خیال میں ڈائرکٹر اس لیئے قابلِ گردن زدنی تھا کہ ایک منظر میں ہیرو اپنے دوست کو وقت بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ چھ بج رہے ہیں جبکہ پسِ منظر میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹیبل واچ میں اس وقت دو بج رہے تھے۔ "آخر اسطرح عوام کو بیوقوف بنا کر ان کی دولت لوٹنے کا ڈائرکٹر کو کیا حق ہے"؟ ۔ یہ تھا دیدہ وَر کے مضمون کا آخری جوشیلا جملہ۔ جس پر ہم سب نے بھی پُر جوش تالیاں بجائیں۔ یوں تو ملک کے بہت سے مشہور فلمی رسالوں میں دیدہ وَر کے ایسے "تنقید پارے" اکثر چھپتے رہے تھے لیکن اب "زعفران" کے ذریعہ وہ یقیناً فلم انڈسٹری میں زبردست ہلچل پیدا کرنے والے تھے۔ مضمون کے ختم ہوتے ہی ہم اور دیدہ ور بلاک میکر کے یہاں گئے جس نے آج ٹائٹل کا بلاک دینے کا وعدہ کیا تھا۔ "پیرا ڈائز بلاک میکرز" میں سے ایک بڑے میاں نکلے، انہوں نے ہم دونوں کو غور سے گھورا اور پھر بہ دقت ہزار مسکرا کر بولے۔ "عجیب بات ہے قدرت نے آپ کو ہاف ٹون میں بنایا ہے اور آپ کے دوست کو لائن بلاک میں"۔

اس وقت تو ان کا مطلب ہماری سمجھ میں خاک نہ آیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے جملہ کا راست تعلق میری رنگت اور دیدہ وَر کے چیچک کے نشانوں سے تھا۔! بہرحال جب ہم نے ان سے بلاک مانگا تو انہوں نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟ اس موسم میں بلاک لینے آئے ہیں آپ؟"

"جی موسم سے کیا مطلب؟ آپنے آج ہی کی تو تاریخ دی ہے"۔

"اوہ! بُرا نہ ماننا، پڑھ لکھ کر آپ لوگوں کا ایمان خراب ہوگیا ہے، بھلا قدرت ساتھ نہ دے تو انسان کی مجال ہے جو بلاک بھی چھپ جائے اور آپ ہیں کہ تاریخ لیئے پھر رہے ہیں۔ اجی جناب دیکھتے نہیں، ہفتہ بھر سے دُھوپ نہیں نکلی ہے۔ اَبر چھایا ہوا ہے، دُھوپ کے بغیر بھلا بلاک کیسے بن سکتا ہے؟"۔

ہم دونوں کو اپنی کم علمی پر بڑی ندامت ہوئی ہم نے پوچھا.....

"پھر کب آنا ہوگا؟"۔

"بھلا میں کیا جانوں کب قدرت کا حکم ہوگا، بس جائیے اور دُھوپ نکلنے کی دُعا فرمائیے"۔

واپسی پر ہم دونوں مُنہ لٹکائے چلے جا رہے تھے۔ دیدہ وَر نے دانت پیس کر کہا۔

"کمبخت نوتی نے کیسی اچھی اچھی دُھوپیں ضائع کر دیں اس وقت کبھی رسالہ نکالنے کا خیال نہیں آیا۔ اب چلا ہے رسالہ نکالنے، برساتی مینڈک کہیں کا!"۔

اس بار میں بھی دیدہ وَر سے متفق تھا، لیکن ظاہر ہے کہ نوتی کے سامنے اظہارِ رائے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ہم نے اُسے مشورہ دیا کہ جب تک رسالہ چھپتا رہے، ٹائٹل کا بلاک بنتا رہے گا۔ آخر کار خدا نے وہ دِن دکھایا کہ رسالہ پریس کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن پھر رسالہ پریس میں پڑا ہی رہا۔ اور بس۔ کسی طرح چھپائی کی نوبت آتی ہی نہ تھی۔ پریس منیجر کے وعدوں کے مطابق ہم روز بڑے اشتیاق سے پہلا پُروف دیکھنے جاتے اور پھر اپنا سا مُنہ لے کر لوٹ جاتے۔ آخر ایک دن میرے ساتھ لالہ صحرائی بھی بڑے جوش میں پریس پہنچے۔ ان کا یہ جوش حق بجانب تھا۔ کیونکہ منیجر کے وعدوں کا پانی اب سَر سے گذر چکا تھا۔ اور "زعفران" اب "دولتِ مشترکہ" کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ چنانچہ صحرائی نے منیجر سے گرجتے ہوئے کہا: "کیوں جناب! آخر آپ کب تک اس طرح جھوٹے وعدے کرتے رہیں گے؟ اگر آپ سے کام نہیں ہوسکتا تو لائیے ہمارا رسالہ ہم کہیں اور چھپوالیں گے"۔ منیجر نے مُطمئن انداز میں جواب دیا "سُنیئے تو سہی، اسطرح غصہ سے تو آپ کا کام کہیں نہیں ہوسکتا میں آج ضرور آپ کا کام شروع کروا دیتا لیکن....."....

"لیکن کیا"؟

"ایک مجبوری ہے۔ پھر اس نے لالہ صحرائی سے پوچھا "کیوں جناب! آپ اُلٹا لکھنا جانتے ہیں"؟

میں نے کہا: "خوب پہچانا آپ نے۔ ان کی تو ساری زندگی

الٹ پلٹ لکھنے میں گذاری ہے"!۔

صحرائی بگڑ کر بولے، "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

مینجر نے مسکرا کر کہا۔ "معاف فرمائیے آپ کے دوست نے غلط مطلب لیا۔ بات یہ ہے کہ ایک ہفتہ سے ہمارے سنگ ساز اور معکوس نویس نہیں آئے جو دُھندلی عبارتوں کو پتھر پر اُلٹی طرف سے لکھتے ہیں۔ اگر آپ اس کام سے واقف ہوتے تو آج ہی آپ کا رسالہ چھپ جاتا"!

راستے میں صحرائی نے مجھ سے پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس اُلو کے پٹھے کو یہ فن نہیں آتا، اسے ایڈیٹر بننے کا کوئی حق نہیں ہے؟" میں نے اس میں یہ ترمیم کی، "جو اُلٹا لکھنا جانتا ہے دراصل وہی ایڈیٹر بن سکتا ہے"۔

ہمارا پہلا شمارہ ابھی تکمیل کے ان تمام زبردست مراحل سے گذر ہی رہا تھا کہ رجسٹریشن آفس سے ہمیں ایک اور خط وصول ہوا

غیر انگریزی داں احباب کی سہولت کے لیئے دیدہ وَر نے حسب معمول اس کا اُردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ لکھا تھا:

"پیارے دوست!

آپ کو رسالہ کی اجازت حاصل کئے ہوئے چھ مہینے گذر چکے ہیں۔ لیکن متعدد بار یاددہانیوں کے باوجود ماہنامہ "زعفران" کا کوئی شمارہ آپ نے ہمیں نہیں بھیجا۔ لہٰذا حسب ضابطہ ذریعہ ہٰذا آپ کے رسالہ کا اجازت نامہ منسوخ کیا جاتا ہے۔"

آپ کا وفادار ....؟

اپنے اس "بن کھلے غنچے" کے مُرجھا جانے پر اب بھی کبھی ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ بے شک اگر "زعفران" شائع ہونے لگتا تو اُردو ادب کی تکمیل صورت ہوتی جو آج ہے! پھر بھی ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ "زعفران" کے مشن اور اغراض و مقاصد پر ملک کے مختلف اُردو رسالے گامزن ہیں تو صبر کر کے ہم خود بخود آنسو پونچھ لیتے ہیں۔ ▲

غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی
(پرائیویٹ لمیٹڈ)

قارئین کرام!

اِدھر جب سے دُنیا تجارت کے چنگل میں پھنس گئی ہے
ں وقت سے ہر شئے تجارت کے ترازو میں تُلنے اور تجارت کے سانچے
ں ڈھلنے لگی ہے۔ ہمیں اُس نوجوان کی بات اب بھی یاد ہے جس نے
ب کُتب فروش کی دوکان پر کھڑے ہو کر کُتب فروش سے کہا تھا ــ
"جناب والا! مجھے کرشن چندر کے دو کیلو افسانے، راجندر سنگھ
یدی کی ڈیڑھ کیلو کہانیاں اور فیض کی چار کیلو غزلیں دیجئے۔"
ر کُتب فروش موصوف نے ہماری آنکھوں کے سامنے کرشن چندر
ر بیدی کی کہانیوں کے مجموعے ترازو میں تول کر دیئے اور فیض کی
زلوں کے بارے میں فرمایا، "حضور والا! میں آپ کو فیض احمد فیض کی
ار کیلو غزلیں دینے کے موقف میں نہیں ہوں کیونکہ فیض کا سارا
دبی سرمایہ صرف دو کیلو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یقین نہ آئے تو.....
دستِ صبا"۔ "نقشِ فریادی" اور "زنداں نامہ" کو تول کر دیکھ
یجئے۔" اس دن کے بعد سے ہمیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ دن دور نہیں
ب تجارت' ادب پر اس قدر غالب آجائے گی کہ لوگ شاعری
ی بلیک مارکیٹنگ اور افسانوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے لگیں گے
ویسے بیرونی ادب کی اسمگلنگ تو ہمارے ہاں اب بھی جاری ہے۔)
مگر ہمارا یہ یقین اُس وقت پختہ ہوا جب ہمیں پتہ چلا کہ ایک صاحب
ل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ" قائم
س کمپنی کا کاروبار زوروں پر جاری ہے۔ چنانچہ

ہم اس کمپنی کا معائنہ کرنے کی غرض سے اُس "مقامِ واردات" پر پہونچے، جہاں "وارداتِ قلبی" کو اشعار میں ڈھالا جا رہا تھا۔ جب ہم اس کمپنی کے دروازے پر پہونچے تو دیکھا کہ لوگ قطار باندھے کھڑے ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں کورے کاغذات ہیں۔ ہم نے اُن لوگوں سے پوچھا، "صاحبو! آپ لوگ کون ہیں، آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں اور آپ نے ہاتھوں میں کورے کاغذات کیوں پکڑ رکھے ہیں؟" اس پر ایک نازک اندام نوجوان جس کے بال بڑھے ہوئے تھے، آگے بڑھا اور بولا۔ "جنابِ والا! ہم ماڈرن شاعر ہیں اور فکرِ شعر میں وقت برباد نہیں کرتے' اسلیئے ریڈی میڈ غزلیں خریدنے آئے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں کورے کاغذات اس لیئے ہیں کہ ہم ان پر غزلیں لکھوا کر لیجا سکیں۔" نوجوان کا یہ جواب سُن کر ہم آگے بڑھنے لگے تو قطار میں ایک شور بلند ہوا کہ "صاحب! قطار میں ٹھہریئے۔ ہم تو صبح سے یہاں کھڑے ہیں۔ آپ دیر سے آئے ہیں اس لیئے آپ کو قطار میں سب سے پیچھے ٹھہرنا چاہیئے۔" ہم نے شعرا کی اس ہوٹنگ کا کوئی نوٹس نہ لیا اور کمپنی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک کمرے میں ہمیں اس کمپنی کے پروپرائٹر مسٹر عبدالرحیم وفا نظر آئے جو ہاتھ میں قینچی پکڑے ایک غزل کو کاٹ رہے تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولے "مکرر، مکرر!" ہم نے اپنا دوبارہ تعارف کروایا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بولے "معاف کیجئے، میں ذرا اونچا سُنتا ہوں، اس لیئے آپ کو اپنا تعارف مکرّر کروانا پڑا۔" پھر وہ بولے۔ "میں آپ کو

اپنی کمپنی کا معائنہ ضرور کرواؤں گا، مگر آپ کو پانچ منٹ تک انتظار کی زحمت برداشت کرنی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت میں ایک غزل کاٹ رہا ہوں۔" پھر جب وہ قینچی لے کر دوبارہ غزل کاٹنے میں مصروف ہوگئے تو ہم نے ازراہِ تجسس اُن سے پوچھا۔ "قبلہ! آپ قینچی سے اس غزل کو کیوں کاٹ رہے ہیں؟" تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "بھئی! بات دراصل یہ ہے کہ یہ غزل بڑی بحر میں لکھی گئی ہے اور اب میں اسے کاٹ کر اس میں سے چھوٹی بحر کی دو غزلیں برآمد کر رہا ہوں۔ کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور شعرا کے ڈھیروں آرڈرز میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے غزل کاٹی اور اپنے نوکر کو بُلا کر کہنے لگے۔ "میاں! یہ غزلیں اسی وقت میوزک ڈائرکٹر صاحب کے پاس لے جاؤ اور اُن سے کہو کہ شام تک ان دونوں غزلوں کا ترنم فِٹ ہو جائے، کیونکہ آج رات میں مشاعرہ ہے اور جناب ترنم رُوحانی اس مشاعرہ میں یہ غزلیں پڑھنے والے ہیں۔" ہم نے پوچھا۔ "یہ ترنم رُوحانی صاحب کون ہیں؟" وہ بولے۔ "ہمارے بہت پُرانے گاہک ہیں آپ انہیں نہیں جانتے وہ تو ہمارے مُلک کے ممتاز شعرا میں شمار کیئے جاتے ہیں اور ہمیں یہ فخر ہے کہ وہ گذشتہ بیس برسوں سے ہماری کمپنی سے غزلیں اور اُن کا ترنم خرید رہے ہیں۔"

پھر جناب عبدالرحیم وفا نے اپنی داستانِ الم انگیز یوں بیان کرنی شروع کی کہ: "جناب والا! میں بچپن ہی سے اس نظریہ کا قائل رہا ہوں کہ شعرا تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک پیدائشی شاعر، دوسرا موروثی شاعر اور تیسرا نمائشی شاعر...... پیدائشی شاعر تو وہ ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی مطلع عرض کرتا ہے یعنی روتا بھی ہے تو علمِ عروض کے اُصولوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے اُس کے رونے میں بھی ایک ترنم پوشیدہ ہوتا ہے اور ابھی دس بارہ سال کا بھی ہونے نہیں پاتا کہ "صاحبِ دیوان" بن جاتا ہے موروثی شاعر وہ ہوتا ہے جسے شاعری ورثہ میں ملتی ہے، یعنی اصل میں اس کا باپ شاعر ہوتا ہے اور جب وہ مرتا ہے تو اپنے پیچھے قرض خواہوں کے علاوہ غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں چھوڑ جاتا ہے۔ پس اُس کا بیٹا ان غزلوں اور نظموں کو وقفہ وقفہ سے رسائل میں چھپواتا ہے اور موروثی شاعر ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ لیکن شاعروں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو "نمائشی شاعر" کہلاتی ہے۔ اور سچ پُوچھیئے تو ان دنوں ہر طرف "نمائشی شعرا" کی بھرمار ہے جو کہیں سے غزلیں لکھواتے ہیں اور انہیں مشاعروں میں پڑھ کر نام کماتے ہیں۔ چونکہ میں ابتدا ہی سے "پیدائشی شاعر" رہا ہوں، اس لیئے میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ بڑا ہو کر ایک ایسی کمپنی قائم کروں گا جہاں، سے نمائشی شعرا کو سستے داموں پر غزلیں اور نظمیں فراہم کی جائیں گی۔ چنانچہ میں نے نہایت قلیل سرمائے کے ساتھ اس کمپنی کا آغاز کیا۔ میں نے ایک سکنڈ ہینڈ قلم اور ایک سکنڈ ہینڈ سیاہی کی دوات خریدی اور اپنے مستقبل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابتدا میں میرا طریقہ کار یہ تھا کہ میں اپنے ہاتھ میں قلم پکڑتا اور گلی گلی آوازے لگاتا پھرتا کہ "غزل لکھوائیے، نظم کی اصلاح کروائیے۔" وہ دن میرے لیئے سخت آزمائش کے دن تھے جب ہر طرف "پیدائشی شاعر" نظر آیا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ کچھ "نمائشی شعرا" نمودار ہونے لگے اور میرا کاروبار چل پڑا۔ جب میری حالت ذرا سنبھلی تو میں نے ایک ٹھیلہ خریدا، اور اس ٹھیلے میں غزلیں، نظمیں، سہرے اور رباعیاں رکھ کر فروخت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ میری "گمنامی" دُور دُور تک جا پہونچی۔ اور لوگ دُور دُور سے غزلیں لکھوانے کے لیئے آنے لگے۔ میرا نصیبا جاگ اُٹھا اور میں اتنا مالدار ہوگیا کہ آج "غزل سپلائنگ اینڈ مینو فیکچرنگ کمپنی" کا پروپرائٹر ہوں۔ اب میں نے چار پیدائشی شعرا کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں، جو دن رات غزلیں، نظمیں، رُباعیاں اور قطعات لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ایک میوزک ڈائرکٹر کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں جو مختلف غزلوں کا ترنم فٹ کرتا ہے پھر میں نے اپنی کمپنی میں ایک نیا شعبہ بھی قائم کیا ہے، جسے...

شعبۂ سامعین کا نام دیا گیا ہے۔ اس شعبہ کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ مشاعروں میں "سامعین" کو روانہ کرے اور کمپنی کی فراہم کردہ غزلوں پر کچھ ایسی داد دے کہ اچھے خاصے "نمائشی شاعر" پر —— "پیدائشی شاعر" کا گمان ہونے لگ جائے۔ چنانچہ میں فی سامع سواری خرچ کے علاوہ ڈیڑھ روپے چارج کرتا ہوں۔ میرا یہ نیا شعبہ بھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، کیونکہ مشاعرے زیادہ راتوں ہی میں منعقد ہوتے ہیں۔ ہمارے سامعین کسی شاعر کے کلام اس زور و شور سے داد دیتے ہیں کہ خود بیچارے شاعر کا کلام کوئی سُننے نہیں پاتا۔ اب میں نے ایک "شعبۂ ہوٹنگ" بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ کمپنی کے مخالفین کے دانت کھٹے کیئے جائیں۔" مسٹر عبدالرحیم وفا ابھی اپنی داستان بیان ہی کر رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ ریسیور اُٹھا کر کہنے لگے

"ہیلو! کون شادانی صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں..... ! مجھے معلوم ہے کہ مشاعرہ آج رات میں ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ کیونکہ آپ نے ابھی تک دو پرانی غزلوں کی قیمت ادا نہیں کی ہے، جب تک پچھلا حساب صاف نہ ہو جائے میں آپ کے لیئے ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا کہا۔ مشاعرہ میں آپ کو معاوضہ ملنے والا ہے۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آپ کو مشاعرہ میں معاوضہ ملتا ہے۔ گذشتہ بار بھی آپ کو معاوضہ ملا تھا، لیکن آپ نے میری غزلوں کی اُجرت ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ مجھ سے پانچ روپے میں ایک غزل لے جاتے ہیں اور اُسے مشاعرہ میں پڑھ کر پچیس تیس روپے معاوضہ حاصل کر لیتے ہیں، میں کبھی یہ برداشت نہیں کروں گا کہ آپ میری شاعری کے علاوہ میری دولت کا بھی استحصال کریں۔" اس کے بعد ٹیلیفون پر طویل وقفہ رہا اور شادانی صاحب دوسری طرف سے مسلسل بولتے رہے اور آخر میں وفا صاحب جھنجھلاتے ہوئے بولے۔

"بہت اچھا شادانی صاحب، میں آپ کو غزل ضرور لکھ دیتا لیکن میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے، کیونکہ مجھے خود "صدرِ مشاعرہ" کی غزل کہنی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ آج مشاعرہ میں نہ جائیں۔" اس کے بعد وفا صاحب نے بڑے زور سے ریسیور کو رکھ دیا اور بولے

"بدتمیز کہیں کے۔ جب غزل لکھوانی ہوتی ہے تو یوں منت سماجت کرتے ہیں جیسے کوئی فقیر بھیک مانگ رہا ہو لیکن جب مشاعرے میں میری ہی غزل میرے سامنے پڑھتے ہیں تو میری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے اپنی ذاتی غزل سُنا رہے ہیں۔" پھر وفا صاحب نے اپنے حواس دُرست کیئے اور کہنے لگے "میں آپ کو اپنی کمپنی کی داستان تو سُنا چکا ہوں، اب آپ میرے پراسپکٹس کا مطالعہ فرمالیجئے، جس میں آپ کو میری کمپنی کی جملہ شرائط اور تفصیلات کا علم ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے —— پراسپکٹس ہمارے سامنے پھینک دیا۔ ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور ایک پراسپکٹس اپنے ساتھ لے آئے، جسے من و عن یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

غزل سپلائنگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ

پراسپکٹس:

● گاہکوں کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تخلص کا خود انتخاب کریں۔ ایک بار آپ نے تخلص رکھ لیا تو آپ کو مکمل شاعر بنانے کی ذمہ داری کمپنی پر عائد ہوگی۔

● بیک وقت چار غزلوں کا آرڈر دینے پر ایک قطعہ مُفت فراہم کیا جائے گا۔

● اگر کمپنی کی فراہم کردہ کسی غزل پر مشاعرہ میں ہوٹنگ ہو تو اس کی ذمہ داری کمپنی پر عائد نہ ہوگی۔ ہم غزل کو ہوٹنگ سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری صرف اُسی صورت میں قبول کر سکتے ہیں جب کہ آپ ہمارے "شعبۂ سامعین" کی خدمات سے استفادہ کریں۔

● غزلوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے کی ذمہ داری بھی متعلقہ پر ہی عائد ہوگی۔ کیونکہ کمپنی صرف شعر کہتی ہے "شعرا" کو "قاعدہ" نہیں پڑھا سکتی۔

● بڑی بحر کی غزل کے پانچ اشعار کی قیمت دس روپے اور چھوٹی بحر کی غزل کے پانچ اشعار کی قیمت آٹھ روپے ہوگی۔ اگر کوئی صاحب صرف ایک مصرعہ خریدنا چاہیں تو اُن سے پُورے شعر کی اُجرت وصول کی جائے گی۔

● اگر کوئی صاحب کمپنی ہٰذا سے آزاد نظمیں لکھوانا چاہتے ہوں تو اُنہیں اپنی دماغی صحت کے بارے میں سب سے پہلے ایک طبی صداقت نامہ پیش کرنا ہوگا۔

● اگر کوئی صاحب "سہرا" لکھوانا چاہتے ہوں تو واضح ہو کہ کمپنی "سہرا نگاری" کی اُجرت بہت بھاری وصول کرتی ہے۔ کیونکہ دوسروں کی شادی پر خوشی کا اظہار کرنا ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

● کمپنی ہٰذا نے گاہکوں کی سہولت کے لیۓ غزلیں کرایہ پر دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ لیکن کوئی غزل چوبیس گھنٹوں سے زیادہ عرصہ کے لیۓ اپنے پاس نہ رکھی جائے۔ کیونکہ سائیکلیں جب کرایہ پر دی جاتی ہیں تو اُنہیں بھی اسی شرط کے ساتھ کرایہ پر دیا جاتا ہے۔

● گاہکوں کو غزلوں کی قیمت نقد ادا کرنی ہوگی۔ کیونکہ شعرا کو اُدھار غزلیں دینا، دُنیا کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

● ہم نے گاہکوں کی سہولت کی خاطر پُرانی غزلوں کی "ریپرنگ" کا بھی بندوبست کیا ہے۔ لیکن یہ غزلیں اتنی پُرانی، بوسیدہ اور شکستہ نہیں ہونی چاہئیں کہ اُن کی "ریپرنگ" پر نئی غزل کی لاگت آجائے۔

● ایک بار فروخت کی ہوئی غزلیں واپس نہیں لی جائیں گی۔ البتہ مستعمل غزلیں نصف قیمت پر خریدی جائیں گی۔

ہم نے کمپنی کا یہ پراسپکٹس بغور پڑھا اور مسٹر عبدالرحیم وفا سے رخصت ہو کر واپس آگئے۔ اور اب ہم عوام کی اطلاع کے لیۓ اسے شائع کر رہے ہیں تاکہ جو کوئی بھی صاحب خواہ مخواہ شاعر بننے کی تمنا رکھتے ہوں، وہ شاعری کی اسی بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھولیں اور یُوں سارے پانی کو گندہ بنادیں۔ ▲

---

(۱)

۱۹۶۴ء کی فلمیں

ایک تنقیدی جائزہ

اعجاز قریشی

۱۹۶۴ء ہماری فلمی صنعت کے لیے صدموں اور محرومیوں، کامیابیوں ناکامیوں، تلخیوں اور تجربوں کے اثرات اور گہرے نقوش چھوڑنے والا سال ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا ہم سے جدا ہو جانا' ہماری قومی اور اجتماعی زندگی کا سانحہ عظیم تھا۔ ہماری قومی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو اس عظیم المرتبت قائد کے چلے جانے سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ فلمی صنعت نے بھی اپنے سب سے محبوب رہنما، اپنے مشفق رہنما اور اپنے بہتر ہمدرد اور بہی خواہ کو کھو دیا۔ یہ محرومی اور یہ صدمہ آنے والے طویل عرصہ تک صنعت کو متاثر رکھے گا۔ پنڈت جی کے انتقال کے دوسرے ہی دن ہماری فلمی صنعت اپنی ایک محبوب شخصیت ہدایت کار اور پروڈیوسر محبوب سے محروم ہو گئی۔ محبوب خاں صرف ایک ہدایت کار اور پروڈیوسر یا اسٹوڈیو اونر ہی نہیں بلکہ ہماری فلمی سوسائٹی کے ایک اہم ستون تھے۔ ایک ہدایت کار اور فلمساز کی حیثیت سے انہیں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اور ان کا جو رول رہا اس کا جائزہ ایک علٰحدہ مضمون میں ہی ممکن ہے۔ محبوب خان کی موت سے زیادہ المناک موت ملک کے ایک بہترین فلم آرٹسٹ، اپنی طرز کے بہترین اور منفرد فلمساز اور ہدایت کار گرودت کی رہی۔ زیادہ اس وجہ سے کہ یہ موت المناک حالات میں ہوئی۔ موت نے گرودت کو نہیں، گرودت نے موت کو منتخب کیا۔ اس بڑے فن کار کی بے وقت موت کی وجہ سے ہماری فلموں کے ارتقا کا ایک حصہ ادھورا رہ گیا۔ اس فنکار سے صاحب بی بی اور غلام، اور کاغذ کے پھول، جیسی فلموں کے بعد بہت زیادہ توقعات پیدا ہو گئی تھیں۔

محبوب خاں اور گرودت کے علاوہ فلمی صنعت نے اپنے کچھ نامور اہم فن کاروں کو کھو دیا' جن میں پروڈیوسر ڈائرکٹر ایس یونی ہدایت کار آرٹ ڈائرکٹر بیرن ناگ کا شمار ہمارے ملک کے بہترین آرٹ ڈائرکٹروں میں کیا جاتا تھا۔ بیس سال بعد اور گہرا ہدایت کار کی حیثیت سے بھی وہ ایک ابھرتے ہوئے باصلاحیت ہدایت کار سمجھے جا رہے تھے۔

بعض فلمی ستاروں کے مکانات پر "بلیک منی" کے سلسلہ میں دھاوے کیے گئے اور اس کارروائی کے نتیجہ میں جو تلخیاں پیدا ہوئیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کارروائیوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ فلمی ستارے متحد ہو گئے فلمسازوں اور فلمی ستاروں میں اس سے پہلے کبھی اس قسم کا اتحاد دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کارروائی' اور اس کے ردِ عمل کے طور پر آئندہ کے لئے بعض اہم تجاویز سامنے آ رہی ہیں۔ فلمسازوں اور فلمی ستاروں کے نمائندے اور حکومت کے نمائندوں میں بات چیت جاری ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس بات چیت کے نتیجہ میں" بلیک منی" کے مسئلہ کا کوئی حل برآمد ہو۔ فلمی ستارے محاصل کے معاملہ میں اپنے مخصوص حالات، جداگانہ موقف اور دیگر بہت سی باتوں کی وجہ سے ایک علٰحدہ پالیسی چاہتے ہیں۔

۱۹۶۴ء کا جائزہ لینے والے بعض مبصرین کو اس بات کا افسوس ہے کہ بمبئی میں اس سال فلمیں نسبتاً کم تعداد میں تیار ہوئی ہیں لیکن محض تعداد کو ہی اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ زیادہ بڑے پیمانہ پر رنگین فلموں کی تیاری میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ چند بڑی فلموں پر پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ سرمایہ لگایا جا رہا ہے' جس کے نتیجہ میں مجموعی طور پر فلموں کی تعداد کم ہو سکتی ہے۔ جہاں تک بمبئی میں اسٹوڈیوز کی کمی کا سوال ہے فلمی صنعت کی شکایت حق بجانب ہے۔ فلمی صنعت پر ہر قسم کے محاصل میں اضافہ اور درآمدی اور برآمدی تحدیدات کی وجہ سے بعض ایسے مسائل اور دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا حل حکومت کے پاس ہے آئندہ برس ارش

حکومت نے اسٹوڈیوز کی تعمیر کے لیئے سہولتیں دینے کے ساتھ ساتھ مالی امداد کی ترغیب دینے کا فیصلہ کرکے ایک مثال قائم کی ہے۔ ہندی اور اُردو کی فلمیں تیار کرنے والے سبھی لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دوسری صوبائی حکومتیں بالخصوص حکومت مہاراشٹرا بھی اس طرح کا ہمدردانہ رویہ اختیار کرے اور موجودہ دشواریوں کو کم کرنے کے لیئے اقدامات کرے۔ کمی صرف اسٹوڈیوز اور لیبارٹریوں ہی کی نہیں، سینما گھروں کی بھی کمی ہے سینما گھروں کے کرایے اتنے زیادہ ہوگئے ہیں اور سینما گھروں کو کرایہ پر لینے کے معاملہ میں بھی "بلیک منی" اتنی عام ہوگئی ہے کہ پیچیدگیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ فلمی صنعت ہمارے مُلک کی ایک اہم صنعت ہے فلمسازی، ڈسٹری بیوشن اور ایکزبیشن سے متعلق جملہ صنعتی اور کاروباری سرگرمیوں میں مصروف اور انہی ذرائع سے روزگار حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے۔ فلمی صنعت اور اس سے متعلقہ ہر قسم کے کاروبار اور معاشی صنعتی اور تجارتی سرگرمیوں سے حکومت کو جو آمدنی ہوتی ہے وہ مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ اس لیئے حکومت کو بھی اس صنعت کی صحت مند ترقی میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے۔ بدقسمتی سے اب تک بھی حکومت نے اس معاملہ میں کوئی جامع پالیسی مرتب نہیں کی ہے۔

دو تین سال پہلے صورت حال یہ تھی کہ صرف اعلیٰ پیمانہ پر تیار کی گئی فلمیں ہی کامیاب ہوتی تھیں۔ چھوٹے پیمانے کی کاسٹیوم یا مار دھاڑ کی فلمیں بالکلیہ طور پر ناکام جارہی تھیں۔ لیکن دارا سنگھ کی وجہ سے اس قسم کی فلمیں بھی تجارتی طور پر کامیاب ہورہی ہیں۔ اس اعتبار سے دارا سنگھ نے جہاں بہت سے پہلوانوں کے لیئے فلمی صنعت میں روزگار کے دروازے کھول دیئے، بہت سے فلمسازوں کو بھی سہارا دیا ہے۔ اب ہندی اور اُردو میں تیار ہونے والی فلموں کے مارکیٹ تین قسم کے بن چکے ہیں۔ بڑے فلمی ستاروں کے ساتھ بڑے پیمانہ پر کثیر صرفہ کے ساتھ تیار ہونے والی فلموں کا مارکیٹ، اوسط پیمانہ کی تفریحی یا معاشرتی فلموں کا مارکیٹ اور دارا سنگھ کی فلموں اور اس قبیل کی دوسری فلموں کا مارکیٹ۔

سنہ ۱۹۶۴ء کی فلموں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سال کامیابیوں اور ناکامیوں اور مایوسیوں اور اُمید افزا امکانات کا سال ہے۔ اس سال (۱۵) رنگین فلمیں بڑے پیمانہ پر تیار ہوئی ہیں اور مستقبل میں بھی رنگین فلموں کے زیادہ تعداد میں تیار ہونے کے امکانات روشن ہیں۔ لیڈر کی ناکامی کے نتیجہ میں یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ بڑے پیمانہ پر تیار ہونے والی رنگین فلموں پر اس کے انتہائی مُضر اثرات مُرتب ہوں گے۔ لیکن سنگم نے باکس آفس پر کامیابی اور بزنس کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ بیرونِ ملک ہندوستانی فلموں کے "ٹریڈیشنل" مارکیٹ میں بھی اس فلم کی کامیابی کا یہی حال ہے اور بہت جلد یہ فلم مغربی ممالک اور یورپ کی مارکیٹ میں بھی نمائش کے لیئے پیش کی جانے والی ہے۔ سنگم نے جہاں ہماری فلمی تکنک کو نئی وسعتیں اور نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا، نئے مارکیٹ اور نئے امکانات بھی پیدا کیئے ہیں۔ بیرونی ملکوں کے فلمسازوں کے اشتراک و تعاون سے فلمیں تیار کرنے کا رُجحان اور بھی قوی ہو چکا ہے۔ انگریزی فلموں کے ٹریڈیشنل عالمی مارکیٹ پر اب ہماری نظریں لگی ہوئی ہیں — مستقبل قریب میں ہم یقیناً اس سمت میں بھی اہم پیش قدمی کرسکتے ہیں۔

"سائن اڈوانس" میں سنہ ۱۹۶۴ء کی فلموں کا جو جائزہ شائع ہوا ہے اس میں اس سال کو "سنگم کا سال" قرار دیا گیا ہے باکس آفس پر کامیابی، اداکاری، صنّاعی (کرافٹ مین شپ)، فوٹو گرافی، موسیقی، غرض فلم کے بیشتر شعبوں کا علحدہ علحدہ جائزہ لینے کی صورت میں یہی فلم نُمایاں نظر آتا ہے اور فلمی نقادوں اور مبصرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ سنہ ۱۹۶۴ء کے بیشتر فلم اوارڈ بھی یہی فلم سمیٹ لے گا۔ ہندوستانی فلموں کے ترجمان ہفتہ وار "اسکرین" میں بھی سنگم ہی کو سنہ ۱۹۶۴ء کا حاصل قرار دیا گیا ہے اسکرین نے سنہ ۱۹۶۴ء کو "راج کپور کے سال" کی حیثیت سے بھی یاد کیا ہے۔ حال ہی میں سنگم کی سلور جوبلی کے سلسلہ میں منعقدہ ایک تقریب میں ہز ماسٹرز وائس کے چیف نے سنگم کے موسیقاروں شنکر اور جے کشن کو "سلور سیلورس" پیش کیئے۔ ہز ماسٹرز وائس کمپنی کے سربراہ نے

ناف کیا کہ سنگم کے ریکارڈ جتنی تعداد میں فروخت ہوئے اس سے
سی دوسری ہندوستانی فلم کے ریکارڈ اتنی تعداد میں فروخت نہیں
ئے تھے۔ کامیابی اور مقبولیت کے معاملہ میں شنکر ادجے کشن سدابہار
کے موسیقار ہیں۔ جنہوں نے سنگم میں اپنی پچھلی کامیابیوں کے تمام
انڈ بھی توڑ دیئے ہیں۔ اس پس منظر میں ہز ماسٹرز وائس کمپنی کی طرف سے
ں جو اعزاز دیا گیا ہے وہ ہر طرح اس کے مستحق تھے۔

۱۹۶۴ء کی فلموں میں سنگم کے علاوہ دوسری کوئی بڑی فلم نظر
یں آتی۔ لیکن باکس آفس پر نصف درجن سے زائد فلموں کی کامیابی
صلہ افزا ہے۔ ان میں نصف فلمیں بلیک اینڈ وائٹ اور نصف فلمیں رنگین
ں۔ اس سال کی فلموں میں سب سے پہلے جیمنی کی زندگی کامیاب رہی اور
س نے چند بڑے شہروں میں سلور جوبلی منائی۔ وہ کون تھی، دوسری کامیاب
م تھی۔ جو توقع اور اندازوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ بیٹی بیٹے،
زندگی سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔ بمبئی میں اس نے ایک ساتھ دو تھیٹروں
میں سلور جوبلی منائی۔ اور دوسرے کئی بڑے شہروں میں اچھا بزنس کیا۔ رنگین
فلموں میں سنگم کے بعد سب سے زیادہ کامیاب فلم آئی ملن کی بیلا رہی۔
اپریل فول اور راج کمار کی کامیابی کا اندازہ ۱۹۶۵ء کی ابتدائی سہ ماہی
کے دوران میں ہوگا۔ یہی بات گیت گایا پتھروں نے کے بارے میں کہی
جا سکتی ہے۔ بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں اس سال کے آخر میں فلم دوستی
کی کامیابی چونکا دینے والی ثابت ہوئی۔ بڑے فلمی ستاروں کے بغیر اس
فلم کی کامیابی ایک اہم تجربہ تھی (جس پر پونم کے گذشتہ شمارہ میں تفصیل
کے ساتھ لکھا جا چکا ہے) دوستی کے بنانے والوں نے اس پاک صاف فلم
کو نامور ستاروں کے بغیر کامیاب بنانے میں غیر معمولی تاجرانہ مہارت کا
ثبوت دیا ہے۔ ہماری فلمیں محض "آرٹ فلمیں" نہیں ہوتیں، انہیں بازار
میں چلنے والی ایک جنس کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی
فلموں کا بنیادی مقصد تفریح اور تجارت ہی ہوتا ہے۔ اگر تفریح اور
تجارت کے ساتھ ساتھ مقصدیت، فن کاری اور حسن کاری کی جھلکیاں
بھی مل جائیں تو بہت غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

زیرِ تبصرہ سال کی فلموں میں سنگم کے بعد دوسرا نمبر "شہر اور سپنا"
کو ہی مل سکتا ہے۔ جتنے بڑے پیمانہ پر سنگم تیار ہوئی۔ اس کے مقابلہ
میں اتنے ہی معمولی پیمانہ پر اور کم صرفہ سے شہر اور سپنا ۱۹۶۳ء کے آخر
میں مکمل ہوئی۔ اسٹیٹ اوارڈ کے لیے ۱۹۶۳ء کی فلموں میں ہی اس کا
شمار کیا گیا اور اسے پریسیڈنٹ گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔ صدر ہند کا طلائی تمغہ
ملنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس فلم کی نمائش سارے ملک میں ہو سکی لیکن
اس اعزاز کے ملنے سے ایک تنازعہ بھی کھڑا ہو گیا۔ بہت سے نقاد اس فلم
کو اس اعزاز کا مستحق نہیں سمجھ رہے تھے۔ اگر شہر اور سپنا نے یہ اعزاز
حاصل نہ کیا ہوتا تو اس فلم کے نقادوں کا رویہ سخت ہونے کی بجائے
حوصلہ افزائی کا اور ہمدردانہ ہو سکتا تھا۔ تنقید کے یہ دونوں طریقے
نامناسب ہیں۔ شہر اور سپنا پر تنقیدی نظر ڈالنے سے پہلے روایتی فلمی
معیارات اور رجحانات کو پیشِ نظر رکھنا اور ان حالات کو ذہن میں
رکھنا ضروری ہے، جن میں یہ فلم مکمل ہو سکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ
شہر اور سپنا کوئی بہت بڑی فلم نہیں ہے، لیکن چھوٹے پیمانے پر ایک
بڑی کوشش ضرور ہے۔ اس فلم نے جو امداد باہمی کی اساس پر تیار ہوئی ہے
فلمی صنعت اور فلمی کاروبار میں ایک نئے عنصر کو داخل کیا ہے، اس
لحاظ سے یہ فلم ایک اہم تجربہ ہے۔ شہر اور سپنا میں نقائص اور کوتاہیوں
کے ساتھ ساتھ پُر اثر اور خوبصورت حصے بھی ملیں گے۔ مجموعی طور پر
شہر اور سپنا ایک اچھی اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ شہر اور سپنا کے بعد
دوستی عمومی اعتبار سے تیسرے نمبر پر آتی ہے۔ اس کے بعد سے ترتیب
دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ گیت گایا پتھروں نے، دیکھنے سے یہ خیال
پیدا ہوتا ہے کہ، دو آنکھیں بارہ ہاتھ، بنانے کے بعد شانتارام نے
ایک بار پھر ایک بڑے فن کار کی حیثیت سے اپنے وجود کو منوانے
کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کوشش میں وہ ناکام رہے۔ اس فلم کے
بعض حصے خوبصورت ہیں۔ ان میں فنی چابکدستی بھی نظر آتی ہے لیکن
مقصدیت کڑوی گولیوں کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ آرٹ کی جگہ پرچار،
پروپیگنڈہ اور نصیحت ملتی ہے۔ فن اور مقصدیت کا یہ امتزاج بھدا
اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

Registered with the Registrar of News papers at R. N. No: 8285/

Regd. No.
H. 740

POONAM MONTHLY

AZAMPURA, HYDERABAD-A. P.





محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی

ONTHLY
POONAM
HYDERABAD

پونم

قیمت فی پرچہ ـــــ (۵۰) ـــــ پیسے
زرِ سالانہ ـــــ (۶) ـــــ روپے
ششماہی ـــــ (۳) ـــــ روپے
بیرونِ ہند سے ـــــ (۲۰) ـــــ شلنگ
تاعمر خریداری ـــــ (۱۰۰) ـــــ روپے

★

جلد (۱)
شمارہ (۱۰)

فروری سنہ ۱۹۶۵ء

مدیر
ناصر کرنولی ایم۔اے عثمانیہ

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ پونم
16-7-301.
اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

کتابت:
محمد عبدالسلام خوشنویس

طباعت: اعجاز پرنٹنگ پریس
چھتہ بازار حیدرآباد۔ فون: ۴۱۸۴۳ (۲۵۸۴۳)

مقامِ اشاعت:
ماہنامہ پونم ۱-۳۰۱-۷-۱۶ اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔ اے پی

ترتیب

اداریہ ——— ادارہ ——— ۳

مضامین
میر کے صید نامے ——— ڈاکٹر سلام سندیلوی ——— ۵
مرزا غالب کی ایک غزل ——— ڈاکٹر حکم چند نیّر ——— ۱۲
غبارِ خاطر ——— اقبال جہاں ——— ۱۷

★ ہمارے مسائل ÷ اردو شاعری میں نئے تجربے ——— عمیق حنفی ——— ۲۰

غزلیں
کیفی اعظمی — الطاف مشہدی ——— ۲۳
شاذ تمکنت — مغنی تبسم — ۲۴ ÷ شہریار ÷ راز یوسفی ——— ۲۵
لمعتر نظمی — باواکرشن گوپال مغموم — جوہر صدیقی ——— ۲۶
نیّر نظر — صدیق نظر ——— ۲۷
عتیق تابش — صہبا وحید ——— ۲۸

افسانے
کل آج اور کل ——— نگی انور ——— ۲۹
مارشل ——— نکہت اقبال ——— ۳۶
اُلٹے پیر ——— رئیس نجمی ——— ۴۱

★ لندن کی ادبی و تہذیبی خبریں ÷ کچھ انگریز کے بارے میں ——— وقار لطیف ——— ۴۷

نظمیں
عظمتِ غالب ——— جگر مرادآبادی ——— ۵۰
میں شنکر کا پجاری ہوں ——— سلام مچھلی شہری ——— ۵۱
مستقبل کا شاہکار ——— کرشن موہن
جھاگ ——— مصحف اقبال توصیفی ——— ۵۳
سگریٹ ——— احمد وصی
پُرانی یاد ——— ندا فاضلی
آنکھیں، انگلیاں، دل ——— کیلاش ماہر ——— ۱۴
تفکّر ——— نسیر پروانہ
پیاسی رُوح ——— انتخاب سیّد ——— ۵

★ طنز و مزاح ÷ علامہ نارسا کی وفات حسرت آیات پر ——— بیتاب اندانہ ——— ۶
★ صنم کدے ÷ ۱۹۶۴ء کی فلمیں، ایک تنقیدی جائزہ ——— اعجاز قریشی ——— ۱

★ پُونم میں شائع ہونے والے تمام ادبی، نیم ادبی مواد میں نام، کردار، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی، جس کے لیئے ادارہ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی

اداریہ

اُردو کا مستقبل

گذشتہ سال ماہ اکتوبر میں کُل ہند انجمن ترقی اُردو کانفرنس میں ہوئی تھی جو انجمن کی سابقہ تمام کانفرنسوں کے مقابلہ میں ۔ سے کامیاب رہی ، مختلف صُوبوں سے مندوبین کی بہت بڑی تعداد ں کانفرنس میں شرکت کی ۔ نمایندوں کے علاوہ کانفرنس کے کھُلے ں بیں ہزاروں کی تعداد میں اُردو کے پروانے شریک رہے ، جن کے بں جوش وخروش کے ساتھ شمعِ اُردو پر فِدا ہونے کا جذبہ بھی تھا ۔بان کے تحفظ اور بقا کے اہم مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوص یا اور ایسی قرار دادیں منظور کی گئیں جن کی عملی صُورت گری اُردو ن کے شاندار مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہے ۔ مرکزی انجمن کی کارکردگی ستائش کے ساتھ اس کی مصلحت اندیشی اور دیگر کمزوریوں پر ت مند تنقیدیں بھی ہوئیں ، جن کو انجمن نے وقت کے تقاضوں اور ری بُنیادوں کے پیشِ نظر کھُلے دل سے نہ صرف قبول کیا بلکہ ان ںگذاشتوں کو دُور کرنے کے تعلق سے بعض تعمیری تجاویز بھی منظور کیں ںمیں ایک اہم تجویز یہ بھی تھی کہ مرکزی انجمن کے دستور پر نظرِ ثانی جائے اور اس کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عوام ے رابطہ قائم رکھ سکے ۔ غرض اس کانفرنس کے بعد مرکزی انجمن کے اکین میں جذبۂ عمل کی تیزی آچلی ہے اور ریاستی شاخیں بھی خلوص ر سنجیدگی کے ساتھ سرگرم عمل ہو چکی ہیں ۔ چنانچہ ماہ دسمبر میں آندھرا پردیش ل صُوبائی شاخ کے زیرِ اہتمام اضلاع کی انجمنوں کے نمایندوں اُردو کے بہی خواہوں اور دوستوں کا ایک عظیم اجتماع بھی ہوا ، جس میں ریاست آندھرا پردیش میں اُردو کے مسائل ، حالات اور مشکلات کا مخلصانہ جائزہ لیا گیا ۔ دیگر صُوبائی شاخیں بھی اپنے صُوبائی حالات کی روشنی میں اُردو کو اس کا جائز حق دلانے میں مصروف نظر آرہی ہیں ۔ لیکن ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء کے بعد سے ہندی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے کے نتیجہ میں اُردو زبان کا موقف بے حد کمزور ہو چکا ہے کیونکہ مرکزی حکومت کے اس اقدام کے بعد سے اکثر ریاستوں نے ریاستی کاروبار اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں چلانے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ اس طرح ہندی کے سرکاری زبان قرار پانے سے علاقائی زبانوں کی اہمیت قابلِ لحاظ ہو گئی ہے ۔ بیچاری اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو قومی یکجہتی کی آئینہ دار ہونے کے باوجود اپنی کوئی ریاست نہیں رکھتی ۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ، بقول پروفیسر احتشام حسین ' یہ علاقہ لسانی نقطۂ نظر سے اُردو کا علاقہ نہیں ہے البتہ کشمیر میں اُردو کے لئے کچھ فضا سازگار ضرور ہے ۔ ۲۶ جنوری کے بعد سے رسم الخط کا مسئلہ بھی موضوعِ بحث بنا ہوا ہے ۔ بعض کم فہم اور ناعاقبت اندیش اُردو زبان کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کا مشورہ بھی دے رہے ہیں جو اُردو زبان کو ختم کرنے کے مُماثل ہے ۔ اُردو زبان کا وجود اس کے رسم الخط ہی سے باقی ہے اگر رسم الخط ختم ہو جائے تو اُردو زبان ہندی میں ضم ہو کر رہ جائے گی ۔ اُردو دوستوں اور بہی خواہوں سے ہماری پُرخلوص درخواست ہے کہ وہ رسم الخط کی تبدیلی کا تصور بھی ذہن سے نکال دیں اور انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مکمل تعاون عمل کریں تاکہ حکومت سے ایسے قانونی تحفظات اور مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکے جن سے اُردو زبان کا مستقبل تابناک ہو سکے ۔ اگر وقت کے اس اہم ترین تقاضے کو نظر انداز کر دیا گیا یا اس کے حصول میں سستی اور کوتاہی برتی گئی تو ہماری مشترکہ تہذیب کا یہ انمول سرمایہ فنا ہو جائے گا اُردو زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور اس کے خاتمہ کے ذمہ دار بھی ہم خود ہی ہوں گے ۔

پُونم کا فروری کا شمارہ پیشِ خدمت ہے ۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ اس کے منتخبہ مضامین نظم و نثر کا معیار اپنی روایتی برتری کا آئینہ دار ثابت ہو گا ۔

" اُردو شاعری میں نئے تجربے " کے عنوان کے تحت ہم نے جو

مستقل سلسلہ شروع کیا تھا اب وہ مُناظرہ کی شکل اختیار کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ اور مُراسلہ نگار شاعری کے نئے تجربوں سے بحث کرنے کی بجائے ذاتیات پر اُتر آئے ہیں جو اُردو ادب کی صحت مند قدروں کے بالکل منافی ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرنے والوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ذاتیات سے ہٹ کر خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اُردو شاعری میں نئے تجربوں کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کریں۔ ورنہ ہمیں مجبوراً یہ سلسلہ ختم کردینا پڑے گا۔

صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے نئی کتابوں پر تبصرے گذشتہ تین شماروں سے شائع نہیں کئے جاسکے، جس کا ادارہ کو افسوس ہے۔ آئندہ شماروں میں کتابوں پر تبصرہ کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالی جائے گی۔

——— ادارہ ———

محمد قلی قطب شاہ

دکن میں قطب شاہی خاندان نے اپنے دوسو سالہ دورِ حکومت میں علم و ادب کی جو گراں قدر سرپرستی کی ہے وہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے۔ خصوصاً قطب شاہی خاندان کے پانچویں تاجدار اور شہر حیدرآباد کے بانی شاعر محمد قلی کی خدمات سرزمین دکن کے لئے باعثِ افتخار ہیں۔ چار مینار، مکہ مسجد، دارالشفاء اور دیگر خوبصورت عمارتیں اسی کے تعمیری ذوق کی یادگار ہیں۔ شہر حیدرآباد کی خوبصورتی سے متاثر ہوکر ڈاکٹر گوپال ریڈی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "شاہجہان نے اپنی محبوبہ کی یادگار کے طور پر تاج محل تعمیر کرایا تھا اور محمد قلی نے اپنی محبوبہ بھاگ متی (حیدر محل) سے اُن جیسے پیار اور یادگار کے طور پر یہ عظیم اور جیتا جاگتا شہر چھوڑا ہے"۔ ایک طرف تو محمد قلی کی تعمیر کردہ عمارتیں اس کے تعمیری ذوق کی نشاندہی کرتی ہیں تو دوسری طرف اس کا رنگا رنگ کلیات نہ صرف ایک قادرالکلام شاعر کی غمازی کرتا ہے بلکہ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا مُسلّم ثبوت بھی پیش کرتا ہے۔ محمد قلی نے مختلف مُروّجہ اصنافِ سخن میں بھرپور طبع آزمائی کی ہے اور سچ پوچھئے تو ہر صنفِ سخن کا حق ادا کردیا ہے۔

۱۹۵۸ء سے اب تک ہر سال ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ جس قدر اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے، اس کے لئے وہ مبارکباد کا مستحق ہے ——— اگر ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے اراکین کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہی تو مستقبل قریب میں اس یوم کو حیدرآباد کی تہذیبی زندگی میں ایک کلچرل تہوار کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔

ادارہ

ڈاکٹر سلام سندیلوی
لکچرر شعبۂ اُردو۔ گورکھپور یونیورسٹی

میر کے صید نامے

اُردو شاعری میں ہندوستان کی جغرافیائی کیفیات کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو شاعری کی، منظر نگاری بہت خام ہے۔ اگر قصیدہ گو شعرائے ہندوستان میں بیٹھ کر ایران کی بہار کے نقشے پیش کیے ہیں تو مرثیہ گو شعرانے ہندوستان میں بیٹھ کر عراق کے میدانوں کی مُصوّری کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بغیر دیکھے ہوئے عراق کے ریگستان میں چمن کھلا دیتے ہیں۔ یہی حال زیادہ تر مثنوی نگاروں کا ہے انہوں نے بھی مصر، عرب اور چین کے میدانوں، کھیتوں، پہاڑوں اور سمندروں کی عکاسی ہندوستان میں بیٹھ کر کی ہے اور اس طرح اسپِ تخیل کی جولانی دکھائی ہے۔ لیکن جن مثنوی نگاروں نے ہندوستان ہی کے مناظر کو اپنی مثنویوں میں پیش کیا ہے انہوں نے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے اس کے علاوہ جن شعرا نے منظر نگاری کے سلسلے میں اپنے مشاہدے سے کام لیا ہے انہوں نے نہایت صداقت اور اصلیت کے ساتھ مناظر قدرت کے خدوخال پیش کر دیئے ہیں۔

یہاں ہم کو اُردو شاعری کی منظر نگاری سے بحث نہیں کرنا ہے، بلکہ صرف میر کے صید ناموں کو منظر نگاری کے نقطۂ نظر سے جانچنا ہے۔ میر نے تین صید نامے کہے ہیں۔ سودا نے بھی ایک صید نامہ کہا ہے اس لحاظ سے دونوں شعرا کے صید ناموں کا تقابلی مطالعہ بہت دلچسپ ہوگا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میر نے تین صید نامے کہے ہیں اور سودا نے ایک۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ سودا تین صید نامے کہتے اور میر ایک۔ کیونکہ سودا خارجیت کے شاعر ہیں اور میر داخلیت کے۔ اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ سودا کے مقابلے میں میر نے صید ناموں میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اگرچہ زیادہ کامیاب سودا کو ہونا چاہیئے کیونکہ سودا خارجیت کے شاعر کے علاوہ ایک شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ان کے مقابلہ میں میر ایک غمگین انسان تھے۔ جس کا "سینہ تمام چاک" اور "سارا جگر داغ" ہو اس کو نظارۂ کائنات اور فضائے چمن سے کیا تعلق۔ وہ تو اپنے گلشنِ دل ہی کے نظارے میں مصروف رہے گا جو شاعر کسی محل سرا میں کئی سال تک رہے اور اس کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ اس کی پشت میں کوئی باغ بھی ہے وہ کوہ و صحرا کے مناظر سے کیا لُطف اندوز ہوگا، وہ تو اپنی غزلوں ہی کے پچھڑے پرانے مسودوں

کے باغ کی فکر میں لگا رہے تھا، ایسے شاعر کو جنگل اور شکار سے کیا واسطہ۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کوہ و صحرا کی منظر کشی میں یہ "پراگندہ روزی پراگندہ دل" شاعر سوداؔ پر سبقت لے گیا۔

ڈاکٹر زورؔ نے بھی میرؔ کی اس کامیابی کو اپنے ایک مضمون "نواب آصف الدولہ کا شکار اور میرؔ و سوداؔ" میں تسلیم کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"نواب آصف الدولہ کے شکار سے متعلق میرؔ نے مثنویوں کی شکل میں کئی صید نامے لکھے ہیں، اس کے برخلاف سوداؔ کی مثنویوں میں ایک ہی صید نامہ پایا جاتا ہے جو اظہار موضوع کے لحاظ سے بھی میرؔ کے صید ناموں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ سوداؔ ــــ وہ سوداؔ جو اس میدان میں میرؔ سے سبقت لے جایا کرتے تھے اس موقع پر کیوں کر ان سے پیچھے رہ گئے۔"[1]

میرؔ کی اس حیرت انگیز کامیابی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنے اس مضمون میں میرؔ کی کامیابی کے اسباب سے بھی بحث کی ہے انہوں نے میرؔ کی کامیابی کے جو اسباب بتائے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ میرؔ نے صید ناموں کی طرف خاص طور سے توجہ کی، سوداؔ نے اپنا صید نامہ زیادہ توجہ کے ساتھ نہیں لکھا۔

۲۔ اس کا امکان ہے کہ سوداؔ نے میرؔ کے صید ناموں سے متاثر ہو کر اپنا صید نامہ لکھا ہو۔

۳۔ سوداؔ نے اپنے قصیدوں میں زورِ قلم دکھایا تھا۔ میرؔ، سوداؔ کے مقابلہ میں قصیدہ گوئی میں پست تھے، اس لیے میرؔ نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ صید نامے لکھ کر اس کمی کو پورا کریں۔

۴۔ ممکن ہے کہ میرؔ نے کسی بڑے انعام کی توقع میں ایسے کامیاب صید نامے لکھے ہوں۔

ڈاکٹر زورؔ نے میرؔ کی کامیابی کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ قابلِ غور ہیں۔ انہوں نے پہلی بات بالکل صحیح کہی ہے کہ میرؔ نے صید ناموں کی طرف کافی توجہ کی ہے .... اور انہوں نے اپنے صید نامے کافی کاوش سے کہے ہیں۔ میرؔ کے مقابلہ میں سوداؔ نے اپنا صید نامہ کسی خاص توجہ کے ساتھ نہیں کہا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے اس بیان سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کا دوسرا سبب قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ سوداؔ کا میرؔ سے متاثر ہو کر صید ناموں کی تخلیق کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ سوداؔ کے انتقال (۱۱۹۵ھ) کے بعد میرؔ لکھنؤ (۱۱۹۷ھ) پہونچے ظاہر ہے کہ میرؔ نے سوداؔ کے بعد صید نامے کہے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نے تیسرا سبب میرؔ کی کامیابی کا یہ بتایا ہے کہ میرؔ نے چونکہ قصیدے بہت کم کہے ہیں اور جو کچھ کہے ہیں وہ سوداؔ کے قصائد سے پست ہیں۔ اس لیے انہوں نے قصائد کی کمی کو صید ناموں کی تخلیق کر کے پوری کی۔ ڈاکٹر زورؔ کے بیان سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ میرؔ کو قصیدہ کہنے کا شوق تھا مگر وہ کہنے سے معذور تھے میں سمجھتا ہوں کہ میرؔ کو قصیدہ گوئی سے بہت کم رغبت رہی ہے بلکہ وہ ہمیشہ عرفی کی طرح قصیدہ گوئی کو "کارِ ہوس پیشگاں" سمجھتے رہے ہیں اور "قبیلۂ عشق" کے ایک رُکن کی حیثیت سے غزل گوئی کو اپنا وظیفہ گردانتے رہے ہیں۔ میرؔ جیسا بددماغ شاعر کسی دوسرے کی توصیف خلوصِ دل سے کیونکر کر سکتا ہے۔ میرؔ کا تو یہ قول ہے:

مجھ کو دماغِ وصفِ گُل و یاسمن نہیں
میں جُوں نسیم بادہ فروشِ چمن نہیں

---

[1] مضمون "آصف الدولہ کا شکار اور میرؔ و سوداؔ"۔ ڈاکٹر زورؔ۔ مطبوعہ "زبان" کاٹھیاوار۔ جنوری ۱۹۲۶ء

اس شعر کا کہنے والا قصیدہ گوئی کو اپنے لیئے باعثِ فخر نہیں سمجھے گا اور قصیدہ نہ کہنے پر اظہارِ تاسف بھی نہیں کرے گا اور نہ اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرے گا۔

ڈاکٹر زور نے میر کی کامیابی کا جو تھا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ممکن ہے کہ میر نے "کسی بڑے انعام" کے لالچ میں اچھے صید نامے کہے ہوں۔ میر کی ساری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے کبھی سیم و زر سے محبت نہیں کی۔ میر کی طبیعت میں قناعت، درویشی اور بے نیازی گہرائی تک داخل ہو چکی تھی، یہ سب اُن کے والد اور ان فقرا کی صحبت کا فیض تھا جن کے سایۂ عاطفت میں انہوں نے اپنا بچپن گذارا تھا، اسی تعلیم و تربیت کا اثر ہے جس کی بنا پر میر کہتے ہیں ؎

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

بہرحال ڈاکٹر زور نے میر کی کامیابی کے جو اسباب بتائے ہیں ممکن ہے کہ وہ کسی حد تک درست ہوں مگر میر کی کامیابی اور سودا کی ناکامی کا اصل سبب کچھ اور ہے، سودا غالباً نواب آصف الدولہ کے ہمراہ شکار پر نہیں گئے تھے، اس لیئے انہوں نے کوہ و صحرا کے مناظر اپنے قیاس پر پیش کیئے ہیں۔

اگرچہ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ سودا اس مخصوص شکار میں آصف الدولہ کے ہمراہ تھے کہ نہیں مگر مولانا آزاد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سودا اُس شکار میں نواب آصف الدولہ کے ہمراہ نہیں تھے۔ جس میں انہوں نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا تھا مولانا آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں:

"آصف الدولہ ایک دفعہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا باوجودیکہ سودا انعام و اکرام کے انبار سے زیربار تھے مگر فوراً کہا:

یارو یہ ابنِ ملجم پیدا ہوا دوبارا
شیرِ خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا [1]

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سودا کو خبر ملی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا ہے۔ اس خبر کو سُن کر سودا نے یہ شعر کہا۔ بہت ممکن ہے کہ نواب آصف الدولہ جب بہرائچ اور کوہِ شمالی کی طرف یا کسی اور جنگل میں شکار کرنے گئے ہوں تو اس کے حالات بھی سودا نے سُنے ہوں اور سُنے ہوئے بیانات کی بنا پر انہوں نے صید نامہ کہہ ڈالا ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہو سودا کے صید نامے سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ آصف الدولہ کے ہمراہ سودا شکار میں موجود تھے۔ اس لیئے سودا کے صید نامہ میں حقیقت اور اصلیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی شکایت شیخ چاند کو بھی سودا سے ہے وہ فرماتے ہیں:

"اس مثنوی میں موقع تھا کہ مناظر اور راستوں وغیرہ کی تصویریں دکھائی جاتیں، جانوروں کی خصوصیتیں بتائی جاتیں، اسلحۂ شکار کا ذکر کیا جاتا اور نواب کے شکار کرنے کے طریقوں کو وضاحت سے بیان کیا جاتا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی باتیں تفصیل طلب تھیں لیکن چونکہ شاعر کا مدعا محض تعریف تھا اس لیئے وہ اس سے آگے نہ بڑھا۔" [2]

سودا اس سے آگے بڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے جنگل کے مناظر خود نہیں دیکھے تھے اس لیئے آصف الدولہ کی مدح سرائی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس نکتہ کی طرف ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی نے بھی اشارہ کیا ہے:

"لیکن عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ شکار میں سودا کی نظریں نہ تو مناظر پر پڑتی ہیں اور نہ شکار کی

---

[1] آبِ حیات، مولانا آزاد، مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ص ۲۰۶ ؛ [2] سودا۔ شیخ چاند۔ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد ص ۲۳۴

تفصیلات پر جن کا تعلق نیچر شاعری سے ہو سکتا ہے۔
شاید اس لیئے کہ خود اس راستے سے ناواقف تھے،
بے دیکھے خیالی مصوری کو نامناسب سمجھا اور شکار سے
زیادہ ممدوح کی تعریف میں نغمہ سرائی سے کام لیا۔" [1]

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی کا یہ خیال صحیح ہے کہ سودا نے بے دیکھے خیالی مصوری کو نامناسب سمجھا، یعنی سودا نواب آصف الدولہ کے ہمراہ شکار میں نہیں تھے اس لیئے وہ جنگل کے صحیح مناظر پیش نہیں کر سکے۔ اس لحاظ سے سودا کا یہ صید نامہ فرخی کے اس قصیدے سے ملتا جلتا ہے جو اس نے داغ گاہ کی تعریف میں کہا ہے۔ فرخی کو خواجہ عمید اسعد نے زبانی بتایا کہ ابوالمظفر چغانی کے داغ گاہ کا نقشہ اس طرز پہ ہے۔ اور فرخی نے اس نقشہ کے بموجب داغ گاہ کی تصویر کھینچ دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرخی کے قصیدہ میں لطفِ زبان اور حسنِ بیان کی خوبیاں موجود ہیں مگر قدم قدم پہ "شنیدہ" اور "دیدہ" کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ یہی "شنیدہ" اور "دیدہ" کا فرق سودا کے صید نامہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ سودا کے صید نامہ کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ قیاسی اور تخیلی ہے۔ اور میر کے صید ناموں کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ قیاسی اور تخیلی نہیں ہیں۔ بلکہ اصل مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میر بذات خود آصف الدولہ کے ہمراہ شکار کو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی موجودگی کا ذکر "ذکر میر" میں کیا ہے ان کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"ایں جا فقیر با نواب عالی منزلت است۔ در دعا گوئی ایشاں بسر می کند۔ بندگانِ عالی برائے شکار تا بہرائچ رفتند۔ من در رکاب بودم۔ شکار نامہ موزوں نمودم۔ بارے دیگر باز برائے شکار سوار شدند۔ تا دامن کوہ شمالی تشریف بردند۔ اگرچہ مردمان از نشیب و فراز ایں سفر دُکھ و درد از سخت خوردند لیکن شکار چنیں نہ دیدہ بودند۔ بعد از سہ ماہ بدار القرار خود آمدند فقیر شکار نامہ دیگر گفتہ بحضور خواند۔ دو غزل از غزلہائے شکار نامہ انتخاب شدہ خود بدولت مخمس کردند بخوبی کہ می بایست و در زمین غزل پسند افتادہ غزل دیگر فرمایش نمودند۔ آں ہم از فضل الہٰی گفتہ شد۔ زبان مبارک بہ تحسین کشادند و داد سخن دری دادند۔" [2]

میر کے اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ میر نواب آصف الدولہ کے ہمراہ شکار کو گئے تھے۔ اس لیئے میر نے سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اسی بنا پر ان کے بیانات خیالی اور فرضی نہیں ہیں بلکہ اصلی اور حقیقی ہیں۔ میر نے اپنی منظر نگاری کی بنیاد تخیل پر نہیں رکھی ہے بلکہ محاکات پر رکھی ہے اور ان کی محاکات کا انحصار ان کے ذاتی مشاہدہ پر ہے۔ میر کی کامیابی کا یہی راز ہے۔

اس خارجی ثبوت کے علاوہ میر کے صید ناموں میں قدم قدم پر داخلی شہادت بھی ملتی ہے۔ جس سے یہ خیال اور بھی راسخ ہو جاتا ہے کہ میر ضرور شکار میں آصف الدولہ کے ہمراہ تھے انہوں نے جنگل اور پہاڑ کے اس قدر واضح نقشے کھینچے ہیں کہ کوئی شاعر بغیر دیکھے ہوئے اس قسم کے نقشے نہیں کھینچ سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر نے اپنے پہلے صید نامے میں سودا ہی کی طرح مختلف جانوروں اور پرندوں کے نام گنائے ہیں۔ چنانچہ بقول میر جنگل میں شیر، پلنگ، نر ہاتھی، چیتا، پاڑا، ارنا، گوزن، گرگ اور شغال وغیرہ موجود تھے۔ ان جانوروں کے نام قیاس پر بھی گنائے جا سکتے ہیں۔ اس لیئے اس بیان کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اس کے بعد میر نے یہ بھی بتایا ہے کہ آصف الدولہ نے تالاب میں جال

---

[1] اُردو کی نیچر شاعری، ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی صفحہ ۱۳۳

[2] ذکرِ میر۔ مرتبہ: عبدالحق۔ طبع اول سنہ ۱۹۲۸ء۔ صفحہ ۱۴۰-۱۴۱

ڈالا' اور مچھلی اور مرغابی وغیرہ کا شکار کیا۔ مگر یہ بیانات بھی قیاسی ہوسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے میر کا صید نامہ اوّل زیادہ اہم نہیں ہے مگر میر کا صید نامہ دوم بہت اہم ہے۔ اس صید نامہ میں مشاہدات کی جھلکیاں بہت صحیح اور واضح ہیں۔ مثلاً میر ایک جنگل کی عکاسی کرتے ہیں:

تو آگے بیابان پُر خار ہے
کہیں جھاڑ بوٹا، کہیں خار ہے
بیابان وحشت اثر پُر خطر
یہی ڈر ہے ڈر کیا اِدھر کیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سُوکھی ہے کانس
اگر سبزہ تھا بھی تو تھوہڑ کا بانس

آخری شعر میں میر نے بتایا ہے کہ جنگل میں دُور تک سُوکھی کانس تھی اور سبزہ کا کہیں پتہ نہیں تھا، البتہ تھوہڑ کے بانس نظر آتے تھے۔ انہیں کو سبزہ سمجھ لیجئے۔ سُوکھی کانس اور تھوہڑ کا بانس کوئی شاعر بغیر جنگل دیکھے ہوئے مشکل ہی سے نظم کرسکتا ہے

اس شکار کے دَوران میں بارش ہونے لگی۔ میر نے بارش کا نقشہ نہایت واضح الفاظ میں کھینچا ہے۔

پہروں سے بارش لگی ہونے زور
رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اُوپر حباب
سب اسباب لوگوں کا تھا زیر آب
نہ پُوچھو اور اسباب مردم کا حال
نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا
اگر فرش و بستر تھا پھیلا ہوا

میر نے بتایا ہے کہ پہروں سے بارش زوروں سے ہونے لگی۔ وقت کا تعین میر نے جس انداز سے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ میر واقعی آصف الدولہ کے ہمراہ شکار میں تھے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ سارے خیمے پانی میں ڈوب کر حباب بن گئے اور سارا اسباب زیر آب آگیا۔ یہ واقعہ بھی مشاہدہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

میر نے یہ بھی بتایا ہے کہ بارش کے بعد سردی بڑھ گئی یہ بات بھی بالکل فطری ہے۔ میر نے سردی کے جو اثرات دکھائے ہیں وہ تجربات کی روشنی میں بالکل سچے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ میر بذات خود جنگل میں موجود تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ہُوا سرد از بس ہوئی ایک بار
کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار
پھرے باد سے لوگ مُنہ ڈھانپتے
مگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار
ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار

میر بیان کرتے ہیں کہ ہُوا ایسی سرد ہوگئی تھی کہ کلیجوں سے برچھی کی طرح پار ہوجاتی تھی۔ سردی کی شدت سے لوگ شکار کرنا بھول گئے۔ یعنی یہ حال ہوا کہ "یاراں فراموش کردند عشق"۔ یہ ساری باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد میر فرماتے ہیں۔

برس مینھ دو دن میں کھل بھی گیا
ولیکن ہے کُہرا لطیف نیا

دو دن کہہ کر میر نے پھر وقت کا تعین کردیا۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ میر ایک اصل واقعہ بیان کررہے ہیں دو دن کے بعد پانی برسنا موقوف ہوگیا۔ مگر پھر چاروں طرف کُہر چھاگیا، میر نے یہاں بھی اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔

دو دن کے بعد پھر شکار کا آغاز ہوا۔ شاہی فوج ایک جنگل پر پہونچی۔ وہ جنگل اس قسم کا تھا،

درختان بے برگ و بَر بد نُما
نہ اِک شاخ پر مُرغِ رنگیں نوا

بہت سر بلائے بہم تھے شجر
ولیکن نہ پایا کسوں نے ثمر
نہ قمری ہوئی نالہ پرواز تک
نہ بُلبل کی واں آئی آواز تک

میر نے درختوں کو تر و تازہ اور پُر ثمر نہیں دکھایا ہے اگر میر تخیل سے کام لیتے تو درختوں کو سرسبز و شاداب دکھاتے مگر میر نے اپنے ذاتی مشاہدات پیش کیئے ہیں، اسی لیئے درختوں اور شاخوں کو ویران دکھایا ہے۔ یہ ویرانی سخت سردی کی وجہ سے تھی۔

اس جنگل کی چند اور جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

فقط خار بن کیا کپڑ پہاڑ تھا
کہ بُوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا
چلو ہے چلو ہے، یہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں
نہ ٹوٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں
مگر پچھلے پاؤں ہی رہرو ہٹیں
قیامت نمودار ہر ہر قدم
چلے کوئی کیا سر پہ رکھ کر قدم
کہیں بچ کے نکلے کہیں جھک چلے
کہیں مضطرب تھے کہیں رُک چلے

ان اشعار میں میر نے جنگل کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ صرف کانٹے ہی کپڑ پہاڑ نہیں تھے بلکہ وہاں کا بوٹا بُوٹا جھاڑ جھنکاڑ کے مانند تھا۔ کسی پہاڑی جنگل کی اس سے بہتر مُصوری ممکن نہیں ہے۔ اس جنگل کے درخت اتنے بھاری بھرکم تھے کہ وہ لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے، نہ سرکتے تھے اور نہ کاٹے جاسکتے تھے۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ لوگ اُلٹے پاؤں پلٹ جائیں، لیکن جو لوگ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے تو وہ کہیں بچ کر نکلتے تھے اور کہیں جھک کر چلتے تھے۔ جن لوگوں نے پہاڑی کے جنگل دیکھے ہیں وہ میر کے بیان کی صداقت کو محسوس کرسکتے ہیں۔

میر کا مندرجہ ذیل شعر تو اصلیت اور حقیقت کی سچی تصویر ہے

شجر سر کشیدہ بہت کیا کہوں
جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

بعض درخت واقعی اِتنے اُونچے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی چوٹی کو دیکھنے کی کوشش کی جائے تو سر سے ٹوپی یا ہیٹ گر ہی پڑیگا میر چونکہ پگڑی باندھتے تھے اس لیئے انہوں نے جب اُونچے درخت کی طرف نظر اُٹھائی تو ان کو اپنی پگڑی سنبھالنی پڑی۔ یہ شعر تو اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ میر جنگل میں بذاتِ خود موجود تھے۔

میر کا صید نامہ سوم بھی شکار میں ان کی موجودگی کا ثبوت مُہیّا کرتا ہے۔ یہ صید نامہ بھی تخیل پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں محاکات کی حسین جھلکیاں موجود ہیں۔ میر کہتے ہیں؛

شُتر مرغ سیمرغ از بس ہراس
نہیں آتے کوہ شمالی کے پاس

کوہ شمالی کا ذکر میر نے بغیر دیکھے نہیں کیا ہے۔ دوسرے مصرعے سے واضح طور پر مقامیت کا اظہار ہوتا ہے۔ صید نامہ سوم میں میر ایک جگہ جنگل کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

عجب راہ پُر خوف مُشکل گذار
نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار
گڑھے، غار، پاؤں کی لغزش بلا
چلے جاؤ تو جوں کی لرزش بلا

چونکہ پہاڑی راستے اُونچے نیچے ہوتے ہیں اسی لیئے ہاتھی سوار بھی بعض اوقات نظر نہیں آتے تھے۔ پاؤں کی لغزش کا ذکر میر نے اپنے تجربہ کی بنا پر کیا ہے۔ پہاڑ پر چلنے والے محسوس کرسکتے ہیں کہ پہاڑ پر چلنا آسان نہیں ہے۔ بار بار پاؤں لڑکھڑاتے ہیں اور بار بار یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی کھڈ میں گرے تو ہڈی پسلی کا پتہ نہیں چلے گا۔ منظر نگاری کے اعتبار سے میر کا

صیدنامہ سوم بھی بہت کامیاب ہے۔

میر کے صیدناموں کو پڑھ کر ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ میر نے ان میں جو مناظر پیش کیے ہیں وہ صحت اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان بیانات میں فرضی نقشے نہیں ہیں بلکہ ان صیدناموں کی ساری تصویریں مشاہدات کی روشنی میں کھینچی گئی ہیں۔ دراصل مناظر قدرت کی عکاسی کے لیے ذاتی مشاہدہ بہت ضروری ہے۔ اسی ذاتی مشاہدہ کی بنا پر میر نے صیدناموں کی عکس کشی میں کامیابی حاصل کی ہے۔ میرے ان صیدناموں کے مطالعہ کے بعد ہم ایک نتیجہ اور بھی اخذ کرسکتے ہیں۔ اگر میر خارجی مناظر کی عکاسی کرتے اور خارجیت کو بھی اپنا موضوع قرار دیتے تو وہ داخلی جذبات کے ترجمان کے علاوہ خارجی مناظر کے ایک کامیاب مُصوّر بھی ہوتے، اسی طرح ان کی شاعری میں خارجی اور داخلی جھلکیوں کی دُھوپ چھاؤں ہم کو نظر آتی۔ یہ دُھوپ چھاؤں اُردو شاعری میں ایک حسین اضافہ کرسکتی تھی۔

حکم چند نیّر
ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

مرزا غالب کی ایک غزل

دو ڈھائی برس اِدھر کی بات ہے کہ غالب اکاڈمی کے زیرِ اہتمام رسالہ مرال کے ارکان نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس میں ایک ادبی اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔ یہ اجتماع کئی خصوصیات کا حامل تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ غالبؔ اور ناگری پرچارنی سبھا بنارس کا یہ ملاپ گویا قران السعدین تھا۔ دیگر یہ کہ غالب کا یومِ وفات تو منایا جاتا ہے لیکن یہاں غالبؔ کا یومِ ولادت منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسے کی صدارت سنٹرل ہندو کالج، بنارس ہندو یونیورسٹی کے پرنسپل ڈاکٹر برج موہن صاحب کر رہے تھے۔ اس جلسے میں غالبؔ کی حیات، شخصیت اور کلام سے متعلق مقالے پڑھے گئے۔ مرزا غالب کے بنارس میں ورود و قیام اور اُن کے میزبان کے شجرۂ نسب سے متعلق ایک معلومات افزا تقریر خیر بہوروی صاحب نے کی تھی، کچھ شعراء نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں ایک صاحب نے بڑی پُرسوز لے میں ایک غزل شروع کی۔ آلاتِ موسیقی کا انتظام بھی کیا گیا تھا صفی مرحوم کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آ گیا۔ شاید مرحوم نے کسی ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا ؎

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

غزل اچھی تھی۔ مُطرب کی فنکارانہ مہارت، خوش گلوئی اور آلاتِ موسیقی کی شرکت نے ایک نوع کا کیف پیدا کر دیا۔ محفلِ سماع کا سماں بندھ گیا تھا۔ ہم سب اس سے لُطف اندوز ہو رہے تھے کہ مقطع نے یکایک چونکا دیا کیونکہ غزل، غالبؔ سے منسوب تھی۔

جہاں تک مجھے یاد تھا، یہ غزل غالبؔ کے کسی مطبوعہ دیوان میں شامل نہ تھی۔ اس امر نے آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا۔ محفل برخاست ہوئی تو میں نے مُغنّی سے کچھ استفسارات کیئے انہوں نے بتایا کہ اُن کا نام محمد ایوب خاں معروف بہ ببّن دیوانہ ہے۔ محلہ شورگراں اجمیر شریف کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت کراچی سے آ رہے ہیں۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ چاند خاں اور برخوردار خاں کا شمار ہندوستان کے مشہور موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ ان میں سے

اوّل الذکر شاعر تھے اور چاند پیا تخلص کرتے تھے۔ اُن کی تصنیف کردہ ٹھمریاں آج بھی ہندوپاک کے مغنی بڑے شوق اور فخر سے گاتے ہیں۔ غزل کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ انہیں اپنے خاندان کی ایک قدیم بیاض کے منتشر اوراق میں درج ملی ہے۔ اس ضمن میں راقم نے اور کئی سوالات کیئے، مثلاً یہ کہ بیاض کا مُرتب کون تھا۔ اُن کا مرزا غالب سے کوئی تعلق تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ اگر نہیں تھا تو اُن کو یہ غزل کیسے اور کہاں سے دستیاب ہوئی؟ وہ بیاض یا اُس کے منتشر اوراق اب موجود ہیں، موجود ہیں تو کس کے قبضے میں ہیں اور اگر موجود نہیں تو کہاں گئے؟ انہوں نے بتایا کہ اُن کے خاندان کے کچھ افراد تقسیمِ مُلک کے بعد پاکستان چلے گئے ہیں اس لیئے وہ ان سوالات کا سرِدست کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ممکن ہے کہ تحقیق کے بعد وہ ان اُمور پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔ میں نے کچھ دنوں کے انتظار کے بعد اُن کو دو تین خطوط لکھے لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس دوران میں مجھے تعلیم و تعلّم کے سلسلے میں امریکہ جانا پڑا جس سے بات آئی گئی ہوگئی۔ حال میں واپس آیا اور اپنے کچھ پُرانے کاغذات دیکھ رہا تھا تو وہ کاغذ مِل گیا جس پر میں نے متذکرہ بالا غزل لکھی تھی۔ اس نے وہ پُرانی یاد تازہ کردی۔ غزل اور اس کے مُصنف کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے اس غزل سے لُطف اندوز ہوئیے۔

ہر جُستجو عبث جو تری جُستجو نہ ہو
دل سنگ و خشت ہے جو تری آرزُو نہ ہو

وہ آہ رائیگاں ہے نہ لگ جائے جس سے آگ
اُن آنسوؤں پہ خاک کہ جن میں لُہو نہ ہو

ممکن نہیں ہے حُسنِ حقیقت کا دیکھنا
آئینۂ مجاز اگر رُو برُو نہ ہو

بے کیف بادۂ ہیچ ہے، بے رنگ گُل فضول
وہ حُسن کیا کہ جس میں حقیقت کی بُو نہ ہو

جی بھر کے خُوب حسرت و ارماں کو رو چکا
اب آرزُو یہ ہے کہ کوئی آرزُو نہ ہو

غالب نمازِ عشق کی مقبولیت محال
جب تک کہ اپنے خُونِ جگر سے وضو نہ ہو!

یہ غزل غالب کی ہے یا نہیں، موجودہ صُورت میں کسی ایک اَمر کو بُنیاد بنا کر کوئی آخری اور حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ یہ غزل غالب کی بھی ہو سکتی ہے اور الحاق و اتصال کا کارنامہ بھی۔ اس لیئے مناسب ہوگا کہ ہر دو پہلو پیش کر دینے جائیں تاکہ غالب کے نقاد اور اہلِ تحقیق صحیح فیصلہ کر سکیں۔

یہ مُسلّم ہے کہ مرزا نے اوائلِ مشقِ سخن میں طرزِ بیدل کو اپنا رہنما بنایا تھا اور بڑی جانکاہی اور جگر کاوی سے ریختہ کہا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کی یہ جگر کاویاں بعض اوقات کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق ہو کر رہ جاتی تھیں۔ جس سے معاصرین کی خوردہ گیری اور طعن و تعریض کی نوبت "مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا جانے" تک جا پہونچی۔ کہنے کو تو مرزا نے کہہ دیا کہ ع

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

لیکن ان اعتراضات اور خود اُن کی سلامتی طبع نے اُنہیں طرزِ بیدل کو ترک کرنے اور اپنے کلام کا انتخاب کرنے پر آمادہ کر دیا۔ یُوں تو اپنے کلام کا انتخاب کرنے کا کام ہر شاعر کے لیئے دشوار ہوتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کے لیئے یہ کام دشوار تر تھا۔ اس لیئے کہ انہیں اپنے بیشتر جگر پاروں کو نظری کر دینا تھا۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور قابلِ ذکر ہے کہ انتخاب کرتے وقت مرزا نے جو غزلیں کاٹ دیں اگر اُن میں سے کوئی غزل شگفتہ و شیریں بحر اور پسندیدہ ردیف

قوانی میں تھی تو مرزا نے بعد میں اپنے نئے رنگ میں کچھ اشعار اسی بحر اور ردیف و قوانی میں کہہ کر اپنے منتخب دیوان میں شامل کیے ہیں۔ بعض اوقات اضافہ کردہ اشعار کی تعداد پہلی غزل کے اشعار سے بڑھ گئی ہے۔ اور کبھی کبھی نیا مقطع اور مطلع کہہ کر دو غزلہ بنا دیا ہے۔ دو تین مثالوں پہ اکتفا کروں گا۔

دیوانِ غالب نسخہ بھوپال میں ردیف الف میں ایک غزل ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

بے دلی ہائے اسدؔ افسردگی آہنگ تر
یادِ ایامے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا

مرزا نے اس میں گیارہ شعروں کا اضافہ کیا ہے یا بالفاظ دیگر ایک نئی غزل کہی ہے اور مقطعے میں اپنا نیا تخلص غالب نظم کیا ہے۔

بس نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کی سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

اسی بحر میں ایک غزل اور ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بیکسی
دِل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

اس زمین میں اضافہ شدہ اشعار کی تعداد پانچ ہے جن میں مقطع بھی شامل ہے ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

ذیل کی غزل بھی اسی نوع کی ہے۔

فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کُشتن میں
ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم جوہر تیغِ دشمن میں

اسی بحر میں مرزا نے سات اشعار اور کہے ہیں جن میں یہ مطلع بھی شامل ہے ؎

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور میرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

دیوانِ غالب کے نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی میں جو اس نودریافت غزل کی زمین اور ردیف و قوانی میں ہے اور یقینی طور پر مرزا غالب کے ابتدائی دورِ شاعری کی تخلیق ہے۔ کیونکہ اس کا رنگ و آہنگ طرزِ بیدل میں کہے ہوئے کلام کا سا ہے۔ اور اس میں مرزا کا تخلص غالب نہیں بلکہ اسدؔ نظم ہوا ہے۔

بے دردِ سر بسجدۂ اُلفت فرو نہ ہو
جُوں شمع غوطہ داغ میں کھا، گر وضو نہ ہو

دِل دے کفِ تغافلِ ابروئے یار میں
آئینہ ایسے طاق میں گم کر کہ تُو نہ ہو

زُلفِ خیال و نازک و اظہار بیقرار
یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

تمثالِ نازِ جلوۂ نیرنگِ اعتبار
ہستیٔ عدم ہے آئنہ گر رُو برُو نہ ہو

عرضِ نشاطِ دید ہے مژگانِ انتظار
یارب کہ خارِ پیرہنِ آرزو نہ ہو

واں پرفشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بُو نہ ہو

٭

دیوانِ غالب، نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی میں مندرجہ بالا غزل کی موجودگی سے اس قیاس کو مزید تقویت پہونچتی ہے کہ انتخاب کے وقت مرزا غالب کو اس غزل کی بحر اور ردیف قوانی پسند آئے اور انہوں نے اسی زمین میں زیرِ بحث غزل کہی۔ لیکن اب تک موجودہ محققین کی دسترس سے باہر رہی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مرزا غالب کثیر الاحباب تھے۔ اُن کے شاگردوں اور ممدوحوں کا دائرہ بھی وسیع تھا۔ اُن کے دوست، عزیز، شاگرد اور ممدوح اُن سے تازہ کلام کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔ اور مرزا حتی الامکان ایسی فرمائشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے غزل یا اشعار کا مسودہ اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ فرمائش کنندہ کو اس کلام کو [illegible]

لکھ دیا۔ نواب علاؤ الدین خاں علائی کو لکھتے ہیں کہ :

"تم نے اشعار جدید مانگے۔ خاطر تمہاری عزیز ایک مطلع اور دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخل دیوان بھی نہیں۔ اُن پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی غزل، تم کو بھیجتا ہوں۔ بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رُتبہ نہیں ..... لو صاحب فرمان قضا توامان بجالایا۔ مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں۔ اگر باحتیاط رکھو گے اور اُردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھا دو گے تو اچھا کرو گے۔"

علاوہ ازیں مختلف تذکروں، بیاضوں، یادداشتوں اور خطوں سے تحقیق و تفتیش کی بدولت غالب کا بہت سا کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ عرشی صاحب نے دیوان غالب میں (۲۱۴) صفحات پر مشتمل ایک جزو کا عنوان "یادگار نالہ" قائم کیا ہے۔ اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"اس جزو میں وہ کلام رکھا گیا ہے جو دیوان غالب کے کسی نسخے کے متن میں تو نہ تھا۔ لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں یا خاتمے میں یا مرزا صاحب کے خطوں کے اندر یا اُن کے نام سے دوسروں کی بیاضوں میں پایا گیا اور وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپ کر اہل ذوق تک پہنچ چکا تھا۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا بہت سا کلام [illegible] کے پاس تھا اور یہ کلام مرزا غالب کے دیوان کے کسی نسخہ [illegible] نہ تھا۔ ممکن ہے کہ مرزا نے کچھ کلام اپنے احباب [illegible] [illegible]

ابھی تک محققین کی دسترس سے باہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زیر بحث غزل مرزا کے ایسے ہی کلام میں سے ہو۔

زیر بحث غزل کی ترکیبیں اور بندشیں چست و سلیس ہیں۔ زبان اور لب و لہجہ میں ایک مخصوص قسم کی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ خیالات میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں۔ انداز بیان بھی دلکش ہے۔ اِن خصوصیات کے لحاظ سے یہ غزل مرزا غالب کے جدید کلام سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔

اِن دلائل و حقائق کے پیش نظر زیر بحث غزل کو کلام غالب مان لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھے بغیر فیصلہ نہ کیا جائے۔ مشاہیر شعرا کے کلام میں خلط ملط اور الحاق و انتحال کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔ اُردو ادب میں اس کی مثالیں کم یاب لیکن نایاب نہیں۔ شیخ چاند مرحوم نے اپنی کتاب "سودا" سودا کی کلیات میں بہت سے الحاقی کلام کی نشاندہی کی ہے۔ ذوق اور دیگر شعرا کے کلام میں بھی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں مرزا غالب کا کلام بھی الحاق و انتحال کی زد سے محفوظ نہیں رہ۔ مالک رام صاحب کے مرتبہ دیوان غالب میں ایک غزل درج جس کا مقطع یہ ہے ؎

پیرانہ سال غالب اے کشش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

عرشی صاحب اس غزل کو غالب کی غزل مانتے ہیں [illegible]
لیکن [illegible] دیوان غالب [illegible] شامل کر دیا [illegible]
[illegible]

لے بحوالہ دیوان غالب۔ مرتبہ عرشی [illegible]
ک انسٹ [illegible] دلی، [illegible]

قوافی میں تھی تو مرزا نے بعد میں اپنے نئے رنگ میں کچھ اشعار اسی بحر اور ردیف و قوافی میں کہہ کر اپنے منتخب دیوان میں شامل کیے ہیں۔ بعض اوقات اضافہ کردہ اشعار کی تعداد پہلی غزل کے اشعار سے بڑھ گئی ہے۔ اور کبھی کبھی نیا مقطع اور مطلع کہہ کر دو غزلہ بنا دیا ہے۔ دو تین مثالوں پہ اکتفا کروں گا۔

دیوانِ غالب نسخہ بھوپال میں ردیف الف میں ایک غزل ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

بے دلی ہائے اسدؔ افسردگی آہنگ تر
یاد آیا ہے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا

مرزا نے اس میں گیارہ شعروں کا اضافہ کیا ہے یا بالفاظ دیگر ایک نئی غزل کہی ہے اور مقطع میں اپنا نیا تخلص غالبؔ نظم کیا ہے

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کی سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

اسی بحر میں ایک غزل اور ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بیکسی
دل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

اس زمین میں اضافہ شدہ اشعار کی تعداد پانچ ہے جن میں مقطع بھی شامل ہے ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

ذیل کی غزل بھی اسی نوع کی ہے۔

فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کُشتن میں
ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم جوہر تیغِ دشمن میں

اسی بحر میں مرزا نے سات اشعار اور کہے ہیں جن میں یہ مطلع بھی شامل ہے ؎

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور میرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

دیوانِ غالب کے نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی میں جو اس

تو دریافت غزل کی زمین اور ردیف و قوافی [illegible]
مرزا غالب کے ابتدائی دورِ شاعری کی [illegible]
رنگ و آہنگ طرزِ بیدل میں کہے ہوئے کلام کا سا ہے۔ اور اس [illegible]
مرزا کا تخلص غالب نہیں بلکہ اسدؔ نظم ہوا ہے۔

بے دردِ سر بسجدۂ اُلفت فرو نہ ہو
جُوں شمع غوطہ داغ میں کھا گر وضو نہ ہو
دِل دے کفِ تغافلِ ابروئے یار میں
آئینہ ایسے طاق میں گم کر کہ تو نہ ہو
زُلفِ خیال و نازک و اظہار بیقرار
یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو
تمثالِ ناز جلوۂ نیرنگِ اعتبار
ہستیٔ عدم ہے آئینہ گر رُو برُو نہ ہو
عرضِ نشاطِ دیدہ مژگانِ انتظار
یارب کہ خارِ پیرہنِ آرزو نہ ہو
واں پُرفشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صُبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بُو نہ ہو

⁂

دیوانِ غالب، نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی میں مندرجہ بالا غزل کی موجودگی سے اس قیاس کو مزید تقویت پہونچتی ہے کہ انتخاب کے وقت مرزا غالب کو اس غزل کی بحر اور ردیف و قوافی پسند آئے اور انہوں نے اسی زمین میں زیرِ بحث غزل کہی۔ لیکن اب تک موجودہ محققین کی دسترس سے باہر رہی۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مرزا غالب کثیر الاحباب تھے۔ اُن کے شاگردوں اور ممدُوحوں کا دائرہ بھی وسیع تھا۔ اُن کے دوست، عزیز، شاگرد اور ممدُوح اُن سے تازہ کلام کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔ اور مرزا حتی الامکان ایسی فرمائشوں کو پُورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے غزل یا اشعار کا مسودہ اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ فرمائش کنندہ کو اس کلام کو محفوظ کرنے کے لیے

لکھ دیا۔ [illegible] نقل کر کے لکھتے ہیں کہ:

"تم نے اشعار [illegible] مگر تمہاری عزیز ایک مطلع، صرف دو مصرعے آگے کے لکھے ہوئے یاد آ گئے کہ وہ داخلِ دیوان بھی نہیں۔ اُن پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی غزل، تم کو بھیجتا ہوں۔ بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رُتبہ نہیں .... ر صاحب فرمانِ قضا توامان بجا لایا۔ مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں۔ اگر با احتیاط رکھو گے اور اُردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھا دو گے تو اچھا کرو گے۔"

علاوہ ازیں مختلف تذکروں، بیاضوں، یادداشتوں اور خطوں کی تحقیق و تفتیش کی بدولت غالب کا بہت سا کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب میں (۴۲) صفحات پر مشتمل ایک جزو کا عنوان "یادگارِ نالہ" قائم کیا ہے۔[1] اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[2]

"اس جزو میں وہ کلام رکھا گیا ہے جو دیوانِ غالب کے کسی نسخے کے مَتن میں تو نہ تھا۔ لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں یا خاتمے میں یا مرزا صاحب کے خطوں کے اندر یا اُن کے نام سے دوسروں کی بیاض میں پایا گیا اور وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپ کر اہلِ ذوق تک پہنچ چکا تھا۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا بہت سا کلام دوسروں کے پاس تھا اور یہ کلام مرزا غالب کے دیوان کے کسی نسخے میں درج نہ تھا۔ ممکن ہے کہ مرزا نے کچھ کلام اپنے احباب یا دیگر لوگوں کو بھیجا ہو [illegible] لیکن وہ

ابھی تک محققین کی دسترس سے باہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زیرِ بحث غزل مرزا کے ایسے ہی کلام میں سے ہو۔

زیرِ بحث غزل کی ترکیبیں اور بندشیں چست و سلیس ہیں۔ زبان اور لب و لہجہ میں ایک مخصوص قسم کی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ خیالات میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں۔ اندازِ بیان بھی دلکش ہے۔ اِن خصوصیات کے لحاظ سے یہ غزل مرزا غالب کے جدید کلام سے کافی مُشابہت رکھتی ہے۔

اِن دلائل و حقائق کے پیشِ نظر زیرِ بحث غزل کو کلامِ غالب مان لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھے بغیر فیصلہ نہ کیا جائے۔

مشاہیر شعرا کے کلام میں خلط ملط اور الحاق و اتصال کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔ اُردو ادب میں اس کی مثالیں کم یاب سہی لیکن نایاب نہیں۔ شیخ چاند مرحوم نے اپنی کتاب "سودا" میں سودا کی کلیات میں بہت سے الحاقی کلام کی نشاندہی کی ہے۔ ذوق اور دیگر شعرا کے کلام میں بھی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مرزا غالب کا کلام بھی الحاق و اتصال کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکا مالک رام صاحب کے مرتبہ دیوانِ غالب میں ایک غزل درج ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

پیرانہ سال غالبؔ، مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو!

عرشی صاحب اس غزل کو، غالب کی غزل ماننے میں متامل تھے لیکن پھر بھی انہوں نے دیوانِ غالب میں اسے شامل کر دیا۔ ڈاکٹر گیان چند[4] نے اپنے ایک مضمون "غالب اور بھوپال" میں اس مذاق کا راز افشا کر دیا ہے اور اس الحاقی غزل کے مصنف کا پتہ بھی بتا دیا ہے۔

مرزا کا کلام اُن کی زندگی میں بھی الحاق و انتساب سے محفوظ نہ تھا۔ نواب علاؤالدین خاں علائی کو ۲۴ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک —

۱۔ [illegible] دیوانِ غالب۔ مرتبہ: عرشی، ص: ۲۹۴

۲۔ اُردوئے معلیٰ دہلی، شمارہ ۱، جلد ۱، ص: ۳۰-۹۲

۳۔ دیوانِ غالب۔ مرتبہ: عرشی۔ ص: ۵۳

۴۔ دیوانِ غالب۔ مرتبہ: عرشی۔ ص: ۳۵۶

نا میں تھی تو مرزا نے بعد میں اپنے نئے رنگ میں کچھ اشعار اسی اور ردیف و قوافی میں کہہ کر اپنے منتخب دیوان میں شامل کیے ۔ بعض اوقات اضافہ کردہ اشعار کی تعداد پہلی غزل کے اشعار بڑھ گئی ہے ۔ اور کبھی کبھی نیا مقطع اور مطلع کہہ کر دو غزلہ بنا ہے ۔ دو تین مثالوں پہ اکتفا کروں گا ۔

دیوانِ غالب نسخہ بھوپال میں ردیف الف میں ایک غزل ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

بے دلی ہائے اسدؔ افسردگی آہنگ تر
یاد آیا ہے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا

مرزا نے اس میں گیارہ شعروں کا اضافہ کیا ہے یا بالفاظ دیگر ایک نئی غزل کہی ہے اور مقطع میں اپنا نیا تخلص غالب نظم کیا ہے ۔

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اُس کی سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

اسی بحر میں ایک غزل اور ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بیکسی
دِل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دُنیا جَل گیا

س زمین میں اضافہ شدہ اشعار کی تعداد پانچ ہے جن میں مقطع بھی شامل ہے ؎

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جَل گیا

ذیل کی غزل بھی اسی نوع کی ہے ۔

فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کُشتن میں
ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم جوہر تیغِ دشمن میں

اسی بحر میں مرزا نے سات اشعار اور کہے ہیں جن میں یہ مطلع بھی شامل ہے ؎

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور میرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

دیوانِ غالب کے نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی میں جو اس نو دریافت غزل کی زمین اور ردیف و قوافی میں ہے اور یقینی طور پر مرزا غالب کے ابتدائی دورِ شاعری کی تخلیق ہے ۔ کیونکہ اس کا رنگ و آہنگ طرزِ بیدل میں کہے ہوئے کلام کا سا ہے ۔ اور اس میں مرزا کا تخلص غالب نہیں بلکہ اسد نظم ہوا ہے ۔

بے دردِ سر بسجدۂ اُلفت فرو نہ ہو
جُوں شمع غوطہ داغ میں کھا گر وضُو نہ ہو

دِل دے کفِ تغافلِ ابرُوئے یار میں
آئینہ ایسے طاق میں گُم کر کہ تُو نہ ہو

زُلفِ خیال و نازک و اظہار بیقرار
یارب بیانِ شانہ کشِ گُفتگُو نہ ہو

تمثالِ ناز جلوۂ نیرنگِ اعتبار
ہستیٔ عدم ہے آئینہ گر رُو برُو نہ ہو

عرضِ نشاطِ دیدہ ہے مژگانِ انتظار
یارب کہ خارِ پیرہنِ آرزُو نہ ہو

وَاں پُرفشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صُبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بُو نہ ہو

ﷴ

دیوانِ غالب، نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی میں مندرجہ بالا غزل کی موجودگی سے اس قیاس کو مزید تقویت پہونچتی ہے کہ انتخاب کے وقت مرزا غالب کو اس غزل کی بحر اور ردیف و قوافی پسند آئے اور انہوں نے اسی زمین میں زیرِ بحث غزل کہی ۔ لیکن اب تک موجودہ محققین کی دسترس سے باہر رہی ۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مرزا غالب کثیر الاحباب تھے ۔ اُن کے شاگردوں اور ممدُوحوں کا دائرہ بھی وسیع تھا ۔ اُن کے دوست، عزیز، شاگرد اور ممدُوح اُن سے تازہ کلام کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے ۔ اور مرزا حتی الامکان ایسی فرمائشوں کو پُورا کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے غزل یا اشعار کا مسودہ اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ فرمائش کنندہ کو اس کلام کو محفُوظ کرنے کے لیے

لکھ دیا۔ نواب علاؤالدین خاں علائی کو لکھتے ہیں کہ :

" تم نے اشعارِ جدید مانگے۔ خاطر تمہاری عزیز ایک مطلع، صرف دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے یاد آ گئے کہ وہ داخلِ دیوان بھی نہیں۔ اُن پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی غزل، تم کو بھیجتا ہوں۔ بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رُتبہ نہیں .... لو صاحب فرمانِ قضا توامان بجالایا۔ مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں۔ اگر باحتیاط رکھو گے اور اُردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھا دو گے تو اچھا کرو گے "[1]

علاوہ ازیں مختلف تذکروں، بیاضوں، یادداشتوں اور خطوں کی تحقیق و تفتیش کی بدولت غالب کا بہت سا کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب میں (۴۲) صفحات پر مشتمل ایک جُزو کا عنوان "یادگارِ نالہ" قائم کیا ہے۔ اس کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2] :

" اس جُزو میں وہ کلام رکھا گیا ہے جو دیوانِ غالب کے کسی نُسخے کے مَتن میں تو نہ تھا۔ لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں یا خاتمے میں یا مرزا صاحب کے خطوں کے اندر یا اُن کے نام سے دوسروں کی بیاض میں پایا گیا اور وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپ کر اہلِ ذوق تک پہنچ چکا تھا "

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا بہت سا کلام دوسروں کے پاس تھا اور یہ کلام مرزا غالب کے دیوان کے کسی نُسخے میں درج نہ تھا۔ ممکن ہے کہ مرزا نے کچھ کلام اپنے احباب یا دیگر لوگوں کو بھیجا ہو اور وہ غزل ان لوگوں نے درج نہیں کیا یا درج تو کیا لیکن وہ

ابھی تک محققین کی دسترس سے باہر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زیرِ بحث غزل مرزا کے ایسے ہی کلام میں سے ہو۔

زیرِ بحث غزل کی ترکیبیں اور بندشیں چُست و سلیس ہیں۔ زبان اور لب و لہجہ میں ایک مخصوص قسم کی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ خیالات میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں۔ انداز بیان بھی دلکش ہے۔ اِن خصوصیات کے لحاظ سے یہ غزل مرزا غالب کے 'جدید کلام' سے کافی مُشابہت رکھتی ہے۔

اِن دلائل و حقائق کے پیشِ نظر زیرِ بحث غزل کو کلامِ غالب مان لینے میں تامّل نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھے بغیر فیصلہ نہ کیا جائے۔

مشاہیر شعرا کے کلام میں خلط ملط اور الحاق و انتحال کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔ اُردو ادب میں اس کی مثالیں کمیاب سہی لیکن نایاب نہیں۔ شیخ چاند مرحوم نے اپنی کتاب "سودا" میں سودا کی کلیات میں بہت سے الحاقی کلام کی نشاندہی کی ہے۔ ذوق اور دیگر شعرا کے کلام میں بھی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مرزا غالب کا کلام بھی الحاق و انتحال کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکا مالک رام صاحب کے مرتبہ دیوانِ غالب میں ایک غزل درج ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

پیرانہ سال غالبؔ، مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو !

عرشی صاحب اس غزل کو، غالب کی غزل ماننے میں متامّل تھے لیکن پھر بھی انہوں نے دیوانِ غالب میں اسے شامل کر دیا۔ ڈاکٹر گیان چند[3] نے اپنے ایک مضمون 'غالب اور بھوپال' میں اس 'مذاق' کا راز افشا کر دیا ہے اور اس الحاقی غزل کے مُصنف کا پتہ بھی بتا دیا ہے۔

مرزا کا کلام اُن کی زندگی میں بھی الحاق و انتساب سے محفوظ نہ تھا۔ نواب علاؤالدین خاں علائی کو ۲۰ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک

---

[1] بحوالہ دیوانِ غالب۔ مرتبہ : عرشی۔ ص : ۳۹۴
[2] اُردوئے معلّیٰ دہلی، شمارہ ۱۔ جلد ۱۔ ص : ۳۰-۹۲
[3] دیوانِ غالب۔ مرتبہ : عرشی۔ ص : ۵۳
[4] دیوانِ غالب۔ مرتبہ : عرشی۔ ص : ۳۵۶

ایک خط میں لکھتے ہیں :

" پچاس برس کی بات ہے کہ الہٰی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی تھی۔ میں نے حسب الحکم غزل کہی۔ بیت الغزل یہ ' پلادے اوک سے ساقی ' الخ مقطع یہ ' اسد خوشی سے میرے ہاتھ ' الخ۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کرکے غزل بنالی اور اُس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا، اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔

جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کردیں تو کیا بعید کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مُطربوں نے غلط ملط کر دیا ہو "

زیرِ بحث غزل جس بیاض سے حاصل ہوئی ہے بیاض کا مُرتب مجہُول ہے۔ مرزا غالب سے بظاہر اس کا کوئی تعلق بھی سامنے نہیں ہے۔ مرزا کے خطوط یا دیگر تحریروں میں بھی ایسے کسی شخص کا ذکر نہیں ملتا۔ ان حالات میں تحقیق تفتیش کے بغیر سہل انگاری سے کام لے کر زیرِ بحث غزل کو غالب سے منسوب کر دینا' دانشمندی نہیں کہی جائے گی۔

اقبال جہاں
ایم۔ اے (علیگ)

غبارِ خاطر

ایک مطالعہ

★

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے قلم کی ضیا باریوں سے اُردو ادب کے جن تاریک گوشوں کو منوّر فرمایا ہے — وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ان کے نکرونظر کا نرالا انداز، ان کی تحریر کی بلاغت وفصاحت، ان کے لفظوں کی قوّت ان کے ہمعصروں کی تخلیقات میں تلاش کرنا سعئ لاحاصل کے مترادف ہے۔ مولانا الفاظ سے اسی طرح کام لیتے ہیں جس طرح کہ ایک مصوّر اپنے رنگوں سے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب ایک بہترین اور لطیف آرٹ بن کر رہ گیا ہے اور بقول شخصے "اگر وہ ادیب نہ ہوتے تو یقیناً اپنے زمانے کے بہترین مصوّر ہوتے" ——

یوں تو اُردو ادب میں خطوط کے کئی مجموعے ملتے ہیں لیکن غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مجموعوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں اور شاگردوں کے نام ہیں، لیکن مولانا آزاد کے خطوط ایک ہی شخص نواب صدر یار جنگ کے نام ہیں۔ نیز غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے اور مولانا کے بیشتر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے، قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے زمانے کی یادگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اور مولانا کے اندازِ نگارش میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ لیکن بقول گوپی ناتھ امن —" دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے" چونکہ مولانا آزاد کا دائرۂ علم وفضل غالب کے مقابلے میں وسیع تھا اور مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی اس لیئے ان کے مکاتیب میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں، وہ مکتوباتِ غالب میں کہیں نہیں ملتے اس لحاظ سے مولانا کا مرتبہ غالب سے کسی حد تک بلند نظر آتا ہے۔

چونکہ یہ خطوط شائع کرنے کی غرض سے نہیں لکھے گئے اور نہ ہی یہ مکتوب الیہ تک پہونچتے تھے، اس لیئے ان میں مو

...نگار کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ جدوجہد ...ادی کے سلسلہ میں مولانا کو اگست ۱۹۴۲ء قلعہ احمد نگر جیل میں ...ر بند کر دیا گیا۔ جیل میں وقت گذاری کے طور پر یا یوں سمجھئے کہ اپنے ... بوجھ کو ہلکا کرنے کی غرض سے انہوں نے صدیق مکرم کے نام ...وط لکھنا شروع کیا۔ چونکہ مکتوب الیہ نواب صدر یار جنگ سے ...ے تعلقات، خلوص و محبت اور علم و ادب کی حد تک تھے اسلئے ...ں نے جہاں تک ہو سکے اپنے خطوط میں سیاست کے تذکرے ...گریز کیا ہے۔ چنانچہ ۲۹ راگست ۱۹۴۲ء قلعہ احمد نگر کے ایک ...ذب میں لکھتے ہیں :

"میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔"

...لانا نے اپنے خطوط میں زندگی کے ہر شعبہ پر براہ راست روشنی ...الی ہے اور چونکہ وہ زندگی کے تمام مسائل کا شعور رکھتے تھے ...سلئے انہوں نے فلسفۂ زندگی کو جس پیرائے میں بیان کیا ہے، وہ ...یں کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں :

"ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سایہ سے کام لے لیں، مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں، اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے۔ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی جلوہ فروشیاں کریگی لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈیں۔ اس کی خالی جگہ بھرنے کے لئے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے۔"

مولانا کے علم و فضل کی انفرادیت ان کے ادب پر اتنی ذرہ چھا گئی ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت دشوار مرحلہ ہے۔ 'غبار خاطر' میں بھی مولانا کی انفرادیت کے نقوش جا بجا ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

چند جملے ملاحظہ فرمایئے :

"لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"

مولانا ایک غیرت مند اور خوددار شخصیت کے مالک تھے ان کی خودداری نے ان کے دل میں ایسی قوت برداشت پیدا کر دی تھی جس کے قدم مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت امتحان کے وقت بھی ڈگمگانے نہیں پائے۔ چنانچہ مولانا کی طبع غیور نے حکومت کی اجازت سے اپنی رفیقۂ حیات کا آخری دیدار کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ اسی قوت برداشت نے ان کے دل کو لذت غم کے مزے لینا بھی سکھا دیا اور تکلیفوں اور مصیبتوں کے ہر مرحلے میں ان کے چہرے پر ایک شکن بھی نہیں آئی۔ ہر حالت میں ان کی زندہ دلی برقرار رہی اور ان کا لہجہ کبھی سوگوار نہیں ہوا چنانچہ خود فرماتے ہیں :

"کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے کوئی کانٹوں سے۔ دونوں میں سے کوئی بھی یہ پسند نہ کرے گا کہ تہی دامن رہے۔ جب

جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے تو ہمارے حصہ میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے اُنہوں نے پھول چُن لیے اور کانٹے چھوڑ دیئے ۔ ہم نے کانٹے چُن لیے اور پھول چھوڑ دیئے۔"

چڑیا چڑے کی کہانی کے عنوان سے جو خط مولانا نے لکھا ہے اس سے نہ صرف مولانا کی قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے ، بلکہ کٹر مُلّاؤں اور صوفیوں کے متعلق ان کے نظریات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ مولانا نے جس چڑے کا نام مُلّا رکھا تھا اس کی صفات ملاحظہ فرمائیے :

" ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے ۔ جب دیکھو زبان چل رہی ہے ، سر اُٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا ہے ، جو بھی سامنے آجائے دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہے گا کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلے میں قدم رکھ سکے ..... فرمائیے ، اگر اس کا نام مُلّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا ۔"

صوفی کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں :

" ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے ، اسے جب دیکھیے اپنی حالت میں گُم اور خاموش ہے ..... دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آگئے ہیں ۔ اس کی زبان کھلتی ہی نہیں ، البتہ لگا ہوں پر کان لگائیے تو ان کی صدائے خاموشی سُنی جا سکتی ہے ...... میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھا۔"

گاندھی جی ہمیشہ چائے اور سگریٹ کے مخالف رہے ہیں ۔ اس کے برعکس مولانا آزاد چائے اور سگریٹ کو اس حد تک پسند کرتے تھے کہ انہوں نے " غبارِ خاطر" کے تقریباً پندرہ صفحات چائے کی تعریف میں صرف کیے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

" میں نے چائے کی لطافت و شیرینی ، تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مولانا کو چائے اور سگریٹ کے مضر اثرات کا علم نہیں تھا ۔ چنانچہ چائے اور سگریٹ کی عادت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں ، لیکن کیا کہوں ، جب کبھی معاملے کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روز گارِ خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں ۔"

ان سطور میں مولانا نے حیاتِ انسانی کے فطری اسرار و رموز کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ۔ خصوصاً آخری جملہ سے بے ساختہ —— (To err is human) والی کہاوت یاد آجاتی ہے ۔

ان خصوصیات کے علاوہ مولانا نے خطوط میں جا بجا فارسی عربی ، اور اُردو کے جو برمحل اشعار استعمال کیے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے اور غلام رسول مہر کے اس خیال کو ماننا ہی پڑتا ہے کہ " مولانا جو کچھ پڑھتے تھے دماغ کے مختلف خانوں میں حُسنِ ترتیب سے چُنتے جاتے تھے ، ہر خانہ ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور جو شے چاہتے اُٹھا لیتے ۔"

نیز مولانا کی بولتی ہوئی تشبیہات ، رنگین استعارے اور لالہ کا تخیل نے " غبارِ خاطر" کی نثر کو ایسا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے جس پر سیکڑوں نظمیں قربان کی جا سکتی ہیں اور جس پر اُردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ۔

▲▲▲

ہمارے مسائل

عمیق حنفی ★

اُردو شاعری میں نئے تجربے

★ ان دنوں اُردو شاعری میں مختلف قسم کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ نظم آزاد اور نظمِ مُعرّیٰ کے ساتھ ساتھ اِدھر کچھ شاعروں نے منثور نظم کے بھی تجربے کیئے ہیں۔ ہئیت سے ہٹ کر مواد اور موضوع میں بھی تنوّع اور انوکھا پن پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اشاریت کی تحریک کو بھی کئی ایک نئے شاعروں نے اپنایا ہے اور مِنّی نئی عَلامات کو اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اُردو شاعری، خاص طور سے اُردو نظم آگے بڑھنے کے بجائے رُو بہ زوال ہوتی جارہی ہے نئے شاعروں میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے، جو پڑھنے والوں کو پُوری قوت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرسکے کسی کا اندازِ بیان اتنا کاواک ہے کہ کسی عُنوان بات پلّے نہیں پڑتی اور کوئی ایسے دُور از کار خیالات کو بے سرو پا علامات میں قید کرنا چاہتا ہے کہ اس کی نظم چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اِس رُجحان کے اسباب اور اُس کی اگلی سمتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تجربوں کے بطن سے بڑی شاعری کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

"پونم" نے "ہمارے مسائل" کے تحت نئی شاعری کی ہئیت، نوعیت موضوعاتی دائرے، اندازِ بیان، اس کی اگلی سمت اور مستقبل کے بارے میں ایک اہم اور مفید مذاکراتی کالم قائم کیا ہے۔ اس کالم کی زینت ستمبر ۶۴ء کے شمارے میں میرے خیالات بن چکے ہیں۔ میں اس کالم کو اب کنارے بیٹھ کر دیکھ رہا تھا کہ یکایک میرے دوست عشرت قادری صاحب نے مجھے میرے ارادے اور نیّت کے خلاف بھپر دھاروں میں کھینچ لیا۔ چونکہ عشرت صاحب نے اپنے ارشادات کا بیشتر حصّہ میرے ہی خیالات پر بحث کرنے کے لیئے وقف کیا ہے۔ میں ایک بار پھر اس بحث میں حصّہ لے رہا ہوں تاکہ قارئین کرام کے سامنے اپنی پوزیشن کو صاف کردوں۔

میں نہیں جانتا کہ اُردو تنقید میں یہ رسم کیوں جاری ہے کہ اُردو زبان اور فارسی رسم الخط میں ہی چھپے ہوئے مضامین پر بحث کرنے کے لیئے۔ بجائے متعلقہ عبارت نقل کرنے کے اس عبارت کا ترجمہ نقاد اپنی سلیس زبان میں کرکے پیش کرے! میرے دوست نے اسی رسم کی پابندی کی ہے اور میری باتوں کو ایک مخصوص پہلے سے قائم کیئے ہوئے تعبیری قالب میں ڈھال دیا ہے۔

انسانوں کا عجائب خانہ ہے تو رضا دلچسپ مقام
جس کو دیکھو، جس سے بولو' کچھ کم' سمجھائیے بہت

عشرت صاحب ترقی پسند تحریک کو (جو اب اپنی تنظیم ختم کرچکی ہے) اب سنِ بلوغ کو پہنچی ہوئی مان رہے ہیں اور ستم ظریفی یہ

نئی شاعری جو ترقی پسند شاعری کی ہم عُمر ہے نہ صرف نابالغ ملنتے ہیں بلکہ اسے نصاب میں شامل نہ کیئے جانے کی رائے اس لیئے دے رہے ہیں کہ " اس میں مقصدیت ، سیاست ، سائنس ، اخلاق اور فلسفہ قطعی بے معنیٰ اور غیر ضروری قرار دیئے جاتے ہیں " گویا —— عشرت صاحب کی نظر میں شاعری کا نصابِ تعلیم مرتب کرنے کے لیئے مقصدیت ، سیاست ، سائنس ، اخلاق اور فلسفہ کا اس میں پایا جانا پہلی شرط ہے ، اس کا شاعری ہونا نہ ہونا فروعی بات ہے ! میں نے کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ علوم و فنون شاعری کے لیئے بے معنیٰ اور غیر ضروری ہیں۔ میرا مطلب واضح ہے کہ اپنے عہد کے علمی شعور کو احساس کی آنچ میں کُندن بنا کر پیش کرنا اور بات ہے اور علمی نکات ، معاشی فارمولے ، نفسیاتی تجزیئے ، سیاسی نعرے ' اور مذہبی عقائد نظم کر دینا اور بات ہے ۔ علم کو نظم کرنا اور بات ہے اور ہضم کرنا اور بات ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ شعرا کو علم کی بدہضمی کی شکایت رہتی ہے۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ " اب تک شاعری سیاست ، فلسفے ، سائنس ، اخلاق ، آئین کی پچھ لگو بنی ہوئی تھی " میری مُراد صرف یہ تھی کہ نئی شاعری ، شاعری کو ان تمام علوم و فنون اور نظریاتی اور عملی تحریکات سے برتر یا کمتر نہیں مانتی بلکہ ان کے ہم مرتبہ مانتی ہے ۔ اطاعت اور تقلید میں اور رفاقت اور تائید میں فرق ہے ۔

عظمت کی تلاش کا مسئلہ بھی جذباتی بنالیا گیا ہے عظمت کا حصول ایک دیرینہ انسانی آرزو ہے ۔ لیکن اس عہد میں عظمت کا تصور نہ صرف اضافی ہو گیا ہے بلکہ اس کا حصول انفرادی سطح پر ممکن نہیں ۔ اس دلیل کا جواز میں نے معاشی نظام ' صنعت اور تجارت سے پیش کیا تھا ۔ اگر آج کی عظمت تلاش کرنی ہے تو کسی فرد میں نہیں ، افراد کی کوششوں کے مجموعی حاصل میں کرنی ہوگی ۔ ایٹمی توانائی کا سہرہ کسی ایک سائنس داں کے سر نہیں باندھا جاسکتا ۔ جدید فنِ تعمیر کسی ایک معمار کا مرہونِ منت نہیں ہے ۔

کیا عشرت صاحب کسی ایک ایسے بڑے ترقی پسند اُردو شاعر کا نام لے سکتے ہیں ' جسے میر ' غالب اور اقبال کا ہم مرتبہ مانا جا سکے ؟ کیا ترقی پسند شاعری سے کسی ایک ایسے شاعر کا نام پیش کیا جاسکتا ہے ؟ اس لیئے عشرت صاحب کو میری بات کا بُرا نہ ماننا تھا۔ میں نے میر و غالب کی عظمت سے انکار نہیں کیا ۔ " ٹائم " جیسے عالمگیر شہرت اور اہمیت رکھنے والے اخبار میں میر و غالب کو فارسی کے کم معروف شاعر کہا گیا ہے اس بات سے میں نے عظمت کے تصور کی اضافیت کا ثبوت دیا تھا اور بس ۔ میں مانتا ہوں یہ کافی دل شکن ثبوت ہے ۔

عشرت صاحب نے احتشام حسین صاحب کا حوالہ دے کر گویا اپنی باتوں پر ایک بڑے نقاد کے نام کی مہر ثبت کر دی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ یہ عہد شخصیت پرستی کا نہیں ہے ۔ خود ترقی پسند ادب اس کی پُر زور مخالفت کر چکا ہے ۔ انتہائی علامیاتی اور گنجلک شاعری واقعی اس کے خلاف رائے دینے پر مجبور کرتی ہے ۔ لیکن تمام تر نئی شاعری ایسی نہیں ہے ۔ اچھی اور بُری ، خوش معنیٰ اور مہمل ، سادہ اور گنجلک ، صاف اور اُلجھی ہوئی تخلیقات پر نہ نئی کا اجارہ ہے نہ پُرانی کا کاپی رائٹ ۔ میں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ عظیم شاعری کا جنم اسی قسم کی علامتی شاعری سے ہونے والا ہے ۔ میں نے اس قسم کی علامتی شاعری کی مخالفت کرنے کے بعد اس اُمید کا اظہار کیا تھا کہ نئی شاعری کی کوکھ ہی سے شاعرانہ عظمت کا جنم ہوگا کیونکہ یہی وہ شاعری ہے جو رُوحِ عصر سے گہرا رابطہ رکھتی ہے اور ایک آفاقی رنگ و آہنگ بھی ۔

جب ذہن روایتی اصطلاحاتِ تنقید اور منطق کا مشروط ہوتا ہے اور ذاتی طور پر ' اپنے طور پر سوچنے ' سمجھنے کی تکلیف اُٹھانا گوارا نہیں کرتا تو اسے فریقِ مخالف کی باتوں میں تضاد اور تناقض نظر آنے لگتا ہے ۔ میں نے کہیں اپنی باتوں کی نفی نہیں کی ۔ بات دراصل یہ ہے کہ عشرت صاحب نے جُزو کو کُل سمجھ لیا ہے ۔ علامتی نظموں ہی کو وہ نئی یا تجرباتی شاعری مان رہے ہیں اور پھر شاید انہیں " علامیت " اور " علامت نگاری " ——————

Symbolic اور Symbolism کے فرق سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ Symbolism ایک مکتبِ فن و ادب ہے اور Symbols کے ذریعہ بات کہنا ایک اسلوب۔ انتہائی Private قسم کی علامتوں کا استعمال نظم کو گنجلک اور بیان کو کاواک بنا دیتا ہے۔ لیکن علامتیں اگر شاعر اور قاری کے درمیان مشترک میدانوں سے، عام زندگی سے، داستانوں سے، اساطیر سے، کلاسکس سے، مذہبی صحیفوں سے، تاریخ سے، اخذ کی گئی ہوں تو یہ عیب پیدا نہیں ہوتے اور پھر سبھی نئے شاعر علامت نگار نہیں ہیں۔ تمثالیں (IMAGES) اشارے (Suggestions) اور بیانات (Statements) ، بھی ان کے رسائلِ اظہار و احضار ہیں۔

عشرت صاحب نے "تجرباتی شاعری" اور "ترقی پسند شاعری" کو ایک دوسرے کی ضد مان لیا ہے۔ گویا کہ یہ دونوں منظم فرقے ہیں "تجرباتی شاعری" یا "نئی شاعری" نہ تو کوئی مکتبِ فکر و فن ہے نہ منظم تحریک، نہ اس کا کوئی صحیفۂ دین ہے نہ کوئی منشور۔ اس کے دائرے میں ترقی پسند ترقی یافتہ اور رجعت پسند سبھی شامل ہیں۔ جو ترقی پسند کہ تجرباتی شاعری کے علمبرداروں میں نظر آ رہے ہیں وہ کس "مقصد برآری" کے بعد پوری تحریک کے خلاف ہو گئے؟ لہٰذا نہ ترقی پسند تحریک نے بلنٹے اور نہ "تجرباتی شاعری" بانٹ رہی ہے یہ زاویۂ فکر صحت مند نہیں ہے۔ منظم ترقی پسندی سے برگشتگی کے اسباب کچھ اور ہی ہیں جن پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اور پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی کُل ہند تنظیم باقاعدہ ختم کر دی گئی، اسلیئے اس کا ماتم کیوں؟۔

عشرت صاحب میری گذشتہ گذارشات کو ٹھنڈے دل اور صاف دماغ سے ایکبار پھر پڑھیں اور عشرتِ تنقید کی عُجلت سے کام نہ لیں۔ مقصدیت اور افادیت کا قائل میں بھی ہوں، لیکن ان کی تعریفات کو اس صورت میں قبول نہیں کرتا جو ترقی پسندوں کے یہاں مروّج ہے۔

کلاسیکل شاعری اور نئی شاعری میں فرق یہ ہے کہ کلاسیکل شاعری زبان، بیان، اسلوب، عروض اور قواعد کی سخت پابندی پر زور دیتی تھی جبکہ نئی شاعری، موضوع، اندازِ بیان، لفظیات، لَے اور زبان کی ہم رنگی، تناسب اور توازن پر زور دیتی ہے۔ نئی شاعری ذاتی احساس کی شاعری ہے۔ ٹائپ کے بجائے فرد کی ذات اس کے لیئے اہم ہے۔ نظریات، عقائد، محضر، وعدے، نعرے، مفروضات کی عینکوں کے بجائے اپنی ننگی آنکھ سے حیات و کائنات کو دیکھنا اور اپنے دل و دماغ سے اسے محسوس کرنا اور اس پر سوچ بچار کرنا اس کا طریقہ کار ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر کے دل و دماغ کی تعلیم، تہذیب، اور تربیت میں جن عناصر نے حصّہ لیا ہے اس شاعر کا ذاتی ردِّ عمل ان عناصر سے ایک نہ ایک حد تک متعین ہوگا، لیکن ایسا ہونا فطری ہوگا۔ اس پر کسی جبر یا خارجی رشتوں کے باعث نہ ہوگا۔

▲

کیفی اعظمی

○

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو!
کیا غم ہے، جسے چھپا رہے ہو؟

تسخیر جہاں کے بعد، یارو!
اپنے سے شکست کھا رہے ہو؟

کرلیں گے قبول سب جہنم
جنت جو تمہیں بنا رہے ہو

انسان بھی اک بناتے چلتے
اسے تم کہ خدا بنا رہے ہو

اک تم ہی رہے ہو قاتلوں میں
سچ پوچھو تو تم بھی کیا رہے ہو

ہے آج یہی جہاد کیفی!
یاری جو نبھائے جا رہے ہو

❖

الطاف مشہدی

○

کوئی احوال سناتا ہے تو رو دیتا ہوں
درد جب ہونٹ پہ آتا ہے تو رو دیتا ہوں

اتنا برباد کیا ہے مجھے غم خواروں نے
اب کوئی رحم بھی کھاتا ہے تو رو دیتا ہوں

چاندنی رات میں جب کوئی حسیں دیوانہ
اپنی روداد سناتا ہے تو رو دیتا ہوں

تیرہ و تار فضاؤں سے ہوں اتنا مانوس
جب کوئی دیپ جلاتا ہے تو رو دیتا ہوں

اک حسیں آنکھ نے کچھ زخم دیئے تھے مجھ کو
اب کوئی آنکھ ملاتا ہے تو رو دیتا ہوں

میرے ارمانوں کی تربت پہ بصد حسرت و یاس
جب کوئی پھول چڑھاتا ہے تو رو دیتا ہوں

اُف وہ بیتے ہوئے لمحات کہ اب تو الطاف
کوئی بچھڑا ہوا لگتا ہے تو رو دیتا ہوں

❖

شاذ تمکنت

دو نامکمل غزلیں

خود فریبی ہی سہی، زیست کو آرام ملے
تیرے ہم شکل کو ڈھونڈیں، ترا ہم نام ملے

ترکِ صہبا کی قسم کھائی تھی، جس کے آگے
کیا قیامت ہے وہی شخص سرِ جام ملے

دن کی رُوداد جُدا، رات کی فریاد جُدا
اب بھلا کیا کہیں اُس سے جو سرِ شام ملے

❖

مزاجِ عشق کو رسم و رہِ کُہن نہ ملی
کچھ اس طرح وہ ملے بُوئے پیرہن نہ ملی

جفائے دہر کو تیری رضا سمجھتا تھا
پھر اہلِ غم کی جبیں پر کوئی شکن نہ ملی

جو بدلیوں میں کہیں چھپ گیا، وہ مہر ہے تُو
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم، جسے کرن نہ ملی

❖

مغنی تبسم

○

آنکھوں سے چھلکتے ہیں، مینا سے تہی دیکھو
توبہ شکنی کیسی، ساغر شکنی دیکھو

یوں دورِ شباب آیا، جس طرح بہار آئے
گُل پیرہنی دیکھو، شعلہ بدنی دیکھو

شانوں پہ پریشاں ہے، مستانہ گھٹا کیسی
رُخسار پہ بکھری ہے کیا خوش چمنی دیکھو

ابرو کے اشارے سے محفل ہے تہ و بالا
غوغائے تماشا میں یہ کم سخنی دیکھو

اب دل کو سنبھالیں یا مرجائیں یہ ہم جانیں
قاتل ہو اگر، اپنی ناوک فگنی دیکھو

ہر شام منوّر ہے، ہر صبح درخشاں ہے
اس حُسنِ تصوّر کی ظلمت شکنی دیکھو

❖

شہریار

٭

○

ذکر کسی کا پھر نکلا، پھر چھائی اُداسی محفل پر
آج کی رات کڑی گذرے گی شاید پھر اہلِ دل پر

میری محبت کے انجام کی فکر تمہیں اتنی کیوں ہے
جو کچھ بیتے گی یارو، بیتے گی میرے دل پر

چاہے جتنا تیز چلو، مجھ سے تم میرے ہمسفرو
پہونچ نہ پاؤ گے تم لیکن مجھ سے پہلے منزل پر

فرصت وقت نے دی تو ہم بھی لکھیں گے اسکی رُوداد
کیسے طوفانوں سے نکلے، پہونچے کیسے ساحل پر

٭

سآن یوسفی

٭

○

اُوجھل ہے یُوں نگاہ سے تابندگی کی شکل
جیسے پسِ طلوعِ سحر، تیرگی کی شکل

اُڑتی ہے غم کی دُھول گلستاں میں چارسُو
بِتیا زمانہ دیکھے ہوئے تازگی کی شکل

گُل بُوٹے جی رہے ہیں تمنّائے مرگ میں
ہستی کا رُوپ دھار گئی نیستی کی شکل

دھوکا نہ ہو نظر کا کہیں موجِ نُور بھی
قلب و نگاہ میں ہے بسی تیرگی کی شکل

یُوں بے نیازِ عیش و طرب ہوگیا ہے دل
لب ہوگئے خموش جو دیکھی ہنسی کی شکل

گُنجائشِ تصوّرِ غم، جس سے دُور تھی
موہُوم ہوگئی ہے وہ اب زندگی کی شکل

جب سے کھلے ہیں فطرتِ آدم کے پیچ و خم
دل کانپتا ہے دیکھ کے اب آدمی کی شکل

دِل میں ملالِ تنگیٔ داماں نہیں رہا
اے سآن اپنا بخت ہے جامِ تہی کی شکل

لغمتر نظمی

○

بس گئے ہیں آج خیالوں کے شہر میں
ڈھل گیا ہے زہرہ جمالوں کے شہر میں

...ل بہت ہیں خونِ تمنا کی سُرخیاں
...حیات بیچنے والوں کے شہر میں

...تو یہ ہے وہ اپنی مثال آپ بھی نہیں
...کا کہاں جواب سوالوں کے شہر میں

...رات تیری یاد رہی دل کے آس پاس
...رات کٹ گئی ہے اُجالوں کے شہر میں

...یہ ہے کسی سے بھی ملتی نہیں نظر
...ہی نگاہ دیکھنے والوں کے شہر میں

...ئی تو ساتھ دے کہ مجھے راستہ ملے
...یا بھٹک رہا ہوں خیالوں کے شہر میں

...وقت بھی میں تیری پرستش میں محو تھا
...یہ نہیں بنا تھا شوالوں کے شہر میں

...نسبت ہے ایک آہوئے خوش چشم سے مجھے
...میں نے غزل کہی ہے غزالوں کے شہر میں

نظمی چمن میں رقصِ نسیمِ بہار ہے
غنچے چٹک رہے ہیں خیالوں کے شہر میں

باوا کرشن گوپال مغموم

○

جب تکلّف سے ہم مُسکرائے
اور گھرے ہوئے غم کے سائے!

جی رہا ہوں، مگر لمحہ لمحہ
تیری یادوں کو دل میں بسائے

اک بھی آنسو نہ آنکھوں سے ڈھلکا
ہم نے یُوں بھی تو آنسو بہائے!

زندگی کی کڑی دُھوپ، توبہ!
دُور نظروں سے زُلفوں کے سائے

ہم سے رخصت ہوئے تھے جہاں تم
ہم کھڑے ہیں وہیں سر جھکائے!

دل نہ بہلا، نہ بہلا، نہ بہلا
تُم نہ آئے، نہ آئے، نہ آئے

جیسے سچ مُچ تمہیں آ رہے ہو
کتنے دھوکے نگاہوں نے کھائے

سعی بے فیض ہو گی یہ مغموم!
کون رُوٹھے دنوں کو منائے؟

جوہر صدیقی

○

سوزِ دل پیش کروں، داغِ جگر پیش کروں
آ تجھے تیرے ہی شہکارِ نظر پیش کروں

زُلف کو نذر کروں، ہجر کی راتوں کا فسوں
اور عارض کو اُمیدوں کی سحر پیش کروں

ہو اجازت تو ترے نازِ تغافل کے حضور
اجنبی سا کوئی اندازِ نظر پیش کروں

لاج رہ جائے ترے بخشے ہوئے زہد کی آج
چند آنسو ترے دامن کو اگر پیش کروں

مجھ سے ہر پھول نے ہنس ہنس کر یہی پوچھا جوہر
تجھ کو کانٹوں سے بھری راہ گذر پیش کروں

صدیق نظر

○

جاگتے سوتے کٹ جائے گی غم کی رات تو اپنی ہے
چنچل من کو بہلائیں گے یہ سوغات تو اپنی ہے

ناکامی کے شعلے دل میں لاکھ جہنم بن جائیں
اشکِ غم سا ر آ جائیں گے یہ برسات تو اپنی ہے

بجلی برکھا ایسی برسی شیش محل سب ڈھیر ہوئے
کس سے کہیے لوگ ہنسیں گے یہ بھی بات تو اپنی ہے

نور بھی نور ہے چندر بدن میں جس کا کوئی نام نہیں
جس کو غم کا سایہ کہیے ایسی ذات تو اپنی ہے

سدا سویرا ناچ رہے ہیں کھیتوں اور کھلیانوں میں
دنیا کو کیوں تنہا جانیں، تنہا ذات تو اپنی ہے

گوری کی دنیا ہے اپنی گوری کی بانہیں اپنی
لوگ جسے کہتے ہیں الفت وہ بھی گھات تو اپنی ہے

ساون بھادوں کی راتوں میں آگ بجھانے آ جاؤ
صبح کا کیا ہے سب دیکھیں گے وہ پربھات تو اپنی ہے

ان ہونٹوں کو چوم رہی تھی ارمانوں کی میت ہوا
جیسے یہ ہے اپنے بس میں گو یہ بات تو اپنی ہے

ناکامی کے بوجھ سے دب کر بیٹھ گئے گو آپ نظر
دنیا کا کیا ہے ہنس دے گی لیکن ذات تو اپنی ہے

فیض نظر

○

میں جو محفل سے اٹھا میری کمی رہ جائے گی
کوئی ہنگامہ نہ ہوگا خامشی رہ جائے گی

چوم لیں گے زندگی کے ہونٹ ہم اہلِ جنوں
اور خرد اب دیکھنا سر پیٹتی رہ جائے گی

بے نیازانہ گذر جاؤں گا میں، ہر رہگذر
چشمِ حیرت سے مجھے اب دیکھتی رہ جائے گی

پھر ملے ہو تم امیدیں مسکرائی ہیں، مگر
پھر گلے ہونٹوں پہ آنکھوں میں نمی رہ جائے گی

کب ملے اذنِ تبسم، کب بہار آئے یہاں
ہر کلی شائد یہی اب سوچتی رہ جائے گی

اور اگر کچھ دن یہی عالم رہا اس بزم کا
داستاں بن کر تمہاری خود سری رہ جائے گی

کیا خبر تھی حشر امیدوں کا یہ ہوگا یہاں
[illegible]، نظر شبِ وصل کی [illegible] رہ جائے گی

عتیق تابش

تم نہیں آتے نہ آؤ موسمِ گُل فام میں
بوتلوں میں بند ہو جاتے ہیں ہم بھی شام میں

راستوں کی دھول اُڑ اُڑ کر بتائے گی یہ بلا
کتنی آوازیں دبی ہیں شہر کے کہرام میں

میکدے کے باب میں بہرو پیا کوئی نہیں
اپنے اپنے خال و خط ہیں اپنے اپنے جام میں

جن کے پس منظر میں شامل ہو کوئی نوریں خیال
رات آسانی سے کٹ جاتی ہے اُن ایام میں

اِک ذرا مُہلت ملے ہم کو اے کارِ فکر و فن
اپنے احساسات بھر دیں تیرے در اور بام میں

اب کوئی باہر نہ نکلے، اپنا محرم چھوڑ کر
پتھروں کی بارشیں ہیں شاہراہِ عام میں

عشق میں کوئی بُرائی تو نہیں پھر بھی عتیق
اِک اضافے پہ تُلے ہیں لوگ میرے نام میں

صہبا وحید

صبا کے دوش پہ سرگشتہ سفر کی طرح
تمام عُمر رہے خاکِ رہ گذر کی طرح

جو اِذن ہو تو کہیں ہم بھی مُدعائے دِل
ترے خطوط کی تحریرِ مختصر کی طرح

تمام انجمنِ اہلِ حُسن چونک اُٹھی
مرا فسانۂ دِل تھا کسی خبر کی طرح

صَدا لگاتے ہیں لے کر حیات کا کشکول
دیارِ زہرہ وشاں میں گدائے در کی طرح

کبھی تو قافلہ اہلِ نظر کا گذرے گا
پڑے ہیں خاک بسر سنگِ رہ گذر کی طرح

کہاں ہے واقفِ اسرارِ دلبراں یارو!
سوادِ شہر میں صہبائے دیدہ ور کی طرح

[illegible]کی الوپ

کل آج اور کل

اپنے چھوٹے بھائی بھیکو کی بیوی کو بُری طرح مار پیٹ کر منگل اُس کے پاس سے الگ ہوا تو اُسے ایسا لگا کہ ابھی اُس کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک کنارے برآمدے میں ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور بھیکو کی بیوی کو ایسی گندی گندی گالیاں دینے لگا کہ باورچی خانے میں چُپکی بیٹھی منگل کی بیوی سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ دبے پاؤں باہر آئی اور منگل کے پاس پہنچکر نہایت ہی دبی زبان سے بولی۔

"گھر میں اپنی بھی جوان بیٹی ہے، جوان بیٹے ہیں۔ تمہیں ایسی ایسی گالیاں نہیں بکنی چاہئیں"۔

اور تب ہمیشہ اور ہر وقت کی طرح منگل، بھیکو کی بیوی کو میکے یا بھیکو کے آشرم چلی جانے کی بات کرنے لگا۔ لیکن پھر وہ خاموش ہو گیا، پھر اُس نے گانجے کی ایک چلم بھری اور دو تین بھرپور دَم لگانے کے بعد کئی بار پہلے کی طرح سوچنے لگا کہ بھیکو کی بیوی اور اُس کے بچّوں کے ساتھ اُس کا رویّہ مناسب ہے، یا گاؤں کے دوسرے لوگوں کے کہنے کے مطابق ظلم ہے؛ لیکن اُس کا مَن کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر سکا اور تب اُس نے اپنے بڑے بیٹے بیجو کو پاس بُلایا اور بڑے ہی مُدبّرانہ انداز میں کہنے لگا۔

"بیٹیا! اب تیرے پاؤں میں میرے جُوتے آنے لگے ہیں۔ اور جب باپ کے جُوتے، بیٹے کے پاؤں میں پُورے ہونے لگیں تو باپ، بیٹے سے مشورہ کر سکتا ہے۔ تُو ہی بتا، میں نے بُرا کیا یا اچھا بھیکو والی کا اب یہاں کیا دَھرا ہے؟"

بیجو ابھی باپ کے سوال کا جواب دے بھی نہیں پایا تھا کہ منگل کا چھوٹا بیٹا سدا رتھ اپنی ٹائی کی ناٹ دُرست کرتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا اور کسی قدر زوردار آواز میں بولا۔

"ارے بھیّا کیا بولے گا بابو، اِس کے ملتے میں گودا بھی ہے؟ سارا گاؤں کہہ رہا ہے کہ تم ظلم کر رہے ہو، اتیاچار کر رہے ہو۔ یہ سب کچھ ختم ہونا چاہیے"۔

"تُو چُپ رہ رے ناستک چپ کر رے، چار حرف پڑھ کیا گیا ہے کہ بڑا بنا۔ اے بالسٹر بنا پھرتا ہے"۔ وہ دونوں ہی گانجے کی چلم جما کر دَم لینے کو تھا ہی کہ جیسے اُسے کوئی خاص بات یاد آ گئی اور وہ

جلدی سے بولا۔ "تُو نے ہماری باتوں میں ٹانگ اڑائی۔ تو گھر سے باہر نکال دوں گا۔"

"مجھ پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوگا باپو!" سدآنند نے گردن جھٹکا کر اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی اور اُسے انگلیوں سے دبا کر دھار دار سی بناتا ہوا بولا۔ "یہ سب کچھ تم چاچی کو کہہ سکتے ہو، کیونکہ وہ بے وقوف سمجھتی ہے کہ اس گھر سے باہر اُسے سر چھپانے کی جگہ ہی نہیں ملے گی۔ میں چاہوں تو خود ہی اس جہنم سے نکل بھاگ سکتا ہوں۔ مکھیا جی کے ہاں کبھی بھی میرا سواگت ہو سکتا ہے، پھر میں کیوں تمہاری دھمکی سے ڈروں۔ چاری دھرتی بہت بڑی ہے بڑی لمبی چوڑی ہے، لیکن میں کہیں نہیں جاؤں گا باپو! کیوں جاؤں یہ میرا گھر ہے، اور ٹھیک اتنا ہی میرا ہے جتنا بھیا کا اور جتنا میرا اور بھیا کا ہے اتنا ہی چاچی کا ہے، پر وہ بے وقوف عورت...."

"کمینہ، گنڈا!" — منگل بڑے غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "جب سنو چاچی کا پاٹ لیتا ہے، جب دیکھو مکھیا کے نیچے کا گن گاتا ہے، پوجا پاٹ، دیوی دیوتا سے تو کوئی مطلب نہیں، بھگوان تک کو گالیاں دیتا ہے، اب تو نرک میں جائے گا، سیدھے نرک میں — بڑا آیا مکھیا کا جنا۔"

"اے جی! — " منگل کی بیوی بڑے طیش میں بولی: "تم اُسے کیوں گالی دیتے ہو۔ یہ تو سوچو کہ اگر یہ مکھیا کا جنا ہے تو یہ بات تمہارے لیے شرم کی ہے یا نہیں؟"

"ماں تو اپنا کھا پی کر گئے بجاتی ہے۔" سدآنند ہنس پڑا۔ "باپو میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا کروں یا نہ کروں، تمہارے مٹی کے لوندے بھگوان پر میرا وشواس ہو یا نہ ہو، میں اپنے کرموں کا پھل بھگت لوں گا، لیکن پوجا پاٹھ کرنے اور بھگوان کی مالا جپنے کے بعد بھی ایک ابلا ناری اور معصوم بچوں پر اتیاچار کر کے تم دھرماتما ہو تو تمہارے دھرم کرم کو میرا ایک ہزار پرنام!"

"بیجو کی ماں!" منگل چیخا۔ "اس لونڈے کو روک ورنہ میں تیرے سامنے ہی اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔" اور وہ بڑے غصے میں اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ منگل کی بیوی سمجھ گئی کہ آج یقیناً معاملہ بگڑ کے رہے گا۔ اُسے اپنے پتی کے غصے کا بھی علم تھا— داروغہ کو رشوت دے دلا کر بات داب دی گئی تھی اور اب بہت پرانی بھی ہو گئی تھی۔ لیکن جانتا کون نہیں تھا کہ چودھری دھرم ناتھ کا خون خود اُس کے بیٹے منگل رام نے کیا تھا۔ جب اُسے دھرماتما باپ کو قتل کرتے دیر نہ لگی تو پھر سدآنند سے تو وہ دل سے کڑھتا تھا——

ماں نے اپنی سوگند دے کر اور دھکیل کر سدآنند کو گھر سے باہر نکال دیا، اور سدآنند بڑے اطمینان سے کسی فلمی دُھن کی سیٹی بجاتا ہوا شہر جانے والی بس کے پڑاؤ کی طرف چل پڑا۔

منگل اپنے کمرے سے سچ مچ تلوار لے کر نکل آیا تھا لیکن سدآنند جا چکا تھا اس لیے اُس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس نے اپنی تلوار بیجو کے حوالے کر دی، پھر کہا۔

"لے بیٹا اسے ٹانگ آ..... اور سُن، میں کھیت پر جا رہا ہوں تو گھر ہی پر رہنا، آج میں نے کرم چاری کو مال گزاری لینے کو بلایا ہے۔ کوشش کرنا کہ وہ بھیکو کے حصے کی زمین کی رسید بھی کاٹ دے۔"

"وہ نہیں کاٹے گا باپو" بیجو بولا۔ "وہ سدا کا دوست ہے اور سدو نے اُسے بہکا دیا ہے۔"

ایک بار پھر منگل کو سدآنند پر ایسا غصہ آیا کہ وہ سامنے ہوتا تو ضرور اُس کے دو ٹکڑے کر دیتا اور وہ دانت پیس کر کہنے لگا۔

"سالا عجیب حرامی کا بچہ ہے۔ میں پانچ سو دینے کو تیار ہوں مگر مانتا ہی نہیں۔ کہتا ہے رشوت میں نہیں لوں گا۔ زمین جس کی ہے، رسید اُسی کے نام سے کٹے گی..... بے چارہ بی ڈی او تو بڑا بھلے مانس ہے، وہ تو تیار ہے، لیکن وہ تو جو کچھ کرے گا کرم چاری یا مکھیا کی رپورٹ پر کرے گا اور یہ دونوں سالے..... اُف بھگوان ناس کرے، خیر دیکھا جائے گا، یہ سالے بھی پیسے کے کرم چاری بابو، گھوس نہیں لیں گے! ہُنہ، بچے سڑک پر بھیک مانگیں گے تب آنکھ کھلے گی۔"

لیکن پھر وہ کچھ اور بڑبڑاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ صبح سویرے اُس نے تھوڑی سی دارو پی تھی، لیکن اُس کا سارا نشہ بھیکو کی بیوی کو پیٹنے میں ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ کچھ ہی دور آگے جا کر وہ اپنے کھیت پر جانے کی بجائے بھٹی کی طرف مُڑ گیا۔

اب تک بھیکو کی بیوی اپنی چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنے بچّوں کو سمیٹے رو رہی تھی اور اپنے خاوند کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ خود تو سُورگ کے مزے لے رہا ہوگا اور وہ اپنے بچّوں سمیت نرک میں جل رہی تھی۔

اُس کے خاوند، بھیکو کا مزاج بچپن سے ہی صوفیانہ تھا۔ اُس نے کچھ پڑھا لکھا بھی تھا اور مہاتما بُدھ کی زندگی سے بے حد متاثر تھا۔ یہاں تک کہ مہاتما بُدھ سے عقیدت مندی کے تحت اُس نے اپنے بڑے بھائی منگل رام کے بیٹے کا نام سدارتھ رکھا تھا۔ دھرم کرم کا بہت ہی پابند ہوتے ہوئے بھی بھیکو بڑے مزے میں کھیت باڑی کا کام بھی کرتا تھا۔ لیکن یکایک اُس کے دماغ میں جانے کہاں سے یہ بات آ گئی کہ نہ یہ دھرتی پوتر ہے، نہ اِس ناپاک دھرتی پر بھگوان کی عبادت ہی صحیح ڈھنگ پر ہو سکتی ہے۔ اُن دنوں ایک رِشی سوامی جیانند جی کا بڑا نام تھا۔ بھیکو اُن سے ملا۔ سوامی جیانند جی بھی ایک ایسا آشرم بنانے کے خواہش مند تھے جو پاک ہو، جہاں مایا کے جال نہ ہوں اور جو صحیح معنوں میں عبادت کی جگہ ہو۔ بھیکو نے مشترکہ آبائی زمین کا ایک حصّہ اُس پاک آشرم کے لیے دان کر دیا اور آشرم بننے کے بعد وہ خود بھی وہیں جا کر رہنے لگا۔ اُس کے دو چھوٹے چھوٹے بچّے تھے ایک بیٹا جس کا نام آتما رام تھا اور دوسری بیٹی جس کا نام رُوپ متی تھا لیکن جب سے وہ آشرم میں جا رہنے لگا تھا، اُس نے نہ تو اپنے بچّوں کی خبر لی تھی، نہ بیوی کی۔

منگل نے پہلے تو بھیکو کی بیوی کو پھسلا کر اُس سے بھیکو کے حصّے کی بچی ہوئی زمین لکھوا لینا چاہا اور پھر اُس نے دھوکے سے یہ کام کرنا چاہا۔ لیکن سدارتھ ہمیشہ اپنی چچی کو باخبر کرتا رہا۔ اور زمین بھیکو کے قبضے سے نکل کر منگل کے قبضے میں نہیں جا سکی! چنانچہ اب منگل بھیکو کی بیوی اور بچّوں پر ظلم کرنے لگا تھا تاکہ وہ خود ہی گھر چھوڑ کر چلے جائیں اور وہ آسانی سے بھیکو کی بچی ہوئی زمین پر اپنا قبضہ جما لے۔

اور آج بھی منگل نے بھیکو کی بیوی کو بُری طرح پیٹا تھا، گالیاں دی تھیں اور طعنے دیئے تھے کہ اب وہ اپنے بچّوں سمیت اپنے میکے چلی جائے یا بھیکو کے آشرم میں، پھر جہاں سینگ سمائے۔

اور بھیکو کی بیوی اپنے بچّوں کو سمیٹے رو تی رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بھیکو خود تو گیان دھیان میں مست سورگ کے مزے لے رہا ہوگا اور اُسے اور بچّوں کو نرک میں چھوڑ گیا تھا۔

کافی دیر کے بعد وہ اپنی چھوٹی سی تنگ و تاریک کوٹھری سے باہر نکلی اور منگل کی بیوی کے پاس آ کر زار و قطار رونے لگی اور پھر سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ بولی۔

"دیدی! تم نے دیکھا نا۔ تمہارا پتی دارو پی کر کیسی کیسی بات کرتا ہے۔ اب تو مجھے اپنی آبرو کی خیر بھی نظر نہیں آتی۔ دیدی تم ہی اُسے سمجھاؤ نا ایک ابلا ناری اور بے قصور بچّوں پر ظلم کر کے اُسے کیا ملے گا؟"

"چاچی!" — ماں کے جواب دینے سے پہلے ہی سدارتھ بول اٹھا۔ — "بابو جو کچھ دارو پی کر آتا ہے اور کہتا ہے میں بھی وہی سب کچھ بنا دارو پیے کروں گا اور کہوں گا۔ چاچا نے اپنی ساری زمین بیچ باچ کر آشرم میں لگا دی جو تھوڑی بہت بنجر دھرتی پڑی ہے اُس سے تو مال گزاری بھی نہیں آتی اناج تو دور کی بات ہے۔ پھر اب تم لوگوں کا اِس گھر میں کیا دھرا ہے؟ بے شک میں بھی یہی کہوں گا کہ اِس گھر سے چلی جاؤ، اب تمہاری مرضی، جہاں سے آئی ہو، وہاں جاؤ یا چاچا کے آشرم ..... پرنتو یہاں سے چلی جاؤ ورنہ یہیں رہو گی تو ایک دن گھر کا کھرا ہوگا۔"

"میں میکے کیوں جاؤں، سدارتھ بیٹا؟" بھیکو کی بیوی کہنے لگی۔ "اب میرا وہاں کیا ادھیکار ہے۔ اب تو وہ میرے لیے پرایا گھر ہے۔ رہی آشرم کی بات ..... نہیں میں وہاں بھی نہیں جاؤں گی، میرا اصلی گھر تو یہی ہے بیٹا ..... یہی تو میرا گھر ہے، میرا سنسار ہے، میں کہاں جاؤں یہاں سے!"

"پدی یہ تم لوگوں کا اصلی گھر ہوتا!" بیجو بولا۔ "تو کیا چاچا اسے ناپاک سمجھتے اور اپنے لیئے پاک آسرم میں رہنا مناسب سمجھتے!"

"بیجو بیٹا!" بھیکو بولی۔ "ہر کوئی ایک سی بات نہیں سوچتا تیرے چاچا کے من میں اگر یہی بس گیا کہ یہ ناپاک جگہ تو اس میں میرا اور ان معصوم بچوں کا کیا دوس ہے؟"

بیجو نے کوئی جواب نہیں دیا اور بھیکو کی بیوی بہت ہی اُمید بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُس کی طرف داری میں کچھ تو ضرور بولے گی۔ لیکن منگل کی بیوی بدستور سر جھکائے کھڑی رہی اور تب بھیکو کی بیوی جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"ہاں میں آسرم ہی چلی جاؤں گی، مجھے وہیں جانا ہوگا، وہی تو ایک سہارا ہے سر چھپانے کا ..... بھیا کا ظلم تو حد سے جیادہ ہو گیا ہے بات کوئی ایک دن کی ہو تو ہو، اس گھر میں معمولی تو تو میں میں نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں تو روج روج کا یہی تماشا ہے، بسنتی جوان ہو چلی بھیا اُس کے ہاتھ پیلے کرنے کی کیا سوچتے، کہ اُلٹے انہوں نے گھر کو ایسا بنا رکھا ہے کہ کوئی بھی ایسے جھگڑالو گھر کی بیٹی لے جانا پسند نہیں کرے گا۔"

منگل کی بیوی نے سوچا کہ اس کی جیٹھ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی گھر کی یہ بدنامی صرف بسنتی کے لیئے ہی نقصان دہ نہیں تھی بلکہ اس کا اثر تو رُوپ متی پر بھی پڑ سکتا تھا۔ لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ اپنے خاوند اور بڑے بیٹے کے سامنے اُسے کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ویسے یہ بھی سچی بات تھی کہ بھیکو کی بیوی اور بچوں کیلئے اُس کے دل میں ہمدردی بھی تھی۔ لیکن وہ یہ ہمدردی بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب تک بیجو وہاں کھڑا رہا اُس نے بھیکو کی بیوی سے کچھ بھی نہیں کہا اور جب وہ وہاں سے ہٹ گیا تو اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا بہن ـــــ ابھی تو تم ہاتھ مُنہ دھو لو، بچوں کے ہاتھ مُنہ دُھلاؤ اور چلو کچھ کھا پی لو، بھگوان پر بھروسہ رکھو بہن، بھگوان جو کریں گے اچھا ہی کریں گے!"

ایک ٹوٹے ہوئے دل کے لیئے ہمدردی کی اتنی سی بات بھی بہت ہو گئی اور بھیکو کی بیوی ایک بار پھر رو پڑی۔ لیکن پھر وہ بچوں کو ساتھ لے کر کنواں پر چلی گئی اور وہاں سے لوٹی تو اُس نے دیکھا کہ سدارتھ واپس آ گیا تھا۔ اور اُس کی ماں اُس سے واپس آجانے کی وجہ پُوچھ رہی تھی۔

سدارتھ کہہ رہا تھا ـــــ "ماں مکھیا جی نے مجھے بتایا کہ باپو پھر دارُو پینے چلے گئے ہیں، اور انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ آج میں گھر پر ہی رہوں۔ کون جانے باپو واپس آ کر پھر ہنگامہ نہ مچانے لگیں، اسی لیئے میں کالج نہیں گیا۔"

"بیٹا تو نے بہت اچھا کیا۔" اُس کی ماں بولی۔ "پر اسطرح انہیں اگور کر کب تک رکھا جا سکتا ہے۔ اس کا تو کچھ نہ کچھ فیصلہ ہی ہو جانا چاہیئے۔"

"ماں ـــ!" سدارتھ بولا ـــــ "اس بات کا فیصلہ ہو بھی کیا سکتا ہے، کھُلی ہوئی بات ہے کہ چاچا نے گھر کا اپنا حصہ نہیں بیچا ہے، بہت سی زمین نہیں بیچی ہے، باغ نہیں بیچا ہے تو پھر چاچی کیوں کہیں جانے لگیں۔"

"لیکن تیرا باپ سب کچھ کر سکتا ہے وہ .... وہ ...." اُس کی ماں کہتے کہتے رُک گئی۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں" سدارتھ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں وہ قتل بھی کر سکتے ہیں، خون بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ..... کہ ..... اُن کے ڈر سے ...!"

"تو پڑھا لکھا ہے تو کیا ہوا" ماں بولی۔ "تو ہے بڑا نا سمجھ اگر بھگوان نہ کرے گھر میں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیسی شرم کی بات ہوگی۔ میں نے ایک بات سوچی ہے، تجھ سے ہی رائے کرنے والی تھی۔ بسنتی کی ماں بھی موجود ہے۔ میں سوچتی ہوں یہ کیسا رہے گا کہ بسنتی کی ماں اکیلی صرف اس کام کے لیئے آشرم چلی جائے کہ ـــ

کسی طرح بہلا پھسلا کر بھیکو بھیا کو یہاں لے آئیے ؟"

"انہوں نے بڑی محنت سے اپنی ذرہ پاک دھرتی بنائی ہے۔"

سدارتھ ہنس پڑا۔ "وہ نہیں آئیں گے ماں، پوجا پاٹ کرنے والوں کی حالت بھی افیمچی کی سی ہوتی ہے، غصے میں پڑا کہیں رام رام کرتا رہے گا۔ پرنتو افیمچی کو اس بات کی چنتا ہوتی ہے اور نہ بھگوان جی کو کہ اُس کے بال بچے کس حال میں ہیں ؟!"

"بیٹا سدّو" ــــ اُس کی ماں نے بڑی بیزاری سے کہا "تیری انہیں باتوں سے میں بھی کڑھ جاتی ہوں۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے بیٹے، پاپ ہوتا ہے ؟!"

"اچھا تو پھر پُن کی ہی بات کرتا ہوں ؟" سدارتھ بدستور ہنس رہا تھا۔ "اور پُن کی بات یہ ہے ماں کہ چاچی اور کملی اور بسنتی کو باپو کے ظلم سے کیسے بچایا جائے ہے نا ؟"

"ہاں ؟" اُس کی ماں نے کہا۔ "پر تُو نے میری بات کاٹ تو ڈالی میں کہتی ہوں، اگر بھیا آئے اور بٹوارہ دائر کر کے اپنے حصے کی زمین اور کھیت اور گھر الگ کرے تو کیا حرج ہے ؟"

"حرج کیا ہوگا ؟" سدارتھ بولا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک ہنگامہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ لیکن میرے حساب سے یہ اچھی بات نہیں، چاچی کا یہ اپنا گھر ہے اور چاچی کو ڈنکے کی چوٹ سینہ تان کر یہاں رہنا چاہیئے ؟"

اُس کی ماں کچھ نہیں بولی، کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی پھر بھیکو اور اُس کے بچوں کو لے کر باورچی خانے میں گھس گئی۔ وہاں بھی اُس نے بھیکو کی بیوی سے یہی کہا کہ اس کے علاوہ اور صورت نظر نہیں آتی کہ بھیکو آئے اور بٹوارہ کرا کے پھر چلا جائے۔

اور اپنی جیٹھانی کی یہ بات بھیکو کی بیوی کے دل میں جم سی گئی۔

چنانچہ اُس واقعے کے چند دنوں کے بعد ہی جب پھر منگل نے بار بار کی روایت دہرائی تو شام کے وقت بھیکو کی بیوی نے اپنے بچوں کو ساتھ لیا اور اپنے میکے کی طرف چل پڑی۔

کملی اور بسنتی کو اُس نے اپنے میکے میں چھوڑا اور دوسری ہی صبح بھیکو کے آشرم پہنچ گئی۔

آشرم میں ایک دھوم سی مچی ہوئی تھی۔ کئی ہفتے ہوئے سوامی جیانندجی کا دیہانت ہو گیا تھا اور اُن کے بعد سے اب تک آشرم کی دیکھ بھال ایک اور سادھو کرنے لگا تھا۔ لیکن اُس آشرم میں سادھو سنتوں کی تعداد بہت کافی تھی اور سب ہی چاہتے تھے کہ وہ سب مل کر، ایک رائے ہو کر سوامی جیانندجی کی جگہ اپنا دھرم گرو کسی کو بنالیں۔ کچھ سادھو سنتوں کا خیال تھا کہ میرا بائی کی بھگت اور سوامی جیانندجی کی خاص شاگرد سوبھاگیہ وتی کرشن داسی جی کو اپنا دھرم گرو بنایا جائے، جبکہ دوسروں کا یہ خیال تھا کہ کیول کرشن جی کے دھیان میں ڈوبی رہنے سے آشرم کا کام نہیں چل سکے گا اس کے لیئے بہت کچھ اور کرنا ہوگا، جیسے دوسرے دھارمک آشرموں اور سنستھاؤں سے میل جول، آشرم کے لیئے پیسے جٹانا وغیرہ، اور ایک محض میرا بائی کی بھگت عورت سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا چنانچہ یہ جگہ سنت ناگ داس کو دی جائے جو بڑی صلاحیت کا آدمی تھا اور جو سوامی جیانندجی کی موت کے بعد سے اب تک آشرم کا کام چلاتا رہا تھا۔

بات آشرم کی ہو یا شراب خانے کی، جیب کترے اپنا سردار چُنتے ہوں یا کاروانِ حرم اپنا میرِ کارواں، کچھ فرق نہیں پڑتا ہے اور اختلافِ رائے کی صورت میں انفرادی رائے دریافت کرنا ضروری ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ یہی بھیکو کے آشرم میں ہوا، اور نوبت انفرادی رائے معلوم کرنے کی آ گئی۔ اور میں انفرادی رائے شماری میں سوامی ناگ داس کثرتِ رائے سے دھرم گرو چُن لیئے گئے۔

اور یہ سب کچھ اُسی دن ہوا، جس دن بھیکو کی بیوی وہاں پہنچی۔

بلکہ اُسی دن رات کے وقت ایک بڑی عجیب بات ہو گئی شامتِ اعمال بھیکو نے سوبھاگیہ وتی کرشن داس جی کے حق میں اپنی رائے دی تھی اور ظاہر ہے اُس کی بیوی نے بھی یہی کچھ کیا تھا لیکن سوامی ناگ داس جی کے چاہنے والوں کو یہ بات بہت بُری لگی تھی

چنانچہ رات کے وقت بات ہی بات میں بات بڑھی اور سوامی ناگ داس جی کے کچھ چاہنے والوں سے بھیکو کی تو تو میں میں ہو گئی ۔ بات اور آگے بڑھی اور بھیکو جس کی ہی بدولت یہ سارا آشرم قائم تھا، بری طرح پٹ گیا اور ساتھ ہی بھیکو کی بیوی بھی ۔

مجبور کر بھیکو کی بیوی نے اُسے بہت سمجھایا کہ آشرم چھوڑ کر چلا چلے ، لیکن بھیکو ایک نہ مانا اور اُس نے ہر دم یہی جواب دیا کہ اُس آشرم کو اُس نے اپنے خون سے سینچا تھا ، آشرم سے اُس کی آتما کا سمبندھ تھا وہ اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا اور جب اُس کی بیوی اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی ، تو وہ کچھ تو چڑ کر ، کچھ گھبرا کر کچھ ڈر کر ، اور کچھ اپنی عزت آبرو کو غیر محفوظ سمجھ کر واپس چلی آئی ۔

اُسی دن جلتی ہوئی دوپہر میں نو میل پیدل چل کر سدارتھ بھیکو کی بیوی کے میکے پہنچا ۔

اُس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا ۔ اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا ۔ کافی دیر تک وہ کچھ اس طرح ہانپتا رہا جیسے اب وہ پیاس کی شدت سے دم توڑ دے گا ۔ اور جب اُسے کچھ ہوش آیا تو اُس نے اپنی چچی کو پرنام کیا ۔ کمل اور بسنتی اُس کے پاس آ گئے تھے ، دونوں ہی کو اُس نے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ۔ جب تک بھیکو کی بیوی کی چھوٹی بہن لسی کا ایک بڑا گلاس لے کر آئی ــــ سدارتھ نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ لسی کا گلاس اُس کے سامنے آ گیا اور اُس نے بھیکو کی بہن کے ہاتھ سے گلاس چھیننے کے سے انداز میں لے کر ایک پل میں گلاس خالی کر دیا اور اپنی آستین سے لب صاف کر کے اُس نے کہا ۔

" اب چلو چاچی ۔ آشرم کا حال بھی تم دیکھ آئیں نا ، بھگوان کی وہ پاک دھرتی ! "

وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا رہا اور جب وہ ہنس چکا تو بھیکو کی بیوی نے پوچھا ۔

" پر اب میں وہاں کس منہ سے جاؤں بیٹے ! "

" بہت تیرے کی " سدارتھ پھر ہنس پڑا ۔ " منہ سے تھوڑا ہی کوئی کہیں جاتا ہے چاچی ۔ بس سے ، ٹم ٹم سے ، بیل گاڑی سے ، جس سے بھی چاہیے چلیے "

اب کے کمل اور بسنتی بھی ہنس پڑے ، اور بھیکو کی بیوی کی چھوٹی بہن بھی ، جس کی ہنسی میں کم سے کم سدارتھ کو ایسا لگا کہ موسیقی مدغم تھی ۔ اور اُس کے لبوں کے بارے میں بھی اُس نے سوچا گلاب کی پنکھڑیوں کے سے تھے اور آنکھوں کے بارے میں بھی وہ سوچ رہا تھا کہ بڑی مست تھیں ۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے نہا کر آئی تھی ، اور سدارتھ اُس کے بھیگے کھلے بالوں کے بارے میں سوچنے ہی کو تھا کہ بھیکو کی بیوی نے پوچھا ۔

" اب تو تجھیا کو گالیاں دینے کا اور بھی مرتع ہے نا ! "

" فی الحال تو نہیں " سدارتھ بڑے اطمینان سے بولا ۔ " یہ سوال کم سے کم چھ مہینے کے بعد اُٹھے گا اور اگر یہ سوال چھ مہینے بعد اُٹھنے کو ہوا تو پھر ہم ایسا کریں گے کہ یہ سوال سولہ سال بعد اُٹھے جب تک تم بوڑھی ہو جاؤ گی اور کمل کمانے لگے گا اُسی کے پاس چلی جانا ، پر یہ سوال اب کبھی نہیں اُٹھے گا ، میں سمجھتا ہوں کبھی نہیں اُٹھے گا ۔ " اُس نے کچھ ایسی نظروں سے بھیکو کی بیوی کی چھوٹی بہن کی طرف دیکھا کہ وہ شرما کر بھاگ گئی ۔

" بیٹے سدارتھ " اُس کی چچی نے بہت بیزاری سے کہا ۔ " تیری باتیں میری سمجھ میں بہت کم آتی ہیں ، بھگوان کے لیے صاف صاف بتانا کیا بات ہے ! "

" بھگوان کے لیے نہیں " سدارتھ پھر بے ڈھنگے پن سے ہنس پڑا ۔ " تمہیں تو صاف صاف بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ۔ ہاں تمہارے لیے میں صاف صاف کہہ سکتا ہوں ، اور وہ یہ ہے کہ ـــ بی ڈی او کو رشوت دینے کے جرم میں باپو کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے ، لہٰذا کم سے کم چھ مہینے کے لیے امن ہے ۔ "

" یہ تو بہت برا ہوا بیٹے " بھیکو کی بیوی کا چہرہ فق ہو گیا لیکن سدارتھ کی بیوی نے پھر کہا ۔

…س طرح تمہارے ظلم کا سوال چھ مہینے تک نہیں اُٹھتا
…باپ سے جیل میں ملیں گے اور انہیں سمجھائیں گے کہ آدمی نہیں
…پر آدمی نہ بن سکے تو دادا کے خون کا قصہ پھر تازہ کیا جاسکتا
…طرح سولہ سال تک تمہارے ساتھ ظلم کا سوال نہیں اُٹھ سکتا
…سمجھتا ہوں چاچی، اب یہ سوال کبھی نہیں اُٹھے گا ……ہاں
……باپو آج بھی جیل سے واپس آجائیں تب بھی نہیں۔"
…سے کیسے ہ؟" بھیکو کی بیوی نے پوچھا۔
…ماں بتلائے گی۔" سلارتھ ہنس پڑا —— "لیکن ایک گلاس
اور لسی منگواؤ نا!"
"شریر کہیں کے۔" بھیکو کی بیوی نے اُسے ایک چپت لگائی
اور پھر سینے سے لگا کر بولی —— "میں سب سمجھ گئی گدھے میں
سب کچھ سمجھ گئی۔"
اور اُس دن سلارتھ وہیں رہ گیا۔ دوسرے دن صبح سویرے
جب سارا پورب ایک نئی صبح کی آمد کی خوشی میں سُرخ ہو رہا تھا۔
سلارتھ اپنی چچی، کمل اور بسنتی کے علاوہ ایک عجیب و غریب
کسک ساتھ لیے واپس لوٹ رہا تھا!

▲▲▲

نکہت اقبال

ماحصل

میرے نزدیک یہ کوئی خوبصورت بات نہیں تھی کہ انسان حیوان کے لیے دست و گریباں ہو جائیں اور اعلیٰ قدروں کو نظر انداز کر دیں اور ایک کتے کے لیے جھگڑنے لگیں ــــــ ایک کتا انسانوں میں تفرقہ ڈال دے ۔!

آج پھر کتے کی پیشی تھی اور جوں ہی میں کورٹ میں داخل ہوئی تو نگاہ پڑتے ہی میرے خیالات اس نقطہ پر ایک بار پھر مرکوز ہو گئے ۔ میں نے دیکھا کہ وہ جوان اور خوبصورت لڑکی مغموم لیکن پُر اُمید نگاہوں سے ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھے گھور رہی ہے دوسری طرف وہ نوجوان آدمی بڑی بے نیازی سے کسی قدر مشکوک نگاہوں سے مجھے گھور رہا ہے ۔ کوشش کے باوجود کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے میں زیرِ لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکی ۔!

اس خوبصورت جوان لڑکی اور اس جوان مرد کو جب بھی پیشی کے دن کمرۂ عدالت میں موجود پایا تو اسی طرح مجھے ہنسی ضرور آئی ، اس خیال کے تحت کہ وہ دونوں اس عمر میں ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں ۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ دونوں ایک کتے کے لیے لڑ رہے تھے ــــ کہاں انسان اور کہاں کتا ــــ !!

اس جوان اور خوبصورت لڑکی اور اس نوجوان میں کتے کی ملکیت کا جھگڑا تھا ۔ کتے کے لیے ان دونوں کے دعوے متضاد تھے ۔ یہاں تک کہ معاملہ عدالت تک آ پہنچا اور فیصلہ مجھے کرنا تھا کہ ان دونوں میں اُس کتے کا حقیقی مالک کون ہے ۔ ان میں سے کس کا دعویٰ صحیح ہے اور کس کا غلط ۔!

پیشکار نے جس مقدمے کی فائل میرے سامنے رکھی وہ کتے کے مقدمے کی تھی ۔ جس سے یہ اندازہ لگانا میرے لیے دشوار نہیں تھا کہ پیشکار کو اس خوبصورت جوان لڑکی سے ہمدردی ہے اور وہ لڑکی کا طرفدار ہے ــــ !

فائل کے ساتھ ہی پیشکار نے اشارہ کیا اور وہ دونوں عدالت کے جنگلے کے پاس آ گئے ۔ کارروائی انصاف کا آغاز مجھے ایک کتے کے مقدمے سے کرتے ہوئے کوفت ہو رہی تھی ۔ آخر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور پوچھا :

" کہیے صلح کی گنجائش نہیں نکلی ؟"

"جی نہیں"۔

لڑکی نے انتہائی سنجیدگی اور غم کے ساتھ اپنے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تب میں نے نوجوان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ اس نے مودبانہ لیکن بڑے استقلال سے کہا۔ "مس فروزا اپنی ضد پر قائم ہیں ...!"

"کتا میرا ہے"! مس فروزا نے فوراً تردید کرتے ہوئے کہا۔

ایک نظر میں ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اور فائل پر نگاہ ڈالتے ہوئے آخر میں نے کہا۔

"بہتر ہے آپ دونوں راضی نامہ کر لیں۔ ایک کتے کے لیے لڑنا کوئی مفید بات نہیں"۔

"میں یہی چاہتا ہوں"۔ اسٹیورٹ نے سر کو خم کرتے ہوئے کہا۔ "میری کوشش یہی ہے"۔

"مسٹر اسٹیورٹ نے میرا پیارا کتا چرایا ہے"! مس فروزا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "صلح ممکن نہیں"۔

اس کی آواز میں غم چھپا ہوا تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہے۔ آخر میں نے کہا۔

"آپ دونوں پھر کوشش کریں"۔

یہ کہہ کر میں نے فائل پر آرڈر لکھ دیا اور پیشی ملتوی کر دی آرڈر لکھ کر جب میں نے نگاہیں اٹھائیں تو نوجوان کو مس فروزا کو گھورتے پایا جبکہ وہ خود گاندھی جی کی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جو عقبی دیوار پر آویزاں تھی۔ اُسے پیشی بڑھنے کا یقیناً ملال تھا میں اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا شکوہ دیکھ سکتی تھی۔ میری اس حرکت سے وہ خوش نہیں تھی اور ہو سکتا ہے کہ اسے مجھ سے محض اس لیے گہری شکایت بھی ہو کیونکہ اسے اپنے ہم جنس مجسٹریٹ سے اس بے نیازی کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ جبکہ نوجوان کے لبوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔

فائل پیشکار نے لے لی۔ اگلی تاریخ کا اعلان کیا۔ پہلے مس فروزا نے دستخط کیے، بعد میں فریقِ مخالف نے۔ پھر دونوں چلے گئے۔ اسٹیورٹ، مس فروزا کو اب تک گھور رہا تھا۔ جب کہ وہ منہ پھلائے تیز قدموں سے کمرۂ عدالت سے نکل جانا چاہتی تھی ــــ:

کتے کی ملکیت کا مقدمہ سیدھا سادا تھا۔ شہادت سے مبرّا۔ بس دونوں کا دعویٰ اپنے اپنے دعوے تک محدود تھا۔

اگلی پیشی پر وہ دونوں بغیر صلح کے پھر موجود تھے۔ کتے نے ان دونوں کو ملنے نہیں دیا تھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ مقدمہ کا آغاز کر دوں اور فیصلہ کر دوں۔ نوجوان ہمیشہ کی طرح آج بھی مطمئن نظر آ رہا تھا اور برابر مس فروزا کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ مس فروزا پہلے کی طرح آج بھی سنجیدہ مغموم اور غیر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ آج بھی اس نے ایک بار بھی اپنے مخالف کی سمت بھولے سے بھی نہیں دیکھا۔

"کتا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری حفاظت میں"۔ نوجوان نے مس فروزا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کل ساتھ لائیے"۔

"بہت اچھا"۔

"کل تک پیشی ملتوی"۔

میں نے آرڈر لکھا۔ مس فروزا خاموش تھی اور اسٹیورٹ خوش تھا۔ جب وہ باہر جا رہا تھا تو حسب عادت مس فروزا ہی کو گھور رہا تھا اور وہ اسٹیورٹ کی طرف بغیر دیکھے باہر جا رہی تھی۔

رات میں کافی پریشان رہی کہ مقدمہ کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ اس لیے کہ رسید خریداری یا کوئی دوسری شہادت ان میں سے کسی کے پاس نہیں تھی محض اپنے بیانات کے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فیصلہ ہو تو کیونکر ہو...!؟

دوسرے دن "قبضہ مخالفانہ" کے مقدمہ کا آغاز ہوا۔ الزام اپنے معنوی لحاظ سے بہت وسیع تھا، لیکن جس مقدمے کی فائل میرے سامنے تھی اس سے مخصوص طور پر مراد غیر قانونی انداز سے دوسرے

کے گتے کو اپنے قبضہ میں رکھنا تھا۔ مس فرزانہ اور ملزم اسٹیورٹ دونوں عدالت میں موجود تھے۔

سب سے پہلے مس فرزانہ جو ہلکے آسمانی رنگ کی فراک پہنے تھی اپنے دعوے کا اعادہ کرنے کی غرض سے سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا:

"میرے گتے کا نام مارشل ہے، دو سال کی عمر ہے اس کی۔ اور میں نے اسے جب وہ پلہ تھا خریدا تھا۔ ڈیڑھ سال میرے پاس رہا پھر اچانک چھ ماہ قبل کسی نے اسے چرا لیا۔ بعد کوشش اسے مسٹر اسٹیورٹ کے پاس پایا جو میرا اپنا پیارا گتا ہے۔"

مختصر سے بیان کے بعد، شہادت میں مس فرزانہ کی ماں نے یوں بیان کیا:

"میری لڑکی نے مارشل کو دو سال قبل خریدا تھا۔ چھ ماہ پہلے اسے کسی نے چرا لیا۔ تلاش کے بعد مارشل کو مسٹر اسٹیورٹ کے پاس پایا۔ چونکہ مسٹر اسٹیورٹ، مارشل کو واپس کرنے پر آمادہ نہیں، تب مجبوراً انصاف کے لیئے عدالت کو رجوع کرنا پڑا۔"

ملزم کا بیان اتنا ہی مختصر تھا۔ اس نے ماں بیٹی کی نہ صرف تردید کی بلکہ دعویٰ کیا کہ مارشل کو اس نے خریدا تھا اور خود ہی اس نے پالا ہے۔ گتا اس کا ہے نہ کہ مس فرزانہ کا۔"

بیانات کے دوران، میرا ذہن بغداد کے اس قاضی کی طرف چلا گیا جس نے ایک گھوڑے کا فیصلہ کیا تھا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا تھا۔ جس پر خوش ہو کر خلیفہ بغداد نے اسے اپنا وزیر بنا دیا کیونکہ گھوڑا خود خلیفہ کا تھا جس پر ایک فقیر نے غلط دعویٰ کیا تھا جبکہ خلیفہ بھیس بدل کر قاضی کے انصاف کا امتحان لینے آیا تھا۔

"گتا ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"باڑہ کمرے میں"۔ ملزم نے برجستہ جواب دیا۔

"آپ کے پاس لائسنس ہے؟"

ملزم نے باقاعدہ لائسنس دکھلا دیا۔

"میں انصاف کا قدیم طریقہ اختیار کروں گی" میں نے کہا۔

"آپ لوگ حرف بحرف تعمیل کریں۔"

دونوں نے آمادگی ظاہر کی۔ مجھ ہو کر جیسے ملزم کو یہ ڈر کتا تھا کہ اپنی نگاہیں عدالت کی طرف رکھے نہ کہ مدعیہ کی طرف۔ جس پر کمرۂ عدالت میں ہنسی بکھر گئی۔ میں نے مس فرزانہ اور اس کی ماں کو اشارہ کیا اور حسب ہدایت دونوں کمرۂ عدالت سے چلی گئیں اور ملزم کو میں نے اپنی کرسی کے عقب میں دیوار سے لگ کر کھڑے ہونے کی ہدایت کی۔ اس تماشے کو دیکھنے کے لیئے ہر آدمی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور گتا تیزی سے کمرۂ عدالت میں داخل ہوا۔

سب خاموش تھے لیکن ہر نگاہ مارشل پر لگی تھی۔ اندر آتے ہی مارشل ٹھٹک گیا۔ ہوا میں سونگھنے لگا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈالی۔ دائیں بائیں منہ اٹھا کر دیکھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنے مالک کی خوشبو سونگھ چکا ہے، لیکن پریشان یوں ہے کہ اسے مالک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی حیرانی بجا تھی۔ اس لیئے کہ اس کا مالک ڈائس پر میری کرسی کے عقب میں خاموش کھڑا تھا۔

مارشل نے ادھر ادھر چکر لگایا۔ پھر منہ اٹھا کر سامنے دیکھا اور خوش ہو کر آواز کے ساتھ جست لگائی اور اپنے مالک کو دیکھ کر اچھلنے اور ناچنے لگا۔ مارشل کی خوشی بے حساب تھی جو گتے کو یقیناً اسی وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے مالک کو پا لیتا ہے۔

کھیل ختم ہو گیا تھا۔ گتے کی خوشی اور حرکات و سکنات نے ملزم کے دعوے کی تائید کر دی تھی۔ میرا اشارہ پا کر ملزم نے مارشل کو تھپکا اور چمکارا پھر بموجب حکم کمرے سے چلا گیا اور مارشل کو اس سے جدا کر دیا گیا۔

اب مس فرزانہ اور اس کی ماں کی باری تھی۔ مس فرزانہ کی جگہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی، جہاں اس کا مالک کھڑا تھا اور ماں کو میں نے اس بنچ پر بٹھا دیا جو دروازے کے پاس پڑی تھی اور جس پر کئی اور لوگ بیٹھے تھے۔

مارشل دوبارہ تیزی سے داخل ہوا۔ سب اسے گھور رہے تھے

بار نہ وہ ٹھٹکا نہ رُکا نہ حیران ہوا بلکہ سیدھا ڈائس کی طرف بڑھا ں فروزا کی طرف پلٹ گیا جو ساکت بنی کھڑی تھی، لیکن جس کی ں چمک رہی تھیں۔

اچانک مارشل ٹھٹکا ـــــ غور سے اس نے مس فروزا کو ہا اور خلافِ اُمید تیزی سے لوٹ گیا۔ میں نے مس فروزا کے گالوں ردی دیکھی اور آنکھوں کی چمک ماند ہوتے ـــــ مارشل دروازے پاس جا کر رُک گیا۔ پلٹ کر اُس نے مس فروزا کو دیکھا اور بھونکنے لگا۔

"باؤں!"

لیکن اس کی آواز میں غصہ یا تلخی نہیں بلکہ حیوان کی محبت موجود تھی!۔

اچانک مارشل نے زمین کی طرف مُنہ جُھکایا اور بنچ کے قریب پہنچ کر پیر سونگھنے لگا۔ جب وہ مس فروزا کے پاس پہنچا تو مُنہ اُٹھا کر دُم ہلانے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ اُچک کر پھر ڈائس پر آیا اور مس فروزا کے پیٹ پر دونوں اگلے پنجے رکھ کر دُم ہلانے لگا۔ تب میرا اشارہ پا کر مس فروزا جُھکی اور کُتے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی:

"مارشل! ـــــ مارشل ڈارلنگ!" ـــــ

اور وہ اسی طرح اظہارِ محبت کرنے لگا جس طرح کے اسٹیورٹ کے ساتھ کر رہا تھا۔ مس فروزا پہلی بار مُسکرائی اور اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"مارشل میرا ہے"!

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مارشل کو جُدا کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ لیکن مارشل کو چند لمحوں بعد کمرے سے ہٹا دیا گیا۔ جب وہ جا رہا تھا تو مس فروزا بڑی حسرت و یاس سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

مُلزم کٹہرے میں آ چکا تھا اور حسبِ عادت مس فروزا کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔

"مس فروزا"! میں نے پُوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی ایسا ٹھوس ثبوت ہے، جس سے مارشل پر اپنا حق ثابت کر سکیں"؟

وہ میرے سوال پر گھبرا گئی۔ چونک کر اس نے میری طرف دیکھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ "یہ ثبوت کافی ہے کہ مارشل نہ صرف مجھے پہچان گیا بلکہ اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بھی کیا"!

آخر میں نے قلم اُٹھایا اور آرڈر شیٹ پر یُوں حکم تحریر کیا۔

"کُتا مسٹر اسٹیورٹ کو دے دیا جائے، مس فروزا کا کُتے پر کوئی حق نہیں اور نہ وہ کوئی ثبوت پیش کر سکی ہے۔ مس فروزا کا دعویٰ خارج کیا جاتا ہے، مصارف دونوں فریق خود برداشت کریں"۔

یہ لکھ کر میں نے مس فروزا کی طرف دیکھے بغیر فائل پیشکار کی طرف پھینک دی۔ جس نے جھپٹ کر فائل لی، میرا حکم پڑھا اور بڑی حسرت سے مس فروزا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"مس صاحبہ! آپ کیس ہار گئیں۔ کُتا مسٹر اسٹیورٹ کا ہے"

اچانک مس فروزا کو اس کی ماں نے سنبھال لیا۔ کیونکہ وہ حکم سُنتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اُسے میز پر لٹا دیا گیا اور وہ کوئی پندرہ منٹ تک بیہوش رہی۔ مجھے دُکھ ہوا، لیکن میں مجبور تھا کیونکہ کُتا مس فروزا کا ہرگز نہیں تھا۔

مسٹر اسٹیورٹ نے مس فروزا کی مدد کرنی چاہی تو اس کی ماں نے یہ کہہ کر اُسے روک دیا:

"تھینک یُو مسٹر اسٹیورٹ"!

لیکن اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اسے مس فروزا کے بیہوش ہو جانے کا واقعی غم ہے، لیکن مجبور تھا مدد نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ شاید وہ اپنی طرف سے انسانیت کا مظاہرہ کرے گا اور کُتا مس فروزا کو دے دے گا ـــــ میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ ایسا کرے۔ اس لیے کہ کُتا انسان سے کسی طرح بڑا اور قیمتی نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے اس وقت دُکھ ہوا، جب مسٹر اسٹیورٹ نے کُتے کو انسان پر ترجیح دی۔

پہلے وہ مارشل کو لے کر گیا ـــــ تھوڑی دیر بعد مس فروزا

نڈھال ہوکر اپنی ماں کے کاندھے کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے کمرہ عدالت سے چلی گئی۔ اور اس طرح کُتے کا مقدمہ ختم ہوگیا۔!

کئی ماہ گزر گئے ——

ایک روز اچانک عدالت سے گھر جاتے ہوئے ایک پارک کے قریب میں نے کار روک دی اور غور سے پارک کی طرف دیکھنے لگی، پہلے تو یقین نہیں آیا، لیکن بعد میں مجھے یقین ہوگیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ دھوکا نہیں حقیقت ہے۔!

مس فروزا اور مسٹر اسٹیورٹ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پارک میں ٹہل رہے تھے اور دونوں مارشل کر تلا بازیاں کھاتے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ میں یہ تماشا دیکھتی رہی اور جب وہ دونوں پارک سے ہوکر باہر سڑک پر آئے تو میں نے ہاتھ نکال کر مس فروزا کو روکا اور کہا "مارشل مبارک ہو!"

پہلے وہ چکرا گئی پھر پہچان گئی۔ اس کے چہرے پر سُرخی آگئی اور مسٹر اسٹیورٹ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں مسٹر اسٹیورٹ کی شکر گزار ہوں کہ کُتا انہوں نے مجھے دے دیا ...!"

میں نے مسٹر اسٹیورٹ کی طرف دیکھا تو اُس نے ہنستے ہوئے کہا —— "میرا ہی فرض تھا —— مجھے انسان عزیز ہے نہ کہ کُتا ....!"

میں نے مسٹر اسٹیورٹ کی تائید کی اور اسے سراہا، پھر کار اسٹارٹ کی اور ان دونوں کو خوش و خرم چھوڑ کر چلی گئی ——

راستے میں یہ خیال آتا رہا کہ ایک کُتے نے اگر ان دونوں کو لڑایا تھا تو اُسی نے ملا بھی دیا —— جبکہ آج کی دُنیا میں انسان سے بھی ملاپ کرانے کی اُمید کم ہی کی جاسکتی ہے۔!

چند ہفتوں بعد کسی نے مجھے بتایا کہ مسٹر اسٹیورٹ اور مس فروزا کی شادی ہوگئی ہے —— اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مس فروزا چونکہ مغرور لڑکی تھی اور اسٹیورٹ کو مُنہ نہیں لگاتی تھی، اس لیئے اسٹیورٹ نے مس فروزا کی محبت جیتنے کے لیئے کُتے کو چرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح وہ اپنی محبت میں کامیاب ہوجائے گا۔ اور وہی ہوا۔ اگر اسٹیورٹ ایسا نہ کرتا تو اُسے اس کی محبت نہیں مل سکتی تھی۔ کُتا چُرا کر کسی حسینہ کی محبت حاصل کرنے کا طریقہ اس سے قبل میرے علم میں نہیں آیا تھا —— لیکن مجھے افسوس یہ تھا کہ اسٹیورٹ نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا اور میرے پہلے فیصلے پر پانی پھیر دیا تھا —— لیکن خوشی یہ تھی کہ کُتے نے دو محبت کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیئے ایک کر دیا تھا —— اور میں اُمید نہیں کرسکتی کہ وہ دونوں اپنی ازدواجی زندگی میں کبھی کُتوں کی طرح لڑیں اور جھگڑیں گے بھی ——!!

▲▲▲

اُلٹے پیر

از: انیس نجمی امروہوی

★

یہ کئی دن پہلے کی بات ہے کہ وہ کسی فلم کا آخری شو دیکھ کر گھر واپس جانا چاہتا تھا۔ اس دن سردی بلا کی تھی اور اس کے ہاتھ سرد ہواؤں سے برف کی مانند ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اسے اب تک باوجود تلاش کے کوئی رکشہ نہیں مل سکا تھا۔ کیونکہ فلم کے اختتام پر چند لمحوں بعد جیسے ہی وہ ہال سے باہر نکلا تو سب ہی رکشے ایکدم مختلف سمتوں کو جانے والے لوگوں کے لیئے پُر ہو گئے اور چلے گئے۔ اس کا گھر سینما ہال سے کافی دُور تھا۔ وہ دیر سے سینما کی باؤنڈری کے اندر کھڑا ہوا بڑی شدت کے ساتھ اب اس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ جائے۔ یہ گہری سوچ اس وقت منتشر ہوئی، جب اس نے پیدل چلنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ بالکل ہی اچانک نہ جانے کیوں کر اُسکے ذہن کو یہ بے معنی خیال بُری طرح ستانے لگا کہ اس کے مرحوم بزرگوں نے پچھلے وقتوں میں سینما ہال سے اس قدر دُور مکان کے لیئے زمین پسند کر کے کسی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ جبکہ آج بھی اس کے قُرب میں بے شمار پلاٹ ایسے خالی پڑے ہیں جن پر اس کے جیسے کتنے ہی مکان بہ آسانی تعمیر کیئے جا سکتے ہیں۔ کچھ دیر تک چلتے چلتے اور سوچتے سوچتے اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ ایکدم اس کے ذہن میں ایک نیا خیال اُبھر آیا۔ اور اس نئے خیال نے اس کے پچھلے خیال کی یوں تردید کر دی کہ گئے وقتوں میں سینما اس قدر عام کب تھا کہ اس کے قصبے میں بھی سینما ہال کا وجود ہوتا جو اس کے آبا و اجداد بھی اس کی طرح شوقین بن سکتے اور کسی سرد رات میں بالکل اسی طرح پیدل چلتے ہوئے انہیں بھی اس طویل فاصلے کا کبھی احساس ہو سکتا۔ یہ تو آج کا ترقی یافتہ دَور ہے کہ ہر ضروری اور غیر ضروری چیز نے آزادی کے بعد مُلک میں لامحدود ترقی کر لی ہے۔ اب ہر چیز کسی خاص شہر، خاص محلے، خاص طبقے یا کسی خاص شخص کے لیئے مخصوص نہیں رہی۔ بھُوک بیکاری اور مہنگائی اب ہر چھوٹے بڑے شہر میں دیکھنے کو ملتی ہے مختلف قسم کے ڈاکو چور اور اُچکے ہر شہر کی ہر گلی اور ہر محلے میں عمومیت کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ کرپشن کا تسلط دھیرے دھیرے ملک کی زندگی کے ہر شعبے پر ہو گیا ہے۔ فرقہ پرستی اور صوبہ پرستی

مختلف صورتوں میں ملک کے ہر گوشے میں ترقی کر رہی ہے۔ موجودہ دور نے رشوت کے "لینے والے" ہاتھ کو "دینے والے" ہاتھ کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ باوجود کوششوں کے کوئی ہاتھ 'ہاتھ' نہیں آتا۔

یہ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں فلم کی پوری کہانی گھوم گئی اور وہ تمام خوبصورت مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگے جنہیں کچھ دیر پہلے پردۂ سیمیں پر دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ مناظر تھے جن کو فلمانے کے لیئے فلم پروڈیوسر نے لاکھوں روپے صرف کیئے تھے۔ ملک کی کرنسی اُن ممالک میں جاکر خرچ کی تھی جہاں وہ اصل مناظر موجود تھے اس فلم کی پبلسٹی میں بھی پروڈیوسر نے بڑی جدت سے کام لیا تھا فلم کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ فلم سرکار کی طرف سے قانونی طور پر صرف بالغان کے دیکھنے کے لیئے مخصوص تھی لیکن وہ یہ سوچکر اب تک حیرت زدہ تھا کہ فلم دیکھ کر ہال سے نکلنے والے زیادہ نابالغ ہی تھے۔ اس نے سوچا یہ بھی شاید ملک کا ترقی کی طرف ایک قدم ہے کہ اب بچے وقت سے پہلے بالغ ہو رہے ہیں یا پھر ہو سکتا ہے..... وہ یہ سوچکر دُکھی ہوا کہ اب قانون صرف قانون کی کتابوں میں پڑھنے کے لیئے رہ گیا ہے اور عملی زندگی سے اس کا تعلق مٹتا جا رہا ہے۔ اتنا سوچنے کے بعد اس کا ذہن فلم کی کہانی اور اس کے کرداروں میں اس مقام پر اُلجھ گیا: جہاں فلمی دُنیا کا ایک مشہور ہیرو ایک مزدور اُمیدوار کے رول میں سرمایہ دارانہ نظام اور کالے روپے کی مخالفت میں بڑی اثر انگیز تقریر کرتا ہے اور الیکشن جیت جاتا ہے۔ فلمی اداکاری سے ہٹ کر اس کا ذہن ہیرو کی اصل زندگی کا جائزہ لینے میں محو ہو جاتا ہے۔ جس کے پس منظر میں کئی لاکھ کا سرمایہ موجود ہے۔ ہیرو کی فلمی اور نجی زندگی کے اس تضاد پر اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اور سوچتے سوچتے اس کی نگاہوں میں اس کے اپنے شہر کے کتنے ہی چہرے گھوم گئے جو اس ہیرو سے کہیں زیادہ ناجائز دولت کے مالک تھے اور مزدوروں کے لیڈر کہلاتے تھے۔ وہ ہیرو کے بارے میں اور بہت کچھ سوچتا لیکن فلم کی کہانی سے ہٹ کر ایک دم اس کا ذہن نیوز ریل میں فلمائے

گئے درگاپور، رورکیلا اور بھلائی کے ان مناظر میں پھنس گ فولاد کے کارخانوں میں فولاد پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور ا وجود سے ملکی اور غیر ملکی ضرورتوں کے واسطے مختلف قسم کی ا ڈھالی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا انسانی دماغ کی ترقی کی ا سے زیادہ اور کیا معراج ہو سکتی ہے کہ اس نے فولاد جیسی ٹھ چیز کو آج پانی کی شکل دے دی ہے اور اس ایٹمی دور میں ، جس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، ڈھال لیتا ہے۔ اور ا لمحے اسے یہ خیال بڑا بھلا معلوم ہوا اور دل ہی دل میں اس خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ آج یہ سب کچھ اس کے اپنے ملا ہو رہا ہے۔ اور یہ ملک کی آزادی کا ایک بہت بڑا تحفہ ہے بدنصیبی سے ملک آزاد نہ ہوتا تو یہ چیزیں شاید صدیوں تک ا مُنہ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ فولاد کی ان بڑی بڑی بھٹیوں کے تصور ک اسے ہندوستان کی کئی آنے والی نسلوں کا مستقبل تابناک نظر آ

اس نے چلتے چلتے سڑک کے بلب کی روشنی میں اپنی میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔ اور ابھی اس کا گھر کافی د ٹائم دیکھنے کے بعد نہ جانے کیوں اس کا ذہن سڑکوں کی سُنسا میں پھنس گیا اور یکلخت اس کے دل میں کچھ بے معنی خدشات لینے لگے۔ سُنسان سڑک کا سنّاٹا۔ آدھی رات کا وقت اور اس کے ہی پیروں کی آواز، نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لیئے طلسماتی احساس پیدا کرنے لگی۔ اچانک اسے پچھلے دنوں ہو وہ تمام چوری کی وارداتیں یاد آگئیں جو قلعہ کی کمر توڑ مہنگائی کی سے اس کے شہر میں شروع ہو گئی تھیں اور جن پر چاہتے ہو پولیس قابو نہ پا سکی تھی۔ اتنے سارے خیال یکجا ہونے کے اس نے اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھنا شروع کر دیا خیال کیا کہیں اس وقت تو کوئی چور اِدھر اُدھر گشت نہیں کر وہ چوک کے موڑ سے کچھ دُور آگے بڑھا ہوگا کہ چونک گیا۔ و کسی تعارف کے کئی دیسی کتوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ و ٹھٹک کر رُک گیا اور ڈر کر پیچھے کی جانب لوٹا۔ راستہ تبدیل

کے بعد دوسرے راستے پر چلنے لگا۔ "سول اسٹریٹ" پر بھی وہی سنسانی کیفیت تھی۔ اس نے اپنی چال کا گیر بدل کر چال کو ذرا اور تیز کر دیا اور درمیانی سُروں میں کسی فلم کا گیت گانا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے اپنی منزل کے چند ہی قدم طے کیئے ہوں گے اسے گلی کی دوسری جانب سے ایک سایہ آتا ہوا دکھائی دیا اور کسی انجانے ڈر سے اس کی چال خود بخود دھیمی پڑ گئی۔ وہ سایہ اگرچہ کافی دُور تھا لیکن وہ جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی، جا رہی تھیں اور اسے اپنی قوتِ فیصلہ بھی جواب دیتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لمحے وہ کچھ نہیں سمجھ پایا کہ کیا کرے؟ آگے بڑھے یا پیچھے لوٹ جائے۔ پھر بھی غیر ارادی طور پر اس کے قدم آگے کی جانب بڑھتے ہی رہے۔ جب وہ سایہ تھوڑی دُور رہ گیا تو اس کے پیروں کی چاپ کے ساتھ ایک لاٹھی کے زمین پر ٹیکنے کی آواز اسکی سماعت سے ٹکرائی اور جب اس نے زیادہ غور سے ان تمام آوازوں کو یکجا سُنا تو ان آوازوں کے ساتھ ایک انسانی کراہٹ بھی معلوم ہوئی جو شائد اسی کے مُنہ سے نکل رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیئے پھر اُس کے ذہن میں شب کی راہزنی کے کئی واقعات بڑی تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگے۔ احتیاطاً اس نے سڑک کی دائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر وہ ایکدم اس پر حملہ آور ہوگا تو اس کی حرکات و سکنات سے کسی قدر پہلے ضرور علم ہو جائیگا اور اسطرح اسے اپنے دفاع میں آسانی رہے گی۔ جب وہ سایہ اس کے بالکل متوازی آگیا تو غیر اختیاری طور پر گھبراہٹ میں ایکدم اس کے مُنہ سے نکل گیا۔ "کون؟" وہ سایہ جواب میں کچھ بھی نہ بولا اور اس کی طرح سڑک کی بائیں طرف چلتا ہی رہا۔ اسے اب سائے کی پُراسراریت مزید بڑھتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور جلد ہی اپنی اس بیوقوفی پر نادم سا ہو کر سوچنے لگا کہ اس نے اس طرح اسے کیوں ٹوک دیا۔ اگرچہ اب وہ پُراسرار سایہ اس کے طے کیئے ہوئے راستے پر دھیرے دھیرے چلتا ہوا دُور نکل چکا تھا لیکن اسے اچانک ہی مختلف لوگوں کے کہے ہوئے وہ تمام واقعات اور نصیحتیں یاد آگئیں جو اکثر رات کی راہزنی کے قصے سُنانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ رات میں کسی بھی اجنبی شخص کو ٹوکنا اچھا نہیں ہوتا۔ کیونکہ آدھی راتوں میں پھرنے والے اکثر چور ہی ہوتے ہیں اور ٹوکنے سے اُن کے شگون خراب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بدشگونی کی وجہ سے غصے میں آکر کبھی کبھی ٹوکنے والے کی جان لینے سے بھی گُریز نہیں کرتے۔ اس نے سکون کی گہری سانس لی اور سوچنے لگا کہ چلو اچھا ہی ہوا یہ چور زیادہ جذباتی یا پُرانے خیالات رکھنے والا نہیں تھا ورنہ اُسے اپنی خطا پر جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

چند قدم اور طے کرنے کے بعد اسے ایک بالکل نیا خدشہ ستانے لگا کہ کبھی کبھی اندھیری راتوں میں آسیبی بلائیں بھی اکیلے آدمی کو انسانی رُوپ دھار کر ڈرانے لگتی ہیں۔ اگرچہ وہ ان میں یقین نہیں رکھتا تھا لیکن بعض ذمہ دار لوگوں کے واقعات تو جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ ایک بار تو اس کے ہی قریبی دوست فریدہ آرٹسٹ نے اپنے ساتھ گذرا ہوا آسیب کا ایک ایسا ڈراؤنا واقعہ سُنایا تھا کہ اسے سُن کر اس کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے تھے اور اس رات ویسی ہی آسیبی شکل اسے خواب میں بھی دکھائی دینے لگی تھی وہ سوتے میں چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا تھا اور اس کے گھر کے تمام افراد اس کی اس بھیانک چیخ سے اس سے کہیں زیادہ ڈر گئے تھے۔

ہو سکتا ہے یہ بھی انہیں میں سے کوئی شئے ہو اور اسے اکیلا دیکھ کر ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو، ورنہ اس کا نہ بولنا کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن آسیبی بلاؤں کی پہچان کے لیئے ایک بات ضروری ہے اور کہنے والوں کا یہ بھی کہنا ہے یہاں تک کہ فر نے بھی یہی بات کہی تھی کہ ایسی بلائیں اگر کسی شخص کو ڈرانے ک لیئے انسانی رُوپ دھار لیتی ہیں تو ان کے پیروں کے پنجے ہمیشہ پیچھے کی طرف ہوتے ہیں اور عموماً ایسے حادثات جمعرات کی ر میں اکثر رُونما ہوا کرتے ہیں۔ آج کونسا دن ہے؟ اس نے جب اپنے دل سے سوال کیا۔ کل بدھ کا دن تھا تو آج جمعرات کا دن ہونا چاہیئے۔ اس کے دل نے جواب دیا۔ یہ سوچکر اسے ک

ر کا احساس ہوا اور اس کے رُونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا
م سنسنانے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خیال کیا یہ آسیب
غیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی ہوگی بلکہ یہ سب آدمی کا وہم ہوتا ہوگا' جو
س کے احساس کی خواہش کے ساتھ ساتھ بنتا بگڑتا رہتا ہوگا اور
ر ہے بھی تو وہ انسان سے زیادہ طاقتور ہرگز نہیں۔ اس نے فیصلہ کن
داز میں سوچا' لیکن اس نے اس وقت اس کے پیروں کی طرف
ھیان کیوں نہیں دیا۔ وہ اپنی اس بھول پر کئی ثانیوں تک پچھتاتا
ہا۔

یکایک وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسے
پسینہ آگیا ہے۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اُسے واقعی
پسینہ کی ننھی ننھی بُوندیں محسوس ہوئیں۔ اس نے اسی وقت جیب
سے رُومال نکال کر پیشانی کے اُن قطروں کو صاف کیا اور ساتھ ہی
ساتھ اپنے ہوش وحواس بھی دُرست کیے اور پھر گھر کی جانب تیز
تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ اس نے سوچا دُنیا نے جتنی ترقی کر لی
ہے اس سے کہیں زیادہ آج انسان، انسان سے ڈرنے لگا ہے۔ وہ
سایہ نہ تو کوئی آسیب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی چور بلکہ ایک عام شخص
ہی ہوگا اور اسے اس شخص سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیئے تھا۔ اگر اس وقت
کوئی اس کے خوفزدہ چہرہ کی کیفیت دیکھ لیتا تو اس کا کسقدر مذاق
اڑاتا۔ چلو اچھا ہی ہوا اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ یہ
سوچتے ہی ایک پُرسکون مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی اور
وہ پھر اپنی سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اسے پھر
خیال آیا، انسان جسقدر ڈرنا چاہیئے ڈر سکتا ہے اور جتنا نڈر
بننا چاہے' نڈر بن سکتا ہے۔ یہ سب اس کے اپنے احساسات پر
مبنی ہوتا ہے۔ ڈر، اصلیت میں کوئی چیز نہیں' ہم جس کسی شئے
کے بارے میں جسقدر بھی بھیانک خیال رکھنے لگتے ہیں وہ ہمارے
تصور کے لیئے اس خیال سے کہیں زیادہ بھیانک اور خطرناک
بنی شروع ہوجاتی ہے۔ یہاں لوگ سانپ کو دیکھ کر ہی ڈرجاتے
ہیں جبکہ بعض علاقے ملک میں ایسے بھی ہیں جہاں پر سانپ بطور غذا

کے استعمال کیئے جاتے ہیں۔ دراصل غلطی اسی کی ہے۔ اس نے اس
شخص کے بارے میں پہلے ہی سے غلط رائے قائم کر لی تھی۔
لیکن وہ اس کے معلوم کرنے کے باوجود بھی بولا کیوں نہیں!
اس کے ذہن کی وسعتوں میں ایک شک اور اُبھرا۔
ہو سکتا ہے وہ بہرہ ہو۔ ذہن نے دوسرے ہی لمحہ اسکے
شک کی فوراً تردید کر دی۔ لیکن اتنی رات گئے وہ کہاں جارہا ہے؟
یہ وقت تو کسی شریف آدمی کے گھر سے باہر نکلنے کا ہے نہیں لیکن
تم اپنے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو' کیونکہ تم بھی تو اس وقت
اپنے گھر سے باہر ہو۔ اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔
"میں بھی تو اس وقت گھر سے باہر ہی ہوں" اس نے
اس آواز کا جواب اپنے دل میں دیا۔
تو پھر ٹھیک ہے یہ سایہ بھی ہرگز چور نہیں ہو سکتا! اس
نے فیصلہ کن انداز میں سوچا پھر کیوں نہ اس سے معلوم کر لیا جائے
ممکن ہے وہ کسی غیر متوقع پریشانی سے مجبور ہو کر اتنے غیر وقت
گھر سے نکلا ہو۔ اب ایک بہتر بات یہی ہے کہ اسے اس کی
پریشانی میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ انسانیت اسی کا نام ہے کہ انسان
انسان کی تکلیف میں کام آئے!۔ اس کے اندر چھپے ہوئے
انسان نے اسے مشورہ دیا۔
اپنے اندر کے انسان سے اتنا سننے کے فوراً بعد اس
نے کوئی نیصلہ کرنا چاہا' لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن نے
اس کی سوچوں کے لیئے ایک سوالیہ تیر اور چھوڑ دیا' جس کے
تحت وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگا۔ آج کون انسان ہے
جو انسانیت کے کام کر رہا ہے؟ انسانیت کو مٹانے کے لیئے
آج کے انسان ایٹم بم کا تجربہ کر رہے ہیں!۔ انسانیت کو
دفنانے کے لیئے آج کے انسان فرقہ پرستی کی آڑ لیکر بڑے
بڑے فسادات کرا رہے ہیں۔ انسانیت کو بھوکوں مارنے
کے لیئے آج کے انسان غلے کے بڑے بڑے اسٹاک کر رہے
ہیں، پھر تم کیوں انسانیت کے نام کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو؟ —

جاؤ اور گھر جاکر آرام سے اپنے لحاف میں منہ ڈال کر سو جاؤ ۔

وہ بغیر کسی شک و شبہ کی گنجائش کے کوئی مخدوش آدمی ہے اس کے دل میں پوشیدہ خوف کے کسی جذبے نے اسے رائے دی، اور اسے یہ رائے کسی حد تک پسند آئی ۔ اور اس نے انسانیت کے تمام تقاضوں کو پیچھے چھوڑ دیا ۔ لیکن وہ مطمئن پھر بھی نہ ہوا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد چلتے چلتے اچانک اس کے لاشعور میں اس کی کراہٹ گونجنے لگی اور اس گونج سے اس کا ذہن پھر اسی مرکز پر پلٹ آیا۔

" وہ کراہ رہا تھا ــــ اس پر ضرور کوئی تکلیف ہے " وہ بڑبڑایا۔

جاؤ چلے جاؤ ، اب گھر بھی زیادہ دور نہیں رہا ۔ وہ چور ہی ہے وہ کراہٹ مصنوعی ہے ۔ وہ تو تمہیں دیکھ کر کراہنے لگا تھا کہ کہیں تم اس پر شک کر کے شور نہ مچا دو اور پولیس نہ آجائے " اس کے ذہن نے اسے پھر روک دیا ۔ وہ متواتر آگے ہی بڑھتا رہا ۔ اپنے گھر کی جانب!

اس کے دل اور ذہن میں کافی کشمکش ہوتی رہی کہ وہ اس کے پاس جائے یا نہ جائے ۔ آخرکار جیت دل کی ہوئی اور وہ اپنے ذہن کی تمام تر مخالف آوازوں کو پیچھے چھوڑ کر اس کا پیچھا کرنے کے لیئے طے کیئے ہوئے راستے پر لوٹ پڑا ۔ اس نے خیال کیا کہ اگر وہ اس طرح آج ڈر گیا تو زندگی بھر ڈرتا رہے گا ۔ وہ جواں دل اور جوان جسم کا مالک ہے ۔ ایسا سوچتے ہی اس کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی اور اس جھرجھری کے ساتھ ہی اس نے محسوس کیا ، جیسے اس وقت وہ ــ بے پناہ طاقت کا مالک ہے ۔ وہ اگر چور بھی ہوگا ــ تو وہ اس سے طاقت میں ہرگز زیادہ نہیں پھر وہ تو پہلے اسے سمجھائے گا ، ممکن ہے وہ اسے ایک اچھا آدمی بنا دے کیونکہ آج کا چور پیشہ ور چور نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی محدود آمدنی اور لامحدود مہنگائی اسے چور بنا تی رہتی ہے ۔ اسی ساعت اس نے یہ بھی ارادہ کیا کہ اگر وہ چور اس کے سمجھانے سے سیدھے راستے پر آگیا تو اسے بھی اپنی جیب میں رکھا ہوا پانچ روپے کا نوٹ دے کر یہ کہے گا کہ پیارے چور صبح ہوتے ہی ان روپیوں کا تم آٹا خریدنا اور اب کبھی چوری مت کرنا ، کیونکہ آج کے دور میں معمولی چوری کرنا سماج مذہب اور قانون کی نگاہ میں بہت بڑا جرم ہے ۔ چاہے گیہوں موجودہ قیمت سے چوگنی قیمت پر کیوں نہ ہو جائے ۔ چاہے تم اور تمہارے بچے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں ۔ لیکن چوری کا تصور بھی تم ذہن میں نہ لانا کیونکہ چوری ، پھر چوری ہے ۔ لیکن اگر وہ کوئی آسیبی شئے ہوئی تو؟ یہاں آکر اس کی سوچیں رک سی گئیں ۔

جس کھمبے کے بلب کے نیچے اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا تھا وہ سایہ اب ٹھیک اسی کے نیچے چل رہا تھا ۔ روشنی میں اُسے نظر آیا کہ اس شخص کی کمر کس قدر جھکی ہوئی ہے اور اپنی عمر کی آخری منزلوں پر ہے ۔ اس نے جاتے وقت اس کی طرف شاید اتنی گہری نظروں سے نہیں دیکھا تھا ، جتنا کہ اب ۔ اس لیئے اب اسے کچھ یقین سا ہو گیا کہ وہ چور ہرگز نہیں ہے بلکہ کوئی راہ گیر ہے ۔ اچانک اسے اس کی کراہٹ کی آواز سنائی دی ۔ اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا اس نے اپنے قدم تیزی کے ساتھ آگے کی طرف بڑھائے اور جلدی ہی اس کے قریب پہنچ گیا ۔ جب چند ہی قدم کا فاصلہ باقی رہ گیا تو اس نے اس کو مخاطب کیا ۔ " سنیئے " !

اس بار بھی حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جواب میں وہ کچھ نہیں بولا ۔ معاً اس نے اس کے پیروں کی طرف نگاہ کی لیکن اسے اس کے پاؤں نظر نہ آسکے ، کیونکہ اس جگہ جہاں وہ اب چل رہا تھا کسی قدر اندھیرا تھا ۔ ایک لمحہ کے لیئے اس کی ہمت پھر جواب دیتی ہوئی محسوس ہوئی ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اسے خیال آیا کہ ابھی ابھی تو وہ نہ ڈرنے کا عہد کر چکا ہے ۔ اتنا سوچتے ہی اس نے اپنے تحفظ کے لیئے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور اس کے قریب جاکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر کہا ۔ " میری بات ، آپ نے نہیں سنی " ؟

نیم اندھیرے میں اس نے اس شخص کا بغور مشاہدہ کیا تو وہ واقعی ایک پچاس پچپن سال کا بوڑھا آدمی تھا اور اس کے پیر بھی اُلٹے نہ تھے ۔ معمولی سا کوٹ اور پاجامہ اس کا لباس تھا اور اس پر ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کی گردن کے چاروں طرف ایک چادر لپٹی ہوئی تھی جس کے دونوں سرے اس کے آگے کی طرف پڑے تھے ۔

اس کا تمام ڈر اور خوف ایک دم فرد ہوگیا۔

ہاتھ پکڑنے پر وہ شخص آہستہ سے بولا: "کون ہے؟"

"آپ کو آواز نہیں آتی ہے۔ میں نے جاتے وقت بھی آپ سے معلوم کیا تھا۔" اس بار وہ اس سے پُر رعب اور تحکمانہ انداز سے بولا۔

"آپ زور سے بولیئے، مجھے ذرا کم سُنائی دیتا ہے۔" بوڑھے نے اپنا یہ جملہ بہت آہستہ سے کہہ کر اپنے کوٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور کسی چیز کو اندر ہی اندر بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔

یہ دیکھتے ہی اس نے سوچا، شاید بوڑھے نے جیب میں رکھے ہوئے کسی اسلحہ کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ وہ ڈر کر کسی قدر پیچھے ہٹ گیا اور بلند لیکن گھبرائی ہوئی آواز میں اس سے معلوم کیا......

"آپ اس وقت کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"بازار" جواب میں بوڑھا بولا۔

"اور آپ کی جیب میں کیا ہے؟" اس کے ذہن کا جملہ زبان پر آگیا۔

"میری جیب میں ....." اتنا کہہ کر بوڑھا کچھ دیر تک چپ رہا اور پھر بولا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

اس کی بے ربط باتوں سے اس نے جلد یہ اندازہ لگا لیا کہ اس کا دماغ بھی عمر کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوچکا ہے۔ ورنہ بے پناہ سردی اس پر منجمد کر دینے والی ہوائیں اور رات کا وقت پھر یہ بازار کیا معنی رکھتا ہے۔ اس نے سوچا اس بوڑھے کو اس کے گھر پہنچا دینا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سردی اس کا کام تمام کردے۔

اس نے ہمدردی اور خوف کے ملے جُلے جذبات میں بوڑھے سے پھر چیخ کر کہا۔ "بابا اس وقت بازار جاکر کیا لو گے؟ وہاں تو تمام دوکانیں بند ہیں۔ وہاں تم صبح ہوتے ہی چلے جانا، چلو میں اس وقت تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔"

یہ سُن کر بوڑھے نے اپنا چہرہ اُوپر کیا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ جب تھوڑی دیر گذر گئی تو مسکراتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

"آپ مجھے غلط سمجھے اور شاید میں بھی آپ کو غلط ہی سمجھا۔ سنو! میں اس وقت راشن کی دوکان پر جارہا ہوں۔" وہ مختصر سا جواب دے کر پھر خاموش ہوگیا۔

"راشن کی دوکان، راشن کی دوکان تو اس وقت کہیں بھی کھلی ہوئی نہ ملے گی۔" اس نے بوڑھے کے کان کے قریب خوب چیخ کر اپنا جملہ کہہ دیا۔

"کھلی ہوئی تو کوئی نہ ملے گی، لیکن صبح ہوتے ہی ضرور کھل جائے گی۔ اور میں طویل لائن کی وجہ سے پچھلے تین دن کی طرح ناکام نہیں لوٹوں گا۔" اتنا کہنے کے بعد بوڑھا پھر کراہ اٹھا ..... "گھر میں تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جو میرے مرحوم بیٹے کی نشانی ہیں۔ باپ کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری بھی میرے ضعیف کاندھوں پر ہے۔ اگر آج بھی اناج نہ ملے تو یہ معصوم بھوک سے دَم توڑ دیں گے۔"

یہ سُنتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے ساری زمین اور سارا آسمان ایک ساتھ گردش کرنے لگے ہیں۔ ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے فولاد کی بڑی بڑی بھٹیاں رقص کرنے لگیں جن میں اسی ساعت اسے ایسا دکھائی دیا، جیسے اب ان بھٹیوں میں ہندوستان کی آنے والی نسلوں کے مستقبل کے ساتھ ساتھ حال کے کروڑوں انسانوں کے پیٹ بھی ڈھالے جارہے ہیں تاکہ وہ آئندہ کئی برسوں بعد پیدا ہونے والے گیہوں کے لیئے کام آسکیں۔ کیونکہ مشہور ہے کہ گیہوں کی روٹی فولاد کا پیٹ چاہتی ہے۔ ایک بار پھر اس نے ملک کے ان راہنماؤں کو اور ان کی اس دُور اندیشی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ جن کی وجہ سے کروڑوں انسانوں کے لیئے گیہوں سے پہلے فولاد کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ ▲

لندن کی ادبی و تہذیبی جھلکیاں

وقار لطیف

★

کچھ انگریز کے بارے میں

یونم کے قارئین کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اردو کے ممتاز افسانہ نگار وقار لطیف نے ، جو اِن دنوں لندن میں مقیم ہیں ادارہ کی خواہش پر لندن کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے بارے میں مسلسل مضامین لکھنے کا وعدہ کیا ہے ۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی پیش خدمت ہے ۔ اُمید ہے کہ قارئین کو یہ سلسلہ پسند آئے گا ۔ (ادارہ)

محترمی و مکرمی ناظر صاحب !

مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ آپ ارادے کی پختگی اور نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے رسالے کو جاری رکھے ہوئے ہیں ۔ اور وہ الص ادبی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ـــــ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ انگلستان جیسا ادب و شاعری کا شیدائی ملک بھی تجارتی مفادات کے ر آج یہاں تک پہنچا ہے کہ کسی بھی رسائل کی دوکان میں ، کسی بھی ادبی رسالے (ہفتہ وار یا ماہنامے) کا ملنا محال ہے ۔ جہاں تک میرا مشاہدہ ہے Encounter اور London Magazine کے علاوہ کوئی بھی قابلِ ذکر رسالہ آج اَدب یا سنجیدہ مسائل کے لئے وقف ۔! یہاں کے ادبی حلقوں میں بارہا پوچھنے کے باوجود مجھے کسی اچھے رسالے کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی ۔ واقعہ یہ ہے کہ خالص ادبی انگلستان ی ، معاشی ، اور تہذیبی انگلستان کے ساتھ ساتھ روبہ تنزّل ہے ۔ اس تنزّل میں اگر مثبت باطلانہ یا شیطانی رجحان ہوتا تو غنیمت تھا ۔ کیونکہ ، رجحان کے ردِّ عمل کے طور پر ہی اکثر اوقات کئی ممالک میں (جیسے فرانس ، روس یا جرمنی میں) عظیم اَدب پیدا ہوا ہے ۔ مگر انگلستان کی موجودہ حالت تھکے ہارے سپاہی کی سی ہے جو ابھی ابھی جنگ سے لوٹا ہے اور جسے قطعی پرواہ نہیں کہ ناشتہ میں اس کے لئے آج انڈے ہیں کہ گوشت اور س لئے مگن ہے کہ اب تو جنگ ختم ہو چکی اور وہ اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ ہے ۔

انگلستان کے پیشہ ور ادیب و شاعر ، سب کے سب یا تو سینما اور عوامی تھیٹر کے مرہونِ منت ہیں یا پھر ٹی ۔ وی Television کے ! حالات میں اَدبی معیارات کے بارے میں تبصرہ کرنا لغو ہی !۔

آپ کی خدمت میں اپنے مضامین (نیم مزاحیہ ، نیم سنجیدہ) کے سلسلے " کچھ انگریز کے بارے میں "..... کی پہلی کڑی پیش ہے ۔ اس کے ریعہ میں اپنے ہم وطنوں کو یہاں کی زندگی کے اُن شعبوں سے روشناس کرانا چاہتا ہوں ، جن میں وہ واقعی دلچسپی لیتے ہیں ، اور جن کے بارے میں

انہیں آج کے خشک، بے مزہ اور محض سیاسی اخبار کے نام نہاد ——— مقالے" کچھ بھی نہیں تبلاتے !۔ میں اس سلسلہ کی دوسری کڑیاں بھی پابندی سے آپ کو روانہ کرتا رہوں گا۔ خیراندیش ——— وقارلطیف ———

لندن آنے کے بعد سب سے پہلی چیز جو میں نے واقعی یہاں پائی وہ تھی انگریزوں کی شہرۂ آفاق خودپسندی کی عادت !۔ مگر ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی غور کیا کہ وہ بہت ساری باتیں جو انگریزوں کے مزاج، ان کی طبیعت، رہن سہن اور تہذیب کے بارے میں ساری دُنیا میں مشہور ہیں وہ سرے سے یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ بہت حیرانی کی بات تھی، مگر تھی بڑی خوشگوار اور دلچسپ !۔

دراصل انگریز اتنا خودپسند واقع ہوا ہے کہ اُس نے دُنیا بھر میں اپنی "نام نہاد" کمزوریوں کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے۔

مثلاً انگریز کو اپنی اس کمزوری پر فخر ہے کہ اُس کی قوم دُنیا کی سب سے شاعرانہ قوم ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے بڑے ہی لاپرواہ انداز میں وہ اکثر گڈ اولڈ شیلے، دی بارڈ (شیکسپیئر) اور ملٹن کے حوالے دیا کرتا ہے۔ اتنے لاپرواہ انداز میں کہ بعض اوقات شُبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ شیلے اُس کی پالتو بلی، یہ بارڈ اس کا پرانا اسکول کا یارِ غار، اور یہ ملٹن کوئی اعلیٰ پائپ کا تمباکو تو نہیں۔ ہر بار اُس کے چہرے پر آپ کو بے انتہا انکساری اور خاکساری کے آثار ملیں گے۔ مگر یہ آثار واقعی بہت گمراہ کُن ہیں، کیونکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔

اور یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انگریز قوم دُنیا کی سب سے کم شاعرانہ قوم ہے۔ دُنیا کے سب سے زیادہ شاعرانہ مزاج رکھنے والے لوگ، یا تو آپ کو ہسپانیہ میں ملیں گے، یا جزائر بالی میں یا پھر قطب منجمد شمالی میں جہاں اسکیموز رہا کرتے ہیں۔ افسوس کہ ان مقامات میں بہت کم واقعی عظیم شاعر پیدا ہوئے۔ مگر شاعرانہ قوم ویسے شاعری کرتی "کب" ہے۔ اُس کی تو زندگی ہی شاعری ہوا کرتی ہے۔ جب بھی کسی ہسپانوی نوجوان پر شاعری کا مُوڈ سوار ہوتا ہے وہ سیدھے اپنی محبوبہ کے باپ کے گھر جاتا ہے (اس گھر میں خوش قسمتی سے محبوبہ کا کمرہ ہمیشہ دوسری منزل پر ہوا کرتا ہے) اور فوراً محبوبہ کے دریچے کے نیچے کھڑے ہو کر سرینیڈ (Serenade) کرنے لگتا ہے۔ یا پھر اگر شاعری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہو تو وہ بُل فائٹ (بیلوں کی لڑائی) دیکھنے چلا جاتا ہے (اس کو بُل فائٹ یا مین فائٹ (Man Fight) کہنے کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ کس کی طرفداری کر رہے ہیں، آدمی کی یا بیل کی؟) اگر بُل فائٹ دیکھنا بھی فی الوقت ممکن نہ ہو تو اپنے اَن گنت رقیبوں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ نکالتا ہے اور نتیجتاً اُسے ختم کر دیتا ہے یا خود ختم ہو جاتا ہے ——— جزائر بالی کی پُراسرار حسینہ اپنی شاعری کو دلفریب نغموں اور رقصوں کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ اس کی ساری آزادانہ بے فکر زندگی ہی خود شاعری ہے۔ عام طور پر اسکیمو مرد، اپنے شدید ترین شاعرانہ لمحوں میں اپنی بہترین بیوی کو اپنے بہترین مہمان کو تحفہ کے طور پر دے دیتا ہے اور خود سیٹی بجاتے ہوئے سفید برفانی پُرسکون "بن بیوی" میدانوں میں مچھلی کا شکار کرنے نکل جاتا ہے !۔ مگر انگریز ان میں سے کچھ بھی کرنے کا عادی نہیں اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ دراصل انگریز پر شاعرانہ اور رُومانٹک مُوڈ سوار ہی کب ہوتا ہے !۔

لوزان (سوئٹزرلینڈ) کے ایک نائٹ کلب میں، میرے انگلستان آنے سے پیشتر، ایک بے حد بے تکلف اور مُنہ پھٹ انگریز نے (ایسے کمیاب نسل کے انگریز کی انگلستان سے باہر جتنی قدر کی جاتی ہے وہ بیان سے باہر ہے) میرے آگے رازدارانہ انداز میں اس بات کا اقبال کیا کہ اُس پر ایک مرتبہ شدید شاعرانہ دورہ پڑا تھا۔ پھر اس نے اصرار کرنے پر شرماتے ہوئے تبلایا کہ ایسا اس وقت ہوا تھا جبکہ اُسے سٹاک ایکسچینج میں پانچ ہزار پونڈ کا منافع ہوا تھا۔ پھر میں نے جب اس سے پُوچھا کہ ایسے بیش بہا شاعرانہ لمحات اس نے کیسے گذارے؟ تب اُس نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں پتہ بھی ہے، میں نے کیا کیا؟ اُس رات میں نے شراب نہیں پی۔ گھر پر ہی رہنا پسند کیا۔ میرا مطلب ہے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ"۔ گویا انگریز کا ردِ عمل اسکیمو جیسے رنگین مزاج باشندے

مین برعکس ہے۔ لہٰذا انگریز شاعرانہ مزاج کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب آپ کو اس بات کا پتہ چل چکا ہوگا کہ انگلستان آخر کیوں دنیا کے اتنے سارے عظیم ترین، لافانی شاعر پیدا کر سکا۔ انگریز کی زندگی میں شاعری کو کچھ بھی دخل نہیں۔ اس کی ساری زندگی بے مزہ اور اس کے موسم کی طرح سرد اور مرطوب ہے۔ اس لیئے وہ شاعری "کرتا" اور "لکھتا" ہے۔

ویسے بھی ایک عام انگریز کو اُس کی اپنی الفاظ اور محاوروں سے مالا مال زبان کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا! یہ زبان صرف شیکسپیر کے ڈراموں، ملٹن کے شاہناموں، کیٹس کے نغموں اور بائرن کی نظموں میں ملا کرتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ زبان عام طور پر بولی جاتی تو اُسے شاعری میں کبھی نہ منتقل کیا جاتا۔

اطالوی خوش باش، فرانسیسی عیش پسند اور سوس امن پسند لوگ، سب کے سب اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ کا جامہ پہناتے وقت بے حد جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کے گھوڑے خوب دوڑاتے ہیں، اپنے ہاتھوں کو مسلسل جنبش دے دے کر اپنے چہرے کے اعصاب اور پٹھوں کی لگاتار ورزش کرتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو رقصِ پیہم کی حالت میں رکھ کر، وہ واقعی شاعری "بولتے" ہیں۔ اگر وہ یوں شاعری نہ "بولتے" تو یقیناً ان کو اس بات کا فخر ہو سکتا کہ ان کے پاس انگریزوں سے بھی کہیں زیادہ عظیم اور کہیں زیادہ تعداد میں ایسے شاعر پیدا ہوئے جو شاعری "کر" اور "لکھ" سکتے ہیں۔!

▲

جگر مراد آبادی

عظمتِ غالب

یہ نظم خبیر بہوروی صاحب کی وساطت سے حاصل ہوئی ہے ۔ ان کو جگر صاحب نے ان کے زمانۂ قیام علی گڑھ میں عنایت کی تھی ۔ (ایڈیٹر)

اے وہ کہ تری ذاتِ گرامی بہ ہمہ رنگ
قدرت کی جو ہمراز تو فطرت کی ہم آہنگ

اے وہ کہ تری فکر بہ ہر طرز و بہ ہر صنف
ہم شعلہ و ہم شبنم و ہم شیشہ و ہم سنگ

اے وہ کہ ہر اک نغمۂ ترا نغمۂ فطرت
اے وہ کہ ہر اک نقش ترا روکشِ ارژنگ

اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے
اک جنتِ شاداب ہر اک غنچۂ دل تنگ

ہر پھول ترے باغ کا فردوس بہ دامن
ہر خار ترے دشت کا انگشت شفق رنگ

اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے
ہم نغمہ و ہم شیشہ و ہم نکہت و ہم رنگ

اک گوشۂ دامن میں ترے دجلہ و جیحوں
اک موجِ نفس میں تری رقصاں جمن و گنگ

تھے ملکِ سخن میں ترے ہم عصر ہزاروں
تنہا تھی تری ذات مگر صاحبِ اورنگ

تو نظم میں بھی، نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ

تو نے اسے گنجائشِ کونین عطا کی !
ہر چند بہت تھا کبھی دامانِ غزل تنگ

عرفی و نظیری و ظہوری و نغانی ۔ !
تیرا کوئی ہم سر نہ تیرا کوئی ہم آہنگ

لاریب کہ اس رمز سے واقف تھی تری ذات
افسانہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ

الحق کہ تری وسعتِ تخئیل کے آگے
صحرا کفِ خاکستر و گلشن قفسِ رنگ

سلام مچھلی شہری

میں شنکر کا پجاری ہوں!

اگر مذہب اجازت دے
تو میں دُنیا کو بتلا دُوں
کہ میں "شنکر" ہُوں
اور میرے گلے میں زہر رقصاں ہے
مگر یہ زہر اُس اَمرت کے پانے کی تمنّا ہے
جسے دَراصل "شنکر" نے کبھی دُنیا میں ڈھونڈا تھا
مگر اُس دَور میں دَھرتی پہ ہر سُو زہر پھیلا تھا
انہوں نے دل میں سوچا
زہر دنیا کا جو ہم پی لیں
تو یہ جاندار شاید کچھ دنوں آرام سے جی لیں!

—— میں "شنکر" کا پُجاری ہوں
قسم ہے، اُن پہ قرباں ہوں
پُجاری کی پرستش ایسی اِک منزل پہ آتی ہے
بنا کر دیوتا بھی جو اسے اِک دن دکھاتی ہے
میں بے شک دیوتا ہوں
یعنی "شنکر" کا پُجاری ہوں!

—— اگر مذہب اجازت دے
تو میں دُنیا کو بتلا دوں
کہ میں "شنکر" ہُوں
اور میرے گلے میں زہر رقصاں ہے
مرے "شنکر" کا وہ "رقصِ قیامت" جاننے والو
مجھے میرے فسُردہ دَور میں پہچاننے والو
میں پُھولوں کی مَہک
چاند اور ستاروں کی چمک —— لیکن
ذرا یہ سوچ لو، میرے لئے یہ بھی تو ہے ممکن
کہ میری "تیسری آنکھ" اب شرارہ بار ہو جائے
مری یہ خامُشی اِک حَشر کی جھنکار ہو جائے

—— مجھے تم پُوجتے ہو
میں "کلا مندر" کا اِک "شنکر"
مگر حیرت تو یہ ہے تم سمجھتے ہو مجھے پتّھر
ذرا یہ سوچ لو، پتّھر میں بھی اِک جان ہوتی ہے
بہت ہی مُضمحل سی لَہر بھی طوُفان ہوتی ہے

مرے سارے پرستش کرنے والو! وقت کچھ کم ہے
سمجھنا ہے تو اب سمجھو کہ میرے "فن" کو کیا غم ہے؟
کہیں ایسا نہ ہو یہ ناگ پھر غصّے میں آ جائیں
زمانے میں وہی نظّارہ ہائے حشر چھا جائیں
"آسا تیری زمانے" سے جدا ہے، یہ نئی دُنیا
خدا کو مان کر بھی کچھ خفا ہے، یہ نئی دُنیا
"نئے مشنکو" کا غصّہ پائلوں سے کم نہیں ہوگا
اگر طوفان اُٹھے گا تو وہ مدّھم نہیں ہوگا

——— میں "مشنکر" کا پجاری ہوں
مری پوجا میں قوّت ہے
مری پوجا میں شدّت ہے
یہی پوجا کی شدّت، دیوتا مجھ کو بناتی ہے
مرے کانوں میں خود "مشنکر" کی یہ آواز آتی ہے:
——— "مجھے معلوم ہے تم اہلِ دل ہو، اہلِ ایماں ہو
مری عظمت پہ قرباں ہو
بہت نزدیک ہو میرے، نیا پرتیک ہو میرے
میں "بھولا" ہوں مگر فنکار کے دل کو سمجھتا ہوں
تمہارے مضطرب سے ذوقِ منزل کو سمجھتا ہوں
وہ منزل آئے گی
آ کر رہے گی
میرا وعدہ ہے

مگر تم اُس سے باز آ جاؤ، دل میں جو ارادہ ہے
میں خود شعلوں کا دیوتا ہوں
مگر تم سے یہ کہتا ہوں
کہ دَھرتی ماں بہت نازک ہے اس کو آگ مت دینا
سُہانے گیت دینا، آتشیں سار اگ مت دینا
مجھے معلوم ہے تم نے مجھے شدّت سے، پُوجا ہے
اسی باعث بڑی شفقت سے میرا تم سے کہنا ہے
کہ تم جس دَور میں ہو
وہ بہر انداز بہتر ہے
مری آنکھوں سے دیکھو گے تو پھر ہر پھول پتّھر ہے
دعا یہ ہے کہ تم نظمیں لکھو پتّھر کے سینے پر
نہ گھبراؤ، ہمارے ناگ ہیں "فن" کے دفینے پر
یوں ہی بس کام کرتے جاؤ
دُنیا سے نہ گھبراؤ
تمہیں کچھ کام کرنا ہے
تمہیں کچھ کر کے مرنا ہے،
تمہاری موت بھی
میری دُعا یہ ہے
اَمر ہو گی،
کلا کے اِک نئے آکاش پر "زندہ سحر" ہو گی۔!!"

▲

لہ علامت ——— PRATEEK

مستقبل کا شاہکار

کرشن موہن

جاگزیں ہے قدم وہ چشمۂ نور
جس کا پیکر الم گداز سرور
مانگ ہے تیرگی کی زلفوں کی!
رہ گذارِ مسرّتِ مخمور!

جس کی موسیقیت نہاں ہے ابھی
جس کی رعنائی نوجواں ہے ابھی
ناشناسائے عالمِ ظاہر
اور ناواقفِ زیاں ہے ابھی

آئیگی آئے گی کبھی وہ بہار
گیت گائے گا جب چمن کا نکھار
جب صبا ہوگی زمزمہ پرواز
اور شمیمِ نشاط افسوں کار

سحرِ آثار نقشِ مرگ شکار
آرزوئے حیات کا غمخوار
آئے گا معرضِ شہود میں کب؟
حسنِ عالم کا بہترین شہکار!

کیوں کھنکتے نہیں ہیں جام و سبو
کیوں نہیں شوقِ دل نیاز گداز
اہلِ دل کی مسرّتوں کا لہو
بن گیا رنگِ ارغوانِ بہار

آرزو کا جنوں ہے خام ابھی
سوزِ ایثار نا تمام ابھی
تیری ابریشمیں لٹوں کی لپٹ
بھی نہیں محرمِ خرام ابھی

وہ مدھر گیت ہے ابھی خاموش
جو ہے درمانِ حدتِ عالم
وہ شمیمِ شعور ہے روپوش
چوم لے گی بہار جس کے قدم

آرزو کی جبینِ نور فشاں
بن گئی تیرگیٔ غم کا دھواں
مرگِ دوشیزگی کے ماتم میں
خون روتی رہی ہے کاہکشاں

ابھی رسوائے دہر ہونا ہے
غمِ حسرت کو زہر ہونا ہے
خالقِ شاہکارِ مستقبل
اور ابھی تجھ پہ قہر ہونا ہے

پھٹکا

مغنی اقبال قریشی

تم میرے کرتے میں
ٹوٹے بٹنوں کو ٹانک رہی ہو
تم نے اپنی انگلی میں
دیکھو، سوئی چبھو لی
اک قطرہ، وہ خوں کا
جو پوروں میں پھیل گیا ہے
اک قطرہ، وہ خوں کا
جو میرے دل میں باقی ہے
میرے پاگل خوابوں سے
ہولی کھیل رہا ہے!

اسیرا

احمد وصی

جب کسی مخلصِ دیرینہ نے یا دشمن نے
مجھ سے پوچھا بھی کہ کیوں پیار کیا ہے اس سے
کیوں اسے کانپتے ہونٹوں سے لگا رکھا ہے
کیوں اسے ذہن کے گوشوں میں بسا رکھا ہے
میں نے اس پوچھنے والے سے یہی ہنس کے کہا
اس لیے ذہن کے گوشوں میں بسا رکھا ہے
اس لیے کانپتے ہونٹوں سے لگا رکھا ہے
اس لیے میں نے اسے پیار کیا ہے کیونکہ
اس میں بھی آگ دہکتی ہے مرے دل کی طرح!

ندا فاضلی

پرانی یاد

تم نے شاید کسی رسالے میں
کوئی افسانہ پڑھ لیا ہوگا
"کھو گئی ہوگی رُوپ کی رانی
عشق نے زہر کھا لیا ہوگا"
تم اکیلی کھڑی ہوئی ہوگی
سر سے آنچل ڈھلک رہا ہوگا
یا پڑوسن کے پھول سے رُخ پر
کوئی دھبہ چمک رہا ہوگا
کام میں ہوں گے سارے گھر والے
ریڈیو گنگنا رہا ہوگا
— تم پہ نشہ سا چھا گیا ہوگا

مجھ کو وشواس ہے کہ اب تم بھی
شام کو کھڑکی کھول دینے پر
اپنی لڑکی کو ٹوکتی ہوگی!
گیت گانے سے روکتی ہوگی!!

کیلاش ماہر

آنکھیں انگلیاں دل

راکھ ہی راکھ ہے، اِس ڈھیر میں کیا رکھا ہے!
کھوکھلی آنکھیں — جہاں بہتا رہا آبِ حیات
کب سے اِک غار کی مانند پڑی ہیں ویراں
قبر میں سانپ کا بِل جھانک رہا ہو جیسے!
راکھ ہی راکھ ہے ......!

اُنگلیاں — صدیوں کو لمحوں میں بدلنے والیں
اُنگلیاں شعر تھیں، نغمہ تھیں، ترنم تھیں کبھی
اُنگلیاں — جن میں تیرے لمس کا جادو تھا کبھی
اب تو بس سُوکھی ہوئی "ناگ پھنی" ہوں جیسے
راکھ ہی راکھ ہے ......!

دل — کہ تھا ناچتی گاتی ہوئی پریوں کا جہاں
اَن گنت یادوں کا، ارمانوں کا ایک شیش محل
تیری تصویر دریچوں پہ کھڑی ہنستی تھی!
اب تو بجھتے ہوئے لاوے کے سوا، کچھ بھی نہیں!

راکھ کے جلتے ہوئے ڈھیر میں کیا پاؤ گی
شہر سے دُور ہے شمشان کہاں جاؤ گی!

نصیر پروازؔ

تفکر

ہے ازل سے آدمی محوِ تلاشِ و جستجو
کر رہا ہے زندگانی سے دلوں کی گفتگو
بے بسی کی تیرگی کو انتہا سمجھا کوئی
گردشِ حالات کو رازِ خدا سمجھا کوئی
معبدِ اصنام کوئی چھوگیا روحِ سکوں
ہوگئے گم غم کے صحرا میں کہیں اہلِ جنوں
کوئی فرقت کی اندھیری رات میں جلتا رہا
راہِ ایماں پر کہیں اک کارواں چلتا رہا
فلسفے کے شاہراہِ فکر پر چلتے رہے
سوچ اور ادراک کے آئینے پگھلاتے رہے
چوم لی افکار نے افلاک کی روشن جبیں
کوئی بن بیٹھا نگارِ علم و فن کا نکتہ چیں
ہوگیا کوئی دوانہ اپنی ہستی میں مگن
بن گیا کوئی جہانِ شوق شمعِ انجمن
کوئی رہبر ہوگیا کوئی ستم گر ہوگیا
گلستانِ شوق میں کوئی گلِ تر ہوگیا
روز ٹکراتا رہا انساں سے زورِ انقلاب
زندگی کے چہرۂ رنگیں سے نہ اٹھا نقاب
آدمی کی جستجو تاریکیوں میں کھو گئی
موت کی آغوش میں ہر سعیِ پیہم سو گئی

▲

انتخاب سیّد

پیاسی روح

میں نے
سوچا تھا اس رات کی خاموشی میں
ہزاروں تمناؤں کے دِن پھریں گے
نئی زندگی کا اِک آغوش ہوگا
اشاروں اشاروں میں ہر بات ہوگی
مگر
مختلف زاویوں سے بہت دیر تک
سوچتا ہی رہا
راہ تکتا رہا
تم نہ آئے
تو ہر حسینہ میرے لیئے اجنبی ہوگئی
مجھ کو محسوس ہونے لگا
زندگی جیسے تنہائی کا نام ہے!
اِک نئے حادثے کی چبھن لے کے
اس رات کی صبح کا منتظر ہوگیا
رات بھیگی تو آنکھوں میں نیند آگئی
میں فضاؤں میں پرواز کرنے لگا
شہر و دیہات کے فاصلے مختصر ہوگئے!
میں نہ جانے کہاں
کونسے شہر میں آگیا
نیم عُریاں بدن
حُسن توبہ شکن
ہر طرف جیسے دوشیزگی کی مہک
میری آنکھوں کے ڈورے گلابی ہوئے
اور پھر
دفعتاً
میرے گالوں پہ ٹھنڈک کے احساس سے
رُوح میں گُدگُدی سی ہوئی
بند آنکھوں کے دروازے کھُلنے لگے
میں نے دیکھا
تو کچھ دُور پر
چاند
بادل کے ٹکڑوں سے اُلجھا ہوا
مجھ سے سرگوشی کر رہا ہے !!

▲

دی حیدرآباد آلوین میٹل ورکس لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس اور کارخانہ : صنعت نگر۔ حیدرآباد ۱۸ آے۔ پی

گرامس : آلوین۔ بیگم پیٹھ ÷ فون : ۳۲۳۱۴ جی جی اکس

—— تیارکنندگان ÷ ۵ لائنس ——

★ آلوین، اسٹیل فرنیچر ★ آلوین اینڈ آلوین پرسٹ کولڈ ریفریجریٹرس ★ آلوین آل ورش مشینس ★ آلوین پروڈکشن اینڈ سامشین ★ آلوین دھاتی بس باڈیاں

شوروم : بمقام 216 توپ کا سانچہ حیدرآباد آے۔ پی

—— فون : ۳۴۴۷۳ ——

اپنے مذہبی معلومات میں اضافہ کیجئے

ہم نے انجیل مقدس کی روشنی میں مذہب کے بارے میں ایسے اسباق تیار کئے ہیں، جن کے مطالعہ سے آپ کے مذہبی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا، اور آپ کو ایک خوبصورت سند بھی دی جائے گی۔
آج ہی مندرجہ ذیل پتہ پر خط لکھ کر مفت طلب کیجئے

زندگی کا نور

پوسٹ بکس ÷ ۱۴۵

روبروجان کمپنی ÷ عابد روڈ ÷ حیدرآباد آے۔ پی

حیدرآباد کا مایہ ناز ہوٹل

جو مقوی غذاؤں
فرحت بخش چائے
مفرح مشروبات

اور بے مثال خوش خدمتی کے لیے مشہور ہے۔

مدینہ ہوٹل

مدینہ بلڈنگ، حیدرآباد

فون : ۴۴۱۳۸ ÷ ۴۳۶۸۶

★ اہلِ زبان حضرات

معترف ہیں کہ جانوروں کی زبان بھی وقتی لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

★ چاہے آپ کی مادری زبان کچھ ہو اور آپ دوسری زبانوں کے ماہر ہوں یا نہ ہوں لیکن آج شہر کے سارے زبان داں، ایک زباں ہو کر یہی کہتے ہیں کہ

★ زبان میں زبان عزیزیہ کی زبان ہوتی ہے۔ لذت اور ذائقہ کے لئے کسی مخصوص زبان کی تشریح و تعریف کی محتاج نہیں۔

عزیزیہ ہوٹل قیام گاہ

نامپلی اسٹیشن۔ حیدرآباد آے۔ پی۔ فون : (۳۴۳۳۱۶)

مستقل فیچر

کمیں

تیر انداز

علامہ نارسا کی وفات حسرت آیات پر!

جب عین عالم ضعیفی میں علامہ نارسا کا انتقال ہوا تو اُن کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور فائر بریگیڈ کا عملہ صرف منہ دیکھتا رہ گیا۔ علامہ نارسا کے بال بہت بڑے تھے، اسی لیے وہ اردو کے چوٹی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اور لوگ انھیں سرآنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ (بعض لوگوں نے انھیں ناک اور پیشانی پر بھی بٹھانے کی کوشش کی مگر مرحوم کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ سراسر اُن کی کسرنفسی تھی) علامہ ہر اعتبار سے علامہ تھے جیسے بنیا ہر اعتبار سے بنیا ہوتا ہے مرحوم میں کئی خوبیاں تھیں جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اور ہمیں اگر قدرت کی ستم ظریفی کو کوسنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے بلا وجہ انسان کو دس انگلیاں دے رکھی ہیں کیوں کہ علامہ کی خوبیوں کو گننے کے لیے دو چار انگلیاں ہی کافی ہوسکتی تھیں۔ اسے آپ قدرت کی فضول خرچی پر محمول کریں تو مناسب ہوگا۔

علامہ کی سب سے بڑی خوبی جو دراصل ایک خرابی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ شاعری کرتے تھے۔ لیکن مرحوم کی قوتِ ارادی کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے مرتے دم تک شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نزع کے عالم میں بھی کلمۂ طیبہ کی بجائے اپنے تیمارداروں کو غزلیں سُناتے رہے۔ حق جہنم رسید کرے عجب بور مرد تھا۔ اسے علامہ کی فرض شناسی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ انھوں نے اپنی ایک غزل بھی نامکمل نہ چھوڑی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور انھوں نے ۸ ہزار غزلیں کہیں جن پر ۸ لاکھ افراد نے ہوٹنگ کی مگر مرحوم ایسے حوصلہ مند، نڈر اور جری انسان واقع ہوئے تھے کہ اگر ۸ کروڑ افراد نے بھی ہوٹنگ کی ہوتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ علامہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اور ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ مثلاً ایک مشاعرے میں جب سامعین نے اُن پر انڈے پھینکے تو انھوں نے سارے انڈے ہاتھوں میں جھیل لیے اور گھر جاکر اُن انڈوں کی پُڈنگ پکوائی۔ پھر جب دوسری بار مشاعرے میں شرکت کرنے گئے اور لوگوں نے اُن پر انڈے نہ پھینکے تو علامہ بِپھر گئے اور سامعین سے شکایت کرنے لگے "حضرات! اگر آپ لوگوں نے انڈے نہیں پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا۔" اس پر منتظمین مشاعرہ نے فوراً بازار سے انڈے منگوائے اور جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا جو صبح تک جاری رہا اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جب بھی کسی مشاعرے میں جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ "آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں کیونکہ

"آج جی آلو کھانے کو چاہ رہا ہے"۔ ایک بار تو انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "آج مجھ پر ایک پلیٹ بریانی، ایک پیالی چائے اور سگریٹ کی ڈبیہ پھینکی جائے"۔

علامہ نے بڑی خوددار طبیعت پائی تھی۔ چنانچہ انھیں زندگی بھر اپنے کلام کے سوائے کسی شاعر کا کلام پسند نہ آیا۔ حد تو یہ کہ انھوں نے محض اپنی خودداری کو سنبھالے رکھنے کے لیے کسی شاعر کا کلام بھی نہیں پڑھا۔ اور اپنے سوائے کسی اور کے کلام پر داد نہیں دی۔ خودداری کی ایسی مثال ان دنوں مشکل سے ہی ملے گی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر میں چار شادیاں کیں۔ اور اپنی شاعری کے جملہ چار مجموعے شائع کروائے۔ جن میں سے ہر ایک مجموعے کو انھوں نے اپنی ایک ایک بیوی کے نام معنون کروایا۔ (خدا کا شکر ہے کہ مرحوم نے پانچ شادیاں نہیں کیں ورنہ پانچ مجموعے منظرِ عام پر آجاتے) پہلے مجموعے کا انتسابی نوٹ انھوں نے یوں لکھا تھا "میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام کو بصد نفرت و حقارت اپنی پہلی بیوی کے نام معنون کرتا ہوں"۔ دوسرے مجموعے کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا "میرے دوسرے مجموعۂ کلام کے منظرِ عام پر آنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ میری دوسری بیوی کو عرصے سے یہ شکایت تھی کہ میں نے اپنا مجموعۂ کلام صرف پہلی بیوی کے نام کیوں معنون کیا ہے؟ اس کے نام کیوں معنون نہیں کیا۔ اس مسئلے پر میری ہر دو بیویوں میں لڑائی جھگڑا جاری رہتا تھا۔ جس سے میں تنگ آچکا تھا۔ سو میں اپنے گھریلو حالات کو پُر امن بنانے کے لیے دوسرا مجموعۂ کلام شائع کر رہا ہوں۔ اب اگر ضمنی طور پر اس مجموعے کی اشاعت سے ادب کی خدمت ہوتی ہے تو میں اس کے لیے معافی کا خواستگار رہوں"۔ علامہ کے تیسرے اور چوتھے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے پیچھے بھی علامہ کی "ازدواجی زندگی" پوشیدہ تھی۔ جو لوگوں کو بہت کم نظر آتی تھی۔ علامہ ریاضی میں بہت کمزور تھے۔ چنانچہ انھیں صرف ۵ تک گنتی آتی تھی اور وہ بھی اس لیے آتی تھی کہ علامہ کی ۲۵ اولادیں تھیں۔ ریاضی سے اُن کی واقفیت محض ایک مجبوری تھی۔ عمر کے آخری حصے میں علامہ کی بینائی خراب ہو چکی تھی۔ اور اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ ایک بار جب ان کے بڑے لڑکے نے سڑک پر چلتے ہوئے انھیں سلام کیا تو انھوں نے اپنے ہی بیٹے کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا "کہو میاں! تمھارے والد کی صحت کیسی ہے؟" اور سعادت مند بیٹا ان کے استفسار کے جواب میں بولا "کیا عرض کروں! والدِ بزرگوار کی صحت ان دنوں اچھی نہیں رہتی بینائی بہت خراب ہو چکی ہے یہاں تک کہ ہم لوگوں کو بھی نہیں پہچان پاتے"۔ اس پر علامہ نے کہا "آپ بینائی کی خرابی کی باتیں کرتے ہیں۔ اگر میری بینائی اچھی بھی ہو تب بھی میں اپنے بچوں کو پہچان نہیں سکتا"۔ پھر بولے "میاں! اتنے سعادت مند والدین اس دنیا میں کہاں باقی ہیں جو اپنی ہی اولاد کو پہچان سکیں"۔

علامہ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ انھیں اپنا کلام سنانے کا عارضہ لاحق تھا۔ اگر کوئی نئی غزل ہوتی (جو اتفاق سے ہر روز ہو جایا کرتی تھی) تو وہ سارے محلے کو سنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب علامہ اپنے گھر سے نکلتے تو سڑکوں پر بھگدڑ مچ جاتی۔ اور لوگ گلیوں میں بھاگ جاتے۔ دُکان دار اپنی دُکانیں بند کر دیتے اور مائیں اپنے بچوں کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیتیں۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو جایا کرتی تھی۔ مگر علامہ کا یہ عارضہ اکثر اوقات ملک اور قوم کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مقامی کالج کے طلبا نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ ایک مقام پر جلوس مشتعل ہو گیا اور پولیس پر سنگ باری کرنے لگا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پولیس نے آنسو گیس پھینکی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا زور زور سے ہنسنے لگے۔ پولیس نے طلبا کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ جب

صورتِ حال بہت نازک ہوگئی تو سب انسپکٹر پولیس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ وہ سیدھے علامہ کے گھر بھاگا اور انھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ اِدھر طلبا کی سنگباری بدستور جاری تھی کہ اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا "خواتین و حضرات ! اب آپ علامہ نارسا سے ان کی تازہ غزل سماعت فرمایئے" مائیکروفون پر بس یہ اعلان ہونا تھا کہ طلبا اپنے سر پہ پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے۔ اور ابھی علامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سنایا تھا کہ مطلع صاف ہوگیا۔ طلبا تو طلبا پولیس کی ساری جمیعت بہ شمول سب انسپکٹر پولیس مقامِ حادثہ سے غائب تھی۔ علامہ کے کشف و کرامات کی یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔

مگر بعض اوقات سنانے کے اس مرض نے علامہ کو کافی ذلیل و خوار بھی کروایا۔ مثلاً ایک بار علامہ نے اپنی غزل سنانے کے لیے ایک راہ چلتے شخص کا اغوا کیا اور اسے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ اور چائے کے ساتھ ——— لگاتار دو گھنٹوں تک اسے اپنا کلام پلاتے رہے۔ اور وہ بھی لگاتار دو گھنٹوں تک مختلف اشیائے خور و نوش کھاتا رہا۔ جب علامہ کی طبیعت سنبھلی تو شخص مذکور سے اپنے کلام کے بارے میں رائے پوچھی۔ اس پر وہ شخص اپنے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلّا کر بولا "قبلہ اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں تو براہ کرم اس کاغذ پر لکھ دیجیے کیوں کہ میں پیدائشی بہرہ ہوں۔ اور کوئی بات سننے کی اہلیت نہیں رکھتا"۔ لوگوں کا بیان ہے کہ یہ وہ واحد شخص تھا جسے علامہ کی ذات سے فائدہ پہنچا تھا۔ کیوں کہ اور لوگوں کو وہ اپنی غزل سنائے بغیر کچھ کھلاتے پلاتے نہیں تھے۔ حد تو یہ کہ کسی فقیر کو ایک پیسہ بھی خیرات میں دیتے تو اسے اپنا ایک شعر ضرور سنا دیتے تھے۔ اس عادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ کے گھر پہ آج تک کسی فقیر کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا گیا۔

علامہ کو شاعری کے میدان میں قدم جمانے کے لیے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں جب ان کے ہر شعر پر "ہوٹنگ" کرنے کو لوگ اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے تو انھوں نے اپنے کلام کو مقبول بنانے کے لیے بعض فقیروں کی خدمات حاصل کیں۔ انھیں اپنا کلام رٹایا۔ اور سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ جہاں وہ علامہ کی غزلیں گا گا کر بھیک مانگتے مگر انھیں دن بھر ایک پیسے کی خیرات بھی نہیں ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ کا کلام تو عوام میں مقبول ہوگیا مگر بے چارے فقیروں کا "بزنس" تباہ و تاراج ہوگیا ——— جب فقیروں نے بھی علامہ کا کلام گانے سے انکار کر دیا تو انھیں ایک نئی ترکیب سوجھی۔ یعنے اب کی بار انھوں نے ایک خوشنویس کی خدمات حاصل کیں۔ اور اپنی ساری پسندیدہ غزلیں شہر کی دیواروں پر لکھوا دیں۔ جب ان کا سارا کلام شہر کی دیواروں پر "زیورِ طبع" سے آراستہ ہوگیا اور لوگ آہک پاشی کرواتے کرواتے عاجز آ گئے تو شہریوں کے ایک وفد نے علامہ سے ملاقات کی اور ان سے "صلح" کر لی کہ وہ انھیں مشاعروں میں مدعو کیا کریں گے ——— (تاریخ میں اس "صلح" کو "صلح نامہ شاعر و سامعین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) ——— اس کے بعد سے علامہ ہر مشاعرے میں جانے لگے اور مشاعروں کو لوٹ کر اپنے گھر لے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے گھر میں مشاعروں کا انبار لگ گیا۔ علامہ کے کلام کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترنم کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی شہنائی پر اور کبھی کبھار ستار پر اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ ایک بار تو انھوں نے اپنی ایک غزل مکمل آرکسٹرا پر بھی سنائی تھی۔ سامعین کی فرمائش پر وہ اکثر اوقات اپنا کلام بھیرویں میں بھی سناتے تھے۔ زمانے کے حالات کو بدلتے دیکھ کر علامہ نے عمر کے آخری حصے میں ایک غزل "راک اینڈ رول میوزک" میں بھی سنائی تھی۔ یہ علامہ کی ترقی پسندی کی دلیل تھی۔

علامہ نے زندگی بھر میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جو بحر سے خارج نہ ہو۔ ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے یا تو چھوٹا ہوتا تھا یا بڑا۔ اور جب لوگ ان سے شکایت کرتے کہ غز

غزل کے سارے مصرعے بحر سے خارج ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے کہ "میاں جب انسان کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو ایک غزل کے دس مصرعے کس طرح برابر ہوسکتے ہیں۔ قدرت کی تخلیق خود بحر سے خارج ہے۔ خدا نے سب کو یکساں پیدا نہیں کیا ہے"

علامہ کے کلام سنانے کا انداز بھی بڑا انوکھا اور اچھوتا تھا وہ کلام کیا سناتے تھے اچھا خاصا ڈرامہ پیش کرتے تھے۔ شعر میں اگر معشوق کی انگڑائی کا تذکرہ ہوتا تھا تو اسٹیج پر ایسی بھرپور انگڑائی لیتے کہ مائیکروفون سمیت چار پانچ شعرا کو اپنی انگڑائی کی زد میں لے لیتے۔ ایک مشاعرے کا ذکر ہے کہ علامہ نے ایک شعر میں گریباں کے چاک ہونے کا سماں باندھا تھا۔ اس شعر کو پڑھتے ہوئے انھوں نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ آن کی آن میں اپنی قمیص کا گریباں چاک کرلیا۔ پھر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منتظمین کے پیچھے پڑ گئے کہ انھیں مشاعرے کے مقررہ معاوضے کے علاوہ قمیص کی قیمت بھی ادا کی جائے۔ منتظمین نے لاکھ سمجھایا کہ علامہ آپ کی قمیص تو پرانی تھی ہم آپ کو نئی قمیص کی قیمت کس طرح ادا کرسکتے ہیں؟ مگر علامہ نہ مانے اور بالآخر منتظمین کو نئی قمیص کی قیمت ادا کرنی ہی پڑی۔ اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنا لیا کہ جس کسی مشاعرے میں جاتے وہاں "گریباں چاک" والی غزل سناتے۔ اور پرانی قمیص کے بدلے نئی قمیص لے آتے مگر رفتہ رفتہ منتظمین بھی ہوشیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک مشاعرے میں جب علامہ کلام سنانے کے لیے پہنچے تو انھوں نے زبردستی علامہ کی قمیص اتار لی اور احتیاطاً انھیں پاجامے سے بھی محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ کو صرف لنگوٹ پہن کر مائیکروفون پر کلام سنانا پڑا۔

مگر افسوس کہ علامہ کے کلام سنانے کا یہی انداز بالآخر ان کی موت کا سبب بنا اور وہ شاعری کی راہ میں "شہید" ہوگئے ہوا یوں کہ ایک شعر میں "قتل" کا تذکرہ تھا۔ چنانچہ علامہ نے "قتل" کا سماں باندھنے کے لیے اپنی جیب سے اُسترا نکالا اور آن کی آن میں اسے اپنے گلے پر پھیر لیا۔ علامہ کی نعش اسٹیج پر تڑپنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے علامہ کی روح "قفس عنصری" کا تالا توڑ کر پرواز کر گئی۔ اب علامہ میں ہم نہیں رہے جس پر جتنی مسرت کا اظہار کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ زندگی بھر علامہ کو بہیترا سمجھایا گیا کہ علامہ ایسے مہلک اشعار نہ کہیے جن سے آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں۔ مگر وہ نہ مانے اور گزشتہ پیر کو شاعری کے میدان میں شعر پڑھتے پڑھتے ہمیشہ کے لیے شہید ہو گئے۔

علامہ کی کس کس بات کا تذکرہ کیا جائے اور ان کی موت پر کتنے قہقہے لگائے جائیں۔ غرض علامہ کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ علامہ بہت موٹے تھے اور اتنا بڑا خلا، تین چار شعرا سے بھی پر نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ نے بڑی سادہ طبیعت پائی تھی چنانچہ وہ ہمیشہ سادہ پان کھایا کرتے تھے۔ خدا مرحوم کی روح کے ساتھ فراخدلی سلوک کرے اور ان کے پسماندگان کو بے صبری عطا کرے ؎

خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والے میں!

بسلسلۂ گذشتہ
(آخری سلسلہ)

۱۹۶۴ء کی فلمیں

ایک تنقیدی جائزہ

اعجاز قریشی

کشور کمار نے 'دُور گگن کی چھاؤں میں' سے جاکر ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہ صرف اوٹ پٹانگ قسم کی حرکتیں کرنے والا مسخرہ ہی نہیں، ایک سنجیدہ آدمی اور فن کار بھی ہے۔ 'دُور گگن کی چھاؤں میں' سنجیدگی کی جھلکیاں ملتی ہیں اور کہیں کہیں فنی نزاکت اور باریکیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔

'فریاد' میں کیدار شرما نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک فنکار کی حیثیت سے وہ ختم نہیں ہوا۔ اگر حالات سازگار ہوں اور موقعے فراہم کیے جائیں تو راکھ کے ڈھیر میں اب بھی چنگاریاں موجود ہیں۔ اور یہ چنگاریاں پھر آگ پیدا کر سکتی ہیں۔ لیکن .... کیدار شرما کے فن کی یہ آگ آتشِ گُل کی طرح ہے۔ وہ حُسن کا پرستار ہے۔ چنانچہ اس کے فن کا جمالیاتی رچاؤ فریاد میں جگہ جگہ فریاد کرتا نظر آتا ہے کہ اسے اظہار کے موقعے دیئے جائیں۔ اس میں اب بھی حُسن اور تاثر پیدا کرنے والی حرارت اور احساس کو تازگی بخشنے والا بانکپن موجود ہے۔ ذرائع اور وسائل کی کمی، حالات کی ستم ظریفی اور سب سے بڑھ کر دیکھنے والوں کی بے رُخی اور سرد مہری کے باوجود فن کار کیدار شرما نے اس فلم 'فریاد' میں کئی خوبصورت "نزیم" اور "چونکا دینے والے لمحے" دیئے ہیں۔ ایک نئی اداکارہ زیب رحمٰن (پریتی بالا) سے اس نے وہ کام لیا ہے کہ دوسرے بہت سے "صناع" دُنیا بھر کے ذرائع اور وسائل کے ساتھ کسی بڑی مشہور اور منجھی ہوئی اداکارہ سے بھی نہیں لے سکتے۔ زیب رحمٰن کو کیدار شرما نے ایک خوبصورت کردار، ایک دیکھنے کی چیز اور ایک اچھی اداکارہ کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس فلم کے باکس آفس پر ناکام ہو جانے کی وجہ سے زیب رحمٰن بھی کیدار شرما کی طرح بے توجہی کا شکار رہے گی۔

"ہاؤس ہولڈر" دو سال قبل مکمل ہوئی تھی اور منتخب اہلِ ذوق حضرات اور صحافت کے لیے اس کی نمائش بھی کی گئی تھی لیکن تجارتی پیمانہ پر یہ فلم ۱۹۶۴ء کے دوران میں ہی پیش کی جا سکی۔ اس فلم میں باہر والوں نے ہندوستانی زندگی کی صحیح عکاسی اور حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش ہندوستانی فلم سازوں کے لیے سبق ہے۔ اس فلم میں بھی مقصدیت کہیں کہیں "ٹاٹ کا پیوند" معلوم ہوتی ہے اور وعظ و نصیحت بن کر فلم کے مجموعی تاثر کو کم کر دیتی ہے۔ پُر اثر اداکاری، اچھے اور برجستہ مکالموں اور دیگر خوبیوں کی وجہ سے یہ فلم ۱۹۶۴ء کی تین چار قابلِ ذکر فلموں میں شمار کی جا سکتی ہے اگر اسے ۱۹۶۴ء کی فلم سمجھا جائے۔

ان فلموں کے بعد کوئی فلم ایسی نظر نہیں آئی جو کم سے کم معیار پر بھی پورا اُترتی ہو۔ پھر بھی باکس آفس پر کامیابی، مقبولیت اور کچھ نہ کچھ مقبولیت، ان باتوں کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو اس سال کی کامیاب اور مقبول فلموں میں 'کشمیر کی کلی' اور 'ضدی' قابلِ ذکر ہیں 'کشمیر کی کلی میں' نسبتاً اچھی اداکاری ملتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ فلم فارمولا قسم کی تفریحی، رُومانی فلموں میں غنیمت رہی۔ 'ضدی' بھی کافی دلچسپ فلم ہے۔ ان دونوں فلموں کے مقابلہ میں باکس آفس پر "آئی ملن کی بیلا" زیادہ کامیاب رہی ہے۔ حالانکہ یہ ایک مایوس کُن فلم ہے جو کسی بھی زاویئے سے فلم نہیں۔ شروع سے آخر تک فارمولا ہی فارمولا معلوم ہوتی ہے۔ باکس آفس پر اس فلم کی زیادہ کامیابی کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کے تقریباً تمام گانے بے حد مقبول ہوئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ 'جنگلی' کے بعد یہ سائرہ بانو کی پہلی اہم رنگین فلم تھی۔ جس میں سائرہ کے ساتھ ہیرو بھی راجندر کمار ہے جو مسلسل کامیاب فلموں کی وجہ سے اور بھی مقبول ہیرو بن چکا ہے۔ اس سال کی فلموں میں سنگم کے بعد آئی ملن کی بیلا کے گانے ہی سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ رہے۔ مدراس کی عام اپیل رکھنے والی اور گھریلو زندگی اور معاشرتی کرداروں کو پیش کرنے والے فارمولہ فلموں میں "بیٹی بیٹے" اور "زندگی" بہت کامیاب رہیں۔ 'بیٹی بیٹے' پھر بھی اتنی بُری نہیں تھی۔ اس میں کہیں کہیں متاثر کرنے والی باتیں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن 'زندگی' رامانند ساگر جیسے سمجھدار ادیب اور ہدایت کار کی طرف سے ایک بکواس قسم کی لغو تصویر تھی۔ جنوبی ہند کی بعض فلمیں اس بار بُری طرح ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن ان دنوں راج کمار باکس آفس پر اچھی جا رہی ہے۔ سبودھ مکرجی نے جنگلی جیسی کامیاب اور دلچسپ رومانی فلم پیش کرنے کے بعد اپریل فول جیسی واہیات فلم بنائی ہے۔ حیرت ہے کہ کس طرح یہ فلم باکس آفس پر اچھی جا رہی ہے۔ 'راج کمار' دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ سنسر بورڈ نے کس طرح اس فلم کے انتہائی قابلِ اعتراض حصّوں کو پاس کر دیا جو فحاشی کی حدوں کو چھو رہے ہیں۔

اداکاری کے میدان میں ۱۹۶۴ء کا سال کئی مشہور اداکاروں کے لیئے ناکام ترین سال رہا ہے۔ اس سال مینا کماری کی کوئی اہم اور قابلِ ذکر فلم دیکھنے کو نہیں ملی جس میں ہندوستان کی اس ممتاز اداکارہ نے اپنی اداکاری کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا ہو۔ "میں بھی لڑکی ہوں" کے کردار میں کافی گنجائش تھی۔ لیکن ہدایت کار اور کہانی نویس نے اس کردار کو بھی "ٹائپ" کردار بنا دیا۔ مینا کماری کے کرداروں اور اداکاری میں اسی طرح اگر یکسانیت پیدا ہو گئی تو رفتہ رفتہ اس اداکارہ کی شہرت اور اہمیت بھی کم ہوتی جائے گی۔ وحیدہ رحمٰن کی فلمیں بھی اس سال ناکام رہیں لیکن 'کُہرا' میں اس کی اداکاری بہت عمدہ تھی سال ۱۹۶۴ء کی بہترین اداکارہ بلاشبہ وجنیتی مالا تھی جس نے سنگم میں اپنے مشکل کردار کو اچھی اداکاری کے ذریعہ جاندار بنا دیا۔ یوں تو فلموں کی کامیابی اور شہرت حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے سائرہ بانو کے لیئے ۱۹۶۴ء کا سال اچھا رہا۔ لیکن 'جنگلی' میں اس نے جیسی اداکاری پیش کی تھی، اس معیار کو بھی وہ کسی دوسری فلم میں نہیں پہونچ سکی. 'فریاد' میں زیب رحمٰن (ریتی بالا) نے اچھی اداکاری کی، لیکن، زیب رحمٰن کو ہنوز نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ 'ہاؤس ہولڈر' میں لیلا نائیڈو کی اداکاری بھی اچھی تھی۔ سادھنا نے زیرِ تبصرہ سال کی کسی بھی فلم میں اچھی اداکاری پیش نہیں کی۔ لیکن دو فلموں کی کامیابی کی وجہ سے وہ اپنی اسٹار ویلیو کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ نوتن کی جو اسٹار ویلیو شادی سے پہلے تھی اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیئے وہ جد و جہد میں مصروف ہے۔ کاش ہمارے فلمساز اس باصلاحیت اداکارہ کی اداکارانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ مالا سنہا کے لیئے بھی یہ سال اچھا نہیں رہا۔ آشا پارکھ اپنی اسٹار ویلیو کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ راج شری کو "گیت گایا پتھروں نے" میں زیادہ چمکنے کا موقع ملا۔ ویمپ دُہری عورت کے کردار میں زیرِ تبصرہ سال کے دوران کسی نے بھی کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑا۔ معاون اداکارہ کی حیثیت سے جمنا 'بیٹی بیٹے' میں کامیاب رہی۔ [illegible] کا کام 'کُہرا' میں ناظمہ کو اپریل فول میں اچھے رول کا موقع ملا [illegible] دوسرے اور تیسرے درجہ کی [illegible] میں نئی اداکا

چھائی ہوئی رہی اور مستقبل قریب میں بھی اس کی بہت سی فلمیں ریلیز ہونے والی ہیں۔ ششی کلا ٹائپ بنتی جارہی ہے اور شادی کے بعد شوبھا کھوٹے کی فلموں کی تعداد بھی کم ہونے لگی ہے۔ رقاصہ کی حیثیت سے ہیلن، بدستور اپنے منفرد مقام کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ نئی رقاصہ بیلا بوس بھی چمک رہی ہے۔ اسے چھوٹے چھوٹے کردار بھی مل رہے ہیں۔ 'بیٹی بیٹے' میں بے بی فریدہ نے متاثر کیا ہے۔ نئے چہروں میں سریکھا (شہر اور سپنا) قابلِ قدر اضافہ ہے۔

اداکاروں میں اشوک کمار کی یہ خصوصیت برقرار ہے کہ وہ کئی فلموں میں آرہا ہے اور مختلف کردار اسے مل رہے ہیں۔ لیکن اس سال کسی بھی فلم میں اس نے بہترین اداکاری پیش نہیں کی۔ سال ۱۹۶۴ء کا بہترین اداکار بلاشبہ راج کپور 'سنگم' میں رہا۔ وہ بلا مقابلہ اس اعزاز کو حاصل کر چکا ہے۔ کسی دوسرے ہیرو نے اونچے معیار کی اداکاری مرکزی کردار ادا کرتے ہوئے پیش نہیں کی۔ دلیپ کمار کی فلمیں طویل عرصہ کے بعد آتی ہیں لیکن 'لیڈر' بالکل ہی فلاپ رہی۔ ہیرو کی حیثیت سے نئے چہروں میں دلیپ راج (شہر اور سپنا) اور جتیندر (گیت گایا پتھروں نے) اہم اضافہ ثابت ہوں گے۔ جتیندر کا مستقبل زیادہ شاندار نظر آتا ہے۔ ہیرو کی حیثیت سے راجندر کمار کی فلم 'زندگی' اور 'آئی ملن کی بیلا' بہت کامیاب رہیں۔ لیکن ان میں سے کسی فلم میں بھی راجندر کمار کی اداکاری اچھی نہیں تھی۔ البتہ معاون اداکار کی حیثیت سے وہ بلا مقابلہ اس سال کے بہترین معاون اداکار کا اعزاز "سنگم" میں حاصل کر سکتا ہے۔ شمی کپور کی کامیاب فلمیں 'کشمیر کی کلی' اور 'راج کمار' ہیں۔ کشمیر کی کلی میں اس کی اداکاری بہتر تھی۔ لیکن بسواجیت مسلسل ناکام جارہا ہے۔ اپریل فول میں وہ شمی کپور بننے کی کوشش میں بری طرح اوور ایکٹ اور عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایس مکرجی اور اُن کے رشتہ داروں کے نام اور اثر و رسوخ کی وجہ سے جائے مکرجی کو مسلسل اے کلاس فلمیں مل رہی ہیں لیکن اس کی اداکاری میں ہنوز پختگی نہیں آئی۔ دیو آنند کی کوئی قابلِ ذکر فلم دیکھنے کو نہیں ملی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اسٹار ویلیو بہت گھٹ گئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ 'گائیڈ' اسے صفِ اول کے اداکاروں میں جگہ دے گی یا نہیں۔ دھرمیندر اور منوج کمار ترقی کرتے جارہے ہیں۔ لیکن اچھی صلاحیتوں کے باوجود شمی کپور ہنوز کامیاب اداکاروں کی صف میں شامل نہ ہوسکا۔ 'ہاؤس ہولڈر' میں اس کی اداکاری اچھی تھی۔ معاون اداکار کی حیثیت سے 'مجھے' میں بھی لڑکی ہوں' میں — رنگا راؤ اور 'دوستی' میں نئے اداکار سدھیر کمار کی اداکاری بہت پسند آئی۔ محمود کی فلموں میں 'ضدی' ہی غنیمت تھی۔ بعض فلموں میں وہ بری طرح ناکام رہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترقی رک گئی ہے اگر اس کی اداکاری میں یکسانیت پیدا ہوگئی تو اس کی اسٹار ویلیو کم ہوجائے گی۔ پران بوڑھا ہوچکا ہے لیکن کوئی دوسرا ویلن نہ ہونے کی وجہ سے اب بھی اسے کشمیر کی کلی میں شمی کپور جیسے نوجوان اور طاقتور ہیرو سے زور آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ نذیر حسین روبہ زوال ہیں۔

ہدایت کاری، عکاسی، صدابندی اور دوسرے فنی شعبوں کا جائزہ لیتے وقت یقیناً بار بار 'سنگم' کا نام سرِفہرست آئے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ سنگم، تکنیک کے اعتبار سے کئی سال آگے ہے۔ سنگم کی طرح تکنیک کی بلندی کو پہنچنا، سنگم کے معیار کی حسین فوٹوگرافی پیش کرنا، سنگم کی طرح مہارت کے ساتھ رنگ پیش کرنا آئندہ چند سال تک ہندوستانی فلموں کے لئے مشکل رہے گا۔ سنگم کو یہ خصوصیت اور امتیاز بہترین ہدایت کاری کی وجہ سے ہی حاصل ہوسکا۔ صرف تین کرداروں کو لے کر پونے چار گھنٹے کی فلم بنانا اور اسے ہندوستانی فلمی تاریخ کی کامیاب ترین اور مقبول ترین فلم ثابت کرنا واقعی کارنامہ ہے۔ سنگم کے بعد اچھی ہدایت کاری کی جھلکیاں 'شہر اور سپنا' 'فریاد' 'ہاؤس ہولڈر' 'گیت گایا پتھروں نے' اور 'دوستی' میں ملتی ہیں۔ لیکن ان فلموں کے ہدایت کاروں نے جگہ جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ 'سنگم' کی فوٹوگرافی کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راد ملو کھرمارکر اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بہترین فوٹوگرافر ہیں بلکہ ان کا شمار بین الاقوامی شہرت رکھنے والے چند بہترین فوٹوگرافروں میں کیا جاسکتا ہے۔ 'گیت گایا پتھروں نے' کی عکاسی بھی مجھے بہت پسند آئی۔ 'ضدی' میں مورتی کی عکاسی بھی اچھی تھی۔ 'جنگلی' کے سری نواسن نے اپریل فول میں.......

آگے کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ بابا صاحب کا فن بھی 'آئی ملن کی بیلا' میں نئی بلندیوں کو نہیں چھو سکا۔ بلیک اینڈ وہائیٹ فلموں میں سب سے اچھی فوٹوگرافی گہرا میں پیش کی گئی۔ 'بیٹی بیٹے' میں بھی دوبچہ کا استادانہ رنگ نظر آتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے مجموعی طور پر گیت گایا تیمروں' سنے 'سنگم' کے بعد دوسری تمام فلموں میں نمایاں رہی 'سنگم' میں علاالدین کی صدابندی 'سنگم' کے گانوں اور موسیقی کی صدابندی اور اچریکر کا آرٹ ڈائرکشن یہ سب بلاشبہ اعلیٰ بین الاقوامی معیار کے قابلِ فخر نمونے ہیں۔

سال ۱۹۶۴ء کے دوران میں موسیقی کے اعتبار سے کامیاب فلموں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ فلموں کی کامیابی میں گانوں کی مقبولیت نے اہم حصہ ادا کیا۔ گانوں کی مقبولیت اور کامیابی کے اعتبار سے فلموں کی ترتیب اس طرح دی جا سکتی ہے :

(۱) سنگم (۲) آئی ملن کی بیلا (۳) دوستی (۴) اپریل فول (۵) بیٹی بیٹے (۶) وہ کون تھی (۷) کشمیر کی کلی (۸) راج کمار (۹) لیڈر (۱۰) زندگی۔

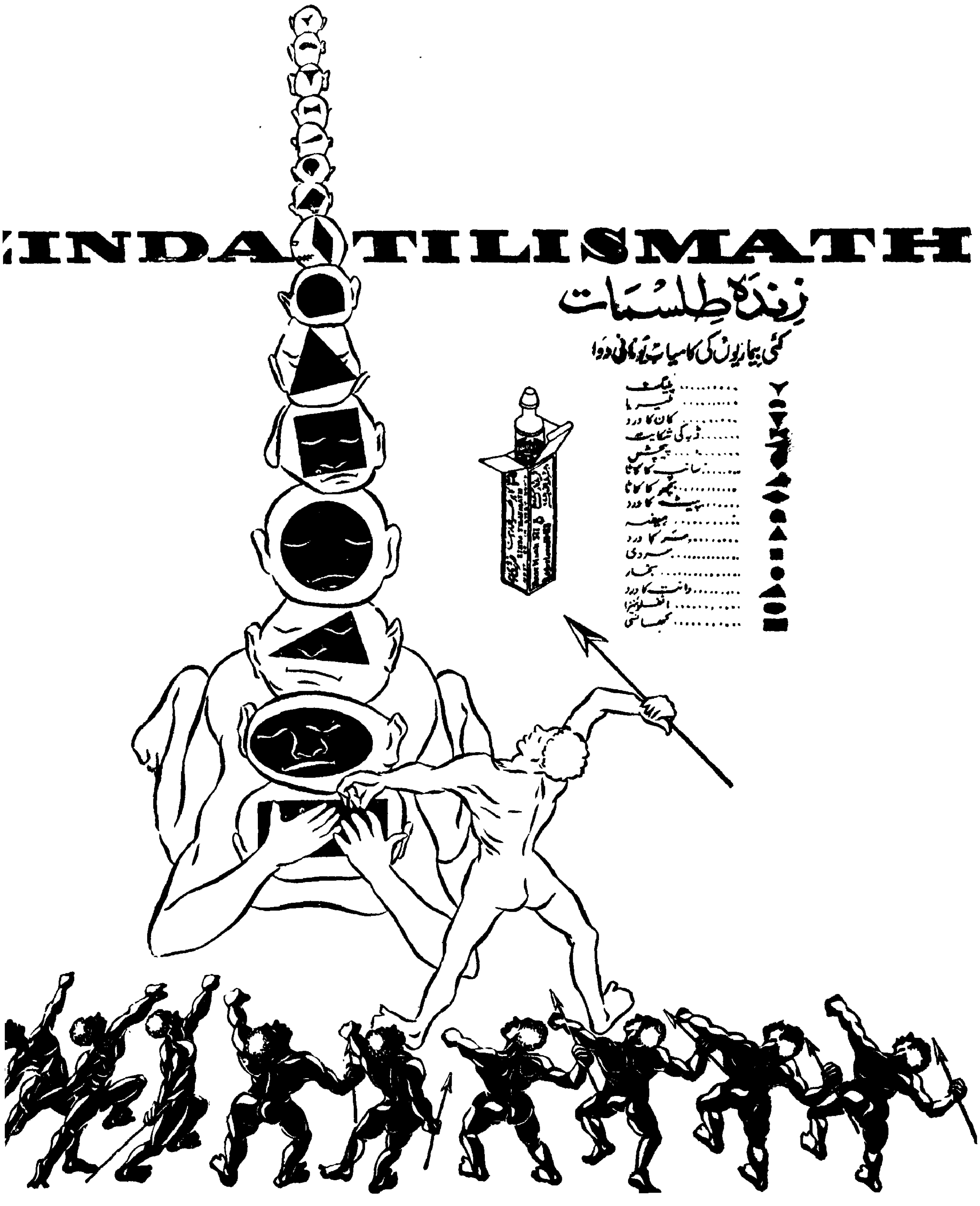
ان دس فلموں میں چھ فلمیں شنکر جے کشن کی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال ۱۹۶۴ء کے دوران میں بھی ملک کے یہ کامیاب ترین اور مقبول ترین موسیقار چھائے ہوئے رہے۔ چنانچہ 'ہز ماسٹر وائس کمپنی' کی طرف سے بھی ان کی کامیابی کا بھرپور اعتراف کیا گیا (جس کا گزشتہ مہینے ذکر کیا جا چکا ہے)۔ موسیقار روی اس سال اپنے دوسرے مقام کو برقرار نہ رکھ سکے۔ گزشتہ سال روشن نے دو فلموں میں اچھی اور بہت کامیاب موسیقی دی تھی۔ اس سال وہ بجھے بجھے رہے۔ اس سال کے اگر ۳۰۔۳۵ مقبول ترین گانوں کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں زیادہ تر گانے شنکر جے کشن ہی کے ملیں گے۔ اس سال کے مقبول ترین گانے تو بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ اس لیے میں خصوصی طور پر چند ایسے گانوں کا ذکر کرتا ہوں جو بہت زیادہ مقبول تو نہیں ہوئے لیکن جن کی دھنیں بڑی خوبصورت اور پُر اثر تھیں۔ (بلا ترتیب)

جھوم جھوم ڈھلتی رات (لتا۔ گہرا) یہ نین ڈرے ڈرے (ہیمنت کمار۔ گہرا)، نیناں برسے رم جھم رم جھم (لتا۔ وہ کون تھی) آ میں تجھے پلکوں میں رکھ لوں سپنا کر لوں سپنا (لتا و مکیش (اپنے ہوئے پرائے)، او سجنا میرے گھر آ جا (لتا۔ سانجھ اور سویرا) مسکرا لاڈلے مسکرا (مناڈے۔ زندگی)، ... کہیں دور گگن کی چھاؤں میں (ہیمنت کمار، گڑیا ہم سے روٹھی رہو گی (لتا۔ دوستی) (یہ فہرست نامکمل ہے) سال ۱۹۶۴ء کا مقبول ترین گانا کونسا ہے، اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ "یہ میرا پریم پتر" (رفیع)، "بول رادھا بول" (مکیش) اور "میں کیا کروں رام" (لتا)، یہ گانے بلاشبہ مقبول ترین گانے رہے لتا اور رفیع اس بار بھی فلمی موسیقی پر چھائے رہے، لیکن مکیش کے دو تین گانے بھی سال کے مقبول ترین گانوں میں جگہ پانے میں کامیاب ہو گئے۔ "گیت مالاؤں" کے بموجب سال کا مقبول ترین گانا "بول رادھا بول" مکیش کا ہی ہے۔ مکیش کے دو چار کامیاب گانوں کے قطع نظر محمد رفیع نے اس سال بھی کئی مقبول کامیاب اور عمدہ گانوں کے ذریعہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اس معاملہ میں کوئی دوسرا پلے بیک سنگر سال ۱۹۶۴ء کے دوران میں رفیع سے مقابلہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی حال لتا منگیشکر کا ہے "فی میل پلے بیک سنگروں" میں کوئی دوسری آواز لتا سے مقابلہ کا سال ۱۹۶۴ء کے دوران میں بھی تصور نہیں کر سکتی۔ حالیہ برسوں کی فلموں میں بالعموم تمام تر توجہ ہیرو پر ہی مرکوز ہوا کرتی ہے مقبول ترین اور اہم گانے فلموں میں ہیرو ہی گاتے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر لتا اور رفیع کے گانوں کی مقبولیت، کامیابی اور معیار کا مقابلہ کیا جائے تو اس کا بہترین اور منصفانہ نتیجہ یہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ سال ۱۹۶۴ء کے دوران میں ان دونوں مقبول ترین اور کامیاب ترین گلوکاروں کا مقابلہ برابری پر ختم ہوا۔ ▲

Registered with the Registrar of News papers at R. N. No: 8285/64.

d. No. **POONAM MONTHLY** Februa

40 AZAMPURA, HYDERABAD-A. P. 1965





پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

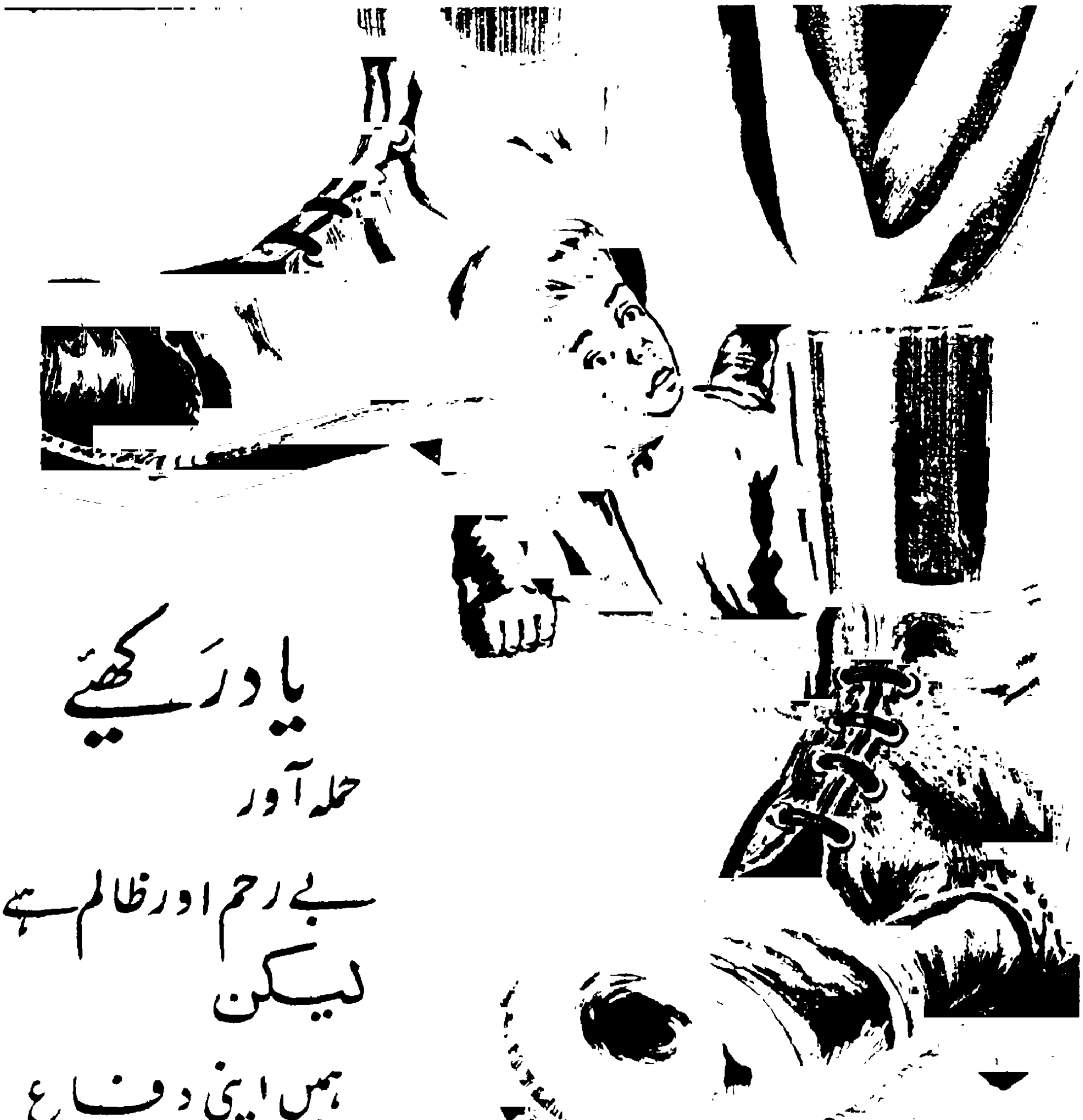
MONTHLY

POONAM HYDERABAD

ماہ نامہ

50 P.

حیدرآباد



جولائی ۱۹۶۵ء

پونم

جلد: ۲ شمارہ: ۱۳، ۱۴

مدیر:

ناصر کرنولی (ایم اے عثمانیہ)

قیمت فی پرچہ: ۵۰ پیسے
زرسالانہ: ۶ روپے
ششماہی: ۳ روپے
بیرونِ ہند سے ۲۰ شلنگ
تاعمر خریداری ۱۰۰ روپے

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ پونم
۱۶-۷-۳۰۱ اعظم پورہ حیدرآباد (آندھرا پردیش)

مقام اشاعت:
ماہنامہ پونم
۱۶-۷-۳۰۱ اعظم پورہ حیدرآباد (آندھرا پردیش)

کتابت
ادارہ حسنِ کتابت حیدرآباد

طباعت:
اعجاز پرنٹنگ پریس، دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

ترتیب

کرنیں:	(اداریہ)	ادارۂ ماہ نامۂ پونم	۴
مضامین:	کارِ خیر	نیرؔ بہوروی	۶
	داستانِ آرزو	جرم محمد آبادی	۷
	کچھ انگریزی کے بارے میں	مقالطیف	۱۳
	ہمارے مسائل	باگا ریڈی	۱۶
غزلیں:	انور صابری، الطاف مشہدی		۱۸
	شاذ تمکنت، شہریار		۱۹
	عبدالعزیز خالد، فنا نظامی کان پوری		۲۰
	ذکا صدیقی، متین سروش		۲۱
افسانے:	شادی کی رات	واجدہ تبسم	۲۲
	تمنا کا دوسرا قدم	حسن عسکری	۳۳
نظمیں:	سازِ ہندی	جگن ناتھ آزاد	۳۸
	جیون چکر	اختر حسن	۳۹
	کوہِ گراں	ڈاکٹر عزیز تمنائی	۴۱
	اکائی	دانش فرازی	۴۱
	ایک تامل نظم کا ترجمہ	کاوش بدری	۴۲
طنز و مزاح:	نہرو کی بذلہ سنجی		۴۴
	مکھن	واہی	۴۵
	ایشس ٹرے	مصطفٰے علی بیگ	۴۶
	جوابِ شکوۂ تنخواہ	شہباز صدیقی	۴۹
صنم کدے:	نئے اور ابھرتے ہوئے فنکار	اعجاز قریشی	۵۳

•

سرورق • عزیز اعظمی آرٹسٹ •



پنڈت نہرو کو ہم سے بچھڑے ہوے ایک سال ہوگیا۔ ان کی شخصیت بین الاقوامی اہمیت کی حامل تھی ان کی پرخلوص مساعی سے امنِ عالم اور جمہوریت کی صحت مند قدروں کو جو فروغ حاصل ہوا وہ ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے ان کا وجود پرامن بقائے باہم کے اصولوں کی عملی صورت گری کے لیے بہت ضروری تھا۔ ایک سال کے اس قلیل عرصے میں دنیا کے حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہوی ہیں، وہ پنڈت نہرو کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس دلاتی ہیں۔

ہندوستان کی سالمیت، قومی یک جہتی اور فرقہ ورانہ اتحاد سے پنڈت جی کو گہرا لگاؤ تھا۔ بقول صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن جواہر لال کے بغیر ہندوستان کی عظمت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آج پنڈت جی ہم میں نہیں ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی روح آج بھی بے چین ہے اور ہم سے مطالبہ کر رہی ہے کہ ان کے ادھورے مشن کی تکمیل کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔

آیئے آج ہم عہد کریں کہ جن تصورات اور نظریات کے پنڈت جی حامی تھے ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ان کی بے چین روح کو شانتی حاصل ہو سکے۔ (ادارہ)

اداریہ

کرنیں

پیش نظر شمارے کے ساتھ

پونم اپنی زندگی کے دوسرے سال میں داخل ہوچکا ہے، اس قلیل عرصے میں پونم نے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں وہ ایک روشن حقیقت ہے۔ شاید ہی کوئی ماہنامہ ہوگا جس نے اتنی کم مدت میں اس قدر مقبولیت حاصل کی ہو۔

ہمیں خوشی ہے کہ

ہم اس ایک سال کے دوران پونم کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے میں کامیاب رہے، یہی وجہ ہے کہ آج 'پونم' کا شمار اردو کے بہترین رسالوں میں کیا جارہا ہے۔ ہم ان تمام قلمی معاونین کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی گرانقدر تخلیقات نے "پونم" کی معنوی خوبصورتی کو قابلِ رشک بنادیا اور امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی ان کا قلمی تعاون ہمیں حاصل رہے گا تاکہ "پونم" کو خوب سے خوب تر بنایا جاسکے۔

جب "پونم" کا پہلا شمارہ منظرِ عام پہ آیا تھا تو بعض کرم فرماؤں نے یہ قیاس آرائی بھی کی تھی کہ پرچہ مستقبل قریب میں دم توڑ دے گا کیونکہ موجودہ ناسازگار حالات میں عمدہ کاغذ، جاذبِ نظر ٹائٹل، خوبصورت کتابت اور طباعت، معیاری اور دلچسپ تخلیقات کے ساتھ پرچہ کو صرف ۵۰ پیسوں میں فروخت کرنا دانستہ نقصان کو دعوت دینا ہے، جہاں تک نقصان کا تعلق ہے، ان کی قیاس آرائیاں بالکل درست ثابت ہوئیں لیکن "پونم" دم نہیں توڑ سکا، وہ آج بھی زندہ ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی زندہ رہے گا۔ ہم اس کے لئے جس جدوجہد میں مصروف ہیں۔ وہ کبھی رائیگاں نہیں جائے گی، یہ ہمارا یقین ہے۔

"ہمیں یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ
"پونم" جنوبی ہند کے ہوائی اڈوں، بندرگاہوں
اور سدرن ریلوے بُک سٹالس کے لئے منظور ہوچکا

”۔ان مقامات پر ”پونم“ جولائی ۱۹۶۵ء سے دستیاب ہو سکے گا۔“

اکثر دوست احباب کے علاوہ ”پونم“ کے بعض قارئین نے بھی ہمیں مشورہ دیا تھا کہ پونم کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے لیکن ہم محض اس خیال سے اس کی قیمت میں اضافہ نہیں کر رہے تھے کہ کم سے کم قیمت میں عمدہ سے عمدہ لٹریچر عوام تک پہونچانا بھی ایک ادبی خدمت ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مدد مل سکتی ہے۔ اس خصوص میں ادارہ کو جو بھی نقصان ہوگا۔ اس کی تلافی اشتہارات سے کر لی جائے گی لیکن ایک سال کے تجربے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو پرچوں کے لئے اشتہارات حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اور جبکہ روز افزوں بڑھتی ہوئی قیمتوں اور اجرتوں نے ہندوستان کے بعض ایسے رسالوں کو بھی اپنی قیمت بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے جن کی اشاعت اور اشتہارات سے آمدنی قابل لحاظ ہے تو ”پونم“ کی قیمت میں اضافہ نہ کرتے ہوئے مزید نقصان برداشت کرنا حماقت سے کم نہ ہوگا۔

چناں چہ

” اگست ۱۹۶۵ء سے ”پونم“ کی قیمت فی کاپی ۷۵ پیسے اور سالانہ قیمت ۸ روپے کردی گئی ہے “

ہم پونم کے بہی خواہوں سے امید کرتے ہیں کہ

پونم کے خریداروں کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کرنے اور جہاں پونم کی ایجنسیاں نہیں ہیں وہاں ان کے قیام کے لئے کوشش کریں گے۔ اور پونم کے لئے اشتہارات کی فراہمی میں ادارہ کے ساتھ عملی تعاون فرمائیں گے — ادارہ۔

▲

پونم کی قیمت میں اضافہ

فی پرچہ	۷۵ پیسے
زرسالانہ خریداری	۸ روپے
ششماہی	۴ روپے ۵۰ پیسے
بیرونِ ہند سے	۲۵ شلنگ
تاعمر خریداری	۱۰۰ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: مینجر ماہنامہ پونم۔ اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔ (آندھرا پردیش)

خیر بہوروی

کارِ خیر

مولانا ظفر علی خاں کی قادرالکلامی اور بدیہہ گوئی مشہور ہے۔ مرحوم ۲۹ اگست ۱۹۴۱ء کو مدراس آئے تھے اور افضل العلماء الحاج ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے مہمان تھے۔ اس وقت افضل العلماء پریسی ڈنسی کالج مدراس کے پرنسپل تھے اور بہت ہی عمدہ قسم کا حقہ استعمال کرتے تھے۔ جس کی حسین ترین بلوری فرش میں پانی کے ساتھ لال گلاب کی پتیاں التزاماً ڈال دی جایا کرتی تھیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے جو حقے کے بے حد شوقین تھے۔ افضل العلماء کے حقے کو دیکھ کر فی البدیہہ یہ اشعار موزوں کیے تھے

بھری گئی تھی چلم عاشقی کی روزِ ازل
ہوا ہے جاری اسی کے جواب میں حقہ
ہر ایک سمت ہو "حق سرہٗ" کا نعرہ بلند
پیوں اگر میں کسی رات خواب میں حقہ
شراب سے جو بچا میں تو تھا یہ راز اس کا
دیا گیا مجھے عہدِ شباب میں حقہ

جو ہیں تو ہیں یہی تہذیبِ مشرقی کے نشاں
اِدھر سے پان اُدھر کو جناب میں حقہ
بحکمِ آیۂ مُنِّی القمر و حسنِ آب
لگا ہے جس کو شبِ ماہتاب میں حقہ

ہے حق تو یہ کہ مذاقِ لطیفِ عبدالحق
بسا کر لایا ہوں بوئے گلاب میں حقہ

•

دسمبر ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ میرا قیام علی گڑھ میں تھا۔ اور ناخدائے سخن نوح ناروی مرحوم موہن لعل آئی ہاسپٹل میں داخل تھے۔ اسی اثنا میں مسلم یونی ورسٹی کی یونین کا سالانہ کل ہند مشاعرہ تھا۔ میں نے سکریٹری مشاعرہ مسٹر رضوان کی سفارش کی تھی اور مرحوم نے ذیل کے قطعات عنایت فرمائے تھے۔

کالج میں ہوا نوح کو لانا مشکل
چل کر کہیں آنا کہیں جانا مشکل
مجبور ہیں وہ آنکھ کے آپریشن سے
ایسے میں ہے طوفان اٹھانا مشکل

•

پھیلایا زمانے میں اثر سید نے
دی علم کی اک اک کو خبر سید نے
جو آئی مہم سامنے ان کے اے نوح
خوبی سے کیا سر اُسے سر سید نے

•

کالج کی بلندی ایسی ہوا سید سے
کالج کی جہاں میں ہے فضا سید سے
سید کے سبب سے ہے بنائے کالج
کالج کی ہوئی نشو و نما سید سے

•

افتخارِ حضرتِ سید یہ ہے
اعتبارِ حضرتِ سید یہ ہے
کیوں نہ شہرت پائے یونی ورسٹی
یادگارِ حضرتِ سید یہ ہے

جُرم محمد آبادی

داستانِ آرزو

جلال کی شاگردی کی خبر جب شہر کے ممتاز لوگوں تک پہنچی تو ایک بزرگ نے فرمایا۔ میاں منجھو! سنا ہے کہ تم بھی شعر کہتے ہو ایک مصرعہ دیتا ہوں اگر اس پر سال بھر میں بھی مصرعہ لگا دو گے تو شاعر مان لوں گا یہ کہہ کر مصرعہ پڑھا ؎

اُڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

آرزو صاحب نے کچھ تامل کرنے کے بعد کہا لیجئے مصرعہ لگ گیا ؎

دامن اس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں
اُڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

بارہ برس کے لڑکے کی زبان سے یہ مصرعہ سن کر میر صاحب پھڑک اُٹھے اور کہنے لگے خدا نظر بد سے بچائے تم تو ابھی سے اُستاد ہو۔ ایک مشاعرے میں باپ بیٹے دونوں بلائے گئے۔ طرح تھی ؎

ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یاس صاحب نے مطلع پڑھا ؎

قابو میں رکھے دل جسے پروردگار دے
اتنا دیا ہو عشق میں کوئی پکار دے

آرزو صاحب نے جب مطلع پڑھا تو رنگِ محفل ہی

غم دے تو دل بھی شمع کا پروردگار دے
جو ساری عمر ایک طرح پر گزار دے

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ طرح میں مشروط ہوتا تھا۔ اس قافیہ کو شعرا ضرور نظم کرتے تھے طرح ہو جانے بھی "دو" اس میں "جانے" کا قافیہ مشروط تھا۔ جناب سماعت فرمایئے ؎

بکھنے آئے ہو تم سے آئینہ آنے بھی دو
خیر تم اپنی حرف دیکھو چلو جانے بھی دو

آرزو صاحب کا مطلع سنیے ؎

تیغ پر غصہ ہے کیوں ہم سخت جاں ہو لیں گے!
دیکھو اپنی نازکی کا منہ کرو جانے بھی

اسی زمانے میں دربار رام پور میں طرح ہوئی "جگر رکھ دیا، پتھر رکھ دیا۔ دربار میں باکمالوں کا مجمع تھا جس کی تصویر جناب شکوہ آبادی نے یوں کھینچی ہے ؎

مجمع شاعرانِ نامی ہے — شاعری کی ہے گرم بازاری
فنِ تاریخ میں رسا منصور — جان صاحب کی ریختی پیاری
داغ شاداں عشق جلال امیر — ہم سری انوری و مختاری
سب سے بڑھ کر نئیر کو حاصل — بے کمالی و ہرزہ گفتاری

چنانچہ جب حضرت جلال مشاعرے سے تشریف لائے تو آرزو صاحب نے فرمایا حضور مشاعرہ کیسا رہا؟ اساتذہ کے مطلعے سنایئے جناب انہوں نے جواب دیا تم نے بھی فکر کی ہے؟ اچھا سنو! جناب داغ کا مطلع ہے ؎

میں نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

جناب امیر نے یہ کہا اور فلاں نے یہ فرمایا میرا مطلع سنو ؎

جس نے کچھ احساں کیا اک بوجھ ہم پر رکھ دیا
سر سے تنکا کیا اتارا سر پہ چھپر رکھ دیا

اب تم اپنا مطلع سناؤ۔ آرزو صاحب نے تسلیم کر کے مطلع پڑھا ؎

قصدِ نالہ پا کے اس نے ہاتھ منہ پر رکھ دیا
آبلہ پھٹنے نہ پایا تھا کہ نشتر رکھ دیا

اسی زمانے کی دو غزلیں مرزا غالب کی مشہور غزلوں پر ہیں۔ پنسل کی لکھاوٹ اور کاغذ کی بوسیدگی کے باعث صرف چند ہی شعر پڑھ سکا۔ یہ غزلیں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب اسی زمین میں چار شعر چودہ برس کے لڑکے کے سنیے ؎

مرنے پہ آہِ گرم کا بازار سرد تھا
یارب یہ تھا نفس کا تعلق کہ درد تھا
دل جلوۂ حبیب سے تھا قفلِ بے چراغ
ظاہر میں بس رہا تھا حقیقت میں سرد تھا
آرامِ جاں تو ہیں اگر ایذا رساں بھی ہیں
بیٹھے تھے وہ جدھر اسی پہلو میں درد تھا
نازک مزاجیوں سے تری وقتِ التفات
گو خون بڑھ رہا تھا مگر رنگ زرد تھا

دوسری غزل صواجن گیا ماہ نامہ پونم کے ذریعے ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں۔

اٹھارہ برس کی عمر میں حضرت جلال نے اصلاح سے مستغنی قرار دیا اور اپنے شاگردوں کی اصلاح بھی ان کے سپرد کر دی اور ہر طرح کسوٹی پر کسنے کے بعد سندِ استادی بھی عطا کر دی جو تحریر بطورِ اجازہ مرحمت فرمائی تھی اس میں تحریر فرمایا ہے۔

نقل اجازہ

"سید انور حسین جو میرے شاگرد ہیں، شاعرِ خوش فکر و نازک خیال سخن ور عالی مذاق ہونے کے علاوہ ماہرِ فنِ شعر بھی ہیں یعنی علم عروض و قافیہ و دیگر ضروریاتِ شعری سے بھی خوب آگاہ ہیں اور تمام اصنافِ سخن میں توجہ کر کے اپنے میں جامعیت پیدا کر لی ہے، لیکن غزل اور مرثیہ میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور بہ سبب صاحبِ طبعِ سلیم ہونے کے ہر اختلافی بحث پر رائے زنی کر کے قوتِ فیصلہ سے کام لے سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ تحریر ان کو بطور اجازہ دی جا رہی ہے"

راقم ایں سطور ننگ سخنورانِ ماضی و حال، ہیچمدان حکیم سید ضامن علی جلال بقلم خود۔ ۲۷ جون ۱۹۰۸ء

حضرت جلال سے اجازہ حاصل ہونے کے بعد شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ سندیلہ سے کامل صاحب مولوی منصب علی صاحب ہنر لکھنوی کے انتقال کے بعد استاد کی تلاش میں لکھنو آئے اور جناب جلال کے مشورے پر آرزو صاحب کو سندیلے لے گئے۔ وہاں جناب التفات رسول صاحب تعلقدار نے بڑی قدر کی۔ سندیلہ میں جیسے مشاعرے ہو چکے ہیں وہ اپنی آپ مثال ہیں۔ نشتر سندیلوی نے اصلاح کے لیے غزل پیش کی، اس میں ایک مصرعہ تھا ع

جیسے کھینچے لیے جاتا ہے کلیجا کوئی

مصرع نہیں لگ رہا تھا آرزو صاحب نے فرمایا کہ لو ؎

وہ گلے مل کے جو پلٹے تو یہ محسوس ہوا
جیسے کھینچے لیے جاتا ہے کلیجا کوئی

جب اصلاحِ سخن تک بات آ پہنچی ہے تو چند اصلاحیں بھی پیش کر دوں یوں تو میرے پاس سیکڑوں خواجہ تاشوں کے کلام پر اصلاح کا قیمتی سرمایہ محفوظ ہے۔ جو آن سندیلوی فرماتے ہیں ؎

محشر میں آج آئی ہے مقتل کی سرزمیں
دامن میں خون لے کے کسی بے قصور کا

اصلاح: محشر میں اُٹھ کے آئی ہے مقتل کی سرزمیں
دامن میں خون لے کے کسی بے قصور کا

جب محشر ہی ہے تو آج کی کیا ضرورت ایک لفظ کی ترمیم نے شعر کی معنوی حیثیت بھی درست کر دی اور سقم بھی دور کر دیا۔

لندن، آغا برق ؎

دل بستگی وہیں ہے جہاں ہم خیال ہوں
گلشن اداس ہے نہ بیاباں اداس ہے

اصلاح: دل بستگی وہیں ہے جہاں ہم مذاق ہوں
گلشن اداس ہے نہ بیاباں اداس ہے

ہم خیال ہونا مشکل ہے دل بستگی ہم مذاق کے وجود سے وابستہ ہے۔

میرا مقطع تھا ؎

کوئی مانے نہ مانے ترنم لیکن یہ حقیقت ہے
ضعیفی میں بھی روداد جوانی یاد آتی ہے

اصلاح: کوئی مانے نہ مانے ترنم لیکن حقیقت ہے
بہت پیری میں بھی روداد جوانی یاد آتی ہے

جب نواب امداد بہادر رئیس باندہ کی تحریک پر آرزو صاحب جانشین جلال ہوئے تو نواب بہادر حسین خاں صاحب انجم نے تاریخ کہی ؎

آرزو شد رکنِ اعلیٰ مسند آرائے جلال

اس خبر کے بعد نواب احمد حسین خاں صاحب رئیس پریانواں مصنف "تاریخ احمدی" نے بھی آرزو صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ جلال کی جانشینی کے بعد آرزو صاحب کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس شستہ اور نکھری ہوئی اردو کے خالق ناسخ ہی ہیں۔ ناسخ کے بعد سید علی اوسط رشک مرحوم نے تذکیر و تانیث کے قواعد مرتب کیے ان کے جانشین حضرت جلال نے محاورات، زبان کا لغت مرتب کیا۔ چراغ سے چراغ جلتا آ رہا تھا۔ چنانچہ آرزو صاحب نے بھی خدمتِ زبان کا بیڑہ اٹھایا اور زندگی کے بیس سال صرف کر کے ۸۰ صفحات کی کتاب نظام اردو کے نام سے پیش کی۔ قواعد فصاحتِ زبان مرتب کرنا اور کلیہ بنانا کھیل نہیں ہے۔ ابھی تک فصاحتِ زبان کا معیار یہ تھا کہ اہلِ لکھنؤ یوں بولتے ہیں فصحائے دہلی یوں ادا کرتے ہیں۔ مگر اہلِ زبان کسی مخصوص محل پر یہ لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی جگہ اور کوئی لفظ کیوں نہیں بولتے جملے کی کونسی ترکیب فصیح ہے کون غیر فصیح ہے، محاورہ اور روزمرہ میں کیا فرق ہے۔ کلام کے فصیح ہونے کا کیا معیار ہے ان باتوں کا کوئی واضح جواب ہمارے پاس نہیں تھا۔ یہ کام مشکل بھی تھا اور نیا بھی۔ نیا اس لیے کہ کسی بیرونی امداد کا آسرا نہیں تھا اور مشکل اس بنا پر تھا کہ خواجہ تاشوں کو سنبھالنا اور اپنے شاگردوں کی خبر لینا۔ جن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا کتاب کی افادیت اسی سے واضح ہو رہی ہے کہ آرزو صاحب ایسا باکمال ۸۰ صفحات کی کتاب ۲۰ سال میں لکھے۔ نظامِ اردو کے بعد میزان الحروف پیش کیا۔ یہ رسالہ بھی اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے بالکل نیا ہے۔ حروفِ تہجی کی مقدار و صورت کیا ہے لفظوں میں ترنم کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔ تمام راگ راگنیاں علمِ عروض کے حلقۂ اثر میں ہیں؟ یہ سب موضوعات میزان الحروف میں نہایت واضح طور پر سمجھائے گئے ہیں۔

اصنافِ سخن اور تصانیف

فنی رسالے۔ نظامِ اردو، میزان الحروف، شائع ہوچکے ہیں ہفت کشور، قانونِ فصاحت اور عروضِ اردو یہ غیر مطبوعہ ہیں۔

ڈرامے: متوالی جوگن، حسن کی چنگاری، دل جلی بیراگن، چراغِ توحید، چاند گہن، بات کا دھنی، ستی شانتی، سیفو، گدڑی کا لال، دورخی تصویر، عمل کا پھل، اور جامِ زہراب میں تین ڈراموں کے علاوہ سب اسٹیج ہوئے اور قبولیتِ عام حاصل کی۔

داستانیں: نثر کا حصہ نظم کی بہ نسبت کم ہے مگر جو ہے وہ بہت وقیع ہے، نواب صاحب بھاولپور کی فرمائش پر کوچک باختر اور بالا باختر کے درمیان اس داستان کا اضافہ کیا جو دو ہزار سات سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا مسودہ ریاست کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

مثنوی: کئی مثنویاں ہیں۔ لیکن صبحِ بنارس، عدلِ محمود، اور دردانہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور شائع ہوچکی ہیں تمام اشعار کی تعداد تقریباً تین ہزار ہوگی۔

فلمی کہانیاں: فلمی دور میں کئی کہانیاں لکھیں۔ حالات کی بنا پر صرف ایک کہانی "مجھ ڈھونڈو" پردۂ سیمیں پر آئی۔

افسانے: بہت کم لکھے، دو مختصر افسانے "ایک کٹھن رات" اور ستی سہاگن خالص اردو میں لکھے گئے ہیں یہ دونوں افسانے سریلی بانسری میں شامل ہیں۔

لغت: اکبر الٰہ آبادی کی فرمائش پر کام شروع کیا تھا مگر درمیان میں کھا نچلا پڑ گیا۔ جناب جوش کے پیہم تقاضوں کے بعد پھر شروع کیا۔ لیکن لغت کی تکمیل سے پہلے ہی سفرِ زندگی تمام ہوگیا۔ اصنافِ سخن میں آرزو صاحب نے علاوہ واسوخت کے ہر صنف میں حاکمانہ اقتدار کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے اور قابلِ قدر ذخیرہ چھوڑا ہے، غزل، مرثیہ، رباعی، قصیدہ، نظم، مثنوی، قطعات، تاریخ اور گیتوں کا اچھا خاصہ سرمایہ موجود ہے ان کے علاوہ نثر میں، داستانیں، ڈرامے، افسانے اور متعدد فنی رسالے لکھے ہیں جن کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں۔

غزل: ۶۵ برس کی عمر میں پچیس ہزار شعر کہے۔ جن میں انتخاب کے بعد سات دیوان مرتب کیے گئے۔

فغانِ آرزو، جہانِ آرزو، سریلی بانسری، اور نشانِ آرزو علی الترتیب کئی بار شائع ہوچکے ہیں۔ زبانِ آرزو، جانِ آرزو اور بستانِ آرزو ہنوز زیورِ طبع سے محروم ہیں۔

سریلی بانسری: یہ علامہ آرزو کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں ہوا ہے اس قید کے باوجود زبان کی لطافت روزمرہ کا لطف ندرتِ خیال کی پاکیزگی اس حد تک موجود ہے

کہ اگر ملی ہدایہ نہ کہا جائے کہ یہ غزلیں اس قید میں کہی گئی ہیں تو آپ کو مطلق احساس نہ ہوگا کہ ہم کیا سن رہے ہیں عربی و فارسی کے استعمال بغیر قدما کے دواوین میں بھی اکا دکا اشعار ملتے ہیں مگر وہ نادانستہ طور پر نظم ہو گئے ہیں۔ یہاں التزام کے ساتھ غزلیں کہہ کے اردو کی ایک مستقل تصنیف کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر نقل کر رہا ہوں فیصلہ کیجئے کہ آرزو صاحب نے قدرتِ زبان و بیان کا کیسا اعجاز آفریں نمونہ پیش کیا ہے ؎

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

بیڑا ہو پار کیا بھلا باندھا ہے اس سے آسرا
کھول کے ناؤ لے چلے دھارے پہ لاکے چھوڑ دے

اس نے لبھا کے آرزو بدلی ہے مجھ سے آنکھ یوں
جیسے کوئی چھڑک کے تیل آگ لگا کے چھوڑ دے

کالی گھٹا میں کوندا لپکا رو کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

دیکھا تو نہیں اب تک اور ڈھونڈھ نکالا ہے
آنکھوں میں اندھیرا ہے پاؤں میں اجالا ہے

سریلی بانسری میں سیکڑوں ایسے الفاظ جو اہلِ زبان کا روزہ

ضرور تھے مگر فصحا نظم کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ یہ فصیح بھی ہیں یا نہیں۔ آرزو صاحب نے فصیح و مستعمل مگر غیر مکتوبی الفاظ کو استعمال کرکے فنا ہونے سے بچا لیا۔ خالص اردو میں ایک دیوان کی ترتیب ہی دنیائے ادب میں ایک نئی شاہراہ کا اضافہ تھی۔ اگر آرزو صاحب محض یہی ایک کام انجام دیتے تو وہ خاندان ناسخ کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے ادبی اسلاف کے سچے جانشین تسلیم کرلیے جاتے مگر انھوں نے محض اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ زبان کو وسعت دینے اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے اور فصیح و مستعمل مگر غیر مکتوبی الفاظ کو فنا ہونے سے بچا لینے میں جو سعیٔ بلیغ فرمائی ہے۔ اس میں موصوف کا مقابلہ ناسخ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر سے کرنا محال ہے' ذیل میں وہ اشعار نقل کر رہا ہوں جن میں وہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اہلِ زبان کا روزمرہ اور فصاحت کی ٹکسال کے کھرے سکے تو ضرور ہیں لیکن اگر حضرت آرزو ان کو نظم نہ کرتے تو آج ان کا وجود نہ رہتا ؂

کیا کیجئے اس پر بھی جو بھاویں ہو ان کے
ہم چاہ میں کرسکتے تھے جو کچھ وہ کیا تھا

یہی ہر گھڑی پھر تو چاہیں گی آنکھیں
دکھا کے جھلک کیوں لگاتے ہو ہرا

سکھ ملا ہے تو دکھ بھی سہنا ہے
نہیں ہنسنا تو پھر اُہنسنا ہے

کس سے ہے کس کا چاہ پیار بگڑے کہ بھید کھل گیا
یوں تو یہ ہے کہ اک سڑی بکتا ہے آئیں بائیں شائیں

وہ یوں ہنستے نہ تھے پہلے رُلا کے
یہی ہوتا ہے اب تو ادبدا کے

کیسا گانا' ناچ کیسا اب نہ کوئل ہے نہ مور
ہوگئی ساری سبھا بھر بھنڈ جب کھٹکا ہوا

سریلی بانسری میں ایسے ہزاروں الفاظ ہیں جس کو مطالعہ کا شوق ہو وہ زحمت گوارا کرے۔ خاندانِ ناسخ کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے محاورات زبان کے تحفظ پر اپنی پوری توجہ مبذول کر رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت جلال مرحوم نے تو محاورات اور ان کا برمحل استعمال سمجھانے کے لیے ایک لغت بھی تصنیف فرمائی تھی۔ حضرت آرزو بھی اپنے خاندانِ شعر و ادب کی اس روایت کے پورے پابند ہیں۔ چنانچہ آج سارا ہندوستان اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ کسی محاورے کی صحت یا عدم صحت کے سلسلے میں اگر کسی کا فیصلہ آخری اور قطعی تسلیم کیا جاسکتا ہے تو وہ حضرت آرزو ہیں۔ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ محاورات کو اس صورت سے نظم کر دیا جائے کہ آنے والی نسلوں سے ان کا صحیح استعمال پوشیدہ نہ رہے چنانچہ فغانِ آرزو وغیرہ کی طرح سریلی بانسری میں بھی آپ کی یہ مہم جاری رہی ملاحظہ فرمائیے ؂

چاہ میں جس کو پھانس کے رکھا
اس کو پھنسر تانس تانس کے رکھا

ہمیں بھی ایک لڑائی کا دھیان ہے تو سہی
یہ کان بجتے ہیں یا بولتا ہے رن اب تک

آنکھیں ملتی ہیں جی سے میل نہیں
سچ ہے ان بوتلوں میں تیل نہیں

چھپنے والا پاس ہونے پر بھی ہے کتنا الگ
اس سے پوچھو جس نے جانے کونے کونے کیلئے

ابھی تھوڑی تھوڑی ہے آنسو میں لالی
اسے اور ہلکا سا اک ڈوب دے لیں

سریلی بانسری علامہ موصوف کی ایسی بے بہا تصنیف ہے جس کی نظیر متقدمین سے لے کر متاخرین تک نہیں ملتی خالص اردو میں طائر روح کا قفس عنصری سے پرواز کرنا' حیاتِ چند روزہ کی ناپائیداری قدم قدم پر قیود کے پہرے بیٹھے ہیں مگر آرزو صاحب ہر مضمون کو اس خوبی سے ادا کر جاتے ہیں کہ دوسرا شاعر ایک مصرع کہے تو دانتوں پسینہ آجائے۔

سانس تک تھی بولتی چڑیا بھی بند   تیلی ٹوٹی ایک فسترا ٹا ہوا

گیت: زیادہ تر فلموں اور ڈراموں کے لیے کہے ہیں کچھ پنے ذوق سے بھی کہے ہیں جن کی مجموعی تعداد تین ہزار تک پہنچتی ہے۔

نظمیں: اتحاد بین المسلمین پر زیادہ کہی ہیں۔ ماہنامہ عکاس کلکتہ میں بہت سی قابلِ قدر نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ سریلی بانسری ن کچھ۔ کی لڑائی" خالص اردو کی قید میں موجود ہے۔ بقیہ غیر مطبوعہ منظومات ماہنامہ 'پونم' کے ذریعے وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہونگا

دیگر اصناف سخن: مثلاً ہندی کے دوہے۔ یا کسی خاص موضوع پر چند شعر یا فردیں جن کو عام طور سے کسی خاص صنف کی طرف نہیں منسوب کر سکتے، ان اشعار کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں ہے۔

قطعات: خاص خاص مواقع پر حسبِ ضرورت یا فرمائش کے طور پر کہے ہیں، جو اب تک مجموعی صورت میں شائع نہ ہو سکے۔ قطعات کے اشعار کی تعداد بھی کم و بیش دو ہزار ہوگی۔

قصائد: کبھی کسی والیٔ ریاست کی شان میں قصیدہ نہیں کہا۔ البتہ جناب رسول خدا اور ان کی آل پاک کی شان میں قصائد لکھے ہیں۔ اور ان میں قصیدہ گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ قصائد کی تعداد زیادہ نہیں ہے پھر بھی سات ہزار اشعار کا یہ مجموعہ اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ حضرت آرزو کو اس صنف سخن پر بھی کامل قدرت حاصل ہے۔ ایک طولانی قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دل کی ہمت ہے بتِ پندار کا سر توڑ دے
یہ وہ شیشہ ہے کہ رہ جائے تو پتھر توڑ دے

جوہر آج اس شیشۂ ساغر نما کے یوں دکھا
جم ٹپک دے جام، آئینہ سکندر توڑ دے

جوششِ غم کی رکاوٹ ہے قانونِ فطرت کے خلاف
بند آبِ اشک کا اے دیدۂ تر توڑ دے

فرش پر رہ کے بن کے اپنی بیقراری کی شکن
ایک اک کروٹ میں سو سو تار بستر توڑ دے

ماہنامہ پونم کی تنگ دامانی کا خیال دامن گیر ہے ورنہ ہر صنف سخن کی مثال پیش کرتا خصوصاً مراثی اور دیوان کے منتخب اشعار (خیر کسی) دوسری صحبت میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

رباعیات: رباعیات بہت ہیں ہزاروں فلسفے رباعیوں کی صورت میں قلمبند کر دیئے ہیں۔ چند رباعیاں فغانِ آرزو میں شائع ہوئی ہیں ورنہ تمام ذخیرہ غیر مطبوعہ پڑا ہوا ہے جن کی مجموعی تعداد تین ہزار اشعار ہوگی۔

سلام: مرثیوں کے بعد سلام بھی کثرت سے کہے جن کی مجموعی تعداد پانچ ہزار اشعار کے لگ بھگ ہوگی۔ اگرچہ کئی بار متعدد مجموعے شائع ہوئے لیکن کوئی ایسا جامع مجموعہ شائع نہ ہوا جس میں کم از کم تمام منتخب سلام درج کر دیئے جاتے۔

مرثیہ: مکمل و نا مکمل ۲۶ مرثیے کہے ہیں، لیکن پچاس برس کی عمر کے بعد اس صنف میں کوئی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ یہی زمانہ مرثیہ گوئی کا تھا۔ صرف ۵ مرثیے خمسۂ متحیرہ کے نام سے سلطانی پریس بمبئی نے شائع کیے۔

آرزو صاحب نے اردو کو کتنی لفظیں دی ہیں یہ ایک مستقل موضوع ہے، معاصرین نے کہاں کہاں مدد لی ہے یہ باب بھی نہایت دلچسپ ہے۔ اس ذکر کو پھر کبھی چھیڑوں گا، ۶۵ سالہ مشق کا کارنامہ کم و بیش ۶۵ ہزار اشعار ہیں۔ بالکل شروع زمانے کے اشعار جو کسی سبب ضائع ہو گئے ان اشعار کے علاوہ ہیں۔

•

میں انجمن ترقی اردو کلکتہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے "یوم آرزو" منانے کا فیصلہ کر کے مجھ ایسے کوتاہ قلم سے داستانِ آرزو لکھوالی۔

••

وقار لطیف (مقیم لندن)

لندن کی تہذیبی جھلکیاں

مستقل فیچر

کچھ انگریز کے بارے میں

حکومت برطانیہ ہر سال دولت مشترکہ (دولت مشترکہ) کے باشندوں کو ان گنت ملازمتی اجازت نامے (EMPLOYMENT VOUCHERS) اجرا کرتی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ اس ملک میں چند سال پیشتر لوگ نوکریوں کو نہیں بلکہ نوکریاں لوگوں کو ڈھونڈا کرتی تھیں۔ چنانچہ آج بھی آپ کو بعض ہندوستانی بیرے جزائر غرب الہند کے حجام یا نائیجیریا اور گھانا کے ماہر کان صاف کرنے والے کافی معقول اور ذمہ دارانہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ملیں گے۔ مگر غالباً جب جائیدادیں اس قدر تیزی سے پُر ہونے لگیں کہ حکومت برطانیہ کچھ پابندیاں عائد کرنے پر مجبور ہو گئی اور اجازت نامے دینے سے پیشتر شخص مذکور کی علمی، ادبی یا کسی دوسری غیر پسندیدہ سمت میں قابلیتوں کی جانچ پڑتال کی جانے لگی۔ مثلاً پہلے صرف انجینئر ہونا کافی تھا۔ (انگلستان میں یونیورسٹی گریجویٹ سے لے کر برقی تاروں کے سلسلوں کی نگہبانی کرنے والا جوان یا اپنے ہاتھ روم کے پائپوں کی درستگی کرنے والا بھی اکثر انجینئر کہلاتا ہے) مگر بعد میں انجینئرنگ کی ڈگری، ڈپلوما، یا سند کے علاوہ متعلقہ پیشہ میں کم از کم دو سال کا تجربہ ضروری قرار دیا گیا۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریزی سے قطعی طور پر نابلد ہندوستانی تجربہ کار استاد دو تین مہینوں میں انگریزی کا کورس ختم کر کے انگریز بچوں کو ان کی اپنی مادری زبان سکھاتا تھا (اب بھی سکھاتا ہے، لیکن اب ایسے قابل اتالیقوں کی کوئی خاص قلت نہیں محسوس کی جا رہی ہے۔)

مگر آج بھی ڈاکٹروں، نرسوں، دنداں سازوں، پروفیسروں اور ماہر شارٹ ہینڈ ٹائپسٹوں کو یہ اجازت نامے فوراً مل جاتے ہیں۔ میرے اپنے معیار تو کچھ اور تھے مگر مجھے توقع تھی کہ انگلستان میں کم از کم مذکورہ بالا محکمۂ صحت سے تعلق رکھنے والے پیشہ ور لوگ (جن میں موخر الذکر بہت اہمیت رکھتی ہیں) ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہوں گے (سوائے دنداں سازوں کے!) اور ملازمتیں ان کے قدم چومتی ہوں گی خود میں اس صورتِ حال سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتا کیونکہ برطانیہ کے معیار تقریباً ہر شعبۂ زندگی میں بہت ہی اونچے مانے جاتے ہیں۔ ان کا اس دریا دلی سے غیر ملکیوں کو اجازت نامے دینا مجھے دراصل

ایک آنکھ نہیں بھایا ۔

انگلستان پہنچنے کے بعد مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ واقعات اس قدر قابو سے باہر نہیں ۔ پہلے پہل اس بات کو میں پوری طور پر سمجھ نہ سکا مگر بہت غور و خوض کے بعد ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک طرح سے بیٹھ گئی ۔ !

ہاں تو مجھے یہاں آ کر ہی اس بات کا پتہ چلا کہ پہلی بار انگلستان آنے والے ان خوش قسمت افراد کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں :

(۱) وہ جنھیں انگلستان میں کام کا تجربہ نہیں رہا ۔

(۲) وہ جنھیں انگلستان میں کام کا تجربہ رہا ۔

قسم نمبر ۱ : افسوس تو اس بات کا ہے کہ تقریباً تمام غیر ملکی باشندے جو اس ملک کو پہلی مرتبہ آتے ہیں انھیں سوائے ایک زمانے میں ان سے محکوم رہنے کے کسی اور قسم کا انگلستانی تجربہ نہیں رہا ۔ اگر ایسا ہوتا تو بڑی ہی دل خوش کن بات ہوتی ۔ کیونکہ وہ تین سوالات جو ٹیپ کے بند کی طرح ہر نئے آنے والے ملازمت کے امیدوار سے کئے جاتے ہیں وہ علی الترتیب یہ ہیں (ترتیب بے حد قابلِ توجہ ہے) :

سوال ۱ : کیا آپ اس سے پیشتر کبھی انگلستان آئے ہیں ۔؟

جواب ۱ : نہیں ۔

سوال ۲ : کیا آپ کے پاس کسی انگلستانی ادارے کی ڈگری ڈپلوما یا سند ہے ؟

جواب ۲ : نہیں ۔

سوال ۳ : کیا آپ کو یہ انگلستانی ڈگری ، ڈپلوما یا سند حاصل کرنے کے بعد انگلستان میں کام کرنے کا تجربہ ہے ۔

جواب ۳ : نہیں ۔

مجھے یقین ہے قارئین کو وہ مشہور لطیفہ یاد آ رہا ہوگا جس میں ایک مولانا نے ایک خاتون ہم سفر سے پوچھا تھا کہ کیا وہ شادی شدہ ہیں (جواب نہیں) نہایت شائستگی سے دریافت کیا تھا کہ ان کے کتنے بچے ہیں ۔ اور بعد میں ایک دوست کی تنبیہ پر ایک دوسری ہم سفر خاتون سے یہ دریافت کرنے کے بعد کہ ان کے کتنے بچے ہیں ۔ (جواب : چار ۔ !) یہ پوچھا کہ اُن کی شادی ہوئی کہ نہیں ۔ !

مگر قارئین اس لطیفہ کو قطعاً مندرجہ بالا سوال و جواب سے منسوب نہ کریں کیونکہ وہ قصہ " ایک ایسے حضرت کے بارے میں ہے جنھیں سیاست اور ڈپلومیسی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور یہ حقیقت " ایک ایسی قوم کے بارے میں ہے جو اپنی قومی خصوصیات کی بنا پر ساری دنیا میں مشہور رہی ۔ اور اسی وجہ سے آج تک اپنے آپ کو باقی رکھنے میں کامیاب بھی رہی ۔

ہاں تو ہر سرکاری EMPLOYMENT EXCHANGE. ہر پرائیویٹ EMMPLOYMENT AGENCY اور ہر اس ادارے میں جس نے اپنے آپ کو ملازمتیں چلانے کا ٹھیکہ دار مشہور کر رکھا ہے یہی ابتدائی تین سوال بار بار ہر ایک سے کئے جاتے ہیں ۔ (ظاہر ہے کہ تین آخری سوالات بھی یہی ہوتے ہوں گے) اب آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ فریقین کو اس صورتِ حال میں کتنی شرمندگی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا ۔ کیونکہ ایک بیچارہ آپ کو نوکری دینا چاہتا ہے مگر چند اصولوں کی بنا پر مجبور ہے ۔ دوسرا نوکری کرنا چاہتا ہے مگر کچھ شرائط پورے نہ کر سکنے کی وجہ سے معذور ہے ۔ !

ایک ماہر سے اس بارے میں استفسار کرنے پر اس نے دو آسان نسخے ان انگلستان آنے والے حضرات کے بارے میں تجویز فرمائے جو آپ سب کی سہولت کے لئے نیچے پیش کئے جا رہے ہیں :

نسخہ نمبر (۱) ملازمتی اجازت نامہ ملنے کے فوری بعد کسی نہ کسی طرح سے " کانٹے سے یا غنڈے سے "

(یہ BY HOOK OR BY CROOK کا غالباً حد سے زیادہ آزاد ترجمہ ہے)

اپنے ملک میں ہی کوئی انگلستانی ڈگری حاصل کر لیں (یاد رہے کہ مراسلتی طریقۂ تعلیم اور اس طرح سے حاصل کی ہوئی سندیں جو کسی انگلستانی ادارے نے دی ہوں یہاں انگلستانی نہیں مانی جائیں)

نسخہ نمبر (۲) ، اگر ایسا نہ ہو سکے تو کسی نہ کسی طرح سے جان توڑ کوشش کر کے ، ان چھ مہینوں میں اپنے ہی ملک میں

تین سال کا انگلستانی تجربہ حاصل کرلیں (یاد رہے کہ انگلستان سے باہر کے کسی ملک میں کسی انگلستانی کمپنی میں کام کا تجربہ انگلستانی تجربہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ وہاں کے موسم اور جغرافیائی حالات بالکل جداگانہ ہوا کرتے ہیں، خصوصاً موسم ــــ! انگلستان کا موسم کسی اور ملک سے تو کیا خود گذرے ہوئے کسی اور انگلستانی موسم سے نہیں ملتا ــ)۔

ان دونوں نسخوں پر اگر آپ حرف بہ حرف عمل کرسکیں تو پھر وارے نیارے ہیں مگر غالباً ان میں سے ایک بھی کافی ہوگا وہ اس کے بعد یہاں آتے ہی ملازمتیں ضرور آپکے قدم چومینگی۔ لہٰذا ہر نوانگلستانی ملکی کو میرا یہ پرخلوص مشورہ ہے کہ اگر وہ اس سراب نما جزیرہ پر اپنے جہاز کو لنگر انداز کرنے کا خیال بھی نہ کرے اور اس سنہرے اصول کو کبھی نہ بھولے جو ایک عقلمند فلسفی نے اپنے ایک بیوقوف فلسفی دوست کو سمندر ہی کے کنارے بتلایا تھا، جب تک تمہیں تیرنا نہ آجائے بھول کر بھی پانی میں قدم نہ رکھنا۔"

قسم نمبر۲ : دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو پہلی بار انگلستان آتے ہوئے اپنے ساتھ انگلستانی ڈگریاں اور انگلستانی تجربے کی سندیں بھی لے آتے ہیں۔ ایسی قسم ممکن ہے قدیم زمانہ میں رہی ہو جب کہ جادو ٹونا اور طلسم بہت مقبول عام تھے۔

ایسے لوگ آجکل شاذونادر ہی ملیں گے۔ مگر بہرحال ان کے بارے میں مزید تحقیق یا تو آثار قدیمہ اور تاریخ کے طالب علموں کو کرنی چاہیئے یا پھر محکمہ پولیس کو ــ!!

حیدرآباد

ماہنامہ پونم

ہمارے مسائل

مستقل فیچر

ایم۔ باگا ریڈی ایم۔ پی۔ اے
صدر انجمن تحفظ اردو

۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء سے ہندی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مرکزی حکومت کے اس اعلان کے بعد صوبائی حکومتیں بھی علاقائی زبانوں کی ترقی کی طرف متوجہ ہو چکی ہیں۔ چنانچہ مستقبل قریب میں ریاستوں میں علاقائی زبانوں کا سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال شروع ہو جائے گا۔ اور ان زبانوں کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہو جائے گی۔ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان میں کئی کروڑ باشندوں کی زبان ہونے کے باوجود اپنی کوئی ریاست نہیں رکھتی۔ یہاں تک کہ دہلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش اور پنجاب جیسے علاقوں میں جو اردو کے گہوارے کہلاتے ہیں، اردو اپنے جائز حق سے محروم ہے۔ آندھرا پردیش میں تلگو کے ساتھ اردو کو بھی علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کا قانونی تحفظ ضروری ہے۔ موجودہ حالات کی روشنی میں اردو کو اس کا جائز حق دلانا اردو والوں کا اولین فریضہ ہے۔ اس خصوص میں اب تک اردو زبان کی ترقی و تحفظ کے لئے جو اقدامات کئے گئے اور ان کے جو بھی نتائج برآمد ہوئے اس کا جائزہ لیتے ہوئے آئندہ کیا تدابیر اختیار کرنے چاہئیں تاکہ اردو کو اس کے جائز جمہوری اور قانونی حقوق حاصل ہو سکیں؟ (ادارہ)

جناب ایڈیٹر صاحب "پونم" حیدرآباد

آپ کا سوال نامہ شائع ہونے کے بعد ملک کے لسانی مسئلہ کے حل کے لئے بعض ایسے اہم اور بنیادی فیصلے ہوئے ہیں جنھیں ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے ۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء کے بعد سے ہندی کو ہند یونین کی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن غیر ہندی داں علاقوں اور ریاستوں کے عوام کی خواہشات اور احساسات کا خیال کرتے ہوئے ہماری قومی حکومت اور قومی قائدین نے یہ فیصلے کئے ہیں کہ انگریزی جس طرح ۲۵ جنوری تک استعمال کی جاتی تھی آئندہ بھی اسی طرح غیر معینہ مدت تک ہندی کے ساتھ ساتھ استعمال کی جاتی رہے گی۔ موجودہ لسانی حالات کی روشنی میں ان فیصلوں کو بہترین مفاہمتی فارمولہ کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ لسانی مسئلہ کا مستقل حل کسی مفاہمتی فارمولہ میں نہیں بلکہ منصفانہ، معقول اور حقیقت پسندانہ پالیسی کو روبہ عمل لانے میں ہے۔ ہندی کو رابطہ زبان ہونے کے

ناطے جو حیثیت دی گئی ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ انگریزی کو دیئے گئے تحفظات کی قانونی شکل اس کی زندگی اور ترقی کے لئے امید افزا ہے۔ اس خصوص میں اگر دستور کی مسلمہ تمام ۱۴ زبانوں کو مساوی مقام دیا جائے اور ان کے ساتھ مساوی برتاؤ کیا جائے تو حکومت کا ایک مستحسن اقدام ہوگا۔ یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات کے ان ۱۴ زبانوں میں انعقاد کا فیصلہ اس مقصد کے حصول کی ایک اہم قدم ہے اس طرح اردو زبان میں بھی یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات منعقد ہو سکیں گے۔ لیکن یہ عجیب تضاد ہے بعض ریاستوں اور بعض علاقوں میں تو اردو کے ساتھ ناانصافی کا یہ عالم ہے کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ہے، ابتدائی ثانوی سطح پر تعلیم پانے کے جائز حق سے محروم ہیں اور دوسری مرکزی حکومت کی طرف سے یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحانات اسی زبان میں بھی منعقد ہونے والے ہیں۔ یونین پبلک سروس جیسے اہم امتحانات میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ ابتدائی

تعلیم سے لے کر اعلیٰ جامعاتی تعلیم تک اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے کیونکہ مضبوط عمارت کی تعمیر کے لئے مستحکم بنیاد بھی لازمی ہے۔

جہاں تک آندھرا پردیش کا تعلق ہے یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں حکومت نے منصفانہ، مثالی لسانی پالیسی اختیار کی ہے توی امید ہے کہ قانون سازی کے ذریعہ اس ریاست میں اردو کے موقف کا تعین ہو جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی سطح پر قومی قائدین اردو کے ساتھ انصاف کریں اور صدر جمہوریہ ہند اپنے ان اختیارات کا استعمال کریں جن کی صراحت دستور ہند میں کر دی گئی ہے۔ جب تک اردو کے تعلق سے حقیقت پسندی اور انصاف کے اصولوں پر مبنی قومی پالیسی مرتب نہیں ہوگی اردو قومی زندگی میں اپنے حقیقی مقام اور موقف سے محروم رہے گی، اور بعض علاقوں میں ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر رہے گی جو زبان کے مسئلہ کو تعصب اور پارٹی پالیٹکس کی ترازو میں تولتے ہیں انصاف کی ترازو میں نہیں۔

ہم اردو والے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم میں قوت عمل اور استقلال کی کمی ہے جس کے بغیر کوئی جدوجہد یا تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ صرف جلسے منعقد کرنے، مطالبہ پیش کرنے اور محضر پیش کرنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے منصوبہ بند، منظم طریقہ پر [illegible] کی ضرورت ہے۔ اتحاد اور اشتراک عمل اور کسی مستعدی [illegible] ذریعہ ہمیں ایک ایسی متحدہ قوت بنانا چاہیئے جس کی آواز اور مانگ کو کسی بھی جمہوری نظام کے اندر نظر انداز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ہی اردو کو کل ہند سطح پر اور ان تمام ریاستوں میں جہاں اردو کو دوسری اور تیسری بڑی زبان کا درجہ حاصل ہے اس کا جائز مقام اور قانونی موقف حاصل ہو سکتا ہے [illegible] جامعات قائم ہو سکتی ہیں۔ اور پنچایت سمیتی کی سطح سے [illegible] سکریٹریٹ کی سطح تک اردو کو اس کا مستحقہ مقام مل سکتا ہے۔

جہاں تک اردو کی موجودہ تحریک کا تعلق ہے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر اردو کی نمائندگی اور قیادت کرنے والے بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ مسائل کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اردو کے مطالبات سے سرگرم دلچسپی اور سنجیدہ اور عمیق غور و فکر کی کمی کا یہ عالم ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور کل ہند سطح پر بھی جو تجاویز اور یادداشتیں وغیرہ مرتب کی جاتی ہیں وہ ناقص اور تشنہ ہوتی ہیں تو بعض یادداشتیں اور مرتب کرنے والوں کی ریاستوں میں اردو کے مقام اور موقف سے عدم واقفیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس افسوسناک صورت حال اور غور و فکر کے سرسری انداز کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں لیکن اس تفصیل میں گئے بغیر مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ اردو کی جدوجہد سے اردو کے تمام اداروں، تنظیموں، محبان اردو اور بہی خواہوں کو اس طرح وابستہ کیا جائے کہ ان میں سے ہر کوئی اسے اپنی جدوجہد تصور کرے اس جدوجہد میں اردو کے بہی خواہوں اور صحیح نمائندگی کرنے والے سبھی عوامی کارکن شامل ہوں جن میں وکلا بھی ہوں اور قانون ساز بھی ادیب اور صحافی بھی ہوں اور فنکار بھی پبلشر بھی ہوں... اور سیاسی سماجی رہنما بھی جب عوامی اور قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں کام کرنے والے لوگ مل جل کر کام کریں گے تو جدوجہد کی کامیابی یقینی بن جائے گی بعض لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ جدوجہد میں شامل ہونا ہر اردو دوست کا فرض ہے، اس کے لئے دعوت کی کیا ضرورت ہے...؟ یہ اعتراض بظاہر درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی سازگار فضا موجود ہی نہیں ہے جس میں خود بخود لوگ اس طرح باہم متحد ہو کر منظم طریقہ سے کام کر سکیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو تحریک کے تعلق سے وسیع النظری اور حقیقت پسندی کے ساتھ متحد ہو کر عملی اقدامات کئے جائیں۔ اگر چھوٹے چھوٹے شخصی یا جماعتی مفادات کا لحاظ کیا گیا اور تحفظات ذہنی سے کام لیا گیا تو اردو والوں کی طاقت منتشر ہی رہے گی اور تنظیم عمل اور اتحاد عمل ایک خواب ہی رہے گا۔

غزل

خوشی دیکھتا جا نہ غم دیکھتا جا
جو دکھلائے ان کا کرم دیکھتا جا

بچائے ہوئے خاص سجدوں کی عظمت
تماشائے دیر و حرم دیکھتا جا

ہے اک یہ بھی حسنِ تغافل کا پہلو
مرا دامنِ چشمِ نم دیکھتا جا

نئی زندگی کی تلاش و طلب میں
ملیں گے بہت پیچ و خم دیکھتا جا

توازن کا قائل نہیں رنگِ دنیا
بہ اندازۂ بیش و کم دیکھتا جا

ہیں سب تیرے ماضی کے رنگین خاکے
عرب دیکھتا جا عجم دیکھتا جا

ہر اک شعرِ انور کے پردے میں پنہاں
کسی کے نقوشِ قدم دیکھتا جا

انور صابری

الطاف مشہدی

چند رعنائیاں مجھے دے دو — میری رسوائیاں مجھے دے دو
میں نہیں دردناک کر دوں گا — مست شہنائیاں مجھے دے دو
نام کو بھی نہیں کہیں انساں — اب تو پرچھائیاں مجھے دے دو
بزم آرائیوں سے کیا حاصل — میری تنہائیاں مجھے دے دو
طور خود ساتھ ساتھ ہو لے گا — جلوہ آرائیاں مجھے دے دو
درد کو روگ جاننے والو! — غم شناسائیاں مجھے دے دو

آج الطاف بہرِ شعر و شباب
اُن کی انگڑائیاں مجھے دے دو

ملیں مختاریاں اے کاش ہم مجبور ہو جاتے
بھلا تھا تم قریب آنے سے پہلے دور ہو جاتے

شریکِ ہر نفس اک آرزوئے مرگ ہے ورنہ
مرے سارے چراغ اے زندگی بے نور ہو جاتے

سرِ دریائے بے تابی وہ منظر یاد ہے اب تک
کہ ساحل تک سفینے آتے آتے دور ہو جاتے

بُرا ہو دل نے کیوں ظرفِ نشاطِ غم نہیں پایا
کہ ترا ذکر آتا اور ہم مسرور ہو جاتے

وصال اک عیشِ غم تھا قربتِ دوری نما کیا تھی
یہ ایسے زخم تھے جو بھر کے بھی ناسور ہو جاتے

تری شانِ عطا کی خیر سائل کی صدا سننا
کہ یوں بھی کاسہ ہائے چشم تھے معمور ہو جاتے

خیالِ ہم نشیں تو نے نگوں ساری عطا کر دی
جمالِ ہم نشیں پاتے تو ہم مغرور ہو جاتے

شاذ تمکنت

شہریار

مشعلِ درد پھر اک بار جلا لی جائے
جشن ہو جائے ذرا دھوم مچا لی جائے

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گزرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے

جو بھی ملنا ہے ترے در ہی سے ملنا ہے اسے
در ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے

وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھا لی جائے

غزل

شاعر نے اس کو زندۂ جاوید کر دیا
تھی ورنہ ایک دخترِ صحرا ـــ شکنتلا

اک گمشدہ انگوٹھی کا ناٹک ہے اور کیا
کہتے ہیں جس کو لوگ تخیل کا معجزہ

یادیں، خیال، آرزوئیں، خواب، خواہشیں
مزدِ ثواب و برگ و نوائے حسن کا رس کا

ترساکرے گا عمر بھر آسودگی کو وہ
انصاف کو جو جنسِ تجارت بنائیگا

دنیا کا دودھ پیتے ہیں جو دوں نہاد ہیں
آبِ حیاتِ عشق پلا ہم کو، ساقیا!

جو دور ہیں وہ دل سے زیادہ قریب ہیں
سورج سے نور لے کے چمکتا ہے چاند کیا

شوقِ جہاں نورد کا کوئی وطن نہیں
نشہ ہے کس قدر مجھے ارضی شراب کا

ہم تو فقط زمیں پہ خدا کے امین ہیں
غالب ہے کردگار علیٰ کُلِّ من علیھا

سرّ و علن پکار تو خوف و طمع کے ساتھ
سُبحانَ مایریٰ اَثرہٗ اَنملِ فی الدُّجیٰ

انساں نہیں ہے صرف سُلالۂ آب و گِل
کیوں اس کو پھر گمان ہے اُفتادگیٔ گُمشدگی

الفاظ کے طلسم سے ہے ماورا سخن
تخلیق کشف و فراست و شعر و مراقبہ

سوئے ہوئے دماغ میں نغموں کا جل ترنگ
الاکرائے شعر، مرے دل کا دیوتا!

عبدالعزیز خالد

غزلیں

فنا نظامی کانپوری

چند لمحے حسن بے پردا رہا
مدتوں ذوقِ نظر رسوا رہا

میرے بعد آئی نہ شاید فصلِ گل
عمر بھر زنداں میں میں تنہا رہا

آج کچھ کہنا ہے دنیا سے مجھے
آج تک دنیا کی میں سنتا رہا

اہلِ دانش بھی گئے تھے دار تک
تیرے دیوانوں کے سر سہرا رہا

اس نے مڑ کر اس طرح دیکھا مجھے
بے نیازی کا گلہ جاتا رہا

میکدے پر تشنگی چھا جائے گی
ایک میکش بھی اگر پیاسا رہا

اہلِ ساحل کی زباں پر اے فنا
ڈوبنے والوں ہی کا چرچا رہا

غزلیں

پروفیسر ذکا صدیقی

حقیقت بھی کہانی ہو گئی ہے
یہ اپنے خواب میں خود کھو گئی ہے

اب ایسے بھی وہ بیگانے نہیں تھے
محبت کارگر کیوں ہو گئی ہے

شبِ غم میں دلاسا کون دیتا
دیئے کی لو بھی تھک کر سو گئی ہے

کسی صورت ٹھہرتا ہی نہیں دل
سحر بھی ہجر کی شب ہو گئی ہے

مآلِ خندۂ گل کیا بتائیں
اسی ہنسنے پہ شبنم رو گئی ہے

ذکا چاکِ گریباں سی رہے ہیں
بہار آتے ہی وحشت ہو گئی ہے

متین سروش

بزمِ عشرت سے تری دیدۂ نم لے کے اُٹھے
ہم سمجھتے ہیں مگر ساغرِ جم لے کے اُٹھے

نازِ عرفانِ وفا ہمتِ غم لے کے اُٹھے
محفلِ ناز سے جب تیرے قدم لے کے اُٹھے

عظمتِ لوح و قلم زیرِ قدم لے کے اُٹھے
آج کیا شے ترے آسودۂ غم لے کے اُٹھے

جلوۂ دیر و حرم کی کوئی عظمت نہ رہی
اہلِ غم آج تری شمعِ کرم لے کے اُٹھے

زندگی عہدِ وفا تجھ سے نباہیں کیوں کر
جان دے دینے کی وہ آج قسم لے کے اُٹھے

ہم جہاں ساز کہ برگشتہ مقدر سے ہوئے
خوں میں ڈوبے ہوئے خوابوں کے صنم لے کے اُٹھے

رقصِ بسمل پہ کوئی آج نہیں ہے تیار
ہم نے مانا وہ حسیں تیغِ ستم لے کے اُٹھے

ہم نے ہر دور میں لکھی نئی تقدیرِ حیات
مصحفِ جہد و عمل، لوح و قلم لے کے اُٹھے

چاہیئے دل کی ضیا ساتھ رہے ان کے سروش
دہر میں جو غمِ انسان کا علم لے کے اُٹھے

حیدرآباد

...م

...ہ تبسم

شادی کی رات

بیٹھک سے لے کے اندر برآمدے تک ـ برآمدے سے لیکر ...نگن، دالان سے لے کر ـــ غرض کہ پوری حویلی میں عجیب سہما سہما سا ...ا چھایا ہوا تھا ـــ

ہوا یہ تھا کہ صبح ہی صبح روز کی طرح گلابو سلیم میاں کے پاؤں دباتی ...کے بستر پر کھڑی تھی کہ اکرم سلیم میاں نے اس کا ہاتھ جھپٹ کر اسے ...رضائی میں کھینچ لیا ـــ!

منجھلی پھوپھی نے یہ کارروائی دیکھ لی اور چونکہ بیک نائی کی طرح ...کوئی بات اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتی تھیں اس لئے جھٹ سے جا کر صفیہ ...سے لگا دیا کہ "اے تمہارے میاں کی مت ماری گئی ہے گلابو سے ...مشغول ہو رہی ہے"

صفیہ بیگم کے کاٹو تو بدن لہو نہیں ـــ جھرجھرا کر پھوپھی کو دیکھا ...ور بولیں ـــ "آپ سدا یونہی دو دو کی بھڑ لگایا کرتی ہیں ـــ"

"اے میاں کیا پیٹ بھرتا ہے دو دو کی لگائی کرنے سے ـــ پاؤں ...ٹوٹنے دیتے ہیں چل کر دیکھ ہی نہ لو ـــ"

ہرچند کہ یہ عورت گناہ کی بات تھی کہ دو کے بیچ میں آنکھ جھکائی ...جائے مگر منجھلی پھوپھی کو منزل پہونچانا بھی تو تھا ـــ

دبے دبے پیروں سے چلتی چلتی دونو پرلی کھڑکی پاس پہونچیں تو صفیہ بیگم نے سچ مچ ہی اپنی آنکھوں دیکھا ـــ گلابو کا تو نام ونشان نہیں ـ "مگر یہ کیا ضرور ہے کہ گلابو........ انھوں نے پھر بھی اپنے میاں کو بے گناہ ٹھہرانا چاہا ـــ

"اے بی کیا تمہاری عقل ہے کہ واہ ـــ میں کہوں تم نے تیرہ برس راجے رجا ڈھیر سے بچے پیدا کئے اور تمہیں اتنا ہی نہیں معلوم کہ....

سلیم میاں کے کان بھی چوہے کی تیزی کو مات کرتے تھے ـــ اکرم سے انہوں نے دھکا دے کر گلابو کو لوٹ دیا ـــ

"کم بخت کو پیر دبانے تک کا سلیقہ نہیں ـــ یہ کدھر گھسی چلی آ رہی ہے ـــ"

صفیہ بیگم نے ہولا کر منجھلی پھوپی کو دیکھا ـ منجھلی پھوپھی نے گلابو کو دیکھا مگر ذرا ہنس کر بولیں ـــ

"وہ تو کہو "کاشت کاری" ابھی نہیں ہوئی ـــ"

"کیا مطلب ـــ"؟ صفیہ بیگم بگڑ گئیں ـ!

"ودئی مطلب وطلب کی اس میں کون بات ہے ـــ"

سلیم میاں کو اپنی بے گناہی جتانی منظور تھی اور ... سوائے

منجلی پھوپھی کے کس کے سامنے رو نا رو سکتے تھے ۔

"قسم اللہ کی منجے پھوپھی وہ پلنگ نواڑ کا ہے ۔ وہ ایک جھکولے سے میرے بازو آ پڑی ۔"

"اچھا میاں! آ بھی پڑی تو اسے رضائی سے کس نے ڈھانپا ۔ موٹی گلا بو نہ ہوئی عید بقر عید کا حصہ ہو گئی کہ سر پوش سے ڈھک دیا ۔"

سلیم میاں نے غصّے سے ان کی طرف دیکھا ۔ "تو مطلب آپکا یہی ہے کہ میں نے جان کر اس کا ہاتھ پکڑ کر گرا لیا ۔"

"یہ خود تم ہی کہہ رہے ہو میاں ۔ میں نے کب کہا ہے بھلا ۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔ انسان تھکا ماندہ ہو کر آتا ہے تو اُسے اتنی بھی مہلت نہیں کہ چار گھڑی پاؤں ہی دبوا لے ۔"

"تو میاں تم پاؤں دبوانے کے لئے اس کنکالہ کو ہی کیوں پکڑ لاتے ہو ۔ کیا رحیمو نہیں ہے ۔"

"وہ ۔ وہ ۔ پہلے تو سلیم میاں سٹ پٹائے پھر سنبھلے ۔" وہ بات کچھ ایسی ہے کہ اب وہ دباتی ہے تو اسی کے پیروں کی عادت لگ گئی ۔"

"ہونہہ اسی کے پیروں کی عادت لگ گئی ۔ تم تم نہ ہوئے بھینس ہو گئے کہ تھنوں کو ایک ہی گوالے کے ہاتھوں کی عادت ہو گئی ۔"

سلیم میاں گھر کے مالک تھے چاہتے جو کرتے ۔ مگر کھلے خزانے کچھ کرتے پھرتے یوں بھی تو شرم آتی تھی کہ دو بیٹیوں کے باپ بھی تھے ۔ اور بیٹیاں اللہ رکھے اتنی بڑی کہ کہو تو چولھا سنبھال لیں ۔

"تم کو تو شرم نہیں ۔ گھر میں بچے ہیں ان کا خیال تو ہو ۔"

اب تک تو سلیم میاں طرح دیئے جاتے تھے ۔ مگر اب چڑ گئے ۔

"کمال کی بات ہے منجے پھوپی ۔ اب ہماری شرم کو کیا ہو گیا ۔ ہم نے کچھ کیا ہو تو ایک بات بھی ہو ۔ یہاں تو بے قصوری میں جی حضوری ہو گئی ۔"

"اپنا کیا ہے میاں ۔ دو نوالوں کے بھوکے ہیں ۔ زندگی تو تم دونوں کی ہے ۔ ہمارا کیا بھروسہ ۔ ؟"

مگر حقیقت تو یہ تھی کہ منجلی پھوپھی صرف دو نوالوں کی ہی بھوکی نہ تھیں ۔

جب تک ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر نہ لگا دیتیں ان کا پیٹ نہ بھرتا ۔ لڑائی لگا دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ ابھی ابھی دونوں ہنس بول رہے ہیں ۔ میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی ہیں ۔ اتنے ہی لتے ذرا کی ذرا جو سپاری لینے اٹھیں تو جھٹ جا کے کان بھر دیئے ۔ اب میاں انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اب سپاری لے کے آتی ہیں ۔ جب سپاری لے کے آتی ہیں اور یہاں عدالت کی کارروائی ہی ختم نہیں ہو چکتی ۔ وہ تو کہو دونوں ہی کو عقل آ گئی اور سمجھ گئے کہ نہیں ان کا طلب کچھ کچھ بھبک نائی سے ملتا جلتا ہے ۔ ورنہ اب تک تو ایک گھر کے دو گھر ہو گئے ہوتے ۔ آج کی بات کو بھی پہلے تو صفیہ بیگم نے مذاق ہی سمجھا مگر جب خود آنکھوں سے رضائی سے بندریا اچھلتی دیکھی تو سمجھ گئیں کہ نہیں تہہ میں کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور ۔

سلیم میاں کی پندرہ برس اُدھر صفیہ بیگم سے شادی ہوئی تھی ۔

شادی ہوئی اس وقت صفیہ بی کی عمر ۱۵ سال تھی ۔ پندرہ سال تک بھلا کون بیٹی بٹھائے رکھتا ہے مگر وہاں بھی عجیب کھیل ہو گیا ۔ صفو کی نہ تو منگنی ہی ہوئی تھی نہ نسبت ہی طے ہوئی تھی ۔ ہاں تائی جان کے چھوٹے بیٹے کے لئے تاکی ہوئی ضرور تھیں ۔ بس اتنا ہی قصہ تھا، آگے پیچھے کوئی بات نہ تھی ۔ مگر ایک دن ہوا یوں کہ شہر سے صفیہ بی کے بڑے چچا کے بیٹے چھٹیاں گذارنے گاؤں آئے ۔ اب اماں نے تو صفیہ بی کو ہر فن میں طاق کر رکھا تھا ۔ کون کام بھلا نہ آتا ۔ صبح ہی صبح عابد میاں جب گاؤں کی ہوا کھانے کو نکلنے کو ہوئے تو اماں نے کہا ۔

"میاں ناشتہ تو کرتے جاؤ ۔"

"باپ رے" وہ چھڑی ہلا کر بولے "اب ناشتہ پکے گا میں کھاؤں گا پھر جاؤں گا ۔ بس اب تو واپسی پر ہی بات اٹھا رکھئے ۔"

مگر اتنے کے لتنے باورچی خانے سے گھر کے آتارے گھی کی لپٹیں چلنے لگیں اور جب تک کہ چچی بھتیجے کی بات ختم ہوئی ۔ ادھر دسترخوان بھی بچھ گیا ۔ انڈے بھی تلے گئے اور گرم گرم پراٹھے بھی اترنے لگے ۔ اور پھر صفیہ نے آکر نیوتا بھی دے دیا ۔

"بھائی میاں دو نوالے ہی لے لیجئے ۔ ادھر گاؤں کی سیر کو آپ نکل گئے تو دل پلٹے نہ پلٹے گا ۔ انسان کھنچ کر رہ جاتا ہے، بارہ سے پہلے

کیا آپ کی واپسی ہو گی ــــ"

"اچھا ــــ" وہ مسکرا کر بولے ــــ اور پتلون کے پائنچے ذرا اوپر چڑھا کر وہیں دھپ سے بیٹھ گئے ـ

شہر میں تو اندھے بہرے بازاری گھی اور دوکان کے گیہوں نے جیسے بھی بنا بس پیٹ بھر لیا ـ یہاں تو گھی کی خوشبو سیدھی دل تک تیرتی چلی گئی ــــ صفیہ پراٹھے بناتی ــــ اور چھی بی گرم گرم لا کر سامنے ڈالتی جاتیں ــ آدھوں بھر پراٹھے دم کی دم میں چٹ کر گئے ــ نرم نرم ایسے کہ حلق سے اترتے تو معلوم بھی نہ ہوتا ــ اسی جنون میں لگے ہاتھوں تعریف بھی کر دی ــ

"ارے واہ ــ صفیہ کیا خستہ پراٹھے ڈالتی ہیں بھئی ـ ــ"

اے لو ــ بس اتنی ہی بات پر اماں کے تو دل کے ہزار دل ہو گئے ــــ وہ چار چھ دن گاؤں رہے بھی مگر ـ بس آنا ہی قصہ تھا آگے پیچھے کوئی بات نہ تھی ــ مگر ترقی سودیوں میں جب تائی اماں بیٹے کی نسبت لے کر آئیں تو اماں نے منھ تیسے پر اٹھوں والی بات پھیر پور جواب دے دیا کہ ــــ

"ہماری صفو کی نسبت تو گاؤں سے پرے لگی ہے ــ"

تائی نے دیدے پھاڑے تو اماں نے وضاحت کی ــــ

"اے ہماری بھابھی کا بیٹا شہر میں پڑھتا ہے کہ نئیں ــ ؟

اس نے اپنے منہ سے بات چھیڑی ہے ــــ"

اب دن ہی کہ بیتے جا رہے ہیں ــــ صفیہ چاروں طرف سے یوں پھل پھول رہی ہے جیسے ترائی کی بیل ــــ مگر شہر سے اب سلام آیا نہ تب ــــ ڈیڑھ سال تو یوں گذرا جیسے پلک بھی نہ جھپکائی ہو ــــ ادھر کے سارے لڑکے گتھ گئے ــــ کون جوان لڑکوں کو ڈھیل دیتا ہے بی ــ صفیہ بیگم بیٹھی کی بیٹھی رہیں ــ صورت یوں بری کا ہے کو تھی ــــ رنگ روپ چاہے اچھا ہی تھا ــــ اور گن ڈھنگ کی بات تو جانے دو ـ گاؤں والے اپنی اولاد کو سکھانے پڑھانے میں کوتاہی کرتے ہیں ــــ

صفیہ کی ایک خالہ تھیں جن کے لڑکے مکتب کی پڑھائی پوری ہوتے ہی گاؤں باہر بھیج دیئے گئے تھے ــــ ان بیچاروں کا یہ حال تھا کہ کسی شمار قطار میں نہ تھیں ــــ دھن تھا نہ دولت ـ مکان تھے نہ گاؤں گھر آ کے کرائے کے مکان میں رہتی تھیں ـ پھر بھلا کیا کسی کی نظروں میں جچتی تھیں ــــ ؟ بیوہ کی اولاد بھی تو نگاہ میں نہیں چڑھتی ــــ کسی کو پتہ تک نہ معلوم تھا کہ بنے میاں کی تعلیم کیا ہوتی ہے ـــ اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں ــــ ہاں البتہ ایک بار یونہی صفیہ کے ابا گھومتے گھامتے چلے گئے تھے تو دیکھا کہ مکان کا دروازہ کھلا ہے ـ گلی کے چراغ کی تھرتھراتی لو ان کے مکان میں گر رہی ہے ــــ اور خالہ ہیں کہ سوئی کی پوریاں، اونچے نیچے ہاتھوں نکالتی بیٹھی ہیں ــــ

کئی دنوں بعد بنے میاں گاؤں لوٹے تو صورت شکل تو بدلی ہی بدلی ـ گن ڈھنگ بھی بدلے ہوئے تھے ــــ یہ اندازہ تو کون لگاتا کہ کہاں تک تعلیم پائی مگر سر ویسے ہی جھکا رہا جیسے کہ پھلوں سے لدی ڈالی زمین کی طرف جھکی آتی ہے ـ

کرایہ دار کے تین مہینے چڑھ گئے ــــ نو روپیہ سر پہ لگ گیا ـ اس نے دو دن چار دن انتظار دیکھا، اور پھر سامان اٹھا اٹھا باہر پھینکنا شروع کیا ــ جتنا اٹھتا سامان تھا ہی کیا ــ ایک آدھ بیٹی ــ ٹرنک اور یونہی دو چار خالی خولی برتن ـ

صفیہ کی اماں نے یوں نہیں کہ بیٹی کے لئے بیٹا ہو جائے بلکہ مروت نا طے انہیں اپنے گھر میں بلا لیا ــــ یوں رشتہ بھی تو آنا ہی تھا ــــ مگر چولہا ہانڈی الگ ہی الگ رہا ــ اللہ ہی جانے بیچاری کیا پکائیں اور کیا کھاتیں ــــ چولہا تو برائے نام کبھی کبھار ہی سلگتا تو سلگ جاتا ورنہ یہی ہوتا کہ چولہا ٹھنڈا پڑا ہے اور دھلے دھلائے برتن کونے سے دھرے پڑے ہیں ــــ مگر سچ تو یہ تھا کہ ہاتھی نکل گیا تھا بس دُم باقی تھی ــــ اب بنے میاں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کیسے بھی بنے اور شہر چل دیں ــــ اور یہ بیڑا کٹے ــــ

ایک رات بنے میاں دیر سے لوٹے تو دروازے سے ہی بولے ـ

"اماں جی بڑی بھوک لگی ہے آج تو ــــ کیا پکایا ہے ــ"

اماں نے چنگیر سے روٹی اور بیسن نکال سامنے رکھ دیا اور خود پھر بستر پہ جا پڑیں ــــ

انہوں نے ایک ہی نوالہ منہ میں رکھا نہیں کہ الجھ پڑے ــ اماں یہ سچ بتانا بیسن میں کتنی ریت ملائی تھی ــ"

اماں چونک کر دیکھنے لگیں ــ "اوئی، اللہ ہے کہ یہ کچھ کھایا ــــ"؟

"نہیں ــــ وہ اس صفائی سے بولے ـ" بات یکن ہے ابھی ــــ [illegible]

کی بچت ہو جاتی ہوگی ـــ اکرم رکابی پرے پھینک کر بولے ـــ "میں نہیں کھاتا اتنا یہ ریت کے گولے ـــ"

آنگن میں ایک سایہ سا کانپا اور مرغیوں کے کھڑ ڈربے کے پاس کچھ کھڑ بڑ ہوئی ـــ تھوڑی دیر بعد صغو ہاتھ میں دو انڈے لئے آئی اور وہیں دروازے کے پاس کھڑی کھڑی بولی ـــ

"خالہ بی ـــ یہ رکھ لیجئے ـــ تیل تو آپ کے پاس ہوگا نا ـــ"

اس کے پندرہ دن بعد جب بنے سلیم میاں گاؤں سے شہر چلے تو ساتھ اماں بی کے علاوہ پھول دار لال ریشم میں لپٹی لپٹائی صفیہ بھی تھی ـــ گاڑی میں دھچکے لگتے تو صفیہ کا خوشبودار جسم ان کی پیٹھ سے دھکے کھانے لگتا اور ریت کے گولے جیسے ان کے حلق میں اٹکنے لگتے ـــ

بڑے بوڑھے بہو کے قدم کا شگون بہت مانتے ہیں ـــ صفیہ کا قدم بھی بڑا بابرکت تھا ـــ سلیم میاں نے تن من دھن کی بازی لگا کر، فاقے کر کر کے، ٹیوشن کر کر کے وکالت پاس کی تھی ـــ پہلے تو یوں ہی سی آمدنی ہوا کی ـــ لیکن دن گذرتے گئے اور گھر میں گویا چھاؤڑے لگ گئے ـــ یوں کہ برس دو برس بعد صفیہ جب میکے لوٹی ہے تو جسم سونے سے پیلا تھا اور میاں تو واری نیاری تھے بن داموں ایسا ہیرا ملا ـــ بیوی میاں پر نثار تھی تو میاں بیوی پر فدا ـــ قابلِ رشک زندگی تھی ـــ اور بڑے مزے سے گذر رہی تھی۔

مرد کا دل پلٹتے دیر نہیں لگتی ـــ جس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ڈال محبت جتاتے ہیں، بات کی بات میں اس سے آنکھیں پھیر بیٹھتے ہیں اور یوں کہ جیسے کچھ چاہا ہی نہیں ـــ

سلیم میاں کے دل میں محبت پیپرمنٹ کا وہ جذبہ تھا کہ بولنے بتانے کی بات نہیں ـــ سمجھنے کی بات تھی ـــ کبھی جھوٹوں ـــ بھی اپنی بی بی کو تکلیف نہ ہونے دی ـــ زچگی تو صفیہ بیگم کی ہوتی اور دردِ زہ ان کے شروع ہو جاتا ـــ ہر بچہ پا کر نکلے پڑتے ـــ

مغلانی بوا سلیم میاں کے رشتوں سے آتی تھیں ـــ ان کے مرد کا انتقال ہوا تو کوئی انھیں پوچھنے والا نہ تھا ـــ بس سلیم میاں ہی اپنے دکھائی دیئے جن سے کچھ امید ہو سکتی تھی اور ان ہی کے ہاں آ پڑیں ـــ بیچاری اپنی عادت سے مجبور تھیں ـــ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ جہاں موقع ملتا بس دونوں میں لگا دیتیں ـــ نہ اس سے کچھ فائدہ ملتا نہ نفع۔ مگر بس عادت جو تھی ـــ سلیم میاں کا دل چھیڑنے کا انھوں نے ایک سے بڑھ کر ایک جتن کیا مگر وہ تو ایسے پکے تھے، ہنس کر ٹال جاتے۔

"منجھلی پھوپی ـــ وہ ہنستے ہنستے بولتے ـــ "آپ یوں نہ کہیں تو بھلا کھانا ہضم کیسے ہوئے ـــ"

صفیہ بی تو ان کی آنکھوں کی پتلی تھیں ـــ گھر بھرے میں یہ برکتیں انہی کے دم قدم سے تھیں ـــ پھر خدا نے کوکھ بھی ایسی بھاری رکھی تھی کہ دن گنے نہیں اور پانچ چھ بچوں کی ماں بن بیٹھیں ـــ

ایک دن یہ اپنی بیٹھک میں مثلوں کی ورق گردانی کرتے بیٹھے تھے کوئی بڑا مقدمہ لڑنے والے تھے ـــ سامنے پیالی میں چائے رکھی تھی۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا ـــ اتنے انہماک میں تھے کہ چائے پیالی میں چھوڑتی چھوڑتی برف ہوگئی۔ سطح پر سفید سفید سی جھلی تیر گئی ـــ دیوار پر ٹنگے گھنٹے نے گیارہ بجائے تو ان کی محویت ٹوٹی ـــ چائے حلق میں انڈیلی اور بستر پر لیٹ گئے ـــ قندیل کی لو نیچی کر دی ـــ ایکدم بھڑ سے کواڑ کھڑکھڑائے اور بند ہو گئے ـــ

انھوں نے بڑبڑا کر دیکھا ـــ آنے والی ہانپتی کھڑی تھی ـــ انھوں نے کچھ پوچھنا چاہا تو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "شی شی" ـــ

یہ اس کی سراسیمگی دیکھ کر "شی شی" ہو گئے ـــ

دس۔ پندرہ۔ بیس۔ تیس منٹ گذر گئے تو وہ ذرا کچھ سنبھلی ـــ

"بہ گئے میاں اب جاتی ہیں ـــ" وہ اکھڑے لہجے میں بولی ـــ یہ اٹھ کر بیٹھ گئے ـــ چلتے چلتے وہ رک گئی ـــ پلٹ کر دیکھا ـــ اس کی آنکھوں میں تو پانی تیر رہا تھا ـــ

"کون ہو تم ـــ روتی کیوں ہو ـــ"؟!

یہ سامنے بڑا سا بنگلہ ہے نا کے ـــ وہاں میں رہتی ہیں ـــ پن واں ـــ! وہ ذرا رکی..... وہاں کا مالک اتنا برا ہے ـــ" اب تو میرے پیچھے" وہ رک گئی ـــ

سلیم میاں بھی چھ بچوں کے باپ تھے ـــ سمجھ گئے سب ـــ

"پھر اب کہاں جائے گی —" ؟

"کہیں نوکری ڈھونڈھ لوں گی —"

سلیم میاں کو خیال آیا کہ نوکرانی کی یوں بھی ضرورت تھی ہی —

"یہاں نوکری کرے گی —" ؟

"ہو میاں" وہ خوش ہو کر بولی —

"کھانا پکانا آتا ہے —— ؟"

ہو میاں — کھانا پکانا، جھاڑو بہارو — برتن باسن —— [illegible]نے بچھانا اٹھانا — سب کام آتا میرے کو ——"

اتنی رات کو اُسے اندر لے کر آئے — صفیہ بیگم نے اسے سر سے [illegible]نک دیکھا — میاں اس عمر میں تھے کہ ہر برائی کو اپنا لیں۔ مرد کی چڑھتی [illegible]وا اترتی عمر اتنی خطرناک نہیں ہوتی، جتنی کہ یہ رکتی عمر — سلیم میاں چالیس [illegible]الیس کے پیٹے میں تھے —— سورج ٹھیک نصف النہار پر چمک رہا تھا [illegible]نہیں کہتیں تو ممکن تھا میاں خفا ہو جائے اور رکھتی ہیں تو ممکن ہے باندی [illegible]وت ہو جائے —— اور اپنی اماں کے منہ سے تو سدا سنتی رہی تھیں —— [illegible]بیتیجی بہو نہ ہوئے — باندی سوت نہ ہوئے ——" برداشت نہیں ہو [illegible]اتی ——

مگر میاں نے تو رائے دینے کی جگہ ہی نہ رکھی — بس اتنا کہہ کر چلتے [illegible]بنے ——

"یہ کل سے کھانا پکایا کرے گی — یہیں رہے گی ——"

منجلی پھوپھی نے صبح اٹھ کر اُسے دیکھا تو دل میں کھد بدی سی ہونے لگی۔

"صفو ماں —— میں کہوں اب میرے ہوتے اس کی کیا ضرورت تھی ——"

باورچی خانے کا سارا انتظام انہی کے سپرد تھا — چاول، شکر، دال دال، سب چیزوں کی خرد برد جاری رہتی — بلا شرکت غیرے ہر چیز پر قابض تھیں — اب یہ بٹائی انہیں کہاں بھاتی —— ؟

صفیہ بیگم کو بھی یہ خیال تب ہی آیا تھا کہ کچھ ہو جائے — کچھ بھی ہوا نہ گیا ——اور تو یہ ہوتی کہ میاں نے کبھی اس کے ہاتھوں پانی بھی نہ مانگا —— مگر ادھر منجلی پھوپھی اور خود صفیہ بیگم کا خیال تھا کہ گلابو بے آفت کی پرکالہ

گھر کا دو گھر اکر دے گی — ایسی دیدہ دلیر ہوئی تھی — معصومیت اور حیا کا تو نام و نام نہ تھا — عمر تو ہوئی سولہ سترہ کی ہی — مگر صورت پر وہ بچپن تھا — دیکھو تو ٹکٹکی باندھے دیکھے ہی جاتی — ویسے کیا تھے اچھے خاصے سرائے گھر تھے — جانے کتنے یہاں ٹھہرے ہوں گے، اور کتنے چلے گئے ہونگے

آنے کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ بڑے دروازے میں جا کر کھڑی ہو گئی ——

منجلی پھوپھی نے پوچھا بھی کہ وہاں کیا کام — مردانے میں کیوں کھڑی ہے ؟ —"

بولی — "جرا کام ہے میرے کو ——"

شرفو بساطی اپنا ٹھیلا دھکاتا گزرا تو وہیں سے کھڑے کھڑے بڑی بے باکی سے ہنس کر بولی —

"ادئے تیرے پاس بال صفا پوڈر ہے — ؟"

صفیہ بیگم کا حلق میں کلیجہ آ گیا — منجلی پھوپھی بھی ایک دفعہ گڑبڑا گئیں —

شرفو نے شہ پائی تو وہ بھی ہنس کر بولا — "ہے تو — پر دام ؟!"

اور اس نے اپنا منہ پچ پچا دیا — جیسے ہوائی بوسہ لیتا ہو —

یہ بے حیا وہیں کھڑی کھچ کھچ کر کے ہنستی رہی۔

صفیہ بیگم اپنے سہاگ کی خیر منانے لگیں — الگ کرتی ہیں تو میاں غصہ دکھائیں گے اور رکھتی ہیں تو سامنے ہی نتیجہ ہے —— اس کے لچھن چالے تو ایسے تھے کہ منہ پھوڑ کے بولتے بھی نہ آتا کہ "اری بے حیا یہ کوئی ڈھنگ — ہے — ؟"

دو دو بیٹیاں سامنے تھیں کہ جوانی قدم چومنے کو لپکی آ رہی تھی اور پھر بیٹوں والا گھر تھا — وہ دن دور نہ تھا کہ باپ بیٹے سبھی ایک ہی حوض پر بیٹھے منہ دھویا کرتے —— اس واللہ کا کیا جاتا تھا — مگر بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ چونکہ کوئی حرکت ایسی دیکھی نہ تھی اس لئے الزام بھی دیتے نہ آتا۔

سلیم میاں کی بڑی بیٹی زاہدہ قد قامت میں تک بھگ گلابو کے برابر ہی آتی تھی — ایک رات سلیم میاں دیر سے سوئے — صبح آنکھ بھی نہ کھلتی تھی — پیر دکھے جا رہے تھے —— گلابو کسی کام سے گزری تو سمجھے کہ زاہدہ ہے — بولے —

"ذرا پاؤں پہ پاؤں تو دینا دو ایک منٹ —"

منو پاؤں دبانے پہ آئی تو گھنٹے سے دو گھنٹے گذر گئے ۔ بجلی کی سی پھرتی سے ایسی کوملتا سے پاؤں دھرے جاتی تھی کہ سلیم میاں دس بجے کے اٹھتے بارہ بجے بستر سے اٹھے ۔

رضائی پھینکی تو ہول گئے ۔ "ارے تو ۔۔ "؟

"پھر کیا ۔ آج تو بولے کر دیا ۔۔" !

پھر کیا تھا روزانہ زاہدہ کے دھوکے میں گلابو آتی گئی ۔۔ پہلے پہل تو یہ ہوتا تھا کہ کام زیادہ ہوتا تو سلیم میاں پڑھتے لکھتے باہر رات کے بارہ بجا دیتے ۔ اٹھ کر جانا، جان پہ آتا تو بیٹھک والے پلنگ پر ہی لڑھک جاتے ۔۔ اور یہ مہینے میں ایک آدھ بار ہی ہوتا ۔۔ ورنہ ان کا معمول تھا کہ بی بی کے ساتھ ہی ہوتے ۔۔ اماں نے اتنی آزادی کبھی نہ دی کہ جوان جوڑ کے ہوتے سلاتے ایک بیچ سجائیں۔ وہ تو اماں کی آنکھ بند ہوئی تو اتنا بھی ہوا ۔۔ مگر اب جو پیر دبوانے کی لت پڑی تو بستر ادھر بیٹھک ہی میں اٹھ آیا ۔ بولتا بھی کون ۔۔ بادشاہ اپنی رعایا کا پالن ہار ہوتا ہے ۔۔ وہ جو کرے سو کرے کسی کی کیا ہمت کہ دخل دے ۔۔ اور صفیہ بیگم لاکھ جنم جنم کی ساتھی تھیں ۔۔ تھیں تو رعایا جیسی ۔۔

یہ لت یہاں تک بڑھی کہ اب گھر بھر میں سناٹا ہی پڑ گیا ۔۔

اتنی بڑی بات تھی ڈھکی چھپی رہتی بھی تو کیسے ؟ ۔۔ اور پھر منجھلی پھوپھی تھیں جس کا پلڑا بھاری دیکھتیں اسی میں جا بیٹھتیں ۔۔ اگر سلیم میاں جیت پہ ہیں تو انہیں کے ساتھ ہو گئیں اور پھر ساس بن کر بہو کو سمجھاتی پھر رہی ہیں ۔۔ صفیہ بیگم کا ساتھ دیا تو سلیم میاں کے لتے لئے جا رہے ہیں ۔۔

اب تک گویا پردے پردے میں کھیل ہوتا تھا ۔۔ اب ایک ہی دم سے پردہ ہٹ گیا تو کاہے لحاظ ۔۔ سلیم میاں کی جوتی کو غرض تھی کہ بی بی کی منوتی کرتے پھرتے ۔۔ بلکہ غصہ ہی آیا ۔ "ارے مرد کو تو حق ہے کہ چاہے چار کرے ۔۔ میں خواہ مخواہ پابند ہو کر رہ گیا ہوں ۔۔ "

اس دن سلیم میاں کورٹ نہ گئے ۔۔ اپنے ہی کمرے میں لنگیاں لگاتے پڑے رہے ۔۔ چائے کا حکم ہوا بھی تو گلابو کو ۔۔ پان منگوائے بھی تو گلابو سے ۔۔ کھانا لگانے کو کہا بھی تو گلابو سے ۔۔

حرام کا بردہ آنکھوں پر پڑ جاتا ہے تو سب سے پہلے بیوی کی صورت ہی ۔۔ کیڑے پڑتے ہیں ۔۔ چار بجے اٹھے نہانے کے لئے جاتے تھے تو ہمیشہ کی طرح صفیہ بی نے کہا ۔۔

"کون سے کپڑے پہنئے گا ۔۔" ؟

سلیم میاں نے اجنبی اجنبی نظروں سے صفیہ کو دیکھا ۔۔ بھرے بھرے گال ۔ بڑی بڑی آنکھیں ۔ گیہواں رنگ ۔۔ قد و قامت مناسب۔ مگر کانوں کے پاس سے بالوں میں سفیدی سی آ رہی تھی ۔۔ اور آنکھوں کے کونوں کے پاس ہلکی سی جھریاں آج پہلی بار دکھائی دیں ۔۔

"کیا اسی صورت کا میں آج تک دیوانہ رہا ہوں ۔۔"

"مجھے اللہ نے خود ہاتھ پیر دیئے ہیں ۔۔" وہ تنک کر بولے ۔۔

"یہ آپ آپ غصہ کاہے پر آیا ۔۔" صفیہ بیگم نرمی سے بولیں "بھلا کبھی آج تک آپ نے کپڑے نکالے ہیں ۔۔"

"نہیں نکالے، پر اب نکال لوں گا ۔۔ تم میرا کام کیوں کرو بھئی ۔۔ ایک دل سے تو مجھے لت اٹھتی پھر اور دوسرے دل سے یوں ملی ملی باتیں ۔۔ مجھے پسند نہیں ۔۔"

"اے واہ ۔۔ یہ میرے دو دل کب سے ہو گئے ۔۔"

"کب سے ہو گئے ۔۔" یہ سلیم میاں گرجے ۔۔ ؟ تم نے مجھ پر شک نہیں کیا کہ میں گلابو ۔۔ سامنے بچوں کو کھیلتا دیکھ کر ان کی آواز نیچی رہ گئی ۔۔

"اوئی خدا خیر کرے ۔ میں نے کب شک و شبہ کیا ہے ۔۔"

"اور کیا منجھلی پھوپھی جھوٹ موٹ مجھے صلواتیں سنا رہی تھیں ۔۔"؟

"تو یوں کہیئے نا کہ منجھلی پھوپی سنا رہی تھیں ۔۔ میں تو نہ تھی ۔۔"

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے دونوں کے خیالات ایک ہی ہیں ۔۔"

صفیہ بیگم کو آج اندازہ ہوا کہ مرد کتنے کچے کانوں کے ہوتے ہیں۔ آخر منجھلی پھوپی کی کارستانی کام آ ہی گئی۔

منجھلی پھوپی کے صفیہ بیگم نے لتے لے ڈالے ۔۔

"آج تک نہیں کہا تھا، مگر آج کہتی ہوں، آپ کو کیا مزہ آتا ہے لگائی بجھائی کرنے میں ۔۔" ؟

منجھلی چڑ گئیں ـــ "ذرا تم دونوں کی اور سے پلٹے میرے یہاں آ رہی ہوں ـــ اے واہ ـــ"

"وہ میاں میرے، میں بی بی اُن کی ـــ وہ ایک گلا بو چھوڑ ہزار چھوکریوں سے لگتے پھریں۔ میں کچھ نہیں کہتی تو آپ کو میری کریا کیوں آئے ـــ بھلا میں نے آپ سے کہا تھا کہ بیچ والی بات پر پوچھ گچھ کیجیے ـــ"

"اے واہ ـــ منجھلی پھوپھی زبردستی محبت پر اتر آئیں ـــ" ہماری بچی کا گھر جلے اور ہم بیٹھے منہ دیکھا کریں ـــ ہمارے سامنے کے بچے غلطیاں کریں گے تو ہم نہ بتائیں تو کون بتائے ـــ" ؟

"ایسی بزرگی آپ ہی کو مبارک کہ گھر میں آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک جائے ـــ میں آپ سے صاف کہے دیتی ہوں خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ نہ اڑایا کیجیے ـــ"

لفظ "ٹانگ اڑانا" منجھلی پھوپھی کو بے حد کھل گیا اور وہ اپنی جھولنا چارپائی میں پسر گئیں ـــ غصے کے اظہار کے لئے زاہدہ کو پکار کر کہہ دیا۔

"مجھے جگانا مت بھوک نہیں ہے ـــ" منجھلی پھوپھی کو جب تب غصہ آتا، ان کی بھوک بند ہو جاتی تھی اور نیند گھر گھس جاتی تھی ـــ

صفیہ بیگم کو شروع دن سے ہی گلا بو کا چلن نہ بھایا۔ ہر بازاری وصف اس میں موجود تھا ـــ سلیم میاں نے جب بتایا کہ کیوں وہ بڑے بنگلے سے بھاگی تھی تو صفیہ بیگم کو ذرا تو یقین نہ آیا ـــ

"منہ کالا کیا ہوگا چھنال نے تو مالکن نے دُھتا بتا دیا ہوگا ـــ"

ان کو پورا یقین تھا ـــ مگر مرد کو ہمخیال بنا لینا ان کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ اب بات سے بات سوچتی جاتیں تو خیال آتا گیا کہ کمبخت چھلی لنگوٹی سے آئی تھی اور اب لہن ٹہن نو گزی ساڑی باندھے پھرتی ہے ـــ کس نے لا کر دی ہوگی ـــ ؟! سلیم میاں کے علاوہ لا بھی کون سکتا تھا ـــ

اور اس دن شرکوبتالی سے کس دیدہ دلیری سے پوچھ رہی تھی ـــ

ادے ـــ تیرے پاس بال صفا پوڈر ہے ـــ" صفیہ بی کو یاد تھا کہ بڑے ماموں نے رنڈی گھر ڈال لی تھی ـــ مگر وہ بھی اتنی چرپانک نہ تھی کہ رستہ چلتوں سے جائی بوسوں کے بدلے ایسے ایسے پوڈر، صابنیں مانگتی ـــ ؟

شام کو سلیم میاں کا معمول تھا کہ سونے سے قبل دودھ کا ایک گلاس پیتے ـــ اماں کہتی تھیں دماغی کام کرنے والوں کو طاقت بھی ملنی چاہئیے ـــ اور انہوں نے ہی یہ پابندی لگائی تھی ـــ یہ اماں سے کہتے کہ اسی میں پتی ڈال کر چاء بنا دیا کیجیے ـــ مگر اماں کہاں سنتیں ـــ ؟

"ارے نیک بختے! بھینس کے دودھ میں ماں کے دودھ کی سی طاقت ہوتی ہے، موئی پتی سے سارا جوہر چلا جاتا ہے ـــ"

اماں مر بھی گئیں ـــ مگر صفیہ بی پابندی سے انہیں دودھ پلاتے جاتیں کبھی کام میں ہوتے تو گلاس لئے بیٹھی رہتیں ـــ یہ بولتے "رکھ دو ـــ ابھی پی لوں گا ـــ"

صفیہ بی ہنستیں "جی سب معلوم ہے ـــ صبح کو گلاس جوں کا توں پڑا رہے گا ـــ"

"قسم خدا کی تم پکّی ہندوستانی بیوی ہو ـــ لاؤ ادھر ـــ"

اور ہنستے ہنستے گلاس چڑھا جاتے ـــ

آج بھی روز کی طرح یہ گلاس لئے پہونچیں تو میاں کے تیور بدلے بگڑے تھے ـــ

"میں بچہ نہیں ہوں کہ چٹ چٹ دودھ پیا کروں ـــ" وہ گلاس دیکھتے ہی جھلا گئے ـــ

"مجھے معلوم تھی یہ بات ـــ" وہ سادگی سے بولیں ـــ سلیم میاں نے کچھ کچا کر انہیں دیکھا ـــ "یوں سر پر ملک الموت کی طرح کھڑی کیوں ہو جاتی ہو ـــ کیا میز نہیں ہے گلاس رکھنے کے لئے ـــ ؟"

صفیہ بیگم کا دل مرجھا سا گیا ـــ "خدا کی قدرت ہے کہ آج آپ مجھے ان لفظوں سے نوازتے ہیں ـــ ؟"!

"تو کیا تمہیں گود میں اٹھا کر ناچتا پھروں ـــ" وہ لال دیدے کر کے بولے ـــ

صفیہ بیگم کا سانس ایک لمحہ کو رک سا گیا ـــ "آپ ـــ!" وہ اتنا ہی کہہ سکیں ـــ

انھوں نے بے توڑ جواب دیا ـــ "ہاں میں ـــ"

دودھ کا گلاس ہاتھ میں کپکپا رہا تھا ـــ سلیم میاں کو بے بات غصہ

آرہا تھا ۔۔ گلاس چھینا اور زمین پر پٹخ دیا ۔۔ " مجھے یہ نخرے بھاتے نہیں۔
اب یہ ٹسوے کیوں بہا رہے ہیں ۔۔ ؟ "

اب تک تو صفیہ بی کی آنکھوں میں نمی تھیں مگر یہ نمی سر سے بہتے پانی سے بدل گئی ۔۔ پندرہ برس سے بڑھ کے ہوئے تھے آج تک آدمی بات بھی سلیم میاں نے نہ کہی ہوگی ۔۔ کبھی اونچی آواز سے پکارا تک نہیں ۔۔ لڑائی جھگڑے کون میاں بیوی میں نہیں ہوتے ۔۔ ؟ مگر ان کے جھگڑوں کی بھی بات دوسری تھی ۔۔ گرمی کے دن ہیں اور سلیم میاں ہیں کہ گھسے چلے آرہے ہیں ۔۔ انھوں نے ناز سے منہ پھیر لیا ۔۔

" ہائے اللہ ۔۔ کوئی بات ہوئی یہ بھی ۔۔ ! "

" دیکھو صفو بی، ادھر منہ کرو ورنہ ! ؟ ۔۔ ! "

" ورنہ کیا ۔۔ " یہ لگاوٹ سے پوچھتیں ۔۔

" یہ خود ہی معلوم ہو جائے گا ۔۔ "

ان کو منہ پھیرنا تھا نہ پھیرا ۔۔ چلو بات بند ہو گئی ۔۔ دوسرے دن یہ نماز میں کھڑی ہیں کہ بازوؤں میں گھ گھیا کے دو تین بوسے توڑ لیے۔ سلام پھیرتے پھیرتے تک یہ لال لال ہو جاتیں ۔۔

" توبہ ہے نماز کا تو خیال کرتے ۔۔ کتنے گناہ کی بات ہے ؟ "

یہ سارا گناہ تمھارے سر جائے گا ۔۔ بھلے کو کل چپ چاپ ادھر گھستر جاتیں تو کچھ بگڑ جاتا ۔۔ "

مگر اسے لڑائی کون کہے ۔۔ اس سے ہٹ کر کبھی تو لڑائی نہ ہوئی کبھی کوئی بات ہوتی بھی تو یہ ہنس کر ٹال جاتیں کبھی یہ خود طرح دے جاتے۔ کیسے بہتے پانی جیسی رواں دواں زندگی تھی ۔۔ کس بدبخت نے کانٹے بو دیئے ۔۔

آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے مگر سلیم میاں تو جیسے پتھر بن گئے تھے ورنہ کبھی ان سے صفیہ بی کے آنسو دیکھے گئے ۔۔ ؟ شہر باہر کا کوئی مقدمہ لگا تھا ۔۔ یکمشت سات ہزار بات ٹھہری تھی ۔۔ انھوں نے ابھی اپنی آنکھیں بھیگی بھیگی سی، اٹھائی ہی تھیں کہ سلیم میاں نے وہیں اپنا بستر صندوق پٹخ دیا ۔۔ " اے لو بھائی ۔۔ میں نہیں جاتا واتا ۔۔ کیا تمھیں رنجیدہ کر کے مجھے جینا ہے ۔۔ " ؟

کہاں تو وہ نمی ۔۔ اور کہاں یہ ندی ۔۔ کیسے کیسے دن ان آنکھوں سے دیکھنے پڑتے ہیں ۔۔

صفیہ بیگم نے روتے روتے ان کا ہاتھ پکڑ لیا ۔۔ " آپ کو اتنی تلخ باتیں کہتے خیال نہیں ہوتا ۔۔ "

سلیم میاں کے سر پر گلابو کی جوانی کا بھوت چڑھا بیٹھا تھا۔ تنک کر بولے ۔۔

" یہ تلخ باتیں ہیں ۔۔ ؟ ؟ ۔۔ یہ تلخ باتیں ہیں ۔۔ ؟ ؟ ارے تم سی بیوی سے نباہ کیسے ہوا، اس پر تعجب آتا ہے ۔۔ ؟ ؟ بھلے کو اب تک طلاق نہ ہو گئی ۔۔ ! "

لاکھ بوری تھیں ۔۔ محبت بھرا دل رکھتی تھیں مگر اتنا بڑا طعنہ سن کر چپکی نہ رہ سکیں ۔۔ دل سنا اٹھا کانپ کر بولتیں ۔۔

" نہیں ہوئی تو اب دے دیجئے ۔۔ جاتا ہی کیا ہے ۔۔ "

" اچھا ۔۔ ! سلیم میاں ڈپٹ کر بولے " یہ بات ۔۔ " !

" ہاں ! ۔۔ اس بے عزتی اور بے محبتی زندگی سے تو طلاق ہی بھلی ۔۔ "

سلیم میاں برداشت نہ کر سکے تیزی سے بولے ۔۔ " جاؤ تمھیں طلاق دی ۔۔ تین بار طلاق دی ۔۔ "

اب تک تو صفیہ بی یونہی غصے میں کہے جا رہی تھیں ۔۔ سلیم میاں کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو چکر سے آگئے ۔۔ سر گھوم گیا ۔۔

" تین بار طلاق دی ۔۔ "

اتنے برسوں کا بندھن تین لفظوں میں ختم ۔۔ تین لمحوں میں ختم ۔۔ ! کیا اسی دن کے لئے یہ پیار ہوا تھا ۔۔ کیا ایسی ہی محبت ہوتی ہے۔ سلیم میاں بس بھرے ناگ کی طرح فوں فوں کر رہے تھے ۔۔ صفیہ بیگم کا ساکت جسم وہیں کھڑا کانپ اٹھا ۔۔ !

▲

بچے سو گئے تھے ۔۔ سامنے چارپائی پر جمیل سویا تھا اسکے بازو در تعبیر ۔۔ پھر ایک بڑے سے پلنگ پر ممتا ۔۔ ردوف اور کمال تھے بازو کی پلنگڑی پر زاہدہ سوئی تھی ۔۔ کیسے دن میں جوان ہو جائے گی ۔۔

لیکن میں کہاں رہوں گی کہ اسے اپنے ہاتھوں ڈالی پہنا جاؤں ۔ یہ مناسب رہے گا کیسا لگے گا ۔ رفو ۔ کمال اور رفیعہ ۔ یہ تو میرے بغیر نوالہ اٹھاتے نہیں ۔ ان کا کیا ہوگا ۔" صفو بی کا دل بھر آیا ۔

" خدایا تو کسی گھر میں بیٹی نہ پیدا کیجو ۔ زندگی کے اتنے سال سکھ سے بتانے کے بعد ایسی افتاد پڑے، اس سے تو اچھا ہے کہ پیدا ہی نہ ہووے ۔"

پر اگھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا ۔" کہاں جاؤں گی ۔ اماں کے پاس ۔"؟ گاؤں والے کیا تھو کیں گے ۔ پہلے جاتی تھی تو گہنوں سے لدی ۔ کپڑوں سے سجی ۔ جیسے کوئی دلہن سسرال میں اترتی ہے ۔ اب کیسے جاؤں گی ۔ کیا لے جاؤں گی ۔ پاس پڑوس والے اماں کی جان کو آجائیں گے ۔

" اوری! کیسی تربیت کی تھی کہ میاں سے نباہ نہ ہوا ۔"

" اے بی یہ شہر کی ہوا لگی ہے ۔ کہ کھڑا کھڑی میاں سے طلاق لے لی ۔"

" اوی بی تو گیا کیا ۔ ماشاءاللہ سجیلا ڈ دل ہے کیا کمی ہے ؟"

یہ آخری خیال آیا تو صفیہ پوری کانپ گئی ۔ !

" نہیں نہیں ! میں گاؤں نہیں جاؤں گی ۔"

بھاری قدموں اور بوجھل دل سے اٹھ کر الماری کے پاس گئیں ۔ کپڑوں سے لدی ہوئی تھی ۔ نچلے خانے میں زیورات کا ڈبہ تھا ۔ دس بارہ ہزار سے کیا کم کے رہے ہوں گے ۔ چاندی کا زیور الگ ۔ یہ بس حرام ہو چکا ۔ میرا کیا تھا ۔ پانچ تولے سونے اور پچاس تولے چاندی سے آئی تھی ۔ بس وہی میرا ہے ۔ کانوں سے لویں اتار کر صندوقچی میں رکھ دیں ۔ پھر دان کنگن اتار دیئے ۔ سہاگ لڑی اتارتے اتارتے صفیہ بی کا کلیجہ کٹ کٹ گیا ۔

ایک وہ نصیب والیاں ہوتی ہیں کہ میت سے اپنا سہاگ اتارتی ہیں ایک میں کرموں جلی ہوں کہ بھرے گھر سے خالی جا رہی ہوں ۔"

انگوٹھیاں اتار کر نچلے خانے میں ڈالیں ۔ سونے کا موٹا سا چھلا میاں نے پہلی رات منہ دیکھ کر چڑھایا تھا ۔ کیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اس دن ۔"؟ لال لال کپڑوں میں میں تھی کہ سمٹی جاتی تھی اور وہ تھے کہ گھسے چلے آتے تھے ۔ پھر انگلی کھینچ کر اتنی زور سے انگوٹھی پہنائی کہ انگلی چھل سی گئی ۔ میں بازو سرکتی تو وہ اور قریب آتے ۔

" آج میں ان کے قریب جانا چاہتی ہوں تو وہ پاندسرک گئے ہیں ۔ کیا زندگی ہے مولی ۔"

چھوٹے خانے سے اپنے جہیز کا تین تولے کا ہار اور دو تولے کی چوڑیاں نکال کر پہنیں اور پاؤں کے پازیب کپڑے باندھ لئے ۔ پندرہ برس سے اوپر شادی کو ہو گئے ۔ اب تک جہیز کے کپڑے کیا ساتھ دیتے ۔ مگر چوتھی کا جوڑا اور چھٹی کے جوڑے اب تک موجود تھے ۔ اماں نے کیسے چاؤ سے ہر بار چھوچھک چھٹی کی ہر بار دلہن بنایا ۔ پانچ چھ جوڑے ۔ اور یہ زیور ۔

چوتھی کا جوڑا اٹھایا کہ آنسو ٹپک پڑے ۔ شادی کو دن ہوتے ہیں ۔ میاں ہیں کہ منہ سے منہ نہیں ہٹاتے ۔ رشتے بھائی بند ۔ سالے بہنوئی ہنسی اڑاتے ہیں ۔ مذاق سے فقرے ہیں مگر یہ ہیں کہ کمرے کی کنڈی نہیں کھولتے ۔ چوتھی کا جوڑا ہرے کا تھا ۔ ٹھپہ گوٹا لگی کرتی ۔ بانگڑی حاشیے اور کرنوں لگا تنگ تنگ کلی دار پاجامہ کہ پھنسا پھنسا جاتا ۔ بدن سے لپٹی ہو کیا گت بن گئی تھی ایسے بھاری جوڑے کی ۔

بھاری دل سے، جلدی سے صفیہ بیگم نے جوڑا لپیٹ اماں نے اپنے جہیز کے چاندی کے دو چار برتن حوالے کر دیئے تھے ۔ رکابی، اس میں پہلی بار ساتھ ساتھ کھانا کھایا تھا ۔ ایک نوالہ منہ میں دیتے، میں ان کے منہ میں دیتی ۔ کس قدر زور سے انگلی کاٹ کھایا تھا ۔ !

" روٹی کھائیں گے یا مجھی کو کھالیں گے ۔" میں بولی تھی ۔

" دیکھ لینا یہ بھی ۔" بڑے معنی خیز انداز سے کہا تھا پھر سچ مچ جیسے مجھے کھا ہی گئے تھے ۔

کیا ہو حق کیسا سناٹا ہے ۔ ساڑھے نو ہو رہے

اسی وقت تو پہلی بار انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا ___
ادھر ساڑھے نو ہو گئے ___" نیند آ رہی ہے ___"
کس قدر شرارت بھری آنکھیں تھیں ان کی ___ نیند وینڈ خاک بھی نہ آ رہی تھی بس مجھے ستانا جو مقصود تھا ___

ساڑھے نو ہو رہے تھے' نیند وینڈ خاک بھی نہ آ رہی تھی ___
سامنے ہی دودھ فرش پر جم سا چلا تھا ___ کانچ کے گلاس کی کرچیاں فرش پر بکھری پڑی تھیں ___ یہ سسکیاں کیسی ہیں ___؟؟ جیسے صفیہ دولہن بنتے وقت روئی تھی ___ بیٹھک کا یہ پلنگ ___ پہلے یہاں کب تھا ___ یہاں تو بس میز اور دو ایک کرسیاں پڑی ہوتی تھیں ___ بھلا اماں نے اس بات کی اجازت ہی کب دی کہ میں بی صفیہ سے ہٹ کر کوئی بات سوچوں ___

ایک بار صفیہ سے کیسے جٹ گئی تھی ___ گرمی کے دن کہ بدن جھلسے جاتے ___ صفو بی بار بار کروٹیں بدلتیں ___ ایسے میں بھلا انہیں کیوں بھاتا کہ میں ان کے ساتھ جا لیٹوں ___ کیسے مزے آئے ___ وہ ان کا روٹھنا پھولنا ___"

سلیم میاں نے کتاب دھیرے سے بند کر دی ___ قندیل کی بتی نیچے کر دی ___ ہلکا ہلکا اجالا باقی رہ گیا تھا ___ ایڑیوں کے بل چلتے وہ دروازے کی دراز تک پہونچے ___ سسکیاں سی سنائی دے رہی تھیں یوں جیسے انہیں روکنے کی کوشش کی جا رہی ہو ___ پھر آنکھیں دراز سے لگ گئیں ___

صفیہ بی باری باری بس بچوں کو پیار کر رہی تھیں ___" میرا تم پر اتنا ہی حق تھا میرے بچو کہ نو مہینے پیٹ میں رکھ رکھ درد دل سے جنوں اور یوں بے آسرا چھوڑ کر چلی جاؤں ___"

الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے ___ صبح سے جو ساڑی صفیہ بیگم نے پہنی ہوئی تھی' وہ اتار کے اپنے جہیز کا جوڑا پہن لیا تھا ___ یہاں کی ہر ہر چیز حرام ہو گئی تھی' بھلا کیسے ساتھ لے جاتیں ___ جہیز کے جوڑے سب جھپا جھپ اور کام دار تھے ___ تو ان جوڑے کے جنہیں پہن کر چلنا ہی دشوار ہو جائے ___

دودھ فرش پر جمتا جا رہا تھا ___ بڑی سردی تھی ___" اچھا اگر صفیہ چلی گئی تو پھر روزانہ دودھ کون لا کے دیا کرے گا ___؟"
"بے شک دودھ اچھا نہیں لگتا' مگر عادت جو پڑ گئی ہے ___"

صفیہ کیسی عورت ہے کہ لاکھ بول بول جاؤں' کبھی زبان نہیں ہلاتی ___ سارے اس عمر میں بھی ایک سے ایک لڑکی مل جائے' پیسے کی کون کمی ہے مگر صفیہ کی سی عادتیں' وہ مروت' وہ لگن' وہ چاہت وہ محبت کہاں ملے گی ___ پیسہ کیا اتنی ساری چیزیں دے سکتا ہے ؟___"
" اوفوہ! میں نے طلاق بھی دے دی ___"
ٹن ٹن ٹن گھڑی نے دس بجائے ___
" دس بجے تو نیند بالکل ہی آ جاتی تھی ___ صفیہ کے بھرے بھرے گال ___" اوفوہ! کیا مصیبت ہوتی تھی اس کی شرم"

دراز سے آنکھ لگا کر سلیم میاں پھر جھانکنے لگے ___
کیسی دولہن بنی پھر رہی تھیں کمرے میں ___ بس بالکل ایسا ہی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اس رات بھی ___ میں نے شرارت سے ہاتھ پکڑ لیا تھا تو ہنس کر اور شرما کر بولی تھی ___
" خوشامدی کدھر کے ___؟"

خوشامدی تو میں تھا ہی' اب جب کہ اس کی عمر ڈھل گئی ہے تو اسے بھول بیٹھا ہوں ___ عمر تو میری بھی ڈھل رہی ہے پھر اس نے مجھے کیوں نہیں دھتکارا ___؟؟

صفیہ بیگم نے آئینے میں خود کو دیکھا ___" اوفوہ! یہ جوڑا تو میری جان لے کر ٹلے گا ___ کیسی کیسی باتیں یاد آ آ کر میری راہ روک رہی ہیں ___ دل ہے کہ بس کہے جا رہا ہے ___ جا ___ جا کر قدم چوم لے ___ وہ تو تیرا جنم مرن کا ساتھی ہے ___ مگر انھوں نے تو مجھے طلاق دے دی ___"

گلی ہی سے تانگہ چھن چھناتا گذرا تو صفیہ بیگم نے اسے آواز دی' تانگہ دروازے کے سامنے آ کر رک گیا ___

بستر۔ صندوق۔ توشے دان ۔ بدھنا اور ایک لوٹا یہی کل کائنات تھی ۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی صفیہ بیگم دروازے تک پہنچیں ۔

" بھائی ذرا یہ سامان چڑھا لینا ٹانگے میں ۔ " مگر اسی لمحے گرج کر، جھڑک کر سلیم میاں نے ٹانگے والے کو بھگا دیا ۔ " اے چلے جاؤ کسی کو جانا آنا نہیں ہے ۔ "

ٹانگہ والا بکتا جھکتا چلا گیا ۔ چھن چھن چھن گھوڑے کے گلے کے گھنگرو بج رہے تھے ۔

" کہاں جا رہی ہو ۔ ؟ " سلیم میاں نے ذرا لگاوٹ سے پوچھا ۔

" جہاں خدا لے جائے گا ۔ "

" خدا تو اسی گھر میں رکھے گا ۔ "

صفیہ بیگم نے تیزی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا ۔

سلیم میاں ہنس کر آگے بڑھے ۔ " کوئی اتنی اتنی سی بات پر یوں ناراض ہوا کرتا ہے ۔ " ؟

صفیہ بیگم دور ہٹا کر بولیں ۔ " مجھے ہاتھ نہ لگانا ۔ میں تم پر حرام ہو گئی ۔ یاد رہے تم نے مجھے طلاق دے دی ہے ۔ "

" شادی بھی تو ہم ہی سے ہوئی تھی نا ۔ اچھا بتاؤ یہ جوڑا تم نے کہیں پہنا ۔ آئیں ۔ " اور انھوں نے ہاتھ پکڑ کر صفیہ بی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا ۔ " سچ مچ آج تو بالکل ویسی ہی لگ رہی ہو جیسی ۔ "

صفیہ بیگم نے ٹیڑھی ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھا تو وہ شرارت بھری ہنسی رہے تھے ۔

گھسر پھسر سے منجھلی پھوپی کی آنکھ اُچٹ گئی تھی ۔ دیکھا تو دونوں ہنستے بیٹھے ہیں ۔ کچھ چڑ کر بولیں ۔ " اوئی اتنا بھی نہیں ہوتا کہ پردہ ہی چھوڑ لیں ۔ " اور انہوں نے خود ہی کروٹ لے لی ۔

اختر حسن

جیون چکر

جیون گھن چکر — گھن گھن گھن
گھنٹے کی صدا، ٹن ٹن ٹن ٹن!
سنکی بادِ سحر، سَن سَن سَن!
دل کے تار بجے، جھن جھن جھن!

آنچل میں لیے سورج کی کرن
دھرتی جاگی، جاگا جیون
زید، بکر، چھمن، موہن، سوہن
بیلا، نرگس، موتی، گلشن
سندر سندر سپنوں کی دلھن
راتوں راتوں کی چندر بدن
مہندی، ٹیکہ، کاجل، اُبٹن!
جھمکے، جھلے، جھومر، جھانجھن
چوڑی، جگنو، پائل، کنگن

سپنے ٹوٹے، ٹوٹا درپن
گھنگرو بکھرے، چھن چھن چھن چھن

پھول چنے، پھلواری میں مالن
چنچل ناری اپنے آپ مگن
بچے کھیلیں، آنگن آنگن
بوڑھے نانا پھیریں، سمرن!
جیون جاگا، جاگا تن من!
کوٹھا، دالان، اٹاری، آنگن
کوڑا کرکٹ، جھاڑو جھٹکن
چولھا، ہانڈی، ڈوئی، ایندھن
آٹا، دال، نمک، ادرک، لہسن
ڈوری، ناخن، گتھی، الجھن!
فعِلُن، فعلن، فعلن، فعلن!
جیون جاگا جاگا تن من!
پنڈت، ملّا، شیخ، برہمن!
چور، اچکّے، ڈاکو، رہزن!
ساہو، بنیے، بقّال، مہاجن
بوڑھے، طفل و جواں، مرد و زن
پورب، پچھم، اُتّر، دکھن
چاروں اور انسانوں کا بن

چاروں اور انسانوں کا بن
لاکھوں ان میں بے گھر، بے دھن
پیاسی آنکھیں، سوکھے گلشن
زخمی تلوے، مجروح بدن
زندہ لاشیں بے گور و کفن
دیپ جلیں بن بتی بن روغن
ابجد، ہوّز، حطّی، کلمن
نیتا کھائیں، انڈا، مکھن!
بریانی، مچھلی، مرغ، مٹن!
جنتا چاٹے جھوٹے برتن!
راشن، راشن، راشن، راشن

ساعت، پل، دن رات، مہینے سن
مہر، آبان، آذر، دے، بہمن
ساون بھادوں جیٹھ شرادن
بھک بھک کرتا جائے انجن

پیرس، پیکن، دلّی، لندن
راولپنڈی، ماسکو، واشنگٹن
یہ میرا وطن، یہ تیرا وطن
کالی نیشن، گوری نیشن
یہ اس کا، وہ اس کا دشمن
بربادی کے سارے لچھّن!
کانفرنسیں، جلسے، کنونشن!
کھوٹے سکّے، مشکوک چلن
شعلے بھڑکیں، خرمن خرمن
ایٹم کے دھماکے، دھن دھن دھن
قدغن، قدغن، قدغن، قدغن

رستے میں بیٹھی اک جوگن،
لہرا لہرا کر گائے بھجن!
"من موہن مورے من موہن

دل کے تار بجے سن سن سن!

من موہن میرا من موہن!
آہوئے ختن، آہوئے ختن!
اس کی آنکھوں میں تیل گگن
زلفیں عنبر، ماتھا کندن!
پھول سا چہرہ، گدرایا جوبن
بانکے ابرو، تیکھی چتون
سونے چاندی موتی کا بدن
من موہن میرا من موہن
دل کے تار بجے سن سن سن
دو سینک میرے دونوں نین
بھیک کی جھولی خالی دامن
جھولی بھر دے میرے ساجن
دید دے دید سے اپنے درشن
من موہن میرے من موہن!
جیون چکر گھن گھن گھن گھن!!

ڈاکٹر عزیز تمنائی

کوہِ گراں

زمانے کے کوہِ گراں کی سرنگوں میں
جلتی ہوئی مشعلیں لے کے
شام وسحر ڈھونڈھتا ہوں
کہ کوئی کرن کوئی روغن کوئی موجۂ بادِ تازہ
جو مل جائے میں ماورائے نظر کی جھلک پا سکوں
اس بھیانک اندھیرے میں گھٹتے ہوئے جی کو بہلا سکوں

•

میں جب پہلی بار ان سرنگوں میں داخل ہوا تھا
مجھے کیا خبر تھی یہاں سے مفر کی کوئی راہ ممکن نہیں
ہر دقیقہ مجھے اور الجھائے گا
سینۂ کوہ کی پیچ در پیچ راہوں میں
ہر پل کی پرچھائیں تاریکیوں میں اضافہ کرے گی
مجھے کیا خبر تھی کہ ہر آرزو مجھ کو مقصود سے دور تر کر سکے گی

•

مگر میرے دل میں یہ کیسی خلش ہے
کہ ہر ضرب پسپائی خو بہ تو
مجھ کو سعیِ مسلسل پہ اُکسا رہی ہے
سرنگوں کی وحشت نظر کے شراروں کو بھڑکا رہی ہے
مجھے جستجو آگے لے جا رہی ہے

•

دانش فرازی

اکائی

مجھے بھی اس کی تلاش رہتی ہے اس کی آہٹ پہ چونکتا ہوں
مگر وہ میرے ارادۂ جستجو سے پہلے ہی آگے بڑھتا ہے
اور کہرے کی اوٹ میں چھپ کے مسکراتا ہے
نرم روندیوں کے بربط پہ گنگناتا ہے
کون ہے وہ؟
کہ جس کے بارے میں ذہن جب سوچتا ہے پہروں
ازل کے زرکار دائرے ہوں کہ زلفِ شامِ ابد کے حلقے
گریز پا وقت کے پگھلتے ہوئے سلاسل
حدود کی فکر، فاصلوں کے حسیں تصور
یہ گردشیں
یہ رواں دواں سلسلے اُفق کے
سکوتِ گُل، اضطرابِ دریا
سکوں کے دشتِ بے کراں کے شکیب اشارے
یہ سارے نقطے سمٹتے جاتے ہیں
اور ابھرتی ہے وہ اکائی
جو سقف و مینار و کاخ و معبد کی رفعتوں سے
لہو، وطن، نسل، قومیت کی کشاکشوں سے بھی
ماورا ہے
کہ اس خرابے میں جو بھی شے اس کے ماسوا ہے
وہ چند خودساختہ خداؤں کا واہمہ ہے

مصنف: ایلنگو وڈیگل
مترجم: کاوش بدری

تامل نظم "سلپ پدی گارم" کا ایک حصہ

Sileppadigaram

درونِ منزلِ شب تابِ حجلہ گاہِ عروس
وہ دونوں مسندِ طاؤس پر تھے جلوہ فگن
یوں لگ رہا تھا' بہ وقتِ نظارگی جیسے
یدِ میا نے انھیں کے لیے بنایا ہو
بہ وقتِ ناز و نیاز و بہ وقتِ خوش بسری
تمام غرفۂ زرّیں کی نرم جنالی سے
تھی جن پہ لولو و مرجاں کی لاکھ آویزش
سبک روی سے در آئی کنیزِ بادِ جنوب
برائے نزہت و آرائشِ دیارِ نشاط
بہ اہتزازِ تماشا' بہ اِدّعائے سلام
بہ روئے سیمبر و سیم رُخ کشادہ دہن
تھے ہم جلیس بصد شوق کر مکِ گلزاد
ہزار ہاتھ میں لے کر مشامِ جاں کے لیے
متاعِ بوئے گلِ تر خنک خنک سائے
کلی کلی کی ملاحت' چمن چمن کی پھبن
لطافتِ خلشِ یاسمینِ سرخ و سپید
جو برگ ہائے جواں سال سے مرصع تھے
کچھ ایسے نیم شگفتہ کنول کی شادابی
جو بھنبھناتی ہوئی نغمگی کے خوگر تھے
کچھ ایسے غنچۂ نورستہ کی حسیں سوغات

جو سبزہ زاروں میں جھیلوں میں لہلہاتے تھے
اور ان کے ساتھ جو زنبور خوش خرام آئے
وہی جو کنجِ خراباتِ مادھوی میں رہے
جو خوشہ چینِ روایاتِ قید و بند رہے
کہ دیکھ پائیں وہ نکہت گزیدہ زلفِ دراز
دمیدہ صبحِ جہانتاب سے لب و رخسار
ہوں کالی پوتّ کے اطراف بے شمار طواف

•

وہ رنگ و نور کے اس عالمِ بہاریں سے
مچلتے گھومتے گاتے بسوئے بام چلے
جہاں لطیف خنک چاندنی کی کرنوں میں
تھا دیوتائے محبت کمان غنچہ بدست
وہ تکیہ گاہِ زرِ گل پہ ہو گئے مدہوش
گمس گمس کی نگاہوں سے ہو گئے روپوش
مصوّری کی لگن کوولن میں کیا جاگی
بڑے سلیقے سے دستِ جمیل نے بڑھ کر
فراخ پشتِ بلوریں پہ لاکھ چاہت سے
نقوشِ نیشکر و نجم ثبت کر ڈالے
دمِ نظارہ وہ یوں صنو فگن نظر آئے

کہ بحر و بر پہ مہ و مہر ہالہ پھیرا ہوں
جو یاسمین کی مالا تھی اس کے زیبِ گلو
خود اس کے برگ بھی جو پائے انجمیں سے کھلے
جو ہار مرمریں گردن پہ جگمگاتا تھا
اسے نصیب تھے گنجان پتیوں کے کنول
تھا دونوں ہار کے سنجوگ کا عجیب سماں
جب آنکھ جھک چلی رخسارِ کنتگی کے قریں
ہوا وہ عربدۂ شوخ و شنگ سے گویا:
تھا گفتگو کا بھی انداز خود کلامی کا
"مری حیات! اگرچہ شیوا کے جوڑے میں
جمی ہوی ہے دلآویز ماہِ نو کی نشست
اس آرزو سے کہ تحسینِ غم شناس ملے
شیوا بھی خود ترے فرقِ جمیل کی خاطر
مرِ عزیز کو تجھ پر نثار کر دے گا
ترے ہی سنگ نہ ہو پائی آفرینشِ ماہ!
اسی طرح تھے بے جسم دیوتائے خلوص
خوشی سے دے دے تجھے اپنے نیشکر کی کماں
اس ادّعا سے کہ بن جائے وہ ترا ابرو
یہی تو ہوتے ہیں میدانِ جنگ کے قانون
کہ ہار ہوتے ہی ہتیار ڈال دے مغلوب!
اور اتورا بھی یہ کہتے ہوے تجھے سونپے
خود اپنی برق کو جو دیوتا کی محسن ہے
ہزار ناز سے بن جائے گی وہ تیری کمر
مرا سوال ہے، تیرا وجودِ لافانی
نہ جلوہ ریز تھا آبِ حیات سے پہلے
یہ کچھ اور سبب نہ تھا رخسارِ شش جہت کیلئے
خود اس نے شعلۂ ترسول تجھ کو دے ہی دیا
تھا اس کے ذہن میں منشا کہ اسکی حدت سے
تری نگاہِ فسوں ساز، سرمگیں آنکھیں
گھٹا کے رنگ کے باوصف لالگوں ہوجائیں
وہ چاہتا تھا کہ خطرے میں مجھ کو دیکھ سکے"

•

ترے جمال سے نیچا دکھا دیا تو نے
ہر ایک گام پہ طاؤسِ صد خراماں کو
ٹنکے ہیں جس کے پر و بال میں ہزار گہر
وہ دشت دشت میں خود کو چھپائے پھرتے ہیں،
ترے دمیدہ ملیح و صبیح چہرے نے
بطِ جواں کو پشیماں کر کے چھوڑا ہے
جو سرد جھیل کے رنگیں کنول کی آڑ لیے
نظر جھکائے ہوے جھینپتی گزرتی ہیں
ہیں اپنے آپ سے شرمندہ سبز طوطے بھی
جب اشتیاق سے سنتے ہیں مدھ بھری آواز
یہ کیا فسوں ہے کہ باوصفِ صد پشیمانی
ترے ہی نرم پھلواتے دستِ نازک پر
یہ آرزو ہے انھیں ساری عمر بیٹھو رہیں
تری صدا تو سراپا تفسیرِ فطرت ہے
حریفِ سیلِ رواں ہے، غم محبت ہے

Arumugam ؎

نہرو کی بذلہ سنجی

شری نہرو کے سورگباش ہونے سے تقریباً دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ پردھان منتری کی کوٹھی پر شعر و شاعری کی ایک بہت ہی مخصوص سی نشست منعقد ہوئی جس میں حضرت فراق گورکھپوری۔ جناب سکندر علی وجد۔ جناب مخدوم محی الدین۔ جناب سردار جعفری۔ جناب بیکل اتساہی کے علاوہ سمت پرکاش شوق کو شرکت کرنے کا موقع ملا۔ پنڈت جی نے شعراء کے درمیان ایک گھنٹہ گذارنے کے لئے رضامندی دی تھی۔ چنانچہ شعر و شاعری کا جب پہلا دور ختم ہو گیا تو ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا شعراء حضرات کو دوسری مرتبہ پڑھنے کی زحمت دی جائے۔ شری نہرو نے اثبات میں جواب دیا۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے سب لوگ محسوس کر رہے تھے کہ شاعروں کو اپنا مختصر کلام پڑھنا چاہیئے۔ شعراء حضرات اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ سردار جعفری کی نظمیں اکثر طویل ہوتی ہیں۔ جب سردار جعفری کی باری آئی تو فراق صاحب سردار جعفری سے ازراہِ مزاح بولے: دیکھنا! زیادہ زور نہ پڑے۔

اس پر پنڈت نہرو کی طبیعت کی شگفتگی عود کر آئی اور وہ چٹکی لیتے ہوئے بولے، کس پر۔؟ سننے والوں پر یا پڑھنے والوں پر؟

فراق صاحب فوراً ہی بولے: اب یہ نہ کھلواؤ:

اس پر ساری محفل زعفران زار بن گئی۔

▲

گورکھپور میں ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے بعد جب نہرو جی اپنی کار کی طرف جانے لگے تو لوگ درشنوں کے لئے ٹوٹ پڑے۔ دو طالب علم بھی آگے آنے کی کوشش میں تھے کہ دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ جب نہرو جی نے دیکھا تو فوراً وہاں پہنچے اور ایک کو پیار سے چپت لگاتے ہوئے بولے:

"ہٹو! جواہر لال آرہے ہیں"

لڑتے ہوئے دونوں طالب علم ہنستے ہوئے راستے سے ہٹ گئے۔

▲

۱۹۵۵ء میں فلم مرزا غالب کو راشٹرپتی کا سونے کا تمغہ ملا تھا اور گیان بھون میں منعقدہ فلم ایوارڈ سمارہ میں جب آپ کا تعارف فلم کی ہیروئن اداکارہ ثریا سے ہوا تو ازراہِ مزاح بولے:

"تو آپ ہیں غالب کی محبوبہ"؟

▲

ایک دعوت میں

کئی لوگ پنڈت جی کو گھیرے کھڑے تھے

کسی نے انہیں بتایا کہ دلی میں بی اے اور ایم اے پاس کچھ نوجوان ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نہر سویز برطانیہ کا حصہ ہے۔ یہ بات کہنے والے نے تو کہہ دی تھی کہ پنڈت جی ہمارے نوجوانوں کی جہالت پر کفِ افسوس ملیں گے۔ مگر سارا پانسہ ایک دم پلٹ گیا جب انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

"مگر برطانیہ اور فرانس کے
وزرائے اعظم جیسے عقلمند لوگ بھی تو
یہی کہتے ہیں"

▲

واہی

مکھن

طاقت ہے قلم میں نہ میسر ہیں وسائل
کس طرح رقم کیجئے مکھن کے فضائل

کھانے سے زیادہ ہیں لگانے کے فوائد
واللہ کہ ہم اس کی کرامت کے ہیں قائل

تیار کیا جائے جو الفاظ کو متھ کر
ہوتا ہے وہ تاثیر میں حلّال مسائل

زہراب کو وہ بادۂ صافی میں بدل دے
دم بھر میں کرے تلخیٔ ایام کو زائل

دو چار پلیتھن میں گھلے موم کی صورت
ہو کوہِ ہمالہ بھی اگر راہ میں حائل

اربابِ سیاست کا یہی خاص ہنر ہے
کرتا ہے مہیا جو ترقی کے وسائل

پہلو میں وزیروں کے جو پھرتے ہیں مصاحب
ان سے کبھی پوچھے کوئی مکھن کے فضائل

جو ناک پہ مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے
ایسے بھی ہیں دو چار مدیرانِ رسائل

مکھن کا مگر اُن پہ بھی چل جاتا ہے جادو
ہو جاتی ہے دم بھر میں خودی انکی بھی زائل

مکھن میں لپیٹا ہوا مکتوبِ خوشامد
حل کرتا ہے مضمون نگاروں کے مسائل

پرچوں میں نظر آئیں نہ کیوں پھر وہ مضامیں
صاف آتی ہو جس سے بخدا بوئے فنائل

اس حق کو سلیقے سے اگر سیکھ لے عاشق
معشوقِ ستمگر کے بدل جائیں خصائل

اعجاز سے مالش کے پگھل جائے دل اس کا
عاشق پہ ہو وہ آپ ہی جی جان سے مائل

یہ بات پتے کی ہے عزیزانِ گرامی
جی چاہے تو کر لیجئے خود آپ ٹرائل

مصطفیٰ علی بیگ

ایش ٹرے

"جو دوسروں کی آگ اپنے سینے میں سمولے اور مسکراتا رہے وہ یقیناً لائقِ تعظیم ہے" (ایڈورڈ فرانسنٹیو)

اب آپ یقیناً سوال کریں گے کہ یہ ایڈورڈ فرانسنٹیو کون ہے؟ جواباً عرض ہے کہ یہ میرے ذہن کی پیداوار ایک ایسی خیالی شخصیت ہے جو ہر آڑے وقت میرے کام آتی ہے۔ اور میں دنیا کے ہر مسئلے پر اس کے کسی نہ کسی مقولے کے ذریعے اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو مرعوب کرلیا کرتا ہوں۔ آپ یہ ضرور پوچھیں گے کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں — مگر میں بتاؤں گا نہیں کیوں کہ یہ میرا (TRADE SECRET) ہے۔ عام طور پر اس نسخے کو دوسروں کو مرعوب کرنے، سستی شہرت حاصل کرنے، یا اپنے مضامین چھپوانے اور جھوٹی سچی افواہیں اڑانے استعمال کیا جاتا ہے جیسے یہ کہ (Suspense) پیدا کرنے کے لیے ایسی گپ ہانک دی جائے جس سے سننے والے کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ جائے مثلاً یہ کہ سہگل اپنے گانے خود نہیں گاتا تھا۔ بلکہ کسی اور سے گواتا تھا یا یہ کہ راجہ پورس کتھک ڈانس کا ماہر تھا۔ یا یہ کہ حنیف محمد اپنے بازو پر بندھے ہوئے تعویذ کے زور سے سنچریاں بناتا ہے وغیرہ تو ایسے تمام نسخے ٹریڈ سیکریٹ کہلاتے ہیں۔ توبہ! میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ میں تو اپنے ایش ٹرے کے تعلق سے بات کررہا تھا جو میری خیالی شخصیت ایڈورڈ فرانسنٹیو کے مقولے کے مطابق (دوسروں کی آگ یا جلتے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے سمو لینے کے باوجود مسکراتا رہتا ہے ...") ہاں تو صاحب یہ میرا ایش ٹرے ہے جو میز پر بے نیازانہ شان سے جلوہ افروز ہے جس میں قسم قسم کے سگریٹوں کے ٹکڑے، سگار، چرٹ، تمباکو، چکنی سپاری کے پھٹے ہوئے کاغذ کچھ اس انداز میں پڑے ہوئے ہیں جیسے مجھے منہ چڑا رہے ہوں۔

وہ ایک گوشے میں آپ کو چارمینار سگریٹ کا جو چھوٹا

سا ٹکڑا نظر آ رہا ہے وہ میرے کالج کے ایک عزیز دوست کا پھینکا ہوا ہے۔ وہ پیار سے اپنے چارمینار سگریٹ کو "جوزی" اور مجھے "ملک" کہا کرتے ہیں۔ ہر سال بی۔ اے میں بڑے اطمینان سے فیل ہوتے ہیں۔ لیکن جب بھی آتے ہیں سگریٹ سلگا کر بڑے اطمینان سے اپنی امکانی کامیابی کی داستان پوری اداکاری کے ساتھ سناتے ہیں میز پر رکھی ہوئی مختلف اشیا کو اپنے نصاب کے مختلف مضامین قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر کا سلسلہ یوں شروع کرتے ہیں" ملک اکنامکس اور پالیٹکس باؤنڈری کے باہر" اس جملے کے ساتھ ہی وہ میز پر دھری ہوئی سگریٹ کی ڈبیہ کو بھی باؤنڈری کے باہر کر دیتے ہیں" لیکن یار انگریزی صرف باؤنڈری پر آ کر رک گئی" وہ ایش ٹرے کو میز کے کنارے پر رکھ دیتے ہیں۔ اور میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ انگریزی بھی باؤنڈری کے باہر نہ ہوئی ورنہ ایش ٹرے کا سارا کچرا میرے کمرے میں پھیلا ہوا نظر آتا۔

ایش ٹرے کے بیچوں بیچ players سگریٹ کا ایک ٹکڑا جو آپ کو نظر آ رہا ہے وہ ہمارے دوست راگی صاحب کا آئینہ دار ہے۔ وہ جب بھی آتے ہیں الاپ کے انداز میں فرمائش ہوتی ہے کہ " players " منگایا جائے اور players کا کش لیتے ہوئے سگریٹ کے نقصانات پر لکچر پلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہوں اور وہ ٹھاٹ سے پلیرز سگریٹ کا کش لیا کرتے ہیں۔

ایش ٹرے میں آپ کو ایک بیڑی کا ٹکڑا دیکھ کر یقیناً حیرت ہوگی، لیکن یہ بھی ہمارے ایک مہربان ہیں۔ میں انھیں "بیڑی نواز" کہتا ہوں۔ کیوں کہ وہ ہر کس و ناکس کو بلا تکلف بیڑی پیش کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بھی گنواتے جاتے ہیں۔ مثلاً بیڑی سے کھانسی نہیں ہوتی۔ تمباکو اصلی ہونے کی وجہ سے نکوٹین کم ہوتا ہے۔ بیڑی کا پینا دماغ کو تازگی بخشتا ہے۔ اگر بیڑی میں اجوائن رکھ کر پی لیں تو سردی سال بھر قریب پھٹکنے نہیں پاتی دراصل سگریٹ سے جو کینسر ہوتا ہے۔ وہ اس کے کاغذ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ان کے اس لکچر کا انداز اتنا پیارا ہوتا ہے کہ میں فوراً اُن کے ہاتھ سے بیڑی چھین کر پے در پے کش پر کش لینے لگتا ہوں۔ اور وہ گھبرا کر اپنی تقریر ختم کر دیتے ہیں۔

یہ آپ کیا گھور رہے ہیں۔ یہ تو کینڈ بری کی پنّی کا ٹکڑا ہے یہ اُن صاحبہ کا ہے جو ہر سکنڈ پر اللہ اللہ اور پلیز پلیز کہہ کے میرا ناک میں دم کر دیتی ہیں۔ سامنے کے بالوں کو "سادھنا کٹ" کر دلیا ہے۔ گلابی رنگ کے خطرناک قسم کے ناخن، لپ اسٹک سے رنگے ہوئے سرخ خونی ہونٹ۔ وہ جب بھی آتی ہیں صوفے پر بیٹھے بغیر ایش ٹرے کے نزدیک کھڑے کھڑے ہی بات کرتی ہیں " اللہ! کتنے بور دوست ہیں آپکے بیڑی پیتے ہیں۔ ہمارے پپا تو 555 پیتے ہیں" میں مجبوراً بیڑی کے فوائد پر اپنے دوست کی تقریر دہرانا شروع کر دیتا ہوں۔ اور وہ بڑے آرٹسٹک انداز میں ہنستی ہوئی کہتی ہیں "پلیز اب بند کرو۔ اللہ پلیز بند کیجئے" مجھے ان کی پلیز بہت پسند ہے ویسے مجھے ہر مختصر سی چیز سے پیار رہا ہے چھوٹا سا مکان، ریڈیو، چھوٹی سی ڈکشنری، ڈائری اور چھوٹے سے قد کی .... جی ہاں .... ! خیر جانے دیجئے ـــ

دیکھئے! ایش ٹرے کے اس کونے میں سنہری رنگ کے چپٹے سگریٹ کا ٹکڑا نظر آ رہا ہے۔ یہ میرے دوست وجو نواب کی یاد دلاتا ہے۔ بھئی جواب نہیں اس سگریٹ کا۔ گورے، دبلے پتلے، نازک اندام وجو نواب جب بھی سگریٹ سلگاتے ہیں، ڈرائینگ روم خوشبو سے مہک جاتا ہے۔ وہ ہر سگریٹ نوشی کے دوران اکثر اپنے شکار کا قصہ مختصراً سناتے ہیں، اور اگر طبیعت موڈ میں ہو اور وہ تفصیل پر اتر آئیں تو شاید ایک ٹن سگریٹ کی ضرورت پڑے اور وہ اپنا قصہ یوں شروع کرتے "معلوم ہوا کل ہی وہ ایک بکری کے بچے کو لے گئی شام کا وقت تھا میں نے سوچا ممکن ہے تالاب پر پانی پینے آئے۔ اور جب میں تالاب کے پاس پہنچا تو پنجوں کے تازہ نشانات بھی ملے

کیا بتاؤں کتنی کوفت ہوئی۔ کاش میں تھوڑی دیر پہلے پہنچ جاتا سب نے کہا گاؤں کے باز و سے جو پگڈنڈی جاتی ہے وہاں فرو ل جائے گی۔ میں نے اپنی جیپ پگڈنڈی کی طرف موڑ دی۔ آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ لائٹ کی روشنی میں ظالم پگڈنڈی کے کنارے بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ریڈی صاحب نے لقمہ دیا ـــ کون تھی ـــ؟ اجی! وہی اپنی شیرنی . . . کیا منظر تھا ہے ـــ ہے ـــ پسینے چھوٹ گئے ہوں گے۔ ریڈی نے پھر گرہ لگائی بس دونوں کی نوک جھونک شروع ہوگئی اور ریڈی نے غصے میں اپنی پائپ کا آدھ جلا تمباکو ایش ٹرے میں انڈیل دیا۔ آپ یہ جو بہت سارا تمباکو دیکھ رہے ہیں اپنے ریڈی ہی کا ہے۔ ریڈی کہتا ہے پائپ سے آدمی بہت اسمارٹ لگتا ہے۔ چنانچہ جب بھی وہ پائپ جلاتا ہے اپنے آپ کو برٹ لنکاسٹر، کبھی گریگوری پک اور کبھی چیف منڈلر سمجھنے لگتا ہے اور اسی ڈھنگ میں بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نہایت ہی سعادت مندی سے اس کی گفتگو سنتا ہوں تاکہ اس کا "ہیروازم" کا احساس مجروح نہ ہو جائے۔

ایش ٹرے کے کنارے پر آپ جو بالکل چھوٹا سا چرٹ دیکھ رہے ہیں، وہ ہمارے بڑے بھائی صاحب کا ہے جو سچ پوچھئے تو چرٹ پیتے کم اور کھاتے زیادہ ہیں۔ وہ اپنے نہایت ہی چھوٹے چرٹ کے ٹکڑے کو منہ میں دبا کر حکم دیتے ہیں "ذرا سلگا دو" ـــ اُن کی مونچھوں کو بچاتے ہوئے ایک ماہر فن کی طرح جب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں، ان کا چرٹ سلگا دیتا ہوں تو بے اختیار فارسی کا وہ مقولہ یاد آجاتا ہے: "سگ باش برادر خورد مباش"

سگار کے نزدیک ہی سپاری کی پڑیہ کا جو کاغذ نظر آرہا ہے، ـــ وہ ہمارے لیڈر قسم کے دوست کا ہے۔ وہ سپاری چباتے ہوئے ہند چین سرحدی جھگڑے پر کچھ اس انداز میں ـــ تبصرہ فرماتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سپاری نہیں چینیوں کو چبا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو غصے سے کانپنے لگتے ہیں اور اپنی غضب ناک آنکھوں سے مجھے اس طرح گھورنے لگتے ہیں جیسے میں مصطفیٰ نہیں ہوں چو این لائی ہوں۔

ہر صبح کو ہماری نوکرانی ایش ٹرے میں پڑے ہوئے کچرے کو باہر پھینک آتی ہے۔ ایش ٹرے خالی ہو جاتا ہے۔ لیکن میرا دماغ ان یادوں سے خالی نہیں ہوتا جو اس ایش ٹرے سے وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ دماغ بھی تو ایک ایش ٹرے ہی ہے جس میں کئی ایک شخصیتوں کی سلگتی بجھتی ہوئی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ وہ یادیں جن میں خلوص ہے ـــ ہے مسکراہٹیں ہیں، درد ہے، کوفت ہے ـــ دوستی کے وہ تقاضے ہیں جن کے بغیر زندگی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ خدا کرے میرا یہ ایش ٹرے کبھی خالی نہ ہو!

●●

شہبانہ صدیقی امروہوی

جوابِ شکوۂ تنخواہ

شورِ ٹیچر بھی قیامت کا اثر رکھتا ہے
وہ تباہی جو بشر میں ہے وہ شر رکھتا ہے
بی ٹی النسل ہے، ہیڈ پہ نظر رکھتا ہے
رُوم سے اُٹھتا ہے، آفس میں گزر رکھتا ہے
اُڑ کے فریاد مری ہیڈ کے دفتر پہنچی
درِ دفتر کے تھرو بابِ منسٹر پہنچی

اس قدر شوخ کہ طعنہ زن آفیسر ہے
تھا جو اُستاد، کلاک یہ وہی ٹیچر ہے
سخت گستاخ ہے، بیباک ہے، خیرہ سر ہے
کوئی فرعون ہے، چنگیز ہے، ہر ہٹلر ہے
مُفت میں شکوۂ تنخواہ سے سر کھاتا ہے
ماسٹر ہے اسے ٹرٹر میں مزا آتا ہے

گیسٹ کیپر نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
تھا پئین کا یہ اشارہ کہ یہیں ہے کوئی
اور ڈلی بولا کہ مغموم و حزیں ہے کوئی
دفتری کہتا تھا مردود و لعیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوہ کو کمشنر سمجھا
شیام پٹ کا مجھے اسکول کے ڈسٹر سمجھا

آئی آواز، سنی ہم نے تمہاری فریاد
فنِ شکوہ کے حقیقت میں ہو تم سب استاد
کہا تم نے جو ہمیں بانیٔ جور و بیداد
ہم بھی تم لوگوں کے ریمارک پہ کرتے ہیں صاد
ہم نوستاک بھی، جلاد بھی، ظالم بھی ہیں
کچھ عیاں تم پہ مگر اپنے مظالم بھی ہیں

تھی کلرکوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
اہلِ دفتر پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
قصر و ایوان پہ بھی ٹیچر کی تگ و تاز ہے کیا
آ گئی بزم کتابی کو بھی پرواز ہے کیا
غافل آداب سے ہیں اہلِ مدارس کیسے؟
دے دی سرکار نے ان لوگوں کو نرسس کیسے؟

دیکھو تم دیدۂ انصاف کی نظروں سے اگر
صاف ہو جائے ہویدا یہ حقیقت تم پر
ہم نے ہر دور میں سمجھا تمہیں سب سے بہتر
ڈالی تم پر کرمِ خاص وزارت کی نظر
درس و تدریس کی مسند پہ بٹھایا تم کو
پاسباں قوم کے بچوں کا بنایا تم کو

تم نے لیکن یہ کیا ظلم وستم قوم کے ساتھ
سر پہ بچوں کے نہ رکھا کرم و لطف کا ہاتھ
ناک میں ان کی ڈسپلن کی نہ ڈالی کبھی ناتھ
نہ دکھایا انہیں پابندیٔ احکام کا پاتھ
اپنے شاگرد کلاسوں میں نہ گھیرے تم نے
کردیئے فیلڈ میں آزاد بچھیرے تم نے

قوم کا ہم نے بنایا تھا جو تم کو معمار
اس کی تعمیر و ترقی کا کیا تھا مختار
اس کی پاداش میں تم نے یہ کیا ہم پر وار
کردیا وحدتِ ملّی کی بنا کو مسمار
ڈال دی خاک رُخِ صلح و رواداری پر
جنگ جو بن گئے نیتاؤں کی ٹھکاری پر

تم نے اسکولوں میں نفرت کا اُٹھایا طوفان
درس گاہوں کو فسادوں کا بنایا میدان
جذبۂ فرقہ پرستی کو چڑھا کر پروان
کردیا قوم ملائک کو مجسم شیطان
علم کا ہاتھ سے بچوں کے عَلَم چھین لیا
کرکے تلوار عطا ان کو قلم چھین لیا

ہم کو تسلیم کہ تم رکھتے ہو بیسک کا گیان
ڈالٹن کا تمہیں معلوم ہے ماڈرن پلان
ماؤنٹیسوری سے بھی پایا ہے تم نے فیضان
ہے پراجکٹ کے میتھڈ کا بھی تم کو عرفان
علم رکھتے ہو مگر کوئی عمل تم میں نہیں
نخل تم سرو سہی کا ہو کہ پھل تم میں نہیں

تم میں بی ایڈ بھی، ایم ایڈ بھی، بی ٹی بھی ہیں
ایچ ٹی سی بھی ہیں، جے ٹی بھی ہیں، سی ٹی بھی ہیں
ایم او ایل بھی، جے وی بھی ہیں، وی ٹی بھی ہیں
واقفِ گیمس بھی ہیں، ماہرِ پی ٹی بھی ہیں
نام سب کچھ ہیں مگر، کام ٹھکانے کے نہیں
دانت ہاتھی کے دکھانے کے ہیں، کھانے کے نہیں

کبھی اسکول میں کرتے ہو رقم تم اشعار
کبھی پڑھتے ہو رسالہ، کبھی کوئی اخبار
چھیڑ دیتے ہو کبھی کوئی سیاسی گفتار
کبھی کرتے ہو معموں کے اشاروں پہ وچار
وقت سارا انہی شغلوں میں گنوا دیتے ہو
ڈائری ٹھیک مگر بھر کے دکھا دیتے ہو

وقت گپ شپ میں کیا کرتے ہو ہر روز خراب
کورس پڑھتے نہیں ہرگز کبھی بالاستیعاب
ختم بچوں سے کراتے نہیں کوئی بھی کتاب
چھوڑتے رہتے ہو ہر ٹرم میں آدھا نصاب
صرف اہم جُزو کتابوں کے پڑھا دیتے ہو
بلکہ طوطے کی طرح وہ بھی رٹا دیتے ہو

گیس پیپر سے جلاتے ہو کبھی ان کا دیا
حل شدہ پرچے پلاتے ہو کبھی پڑھ کے دعا
ایسے لکھ دیتے ہو ایسا کبھی تعویذ نما
درد ہرگز نہ مضامیں کی جو ہوتا ہے دوا
بن کے سیٹر کبھی کر دیتے ہو پیپر آؤٹ
اسی سیرت پہ بنے پھرتے ہو کیا اسکاؤٹ

فرض کو فرض نہیں جانتے اپنے زنہار
کام اسکول کا کرتے ہو سمجھ کر بیگار
تم کو بچوں کی بھلائی سے ہو کیونکر سروکار
بھوت سر پہ ہے جب اپنی ہی پڑھائی کا سوار
امتحاں ٹھاٹ سے ہر سال دیئے جاتے ہو
مفت سرکار سے تنخواہ لیئے جاتے ہو

گھر پہ بچوں کو پڑھاتے ہو جو تم صبح و مسا
کچھ خبر ہے کہ زیاں ہوتے ہیں اس سے کیا کیا
لونڈے جب چھین کے لے جاتے ہیں عقلِ مُلّا
صورتِ بوم میں ہو جاتا ہے تبدیل ہُما
گھر میں پھر جاتی ہے بدھی پہ جب اسکی جھاڑو
جاکے اسکول میں بن جاتا ہے ٹیچر بدھو

جب تم اسکول پہنچتے ہو تو ہوتا ہے یہ حال
قلب افسردہ، زباں گنگ، انرجی پامال
شدتِ ضعف بنا دیتی ہے اس درجہ نڈھال
درس کا شغل تو کیا، قال بھی ہوتا ہے محال
نیند کی جھونک میں مدہوش سے ہو جاتے ہو
سینہ میز پہ سر ٹیک کے سو جاتے ہو

ممتحن تم کو بناتا ہے کوئی بورڈ اگر
ٹھیک ہوتا نہیں ججمنٹ تمہارا اکثر
سرسری ڈال کے اوراقِ نوشتہ پہ نظر
صرف اٹکل سے چڑھا دیتے ہو ان پر نمبر
دام لیتے ہو مگر کام نہیں کرتے ہو!
کیا اسی بات پہ ایثار کا دم بھرتے ہو؟

جب کہیں جاتے ہو تم انویجیلیٹر بن کر
ہم کو ظاہر ہے وہاں جو بھی دکھاتے ہو ہنر
اپنے بیٹھوں کی شرارت پہ نہیں رکھتے نظر
نقل کرتے ہیں دھڑلے سے وہ بے خوف و خطر
لکھ کے تم ان کو سوالات کے حل دیتے ہو
داؤ چلتا ہے تو کاپی بھی بدل دیتے ہو

پیش ہم نے جو کیا ہے یہ تمہارا کردار
کر نہیں سکتے کسی طرح تم اس سے انکار
بہتر اب حق میں تمہارے ہے یہی چارہ کار
اپنے ان کردہ گناہوں پہ کرو استغفار
صدقِ دل سے یہ وفادار ہمارے بن جاؤ
چند ہی روز میں پھر راشٹر دلارے بن جاؤ

تم نے تنخواہ کا ہم سے یہ کیا ہے جو گلا
حق تو یہ ہے کہ نہیں فعل تمہارا یہ بجا
درد جو رکھتے نہیں چاہتے ہو اس کی دوا
ہم سمجھتے ہیں یہ ہڑبونگ کہاں تک ہے روا
رازِ درپردہ کی تم سب کے خبر رکھتے ہیں
اندھے آنکھوں کے نہیں، گدھ کی نظر رکھتے ہیں

ٹیوشن کرتے ہو ہر وقت بنا پرمیشن
گھیر لیتے ہو بیک وقت بہت سی ٹیلشن
پیشگی فیس کے ہوتے ہیں جو ڈیلی درشن
خالی رہتا نہیں نوٹوں سے تمہارا دامن
دیکھتے تم کبھی افلاس کی صورت ہی نہیں
تم کو تنخواہ کی ہر ماہ ضرورت ہی نہیں

بن کے آجاؤگے جس دن بھی حقیقی ٹیچر
وہی ہم ہوں گے، وہی تم، وہی رحمت کی نظر
شکوہ تنخواہ کا لاؤ گے نہ ہرگز لب پر
پاس ہوگا نہ تمہارے کبھی عسرت کا گذر
گھر میں ہر روز ہی شغلِ مئے و مینا ہوگا
ڈیڑھ سو دن کا نہ پھر کوئی مہینا ہوگا

ترجماں آج بنا ہے جو ہمارا شہباز
رہ چکا ہے یہ مدارس میں تمہارا دم ساز
اہلِ اسکول کا معلوم ہے اس کو ہر راز
اسی باعث تو یہ بے باک ہے یوں کلہ دراز
چہرۂ راز سے پردہ نہ اٹھائے کیونکر
گھر کا بھیدی ہے یہ لنکا کو نہ ڈھائے کیونکر

اعجاز قریشی

نئے اور اُبھرتے ہوئے فنکار

ہندی اور اردو کی فلموں کے لئے
گذرا ہوا سال ۱۹۶۴ء حادثوں اور سانحوں کا سال تھا
۱۹۶۵ء نئے اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کے سال کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ گذشتہ چند مہینوں کے دوران میں بمبئی سے تیار ہو کر آنے والی فلموں میں مختلف نئے چہرے دیکھے گئے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نئے اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کے باوجود بیشتر فلمیں کامیاب ثابت ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے مستقبل میں اس قسم کے اور بھی کئی تجربے آسان نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے پچھلے مضمون میں بحث کی تھی کہ اسٹار سسٹم کے خاتمہ اور موجودہ بہت سی دشواریوں کے حل کے لئے صرف نئے چہروں کو دریافت کرنا اور متعارف کرانا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری فلمی صنعت سے وابستہ تمام اچھی صلاحیت رکھنے والے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ایسے فن کاروں کی کمی نہیں جن کی صلاحیتوں کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں لیکن اگر یہ فن کار "بے کار یا نیم بے کار" ہیں تو اس کی وجہ محض اسٹار سسٹم اور فلمسازوں کی ذہنیت ہے کہ نئے [illegible] نہ جائیں بلکہ آزمودہ فن کاروں کے ذریعے ہی کام چلایا جائے۔ اب یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ — ہماری فلموں میں نئے فن کار زیادہ تعداد میں نظر آ رہے ہیں اور مستقبل میں بھی نئے فن کاروں سے کام لینے کا رجحان بڑھے گا اور ایسے فن کاروں کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی جن کی اسٹار ویلیو کم ہو چکی ہے۔

نئے اداکاروں میں سب سے زیادہ خوش نصیب سنجے کمار ہے جسے مسلسل نئے کنٹریکٹ مل رہے ہیں اور جس کا شمار اب معروف ترین اداکاروں میں ہونے لگا ہے۔ سنجے کمار نے فلم دوستی میں مختصر رول ادا کیا تھا۔ اسے جو ایکساتھ کئی فلمیں مل گئی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوستی میں اس کا کام پسند کیا گیا۔ دوستی میں تو اس کا کردار مختصر تھا اور اسے اپنی اداکاری کی صلاحیتوں کے مظاہرہ کا اچھی طرح موقع بھی نہیں ملا۔ سنجے کمار کو زیادہ تعداد میں نئے کنٹریکٹ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مشہور اور بڑے اداکار اپنی اسٹار ویلیو اور اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے بہت کم فلموں کے کنٹریکٹ قبول کر رہے ہیں وہ صرف ایسی فلموں میں ہی کام کرنا پسند کرتے ہیں جن کی کہانیاں

ہر طرح سے نقیبی سمجھی جائے اور جن کی تیاری پر بے دریغ لاکھوں روپیے صرف کئے جائیں، یہی حال اونچے درجہ کے موسیقاروں اور دوسرے بڑے فن کاروں کا ہے۔ سنجے کمار اپنی وجاہت اور پُر اثر شخصیت کی وجہ سے بھی مصروف ترین اداکاروں کی صف میں شامل ہو گیا ہے لیکن اسے فلموں اور اپنے لئے کردار کے انتخاب میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے اگر اس نے ہر پیش کش کو قبول کر لیا تو اس کا انجام بھی عبرتناک بن سکتا ہے۔ فلمی دنیا میں فن کار جس تیزی کے ساتھ شہرت حاصل کرتے ہیں۔ اس تیزی کے ساتھ گمنامی کے اندھیرے میں بھی کھو جاتے ہیں۔

نئی اداکاراؤں میں شرمیلا ٹیگور کا مستقبل شاندار نظر آتا ہے۔ بمبئی میں اس کی پہلی فلم کشمیر کی کلی، تھی جس میں اس کا کام بے حد پسند کیا گیا۔ شرمیلا ٹیگور ستیہ جیت رائے کی دریافت ہے۔ اس میں اداکارانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں مستقبل قریب میں اس کی دو تین اہم فلمیں (بشمول وقت بڑا دیو بی۔ آر۔ چوپڑہ) نمائش کے لئے پیش کی جانے والی ہیں۔

اداکارہ کلپنا کو جس نے پروفیسر میں کامیابی اور شہرت حاصل کر لی تھی اپنی اگلی فلم کے لئے دو سال تک انتظار کرنا پڑا۔ حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر کی شاندار کامیابی کے باوجود اس اداکارہ کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اب اس کی نئی فلم "تین دیویاں" نمائش کے لئے پیش کی گئی ہے لیکن بد قسمتی سے وہ اس فلم میں کامیاب نہیں ہو سکی اس کا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا۔

نئی اداکارہ سیمی کا نام بھی کئی سال سے سنا جا رہا ہے۔ سن آف انڈیا میں اسے مختصر کردار دیا گیا تھا۔ اس کی اصل فلم گوا سمجھی جا رہی تھی۔ "گوا" کے بننے میں بہت تاخیر ہوئی سنسر بورڈ کی وجہ سے بھی اس فلم کی نمائش کافی عرصہ تک رکی ہوئی تھی۔ گوا میں سیمی کو نسبتاً اہم کردار ملا تھا لیکن اس فلم میں دوسری ہی اداکارہ سونیا ساہنی کو ابھرنے کا زیادہ موقعہ ملا۔ سونیا ساہنی ہماری اداکاراؤں میں اچھا اضافہ ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اپنی پہلی ہی فلم میں کافی کامیاب رہی ہے۔ باکس آفس پر فلم "گوا" کی کامیابی بھی سونیا کے نصیب چمکا سکتی ہے۔ سیمی کی تیسری فلم "تین دیویاں" تھی اس فلم میں سیمی کو موزوں کردار ملا تھا اور وہ بے حد کامیاب رہی کشور ساہو نے اپنی فلم "پونم کی رات" میں ایک ساتھ کئی نئے چہرے پیش کر دیئے۔ نئی اداکارہ کمود چوگانی کا کام بہت اچھا رہا اور اس کا مستقبل بھی اچھا نظر آتا ہے۔ دیپ کے کردار کے لئے نندنی پر بھی نظریں پڑ سکتی ہیں۔ زندگی اور موت میں انصاری صاحب نے شکیلہ کی جگہ زیبال کو دی لیکن نئی اداکارہ زیبال کو کامیابی کے لئے بہتر موقعہ اور بہتر کردار کے لئے انتظار کرنا پڑے گا۔ بہتر موقعہ اور بہتر کردار حاصل ہو جانے کے بعد اسے سائرہ بانو اور نوتن کی نقل کرنے کی بجائے اداکاری کے اپنے فطری جوہر دکھانے ہوں گے۔ "بھوت بنگلہ" میں تنوجہ نے ایکبار پھر اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا شاندار مظاہرہ کیا اس کی موجودگی میں دوسرے کردار بجھے بجھے نظر آنے لگے لیکن تنوجہ پر ہمارے فلمساز توجہ ہی نہیں کر رہے ہیں جبکہ بنگال کے فلمسازوں میں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں سے استفادہ کا رجحان پایا جاتا ہے۔ تنوجہ کوئی نئی اداکارہ نہیں ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ وہ اب تک اسٹار نہیں بن سکی۔ ہمارے فلمسازوں کی نظروں کو بالعموم "جھوٹے نگوں" کی "کاریگری" ہی "خیرہ" کرتی ہے اور سچے موتی اور حقیقی چمک رکھنے والے ہیرے ان کی نظروں سے چھپے ہی رہتے ہیں۔

راج شری کا شمار کچھ عرصہ پہلے تک بھی ابھرتی ہوئی اداکاراؤں میں کیا جاتا تھا لیکن "گیت گایا پتھروں نے" اور "جانور" کی کامیابی نے اسے صف اوّل کی کامیاب ترین اداکاراؤں میں شامل کر دیا ہے۔ آئی ایس جوہر سے کون ناواقف ہوگا۔ وہ بمبئی کی فلمی صنعت کی ایک اہم آل راؤنڈ شخصیت ہے۔ ایک کامیاب ڈرامہ نویس اچھا ہدایت کار اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والے کامیڈین جوہر برسہا برس سے نظر انداز کیا جا رہا ہے لیکن گو انہیں وہ ایک ہدایت کار اور فلمساز کی حیثیت سے بھی کامیاب رہا ہے اور کامیڈین کی حیثیت سے بھی پسند کیا جا رہا ہے۔ اپریل فول میں کامیڈین کی حیثیت سے وہ پورے عروج پر تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب جوہر کے جوہر زیادہ چمک رہے ہیں۔ بھوت بنگلہ میں راہول نے کامیڈین کا مختصر کردار بھی ادا کیا ہے وہ ایک کامیاب کامیڈین بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

اس سال نئے اور ابھرتے ہوئے اداکار ہی نہیں موسیقار بھی کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال حالیہ برسوں میں آنے والے موسیقاروں میں سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ شنکر جے کشن کی جوڑی کے بعد اس جوڑی کی

مانگ ہی سب سے زیادہ ہے. کلیان جی آنند جی کی جوڑی نئی نہیں ہے لیکن اب تک یہ جوڑی کامیابی اور شہرت کی بلندی کو چھو نہیں سکی۔ گو اکی کامیابی اور "پورنیما"، "جی چاہتا ہے..." اور "ہمالیہ کی گود میں" میں اس جوڑی نے چند بہت عمدہ دھنیں ترتیب دی ہیں۔ ادشا کھنہ کا شمار بھی اب مصروف ترین میوزک ڈائرکٹرز میں ہونے لگا ہے لیکن ابھی انھیں آزمائش اور تجربہ کے مرحلہ سے کامیاب گذرنا ہے۔

حالیہ عرصہ میں معاون اداکارہ ممتاز کی چند فلمیں آئی ہیں اور بے شمار فلمیں آنے والی ہیں ممتاز کو تیسرے درجہ کی اور مار دھاڑ کی فلموں کی بجائے بہتر فلموں پر زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ رقاصاؤں میں ہیلن تو سدا بہار ہے ہی۔ لیکن نئی رقاصاؤں میں بیلا بوس اور رانی کو اُبھرنے کے موقعے مل رہے ہیں۔ اس طرح دوسرے فلمی شعبوں میں بھی نئے اور اُبھرتے ہوئے فن کاروں کا مظاہرہ بہ حیثیت مجموعی حوصلہ افزا ہے۔ "ہمالیہ کی گود میں" کی عکاسی کی ذمہ داری ایک نئے اور نوجوان کیمرہ مین پربین بھٹ کو سونپی گئی تھی اور انکی پہلی کوشش ہی کامیاب رہی ہے۔ جادھو اور ڈیسائی جو بین الاقوامی شہرت رکھنے والے آرٹ ڈائرکٹر رجو ہیکر اور آنجہانی بیرن ناگ کی نگرانی میں کام کر چکے ہیں۔ اب آزادانہ طور پر آرٹ ڈائرکشن میں مصروف ہیں اور ان کا کام بھی تسلی بخش ہے۔ پلے بیک سنگروں میں نئی پلے بیک سنگر شاردا کی دھوم ہے۔ اسمٰعیل مرچنٹ "ہاؤس ہولڈر" کے بعد اپنی نئی فلم شکسپیر والا میں ششی کپور کے مقابل نئی اداکارہ کو پیش کر رہے ہیں۔

فلمی رسالوں میں بھی ان دنوں نئے چہروں اور ابھرتے ہوئے اداکاروں اور فن کاروں کے بارے میں زیادہ خبریں اور مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ غرض ہر طرف نئے اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کے چرچے ہیں جو فال نیک ہے۔ نئے اور ابھرتے ہوئے ان فن کاروں سے فلمی صنعت اور فلم بینوں کو بہت زیادہ توقعات ہیں۔ امید ہے کہ یہ فن کار ہماری فلموں میں "تازگی" پیدا کرنے کے ساتھ "اسٹار سسٹم" پر کاری ضرب لگا سکیں گے یہ فن کار فلمی صنعت کے مالی بحران کو کم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

Regd. No. H. 470

Registered with the Registrar of News Papers at R. N. No. 8285/64.

POONAM MONTHLY
AZAMPURA, HYDERABAD - A. P.



جشن ازادی جمہور منانے کیلئے خلد سے روح شہنشاہ ظفر آئی ہے

MONTHLY

POONAM

HYDERABAD

ماہ نامہ

75 P.

پونم

مدیر:

ناصر کرنولی (ایم اے، عثمانیہ)

ستمبر ۱۹۶۵ء

جلد: ۲ شمارہ: ۱۲

قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

زر سالانہ: ۸ روپے

ششماہی: ۴ روپے ۵۰ پیسے

بیرون ہند سے ۲۵ شلنگ

تاعمر خریداری ۱۰۰ روپے

مقام اشاعت، ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ "پونم"

۳۰۱-۷-۱۶۰ اعظم پورہ حیدرآباد (آندھرا پردیش)

کتابت:

ادارہ حسنِ کتابت حیدرآباد

طباعت:

اعجاز پرنٹنگ پریس

وائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

گزارش	اداریہ	۳

مضامین

کاوِ تفسیر	خیر بہوروی	۴
اقبال، ژنگ کے نظریہ جمال کی روشنی میں	اصغر خانم	۷
قندیلِ حرم پر سرشار کی تقریظ	مسرت حسین آزاد	۱۰
شاہد صدیقی کی کالم نگاری	یوسف ناظم	۱۲

غزلیں

شفا گوالیاری	جرم محمد آبادی	۱۹
نصیر پرواز	حسن بخت	۲۰
محبوب اللہ مجیب	شکیل مظہری	۲۱
صابر شاہ آبادی	حبیب احمد صدیقی	۲۲

افسانے

جو [illegible]	کوثر چاند پوری	۲۳
[illegible] طوفان	آمنہ ابوالحسن	۲۷
دیو[illegible]	نعیم [illegible]	۳۱
[illegible] کی گھڑی	رفعت [illegible]	۳۵

نظمیں

ایک سال بیت گیا	شاذ تمکنت	۳۸
دو آتشہ	نریش کمار شاد	۳۹
ایک تعاقب	سید حرمت الاکرام	۴۰
قصۂ درد	عزیز تمنائی	۴۰
آنکھیں ہی آنکھیں	حکیم یوسف حسین خاں	۴۱
قرب کا فاصلہ	تاج مہجور	۴۲
دو رخ	ظہیر صدیقی	۴۲

طنز و مزاح

زعفران زار	کوہ کن	۴۳
راجہ مہدی علی خاں کے دلچسپ مشاغل	مصطفٰے علی اکبر	۴۴
جی تو عرض کیا ہے (تمثیل)	رضا الجبار	۴۷

کمندیں

انٹرویو — دیا اُس کا بھلا نہ دیا اُس کا بھلا	تیر انداز	۵۲

صنم کدے

فلمی شاعروں کی کل ہند کانفرنس	گرہچن چندن	۵۸
فلمی تبصرے	اعجاز قریشی	۶۲
عکسِ مہتاب (خطوط)	قارئین	۶۳

کرنٹ

یوم آزادی

ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزادی حاصل ہوئے اٹھارہ سال ہوچکے ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہماری سیاسی جنگِ آزادی کا ایک مرحلہ ختم ہوگیا لیکن اس کے ساتھ سماجی اور معاشی آزادی کا دوسرا صبر آزما مرحلہ شروع ہوچکا ہے۔

ہم نے جمہوریت اور سیکولرزم کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترقیاتی منصوبوں کے مطابق نئے ہندوستان کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وطن سے جہالت اور غریبی کو دور کرنے کی جدوجہد ہمارا نصب العین بن چکی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم نے دریاؤں پر بند باندھے، نت نئے پروجکٹ تعمیر کئے، فولاد کے کارخانے قائم کئے تاکہ ہمارا ملک صنعتی ضروریات کے تعلق سے خودکفیل ہوجائے۔ نیز ہم نے دنیا کے سامنے پارلیمانی جمہوریت کا ایک عمدہ نمونہ بھی پیش کیا، تمام نزاعی مسائل کے پُرامن تصفیہ کو ہم نے اپنا شعار بنالیا، تشدد اور جنگ کے خلاف آواز اٹھائی اور جوہری توانائی کے ضمن میں ہم نے امن دوستی اور بقائے باہم کے اصولوں کا پرچار کیا۔ ہم نے گاندھی جی کی تعلیمات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے پنڈت نہرو کی قیادت میں فرقہ واریت علاقائی اور لسانی تعصبات کا مقابلہ کیا، اقلیتوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کا یقین دلاتے ہوئے انھیں قومی زندگی میں پورا حصہ لینے پر آمادہ کیا۔ غرض ان اٹھارہ سال کے قلیل عرصہ میں ہم نے جو کچھ کیا اس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہندوستان نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی ہے لیکن ابھی ہمارا ملک زرعی اور صنعتی پیداوار کے اعتبار سے خودمکتفی نہیں بنا ہے اور ملک کی معاشی اور سماجی ترقی کے راستے میں ابھی بے شمار موانعات اور رکاوٹیں حائل ہیں، قدرتی وسائل کی کمی، نئے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے میں نظم و نسق کی ناکامی، تربیت یافتہ عملہ کی قلت، پیداوار کے پرانے طریقوں کا رواج یہ ساری باتیں ترقی کے مطلوبہ معیار تک پہونچنے میں مزاحم ہورہی ہیں۔ ان دشواریوں پر قابو پانے کے لئے عوام میں ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے جو ان میں ملک کی ترقی کی اہمیت اور اس کے حصول کیلئے متحد ہوکر عمل کرنے کا احساس پیدا کرسکے جب تک ہم میں اس قسم کا احساس پیدا نہیں ہوگا اور ترقیاتی منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لئے متحد ہوکر کوشش نہیں کی جائے گی۔ اس وقت تک ہمارے ملک کی رفتارِ ترقی سست ہی رہے گی۔ اگر یقین اور اعتماد کی سچی لگن کے ساتھ ترقی کے اس مقدس کام کی رفتار میں تیزی پیدا نہ کی گئی تو مستقبل میں ہماری یہ آزادی بے معنی ہوکر رہ جائے گی اور پنڈت نہرو کا وہ خواب جو نئے ہندوستان کی تشکیل سے عبارت ہے کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

آئیے آج ہم یہ عہد کریں کہ جب تک زندگی ہے، پنڈت نہرو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے، ان کے نظریات کو اپناتے ہوئے ملک کی سالمیت، قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ اتحاد کے ساتھ امن عالم کے لئے بقائے دوام کی تحریک کی پیش رفت میں ہمہ تن معروف رہیں گے تاکہ پنڈت جی کی آتما کو شانتی حاصل ہوسکے (ادارہ)

● اس بار اس شمارہ میں "شاہد صدیقی کی کالم نگاری" کے تعلق سے یوسف ناظم کا مضمون اور شاہد پرشاد تمکنت کی نظم شائع کی جارہی ہے شاہد صدیقی کو ہم سے بچھڑے ہوئے پورے تین سال کا عرصہ ہوتا ہے لیکن اب تک شاہد کی ادبی خدمات کو کوئی مناسب خراج عقیدت پیش نہیں کیا گیا ۔۔۔ ادارہ "پونم" کی جانب سے مستقبل میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حرفِ اوّلیں — ادارہ

مضامین

کارِ تعمیر — خیر بہوروی — ۳

اقبال ژنگ کے نظریۂ جمال کی روشنی میں — اصغر خانم — ۷

قندیلِ حرم پر سرشار کی تقریظ — مسرت حسین آزاد — ۱۰

شاہد صدیقی کی کالم نگاری — یوسف ناظم — ۱۲

غزلیں

شفا گوالیاری — جرم محمد آبادی

نصیر پرواز — حسن بخت

محبوب اللہ مجیب — شکیل مظہری

صابر شاہ آبادی — حبیب ا…

افسا…

جوشِ مظہر

تیسرا طوفان

دیوار

فیصلے کی گھڑی

نظ…

ایک سال بیت گیا

اقبال

ینگ کے نظریہ جمال کی روشنی میں

ینگ کی بین الاقوامی شہرت ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے ہے لیکن اس نے ادب، جمالیات اور مذہب پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

فرائیڈ اور اس کے ہم خیال ماہرین کی رائے میں فن کے تمام شاہکار علامات مرض ہی کا مسئلہ ہیں لیکن ینگ نے اس کے برخلاف یہ کہا کہ اس تجزیے میں آرٹ کے شاہکاروں کا اتنا مطالعہ نہیں ہوتا جتنا خود فن کار کے نفسی میلان کا۔ یعنی یا تو ہم کو آرٹ کی تخلیق پر توجہ کرنی پڑے گی یا فن کار پر۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے فن کار کے ادراک (Vision) میں جو مواد ظاہر ہوتا ہے وہ اصل میں اجتماعی لاشعور سے متعلق ہے۔

ینگ نے اس اجتماعی لاشعور کے وجود پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے اس کے خیال میں انسانی ذہن شخصی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر ماورائے شخصی عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ ہمارا شعور (Consciousness) انفرادیت کا ضامن ہے۔ من و تو کا فرق اسی کی پیداوار ہے۔ اسی سے مختلف نا چاقیاں پیدا ہوتے ہیں اور لاشعور ——————— اتحاد کا علمبردار ہے۔ اس کے وجود سے پتہ چلتا ہے کہ افراد الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں۔ یہ ینگ کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جہاں اس نے یہ بتلانے کی کوشش کی کہ آرٹ بھی جس کو اب تک شخصی سمجھا جاتا رہا ہے اپنا حسن و قیمت صرف شخصیت کی ترجمانی میں نہیں رکھتا بلکہ شخصیت کے تنگ بندھنوں کو منقطع کرنے میں بھی اس کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا آرٹ شخصیت کا عکس نہیں بلکہ مجبور ہے۔ چنانچہ لاشعور کے یہ اجتماعی [illegible] [illegible] میں

[illegible] کی تحریک کی بدولت اور خود شعرا ادیب ہیں
[illegible] تھے اب بے بنیاد معلوم ہونے
[illegible] کہ اس کے مشہور شعراء
[illegible] دن رات ان کے
[illegible] ہر ذہن اپنی توفیق کے
[illegible] مطالب اور تشریحات
[illegible] ہمارے لئے غیر ضروری تھی
[illegible] تشریحات، تنقیدیں
[illegible] تشریح متن سے اہم تر
[illegible] وہ زمانہ
[illegible] اقبال پر بہت زیادہ کچھ
[illegible] اقبال کے تعلق سے
[illegible] دوسرے کی

[illegible]
[illegible] کے

(مسلسل)

خیر بہوروی

کارِ خیر

میں علیگڈھ کی مرحوم انجمن ترقیٔ اردو کا اسسٹنٹ سکریٹری تھا اور نجی طور پر "مرقع غالب"[1] مرتب کر رہا تھا تو بابائے اردو کو مرزا غالب کی تصویر کے لئے لکھا تھا۔ میرے خط کے جواب میں مرحوم نے جو مکتوب تحریر فرمایا تھا اس کی نقل مطابق اصل درج کرتا ہوں، خط پر مورخہ کی جگہ سہواً خالی ہے۔ لفافے پر علیگڈھ کے ڈاک خانے کی جو مہر ہے اس میں ۵۷-۱۰-۲۱ - ۹ - ۷ - ایم صاف پڑھا جاتا ہے۔

حوالہ نمبر ـــــــــــ

مورخہ ـــــــــــ

فون نمبر ۳۲۷۸۴

کل پاکستان انجمن ترقیٔ اردو

اردو روڈ کراچی - ۱

مشفقی و مکرمی خیر بہروی صاحب سلمہ

آپ کا خط پہونچا۔ میرے پاس مرزا غالب کی اصل اور صحیح تصویر تھی لیکن سال گزشتہ میرے ایک دوست جو لندن میں مقیم ہیں اور غالب کے شوقین ہیں مجھ سے بڑے اصرار سے ضد کرکے لے گئے اور کہا کہ وہاں کے کسی اچھے مصور سے اس کی دو چار نقلیں کروا دوں گا اور ایک آپ کو بھیج دوں گا۔ ابھی تک وعدہ وفا نہیں کیا۔ البتہ ایک دوسری تصویر کا فوٹو موجود ہے اور ایک روغنی تصویر بھی ہے۔ اگر آپ کہیں تو اس کا فوٹو بھجوا دوں۔ یہ کام آپ خوب کر رہے ہیں۔

یہ معلوم کرکے مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ انجمن سے مستعفی ہو گئے ہیں[2]۔ اب کیا ارادہ ہے؟ گزربسر کیلئے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیئے۔

خیر طلب

عبدالحق

---

[1] مرقع غالب میں مرزا غالب کی مروجہ تصویریں تحقیق اور تاریخ کی روشنی میں شائع کی گئی ہیں۔ اس کا ہندی ایڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ "غالب چترا ولی" کے نام سے غالب اکاڈمی بنارس نے شائع کیا ہے۔

[2] میں نے استعفےٰ آل احمد سرور کی وجہ سے دیا تھا جس کی تفصیل اور انجمن کے دوسرے حالات کتابچے کی صورت میں مرتب کر رہا ہوں۔

ماہنامہ پونم حیدرآباد   ستمبر ۱۹۶۵ء

ذیل کا مکتوب مرقع غالب کی رسید ہے

فون نمبر ۳۲۷۸۴
کل پاکستان انجمن ترقی اردو
اردو روڈ کراچی ۔ ۱

مورخہ ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء   نمبر ـــــــ

عزیزم خیر بہوروی سلمہ اللہ تعالیٰ   مرقع غالب پہنچا۔ سبحان اللہ کیا کام کیا ہے۔ تمھارے حسنِ ذوق، تلاش اور محنت کی داد نہ دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ تم نے 'غالب[1] ان سائی کلوپی ڈیا' کا کام اپنے سر لیا ہے۔ یہ بڑا مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تم اسے تکمیل کو پہنچا کے رہوگے۔ تم تو نہیں رہوگے مگر تمھاری یہ یادگار ہمیشہ زندہ رہے گی اور اصحاب ذوق کو تمھاری یاد دلاتی رہے گی۔

سرورق پر جو تصویر دی گئی ہے وہ غالب کی نہیں محض اس وجہ سے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے دلّی کے ایک بازار میں خریدی تھی۔ غالب کی مصدقہ تصویر کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے ہرگز سرورق پر نہ لگانا۔ غالب کی اصل تصویر وہی ہے جو میں نے رسالۂ اردو میں شائع کی تھی۔ سب سے آخر میں جو تصویر ہے وہ لکھنؤ کے کسی رئیس زادے کی معلوم ہوتی ہے۔ اسے غالب سے منسوب کرنا بدذوقی کی دلیل ہے۔ جو تصویر میرے ایک دوست امریکہ لے گئے وہ وہی ہے جو اردو میں شائع ہوئی تھی۔ مصور نے اصل تصویر سامنے رکھ کر بنائی تھی اور اصل میں جو رنگ مٹے ہوئے تھے اس نے اپنی تصویر میں اجاگر کر دیئے تھے۔ افسوس وہ واپس نہیں آئی۔ باقی دو تصویریں جو میرے پاس ہیں وہ وہی ہیں جو تمھارے مرقع میں موجود ہیں۔

میری تصویر لے کر تم کیا کروگے۔ پہلے ایک بھیج تو چکا ہوں۔ میرے پاس اپنا کوئی فوٹو نہیں۔ پہلے جو بھیجا تھا وہ بھی ایک دوست سے لے کر بھیجا تھا۔ لوگ آتے ہیں تصویریں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ میں نے ان سے کبھی کوئی نقل نہیں طلب کی۔ اب تمھارے لئے خاص اہتمام کرنا پڑے گا۔ تمھیں میرے سامنے اپنے آپ کو بڈھا[2] کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں تو تمھیں بچہ ہی سمجھتا ہوں۔

تم میرے حالات معلوم کرنا چاہتے ہو میں "انجمن ترقی اردو کا المیہ" ایک نسخہ بھیجتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوگا۔ میرے حالات کیا ہیں اور مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ بھارت میں مردود اور پاکستان میں مطعون۔ آزاد ہند کلکتہ کے ایڈیٹر علامہ[3] ملیح آبادی نے اپنے اخبار میں تحریر فرمایا تھا کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان عبدالحق نے پہنچایا۔ اختر[4] آنجہانی (نام بھول گیا) جو شاعر تھے اور زمرۂ شعراء میں بہت مقبول، انھوں نے بھی اپنے مضمون میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ سچ ہے اردو کا دشمن مجھ سے زیادہ کون ہوگا۔ اب معلوم ہوا کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی کہ اردو کے پیچھے اپنی عمر عزیز ضائع کی، اپنی دولت، اپنا دماغ، اپنی توانائی اس کی نذر کی۔ اب اس غلطی کی سزا بھگت رہا ہوں۔

عیب نکلا جو ہنر پیدا کیا   ہم نے کھویا جس قدر پیدا کیا

---

[1] "غالب ان سائی کلوپی ڈیا" کی ترتیب تقریباً مکمل ہے   [2] مولوی صاحب کی تصویر کے سلسلے میں لکھا تھا کہ یہ بوڑھے بچے کی ضد ہے، اسے تو پورا کرنا ہی پڑے گا۔   [3] عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم

[4] پنڈت ہری چند اختر۔ ہند سرکار کے وظیفہ خوار تھے۔

تم نے اب تک جو کیا سو کیا، آئندہ کو ایسی حماقت نہ کرنا۔ میری زندگی سے سبق حاصل کرو ——— من نہ کردم شما حذر بکنید ——— ورنہ پچھتاؤ گے۔ اور یہ دوسری حماقت ہوگی۔

تم میری درازیٔ عمر کی دعا نہ مانگا کرو۔ میں زندگی سے بیزار ہوں۔ اس زمانے میں کثرتِ اولاد اور درازیٔ عمر عذابِ الیم ہیں۔ خدا ہر شریف آدمی کو اس عذاب سے بچائے۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور خوش حالی اور اطمینان عطا فرمائے۔ میں تمہارے خلوص وفاداری اور محبت کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

خیر طلب
عبدالحق

(یہ خط مجھے کان پور میں معرفت جاوید اینڈ کو، وصول ہوا تھا۔ میں ہیلٹ اسپتال کان پور میں داخل تھا اور حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔)

اصغر خانم
ایم اے پی ایچ ڈی

اقبال
یُنگ کے نظریہ جمال کی روشنی میں

یہ خیال کہ بڑے فن کار کی قدر نہیں کی جاتی اور خود شعراء اور ادیبوں کے گلے کہ انہیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے، اب بے بنیاد معلوم ہونے لگے ہیں۔ دوسری زبانوں کا ذکر نہیں، صرف اردو زبان ہی کو لیں کہ اس کے مشہور شعراء اور ادیب کس طرح قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دن رات ان کے فن پر تحقیقی کام ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی زندگی پر اور کلام پر ہر ذہن اپنی توفیق کے مطابق کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے۔ ایک ایک شعر اپنے ہزارہا مطالب اور تشریحات کے ساتھ اس طرح ہمارے ساتھ رہتا ہے کہ شاعر کی شخصیت ہمارے لئے غیر نہیں رہتی۔ یہی حال اقبال کی شخصیت اور اس کی تخلیق کا رہا ہے۔ بے شمار تشریحات، تنقیدیں اور مقالے لکھے گئے ہیں کہ بعض وقت شبہ ہونے لگتا ہے کہ تشریح متن سے اہم بن کر رہ گئی ہے۔ اقبال کے کلام کی ایک ایک رگ کا ڈیسکشن ہو چکا ہے اور اب وہ زمانہ ہے کہ صرف جراح کی چابک دستی پر نظر رہنے لگی ہے۔ چنانچہ اقبال پر میں زیادہ کہنے کی جرأت اس لئے بھی نہیں کر سکتی کہ حاضرین میں سے تقریباً ہر فرد اقبال کے تعلق سے مجھ سے زیادہ گہری نظر رکھتا ہے لیکن یہ انسانی فطرت کی خامی ہے کہ وہ دوسرے کی بات بھی سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

چنانچہ اقبال کے کلام کا جو مختصر سا خاکہ یہاں کھینچا گیا ہے وہ ادبی نقطۂ نگاہ سے اتنا اہم نہیں جتنا کہ نفسیاتی اعتبار سے خصوصیت سے ڈاکٹر سی، جی یُنگ کے نظریہ جمال کی روشنی میں۔

یُنگ کی بین الاقوامی شہرت، ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے ہے لیکن اس نے ادب، جمالیات، و مذہب پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

فرائیڈ اور اس کے ہم خیال ماہرین کی رائے میں فن کے تمام شاہکار علاماتی ہی کا مسئلہ ہیں لیکن یُنگ نے اس کے برخلاف یہ کہا کہ اس تجزیے میں آرٹ کے شاہ کاروں کا اتنا مطالعہ نہیں ہوتا جتنا خود فن کار کے نفسی میلان کا۔ یعنی یا تو ہم کو آرٹ کی تخلیق پر توجہ کرنی پڑے گی یا فن کار پر۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے فن کار کے ادراک (Vision) میں جو مواد ظاہر ہوتا ہے وہ اصل میں اجتماعی لاشعور سے متعلق ہے۔

یُنگ نے اس اجتماعی لاشعور کے وجود پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے اس کے خیال میں انسانی ذہن شخصی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر ماورائے شخصی عناصر بھی کار فرما تے ہیں۔ ہمارا شعور (Consciousness) انفرادیت کا ضامن ہے۔ من و تو کا فرق اسی کی پیداوار ہے۔ اسی سے مختلف نا اتفاقیاں پیدا ہوتی ہیں اور لاشعور ———— اتحاد کا علمبردار ہے۔ اس کے وجود سے پتہ چلتا ہے کہ افراد الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں۔ یہ یُنگ کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جہاں اس نے یہ بتلانے کی کوشش کی آرٹ بھی جس کو اب تک شخصی سمجھا جاتا رہا ہے اپنا حسن و قیمت صرف شخصیت کی ترجمانی میں نہیں رکھتا بلکہ شخصیت کے تنگ بندھنوں کو منقطع کرنے میں بھی اس کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ لہٰذا آرٹ شخصیت کا عکس نہیں بلکہ عبور ہے۔ چنانچہ لاشعور کے یہ اجتماعی مظاہر جب کہ شاعر میں

[illegible] عام انسانی آلام و اضطراب [illegible]

[illegible] کی شکایت صرف اس کا اپنا ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک عام ا[illegible]

[illegible] فن کار کے نزدیک شخصی کارٹ میں بھی غیر شخصی عنصر پیدا ہو جاتا ہے جو دوسر[illegible] [illegible] غیر نہیں رہ سکتی۔ جہاں تاریخی اوراق کسی پُر درد واقعہ کو پُر اثر بنانے میں ناکام رہتے ہیں وہاں ایک چھوٹا سا شعر اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے کہ خون کے آنسو رلا دے۔ غالب کا ایک شعر ہماری آنکھیں نم کر سکتا ہے، عروج و زوال، انسانی بے بسی کے اس قوام میں ہم کو تڑپا دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے تاریخی حیثیت سے یہ المیہ ایک معمولی واقعہ کی طرح ہماری نظر سے گزر جائے گا۔

مختصر یہ کہ فن کار کے فن کی توجیہ اس کی شخصی زندگی سے ممکن نہیں اور فائدہ مند نہیں۔ فن کار بہ حیثیت شخص کے سامنے آ سکتا ہے، بہ حیثیت فن کار کے نہیں کیونکہ ہر تخلیقی شخصیت ایک ثنویت (DUALITY) رکھتی ہے یعنی اس میں دو متضاد رجحانات کارفرما ہوتے ہیں۔ فن کار ایک طرف تو آدمی ہے جس کی اپنی شخصی زندگی ہے تو دوسری طرف ایک غیر شخصی تخلیقی عمل۔ بہ حیثیت آدمی وہ تندرست بھی ہو سکتا ہے اور مریض بھی۔ لیکن اس کا فن صرف اس کی فنی تخلیق ہی میں دیکھا جا سکتا ہے اور وہ فنی تخلیق غیر شعوری اجتماعی مظاہر کا نتیجہ ہے۔ آرٹ ایک جبلی میلان ہے جب وہ آدمی پر تسلط پا لیتا ہے تو اس کو ایک آلے کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ فن کار اپنے ذاتی مقاصد کی تلاش میں نہیں رہتا بلکہ آرٹ کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کے مقاصد کو اپنے وسیلے سے پورا کرنے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اسے اپنی ذاتی خوشی اور مسرت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ فن کار کی زندگی شخصی [illegible]

[illegible] بہت سے تضادات انسانی [illegible]

اس طرح فن کار کا کام اس کے سماج کی روحانی ضرورت کو پورا کرنا [illegible] کا فن اس کے شخصی مقصد سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یونگ کے اس نظریہ [illegible] فن کہاں تک پورا اترتا ہے۔ یہ ہم پر واضح ہے یعنی اقبال اپنے عوام کی [illegible] سیاسی لاشعوری تمنا سے واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ پرانے اقدار فنا [illegible] ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ ایک نصب العین کیر کٹر کی ضرورت تھی جو صحیح را[illegible] [illegible] ہے بلکہ جس کی نگاہ سے انسانوں کی تقدیریں بدل جائیں [illegible] وہ مرد کامل اور مرد مومن کا نام دیتا ہے لیکن درحقیقت یہ اسی [illegible] [illegible] (OLD WISE MAN) [illegible]

[illegible]

تیں ایسی نہیں ہیں جن سے کسی قوم کا ابھار ہو سکے ۔

جہاں ہیں الہوا یاں اس وقت خورشید چھپتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

جہاں تک خدا اور مذہب کا تعلق ہے اقبال کے پاس ایک مخصوص رجحان ہے ۔ غالباً یہ اس کے ارادے اور عقل کی پیداوار ہے کیونکہ اس نے ایک مخصوص مذہبی ماحول میں پرورش پائی اس لئے وہ اپنے مذہبی آرچ ٹائپ کو اسلامی تصورات کی روشنی میں ترجمانی کرتا ہے اور اس کے فکر و نظر کا یہی وہ رجحان ہے جس کے باعث اس کی وجہ بھی عام طور پر ایک متعین اور مخصوص مذہبی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے ۔ حالانکہ حسن حقیقی ہی کا قدیم اجتماعی مظہر شاعر کے تخیل میں نمودار ہوتا ہے ۔ یاد رہے کہ وہ اپنے مخصوص مذہبی عقاید ہی کو اس کو ڈھال لے ۔ مذہب سے وہ بنیادی قدر اور تجربہ مراد ہے جہاں آدمی کی نظر محسوسات کی دنیا پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ماورا کا بھی شعور رکھتی ہے اور سرحد ادراک سے پرے جانے کی طرف مائل ہوتی ہے ۔ مذہب ہی کے سائے میں بڑے سے بڑا آرٹ پھولا اور پھلا ہے ۔ حسن و جمال اور دوسرے اقدار میں ہم کو ایک لامحدود حسن کا احساس ہوتا ہے ۔ ازل سے ہی انسان کی روح ایک کلی حقیقت اور حسن کی تلاش میں سرگرداں ہے ۔ یہ الگ بحث ہے کہ اقبال نے فنائے ذات کے تصور کو سختی کے ساتھ رد کیا اور اس کے عشق میں سپردگی نہیں ہے ۔ بحث و مباحثے میں عقل پس

کہ حسن و عشق کے اس خوبصورت تانے بانے کو اس نے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور سچ پوچھئے تو بعض جگہ اس کا یہ انداز بے حد کھلتا ہے خصوصاً جب وہ خدا سے بحث کرتا نظر آتا ہے " تو شب آفریدی چراغ آفریدم" والی الجھنوں سے تو اقبال کا ہر پڑھنے والا واقف ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال کے آرٹ کی بے ساختگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ وہ عقل سے ہر گتھی کو سلجھاتا ہے اور پھر اپنے آپ کو وجدان کا تابع بھی سمجھتا ہے ۔ عقل کی بے بسی پر عقلی طور پر روتا ہے ۔ یہ تحلیلی اور توجیہی نقطۂ نگاہ اپنی جگہ حسن ضرور رکھتا ہے لیکن ینگ کے نظریۂ جمال کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ۔ حسن کا یہ جلالی پہلو قابل تعریف ہے اس سے جوش اور ولولے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اس سے حیات کے لطیف احساسات کی پوری ترجمانی نہیں ہوتی ۔

فن کار خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اپنے اندر حدود رکھتا ہے ۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان حدود کے اندر اس کا کیا مرتبہ ہے ۔ اس لحاظ سے اقبال کے فن میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اونچے فن کار کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں ۔ اس کے آرٹ میں وقت کے تقاضوں کا جواب ہے ۔ اس کے اندر ایک مردہ قوم کو جگانے کی بھر پور صلاحیت موجود ہے ۔ گو اس کا نقطۂ آغاز ایک مخصوص جماعت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے ۔ لیکن اس کے فکر و نظر کی منتہا ہم کو زماں و مکاں کی تحدیدات سے ماورا لے جاتی ہے ۔ ●

جلوہ گر ہوتے ہیں تو ان کی عمومیت ہمہ گیر اور آفاقی ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ہماری پریوں کی کہانیاں بھی ہے۔ جن کے کردار دنیا کی ہر زبان میں کم و بیش ملتے ہیں۔ نیک اور مہربان بھوت بچے، ساحروں کو راہ دکھانے والے بزرگ، نفرت اور بغض کی مظہر بدصورت جادوگرنی جیسے کردار آج بھی ہم کو لبھاتے ہیں۔ چنانچہ ہر دور میں فن کار کے تخیل میں یہ لاشعوری ہیولے جنھیں ینگ "آرچ ٹائپ" کا نام دیتا ہے، جگہ پاتے ہیں۔ ادب اور شعر انسانی زندگی سے ماخوذ ہے۔ اس کو صرف شخصی عوامل ہی کا تابع نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح ہے کہ فن کار کی اپنی زندگی اسے متاثر ضرور کرتی ہے لیکن ایک حد تک ... کا انفرادی رنگ، جب مستقل ہو جاتا ہے تو وہ عام انسانی آلام و اضطراب کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ زمانے کی ناقدری کی شکایت صرف اس کا اپنا ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک عام اجتماعی احتجاج ہوتا ہے اور فن کار کے نزدیک شخصی آرٹ میں بھی غیر شخصی انداز پیدا ہو جاتا ہے جو دوسروں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جہاں تاریخی اوراق کسی بڑے واقعہ کو پر اثر بنانے میں ناکام رہے ہیں وہاں ایک چھوٹا سا شعر اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے کہ خون کے آنسو رلا دے۔ ظفر کا ایک شعر ہماری آنکھیں نم کر سکتا ہے، عروج و زوال، انسانی بے بسی کے ان گنت پہلو ہم کو تڑپا دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے تاریخی حیثیت سے یہ المیہ ایک معمولی واقعہ کی طرح ہماری نظر سے گذر جائے گا۔

مختصر یہ کہ فن کار کے فن کی توجیہ اس کی شخصی زندگی سے ممکن نہیں اور فرائڈ کا یہ دعویٰ شاید فن کار پر بہ حیثیت شخص کے صادق آ سکتا ہے، بہ حیثیت فن کار کے نہیں کیونکہ ہر تخلیقی شخصیت ایک ثنویت (DUALITY) رکھتی ہے یعنی اس میں دو متضاد رجحانات کارفرما ہوتے ہیں۔ فن کار ایک طرف تو آدمی ہے جس کی اپنی شخصی زندگی ہے تو دوسری طرف ایک غیر شخصی تخلیقی عمل۔ بہ حیثیت آدمی وہ تندرست بھی ہو سکتا ہے اور مریض بھی۔ لیکن اس کا فن صرف اس کی فنی تخلیق ہی میں مل سکتا ہے اور وہ فنی تخلیق غیر شعوری اجتماعی مظاہر کا نتیجہ ہے۔ آرٹ ایک جبلی رجحان ہے جب وہ آدمی پر تسلط پا لیتا ہے تو اس کو ایک آلے کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ فن کار اپنے ذاتی مقاصد کی تلاش میں نہیں رہتا بلکہ آرٹ کو اجازت دے دیتا ہے کہ وہ اس کے مقاصد کو اپنے وسیلے سے پورا کرنے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اسے اپنی ذاتی خوشی اور مسرت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ فن کار کی زندگی کشمکش کی آماجگاہ ہے بلکہ اسے ایک طرح سے حزنیہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اسے

ان کی شخصی پہلوؤں میں پستی کا احساس ہوتا ہے، جسے دور کرنے کے لئے وہ ماضی کا غیر شعوری طور پر سہارا لیتا ہے اور اپنے تخیل میں ایک رہبر اور رہنما کو دیکھتا ہے جو ساری قوم کے لئے خضر راہ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ گوئٹے اور اقبال نے بھی اسی ابتدائی تمثال یا آرچ ٹائپ کا سہارا لیا یعنی ایک معلم انسانیت، مرد دانا اور نجات دہندہ کا تصور ابتدائے کلچر سے آدمی کے لاشعور میں خفتہ ہے اور یہ اسی وقت بیدار ہوتا ہے جب زمانے میں انتشار پھیل جائے، فکر و نظر کی طنابیں کھینچ جائیں اور قوت عمل مفلوج ہو جائے۔ ایسے نازک وقت میں فن کار اپنے تخیل کے ذریعے اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس کا آرٹ انسانوں کے لئے حیات نو کا پیغام بن جاتا ہے۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے تمثالات انسانی ذہن میں مستتر طور پر پائے جاتے ہیں۔

اس طرح فن کار کا کام اس کے سماج کی روحانی ضرورت کو پورا کرنا ہے اس کا فن اس کے شخصی مقصد سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ینگ کے اس نظریے پر اقبال کا فن کہاں تک پورا اترتا ہے۔ یہ ہم پر واضح ہے یعنی اقبال اپنے اطراف کی سماجی اور سیاسی لاشعوری تمنا سے واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ پرانے اقدار فنا ہو رہے ہیں اور نئے ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ ایک نصب العین کیرکٹر کی ضرورت تھی جو صحیح راستہ بتانے والا نڈر اور بے باک ہو جس کی نگاہ سے انسانوں کی تقدیریں بدل جائیں ایسے انسان کو وہ مرد کامل اور مرد مومن کا نام دیتا ہے لیکن درحقیقت یہ اسی مرد دانش ______ (OLD WISE MAN) کی لاشعوری کارفرمائی ہے۔ یہ اقبال کی ذہانت ہی تھی جس نے اس کردار کو جلالی روپ دیا، اس لئے کہ اس وقت جبکہ صدیوں کی غلامی نے فکر و نظر میں جمود پیدا کر دیا تھا، نرم و نازک جملے کارگر نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک تازیانے کی ضرورت تھی جو ساری سستی اور ماندگی کو ختم کر دے حرکت اور عمل پر مجبور کرے۔

ینگ نے آرٹ کی جو تعریف کی ہے، اقبال اس پر اکثر جگہ پورا اترتا ہے صرف عمل و حرکت کے دائمی اقدار ہی نہیں بلکہ دوسری بے شمار حقیقتیں اس کے یہاں اسی خوبصورتی سے جلوہ افروز ہیں۔ موت ایک ابدی حقیقت ہے اس پر اس کا مرثیہ ایک لافانی شاہکار ہے اور پھر امید اور زندگی کی ہر لمحہ نگارنگی پر جو حقائق اس نے بیان کئے ہیں وہ دنیا کے ہر انسان کو متاثر کر سکتے ہیں۔ موت ہی زندگی کے سارے اقدار کا منتہا نہیں ــــ زندگی انفرادی موت سے ختم نہیں ہو جاتی۔ امید و رجا کی

جاوداں حقیقتیں ایسی نہیں ہیں جن سے کسی قوم کو انکار ہو سکے ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

جہاں تک خدا اور مذہب کا تعلق ہے اقبال کے پاس ایک مخصوص رجحان ملتا ہے ۔ غالباً یہ اس کے ارادے اور عقل کی پیداوار ہے کیونکہ اس نے ایک مخصوص مذہبی ماحول میں پرورش پائی اس لئے وہ اپنے مذہبی آرچ ٹائپ کو اسلامی تصورات کی روشنی میں ترجمانی کرتا ہے اور اس کے فکر و نظر کا یہی وہ رجحان ہے جس کے باعث اس کی توجیہ بھی عام طور پر ایک متعین اور مخصوص مذہبی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے ۔ حالانکہ حسن حقیقی ہی کا قدیم اجتماعی مظہر شاعر کے تخیل میں نمودار ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے مخصوص مذہبی عقاید میں اس کو ڈھال لے ۔ مذہب سے وہ بنیادی قدر اور تجربہ مراد ہیں جہاں آدمی کی نظر محسوسات کی دنیا پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ماورا کا بھی شعور رکھتی ہے اور سرحدِ ادراک سے پرے جانے کی طرف مائل ہوتی ہے ۔ مذہب ہی کے سائے میں بڑے سے بڑا آرٹ پھولا اور پھلا ہے ۔ حُسن و جمال اور دوسرے اقدار میں ہم کو ایک لامحدود حُسن کا احساس ہوتا ہے ۔ ازل سے ہی انسان کی روح ایک کلّی حقیقت اور حسن کی تلاش میں سرگرداں ہے ۔ یہ الگ بحث ہے کہ اقبال نے فنائے ذات کے تصور کو سختی کے ساتھ رد کیا اور اس کے عشق میں سپردگی نہیں ہے ۔ بحث و مباحثے میں مَیں پر حسن و عشق کے اس خوبصورت تانے بانے کو اس نے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور سچ پوچھئے تو بعض جگہ اس کا یہ انداز بے حد کھلتا ہے خصوصاً جب وہ خدا سے بحث کرتا نظر آتا ہے " تو شب آفریدی چراغ آفریدم " والی الجھنوں سے تو اقبال کا ہر پڑھنے والا واقف ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال کے آرٹ کی بے ساختگی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ وہ عقل سے ہر گتھی کو سلجھاتا ہے اور پھر اپنے آپ کو وجدان کا تابع بھی سمجھتا ہے ۔ عقل کی بے بسی پر عقلی طور پر روتا ہے ۔ یہ تحلیلی اور توجیہی نقطہ نگاہ اپنی جگہ حسن ضرور رکھتا ہے لیکن ینگ کے نظریۂ جمال کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ۔ حسن کا یہ جلالی پہلو قابلِ تعریف ہے اس سے جوش اور ولولے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اس سے حیات کے لطیف احساسات کی پوری ترجمانی نہیں ہوتی ۔

فن کار خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اپنے اندر حدود رکھتا ہے ۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان حدود کے اندر اس کا کیا مرتبہ ہے ۔ اس لحاظ سے اقبال کے فن میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اونچے فن کار کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں ۔ اس کے آرٹ میں وقت کے تقاضوں کا جواب ہے ۔ اس کے اندر ایک مردہ قوم کو جگانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے ۔ گو اس کا نقطۂ آغاز ایک مخصوص جماعت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے لیکن اس کے فکر و نظر کی منتہا ہم کو زماں و مکاں کی تحدیدات سے ماوراء لے جاتی ہے ۔ •

مسرت حسین آزاد

قندیلِ حرم پر سرشار کی تقریظ

قندیلِ حرم نواب کلب علی خاں کی ایک تاریخی تحریر ہے جسے ۱۲۸۹ھ میں زیارتِ مدینہ سے مشرف ہو کر فارسی زبان میں نذرِ عقیدت کے طور پر پیش کیا ہے اور ۱۲۹۰ھ میں یہ تحریر قندیلِ حرم کے نام سے مطبع حسنی رامپور نے کتابی شکل میں شائع کی۔ پریس سے نکل کر یہ مختصر سی تصنیف ملک کے مشہور علماء، ادبا اور شعرا کے ہاتھوں میں پہونچی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی اس کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا اور جذبات سے بھرپور ایک تقریظ لکھ کر نواب صاحب کی خدمتِ عالی میں ارسال کی۔

قندیلِ حرم پر سرشار کی یہ تقریظ آج تک رضا لائبریری کے قلمی ذخیرہ میں موجود ہے۔ ریسرچ اسکالر آئے دن اس لائبریری میں آتے ہی رہتے ہیں۔ خصوصاً اردو فارسی اور عربی کے سلسلے کے اسکالروں کے واسطے تو اس کتب خانہ سے استفادہ کرنا ناگزیر ہی ہے لیکن سرشار پر جن حضرات نے پی، ایچ، ڈی کے سلسلے میں تحقیقی مقالے لکھے ہیں، غالباً ان سے چوک ہوئی۔ اگر وہ اپنے اس عظیم علمی کام کے دوران اس تقریظ پر بھی نظر ڈالتے تو اس طرح سرشار کی ابتدائی تحریر کا ایک نمونہ ان کے ہاتھ آجاتا۔

جس زمانے میں نواب کلب علی خاں کی کتاب قندیلِ حرم شائع ہوئی تھی اس وقت سرشار لکھیم پور کے گورنمنٹ اسکول میں ماسٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، ان کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تیس برس ہو سکتی ہے کیونکہ ان کا انتقال ۱۹۰۳ء میں ہوا تھا اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۵ یا ۵۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔ قندیلِ حرم کا سالِ اشاعت ۱۸۷۳ء ہے۔ اس لئے قندیلِ حرم کی اشاعت کے وقت سرشار کی عمر لگ بھگ تیس[۳] سال ہی ہوگی۔ اُن کا مشہور فسانہ "فسانۂ آزاد" ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء کے بیچ اودھ اخبار میں قسط وار شائع ہوا جو اُن کے فن کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف ہیں لیکن یہ تمام تر کام فسانۂ آزاد کے بعد کا ہے۔ سیر کہسار، جامِ سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، ہشو، کرم دھم، بچھڑی ہوئی دلہن، طوفانِ بے تمیز، گورِ غریباں (ناتمام)، چنچل نار (ناتمام) وغیرہ تمام ہی فسانۂ آزاد کے بعد تصنیف کی گئیں۔ شمس الضحیٰ جو ایک انگریزی علمِ طبیعی کے سلسلے کی کتاب کا ترجمہ ہے، وہ بھی "فسانۂ آزاد" کے زمانے کی کوشش ہے۔ گویا فسانۂ آزاد سے پہلے سرشار کا کوئی علمی کارنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ سرشار نے جس زمانے میں قندیلِ حرم پر تقریظ لکھی تھی اس وقت ان کا کوئی ادبی مقام نہ تھا۔ ان کی شہرت کا زمانہ اودھ اخبار کی ایڈیٹری سے شروع ہوتا ہے جو ۱۸۷۸ء کی بات ہے اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے یہ تقریظ قندیلِ حرم کی اشاعت

کے فوراً بعد نہیں بلکہ اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے زمانے میں لکھی ہوگی۔ نواب کلب علیخان کا انتقال ۱۸۷۷ء میں یعنی سرشار کی اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے زمانے سے ایک سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے لازم ہے کہ یہ تقریظ تقریباً ۱۸۷۸ء سے پہلے ہی لکھی گئی ہو۔

سرشار کی تقریظ پر لکھنے سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ قندیلِ حرم اور اس کے مصنف کے متعلق بھی مختصر طور پر کچھ نہ کچھ لکھا جائے قندیلِ حرم کے سنہ اشاعت اور مطبع کا تذکرہ اوپر ہی آچکا ہے۔ یہاں اتنا اور عرض کر دوں کہ یہ مختصر سی کتاب کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۱۳ تک نثر ہے اس کے بعد صفحہ ۱۴ سے صفحہ ۲۰ تک امیر مینائی کی تقریظ ہے۔ صفحہ ۲۰ سے ۲۴ تک نقل خط شیخ الحرم و محافظ منورہ السیر محمد خالد پاشا کہ بزبان ترکی " ساری تعریفوں سے مملو و جواب از ریاست، پھر ترجمہ حجاز اور صاحب حجاز سے خطاب کے بعد آخری صفحہ میں عرض حال ہے یا رسول اللہ یہ سایہ دامانِ رحمت ارباب معصیاں سر بہ گریباں (آمادہ ام) دنیا و ما فیہا۔

نواب صاحب نے نثر میں اور بھی کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے نام یہ ہیں: بلبلِ نغمہ سنج، قصہ مہر و ماہ جاہ، ترانۂ غم اور شگوفۂ خسروی ـــ شاعری میں نواب تخلص کرتے تھے اور امیر مینائی سے شورۂ سخن تھا۔ اردو کلام چار دیوانوں پر اور فارسی کلام ایک دیوان پر مشتمل ہے۔ دیوان اول نشید خسروانی، دیوان دوم دستنبوے خاقانی سوم درۃ الانتخاب، چہارم توقیع سخن، فارسی دیوان کا نام تاج فرخی ہے۔

عام طور سے نوابوں اور بادشاہوں کے ادبی کارناموں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے کارناموں سے منسوب کر دیا جائے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اکثر رئیسوں اور نوابوں نے محض اپنی دولت کے سہارے، سارا کاٹ کباڑ جمع کر لیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ نوابوں ہی میں نواب صدیق حسن خان والئی بھوپال جیسے صاحبِ علم بھی ہوئے ہیں جن کی تصانیف کی تعداد ۲۲۲ تک پہنچتی ہے اور جو تنہا ان کی کوشش اور صلاحیت کا نتیجہ ہے یہاں اس پہلو کو اس لئے بھی کچھ اہمیت دینا پڑی کہ مجھے ڈر ہے کہ نواب صاحب کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کوئی نقاد دیوانِ ناظم میں غالب کا حصہ" جیسا کوئی دوسرا عنوان یعنی " دیوانِ نواب میں امیر مینائی کا حصہ" نہ قائم کر دے۔

نواب صاحب کے کلام پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے جو اس جگہ ممکن نہیں۔ ہاں ان کے فارسی دیوان "تاج فرخی" کے سلسلے میں جو ایک مشہور قصہ چلا آرہا ہے۔ اس کی بابت مختصراً کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ نواب صاحب نے یہ دیوان بغرض اصلاح مرزا محمد تقی خان سپہر ملقب بہ لسان الملک کے پاس ایران بھیجا تھا۔ ساتھ ہی کچھ تحائف بھی بھیجے گئے تھے۔ اور یہ سارا کام سفیر ایران متعینہ ہندوستان کی وساطت سے عمل میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ آغا محمد شیرازی نثار کو بھی اس کام میں صلاح و مشورہ کے خیال سے ایران روانہ کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد آغا صاحب خود ہی اس دیوان کو لیکر آئے اور اس تمام تر کوشش میں نتیجہ کے طور پر نواب صاحب کو سپہر کی طرف سے نثر میں ایک تقریظ، نوے اشعار کا ایک قصیدہ اور ایک نظم جو ان کے خط کے جواب میں تھی موصول ہوئی۔

مولوی نجم الغنی صاحب نے اخبار الصنادید کی دوسری جلد میں اس موضوع پر کافی تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا محمد تقی سپہر کا قصیدہ بنام نواب صاحب محض نثار کی کارستانی ہے قصیدہ ضرور سپہر کا ہے لیکن اس نے یہ قصیدہ ناصر الدین شاہ ایران کی مدح میں لکھا تھا جس کے ۴۶ اشعار معہ مطلع کے تذکرۂ مجمع الفصحا جلد دوم کے صفحہ ۱۷ پر موجود ہیں۔ سپہر کی تقریظ اور نظم بھی اسی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ لیکن نجم الغنی خان نے ان پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ نواب صاحب کے دیوان اور نثار کی رسائی سپہر تک ہوئی ہی نہ تھی تو بات بڑی حد تک صاف ہو جاتی ہے اور اس پر مزید تحقیق و تنقید کی ضرورت بھی نہیں رہ جاتی۔ لیکن نثار کی سپہر تک رسائی مان لی جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اسی نے یہ تقریظ اور نظم نواب صاحب کے دیوان اور مکتوب کے جواب میں بدست نثار بھیجی تھی تو پھر قصیدہ کے متعلق بھی ہم آسانی سے وہ رائے قائم نہیں کر سکتے جو کر دی گئی

ہے۔ یہ درست ہے کہ شاہ ایران کی شان میں اس قصیدے کے بہت سے شعر مل جاتے ہیں مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے اپنے پرانے قصیدے میں نواب صاحب کی شان میں کچھ اشعار کا اضافہ کر دیا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت سپہر کی شہرت و عظمت کا ستارا عروج پر تھا۔ ایران میں وہ ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور تھے مگر نواب صاحب کی شخصیت بھی کچھ ایسی ڈھکی چھپی نہ تھی اور جبکہ اس میں کسی قدر حکومتِ برطانیہ کی شہرت کو بھی شامل کر لیا جائے۔ آخر یہی نواب صاحب تھے کہ جب بیت اللہ تشریف لے گئے تو حکومت انگلشیہ کے ایک ادنیٰ سے اشارہ پر ان کا کس شان و شوکت کے ساتھ استقبال کیا گیا تھا ۲۲ توپوں کی سلامی بھی دی گئی تھی۔ تو یہ کیوں کر مان لیا جائے کہ ایران کے ایک شاعر تک ان کے دیوان اور نمائندہ کی رسائی نہ ہوئی ہوگی، ہاں! اگر واقعی اس پورے واقعے کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جو اب تک افشا نہ ہو سکا ہے تو پھر ان تمام دلیلوں کی اہمیت ایک ریت کی دیوار کی مانند ہے۔ نجم الغنی صاحب نے بھی اس بحث کو مولانا فرنگی کے ایک قول پر ختم کر دیا ہے کہ جب انھوں نے کچھ عرصہ کے بعد شاعر سے اس واقعہ کی حقیقت جاننا چاہی تو جواب میں شاعر نے کہا کہ میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اس مجبوری کی وجہ کو سمجھ لینا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔!

سرشار اور نواب کلب علی خاں پر اس قدر لکھنے کے بعد سرشار کی تقریظ کا ایک تعارفی خاکہ پیش کرتا ہوں۔

رضا لائبریری میں اس تقریظ کا جو نسخہ ہے وہ کافی خوش خط ہے تاہم کہیں کہیں عبارت پڑھنے میں نہیں آتی۔ صفحوں کی تعداد ۶۸ ہے۔ پہلے اور آخری صفحے کو چھوڑ کر ہر صفحہ میں آٹھ سطریں ہیں۔ مصنف نے شروع ہی میں ایک شعر کے ذریعہ اپنا مدعا ظاہر کر دیا ہے۔

مانگتا ہوں اس عریضہ کا صلا
دوسرے سے کچھ نہ مانگوں عمر بھر

اصل عبارت ایک فارسی شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را
ثریا دہ طارم تاک را

اور غالب کے قصیدہ کے اس شعر پر تقریظ ختم ہوتی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

پنڈت رتن ناتھ کی یہ تقریظ کافی طویل ہے اس لئے ذیل میں خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شروع میں تو پنڈت جی کسی تاریخ کی کتاب کے مطالعہ میں مستغرق نظر آتے ہیں۔ بادشاہوں کے کارناموں پر ان کی نظر جاتی ہے اور وہ ان کے جاہ و جلال، عروج و زوال اور غرور و عجز کے بارے میں دیر تک سوچتے رہتے ہیں اور اسی ادھیڑ بن میں شام ہو جاتی ہے۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ پڑتے ہیں اور کسان اپنے مویشیوں کے ساتھ اپنی جھونپڑیوں کا رخ کرتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد دن کا اجالا رات کی تاریکی میں بدل جاتا ہے (جگہ جگہ اردو فارسی کے اشعار بھی درج کئے گئے ہیں) رات ہوتی ہے تو سو جاتے ہیں اور خواب میں خود کو ایک ایسے لق و دق میدان میں پاتے ہیں کہ جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی چرند پرند تھوڑی دیر بعد چاند نمودار ہوتا ہے۔ جس کی خوبصورت چاندنی میں سارا ماحول جاگ اٹھتا ہے۔ سرشار رات بھر راستہ کی تلاش میں ادھر ادھر مارے پھرے اور جب وہ پریشان ہو گئے تو اتفاق سے ان کو ایک چمن بے خار نظر آیا۔ چمن میں وہ ساری خصوصیات اور کیفیات موجود تھیں جو داستانوں والے چمن کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی ہیں۔ یعنی چودہ چودہ سال کی کنواریاں، فردوس کے مانند قصر اور رقص و سرود کی محفلیں وغیرہ سارے ہی لوازمات موجود تھے۔ سرشار خواب میں اس چمن کی رنگینیوں ہی میں مست اور حسینانِ چمن سے دل لگانے میں معروف تھے کہ کسی پیر مرد ملکوتی صفات کی صدا " لا تنم قم کہ یہ غافل نہیں وقتِ غفلت " سے آنکھ کھل گئی۔ دیر تک سرشار کے دل و دماغ پر خواب والا چمن چھایا رہا۔ وہ فوراً اٹھے اور ایک باغ میں تفریح کی غرض سے نکل گئے۔ باغ کے قدرتی حسن و جمال سے لطف اندوز ہوئے۔ نسیم صبح جس کی مستانہ چال چمن کے ہر پھول پتے کو بیدار کرتی ہے سرشار سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی کہ رات خواب میں جو باغ دیکھا تھا اس کا نام "فصاحت باغ" ہے۔ جو مجالس علم و انشا کا چراغ ہے

اور وہ زن جمیلۂ فصاحت اور وہ کتاب مکرمت انتساب قندیلِ حرم جس کو خود فصاحت دیکھ دیکھ کر پھڑک رہی تھی اور مرحبا کہتی تھی، یہ سنتے ہی رتن ناتھ سرشار نے گھر کی راہ لی اور قندیلِ حرم کا مطالعہ کرکے اس کی تقریظ اس طرح شروع کی

" سبحان اللہ کیا مکرمت انتساب کتاب ہے حق تو یوں ہے کہ از سرتاپا لاجواب ہے جو فقرہ ہے دلربا ہے جو لفظ ہے شیریں ادا ہے "

کیا نامۂ نامی ہے مہتابِ ظہور
ہے چشمک ہر نقطہ چشم بددور

اللہ رے کیفیتِ لفظ و معنی
وہ آنکھ میں ہے نور تو یہ دل میں سرور

" اللہ اللہ کیا کتاب لکھی ہے بقولیکہ چمنستانِ بیان میں رنگ بہار دکھایا ہے۔ صفحۂ قرطاس کو دامن گلزار بنایا ہے۔ سوادِ بیاض جلوۂ شام اودھ و صبح بنارس دکھاتی ہے۔ ہر سطر کہکشاں نظر آتی ہے۔"

کچھ اسی انداز کی عبارت آرائی سے یہ ساری تقریظ مملو ہے۔

▲

یوسف ناظم

شاہد صدیقی کی کالم نگاری

کیا تعجب شاہد صدیقی کا ادبی رشتہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جاکر مولانا محمد علی سے ملتا ہو۔ مولانا محمد علی 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' کے کالم لکھ کر لوگوں کے دل زخمی کیا کرتے تھے اور شاہد صدیقی تقریباً نصف صدی بعد سیاست میں پھلجھڑیاں چھوڑا کرتے تھے۔ آتش بازی کا یہ شوقین ادیب گلکاری کا بھی ماہر تھا اور جگر مرادآبادی نے اپنے مجموعۂ کلام 'آتشِ گل' کا نام شاہد صدیقی ہی کو دیکھ کر سوچا ہوگا۔ یوں تو شاہد صدیقی کے والدین نے ان کا نام عبدالمتین رکھا تھا لیکن شاہد صدیقی کو متانت سے اپنا رشتہ جوڑنا دھوکہ دہی معلوم ہوا۔ متانت سے انھیں کیا تعلق۔ وہ تو قہقہوں کے سوداگر تھے ہنسی بانٹنا ان کا معمول تھا جیسے درگاہ کا مجاور شیرینی تقسیم کرتا ہے شاہد صدیقی کے قہقہے اتنے عام اور ارزاں تھے جیسے بڑی بوڑھی عورتوں کی دعائیں۔

ماضی کے پردوں کو ہٹاتا ہوں تو یادوں کے دھندلکوں میں شاہد صدیقی دوستوں کی محفل میں مصروف گفتگو نظر آتے ہیں۔

شاہد صدیقی میں زمین کی کششِ ثقل تھی اور وہ ہر محفل کے محور تھے۔ ان کی ہر بات پھلجھڑی اور ہر جملہ پٹاخہ ہوا کرتا تھا۔ اگر ہر شہر کے محلے میں ایسا ایک آدمی بھی ہو جائے تو سارا شہر شہر آرزو بن جائے۔ زندگی کی کتنی ہی کٹھن منزلیں شاہد صدیقی نے اپنے قہقہوں کے سہارے طے کی تھیں اور کتنے ہی لوگوں کو ہنسی کے لمحات بخشے تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ اردو غزل کا یہ بانکا شاعر مزاحیہ نثر پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتا تھا۔

شاہد صدیقی اصل میں دودھاری تلوار تھے اور جب وار کرتے تو تسمہ لگا نہ رکھتے تھے۔ ان کی نثر ان کی چابک دستی کا نمونہ تھی۔ چابک دستی کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں چابک تو دوسرے ہاتھ میں دستی۔ لیکن اگر آپ نے ایسا سمجھا ہے تو کچھ زیادہ غلطی نہیں کی۔ طنز کے ساتھ اشک شوئی بھی اُن کی تحریک کا جز تھی۔

کسی روزنامہ میں مزاحیہ کالم نگاری کی ڈیوٹی انجام دینے

بازیچۂ اطفال نہیں۔ جان بوجھ کر ہنسنا اور کسی کو ہنسانے کا اہتمام کرنا گورنری سے کم نہیں۔ ایک ریاست کے گورنر کو ہمیشہ تبسم بلب رہنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کو خوش آمدید کہنا اور اس کو خوش کرنا اس کا فرض ہے۔ اسی طرح مزاحیہ کالم لکھنے والے کو پڑھنے والے سے دور بیٹھ کر یہ فرض پورا کرنا پڑتا ہے۔ مزاحیہ کالم نگار کا ترکش کبھی خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ اور شاہد صدیقی کے ترکش میں خدا معلوم اور کتنے تیر محفوظ تھے کہ ان کے لکھنے اور اس تحت کے چھپنے کے درمیانی وقفے ہی میں انھیں ہمیشہ کے لیے چُپ ہو جانا پڑا۔ ایک رات وہ کالم لکھ کر گھر گئے اور دوسری صبح جب وہ کالم اخبار میں چھپا تو شاہد صدیقی کی موت کی خبر بھی اس کے ساتھ شائع ہوئی۔ آتشبازی کا کارخانہ جل گیا۔

شاہد صدیقی پیروڈی لکھنے کے ماہر تھے۔ وہ جب بھی قلم اُٹھاتے ایک پیروڈی ان کے سامنے ہاتھ باندھے آکر کھڑی ہو جاتی پیروڈی کے معاملے میں شاہد صدیقی اختر نگر کے پیلے تھے۔ 'برتھ کنٹرول' نمائش اور مشاعرہ، 'کنونشن' اور 'انتخابات' ان کی خاص الخاص پیروڈیاں ہیں۔ اور سرسید احمد کی طرح رعب دار ہیں۔ برتھ کنٹرول میں ارشاد ہوتا ہے ؎

میں یہ کہتا ہوں کہ بچوں کی ضرورت کیا ہے
اور مرے ملک کو اولاد کی حاجت کیا ہے
اس میں پہلے ہی سے آباد ہیں لوگ
جن میں لیڈر بھی ہیں نقال بھی ہیں
گانے والے بھی ہیں قوال بھی ہیں
اور پھر شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
اس کو سمجھاؤ کہ اعصاب سے نیچے اُترے
ورنہ بچوں کی ولادت نہ رُکے گی ہرگز

یہ نظم ختم ہوتی ہے غالب کے ایک مصرعے پر کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

"کنونشن" کے بارے میں مرحوم کی رائے یہ تھی:

اُف وہ دل جو بے نیازِ لطفِ کنونشن رہے
اور ہمیشہ مبتلائے نالہ و شیون رہے
اُن سے محشر میں یہ پوچھا جائے گا
تم نے کنونشن کیا تھا یا نہیں
تب یہ کیا دیں گے جواب
پھر انہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا
دوزخی جتنے ہیں سب مل کر یہ مصرعہ گائیں گے
اے ہجومِ نامراداں "جی بہت گھبرائے ہے"
جاگ اے اہلِ وطن ہوشیار ہو ہوشیار ہو
بہرِ کنونشن ابھی تیار ہو تیار ہو
باندھ لے اپنی کمر
کوئی رسی ڈھونڈ کر
جن کو دنیا میں نہیں ہے کوئی کام
اُن کو لازم ہے کہ کنونشن کریں
اور وطن کے نام کو روشن کریں

یہ بذلہ سنجی اور لطیف طنز شاہد صدیقی کی ذات سے علٰحدہ نہیں کیے جا سکتے تھے۔ وہ بے حد زود قلم تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوچ کر نہیں لکھ رہے ہیں۔ سوچنے کی انھیں ضرورت بھی کیا تھی۔ سوچا سمجھا طنز، اور کسی منصوبے کا پابند مزاح، مزاح نہیں ہوتا 'طوائف کا مجرا ہوا کرتا ہے۔ شاہد صدیقی کے ہاں بندھے ہوئے الفاظ نہیں مقررہ اور پٹے پٹائے لطیفے نہیں۔ ان کے کیمیائی قلم سے پامال مضمون بھی کایا کلپ کیا ہوا آدمی بن جاتا ہے۔ 'انتخابات' بڑے معرکے کی نظم ہے جس میں شاہ ظفر، ذوق، غالب اور مومن سبھی جمع ہیں۔

دفعتاً شاہ ظفر ذوق سے فرمانے لگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے
پھر مخاطب ہوئے غالب سے کہ اے برخوردار
امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

یہ تخاطب ابھی جاری تھا کہ مومن آئے
منہ میں اک پان لیے ہاتھ میں دیوان لیے
ان کو دیکھا تو کہا شاہ ظفر نے ہنس کر
آج کل رونق اُردوئے معلّٰی تم ہو
انتخابات کا عالم ہے کھڑے ہو جاؤ
اس پہ مومن نے بڑی شان سے شرما کے کہا
"آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"

یہ رواں زبان۔ پڑھیے تو بوٹنگ کا لطف آئے۔ شاہد صدیقی بڑے "حاضر دماغ" شاعر تھے۔ دوسرے شاعروں کے مصرعوں سے ایک نظم مکمل کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریلے ریس میں حصّہ لینا۔ یہ بڑی سمجھ بوجھ کا کام ہے۔ شاہد صدیقی نے مزاحیہ نثر میں بھی اپنی طباعی کے ایسے کئی نمونے دکھلائے ہیں "شیشہ و تیشہ" ٹائے ایمپوریم TOY Emporium سے کسی طرح کم نہیں۔ سماجی مسئلہ ہو یا سیاسی نکتہ۔ ادب کا کوئی موضوع ہو یا روزمرّہ زندگی کا کوئی واقعہ۔ شاہد صدیقی کا زرخیز دماغ اس میں مزاح اور ظرافت کا پہلو ڈھونڈ ہی لے گا۔

"گزشتہ زمانے میں ہمارے یہاں اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ دفاتر کی زیادہ سے زیادہ ملازمتیں ان لوگوں کو ملیں جو موزوں اور مناسب صلاحیتیں نہ رکھتے ہوں، یا غیر ضروری قابلیت کے حامل ہوں، مثال کے طور پر ایک صاحب جو کیمسٹری کے پروفیسر تھے، دارالقضارت کے ناظم بنا دیئے گئے تھے۔ ایک ماہر قانون، صدر مدرس تھے ایک فلسفے کے اسکالر صاحب تعلقداری کرتے کرتے انتقال فرما گئے۔ اسی طرح دوسری ملازمتوں میں بھی یہ نکتہ ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص سائنس داں ہے تو اسے کوئی ایسی ملازمت نہ دی جائے جس میں سائنس کی ضرورت ہو۔ اگر کسی نے انجنیئرنگ میں مستند حیثیت حاصل کی ہے تو اُسے انجنیئر ہرگز نہ بنایا جائے۔

تقررات اکثر و بیشتر ضرورت کی بجائے شخصیت پر منحصر ہوتے تھے۔ یا کسی سفارش کو پیشِ نظر رکھ کر کیے جاتے تھے۔ یا پھر ان میں شخصی تعلقات کی کارفرمائی شامل رہتی تھی۔ یہ صورتِ حال کہیں اب بھی باقی ہے۔ مثال کے طور پر چند روز پہلے ایک دفتر میں ایک خوشنویس کا انتقال ہوا تو اس سے پہلے کہ اس بے چارے کی تجہیز و تکفین ہو سکے، ایک صاحب، جنھیں خوشنویسی کی الف، بے بھی نہیں آتی تھی، اور جو محکمۂ مال کے وظیفہ یاب تحصیلدار تھے محض اضافۂ آمدنی کی خاطر اپنا تقرر خوشنویسی کی اس جگہ پر کرا لائے آپ اندازہ لگائیے کہ کدھر تحصیل داری اور کدھر خوشنویسی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے شاہد صدیقی کا کام ہی مشاہدہ کرنا تھا۔ یوں وہ نہایت بے ضرر اور سادہ آدمی نظر آتے تھے جیسے کہ کسی کے عیب پر ان کی نظر ہی نہ ہو۔ اور اگر کوئی عیب انھیں دکھائی بھی دے تو وہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے لیکن یہ سب دکھاوا تھا۔ شاہد صدیقی بڑی گہری نظر رکھتے تھے دفتریت کے بارے میں ان کا ایک اور قصیدہ دیکھیے:

"انگریزوں کے زمانے میں دفتری تساہل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک دفتر میں آگ لگ گئی حسبِ معمول عہدیدارانِ بالا کو اطلاع ہوئی۔ کارروائی کا آغاز ہوا مثلیں بنائی گئیں۔ تجویزیں ہوئیں۔ مراسلے اِدھر سے اُدھر دوڑے اور آخرکار یہ حکم صادر فرمایا کہ آگ فوراً بجھا دی جائے اس پورے واقعے میں غور طلب بات صرف یہ ہے کہ آگ بجھانے کا یہ حکم اس وقت نافذ ہوا جب کہ سابق دفتر کا

خاکستر پر دوسری عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔

اب ہمارے چیف سکریٹری صاحب نے دفتریت کی ایک اور مثال پیش فرمائی ہے جسے سن کر ہم دنگ ہوتے ہوتے رہ گئے موصوف نے ریاست مدراس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ایک پست قد عہدے دار کو پائیدان کی ضرورت پڑی، اور اس کی کارروائی چلی تو منظوری آتے آتے چھ ماہ لگ گئے۔ لیکن جب ان پستہ قد عہدے دار تک یہ خوش خبری پہنچی کہ وہ پائے دان خرید سکتے ہیں اس وقت وہ نہایت اطمینان اور آرام سے بسکٹوں کی ایک پیٹی سے پائے دان کا کام لے رہے تھے اور ضرورت سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

دفتریت ہمارے یہاں کی ایک ایسی رسم ہے جسے ہم آسانی سے ترک نہیں کر سکتے اور اس کی وجہ سے نہایت دلچسپ واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک دوست قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے گھر میں چوہوں کی آبادی بڑھ گئی تھی، انھوں نے محکمۂ متعلقہ کو توجہ دلائی۔ چنانچہ حسب ضابطہ اور حسب معمول کارروائی شروع ہوئی تو خود ان کا انتقال ہو چکا تھا۔"

شاہد صدیقی کو غالب کی طرح کسی دفتر سے پنشن نہیں ملتی تھی۔ تب بھی ان کی واقفیت کا یہ عالم تھا۔ مشاہدہ حق کی گفتگو شاید ان کی عادت تھی۔

شاہد صدیقی گرانی کے عروج سے پہلے ہی انتقال کر گئے لیکن ان کی پیش بینی نے یہ رنگ پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور شاید ان میں گرانی کے صدمے سہنے کی ہمت بھی نہ تھی ورنہ وہ ابھی اور جیتے۔ ان کا شعر ہے ؎

غم ہائے جہاں سے ڈر گئے ہم
اور اتنے ڈرے کہ مر گئے ہم

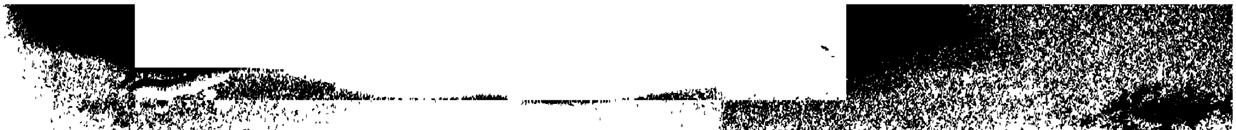
اس خیال کو انھوں نے نثر میں یوں ادا کیا ہے

"لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں عام آدمی کی معاشی سطح کیا ہے؟ گہری نظر سے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ دراصل سرے سے کوئی سطح موجود ہی نہیں ہے۔ عام آدمی پر جو مصیبت پڑتی ہے وہ صبر و شکر کے ساتھ جھیلتا ہے اور اسی کو اپنی اخلاقی سطح سمجھتا ہے۔"

شاہد صدیقی کو مزاح نگاری کا وہی سلیقہ تھا جو عورتوں کو اپنی چوٹی گوندھنے کا ہوا کرتا ہے۔ ان کی ظرافت نگاری میں تنقید کا وہ رنگ موجود ہے جو ہمدرد کے کالم نگاروں کی تحریروں میں تھا سلطان حیدر جوش اور مبوق کی تحریریں جن لوگوں نے پڑھی ہیں انہیں معلوم ہے کہ کالم نگاری صرف ظرافت نہیں چاہتی افادیت بھی مانگتی ہے۔ کالم نگاری کا یہ ڈھب' مولانا محمد علی کی تحریروں میں سے اُردو میں منتقل ہوا۔ اور شاہد صدیقی نے بھی اسی دریچے سے اپنا دیا روشن کیا ہوگا۔ مدینہ اور پیام کے مزاحیہ کالموں کے بعد سیاست کے کالم شیشہ و تیشہ میں بھی وہی آب و تاب تھی جو ایک اونچے درجے کی مزاحیہ تحریروں میں ہوا کرتی ہے

شاہد صدیقی اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل ہو گئے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

خبر آئی ہے اور کیا ہی سنسنی خیز خبر آئی ہے کہ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے شراب نوشی ترک کر دی ہے اور جس وقت یہ سطریں آپ کے مطالعے میں آئیں گی، اُس وقت تک ان کے "ترک مے" کو کم و بیش دو ہفتے گزر چکے ہوں گے جو لوگ جوش صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ شراب



موصوف کی زندگی کا ایک جزو ... بلکہ جزو اعظم بن چکی تھی۔ آپ روزانہ پیتے تھے۔ یہاں تک کہ جوش اور شراب کا رشتہ بہت گہرا ہو چکا تھا اور بڑے سے بڑے اہلِ نظر کے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ شراب کہاں ختم ہوتی ہے اور جوش ملیح آبادی صاحب کہاں سے شروع ہوتے ہیں گویا بالکل ؎

من تو شدم تو من شدی

والا معاملہ تھا۔ اور اب جب کہ موصوف خیلِ رنداں کے عہدے پر نہیں ہیں بلکہ گروہ متقیاں میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ہم ... سوچتے ہیں کہ آپ نے بہ درستیٔ ہوش و حواس اور بہ سلامتیٔ عقل شراب کو چھوڑا ہے یا خود شراب نے آپ کو طلاق دے دی ہے؟

شیشہ و تیشہ اس سے پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ لیکن وہ کتاب کنھیا لال کپور کی تھی۔ یہ شیشہ و تیشہ جو آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی سے شائع ہوئی ہے اور چیز ہے۔ بہت کم کالم نگاروں کی تحریریں کتابی صورت میں چھپ سکی ہیں اور شاہد صدیقی کے لکھے ہوئے کالم کا ایک جگہ جمع کر دیا جانا ایسا ہی ہے جیسے شہزادۂ جواں بخت کا سہرا تیار کرنا۔ یہ شیشہ و تیشہ خمیرِ مروارید کی طرح فرحت بخش ہے۔

چمن کچھ اور بھی ہیں دشت و در کچھ اور بھی ہیں
رہِ جنوں میں نقوشِ سفر کچھ اور بھی ہیں

مہ و نجوم کے سینوں کو چیرنے والو
امینِ جلوہ، نقیبِ سحر کچھ اور بھی ہیں

فرازِ دار سے منصور نے بڑھا اپنی
کہ زیرِ دارِ بغاوت نگر کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو جلتے رہیں گے چراغ کوہ کنی
جہانِ عشق میں شوریدہ سر کچھ اور بھی ہیں

نہ روک موجِ تبسم کہ تیری محفل میں
فسردہ قلب، تپیدہ جگر کچھ اور بھی ہیں

مریضِ غم پہ توجہ کا شکریہ، لیکن
فرائضِ نگہ چارہ گر کچھ اور بھی ہیں

نہ سمجھو منزلِ مقصود کہکشاں کو شفا
ابھی تو مرحلہ ہائے نظر کچھ اور بھی ہیں

شفا گوالیاری

غزل

جرّم محمد آبادی

اظہارِ بے بسی میں نہ ہرگز خلل پڑے — خاموش ہو زباں تو آنسو نکل پڑے
ساقی نے ظرف دیکھ کے تقسیم کی تھی مے — اس احتیاط پر بھی ہزاروں اُبل پڑے
ہنسنے کی اور ہنسانے کی ہوتی ہے ایک حد — اتنا نہ گدگداؤ کہ آنسو نکل پڑے
اٹھتے ہی ان کے ٹوٹ گیا ضبط کا طلسم — دامن تک آنے کے لیے آنسو مچل پڑے
اہلِ خرد مآلِ سفر سوچتے رہے — دیوانے سوئے منزلِ مقصود چل پڑے
میری طرح اٹھاؤ جو سختی راہِ عشق — آنسو کا ذکر کیا ہے کلیجا نکل پڑے
طے اس طرح ہو مرحلۂ راہِ زندگی — تیور پہ میل آئے نہ ابرو پہ بل پڑے

اے جرّم عرش بن گئی مقتل کی سرزمیں
جب سرکشانِ باستہ کے مارے نکل پڑے

موصوف کی زندگی کا ایک جزو۔ بلکہ جزو اعظم بن چکی تھی۔ آپ روزانہ پیتے تھے۔ یہاں تک کہ جوش اور شراب کا رشتہ بہت گہرا ہو چکا تھا اور بڑے سے بڑے اہلِ نظر کے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ شراب کہاں ختم ہوتی ہے اور جوش ملیح آبادی صاحب کہاں سے شروع ہوتے ہیں گویا بالکل ؎

من تو شدم تو من شدی

والا معاملہ تھا۔ اور اب جب کہ موصوف خیلِ رنداں کے عہدے پہنچے ہیں بلکہ گروہ متقیاں میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ ہم جیسے آدمی کے لیے سوچنا ضروری ہے کہ آپ نے بہ درستیٔ ہوش و حواس اور بہ سلامتی عقل شراب کو چھوڑا ہے یا خود شراب نے آپ کو طلاق دے دی ہے ؟

شیشہ و تیشہ اس سے پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ لیکن وہ کتاب کنھیا لال کپور کی تھی۔ یہ شیشہ و تیشہ جو آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی سے شائع ہوئی ہے اور چیز ہے۔ بہت کم کالم نگاروں کی تحریریں کتابی صورت میں چھپ سکی ہیں اور شاہد صدیقی کے لکھے ہوئے کالم کا ایک جگہ جمع کر دیا جانا ایسا ہی ہے جیسے شہزادہ جواں بخت کا سہرا تیار کرنا۔ یہ شیشہ و تیشہ خمیر مروارید کی طرح فرحت بخش ہے۔

چمن کچھ اور بھی ہیں دشت و در کچھ اور بھی ہیں
رہِ جنوں میں نقوشِ سفر کچھ اور بھی ہیں

مہ و نجوم کے سینوں کو چیرنے والو
امینِ جلوہ، نقیبِ سحر کچھ اور بھی ہیں

فرازِ دار سے منصور نے بڑھا اپنی
کہ زیرِ دار بغاوت نگر کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو جلتے رہیں گے چراغِ کوہ کنی
جہانِ عشق میں شوریدہ سر کچھ اور بھی ہیں

نہ روک موجِ تبسم کہ تیری محفل میں
فسردہ قلب، تپیدہ جگر کچھ اور بھی ہیں

مریضِ غم پہ توجہ کا شکریہ، لیکن
فراقِ نگہِ چارہ گر کچھ اور بھی ہیں

نہ سمجھو منزلِ مقصود کہکشاں کو شفا
ابھی تو مرحلہ ہائے نظر کچھ اور بھی ہیں

شفا گوالیاری

غزل

جرم محمد آبادی

اظہارِ بے بسی میں نہ ہرگز خلل پڑے / خاموش ہو زباں تو آنسو نکل پڑے

ساقی نے ظرف دیکھ کے تقسیم کی تھی مے / اس احتیاط پر بھی ہزاروں اُبل پڑے

ہنسنے کی اور ہنسانے کی ہوتی ہے ایک حد / اتنا نہ گدگداؤ کہ آنسو نکل پڑے

اٹھتے ہی ان کے ٹوٹ گیا ضبط کا طلسم / دامن تک آنے کے لیے آنسو مچل پڑے

اہلِ خرد مآلِ سفر سوچتے رہے / دیوانے سوئے منزلِ مقصود چل پڑے

میری طرح اٹھاؤ جو سختی راہِ عشق / آنسو کا ذکر کیا ہے کلیجا نکل پڑے

طے اس طرح ہو مرحلۂ راہِ زندگی / تیور پہ میل آئے نہ ابرو پہ بل پڑے

اے جرم عرش بن گئی مقتل کی سرزمیں
جب سرکشانے باتند کے مارے نکل پڑے

ذکرِ تحریمِ حرم یا جامِ صہبا کچھ تو ہو
روح کی شعلہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو

داغِ دل، زخمِ نظر، سوزِ جگر، فکرِ حیات
ہم تہی دامن سہی تدبیرِ تمنا کچھ تو ہو

رہ گزر ویران ہے ہر حادثہ خاموش ہے
اے دلِ ایذا طلب بہرِ تماشا کچھ تو ہو

زندگی پھر اپنے مستقبل سے غافل کیوں رہی
ساغرِ امروز میں صہبائے فردا کچھ تو ہو

ہم کسی احساس سے خاموش ہیں اُن کے حضور
وہ بہ ضد ہیں ہم سے تشریحِ تمنا کچھ تو ہو

بے طلب کیسے ملے، کیوں کر ملے حسنِ طلب
زندگی کے ہونٹ پر آخر تقاضا کچھ تو ہو

کس قدر مایوس ہے میرا جنونِ بے کراں
بخت آخر وسعتِ دامانِ صحرا کچھ تو ہو

حسن بخت

نصیر پرواز

مجھے تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جانے دے
گریزاں ہیں جو ان پرچھائیوں میں ڈوب جانے دے
نشاط آمیز ہوتے ہیں سکوتِ درد کے سائے
محبت کو کبھی تنہائیوں میں ڈوب جانے دے
کہیں تسکیں نہیں پاتی نگاہِ مضطرب میری
مجھے خود اپنی ہی رعنائیوں میں ڈوب جانے دے
سنبھلتی ہی نہیں مجھ سے کلاہِ شانِ محرومی
مجھے دل کی کرم فرمائیوں میں ڈوب جانے دے
اسیرانِ خرد خود تھام لیں گے دامنِ ہستی
جوانی کو ذرا رسوائیوں میں ڈوب جانے دے
لبِ احساس بڑھ کر چوم لے گا خود جبینِ غم
غرورِ ناز کو پہنائیوں میں ڈوب جانے دے
بڑی پُرکیف لگتی ہے مجھے یہ صبح کی ٹھنڈک
ذرا مجھ کو انھیں پروائیوں میں ڈوب جانے دے
مجسم ہو ہی جائیں گے لبِ اظہار کے نغمے
جمالِ سوز کو شہنائیوں میں ڈوب جانے دے
نظر بے باک خود پرواز ہوتی ہے محبت کی
ذرا اس کو حسیں برنائیوں میں ڈوب جانے دے

ستمبر ۱۹۷۵ء

ماہنامہ [illegible] حیدرآباد

جانے کیا بات ہے ہر بات سے جی ڈرنے لگا ہے
دوستو اب تو ہر اک رات سے جی ڈرنے لگا ہے
جانِ جاناں! تیری کرامات سے جی ڈرنے لگا ہے
پھر دلِ سادہ کے صدمات سے جی ڈرنے لگا ہے
اس لیے اور ملاقات سے جی ڈرنے لگا ہے
چاہنے والے! تری ذات سے جی ڈرنے لگا ہے
لیجئے! اور بھی خطرات سے جی ڈرنے لگا ہے

تیری اس درجہ عنایات سے بھی ڈرنے لگا ہے
عمر کی شب ہجر کے یادوں پہ کچھ ایسی گزری
موسم گل ہے کہ ہے تیرے بدن کی خوشبو
پھر نگاہِ وفا تیری ہی جانب لپکے
پھر وہی درد وہی درد کے ساماں ہوں گے
آج پھر تم نے دیا دل پہ لگائی ہے صدا
دستِ قاتل بھی وہی حوصلۂ دل بھی وہی
اس نے جاتے ہوئے بس اتنا کہا تھا کہ مجیب
چپ بھی رہیے کہ شکایات سے جی ڈرنے لگا ہے

محبوب اللہ مجیب

غزلیں

شکیل مظہری

دل میں کیا کیا نہ چھپائے ہیں تجھ کے سائے
جب نظر آئے ہیں یا کہ کنول کے سائے
یوں تو جاں بخش بھی ہیں تاج محل کے سائے
آؤ دیکھو تو ذرا میری نظر کے سائے
کوئی دیکھا ہی نہیں آنکھ بدل کے سائے
اس پہ پھیلائے چراغوں نے بھی جل کے سائے

جب ترے رخ پہ پڑے میری غزل کے سائے
رخ پہ چھائی ہے ملاحت یا ہیں پلکے سائے
اس کی تاریخ سنو گے تو لہو روؤ گے
نگرِ احساس پہ اک نور برس جائے گا
سب نے پوجے ہوئے سورج ہی کو پوجا ہے یہاں
تیرگی ویسے بھی کچھ کم تو نہیں تھی اے دوست

کون کہتا ہے کہ آیا ہوں اکیلا میں شکیل
گھر سے آئے ہیں مرے ساتھ [illegible] کے سائے

غزلیں

راہِ وفا میں ذوقِ طرب نارسا رہا
کچھ دن غمِ جہاں، غمِ جاناں بنا رہا

منہ پھیر کے وہ اس طرح کچھ سوچتا رہا
احساس میں لطیف سا اک زلزلہ رہا

اک اور بھی تو شمع فروزاں تھی بزم میں
پروانہ اس طرف بھی بہت دیکھتا رہا

اشکوں سے تر کیا نہ اُسے چاک کر سکا
دامن کا احترام، مرا قاعدہ رہا

نامعتبر رہی مری نظریں کسی قدر
لیکن مرا مزاجِ وفا پارسا رہا

مانا، اصول بزم کے یکسر خلاف تھا
لیکن ترا نہ دیکھنا میں دیکھتا رہا

ان کا حجاب اور وہ اقرار ناتمام
ہر ذرہ حسرتوں سے مجھے دیکھتا رہا

صابر، شعاعِ حسن کا اللہ رے اثر
چلمن جو تھرتھرائی تو دل کانپتا رہا

صابر شاہ آبادی

شکوۂ رنجِ غمِ ایام نہ ہو
گر نہیں بادۂ گلفام نہ ہو

تا بہ کے منتِ ابنِ مریم
اس سے بہتر ہے کہ آرام نہ ہو

رات باقی ہے تڑپنے کے لیے
اتنا بے تاب سرِ شام نہ ہو

آرزوؤں کے صنم ہیں اور ہم
یوں کوئی بندۂ اصنام نہ ہو

مقصدِ زیست ہے کتنوں کا یہی
بخششِ ابرِ کرم عام نہ ہو

پھر یقیں جینے کا آئے کیوں کر
جب کوئی فتنۂ ایام نہ ہو

لذتِ غم بھی نہ مٹ جائے کہیں
اس قدر خوگرِ آلام نہ ہو

سعیِ پیہم ہی سہی تیرا شعار
پھر بھی بیگانۂ انجام نہ ہو

برق کے سائے میں پلنا ہے تجھے
اس قدر لرزہ براندام نہ ہو

حبیب احمد صدیقی

کوثر چاندپوری

جُوئے شیر

ایک ساتھ دسیوں گیتی اور پھاؤڑے خاص انداز سے فضا میں بلند ہو کر بڑے نغمہ ریز دھماکوں کے ساتھ دھرتی کی چھاتی پر گر پڑتے ہیں۔ انداز وہ نہیں بیج کے دانے گرنے کا ہوتا ہے۔ اس میں ایک درخواست عاجزی اور کمتری کا رنگ ہوتا ہے گیتی اور پھاؤڑوں کے اوپر اٹھانے اور پھر اوپر کے دھڑ کی طاقت سے انہیں نیچے گرانے میں فرمان شکنی اور برتری کا جذبہ جھلکتا ہے جیسے مزدوروں کے گیتی پھاؤڑے کسان کی طرح زمین سے مانگنا نہیں چاہتے بلکہ اسے کچھ دے ڈالنے کی امنگ رکھتے ہیں، دو تین مہینے سے کام اسی طرح چل رہا ہے مزدور زمین کی لمبی سی مانگ بنا کر اسے سنوارتے جا رہے ہیں سیندور کی سرخی سے نہیں کولتار کی گہری سیاہی سے وہ اس مانگ کو سجا رہے ہیں۔ جاڑوں میں مزدوروں کو پسینہ نہیں آتا تھا، سردی لگتی تھی۔ اس وقت حوصلہ کی گرمی ہی سے ٹھنڈی ہواؤں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا اور اب بڑے زور کی گرمی پڑ رہی ہے دور تک سائے کا نام نہیں۔ اونچی نیچی پہاڑیاں، حدِ نظر تک لیٹی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں ۱۵ر مئی کی دھوپ ہر طرف آگ بکھیر رہی ہے، مزدور اس گرمی میں بھی بڑی تیزی سے کام کر رہے ہیں جیسے کام ہی ان کی زندگی اور طاقت ہو، لُو کے تیز و تند جھونکے خس کی ٹٹی سے نکلی ہوئی خشک ہواؤں کی طرح ان کی طرف آتے محسوس ہو رہے ہیں اور ان کی رگوں سے طاقت اور ہمت کے سوتے اُبل رہے ہیں، تھکن کا احساس ان کے اعصاب کو چھو بھی نہیں سکتا۔ کھنتیاں گہری اور گہری اور گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ بیچ بیچ میں کچی مٹی کے مینار اس طرح کھڑے نظر آ رہے ہیں جیسے منڈھے ہوئے سروں پر چوٹیاں لہرا رہی ہوں، ذرا فاصلہ پر اسٹیم رولر دھواں اگلتا آگے پیچھے دوڑ رہا ہے، سڑک پر مٹی ڈال کر جو بولڈر بچھا دیئے گئے ہیں وہ برابر ہوتے جا رہے ہیں نشیب و فراز آپ ہی آپ مٹ رہے ہیں، مزدوروں کی قطاریں سروں پر مٹی کی ڈلیاں اٹھائے اس طرح آگے بڑھتی ہیں جیسے لال چیونٹیاں منہ میں چھوٹے چھوٹے ذرے دبائے بل کی جانب دوڑ رہی ہوں، سڑک روز بروز لمبی ہوتی جا رہی ہے شروع میں اس کی لمبائی اتنی نمایاں نہیں تھی مگر اب وہ چالیس میل کا فاصلہ طے کر چکی ہے اور محسوس ہو رہا ہے کہ وہ آگے ہی کو بھاگ رہی ہے، چالیس میل کی اس سڑک پر جو ابھی ادھوری ہی ہے موٹریں سائیکلیں اور گاڑیاں چلنے لگی ہیں ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا قافلہ تیز گام ہو گیا ہے اور سڑک کے ساتھ ہر چیز آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ تہذیب، آبادی، روشنی اور نہ جانے کیا کیا، ہو سکتا ہے کہ سڑک کا اگلا سرا تہذیب کے ہاتھ میں ہو اور وہ اسے کھینچ کر کہیں لے جا رہی ہو، اس وقت حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مزدور اتنی گرمی میں کیونکر اس قدر حوصلے سے کام کر رہے ہیں۔ ۱۵ر مئی کی دہکتی ہوئی دھوپ نے ان کے ہاتھ پیروں میں طاقت کی بجلیاں دوڑا دی ہیں، ابھی ابھی موٹر کا ہارن بجا ہے اور سرپٹ اوپر اٹھتے ہوئے پھاؤڑے پوری بلندی پر پہونچنے سے پہلے ہی نیچے آ گئے ہیں جیسے چاند کی سمت جاتے ہوئے راکٹ میں انرجی ختم ہو گئی ہو اور وہ زمین کی طرف لوٹ پڑا ہو سڑک پر ایک جیپ مچھلی کی مانند تیرتی کھنتیاں کھودتی ہوئی مزدوروں کے قریب آ گئی ہے گرد و غبار کا ایک بگولہ دھرتی سے آکاش تک ناچتا دکھائی دے رہا ہے، جیپ رک گئی ہے اور اس سے ایک دم تین آدمی اتر پڑے ہیں۔

دھرتی کھول رہی ہے مرنے !! ایک سردار جی اپنی پگڑی کو ٹھیک

کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں ٹھیک سے دیکھ رہے ہو ہرنام سنگھ!

تم نے یارہ بہت ولی بات کا خوب بنا دکھا ہے تو اس دھوپ میں چار گز بھی میرے ساتھ نہیں چل سکتا۔ علی مرزا اتنی لمبی سڑک بنانا تخت طاؤس بنانے سے زیادہ مشکل ہے مسورا جی نے ہرے رنگ کا چشمہ ماتھے سے صاف کرنے کے بعد آنکھوں پر لگاتے ہوئے کہا ہے معلوم نہیں ہو سکا کہ تیوری سے شعلے لپکے یا آنکھیں حسب معمول مسکرائی ہیں۔

دس کو نہیں مجھے ابھی پورے ساٹھ میل تیرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے ہرنام سنگھ علی مرزا ہنس کر اس انداز سے کہہ رہا ہے جیسے وہ اس کے ساتھ کمپنی کی کسی بہت بڑی چھاؤنی پر حملہ کرنے جا رہا ہو، وہ ہرنام سنگھ کا شریک ہے مہم کا بنا ہوا ہے انھوں نے ایک دوسرے کے اثر اور دولت سے فائدہ اٹھانے کے لئے باہمی طور پر سمجھوتہ کر لیا ہے، ان دونوں کے باپ ایک ساتھ فوج میں بھرتی ہوئے تھے ہرنام سنگھ عمر میں بڑا ہے اور علی مرزا بالکل ناتجربہ کار نوجوان ہے اس کے باپ نے ہرنام سنگھ سے صاف کہہ دیا ہے کہ میرا بیٹا منحل ہے جو حسن اور آرٹ کا پرستار ہوتا ہے وہ صرف لٹانا جانتا ہے کمانا تم اسے سکھاؤ گے، اور کھونے کمانے کا یہ کھیل تو دس بیس نہیں سو میل لمبا تھا جس میں سے ابھی چالیس میل ہی پورے ہوئے تھے ۔۔۔ جیپ ایک جگہ کھڑی ہو چکی ہے۔ سیمنٹ کی سڑک چولہے پر رکھے توے کی مانند گرم ہے اس سے بھاپ سی اٹھتی محسوس ہو رہی ہے جیسے گٹی کے نیچے دبے ہوئے مینڈک گوندھ کی طرح سلگنے لگے ہوں، ایک پہاڑی پر پتھروں سے بنے دس بیس اونچے مکان دکھائی دے رہے ہیں ان سے کچھ فاصلہ پر بہت سی جھونپڑیاں ہیں، ایک طرف گٹی توڑنے کی مشینیں دھڑ دھڑا رہی ہیں۔ وہ اس طرح پتھروں کو منہ میں دبا کر پیس ڈالتی ہے جیسے کوئی مزدور چنے چبا رہا ہو، پتھروں کے باریک ریزے ریت کی طرح ہوا میں اڑ رہے ہیں اور گٹی کے ڈھیر بڑے قاعدہ سے سڑک کے کنارے کنارے لگے ہوئے ہیں۔ بہت سے مزدور خالی اور بھری ہوئی ڈلیاں سروں پر رکھے سڑک کے آس پاس رینگ رہے ہیں بہت سے بیلداروں کے اوپر گٹی بچھانے میں مصروف ہیں، ایک موٹر اسٹیم رولر چھک چھک کر گٹی پر چڑھا ہے، قریب ہی کولتار کے ڈرم آگ پر رکھے سنسنا رہے ہیں ہوا میں کولتار کی بو بسی ہوئی ہے۔ انجن جس ٹکڑے کی دبائی کر چکا ہے اس پر باریک گٹی ڈالی جا رہی ہے اور تارکول چھڑکا جا رہا ہے۔ ہرنام سنگھ اور علی مرزا

اپنے ایک اور ساتھی اوم پرکاش کے ساتھ وہاں جا کر کھڑے ہو گئے ہیں جہاں ڈھاک کے پیڑ کی جڑ میں بڑی سی ڈلیا کے نیچے دو کالے کلوٹے مگر تندرست بچے لیٹے ہیں۔ ڈلیا دھوپ نہیں روک سکی ہے، پیڑ بھی بالکل ننگا ہے لیکن بچوں کی ماؤں کو اطمینان ہے کہ انھوں نے اپنے چہیتوں پر سایہ کر دیا ہے۔ وہ بھی کر سکتی تھیں ٹینٹ یا چھولداری لگانا ان کے بس کی بات نہیں، اوم پرکاش تنگ پائنچوں کی پینٹ پر شوخ رنگ کی بش شرٹ پہنے ہوئے بالکل تنہا کھڑا ہے اس کے جسم میں کوئی جھول نہیں وہ مزدوری کرتی ہوئی عورتوں کے جھلسے ہوئے چہروں پر دھنک کے رنگ ڈھونڈ رہا ہے وہ گلاب اور شفق کی سرخی کا تجسس کر رہا ہے اسے صرف ان مزدورنیوں سے دلچسپی ہے جو حسین بھی ہوں اور جوان بھی، اس کا نقطۂ نظر ہرنام سنگھ اور علی مرزا سے بالکل مختلف ہے، یہ دونوں مزدوروں اور ان عورتوں سے محض اس لئے ہمدردی رکھتے ہیں کہ ان کا پسینہ نوٹوں کے ماں سون میں بدل کر جیب میں آ جاتا ہے۔ وہ چاہیں تو اس روپے سے اپنے سماج کی ہر کھلبلی پیڑا کا سودا کر سکتے ہیں۔ اوم پرکاش دل ہی دل میں مزدوروں کو برا بھلا کہہ رہا ہے اسے پڑاؤ حسن اور جوانی سے یوں خالی نظر آ رہا ہے جیسے جنگل سایہ دار درختوں سے، اس نے رومال سے پینٹ جھاڑتے ہوئے کہا ہے۔

بڑی دھول ہے یار، میری تو یہاں ٹھہرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

پھر جیپ میں جا بیٹھ!

گرمی وہاں بھی ہے۔

آیا ہی کیوں تھا؟

جس مطلب سے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تم لوگ ایسی عورتوں کو کام پر لگاتے ہو جن کو دیکھنے سے بھی تسلی ہوتی ہے۔

تیرے لئے ٹیڈی گرلز کی فوج کہاں سے بھرتی کروں ۔۔۔ تجھے ہر قدم پر شیریں، لیلیٰ اور ہیر چاہیئے۔

پھر سڑکیں مت بناؤ، کوئی عمدہ سا مینا بازار بناؤ، جہاں تو جہانگیر بن کر آئے ۔۔۔؟

ایک دم موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آئی ہرنام سنگھ نے دوربین سے دیکھا۔

کس کی موٹر ہے؟ اوم پرکاش نے پوچھا

انجینیر ہوگا، علی مرزا بولا

کوئی اور ہے، ہرنام سنگھ نے دوربین کوٹ کی جیب میں رکھ لی،
مزدور ڈلیاں اور پھاوڑے پھینک کر ٹھیکیداروں کے پاس آگئے
ں انھیں امید تھی کہ جٹھا ضرور بٹے گا ورنہ پیشگی مل جائے گی۔

انجن بھی رکا کھڑا ہے ڈرائیور خاکی وردی پر تیل کے دھبے لگائے
دھر ہی کو آرہا ہے، انجن صرف سستا رہا ہے، کوئی آواز نہیں نکال رہا، ایسا
ل رہا ہے جیسے سڑک چلتے چلتے رک گئی ہو دس بارہ مزدور جن کے سیاہ
بالوں میں دھول کے ذرات یوں چمک رہے ہیں جیسے رات کی تاریکی میں
ستارے جگمگایا کرتے ہیں، خالی ڈلیاں ہاتھوں میں تھامے ٹھیکیدار سے باتیں
کر رہے ہیں۔

بابو پیسہ چاہیے ——

پیسہ! —— ہرنام سنگھ چونک اٹھا ہے اس کی پیشانی شکن آلود
ہو گئی ہے جیسے مزدور نے گالی بک دی ہو۔

پیر کو پیسہ بانٹ کر گیا ہوں، آج سنیچر ہے ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا
آٹا نہیں رہا، آدھا چھٹا بانٹنا تھا بابو!

میں تمھارا پیسہ لے کر بھاگ نہیں جاؤں گا۔

بال بچے بھوکے مر جائیں گے ان داتا! —— دوکاندار بیڑی
کا بنڈل بھی ادھار نہیں دیتا۔

میں نہیں جانتا !؟......

بات ہرنام سنگھ کر رہا تھا، لین دین کا تعلق اسی سے تھا اسی
وقت کالے رنگ کی ایک موٹر سڑک پر رکی اس کی پوری باڈی دھول میں
اٹی ہوئی ہے۔ کھڑکی کھلی اور ایک خوب صورت نازک اندام آدمی نیچے
اترا اس نے پکار کر کہا

مرزا صاحب! آداب

علی مرزا اسے دیکھ کر حیران ہوا اور ہنستے ہوئے موٹر کی سمت بڑھا

منیر تم کہاں؟

مشاعرے سے لوٹ رہا ہوں، سڑک خوب بنائی ہے تم نے
مرزا، ہم بڑے غور سے دیکھتے آرہے ہیں۔

ابھی تو ساٹھ میل کے قریب باقی ہے

وہ بھی بن جائے گی —! —— منیر نے بات ختم کرکے عجب انداز سے
مزدوروں کو دیکھا ہے جو بڑے اطمینان سے دھوپ میں کھڑے ہیں ان کے
چہروں پر تھکن کے آثار نہیں ہیں، وہ سڑک کی لمبائی کو علی مرزا کی طرح پچاس
میل نہیں پچاس قدم سمجھ رہے ہیں۔ منیر نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا

ہم کو تسلیم نکونامئ فرہاد نہیں

ہمارے زمانے کے فرہاد یہ ہیں، میں انھیں کے لئے شعر کہتا ہوں

ہرنام سنگھ نے گھور کر علی مرزا کو دیکھا جیسے وہ منیر کو بارود کے قریب پڑی
چنگاری سمجھ رہا ہو اور جلد سے جلد بجھا دینا چاہتا ہو

یہ مشاعرہ نہیں مرزا، ہرنام سنگھ نے ذرا تلخی کے ساتھ کہا، مشاعرہ
ہر جگہ ہے سردار جی جہاں زندگی ہو اور جہاں زندگی کے یہ معمار ہوں اور
آپ ان کے ان داتا ہوں، وہیں مشاعرہ ہے۔

اس آفت کو یہاں سے ٹال مرزے۔ ہرنام سنگھ نے آہستہ سے
مرزا کو مخاطب کرکے کہا۔

پانی پیو گے منیر؟ علی مرزا نے جلدی سے بات کاٹی

کہاں ملے گا؟

میرے پاس ہے کپی میں ——

کپی کا پانی کس کس کو پلاؤ گے مرزا، ابھی کئی بچوں کو پیڑ کے نیچے
روتا چھوڑ آیا ہوں وہ پانی مانگ رہے تھے۔ مزدوروں کے کیمپ میں بھوک
تو ہر جگہ مل جاتی ہے، تمھارے یہاں پیاس بھی ہے۔ ایک عورت نے بتایا کہ
پانی دو میل پر ہے۔ یہاں سے شام کو عورتیں بھر لاتی ہیں، دن بھر کام کرتی
ہیں کبھی جلدی ہی پانی ختم ہو جاتا ہے، پیاس ہی اتنی لگتی ہوگی اس گرمی میں، تم
کوئی بندوبست کیوں نہیں کرتے پانی کا۔ ایک گاڑی صرف پانی لانے
کے لئے ہونی چاہیئے۔ مرزا صاحب ٹھیکیدار کی ان داتا نہ جانے کب سے تھا اب
اسے اندر دیوتا بھی بن جانا چاہیئے۔

زیادہ باتیں مت کرو پانی پیو ——

اس پانی سے صرف میرا ہی حلق تر ہو سکے گا، پلانا ہے تو سب کو پلاؤ ورنہ مجھے پیاسا ہی جانے دو۔ آدھا گھنٹہ بعد ہم ایسی جگہ پہونچ جائیں گے جہاں پانی ہی پانی ہوگا، اس نے موٹر میں بیٹھ کر کھڑکی بند کرلی، موٹر چلی تو منیر ہاتھ نچا کر بولا

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلیں

بیوکوف! ــــ سردار ہرنام سنگھ دانت پیستے ہوئے بولا، سماج شاعری سے نہیں سڑکوں سے بنتا ہے، پوئٹری سے ترقی ممکن نہیں سب کو پانی پلانا ہے تو سڑکیں اور بند بناؤ، کام چور کہیں کے ہاتھ پاؤں ہلاتے نہیں اور زمانہ بھر کو ساتھ لے کر چلنے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ بیچ میں سو آدمی پیدل چلتے ملے ہوں گے کس کس سے کہا ہوگا اس نے اپنے ساتھ موٹر میں بیٹھنے کو؟ سب کہنے کی باتیں ہیں کوئی کسی کو ساتھ لے کر نہیں چلتا اسی طرح لوگوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے شاعر بھی آگے چلا جاتا ہے اور ادیب بھی، ــــ نعرے باز! چل مکندرا ادھی نکال اور ٹینک میں پانی ڈال۔

ایک مزدور اپنا نام سن کر دوڑا اور ادھی میں بھرا ہوا پانی ٹینک میں الٹ دیا ہرنام سنگھ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، اس کے پاؤں کمانیوں پر ہیں اور ہاتھ اسٹیرنگ پر جمے ہوئے ہیں۔

انہیں پیسے کیوں نہیں دیدیئے! ادم پرکاش نے ہرنام سنگھ کے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

چپ رہو، سالے بے ایمان ہیں، پورے پیسے ہم کبھی نہیں دیتے ایسا نہ کریں تو ان میں سے ایک بھی یہاں دکھائی نہ دے۔ جو نکلتا ہے وہ دینا ہی چاہیئے، کھائیں گے کہاں سے؟ کھانے کو ان کے پاس بہت ہے ہم نے راشن کی دوکان کھول دی ہے۔ جانتے ہو ایک مدد پر کتنی ہزار خرچ ہو جاتے ہیں اور موقع پاتے ہی مدد اس طرح بھاگ جاتی ہے، جیسے ٹڈی دل کھیت چاٹ کر اڑ جاتا ہے ان لوگوں پر ڈیڑھ ہزار باقی ہیں ہر ہفتہ آدھے پیسے پیشگی میں کاٹ لئے جاتے ہیں۔

اور کم کا تاکرود دیکھتے نہیں ہو، ان کے بچے ننگے ہیں، عورتوں کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے ہیں۔

ان کو کپڑے تو بنا دے بڑا عاشق مزاج ہے تو!

ادم پرکاش چپ ہو گیا، اس کے دل میں محبت کا دریا چپکے ہی چپکے امنڈتا رہا، جیب فراٹے بھرنے لگی، ذرا دیر بعد ادم پرکاش پوچھا ــــ

کونسا شعر پڑھا تھا مرزے تمھارے شاعر دوست نے،

غالب کا ایک مصرعہ تھا شعر نہیں تھا۔

کیا مطلب تھا اس کا؟

یہی کہ فرہاد جو شیریں کے عشق میں پہاڑ کھود کر جوئے شیر کا لایا تھا اور جس کی شہرت اب تک ہے وہ ان مزدوروں کے مقابلہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ دھوپ کی اس حدت میں لمبی لمبی سڑکیں بنا رہے ہیں جن سے تہذیب میں ترقی ہوتی ہے۔

ٹھیک کہہ رہا تھا وہ! مگر یہ جوئے شیر کیا ہوتی ہے؟ دودھ کی نہر ــــ! شاعروں نے یوں ہی افسانے بنا رکھے ہیں پرکاش، فرہاد دودھ کی نہر کہاں سے لاتا ممکن ہے اس نے دو چار میل لمبی سڑک بنائی ہو بادشاہ کی تفریح کے لئے۔

ہاں ہاں ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا اور بادشاہ بہت سی عورتوں کو ساتھ لے کر گھوڑا گاڑی میں شکار کھیلنے گیا ہوگا اور ان مزدوروں جو سڑک بنائی ہے اس پر سے ہزاروں ٹرک عوام کے کھانے پینے کی چیزیں اور دوائیں لیکر گذرا کریں گے یہ سڑک سچ مچ کی جوئے شیر ہے اور یہ مزدور ہیں ہمارے سماج کے ــ!

پھر پورے پیسے کیوں نہیں دیتے تم انہیں،

یہ مت پوچھو پرکاش! مرزا ہنس کر بولا:

ہرنام اپنے زمانے کا خسرو ہے وہ شیریں کو اپنے محل میں رکھے گا۔ اور ان فرہادوں کا خون چوستا رہے گا۔

ہرنام سنگھ چڑ گیا اس نے دوربین جیب سے نکال کر جیپ روک دی اور جنگل میں ادھر ادھر کچھ دیکھنے لگا، ممکن ہے وہ آنے والے وقت کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو، جب یہ فرہاد اس محل کو بھی سڑک میں تبدیل کر دینگے ــ!

آمنہ ابوالحسن

تیسرا طوفان

جب میری آنکھ کھلی تو میں اُس بڑے جہاز میں سوار ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ اور بھی لوگ تھے اور ہم سب کو اپنی اپنی منزلوں تک جانا تھا میری ماں کی شفیق نظریں اور میرے باپ کے مضبوط ہاتھ کا سہارا مجھ سے چھن چکا تھا اور اب اکیلے ہی مجھے یہ سارا سفر طے کرنا تھا۔ میرے بہن بھائیوں اور دوست احباب کے چہرے میرے اطراف پھولوں کی طرح کِھلے ہوئے تھے اور ان کی مہک سے زندگی پاکر میں دم بدم آگے بڑھ رہی تھی۔ جس طرح بیل منڈوے کا سہارا پاکر پھیلتی ہے میں بھی یگانگت کی طاقتوں سے مالا مال بڑھتی رہی۔ میری ذہنی بالیدگی اور میرا جسمانی ارتقاء ان شدید رجحانات کا سخت حامل ہے جو مجھے کشمکش ذات کے اس سفر سے حاصل ہوئے۔

اس سفر پر چلنے سے پہلے میں نے نہیں سوچا تھا اتنی مشکلات ہونگی ایسی سخت آزمائش۔ پلٹ کر دیکھنا میری عادت نہیں۔ گھوم کر چھوڑی ہوئی گذرگاہ کو دیکھنا بھی عادت نہیں اس لئے کبھی نہ اپنے نقش قدم دیکھے نہ پاؤں کے چھالے۔ دنیا کے گھور اندھیرے میں جو ننھا چراغ ہستی کی ظلمت میں جلتا رہا' اُسی کی روشنی کی زد میں دھیرے دھیرے بڑھتی رہی۔ کتنے موڑ، کتنے نشیب و فراز پھلانگ ڈالے۔ کہیں بھی تو پل بھر کے لئے نہیں ٹھٹکی لیکن جب چونکی تو مجھے احساس ہوا ضرور کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہے۔ کوئی ایسا واقعہ جس

کے پیچھے صدیوں قرنوں کا طوفان اکھٹا چھپا بیٹھا ہے۔ طوفانوں سے ٹکر لینا پسند بھی ہے۔ یہ پتہ تو چل ہی جاتا ہے کہ کس کی طاقت زیادہ ہے۔ کون زیادہ ثابت قدم اور جری۔ ٹکر لینے والا یا دینے والا۔ بعض اضطراب کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ جن میں سکون بھی ہوتا ہے۔ ہل چل بھی۔ جیسے گہرے سمندر کی سطح پر چھپا ہوا بھنور۔ بھنور سے نکل آنے کی کشمکش تو وہی جانے جو ایک بار اس چکر میں پھنس گیا ہو لیکن کنارے پر کھڑے رہنے والوں کے لئے تو یہ فقط ایک تماشہ ہی ہے۔ گھومتے گھومتے کسی چیز کا غائب ہو جانا۔ یوں بھی زندگی بھر انسان ڈوبتے ابھرتے ہی رہتے ہیں۔ حوادث کے سیل گراں میں تو پھر کوئی کہاں تک انکا غم کرے۔ اسی لئے پھولوں کی طرح میں نے ہمیشہ اپنے زخم گنے۔ آج چمن میں کتنے پھول کِھلے اور آج دل پر کتنے داغ پڑے۔ داغوں اور پھولوں میں یوں تو کوئی مماثلت نہیں۔ دور کا تعلق بھی نہیں۔ ذرا سی بھی نسبت نہیں لیکن سوچئے تو پتہ چلے کِھلا ہوا پھول زندگی سے عبارت ہے اور روندا ہوا پھول زخم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی لئے میں پھولوں سے بہت خائف بھی رہتی ہوں۔ مجھے ان کی نزاکت سے ہر وقت خدشہ رہتا ہے۔ یہ ننھے نازک بدن سختیاں کس طرح برداشت کرینگے۔ لیکن میں نے یہ بھی دیکھا ہے چنچل سے چنچل کومل سے کومل پھول دن بھر کی دھوپ سہتا دھول سہتا۔ سرد و گرم سہتا ہے، تب کہیں کوئی آنکھ۔ کوئی نظر۔ کوئی دل

لے بلند نگاہی کا خراج پیش کرتا ہے۔ یہاں پہنچ کر زندگی ختم ہو جاتی ہے اسے زیست کا وہ دوام حاصل ہو جاتا ہے جو اس طویل کشمکش نے اُسے دیا۔ اور کتنے ہی تہی دست ایسے ہوں گے کتنے مفلس جن کے پاس یہ نگاہ نہیں جنھوں نے خود اس نگاہ سے کسی کو نہیں دیکھا اور کبھی نے انھیں دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس صبح میں نے اپنے ہمسفر ساتھیوں سے پوچھا تھا۔ دوستو! اپنی اپنی منزلوں کا پتہ بتاؤ۔ ساتھیوں میں ایک آدمی مسکرایا تھا۔ منزل کی تلاش کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔ سدا بھٹکتے رہتے ہیں۔ سفر تو کسی تعین کے بغیر شروع کرنا چاہیے۔ مزا بھی اسی میں ہے کہ منزلیں خود چل کر قدموں تک آئیں۔ وہ پھر اُس کے پیچھے سے سورج نے دفعتاً سر نکال کر اس بات کی گواہی دی کہ اس بے وطن کے سفر کے لئے میری کوئی سوچ، کوئی فکر کوئی تلاش نہیں۔ میں تو بس چل پڑا ہوں۔ منزلیں خود بخود بن جائیں گی۔

سنہری روشنی میں ذہین۔ احمق۔ فکرمند۔ خوش طبع چہرے جگمگا اٹھے تھے۔ نور کی چھوٹ سب پر یکساں تھی۔ لیکن نور کا اکتساب ہر چہرے کے بس کی بات نہیں۔ تب میں نے سوچا تھا کہ اکتساب ایک بڑا عمل ہے جو ہمت۔ سوجھ بوجھ اور جرأت چاہتا ہے جو انسان کو ممتاز و ممیز کرتا ہے۔ طالب جیسے بہت سے انسانوں کے درمیان اور تبھی میں نے خود کو ہر حد جبری پایا تھا۔ بڑے فخر سے آسمان کی بلندیوں اور سمندر کی گہرائیوں کی جانب دیکھا تھا۔۔۔

میں تمہیں کھوج لوں گی۔ خود کھو جاؤں گی، کیونکہ اب مجھے کسی شئے سے خوف نہیں محسوس ہوتا۔ خوف دراصل وہ جذباتی کیفیت ہے جو منفی اثر کے نتیجے میں خود کو ظاہر کرتی ہے۔ مثبت پہلوؤں سے زبردست شکست خوردگی کی صورت میں لیکن اگر اس کیفیت سے لڑا جائے اس کا مقابلہ کیا جا تو خود بہت بزدل ثابت ہوتی ہے۔۔۔ اور جیسے آرا ہو گئی تب سے وہ چہرہ میرا ساتھی بن گیا۔ اس چہرے کی ضد میں سیکڑوں خوبصورت اور دلنواز چہرے میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ خوب صورتی کو پا لینے کی جستجو سے میں کوسوں میلوں دور ہٹ گئی۔ جیسے خوبصورتی ایک چشمہ ہو، ٹھنڈا اور میٹھا وقتی طور پر بہبود کرنے والا دنیا نے شناسائی ایک سمندر۔ گہرا اور ناقابل عبور۔ جتنا چلو فاصلہ بڑھتا جائے۔ تجربہ بڑھتا جائے۔ طلب بڑھتی چلی جائے۔

پھر میں اس چہرے کے خدوخال ابھارتی رہی جیسے یہی میری زندگی کا [illegible] یہی میرا مقصد ہو۔ یہی وہ دریچہ ہے جس سے جھانک کر میں نے اتنی بڑی [illegible] ہوئی دنیا کو صاف اور صریح انداز میں دیکھ لیا۔ میں اس دریچے کو اپنے دل میں بند کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ جب جب آسمان پر چاند چلتے چلتے رک جاتا میں اس دریچے کے آگے ٹھہر جاتی۔

ہمارے درمیان کہر میں ملفوف دنیا یکلخت اپنی جگہ سے سرک جا [illegible] تب ہم دونوں ہی مسکرا پڑتے، میں تعجب سے سوچتی بھلا چاند کس طرح مسکرا [illegible] ہے؟ لیکن آج مجھے محسوس ہوتا ہے جب کوئی امنگ دل میں انگڑائی لے [illegible] ہے۔ کوئی طاقت خود کو منوا لیتی ہے تو یہ چاند کی مسکراہٹ کا عکس ہی [illegible] ہے۔ پھر جہاز بندرگاہ پر پہنچنے سے پہلے اچانک طوفان سے آشنا [illegible] ہم سب ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ دنیا کے میلے میں ایک دوسرے سے کھو [illegible] دور پرے ۔۔۔ کسی نے تختے کا سہارا لیا ۔۔۔ کسی نے شہتیر کا۔ کوئی [illegible] کے گھونٹ برداشت کرتا رہا۔ کوئی خشک ریتیلے ساحل پر دور جا پڑا ۔۔۔ ہوش میں آئی تو پھر ایک کشتی پر سوار تھی۔ کشتی کھینے والے نے مجھے پناہ دی [illegible] وہ میرا امین تھا۔ میری پذیرائی کا متمنی ۔۔۔ میں نے آنکھیں مَل مَل کے سوچا کیسے ممکن ہو سکتا ہے ایک بالکل ہی نئے آدمی سے سمجھوتہ ۔۔۔؟ ۔۔۔ [illegible] نے فوراً اس چہرے کو ڈھونڈا، مقابل والے چہرے پر اس کا اطلاق کرنا [illegible] لیکن یہ کیسی بعید از امکان کوشش تھی۔ میں اُسے کھو چکی تھی ۔۔۔ کم [illegible] میں سوچتی ۔۔۔ عمر کی ابتدائی منزل پر راہ سمجھانے والا وہ آدمی بہت [illegible] تھا لیکن اُسے پالینے کی میری خواہش کتنی نوجوان تو مجھے ایک بچ [illegible] سی کہاتی ۔۔۔ ناچار مجھے اپنے موتیوں کی تلاش ترک کرنا پڑی۔ دور [illegible] اس نئے تجربے پر حیران مگر مطمئن پڑی رہی۔ شاید میرا ہمسفر بھی کچھ د [illegible] ہوا خود سے تھک کر سو چکا تھا ۔۔۔ چھ سال کی لمبی نیند کے بعد ایک دن جاگی تو دیکھا نئے چہرے پر ایک حیرت ناک مرحلہ تیار کھڑا تھا وہی چہرہ تھا جو برسوں میری طلب کے حافظے میں محفوظ رہا۔ جو ایک [illegible] لمحے سات کہاں اچانک مجھ سے بچھڑ گیا اور اب دوبارہ [illegible] میرے ٹک جوان اور تندرست تھا ۔۔۔ میں چونک گئی ۔۔۔ اس [illegible] کے آگے میری ہستی کے سمندر نے خود بخود ہتھیار ڈال دیئے [illegible]

بانیں اپنی جگہ سے سرک گئیں۔ صدیوں، قرنوں کی خواہشات میری اکیلی ہستی پر
پوری قوت سے یورش کرنے لگیں۔ میں بچتی رہی۔ بچتی رہی۔ بچتی رہی مگر
کب تک ـــ؟ ایک سہ پہر جب پھر طوفان آیا اور سب کے موتیوں کی
کھوج کرنے والے اس نوجوان کو اپنی لپیٹ میں بہالے گیا تو میں بھی زندگی کے
سارے آداب بھول کر گہرے خطرناک سمندر میں کود پڑی۔ میں تمہیں ڈوبنے
نہ دوں گی۔ میں تمہیں مٹنے نہ دوں گی۔ تمہیں پھر نہ کھوؤں گی۔ اس بار آنکھ
کھلنے پر ہم دونوں ساحل کی ریت پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے جسم زخمی
ہماری طاقتیں نڈھال تھیں ـــ کچھ دیر ہم نے ٹکٹکی باندھ کر ایک دوسرے
کو دیکھا پھر میں نے دھیرے سے سوال کیا ـــ "کیا تم وہی ہو ـــ
وہی ـــ؟؟" اس نے میرا سوال اَن سنا کرتے ہوئے کہا "عجیب بات
ہے۔ آج سے چند برسوں پہلے اسی طرح کے ایک خوفناک طوفان نے میرے
والد کی جان لی تھی معہ اسباب ـــ" پھر وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا "کیا میں
زندہ ہوں" اس نے جلد جلد ہذیانی انداز میں اپنے ہاتھ پیر سہلائے ـــ
پھر مسرت کے ایک فلک شگاف نعرے کے بعد جھک کر مجھے سہارا دیا۔
"مگر تم کس طرح سمندر میں کود پڑیں۔ میں تو اکیلا ڈوبا تھا ـــ" میں نے
اپنی زخمی آرزو کی پوری تڑپ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا "شوق
مشترک ـــ موتیوں کی تلاش ـــ؟" وہ ہنسا، پھر ہم دونوں
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ـــ ایک دوسرے کا سہارا لیتے آگے بڑھے۔ تھکن
اور اضطراب کے باوجود گرم ریت پھولوں کی طرح نرم محسوس ہوئی اور آن
ملاقات وصل کے آگے چھ سال کسی غیر محسوس مختصر عرصے کی طرح یکلخت
فراموش ہو گئے ـــ چھ سال جو میری زندگی کا ایک اہم حصہ تھے لیکن محسوس
ہوا جیسے میری زندگی کا وہ حصہ ایک امانت تھی جو میں نے اوروں کے
ہاں بغرض ضرورت رکھوائی لیکن جب واپس لینا چاہی تو معلوم ہوا دنیا
کے دستور کے مطابق اس کا رکھوالا ہی اس کا مالک و حکمران بن چکا ہے
میں نے بے بسی سے اپنی آرزو کی جانب دیکھا۔ میں نے خود کو اتنا مجبور کبھی
نہیں پایا ـــ "کوئی بات نہیں" ـــ اس نے تشفی آمیز انداز میں سمجھایا۔ "کبھی
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ـــ مگر سنو کیا تمہیں سفر کا تجربہ ہے؟ تم اپنے ارادے
میں مستقل اور ثابت قدم رہ سکو گی ـــ؟" میں نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا

لیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ ساری کائنات گھوم رہی تھی ـــ پھر میں نے کسی
اضطراری قوت سے مجبور ہو کر اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹالئے۔ آنکھوں پہ ہاتھوں
کا چھجہ بنا کر ساحل کی دوسری سمت اپنا گھر تلاش کیا۔ گھر جو میری چھ سالہ
رفاقت کا ساتھی تھا ـــ "اس طرف میرا ایک گھر ہے ـــ" میرے ساتھی
نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے جھلے سے کہا "ہوا کرے۔ میرا
بھی تو ایک گھر ہے" میں نے دوسرے اضطرار سے اس کی طرف دیکھا
اور اس گھر میں کون کون ہے؟" "میرا خاندان ـــ" "خاندان؟"
میرا سر پھر گھوم گیا ـــ میں نے پھر اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور
کسی ناقابل قبول کرب کے اثر سے سسک پڑی۔ "ونہیں" اس نے
سنجیدہ لہجے میں کہا "آنسو کمزوری کی نشانی ہوتے ہیں" پھر اس
نے بڑے فروغ سے میری آنکھیں چوم لیں اور مجھے اس کے لہجے میں وہی
شدت وہی عزم، وہی جادو محسوس ہوا جو میرے جہاز کے پہلے رفیق اور
ساتھی کے لہجے میں تھا۔ محکم ہے، طاقت سے توانائیوں سے بھرپور ایک
حکم کی طرح ـــ اور دفعتہً مجھے اپنی آنکھوں پر اس کے ہونٹوں کا لمس اس
پہلے لطیف بوسے سے بالکل مشابہ لگا جو بابا آدم اور اماں حوا کے درمیان
کبھی وجہ حیات بنا ہوگا۔ میں نے دھیرے سے جیسے کوئی نو زائیدہ زندگی کا آنچل
کھولے۔ اپنی آنسوؤں سے تر بتر آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھتے
ہوئے بولی "تو اتنی بڑی دنیا میں ان دو ننھے گھروں کا کیا ہوگا ـــ؟"
"خدا کرے ایک اور طوفان آئے ـــ تیز زبردست فیصلہ کن طوفان۔
اور اس طوفان میں ساری دنیا تباہ ہو جائے صرف تم اور میں باقی رہ جائیں"
"نہیں نہیں" میں نے سہم کر کہا "ایسی خوفناک باتیں نہ کرو ـــ"
"ڈرو نہیں ـــ ہم پھر دنیا بسائیں گے۔ زیادہ خوبصورت، متوازن دنیا"
"مگر ـــ" میرا دل اپنی ساری اچھوتی خواہشات کے باوجود اس بات
پر تیار نہ ہوا کہ میرے چھ سالہ گھر خواہ مخواہ طوفان کی نذر ہو جائے ـــ اس
نے ایک عجیب قہقہہ لگایا۔ دنیا ایک بڑی بندرگاہ ہے اور انسانی ہستی فقط
ایک جہاز ـــــــــــ میں نے خالی خالی آنکھوں سے الجھتے ہوئے
بگولوں کو دیکھا ـــ "تمہیں ڈوبنا پسند ہے؟ مجھے یقین ہے میں مر جاؤں گا۔
"نہیں نہیں" میں نے پہلے سے بھی زیادہ سہم کر کہا "یہ بہت وحشیانہ طریقہ ہے"

اسے بلند نگاہی کا خراج پیش کرتا ہے۔ یہاں پہچان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اسے زیست کا وہ دوام حاصل ہو جاتا ہے جو اس طویل کشمکش نے اسے دیا۔ اور کتنے ہی تہی دست ہیں وہ کتنے مفلس جن کے پاس یہ نگاہ نہیں جنھوں نے خود اس نگاہ سے کسی کو نہیں دیکھا اور کبھی نے انھیں دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس صبح میں نے اپنے مسافر ساتھیوں سے پوچھا تھا۔ دوستو! اپنی اپنی منزلوں کا پتہ بتاؤ۔ ساتھیوں میں ایک آدمی مسکرایا تھا۔ منزل کی تلاش کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔ سدا بھٹکتے رہتے ہیں۔ سفر تو کسی تعین کے بغیر شروع کرنا چاہیئے۔ مزا بھی اسی میں ہے کہ منزلیں خود چل کر قدموں تک آئیں اور پھر اُفق کے سپید سے سویرے نے دفعتاً سر نکال کر اس بات کی گواہی دی کہ اس بے وطن کے سفر کے لئے میری کوئی سوچ، کوئی فکر کوئی تلاش نہیں۔ میں تو بس چل پڑا ہوں۔ منزلیں خود بخود بن جائیں گی۔

سنہری روشنی میں ذہین۔ احمق۔ فکر مند۔ خوش طبع چہرے جگمگا اٹھے تھے۔ نور کی چھوٹ سب پر یکساں تھی لیکن نور کا اکتساب ہر چہرے کے بس کی بات نہیں۔ تب میں نے سوچا تھا کہ اکتساب ایک بڑا عمل ہے جو ہمت — سوجھ بوجھ اور جرأت چاہتا ہے جو انسان کو ممتاز اور ممیز کرتا ہے علاحدہ جیسے بہت سے انسانوں کے درمیان اور تبھی میں نے خود کو از حد جری پایا تھا۔ بڑے فخر سے آسمان کی بلندیوں اور سمندر کی گہرائیوں کی جانب دیکھا تھا —

میں تمہیں کھوج لوں گی۔ خود کھو جاؤں گی، کیونکہ اب مجھے کسی شئے سے خوف نہیں محسوس ہوتا۔ خوف دراصل وہ جذباتی کیفیت ہے جو منفی اثر کے نتیجے میں خود کو ظاہر کرتی ہے۔ مثبت پہلوؤں سے زبردست شکست خوردگی کی صورت میں لیکن اگر اس کیفیت سے لڑا جائے اس کا مقابلہ کیا جائے تو یہ خود بہت بزدل ثابت ہوتی ہے — اور میں صف آرا ہو گئی۔ تب سے وہ چہرہ میرا ساتھی بن گیا۔ اس چہرے کی ضد میں سیکڑوں خوبصورت اور دلنواز چہرے میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ خوب صورتی کو پالینے کی جستجو سے میں کوسوں میل دور ہٹ گئی۔ جیسے خوبصورتی ایک چشمہ ہو۔ ٹھنڈا اور میٹھا وقتی طور پر بیہودہ کرنے والا دنیا نے شناسائی ایک سمندر۔ گہرا اور ناقابل عبور۔ جتنا چلو فاصلہ بڑھتا جائے۔ تجربہ بڑھتا جائے۔ طلب بڑھتی جائے۔

پھر میں اس چہرے کے خدوخال ابھارتی رہی جیسے یہی میری زندگی کا محور یہی میرا مقصد ہو۔ یہی وہ دریچہ جس سے جھانک کر میں نے اتنی بڑی پھیلی ہوئی دنیا کو صاف اور صریح انداز میں دیکھ لیا۔ میں اس دریچے کو اپنے دل میں بند نہ کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ جب جب آسمان پر چاند چلتے چلتے رک جاتا میں اس دریچے کے آگے ٹھہر جاتی۔

ہمارے درمیان کہر میں ملفوف دنیا یکلخت اپنی جگہ سے سرک جاتی تب ہم دونوں ہی مسکرا پڑتے۔ میں تعجب سے سوچتی بھلا چاند کس طرح مسکرا سکتا ہے؟ لیکن آج مجھے محسوس ہوتا ہے جب کوئی امنگ دل میں انگڑائی لیتی ہے۔ کوئی طاقت خود کو منوا لیتی ہے تو یہ چاند کی مسکراہٹ کا عکس ہی تو ہوتا ہے۔ پھر جہاز بندرگاہ پر پہونچنے سے پہلے اچانک طوفان سے آشنا ہو گیا ہم سب ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ دنیا کے میلے میں ایک دوسرے سے کہیں دور پڑے — کسی نے تنکے کا سہارا لیا — کسی نے شہتیر کا۔ کوئی تھپیڑوں کے گھاؤ برداشت کرتا رہا۔ کوئی خشک ریتیلے ساحل پر دور جا پڑا — میں ہوش میں آئی تو پھر ایک کشتی پر سوار تھی۔ کشتی کھینے والے نے مجھے پناہ دی تھی۔ وہ میرا امین تھا۔ میری پذیرائی کا متمنی — میں نے آنکھیں مل مل کے سوچا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ایک بالکل ہی نئے آدمی سے سمجھوتہ —؟ — میں نے فوراً اس چہرے کو ڈھونڈا، مقابل والے چہرے پر اس کا اطلاق کرنا چاہا۔ لیکن یہ کیسی بعید اور ناممکن کوشش تھی۔ میں اُسے کھو چکی تھی — کبھی کبھی میں سوچتی — عمر کی ابتدائی منزل پر راہ سمجھانے والا وہ آدمی بہت بوڑھا تھا لیکن اسے پالینے کی میری خواہش کتنی نوجوان تو مجھے ایک لمبی بھربری سی آجاتی — ناچار مجھے اپنی موتیوں کی تلاش ترک کرنا پڑی۔ دونوں ہی اپنے اس نئے تجربے پر حیران مگر مطمئن پڑی رہی۔ شاید میرا رہبر بھی کچھ دیر کیلئے ہنگاموں سے تھک کر سو چکا تھا — چھے سال کی لمبی نیند کے بعد جب میں ایک دن جاگی تو میرے لئے پھر ایک حیرت ناک مرحلہ تیار کھڑا تھا — یہ وہی چہرہ تھا جو برسوں میری طلب کے حافظے میں محفوظ رہا۔ جو ایک خطرناک طریقے سے مات کھا کر اچانک مجھ سے بچھڑ گیا اور اب دوبارہ ملنے پر حیرت کی حد تک جوان اور تندرست تھا — میں چونک گئی — اس غیر متوقع ملاقات کے آگے میری ہستی کے سمندر نے دفعتاً اپنا رخ موڑ دیا۔ [illegible]

چٹانیں اپنی جگہ سے سرک گئیں۔ صدیوں، قرنوں کی خواہشات میری اکیلی ہستی پر پوری قوت سے یورش کرنے لگیں۔ میں بچتی رہی۔ بچتی رہی۔ بچتی رہی مگر کب تک ——؟ ایک سہ پہر جب پھر طوفان آیا اور اب کے موتیوں کی کھوج کرنے والے اس نوجوان کو اپنی لپیٹ میں بہالے گیا تو میں بھی زندگی کے سارے آداب بھول کر گہرے خطرناک سمندر میں کود پڑی۔ میں تمہیں ڈوبنے نہ دوں گی۔ میں تمہیں مٹنے نہ دوں گی۔ تمہیں پھر نہ کھوؤں گی۔ اس بالآخر کھلے پر ہم دونوں ساحل کی ریت پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے جسم زخمی ہماری طاقتیں نڈھال تھیں —— کچھ دیر ہم نے ٹکٹکی باندھ کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر میں نے دھیرے سے سوال کیا —— "کیا تم وہی ہو —— وہی ——؟" اس نے میرا سوال آن سنا کرتے ہوئے کہا "عجیب بات ہے۔ آج سے چند برسوں پہلے اسی طرح کے ایک خوفناک طوفان نے میرے والد کی جان لی تھی اور اب ——" پھر وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا "کیا میں زندہ ہوں" اس نے جلد جلد ہذیانی انداز میں اپنے ہاتھ پیر سہلائے —— پھر مسرت کے ایک فلک شگاف نعرے کے بعد جھک کر مجھے سہارا دیا۔ "مگر تم کس طرح سمندر میں کود پڑیں۔ میں تو اکیلا ڈوبا تھا ——" میں نے اپنی زخمی آرزو کی پوری تڑپ کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں جھانکا "شوقِ مشترک ——" "موتیوں کی تلاش ——؟" وہ ہنسا، پھر ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے —— ایک دوسرے کا سہارا لیتے آگے بڑھے۔ تھکن اور اضطراب کے باوجود گرم ریت پھولوں کی طرح نرم محسوس ہوئی اور اس طاقت ور لمحے کے آگے چھ سال کسی غیر محسوس مختصر عرصے کی طرح یکلخت فراموش ہو گئے —— چھ سال جو میری زندگی کا ایک اہم حصہ تھے لیکن محسوس ہوا جیسے میری زندگی کا وہ حصہ ایک امانت تھی جو میں نے اوروں کے ہاں بغرضِ ضرورت رکھوائی لیکن جب واپس لینا چاہی تو معلوم ہوا دنیا کے دستور کے مطابق اس کا رکھوالا ہی اس کا مالک و حکمران بن چکا ہے میں نے بے بسی سے اپنی آرزو کی جانب دیکھا۔ میں نے خود کو اتنا مجبور کبھی نہیں پایا —— "کوئی بات نہیں" —— اس نے تشفی آمیز انداز میں سمجھایا۔ "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے —— مگر سنو کیا تمہیں سفر کا تجربہ ہے؟ تم اپنے ارادے میں مستقل اور ثابت قدم رہ سکو گی ——؟" میں نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ ساری کائنات گھوم رہی تھی —— پھر میں نے کسی اضطراری قوت سے مجبور ہو کر اپنی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔ آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجہ بنا کر ساحل کی دوسری سمت اپنا گھر تلاش کیا۔ گھر جو میری چھ سالہ رفاقت کا ساتھی تھا —— "اس طرف میرا ایک گھر ہے ——" میرے ساتھی نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے بھولے سے کہا "ہوا کرے۔ میرا بھی تو ایک گھر ہے ——" میں نے رونے اضطرار سے اس کی طرف دیکھا "اور اس گھر میں کون کون ہے؟" "میرا خاندان ——" "خاندان؟" میرا سر پھر گھوم گیا —— میں نے پھر اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور کسی ناقابلِ قبول کرب کے اثر سے سسک پڑی۔ "رو نہیں" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا "آنسو کمزوری کی نشانی ہوتے ہیں" پھر اس نے بڑے غرور سے میری آنکھیں چوم لیں اور مجھے اس کے لہجے میں وہی شدت وہی عزم، وہی جاذبیت محسوس ہوا جو میرے جہاز کے پہلے رفیق اور ساتھی کے لہجے میں تھا۔ تحکم نے، طاقت سے توانائیوں سے بھرپور ایک حکم کی طرح —— اور دفعتہً مجھے اپنی آنکھوں پر اس کے ہونٹوں کا لمس اس پہلے لطیف بوسے سے بالکل مشابہ لگا جو بابا آدم اور اماں حوا کے درمیان کبھی وجہِ حیات بنا ہوگا۔ میں نے دھیرے سے جیسے کوئی نوزائیدہ زندگی کا آغاز کرے۔ اپنی آنسوؤں سے تربتر آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تو اتنی بڑی دنیا میں ان دو ننھے گھروں کا کیا ہوگا ——؟"

"خدا کرے ایک اور طوفان آئے —— تیز، زبردست، فیصلہ کن طوفان. اور اس طوفان میں ساری دنیا تباہ ہو جائے صرف تم اور میں باقی رہ جائیں"

"نہیں نہیں" میں نے سہم کر کہا "ایسی خوفناک باتیں نہ کرو ——"

"ڈرو نہیں —— ہم پھر دنیا بسائیں گے۔ زیادہ خوبصورت، متوازن دنیا"

"مگر ——" میرا دل اپنی ساری اچھوتی خواہشات کے باوجود اس بات پر تیار نہ ہوا کہ میرے چھ سالہ گھر خواہ مخواہ طوفان کی نذر ہو جائے —— اس نے ایک عجیب قہقہہ لگایا۔ "دنیا ایک بڑی بندرگاہ ہے اور انسانی ہستی فقط ایک جہاز ——" میں نے خالی خالی آنکھوں سے الجھے ہوئے بگولوں کو دیکھا —— "تمہیں تبدیلی پسند ہے؟" "مجھے یقین ہے تم بہت جلد تنگ آ جاؤ گی۔ "نہیں شاید" میں نے پہلے سے بھی زیادہ سہم کر کہا "یہ بہت وحشیانہ طریقہ ہے"

" تو پھر مجھے بچایا کیوں تھا۔ ڈوب جانے دیا ہوتا ۔ میں اب تک اپنی زندگی سے مطمئن تھا مگر اب ۔ اب ۔ اسی لمحے سے میرا جی چاہتا ہے۔ اپنے گھر اپنے خاندان کو اس گہرے سمندر میں ڈبو دوں اور پھر خود بھی ڈوب جاؤں" میں اس سے ہاتھ چھڑا کر سرپٹ بھاگی ۔ اس کی وحشت ناک باتوں نے مجھ پر ہیبت طاری کر دی ۔ کچھ دیر تک وہ مجھے دوڑتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر چلا کر بولا ۔ " ٹھیرو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں اپنا تصفیہ بعد میں کروں گا ۔"

" کیسا تصفیہ ۔ ؟" میرے اٹھتے ہوئے قدم تھم گئے۔ میں اس کے اطمینان اور عزم سے ڈر گئی ۔ پھر جانے مجھے کیا ہوا ۔ میں دوڑ کر اس کے قریب گئی۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور زندگی کے دشت میں دفعتہً ہزاروں کلیاں کھل کر پھول بن گئیں شفق کے راستے کھل گئے کہکشاں کی سرنگیں وا ہو گئیں ....

تیسرے خطرناک ترین طوفان کا مقابلہ کرنے ہم دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔

نعیم زبیری

دیوار

کچھ ہی دیر پہلے جب ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو وہ بڑا پرسکون تھا، کچھ سوچ ضرور رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تمام نقوش اپنی اپنی جگہ موجود تھے جو عام طور پر پریشانی کے موقعہ پر آپس میں گڈمڈ ہوجاتے تھے۔

میز پر بیٹھتے ہی اس نے کچھ ایسی برہمی سے بیرے کو آواز دی جیسے مہینوں سے وہیں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہو، پھر اپنے لئے گہری اور میرے لئے لائٹ چائے کا آرڈر دے کر میز کے کنارے کو چپ چاپ کریدنے لگا۔

یہ عموماً اس کے ذہنی خلفشار کے آغاز کا پہلا اشارہ ہوتا تھا۔

اور پھر دوسرے اشارے تیزی سے نمودار ہونے شروع ہوگئے۔

وہ بار بار اپنے ہاتھ کو گال پر پھیر کر وہاں چپکی ہوئی کسی نامعلوم چیز کو نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ سر کی پچھلی طرف چلا گیا جہاں وہ بلامقصد بڑی دیر تک بال نوچنے میں مصروف رہا۔

"چلو یار — چلیں !!"

اس نے اچانک کرسی کی پشت پر پڑا ہوا اپنا قیمتی سوئٹر اٹھایا اور گٹھڑی سا بنا کر بغل میں دبا لیا۔

"کہاں — !؟"

میں نے بوکھلا کر پوچھا —

"کہیں بھی — یہاں مجھے وحشت ہو رہی ہے —!"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا جس ہوٹل میں جس وقت ہم بیٹھے تھے یہ شہر کا سب سے خوبصورت رنگین اور دلچسپ مقام تھا، جہاں لوگ اپنی فکروں کو بھولنے کے لئے آتے تھے۔ کاؤنٹر پہ سوریتا بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں آج اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ ہوٹل میں نہ تو لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور نہ ہال خالی خالی معلوم ہو رہا تھا۔ صاف ستھرے اور باذوق لوگ نیچی آوازمیں خوش گپیوں میں مصروف تھے اور فضا میں ہوائن گٹار پر کوئی رومانوی دھن بکھری ہوئی تھی۔

چائے آئی تو وہ بڑے اکتائے ہوئے انداز میں دوبارہ کرسی میں ڈھیر ہوگیا — سوئٹر اب بھی گٹھڑی بنا اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

وہ کچھ اس بُری طرح بوکھلایا ہوا تھا کہ کوئی اور میری جگہ ہوتا تو ضرور اس سے پوچھ بیٹھتا — "کیا بات ہے — !؟"

اور پھر اس کی آنکھوں میں ایسی وحشت اُبھر آئی کہ پوچھنے والا خود بھی بوکھلا جاتا لیکن میں جانتا تھا یہ ایک ایسا دورہ تھا جو ہفتہ میں ایک آدھ بار اس پر ضرور پڑتا تھا۔

سینما کی کیو میں کھڑے ہوئے ٹکٹ کا انتظار کرتے کرتے اچانک وہ جیسوں میں اس بُری طرح کچھ ٹٹولنے لگتا جیسے کوئی چیز گر گئی ہو اور اچانک کیو سے نکل کر کسی طرف چل دیتا اور پھر تھوڑی دیر بعد کسی ہوٹل میں بیٹھا خالی خالی

ں سے چھت کو گھورتا دکھائی دیتا۔ کہیں جاتے جاتے اچانک رکشا والے
بتے ہی میں روک دیتا اور اتر کر مخالف سمت میں چل پڑتا۔
اور ایسے میں وہ دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف معلوم ہوتا۔

"معلوم کیا ہوتا ہے؟ — درحقیقت وہ دنیا کا سب سے بڑا وقوف ہے۔" رشید نے ایک دفعہ جھنجلا کر کہا تھا — "اور خود تم بھی کم اپنے سب دوستوں میں سب سے بڑے بے وقوف ہو جو دن رات سیکل احمق کے ساتھ یوں لٹکے پھرتے ہو جیسے میونسپلٹی کی موٹر کے رے کا ٹریلر۔"

خود وہ بھی میرے دوستوں سے بُری طرح نالاں تھے۔
اس کا خیال تھا کہ
"رشید صورت سے مسخرا معلوم ہوتا ہے۔"
حالانکہ رشید کافی جاذب نظر شخصیت کا مالک ہے۔

حامد کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ "اسے اپنے ہاتھ میں کسی بڑے یب کی موٹی سی کتاب لٹکائے پھرنے کا شوق ہی شوق ہے۔ ورنہ اس کی نڈی کچھ بھی نہیں ہے۔"

حالانکہ حامد کی اسٹڈی کا دور دور تک شہرہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے دماغ کی حالت اب ایک ایسی کوٹھری کی ہے جس میں سیکڑوں تابوں کی ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں سطریں۔ الفاظ۔ پیراگراف نوان۔ اور حوالے کباڑ کی طرح بھرے ہوئے ہیں اور اس ڈھیر سے ضرورت کے وقت کوئی چیز مشکل ہی سے ملتی ہے۔

انتظار کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "یا تو اس کے والدین نے چہرے کی مناسبت سے اس کا نام رکھا تھا یا پھر نام کے ردعمل کے طور پر اس کے چہرے پر دائمی انتظار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔"

"اور شرما — عجیب پنجابی قسم کا آدمی ہے۔"

"ارے —" میں نے کہا "اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ وہ ہے بھی تو پنجابی —!!"

"ہاں — مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر پنجابی بالکل پنجابی قسم کا ہو"

"یہ پنجابی قسم کیا ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا

"کھردرا پن — بے مروتی — خود غرضی" اس نے پیشانی پر بل ڈالے چھت کو گھورتے ہوئے وضاحت کی۔

"لیکن شرما کھردرا، بے مروت اور خود غرض کہاں ہے؟" میں نے وکالت کی۔ "بے وقوف ہو تم —" اس نے انتہائی اعتماد کے ساتھ تشخیص کی "تم سائیکالوجی سے واقف نہیں ہو۔"

اور بالکل یہی خیال میرے ان دوستوں کا بھی تھا جو بَلّی (یعنی کسر بَل والے "بل" اور بلّی والی "ل") کے سلسلے میں حزب الاختلاف کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں بنیادی اعتراض تو اس کے وجود ہی پر تھا۔
"وہ کس سلسلے میں پیدا ہوا ہے؟"

یہ سوال مجھ سے یوں بار بار پوچھا جاتا، جیسے اسے تخلیق کرنے سے پہلے خدا نے مجھ سے مشورہ کیا تھا اور میری غلط رائے کی بناء پر اس کی تخلیق عمل میں آئی تھی!!

"کیسا گھٹیا اور بے تکا نام ہے — "بل — لی" حامد کہتا، کمبخت لمبا ہی ہوتا تو یہ نام کھپ جاتا —"
"مگر اس کا اصلی نام بلراج ہے۔" میں وضاحت کی کوشش کرتا۔
"وہ تو اور بھی بھدا ہے — اور بذاتِ خود یہ تمہارا بَلّی بھی صورت شکل کے اعتبار سے کچھ کم بھدا نہیں ہے۔"

لیکن یہ سراسر زیادتی تھی — کیونکہ بَلّی کچھ بھی ہو بدصورت ہرگز نہیں تھا۔ یہ میرا ایقان ہے کہ جس وقت تک دو آدمیوں میں کئی چیزیں مشترک نہ ہوں وہ ایک دوسرے کے قریبی دوست نہیں بن سکتے — لیکن ہر قانون کی طرح فطرت کے اس اٹل قانون کے سلسلے میں بھی شاید ایک استثنائی صورت موجود ہے۔

مجھ — بَلّی ہے
مجھ میں — اور اس میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے — اس کے برتاؤ میں کھردرا پن، بد اخلاقی کی حد تک بڑھا ہوا ہے — اس کی رائے ہر ایک کے بارے میں بُری ہے۔ وہ انتہائی بھڑکیلے اور شوخ رنگ کپڑے پسند کرتا ہے اور دن رات اسی تلاش میں رہتا ہے کہ کوئی "نیا" رنگ دستیاب ہو سکے چنانچہ ایک نئی قمیض کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ اس کا رنگ ایکدم

اٹو کھا اور انگلش قسم کا ہے۔ حالانکہ مجھے صدفی صد یقین ہے کہ یہ رنگ قطعی اُس قسم کا گیروا ہے بالکل ایسا جیسا سادھو لوگ پہنتے ہیں۔

انگلش کے بعض الفاظ کا تلفظ اس نے اپنے طور پر وضع کر رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس کا قطعی نجی معاملہ ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اس خود ساختہ تلفظ کو بڑے اعتماد سے دوسرے پر لادنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ حرکت وہ کچھ اس انداز سے کرتا ہے جیسے اصلاح دے رہا ہو۔ وہ پیسے لیکر بھول جاتا ہے لیکن دے کر ہمیشہ یاد رکھتا ہے اور وعدہ فراموشی کے سلسلے میں اخلاقیات کے درس دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اور ان ساری حرکتوں کے ردِ عمل کے طور پر اُبھرنے والے جذبات ہی کو غالباً نفرت ہی کہا جاتا ہے۔ !

لیکن ــــ وہ میرا دوست ہے ــــ! کیوں ؟ یہ میں خود بھی آج تک سمجھ نہیں پایا۔ وہ کون سا غیر مرئی بندھن ــــ کون سی قدرِ مشترک ہے جس نے مجھے اس کے قریب کر رکھا ہے۔ اپنے بادوق اور انتہائی پرخلوص دوستوں کی عدالت میں کیوں میں آئے دن اس کی وکالت کرتا ہوا پایا جاتا ہوں یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کا جواب آج تک مجھے نہیں سوجھ سکا۔

جلتی ہوئی چائے کو اس نے بُری صورت بنا کر جلدی جلدی حلق میں انڈیلا اور پھر اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔

" دیکھو۔ تم بیٹھنا چاہتے ہو تو بیٹھو۔ مجھے جانے دو ــــ"

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

" ٹھیک ہے ــــ جاؤ "

میں نے یونہی کہدیا ــــ اور وہ جیسے اس جواب کا منتظر ہی تھا" تیر کی طرح نکلا اور باہر چلا گیا ــــ تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا یہ شاید میں نے اچھا نہیں کیا۔ اور یہ سوچ کر میں بھی اس کے پیچھے ہوٹل سے نکل آیا۔ اتنی دیر میں وہ تیزی سے چلتا کافی دور نکل گیا تھا۔ سوٹ اب بھی گٹھری بنا اس کی بغل میں دبا ہوا تھا ــــ بھیڑ کی وجہ سے میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا رخ دریا کنارے اس حصہ کی طرف تھا جہاں عموماً سناٹا رہتا ہے ــــ چلتے چلتے وہ مندر کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے غائب ہوگیا اور دیوار تک پہنچتے پہنچتے مجھے کافی دیر لگ گئی ــــ وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔

کافی دیر ڈھونڈتے رہنے کے بعد جھاڑی سے ذرا آگے نکلے ہوئے اس کے پیر مجھے نظر آئے۔ میں دوڑتا ہوا جھاڑی تک پہنچا۔ وہ ساری دنیا سے دور، بالکل الگ تھلگ۔ سوکھے پتوں اور تنکوں کے درمیان سوٹ کی گٹھری کو سر کے نیچے رکھے لیٹا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ میری آمد جیسے اس کے لئے غیر متوقع تھی وہ بالکل اس بچے کی طرح چونکا جو مٹھائی چرا کر کھا رہا ہو۔ اور پتہ نہیں کیوں بُری طرح جھنجلا کے بولا:

" مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے ؟! "

میں ایکدم ٹھٹک کے رہ گیا۔ میں تو اس کی ہمدردی میں یہاں تک دوڑا ہوا آیا تھا اور اس کے انداز سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بلاوجہ اس کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ اسے ستا رہا ہوں۔ میرے دل میں اچانک اس کے خلاف نفرت اور غصہ کا ایک طوفان سا اٹھا ــــ اور میں فوراً ہی وہاں سے لوٹ آیا۔

دوسرے دن آفس میں بلّی کی کرسی جو سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں تھی خالی رہی۔ رشید، حامد اور شرما وغیرہ اپنی اپنی فائیلوں پر جھکے وہی سب کچھ لکھتے رہے جو کل بھی لکھ رہے تھے۔ پرسوں بھی لکھ رہے تھے۔ دو برس پہلے بھی لکھ رہے تھے۔

لیکن میں زیادہ کام نہ کر سکا۔ کیونکہ میں جھنجلایا ہوا سا تھا۔ میں نے اس واقعہ کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔ بلّی دو تین دن تک آفس نہیں آیا۔

اس دوران میں رشید کا تبادلہ ایک انتہائی اجنبی اور دور دراز مقام کو کر دیا گیا۔ اس نے لاکھ کوششیں کیں لیکن آرڈر منسوخ نہیں ہوئے۔

یہ صحیح تھا کہ تبادلے کی وجہ سے اسے اپنی بیوی سے الگ رہنا پڑتا کیونکہ اس کی بچی اسکول جاتی تھی اور جس جگہ وہ جا رہا تھا وہاں اس زبان کے اسکول نہیں تھے۔ جو اس کی بچی سمجھ سکتی۔

یہ بھی صحیح تھا کہ اسے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پُرمسرت زندگی گذارنے کا پورا پورا حق تھا۔ اور یہ بھی صحیح تھا کہ اس تبادلے کی وجہ سے وہ معاشی طور پر تباہ ہو جائے گا۔

"لیکن — میں کیا کرسکتا ہوں مسٹر رشید" ؟ اس کے افسر نے کہا۔
"کسی نہ کسی کو جانا ہی پڑے گا۔ یہ تمام باتیں تو خود مجھے بھی سوچنی چاہئیں۔
کیوں کہ میں بھی اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور ہوں۔"

اور جواب میں رشید یہ نہ کہہ سکا کہ "آپ کی — اور میری معاشی اور سماجی زندگی میں صدیوں کا فاصلہ ہے — زندگی کے بارے میں آپ کے اور میرے سوچنے میں بڑا فرق ہے۔ آپ کے بچے آپ سے سینکڑوں میل دور فرنس کے ساتھ رہ سکتے ہیں لیکن میں تو اسی وقت خوش رہ سکتا ہوں جب میرے بچے میری میز کے آس پاس ملتے رہیں۔ سیاہی لگے ہاتھوں سے میری جیبوں میں چاکلیٹ ٹٹول کر میری صاف ستھری پتلونوں پر دھبے لگاتے رہیں۔ اور روز شام میری آواز میں بیٹھے میرا انتظار کرتے رہیں اور مجھے دور سے دیکھ کر ننگے پاؤں دوڑتے چلے آئیں۔ میں لپک کے اپنی چھوٹی بچی کو گود میں اٹھالوں اور اس کے پیروں کی ہوئی کیچڑ میری سفید قمیص پر ایک چھوٹا سا پیر چھاپ دے — میں تو ایک گھٹیا قسم کا ہندوستانی ہوں۔ میرا دل کلبس میں کب لگ سکتا ہے اور پھر میں وہاں تک پہنچ بھی تو نہیں سکتا۔"

جب وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھا تو جیسے لوٹ چکا تھا۔ اگلے دو دن اس نے چارج دینے کی تیاری میں گزار دے۔ اور بلی — ان سب باتوں سے بے تعلق اپنی میز پر کام کرتا رہا۔ میں نے بھی اس سے بات نہیں کی۔

پھر اچانک رشید کا تبادلہ منسوخ کر دیا گیا۔

بلی نے اپنے طور پر رشید کی بجائے جانے کی پیشکش کی تھی جسے قبول کر لیا گیا تھا۔

بلی کی اس حرکت سے ایک سنسنی سی پھیل گئی ہم سب شرمندہ بھی تھے۔ حیران بھی۔ لیکن اس کے بعد بلی آفس میں نظر نہیں آیا۔

میں اس کے کمرے پر بھی گیا لیکن وہ بند تھا۔

جس دن وہ شہر چھوڑ رہا تھا میں اسٹیشن پہنچا۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ٹرین میں بھی میں نے اسے بہت ڈھونڈا لیکن پتہ نہیں وہ کہاں چھپ بیٹھا تھا۔ پھر اچانک سکنڈ کلاس کی ایک بند کھڑکی کے پیچھے سے میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ جھنجھلایا ہوا کسی سے کہہ رہا تھا۔

"ماں — تم کیوں آئیں یہاں — کسی نے دیکھ لیا تو —؟"

پھر کسی کی سسکیاں ابھریں — میں وہاں سے کچھ دور ہٹ گیا۔ ایک بوڑھی اپنے کندھوں پر پڑی ہوئی شال سے آنکھیں پونچھتی ٹرین سے اتر آئی۔

وہ کسی زمانے کی بدنام طوائف چندن بائی تھی۔ ▲

فیصلے کی گھڑی

رفعت نواز

ناشتے کے دوران شاہد نے شیلا نائر کا ذکر کیا تو مجھے یوں لگا جیسے نوالے حلق میں پھنس رہے ہیں۔ شاہد کی یہ عادت بری ہے کہ وہ وقت بے وقت پرانی باتیں یاد دلاتا ہے اور ہر معاملے کی تفصیلی روداد بھی سناتا جاتا ہے۔ شیلا کا ذکر آیا تو سات آٹھ سال پہلے کا زمانہ میرے تصور کی گرفت میں آگیا۔ میں اس زمانے کو تصور میں لانے کی کوشش میں تھا کہ شاہد نے انتہائی رازداری سے میرے کان میں کہا "شیلا تو آج کل بہت اونچی اڑ رہی ہے۔ ایک اے کلاس کنٹراکٹر کے ساتھ۔ خوبصورت بنگلہ، اسٹینڈرڈ کار، اور ڈھیر سے زیورات میں لدی رہتی ہے۔ یار! مجھے تو شیلا کی قسمت اور صحت پر رشک آتا ہے۔ پچھلے چھ سات سال میں کئی امیر کبیر سیٹھوں کے لونڈوں کو لوٹ چکی ہے مگر اس کی رعنائی میں برابر فرق نہیں آیا۔ وہی رکھ رکھاؤ، بناؤ سنگار اور ناز نخرے ہیں، جو تم سے وابستگی کے زمانے میں تھے۔ اب بھی باہر نکلتی ہے تو راہ چلتوں کے حواس گم ہو جاتے ہیں۔ ہر تیسرا آدمی اس کی آرزو میں مچلتا ہے۔"

"اچھا تو بڑے ٹھاٹ ہیں اس کے!" میں نے بظاہر بڑی لاپروائی سے کہا مگر میرے دل کی حالت بڑی دگرگوں ہو رہی تھی۔ کوئی دل کو انگلیوں کی گرفت میں لئے مسل رہا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور میرے جذبات پر اوس سی پڑ گئی تھی۔

میں صاف صاف کہہ دوں۔ میں نے زندگی میں جو بھی گناہ کیا اسے کبھی نہیں چھپایا اور گناہ کو گناہ سمجھ کر بھرپور طریقے پر کیا۔ آج سے آٹھ سال پہلے بھی میں کوئی نیک اور پاکباز آدمی نہیں تھا۔ اس وقت تک میری زندگی میں پانچ لڑکیاں آ چکی تھیں اور میں باپ دادا کے ترکے کو خوب لٹا رہا تھا۔ وقت گزاری اور تفریح طبع کے لئے کالج بھی جاتا تھا اور اپنی دولت کی نمائش کرتا تھا۔ اپنے دل موہ لینے والے انداز گفتگو اور بظاہر ہر ایک سے ہمدردانہ رویہ کی وجہ سے میں نے کئی دوست پیدا کر لئے تھے جو دن رات میرے کردار اور اوصاف کی تعریف کرتے رہتے تھے۔

شیلا ہمارے کالج کے سامنے والے مڈل اسکول میں نئی ٹیچر ہو کر آئی تھی۔ ایک شام میں کالج سے موٹر لے کر نکلا تو شیلا بڑ کے پیڑ سے لگی کھڑی تھی۔ موسلادھار بارش ہو رہی تھی اور اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ وہ اداس نظر منتظر نگاہوں سے سنسان سڑک کو گھور رہی تھی۔ اس کے مختصر سے، معصوم و سپید چہرے کے دلکش نقوش میری نگاہوں میں کھب گئے۔ میں نے موٹر روک کر اس سے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں کہا "اگر برا نہ مانیں تو آپ کو گھر تک پہنچا دوں۔ بارش رکنے کے آثار نہیں ہیں اور رکشا بھی دور تک نظر نہیں آتا۔"

اس نے تھوڑا پس و پیش تو کیا مگر موسم کی ستم ظریفی دیکھ کر وہ شکریہ کہتی ہوئی پچھلی سیٹ پر سکڑ کر بیٹھ گئی، وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ بازار سے نکل کر ایک چھوٹے سے چائے خانے کے قریب میں نے موٹر روک کر چائے کا پیشکش کیا تو اس نے قدرے تکلف کے بعد گھبرائی ہوئی آواز میں اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ چائے کار ہی میں منگوا لیں۔ اس کی اس ادا نے مجھے بے حد

ستاتی رہی۔

اس دن کے بعد سے میں بار بار، مختلف بہانے تراش کر شیلا سے ملتا رہا۔ وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی۔ اس کے والدین نے بھی اس لئے ڈھیل دی کہ شیلا کے لئے مجھ سے اچھا لڑکا انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم شام میں گھنٹوں سیر کیا کرتے اور چاندنی راتوں میں سوئمنگ پول کے قریب والے میدان میں بے فکری سے بیٹھے گھنٹوں مستقبل کے خوابوں میں کھو جاتے اور جب بھی شدت جذبات سے میں حد سے گزرنے کی کوشش کرتا، شیلا سہم جاتی اور غصہ میں گھر لوٹ جاتی۔ میں اس کھیل سے بڑا پریشان تھا، فیصلہ کن بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔ جب کبھی میں اُسے اپنے گھر والے کی کوشش کرتا تو وہ شرما کر کہتی، میرے پتاجی سے بات پکی کر جیسے پھر میں ہمیشہ کے لئے تمہارے گھر آ جاؤں گی ـــ اور یہی ایک ایسا مسئلہ تھا جہاں میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک شام میں بہلا پھسلا کر اسے اپنے گھر لے ہی آیا۔ اس نے حیرت سے ایک ایک چیز دیکھی، میں بھی خوش خوش اُسے اپنی جمع پونجی دکھاتا رہا۔ پھر ہمیشہ کی طرح پینترا بدلا، اور میں سوئچ آف کر دیا۔ جب روشنی ہوئی تو شیلا ... اور میرے گلے سے لگی کہہ رہی تھی "اب مجھے اپنا لو ورنہ میں مر جاؤں گی، میں کسی دوسرے کے ساتھ نباہ نہ کر سکوں گی۔" اور میں نے بھی جذبات میں بلا جھجک کہہ دیا۔ "میں تو ایک عرصہ سے تمہارا منتظر تھا مجھے یقین ہے کہ ہماری ازدواجی زندگی کامیاب رہے گی۔"

شیلا کو اس کے گھر چھوڑ کر آنے کے بعد کافی رات تک میں سوچتا رہا کہ اب آگے کیا کرنا چاہئے۔ ویسے یہ میرے لئے کوئی پریشان کن بات نہیں تھی میں آسانی شیلا سے پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں میں خود کو ایسا کرنے پر راضی نہیں کر پایا تھا۔ اور اس سوچ میں نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اٹھا تو شیلا کا ہی خیال تھا اور مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے آپ سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس پریشانی میں میں کچھ دن ... دوست کے یہاں امراؤتی چلا گیا۔ جہاں کی رنگین محفلوں میں شیلا کا خیال دھندلا پڑ گیا۔

... کی پوری رات ... ختم ہونے لگی تو میں نے ... [illegible]

ہوا کہ اپنے وطن سات سال تک نہ جا سکا۔

اب میں والدین کی آخری نشانی یعنے رہائشی مکان فروخت کرنے کی غرض سے وطن آیا تھا اور شاہد کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ شاہد نے شیلا کے متعلق کہا تھا تو نہ جانے مجھے یہ خواہش کیوں ہوئی کہ شیلا سے ایک بار ضرور ملوں۔

میں نے شاہد سے شیلا کا پتہ لیا اور اُسی کے اسکوٹر پر شیلا کے مکان پہنچ گیا۔ وہ مجھے بنگلے کے باغ ہی میں مل گئی۔ میں نے سلام کیا تو اس نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میرے بوسے لینے لگی۔

میں نے جب رکتے رکتے انتہائی سنبھلے ہوئے لہجے میں اس کی مصروفیات کے متعلق پوچھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے اپنے گزشتہ چھ سال کے کارنامے گنوا دیئے۔ جس میں ماں باپ سے لڑ کر الگ ہونے سے لیکر سات آٹھ یاروں سے تعلقات قائم ہونے اور ٹوٹنے کا احوال تھا۔ میں معصوم شیلا کی بے باکی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جسمانی طور پر تو نہیں مگر ذہنی اعتبار سے یقیناً کافی بدل گئی تھی۔ بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے اب وہ فیشن ایبل پیشہ ور عورت بن گئی ہے۔ شیلا کو اس حال میں دیکھ کر مجھے بُرا لگ رہا تھا اور مجھے نہ جانے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ شیلا کو اس بات کا قطعی افسوس یا دکھ نہیں ہے۔

وہ مجھے کھینچکر ڈرائینگ روم میں لے آئی۔ جو قیمتی فرش، فرنیچر اور ساز و سامان سے سجا ہوا تھا، چائے کے بعد اس نے خود ہی کہا "آؤ تھوڑا گھوم آئیں" تو وہ اسکوٹر پر پیچھے بیٹھ گئی اور ہم شہر سے دور نکل گئے۔ پھر اُسے میں سوئمنگ پول کے قریب کی پہاڑی پر لے آیا اور ہمیشہ کی طرح ہم سبزہ پر لیٹ گئے۔ شیلا بغیر کسی جھجک کے میرے قریب آ گئی اور مجھ سے لپٹ گئی میں نے اُسے کھینچا تو اس نے اپنا پورا جسم میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ اٹھایا تو اس کی آنکھیں بند تھیں مگر آنسو رخساروں تک بہہ آئے تھے۔ مجھے دھکا سا لگا اور میں نے ... ایک ... سا ... محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا دل ... اور ... چہرہ ... [illegible]

اور یہ پہاڑی اور یہ سہانی شام سب معدوم ہو جائیں گے اور میں تنہا حیران پریشان سا، دنیا کے ویرانے میں بھٹکتا پھروں گا اور کوئی نہیں ہوگا جو مجھ سے پوچھے کہ تم کون ہو، کسے ڈھونڈ رہے ہو، تمہیں کیا غم ہے؟

میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ شیلا نے گلوگیر آواز میں پوچھا "ونود تمہیں کیا مل گیا مجھے برباد کر کے، تم تو آرام سے رہے مگر تم نے مجھے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا، میں نے کیا برائی کی تھی تمہارے ساتھ، کچھ تو کہو میرے پیارے"

میرے پاس شیلا کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میرا دل بھر آیا اور کئی سال بعد میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اور میں نے شیلا کی روتی ہوئی آنکھیں چوم لیں اور میرے سے فیصلہ کن لہجے میں کہا، "مجھے اپنا ہی سمجھو شیلا، میں بھی آوارگی کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔"

شیلا نے بڑی حیرت سے پوچھا "سچ مچ ایسا ہوگا ونود"

اور میں نے سچائی کے ثبوت میں شیلا کے لبوں پر اپنے لبوں کی مہر ثبت کر دی ۔۔ ▲

ایک سال بیت گیا

(شاہد صدیقی مرحوم کی پہلی برسی پر)

مرے رفیق مرے محترم مرے شاہد
تجھے بھلائے ہوئے ایک سال بیت گیا

تو محوِ خواب ہے ترا کوئی قصور نہیں
ہمیں جگائے ہوئے ایک سال بیت گیا

زمانہ فرصتِ نظّارگی نہیں دیتا
تجھے چھپائے ہوئے ایک سال بیت گیا

تو لوحِ دہر پہ مانندِ حرفِ تنہا تھا
مگر مٹائے ہوئے ایک سال بیت گیا

چڑھائیں چادرِ گُل یا ردائے اشک کہ آج
تمیز اٹھائے ہوئے ایک سال بیت گیا

دلوں میں تو ترا مدفن، زمیں پہ تودۂ خاک
یہ راز پائے ہوئے ایک سال بیت گیا

کہاں ہے صورِ سرافیلِ نالہ و فریاد
کہ حشر اٹھائے ہوئے ایک سال بیت گیا

چلو چراغ جلائیں سرِ مزارِ حبیب
کہ لو بڑھائے ہوئے ایک سال بیت گیا

شاذ تمکنت

نرپش کمار شاد

دو آتشہ

(اپنی ہی ایک غزل کی تضمین)

غم دیئے اس نے بے شمار ہمیں   ہر قدم پہ کیا ہے خوار ہمیں
راس آئی نہ فتنہ کار ہمیں   زندگی کب ہے سازگار ہمیں
پھر بھی کم بخت سے ہے پیار ہمیں

ہر تبسم ہے نوحہ خواں توبہ   ہر ترنم میں ہے فغاں توبہ
نور بھی ہے دھواں دھواں توبہ   اپنی تیرہ نصیبیاں توبہ
دن میں ہے دن کا انتظار ہمیں

حسن کے رازدار تھے لیکن   نکہتِ زلفِ یار تھے لیکن
سربسر رنگ بار تھے لیکن   ہم امیدِ بہار تھے لیکن
رو پڑی دیکھ کر بہار ہمیں

دل کو ہر موڑ پر نہیں بھولی   گو بھلائی مگر نہیں بھولی
فتنہ گر بھول کر نہیں بھولی   آج تک وہ نظر نہیں بھولی
تم نے دیکھا تھا ایک بار ہمیں

نغمہ آرائیوں کے پردے میں   بادہ پیمائیوں کے پردے میں
دل کی گہرائیوں کے پردے میں   اپنی رعنائیوں کے پردے میں
ڈھونڈ لے اے نگاہِ یار ہمیں

بے اساس اور بے اصول ہیں ہم   خود بھی اپنے کو کب قبول ہیں ہم
شاخِ افسردگی کے پھول ہیں ہم   تجھ سے چھٹ کر بڑے ملول ہیں ہم
اے غمِ زندگی! پکار ہمیں

ایسا الزام دل شکستوں پر   کوئی انصاف بھی ہے اہلِ نظر!
مے کدے میں تو ہم بدیدۂ تر   اپنے اشکوں کو پی رہے ہیں مگر
لوگ کہتے ہیں بادہ خوار ہمیں

کیسی بے سوز و بے وقار سی ہے   دل شکستہ و دل فگار سی ہے
آہ بر لب سی اشکبار سی ہے   شادمانی بھی سوگوار سی ہے
دیکھ کر شاد سوگوار ہمیں

ایک آواز

سید حرمت الاکرام

یہ آواز اسی طرح پیچھا کرے گی
زمیں سے فضا تک، فضا سے خلا تک
نئی داستانیں بکھیرا کرے گی
یہ آواز تاریخ کی وادیوں کی حدوں سے
نکلتی ہوئی مرحلہ مرحلہ
وقت کا پیچھا کرتی چلی آئی ہے
خندہ ساماں گزرتی چلی آئی ہے
یہ آواز فکر و نظر کے دریچوں کو
ایک اجنبی راہرو کی طرح
تھپتھپایا کرے گی
صبح کے ٹھنڈے جھونکوں کی نکہت لیے
خواب آلودہ ذہنوں سے کھیلا کرے گی
قریہ قریہ پھرے گی یہ آواز
اور ہر سونے والے کے چہرے سے
افسردہ لمحوں کی چادر ہٹا کر
یہ شکوہ کرے گی
کہ دھرتی کی پھیلی ہوئی گود میں
نیند جادو کی مانند پیوست ہے
یہ آواز ہر گام پر اک نئی لے میں
اور اک کے قافلے کو پکارا کرے گی
کہ صدیوں کی خوابیدگی کی ردا
آدمی اپنے چہرے سے سرکا سکے
اپنی گم گشتگی کا صلہ پا سکے

قصۂ درد

عزیز قنائی

چاند نے مسکرا کر کہا
"دوستو،
قصۂ درد چھیڑے سرِ راہ کون؟"
پھر بھی تارے مصر تھے
کہ ہم آج کی شب سنیں گے
وہی ان سنی داستاں
دیر تک چاند سوچا کیا
دور آفاق کی سمت دیکھا کیا
اور تاروں کی آنکھیں جھپکتی رہیں
رات کے دامن تر کو
آہستہ آہستہ
لمحوں کا ٹھنڈا لہو
جذب ہو ہو کے رنگین کرتا رہا
ناگہاں ایک نادیدہ زریں ترقسم
دستِ سیمیں بڑھا اور افق تا افق
ایک جنبش میں کھینچے ہزاروں کروڑوں
طلائی خطوط
ڈوب کر رہ گئے شب کے سارے نقوط
چشمِ آفاق سے
اولیں قطرۂ درد ٹپکا
کسی برگِ نوخیز پر
عکسِ انجام رخسارِ آغاز پر

میلے میں آکر
جنس گراں کو
تکتی کھڑی ہیں ــــ آنکھیں، ہی آنکھیں

لالچ کے پھل کی قاشیں ہی قاشیں
خواہش کی زندہ درگور لاشیں
کوثر کی بوندیں اور دھول پھانکیں ــــ آنکھیں، ہی آنکھیں

جیسے معلق ــــ آہو رمیدہ
ہیروں کے دل میں نشتر خمیدہ
کرنوں سے راتیں، گیسو بُریدہ
داماں دریدہ یوسف کو مانگے یعقوب جیسے
گندم کے دانے
اپنے گنہ پر محجوب جیسے!

آنکھیں ہی آنکھیں

مطلب کی رہ پر کاسے ہی کاسے
کھیتوں میں ساگر بھوکے پیاسے
قارون بھوکے، دہقان بھوکے
اونچے کلس کے ایوان بھوکے
برکھا کی رُت میں کھلیان بھوکے
انسان ہوکر ارمان بھوکے
بھوکوں سے یارب ایمان لے لے
کہہ دے، کہ خالی قرآن جھانکیں
میلے میں آکر جنس گراں کو
تکتی کھڑی ہیں آنکھیں ہی آنکھیں!

حکیم یوسف حسین خاں

تاج مہجور

قرب کا فاصلہ

اپنی تنہائیوں کی سیہ رات میں
میں جہاں بھی گیا ذہن و دل میں مرے
تیری یادوں کی قندیل جلتی رہی
تیری قامت کا شعلہ سلگتا رہا
تیرے دستِ حنائی کی رنگیں شفق
میری نظروں کے آگے دمکتی رہی
تیری آواز کی نقرئی گھنٹیاں
میرے کانوں میں تھم تھم کے بجتی رہیں
تیری زلفوں کی نکہت شمیمِ بدن
میری سانسوں میں رہ رہ کے مہکا کیے
ذکر سے تیرے دل کو تسلی ملی
تیرے بارے میں سوچا تو غم مٹ گئے
دوریاں تجھ سے نزدیک کرتی رہیں
فاصلے تجھ کو نزدیک لاتے رہے
آج جب پاس آیا تو مجھ پر کھلا
کیا قیامت ہے یہ قرب کا فاصلہ

دو رُخ

ظہیر صدیقی

اک حسیں صبح تھی
کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی تھی فضا
ہر طرف رنگ و بو
دلکشی چار سو
لیتی اٹھکیلیاں آئی بادِ صبا
آکے اک نو شگفتہ حسیں پھول کے
جسمِ نازک سے ٹکرا گئی
پھول کو شرم سے جھرجھری آگئی
اس کے بندِ قبا کی گرہ کھل گئی
کتنی لذت تھی دستِ صبا کے حسیں لمس میں
دوسری صبح تھی
آج بھی کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی تھی فضا
طائرِ خوش نوا
چہچہانے لگے گیت گانے لگے
آئی بادِ صبا لیتی انگڑائیاں
اور پھر دفعتاً
اس حسیں پھول سے آکے ٹکرا گئی
آج لیکن صبا کے حسیں لمس میں
اک اذیت کا احساس اس کو ہوا
اس کا شیرازۂ دل بکھرنے لگا
پھول گھبرا گیا
پھول نے اپنا دامن سمیٹا مگر
دامنِ صد گرہ کھل گیا
اور پھر
یک بہ یک شاخ سے ٹوٹ کر
خاک میں مل گیا!

زعفران زار

کوہکن

آج کل پورے ملک میں برتھ کنٹرول کے موضوع پر ایک مشاعرہ برپا ہے جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو منہ کم ہیں اور باتیں زیادہ مخالفت اور موافقت کا ہنگامہ جاری ہے۔ اس موضوع پر کوہکن کی آزاد نظم ملاحظہ فرمایئے۔

برتھ کنٹرول

ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

وہ ممالک بھی ہیں ظلمت کدۂ عالم میں
جن کو بچوں کے تبسم سے ضیا ملتی ہے
جب کوئی ماں کسی معصوم کو دیتی ہے جنم
باپ کے دل کی کلی کھلتی ہے!
دعوتیں ہوتی ہیں
کاگ اڑتے ہیں
دور و نزدیک عزیزوں کے لیے ہوتی ہے عید
لوگ خوش ہوتے ہیں اور گاتے ہیں
فارسی کے یہ پرانے مصرعے
شکر اللہ ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدر
اور ایک ملک ہمارا ہے کہ بس کیا کہیئے
ادھر اک طفل کسی گھر میں نمودار ہوا
اور ادھر فکر بڑھی
باپ گھبرانے لگا رونے لگا
ماں کو اس بات کا افسوس کہ میں کا لے نہیں
دودھ کس طرح پلاؤں گی اسے
جب بڑا ہوگا تو کیا چیز کھلاؤں گی اسے
اس کی تعلیم کہاں سے ہوگی

اور انساں کا یہ عالم کہ مرا جاتا ہے
نہ کوئی کام نہ دھندہ نہ مروت، نہ ادا
تم ہی بتلاؤ تمہیں چاہیں تو چاہیں کیوں کر
گھر میں مفلس کے کسی طفلک ناداں کا طلوع
جبر ہے، قہر خداوندی ہے
دودھ پوڈر کا بھی ملتا نہیں آسانی سے
اور بچہ ہے کہ زندہ ہے گراں جانی سے
دانت نکلیں گے تو پھر کھائے گا سوکھے ٹکڑے
اپنے والد کو بھی کھلوائے گا سوکھے ٹکڑے
پھر کسی روز چرائے گا کسی کے پیسے
اور حوالات کا منہ دیکھے گا
اسی عالم میں گزر جائے گا جیون اس کا
شاخ غربت پہ ہی قائم ہے نشیمن اس کا
میں یہ کہتا ہوں کہ بچوں کی ضرورت کیا ہے
اور مرے ملک کو اولاد کی حاجت کیا ہے
اس میں پہلے ہی سے آباد ہیں لوگ
جن میں لیڈر بھی ہیں نقال بھی ہیں
گانے والے بھی ہیں قوال بھی ہیں
حکما بھی ہیں یہاں وید بھی ہیں

جیب کترے بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں
اور پھر شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
اس کو سمجھاؤ کہ اعصاب سے نیچے اترے
ورنہ بچوں کی ولادت نہ رکے گی ہرگز
کشتی قوم و وطن پار نہ ہوگی ہرگز
آج حالات و حقائق کا تقاضہ یہ ہے
قصر اولاد کے در بند ہوں بھوکوں کے لیے
ماں کی آغوش میں بچہ نہ ہنسے
باپ کی گردن نہ پھنسے
جتنے انسان میرے ملک میں ہیں
وہی کافی سے زیادہ ہیں تقدیم
میں نہ ملا ہوں نہ شاعر نہ حکیم
بخت نے صاحب اولاد کیا ہے مجھ کو
کشتۂ کثرت تعداد کیا ہے مجھ کو
صحن میں کھیلتے پھرتے ہیں مرے دس بچے
اور سب چیخ رہے ہیں کہ ہمیں روٹی دو
ان کا کیا ہوگا بھلا میرے بعد
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

محترم ناصر صاحب

بمبئی میں ایک اتفاقی ملاقات کے سلسلے میں راجہ صاحب سے چند لمحوں کی بات چیت ہوئی جو تاثر دل و دماغ نے قبول کیا۔ اسے بصورت تحریر "پونم" کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔ انھوں نے اب تک ممتاز اہل قلم حضرات و خواتین کے محبوب مشغلوں سے شغل کیا ہے۔ اب میں نے خود راجہ صاحب کے محبوب مشاغل سے شغل کرنے کی کوشش کی ہے۔ راجہ صاحب سے وعدہ بھی تھا اور ان کی دلچسپ وعجیب شخصیت کا تقاضہ بھی، سو اس کی تکمیل آپ کو کرنی ہے۔ "پونم" کا ایک پرچہ راجہ صاحب کو بطورِ خاص میری جانب سے بھجوادیجئے، ممنون ہوں گا۔

(م - ع - ا)

٭

مصطفےٰ علی اکبر

راجہ مہدی علی خاں

کے

دلچسپ مشاغل

فلموں کے لئے گانے لکھنا۔ پنجابی پروڈیوسر سے کہنا کہ میں خالص پٹھان ہوں۔ برہمن پروڈیوسر سے کہنا کہ میں تو راجہ ہوں۔ اچھے پروڈیوسر سے کہنا کہ راجہ مہدی علی خاں راجپوت ہے۔ گانے لکھنے کیلئے پہلے رونے کی کوشش کرنا۔ رونا نہ آئے تو اخیر چلم کا حقہ پیتے ہوئے حکومت کو کوسنا کہ عورتوں کے لئے تو اس نے ہزاروں زچگی خانے بنا دیئے لیکن میری پانچ بلیوں کی زچگی کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ اچانک حقے کی نے چھوڑ کر باہر بھاگ نکلنا اور کسی خزاں رسیدہ درخت کو تلاش کر کے اس کے نیچے ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جانا، آنکھیں بند کر لینا اور پھر چلّا چلّا کر گانا "رم جھم رم جھم نیناں برسے۔"

کسی پولیس والے کو آتا ہوا دیکھ کر اس سے لپٹ جانا اور قسمیں کھا کھا کر اس کو یقین دلانا کہ میں راجہ مہدی علی خاں ہوں۔ فلمی گانے لکھنے والا۔ نیان اور تہمد اس لئے باندھ رکھا ہے کہ گانے لکھنے سے پہلے میں ورزش کرتا ہوں، سمجھا بجھا کر پولیس والے کو اپنے گھر لے آنا اور دروازے ہی میں سے چیخنا "طاہرہ ذرا ریڈیو گرام پر وہ گانا تو لگاؤ......"

پولیس والے کا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا اور حیران ہونا کہ یہ ڈسپنسری ہے یا دیوان خانہ — پولیس والے کو گھر کی ایک ایک چیز دکھانا اور اس سے داد طلب کرنا۔ اس کے پوچھنے پر بتانا کہ اتنی ساری دوائیں یہاں اس لئے رکھی ہیں کہ یہی میرا ذریعہ روزگار ہیں پھر ایک ایک شیشی اٹھانا اور سمجھانا کہ یہ دوائی برہا کے گیت لکھنے کے لئے ہے۔ یہ دوائی کھا لی جائے تو شادی کے گیت لکھے جاتے ہیں اور اس گولی کو کھا کر کسی اسسٹنٹ فلم کی مرمار ہیروئن اور ڈاکو کا ڈوئیٹ لکھا جا سکتا ہے۔ پولیس والے کا پریشانی سے

پسینہ پسینہ ہونا اور راجہ صاحب کا پکارنا۔" طاہرہ، فدا خیرہ مولا پید لانا ۔۔ اچھا وہ نہ ہو تو آم ہی لاؤ۔۔" یہ تو بے ہوش ہوا جا رہا ہے۔ پولیس والے کا تقریباً قدموس ہو جانا کہ غلطی ہوئی معاف کیجئے میری نسلیں بھی آپ کی ممنون ہونگی اگر آپ مجھے رہا کردیں۔ آرام کرسی پر جھولتے ہوئے راجہ صاحب کا دھاڑنا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر یہ پانچ سیر آم نہ کھاؤ گے تو پانچ منٹ بعد تمہیں چھلکوں سمیت یہ آم کھلاؤں گا۔ پولیس والے کا چکرا کر گرنا اور بے ہوش ہوجانا۔ بیوی کا آہستہ سے ٹیکسی منگوانا اور پولیس والے کو بحفاظت روانہ کردینا۔

خطوط لکھنا۔ ادیبوں کی بیویوں کو اور ادیباؤں کے شوہروں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا جب یہ بھڑک جائیں تو معصومیت سے پوچھنا تم اپنے شوہر سے لڑتیں تو نہیں یا تم اپنی بیوی سے جھگڑتے تو نہیں خطوط لکھنے میں دوائی کھانے کی طرح پابندی کرنا۔ خطوں میں گالیاں لکھنا۔ جواب نہ آنے پر گالیاں دے دے کر دیوان خانہ سر پر اٹھا لینا اور طاہرہ کی جان ضیق میں کر دینا۔ اذاں کی آواز سنکر اٹھ کھڑے ہونا۔ کھونٹی سے تسبیح اٹھانا اور سورج نکلنے تک۔

بامسلماں اللہ اللہ۔ یا برہمن رام رام جپتے رہنا۔ اس کے بعد بڑے خشوع وخضوع سے قلم کو بوسہ دینا اور ہیروئین کے بول لکھنے کی کوشش کرنا۔ لکھا نہ جائے تو کپڑے پھاڑ کے جسم سے الگ کرنا۔ مکان کی چھت پر چڑھ جانا اور چلا چلا کر کہنا۔ اے خدا مجھ سے گانا نہیں لکھا جاتا وہ بدمعاش پروڈیوسر آتا ہی ہوگا۔ جیسا تو نے مجھے بیمار کیا ہے، ویسے ہی اب اس گانے کو مکمل کر۔ خدا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر گھر کے سامنے بندھے ہوئے گدھے کو پکڑنا اور خوب پیٹنا۔ گدھے کے مالک کو اپنے ڈنڈ کی مچھلیاں بتا بتا کر مرعوب کرنا اور پھر اپنے گیت کا ایک ریکارڈ دے کر معاملہ رفع دفع کرنا۔

فوٹو گرافر سے طرح طرح کی تصویریں اتروانا۔ ہیرو بننے کی جان توڑ کوشش کرنا۔ اپنی تصویر دیکھنا۔ پہلے فوٹو گرافر کو پھر طاہرہ کو خوب گالیاں دینا اور اپنے منہ پر طمانچے مار مار کر کہنا۔ کمبخت نے مجھے سچ مچ ہیرو بنا دیا۔ پورے جسم کی تصویر نہ آنے پر فوٹو گرافر پر غصہ کرنا اور اصرار کرنا کہ میری تصویر [illegible] آمادہ لیکن پوری تصویر ضرور دے۔ فوٹو گرافر کے موٹا کھدے ہنسے پڑھتے سے پاگل ہو جانے [illegible] ۔ ریڈیو پروگرام کے ریکارڈ نکال کر توڑنا۔" وہ کون تھی۔۔" کی سلور جوبلی پر ملی ہوئی ڈھال کلاک پر نظر پڑتے ہی سوالیہ علامت بن جانا اور پکارنا۔ طاہرہ مجھے چائے چاہیئے۔ طاہرہ کا جواب دینا ۔۔۔ دودھ نہیں ہے۔ راجہ صاحب کا چنگھاڑنا یہ پانچ پانچ بلیاں آخر کس دن کیلئے ہیں۔ بھینس کا نہیں تو بلیوں کے دودھ سے ہی چائے بناؤ۔ طاہرہ کا ڈانٹنا اور راجہ صاحب کا چوہے کی طرح پلنگ میں گھسنے کی کوشش میں پلنگ کا ایک پایہ توڑ بیٹھنا۔

باندرہ کے لوگوں کا پولیس کمشنر سے شکایت کرنا کہ سارا گوشت راجہ صاحب کے گھر چلا جاتا ہے۔ محلے میں کوئی مرغی سلامت نہیں رہتی۔ حد یہ کہ ایک گھوڑا راجہ صاحب کے گھر میں گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ پولیس کمشنر کا حکم دینا۔ راجہ صاحب کے لئے ایک علیحدہ مسلخ قائم کیا جائے۔ راجہ صاحب کا برافروختہ ہو جانا اور تاک تاک کر شکایت کرنے والوں کے گھروں میں بلیوں کو کدانا۔

مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کے لئے مختلف قسم کے لباس پہننا۔ دنیا بھر کی عورتوں کو گالیاں دینا کہ وہ اپنے شوہروں سے لڑتی ہیں۔ اور خود سارا وقت اپنی بیوی سے لڑتے رہنا اور جب سب چلے جائیں تو خوشامدیں کر کر کے بیوی کو منانا اور لڑنے سے توبہ و استغفار کرنا۔

بیوی کا روز کی اس جھک جھک سے پریشان ہو کر کبھی حیدرآباد کبھی دہلی کبھی لکھنؤ چلے جانا۔ راجہ صاحب کا بیوی کو نہ پاکر اخبارات میں ضرورت رشتہ کا اشتہار چھپوانا اور اخبار والوں کو دھمکی آمیز خطوط لکھنا کہ میری پوری تصویر چھپنی چاہیئے۔ رشتے کی درخواست لے کر آنے والوں کو مار مار کر گھر سے نکال دینا اور پھر طاہرہ کو یاد کر کے رونا۔ پھر دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد کے لوگوں کو گڑگڑا گڑگڑا کر خطوط لکھنا کہ خدارا میری بیوی کو سمجھا کر میٹھی واپس بھیج دو۔ گڑ کھانا لیکن گلگلوں سے پرہیز کرنا۔ ذیابطیس کے بہانے چائے میں شکر نہ پینا لیکن میرٹھ مٹھائی (خوشتر گرامی) کی بھیجی ہوئی ہضم کر جانا۔ جو بچ جائے اسے شہر کے حلوائیوں میں تقسیم کر دینا۔ پروڈیوسروں کی نظر میں اپنے آپ کو خاص [illegible] ثابت کرنے کے لئے راجہ مہدی علی خاں مٹھائی والا کہلانا۔ تنہائی میں بخیئے ادھیڑنا۔ دو چار مہمان آجائیں تو گالی گلوچ کرنا۔ کوئی نہ ملے تو محبوب مشغلوں کا نام دیگر مشہور لوگوں کی نقاب پوش زندگی کی سوانح [illegible] انداز میں

لب اٹھانا کہ اپنی شہرت کو نیلام ہوتا ہوا دیکھنے والے بھی دل ہی دل میں گالیاں لگا کے بھی بے مزہ نہ ہوا" والی بات دہرائیں۔ اپنے آپ کو غالب کا استاد سمجھنا اور اکیڈمی پنجاب والوں کو یہ باور کرا کے کہ میں پنجابی ہوں۔ کتاب انداز بیاں اور" شائع کروانا اور لوگوں کو خطوط لکھنا کہ دیکھو انداز بیاں یہ ہے (غالب تو محض لغو تھا)۔

اپنی ہمسایہ اینگلو انڈین لڑکی کے ریڈیو گرام پر بجتے ہوئے جاز ی لے پر تھرکنا اور بیوی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آہ واہ کرتے ہوئے بکھڑا کر گر پڑنا۔ بیوی کا پریشان ہو کر ڈاکٹر کو بلانے جانا۔ بیوی کے جاتے ی کھڑے ہو جانا اور پھر ناچنے لگنا اور مدہوش ہو کر — "جھوم جھوم ڈھلتی جائے رات — ..." گانا — اقبال کو گالیاں دینا کہ اس نے آہ! جاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار —" کیوں لکھا۔ گالیاں دیتے دیتے ورت کے بارے میں سوچنا۔ عورت کے بارے میں لکھنا۔ زنانہ خواب دیکھنا ونس سالن پکوانا۔ زنانی میوہ کھانا۔ حتیٰ کہ اپنی چہیتی بلیوں کے نر بچوں کو گھر سے باہر پھنکوا دینا، صرف مادہ بچوں کی نرسنگ کرنا۔ انہیں اپنی گود میں سلانا اور ان کے حسین ترین نام رکھنا۔ ان کے نام لے لے کر فحش گالیاں دینا۔ بیوی کے منع کرنے پر کہنا — دیکھو جھگڑا نہ کرو، پھر کرسی چھوڑ کر کمرے میں ٹہلنا۔ ٹہلتے ٹہلتے بیٹھ جانا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنا اور سو جانا۔ نیند میں بڑبڑانا۔ بڑبڑاتے ہوئے اٹھنا۔ نیند کی حالت میں سڑک پر نکل جانا۔ اور کبھی جاں نثار اختر کا کبھی شکیل بدایونی کا گھر تلاش کرنا۔ ان کے بند دروازوں پر کھڑے ہو کر انہیں خوب خوب کوسنا۔ گورکھے چوکیدار کے دھمکانے پر کھڑاویں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونا۔ اور بھی تبسم کے گھر کے سائے میں پناہ گزیں ہو جانا۔ صبح ملازم چوکروں کا ڈھونڈتے ہوئے آنا اور منا سمجھا کر، راجہ صاحب ہونے کا یقین دلا کر گھر لے جانا ہر کھانے پر مہمانوں کی توقع میں ضرورت سے زیادہ پکوانا۔ مہمان نہ آنے پر دھرم شالہ کھلوانے کی دھمکیاں دینا۔ سڑک پر کھڑے ہو جانا — راہ روں کی خوشامدیں کر کے دھکا دھکا کے گھر بلانا۔ آنا کھلانا کہ بدہضمی ہو جائے پھر ان کے سروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر فقیرانہ پہونچی ہوئی دعائیں دینا اور دوبارہ آنے کا وعدہ لینے تک رہا نہ کرنا — اتفاق سے مہمان

آجائیں تو گالیاں دے دے کر واپس بڑھا دینا اور جب وہ جانے لگیں تو رو رو کر کہنا — ہائے یہ کیا قیامت ہے۔ !!!

تصحیح اگست ۱۹۶۵ء کے شمارے میں جناب خورشید احمد جامی صاحب کی غزل کے مقطع کے پہلے مصرعہ میں سہواً کتابت کی غلطی کی وجہ سے لفظ "خیال" کی جگہ حیات شائع ہو گیا ہے۔ صحیح شعر یہ ہے: —

لے کر نئے خیال کی قندیل ہاتھ میں
جامی کسی کو ڈھونڈ رہی ہے نئی غزل

قارئین تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)

جی! تو عرض کیا ہے

رضا الجبار

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ یوسف اپنے دیوان خانے کا دروازہ کھولتا ہے)

"اوہ! آپ ہیں جمال صاحب، آداب عرض"

"آداب عرض ——— خیریت؟

"جی ہاں، خیریت — تشریف لائیے۔ کہیئے آتنی رات کو کیسے آنا ہوا —؟" (دیوانخانے میں داخل ہوتے ہوئے)

"کیا بتاؤں یوسف صاحب میں دراصل آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہوں"

"یعنے کہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی آئے ہیں"؟

"ایسا ہی سمجھ لیجئے"

"کیا مطلب؟ نظر تو کوئی نہیں آتا۔ جمال صاحب یہ پہیلیاں کب سے بجھوانی شروع کر دی ہیں آپ نے —"

"میرا مطلب ہے بھائی ایک شدید خواہش اور ایک لطیف جذبے نے مجھے آپ کے پاس آنے پر مجبور کیا اور میں آگیا"

"میں اب بھی نہیں سمجھا"

"ہوا یہ کہ آج دفتر نہیں گیا تھا۔ سہ پہر میں ذرا دالانڈے میں بیٹھا تھا کہ بارش کی بوندیں اور ٹھنڈی ہوائیں شروع ہوئیں۔ پھر میں نے ایک پیالی چائے پی۔ اور، اور کیا بتاؤں کس تیزی کے ساتھ طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ میں نے اسی وقت ایک غزل مکمل کر لی، سوچا کہ آپ کو سنا کر اب آپ کی رائے لوں۔ یہی وجہ ہے کہ بس آگیا — تو سناؤں —"

"یہ تمہید اور یہ پس منظر — یقیناً آپ نے زوردار غزل مکمل کی ہوگی۔ خوب اشعار موزوں ہوئے ہونگے لیکن جمال صاحب بُرا نہ مانئے تو میری طبیعت اس وقت شاعری کی طرف نہیں ہے، طبیعت ٹھیک بھی نہیں ہے آپ آ ہی گئے ہیں تو کچھ دیر گپ شپ ماریں گے۔ ادھر اُدھر کی باتیں کریں گے۔"

"اجی یوسف صاحب میں غزل میں زیادہ اشعار موزوں کرنے کا شروع ہی سے قائل نہیں ہوں۔ میری غزل میں صرف ایک ہی شعر ہے۔"

(یوسف خوش ہو جاتا ہے اور کسی قدر تعجب کے ساتھ کہتا ہے،

"کیا کہا — ایک شعر کی غزل — تو جمال صاحب یہ غزل کہاں ہوئی۔ صرف شعر ہی ہوا۔ ایک شعر، صرف ایک شعر —"

(جمال ذرا سا ہنستا ہے)

"آپ کو پہلی بار سنا رہا ہوں نا۔ اس لئے تعجب ہو رہا ہے، ورنہ
…ت کے آپ گن لگتے۔ دراصل میری ہر غزل میں مجھے مطلعے پہ مقطعے
…شعر ہوتا ہے۔"

(یوسف زور سے قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر کسی قدر پریشان ہو کر کہتا ہے)

"نہیں۔ یعنی کہ تیرہ اشعار۔ آپ مجھے تیرہ اشعار سنائیں گے
…یئے جمال صاحب۔"

"نہیں یوسف بھائی۔ آپ مقطعوں اور مطلعوں کو اشعار میں شامل
کیجئے۔ ہاں تو عرض کروں؟"

(یوسف فوراً بات بدلنے کے ارادے سے)

"ارے ہاں! خوب یاد آیا۔ میں صبح سے بڑی الجھن میں تھا اور
…چ رہا تھا کہ آپ ہی میری مشکل کو دور کر سکتے ہیں۔ خوب آئے آپ بھی۔"

"بندہ حاضر ہے۔ کوئی خدمت ہو سکے تو میں بڑے فخر کے ساتھ
…ں گا۔ آپ فرمائیے تو دیکھئے۔"

"بات یہ ہے جمال صاحب میرے ایک رشتہ دار اپنے بچے کی
…ی کے سلسلے میں یہاں شہر آنا چاہتے ہیں۔ ایک ماہ قیام رہے گا۔ میں
…کے لئے کرایے کے گھر کی تلاش میں ہوں۔ صرف ایک ماہ کے لئے چاہیئے!"

"بس اتنی سی بات! غضب کرتے ہیں آپ بھی۔ اگر صبح آپ
…ے ذکر کیا ہوتا تو شام تک آپ کو مکان دکھلا دیتا اور آپ کا قبضہ بھی
…ر وا دیتا۔"

(یوسف خوشی سے طویل لہجے میں) "۔ اچھا۔"

"ہاں ہاں۔ اب تو خیر رات ہو گئی۔ صبح دیکھیں گے تو پھر
…رض کردوں؟"

"واہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ یوں چٹکیاں بجاتے میں کام بنا
…یتے ہیں۔ کتنی گنجائش کا گھر آپ دلوا سکتے ہیں"

"میری نظر میں دو چار مکانات ہیں۔ آپ کو کتنا بڑا مکان
چاہیئے… تو بتائیے۔"

"…میں چار پانچ کمرے ہوں۔ رسوئی اور حمام ہو۔ نل اور روشنی

کا انتظام بھی رہے تو ٹھیک ہے۔"

"اتنی گنجائش کا مکان … ہے۔ میرے ایک … کا …
ہی میں ہے۔ میں ان سے کہہ دوں گا۔"

"شکریہ جمال صاحب۔ آپ کے بھائی … کردیں … کا
کردوں گا۔ بس ذرا بات پکی رہے۔"

"وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ … میں …
تو عرض کیا ہے۔"

(یوسف پھر بات کا رخ دوسری طرف پلٹتا ہے)

"جمال صاحب آپ جب بھی آتے ہیں مجھے وہ آپ کی چھوٹی
بچی بہت یاد آتی ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے۔"

"آپ دوجاں کو کہہ رہے ہیں یا افشاں کو؟"

"ان دونوں میں چھوٹی کونسی ہے؟"

"شعر کے دو مصرعوں کی طرح دونوں برابر ہیں۔ دراصل دونوں
جڑواں ہیں، ایک ساتھ ہی وجود میں آئیں۔"

"اچھا۔ واہ، آپ نے تو انہیں شعر کے دو مصرعوں
سے تشبیہہ دے دی خوب!"

"اور کیا کرتا۔ فی الحال ہماری زندگی میں یہ ایک ہی شعر ہے
اگر مجھے اور میری بیوی میں سے ہر ایک کو چھ چھ مطلعوں … سے
تشبیہہ دے دیں تو سمجھئے۔"

(فوراً جمال کی بات کاٹ کر)

"۔ کہ زندگی سراپا غزل ہو گئی ہے"

(جمال کے ہنسی کی آواز) "ہاں … تو تازہ غزل کا
مطلع عرض ہے۔"

"ارے ہاں جمال صاحب …
ہمارے دفتر میں صادق نامی ایک …
بھی شاعر ہیں۔"

"صادق نام کے۔ وا…
کیونکہ اس نام کے میرے چاہنے…

"ہوں سے جونا ہی چاہیئے۔ میں کہہ رہا تھا دراصل یہ کہ وہ صادق مرزا غالب کے کلام کا کیا عقیدت مند ہے جناب —؟

"کاش! وہ میرا سارا کلام سن چکے ہوتے"

"وہ کہہ رہے تھے کہ غالب نے جتنی زیادہ بحروں میں طبع آزمائی کی ہے اس اے —"

(پھر فوراً بات کاٹ کر جمال کی مخاطبت)

"خدا کی قسم یوسف بھائی، آپ غالب کے علاوہ میر، امیر مینائی، داغ اور ایسے دوسرے شعراء کے جملہ کلام میں سے مختلف بحروں کے جتنے چاہیں اتنے اشعار سنائیے اور میں اسی بحر میں اپنی غزل زبانی نہ سناؤں تو آپ بڑے شوق سے میرا نام بدل دیں۔"

"اچھا— (حیرت سے زیادہ گھبراہٹ کے انداز میں) خوب! خوب! تو کسی دن میں صادق صاحب کو اپنے گھر پر بلا کر آپ سے ملاؤں گا۔ موقع رہے تو ایک مقابلہ ہی رکھیں گے۔ آپ کے اور صادق کے درمیان یہ"

"ضرور — ابھی ایسے مقابلوں کے لئے تو میں ترستا ہوں تازہ غزل پیش ہے۔"

"بے چارہ صادق آج کچھ کھویا کھویا سا بیٹھا تھا اور مجھے افسوس رہا کہ میں اس کی خاطر خواہ مدد نہیں کرسکا۔"

"کاہے کی پریشانی ہے انہیں"

"وہ اپنا تخلص تبدیل کرنا چاہتا ہے"

(جمال سرد آہ بھرتا ہے) "اوہ! آپ نے میرے دکھوں کو ادا بھی کرید ڈالا۔ سچ پوچھئے تو اب میرا موڈ بدل گیا۔"

"خدانخواستہ۔ کیوں کیوں؟ کیا بات ہوئی"؟

"آہ۔ کتنی محنت سے اور کس قدر زیادہ تعداد میں میں غزلیں موزوں کرتا رہتا ہوں لیکن یہ میرا تخلص مجھے راس نہیں آرہا ہے۔"

"کیوں؟ آپ تو جم کر لکھنے والوں ہی میں نہیں بلکہ ڈٹ کر سنانے والوں میں بھی ہیں۔"

"اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ مجھے اتنی شہرت بھی نہیں ملی، جتنی کہ میرے شاگردوں کے شاگردوں کو ملی ہے۔"

"آپ ضرور تخلص کی نفسیات سے واقف نہیں۔"

"میرے پاس نفسیاتی چیزوں کو سلجھانے کے لئے وقت ہی کہاں ہے بھائی جان وقت کبھی ملجاتا ہے تو ادھر اُدھر کی باتیں سوچنے کی بجائے میں غزل لکھتا ہوں۔"

"اس سلسلے میں آپ کچھ کیجئے۔ واقعی مسئلہ نازک بھی اور حل طلب بھی ہے —"

"میں نجومیوں سے پوچھوں گا تاکہ وہ ایک ایسا نام تجویز کریں جس پر شہرت کے ستاروں کا راست اثر پڑے۔ تو پھر عرض کروں —؟"

"جمال صاحب میں نجومیوں کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتا۔ اگر آپ بھی تخلص کی تھوڑی نفسیات جان جائیں تو ایسی باتیں نہیں کریں گے۔"

(جمال کے لہجے میں کسی قدر تعجب) "اچھا! تو بتائیے آپ کی رائے کیا ہے"

"آپ تخلص کے انتخاب میں جدت سے کام لیں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا تخلص منتخب کیجئے جس کا پہلا نصف حصہ آپ کی کسی بچھڑی ہوئی محبوبہ کے نام سے لیا گیا ہو اور دوسرا حصہ کچھ یوں جما دیجئے کہ آپ کے کلام کو پڑھنے والے یہ تمیز نہ کرسکیں کہ آپ عورت ہیں یا مرد؟"

"کیا فائدہ ہوگا اس سے"

"ابھی ایک آدھ فائدہ ہو تو پوچھئے۔ یہاں تو بے شمار فوائد ہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ خواتین کے حلقے یہ سمجھ کر آپ کے کلام کو پڑھیں گے کہ کسی مرد شاعر کا کلام ہے اور مردوں کے حلقوں میں یہ ڈھنڈورا پیٹا رہے گا کہ یہ کسی صنف نازک کا کمال ہے اور ایک دن ان دونوں حلقوں کے درمیان اچھی خاصی بحث چل جائے گی۔ اب آپ جانتے ہیں کہ ایسی ادبی بحث سے کوئی شخص کتنا پاپولر ہوسکتا ہے۔"

(جمال اچھل جاتا ہے) "بڑی شاندار ترکیب ہے۔ یوسف صاحب واللہ میں آپ کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ اب میرے لئے براہ کرم ایک مہربانی یہ کیجئے کہ یہ رائے کسی اور کو نہ دیں ورنہ مجھ سے پہلے یہ ترکیب کوئی اور لے اڑا تو پھر یہ بندہ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ویسے اسی قسم کی کئی ترکیبیں میری جیبوں میں

پڑی رہتی ہیں ۔"

" اور یہ میری ایک شعر والی غزل تو رہ گئی ۔۔ عرض کیا ہے"
(پھر بات کاٹ کر) " اس ترکیب کے بعد میں ایک اور تجویز کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں ۔"

" آپ بلا کے ذہین اور عملی آدمی ہیں یوسف صاحب۔ مجھے انتہائی مسرت ہے کہ مجھے آپ کی دوستی کا شرف حاصل ہے ۔"

" یہی سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ آپ کو اس شہر کی ادبی انجمن کی جانب سے انعام دلوانے کے لئے تھوڑی سی کوشش کروں ۔"

" یوسف صاحب! مجھے عمر بھر آپ کی دوستی پر ناز رہے گا۔ میں انعام کی آدھی رقم سے آپ کو ایک شاندار پارٹی دوں گا اور آپ کی شان میں بہترین قصیدہ لکھوں گا "

(یوسف کو ہنسی آتی ہے) " ایک شعر کا قصیدہ تو نہیں ؟"

" نہیں ۔۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ واقعی وہ ایک شاندار اور طویل قصیدہ ہوگا اور یقین کریں میری عمر بھر کی شاعری کا نچوڑ ہوگا۔ آپ خود ہی سوچئے یوسف صاحب اس ادبی انجمن والے مجھ جیسے مستحق فرد کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کو انعام دیتے ہیں جنہوں نے زندگی میں بمشکل چار، چھ غزلیں لکھی ہوں ۔۔ یہ انصاف نہیں ہے "

" خیر ان کے انتخابی مسئلہ کو چھوڑئیے۔ اس بارہ میں ایسا کروں گا کہ اس انجمن کے جملہ اراکین کو کچھ عہدہ بخش کے اپنے پاس مدعو کر دوں گا اور آپ خوب جی بھر کر اور ترنم کے ساتھ اپنا کلام سنانا ۔"

" آپ کہیں تو یہ غزل بھی میں ترنم سے سناؤں "

" آپ بڑے جلد باز ہیں جمال صاحب ۔ دیکھئے آپ تحت اللفظ پڑھنے کے عادی ہیں۔ ترنم سیکھنے کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے ۔"

" میں آج سے صبح و شام ایک ایک گھنٹہ مشق کرنے کے لئے مختص کر دوں گا ۔"

" شاعری سنانے کے لئے ترنم اتنا ہی ضروری اور مناسب ہے جتنا کہ دیوار پر لٹکنے والی ایک تصویر کے لئے خوبصورت فریم۔ آپ جانتے ہیں، بہت سے معمولی شعراء کے کلام پر داد صرف ترنم ہی کی وجہ

سے اچھا لکھنے والوں کے اچھے کلام سے زیادہ ملا کرتی ہے ۔"

" مانتا ہوں۔ اپنی غزل فی الحال تحت اللفظ عرض کیا ہے ۔"

" نہیں جمال صاحب مجھ پر اس وقت نیند کا غلبہ ہے اور رات بھی کافی ہو گئی ہیں ٹھیک طور سے آپ کی کاوش کو سراہ بھی نہ سکوں گا "

" اجی جناب! میں کوئی افسانہ نگار یا ڈرامہ نویس تھوڑا ہی ہوں جو اپنے طویل افسانے یا ڈرامے سے مسلسل آپ کا دماغ چاٹتا رہوں۔ ایک ہی شعر کے غزل کی تو بات ہے۔ آپ فرمائیں تو باذو کے ہوٹل والے کو دو عدد چائے کا آرڈر دے آؤں۔ اب بھابی جان کو زحمت دینا مناسب نہیں۔ رات میں ہوٹلوں میں بڑی اچھی چائے ملتی ہے "

" اب میں آپ کو کیا بتاؤں جمال صاحب کہ میں اپنی بیوی ۔"

" بتائیے بتلائیے کیا بات ہے ۔" ؟

" کہتے ہوئے اچھا بھی نہیں لگتا کہ میں اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہوں ۔۔ "

" کیا فرما رہے ہیں ۔ آماں، آپ بیوی سے ڈرتے ہیں ۔ ؟"
(یوسف کی آواز بلند ہو جاتی ہے)

" ہاں بیگم ۔۔ بیگم ۔۔ میں کہہ رہا تھا جمال صاحب کہ میں اپنی بیگم سے بہت ڈرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر گھر میں میرے لئے کوئی ضروری کام ہوتا ہے اور میں یہاں دیوان خانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر بے کار باتیں کرتا ہوں تو ۔۔ "

(بات کاٹ کر) " ۔ تو حضرت ذرا آہستہ فرمائیے نا ۔"

" لیکن جمال صاحب میری بیوی بڑی ہوشیار ہے ۔ وہ ہر بات بھانپ جاتی ہے ۔ وہ بھانپ جاتی ہے کہ اب مجھے دیوان خانے میں نہیں رہنا چاہیئے تب وہ ۔۔ وہ "

" آخر فرمائیے تو سہی ۔۔ "

" تب وہ اندر سے بڑی آواز کے ساتھ یہ دیوان خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے ۔"

(دفعتاً زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

" دیکھ لیا آپ نے جناب ۔ اب آپ میری پریشانی کا اندازہ

نہیں لگا سکتے۔"

"پریشانی کی بات کیوں ۔۔۔۔؟"

"آپ نہیں جانتے ۔ اس دروازے کے کھٹکھٹانے کے ساتھ ہی مجھے اندر چلا جانا چاہئیے، اپنے دوست کو خدا حافظ کہدینا چاہیئے، ورنہ وہ دوسری بار دروازہ کھٹکھٹائے گی اور جمال صاحب پوچھئے کہ پھر کیا ہوتا ہے اگر میں تب بھی نہ جاؤں ؟"

"بتائیے کیا ہوتا ہے" ؟

"اجی حضرت! ایک زبردست ہنگامہ ہوجاتا ہے۔ ہماری بیگم ہمارا کھانا پینا بند کردینے کے لئے قطعی طور پر میکہ جانے کا تہیہ کرتی ہیں ۔ میری زندگی دوبھر ہوجاتی ہے۔ اسی لئے میں ایسا موقعہ نہیں آنے دوں گا۔"

(دفعتاً دوسری بار زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

"اوہ دیکھئے: سنا آپ نے۔ جمال صاحب اب آپ مجھ پر رحم کیجئے۔ میں اجازت چاہتا ہوں، کیونکہ خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ آپ جب تک چاہیں غزل گنگناتے بیٹھئے لیکن جاتے وقت ذرا مہربانی کرکے لائٹ آف کرکے اور باہر کے دروازے کو آواز سے بند کرکے چلے جائیے، مہربانی ہوگی۔ اچھا۔! ہاں خدا حافظ!"

"اے دیکھئے، دیکھئے یوسف بھائی۔۔۔"

(یوسف اندر چلا جاتا ہے)

کمندیں

مستقل فیچر

تیر انداز

انٹرویو

"دیا اُس کا بھلا نہ دیا اُس کا بھلا"

جب چیونٹی کی موت آتی ہے اُس کے پر نکل آتے ہیں اور جب ادب میں جمود آتا ہے تو "انٹرویو نگاروں" کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ اگر آپ ادیب ہیں اور ان دنوں آپ کے پاس لکھنے کے لئے کوئی موضوع نہیں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں کسی دوسرے ادیب کا انٹرویو لے لیجئے کام بن جائے گا۔ اگر آپ کی آنکھوں میں جلن ہوتی ہے، ہاضمہ ٹھیک نہیں رہتا، راتوں کو نیند برابر نہیں آتی ہاتھوں اور پاؤں میں درد ہوتا ہے، گلے میں خراش اور سینے پر غبار رہتا ہے تو آج ہی کسی نامور ادیب کا انٹرویو لے لیجئے۔ انشاءاللہ آپ کو شفا ہو جائے گی۔ آپ نہ صرف "بھلے" ہو جائیں گے بلکہ "چنگے" بھی ہو جائیں گے۔ صاحبو! انٹرویو بڑے کام کی چیز ہے اور کام سے زیادہ نام کی چیز ہے۔ کام کا کام اور نام کا نام۔ کسی شاعر نے انٹرویو کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

کیا خوب سودا نقد ہے
اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

اس نقد سودے میں انٹرویو دینے اور لینے والا دونوں مزے میں رہتے ہیں۔ یہ لین دین بڑا کاروباری لین دین ہے۔ نہ محنت لگتی ہے اور نہ عقل کو کام میں لانا پڑتا ہے مگر لطف یہ کہ رنگ چوکھا آجاتا ہے۔ اگر آپ کسی ادیب سے خود اُس کا اور اُس کے والد کا نام پوچھنے کی اہلیت رکھتے ہیں تو سمجھئے کہ آپ میں "انٹرویو نگار" بننے کی ساری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مگر انٹرویو لینے سے زیادہ انٹرویو دینے میں بڑی ہوشیاری کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ ہم اپنے ایک دوست سے واقف ہیں جن سے ایک انٹرویو نگار نے ان کی آمدنی پوچھی اور جب یہ آمدنی بتا چکے تو انٹرویو نگار نے خود اپنا انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ حضرت میں محکمہ انکم ٹیکس سے آیا ہوں۔ یا تو انکم ٹیکس کا بقایا ادا کیجئے یا پھر میرے ساتھ پولیس تھانہ چلئے۔ ہمارے ادیب دوست بید مجنوں اور سگ لیلیٰ کی دم کی طرح لرزنے لگے۔ اس پر محکمہ انکم ٹیکس کے "انٹرویو نگار" نے کہا کہ "قبلہ! میں آپ کا انکم ٹیکس معاف کر سکتا ہوں، بشرطیکہ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مستقبل میں افسانہ نویسی سے شوق نہیں فرمائیں گے"۔ یوں ہمارے ادیب دوست نے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے ادب سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے ۔۔ لہٰذا ہمارا پرخلوص مشورہ ہے کہ آپ انٹرویو دیتے وقت چوکس رہیں۔ کہیں آپ کا حشر بھی ایسا ہی نہ ہو جیسے ہمارے ایک شاعر دوست کا ہوا تھا جنھوں نے ایک انجانے شخص کو بیٹھے بٹھائے انٹرویو دیدیا تھا۔ یہ شخص انٹرویو لے کر تو چلا گیا لیکن دوسرے دن اُن کے ہونے والے خسر صاحب وارد ہوئے اور ہمارے شاعر دوست سے کہنے لگے "برخوردار! کل میرے بیٹے نے تم سے جو انٹرویو حاصل کیا ہے اس کی روشنی میں، میں تمہیں اپنی بیٹی کا شوہر بننے کے قابل نہیں سمجھتا تمھارے دئیے ہوئے انٹرویو اور تمہاری بیٹی ہوگی" اسم نویسی میں زمین آسمان کا

فرق ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تم نے اپنے والد کا نام تک غلط لکھوایا ہے۔ اسم نویسی میں پانچ بھائی بہن بتائے ہیں لیکن انٹرویو میں آپ نے دو بھائیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ انٹرویو میں آپ نے اپنی آمدنی کم بتائی ہے مگر اسم نویسی میں یہ آمدنی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔" آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک شاعر محض انٹرویو دینے کی وجہ سے آج تک کنوارا بنا پھر رہا ہے۔

لگے ہاتھوں ایک اور ادیب صاحب کا قصہ بھی سن لیجئے کہ ایک دن ایک نوجوان ان کا انٹرویو لینے کے لئے پہونچا۔ اُس نے پوچھا "قبلہ آپ کا نام کیا ہے؟" انھوں نے نام بتلایا پھر پوچھا "آپ کے والد کا نام کیا ہے" انھوں نے جب اس مشکل سوال کا جواب بھی دے دیا تو نوجوان بولا "آپ کے کتنے بھائی ہیں ـــ؟" انھوں نے کہا "ہم دو بھائی ہیں"۔ نوجوان بولا "آپ کے دوسرے بھائی کیا کرتے ہیں؟"۔ ادیب صاحب نے آہِ سرد بھر کر کہا "میرا چھوٹا بھائی بچپن میں گھر سے غائب ہو گیا تھا اور آج تک واپس نہیں لوٹا"۔ ادیب صاحب کا یہ جملہ سن کر نوجوان کے چہرے پر اچانک بجلیاں سی کوند گئیں۔ وہ تھوڑی دیر تو گہری سوچ میں غرق رہا۔ پھر اچانک کرسی سے اُچھل کر ادیب صاحب سے بغلگیر ہو گیا اور چیخنے لگا "بھیا! بھیا!" ـــ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ نوجوان آیا واقعی اُن کا بھائی ہے یا نہیں لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ان دنوں یہ نوجوان ادیب صاحب کے گھر پر ہی رہتا ہے۔ اُن کے کپڑے پہنتا ہے اور ہر ہفتہ اُن سے "پاکٹ منی" بھی لے لیتا ہے۔ اب اس نے انٹرویو لینے کا کاروبار ترک کر دیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک انٹرویو نے دو بچھڑے دلوں کو ملا دیا۔ اگر آپ کے پاس کوئی "انٹرویو" لینے آئے تو خدارا اُس سے اپنے اُن رشتہ داروں کا ذکر نہ کیجئے جو بچپن میں گھر سے غائب ہو گئے تھے، ورنہ خواہ مخواہ دو بچھڑے دلوں کو زبردستی ملنا ہوگا۔

اگر آپ انٹرویو دینا چاہتے ہوں تو اس کے لئے کسی "انٹرویو نگار" کو تلاش کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ "انٹرویو نگار" خود آپ کو تلاش کرے گا کیونکہ ان دنوں "انٹرویو نگاروں" نے "ہوم ڈلیوری سروس" شروع کر رکھی ہے ہم نے ادیبوں کے گھروں پر انٹرویو نگاروں کی اتنی لمبی قطاریں بھی دیکھی ہیں کہ ایک بار ہم اس قطار کو غلہ کی دُکان کی قطار سمجھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاتھ میں اس وقت غلہ کی تھیلیاں تھیں۔ اس پر ایک صاحب نے پوچھا تھا "قبلہ! آپ ایسا کتنا طویل انٹرویو لینا چاہتے ہیں کہ جسے لیجانے کے لئے آپ اپنے ساتھ تھیلیاں لائی ہیں۔" یہ سنکر ہم نادم ہوئے تھے اور غلہ کی دُکان کی قطار کی تلاش میں روانہ ہو گئے تھے۔ ہم نے بعض ادیبوں کے گھروں پر "ہاؤس فل" کے بورڈ بھی آویزاں دیکھے ہیں۔ غرض ان دنوں ہر آدمی انٹرویو لے رہا ہے اور ہر ادیب انٹرویو دے رہا ہے۔

ایک دن ہم نے ایک شاعر کے گھر پر ایک خستہ حال شخص کو دیکھا جو بار بار صدا لگا رہا تھا "بابا! اللہ کی راہ میں ایک انٹرویو دیتے جیئے۔ آپ کے بال بچوں کا بھلا ہوگا۔" اس پر اندر سے آواز آئی "سائیں بابا! معاف کرو، شاعر صاحب مشاعرہ میں شرکت کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔" یہ سن کر اس خستہ حال شخص نے کہا "بی بی! مجھے مایوس نہ کیجئے۔ دو دنوں سے میں نے کوئی انٹرویو نہیں لیا ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ اپنا ہی انٹرویو دیدیجیئے۔" اندر سے آواز آئی "سائیں بابا! اس وقت میں کھانا پکانے میں مصروف ہوں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے دودھ پیتے بچے کا انٹرویو لے لیجئے جو اس وقت جھولے میں سو رہا ہے۔"

بعض ایسے ادیب بھی ہوتے ہیں، جو ایک ایک دن میں دس دس بارہ بارہ انٹرویو دے ڈالتے ہیں۔ ہم نے ایک ادیب کو ایک انٹرویو نگار سے یہ کہتے ہوئے سُنا تھا کہ "بھائی! صبح سے اب تک دس انٹرویو دے چکا ہوں۔ اب میرے پاس بہت تھوڑا سا انٹرویو بچ رہا ہے، کہیئے تو پیش کر دوں؟" یہ کہہ انھوں نے کہا "میرا نام جمیل احمد جالی ہے اور میرے والد کا نام طفیل احمد طفالی ہے،" پھر بولے "بس اتنا ہی انٹرویو بچ رہا تھا جو آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ "گر قبول افتد زہے عز و شرف"

مگر ہم "انٹرویو نگاروں" سے یہ عرض کریں گے کہ "انٹرویو" انگریزی کا لفظ ہے اور جب آپ کسی علامہ یا شمس العلماء قسم کے ادیب یا شاعر کا انٹرویو لینے جائیں تو براہ کرم "انٹرویو" کا مفہوم بھی سمجھا دیا کریں ورنہ آپ کا حشر بھی اس اناڑی انٹرویو نگار کا سا ہوگا جو ایک مولوی ٹائپ ادیب کا انٹرویو لینے کی غرض سے اُن کے گھر پہونچا تھا۔ اس نے زنجیر کھٹکھٹائی تو ادیب صاحب ہانپتے ہانپتے باہر آئے اور بولے "کیوں میاں! کیا کام ہے؟"

…ہلہ! میں آپ سے انٹرویو لینے آیا ہوں" ۔ یہ سننا تھا کہ علامہ …
…پاؤں لرزنے لگے اور انھوں نے ذرا سے چیختے ہوئے کہا۔ "میاں پچھلے …
…ے ابر ساتی کا سارا ٹیکس جمع کروا دیا تھا۔ اب یہ پھر تم نے کونسا تقاضا …
… ۔ اسی طرح ایک اور علامہ قسم کے ادیب نے ایک اور انٹرویو نگار …
…تھا "میاں! تم کیا منہ لے کر مجھ سے انٹرویو مانگتے ہو۔ میں نے تم سے …
…ک لیا تھا، جواب اس کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہو۔"

تو صاحبو انٹرویو نگاروں نے ادب کے میدان میں کافی ہڑبونگ …
…چا رکھی ہے "انٹرویو" کا بھرکس نکال کر رکھ دیا ہے۔ انٹرویو کے معنی …
…بدل دیئے ہیں۔ حد تو یہ کہ پرسوں ایک پولیس عہدہ دار حوالات میں ایک …
…تفتیش کر رہا تھا کسی نے پوچھا "کیا کر رہے ہو؟" اس پر وہ بولا "میں …
…ے انٹرویو لے رہا ہوں۔" اور ہم سمجھتے ہیں کہ ادیب کا انٹرویو لینا …
…ی تفتیش کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کسی …
…سے اس کا نام، اُس کے والد کا نام، اس کے دادا کا نام، بیوی کا نام …
…نام پوچھ لیا جائے اور اپنے تئیں یہ سمجھ لیا جائے کہ آپ نے ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔
اِدھر چند دنوں سے "انٹرویوز" کی ایک نئی قسم بھی پروان چڑھ رہی ہے …
…رویوز" "امداد باہمی" کی اساس پر لئے جاتے ہیں۔ اس کے تحت یوں ہوتا ہے …
…ن چار انٹرویو نگار بیک وقت ایک ادیب کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں۔
…س پر سوالات کی بوچھار کر دیتے ہیں جس طرح "دو ملّاؤں کے بیچ ایک …
…ا مرغا حرام ہو جاتی ہے" اسی طرح تین چار انٹرویو نگاروں کے بیچ ایک اچھا خاصا …
…یب پھنس جاتا ہے۔ ادیب کی پریشانی کا وہ عالم ہوتا ہے کہ ہمارے ایک …
…یب دوست نے بدحواسی میں تین انٹرویو نگاروں کو اپنے والد کے تین علاحدہ …
…علیحدہ نام بتلائے تھے۔ جب یہ انٹرویو نگار اُن کی اس غلط بیانی پر معترض ہوئے …
…تو انھوں نے کہا تھا "بھئی! ہر بار انٹرویو نگار کو ایک ہی قسم کا انٹرویو …
…دیتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے اسی لئے میں نے اب کی بار انٹرویو میں چاشنی …
اور جدت پیدا کرنے کے لئے اپنے والد کا نام بدل دیا ہے۔"

خدا اُن انٹرویو نگاروں کو اجرِ عظیم دے جو ادیبوں کو انٹرویو …
…دینے سے قبل اطلاع نامہ دے دیتے ہیں۔ جیسا ہمیں یاد ہے کہ ایک …
… [illegible] صاحب کو ایک خط ملا تھا کہ … [illegible]

۵ رجون کو آپ سے انٹرویو لینے کے لئے آرہا ہوں۔ لہٰذا آپ اپنے والد کا نام، اپنے دادا کا نام، بیوی کا نام اور خود اپنا نام اچھی طرح یاد کرلیں۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ اگر آپ کو اپنے والد کا نام یاد نہیں ہے تو براہ کرم مجھے ان کا پتہ بتلا دیجئے تاکہ میں خود ان سے ان کا نام پوچھ سکوں۔ چونکہ یہ انٹرویو ادب کی تاریخ میں ایک انقلاب لے آئے گا اسی لئے اس میں آپ کے والد کا نام شامل کرنا نہایت ضروری ہے۔"

انٹرویو نگاروں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ ادیبوں کے انٹرویوز ضرور لیں مگر خدا کے لئے ایک انٹرویو کی خاطر ادیبوں کا اتنا پیچھا نہ کیجئے کہ وہ منہ چھپاتے پھریں۔ ہم نے ایک لطیفہ یہ بھی سن رکھا ہے کہ پرسوں ایک ادیب صاحب کے گھر میں رات کے پچھلے پہر ایک چور دبے پاؤں داخل ہوا۔ اتفاق سے ادیب صاحب اس وقت جاگ رہے تھے چنانچہ انھوں نے آن کی آن میں چور کو پکڑ لیا۔ مگر چور نے فوراً اپنا گریبان اُن کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور جیب سے ایک کاپی اور قلم نکال کر بولا "قبلہ! آپ کا نام کیا ہے؟" ادیب صاحب نے اپنا نام بتایا۔ پھر چور نے پوچھا "آپ کے والد کا نام کیا ہے؟" ادیب صاحب نے اس پر پوچھا "مگر تم یہ سوالات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" ۔ چور بولا "حضور! میں دراصل ایک انٹرویو نگار ہوں اور آپ سے انٹرویو لینے کی غرض سے آیا ہوں۔ لِلّٰہ مجھے مایوس کیجئے!"

لوگوں کا بیان ہے کہ ادیب صاحب نے بنا سوچے سمجھے اس شخص کو انٹرویو دے دیا اور آج تک کسی نہ کسی رسالے میں اس "انٹرویو" کی اشاعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ جس شخص نے ان سے انٹرویو لیا تھا وہ دراصل چور ہی تھا۔ اس نے تو بس ادیب صاحب کی دکھتی رگ پکڑ لی تھی اور یوں پولیس کے چنگل میں آنے سے بچ گیا تھا۔ لہٰذا جب بھی کوئی انٹرویو نگار آپ کے پاس آئے تو آپ اُسے سب سے پہلے پولیس اسٹیشن بھجوائیں اور جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ شخص چور نہیں بلکہ واقعی انٹرویو نگار ہے تب انٹرویو دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔ ہر کس و ناکس کو انٹرویو دینے کا نتیجہ … [illegible] … اپنے نقلی اور جعلی … انٹرویو نگار … [illegible] … بلکہ آپ …

اگر انٹرویو نگاروں کی تعداد میں یونہی اضافہ ہوتا رہا تو ہمیں بجا طور پر یہ اندیشہ ہے کہ ایک دن کراماً کاتبین کی اہمیت خاک میں مل جائے گی جب کوئی ادیب مرنے کے بعد خدا کے حضور میں پیش ہوگا تو کراماً کاتبین کے مرتبہ اعمال ناموں کو نہیں دیکھا جائے گا۔ بلکہ اس کے لئے انٹرویو نگاروں کے "انٹرویو" پر نظر ڈالی جائے گی اور جنت اور دوزخ میں جانے کے فیصلے صادر کئے جائیں گے۔ کسی ادیب سے کہا جائے گا کہ تم ادب میں جمود کے قائل تھے (ملاحظہ ہو انٹرویو شائع شدہ در رسالہ گفتار شمارہ ۵ جلد ۱) اس لئے تمہیں دوزخ میں ڈالا جا رہا ہے۔" اس وقت ادیب تو "دوزخ" کی طرف جائے گا مگر انٹرویو نگار کھڑا ادیب پر مسکرا رہا ہوگا۔

پس اگر آپ اپنی عاقبت کو سنوارنا چاہتے ہیں تو انٹرویو نگاروں سے بچیئے ورنہ آپ خواہ مخواہ انٹرویو نگاروں کے پیچھے پڑے جائیں گے اور آپ کی ساری نیکیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ •

نرنجن چندن

فلمی شاعروں کی کل ہند کانفرنس

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین

ہمارے بامبے کی مارکٹ میں آپ شاعروں کا یہ میلہ آپ کے پھن (فن) بدیا (ودیا) کی ترقی کا ایک بڑا میل پتھر ہے اور اس کے اوپننگ کے لئے جمیل بل بگل گھونٹا جیسے ایک آدمی کو جسے آم (عام) طور پر فلمی سیٹھ کہا جاتا ہے اور شعر سمجھنے کے ناکابل (قابل) سمجھا جاتا ہے، اجت (عزت) دینا آپکے پھن (فن) بدیا (ودیا) کی ترقی کا دوسرا میل پتھر ہے۔

"ہم لوگ آپ کو فائنانس کرتا ہے۔ کیوں؟ ہم جانتا ہے کہ آپ لوگوں نے بڑا کام کیا ہے (تالیاں) اور جب بڑا کام ہوتا ہے تو نام بھی بڑا ہوتا ہے۔ سو ہوا۔ ہمارا بھی ہوا، آپ کا بھی ہوا (تالیاں) اچھی بات ہے۔ ہم سب کو بھائی بھائی بن کر رہنا چاہئیے اور اپنے دیس کے لوگوں کا جی کھش (خوش) رکھنا چاہئیے۔

"ہمارے دیس کا لوگ بڑا اچھا ہے۔ بھولا ہے۔ جو پیش کرو کبول (قبول) کر لیتا ہے۔ سب چلتا ہے۔ سالا تمہارا کئی بھائی ہمیں کہتا ہے کہ آجکل کی فلموں سے عوام کا مجاق (مذاق) خراب ہوتا ہے۔ سالا بکتا ہے ہم لاکھوں روپیہ لگاتا ہے تو ایک فلم بنتا ہے اور پبلک لوگ اس پر دونوں ہاتھ سے خرچتا ہے پھر بھی اس کا مجاق (مذاق) خراب ہوتا ہے۔ ہمیں ایسی بات اچھا نہیں لگتا۔

"ہم آپ کے بھائی سے آج کہے گا کہ وہ کوئی حجت یا بکل (بکواس) نہ کرے اور ایسے گیت لکھتا رہے جس سے لوگوں کا دل باگ باگ (باغ باغ) ہو دماگ (دماغ) کو ٹھنڈک ہو اور میٹھی میٹھی نیند آجائے۔ (تالیاں)

"ہم بزنس مین زیادہ بات نہیں کرتا، آپ نے یہاں بلایا اس کے لئے آپ کے کنوینر، مدہوش گنگا جمنی جواب آپ کا صدر بن گیا ہے اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہے، اس کانفرنس کو شروع کرنا مانگتا ہے اور آپ کے مشاعرے کی اجاجت (اجازت) دیتا ہے۔"

(نوٹ:۔ یہ مشاعرہ داد و تحسین کے نعروں سے بھرپور تھا۔ ایک کے بعد دوسرا شاعر گٹکری لے کر ترنم سروں میں اپنے اشعار کو چینٹ چینٹ کر پڑھ رہا تھا۔ سامعین شعراء اور سامعین کے علاوہ موسیقار اور اس کے ساز ندے طبلہ اور ڈھول بجا کر واہ واہیاں بلنے میرے گلے میں سو سو ٹلنے کی طرز پر "ڈونگرے" برسا رہے تھے۔ ہر بہکتے ہوئے شعر اور ٹوٹتے ہوئے مصرع پہ واہ واہ ہے، ہو ہو کی بھی کی صدائیں بلند ہوتی رہیں لیکن نہیں

یہاں اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ قارئین کا مزہ خراب
نہ ہو بشرطیکہ کچھ آرہا ہو اور وہ نیٹ مشاعرہ پڑھ سکیں)

مشـــــاعرہ :

پھیلینڈر : تھیٹر کے پرانے رنگ میں مجنوں کی نئی فریاد سنیئے :-

میرے دل پہ چڑ کے لگا دھیرے دھیرے — جی ہاں دھیرے دھیرے
مجھے اپنا مجنوں بنا دھیرے دھیرے — جی ہاں دھیرے دھیرے
میں صدیوں سے کرتا رہا کھوج تیری
تھکا ماندہ ہوں آزما دھیرے دھیرے — جی ہاں دھیرے دھیرے
میں مجنوں کا بیٹا تو لیلےٰ کی سالی
ذرا اپنے نخرے دکھا دھیرے دھیرے — جی ہاں دھیرے دھیرے
یہ لمبی سی گردن یہ خم کھا کے شانے
ہلا دھیرے دھیرے اٹھا دھیرے دھیرے — جی ہاں دھیرے دھیرے

بے ٹوک :- ماہیا کے نئے نویلے پنے سنیئے :

عورت: کوئی شرٹ ہوائی ہے — پتلون ہے آوارہ
اڑتی نکٹائی ہے
مرد: کوئی لال دوپٹہ ہے — دل کا تو خون ہوا
کیا آنکھ مٹکا ہے
عورت: تم شیخی خورے ہو — وعدے میٹر کے
پر جیب کے کورے ہو
مرد: ہوٹنگ نہ کیا کرو — عاشق کے وعدوں کی
کچھ داد بھی دیا کرو
عورت: دل میت کی چاہ کرے — اکھیاں ترس گئیں
کوئی پریم کی راہ ملے
مرد: ہم ہیں تیرے دیوانے — چاہیں گے تجھے ہردم
تو مانے یا نہ مانے
دونوں: ہم ہیں تیرے دیوانے

ثقیل باتونی : ایک غزل سماعت فرمائیے ۔ اس کی ردیف مدت مدید تک آپ کا پیچھا کرے گی ۔

بہاریں پی کے آئی ہیں تیری زلفوں کے کیا کہنے
ہوائیں مسکرائی ہیں تیری زلفوں کے کیا کہنے
میرے دل میں سمائی ہیں تیری زلفوں کے کیا کہنے
یہ عاشق کی خدائی ہیں تیری زلفوں کے کیا کہنے
تیری زلفوں پہ ہوتا ہی گماں جیسے یہ اپنی ہوں
مگر پھر بھی پرائی ہیں تیری زلفوں کے کیا کہنے

حضرت نان پوری : راک اینڈ رول کی ایک ہٹ ملاحظہ فرمائیے :

مرد: بف بف بف
عورتیں: ہٹ ہٹ ہٹ
ایک مرد: سن میری سجنی — نیندیں ٹھگنی
پیار کی اگنی — پل پل جگنی
اس کے شعلے — دھک دھک دھک

مرد: بف بف بف
دوسری عورت: پیار کا لوبھی — ملتا ہے جوگی
بڈھا بھی روگی — جوگی بھی بھوگی
پریم ہی ان کی — رٹ رٹ رٹ
عورتیں: ہٹ ہٹ ہٹ
دوسرا مرد: او متوالی — نخرے والی
لالی جیالی — نشے کی پیالی
پی لینے دے — غٹ غٹ غٹ
عورتیں: ہٹ ہٹ ہٹ
مرد: بف بف بف

ماہر خبطی : ایک عملی کا گیت سنیئے ۔ اس کی ایک کامیاب نقل کو فلم گیت کا ہر پیاسا داد دے چکا ہے ۔

دل جو میرا گھبرائے — اور سر بھی چکر کھائے
جاتا ہوں میں چنڈو خانے — جہاں دیوانے
بڑے سیانے — جگ کی کتھا بچھائیں

ان کی رام کہانی — سن لے آکر جانی
اسمیں ملے گی تم کو پیارے — میرے دل کی نشانی
آ آ آ میرے پیارے آ — آکر تو بھی موج اڑا
لاکھ جگہوں کی ایک جگہ ہے — کیوں نہ تو پہچانے
دل جو میرا گھبرائے — ....

تم جو بات کو سمجھو — میری جیب کو دیکھو
پا جاؤ گے راز ہمارا — یار کی لاج نہ پرکھو
لالا لا مائی ڈیر لا — جو بھی لاسکتا ہے لا
لاکھ جگہوں کی ایک جگہ ہے — کیوں نہ تو پہچانے
دل جو میرا گھبرائے — اور سر بھی چکر کھائے
جاتا ہوں چنڈو خانے — جہاں دیوانے
بڑے سیانے — جگ کی کتھا بکھانیں

مکتب طفلی: جدید لوری ملاحظہ فرمائیے۔ طفلستان کمپنی کی طرف سے اس کے لئے دس ہزار روپیہ پیش ہو چکا ہے۔

جیو میرے لال پاؤ پگ پگ آرام
سینما میں بیتے تیری ہر اک شام
جیو میرے لال جیو جیو میرے لال
دیکھو "دیوداس"، دیکھو "سوہنی مہینوال"
دیکھو "برسات"، دیکھو "سولھواں سال"
جیو میرے لال — جیو میرے لال
جیو میرے لال — پاؤ پگ پگ آرام
ہوٹل میں دن کٹے — سینما میں شام
جیو میرے لال — سیکھو فلموں کا فن
دیوانند بنو، آغا بنو — یا راد ھاکشن
ہر رنگ میں مٹیا پیدا کرو — تم اپنا ہی ڈھنگ
جو بھی دیکھے مان جائے تیرا کمال

جیو میرے لال — جیو جیو میرے لال
جیو میرے لال پاؤ دنیا کا دھن
اس سے پہلے سندر فلم مووی ٹون
راج مدھو بالا بنیں ہیرو ہیروئین
رسم مہورت کرے سیٹھ چند ولال
جیو میرے لال جیو جیو میرے لال

جیو میرے لال جیو جیو میرے لال

مفتوح شاہپوری: گنتی کی سنگلاخ زمین میں دو نرم گرم بیت سنئے:

لڑکا: ایک دو تین گوری ایک دو تین
میں ہوں مداری تیرا تو میری بین — ایک دو تین
لڑکی: چار پانچ چھ، چھورے، چار پانچ چھ
تیرے جیسے بھٹکتے ہیں کئی لڑکے — چار پانچ چھ
لڑکا: سات آٹھ نو، گوری، سات آٹھ نو
منتر مار دوں گا اگر بات نہ سنو — سات آٹھ نو
لڑکی: دس گیارہ بارہ، چھورے، دس گیارہ بارہ
منتر جنتر کردں بھگنتر میری پو بارہ — دس گیارہ بارہ

میرا ارادہ تھا کہ آپ کو ایک عشقیہ قوالی اور ایک رنگین بھجن بھی سنا دوں لیکن ہمارے صدر محترم جناب مدہوش گنگا جمنی کا حکم ہوا ہے کہ اب اسٹیج ان کے حوالے کردی جائے۔ "ایک ضروری اعلان" —

(الف) فلمسازوں کے لئے

اس مشاعرہ کے جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ نہیں۔

(ب) قارئین کے لئے

اگر اس مشاعرے سے یہ محسوس ہو کہ فلمی شاعری بہت آسان ہے اور مضمون نگار نے کوئی تیر نہیں مارا تو یہ اس مضمون کے مقصد کی کامیابی ہوگی۔ مداخلت معاف۔ اب صدر کی تقریر سنئے:

مسکانفرنس مدہوش گنگاجمنی

پیارے حاضرین، دوستو! مہربانو!

جیسا کہ آپ نے ابھی دیکھا، فلمی شاعروں نے ہر گام پر جدت طرازی کی ہے۔ عروس سخن کو انوکھے اور نرالے زیورات سے مالا مال کیا ہے بلکہ دنیائے شاعری میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا ہے جس کا حرف آخر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔

قدیم ادوار کے پیروکار جدید شاعروں نے ادب کی اس گداز صنف کو کچھ آزمودہ طریقوں تک ہی محدود رکھا جس سے اس امیر شہزادی کا دامن تنگ ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب لوگ انیسویں صدی کے پرانے رنگ کے تغزل سے بیزار ہو رہے تھے، انگریزی ادب اردو ادب پر حاوی ہو رہا تھا اور قدامت پسند شعرا کی افسردگی بیسویں صدی میں داخل ہو رہی تھی تو آسمانِ ادب پر فلمی شاعر کے فرشتے نے انگڑائی لی اور یونانی شہنشاہ سکندر اعظم کی طرح اس برصغیر پر اپنی عبا پھینک دی (تالیاں) لوگوں نے اس عبا کے اثر کو گھنی چھاؤں کے برابر پایا اور جوق در جوق اس کے نیچے جمع ہو گئے (تالیاں)

فلمی شاعری کا ابتدائی دور تو بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ عجیب قسم کے کودوق اور ٹھس لوگوں سے واسطہ تھا۔ ایسے ایسے بدھوؤں کے سامنے اپنا کلام رکھنا پڑتا تھا جو ستم۔ فلک۔ فرقت ہجر اور تغافل ایسے الفاظ کی وضاحت مانگا کرتے تھے لیکن صبر کی طرح محنت بھی اپنا ثمر لاتی ہے اور آج اس ثمر کے صدقے ہماری ہر ترکیب اور ہر اختراع قبول و محبوب ہے۔ چنانچہ "رمیا وستہ وتیہ۔ ڈوا ڈوا ڈواں۔ آنکھ مٹکا، اڈی پٹہ لارا لپا۔ فنٹوش، اینا مینا ڈیکا۔ رم پم پوش۔ جوڑی دار بڑا ٹٹ پنیا، کو منہ چھپا کے جمرات آئی رے" ایسے اقوال و الفاظ ہمارے پڑھے لکھے نقادوں کے لئے ضرور نئے اور انوکھے ہیں لیکن ہمارے ان پڑھ سرپرستوں کا تکیہ کلام ہیں۔

لیکن شاعری کی پرانی لیکھ کے فقیر کہتے ہیں کہ ہماری اپج علم عروض و قافیہ کے خلاف ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب ایک نئی صنف اپنے فرائض بلا رجبرانہ ادا کر رہی ہو تو اس پر پرانے عروض و قافیے ٹھونسنے میں کیا تُک ہے؟ اور ہم نے تو شاعری کے لئے نئے قواعد وضع کر دیئے ہیں۔ ان کی قدر کے قدرِ ناشناس زمانے میں تو قدر نہیں لیکن آنے والی نسل ان کے زیر بار رہے گی اور گردن نہ اٹھا سکے گی۔ ہم نے بحروں کی تعداد میں بے شمار اضافہ کر دیا ہے۔ دائرہ ادب سے قدم آگے رکھنے کی جسارت کی ہے۔ غزل میں مرثیہ کا رنگ اختیار کیا ہے۔ اس میں نوحہ اور سوز کے مضمون نظم کئے ہیں۔ شعر کو اس کی بحر سے الگ کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ ایک ہی شعر میں صیغہ واحد اور جمع پیش کئے ہیں۔ ہم نے نئے نئے اصول ایجاد کئے ہیں مثلاً اپنے مطلب کو پیٹ میں نہ رکھو، اسے ادا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی الفاظ ڈھونڈ نکالو۔ اگر لغت کے الفاظ میں وہی مطلب یا مفہوم ادا نہ ہو تو اختراعات کرو۔ معشوق کی کسی بات کو برا کہنے سے گریز نہ کرو۔ اس کی ہر ادا کو ناگوار نہ بتاؤ۔ شعر گوئی سے قبل کسی شعر کی تقطیع کا تکلف نہ کرو۔ مصرعے کی موزونیت کے لئے موسیقار کی طرز کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ گلوکار یا ایکٹرس اگر کسی لفظ کا تلفظ نہ کر سکتے ہوں یا کسی محاورے کو صحیح طور پر نہ ادا کر سکتے ہوں تو حسب موقع اسے تبدیل کر لو۔ آخر عروض و قافیہ ایک راستہ ہیں، منزل نہیں اور ہمیں محض راستے کی پابندی کے لئے منزل سے محروم نہیں ہو جانا چاہیئے (تالیاں)

بعض ہم سخن کہتے ہیں کہ ہماری شاعری فن و ادب پر ظلم ہے اور اس کام کے لئے ضمیر ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ اب ذرا سوچئے کہ یہ محض خود فریبی نہیں تو کیا ہے۔ ضمیر تو بزدلوں کی دلیل ہے۔ شاعر میں حوصلہ ہونا چاہیئے، جرأت ہونی چاہیئے۔ ضمیر خود بخود ڈل جاتا ہے۔ یہ تو بیمار کتیا ہے جو بہت دیر تک آپ کا تعاقب نہیں کر سکتی۔ آخر ہم نے کونسی قاضی کی گدھی چرائی ہے کہ ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرے۔ (تالیاں) ہم آرڈر ملنے پر مال سپلائی کرتے ہیں، مارکیٹ کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں اور اپنے دماغ کی محنت کا پھل کھاتے ہیں۔ ہم کسی خلاف وضع فعل کے مرتکب نہیں (تالیاں)

ہم پر الٹے سیدھے اعتراض کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو شعر و شاعری میں کوئی مہارت نہ رکھنے کے باوجود کہتے ہیں کہ ہماری شاعری بے مقصدیت کو فروغ دیتی ہے گویا بے مقصدیت کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ بنیادی طور پر تو یہی غلط ہے کہ کوئی چیز بے مقصد ہے کیوں کہ دنیا میں کچھ بھی بے مقصد نہیں حتیٰ کہ بے مقصدیت بھی بے مقصد نہیں۔ آپ خود خیال فرمایئے کہ ہم نے بے مقصدیت سے کیا کیا کام لئے ہیں۔ ہر مسئلہ اور ہر مشکل کو گاتے گاتے حل کرنا ایک بہت

اچھا اصول ہے اور ہمارے کارناموں کے سبب اب بے شمار طلباء فلمی گانے گاتے ہوئے امتحان دینے جاتے ہیں اور اگر فیل ہو جائیں تو گاتے گاتے دل کو ڈھارس بندھاتے ہیں۔ روزگار کے ضرورت مند گاتے گاتے روزگار تلاش کرنے نکلتے ہیں اور کامیاب ہوں یا ناکام ہمارے ہی گیتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ نرسری کے بچے جو مہینوں تک گنتی نہیں سیکھ سکتے اب ایچک دانہ بیچک دانہ کہتے کہتے دو دن میں طاق ہو جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں گاتے گاتے شادی کی تیاری کرتی ہیں اور اگر خاوند سے نہ بنے تو ہمارے ہی گانے گا کر وہ اس گھڑیوں کی شدت کو کم کرتی ہیں۔ پنڈت اور راگی ہمارے ہی گانوں کی طرزوں کے استعمال سے اپنے عقیدت مندوں کے دلوں پر اثر کرتے ہیں بادہ خوار جو کسی زمانے میں توازن کھو کر اول جلول بکا کرتے تھے اب اطمینان سے کوئی فلمی گانا گا کر اپنی بدمستی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم نے اپنی بے مقصدیت سے عوام کی زندگی کے ہر پہلو کے لئے کوئی نہ کوئی خدمت سر انجام دی ہے۔ بے مقصدیت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے لئے کسی قاعدہ یا اصول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پرانے زمانے میں لوگوں کو عادت تھی کہ ہر آرٹ کے لئے دقیق اور ثقیل اصول وضع کئے جاتے تھے لیکن ہم اپنے آرٹ کو اپنی بے مقصدیت کے سہارے اس مقام تک لے آئے ہیں جہاں اس کے لئے کسی اصول کی ضرورت نہیں (تالیاں) جب یہ معلوم ہو گیا کہ عوام راک اینڈ رول اور جاز کی دھنیں پسند کرتے ہیں تو ہم نے تاریخی اور دھارمک فلموں کے لئے بھی ایسے گانے لکھ دیئے جو آسانی سے راک اور جاز کی دھنوں میں ڈھل گئے (تالیاں) ویسے بھی ہم نے اپنے گیتوں میں ایسے بول بھر دیئے کہ کوئی بھی سمجھدار موسیقار انہیں موسیقی کی جدید ترین دھنوں میں ڈھال سکتا ہے۔ ہندوستان کے وہ لوگ جو ہمارے قدیم اور شاستری سنگیت کی پیچیدگیوں کی وجہ سے موسیقی سے متنفر ہو رہے تھے۔ اب ہمارے گانوں سے تیار کردہ موسیقی پر جان چھڑکنے لگے ہیں۔ وہ راک، لارالپا، رمبا، سامبا اور جاز سنگیت کا نہ صرف رس لیتے ہیں بلکہ اکثر حالتوں میں خود بھی اسے گانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ایسی قابلیت کی بدولت ملک بھر کے باشندے ہم ترنم اور نغمہ سرا ہو گئے ہیں (تالیاں)

معترضین یہ کہتے ہیں کہ ہمارے گانے فلم میں موقع کے مطابق نہیں ہوتے۔ گویا زندگی میں آپ کو ہر چیز بالکل ہی ملتی ہے! اگر ایسا ہی ہوتا تو زندگی یکسانیت کے جمود سے پس جاتی۔ زندگی میں تنوع کے لئے اشیا کا بے موقع اور بے محل ہونا ضروری ہے۔ ایک دنیا چاہتی ہے کہ بے موسم میوے کا اپنا مزہ ہے۔ بے انتظار ملاقات کی اپنی مسرت اور بے وقت کی رنگینی کا اپنا کیف ہے۔ عوام جو ہر مسئلہ کی سب سے بڑی عدالت ہیں ہمارے گانوں کے اس قدر دلدادہ ہو گئے ہیں کہ ہم اپنی پیشکش میں کسی تبدیلی سے کام نہیں لے سکتے۔ (تالیاں)

ہمارے نکتہ چیں ہماری زبان پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ ہندی ہے نہ اردو۔ اب ان بھلے مانسوں کو کون بتائے کہ ہم ایک ایسے ترقی یافتہ دور میں رہتے ہیں جہاں کوئی چیز خالص نہیں۔ ملاوٹ ہر کامیابی کی کلید ہے۔ ادب میں سیاست، سیاست میں مذہب، مذہب میں جنسیات، جنسیات میں نفسیات اور نفسیات میں لذت پسندی کی مسلسل ملاوٹ ہو رہی ہے اور سب چلتا ہے۔ لیکن صاحبو! ہماری ملاوٹ تو آرٹ کی ملاوٹ ہے۔ حسنِ امتزاج ہے جس کے بغیر کوئی آرٹ ممکن نہیں۔ ہم نے ملک کے مختلف صوبوں کے روزمرہ سے زبان کا ایک نیا نمونہ تیار کیا ہے۔ شعر و شاعری کے ذخیرہ میں نئے نئے الفاظ اور تراکیب کا اضافہ کیا ہے۔ ہم نے ایسے ایسے الفاظ ایجاد کئے ہیں جو کسی زبان میں نہیں۔ اس لحاظ سے ہم لغت نواز ہی نہیں بلکہ لغت ساز بھی ہیں (تالیاں)

اعتراض ہوتا ہے کہ ہمارے گانوں پر پنجابیت سوار ہے۔ لیکن پنجابیت چیز ہی ایسی ہے کہ جہاں پہنچے ایک دفعہ تو سوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے غیر پنجابی شاعروں کو بھی اپنے گیتوں میں اس لئے پنجابیت داخل کرنا پڑتی ہے کہ اس سے فلمساز اور فلم بین دونوں خوش ہو جاتے ہیں۔ پنجاب میں نہ صرف زندگی اور رومان کا تصور گہرا ہے بلکہ زندگی اور رومان کے لئے جی جان والے بھی بہت ہیں۔ پنجاب کے لوک گیت ماہیا اور ڈھولک گیت فلموں کی جان بن گئے ہیں اور بھنگڑا تو ایک دن مغرب کے فلم سازوں کو فتح کرے گا۔ (تالیاں)

دراصل ہماری جدتوں میں وہ خوبیاں ہیں کہ انھیں غیر ممالک میں بھی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے لیکن ہمارے اپنے ملک کے نکتہ چینوں کو کیڑے نکالنے کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے گیتوں کا جھکاؤ مغربی طرزوں کی طرف ہو رہا ہے یہ ایک لغو اعتراض ہے۔ بھلا اس بیسویں صدی میں ہم کسی چیز کو مغرب یا مشرق، شمال جنوب کی چار دیواری میں محبوس کر سکتے ہیں؟ اور پھر شاعری اور موسیقی تو کسی ایک علاقے کی کنیز بن کر رہ ہی نہیں سکتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب ہماری شاعری اور دھن سے عوام خوش ہوتے ہیں تو اس میں مغربیت یا امریکیت یا روسیت کے آنے سے کیا بگڑ جاتا ہے؟ (تالیاں)

ہمارا تعلق عوام سے ہے۔ دن رات محنت کرنے والے، روزمرہ کے دکھ

یشان زندگی کی کلفتوں سے نڈھال عوام۔ ان کے محظوظ ہونے سے ملک کی اکثریت
ابھرتی ہے۔ ملک کی زندگی میں حرکت و برکت پیدا ہوتی ہے۔ انہیں عوام کی خوشنودی
ہم نے شاعری کے نئے نئے تجربے کئے ہیں۔ اگر انہیں ہمارے تجربوں سے کوئی تسکین
یہ ستیہ گرہ کرتے (تالیاں) ہمارا بائیکاٹ کرتے (تالیاں) کوئی بھوک ہڑتال
(تالیاں) لیکن آج تک کوئی ایسی چیز نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہونے کا احتمال
الانکہ ہمارے معترضین اکثر لوگوں کو ہمارے فن کے خلاف اکساتے رہتے
شیم شیم کی آوازیں)

میں سمجھتا ہوں کہ فلم جیسی مختلف المذاق صنف ادب کو ہمیشہ تنگ نظر
ں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کی راہوں کا فیصلہ کریں گے (تالیاں)
ے فن کی سرخروئی و قبولیت ہوگی جو ہمارے عوام اس پر نچھاور کرینگے۔
امین کی آوازیں)

ہم جانتے ہیں کہ خواص نے ہمیں داد دینے میں زیادہ عالی ظرفی کا ثبوت
یا لیکن ہمیں ان کی زیادہ فکر بھی نہیں کیوں کہ ہمارے ملک کے خواص کو مفت
یکھنے کا چسکا ہے۔ وہ بعض اچھی فلمیں صرف اس لئے نہیں دیکھ پاتے کہ انہیں
یا پہونچتے اور ہمیں ایسے لوگوں کی تنقید یا مذمت سے کیا ڈر ہوگا۔ جنہیں
ں دیکھنے کی کوئی بے قراری نہ ہو (تالیاں)

فلم کا آرٹ عوام کے لئے ایجاد ہوا۔ عوام کی خاطر ترقی پذیر ہوا اور عوام کی
رواں دواں ہے۔ عوام جانتے ہیں کہ ہم انہیں دس آنے میں اور کہیں کہیں پانچ
بہترین گانے، بہترین موسیقی، بہترین کہانی اور بہترین مکالمے پیش کرتے ہیں۔
اسحین سے اپیل کریں گے کہ وہ زمانے کی ہوا اور مے خانے کے رنگ کو دیکھیں
ائیڈر و جن بموں کی زد میں مشوش اور سہمی ہوئی زندگی کو اپنے شالی نغمے سے
رد نصائح سے مزید پریشان نہ کریں۔ (پرزور تالیاں)

پیارے حاضرین

اب ان قراردادوں کا اعلان کیا جائے گا جو سبجیکٹس کمیٹی نے متفقہ رائے
کی ہیں۔

۱۔ فلمی شاعروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک انجمن قائم کی جائے
عہدہ دار اور مجلس عاملہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی پر مشتمل ہوں۔ اس کی پہلی
کی میعاد اولاً پانچ سال ہو اور اگر ضرورت پڑے تو اس میں مزید پانچ سال

اضافہ کیا جا سکے۔

۲۔ گانوں کی درج ذیل تین اقسام اور دام ہوں۔

(الف) انجمن کی حسب خواہش مدت میں مہیا کردہ تین منٹ تک
کا گانا ـــ تین ہزار روپے

(ب) ہدایت کاروں اور لوکیشن کی تبدیلیوں سے میل کھانیوالا
تین منٹ تک کا گانا ـــ پانچ ہزار روپے

(ج) تین منٹ تک کی حسب طرز مطلوبہ فی البدیہہ ہٹ۔ ۷ ہزار

۳۔ مندروں، گوردواروں اور دیگر عبادت گاہوں میں استعمال ہونے
والی فلمی طرزوں کے لئے اس انجمن سے باقاعدہ اجازت یا سالانہ لائسنس حاصل کئے جائیں

۴۔ حکومت ایک ایسا قانون بنائے جس سے فلمی شاعروں کا مذاق اڑانا
قطعاً بند کر دیا جائے۔

۵۔ فلم کی لمبائی کم کرنے کی ہر تحریک کی حوصلہ شکنی کی جائے اور ہر فلم
میں کم از کم پندرہ گانے بھرے جائیں۔

۶۔ ہر سال فلمی شاعری کا انتخاب شائع کیا جائے جس میں ہر گیت کے نیچے
اس کی طرز موسیقی کے اشارے درج ہوں۔ ''

آخری نوٹ:

(یہ مضمون کانفرنس کی کارروائی کی روداد محض ہے۔ اگر
کہیں یہ محسوس ہو کہ مضمون نگار حائل ہوا ہے تو اسے اس
کی بے ادبی سمجھا جائے۔ کیوں کہ وہ بھی قارئین کی طرح
فلمی گیتوں کا رسیا ہے)

فلمی تبصرہ

اعجاز قریشی

یادیں

تجربہ نہیں ——— خودکشی

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

یہ شعر "یادیں" پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یادیں بنانے والے ایک یا ایک سے زیادہ افراد نے اپنے احساس کمتری کو ختم کرنے کیلئے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ جو "نیا تجربہ" پیش کرنا چاہتے ہیں اس کا اصل فارم (FORM) سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں محض ایک نئی اور انوکھی چیز پیش کردی ہے۔ یادیں دراصل بہت سی آوازوں کا بے ہنگم شور ہے۔ ایک دیوانہ جس طرح تنہا دنیا و مافیہا سے بے خبر گھنٹوں اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے دوسروں کو اپنی باتیں اور خیالات سناتا اور خود ہی ان کے ردعمل اور تاثر کو محسوس کرکے خوش یا رنجیدہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی حال اس فلم کے اکلوتے کردار کا ہے جسے یادیں آتی ہیں تو صرف آوازوں کی چہرے یاد نہیں آتے اور چہرے کردار اور ان کی حرکات و سکنات یاد آتی ہیں تو وہ تجربے کے نام پر یا ایک بالکل ہی انوکھی اور ذاتی تخلیق پیش کرنے کے طفلانہ جنون میں حرکات و سکنات اور چہروں کو غائب کردیتا ہے۔ اس فلم میں ایک چہرہ ہے ایک شخص ہے اور اس کی تقریباً برہنہ حالت میں اچھل کود ہے نیز ازدواجی زندگی سے متعلق اہم اور نازک گھمبیر مسائل پر اوٹ پٹانگ اور کبھی کبھی کام کی باتیں سب دیکھنے اور سننے کو مل جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ یادیں اور تو سب کچھ ہے فلم نہیں۔ دنیا میں گذشتہ (۶۰)، (۷۰) سال کے دوران بڑے بڑے فلمی فنکار گذرے ہیں جنھوں نے فارم کو باقاعدہ تشکیل دینے میں اور فلم کو ایک شئے اور مرکب فن کی حیثیت سے عظمت اور بلندیاں عطا کرنے میں اہم اور تاریخی رول ادا کئے ہیں لیکن کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ ایک اداکار اور ایک سیٹ پر "یادیں" کی طرز پر کوئی فلم تخلیق کرتے یا بناتے۔ اگر اس فلم کو سوچنے اور بنانے والوں نے اپنی تسکین کیلئے ہی یہ تجربہ کیا ہے تو نہیں اس فلم کو عوام میں نمائش کیلئے پیش کرنے کے بجائے اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہی "یادیں" دیکھنا اور خوش ہونا چاہیے۔ دو گھنٹے تک "یادیں" میں ایک ہی شخص کو دیکھنے کے لئے ناظرین کو مجبور کرنا آرٹ نہیں اشتعال انگیزی ہے۔

میرے صنم

——— (نقل کی نقل)

میرے صنم بنانے والوں کا تجربہ یادیں کے تجربہ سے مختلف ہے یادیں میں آرٹ فلم کے نام پر جو تجربہ کیا گیا وہ اپنے طور بلکہ اپنے مرکز سے ہٹ گیا۔ میرے صنم باکس آفس پر کامیاب، ملکی اور غیر ملکی فلموں کے مختلف دلچسپ اور متاثر کرنے والے مناظر کو جوڑ کر ایک فلم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرے صنم میں جن ہندوستانی فلموں کی نقل کی گئی ہے وہ بھی دراصل بعض غیر ملکی فلموں کی نقل تھے لیکن "نقل کی نقل" وہ بھی کم عقلی کے ساتھ "میرے صنم" کی بہترین تعریف ہے۔ ہیرو ششی کپور کی نقل میں اوور ایکٹنگ کرتا ہے۔ مختلف ٹکڑوں کے چربے جوڑنے کے بعد کہانی پھسپھسی منظرنامہ بے ہنگم اور ساری فلم "الم غلم" بن کر رہ گئی ہے۔ نیّر کی موسیقی اس فلم میں پھر وہی۔ انھیں لے ڈوبنے والی موسیقی ہے۔ ایک گانا اچھا۔ اس کے علاوہ ایک اور گانا گوارا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے مکالمے بہت معمولی ہیں جو سخت حیرت اور افسوس کی بات ہے۔ آشا پاریکھ بھلی لگتی ہے۔ راجندر ناتھ کہیں کہیں ہنسانے میں کامیاب ہے۔ ممتاز کا کیرکٹر باکس آفس اپیل رکھتا ہے۔ پران بجھا بجھا سا ہے۔ دوسرا کوئی کردار قابل ذکر نہیں۔ پرنٹ دیکھنے میں "ویلیوز" ایسے دن فلموں کی سی ہیں۔ ٹیکنیک کی عکاسی، رنگ اور مناظر عمدہ ہیں۔

گذشتہ دو تین ماہ سے فلموں کا کال ہونے کی وجہ سے "میرے صنم" دیکھنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے کیونکہ مشہور اور بڑی فلمیں مثلاً گائیڈ۔ دل دیا درد لیا، ساز اور آواز۔ دیوانہ۔ آرزو۔ بدتمیز۔ سورج وغیرہ رکی پڑی ہیں۔ اس لئے میرے صنم ہی کو عادی فلم بین گوارا کر رہے ہیں۔ اگر مذکورہ بالا بڑی اور مشہور فلموں میں سے دو ایک کی نمائش بھی انہی ہفتوں میں ہوتی تو میرے صنم کا انجام عبرت ناک ہوتا۔

> پونم میں شائع ہونیوالے تمام ادبی و نیم ادبی مواد میں نام، کردار، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی ——— (ادارہ)

بَعکسِ مہتاب

خطوط

"پونم" ہر ماہ پہونچ رہا ہے ۔ اس کے مطالعہ کی ہر رات چودھویں سے کم نہیں ہوتی۔ زندگی، فلسفۂ ارتقائے ادب اور خدمتِ فن کا عجیب لطیف امتزاج آپ نے پیدا کیا ہے۔ حضرت مولانا خیر کے مضامین اور بعض تنقیدی نگارشات مجھے بے حد پسند آئیں نیز ترتیب کسی حسین اور فکرِ جمیل کی رہینِ منت ہے ــــ صحت بے حد خراب ہے۔ جلد ایک مضمون اور چند غزلیں حاضر کرونگا۔

(انور صابری ۔ دہلی)

● بہت دنوں سے "پونم" نظر سے نہیں گذرا تھا، پرسوں جب گگن محل ریلوے اسٹیشن بک اسٹال پر گیا تھا تو پونم پر نظر پڑی۔ "پونم" کا ظاہر و باطن دونوں بے حد خوبصورت اور دلچسپ ہوگئے ہیں ــــ آپ جس محنت، خلوص، لگن سے پرچہ نکال رہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ آپنے بہت اچھا کیا کہ پونم کی قیمت میں اضافہ کردیا ــــ اس مرتبہ کے "پونم" میں شاذ تمکنت، فن نظامی کی غزلیں، واجدہ تبسم اور حسن عسکری کے افسانے خوب ہیں۔ "شکوۂ جوابِ تنخواہ" ایک منجھے ہوئے طنز نگار کی فکر ہے اور اس کے اچھے ہونے میں شبہ کی گنجائش نہیں

(شکیل مظہری بہاری)

● پونم کا شمار بلا مبالغہ ملک کے صفِ اول کے جرائد میں ہوتا ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ یہ کہہ دینے کے بعد جزوی اور تفصیلی تعریف کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (شفا گوالیاری۔ بھوپال)

● یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ پونم کی اشاعت ترقی پذیر ہے اور معیار بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے ۔ دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ اردو رسالوں کے اس عہدِ کس مپرسی میں آپ کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اللہ آپ کو اپنے عزائم میں امید افزا کامیابی عنایت فرمائے۔

(ڈاکٹر عزیز تمنائی۔ مدراس)

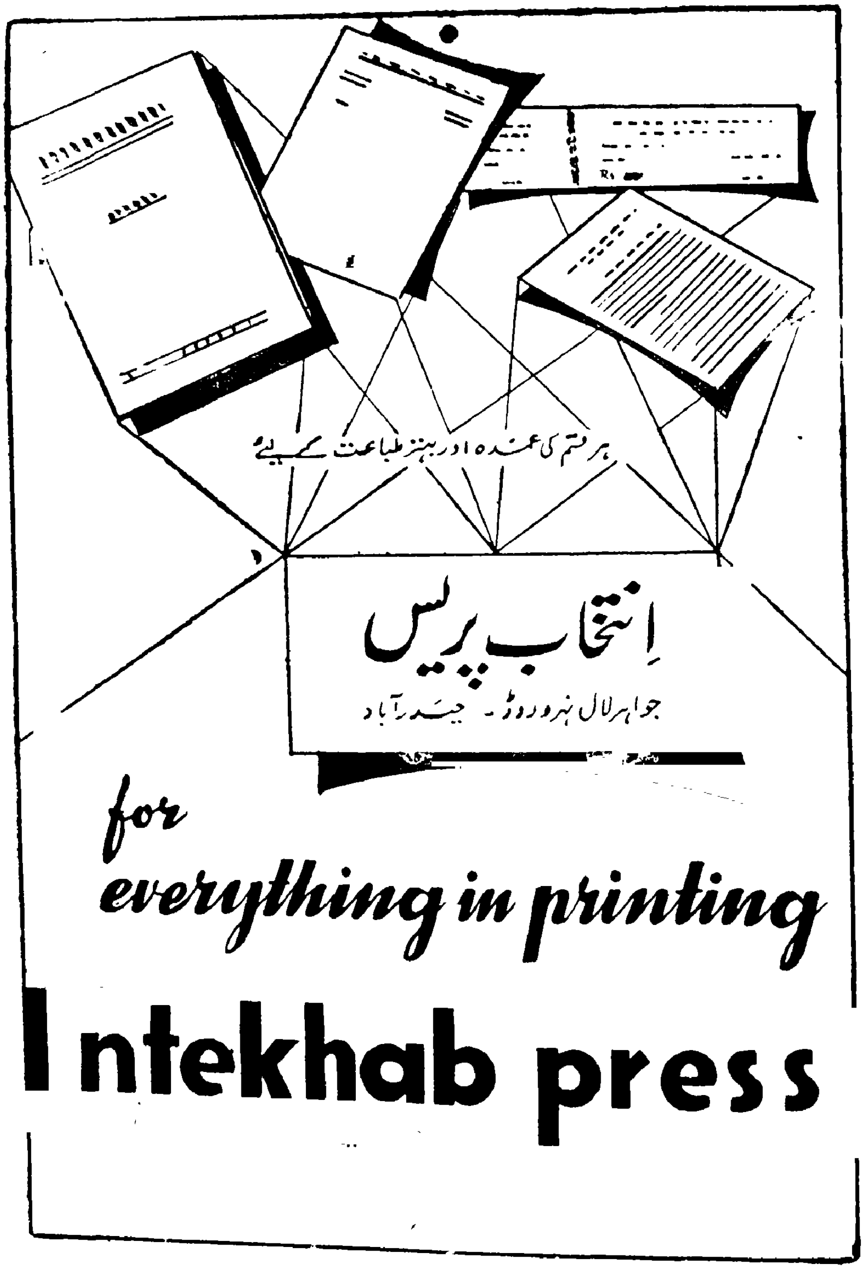
● "پونم" [illegible] نظر نواز ہوا۔ بڑے سلیقے سے ترتیب پایا ہوا صاف ستھرا رسالہ ہے [illegible] ذوق کی آسودگی کا سامان ہے۔

([illegible] میسح الزمان ۔ الہ آباد)

● عرصہ کے بعد آپسے شرفِ ملاقات حاصل کررہا ہوں۔ سخت نادم ہوں کہ میں نے آپکے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ کوئی مضمون بھیجتا تو کیا؟ پونم برابر مل رہا ہے۔ آپ کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے ۔ ماشاءاللہ رسالہ ہر لحاظ سے ترقی پر ہے۔ میں اس طرف تین چار ماہ سے مسلسل پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ سکون اور اطمینان ہوجائے تو پونم کیلئے دو تین مضمون بھیجدوں۔ بہت بہت معذرت کے ساتھ۔ (ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی)

▲ پونم، ہندوستان سے نکلنے والے رسائل میں ایک امتیازی خصوصیت کا حامل ہے، وہ خصوصیت حسنِ ظاہری ہے۔ جہاں تک حسنِ باطنی کا تعلق، اس کا تو جواب نہیں۔ زندگی کے تنوع اور الجھاؤ کی طرح 'پونم' میں مضامینِ نظم ونثر کا انتخاب اور بہتر ذہن لکھنے والوں کا تعاون اس کے معیار کی ضمانت ہے ۔ اس کام میں آپ کو کتنی محنت اور جاں فشانی کرنی پڑتی ہوگی اس کا اندازہ کرنے کے بعد کانپ جاتا ہوں۔ خدا آپ کو استقامت عطا فرمائے (آمین)

(عنوان چشتی ۔ دہلی)



ہر قسم کی عمدہ اور بہتر طباعت کے لیے
اِنتخاب پریس
جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد
for
everything in printing
Intekhab press

SECOND YEAR OF PUBLICATION
Registered with the Registrar of News papers at R. N. No. 8285/64.

eptember, 1965 **POONAM MONTHLY** Regd. N H. 470
AZAMPURA, HYDERABAD-A. P.
Editor : NASIR KURNOOLI M. A. (Osm.)



MONTHLY

POONAM
HYDERABAD

ماہ نامہ

75 P.

حیدرآباد

پونم

مدیر :
ناصر کرنولی ایم اے (عثمانیہ)

نومبر ۱۹۶۵ء ۔ جلد ۲ شمارہ ۱۸

زرِ سالانہ : (۸) روپے
ششماہی : (۴) روپے (۵۰) پیسے
بیرونِ ہند سے : (۲۵) شلنگ
تاعمر خریداری : (۱۰۰) روپے
فی پرچہ : (۷۵) پیسے

مقامِ اشاعت :
ترسیلِ زر :
خط و کتابت کا پتہ :
* ماہنامہ پونم
۱۶-۷-۳۰۱ اعظم پورہ
حیدرآباد ۔ آندھرا پردیش

کتابت : ادارۂ حسنِ کتابت حیدرآباد

طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس
* دائرہ الکٹرک پریس ۔ چھتہ بازار ۔ حیدرآباد

کنٹلہ آبشار عادل آباد
—— : سرورق : ——

مضامین

اے شہیدانِ وطن تم پر سلام (نظم) — نذیر بنارسی — ۳
تیسری آنکھ — (نظم) — مظفر حنفی — ۴
جگر، خطوط کے آئینے میں — محمد اسلام — ۵
سراج لکھنوی — مقبول احمد لاری — ۱۵
ادبی اور عام مصوری کے امتیازی حدود — جمالی شاہجہاں پوری — ۲۰
خالص اردو غزل — علامہ آرزو لکھنوی — ۲۴

غزلیں

شفا گوالیاری — اثیم خیرآبادی — ۲۵
شاذ تمکنت — مصحف اقبال توصیفی — ۲۶
اختر نظمی — راز یوسفی — ۲۷
سراج لکھنوی — جوہر صدیقی — ۲۸
راہی قریشی — وقار لطیف — ۲۹

افسانے

انتقام — گربچن چندن — ۳۰
منزل بہ منزل — عوض سعید — ۳۵
راستے کی کہانی — عاتق شاہ — ۴۱
بیکاری — مسیح الزماں — ۴۵
شب [illegible] — [illegible] — ۵۰
[illegible] — [illegible] — ۵۱
[illegible] کی [illegible] ... — [illegible] — ۵۱
[illegible] — [illegible] — ۵۲
[illegible] — [illegible] — ۵۲
[illegible] — [illegible] — ۵۲
ذلت — [illegible] — ۵۳
[illegible]

نذیر بنارسی

اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

زندگی صدقے تمہاری جان پر
جان دے دی آبرو پر آن پر
آنچ آنے دی نہ ہندوستان پر
اے دلیرانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

جھنڈے پر تم سب الاپے دیش راگ
خوں سے کھیلے جنگ کے میداں میں پھاگ
جن کی تم سنتان ان ماؤں کے بھاگ
تم سے ہے شانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

جنگ کے کارن ہوئے ہیں جو اناتھ
دیش ماتا کا ہے ان کے سر پہ ہاتھ
دیش کے سب بسنے والے ان کے ساتھ
غمگسارانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

آدمیت سے بھی غداری نہ کی
شہریوں پر تم نے بمباری نہ کی
مر گئے لیکن دل آزاری نہ کی
دین و ایمانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

پھول جیسے گلستاں کی گود میں
سوئے یوں ہندوستاں کی گود میں
جیسے بیٹے سوئیں ماں کی گود میں
خوش نصیبانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

دے کے اک سر دیش کا سر لے گئے
مر کے ہم کو زندگی دیتے گئے
اپنی کشتی خون میں کھیتے گئے
ناخدایانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

ن میں بل کھا کھا کے جمنا کی طرح
ہرائے بڑھ کے گنگا کی طرح
گئے دشمن پہ دریا کی طرح
جاں نثارانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

دیش ماتا کا نہ دل دکھنے دیا
حملہ آور کو نہیں رکنے دیا
سر دیا سر کو نہیں جھکنے دیا
سرفروشانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

چاہے مذہب کچھ ہو مسلک ایک ہے
دشمنوں سے سب کی چشمک ایک ہے
آج پورا دیش بے شک ایک ہے
خیر خواہانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

دیش کی خاطر شہادت پا گئے
مر کے انعامِ محبت پا گئے
تم سب اپنی اپنی جنت پا گئے
پاک نامانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

ویرتا دیکھ کے بل کھانے لگی
زندگی اس طرح اِترانے لگی
موت دلہن بن کے شرمانے لگی
نگہبانانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

کھل کے اب جانوں سے کھیلا جائے گا
ایک ایک دشمن سے سمجھا جائے گا
آگے جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا
اے شجاعانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

پنچھ گئے سیندور، ٹوٹیں چوڑیاں
دیوتاؤں کو ہیں روتی دیویاں
بیوگی کہتی ہے بھر کر سسکیاں
اے فدایانِ وطن تم پر سلام
اے شہیدانِ وطن تم پر سلام

مظفر حنفی

*

تیسری آنکھ

وادیٔ گل، بہشت کا پیکر، آج بھی لالہ فام ہے لیکن
سرفروشوں کے خون کے باعث
سرپھروں کے جنون کے باعث
نذرِ آتش ہوئے بہار کے دن
نذرِ آتش ہوئے بہار کے دن، یک بیک آنچ دے رہے گلاب
ہے دھواں دار وادیٔ کشمیر
آگ اگلتا ہے درۂ حاجی پیر
زلزلے میں ہے سرحدِ پنجاب
زلزلے میں ہے سرحدِ پنجاب، اک پڑوسی نے چوٹ دی گہری
دوارکا، جودھپور، امرتسر
خوب کندن ہوگئے ہیں جل جل کر
زخم کھاتے ہیں بے خطا شہری
زخم کھاتے ہیں بے خطا شہری، اسپتالوں پہ پھٹ رہے ہیں بم
کچھ نہ سوچا غنیم نے ضد میں
بم گرتا ہے اور مسجد میں
امن کے نام پر خموش تھے ہم
امن کے نام پر خموش تھے ہم، آج دشمن ہیں ہم بھی دشمن کے
دل پہ یہ جبر تابہ کے آخر
ظلم پہ صبر تابہ کے آخر
ڈس لیا مارِ آستیں بن کے
ڈس لیا مارِ آستیں بن کے، موت جب ہم کو آزمائے تو
موت کو مار کر بھی جیتے ہیں
زندہ رہنے کو زہر پیتے ہیں
جھرجھری آرہی ہے شنکر کو
جھرجھری آرہی ہے شنکر کو، حملۂ موت بول دو شنکر
ہم کو آتش مزاج ہونے دو
ناچ تانڈو کا آج ہونے دو
تیسری آنکھ کھول دو شنکر
تیسری آنکھ کھول دو شنکر، سارا کیلاش گونج اٹھا ہے
تیسری آنکھ کھول دو شنکر
حملۂ موت بول دو شنکر
آج آکاش گونج اٹھا ہے
تیسری آنکھ کھول دو شنکر!

محمد اسلام ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی

جگر، خطوط کے آئینے میں

"خطوط تہذیب انسانی کے محیر العقول عجائبات میں سے ہیں۔ انسان کی یہ اختراع اس کی زندگی کی عجیب و غریب اور ہمہ گیر تقاضوں سے پیدا ہوئی ہے۔"[1]

زبان کا کمالِ رسائی کے باوجود فاصلے کی دشواریوں کا طے کر لینا ممکن نہیں ہے، فاصلے کے مسئلے کو خطوط نے البتہ حل کر دیا ہے۔

موجودہ دور میں خطوط کا شمار انسان کی بنیادی ضروریات میں ہوتا ہے کیونکہ اس دور میں دنیا کے تقریباً ہر انسان کو خط لکھنے یا لکھانے کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے خطوط کی وسعت و مقبولیت عالمگیر ہو گئی ہے اور یہ کاروباری تحریر کے ساتھ ساتھ ادبِ عالیہ کا درجہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ خطوط نگاری ہر شخص کے دسترس میں بھی ہے اور اس قدر مخصوص بھی کہ

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

انسان کی شائستگی کا اندازہ اس کی گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس کی شائستگی کا پتہ اس کی مکتوب نگاری کے سلیقے سے چلتا ہے۔ اس خیال کی تائید جان لارک کے اس قول سے بھی ہوتی ہے۔

"When they understand how to write English with due connection propriety and order, and are pretty well masters of a tollorable narrative style they may be advanted to writing of letters. The writing of letters has so much to do in all the occurances of human life, that no gentleman can avoid showing himself in this kind of writing."[2]

جس کا مفہوم ہے کہ جب کسی کو انگریزی کے طرزِ تحریر کی شائستگی

---

[1] "نقوش" (مکاتیب نمبر) [illegible]

[2] "نقوش" (مکاتیب نمبر) نومبر ۱۹۵۷ء [illegible]

اور اس کی ترتیب کے طور و طریقے معلوم ہوجائیں اور وہ تھوڑا بہت زبان داں کی حیثیت حاصل کرکے کچھ غنیمت قسم کی تحریر کا اسلوب اختیار کر لے تب اس کو خطوط لکھنے کی طرف راغب ہونا چاہیئے۔ مکتوبات حیاتِ انسانی کی بہترین ترجمان ہیں۔ ان کو کوئی بھی شخص نظر انداز نہیں کرسکتا۔

خطوط نگاری ایک مخصوص ماحول، مخصوص مزاج، مخصوص استعداد اور ایک مخصوص ساعت میں ادب بن سکتی ہے بشرطیکہ اس کی اہمیت تہذیبی یا سماجی حیثیت سے ہو، کیونکہ اس قسم کے خطوط کے مطالعہ سے ہر انساں یکساں طور پر مسرور یا رنجور ہوتا ہے۔

خطوط نجی اور پبلک دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط جن کا تعلق پبلک سے ہوتا ہے اور جنھیں پبلک قسم کے خطوط کا نام دیا جاسکتا ہے ان سے کسی شخص کی سیرت و کردار کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خطوط نگار جب اس قسم کے خطوط لکھتا ہے تو اسے اس بات کا احساس رہتا ہے کہ اس کے خطوط عام لوگ پڑھیں گے، اس لیئے وہ بہت محتاط رہتا ہے اور انہیں اپنے عیوب کی پردہ پوشی بڑی خوش اسلوبی سے کرجاتا ہے لیکن نجی خطوط میں خطوط نگار کے نجی اور راز و نیاز کے ایسے واقعات و حالات ہوتے ہیں جن کے متعلق اسے یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ انہیں کبھی عوام بھی پڑھیں گے اسی لیئے یہ خطوط بہت اہم ہوتے ہیں، کیونکہ بعض حضرات یک گونہ زندگی کے بجائے دوگونہ زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ جو کچھ جلوت میں ہوتے ہیں وہ خلوت میں نہیں رہتے۔ ان کی حقیقت کا انکشاف اسی وقت ہوتا ہے جب ان کی خلوت کی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور خلوت کی باتیں بتانے میں مکتوب نگار کے نجی خطوط ہی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

دوگونہ زندگی بسر کرنے والوں کے متعلق خواجہ شیراز نے خوب کہا ہے،

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

اور مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"خانگی خطوں میں اور خاص کر اُن خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں، ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا، گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لائم نہیں ہوتا یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوط کو بڑے ذوق اور شوق سے پڑھتے ہیں۔" [1]

خطوط کی ادبی اہمیت کے متعلق مہدی حسن الافادی الاقتصادی نے بھی صحیح لکھا ہے کہ :-

"نجی کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا، یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گریٔ طبع کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے اس لیئے لٹریچر کا ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والوں کے مرتبہ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے، اچھے اچھے بولنے والوں اور چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں بھی سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے۔" [2]

بعض اوقات مکتوب الیہ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق یہ گمان رہتا ہے کہ معاملہ انھیں تک محدود رہے گا اور ان کا راز فاش نہ ہونے پائے گا۔ اس لیئے مکتوب نگار کبھی کبھی اپنے دلی راز کی ایسی باتیں لکھ دیتا ہے جسے نہ تو وہ کبھی زبان پر لاتا نہ سپردِ قلم کرتا بلکہ ایسے راز کو وہ اپنے سینے ہی میں لیئے ہوئے مدفون ہوجاتا، اسی لیئے کسی نے خطوط کو سوانح نگاری

---

[1] اردو خطوط ۔ ص۲

[2] اردو خطوط ص۱۰۰-۱۰۱

کی جان قرار دیا ہے کیونکہ ان کے ذریعہ سے مکتوب نگار کی زندگی اور ماحول کا صحیح پتہ چلتا ہے اور اس کے کردار کے مختلف عناصر جُدا جُدا نظر آجاتے ہیں جس سے اس کے ذہنی ارتقا کی پُوری کیفیت معلوم ہوجاتی ہے۔

خطوط نصف الملاقات کا درجہ رکھتے ہیں ان میں کا ہل تخلیہ ہوتا ہے اور چونکہ یہ باہم بات چیت کا بدل ہوتے ہیں، اس لیئے ان میں اچھی گفتگو کی ضروری صفات کا ہونا لازمی ہے۔

خطوط کے ذریعہ رُوٹھے ہوئے کو منانے، بگڑے ہوئے سے صُلح و صفائی پیش کرنے، ندامت کے اظہار اور معافی مانگنے میں بڑی مدد ملتی ہے کیونکہ ان کے ذریعہ سے دل کی باتیں بڑی آسانی سے اَدا ہوجاتی ہیں۔

خطوط میں بڑی آزادی کے ساتھ تنقید بھی کی جاسکتی ہے جو کسی مُستقل تصنیف یا مضمون کے ذریعہ اتنی آزادی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

اچھے خطوط کی پہچان ان کا اسلُوب اور لطافت ہے ان میں ملاقات کے تمام اغراض و مقاصد بھی پُورے ہونے چاہئیں۔ کسی کے طرزِ نگارش کا کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں گفتگو ہی کا سا انداز پیدا کردے۔

شمس الرحمٰن نے خطوط نویسی کے سلسلے میں غالبؔ کے آٹھ مندرجہ ذیل قاعدے نکالے ہیں:۔

۱۔ خط کے شروع میں مکتوب الیہ کو اس کے موافقِ حال کسی لفظ سے پکارا جائے۔

۲۔ اس کے بعد زبانِ قلم پر ایک دم حرفِ مطلب آجانا چاہیئے۔ القاب و آداب، خیریت گوئی اور خیر و عافیت طلبی قطعاً زاید و بیکار ہے۔

۳۔ خط لکھنے والے کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیئے کہ تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا ہوجائے۔ مطلب کو اس انداز سے اَدا کرے کہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

۴۔ اگر کئی باتیں کہنا ہوں تو انہیں نہایت ہوشیاری سے ترتیب دے۔

۵۔ ایسا نہ ہو کہ الفاظ پیچیدہ ہوجائیں اور مطلب کے اجزا ایک دوسرے سے مل جائیں۔

۶۔ مشکل اور دقیق استعاروں اور غیر مانوس الفاظ سے جو زمانے کے مذاق کے موافق نہ ہوں ہمیشہ اجتناب کرے۔

۷۔ ایک لفظ کو بار بار لکھنے سے بچے۔ زبان کی خوبی ہاتھ سے جانے نہ دے اور بے فائدہ طوالت سے ہمیشہ بچتا رہے۔

۸۔ تمام خط میں کسی جگہ مکتوب الیہ کے مرتبہ و منزلت کو نظر سے اُوجھل نہ ہونے دے۔" [1]

غالبؔ کے یہ آٹھ قاعدے اس لیئے اور بھی زیادہ غور طلب ہیں، کیونکہ:۔

" خط بڑا ہی نازک فن ہے، یہ کاریگری بھی ہے اور آئینہ سازی بھی۔ یہ مختصر اور محدُود بھی ہے اور وسیع و بیکراں بھی۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے اور بینش بھی۔ یہ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر وَرق پھر بھی دفتر ہے معرفتِ کردگار اور معرفتِ انساں دونوں کا۔ یہ لکھنے والے کے لیئے تو محض عرضِ سخن ہے مگر پڑھنے والے کے لیئے گنجینۂ فن بھی ہوسکتا ہے۔ غرض خط ایک جہانِ راز ہے جس کے راز اگر سَربستہ رہیں تو سینوں کے گہر ہائے معنٰی کے دفینے بنادیں، اور آشکار ہوجائیں تو جذبے کی ساری دُنیا مشک زار بن جائے۔" [2]

غرضیکہ دیرپا اور مستقل اَدبی اہمیت حاصل کرنے والے وہی خطوط ہوتے ہیں جن میں طبعِ انسانی کے بُنیادی ذوق کی تشفی کے وسیع تر سامان موجود ہوتے ہیں۔

ابتدا میں خطوط کے اندر صرف ضروریات کا اظہار ہوتا تھا یا واقعات بیان کیئے جاتے تھے، یا تو بادشاہ اپنے دُور دراز رہنے والے وزرا کو خطوط کے ذریعہ حکم احکام بھیجتے تھے یا مذہبی پیشوا

---

[1] "اُردو خطوط"۔ ص: ۱۵-۱۶

[2] "اُردو خطوط"۔ ص: ۲۴

اپنے امراء و متمندوں کو مذہبی نکات [illegible] باریک بینیوں سے آگاہی کے خطوط بھیجا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ فنِ خطوط نویسی کی ترقی ہوئی اور مشہور لاطینی، انگریزی اور فرانسیسی مصنفین کی انشا پردازی اور اعلیٰ قابلیت کا پتہ لگانے کے لیے ان کے خطوط شائع کیے گئے۔ مسلمانوں کے دور میں نبوت کے زمانے ہی سے خطوط کی نگہداشت شروع ہو گئی تھی اور جب ہندوستان میں مغلوں کی حکومت ہوئی تو دفتر کی زبان فارسی قرار پائی۔ اسی وجہ سے فارسی مکتوب نگاری کو ایران سے زیادہ ہندوستان میں فروغ ملا۔

فارسی اور عربی خطوں میں آن بان، شان و شوکت اور تصنع و تکلف کا حکومتوں کی سرپرستی کی وجہ سے اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ان کی سادگی ختم ہو گئی۔ خطوط تو محض ضرورتاً مختصر لکھے جاتے تھے لیکن شاہی انشا پردازوں نے ان میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نجی خطوط میں بھی ہر عزیز اور ہر حیثیت کے ملنے والے کے لیے جدا جدا القاب مقرر ہوئے اور اچھے لکھنے والے ان میں جدت طرازیاں کرنے لگے۔ جب تک پڑھے لکھے گھرانوں میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی رہی۔ اس وقت تک اس میں ان کا رنگ جھلکتا رہا اور جب خطوط کے لکھنے کا سلسلہ اُردو میں شروع ہوا تو انہوں نے ان پر بھی بہت گہرا اثر چھوڑا۔

ہندوستان کے فارسی اَدب میں ترسّل کا اوّلین ممتاز ہدایت نامہ اعجازِ خسروی ہے، جس نے تکلّف اور رنگینی کی تحریک کی۔ ابوالفضل نے خط نگاری میں دقیقیت اور پیچیدگی پیدا کی، اورنگ زیب عالمگیر اور چندر بھان برہمن نے اس میں سادگی، سلاست' اور مدعا نگاری کا عنصر پیدا کیا' ان میں مکتوب نگاری کی شخصیت کا انفرادی رنگ ملتا ہے۔

غالب سے پہلے جب کہ اُردو زبان بچّہ تھی اس زمانے کے خطوط میں اسلوبِ بیان میں صنائع بدائع کی کثرت، مقفّیٰ و مسجّع عبارتیں، تشبیہ و استعارے اور القاب و آداب کی طوالت ملتی ہے لیکن ان خطوط میں فارسی کی طرح اَدق اور مشکل مطالب اَدا نہ ہو سکے۔ انشائے خرد افروز، مکتوباتِ احمدی و محمدی، رقعاتِ عنایتی، انشائے اُردو، سرور وغیرہ اُردو خطوط کے ابتدائی مجموعوں میں اسلوبِ بیان میں صنائع بدائع کی کثرت، مقفّیٰ و مسجّع عبارتیں اور تشبیہ و استعاروں کی بھرمار ہے۔ غالب کے زمانے تک غلام امام شہید اور غلام غوث بےخبر کے یہاں بھی یہی اسلوب ملتے ہیں۔

۱۸۴۸ء کے قریب غالب نے اُردو میں خطوط لکھنا شروع کیا۔ اُنہوں نے نئے انداز میں خطوط لکھ کر اُردو نثر کو ایک بدیع طرزِ نگارش سے آشنا کرایا۔ ان کے یہاں چارلس لیمب جیسی مہر و محبت اور دوست داری کے خوش گوار اثرات ملتے ہیں۔

سرسیّد نے اُردو خطوط نگاری میں مضمون کی قطعیت، تخاطب کا خلوص اور زبان کی سادگی پیدا کی۔ اس دَور میں محسن الملک اور وقار الملک، شبلی، حالی اور اکبر الہ آبادی کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔

شبلی نے اپنے خطوط میں جذباتیت کو اپنے اعجازِ بیان سے خوشگوار بنا دیا ہے۔ حالی نے سادگی، توازن، خوش مذاقی اور مدعا نگاری کی ہے۔

سرسید کے زمانے سے لیکر ۱۹۱۴ء تک داغ، امیر مینائی، شوق قدوائی، ریاض خیرآبادی، سید ناصر علی وغیرہ کے خطوط میں قدیم رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس دَور میں القاب و آداب میں نیا رنگ اور اختصار آگیا ہے۔

جنگِ عظیم اوّل کے بعد ۱۹۳۶ء تک ذہن و فکر کے انقلاب سے خط نگاری بھی متاثر ہوئی۔ اس دَور کے بڑے علمبردار ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال ہیں۔ مہدی الافادی، سیّد سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتحپوری اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے خطوط بھی مختلف حیثیتوں سے اہم ہیں لیکن بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سب سے بڑے خط نگار اور نمایندہ ادیب ہیں۔ مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کے خطوط بھی قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۶ء کے بعد مُلک میں حقیقت نگاری اور نفسیات کے مطالعہ کے ذوق کی وجہ سے خطوط میں واقعیت کا لحاظ رکھا جانے لگا

۱۹۵۷ء سے کچھ قبل خطوط کے بعض مجموعے شائع ہوئے ہیں، مثلاً "رُوحِ مکاتیب" (مرتبہ ساغر نظامی) جس میں ساغر نظامی کے نام مختلف ادبی، علمی اور سیاسی شخصیتوں کے خطوط ہیں۔ دوسرا مجموعہ "ہمعصر شعراء کے خطوط" (مرتبہ: ضیاءالاسلام) جس میں ضیاءالاسلام کے نام مختلف مشاہیر شعراء کے خطوط ہیں اور "بارِ خاطر" شوکت تھانوی کا مجموعہ مزاح و ظرافت کے سلسلہ میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔

جوش نے اپنے خطوط میں بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیا ہے اور فراق نے اپنی فاضلانہ علمی شان دکھائی ہے۔

اس نئے زمانے (دورِ جدید) میں "نقوشِ زنداں" — "زیرِ لب"۔ "عزیزم کے نام"۔ "گویا دبستاں کھل گیا" — اور "مکاتیبِ جگر" وغیرہ شائع ہوئے ہیں جو خطوط نگاری کے جدا جدا مگر جدید ترین مذاق کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

اگر جگر کے خطوط کو غالب کے بتائے ہوئے اُصولوں پہ پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے غالب کے بعض اُصولوں پہ عمل کیا ہے یا ان سے عمل ہوگیا ہے۔ کیونکہ فطری طور پر وہ ہر قسم کی پابندی سے آزاد تھے۔ انہوں نے مکتوب الیہ کو اس کے موافق حال کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ اگر کوئی ان کا مخلص ہے تو اسے شروع ہی میں انہوں نے حبیبی و مخلصی یا حبیبی و صدیقی، اور اگر کوئی بزرگ ہوا تو اسے حضرت مخدوم المحترم، اور اگر کوئی ان کا خورد ہوتا تو اسے عزیزی اور نورِ چشمی وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے۔ خیریت اور خیر و عافیت طلبی جو غالب کے قاعدے کے مطابق زائد و بیکار تھے ان سے بھی انہوں نے اجتناب کیا۔ ان کی تحریروں میں وہی رنگ ملتا ہے جو ان کی تقریر کا تھا۔ یعنی جس طرح وہ بات کسی ایک موضوع پر یکسوئی سے نہیں کرسکتے تھے اسی طرح ان کی تحریر بھی تھی تحریر میں ان کی ایک بات ختم نہیں ہو پائی کہ اسی میں کوئی دوسری بات نکل آئی۔ غرضیکہ جو کچھ انہیں کہنا تھا انہوں نے اشاروں، کنایوں میں کہہ دیا۔ اب یہ مکتوب الیہ کا فرض ہوتا کہ وہ ان کی تحریر کا مطلب سمجھے۔ وہ "ماورائے سخن بھی ہے اِک بات" کے تحریر و تقریر دونوں میں قائل تھے۔ جس طرح وہ باتوں میں کہا کرتے تھے کہ "وہ جو ایک بات ہوتی ہے جسے بیان نہیں کیا جاسکتا بس ایک بات ہوتی ہے جو محسوس کی جاسکتی ہے لیکن لفظ و بیان میں نہیں آسکتی۔" یہی حال اُن کی تحریر کا بھی ہے "بس ایک بات ہوتی ہے" کہہ کر گویا وہ اپنے دِل کی ساری بات اپنے شاعرانہ انداز میں کہہ گئے۔ مثلاً وہ اپنے ایک خط بنام ضیاءالاسلام میں اسطرح رقم طراز ہیں:

"ہمارے ناقدین کی تمام و کمال توجہ مغرب ہی کی جانب مُنعطف رہتی ہے ..... دراصل بُنیادی طور پر دُنیا میں نہ کوئی نیا خیال ہے نہ کوئی جذبہ .... غزل تو شعرا کی دُنیا میں "حُسن و عشق" زندگی کے صرف حسن و جمال، عشق و محبت تک محدود نہیں ..... اگر آپ اپنی زندگی اور اس کے تأثرات پیش نہیں کرتے تو آپ بھانڈ بہروپئے یا جیکس کے الفاظ میں "ایکٹر"۔ اسی ذیل میں یہ عبرت ناک واقعہ بھی سُن لیجئے۔ کونڈوہ میں "بزمِ ادب" کے سلسلہ میں ذوقی صاحب کے تعلقات خاص کر بالتحت سوشلسٹ شعرا کا ہجوم تھا، میں یہاں موجود نہ تھا اب جو حالات سامنے آرہے ہیں نہایت دلچسپ ہیں اور افسوسناک بھی۔ ان تمام سوشلسٹ حضرات نے معاشرے کے سلسلے میں چار دن قیام فرما کر تین سو ساڑھے تین سو روپے کی شراب سے شغل کیا، خدا جانے کہاں سے کہاں بہکا اور اُڑا چلا جارہا ہوں، لیکن خیر ان بے ربطیوں میں بھی خلوص و محبت کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر ہی لیتی ہے۔"

یہ تھی جگر کی طرزِ تحریر۔ وہ اپنی بے ربط تحریر میں خلوص و محبت کی راہ نکال کر آگے بڑھ لیتے۔ ان کے کہنے کا جو مقصد تھا اسے مکتوب الیہ پر چھوڑ گئے۔

جگر نے دقیق استعاروں اور غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کیا اور مکتوب الیہ کے مرتبہ اور منزلت کو بھی کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا، جو شخص جس مرتبہ کا تھا اسے انہوں نے اپنے خطوط میں اسی مرتبہ پر رکھا اور اس کے لیئے اس کے مرتبہ ہی کے لحاظ سے الفاظ استعمال کیئے، کہیں اس کو اس کے مرتبے سے

گرنے نہیں دیا۔ ان کے خطوط بیشتر مختصر بھی ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنی قدیم الفرصتی اور طبیعت میں فرار ہونے کی وجہ سے ہمیشہ طوالت سے بچتے رہتے تھے۔

راقم الحروف کے اس خیال کی تصدیق محمود علی خاں جامعی کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ :۔

" جگر صاحب خط و کتابت کے بڑے چور ہیں، احباب کے خط آتے ہیں، وہ ان کے ذہن میں بھی رہتے ہیں لیکن تمام جوابات "آجکل آجکل" کی نذر ہو جاتے ہیں اور کسی کو اس کے خط کا جواب نہیں ملتا۔ وہ اپنی غزلیں نقل کرنے کے علاوہ کچھ اور زیادہ لکھنے کے عادی نہیں ہیں، غزل کی طرح کے اشارے ان کے خطوط میں بھی ہوتے ہیں اور عبارت عام طور پر بے ربط ہوتی ہے۔ ان کے خط کی شان یہ ہے کہ پہلے آدھے صفحہ پر متن میں کچھ لکھا ہے، پھر حاشیہ پر، پھر اس خط کے چاروں طرف جہاں کوئی خالی جگہ دیکھی ایک جملہ لکھ دیا، یہ بھی جب کبھی رات میں فرصت ملی تو کسی کو چند سطریں گھسیٹ دیں، ورنہ ملنے پر عموماً معذرت کر دیتے ہیں" [1]

راز مراد آبادی نے بھی ان کے خطوط کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

" جس طرح وہ اپنے ملاقاتی کو یہ احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ اس کو نہیں پہچانتے اور اس سے واقف نہیں ہیں، بلکہ بعض اوقات اسے پسند تک بھی نہیں کرتے، اسی طرح وہ خطوں کے لب و لہجہ میں بھی احتیاط نہ برتتے تھے اور اکثر ایسے پیارے خط لکھ دیتے تھے کہ ؎

ہر شخص کو گماں ہے مخاطب ہمیں رہے "

جگر صاحب نہایت خلیق، ملنسار، شریف اور سراپا محبت تھے وہ کسی کا دل دکھانے کے اہل نہ تھے۔ انہوں نے تو خود ہی کہا ہے ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

چنانچہ ان خطوط اور ملنے جلنے کی بدولت انہوں نے بہت سے ایسے دوست احباب چھوڑے ہیں جن سے وہ ہمیشہ [illegible] لیکن ان کا دل ان سے کبھی نہیں ملا۔ خدا کے لیے آپ یہ نہ سمجھیں کہ جگر صاحب منافقانہ طور پر لوگوں سے ملتے تھے، ہرگز نہیں۔ وہ اپنی طرف سے جن سے ملتے تھے، کوئی ملازمت کے لیے سفارش کرانے آیا ہے تو کوئی کسی مشاعرے میں بلوائے جانے کے لیے خط لکھوا رہا ہے تو کوئی یہ کہنے بیٹھا ہوا ہے کہ اہل و عیال کی کثرت اور معقول آمدنی نہ ہونے کے باعث وہ پریشان ہے اور جگر صاحب اسے الگ کرے ہیں لے جا کر کچھ دے رہے ہیں اور خود بھی شرمندہ ہوتے جا رہے ہیں کہ بھئی اس میں تکلف نہ کرو، مجھے ضرورت ہوگی تو میں آپ سے لے لوں گا اس وقت آپ کام چلالیں وغیرہ وغیرہ تو اصل بات یہ ہے کہ جگر صاحب کی محبت سب کے لیے یکساں تھی لیکن اس محبت میں وسعت اور گہرائی اس وقت پیدا ہوتی جب اس کا جواب دوسروں کی طرف سے بھی ملتا تھا" [2]

جگر کے خطوط میں نہ تو خوشگوار ادبی تجربے ہیں نہ ان میں ادب، تاریخ، مذہب اور فلسفہ ہی ہے، نہ نصیحت کا عنصر ہے نہ فکر و نظر کی بلندی اور نہ ادبی رنگوں کی نقاشی ہے۔ ان کا انداز بیان بھی زیادہ سلیس اور دل نشیں نہیں ہے۔ وہ بعض اوقات ایک ہی خط میں کئی کئی موضوعات پر نامکمل بحث کرتے ہیں اور اس بحث مباحثہ میں اصل بات کہنے سے رہ جاتی ہے، کہیں کہیں ان کے خطوط میں عبارت کی بے ربطی بھی ہے اس کے باوجود ان کے خطوط ان کی سادگیٔ مزاج اور نیک نیتی و پاکیزہ قلبی کے آئینہ دار ہیں۔

ان کے خطوط میں ان کے زمانے کے سیاسی ہنگامی حالات اور اس کی وجہ سے ان کے احباب کے ترک وطن کا تذکرہ جس سے ان کو سخت اذیت پہنچی تھی۔ بعض خطوط میں ان کے خانگی ذاتی حالات ہیں، کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں انہوں نے ادب اور شعر و شاعری کے متعلق اپنے نظریے کا اظہار کیا

ر کچھ میں ان کی مختصر اور نامکمل اَدبی تنقید بھی ملتی ہے۔ بعض خطوط
سے ان کی مصروف زندگی اور مشاعروں میں شرکت کی وجہ بھی معلوم
تی ہے، بعض میں انہوں نے اپنے احباب کی سیرت پر روشنی ڈالی
ہے اور بعض میں بزرگانِ دین سے اظہارِ عقیدت کیا ہے، بعض خطوط
سے ان کے مذہبی خیالات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کچھ خطوط تو ایسے
یں جن میں انہوں نے اپنی تازہ ترین غزلیں لکھ کر اپنے مخلصین کو
یجی ہیں، جن سے ان کی شعری صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ بعد
یں انہوں نے ان غزلوں میں اصلاحیں بھی کی ہیں اور ان میں سے منتخب
شعار اپنے مختلف مجموعوں میں شامل کر لیئے ہیں۔ ان خطوط کی مدد سے
ن کے کچھ غیر مطبوعہ اور تلف شدہ کلام کے اکٹھا کرنے میں بھی مدد
تی ہے۔ ان کے بعض خطوط سے ان کی عسرت کی زندگی اور دَورِ
رشاری کا حال معلوم ہوتا ہے۔ بعض سے ان کے عشق کا سُراغ بھی
تا ہے۔ غرضیکہ ان تمام خطوط سے ان کی سوانح حیات کی صحیح تصویر
اخاکہ کھینچا جا سکتا ہے۔

جن خطوط سے ان کے علمی نظریے کا پتہ چلتا ہے ان میں سے
یک خط سے ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے علمی
نظریے کی وضاحت ہو جائے۔ جگر صاحب ۳ر جنوری ۱۹۵۳ء کو
س شہناز ہاشمی کو لکھتے ہیں کہ :

" علم ایک بحرِ بیکراں ہے جو صرف کتابوں تک محدود نہیں،

کو زمین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار

کو زمین اپنے سینے کے اندر لیئے ہوئے

کتاب سے صرف کتاب بن سکتی ہے، زندگی نہیں بن سکتی "

جگر نے یوں تو اپنے اکثر احباب کو اپنے خطوط میں بہت
سراہا ہے، جن میں میکش اکبرآبادی، حمید صدیقی مرحوم، تسکین قریشی،
بیب احمد صدیقی اور سید صدیق حسن مرحوم وغیرہ وغیرہ حضرات
امل ہیں۔ اس خیال کی تصدیق کے لیئے جگر ہی کے خطوط سے چند
قتباسات پیش کیئے جاتے ہیں تاکہ جگر کے احباب کو سراہنے کا
نداز معلوم ہو سکے وہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۹ر جون ۱۹۴۹ء کو
بیب احمد صدیقی کو لکھتے ہیں :-

" احباب و مخلصین کو کبھی نہیں بھولتا۔ آپ کا میں دل سے معترف
ہوں اور اس لیئے اگرچہ سلسلۂ خط و کتابت جاری رکھنے سے معذور
ہوں لیکن ہمیشہ آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں اور آپ کے لیئے دعاگو۔

مکتوب گرامی نہیں ملتا پھر بھی میرا قیام آپ ہی کے ساتھ ہوتا
اس لیئے نہیں کہ آپ بڑے عہدے پر ہیں بلکہ اس لیئے کہ میں آپ کو
مجسمہ شرافت و اخلاص سمجھتا ہوں اور آپ کے شعر و ادب کی لطافتوں
پاکیزگیوں، نازک اشاروں اور کنایوں اور آپ کے صحیح رنگِ تغزل
کو سمجھتا ہوں، صحیح معنوں میں متاثر ہوتا ہوں اور آپ کی انفرادیت کی
قدر کرتا ہوں "۔

اسی طرح حمید صدیقی مرحوم کو ایک خط میں (جس پر تاریخ درج
نہیں ہے) لکھتے ہیں :

" ہم دونوں کس قدر قریب ہیں کہنے کی ضرورت نہیں .... حمید صاحب!
آپ یقین کریں کہ اس پورے عرصہ میں آپ مسلسل طور پر یاد آتے ہیں
میں اس طرح کی باتیں کیا نہیں کرتا، لیکن بے اختیارانہ کہہ رہا ہوں کہ آپ
سے صحیح معنوں میں تعلقِ خاطر ہے اور بہت قریب بھی۔ زبان تو زبان
ہے، آپکے لیئے دل دعاگو رہتا ہے "

اور میکش اکبرآبادی کو لکھتے ہیں :

" شاہ صاحب! آپ بھولنے کی چیز نہیں اور جب صحیح معنوں
میں تعلق خاطر ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہٹائے نہیں ہٹ سکتا۔ آپ کو
اکثر و بیشتر یاد کر لیا کرتا ہوں "

جگر نے، اس قدر احباب پرست ہوتے ہوئے بھی اپنے بعض
خطوط میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایسے انسانوں کا قحط ہے
جن سے مل کر یا جن کی تحریر دیکھ کر ان کی رُوح متاثر و تسکین ہوتی
رہو ہو۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اکثر و بیشتر
انسان تمام عمر ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں لیکن حقیقت میں
وہ کبھی نہیں ملتے[1] اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر ملتے تو

---

[1] جگر کا ایک شعر بھی اس سلسلہ کا ہے ؎

آدمی آدمی سے ملتا ہے ٭ دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

ت کم ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ حد تک ملتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے
کی رُوحانی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ان احباب سے جن میں خلوص
نت پاتے تھے رُوحانی طور پر ان سے قریب سے قریب تر ہو جاتے
ان کا ایک مستحکم خیال یہ بھی تھا کہ دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے اور
دِل کو دِل سے راہ ہو تو ظاہری ملاقاتیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

بعض خطوط میں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے مخلصین کی
عت کم نہیں تھی لیکن صاحبانِ شنو اور ایسے اہلِ علم حضرات کی
کا شدّت سے احساس رہا جو اپنی ذاتی فکر و نظر رکھتے ہوں۔

وہ بعض اوقات اپنے حاجت مند احباب کے صحیح حالات معلوم
نے کی بھی کوشش کرتے تھے اور اگر وہ اپنی خودداری یا غیرت کی
سے اپنے صحیح حالات بتانے سے اجتناب کرتے تو وہ ان کو فوراً لکھتے

" اگر احباب صحیح معنوں میں احباب ہیں تو انھیں اسی دُنیا میں اپنے
ص اور محبت کا ثبوت دینا چاہیئے "۔ جگر صاحب اپنے احباب کی
م، درمِ، سخنے اسی دُنیا میں اِمداد کرکے اپنے خلوص کا ثبوت دینا
ہتے تھے اسی لیئے ان کے صحیح حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے
ے۔ لیکن ان کو کبھی کبھی اپنے احباب سے شکوہ و شکایت کرنے،
لمانی ہو جانے سے کھُلی کھُلی جنگ تک کرنے میں ایک خاص لطیف
ں عالم نظر آتا تھا۔

وہ بعض اوقات اپنی مصروف زندگی کے سبب سے اکثر اپنے
ب کے خطوط کا جواب نہیں دے پاتے تھے، پھر بھی اگر ان سے
فی عرصہ تک ملاقات نہ ہو پاتی تو لکھتے :-

" کیا کروں طبیعت و مزاج بدل نہیں سکتا لیکن احباب و مخلصین
لیئے ہمیشہ بے قرارانہ دعاگو رہا کرتا ہوں "

جگر صاحب پر کئی خاندانوں کی ذمہ داریاں تھیں اور وہ غربا
ساکین کی بھی بیشتر امداد کرتے رہتے تھے جس کا سُراغ ان کے
وط سے ملتا ہے وہ اپنے ایک خط مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۵۳ء میں
یب احمد صدیقی کو لکھتے ہیں :-

" بھائی اس زمانے میں کہ ہر شخص ضرورت مند ہے اور میری
رورتیں تو تنہا میری ضرورتیں نہیں ہیں بلکہ کئی خاندانوں کی خدمت
میرے ذمّے ہے "

اور تسکین قریشی کو ۱۱ر جون ۱۹۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

" میں جس مرتبہ و مقام کا کاہل انسان واقع ہوا ہوں آپ اس
سے باخبر ہیں۔ اس مرتبہ صرف ڈاک نہ دیکھنے اور خط نہ لکھنے کی بنا
پر ایک ہزار روپے کا نقصان کر لیا۔ دَرانحالیکہ میں کوئی دولت مند
آدمی نہیں بلکہ صاحبِ ضرورت ہوں۔ میرے ذمّے بہت سے فرائض
ہیں اور نہیں چاہتا کہ ان میں سے ایک بھی نظر انداز ہو "

ان ذمّہ داریوں کو نبھانے کے لیئے انہوں نے مشاعروں سے
معاوضہ وصول کرنے کے لیئے کچھ اُصول بنا لیئے تھے جن پر وہ سختی سے
پابندی کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے ایّامِ شباب سے زمانۂ پیری تک
مشاعرے برائے تجارت ہونے لگے تھے اور ان کو (جگر کو) اراکین
مشاعرہ احباب کے تعلقات کی بنا پر مشاعروں میں شرکت کرنے کے
لیئے بُلانے کی کوشش کیا کرتے تھے جس سے وہ باخبر تھے اس لیئے
وہ اپنے مخلصین کو اراکینِ مشاعرہ کی ان چالوں سے آگاہ کرتے
رہتے تھے اور ان پر اپنے اس اصول کی پابندی کرنے کا سبب بھی
ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ لیکن ایسے مشاعرے جو محض برائے اُدب یا
کسی اسکولی ادارہ کی طرف سے برائے امدادِ ادارہ کیئے جاتے تو وہ
ان میں بغیر کسی اُجرت کے شریک ہو جایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں
وہ اپنے ایک خط مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۵۳ء میں تسکین قریشی کو لکھتے
ہیں :-

" انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے ۷ر، ۸ر مارچ کو
دہلی میں کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، مجھے بہ اصرار مدعو کیا گیا ہے۔ فائدے
کی تو کوئی صورت ہی نہیں، لیکن اخلاقاً اور مروتاً اس میں شرکت کا
اِرادہ کر چکا ہوں "۔

جگر کے مشاعروں میں شرکت کے متعلق ان کے اصول کی سختی
اور ان کے ایک تعلیمی ادارے میں بغیر اُجرت کے شرکت کے بارے
میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنا ایک ذاتی تجربہ " ہم قلم " کراچی
سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ء میں اسطرح لکھا ہے :-

" جگر صاحب کا یہ جواب آیا کہ وہ پانچ سو روپیے لیں گے کیونکہ

یہ ان کا اصول ہے اور جہاں تک مشاعروں میں شرکت کرنے کا تعلق ہے وہ اس اصول کو توڑنے کے لیے تیار نہیں۔

جگر صاحب کے اس جواب کو پڑھ کر مجھے بہت غصہ آیا میں نے پھر انہیں خط لکھا کہ اُردو کے تقریباً تمام چوٹی کے شعرا نے میری بات مان لی ہے۔ اور وہ بغیر کسی معاوضہ کے اس مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو معاوضہ کی اتنی رقم کیسے دی جائے۔ عربک سوسائٹی کا حال بھی اچھا نہیں ہے ایسی صورت میں میری گزارش یہی ہے کہ آپ ریڈیو کے مشاعرے میں تو دلی تشریف لا ہی رہے ہیں، اس مشاعرے میں بھی میری خاطر شرکت کر لیجئے گا۔ اس مشاعرہ کا مقصد کاروباری نہیں ہے مسلمانوں کے چند تعلیمی اداروں اور مسلمان طالب علموں کی خدمت ہے لیکن جگر صاحب اس کے باوجود نہیں مانے۔ جواب آیا کہ میں اپنے اصول کو توڑ نہیں سکتا، اس لیے مشاعرے میں شریک ہونے سے معذور ہوں ...... مشاعرے کا آغاز ہوا، اور بابائے اُردو کے افتتاحی خطبے کے بعد شعرا اپنا کلام سنانے لگے ..... اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ جگر صاحب صدر دروازے سے پنڈال میں داخل ہوئے۔ کئی لوگ ان کے ساتھ تھے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آخر کیسے آ گئے۔ انہوں نے انکار کر دیا تھا لیکن حیرت کے ساتھ مجھے خوشی بھی ہوئی اور یہ یقین ہو گیا کہ یہ مشاعرے میں شریک ہونے کی غرض سے آئے ہیں .... بالآخر جگر صاحب نے تمام شعرا کے بعد اپنا کلام سنایا۔"

ان مثالوں سے جگر پر لگائے گئے اس بہتان کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ مشاعروں کے اکھاڑے کے شاعر تھے اور اپنا کلام فروخت کرتے تھے مشاعرے والوں سے تو وہ رقم اس لیے سختی سے وصول کرتے تھے کیونکہ مشاعرے والے خود مشاعرے اپنے مالی مفاد کے لئے کرتے تھے جب وہ خود مشاعروں کو آمدنی کا ذریعہ بناتے تھے تو ان کی آمدنی سے شاعر کو حصہ کیوں نہ ملے جس کی وجہ سے ان کو آمدنی ہوتی تھی۔

جگر نے اپنے اکثر خطوط میں لکھا ہے کہ روپیہ ان کا مقصد زندگی نہ رہا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا وہ روپیہ کو مقصود زندگی بنانا اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے تھے حصول دولت کے معاملہ سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہے۔

انہوں نے بعض خطوط میں اپنے دور کی سوسائٹی کو جاہل و بے بصیرت اندھی مقلد اور سفاک تک کہا ہے وہ مشاعرے بازی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے بلکہ مشاعروں سے تو وہ عاجز تھے لیکن کیا کرتے ضروریاتِ زندگی اور متعلقین کے فرائض انجام دینے کے لئے مجبوراً وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اسی خیال کا اظہار انھوں نے میکش اکبرآبادی کے ایک خط مورخہ ۱۹۴۵ء میں کیا ہے لکھتے ہیں۔

" مشاعروں نے فٹ بال بنا رکھا ہے لیکن میں اس لئے اس زحمت کو گوارا کر رہا ہوں کہ اسی طرح مجھے بہت سے متعلقین کی خدمات کے مواقع مل جاتے ہیں۔"

پھر ۱۳ ردسمبر ۱۹۴۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

" متعلقین و متوسلین کی جماعت کم نہیں بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ "مشاعرہ پیشگی" اختیار کروں اگرچہ تمام احباب جانتے ہیں کہ مشاعروں سے مجھے سخت نفرت ہے لیکن کیا کیا جائے در آنحالیکہ مشاعروں سے نجات کسی طرح ممکن نہیں۔"

جگر نے اپنی پُر معصیت زندگی پر فخر کبھی نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ شرمسار رہے وہ شراب تو پیتے تھے لیکن اس پر ہمیشہ ندامت محسوس کرتے رہتے تھے اور اکثر احباب کو لکھتے بھی تھے کہ وہ اس کے (شراب کے) چھوٹ جانے کی دعا کریں۔ اپنے ایک خط مورخہ مارچ ۱۹۵۸ء میں شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری کو لکھتے ہیں کہ:۔

" میں خود بُرا ہوں لیکن بُرے انسانوں سے میرا دل کبھی نہیں ملتا"۔ اس جملے سے جگر کی پاک طینتی کا ثبوت ملتا ہے۔

جگر کو خاک آگرہ بھی بہت عزیز تھی کیونکہ حیات معاشقہ کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی اس لئے وہ میکش اکبرآبادی کو ۳۰ ستمبر ۱۹۵۰ء کے خط میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

مرتبہ نم۔ حیدرآباد

" فاک آگرہ مجھے کس قدر عزیز ہے اور ہو سکتی ہے آپ کو
نہ ہوگا۔"

جگرؔ نے اپنے ایک خط میں جو میکش اکبرآبادی کے نام ہے لکھا
کہ ایک زمانہ میں انھوں نے دس بارہ سال کے بعد مرادآباد کا
ح کیا تھا کیونکہ ان کو اپنی زندگی میں مرادآباد ہی میں ایک ایسا
شہ پیش آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ مرادآباد چھوڑ کر چلے گئے
، اور دس بارہ سال کے بعد ادھر کا رُخ کیا تھا جس کے متعلق
نے غالباً ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں میکش اکبرآبادی کو لکھا ہے

:-

" غالباً بارہ چودہ برس کے بعد وطن کا رُخ کیا تھا خیر۔ اب
پوری آگیا ہوں لیکن بعض مجبوریاں ایسی ہیں کہ کسی طرح مین پوری
یا چھوڑ سکتا۔"

جگرؔ نے بعض خطوط میں اشاروں کنایوں میں انگریزی حکومت
سیاسی چالوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس حکومت کا "مشرقی علم
ب" کے ساتھ سلوک کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار
ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۳۰ مارچ
۱۹۴۶ء میں شاکی کو لکھا ہے کہ:-

" مشاعرہ ہی نہ ہوتا اگر آپ مجبور نہ کرتے ممکن ہے ایسا ہو
تا اس میں تو خوشنودیٔ برٹش گورنمنٹ کا معاملہ ہے آپ کو اس
کیا مطلب۔ رہ گیا ہندوستانی زخمیوں کا معاملہ۔ کیا یہ تنہا
ست کا فرض نہیں اور کیا یہ واقعات نہیں کہ اس نے ہندوستانی
کا خون چوس لینے میں کس طرح کی کمی کی ہے۔ اب بھی جو طریقے
حصولِ مال کے اختیار کئے جا رہے ہیں وہ کس حد تک جائز ہیں۔
ارے بھائی شاکی! ہندوستانی زخمیوں میں سے کیا ہم سب نہیں
"مشرقی علم و ادب" کے ساتھ حکومت نے کیا سلوک روا رکھا
ہے۔ کیا اہلِ علم و ادب کے سینے حکومت کے طرزِ عمل سے چھلنی
نہیں بن گئے ہیں؟"

ان کو اس بات کا افسوس رہا کرتا تھا کہ انسان اپنی زبان
سے تو بہت کچھ کہتا رہتا ہے لیکن اس پر ثابت قدم نہیں رہ پاتا
وہ انسان کی زبانی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی عملی زندگی بھی
اسی طرح کی دیکھنا چاہتے تھے۔

غرضیکہ جگرؔ کے خطوط ان کی شخصیت اور عہد کے آئینہ
دار ہیں کہیں کہیں ایک ایک جملہ میں معنی کے سمندر پنہاں ہیں۔
ان کے اشاروں کنایوں سے بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اس
لئے ان کے خطوط بھی اردو خطوط نگاری میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ان خطوط کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ
ہے کہ ان سے جگرؔ کی پوری شخصیت سامنے
آجاتی ہے۔ اور ان کے اخلاق و عادات
ان کے احساسات و رجحانات ان کا نظریہ
شعر و شاعری حالاتِ زندگی اور ان کے زمانے
کے سیاسی و سماجی حالات پر بھی روشنی
پڑ جاتی ہے۔ ▲

مقبول احمد لاری

سراج لکھنوی

اردو زبان نے دلّی میں جنم لیا اور اس کا ابتدائی ارتقاء دلّی اور دکن میں ہوا لیکن زمانے کی گردشوں نے دلّی اور دکن کو معرکہ آرائیوں، قتل و غارت گری اور سلطنتوں کے مٹنے اور بدلنے کے لئے پسند کر لیا جہاں اردو زبان کی امن پسندی کو جگہ ملنا ممکن ہی نہیں رہ گیا اور اس زبان کو اپنے نشو و نما کے لئے دوسرے ہاتھوں اور دوسرے گہوارے کی ضرورت لاحق ہوگئی۔ یہ ضرورت شہر لکھنؤ کی مثالی سکون و خموشی کی فضا نے پوری کردی اور ہم نے یہ دیکھا کہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر دلّی سے خانہ بدوش ہو کر لکھنؤ میں آکر آباد ہو گئے۔ شاہانِ اودھ نے ان کی سرپرستی کی۔ یہاں کے باشندوں نے فراخدلی کے ساتھ اردو کو اپنایا اور اس زبان نے اس شہر میں مدارج ترقی حاصل کر کے معراج کمال پائی۔

سماج کا اثر زبان پر پڑنا ناگزیر تھا اس لئے ہم نے ایک طرف یہ دیکھا کہ زبان فصاحت و بلاغت کے سانچوں میں ڈھلنے لگی۔ کچھ الفاظ متروک ہونے لگے اور بہت سے نئے وضع ہوئے تو دوسری طرف اردو شاعری نے دلّی کا سادہ مگر گراں قدر لباس بدل کر لکھنوی رنگین صنعت کاری کا جامہ اختیار کر لیا۔ اس نئے مزاج کی مثالیں انیسویں اور بیسویں صدی کے [illegible] لکھنؤ کے شعراء میں بکثرت ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ خواجہ حیدر علی آتش کے ایسے سادہ شاعر کے یہاں بھی وہ تصنع موجود ہے جو لکھنؤ ادب بالخصوص لکھنؤ شاعری کا طرۂ امتیاز تھا، اور جس کی مکمل تصویر اس دور کے شعراء میں ملتی ہے۔

اردو شاعری کے ساتھ ساتھ اصناف سخن میں بھی ترقیاں ہوئیں چنانچہ مرثیہ مسدس کی شکل اختیار کر کے انیس اور دبیر کی کاوشوں سے معراج ترقی پر پہونچ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس مخصوص صنف شاعری کے کمالات کا اثر ہو یعنی یہ کہ سنجیدہ اثرات سماج کے مزاج میں ساری ہو گئے یا یہ کہ مولانا حالی وغیرہ نے جو ادبی تحریک چلائی تھی اس نے بالآخر یہاں کی سوسائٹی کو بھی متاثر کیا اور ادیبوں کو یہ احساس ہوا کہ شاعری کے لئے محض زبان کی چاشنی۔ الفاظ کی بندش۔ جملوں کا چڑھاؤ اتار۔ ملمع سازی ضرور ہے لیکن "نگینوں کے جڑنے" ہی تک شاعری کا اصل مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس احساس کے بعد بیسویں صدی میں لکھنؤ کے رنگ شاعری میں ایک خوشگوار انقلاب آیا جس کے رہنما مرزا رسوا۔ صفی۔ ثاقب۔ عزیز۔ بلیغ۔ رشید۔ محشر۔ اثر۔ آرزو۔ چکبست اور یگانہ تھے۔ انقلاب آیا اور تیزی سے آیا، جس نے اردو شاعری کے مزاج کو بہت جلد بدل دیا۔

اس ذہنی انقلاب نے اصناف سخن میں سب سے زیادہ غزل کو متاثر کیا اور یہ تبدیلی اردو زبان کی ان خصوصیات کا باعث بنی

جن کی بدولت آج اردو ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں کی پہلی صف میں جگہ لئے ہوئے ہے۔ اس صورت حال سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے انقلاب کی بنیادیں صحیح احساسات و رجحانات پر قائم کی گئیں۔ ہوا یہ تھا کہ غزل گوئی میں لکھنؤ کی زبان کا لطف۔ رنگینی۔ چاشنی وغیرہ تو برقرار رہی لیکن نوچ اور محض لفاظی سے پرہیز کیا جانے لگا۔ اس انقلاب کے رہنماؤں میں مرزا رسوا ایک اہم حیثیت کے مالک تھے اس لئے اس مقام پر انہیں کا ایک شعر پیش کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند
پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

اردو غزل گوئی کی یہ بھی ایک خوش بختی تھی کہ رسوا اور صفی وغیرہ کے بعد جو نسل پروان چڑھی اس نے ان تمام اصلاحات اور روایات کو برقرار رکھا جو اس وقت نافذ ہو چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ آنے والے شعراء نے اُن تمام باتوں کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنا لیا جو اُن کے پیش رو چھوڑ گئے تھے۔ اس نسل میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی اُن میں خصوصیت کے ساتھ آشفتہ، سائل، رضا، قدیر، ماہ اور سراج وغیرہ کے نام پیش کئے جاسکتے ہیں۔

سراج فطرتاً شعر و سخن سے اُنس رکھتے ہیں۔ اُن کے کلام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کا ذوق شعر گوئی اُن کے ضمیر میں شامل تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوگیا کہ اُن کو رشید جیسے استاد فن سے تلمذ کا شرف حاصل ہوگیا۔ اس لئے اُن کے کلام میں لکھنؤ کی زبان کی مخصوص چاشنی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے اور فن کے نقطۂ نظر سے زبان اور بیان میں رشید مرحوم کی پیروی صاف صاف نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

کچھ تو کوچہ ترا جنت کا نمونہ ہے بھی
کچھ مرے حسنِ تخیل کی بھی رعنائی ہے

پھر بھی کہتے ہو کہ ہے قصۂ غم بے تاثیر
کوششیں کی ہیں ہنسی کی تو ہنسی آئی ہے

رات بھر شمع جلاتا ہوں بجھاتا ہوں سراج
بیٹھے بیٹھے یہی شغل شبِ تنہائی ہے

نہ پوچھو محبت کی جوہر شناسی
کہ خود بک گئے ہم خریدار ہو کر

لڑی جو پھولوں سے تھی شاخ آشیانے کی
وہی ہوا کہ نظر لگ گئی زمانے کی

امتحان گاہ محبت کی ہوائیں توبہ
آگ کے پھول پہ نیند آگئی پروانے کو

توبہ کے بعد بھی حسرت بھری نظروں سے سراج
دیکھ لیتا ہوں چھلکتے ہوئے پیمانے کو

وہ رخ دیا کہ خاک میں دل مل گیا سراج
یہ کیا غضب کیا نگہ شرمسار نے

شایانِ التفات نہ تھی ایک لہو کی بوند
ہاں دل نوازیوں نے تیری دل بنا دیا

یہ اقتباس اُن غزلیات سے پیش کیا گیا ہے جو سراج نے ۱۹۱۸ء تا ۱۹۳۰ء میں کہی تھیں غالباً یہ وجہ ہے کہ ان اشعار میں رشید مرحوم کے زبان و بیان کی چاشنی اور لطافت بدرجہ اتم موجود ہے۔ "حسنِ تخیل کی رعنائی"۔ "کوششیں کی ہیں ہنسی کی تو ہنسی آئی ہے"۔ "رات بھر شمع جلاتا ہوں"۔ "خود بک گئے ہم خریدار ہو کر"۔ "نظر لگ گئی زمانے کی"۔ "آگ کے پھول پہ نیند آگئی"۔ "توبہ کے بعد چھلکتے ہوئے پیمانے کو دیکھ لینا"۔ "وہ رخ دیا"۔ "دل نوازیوں نے تیری دل بنا دیا۔" یہ تمام کے تمام محاورے طرزِ ادا، اندازِ سخن لکھنؤ کی مخصوص شیریں زبان اور اچھے جذبات انداز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

سراج ایسے دور کی پیداوار ہیں جس کو ہندوستان کا دور جدید بجا طور سے کہا جاتا ہے۔ اُن کے پہلو میں حساس دل بھی ہے اور نظر دقیقہ سنج بھی۔ اس لئے ان کو پورا پورا موقع ملا کہ وہ دورِ جدید کی کشمکش دیکھیں اور اُن تغیرات سے اثر پذیر ہوں جو قومی

زندگی میں ہو رہے تھے۔ انھوں نے ان بدلتے ہوئے حالات کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور ان سے اثر لیا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایسے نئے مضامین بھی ملتے ہیں جو موجودہ عہد کے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں مثال میں چند اشعار پیش کردینا کافی ہوگا۔

چاہوں تو قفس لے کے بھی اڑ جاؤں میں صیاد
کیا تو نے کہا طاقت پرواز نہیں ہے؟

سراج اک رنگ پر قائم نہیں دیوانگی میری
کبھی گلشن پرستی ہے کبھی صحرا نوردی ہے

ستم ہے غم کی دولت بھی ادا کی جائے قسطوں میں
تکلف برطرف ہونا ہے جو اک بار ہو جائے

فلک پہ روز نیا تارا اک نظر آئے
بلند اتنی تو ہو فکر آشیاں میری

لہو کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آجائے
اگر اے خود غرض دنیا تجھے آرام آجائے

وہی غریبوں کا بھی خدا ہے بہت جینے کو یہ سہارا
سراج اس دور سے گزرنا مگر بڑا سخت امتحاں ہے

کوئی آواز دیئے جائے اگر ساحل سے
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہو جائے

صرف ان ہی چند اشعار میں زندگی کی کشمکش کے قریب قریب تمام احساسات موجود ہیں۔ قنوطیت بھی اور رجائیت بھی۔ ہمت و حوصلے کی امنگیں بھی اور مجبوری و ناچاری کا احساس بھی۔ زندگی سے بیزاری بھی اور جینے کی خواہش بھی۔ ماضی کی یادیں بھی اور حال کو خوشگوار بنانے کی تمنا بھی۔ فلک کا تارا بننے کی ہوس بھی اور کوئی روشناس نہ باقی رہنے کی تاریکی بھی۔ خدا پر بھروسہ بھی اور کسی ہادی الطریق کی آواز سننے کی حاجت بھی۔ غرضیکہ دورِ جدید کی قومی زندگی سے متاثر ہونے کا مکمل ثبوت سراج کے کلام میں موجود ہے۔

ایک اچھے غزل گو کا یہ طرۂ امتیاز ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے تمام حالات۔ انسانی زندگی کے تمام تغیرات۔ دقیقہ سنجی اور تفکر و تعقل کی تمام تخلیقات کیف و مستی، شعلہ و شبنم اور پروانہ و بلبل کے پردے میں کہہ جاتا ہے۔ "ناز و غمزہ" بھی مقصود ہو تو گفتگو میں "دشنہ و خنجر کہے بغیر کام نہیں بنتا اور "ہر چند مشاہدۂ حق ہی کی بات کیوں نہ ہو لیکن "بادہ و ساغر کہے بغیر" نہیں بنتی۔ اسی اصول کے تحت جائزہ لیا جائے تو سراج کے کلام میں بھی ہندوستان کی سیاسی جدوجہد۔ جنگ آزادی۔ ترقی کی خواہش۔ نااتفاقی اور فرقہ پرستی کی مذمت اور اسی قسم کے دوسرے سیاسی و سماجی معاملات کے متعلق بہت سے اشارے گل و بلبل، قفس و آشیاں، شعلہ و برق۔ بادہ و جام وغیرہ علامتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان سب علامتوں کی مثالیں پیش کرنے کے لئے نہ وقت ہے اور نہ ایک مختصر مضمون میں گنجائش اس لئے صرف چند اشعار پیش کردینا کافی ہوگا۔

یہاں کے جھگڑوں سے تو نپٹ لو فلک کے تارے بھی توڑ لانا
نئے جہاں کی تلاش کیوں ہے تمہاری دنیا میں کیا نہیں ہے

تنکے ہیں کچھ جلے ہوئے کچھ نیم گرم خاک
یوں بخشتا جا رہا ہے مرا آشیاں مجھے

آرام کر رہے ہیں تقاضے بھی وقت کے
دیتا ہے لوریاں ابھی خواب گراں مجھے

کچھ نہ دے اے آسماں دو گز زمیں دیدے مجھے
نقش عبرت ہوں شہید حسرت تعمیر ہوں

کچھ تشنہ لب اے ساقی خوددار بھی ہوتے ہیں
اڑ جائے گی مئے رکھے رہ جائیں گے پیمانے

بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
پڑا ہے کام بدلتے ہوئے زمانے سے

آنکھ ساقی سے ملاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
میری توبہ نہ چھلک جائے کہیں جام کے ساتھ

سوتا رہا ہونٹوں پہ تبسم کا سویرا
رو رو کے جگایا گئے تقدیر سحر ہم

فریب دے کے کرم کا نہ کھولی دل کی گرہ
کہیں کلی کو تبسم سکھایا جاتا ہے

کیا خبر تھی ہمیں یہ وقت آئے گا سراج
آستین ہوگی نہ دامن نہ گریباں ہوگا

کلی کی مانگ بھی ہے آہ اُجڑی اُجڑی سی
چمن کے پھول بھی جیسے نکھار کھو بیٹھے

زندگی اک مست سی انگڑائی ہو کر رہ گئی
جیسے اک رنگین پیمانہ چھلک جانے کے بعد

یہ توہینِ وفا ہے آئے دل کا امتحاں کب تک
بس اے صیاد بس اب چھین بھی لے بال و پر ہم سے

سراج اک سانس پر اُن کی حیاتِ جاوداں صدقے
جنہیں جینا پڑے دنیا میں مرگِ ناگہاں ہو کر

میں خود داری کا بندہ تو خدائے بے نیازی ہے
خوشی تیری بڑا ہی سخت ہوگا امتحاں میرا!

ہر حیات۔ کشمکشِ زندگی۔ سیاسی مراحل۔ بدلتے ہوئے زمانے کی مشکلات اور ان سب کے نتیجہ میں فطری طور پر قنوطیت کا طاری ہونا۔ وہ حالات ہیں جن سے ہمارا ملک آزادی کے بعد بھی دوچار ہے۔ سراج نے ان معاملات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی بہترین نظر پر ترجمانی کی ہے اور اس ترجمانی کا یہ اسلوب ہے کہ لکھنؤ کی زبان اور بیان کا لطف ہر قدم پر ملتا ہے۔

سراج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہیں انھوں نے تربیت پائی اور اسی شہر کے زبان داں ماحول میں پروان چڑھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلوب سخن کے ساتھ اُن کے کلام میں محاورات کا بھی خوبصورت صرف ملتا ہے۔ مثال کے طور پر دو چار اشعار پیش کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

سراج اب دلکشی کب زندگی میں
پُرشکل وقت کاٹا جا رہا ہے

کیا ہوگا کل کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
دیکھو سراج یوں ہی کچھ اور روز جی کے

قسمت کی لکیروں کی طرح پھر نہ مٹے گی
ظالم جو شکن پڑ گئی دامانِ وفا میں

دھڑکنیں دل کی بھی شاید ہیں خدا بھی ہے گواہ
ہم پہ جب وقت پڑا تم کو پکارا ہم نے

چرا کے آنکھ چھپے جا رہے ہو کیوں آنسو
ملا کے آنکھ کہو۔ آہ میں اثر کم ہے

شکریہ شوخیٔ حسنِ پسِ پردہ کا سراج
آنکھ بے دیکھے گنہگار ہوئی جاتی ہے

زندہ خون کے آنسو ہیں یہ، تھوڑی دیر تڑپنے دے
وقتِ سحر مٹی میں ملانا، رات گزرنے والی ہے

محاورات کا خوبصورت استعمال سراج کے کلام میں بہت کثرت سے موجود ہے۔ مندرجہ بالا اشعار صرف مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کر دیئے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں تصوف اور فلسفیانہ مضامین کے نظم کرنے کا دستور اسی وقت سے چلا آرہا ہے، جب سے کہ اردو شاعری معرضِ وجود میں آئی تھی۔ ابتداً ایسے مضامین صاف صاف الفاظ میں کہے گئے پھر اُن کو عشقیہ رنگ میں ڈھالا گیا اور جب اردو زبان معراجِ کمال کو پہونچی تو ایسی باتیں اشاروں، کنایوں، تشبیہات و استعارات اور یہاں سے دوسرے لطیف پیرایوں میں کہی جانے لگیں۔ سراج کے دور میں یہ اشارے، محاوروں میں بھی ادا ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ سراج نے تصوف کے مضامین بھی لطیف پیرایہ میں یا محاورہ ادا کئے ہیں جیسا کہ متذکرہ بالا اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جو چیز سراج کو اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اُن کی رنگین بیانی، شگفتگی، اشاراتی انداز اور صحتِ زبان ہے۔ جس شاعر کے یہاں بھی یہ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ اپنے زمانے کے مقبول شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے چنانچہ انہیں خصوصیات کی وجہ سے سراج آج لکھنؤ کے مقبول ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے کلام سے رنگین بیانی شگفتگی اور اشاراتی انداز کی چند مثالیں سن لیجئے۔ جہاں تک صحتِ زبان کا تعلق ہے یہ خصوصیت سراج کے ساتھ اتنی مستند ہے کہ اب کسی مزید

ثبوت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان آنسوؤں میں رنگ تبسم بھی گھول دے
ظالم کوئی مزا بھی تو آئے ملال میں

دنیا کی دل آویزی خالق سے تو باہے
مرتے ہیں مگر پھر بھی جینے کی تمنا ہے

آخری اشک رکا ہے سر مژگاں آکر
ڈوب جائے یہ ستارہ تو سحر ہو جائے

باتیں بھی بے وفا کی بہت دل فریب ہیں
کچھ رنگ بھی بھرا ہے مرے اعتبار نے

ترتیب میں ساری عمر گزری
اک سانس میں کہہ گیا فسانہ

چھوڑ دی چڑھتی ہوئی موجوں پہ کشتی جس نے
کچھ نہ کچھ تو اسے اندازۂ طوفاں ہوگا

رسوائی جسارت نظارہ ہو چکی — دیکھو ادھر کہ عذر تو کرلیں نظر سے ہم
زندگی اک خواب بے تعبیر بنکر رہ گئی — زہر دے کر ہر تمنا کو سلا دینا پڑا

پڑھوں شکست عزائم کا مرثیہ کب تک
نہ جانے کب سے سپرد مقدرات ہوں میں

یہ سب درست مگر پھر بھی یہ کہوں گا سراج
خود ایک زمانہ ہوں خود ایک کائنات ہوں میں

"شاعر کا کلام اس کے دل کا آئینہ دار ہوتا ہے" چنانچہ ہم سراج کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی سیرت میں قناعت اور جاہ و ثروت سے بے نیازی کی جھلکیاں ملتے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سراج نے انسانی زندگی کے اس رخ کی جو عکاسی کی ہے اس کا ہو بہو اپنا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں بھی چند شعر سن لیجئے۔

کہیں کیا حکایت درد دل کریں کس زباں سے شرح غم
جو سوال ہم سے کیا گیا ترا نام بھی نہ بتا سکے

نہ ہر ادا سے غم محبت ترا تو ہر رنگ مستقل ہے
بھلا دوں یہ آگئے دن کہ قصہ فدائے غم دوجہاں سے پہلے

سراج اس دل کو پھول بننا بھرے چمن میں نہ راس آیا
نظر اٹھی خشک ہوگیا خود بہار بن کے خزاں سے پہلے

مری مستقل شب تار کو کبھی دن بنا کے بھی دیکھ لے
کبھی برق بن کے چمک بھی جا کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے

سراج اب کیا کہوں محتاج غم ہے کیوں خوشی میری
بغیر آنسو بہائے مسکرانے کو ترستا ہوں

سراج کا دیوان "شعلۂ آواز" شائع ہو چکا ہے۔ اس دیوان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے پہلے حصہ میں ۱۹۱۸ء تا ۱۹۴۰ء کی غزلیں ہیں۔ دوسرے حصہ میں ۱۹۴۱ء تا ۱۹۵۰ء اور تیسرے میں ۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۰ء کی غزلیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ان کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سراج کے ابتدائی کلام میں بھی پختگی موجود ہے۔ البتہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اور بدلتے ہوئے زمانے کے اثرات نے ان کے دماغ و دل کو متاثر کیا ہے۔ پہلے حصہ میں داستانِ حسن و عشق کی جو رنگینیاں نظر آتی ہیں ان کی جگہ تیسرے حصہ میں زندگی کی کشمکش اور غم روزگار نے لے لی ہے۔ دوسرے حصہ ہی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر کی نفسیات پر حالات روزگار اپنا اثر جما رہے ہیں اور ایک حساس دل غم عشق پر غم روزگار کو بھاری محسوس کر رہا ہے۔ سراج کے فطری رجحانات نے ان کو داستان حسن و عشق سے بیگانہ نہیں بننے دیا لیکن ان کے شعور نے سیاسی انقلاب۔ معاشی اور سماجی تحریکات سے وابستہ رہنے پر بھی مجبور کر دیا۔ ۱۹۶۱ء کے بعد جب صلاحیتوں نے تکمیل کی تمام منزلیں طے کرلی ہیں۔ سراج نے کیا کیا کہا ہے اس کے لئے ہم کو ابھی ان کے دوسرے دیوان کا انتظار کرنا ہوگا۔

> پونم میں شائع ہونے والے تمام ادبی نیم ادبی مواد میں نام، کردار، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لئے ادارے پر کوئی ذمہ داری عاید نہ ہوگی۔
>
> (ادارہ)

جگر کالی شاہجہاں پوری

ادبی اور عام مصوری کے امتیازی حدود

مصوری کی ایک قسم ادبی مصوری بھی ہے جو نسبتاً زیادہ موثر
[د]لکش ہوتی ہے۔ اس رنگ مصوری میں ادبی مصور کمالِ بہزاد
[illegible] موئے قلم اور گوناگوں رنگوں کی پیالی کی ضرورت نہیں پڑتی،
[illegible]ے قلم کی ادنیٰ جنبش اور ایک قطرۂ آب کے بغیر اپنی تخیلی رنگ
[illegible]ے دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر ڈھنگ کی تصویری
[illegible] نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ عام مصور تصویر کھینچنے میں
[illegible] رنگ بھر کر اس کو جاذب نظر بنا سکتا ہے لیکن ادبی مصور
[illegible] میں تھوڑے رنگوں کے بجائے الفاظ کی
[illegible]

صورت بنا کر پیش کر سکے گا، لیکن ادبی مصور اس سینہ فگار اور
جگر پاش حادثہ کی تصویر اس موثر انداز سے کھینچے گا کہ سننے والوں
کے دل و جگر شق ہو جائیں۔

نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

چونکہ یہ واقعہ جذبات کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ استعاری
رنگ آمیزی سے تمام دنیا کو ماتم کدہ یاس و حرماں بنا دیتا ہے۔
غیر مرئی صورت حال کی مصوری عام مصور کے بس کی بات نہیں
لیکن ادبی مصور غیر مرئی اشیاء کی تصویر بھی اس دلکش انداز سے
[illegible] عام مصور
[illegible]

ہیں ۔

ایک باکمال مصور کے نقوش، ناظرِ تماشہ کو حیرت و
عجاب میں ڈال سکتے ہیں لیکن ایک ادبی مصور اپنی فن کارانہ
مہارت سے ایک ایسا پیکرِ جمیل نظروں کے سامنے پیش کرتا
ہے کہ دُنیائے دل صد جہانِ اضطراب بن جاتی ہے ۔

عام مصور قوتِ متخیلہ میں قائم شدہ صورت کو تصویری
خاکے میں لاکر اور مجسمہ ساز مفہومِ ذہنی کو سنگ تراشی کے
ل موضوعہ کی مدد سے ایک جاذبِ نظر مجسمہ میں تبدیل کرکے
پیش کرتا ہے لیکن ادبی مصور قوائے ذہنیہ کو حرکت دیکر الفاظ
الٹ پھیر سے ایک ایسا شعری مجسمہ بنا کر پیش کرتا ہے جس
نظروں کے بجائے دل کی روشنی اور تابناک ہو جاتی ہے ۔
کڑوں نہیں ہزاروں لیسے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں
کو مصور قدرت وکمال کے باوصف پیش نہیں کر سکتا، لیکن
مصور ان کو محاکاتی اصول کے تحت ایسے دل نشیں انداز میں
پیش کر دیتا ہے کہ تمام واقعات شئے مجسم بن کر نظروں کے
سامنے رقص کرنے لگتے ہیں، ایک باکمال مصور درد وغم کے آثار
تصویر پر نمایاں کر کے دیکھنے والوں کو مضطرب بنا سکتا ہے مگر
ت کے اُن غیر مرئی احساسات کو ظاہر نہیں کر سکتا جو عاشق کے
اب وش دل پر بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں ۔ عام مصورانہ محاکات
کمال یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُس کی مکمل کیفیت
ں کے سامنے آجائے مثلاً ایک حسین و رعنا نوجوان کی تصویر بنائی
شباب کی تمام کیفیات کا اس کے چہرے سے عیاں ہونا
تاکہ کوئی جمالیاتی پہلو نظروں سے اُوجھل نہ ہونے پائے
ہ کی منظر کشی مقصود ہو تو شوکت و دل فریبی کے
ری خاکہ سے ظاہر ہونا ضروری ہے لیکن
ے کیفیات کے احاطہ کے ساتھ اپنے
میں جمال و جلال کی ایسی متوازن
مصور کی [illegible] کے سامنے ہوگی
[illegible]

چیز ہے یعنی تصویر اپنی تمام سرگذشت خود اپنے خطوط و نقوش سے ظاہر کرے اور اسی کے ساتھ اس کے نقوش و خطوط میں اُس اثری کیفیت کی نمائش بھی ضروری ہے جس سے خود مصور کا دل ابتدا میں متاثر ہوا تھا تاکہ مشاہد اور مصور ایک ہی صہبائے اثر کی کیفیت میں سرخوش اور ایک ہی رنگِ اثر میں رنگ جائیں اور تصویر کی صورت ترتیب کے وقت مصور کی قوتِ متخیلہ میں جو محاکاتی جزئیات مُرتب ہوئے تھے وہ تمام جُزئیات کے ساتھ اسی ترتیب سے ناظر و شاہد کی نظروں کے سامنے آجائیں ۔ مصور کا اپنے تصویری خاکے میں شانِ واقعیت و اصلیت کا ظاہر کرنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ ناظر و شاہد کے دل پر اثری کیفیت کی پوری طرح جلوہ گری ہو سکے ۔ یعنی جن محرکات سے مصور کا احساس و ادراک جاگا تھا اُن محرکات کی تمام کیفیات تصویری نقوش و خطوط سے عیاں ہو جائے ۔ ان نقوش و خطوط کی نمائش مصور کے احساس کی پاکیزگی اور تاثر و انفعال کی صفائی پر منحصر ہے اگر مصور کے احساس و ادراک میں ان کی کمی ہوگی تو تصویری خاکہ بھی اثری کیفیت سے عاری رہے گا ۔ اسی طرح ادبی مصور کیلئے بھی جدتِ شعر میں تخلیقی محاسن کا پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ واقعہ کی تمام جُزئیات سمٹ کر نظروں کے سامنے آجائیں ۔ اگرچہ بظاہر ادبی اور عام مصور کی حدیں ایک دوسرے سے قریب نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں کمالِ مصوری اور حسن مصوری کے فرق کی بنا پر ایک دوسرے سے جُدا بھی ہیں ، یعنی کمالِ مصوری دونوں میں شئے مشترک کے طور پر واقع ہے لیکن حسن مصوری صرف ادبی مصوری کے ساتھ مختص ہے اِس اعتبار سے ادبی مصوری میں عام مصوری کے مقابلہ میں دو خوبیاں پائی جاتی ہیں ، ادبی مصور چونکہ تلمیذِ فطرت کہلاتا ہے، اس لیئے فطرت کے سربستہ رازوں کی گرہ کشائی میں عام مصور اس کا شریک و سہیم نہیں، حُسنِ مصوری کا زیادہ تر تعلق چونکہ جذبات کی انتہائی گہرائیوں اور غیر مرئی صورت سے ہے اس لیئے عام مصور کے تصویری نقوش حُسنِ مصوری سے یکسر خالی رہتے ہیں، علاوہ ازیں ادبی مصور عنوانِ فکر کے تمام جُزئیات و متعلقات کی تفصیل کا فلسفی کی طرح استقصا نہیں کرتا بلکہ حسن کلام الفاظ کے ذریعہ جذبات اور وارداتِ قلبیہ کی ترجمانی

…سروں کو تاثر پذیر بناتا ہے بلکہ بسا اوقات اس کا …
…حقیقت ہوتا ہے جو کسی نوع سے الفاظ کی گراں باری کا متحمل …
… ایسے نازک موقعہ پر ادبی مصور کا کمالِ مصوری یہ ہے کہ …
…کی نشست اور ترتیب کے ذریعہ ایسا اشارہ کرے کہ مخاطب …
…کی قوتِ مدرکہ "فی بطن الشاعر" معانی و مفاہیم کی طرف خود بخود …
…جائے اور ادبی مصور کو معانی کی جو جلوہ گری اس میں نظر آتی …
…جلوۂ معانی، مخاطب و سامع کو بھی نظر آنے لگے ؎

اُس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں بہار آئی

ہر کمال میں حُسن کی جلوہ گری لازمی نہیں، لیکن حُسن کا ہر عنوان …
…کمال کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہے، مذکورہ شعر میں حُسنِ …
…کی جلوہ سامانیاں جس انداز میں موجود ہیں وہ محتاجِ تشریح نہیں …
…مصوری کی حدود میں چونکہ کمالِ مصوری کا ہونا لازمی ہے اسلیئے …
…کے اشعار میں حُسنِ مصوری کے ساتھ کمالِ مصوری کی عروسِ زیبا …
…جلوہ آرا ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھکو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

دینا وہ اُن کا ساغرِ مئے یاد ہے نظامؔ
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

…ان اشعار کے مصرعہائے ثانی میں جس کیفیت کی مصوری کی گئی …
…وہ بظاہر کیفیتِ مادّی کی حُسنِ مصوری ہے لیکن محبوب کی انفعالی …
…کیفیت کو جس دلفریبی کے ساتھ مصور و متشکل کیا گیا ہے وہ مادّی …
…کیفیت سے کہیں بلند ہے۔

…عام ادبی مصوری کے طریقۂ اثر اندازی میں بھی نمایاں …
…ہے، نقاش و مصور قوتِ باصرہ کے احساس کے واسطے سے ناظر …
…کو اپنے تصویری نقوش و خطوط کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ادبی …
…مصور شعری معنویت کو موسیقیت کی نشہ آور لہروں میں جذب کر کے …
…قوتِ سامعہ کے ذریعہ سامع اور مخاطب کی جانب منتقل کرتا ہے …
…قوتِ متخیلہ اس کیف و تواجد کی غیر مرئی حالت کو تشکیل و تجسیم

کر کے نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اگر ادبی مصور
اپنی شعری تصویر میں اسرار و معارف کے نکات بھی حُسنِ مصوری کے
ذریعہ نمایاں کر دے تو شعری تصویر کی قوت اثری اس حسین و جمیل
کائنات کی غیر ذی روح اشیا میں بھی روحِ انبساط دوڑا دے گی
یا یُوں سمجھیئے کہ اس کی طاقت اثری جمادات کے جسم میں روحِ حیات
ہی نہیں بلکہ قوتِ نمُو پیدا کر دے گی۔

ادبی مصور کی اس منزل تک اگر عام مصور کی رسائی کو
ممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے بعد اسرار و معارف
کے بزمِ تجلّی کی وہ غیر مرئی سرحد شروع ہو جاتی ہے جہاں مصور و نقاش
کے طائرِ تخیل کی پرواز ممکن نہیں، بلکہ وہ خود پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

لیکن ادبی مصور تخیل کی مدد سے اس بزمِ تجلّی کی غیر مرئی حدود
میں پہنچ جاتا ہے اور اس تجلّی کدۂ لاحدود کے رازوں کا انکشاف
اس انداز سے کرتا ہے کہ بزمِ وحدت کی تجلّی کی پُوری تصویر نظروں
کے سامنے آجاتی ہے اور اس مرحلہ پر پہونچ کر شعری مصوری کی ،
اثر انگیزیاں سحرِ سامری نہیں اعجازِ موسوی بن جاتی ہیں۔

ادبی مصور کو اسرارِ حکمت اور رموزِ فطرت کی مصوری کے
لیئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ بصر
اتنی باریک ہونی چاہیئے کہ وہ باریک تر نکتہ ہائے حقائق تک بآسانی
پہونچ سکے اور اس کی قوتِ حسیہ کا بھی اتنا لطیف و پاکیزہ ہونا
ضروری ہے کہ وہ فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ یا حقائقِ
غیر مادّی تک رسائی حاصل کر سکے اور ان دونوں قوتوں کی تکمیل کے
بعد اس کی قوتِ بیانیہ کا بھی اتنا تہذیب یافتہ ہونا لازمی ہے کہ
اس کے بیان کردہ حقائق کی تصویر، صورتِ تجسیم میں نظروں کے
سامنے آجائے، اسی بنا پر ادبی مصور کو اپنی تصویر کشی میں حُسن مصوری
کی شان پیدا کرنے کے لیئے مختلف اُمور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اوّلاً اس کا محاکاتی انداز اس قدر صاف اور روشن ہو کہ واقعہ
کی پوری کیفیت منظرِ عام پر آجائے۔

دوم، دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو جوں کا توں بیان کرنے کے ساتھ ان کی تصویر کشی میں جدت اور تنوع ہو، اور فرسودہ طرزِ نگارش سے اجتناب بھی۔ انہی جذبات کی مصوری کی جائے جن میں بجائے خود دل کشی ہو، اور طبائع انسانی کو اس طرزِ نگارش سے مناسبت بھی۔

سوم، افکار و خیالات، طرزِ بیان اور اسلوبِ نگارش میں ہم آہنگی بھی ہونی چاہیے تاکہ اُن کی یک جائی سامع کے دل میں زیادہ گہرا نقش قائم رکھ سکے ورنہ ادبی مصور کی تمام تر مساعی اُس عام مصور کے مشابہ ہو جائے گی جو ایک مسرت انگیز تصویر بنانے میں مصروف ہو لیکن پریشانیٔ خاطر کے باعث تصویر کے چہرہ پر حسرت و یاس کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ مثلاً جزیرۂ سسلی جس پر برسوں اسلامی پرچم لہراتا رہا۔ ادبی مصور کی جب اُس پر نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے اس کے اظہار کے لیے وہ ایسے الفاظ اور ایسا اسلوبِ بیان اختیار کرتا ہے کہ المیہ حقیقت کی پوری عکاسی ہو جاتی ہے ؎

روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

اس المیہ منظر کے مشاہدہ سے ادبی مصور کے غمناک دل پر جو بیتی ہے اس کے اظہار کے لیے [illegible] کا مزار کہہ کر خیالات و جذبات اور اسلوبِ بیان میں ہم آہنگی کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

چہارم، اس کی زبان کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہونی چاہیے یعنی الفاظ سے چاشنی آمیز شیرینیت ٹپکتی ہو ؎

عارضِ رنگیں پہ اُن کے رنگ سا کچھ آ گیا
ان گُلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

پنجم، محاورات میں صداقت اور اسلوبِ بیان جاذبیت و دل کشی کے سامان موجود ہوں اور حقائق کی مصوری ایسے مؤثر اور لطیف پیرایہ میں ہو کہ ان کی اصل صورت نظروں کے سامنے آ جائے اگر ادبی مصور اپنی تصویر کشی میں مذکورہ رعایتوں کو اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تو یقیناً اس کی تصویر دھندلی اور اس کا رنگ بے رنگ ہو جائے گا ؎

جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

مصرعۂ ثانی نے تصویری خاکے میں جو رنگ بھرا ہے اس سے شبِ غم کی المناکی پورے طور پر نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔

▲

جمالی شاہجہاں پوری

ادبی اور عام مصوّری کے امتیازی حُدود

مُصوّری کی ایک قسم ادبی مصوری بھی ہے جو نسبتاً زیادہ موثر اور دلکش ہوتی ہے' اس رنگ مصوری میں ادبی مصور کو مانی و بہزاد کی طرح مُوئے قلم اور گوناگوں رنگوں کی پیالی کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ مُوئے قلم کی ادنیٰ جُنبش اور ایک قطرۂ آب کے بغیر اپنی تخیلی رنگ آمیزیوں سے دُنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر رنگ کی انفرادی جلوہ گری نظروں کے سامنے آجاتی ہے' عام مصور تصویر کے خاکے میں ہلکے اور گہرے رنگ بھر کر اس کو جنت نظر بناتا ہے لیکن ادبی مصور اپنے تصویری خاکے میں ہلکے اور گہرے رنگوں کے بجائے الفاظ کی حُسنِ ترتیب، اسلوب بیان کی دلآویزی اور تشبیہہ و استعارہ کی رنگینی سے رنگ بھرتا ہے اسی بنا پر ادبی مصور کے تصویری خاکے اپنی تشریح اس انداز سے کرتے نظر آتے ہیں کہ سامعہ جذب و اثر کی رنگین لہروں میں ڈوب سا جاتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک چونکہ محاکات عنصرِ شیریں میں داخل ہیں اس لیئے وہ ادبی مصوری کو عام مصوری سے اس فرق کے ساتھ تشبیہہ دیتا ہے کہ مُصوّر صرف مادّی چیزوں کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور ادبی مصوری مادّی اور غیر مادّی دونوں کی تصویر کشی پر قادر ہے ماں اور باپ کی گود میں پلے ہوئے بیٹے کے انتقال سے جاں گُسل صدمہ والدین کو پہونچتا ہے عام مصور اس کو ایک انتہائی غم انگیز صورت بنا کر پیش کر سکے گا' لیکن ادبی مصور اس سینہ فگار اور جگر پاش حادثہ کی تصویر اس موثر انداز سے کھینچے گا کہ سُننے والوں کے دِل و جگر شق ہو جائیں ؏

نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

چونکہ یہ واقعہ جذبات کی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے اس لیئے وہ استعاری رنگ آمیزی سے تمام دُنیا کو ماتم کدہ یاس و حرماں بنا دیتا ہے۔

غیر مرئی صُورتِ حال کی مصوری عام مصور کے بس کی بات نہیں لیکن ادبی مصور غیر مرئی اشیاء کی تصویر بھی اس دلکش انداز سے کھینچتا ہے کہ ان کی صورت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ عام مصور کے پاس انیس کے اس شعری مفہوم کی تصویر کشی کا کوئی ذریعہ نہیں

؎ گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

ادبی مصور کی وسیع و عریض حُدود میں اسرار و غوامض اور معارف و نکات کی وہ حسین و جمیل دُنیا بھی شامل ہے جہاں عام مصور کے ادراک کی رسائی ممکن نہیں۔ مصور کا مُوئے قلم صرف اُن کیفیات مرئیہ کی مُوکشی کر سکتا ہے جن کا اظہار عوارض جسمانیہ اور محسوسات مادیہ سے ممکن ہے۔ لیکن ادبی مصور کے تخیل کی مُتقابی نگاہ مسلسل گہرائیوں کی ان حُدود تک بھی پہونچتی ہے جہاں کیف و کم کی گنجائش

ی نہیں۔

ایک باکمال مصور کے نقوش، ناظر تماشہ کو حیرت و ستعجاب میں ڈال سکتے ہیں لیکن ایک ادبی مصور اپنی فنکارانہ مصوری سے ایک ایسا پیکرِ جمیل نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ دُنیائے دل صد جہانِ اضطراب بن جاتی ہے۔

عام مصور قوتِ متخیلہ میں قائم شدہ صورت کو تصویری خاکے میں لاکر اور مجسمہ ساز مفہومِ ذہنی کو سنگ تراشی کے اصول موضوعہ کی مدد سے ایک جاذبِ نظر مجسمہ میں تبدیل کر کے پیش کرتا ہے لیکن ادبی مصور قوائے ذہنیہ کو حرکت دیکر الفاظ کے اُلٹ پھیر سے ایک ایسا شعری مجسمہ بنا کر پیش کرتا ہے جس سے نظروں کے بجائے دل کی روشنی اور تابناک ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں جن کو مصور قدرت وکمال کے باوصف پیش نہیں کرسکتا، لیکن ادبی مصور ان کو محاکاتی اصول کے تحت ایسے دل نشیں انداز میں پیش کر دیتا ہے کہ تمام واقعات شئے مجسّم بن کر نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں، ایک باکمال مصور' درد وغم کے آثار چہرۂ تصویر پر نمایاں کر کے دیکھنے والوں کو مضطرب بنا سکتا ہے مگر محبت کے اُن غیر مرئی احساسات کو ظاہر نہیں کرسکتا جو عاشق کے سیماب وش دِل پر بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ عام مصورانہ محاکات کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُس کی مکمل کیفیت نظروں کے سامنے آجائے مثلاً ایک حسین ورعنا نوجوان کی تصویر بنانی ہو تو ریعانِ شباب کی تمام کیفیات کا اس کے چہرے سے عیاں ہونا ضروری ہے تاکہ کوئی جمالیاتی پہلو نظروں سے اُوجھل نہ ہونے پائے یا اگر وادی و کوہ کی منظر کشی مقصود ہو تو شوکت و دل فریبی کے تمام موثر مناظر کا تصویری خاکہ سے ظاہر ہونا ضروری ہے لیکن ادبی مصور محاکاتی جزئیات وکیفیات کے احاطہ کے ساتھ اپنے حُسنِ مصوری کی مدد سے اُن میں جمال وجلال کی ایسی متوازن رنگ آمیزی کرتا ہے کہ مصور کی رنگ آمیزی اُس کے سامنے پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ عام مصور اور مجسمہ ساز کے لیئے کمالِ مصوری لازمی

چیز ہے یعنی تصویر اپنی تمام سرگذشت خود اپنے خطوط ونقوش سے ظاہر کرے اور اسی کے ساتھ اس کے نقوش وخطوط میں اُس اثری کیفیت کی نمائش بھی ضروری ہے جس سے خود مصور کا دل ابتدا میں متاثر ہوا تھا تاکہ مشاہد اور مصور ایک ہی صہبائے اثر کی کیفیت میں سرخوش اور ایک ہی رنگِ اثر میں رنگ جائیں اور تصویر کی صورت ترتیب کے وقت مصور کی قوتِ متخیلہ میں جو محاکاتی جزئیات مرتب ہوئے تھے وہ تمام جزئیات کے ساتھ اسی ترتیب سے ناظر وشاہد کی نظروں کے سامنے آجائیں۔ مصور کا اپنے تصویری خاکے میں شانِ واقعیت واصلیت کا ظاہر کرنا بھی بہت ضروری ہے تاکہ ناظر وشاہد کے دل پر اثری کیفیت کی پوری طرح جلوہ گری ہوسکے۔ یعنی جن محرکات سے مصور کا احساس وادراک جاگا تھا اُن محرکات کی تمام کیفیات تصویری نقوش وخطوط سے عیاں ہوجائے۔ ان نقوش وخطوط کی نمائش مصور کے احساس کی پاکیزگی اور تاثر وانفعال کی صفائی پر منحصر ہے اگر مصور کے احساس وادراک میں ان کی کمی ہو گی تو تصویری خاکہ بھی اثری کیفیت سے عاری رہے گا۔ اسی طرح ادبی مصور کیلئے بھی جسدِ شعر میں تخلیقی محاسن کا پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ واقعہ کی تمام جزئیات سمٹ کر نظروں کے سامنے آجائیں۔ اگرچہ بظاہر ادبی اور عام مصور کی سرحدیں ایک دوسرے سے قریب نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں کمالِ مصوری اور حسن مصوری کے فرق کی بنا پر ایک دوسرے سے جُدا بھی ہیں، یعنی کمالِ مصوری دونوں میں شئے مشترک کے طور پر واقع ہے لیکن حسن مصوری صرف ادبی مصوری کے ساتھ مختص ہے اِس اعتبار سے ادبی مصوری میں عام مصوری کے مقابلہ میں دو خوبیاں پائی جاتی ہیں، ادبی مصور چونکہ تلمیذِ فطرت کہلاتا ہے، اس لیئے فطرت کے سربستہ رازوں کی گرہ کشائی میں عام مصور اس کا شریک و سہیم نہیں، حُسنِ مصوری کا زیادہ تر تعلق چونکہ جذبات کی انتہائی گہرائیوں اور غیر مرئی صورت سے ہے اس لیئے عام مصور کے تصویری نقوش حُسنِ مصوری سے یکسر خالی رہتے ہیں، علاوہ ازیں ادبی مصور عنوانِ فکر کے تمام جزئیات ومتعلقات کی تفصیل کا فلسفی کی طرح استقصا نہیں کرتا بلکہ اس کا کام الفاظ کے ذریعہ جذبات اور وارداتِ قلبیہ کی ترجمانی

در سروں کو تاثر پذیر بناتا ہے بلکہ بسا اوقات اس کا موضوع فکر
ی حقیقت ہوتا ہے جو کسی نوع سے الفاظ کی گراں باری کا متحمل
بتا۔ ایسے نازک موقعہ پر ادبی مصور کا کمالِ مصوری یہ ہے کہ
ظ کی نشست اور ترتیب کے ذریعہ ایسا اشارہ کرے کہ مخاطب
، کی قوتِ مدرکہ فی بطن الشاعر معانی و مفاہیم کی طرف خود بخود
جائے اور ادبی مصور کو معانی کی جو جلوہ گری اس میں نظر آتی
ں جلوۂ معانی، مخاطب و سامع کو بھی نظر آنے لگے ؎

اُس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں بہار آئی

ہر کمال میں حُسن کی جلوہ گری لازمی نہیں، لیکن حُسن کا ہر عُنوان
تِ کمال کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہے، مذکورہ شعر میں حُسنِ
ں کی جلوہ سامانیاں جس انداز میں موجود ہیں وہ محتاجِ تشریح نہیں
صوری کی حدود میں چونکہ کمالِ مصوری کا ہونا لازمی ہے اسلیئے
ے اشعار میں حُسنِ مصوری کے ساتھ کمالِ مصوری کی عُروسِ زیبا
لوہ آرا ہے ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجکو چھوڑ دیئے مُسکرا کے ہاتھ

دینا وہ اُن کا ساغرِ مئے یاد ہے نظامؔ
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

ں اشعار کے مصرعہائے ثانی میں جس کیفیت کی مصوری کی گئی
وہ بظاہر کیفیت مادّی کی حُسنِ مصوری ہے لیکن محبوب کی انفعالی
بت کو جس دلفریبی کے ساتھ مصور و منتقل کیا گیا ہے وہ مادّی
ت سے کہیں بلند ہے۔

عام اور ادبی مصوری کے طریقہ اثر اندازی میں بھی نُمایاں
ہے، نقاش و مصور قوتِ باصرہ کے احساس کے واسطے سے ناظر و
م کو اپنے تصویری نقوش و خطوط کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ادبی
ر شعری معنویت کو موسیقیت کی نشہ آور لہروں میں جذب کرکے
تِ سامعہ کے ذریعہ سامع اور مخاطب کی جانب منتقل کرتا ہے
قوتِ متخیلہ اس کیف و تواجد کی غیر مرئی حالت کو تشکیل و تجسیم

کرکے نگاہوں کے سامنے پیش کردیتی ہے۔ اگر ادبی مصور
اپنی شعری تصویر میں اسرار و معارف کے نکات بھی حُسنِ مصوری کے
ذریعہ نمایاں کردے تو شعری تصویر کی قوت اثری اس حسین و جمیل
کائنات کی غیر ذی رُوح اشیا میں بھی رُوحِ انبساط دوڑا دے گی
یا یُوں سمجھیئے کہ اس کی طاقت اثری جمادات کے جسم میں رُوحِ حیات
ہی نہیں بلکہ قوتِ نمُو پیدا کردے گی۔

ادبی مصور کی اس منزل تک اگر عام مصور کی رسائی کو
ممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے بعد اسرار و معارف
کے بزمِ تجلّی کی وہ غیر مرئی سرحد شروع ہو جاتی ہے جہاں مصور و نقاش
کے طائرِ تخیل کی پرواز ممکن نہیں؛ بلکہ وہ خود پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

لیکن ادبی مصور تخیل کی مدد سے اس بزمِ تجلّی کی غیر مرئی حُدود
میں پہنچ جاتا ہے اور اس تجلّی کدۂ لاحدود کے رازوں کا انکشاف
اس انداز سے کرتا ہے کہ بزمِ وحدت کی تجلّی کی پُوری تصویر نظروں
کے سامنے آجاتی ہے اور اس مرحلہ پر پہونچ کر شعری مصوری کی ،
اثر انگیزیاں سحرِ سامری نہیں اعجازِ موسوی بن جاتی ہیں۔

ادبی مصور کو اسرارِ حکمت اور رموزِ فطرت کی مصوری کے
لیئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ بصر
اتنی باریک ہونی چاہیئے کہ وہ باریک تر نکتہ ہائے حقائق تک بہ آسانی
پہونچ سکے اور اس کی قوتِ حسیہ کا بھی اتنا لطیف و پاکیزہ ہونا
ضروری ہے کہ وہ فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ یا حقائقِ
غیر مادّی تک رسائی حاصل کرسکے اور ان دونوں قوتوں کی تکمیل کے
بعد اس کی قوتِ بیانیہ کا بھی اتنا تہذیب ہونا لازمی ہے کہ
اس کے بیان کردہ حقائق کی تصویر، صورتِ تجسیم میں نظروں کے
سامنے آجائے، اسی بنا پر ادبی مصور کو اپنی تصویر کشی میں حسنِ مصوری
کی شان پیدا کرنے کے لیئے مختلف اُمور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اوّلاً اس کا محاکاتی انداز اس قدر صاف اور روشن ہو کہ واقعہ
کی پوری کیفیت منظرِ عام پر آجائے۔

دوم، دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو جُوں کا توں بیان کرنے کے ساتھ ان کی تصویر کشی میں جدّت اور تنوع ہو، اور فرسودہ طرزِ نگارش سے اجتناب بھی، نہ انہی جذبات کی مصوری کی جائے جن میں بجائے خود دل کشی ہو، اور طبائع انسانی کو اس طرزِ نگارش سے مناسبت بھی۔

سوم، افکار و خیالات، طرزِ بیان اور اسلوبِ نگارش میں ہم آہنگی بھی ہونی چاہیے تاکہ اُن کی یک جائی سامع کے دل میں زیادہ گہرا نقش قائم رکھ سکے ورنہ ادبی مصور کی تمام تر مساعی اُس عام مصور کے مُشابہ ہو جائے گی جو ایک مسرّت انگیز تصویر بنانے میں مصروف ہو لیکن پریشانیٔ خاطر کے باعث تصویر کے چہرہ پر حسرت و یاس کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ مثلاً جزیرۂ سسلی جس پر برسوں اسلامی پرچم لہراتا رہا۔ ادبی مصور کی جب اُس پر نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پہ جو کچھ گزرتی ہے اس کے اظہار کے لیئے وہ ایسے الفاظ اور ایسا اسلوبِ بیان اختیار کرتا ہے کہ المیہ حقیقت کی پُوری عکاسی ہو جاتی ہے ؎

روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خُوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

اس المیہ منظر کے مشاہدہ سے ادبی مصور کے غم ناک دل پر جو ٹھیس لگی، اس کے اظہار کے لیئے اس جزیرہ کو تہذیبِ حجازی کا مزار کہہ کر خیالات و جذبات اور اسلوبِ بیان میں ہم آہنگی کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

چہارم، اس کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہونی چاہیئے یعنی الفاظ سے چاشنی آمیز شیرینیت ٹپکتی ہو ؎

عارضِ رنگیں پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا
ان گُلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

پنجم، محاورات میں صداقت اور اسلوبِ بیان جاذبیت و دل کشی کے سامان موجود ہوں اور حقائق کی مصوری ایسے موثر اور لطیف پیرایہ میں ہو کہ ان کی اصل صورت نظروں کے سامنے آجائے اگر ادبی مصور اپنی تصویر کشی میں مذکورہ رعایتوں کو اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تو یقیناً اس کی تصویر دھندلی اور اس کا رنگ بے رنگ ہو جائے گا ؎

جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

مصرعۂ ثانی نے تصویری خاکے میں جو رنگ بھرا ہے اس سے شبِ غم کی الم کی پُورے طور پر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

▲

علامہ آرزو لکھنوی مرحوم

"خالص اُردو غزل"

کچھ میں نے کہی ہے نہ ابھی اس نے سُنی ہے
چِتون ہے کہ تلوار لیے سر پہ کھڑی ہے
آنے کو ہے کوئی جو للک پھر سے ہوئی ہے
ڈوبے ہوئے سورج کی کرن پھوٹ رہی ہے
ہے پگھلی ہوئی آگ کہ جلتے ہوئے آنسو!
لوکا وہیں اُٹھا ہے، جہاں بوند پڑی ہے
جب سُکھ نہیں جینے میں تو اِک روگ ہے جینا
سانس آئی ہے جب، چوٹ کلیجے میں لگی ہے
کل کب کہے دیکھیں وہ بدلتی ہوئی چتون
سو آسرے ٹوٹے ہیں تو اِک آس بندھی ہے
کہنے کو تو آتی ہے اُنھیں ہاں بھی، نہیں بھی
ہو جس پہ بھروسہ نہ وہی ہے نہ یہی ہے
اُبھرے ہوئے چھالے میں ہے رکا ہوا آنسو
بس بُجھ چکی یہ آگ کہ پانی سے لگی ہے
کب تک یہ الگ رنگ، الگ ڈھنگ، الگ نام
پھر ہم ہیں وہی، تم ہو وہی، بات وہی ہے
پھر آرزو آنے کے لیے رات اندھیری
جاتے ہوئے دن ہی سے پتا پوچھ رہی ہے

عطیہ:
مجرم محمود آبادی

(ضمیمہ)

شفا گوالیاری

○

رہِ حیات میں وہ بھی مقام آئے ہیں
سحر کے لمحے بھی ہمرنگِ شام آئے ہیں

بغیر اشک بھی رونا پڑا کبھی ہم کو
ہماری آنکھوں کو یوں بھی پیام آئے ہیں

کچھ ایسے گل بھی تھے باقی بفیضِ زندہ دلی
خزاں کے وقت جو گلشن کے کام آئے ہیں

تہوں میں جن کی بھڑکتے تھے خون کے شعلے
ہمارے سامنے ایسے بھی جام آئے ہیں

مرے لیے وہی آنسو ہیں تابدارِ حیات
جو اُن کے رنگِ تبسم کے کام آئے ہیں

بتا سکیں گے وہی حالِ نظمِ مے خانہ
جو تشنہ کام گئے، تشنہ کام آئے ہیں

نگاہِ گردشِ دوراں بھی رک گئی ہے شفاؔ
کبھی سنبھل کے جو گردش میں جام آئے ہیں

▲

آثم خیرآبادی

○

دل میں دل کی لگی کے تاؤ نہیں
عشق کے سوز سے لگاؤ نہیں

زندگی کا مزہ وہ کیا جانے؟
جس کے سینے میں کوئی گھاؤ نہیں

نہ جنوں کی بھی جس میں حد ہو پاس
اُس خرد سے ہمیں لگاؤ نہیں

ایک ادنیٰ نظر بڑی قیمت
کوئی جنسِ وفا کا بھاؤ نہیں

عشق ہے اور حسن کے انداز
کون خاطر نہیں، لبھاؤ نہیں

حق نہ کیوں سمجھیں واعظو ہم اسے
تلخ سے بھی تمہیں بتاؤ نہیں

عشق ہے وہ کیسی سیدھی راہ
پھیر جس میں نہیں گھماؤ نہیں

دونوں عالم حقیر پیمانہ
مے ہے یہ مے کا کوئی بھاؤ نہیں

بے تکلف ہم ہیں رند، مگر
کون سا ہے جو رکھ رکھاؤ نہیں

آج تخریب کا زمانہ ہے
کسی تعمیر میں بناؤ نہیں

آمد و شد نفس کی کہتی ہے
کس کو در پیش چل چلاؤ نہیں

ہیں یہاں ایک آثم امیر و فقیر
کچھ محبت میں بھید بھاؤ نہیں

▲

شاذ تمکنت

کہیں بیٹھوں کہیں بہل جاؤں
کیا کروں کس طرف نکل جاؤں

وقت بدلا زمانہ بدلا ہے
ہائے میں کس طرح بدل جاؤں

اے نشیب و فرازِ راہِ وفا
تو بتا، گر پڑوں سنبھل جاؤں

کیسے کیسے کھلونے ٹوٹ گئے
جن کو دیکھوں تو پھر مچل جاؤں

میں کہ ہوں رازِ آتشیں بکنار
منہ سے بولوں اگر تو جل جاؤں

دشتِ غربت اگر سہارا دے
بخدا شاذ سر کے بل جاؤں

مصحف اقبال توصیفی

موم ہوں کس طرح پگھل جاؤں
کیسے اس قید سے نکل جاؤں

جیسے ہر سانس میں تجھے ڈھونڈوں
ایک پل آؤں، ایک پل جاؤں

اب نہ آؤں کسی کی باتوں میں
اب اگر وقت ہوں سنبھل جاؤں

ننھی سشیا کو ٹافیاں دے کر
میں ترے ذکر سے بہل جاؤں

بند دکان، آئینے، گڑیا
میرا بچپن، وہ ضد، مچل جاؤں

نام تیرا، ترا سراپا ہے
اپنے ہونٹوں سے میں نہ جل جاؤں

اختر نظمی

★

○

زندگی کی ہے یوں بسر تنہا
جیسے صحرا میں اک شجر تنہا

اک دوراہے پہ قافلے والے
بڑھ گئے مجھ کو چھوڑ کر تنہا

بجھ گئے روشنی کے مینارے
رہ گئی ہے مری نظر تنہا

بڑھ گئے فاصلے تمنا کے
وہ اُدھر اور ہم اِدھر تنہا

میرا سایہ بھی میرے ساتھ نہیں
ہو گیا ہوں میں کس قدر تنہا

ایک موہوم سی تمنا میں
رات کاٹی ہے جاگ کر تنہا

انجمن انجمن نگاہ گئی
ہر جگہ دل رہا مگر تنہا

یوں گزرتے ہیں روز و شب نظمی
شام تنہا ہے اور سحر تنہا

تاباں یوسفی

★

○

ہر زہر پیا ہنس کر اے ننگِ وفا ہم نے
سر آنکھوں پہ رکھا ہے ہر سنگِ جفا ہم نے

تسکینِ دل و جاں کے نکلے ہیں وہی دشمن
جن زہرہ جمالوں کو چاہا تھا سوا ہم نے

دل اور ہوا غمگیں، ناکامِ طلب ہو کر
دیکھا ہے اثر تیرا اے دستِ دعا ہم نے

دل ہی کی رہی دل میں تم سامنے جب آئے
کچھ بھی نہ سنا تم نے، کچھ بھی نہ کہا ہم نے

کچھ اور ستایا ہے آلامِ زمانہ نے
جب بھی کبھی مانگی ہے مرنے کی دعا ہم نے

اک طرفہ تماشا تھی اس بت کی توجہ بھی
دیکھا ہے سرِ محفل اک حشر بپا ہم نے

آوارہ و رسوا ہیں اس کوئے ملامت میں
دن ہم نے گزارے ہیں بشکلِ گدا ہم نے

دم توڑ چکا شاید بیمارِ تپِ ہجراں
دیکھی ہے فغاں برلب ہر موجِ صبا ہم نے

ہے چاک قبا گل کی، ہر غنچہ ہے لب بستہ
وحشت کا یہ عالم تو دیکھا نہ سنا ہم نے

ہے عجزِ نظر اپنا یا فکر ہے خام اپنا
کم دیکھے ہیں دنیا میں اربابِ وفا ہم نے

ٹوٹا نہ کسی صورت، ماحول کا سناٹا
بیکار لگائی ہے صحرا میں صدا ہم نے

جو عظمتِ انساں کو سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے
دیکھے ہیں بہت ایسے پتھر کے خدا ہم نے

اے تاباں خبر کس کو، کیا عالمِ وحشت ہو؟؟
دیکھا تھا سرِ صحرا اک آبلہ پا ہم نے

٭

آئی ہے گلستاں میں تو آنے دو خزاں اور
ملتے ہیں اسی رُخ سے بہاروں کے نشاں اور
ہے طرزِ فغاں سوئے ادب ان کی نظر میں
اے قلبِ پریشاں کوئی اندازِ بیاں اور
تاریک نہ تھیں اتنی بھی گلشن کی ہوائیں
بے نور چراغوں نے اٹھایا ہے دھواں اور
شاید کہ یہ ہو طنز مرے قلبِ حزیں پر
ملتی ہیں نگاہیں بھی تو ہوتا ہے گماں اور
اے وقت کی ناپاک سیاست ترے ہاتھوں
لٹنا ہیں ابھی کتنے غریبوں کے مکاں اور
اس درجہ تغافل کا سبب ہے یہی معراج
وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ جائے گا کہاں اور

معراج لکھنوی

جوہر صدیقی

غم ناشناس بھی ہے وہ نامہرباں بھی ہے
اے دل مگر بتا تجھے تابِ فغاں بھی ہے؟
وہ انجمن دوام ہے ہر سانس کو جہاں
[illegible] رنجِ جاں بھی ہے
[illegible] چمن کی حیات
اور بوئے گل دماغِ چمن پر گراں بھی ہے
اے گلستاں نصیب تو سب کچھ سہی مگر
آئینہ دارِ جلوہ کوئی خاک داں بھی ہے
شاید ابھی جنونِ تمنا ہے ناتمام
وہ سعی کامیاب [illegible]
ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں
[illegible] بھی ہے

ساقی قریشی

⭘

رَواتھی عہدِ خزاں میں جو فتنہ سامانی
بہار میں بھی ہے قائم وہی ستم رانی

مجھے یہ ڈر ہے کہ تہذیب مرنہ جائے کہیں
اگر یُونہی رہے آدم کے خوں کی ارزانی

لُٹی ہے جن کے اشاروں پہ آبروئے بہار
وہ کر رہے ہیں گلستاں کی پھر نگہبانی

یہ اِلتفاتِ فراواں بجا سہی، لیکن
خدا کرے کہ نہ بڑھ جائے دِل کی ویرانی

نگاہِ ساقی میں اب جن کا احترام نہیں
وہی تو رِند ہیں اِس انقلاب کے بانی

دِلوں میں جن کے ہے احساسِ عظمتِ آدم
اُنہی کے واسطے آسان ہے جہاں بانی

بنا کر اپنا نشیمن ہے پُرسکوں لیکن
چمن پہ چھائی ہوئی ہے عجب ہراسانی

[illegible] ساقی

وقار خلیل

⭘

وَفا کہ جنسِ گراں ہے چلے چلو چُپ چاپ
جہانِ شیشہ گراں ہے چلے چلو چُپ چاپ

"رَوِش رَوِش ہے وہی اِنتظار کا عالم"
ہجومِ تشنہ لباں ہے چلے چلو چُپ چاپ

سَحر تو خیمۂ شب سے پرے ہے چند قدم
بس ایک رات گراں ہے چلے چلو چُپ چاپ

اَزل سے قافلۂ صُبح ہے رَواں اب تک
اَبد کی شام کہاں ہے چلے چلو چُپ چاپ

قدم قدم کوئی آواز دے رہا ہے سُنو!
نفس نفس نگراں ہے چلے چلو چُپ چاپ

بڑے جتن سے اُجالوں کے خواب دیکھے تھے
سَحر پہ شب کا گماں ہے چلے چلو چُپ چاپ

جُنوں کو تابعِ مُہمل بنائیے گا وقارؔ
خرد بھی مرثیہ خواں ہے چلے چلو چُپ چاپ

▲

گربچن چندن

انتقام

اشوک نے اس کی طرف پیٹھ موڑلی اور پورنیما کی رات کو کملا کے بستر پر اندھیرا ہوگیا۔ ابھی شام تک ان دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا جس کے دوران میں کملا نے اشوک کو بے نقط سنائی تھیں لیکن بعد میں اُسے گم سم دیکھ کر وہ کچھ سہم سی گئی اور اپنے کہنے سننے کی معافی مانگ لی تھی۔

اشوک جب رات کی سیر سے واپس آیا تو کملا کھلے بالوں پر ربن باندھے سفید ریشمی بلاؤز اور ہلکا سلیٹی پیٹی کوٹ پہنے صاف ستھرے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ جوں ہی اشوک کچھ گنگناتا ہوا داخل ہوا، کملا نے اُسے کلائی سے تھام کر پاس بٹھا لیا۔

"یہ بلاؤز دیکھا تم نے" کملا نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا

"ہوں" اشوک نے ناگواری سے ہنکارا بھر دیا۔

"یہ اُس ساٹن کا ہے جو میری ماں نے پچھلے ہفتہ بھیجی تھی۔"

"ہوں"

"کتنی پیاری چاندنی ہے" کملا نے اس کے دل میں اُترنے کی کوشش کی ــــ

"ہوں" اشوک کے لہجے میں وہی بے دلی تھی۔

"ایسے وقت میں تمہیں گھر سے باہر جانے کی سوجھتی ہے؟"

"جی ہاں! یہ میرے لئے ضروری ہے"

"کیا ضروری ہے"؟

"رات کی سیر"

"صبح سیر۔ شام کی سیر، رات کو سیر۔ یہ ہر وقت گھومتے رہنے سے کیا ملتا ہے؟"

"خیالوں کی کلیاں۔ یادوں کی تصویریں۔ سپنوں کی بہاریں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نہیں سمجھ سکتی۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں کہ تمہارے خیالوں میں کون ہے، یادوں میں کون ہے، سپنوں میں کون ہے؟"

"تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں کوئی کاٹھ کی جینس نہیں ہوں۔ مجھے بھی بھگوان نے دماغ دیا ہے ــــ"

"میں نے کب انکار کیا ہے؟"

"پر تم سمجھتے تو یہی ہو کہ میں تمہاری باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔"

"لیکن میں بھی تمہاری کتنی باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً گھریلو مسئلے اور امور خانہ داری"

"وہ تو تم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے"

"تمہارے ہوتے مجھے فرصت بھی نہیں"

"بہت اچھے۔ یہ بھی خوب رہی بات ــــ"

اشوک اُس کی طرف دیکھ کر تلخی سے مسکرایا۔

"کتنی اچھی رات ہے" اور کملا نے اُسے بازو سے کھینچ لیا۔

اشوک ایک ہمیل پلے کی طرح اس کے ساتھ لپٹ گیا۔

چاند پورے شباب پر تھا۔ فضا نور سے نکھری جارہی تھی اور اس ماحول میں کملا اپنے نا تمام پیاس میں اس کی آغوش میں ایک سوالی پیسنر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کی آنچ سے اشوک کے مسدود جذبات آنکھیں کھولنے لگے اور دن بھر سے منڈلانے والے سایے ذہن سے ہٹنے لگے۔

اس نے کملا کے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں اور پھر دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کے پورے چہرے کو ساغر کی طرح تھام لیا۔

کملا خمار بھری آنکھوں سے اُسے تاکتی رہی۔

اشوک ساغر کے رنگ سے مسرور ہونے لگا اور پھر ساغر کو قریب لے آیا۔

کملا فرطِ مستی سے چھلک پڑی۔

" اب بتاؤ تمہارے خیالوں میں کون ہے ؟ یادوں میں کون ہے ؟ سپنوں میں کون ہے ؟ "

اشوک کے ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا اور وہ پتھر کی طرح ٹیکنے پر جاگرا۔ اس نے ایک نظر گھورتے ہوئے ساغر پر ڈالی اور پھر اس سے منہ موڑ لیا۔ اس کے بھڑکے ہوئے جذبات بجھ گئے اور وہ بجھے ہوئے کوئلے کی طرح ماند پڑ گیا۔

سہمی ہوئی کملا نے اس کی وحشت بھری آنکھوں میں دیکھا اور اس کی نبض اور سینہ کو ٹٹول ٹٹول کر سانس کی آمد و رفت بھانپنے لگی۔

" میں زندہ ہوں " اشوک نے اسے پرے کرتے ہوئے کہا اور اس کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ وہ کچھ دیر تک پیٹھ کئے پڑا رہا اور پھر رنگ و بو کی قربت بھی برداشت نہ کر سکا۔ صاف ستھرے بستر پر پھیلنے والی چاندنی اسے جو ماسے کی دھوپ کی طرح چبھنے لگی اور کملا کی کایا کا ہر لمس بُری طرح کاٹنے لگا۔

وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے بستر پر جاکر لیٹ گیا۔

چاند آسمان کے عین وسط میں تھا اور سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ آنکھیں ذہن سے پرے ہونے کے باوجود ذہن کے کرب کو آشکار کر رہی تھیں۔

یہ کرب دن بھر سے وہاں رکا ہوا تھا اور ایک پیمانے ملاقاتی کی طرح دراز ہوا جارہا تھا۔

دو دن پہلے میرا نے آج اسے ایک پک نک میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی اور اس پک نک میں اس کا خاوند رنجیت بھی شریک ہو رہا تھا۔ کملا نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس گھر کا کام کاج اتنا زیادہ تھا کہ وہ پک نک کے لئے وقت نہیں نکال سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ پک نک کو ایک فضول سی چیز سمجھتی تھی۔

اشوک کو میرا سے ایک خاص رغبت تھی۔ پڑوسیوں میں یہی ایک گھر تھا جس سے اس کا تعلق کچھ گہرا تھا ورنہ باقی سب سے صاحب سلامت ہی تھی۔ میرا اور رنجیت دونوں اشوک کے خلوص کے قائل تھے۔ اور کملا کے روکھے پن کے باوجود اکثر ان کے ہاں آجایا کرتے تھے۔

میرا موسیقی کی دلدادہ اور ایک بڑی خوش گلو عورت تھی۔ فلموں کے ہر مشہور ہلکے پھلکے گیت کو بڑی کامیابی سے ادا کرسکتی تھی۔ اس ملکہ کی بدولت وہ سماجی تقریبوں کی جان تھی۔ اس کے برعکس رنجیت شعریت سے بے نیاز ایک مرنجان مرنج آدمی تھا اور اسے ان تقریبوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا جن کا اہتمام میرا کے ذوق کی تسکین کا باعث تھا۔

ان تقریبوں میں میرا کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اشوک کے گیت سُنے اور سنائے اور اس لحاظ سے اس کے اور اشوک کے درمیان ایک ایسا اُنس پیدا ہو گیا تھا جس کا اظہار وقت کا پابند نہیں تھا۔ جب بھی اشوک نے نیا گیت لکھا، وہ اُسے سنانے کے لئے خود میرا کے گھر پہنچ گیا۔ کبھی میرا نے کسی نئے گیت کا سُر تیار کیا ہے تو وہ اشوک کے ہاں پہنچ گئی۔ اس میل جول کے بیچوں بیچ تبادلۂ خیال کا ایک ایسا سلسلہ جاری رہتا جو نظامِ زندگی لو انسانی مزاج کے ہر موضوع پر محیط ہوتا اور ایک بار جب یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو رنجیت کی موجودگی یا کملا کی آوازیں اسے توڑنے میں ناکام رہتیں۔

کملا کو بات چیت کے یہ سلسلے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اس کی نظر میں تو ان کی کوئی وقعت ہی نہ تھی۔ اور وہ انہیں محض تضیع اوقات سمجھتی تھی۔ رنجیت سے تو وہ کسی طرح برہم نہیں ہو سکتی تھی لیکن اشوک کو وہ اکثر آڑے ہاتھوں لیتی تھی۔

"ہر وقت بے سر و پیر کی باتوں میں وقت گنوانے سے کیا مطلب ہے"؟

"یہ ہر روز کی دل لگی تمھارے چال چلن کی تصویر ہے"

"تمھارے پاس چہل بازی کے لئے تو وقت ہے لیکن گھر میں دل چسپی لینے کے لئے نہیں ہے"؟

"تمہاری من مانیوں سے بچوں کی باگیں ڈھیلی ہو رہی ہیں"

"پرائی عورت سے اوٹ پٹانگ چلائے رکھنے کا کیا مقصد ہے"؟

لیکن اشوک ان سب کا ایک ہی جواب دیتا۔

"تم نہیں سمجھ سکتی"،

اور اس سے کملا کی خفگی اور بھڑک اٹھتی۔

چنانچہ آج صبح جب کملا نے پوچھا کہ اس فضول پک نک کا کیا فائدہ ہے؟ جو کچھ وہاں جا کر کھانا پینا ہے وہ گھر میں تیار کیا جا سکتا ہے" اور اشوک نے وہی مختصر سا جواب دیا کہ 'تم نہیں سمجھ سکتی'، تو کملا غصہ سے باؤلی ہو گئی۔ "میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ تم اس پک نک میں نہیں جا سکتے۔ وہاں سوائے گپ شپ اور چہل بازی کے کچھ نہیں ہوگا۔ یا پھر تم میرا کی خوشامد کے گیت اور وہ تمہاری کویتا کے گن گائے گی۔ یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ یہ شریفوں کے لچھن بھی نہیں کہ باہر کھلے میدان میں پرائی عورت سے دل لگی کی جائے"

"لیکن وہاں تو رنجیت اور دوسرے لوگ بھی ہوں گے۔ وہاں ایسی چیزیں کس طرح ہو سکتی ہیں جن پر تم شک کر رہی ہو۔"

"رنجیت بھی کوئی آدمی ہے۔ موم کی ناک کی طرح جدھر موڑو مڑ جاتا ہے اور دوسرے لوگ بھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ تبھی تو سب نے مل کر یہ پک نک رچائی ہے"،

"تمھاری نظر میں سب کے سب خراب ہیں؟ تم تو ہنسنے کھیلنے کو، جو روح کی غذا ہے، پاپ سمجھتی ہو۔"

"ہنسنا کھیلنا کیا گھر میں نہیں ہو سکتا؟ پرائی عورت سے ہنسنا کھیلنا ضرور پاپ ہے"

"تم نہیں سمجھ سکتی۔ جاؤ ناشتہ تیار کرو"،

"میں نہیں سمجھ سکتی، کیوں کہ میں بچی ہوں! ناسمجھ ہوں! تم سمجھ سکتے ہو کیوں کہ تم مرد ہو۔ موجی ہو۔ شادی سے پہلے تو تم نے جو کچھ کیا اس سے مجھے کوئی شکایت نہیں لیکن شادی کے بعد بھی تمھارا یہ گھر گھر کی خاک سونگھنا مجھے قطعی پسند نہیں۔ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ میں اپنے گھر میں یہ ناٹک نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمھاری بیوی ہوں، اس گھر کی مالکن ہوں، مجھے حق ہے کہ میں تمہیں برائیوں سے روکوں۔"

"کملا، تم خواہ مخواہ بگڑ رہی ہو، ایک معمولی سے من بہلاوے پر آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ آج کی دنیا میں زندگی کے نظریئے اور طریقے بہت بدل گئے ہیں۔ آج پرائی عورت ہوا نہیں اور نہ ہی چال چلن بگاڑنے والی دیشیا وہ تیری اور میری طرح ایک فرد ہے۔ سماج کا حصہ ہے اور سماج کو بنانا ہم سب کا فرض ہے اچھے اور کام آنے والے سماج سے ہی اچھی اور کام آنے والی زندگی بن سکتی ہے۔ گھر زندگی کے لئے بہت اہم اور ضروری ہے لیکن صرف گھر ہی سے ساری زندگی نہیں بن سکتی ہے۔ اسے بنانے میں سماج کو بھی ساتھ لینا چاہیئے۔ سماج سے اپنے ہم مزاجوں کو چننا چاہیئے اور ان سے مل جل کر زندگی کی صلاحیتوں کی پرورش کرنی چاہیئے۔"

"یہ تمھاری وہی اول جلول باتیں ہیں، بہانے ہیں، چالیں ہیں، اپنا الو سیدھا کرنے کی"

"اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔"

"میں اس لئے نہیں سمجھ سکتی کہ تمہیں من مانیوں سے روکتی ہوں۔ تم اس لئے سیانے ہو کہ پکی پکائی ملتی ہے اور گھر کی کوئی فکر نہیں۔ سویرے آؤ، اندھیرے آؤ، دستر خوان بچھا ہوا ملتا ہے۔ اکیلے آؤ، اکٹھے آؤ، لونڈی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ لیکن دھیان سے سن لو کہ یہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا اور اگر آج تم پکنک پہ گئے تو شام سے مجھے گھر کی کوئی فکر نہیں ہوگی۔ خود ہی لاؤ۔ خود ہی پکاؤ اور خود ہی ہم سب کو کھلاؤ۔ آج تک میں گھر چلاتی رہی ہوں۔ اب کچھ دیر تم بھی کام کر کے دکھاؤ۔ آخر یہ گھر میرا ہی تو نہیں ہے!"

"کملا یہ سب بے جوڑ باتیں ہیں۔ میرا فرض گھر بنانا ہے، تمہارا فرض گھر چلانا، میں اپنا کام کر رہا ہوں۔ تم اپنا کام کئے جاؤ۔"

"تم اپنا فرض نہیں کر رہے ہو۔ ہاں ایک تنخواہ ضرور لاتے ہو لیکن وہ تو نوکری لگی ہوئی ہے۔ اس میں اب کون سی روز روز مشکل مشقت پڑتی ہے۔ ادھر میں ہوں کہ روز نیا کام، روز نیا جھمیلا، روز نیا غم ہے"

"یہی تمھاری سوجھ بوجھ ہے نا؟ یا اسکول شوہر کے کام کی بے قدری سے گھر سکھی نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں گھر تو سکھی ہو سکتا ہے گھر سے باہر ہو کر۔ اپنے بچوں اور بیوی سے بے خبر ہو کر گیتوں کی سہانی سجاکر۔ ٹھیک ہے نا؟"

اشوک نے کوئی جواب نہ دیا۔

"گھر سکھی ہو سکتا ہے ٹھنڈے محول کے نئے سامان سجاکر۔ میرا سے پیار بڑھاکر اور آشنائی کے نئے گھر بناکر۔"

"اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو میں آج پک نک پر نہیں جاؤں گا۔"

اشوک نے جھنجھلاہٹ سے جواب دیا۔ اس کے دل میں جیسے ہزاروں خنجر اتر گئے۔

پچھلے پہر میرا اس کے ہاں آئی اور اس کے پک نک میں نہ پہنچنے کی سخت شکایت کی۔ "آپ نے تو ہمیں بہت مایوس کیا۔ میں نے کیا کیا سوچ رکھا تھا پر وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔ موسم اتنا اچھا تھا کہ میں شام بھر گیت سناتی رہتی۔ جانے آپ نے کیسے نہ آنے کا حوصلہ کیا!"

اشوک اس کی شکایت کو خندہ پیشانی سے سنتا رہا اور کسی آئندہ پروگرام میں شریک ہونے کی دلیل دے کر اپنی خفت چھپاتا رہا۔

آئندہ پروگرام میں شریک ہونے کے وعدہ پر بھی وہ خود بھی سوچنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہوگا؟ کیا کملا مجھے سمجھ سکے گی؟ کیا میں اس کا مزاج بدل سکوں گا؟ چاند برابر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ آنکھیں جو ذہن کے کرب کو اور بھی زیادہ عریاں کر رہی تھیں۔ اسے ایسے محسوس ہوا کہ یہ کرب اس کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے اور اس کی ایک ایک سانس میں بس رہا ہو۔ میرا کی شکایت کا ایک ایک لفظ اس کے دل و جگر میں اترا جا رہا تھا۔ اس کی روح کے تاروں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ "میں کتنا کم ہمت ہوں۔ محض بیوی کی خوشنودی کے لئے ایک بے حد غلط فیصلہ کر لیا۔ کملا تو روز ہی کسی نہ کسی بات پر خفا ہو جاتی ہے۔ اس کا تو مزاج ہی ایسا ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے میرا کو مایوس کیا۔ وہ مجھے اس کے لئے کبھی معاف نہ کرے گی۔" اور اس خیال سے اس کا دم خشک ہونے لگا۔ وہ میرا کی خفگی کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس سے تعلقات قطع ہو جانے کا ڈر تھا۔ وہ تعلقات جنھوں نے اس کے خیالوں اور خوابوں میں میٹھا مہین رس گھول دیا تھا۔ اس کے گیتوں میں مستی انڈیل دی تھی اور اس کی سانسوں میں حلاوتیں بھر دی تھیں۔ کملا کے سبب ان تعلقات کو کوئی ضعف پہنچنے کے تصور سے اسے کملا سے نفرت ہونے لگی تھی اور اس کے تحت شعور میں وہ ایک ناگن بن کر ابھر آتی تھی۔ گاؤں کی ایک خود سر تند خو اور منہ زور عورت جو اپنے زعم میں ہر طرف دراتی پھرتی ہو جسے باغ حیات میں صرف کانٹے اور خار و خس ہی نظر آتے ہوں۔ جسے زندگی کے حسن جمال اور لوچ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جس نے اپنے خار صفت اصولوں سے زندگی کو کانٹوں بھری سیج بنا دیا ہو۔ اس کی ننھی ننھی خوشیوں کو پامال کر دیا ہو۔ اور اس کے ورق ورق پر زہر کا ٹیکہ لگا دیا ہو۔ وہ چپکے چپکے اس سے بھاگ جانے کی سوچنے لگتا تھا۔

میرا سے تعلقات کا کوئی واضح تصور اس کے پاس نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں کملا سے جھگڑا ہو جانے کی صورت میں وہ دونوں میں موازنہ کرنے لگتا اور من ہی من میں کملا کو میرا کے گوناگوں اوصاف گنوانے لگتا۔ جب کملا نہ مانتی اور اپنی بات پر اڑی رہتی تو وہ اسے دھمکی دیتا کہ وہ اسے چھوڑ کر میرا کے پاس چلا جائے گا اور اسے دکھا دے گا کہ وہ کیسی کامیاب زندگی کا سامان کر سکتا ہے مگر اسی لمحہ اسے رنجیت کا خیال آتا اور وہ اپنی حماقت پر نادم ہو جاتا۔ لیکن میرا کے حسنِ سلوک کا وہ دل و جان سے قائل تھا اور اس کی اداؤں کی بے پناہ زبانی کی تاب ہی نہیں لا سکتا تھا۔ وہ کئی بار اپنی شائستگی کے صدقے اس پر نچھاور ہو گئی تھی۔ ایک بار جب اس کی سالگرہ میں خوش رنگیاں ہو رہی تھیں تو اس نے کتنی رجائیت سے کہا تھا "اشوک صاحب! آپ کی ہر سالگرہ پیغام شباب ہو۔" اور ایک بار جب رنجیت ایک طے شدہ پروگرام میں شامل نہیں ہوا تھا تو اس نے کس بے باکی سے کہا تھا "آپ کے ساتھ چھوڑ کر نہ جانے کیوں مجھ سے بے فکر ہو جاتا ہے!" اور ایک بار جب وہ بیاگ اس کے ہاں بھول آیا تھا تو اس نے اسے واپس لوٹاتے ہوئے کتنی پیاری بات کہی تھی "یہ آپ کی بھولنے کی عادت کبھی ہمیں ہی نہ بھلا دے۔" آج بھی اس کی شکایت میں کتنے حسین امکانات پوشیدہ تھے۔ "میں نے کیا کیا سوچ رکھا تھا پر وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔" کتنا فسوں ساز

رتھا کتنی تصورات اور تخیلات کا گلدستہ بن کر آئی تھی اور یہ نفس نفیس
لی نذر ہو جانا چاہتی تھی کس قدر لطیف کس قدر حسین، کس قدر جمیل موقع تھا
کے جسم میں ایک زبردست سنسنی دوڑ گئی۔ انگ انگ میں ایک مستی مچل گئی۔
ب دھکڑ میں خلفشار ذہن میں ایک خیال اُبھرا اور سیماب کی مانند تھر کنے
تھرکتے تھرکتے یہ جذبہ بن گیا۔ جذبہ دماغ میں ٹہلنے لگا۔ دماغ کے
دل میں، دل کے بعد جگر میں اور جگر کے بعد ایک ایک عضو میں اترتا
یا اور پھر ہر عضو، ہر رگ و ریشہ میں جھن جھنانے لگا۔ شدت بڑھنے پا
تی۔ تمام وجود میں ایک اضطراب۔ ایک جنون۔ ایک ہیجان گردش کرنے
لگا۔ ایک جان لیوا ہیجان جس سے تحت شعور میں ایک ہل چل مچ گئی۔ جسم کا
ایک ایک حصہ بے قابو ہونے لگا اور وہ بستر پر پڑا ماہی بے آب کی طرح
تڑپنے لگا۔ اس نے چاہا کہ وہ اٹھ کر بھاگے اور سید عامر کے ہاں پہنچ
جائے، لیکن گہرائیوں میں پڑے ایک وزنی احساس نے اسے بتایا کہ وہ اپنی
جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ اس نے چاہا کہ وہ بلند آواز سے چیخے لیکن وزنی
احساس نے اس میں ایک ایسی گھٹن بھر دی تھی کہ اس کی قوت گویائی اس کا
ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ روئے لیکن آنکھیں وحشت
سے اس قدر پھٹ چکی تھیں کہ ان میں آنسو بھی نہیں اتر رہے تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی لیکن چاند برابر اس کی پھٹی
پھٹی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ چاندنی نے فضا میں ایک خنکی اور نمی سی
بھر دی تھی لیکن اس کے جسم میں ایک آتش فشاں کھول رہا تھا۔

میرا اپنی موہنی صورت سے اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس
کی ہیرے کی طرح چمکتی آنکھیں اور کنول کی طرح اُجلے ملتے ہوئے بانہوں کے
دلکش حلقے اس کے گرد ایک جال کی طرح پھیل گئے تھے اور وہ اس جال میں
بے طرح گرفتار ہوا جا رہا تھا۔

وہ اس کے خیال افروز جملوں کو بار بار دہرانے لگا جیسے.....
دل ہی دل میں نفس کی لذتیں سمیٹ رہا ہو۔ میرا اپنی موہنی صورت سے
برابر مسکرائے جا رہی تھی، مسکرائے جا رہی تھی اور اسے محسوس ہوا کہ وہ مسکراتی
ہوئی اس کے قریب آتی جا رہی ہے — اور قریب — قریب تر.......
اس نے دل کے حجرے کا دروازہ کھول دیا۔ آنکھوں کے دریچے وا کر دیئے۔
بازو پھیلا دیئے اور ہونٹوں کو ایک جوشیلی جنبش دی "آؤ"! اس چھوٹی
سی آواز نے چاندنی بھرے پُرسکون ماحول میں خلل ڈال دیا اور وہ چونک کر
دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

اس نے دیکھا کہ کملا دیبی پھاڑ پھاڑ کر اسے گھور رہی ہے آتنی
دیر بہکنے اور تلملانے کے بعد اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ کملا اس پر نگاہوں کا
پہرہ لگائے ہوئے ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا، اسے محسوس ہوا کہ یہ وہی ہے
جس نے اس سے ایک سنہری موقع چھین لیا۔ اس کے شعور میں احساس
محرومی کا زہر داخل کیا۔ اس کے تصورات کو غارت کیا۔ وہ بدمست نظروں
سے اسے گھورنے لگا لیکن وہ بھرپور غضب سے اسے تاک رہی تھی۔ ماتھے
پر شکن تھے۔ بھنویں کھنچی ہوئی تھیں۔ چہرہ دہک رہا تھا۔ اشوک سٹپٹا اٹھا
اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اس کے آشیاں کو جلانے چلا آ رہا ہو۔
وہ ایک بپھرے ہوئے کتے کی طرح اٹھا اور جا کر کملا سے لپٹ گیا

عوض سعید

منزل بہ منزل

"آہنگ" کے دفتر کی اونچی سہ منزلہ عمارت کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اسے آج تھکن کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوا۔ یوں بھی وہ روزانہ دیر ہی سے گھر جانے کا عادی تھا۔

لیکن آج ترجمے کی دردسری کے بعد جب وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اُترتا ہوا باہر آیا تو سرد ہوا کی بے شمار ننھی ننھی لہریں اس کے کمزور جسم سے الجھ گئیں۔ اس نے سردی سے محفوظ رہنے کے لئے کانوں پر دستی باندھ لی لیکن وہ اپنی پتلی سی اونچی ناک کو بچا نہ سکا۔ جو سردی کے باعث سکڑ کر گلیشیر کا ٹکڑا بن گئی تھی۔ سرد ہوا کی نرم اور سبک لہریں جب اس کے کمزور جسم سے مس ہوتیں تو اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی برف کے تودے کی طرح گھل کر پانی بن جائے گا۔

وہ ایک سائے کی طرح سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا لیکن اس طرح چلنے میں اسے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس کی اس لئے اب اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرنا شروع کر دیئے تھے۔

رات کافی ہو چکی تھی لیکن برقی قمقموں کا عکس عابد روڈ کے خوبصورت گالوں پر اب بھی رینگ رہا تھا، عابد روڈ کی ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک رکشا والا تیز تیز پیڈل مارتا ہوا سڑک سے گزر رہا تھا۔ جب وہ بشیر باغ پار کر کے "جان کمپنی" کے قریب آیا تو یکایک، گلی میں ایک نوجوان لڑکھڑاتا ہوا اس کے سامنے آگیا۔

"شیخ حیدر کیا بندوبست کر لیا ہے۔۔؟"

اور وہ جو شیخ حیدر نہیں تھا۔ کچھ کہنے سے بغیر آگے کو جھک گیا۔ وہ پھر آگے بڑھا۔

"شیخ حیدر تم کل ذرا سی بات پر روٹھ کر چلے گئے۔ یہ لو دو سو روپے۔ بس اب تو خوش ہو گئے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک چچا کے نزدیک اس کی اپنی خوبصورت بھتیجی کی قیمت دو سو روپے بہت کم ہے۔ عورت کا کوئی مول نہیں۔ میں ریشماں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ سن رہے ہو شیخ حیدر میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

وہ نشے میں دُھت تھا۔ اس کی بڑی بڑی نڈھال آنکھوں میں شراب کے سائے پرے کھینچ آئے تھے۔ اس لئے وہ اُسے پہچاننے میں دھوکہ

"معاف کیجئے گا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام شیخ حیدر نہیں۔"

وہ کسی گزرے ہوئے طوفان کے آخری بادل کی طرح لڑکھڑاتا ہوا [illegible] آیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں دیکھا، جیسے وہ شیخ حیدر کو پہچان [illegible]

"تم شیخ حیدر نہیں ہو!" اس نے تعجب سے الفاظ کھترتے ہوئے [illegible] "پھر شیخ حیدر کہاں ہے۔ اس کی خوبصورت بھتیجی کہاں ہے!"

اس نے اپنی لڑکھڑاتی زبان سے پے در پے اس پر سوالات کی [illegible] شروع کر دی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اس وقت وہ چاہتا تو بہ آسانی دو سو روپے مفت میں حاصل کر لیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی فطرت کے خلاف کام کرنے کا سخت مخالف تھا۔

گھر پہنچنے پر اس نے اس واقعہ کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ وہ بڑی دلچسپی اور حیرت سے اس کی ساری باتیں سنتی رہی۔ اس نے اپنی بیوی کے سامنے کانن ڈوائل کے کسی جاسوسی کردار کی طرح کچھ رک کر سر کو آہستہ جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے شرابی کے ہاں سے دو سو روپے نہیں لئے کیونکہ میں شیخ حیدر نہیں تھا۔"

وہ جھنجھلا گئی۔

"وہ انسان ہی کیا جو وقت سے فائدہ نہ اٹھائے! اچھا بھلا ایک موقع ہاتھ آگیا تھا اسے بھی آج آپ نے بے وقوفی سے کھو دیا۔ ذرا سی ہوشیاری کی ہوتی تو آج گھر کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔" وہ دیکھو منی سو کر آنکھیں سجائے سرہانے ہی سے سو گئی ہے۔ اسے آج چھپنے کی کتابیں [illegible]

چراغ کی دھیمی روشنی میں منی کا سانولا سلونا معصوم چہرہ بادل کے ٹکڑے میں چھپے ہوئے چاند کی طرح مدھم دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سر تکیے سے ہٹ کر نیچے آگیا تھا۔ اس نے منی کے قریب جا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور نہایت آہستگی سے اس کے سر کو اٹھا کر تکیہ پر رکھ دیا۔

"منی ہم اگلی تنخواہ پر نئی کتابیں ضرور خرید دیں گے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔"

"میری ننھی منی گڑیا۔ کہیں یہ تنگ مزاجی تمہارے چہرے کی معصومیت چرا نہ لے جائے۔ یہی کیا کچھ کم ہے کہ تمہارا سر پھرا باپ تمہیں ستر روپے تنخواہ میں بھی اسکول بھیج رہا ہے۔"

وہ منی کے چہرے کے قریب کھڑا ہوا یوں کہہ رہا تھا، جیسے وہ جاگ ہی تو رہی تھی۔

وہ منی کے بستر سے پلٹ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کی بیوی بان کے پلنگ پر بیٹھی چہرے کو اداس بنائے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے دیکھا اس کی آنکھوں کی جھیل میں ملامتی تیر رہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک اس بدنت کا ماتم کر رہی تھی کہ اس نے گھر آئی لچھمی سے کیوں منہ موڑا تھا۔

عورت بھی عجیب مخلوق ہے۔ اب یہی دیکھئے نا اس کی بیوی خواہ مخواہ اس سے ناراض ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے اس کے شوہر نے سہرا تار اس کی عزت پر [illegible] پلنگ پر لیٹے لیٹے سو گئی۔

[illegible]

اس کی آنکھوں کے سامنے چھ سال پہلے کی جیتی جاگتی زندگی گھوم گئی جب جلوہ وادی میں کلیوں کی سیج پر ایک نازک سی خوبصورت دوشیزہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس وقت اس نے زندگی کی پر پیچ راہوں میں شاعری کا رنگ بھر کر اس کی مرمریں باہوں میں رنگ کی خوبصورت پچکاریاں سی چھوڑی تھیں محبت کی ایک حسین قوس قزح اس کی آنکھوں کے سامنے چھلکنے لگی اور پھر یکایک آسمان کی نیلاہٹوں میں ڈوب گئی۔ اس وقت وہ ایک مقامی بنک میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ بات وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جس نے اس سے حسابات میں غلطی کروائی اور اس کی ذرا سی بھول ایک بڑے خسارے میں ظاہر ہوئی۔ ایک پینشن کال کرنے پر اس نے نوکری چھوڑ دی۔ اسی تاریخ کے بعد سے اس کی زندگی بے کیفی کے اس بے پایاں سمندر میں جا گری، جہاں اس کے قدم آج بھی پوری طرح نکلنے نہ پائے تھے۔

آج یادوں کے حسین قمقمے اس کے چہرے پر جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے جیسے ان خوبصورت جگمگاتے ہوئے قمقموں کے سائے تلے اس کی روح بے چینی سے سسک رہی ہو۔

اس کے جسم پر بلانکٹ کا ایک بوسیدہ سا ٹکڑا لپٹا ہوا تھا جسے اس نے سردی سے محفوظ رہنے کے لئے ڈھونگ رکھا تھا۔ بلانکٹ کے باریک سوراخوں میں سے سردی دبے پاؤں یوں گھس آئی تھی جیسے چُپ چاپ اس کی آغوش میں بیوی آگئی ہو۔

جب یادوں کے ننھے ننھے خوبصورت قمقمے ایک ایک کر کے بجھ گئے اور اس کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کا دیا بھی محراب میں اونگھنے لگا تو اسے رات کے کافی بھیگ جانے کا احساس ہوا لیکن آج نیند کی خوبصورت اپسرا اس کے پہلو میں آنے سے جیسے شرما رہی تھی اور اب اس کی نگاہیں طاق میں رکھے ہوئے اس دیے کو دیکھ رہی تھیں جو تیل ختم ہو جانے کے باعث دھیما ہوتا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

[illegible] اس کی بیوی دھونکنی کی طرح کھانس رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا۔ ایک آوارہ منش شرابی ہے جو شراب کے نشے میں چور ہو کر راستہ چلنے والے کو دلال سمجھ کر روپے دکھا رہا ہے۔ ایک بے حس شیخ خرید رہا ہے جو اپنی خوبصورت بھتیجی کی کچی پکائی جوانی کا سر بازار نیلام کر رہا ہے۔

اور ایک وہ ہے ستر روپے یافت والا مترجم جس کی جوانی پر خزاں آچکی ہے جسے ڈاکٹروں نے ٹھنڈے اور اونچے مقام پر لے جانے کا مشورہ دیا ہے لیکن وہ اسے ستر روپے جیسی قلیل آمدنی میں کسی بھی اونچے مقام پر لے جانے سے مجبور ہے۔

وہ آدرشوں کے اس اونچے مینار پر پہنچ جانا چاہتا تھا، جہاں روپوں کی چکا چوند کرنے والی روشنی کا گذر نہ ہو۔ اس کی بیوی کی کھانسی کے دردناک سُر جیسے اس کے کانوں میں زہر کا ایک ایک قطرہ ٹپکا رہے تھے اس کے ذہن سے رنج کا ایک دبا دبا سا احساس جھانک رہا تھا۔ اسے اپنے دماغ کی پہلی سیڑھی پر شرابی آہستہ آہستہ چڑھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سو کے دو نوٹ تھے اور وہ شیطانوں کی سی ہنسی ہنستا ہوا کہہ رہا تھا۔

"بے وقوف! تم نے وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تم زندگی بھر اسی ڈربے میں سڑتے رہو گے اور ایک دن کتے کی موت مر جاؤ گے اور تمہارا پوچھنے والا کوئی نہ ہو گا۔ تمہاری بیوی کھوں کھوں کرتی ہوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں میچ لے گی ___

اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

"ذلیل شرابی کے بچے ہٹ جا میری نگاہوں کے سامنے سے"

اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور وہ خواب کے تانے بانے میں کھو گیا تھا ___

صبح کے ٹھنڈے سے پہلے ہی وہ دفتر سے باہر نکل آیا۔ جب وہ عابد روڈ سے گزرا تو شو کیس میں رکھے ہوئے ٹویڈ، شارک سکن اور سلک کے خوبصورت "کٹ پیس" اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے اور اسے احساس ہوا کہ اس نے مدت سے اچھے اور قیمتی کپڑے نہیں سلوائے ہیں۔ اس کے قدم تیز ہو گئے

کپڑوں کی دکانوں کا لامتناہی سلسلہ اب بھی اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

جب کپڑوں کی دکانیں غائب ہو گئیں تو اسے اطمینان سا ہوا۔ وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ اچانک ممبئی ریسٹورنٹ کے قریب ہی کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجیش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کالج کے دور کا سب سے زیادہ قریبی دوست۔

وہ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ راجیش کے خوبصورت سوٹ کو دیکھ کر اسے اپنے کپڑے بہت حقیر لگے۔

اسے خواہ مخواہ احساس ہوا جیسے وہ اسے بہت بُرے وقت ملا ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں پچھلی یادوں کو دہرانے لگا۔

کالج کی رنگین فضا ـــــ پروفیسر نہتہ کی چڑچڑاہٹ ـــــ
ہاسٹل کا کیف ـــــ ریحانہ کی سنجیدگی ـــــ ورشا کی شوخیاں ـ
سب ہی کچھ ـــــ

اس کے کوٹ کی جیب میں ایک روپے کا آخری نوٹ جسے اس نے کل سے سنبھال رکھا تھا کونے میں پڑا سسک رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد ملنے والے ساتھی کی کم از کم کافی ہی سے تواضع کرنا وہ اپنا اولین فرض سمجھ رہا تھا۔ اپنے اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے وہ اپنے ساتھی کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔ اس نے فوراً ہی بوائے کو دو کپ کافی لانے کا آرڈر دیا ـــــ

راجیش آہستہ آہستہ کافی کا ایک ایک گھونٹ سپ کرتا ہوا مزے سے باتیں کئے جا رہا تھا۔

کس طرح اس نے گریجویٹ ہونے کے بعد ورشا پر ڈورے ڈالے تھے اسے شادی کے بندھن میں جکڑا تھا۔ پھر انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری امریکہ جا کر لے آنے کا ذکر ـــــ غرض اس نے اپنی زندگی کے متعلق کوئی بات نہیں چھوڑی۔

جب وہ کافی کہہ چکا تو شاید اسے احساس ہوا کہ وہ اب تک اپنی ذات کے متعلق ڈینگیں مار چکا ہے اسے اپنے دوست کے بارے میں بھی پوچھنا چاہیئے تھا۔

" تو آج کل کیا کر رہے ہو، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کہیں تجعبند میں تو نہیں پڑے ہو۔ یار ایسی بھی کیا کفایت، کچھ ٹھاٹ سے زندگی گزارو۔ دیکھو ہم نے بھی کیا لونڈیا پھانسی ہے۔ زندگی سالی شاندار بن گئی ہے۔ آٹھ سو روپے تنخواہ اور اوپری آمدنی کا کوئی حساب نہ کتاب۔ خسر کو اُلو بنا رکھا ہے۔ بڑے مزے سے زندگی گزر رہی ہے۔ ایک دن کے لئے خسر ہی کے کام سے یہاں آیا تھا۔ کل صبح یا شام کی ٹرین سے ممبئی چلا جاؤں گا ـــ" وہ بولا

اس نے گھڑی دیکھی ۱۲ بج چکے تھے۔ سرمائی ہلکی دھوپ کافی ہاؤس کے فرش پر بکھری گئی تھی۔ بوائے دوڑے دوڑے گاہکوں کو کافی سپلائی کر رہے تھے۔ سامنے کے کھلے حصے میں دو کمزور جسم کی دبلی پتلی کرسچین لڑکیاں بات بات پر قہقہہ مار کر ہنس رہی تھیں اور ایک ادھیڑ عمر کا پارسی بیٹھا "بلٹز" پڑھ رہا تھا۔

بیچ کے برآمدے میں بید کی کرسیوں پر چند لوگ دھنسے ہوئے تھے جن میں ایک شخص زور زور سے باتیں کر رہا تھا کیبن سے قیمتی سگرٹوں کی ہلکی ہلکی سی خوشبو دھوئیں کے غبار کے ساتھ پھیل رہی تھی۔

اور راجیش اب بھی اپنی امارت کے تعلق سے اس پر رعب جما رہا تھا۔ پھر جب وہ کافی ڈینگیں مار چکا تو کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بوائے کو آواز دی۔ بوائے نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں کاؤنٹر کی طرف جھپٹے ـــ راجیش تیزی سے آگے بڑھ کر کاؤنٹر پہ پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔ جواباً اس نے بھی تیزی دکھائی اور منیجر کے سامنے ایک روپے کا نوٹ رکھ دیا۔

منیجر نے ایک لمحہ کے لئے اسے گھور کر دیکھا پھر سلوٹیں پڑے

دوسرے لمحے ہی میں وہ بل وصول کرکے راجیش کو چینج دے رہا تھا۔
ے محسوس ہوا جیسے منیجر نے اس کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر اس سے نوٹ لینا
مناسب نہیں سمجھا ہے۔

بہر حال اگر اس کا یہ خیال صد فیصد درست بھی تھا تو بھی منیجر نے اس کی ذات کو تھوڑا بہت فائدہ ہی پہنچایا تھا۔ پھر راجیش اُسے خدا حافظ کہتا ہوا بازار کے ہنگاموں میں کہیں کھو گیا۔ اخبار کے دفتر پہنچ کر اس نے آج کی تازہ خبریں پڑھیں اور ترجمہ کرنے لگا۔ اس کے ایک ساتھی نے ترجمہ کرتے کرتے آنکھیں اٹھا کر اُسے یوں دیکھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے دیر سے آنے کا سبب پوچھ رہا ہو۔ پھر وہ کاغذوں پر جھک گیا۔

اوپر کی منزل کے بائیں جانب جس سے ملحق مدیر کا کمرہ تھا، آج دن ڈھلے ایک شخص تیز تیز کچھ باتیں کر رہا تھا اور ذرا سوامی نائیڈو جو اس اخبار کا مدیر تھا آہستہ آہستہ اُسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ واپس ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ برجیش تھا۔

وہ اُسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے زینے کی آخری سیڑھیاں اُترتے تک دیکھتا رہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد نائیڈو نے مجھے بتایا کہ وہ مسٹر ریاض کا داماد ہے۔ لندن سے گذر کر یہاں آیا ہے اور اب یہ بلڈنگ فروخت کرنا چاہتا ہے جو اس کی بیوی کی ملکیت ہے۔ بڑا چالاک ہی معلوم ہوتا ہے۔"

اس نے نائیڈو کی ساری باتیں سن لیں اور اس پر یہ بات ظاہر ہونے نہیں دی کہ وہ اس کا قریبی دوست ہے۔

رات کے ۱۲ بجے جب وہ حسب معمول اپنے گھر آیا تو اس نے دیکھا اس کے دروازے کا ایک پٹ کچھ کھلا سا ہے۔ اس نے سوچا شاید اس کی بیوی کو زنجیر لگانے کا خیال نہ رہا ہو۔ اس نے اندر جا کر چٹخنی لگا دی اور بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔ بیوی اس کی آہٹ سے جاگ پڑی۔

اس نے ڈاکٹر کی طرح اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک تو ہے؟"

"ہوں ___ اس نے چہرے پر صحت مندی کا نکھار پیدا کرتے ہوئے کہا لیکن ایک لمحہ بعد ہی اس کے سینے کی خشک کھانسی نے فوراً اس کے جواب کی تردید کر دی۔

اس نے راجیش سے ملاقات کے حال کو عمداً بھی اپنی بیوی پر ظاہر ہونے نہیں دیا کہ کہیں وہ اس پر یہ الزام نہ دے کہ اس نے حالات کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے سرمایہ دار دوست سے مدد نہیں لی

دن تیزی سے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اس کے گھر پر مفلسی کا منحوس سایہ برگد کے درخت کی طرح پھیلتا ہی چلا گیا اور اس کا منھ پریشانیوں سے کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

آج آفس میں نائیڈو نے اس بلڈنگ کی "اِن وِنٹری" Inventory طلب کی تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ اُسے مطلق یاد نہیں رہا تھا کہ نائیڈو نے کبھی اس عمارت کی اِن وِنٹری طلب کی تھی۔ وہ اُلٹے پاؤں گھر لوٹا، اُس نے دیکھا مُنی مزے لے لے کر رس گلے کھا رہی ہے۔ اُسے حیرت ہوئی یہ مُنی رس گلے کہاں سے کھا رہی ہے، جاتے وقت اُس کی بیوی کے ہاں کچھ پیسے بھی تو نہیں تھے۔

اس نے اپنی بیوی کو آواز دی لیکن جواب نہ پا کر اُسے سخت تشویش ہوئی۔ پھر مُنی نے اُسے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک بڑی سی عورت یہاں آئی تھی۔ اس نے مُنی کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔ اور پھر مجھے اس نے رس گلے دے کر کہا۔ "تمہاری اَمی سے تھوڑا کام ہے بیٹا۔ ابھی یہ واپس چلی آئے گی جب تک تم یہ رس گلے کھاتی رہنا!"

جب میں نے امی سے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی تو انھوں نے پہلے مجھے پیار سے سمجھایا پھر میرے ضد کرنے پر مجھے مارا بھی اور مجھے اکیلی چھوڑ کر چلی گئیں۔ یہ کہہ کر منی رونے لگی۔

اس کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ "آخر ایسا کیا ضروری کام

[illegible] کے ذہن میں [illegible] کے خیالات آ رہے تھے اور وہ

[illegible] پر غصہ آ رہا تھا چونکہ وہ فوری آفس پہنچ کر اسے نائیڈو کو ان ونٹری

دینی تھی۔ بس نے اس نے منی کو بہلا پھسلا کر تھوڑی دیر کی اجازت لی اور اس

کے ہاتھ میں پیار بھرے انداز میں چونی تھما کر آفس چلا گیا۔ نائیڈو اپنے

کمرے میں بیٹھا کل کے لئے آرٹیکل لکھ رہا تھا جب وہ اس کے قریب گیا

تو نائیڈو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اشارے سے ان ونٹری چھوڑ جانے

کو کہا۔

پھر وہ الٹے پاؤں تیز تیز آفس کی سیڑھیاں اترتا ہوا باہر

نکل گیا تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک چنگھاڑتے ہوئے شیر کی طرح جب

گھر میں داخل ہوا تو اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو منی کو اپنی آغوش میں

بھینچے پیار کئے جا رہی تھی۔

"منی کو اکیلے گھر میں تنہا چھوڑ کر کہاں گئی تھیں۔ ؟ بولو۔"

اس کے منہ سے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔

"کچھ سنو گے بھی یا محض غصہ ہی کرتے جاؤ گے۔ اورنگ آباد

سے چچی علاج کے لئے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ آج کا ماٹن کے ذریعہ

مجھے بلوایا تھا۔ منی لوتیں نے گھر چھوڑ جانا اس لئے نامناسب سمجھا کہ

کہیں وہ انھیں بستر پر پڑا دیکھ کر ڈر نہ جائے۔"

"بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئے۔" اس نے پیار سے

اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حمایل کر دیئے۔

اُسے محسوس ہوا واقعی اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کچھ زیادتی

کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہوتا ہوا آفس چلا گیا۔ اس نے جب

ترجمہ کرنے کے لئے کاغذ اٹھائے تو اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے آگے

بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔

اس کے [illegible]

کی گڑیاں خریدنے کے ارادے سے بازار کی طرف چل [illegible]

بازار کے نکڑ پر راجیش سے اس کی ملاقات ہوئی۔ [illegible]

آ نکلے۔ اس نے راجیش کے شانوں پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو یہ کونسی سڑک ہے۔"

"ہاں جانتا ہوں۔" راجیش نے زیر لب مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔ "یہی کہ دلال یہاں دنیا بھر گھوما پھرا کرتے ہیں۔ ہاں یار یہ

بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم جیسے ادھر آ نکلے ہو میں بھی دل بہلانے

کی خاطر چلا آیا ہوں۔

"شیخ حیدر کو جانتے ہو؟ بڑا گھاگ ہے سالا"

ادھر اس نے کئی لونڈیوں کو پھانس رکھا ہے۔ کیا بتاؤں یار

شریف گھرانوں کی لڑکیوں تک کو پھانس لاتا ہے۔ ہر روز ایک نیا موڑ

کل ہی کی بات ہے سالے نے ایک بھلے گھرانے کی عورت

پھانس لائی تھی لیکن تھی سالی دق کی مریضہ۔ عین معاملے کے وقت

ہی اس پر کھانسی کے دورے شروع ہو گئے۔ اور وہ سینے کو دبائے

آہستہ سے میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اس کے چلے جانے کے بعد

شیخ حیدر کو ڈانٹ کر پوچھا تھا۔ "کس سینی ٹوریم سے اس دق کی مریضہ

اٹھا لائے تھے۔" اس وقت اس نے ہنس کر اپنے مخصوص عیارانہ لہجے

میں جواب دیا تھا۔ "شریف گھرانے کی عورت تھی صاحب۔ اپنی چھوٹی

سی بچی کو تنہا چھوڑ کر عجلت میں آپ کی خدمت کے لئے آگئی تھی۔"

"کم بخت شیخ حیدر کتنا حرامی اور بدمعاش ہے۔" وہ بولا اس کا

بچھڑنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے ہزاروں فٹ بلندی

سے نیچے پھینک دیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اندر شاید اس کی بچی

پھر اپنی چچی کے ہاں مزاج پرسی کے لئے چلی گئی تھی۔ !!! ▲

ناتی شاہ

راستے کی کہانی

آج پھر مجھے دورہ پڑا۔ اور میں جیسے اپنے خول کو توڑ کر باہر نکلتے ہوئے چیخا ——

کہاں ہے میرا قلم ؟

اور کہاں ہے میرا پیڈ ؟

اس کا مطلب تھا میں آج کچھ لکھوں گا۔ کوئی بات جو مجھے لگ رہی تھی۔ کوئی واقعہ جو مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اور کہانی جو میرے توسط سے اپنا اظہار چاہ رہی تھی۔ لیکن میری چیخ میرے ہی وجود کے سنسان مکان میں چپ ہو کر رہ گئی۔ ویسے اس وجود کے باہر بھی بڑا سناٹا تھا!

پہلے ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس گھر میں اس بوڑھی خاتون کا وجود تھا ہر شئے اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ یہاں تک کہ میں خود کو ایک مفید اور کارآمد آدمی سمجھتا تھا۔ یا کم از کم مجھے ایک نامعلوم طور پر اپنی اہمیت کا مبہم احساس ہوتا تھا۔ یا پھر چاہے جانے کی ایک بے پناہ آرزو ضرور اس بڑھیا کی ممتا بھری مسکراہٹ سے مطمئن ہو جاتی تھی۔ بہرحال ایک عجیب سی بات تھی اس بڑھیا میں۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کی ہر بات کا اسے پتہ چل جاتا تھا۔ جب ہی تو بے موقع بے موقع کہتی تھی۔ — بے چائے پی لے۔ اور سن یہ پان لیتا جا۔ کب سے بنائے میں تیرا انتظار کر رہی ہوں۔!

باتیں کرنا اور میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا گویا اس کا خاص

مشغلہ تھا۔ وہ چھوٹا ہے یہ ترسی ہوئی آپ ہی آپ مجھے بچہ بچہ کہہ کر پکارا کرتی تھی

جیسے میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمائی اور اس کے بڑھاپے کی ایک مضبوط لاٹھی ہوں۔ یہی نہیں اس مسکراہٹ میں ایک غرور تھا۔ ایک نامعلوم سی فتح کا احساس تھا اور ایک ایسی دنیا کا پتہ تھا جسے اس بوڑھی کے سوائے کسی نے دریافت نہیں کیا۔ ویسے میں نے کبھی بھی اس مسکراہٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس خیال سے نہیں کہ اس سے بوڑھی کے کسی جذبے کو دھکا پہنچے گا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کیونکہ محبت کے کسی جذبے کو آپریشن کی ضرورت نہیں رہتی۔!

بڑھیا، بڑھیا کہہ کر شاید میں نے نادانستہ طور پر اس محترم خاتون کی توہین کی ہے لیکن میں ایسا کہنے پر مجبور اس لئے ہوں کہ میں اب تک اس کے نام سے واقف نہیں ہوں۔ ویسے ایک بار میں نے اس کا نام پوچھنے کی جسارت ضرور کی تھی۔ مگر اس کی پوپلی طنزیہ ہنسی نے مجھے خاموش کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے کہا تھا۔

نام کیا پوچھتا ہے بچے۔ کہیں بڑھاپے کا بھی کوئی نام ہوتا ہے؟!

بات ٹھیک تھی۔ بڑھاپے کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ لیکن بڑھاپا

ماہتاب پروین حیدرآباد

جس نے اسے منی کو اکیلے گھر میں تنہا چھوڑ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی باہر قدم نہیں نکالے تھے۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے اور وہ کڑھ رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی پر غصہ آ رہا تھا چونکہ فوری آفس پہنچ کر اسے نائیڈو کو ان ڈوٹی دینی تھی۔ اس لئے اس نے منی کو بہلا پھسلا کر تھوڑی دیر کی اجازت لی اور اس کے ہاتھ میں پیار بھرے انداز میں چونی تھما کر آفس چلا گیا۔ نائیڈو اپنے کمرے میں بیٹھا کل کے لئے آرٹیکل لکھ رہا تھا جب وہ اس کے قریب گیا تو نائیڈو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اشارے سے ان ڈوٹی چھوڑ جانے کو کہا۔

پھر وہ الٹے پاؤں تیز تیز آفس کی سیڑھیاں اترتا ہوا باہر نکل گیا تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک چنگھاڑتے ہوئے شیر کی طرح جب گھر میں داخل ہوا تو اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جو منی کو اپنی آغوش میں بھینچے پیار کئے جا رہی تھی۔

"منی کو اکیلے گھر میں تنہا چھوڑ کر کہاں گئی تھیں۔؟ بولو۔"

اس کے منہ سے غصے کے شعلے نکل رہے تھے۔

"کچھ سنو گے بھی یا محض غصہ ہی کرتے جاؤ گے۔ اورنگ آباد سے چچی علاج کے لئے یہاں آئی ہوئی ہیں۔ آج کا ماٹن کے ذریعہ مجھے بلوایا تھا۔ منی تو میں نے گھر چھوڑ جانا اس لئے مناسب سمجھا کہ کہیں وہ انھیں بستر پر پڑا دیکھ کر ڈر نہ جائے۔"

بس اتنی سی بات پر خفا ہو گئے۔" اس نے پیار سے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

اسے محسوس ہوا واقعی اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کچھ زیادتی کی ہے۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہوتا ہوا آفس چلا گیا۔ اس نے جب ترجمہ کرنے کے لئے کاغذ اٹھائے تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔

وہ آج ایک سطر بھی اخبار کے لئے ترجمہ کر سکا۔

"اس کے سر میں آج ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ وہ منی کے لئے گڑیاں خریدنے کے ارادے سے بازار کی طرف چل پڑا۔ پھر اچانک سے بازار کے نکڑ پر راجیش سے اس کی ملاقات ہوئی۔ "ارے تم اس طرف کدھر آ نکلے۔" اس نے راجیش کے شانوں پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو یہ کونسی علاقہ ہے۔"

"ہاں جانتا ہوں۔" راجیش نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہی کہ دلال یہاں زیادہ گھوما پھرا کرتے ہیں۔ ہاں یار یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم جیسے ادھر آ نکلے ہو میں بھی دل بہلانے کی خاطر چلا آیا ہوں۔

شیخ حیدر کو جانتے ہو؟ بڑا گھاگ ہے سالا"

ادھر اس نے کئی لونڈیوں کو پھانس رکھا ہے۔ کیا بتاؤں یار شریف گھرانوں کی لڑکیوں تک کو پھانس لاتا ہے۔ ہر روز ایک نیا موڈل۔ کل ہی کی بات ہے سالے نے ایک بھلے گھرانے کی عورت پھانس لائی تھی لیکن تھی سالی دق کی مریضہ۔ عین معاملے کے وقت ہی اس پر کھانسی کے دورے شروع ہو گئے۔ اور وہ سینے کو دبائے آہستہ سے میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اس کے چلے جانے کے بعد شیخ حیدر کو ڈانٹ کر پوچھا تھا۔ کس مینی ٹوریم سے اس دق کی مریضہ کو اٹھا لائے تھے۔" اس وقت اس نے ہنس کر اپنے مخصوص کاروباری لہجے میں جواب دیا تھا۔ "شریف گھرانے کی عورت تھی صاحب۔ اپنی چھوٹی سی بچی کو تنہا چھوڑ کر مجبت میں آپ کی خدمت کے لئے آ گئی تھی۔"

"کم بخت شیخ حیدر کتنا حرامی اور بدمعاش ہے۔" وہ بولا اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے ہزاروں فٹ بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اور شاید بیکی بچی آج پھر اپنی چچی کے ہاں مزاج پرسی کے لئے چلی گئی تھی۔۔!!! ▲

عاتق شاہ

راستے کی کہانی

آج پھر مجھے دورہ پڑا۔ اور میں جیسے اپنے خول کو توڑ کر باہر نکلتے ہوئے چیخا ——

کہاں ہے میرا قلم ؟

اور کہاں ہے میرا پیڈ ؟

اس کا مطلب تھا میں آج کچھ لکھوں گا۔ کوئی بات جو مجھے اکسا رہی تھی۔ کوئی واقعہ جو مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اور کہانی جو میرے توسط سے اپنا اظہار چاہ رہی تھی۔ لیکن میری چیخ میرے ہی وجود کے سنسان مکان میں چپ ہو کر رہ گئی۔ ویسے اس وجود کے باہر بھی بڑا سناٹا تھا!

پہلے ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا جب تک اس گھر میں اس بوڑھی خاتون کا وجود تھا۔ ہر شئے اپنی اپنی جگہ پر تھی۔ یہاں تک کہ میں خود کو ایک مفید اور کار آمد آدمی سمجھتا تھا۔ یا کم از کم مجھے ایک نامعلوم طور پر اپنی اہمیت کا دھندلا احساس ہوتا تھا۔ یا پھر چاہے جانے کی ایک بے پناہ آرزو ضرور۔ اس بڑھیا کی ممتا بھری مسکراہٹ سے مطمئن ہو جاتی تھی۔ بہر حال ایک عجیب سی بات تھی اس بڑھیا میں۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کی ہر بات کا اسے پتہ چل جاتا تھا۔ جب ہی تو وہ موقع بے موقع کہتی تھی۔ — بے چارے پلنے — اور سن بیٹا پان لیتا جا۔ کب سے بنائے میں تیرا انتظار کر رہی ہوں —!

باتیں کرنا اور میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا گویا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ چھالیہ کترتی ہوئی آپ ہی آپ مجھے دیکھ دیکھ کر یوں مسکراتی تھی جیسے میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمائی اور اس کے بڑھاپے کی ایک مضبوط لاٹھی ہوں۔ یہی نہیں اس مسکراہٹ میں ایک غرور تھا۔ ایک نامعلوم سی فتح کا احساس تھا اور ایک ایسی دنیا کا پتہ تھا جسے اس بوڑھی کے سوائے کسی نے دریافت نہیں کیا۔ ویسے میں نے کبھی بھی اس مسکراہٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس خیال سے نہیں کہ اس سے بوڑھی کے کسی جذبے کو دھکا پہنچے گا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کیونکہ محبت کے کسی جذبے کو آپریشن کی ضرورت نہیں رہتی —!

بڑھیا، بڑھیا کہہ کر شاید میں نے نادانستہ طور پر اس محترم خاتون کی توہین کی ہے لیکن میں ایسا کہنے پر مجبور اس لئے ہوا کہ میں اب تک اس کے نام سے واقف نہیں ہوں۔ ویسے ایک بار میں نے اس کا نام پوچھنے کی جسارت ضرور کی تھی۔ مگر اس کی پوپلی طنزیہ ہنسی نے مجھے خاموش کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے کہا تھا۔

نام کیا پوچھتا ہے بچے۔ کہیں بڑھاپے کا بھی کوئی نام ہوتا ہے؟!

بات ٹھیک تھی۔ بڑھاپے کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ لیکن بڑھاپا

یلم کہاں سے آتا ہے۔ وہ تو کئی منزلوں اور کئی طوفانوں کے بعد آتا ہے۔ بڑھاپے سے پہلے جوانی، اور جوانی سے پہلے بچپن اور بچپن سے پہلے ــــــ

یقیناً اس کا نام تھا میرا خیال ہے، ایک نہیں کئی نام تھے اُس کے۔

ایک نام جو اُس کے باپ نے اُسے عنایت کیا تھا۔ دوسرا نام جو اس کی ماں نے بڑے پیار سے اُسے دیا تھا۔ اور تیسرا نام یقیناً اُس کے جنم جنم کے ساتھی نے اُسے دیا ہوگا جب وہ پہلی بار اپنی دلہن کا گھونگھٹ الٹ کر اس کے گلابی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا ہوگا۔

نہ جانے کیا کہا ہوگا۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ یہ تو اُس وقت کی بات ہے جب میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے، بہت پہلے جوانی کا طوفان اس کے وجود کے سمندر میں اٹھ اٹھ کر ٹھہر گیا ہوگا۔

میں تو بہت بعد میں اُس سے ملا۔ ملا کہاں، وہ مجھے مل گئی۔ یا میں اسے مل گیا۔ ایسے ہی جیسے کسی کو راہ چلتے ہوئے کوئی اَن مول چیز مل جاتی ہے۔ وہ بھی مجھے راستے پر پڑی ملی۔ دراصل اس کا میرا رشتہ فٹ پاتھ کا رشتہ ہے مجھے اصولاً اس فٹ پاتھ کا ممنون ہونا چاہیئے، جہاں سے اٹھا کر میں نے اُسے اپنی آنکھوں پر بٹھالیا۔

میں نے کہا ـــ مائی تم میرے گھر چلو!

ہوا یوں کہ میں بازار جا رہا تھا تاکہ صبح صبح پیٹ کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے کچھ خرید لاؤں۔ اور وہ بازار سے اپنی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا سامان لئے چلی آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک کھلی ہوئی کھجور کی چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ ٹوکری میں آٹا تھا، پیاز تھی۔ اور ایک کٹوری میں تیل اور یہ سب چیزیں دیکھتے ہی دیکھتے فٹ پاتھ پر آ پڑیں۔ معلوم نہیں یہ ٹھوکر کا اثر تھا یا اس بھوکے فٹ پاتھ کا جس نے زبردستی وہ تمام چیزیں اس سے چھین لیں۔

وہ محترم خاتون جھک کر اُن تمام چیزوں کو چھیٹنے کی کوشش کر رہی تھی تیل گر گیا تھا۔ وہ تو فٹ پاتھ کے پوروں پوروں میں جذب ہو چکا تھا۔

مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ جھک کر اُس کی مدد کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا ـــ

کون ہے وہ ظالم جو تمہیں اس عمر میں بازار بھجواتا ہے؟

خدا اُسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

لیکن میری حقیر مدد اُس کے کچھ کام نہ آئی۔ مٹی، آٹے میں اور آٹا، مٹی میں مل چکا تھا۔!

اُسے سہارا دے کر گری ہوئی لاٹھی کو اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میں نے اس بزرگ خاتون کی خدمت میں ایک میلی کچیلی روپے کی نوٹ پیش کی جو کئی دن سے، میری مٹھی میں بند تھی۔

لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور میں نے محسوس کیا جیسے میں نے کوئی بڑی غیر اخلاقی حرکت کی ہے۔ وہ غصہ میں کانپتی ہوئی صرف ایک فقرہ کو دہراتی جا رہی تھی۔

آخر تو نے کیا سمجھا ہے مجھے۔ مجھے بھیک دیتا ہے ـ مجھے!

پھر اس سے معذرت چاہتے ہوئے میں نے اُسے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ فٹ پاتھ نے بڑا نقصان کیا ہے اس کا میں دراصل ہرجانہ دے رہا ہوں۔ لیکن وہ خاتون اس کے لئے بہر حال تیار نہیں ہوئی اور اس نے بڑے ہی مردانہ انداز میں اپنی بانہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــــ

"جب تک ان ہاتھوں میں دم ہے، بھیک کسی سے کیوں لوں ـــ؟"

ساتھ ہی میں اُس باہمت خاتون کے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان میں اتنی قوت تھی یا نہیں، یہ ایک دوسری بحث ہے لیکن ان ہاتھوں کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ زمانے کی کلائی موڑتے موڑتے وہ ہاتھ خود مڑ چکے تھے اور لٹکتے ہوئے گوشت پر سینکڑوں اَن گنت جھریاں ماضی کے ایک ایک تجربے اور محنت کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

رگ ہاتھوں کو سلام کرتے ہوئے میں نے اس خاتون کے مقدس چہرے پر
ڈالی۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے کسی ڈھیلی ڈھالی باریک جالی کے
ایک نورانی شعلہ تڑپ رہا ہے۔ اس کے بال دودھ کی طرح سفید
میرا خیال ہے وہ معمر خاتون ستر کے قریب تھی۔

میں نے کہا مجھے معاف کرو مائی جی۔ مگر بتاؤ تو تم اس ضعیفی
اتنی محنت کیوں کرتی ہو۔ آخر تمہارا کوئی تو ہوگا۔ کوئی — لڑکا لڑکی
یا پوتا !

بات بھی اُسے اچھی نہیں لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں
یہ بات پوچھ کر اس کی شخصی زندگی میں بے جا مداخلت کی ہے۔ وہ
جھلائی۔ اور اس کا دودھیا چہرہ سلگتی ہوئی آگ کی طرح لال بھبوکا
فٹ پاتھ کے سینے پر لکڑی مار کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے کہا —
کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں — !

میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ میرے اندر کا آدمی چیخا۔
نہ میرے آگے کوئی ہے۔ اور نہ پیچھے کوئی تھا میں تنہا ہوں بالکل
تمہاری طرح شاید تم اپنے ماضی کو بھلا بیٹھی ہو۔ یا اسے بھلا دینا چاہتی ہو،
میرا تو کوئی ماضی ہی نہیں۔ تو اسے بھلانے یا یاد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا۔ نہ مجھے اپنی ماں کا خیال ہے۔ اور نہ مجھے اپنے باپ کا چہرہ یاد ہے۔
بچپن میں یہ دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے اور میں اس دنیا میں اکیلا رہ گیا۔
پتہ نہیں کن کن ہاتھوں سے ہوتے ہوئے میں عمر کی اس منزل میں آیا۔ لیکن تنہائی
کا گلہ کرتا رہا ستا تا اب تک میرا پیچھا کر رہا ہے۔ مگر تم سے ملنے کے بعد تمہیں
دیکھنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے تم اس کمی کو پورا کر سکتی ہو۔ وہ محبت اور
پیار جو مجھے اپنی ماں اور باپ سے نہ مل سکا۔ شاید تم مجھے دے سکو —
اپنا بیٹا بنا کر —

لیکن اپنی شدید جذباتیت پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھ کر میں نے

اُسے روک لیا۔ اور اس کی لاٹھی کا رُخ اپنی طرف کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔
" تم اُدھر کہاں چلیں ماں۔ اب میرے ساتھ چلو۔
میرے گھر۔ آج سے میں تمہارا بیٹا ہوں۔ ! "

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ غم، غصہ، نفرت
اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے بوجھ سے اور لٹک گیا۔

پھر وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔
بیٹا کیا، تیری عمر کا تو مجھے پوتا ہو سکتا تھا۔ مگر بیٹا ہی نہ ہو تو پوتا کہاں سے
آتا۔ میں نے اُسے ڈانٹ بتائی۔ اس کے ہاتھ کو چبا ڈالا۔ شادی سے
پہلے وہ بدمعاش چاہتا تھا۔ انہوں نے اچھا ہی کیا۔ میں کنواری ہی بھلی۔
— کنواری ہی بھلی !

قریب قریب تین مہینے وہ میرے ساتھ رہی۔ اور میں نے
یہ محسوس کیا جیسے وہ میری زندگی کی ایک ان مٹ سچائی ہے۔ ماضی کی کھوئی
ہوئی جنت ہے۔ اور میرے جسم کا دوڑتا ہوا گرم گرم خون ہے۔ اور قریب
قریب میرے متعلق بھی اس کے یہی جذبات تھے۔ لیکن جب وہ مجھے اور
اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی تو اس جدائی پر میں نے قطعی افسوس کا اظہار نہیں
کیا۔ میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر ایک پُرسکون مسکراہٹ ہے۔
میرا خیال ہے ملک الموت بھی اس مسکراہٹ کو دیکھ کر پریشان ہوا ہوگا۔
کیونکہ آدمی کی زندگی کا آخری لمحہ بڑا نازک اور بڑا طویل ہوتا ہے۔ مگر وہ
پُرسکون ہی نہیں رہی۔ بلکہ بڑے پیار سے میرا بوسہ لیتی ہوئی اس نے دو
نصیحتیں کیں۔ ایک تو یہ کہ میں کسی لڑکی کو دھوکہ نہ دوں۔ اور دوسری یہ کہ
اگر مجھے فرصت ملے تو میں اس شخص کی تلاش کروں جس نے آج سے
پچاس سال پہلے اس سے شادی کا وعدہ کر کے اسے ایک دیہات سے اٹھا
لیا تھا اور پھر اس شہر کی جگمگاتی ہوئی دنیا میں اُسے چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ جس کا
نام شنکر سنگھ ہے اگر وہ مل جائے تو میں اسے ضرور سزا دوں۔

ہنامہ آج نم۔ حیدرآباد

شنکر سنگھ مجھے کہاں ملتا۔ اور میں اُس کی کہاں تلاش کرتا۔ اسلیئے اب کبھی مجھے اپنی مُنہ بولی ماں کی یاد آتی تو کبھی اُس کی آخری آرام گاہ پر جاتا اُس فٹ پاتھ پر جہاں وہ مجھے ملی تھی۔ ایک دن' اُسی مقام پر میں نے دیکھا ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان مرد میں جھگڑا ہو رہا ہے اور بہت سے راہ چلنے والے انہیں گھیرے کھڑے ہیں۔ لڑکی کو شکایت تھی کہ وہ نوجوان شادی کے بہانے اُسے شہر لے آیا اور چند دنوں بعد اسے چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا اور اب کئی مہینوں کے بعد اُسے ملا ہے۔ اور اُس نوجوان مرد کا بیان تھا کہ وہ چند مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکا۔ لیکن اب وہ اپنی پہلی فرصت میں اُسے اپنا لے گا..... غرض لڑکی رو رہی تھی اور وہ نئے نئے بہانوں اور وعدوں کے ساتھ اپنا پیچھا چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن اُس کا راستہ روکتے ہوئے اس لڑکی کے قریب جا کر میں نے کہا۔

محترم خاتون! یہ تم نے اچھا کیا جو اُسے سرِ راہ پکڑ لیا۔ اب اسے جانے مت دو۔ ورنہ یہ کبھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سے پہلے بھی اس نے تمہاری طرح دیہات کی ایک معصوم اور حسین لڑکی کو دھوکہ دیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اُس وقت اس کا نام شنکر سنگھ تھا۔

لڑکی نے بڑی ممنونیت اور حیرت کے ساتھ ایک لمحے کے لیئے مجھے دیکھا اور دوسرے لمحے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی مرد کے ہاتھ کو اُس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ساتھ ہی جیسے کوئی ضروری بات مجھے یاد آ گئی۔ ایک پاگل کی طرح دوڑا دوڑا گھر آیا اور کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چیخا۔

کہاں ہے میرا قلم؟ ——— کہاں ہے میرا پیڈ؟!۔ ▲

خوش حالی اور افراط کے ساتھ ہی کفایت شعاری بھی

اپنے پانچ سالہ منصوبوں کو ہم نے پہلے کبھی "خوش حالی کے منصوبوں" کا نام دیا تھا۔ کیونکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ قومی آمدنی بڑھائی جائے اور اوسط فی کس آمدنی میں مستقل طور پر سال بہ سال اضافہ کیا جائے۔ اب بھی یہ منصوبے خوش حالی کے ہی منصوبے ہیں' خوشحالی اور افراط کے۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی ساتھ اب کفایت شعاری کی بھی ضرورت ہے۔ اگر زیادہ اناج اُگایا جائے' برقی قوت زیادہ پیدا ہو اور کارخانوں سے صنعتی مال زیادہ سے زیادہ تیار ہو کر نکلنے لگے تو یہی چیزیں قوم کے لیئے خوشحالی اور افراط کا باعث ہوں گی۔ لیکن ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی صرف کسی ایک ہی فرد یا چند مٹھی بھر افراد کے ہی عیش و آرام' اور تفریح کا باعث نہیں بننا چاہیئے۔

پانچ سالہ منصوبوں کی سرگرم عمل آوری سے جو بھی دولت و قوت پیدا ہو' اسے ساری قوم کی قوت و طاقت کے لیئے استعمال کیا جانا چاہیئے۔ (۲۱۵.۰۰) کروڑ کا قومی منصوبہ بنا لیا گیا ہے اور آنے والے سال کے لیئے ایک ہنگامی سالانہ منصوبہ بھی معمولی ممکن العمل حدود کے اندر مرتب کیا جا رہا ہے۔ آندھرا پردیش کا چوتھا منصوبہ (۷۰۰) کروڑ روپے کا ہے۔ جس کا مقصد ہر سمت میں زبردست ترقیاتی پیش قدمیاں کرنا تھا۔

ہماری ریاست میں رواں سال میں، جو تیسرے منصوبے کا آخری سال ہے، غذائی اجناس کی حقیقی پیداوار تقریباً (۹۰،۲۱) لاکھ ٹن ہوگی، جو اس منصوبے کے آغاز پر (۶۳،۱۹) لاکھ ٹن تھی۔ اب جو خاکہ بنایا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اس پیداوار کو چوتھے منصوبے کی مدت میں بڑھا کر (۱۱۶،۴۰) لاکھ ٹن تک پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح مچھلی کی پیداوار کو جو اس وقت (۲،۶۵) لاکھ ٹن ہے۔ آئندہ منصوبے میں بڑھا کر (۳،۲۱) لاکھ ٹن تک پہنچانے کی تجویز ہے۔

برقی قوت کی پیدائش کی قائم شدہ گنجائش کو جو اس وقت (۴۱۱) میگاواٹ سے بڑھا کر (۱۵۰۱) میگاواٹ تک پہنچانے کی تجویز ہے۔

اسی طرح قومی دولت و طاقت کی ترقی و تعمیر کے لیئے آب پاشی کے وسائل' مویشی اور جنگلات کی دولت، صنعتی ترقی کے امکانات، تعلیم اور طبی خدمات کو بڑھاوا دینے کی غرض سے ایک ہمہ جہتی مہم چلانا، ان کوششوں کا مقصد ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کامیابی بہت سے عوامل اور عناصر پر منحصر ہے۔ لیکن اِن میں سب سے زیادہ اہم' عوام کا عزم، فہم، شعور اور پکا ارادہ ہے۔ مزدور اپنے کارخانے میں، کسان اپنے کھیت میں، خود آپ اور ہم، غرض ہر فرد اپنا اپنا فرض اور کام بڑھتی چڑھتی قوت اور قربانی کے جذبے کے ساتھ انجام دے۔

ہندوستان کو ناقابلِ فتح بنانے کے لیئے یہ ایک اَمن پسند قوم کی جنگ ہے

ایک ہسپانوی افسانہ

النیو الخیلہ
مترجم، محمد مسیح الزماں امروہوی

بے ہنری

گارسا صبح سات بجے سے بازار میں کھڑا تھا۔
اس کی متلاشی نگاہیں ہر گزرنے والے کی طرف اُٹھتیں اور پھر مایوس ہو کر لوٹ آتیں۔ وہ دن بھر کی دوڑ دُھوپ کے باوجود کسی ایسے دوست کی تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا جو اسے کچھ قرض دے سکے۔ کیونکہ اسے آج ہر صورت میں شام تک مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ نہیں تو وہ کھوسٹ مکان مالکن اس کا سامان اُٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیگی اس کا اسے یقین تھا۔

کافی دنوں سے اس کا دھندہ چوپٹ پڑا تھا جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جب اسی بازار کے سب سے بڑھیا ہوٹل میں کھانا کھانے آتا تھا لیکن آج وہ بکس پر بیٹھے ان فقیروں کی طرف بڑی للچائی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن کی جھولیوں میں روٹی کے بہت سے چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ پل بھر کے لئے اس نے اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی جو ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ کسی کو بھیک دینے پر تیار کر سکیں۔ شکل و صورت سے بھی وہ ایک معزز شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور دل نے چاہا کہ وہ ان قیمتی کپڑوں کو اتار کر بھکاریوں کی لائن میں جا بیٹھے اور پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر کیفے ڈیلائٹ کی طرف چل دیا۔

دراصل گارسا کا تعلق ایک ایسے کاروبار سے تھا جس کا پورا دارومدار قسمت پر تھا۔ بڑی رقم ہاتھ لگتی تو وارے نیارے ہو جاتے ورنہ تھوڑے بہت روپیہ تو مل ہی جاتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے اس کاروبار سے مطمئن نہ تھا۔ کیونکہ ہر وقت پکڑے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ اب کچھ دنوں سے گارسا نے اس دھندے کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ویسے بھی اب لوگ کافی ہوشیار ہو گئے تھے ایک دفعہ دن بھر کی محنت کے بعد اس نے ایک بابو کی جیب کاٹی لیکن جب ایک محفوظ جگہ پر اس نے پرس ٹٹولا تو اندر سے صرف ایک دو پیسے (ایک روپیہ) کا سکہ نکلا جب کہ اس کے اندازے کے مطابق اس کی نگاہیں کافی موٹی رقم دیکھنے کی متمنی تھیں۔

شاید وہ کبھی اپنے اس دھندے کو چھوڑنے کا فیصلہ نہ کرتا۔ اگر اس کے قریبی دوست ڈان نے اسے یہ خوشخبری نہ سنائی ہوتی کہ وہ بہت جلد اس کو پولیس کی نوکری دلانے والا ہے۔

ڈان ایک امیر لیکن کنجوس شخص تھا۔ اسے انگلیوں کے نشان پہچاننے کی بڑی مہارت تھی۔ اکثر وہ گارسا کو بھی اس فن سے متعلق بتاتا رہتا تھا چنانچہ مختصر سی مدت میں گارسا نے اس فن میں کسی حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔

ایک روز ڈان کو محکمہ پولیس کے کارکن اپنے چچیرے بھائی سے پتہ چلا تھا کہ اس کے یہاں انگلیوں کے نشان پہچاننے کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے چونکہ ڈان خود ایک اچھی تنخواہ پاتا تھا اس لئے اس نے یہ نوکری گارسا

اس شرط پر دلانا چاہا کہ ہر ماہ تنخواہ کا تیسرا حصہ کمیشن کے طور پر اسے دینا
ے گا۔ اس وقت تو گارسا نے حامی بھر لی۔ اس نے سوچا یہ نوکری مل
ئے تو اس غیر مناسب شرط سے بعد کو نمٹ لیا جائے گا۔

تھوڑی دیر میں وہ کیفے کے سامنے پہنچ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال
۔ اس نے دو سکے نکالے۔ ان میں ایک تانبے کا معمولی سکہ تھا اور دوسرا
ونے کا جس کے اسے پچیس پیسے مل سکتے تھے وہ اسے سدا سنبھال کر
کھتا خود سے زیادہ اس کا دھیان رکھتا اور سخت سے سخت ضرورت
ں بھی اس کو خرچ نہ کرتا۔ درحقیقت اسے اس سکے سے ایک محبوبہ کی
رح دلی محبت ہو گئی تھی یا پھر یوں کہنا چاہیئے کہ دن رات کی دوڑ دھوپ
ے بعد وہ اس سے محبت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بچپن میں گارسا
نے کئی ماہ تک پیسے جوڑ جوڑ کر اس خوبصورت سونے کے سکے کو خریدا تھا
ب وہ بڑے فخر سے اسے لوگوں کو دکھاتا تھا اور بعض موقعوں پر ضرورت
سے زیادہ جذباتی ہو جاتا تھا اور بڑے پیار و عقیدت بھرے لہجے میں کہا
رتا تھا۔

"آہ! یہ سکہ میری ماں نے مجھے اس وقت دیا تھا جب میری عمر
رف سات سال کی تھی"۔ اس اثنا میں اس نے اس سکے سے اتنا گہرا
لق پیدا کر لیا تھا کہ دن بھر میں ہزاروں بار اس سکے کو جیب سے
نکال کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتا۔ پھر اسے چوم کر جیب میں ڈال
یتا لیکن — بھوک کی شدت سے اب وہ مجبور ہو گیا تھا کہ اس سکے کو فروخت
ر ڈالے اور معدہ میں بھڑکتی آگ کو بجھائے مگر دل اور دماغ میں ہونے
الی شدید کشمکش برابر جاری تھی اور ابھی وہ کیفے کے باہر کھڑا اس کشمکش و
پنج میں مبتلا ہی تھا کہ ایک بھکاری کی التجا بھری آواز نے اسے اپنی طرف
متوجہ کر لیا اسے بیحد ہنسی آئی۔ بھلا مجھ سے یہ کیا لے سکیگا؟ کیا ہے میرے
پاس اسے دینے کے لئے؟ لیکن اپنی حالت کا دھیان آتے ہی وہ ایکدم
سنجیدہ ہو گیا وہ ظاہر میں ایک معزز شخص تھا جو ایک خوبصورت اور
بڑھیا کیفے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اگر وہ اس بھکاری کی التجا ٹھکرا
دے تو اس کا مطلب ہو گا کہ اس کی جیب بالکل خالی ہے۔ بھکاری کو
منع کرنے کے بعد اس کی حقارت بھری نظریں اس کی نگاہوں کے سامنے
ابھر آئیں اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ جیب میں پہنچ چکا تھا اور جب وہ باہر آیا

تو تانبے کا معمولی سکہ اس کے ہاتھ میں موجود تھا اس نے وہ سکہ بھکاری کے
ہاتھ پر رکھ دیا۔ لنگڑا بھکاری اس کو دعائیں دیتا واپس چلا گیا۔ اس نے
بڑے فخر سے گردن کو اونچا کیا اور اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی پھر کیفے
کے اندر داخل ہو گیا۔

کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر اس نے جیب میں پڑا سونے کا اکلوتا سکہ نکالتے
ہوئے کہا "ریزگاری چاہیئے!"

اکاؤنٹ منیجر نے اس کی طرف دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور کافی
دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ "کاہے کی ریزگاری — بھیک منگا کہیں کا"
گارسا کی آنکھوں میں ایکدم خون اتر آیا اس نے پوری طاقت سے چیختے
ہوئے کہا — "ذلیل — تیری یہ مجال کہ مجھے بھیک منگا کہے ..." مگر باقی
فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ نگاہوں نے سکہ کو دیکھ لیا تھا کاؤنٹر کی چمکدار
سطح پر تانبے کا حقیر ٹکڑا پڑا منہ چڑا رہا تھا۔

چند لمحوں کے لئے اس کا دماغ سن سے رہ گیا۔

اس کے بعد چوک کی طرف سیدھے بھاگا۔ ایک بچہ اس کی زد میں
آتے آتے بچا وہ خود دروازے سے بڑی زور سے ٹکرایا مگر بھاگتا رہا
اپنے معزز ہونے کا احساس نہ جانے کہاں جا سویا تھا لیکن جب وہ
سیڑھیوں پر آیا تو وہاں اس لنگڑے فقیر کا نام و نشان نہ تھا۔ ہاں!
نیچے سڑک پر اس کی جگہ ایک دوسرا لنگڑا فقیر بیٹھا ہوا تھا جو ایک
آنکھ سے اندھا بھی تھا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ لنگڑا بھکاری کہاں ہے؟ جو ابھی ابھی
مجھے ان سیڑھیوں پر ملا تھا"۔ اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وہ اب گھر جا چکا ہے"۔ اندھے بھکاری نے اپنی ایک آنکھ سے
اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اس کے گھر کا پتہ بتا سکتے ہو؟" گارسا نے دوسرا سوال کیا۔

اور اس بھکاری نے چند ثانیئے بعد گارسا کو اس لنگڑے بھکاری
کا پتہ بتا دیا۔ جس کو اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ لیا اور پھر تیز تیز
قدموں سے اس کے گھر جانے والے راستے پر چل دیا۔ دفعتاً ایک خیال اس
کے ذہن میں ابھرا — اگر یہ پتہ غلط ہوا تو ...؟ اور اس کا دل ڈوبنے
لگا۔ کیونکہ جس پتہ پر وہ جا رہا تھا وہ جگہ اب قبرستان ہو گئی تھی۔ وہاں

پر کھڑی بلند و بالا اور عالیشان عمارتیں اس خیال کو مزید پختہ کر رہی تھیں۔ شاید میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں' اُس نے رُک کر سوچا۔ یہ علاقہ تو بڑے مالدار اور معزز لوگوں کا معلوم ہوتا ہے لیکن جب پتہ پر نگاہ ڈالی تو خیال ڈگمگانے لگا۔ وہ پتہ اسی جگہ کا تھا وہ پھر چلنے لگا لیکن بھوک تھکاوٹ اور کمزوری سے اُس کی رفتار اب کافی سست ہو گئی تھی۔ وہ اب تیزی سے چلنے کی بجائے ایک عام آدمی کی رفتار سے چل رہا تھا کچھ دیر بعد وہ چٹ پر لکھے پتہ پر پہنچ گیا۔

یہ ایک انتہائی خوبصورت اور عظیم الشان عمارت تھی۔ دروازے پر پہرے دار کھڑا تھا جس کو دیکھکر وہ جھجکا اور سوچنے لگا۔ بھلا اس لنگڑے بھکاری کا یہاں کیا کام؟ اُسے تو یہاں کوئی گھسنے بھی نہ دے مگر پتہ تو یہی ہے — ہو سکتا ہے اُس اندھے بھکاری نے اُسے بیوقوف بنایا ہو۔ اس کے ذہن نے جرح کی۔ یا پھر کسی ٹینک میں ہونے کے باعث اس لنگڑے بھکاری کی بجائے کسی دوسرے کا پتہ دیدیا ہو۔ اور پھر دل نے بھی اس خیال کی تصدیق کر دی مگر خود کو مطمئن کر لینے میں کیا حرج ہے اس نے سوچا۔ اور اگلے ہی لمحے ہمت کر کے اس دربان سے پوچھا۔

"یہاں کوئی جارج آتھر رہتے ہیں؟"

"جی! ہاں! جارج آتھر یہیں رہتے ہیں!" دربان نے مؤدب لہجہ میں جواب دیا۔ "ان کا دوسری منزل پر چوتھا فلیٹ ہے تشریف لائیے!"

وہ ایکدم سرد ہو گیا جیسے منوں برف اس پر آ پڑی ہو۔ پھر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا۔ چار نمبر کا فلیٹ تلاش کرنے میں اُسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہرے رنگ کے دروازے پر جارج آتھر کے نام کی سرخ پلیٹ نے فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گھنٹی بجائی اور دروازے سے ذرا ہٹکر کھڑا ہو گیا۔ چند ثانئے بعد دروازہ کھلا اور خادمہ نے باہر جھانکا۔

"کیا جارج آتھر اندر ہیں؟" آگے بڑھکر اس نے کپکپاتے لہجہ میں پوچھا

"جی! تشریف لائیے" خادمہ ادب سے ایک طرف ہٹ گئی۔ اور وہ دھڑکتے دل سے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ کئی خوبصورت صوفے اور ایک بڑی میز عین وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ انھیں حیرت سے دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ کتابوں کی الماری پر ٹھہر گئی جس میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہاں کئی بڑی الماریاں تھیں جو صرف کتابوں سے بھری ہوئی تھیں وہ وہیں رُک کر انھیں دیکھنے میں محو ہو گیا۔ اور چونکا تو آگے بڑھنے میں اس کے قدم ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔

خادمہ نے اس کی حالت تاڑ لی وہ اس کے قریب آ کر بولی۔

"مسٹر جارج آتھر اندر ہیں۔ وہ ڈائننگ روم میں کھانا کھا رہے ہیں! آئیے —"

وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

کئی کمروں سے گزرنے کے بعد وہ خادمہ کے ساتھ ڈائننگ روم میں آیا۔ وہاں ایک بڑی سی میز پر کھانا چنا ہوا تھا۔ تازہ تازہ کھانے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے اس کی بھوک یک لخت تیز ہو گئی۔ یہ اس کی پسندیدہ غذا تھی وہ فوراً آگے بڑھکر میز قریب آ گیا۔ چاہا کہ پلیٹ اٹھا کر اپنی بھوک مٹائے کہ اس کی نظر کرسی بیٹھے ایک شخص پر پڑی۔ کچھ دیر کے لئے سکتے کے دائرے نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور وہ بھونچکا سا اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس سامنے جارج آتھر ایک قیمتی لباس میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ جو اُس وقت انتہائی پُروقار، پُرکشش اور نامدار شخصیت بنا ہوا تھا۔ اور پھر اس کی تیز نظر دل نے بھی بھانپ لیا۔ کہ وہ بالکل لنگڑا نہیں ہے اس کی ٹانگیں قطعی صحیح سلامت اس کے سامنے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو نازک بلوریں جام رکھے ہوئے تھے اور دائیں ہاتھ میں کسی جانور کی بھنی ہوئی ران پکڑے وہ مسکرا رہا ایک بار پھر گارسا کا دماغ جارج آتھر کے بارے میں الجھ گیا کہ ہو سکتا اس شریف آدمی کی شکل اُس لنگڑے بھکاری سے ملتی جلتی ہو لیکن اس سے پہلے کہ اُس کا دماغ اس خیال پر کوئی فیصلہ کرے۔ جارج آتھر اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ کسی بڑے آدمی کی طرح پشت پر باندھ اور ایک وکیل کے سے انداز میں ٹہلتا ہوا اس کے قریب آیا کچھ دیر اس آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر بڑے مہذب لہجہ میں بولا۔

"آئیے آئیے تشریف لائیے — یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے غریب خانے پر آئے — کھانا کھائیے گا؟"

اب گارسا اچھی طرح پہچان چکا تھا کہ یہ وہی لنگڑا بھکاری ہے

...ں کمتری کے دائرے سے باہر نہ آسکا۔ وہ تو یہ سوچ کر چلا تھا کہ لنگڑا ... اگر سکہ دینے سے انکار کرے تو وہ گلا گھونٹ کر اپنا سکہ چھین لے گا ... اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں ... کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کرنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ آخر کچھ دیر کی جد و جہد کے بعد اس نے خود کو احساس ... ی کے دائرے سے باہر نکال لیا اور ایکدم اپنے مقصد کی طرف آگیا۔

"معاف کیجئے گا کہ اس وقت آپ کو تکلیف دینے چلا آیا۔ دراصل آپ سے مجھے ایک ضروری کام تھا ......" وہ رک کر جارج ... کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے اس ناچیز کو ... رکھا۔ آپ کو یاد ہوگا ابھی کوئی ایک گھنٹہ قبل میں نے آپ کو ایک ... دیا تھا وہ سکہ ..."

... بیچ میں جارج آتھر نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس نے اس کا موقع نہ دیا۔ ... بولا کہ میں نے ابھی بتایا کہ ایک سکہ میں نے آپ کو دیا تھا تو اس کو واپس مانگنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن اسے کیا کیا جائے کہ وہ سکہ میرے لئے ... سونے کے ٹکڑوں سے کہیں زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ...."

"جانے بھی دیجئے ___ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تشریف رکھئے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں"۔ اس کے چلے جانے کے بعد ... رسا نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا جلدی سے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ مگر جب وہ اسے بے پناہ کوشش کے بعد اپنے حلق سے نیچے نہ اتار سکا تو اس نے شراب کے ایک گھونٹ کی مدد لینا مناسب سمجھا اور چند لمحوں بعد شراب کے سہارے وہ ٹکڑا خالی معدہ میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن ابھی وہ شراب کی بوتل میز پر رکھنے بھی نہ پایا تھا کہ جارج ایک پھٹا پرانا کوٹ لئے اندر داخل ہوا اور خاموشی سے اس کوٹ کی تمام جیبیں خالی کرنا شروع کر دیں۔ کچھ ہی دیر میں میز پر چھوٹے بڑے سکوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ڈھیر کو تک رہا تھا۔ وہ خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ ان پھٹے پرانے کپڑوں سے اتنی دولت حاصل کی جا سکتی ہے۔ دفعتاً اس کی نظر اپنے سونے کے ٹکڑے پر پڑی جو تانبے کے ٹکڑوں کے بیچ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جارج نے بھی اس کو دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً بول اٹھا۔

"آہا! تو یہ رہے تم ..... اٹھو بھائی ..... یہ تمہاری جگہ نہیں ... تم تو معزز آدمیوں کے جیب کی رونق ہو۔ ہم غریبوں سے تمہارا کیا تعلق؟"

گارسا کو محسوس ہوا جیسے اس کے اندر ایک بڑی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ پہلے تو وہ اپنے سکے کو حاصل کرنے کے لئے بیحد بے چین تھا اور اب شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کاش! دھرتی پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ کاش! آسمان ٹوٹ پڑے اور وہ فنا ہو جائے۔ کچھ دیر تو وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔

"میں یہاں سکہ واپس لینے بھی نہ آتا اگر ....." اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

"ہم کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کریں گے"۔ جارج سے اس کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔

"نہیں ___ آپ کو سننا ہی پڑے گا ___ یہ سکہ میری ماں نے اس وقت مجھے دیا تھا جب میری عمر سات سال کی تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی اسے اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس میری ماں کی یہی ایک نشانی ہے۔"

جارج اسے بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ گارسا کو محسوس ہوا جیسے جارج سمجھ رہا ہے کہ اس کی یہ بات من گھڑت ہے ___ اس کا احساس ہوتے ہی اس کا دماغ کھول اٹھا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان ساتھ نہ دے سکی۔ جارج اب تک اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اسے وہ نگاہیں اپنے دل میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں، روح میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اور پھر وہ ایکدم بول پڑا۔

"مسٹر جارج ___ اس سکہ سے متعلق جو بات میں نے ابھی کہی ہے وہ صرف ایک من گھڑت کہانی ہے۔ آپ کتنے رحمدل ہیں؟ کتنے بلند ہیں۔ ایک بار مجھے معاف کر دیجئے!"

اب جارج آتھر اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا اور اس کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔

میں کبھی آپ سے یہ سکّہ واپس نہ لیتا۔ دو دن سے مجھے کھانے کو
کچھ نہیں ملا۔ مکان مالکن نے تنگ آکر نوٹس دیدیا ہے کہ اگر
ام تک کرایہ ادا نہ کیا تو وہ میرا سامان باہر گلی میں پھینک دے گی۔"
ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ جیب سے تانبے کا سکہ نکالتے ہوئے بولا
یہ لے لیں جو میں حقیقت میں آپ کو دینا چاہتا تھا۔" یہ کہکر اس
سکّہ جارج آتھر کی طرف بڑھا دیا۔ لیکن جارج آتھر نے اس کا ہاتھ
اتے ہوئے بڑے نرم اور ملائم لہجہ میں کہا ـــ مجھ سے زیادہ تمہیں
ضرورت ہے .... تم اسے اپنے پاس رکھو۔"
لیکن یہ آپ کا پیسہ ہے ـــ میں نہیں چاہتا کہ میرے باعث
کے کاروبار کو نقصان پہنچے۔"
نہیں ـــ یہ سکّہ میں ہرگز نہ لوں گا ـــ اسے اپنی جیب میں رکھ لو"
ہوئے جارج آتھر نے اس کی بھیگی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو
چاہا تو گارسا یکدم اس کے قدموں پر گر پڑا اور اس کے پاؤں چومنے
جارج آتھر بڑی مشکل سے اُسے اوپر اٹھانے میں کامیاب ہو سکا۔

پھر وہ اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا ـ
"تم بھوکے ہو ـــ لو کھانا کھاؤ۔"
گارسا چند ساعت رُکا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے بعد اس نے
خوب شراب پی۔ جارج آتھر برابر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اب وہ
بہکنے لگے تھے لہجہ لڑکھڑانے لگا تھا۔
"تم نے ابھی کہا تھا ـــ کہ تم مفلس ہو گئے ہو۔"
"وہ تو میں ہوں ـــ گارسا اٹھتا ہوا بولا۔ پر اب میں سونے
کے اس سکّہ کو بیچ دوں گا!"
لیکن ـــ تم یہ سکّہ ہرگز نہیں بیچو گے ـــ جارج آتھر نے کہا۔
"ورنہ مجھے دکھ ہوگا۔ لو .... یہ لو .... اس نے جیب سے کچھ نوٹ
نکالے اور گارسا کی جیب میں ٹھونس دیئے ـــ اور دیکھو جب ضرورت
پڑے ایکدم چلے آنا۔ ہچکچانا، شرمانا نہیں۔"
یہ کہکر بھکاری جارج آتھر نے اپنی باہیں گارسا کے گلے میں
ڈال دیں۔

راہی بلند شہری

شب ہائے رفتہ

شراب و شہد میں ڈوبی ہوئی فضاؤں میں
مہکتی، جھومتی، گاتی ہوئی فضاؤں میں
کسی کی نقرئی اور نغمہ زا صداؤں میں
کسی کے کاکلِ عنبر فشاں کی چھاؤں میں
گزر گئی ہیں جو گھڑیاں وہ دل دکھاتی ہیں
جو راتیں بیت گئی ہیں وہ یاد آتی ہیں

وہ بیخودی کا اک عالم وہ مستیوں کا جہاں
نہ پاسِ ہوش و خرد اور نہ فکرِ سود و زیاں
وہ بزم وہ کہکشاں اور وہ ماہتابِ جواں
وہ رنگ و نور کی بارش وہ جنتوں کا سماں
وہ جنتوں کی فضائیں مجھے ستاتی ہیں
جو راتیں بیت گئی ہیں، وہ یاد آتی ہیں

وہ لالہ رُخ، وہ ثریا نگار و ماہ جبیں،
وہ چشم و ابرو و رخسار، وہ لبِ لعلیں
وہ حسنِ کفر و قیامت بدوشِ و حشر آگیں
وہ اک حسین مجسم بہارِ خلدِ بریں
اسی حسین کی یادیں مجھے رلاتی ہیں
جو راتیں بیت گئی ہیں وہ یاد آتی ہیں

سکون جب نہیں ملتا کہیں زمانے میں
نہ مسکرانے، نہ اشکِ الم بہانے میں
کسی بھی غیرتِ ناہید کے ترانے میں
کسی حسینۂ زہرہ جبیں کے گانے میں
تو بھولے بسرے ہوئے گیت پھر سناتی ہیں
جو راتیں بیت گئی ہیں وہ یاد آتی ہیں

وہ انتظار مرا بیخودی کے عالم میں
وہ سوچ چراغِ تمنا نگاہِ پُر نم میں
ذرا بھی دیر سے پہونچا تو غصہ و غم میں
وہ رنجشیں سی عیاں کر کے چشمِ برہم میں
"کسی کا کہنا" یہ باتیں ہمیں جلاتی ہیں"
جو راتیں بیت گئی ہیں وہ یاد آتی ہیں

وہ دو دلوں کے تقاضوں کی پاسباں راتیں
جوانیوں کی نزاکت کی رازداں راتیں
کسی کے زلفِ معنبر کی داستاں راتیں
وہ ہائے میری محبت کی کہکشاں راتیں
افق پہ میرے تصور کے جھلملاتی ہیں
جو راتیں بیت گئی ہیں وہ یاد آتی ہیں

الطاف مشہدی

سُن رے کالے کاگ

اُجڑا جوبن رنگت پیلی　رُوٹھ گئی مسکان رسیلی
مَن میں جلتی ہے برہا کی
دِھیمی دِھیمی آگ
سُن رے کالے کاگ
کُٹیا پر تُو بول رہا ہے　جیون میں رس گھول رہا ہے
کیا مَن موہن آجائیں گے
چھیڑا ہے کیا راگ
سُن رے کالے کاگ
کبھی کبھی ہم سُن لیتے تھے　لیکن مَن کو ڈس لیتے تھے
گورے مُکھڑے پر لہرا کر
کالے کالے ناگ
سُن رے کالے کاگ
جیون اب ویران پڑا ہے　مُدت سے سُنسان پڑا ہے
اُڑ کر لا دے کاگ کہیں سے
اُجلے اُجلے بھاگ
سُن رے کالے ناگ

حمید الماس

نہ ستائش کی تمنّا.....

ندا آئی
انبوہِ شیدائیاں
نازنینانِ شہرِ تخیّل
غزالانِ فکر و نظر
غمگسارانِ دار و صلیب و رسن
بڑی دیر سے
عقیدت کی نایاب سوغات لے کر
درِ گنبدِ فن پہ سجدہ کناں ہیں

پئے دیدنِ منظرِ شاد کاماں
بڑی تمکنت سے اُٹھا، اُٹھ کے میں نے
جو دیکھا تو حدِّ نظر تک فروکش
لہو کی لکیروں کا اِک کارواں تھا
کبھی جو رگ و پے میں میری رواں تھا!

منظوم خواب

پھر کسی دشت میں آنکلا خیابانِ طلب
جا بجا دیکھ رہا تھا میں غزالانِ طرب
نقرۂ ناب کوئی، شاخِ سمن، جانِ عنب
راحتِ درد، ترنم کی کلی، آنِ عجب
محفلِ درد میں اِک بار تھا مہ پاروں کا ہجوم
دامنِ شب میں ہوا جیسے بہاروں کا ہجوم
پھر سرِ عرش یکایک ہوا تاروں کا ہجوم
جانے کس سوچ میں پھر ڈوبا نگاروں کا ہجوم
زرشِ لب، ہیر بھی ہیں مال، غزالہ لیلیٰ
انجمن آرا بھی،
گل کلی، ستیا سلمیٰ
رات کی رانی کا ہر جوڑے میں دل کش گجرا
پریت کی آنکھوں میں تھا بان کا نازک گجرا
پھر کسی گنج سے اٹھی کوئی امید کی حور
نکہت و رنگ کا ہر سمت تھا پھر نور ہی نور
دیکھتے دیکھتے ارماں کا تردّد ہوا دور
نزہتِ حسن کی صہبا سے ہوا دل کو سرور
دل کی آنکھوں نے جو دیکھا وہی منظوم سا خواب
مسکراتے رہے پھر فکر کے ہونٹوں کے گلاب

نے جو دیکھا وہی منظوم تھا خواب
بنا،
ب شباب
ن کھلا
ول کا رباب
ہے پھر فکر کے ہونٹوں کے گلاب
سے تھامے ہوئے جوبن کے کنول
،
ک تاج محل
ہے
ب، سازِ غزل
ئی تو سرور تھا فن کار ازل
رس نے کیا روپ کا جاں بخش سنگھار
ون کو دیا نغمے کا خاموش خمار
غنچوں کو نکہت کی شگفتہ دی بہار
ب میں شفق نے کیا چپ کے سے قرار
بیب کو دی قامتِ موزوں کی پھبن
ے کھلا نغموں کا خوابیدہ چمن
ے ذرا اُٹھا جو گگن دان سا بدن
ا میں چھلکنے لگا فن کار کا فن

فرحت کیفی

گھروندا

اِک مُدّت کے بعد
کنارے اس دریا کے آپہنچا ہوں'
جہاں پہ شاموں کے رنگیں لہراتے سائے
رات کے اندھیارے میں گڈ مڈ ہوجاتے تھے
بیٹھے بیٹھے ایک گھروندا بن جاتا تھا
تم بینا کے سُر پہ میرے گیت سُناکر
اَرمانوں کے کتنے سُندر خواب سجاکر
مجھ کو بس یُونہی سا بہلایا کرتی تھیں
میں بے خود سا ہوجاتا تھا

اِک مُدّت کے بعد
کنارے اس دریا کے آپہنچا ہوں
وہی گھروندا آج مرا مُنہ چِڑا رہا ہے!

کرشن موہن

ندامت

کام آ پڑا کیا ہم نے کب
بات بڑی کیا ہم نے کی
دنیا کو کیا راحت دی
دھرتی کو کیا حسن دیا
اور کیا رنگ و آہنگ دیئے
مست رہے سرشار رہے
روز و شب تھے عشرت ہی
چند قوافی جوڑ کے ایک غزل کہہ لی
بات بڑی کیا ہم نے کی؟!

دیر تک دُور تک

لَمس کے ہاتھ میں چاند گہنا گیا
سارا منظر
پسینے میں ڈُوبا ہوا
دیر تک، دُور تک

ہانپتا ہی رہا
آنکھیں کھو گئیں

دُھندلی پرچھائیاں
ٹُوٹ گرتے ستاروں کی خوشبو اُڑی
خواہشوں کی رگیں
پُھول کر کِھنچ گئیں
چھپکلی کی کٹی دُم
تھرکتی رہی
دیر تک
دُور تک

عادل منصوری

میکش غازی پوری

دیوالی

ہزاروں سال کی تہذیب اس پہ شاہد ہے
مناتے آئے ہیں ہر سال "جشنِ دیوالی"
ہمیشہ ہم نے چراغِ وفا جلائے ہیں
ہمیشہ کی ہے اندھیروں کی ہم نے پامالی

فضا میں نور برستا ہے جن چراغوں سے
ہمیں انھیں سے مگر کچھ سبق بھی ملتے ہیں
جو ان کی "صورتِ تخلیق" پر نگاہ کریں
قدم قدم پہ "اخوت" کے پھول کھلتے ہیں

یہ ننھے ننھے دیئے صف بہ صف منڈیروں پر
کسی اکیلے کی محنت کی یادگار نہیں
یہ آب و آتش و گل کے رہینِ منت ہیں
کہ ان چراغوں کا خالق فقط کمہار نہیں

الجھ کے گردشِ دوراں کے سرد و گرم کے ساتھ
عمارتوں کے در و بام ناز دیکھے ہیں
زمیں کی گود سے "سرسوں" نے تیل بننے تک
نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں

کسی کنواری کی شفاف "مانگ" کی صورت
دیئے کے تیل میں ڈوبی ہوئی سفید لکیر
نہ جانے کتنے ہی ہاتھوں سے اس کا رشتہ ہے
یہ اک کپاس کی بتی ہے "محنتوں کی سفیر"

غرض کہ سیکڑوں ہاتھوں کی "قوتِ تخلیق"
بروئے کار جب آئے "چراغ جلتا ہے"
مگر نہیں ہے جہاں پر یہ "اتحادِ مزاج"
وہاں فضا میں "ہوس" کا اندھیرا پلتا ہے

یہ اتحاد کی زنجیر ٹوٹ جائے اگر
ترس کے آدمی رہ جائے روشنی کے لیئے
یہ "بے زبان نمائندہ" ہیں اخوت کے
یہ ایک درسِ حقیقت ہیں آگہی کے لیئے

زہے نصیب کہ پھر آرہی ہے "دیوالی"
اس ایک عہد کے ساتھ اب خوشی منائیں گے
بکھیر دے جو محبت کی روشنی ہر سو
ہم "ابکے" پیار کے ایسے "دیئے" جلائیں گے

وامق

کھٹّے انگور

ایک صاحب ہیں، مرے شہر میں خاصے مشہور   قوم کے درد سے رہتے ہیں جو ہر دم رنجور
ٹھیکیداری بھی ہے راشن کی دکانیں بھی ہیں   ہر طرح خرّم و خوش حال ہیں چشمِ بد دُور
ماہرِ فنِّ سیاست بھی، مقرّر بھی ہیں   نطق کے سحر سے کرتے ہیں دلوں کو مسحور
ان کی خدمت میں جو کل صبح کے ہنگام گیا   وہ نظر آئے مجھے حد سے زیادہ مسرور
سامنے میز پہ تھی چائے کی کشتی رکھی   اِک طرف قاب میں تھے تازہ چمن کے انگور
مجھ کو بھی چائے عطا کی گئی از راہِ کرم   اِس نوازش پہ ہوا دل سے میں ان کا مشکور
باتیں ہونے لگیں پھر وقت گزاری کے لیے   میں کہ تھا فکرِ معیشت سے ملول و رنجور
ان سے کرنے لگا موجودہ گرانی کا ذکر   اور کی عرض کہ اب زیست ہے دشوار حضور
اب تو دو وقت کی روٹی کا ٹھکانا بھی نہیں   اس طرح ہم ہوئے مہنگائی کے ہاتھوں مجبور
اس طرح قلّت و قیمت نے کمر کو توڑا   کہ بنا جاتا ہے اب زخمِ معیشت ناسور

بات پوری ابھی کہہ بھی نہ سکا تھا کہ اُدھر   شکن آلودہ نظر آئی جبینِ پُر نور
دفعتاً صاحب موصوف غضبناک ہوئے   دفعتاً چشم ہوئی شعلہ فشاں مثلِ تنور
ہوا ارشاد کہ شکوہ ہے گرانی کا غلط   سرِ بازار ہے دو روپئے فی سیر انگور
یعنی بازار میں انگور ہے سستو کے بھاؤ   جو غریبوں کا ہے کھانا جو غذائے مزدور

پھر یہ کہنا کہ گرانی سے ہوئے آپ تباہ!
جھوٹ ہے جھوٹ ہے واللہ حقیقت سے ہے دور

٭ ٭ ٭

امینہ ابوالحسن

سیلز گرل

ہمارے ملک میں سیلز گرل کا رواج عام نہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہاں لڑکی خود ایک بکاؤ شئے ہے۔ وہ مغربی ممالک کی لڑکیوں کی طرح گھر گھر گھوم نہیں سکتی، بلکہ سیلز گرل بن بھی جائے تو صرف دوکانوں کے کاؤنٹر پر ہی کھڑی رہتی ہے۔ وہ مغربی سیلز گرل کی طرح اتنا بناؤ سنگھار بھی نہیں کرتی، نہ اپنے آپ کو اسطرح سجاتی ہے کہ لوگ دام پوچھے بغیر ہی اس سے سامان خرید لیں۔ مگر، سیلز گرل مشرق کی ہو یا مغرب کی اس کا کام تو چیزیں فروخت کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کو فروخت کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ ہندوستانی سیلز گرل ظاہری طمطراق نہ رکھتی ہو تو کیا وہ اپنی دلچسپ باتوں سے آپ کو یوں زیر کر لیتی ہے کہ آپ اس سے کوئی نہ کوئی چیز خریدے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر ہندوستان میں بھی کبھی کبھی کوئی الٹرا ماڈرن سیلز گرل آپ کے گھر یوں آ دھمکتی ہے جیسے کوئی پرانا قرض خواہ۔ اور کسی ستم ظریف نے کتنا سچ کہا ہے کہ عورت مرد کی کمزوری تو ہے ہی، لیکن سیلز گرل کی صورت میں خود عورت کی کمزوری بھی بن جاتی ہے، جیسے آپ نہایت مگن مطمئن کھانا پکانے میں بری طرح مصروف ہیں۔ لکڑیاں گیلی ہیں، چولھا جل نہیں رہا ہے۔ آپ پھونکیں مارتی مارتی عاجز آ چکی ہیں کہ اچانک دروازے کی زنجیر دبی زبان میں کھٹکھٹاتی ہے۔ آپ جھجکتی ہوئی بے وقت آنے والے کو جانچنے کے لیئے ذرا سا دروازہ کھولتی ہیں کہ سیلز گرل آپ کی حیرانی سے بے نیاز دھڑ سے داخل ہو جاتی ہے۔ پھر نہایت دلکش مسکراہٹ کے ساتھ نرم اور مہذب لہجے میں فوراً آپ کا دھیان بٹاتی ہے۔ ارے آپ کے بالوں، آپ کے رخساروں پر تو راکھ بھی ہے۔ آنکھوں کا کاجل اتر گیا ہے۔ چہرے پر سرخی کا نام و نشان تک نہیں۔ پھر بھی کس غضب کا حسن اور بانکپن خدا نے آپ کو عطا کیا ہے۔

حسن کا بہلاوا آپ کی ساری اجنبیت سارے غم دور کر دیتا ہے۔ ہونی اور انہونی کو بھول کر آپ یکایک مسرور ہو اٹھتی ہیں اور اپنے سارے فرائض بھول کر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہیں۔ مگر سیلز گرل پر اپنی عدیم الفرصتی کا اثر ڈالنے یہ ضرور کہتی ہیں۔ دیکھو جی میرے پاس وقت بالکل نہیں، جو کچھ دکھانا ہے جلد جلد دکھاؤ۔

وہ جال میں پھنسے شکار کو بھانپ کر فوراً اپنا پٹارہ کھول دیتی ہے۔

"میرے خیال میں آپ کو سب سے پہلے اصلی ولایتی پاؤڈر خریدنا چاہیئے۔ آخر کب تک اس حسن کو راکھ میں اٹے رکھیں گی۔"

اس بات کو سن کر آپ مارے خجالت کے چہرے سے پسینہ پونچھتی ہیں اور آپ پر اتنی خفت طاری ہو جاتی ہے کہ بھاؤ تاؤ کیئے بغیر ہی پوڈر خرید لیتی ہیں۔ اس وقت تک آپ پوری طرح سیلز گرل کے قبضے میں جا چکی ہوتی ہیں اور وہ پورے اطمینان کے ساتھ آپ پر پے در پے حملے شروع کر دیتی ہے۔

"آپ کی ان چمکیلی اور خوبصورت آنکھوں کے لیئے تو یہی کاجل چاہیئے جو اس وقت میرے پاس موجود ہے۔ اتفاق سے آخری شیشی رہ گئی ہے شاید آپ ہی کے حصے کی تھی ورنہ کتنی تو اب تک دھڑا دھڑ فروخت ہو چکیں، اور یہ آتشیں لپ اسٹک، سلور گرے پنسلیں، چہرے کے خطوط دلکش بنانے کا یہ جدید ترین سامان ہے۔"

کسی نئی نویلی دُلہن کی طرح اپنی خوبصورتی کی تعریف سے مسرور آپ نادانستہ سیلز گرل سے سارا سامان چپکے چپکے لیتے جاتی ہیں۔ اس وقت آپ یہ تمیز کرنے کے قابل ہی کہاں رہ جاتی ہیں کہ آپ درحقیقت کوئی عمدہ شئے خرید رہی ہیں یا محض گھٹیا۔ آپ کو تو اپنے حُسن کی تعریف سُن کر یوں لگتا ہے جیسے دو جہاں کی دولت مِل گئی ہو۔ اور سیلز گرل کا سامان بڑی سُرعت کے ساتھ آپ کے پاس منتقل ہونے لگتا ہے اور اُس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ ایک کڑوی کسیلی بو آپ کو چونکا نہیں دیتی۔ تب آپ کو یاد آتا ہے۔ ارے گوشت جل کر خاک ہو گیا۔ سبزی اور دال داغ کھا گئے، چاول گُلّتی بن گئے۔ آپ سرپٹ چولھے کی طرف دوڑنا چاہتی ہیں، لیکن سیلز گرل اپنے کام سے فراغت کے قولی احساس کے ساتھ اپنی بے پناہ عُجلت کا واسطہ دیکر اسی کشمکش کی حالت میں آپ سے رقم وصول کر لیتی ہے۔ اور آپ بے بسی سے خود کو، چولھے چکی کو، گھر گرہستی کو، کوستی ہوئی چولھے کے پاس دوڑ جاتی ہیں اور دیر تک سر تھامے بیٹھی رہ جاتی ہیں۔

اب پہلی مرتبہ آپ کو سیلز گرل پر غصہ آتا ہے لیکن وہ تو آپ کی پہونچ سے دُور کسی اور دروازے کو کھٹکھٹاتی نظر آتی ہے۔ شرافتِ نفس کے نلطے ایکبار آپ کے جی میں آتی ہے، پڑوسن کو اس ناگہانی آفت سے بچانے کا کوئی نہ کوئی جتن ضرور کریں۔ مگر پھر عورت کی خاص جبلت کے تحت آپ یہ باور کر لیتی ہیں کہ جس تکلیف سے آپ خود گزری ہیں اُس سے دوسروں کو ناحق کیوں بچائیں، سو آپ لوٹ آتی ہیں اور پھر جس دن سیلز گرل کا دیا ہوا خالص ولایتی پوڈر استعمال کرتی ہیں تو محسوس کرتی ہیں جیسے چونا اپنے مُنہ پر مَل رہی ہوں اور جب کاجل لگاتی ہیں تو آنکھوں میں اسقدر جلن اور تکلیف ہوتی ہے، اتنا پانی بہتا ہے کہ اوروں سے نظر ملانی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت کسی کے پوچھنے پر سوائے اس کے کیا جواب دیا جا سکتا ہے کہ مجھے آج یکایک ہمیں کُنبے کے سارے مرحومین یکے بعد دیگرے یاد آ رہے ہیں۔ اسی طرح لپ اسٹک اور دوسری اشیا بھی ایسی ہی کسی نہ کسی خصوصیت کی حامل پائی جاتی ہیں اور آپ سوچ سوچ لیتی ہیں۔ آ تو جائے کمبخت ایک بار پھر۔ مزہ نہ چکھا دیا ہو تو نام نہیں۔

لیکن وہ کمبخت آنے ہی کیوں لگی۔ اُسے خود بھی تو احساس رہتا ہے کہ صرف اس کی باتیں ہی دل کو موہ لینے والی ہوتی ہیں۔ بقیہ سب کچھ نہایت ناپائیدار!۔

مگر سچ پوچھیئے تو اسی نوعیت کا کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا تجربہ ہر عورت کو یہ گُر سکھا دیتا ہے کہ جب کوئی چیز لینی ہو تو چاہے کم سے کم قیمت ہی کی کیوں نہ ہو، سو بار پرکھو، سو بار دوکاندار کا سر کھاؤ سو بار لینے اور نہ لینے کی کشمکش کے درمیان لٹکتی رہو، چاہے وقت برباد ہو جائے مگر قیمت کسی حال برباد نہ ہو۔ ▲


Steel

شفیقہ فرحت

عُمر بھر رہے خواری سے!
اور وہ بھی چائے کی ایک پیالی سے!!

رِند تو کائنات کو میخانہ اور ارض و سما کو ساغر و پیمانہ تک بنا لیتے ہیں۔ لیکن ہماری وہ بے کس قوم کیا کرے کہ جس کی پہنچ سے مے و میخانہ تو پرے ہے مگر جسے رِندی ادبی ورثے کے طور پر عطا کر دی گئی ہے۔ مجبوری کا اسم شریف چونکہ صبر ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے صبر کے گھونٹ چائے میں گھول کے پینے شروع کئے۔ آہستہ آہستہ ہمارا یہ صبر صبرِ ایوب کے درجے تک پہنچ گیا۔ اب تو یہ حالت ہے کہ خود بے تحاشا چائے (کہ جو علامتِ صبر ہے ——!) پیتے ہیں اور دوسروں کو پکڑ پکڑ کر پلاتے ہیں۔ اس مہم کے لئے التجا، جھکی، حکم ہر حربے کا استعمال جائز ہے۔ بلکہ اگر فریقِ ثانی کی جسمانی قوت خطرناک حدوں تک پہنچی ہوئی ہو تو پولیس کی مدد بھی لی جا سکتی ہے ——!!

ہوتا یہ ہے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور ہم جو اب تک اداس پریشان کھوئے کھوئے دنیا سے بیزار بیٹھے تھے اور سنیما سے لینے کا پروگرام بنا رہے تھے اور پریشان تھے کہ اس سلسلے میں کسی ٹراول ایجنسی سے مدد لی جائے۔ وہیں ہم خوشی سے اچھل پڑتے ہیں سردی ہو یا گرمی چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ اس پر کچھ ایسے ماڈرن قسم کے رنگ بکھر جاتے ہیں جن کے متعلق یہ نہ کہا جا سکے کہ سرخ ہے یا نیلا۔ نارنجی ہے یا کالا۔ اودا ہے یا پیلا۔ پوائنٹ فائیو مرلے شیشوں کے پیچھے چھپی ہوئی وہ آنکھیں جن کا وجود روایتی محبوب کی روایتی کمر یا دہنِ واہم خیال کی ٹکر کا ہے اس طرح چمک اٹھتی ہیں جیسے دن کی تیز روشنی میں ٹارچ ——!

سانس کی رفتار پر قرب و جوار کے باشندے میر کو یاد کرتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں ——" سانس بھی آہستہ کہ" ... اور یقین مانئے نئی اور پرانی دنیا کے قدیم اور جدید کسی دور میں مجنوں فرہاد اور رومیوں کے Status اور گریڈ تک پہنچے ہوئے کسی عاشق کو اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ سے اتنی خوشی نہ ہوئی ہو گی جتنی ہمیں دستک کو سن کر ہوتی ہے۔! انتہائی تپاک سے مہمان کا استقبال کیا جاتا ہے "آئیے —— آئیے بھئی واہ۔ خوب آئے آپ —— ارے کوئی ہے۔ آپ کے لئے چائے بناؤ ——"

"جی چائے ——؟" وہ یوں دہشت زدہ ہوتے ہیں گویا ان کے آگے ہم گھاس کا گٹھا رکھوا رہے ہوں ——!

"جی ہاں چائے —— ہماری مسرت میں ان کی دہشت سے کوئی کمی نہیں ہوتی ——!!

"لیکن یہ تو چائے کا کوئی وقت نہیں۔" وہ تنکے کی تلاش میں ہاتھ پیر مارتے ہیں۔

"لیجئے بھلا وقت کیسے نہیں۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں بعض شرفا تو اس وقت بیڈ ٹی لیتے ہیں ۔۔!"

"معاف کیجئے گا۔ بیڈ ٹی سے کہیں آپ کی مراد دوپہر کے کھانے کے بعد پلنگ پر بیٹھ کر پی جانے والی چائے تو نہیں ۔۔؟"

"خیر آپ جو سمجھ لیں۔ بہرحال موت کی طرح چائے کا تو کوئی وقت معین ہے نہیں۔ وہ تو صبح کے چھ بجے سے شام کے چھ بجے تک اور پھر شام کے چھ سے صبح کے چھ تک کسی بھی گھڑی بلاخوف وخطر پی جا سکتی ۔۔۔۔!"

اب وہ چائے کے طبی، اخلاقی اور اقتصادی نقصانات کی ایک طویل فہرست پیش کر کے عبرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جواب میں ہم چائے کی کمپنیوں کے اشتہارات کے سہارے چائے کو زندہ طلسمات اور آسمانی مخلوق کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں کہیں تخلیف ہو اور کیسی ہی تکلیف ہو۔ بس چائے کی ایک پیالی میں ہر چیز غرق ۔۔! بلکہ اب تو یہ تک یقین ہو چکا ہے کہ مالک کو تکلیف ہو تو نوکر کو چائے پلا دیجئے۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا ۔۔!!

وہ تہذیب اور آداب کو الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں رکھ کر اٹھتے ہیں تاکہ نظر بچا کے بھاگ سکیں۔

مگر ہم نے بھی شیشے کی پکی گولیاں کھیلی ہیں ۔! دروازہ پہلے ہی بند ہو چکا ہے ۔! اب تو ارادہ یہ ہے کہ مہمان کے آنے ہی احتیاطاً تالا بھی پڑ جایا کرے ۔۔!! اتنی دیر میں چائے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی بے بسی سے پیالی کو دیکھتے ہیں اور ہم انتہائی مسرت سے ان کو انہیں اپنی قسمت پر رونا آتا ہے تو ہمیں اپنی پہ رشک ۔۔! وہ اس کرب سے چائے حلق میں انڈیلتے ہیں جیسے دوزخ میں رہنے کی ریہرسل کر رہے ہوں۔ اور ہم اس سکون سے جیسے جنت میں پہنچ گئے ہوں!

لوگ اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اپنی جان مال اور آل اولاد اور ہماری دوستی کا واسطہ دیتے ہیں۔ واضح اور غیر واضح طریقے پر بڑی بڑی لالچیں دیتے ہیں مگر جوں تک ہمارے کانوں کے آس پاس کے علاقے میں چہل قدمی کرنے سے انکار کرتی ہے ۔! اور ہم اسی طرح اصرار کئے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض حاسدوں کا تو یہ کہنا ہے کہ ہمارا اصرار اب وہ شدت اور وہ نوعیت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ ہم پر فوجداری کا مقدمہ بہ آسانی دائر کیا جا سکتا ہے۔۔! حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن نتیجہ یہ ضرور نکلا ہے کہ چند کم ہمت اور ڈرپوک قسم کے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ ہم سے لاگ اور لگاؤ ہر قسم کے تعلقات ختم کر لئے ہیں بلکہ ہماری گلی سے گزرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اور جو کبھی محلے کے کسی حصے میں مجبوراً آنا ہی پڑے تو وصیت نامہ تیار کر کے اور سر سے کفن باندھ کر آتے ہیں ۔۔!!

رنگ چائے کا خوشبو بھاپ لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے میز پر آنے کا نام

اور بیگانوں کی بات تو چھوڑئیے۔ اکثر خود اپنی ہی جان اس رنگ و نور کے طوفان کی وجہ خطرے میں پڑ جاتی ہے کچھ بڑے اہم اور رشتے کے اعتبار سے ۴.۱.۷ قسم کے بزرگوار کو لینے اسٹیشن پہنچے۔ پتہ چلا کہ گاڑی جسے عام حالات میں رات کے ایک بجے آ جانا چاہیئے وہ چار بجے تک آنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیجئے شب وصال بنتے بنتے وہ شب ہجر بن گئی جسے ہم نے کبھی سو کے کبھی جاگ کر کبھی ٹہل کر سحر کرنے کی کوشش کی لیکن نہ سحر ہوتی تھی نہ وہ ساحرہ آ سکتی تھیں۔ چار سے پانچ اور پانچ سے چھ اور ساڑھے چھ ہو گئے۔ اتنے میں ہم پر جنت کے دروازے کھل گئے۔ اور ہم ماضی کی تڑپ اور کرب اور مستقبل کی مسرت سب کو بھول کر ایک شان بے نیازی اور ادائے دلبری سے چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ کیف و سرور کچھ اس درجے پر تھی کہ دوسرے پلیٹ فارم پر گاڑی آ کر بزرگوں نے برآمد ہو کر ہمیں ہر طرف تلاش کیا۔ پھر ہماری کم خوابی اور نالائقی کا شکوہ اور ہمارا مرثیہ پڑھتے ہوئے گھر

۔جہاں وزر دانست پر رقص کرتے ہوئے تالے نے اُن
اری مغفرت کی دعا مانگنے پر مجبور کر دیا ۔۔!!
۔ ہیں کس خوش فہمی کی بنا پر پورے ایک گروہ کی سر
ارے سپرد ہوئی اور اس راہبری میں پردہ رہبر کمل
س گراں بار کے لئے ظاہر ہے ہمتِ مرداں چاہئے
یر چائے ممکن نہیں ۔! سارا سامان بکھرا پڑا ہے چیزیں
ا کھیل رہی ہیں۔ ایک ملتی ہے تو دوسری غائب ۔ دوسری
ہلی نکل گئی ۔ ادھر بس کھڑی صُور پھونکے جا رہی ہے ۔
اہرطرف سے بے پرواہ چائے نوشی میں مشغول ۔ نتیجے میں گاڑی
ے اس کا لہراتا ہوا دھواں ہاتھ آیا ۔! پیروں تلے سے
نہیں البتہ چپل ضرور نکل گئی ۔ دوسری گاڑی ذرا کس کے
۔ مگر ہماری گاڑی کوئی ہندوستانی فلم کی گاڑی تو تھی نہیں
، عالم بیتابی میں ہم خود چلاتے اور دوڑاتے عین وقت
شیار خبردار" کرتے ہوئے جائے واردات پر پہنچ جاتے
ہم اور ہماری ٹیم مخالفین کے لئے محبوب کا درجہ رکھتے تھے
انتظار کیا جاتا ۔۔! ہمارے نہ پہنچنے پر بظاہر غم لیکن در پردہ
کے ستار اور وائلن بجائے گئے اور ایک انتہائی کمزور
واک اوور دے دیا گیا ۔ جس کے انعام میں ہمیں نوکری
راک اوور بس ملتے ملتے ہی بچا ۔۔!!
ریل میں بیرا چائے کا جلوہ دکھا کر نظروں کو خیرہ کرتا
ور نظروں کے سامنے مگر نظر بچا کر پرس غائب کر دیتا ہے
یٹھے چائے کی داد دے رہے ہیں ۔ ادھر بیرے صاحب
کی لیکن ان کی داد کی خبر ہمیں دوسرے اسٹیشن پر ہوتی
۔جب ہم سے ٹکٹ مانگا جاتا ہے ۔ نہ ہمارے پاس
ے نکلتا ہے نہ پیسے ۔ البتہ ہم ریل سے "ذرا دھوم" سے نکال
ے جاتے ہیں ۔۔!!
چائے کی پیالی وہ رقیب ہے کہ جب یہ ہاتھ میں ہوتی
دوسری تمام چیزیں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں ۔ کچہری کی بنتے
ہیں تو اُس کی برکت سے اس وقت پہنچیں جب "ہاؤس فل"

کی تختی لٹکائی جاچکی ہو ۔۔!
بس پکڑنی ہو تو اُس کے طفیل یکے بعد دیگرے تین بسیں
ہمیں دو چار ہاتھ ادھر چھوڑ کر زن زن گذر جائیں ۔ اور پھر اس
کے بعد ہم پون گھنٹہ حسرت و یاس اور انتظار کے شعر کی تفسیر
بنے کھڑے رہیں اور ہزار صورتوں کے نظر آنے کے باوجود کوئی
امید بر نہ آئے ۔۔!!
اپنے اور پرائے دیس کے کسی فنکشن میں شرکت کرنے
جائیں تو پتہ چلے کہ ہمارے چائے پینے پینے تک افتتاح کا ملو
مکمل ہو چکا ہے اور ہم نے اتنا لمبا سفر محض تالیاں بجانے کے
لئے کیا ہے ۔۔!!
کالج میں داخل ہوتے ہی ہمارا رخ نہ آفس کی طرف
ہوتا ہے نہ اسٹاف روم کی طرف بلکہ کینٹین کی جانب اس
طرح کھنچے چلے جاتے ہیں ۔
" جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں "!
جب تک ہم کینٹین (جسے اب ہمارا کعبہ اور میخانہ کہا جانے
لگا ہے ۔!) نہ پہنچ لیں ہوش اُڑے اُڑے رہتے ہیں۔ ایسے
وقت میں ہم نہ کسی سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں نہ سلام
دعا کرتے ہیں ۔ ہاں کینٹین میں قدم رکھتے ہی بہاریں واپس
آجاتی ہیں ۔ محفل جم جاتی ہے اور گردشِ شام و سحر تھم
جاتی ہے ۔! یہی ہمارا اسٹاف روم ہے ' یہی لائبریری
یہی گیمس روم ۔ اب تو کلاسس بھی کینٹین کے زیر سایہ لگتی
ہیں ۔ اور اگر ممکن ہوتا تو اگزامینیشن ہال بھی اسے ہی بنا لیتے!!
ہماری دنیا میں چائے اسٹرلنگ کی حیثیت اختیار
کر چکی ہے ۔ ہر قسم کا لین دین خواہ وہ اقتصادی ہو یا ادبی
یا جذباتی چائے کے سکے سے ہی چلتا ہے ۔ اور ہر قسم کی داد
چائے سے دی جاتی ہے ۔۔!!
ہمارا یہ عشق خاصہ شہرۂ آفاق قسم کا ہے ۔ ہر خاص
و عام کو خبر ہے کہ ہم آخر وقت تک کیتلی اور پیالی کو اپنے
آگے سے ہٹانا پسند نہیں کرتے ۔ لہذا جہاں جائیں جس وقت

اور جس عالم میں جا ئیں چائے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آگ
و د اپنی ہی لگائی ہوئی ہے اس لئے انکار کی کہیں گنجائش نہیں
ہوتا یہ ہے کہ ہم ٹیکسی کر کے طوفانی انداز سے صرف اس لئے
کالج جاتے ہیں تاکہ غالب کی وہ شرح لے لیں جس کے بغیر آج
آبروئے اہلِ نظر خطرے میں ہے۔ لیکن ہماری کرم فرما شرح
ڈھونڈھنے کے بجائے چائے کی پتی تلاش کرتی ہیں۔ پڑوس کے
گھر سے دودھ منگواتی ہیں تو کسی گھر سے شکر۔ ہماری ہر آہ
فریاد کو حسنِ طلب کا درجہ دے کر اپنی مہم میں جٹی رہتی ہیں۔
ڈیڑھ گھنٹے کی اجتماعی کوششوں کے بعد ہمیں اپنی مجبوبہ کے دیدار نصیب
ہوتے ہیں۔ ادھر ٹیکسی کا کرایہ ساڑھے تین تک پہنچ جاتا ہے! ادھر
کلاس گول ہو جاتی ہے ---!

غروب کی ملگجی سرخی اور لڑکھڑاتی ہوئی ہوائیں ہمیں گھر سے
کھینچ لاتی ہیں۔ ٹہلنے کے لئے ہم کسی کو آواز دیتے ہیں۔ وہ باہر
نکلنے اور خوش ہونے کے بجائے ہمیں اندر لے جانے اور چائے
سے خوش کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہم اڑنے سے پہلے
ہی گرفتار ہو جاتے ہیں ---!

یہی نہیں بلکہ جس راستے سے ہم گزر رہے ہوں۔ اگر اس
پر رہنے والے پانچ دوستوں نے ہمیں دیکھ لیا تو یقین مانئے ہمیں
ہر قسم کا کام چھوڑ کر ان پانچوں کے یہاں یکے بعد دیگرے چائے
پینی پڑے گی --- !

غرض یہ کہ ہم نیک و بد کسی کام کا ارادہ کریں۔ دن اور
رات کے کسی حصے میں دنیا کے کسی کونے میں جانے کا قصد
کریں اپنے اور پرائے اور خود ہم یہ سوچتے ہیں کہ پہلے چائے
پی لیں --- پھر --- ممکن ہے جب موت لینے آئے تو ہم اس
سے بھی یہی کہہ دیں ---

ابھی چلتی ہوں ذرا چائے پی لوں تو چلوں ---!!

اور یہ تو خیر ہونا ہی ہے کہ وقتِ آخر اگر کوئی ہمدرد
پاس پڑوس میں موجود ہو تو وہ حلق میں شربت کے بجائے چائے
کی چند بوندیں ٹپکا دے گا ---!

اور ہمارے وصیت نامے میں یہ بات بھی جوڑ دی
جائے گی کہ اگر ہمیں دفن کے لئے دو گز (حالات کو دیکھتے ہوئے
ڈیڑھ گز سے بھی کام چل جائے گا --- !) زمین نصیب ہو جائے
(خواہ کوئے یار میں ہو یا کوئے رقیب میں ---!!) تو اس پر
چنبیلی اور گلاب کی بجائے چائے کے پودے لگائے جائیں۔
اور قریب ہی کسی گوالے کی بھینس بندھوا دی جائے --- یا پھر
قبر کو باقاعدہ مزار کا درجہ دے کر چائے کا ہوٹل کھول دیں۔
جہاں زائرین فاتحہ پڑھ پڑھ کر چائے پئیں: تاکہ ہماری تشنہ
روح چائے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچ جائے ---!!

تنقید و تبصرہ

رفعت صدیقی
وقار خلیل

آئینہ

تبصرہ کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

"اَدیب اور کمیسار" ہنگری کے مشہور مخالف کمیونسٹ ادیب جارج پیلوکزی ہورنتھ کی کمیونزم کے زیرِ سایہ ادب اور ادیب کا جائزہ لینے والی تصنیف ہے جس کا اردو میں ترجمہ گوپال متّل صاحب نے کیا ہے۔

کتاب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ "ادب اور کمیونزم ایک دوسرے کی ضد ہیں"۔ ایک کمیونسٹ حکومت میں پارٹی کی اہمیت مسلمہ ہوتی ہے۔ پارٹی ایک ایسا محور ہے جس کے گرد حکومت کا پورا نظام گھومتا ہے جہاں اظہارِ خیال کے تمام پیرائے پارٹی کے پابند ہوتے ہیں اور پارٹی کے سانچے ہی سے کشید کیے جاتے ہیں اس طرح ادب کو پارٹی کے پروپگنڈہ کے لئے ایک زبردست ہتھیار کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور جب ادب پارٹی کے اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تو اسے بورژوائی اور انحراف پسند قرار دیا جاتا ہے۔ تصنیف کی پیشانی پر لینن کی کتاب پارٹی تنظیم اور پارٹی ادب" کا جو اقتباس ہے ...... ادب کو پارٹی کے واحد مشینی نظام میں صرف ایک پہیہ یا صرف ایک ڈھیبری ہونا چاہیئے) دیا گیا ہے اس سے پارٹی کی ادب سے جو توقعات وابستہ ہیں وہ کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

"ادیب اور کمیسار" میں دنیا بھر کے کمیونسٹ ممالک میں ادب اور ادیبوں کے درپیش مسائل کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ادیب اور کمیسار (یعنی پارٹی کارکن) میں جو فرق ہے اس کو بھی خوب واضح کیا گیا ہے (کمیسار کے نزدیک سماجی نظام اس کے انفرادی اجزاء سے زیادہ اہم ہوتا ہے لیکن ادیب یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی انسانی سماج کی مسرت اور خوشحالی کو اس کے افراد کی مسرت اور خوشحالی کے پیمانے ہی سے ناپا جا سکتا ہے")

ترجمہ بڑا کٹھن کام ہے۔ اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا سب کے بس کی بات نہیں۔ اچھی سے اچھی تصنیف کا خراب اور ناقص ترجمہ اس کی اہمیت اور کشش کو کافی کم کر دیتا ہے ایک مصنف پر صرف اپنی ہی زبان کی حد تک پابندی عائد ہوتی ہے لیکن ایک مترجم کو دوہری ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں، ایک اپنی زبان کی دوسری اس زبان کی جس سے اپنی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

گوپال متّل صاحب ایک اچھے مترجم ہیں یہ کتاب اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ کمیونزم کے ساتھ بہت سی نئی اصطلاحیں بھی وجود میں آئی ہیں جن کو سمیٹنا خود انگریزی کے لئے جو شاید دنیا کی سب سے زیادہ لچکدار زبان ہے کسی قدر مشکل ہو گیا ہے۔ اردو میں ان اصطلاحات کا نفوذ کسی قدر بدلی ہوئی شکل ہی میں سہی ذرا دیر سے ہو گا۔ گوپال متّل صاحب نے ایسی تمام اصطلاحات کا بڑی خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ پھر بھی چند الفاظ کے ترجمے مکمل نہیں کہلائے جا سکتے۔

Dumb Creature کا ترجمہ انھوں نے
...چرا مخلوق" کیا ہے)۔
ہے آپ کمیونزم کے حامیوں میں سے ہوں یا مخالفوں
یہ سلیس اور رواں ترجمہ موضوع اور مواد کی وجہ سے
معلوم ہوگا۔
بس کاغذ اور عمدہ چھپائی سے مزین یہ کتاب جو ۱۷۲
پر مشتمل ہے آپ نیشنل اکاڈیمی۔ دریا گنج دہلی سے
۔ روپے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ (ر۔ف)

ماہنامہ "پیام تعلیم" دہلی

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی
طباعت آفسٹ، صفحات: (۷۲)، فی پرچہ: (۵۰) پیسے (پانچ روپے) سالانہ
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

زیر تبصرہ ماہنامہ "پیام تعلیم" جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا
جو بچوں کے مشہور ادیب اور مصنف جناب حسان
ادارت میں گزشتہ ایک سال سے پابندی کے ساتھ
رہا ہے۔ سابق میں اس نے چاچا نہرو کی یاد میں اپنا
اور اہم نہرو نمبر بھی شائع کیا تھا اور پھر کچھ مہینوں
الطاف حسین حالی کی شخصیت اور فکر و فن پر محیط ادبی
کامل "حالی نمبر" بھی شائع کیا تھا۔ ان ہر دو خصوصی
میں بچوں کی شگفتہ، سلیس اور خوبصورت تحریروں کا
نوش بچوں کے ممتاز قلمکاروں اور اردو کے مشاہیر
نے حصہ لیا تھا۔ اگست کا "پیام تعلیم" بھی بچوں کی نفسیات
مطابق دلچسپ معیاری مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے۔
مضامین، کہانیاں، لطیفے، تصویریں، کارٹون، بچوں کی
کتابوں کی باتیں وغیرہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔
اچھی طباعت اور کتابت کے علاوہ سرورق کی سادگی
بھی جاذب نظر ہے۔ غرض آٹھ سے لیکر اسی سال کی
عمر کے ہر شخص کے لئے یہ رسالہ یکساں طور پر مفید ہے۔
زیر نظر شمارے میں بچوں کے اقبال (از نسیم حنفی) اسکا
عزت (از نائل نقوی)، پربت ذرہ ...... (رفیق محمد شاستری)
کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ وہ حضرات جنھیں اپنے بچوں کے درخشاں
مستقبل کی فکر ہے انھیں چاہیئے کہ وہ فوراً اس رسالے کو اپنے
بچوں کے نام جاری کرالیں۔ (د۔ع)

SECOND YEAR OF PUBLICATION

Registered with the Registrar of News papers at R. N. No. 8285/64.

ovember, 1965

POONAM MONTHLY

AZAMPURA, HYDERABAD-A. P.

Regd. H. 4'

Editor : NASIR KURNOOLI M. A. (Osm.)



A-PV 23-2-83
11.3.83

66



رقص ——————— ایک منظر

NTHLY

OONAM HYDERABAD

75 P.

ماہنامہ

حیدرآباد

پونم

جلد ۲ ——— شمارہ ۲۴ تا ۲۶

مدیر

ناصر کرنولی ایم۔اے (عثمانیہ)

زرِ سالانہ (۸) روپے
ششماہی (۴) روپے ۵۰ پیسے
بیرونِ ہند سے (۲۵) شلنگ
تا عمر خریداری (۱۰۰) روپے
فی پرچہ (۷۵) پیسے

مقامِ اشاعت، ترسیلِ زر، اور
خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ پونم
۱۶-۷-۳۰۱
اعظم پورہ۔ حیدرآباد
آندھرا پردیش

خوشنویس:
محمد عبدالسلام

طباعت:
اعجاز پرنٹنگ پریس
دائرہ الیکٹرک پریس، چھتہ بازار۔ حیدرآباد

* پونم میں شائع ہونے والے تمام ادبی، نیم ادبی تحریروں میں نام، کردار، واقعات، مقامات اور ادارے فرضی ہیں۔ ان سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کیلئے ادارہ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ (ادارہ)

* پونم کا آیندہ شمارہ خاص نمبر ہوگا۔

* پونم کا آیندہ شمارہ خاص نمبر ہوگا۔

ترتیب

اداریہ ــــ ادارہ ۳

مضامین

قدیم اُردو ــ ایک مطالعہ ــــ مغنی تبسم ۵

چند دن چند باتیں ــــ کوثر چاندپوری ۱۱

کرشن چندر ــ ایک افسانہ نگار ــــ نجمہ سمیع ۱۹

غزل ــــ علامہ آرزو لکھنوی ۲۷

بکھرے موتی ــــ جوہر محمد آبادی ۲۸

غزل ــــ شاذ تمکنت ۲۹

غزل ــــ شہریار ۲۹

غزل ــــ نذیر بنارسی ۳۰

غزل ــــ متین سروش ۳۰

غزل ــــ حسرت سہروردی ۳۱

غزل ــــ کیف احمد صدیقی ۳۱

افسانے

دوسرا بچہ ــــ سلمیٰ صدیقی ۳۲

ہم جنم جنم کے ساتھی ــــ عاتق شاہ ۳۷

ریت اور چشمہ ــــ عوض سعید ۴۰

میٹر ــــ انور صابری ۴۵

نظمیں

نذرانہ ــــ کیفی اعظمی ۴۶

نور ــــ نریش کمار شاد ۴۷

بے ستون ــــ مغنی تبسم ۴۸

خدا جاگتا ہے ــــ عادل منصوری ۴۸

طنز و مزاح

قیام امن ــــ دآہی ۴۹

چاند، ہلی مون اور مسائل ــــ یوسف ناظم ۵۰

فلمی

[illegible] کی فلمیں ــــ اعجاز قریشی ۵۳

پونم کا آیندہ شمارہ خاص نمبر ہوگا۔

اداریہ :

سرکاری زبان بل اور اُردو

آندھرا پردیش کے قیام کے بعد چیف منسٹر مسٹر نیلم سنجیوا ریڈی نے ریاست میں اُردو کو تلگو کے مساوی درجہ دے کر جو دانشمندانہ اور منصفانہ اقدام کیا تھا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ سنجیوا ریڈی کے جانشین مسٹر سنجیویا نے بھی اُردو زبان کو دیئے گئے مراعات، تحفظات، اور تیقنات کی نہ صرف پابندی کی بلکہ ان پر عمل درآمد کے لیئے احکامات بھی جاری کیئے۔ ان کے جانشین مسٹر برہمانند ریڈی نے بھی ریاست کے تلگو اور اُردو بولنے والوں کے ساتھ عملی طور پر مساویانہ سلوک برقرار رکھا۔ اور جب تلگو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے قانونی طور پر تسلیم کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو برہمانند ریڈی نے اُردو کو تلگو کے ساتھ سرکاری زبان بل میں شامل کرنے کے تعلق سے جس جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی اُردو دوستی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کہ بعض تنگ نظر اور رجعت پسند حلقوں کی طرف سے سرکاری بل میں اُردو کو مناسب مقام دیئے جانے کے تعلق سے سخت مخالفت ہو رہی تھی مسٹر ریڈی نے اس نام نہاد مخالفت کو ناقابلِ اعتنا قرار دیتے ہوئے سرکاری زبان بل میں اُردو کو جو موقف دلایا ہے' اس کی جسقدر ستائش کی جائے کم ہے۔ ادارہ چیف منسٹر کے اس جرأت مندانہ اقدام کا خیر مقدم کرتا ہے اور اُمید کرتا ہے کہ اُردو زبان کو جو تحفظات اور مراعات دیئے گئے ہیں وہ نئے مسودہ قانون میں آئینی شکل اختیار کرلیں گے۔

نیاز فتح پوری

اُردو کے ممتاز ادیب اور نقاد جناب نیاز فتح پوری مدیر 'نگار' ۲۴ر مئی کو کراچی (پاکستان) میں انتقال فرما گئے۔

مولانا فارسی، عربی اور اُردو کے علاوہ ترکی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ان کی بیش قیمت تصانیف اور جریدہ 'نگار' نے ہندوستان کی نئی نسل کے ذہن و دماغ کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی تخلیقات میں 'من و یزداں' 'شہاب کی سرگذشت'، 'نگارستان'، 'جمالستان' 'مطالباتِ نیاز'، 'مذاکراتِ نیاز'، اور مجموعہ 'استفسار و جواب' قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ 'نگار' کی خصوصی اشاعتیں بھی ان کے تنقیدی سلوک اور انشائے لطیف کی یادگاریں ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں' حکومتِ ہند نے انہیں پدما بھوشن کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ پاکستان چلے جانے کے بعد بھی 'نگار' ان کی زندگی کا ساتھی رہا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔ اُردو دُنیا کے لیئے ان کا انتقال ایک سانحۂ عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ادارہ)

انجمن ترقی اُردو حیدرآباد اور انجمن تحفظِ اُردو نے جو مشترکہ طور پر آندھرا پردیش میں اُردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے کے تعلق سے کامیاب جدوجہد کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی ان دونوں انجمنوں میں اتحاد اور باہمی تعاون برقرار رہیگا۔

ادبی ٹرسٹ

حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ادیبوں اور شاعروں کی امداد اور ان کی تخلیقات کی اشاعت کے تعلق سے' روزنامہ سیاست کی سرپرستی میں ایک ادبی ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا ہے جو اُردو زبان و ادب کے حق میں ایک نیک شگون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پیشتر بھی حیدرآباد میں ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کے لیئے ایک کوآپریٹیو سوسائٹی کا قیام

عمل میں آیا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ سوسائٹی اپنے کام کے آغاز سے قبل ہی ختم ہوگئی۔ ادیبوں کی امداد اور ان کی تخلیقات کی اشاعت اُردو ادب کی ایک اہم خدمت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے عطیوں کی وصولی کے علاوہ ۷ مئی ۱۹۶۶ء کو ایک کُل ہند مشاعرہ کا انعقاد بھی عمل میں آیا، جس کے ذریعہ جملہ ۲ ہزار روپے جمع کیئے گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر میں اس ادبی ٹرسٹ کا خیر مقدم کیا جائے گا اور اُردو دوست اور ادب نواز حضرات اس تحریک سے تعاون کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کریں گے۔

مزاح نگاروں کی کُل ہند کانفرنس

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۱۴ اور ۱۵ مئی کو حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی کُل ہند کانفرنس اُردو کے مشہور و ممتاز طنز نگار کرشن چندر کی صدارت میں منعقد ہوئی اور پہلی مرتبہ ہندوستان کے چوٹی کے طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں کو مل بیٹھ کر سنجیدگی سے تبادلۂ خیال کرنے اور اپنے مسائل پر غور و خوض کرنے کا موقع ملا ـــــ مزاح ادب کی ایسی خصوصیت ہے جس کا تعلق زندگی سے بڑا ہی گہرا ہوتا ہے ـــــ مزاح نگار بذاتِ خود سنجیدہ انسان ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی کمزوریوں اور حماقتوں پر طنز کرنا اور زندگی کے تلخ حقایق کو قہقہوں کا انداز عطا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ طنز نگار سماج کی کمزوریوں اور حماقتوں پر اس سلیقہ سے طنز کرتا ہے کہ انسانی شعور کو ہنسی ہنسی میں اپنی کمزوریوں کا احساس ہوجاتا ہے اور وہ اصلاح کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ عوام کو ذہنی آسودگی پہنچانے والے ان طنز نگاروں کی تخلیقات کو اُردو ادب میں وہ مقام نہیں دیا جاتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ چنانچہ اس خصوص میں کانفرنس کے بزنس سیشن میں کافی غور و خوض کے بعد مزاح نگاروں کی طرف سے حسبِ ذیل بیان بھی جاری کیا گیا:

"ہم اُردو کے ظرافت اور مزاح گو ادیب اور شاعر جو اس کانفرنس میں شرکت کر رہے ہیں، کانفرنس کی کامیابی اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو ادب میں طنز و مزاح ایک اہم مقام حاصل کر چکے ہیں اور گہرے سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ ہم لوگ اس بات کی اُمید کرتے ہیں کہ ساہتیہ اکاڈیمی دہلی اور بُک ٹرسٹ دہلی، طنز و مزاح کی اہمیت کو تسلیم کرلیں گے اور ظریفانہ ادب کی ترویج و اشاعت میں خصوصی دلچسپی لیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کُل ہند کانفرنس کے مندرجہ ذیل شرکا کی یہ خواہش ہے کہ اس صنف کے ادیب اور شاعر ابتذال، سوقیانہ، مبتذل اور غیر اخلاقی ادب کی تخلیق سے احتراز کریں تاکہ ایک اعلیٰ سطح پر صالح اور ارفع طنزیہ ادب کی تخلیق ہوسکے۔ اس کانفرنس میں مزاح نگاروں کے علاوہ دوسرے اصنافِ ادب کے ادیبوں سے تبادلۂ خیال کے مواقع حاصل رہے ہیں اور اس امر کی ضرورت کو ہر ایک نے محسوس کیا ہے کہ اُردو زبان کے تمام ادیبوں اور شاعروں کی ایک مرکزی انجمن بنائی جائے اور اس سلسلے میں اُردو کے ممتاز ادیب اور شاعر ضروری قدم اُٹھائیں۔"

اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں کرشن چندر، بھارت چند کھنہ، غلام احمد فرقت کاکوروی، دلاور فگار، زینت ساجدہ، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، سلمیٰ صدیقی، مجتبیٰ حسین، علی صاحب میاں، تخلص بھوپالی، مرزا شکور بیگ، حمایت اللہ، ـــــ شفیقہ فرحت اور سرور جمال شامل ہیں۔

اپنی نوعیت کی اس پہلی کانفرنس کی کامیابی کا سہرا بھارت چند کھنہ (صدر استقبالیہ) مجتبیٰ حسین (معتمد استقبالیہ) کے علاوہ فائن آرٹس اکیڈیمی اور حلقۂ اربابِ ذوق کے کارکنوں کے سر ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا یہ کارنامہ، طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔ ▲

نجمہ سمیع

کرشن چندر — ایک افسانہ نگار

زندگی، ادب اور ادیب، تینوں ایک زنجیر کی اہم کڑیاں ہیں۔ ادب زندگی کا ترجمان، نقاد اور مفسر ہے زندگی کے جتنے رنگ ہیں، ادب کے بھی اتنے ہی رنگ ہیں، اور زندگی کے انقلابات کے ساتھ ادب میں بھی انقلاب پیدا ہوتا ہے اور بدلتی ہوئی زندگی کو ادب کے رشتے میں پرونے کا کام ادیب کرتا ہے۔ وہ مشاہدے میں فکر و نظر اور تخیل کی رنگ آمیزی کر کے زندگی کو ادب بناتا ہے۔ اسی کا نام زندگی کی ترجمانی، عکاسی، تفسیر اور تنقید ہے۔

اردو ادب میں اس نظریے نے کب قدم رکھا یہ جاننے کے لئے ادب کی تاریخ کے اوراق اُلٹنے پڑیں گے۔ عام طور پر جدید اردو افسانے کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ یوں تو پریم چند کا افسانہ موضوع، کردار نگاری اور سماجی شعور کے [illegible] کے لحاظ سے بے انتہا جدید تھا مگر مجموعی اعتبار سے سوائے چند ایک ناموں کو چھوڑ کر خاصہ بے جان تھا اسی زمانے میں "لندن کی ایک رات" اور "انگارے" نے اچانک ایک نیا دروازہ کھول دیا اور ادب میں ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ ان کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ادب سماجی تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ اسے سماج کو بہتر بنانے میں حصہ لینا چاہیئے اس نئے نظریے اور نئے تجربے نے بلاشبہ ہمارے ادب کو ایک تاریخی موڑ پر لا کھڑا کیا، جس سے آگے کا راستہ واضح اور روشن تھا۔

"انگارے" کے لکھنے والوں نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کے انداز سکھائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بعد کے لکھنے والوں نے اپنے فن میں بے باکی پیدا کی۔ شاید ہی سوسائٹی کا کوئی پہلو ایسا ہو جس پر انھوں نے شدت اور بے باکی سے قلم نہ اٹھایا ہو۔ غرض ۱۹۳۶ء میں ہمارا افسانہ اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اس میں ہیئت کے نئے نئے تجربے ہو رہے تھے اور پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئی راہیں نکالی جا رہی تھیں۔ نئے لکھنے والوں نے ہیئت اور موضوع کو اور آگے بڑھایا اور اپنے ذہنوں میں کشادگی پیدا کی

اور زندگی کی کشمکش کو نئے زاویوں سے دیکھا۔ زندگی کی باشعور
ترجمانی کا رجحان ان نئے لکھنے والوں میں جن پر زیادہ ہوا ان
میں کرشن چندر کا نام نمایاں ہے۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں کرشن چندر
نے اپنا پہلا افسانہ لکھا اور اسے "ادبی دنیا" میں صلاح الدین
صاحب نے بیحد تعریفی اور حوصلہ افزا نوٹ کے ساتھ چھاپا۔
انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ نوجوان مستقبل میں اردو کا
منفرد افسانہ نگار ہوگا۔ ان کی یہ پیشین گوئی کس حد تک صحیح
ثابت ہوئی۔ آ[illegible] اس کا جائزہ لیں۔

کرشن چندر نے کشمیر کی حسین سرزمین، دہکتے گل پوش [illegible]
مہکتی وادیوں، جھلمل کرتی ندیوں، لہلہاتے کھیتوں، پہاڑوں
کی برف پوش چوٹیوں اور [illegible]
دھڑکنوں سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بُنا۔ کرشن چندر نے ابتدائی
دور میں بڑی حسین رومانی کہانیاں لکھی ہیں۔ ریشماں، آنگی اور
زیتی کے معصوم حسن کے بیان میں کرشن چندر نے الفاظ کا نہیں
پھولوں کا انتخاب کیا ہے۔ خوبصورت الفاظ اور لطیف و نازک
جذبات کے اس حسین امتزاج نے اردو ادب کے مختصر افسانے
میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ کرشن چندر کے ابتدائی افسانے
رومانیت کے نئے رجحان کو پیش کرتے ہیں مگر رومانیت میں
بھی حقیقت پسندی ہوتی ہے، گو کہ ان ابتدائی افسانوں میں
حالات اور سیاسی شعور کا کوئی گہرا اثر نہیں۔ مگر موضوع اور
مواد کے اعتبار سے ان میں وسعت ہے، انفرادیت ہے
ان کے لکھنے کا انداز، اسلوب، تکنیک سب کچھ منفرد ہے
جہاں تک تحریر کا تعلق ہے کرشن چندر سے زیادہ خوبصورت
زبان اردو کا کوئی ادیب نہیں لکھ سکتا۔ کرشن چندر کے پاس
معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لئے بھی ایک غیر معمولی
انداز موجود ہے۔ لفظوں کو برتنے میں [illegible] کی جدت اور
[illegible] بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت
جیسے وہ بات اہم نہ ہو۔ لفظوں، فقروں، اشاروں کنایوں

تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا بھی سلیقہ ہے...
جو کرشن چندر کو دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔ رومانیت
ہو یا حقیقت، طنز ہو یا مزاح، درد ہو یا تبسم، ان کے قلم
سے ہر موقع پر دلکش اور انوکھی تحریر ہی نکلی ہے۔ اس کے
علاوہ انھوں نے اسلوب و فن میں بھی نئے تجربے کر کے
جدید افسانے کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ نئے اسلوب تلاش
کرنے اور انھیں بے جھجک سامنے لانے کی جرأت بھی کی ہے
بلکہ اس وقت ان کا ہر نیا افسانہ ایک نیا تجربہ ہوتا تھا۔ ان
کی افسانہ نگاری کی ابتدا رومانیت، شعریت اور رنگینی سے
ہوئی۔ انھوں نے غم جاناں سے بیقرار، ہیر، رانجھے کے پاکیزہ
آنسوؤں اور ان کے شورفشاں جذبے سے معمور کہانیاں لکھی ہیں
الفاظ کا ایک سیلاب حسن ہے جو قاری کے ذہن کو مسحور کر لیتا
ہے۔ مگر "ٹوٹے ہوئے تارے" اور "نظارے" کے بعد کے مجموعے
آہستہ آہستہ حقیقت کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کہانیوں میں کرشن چندر
نے ہماری دنیا کو پہچاننے اور اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش
کی ہے۔ لیکن زندگی اتنی بے کراں اور وسیع ہے اور اس کی
راہ میں اتنے پیچ و خم ہیں کہ منزل ملتی نہیں اور راہرو منزل کی
تلاش میں خود گم ہو جاتا ہے اور اسی گم شدگی کے عالم میں
جہاں کہیں بھی محبت کی ٹھنڈی چھاؤں ملتی ہے وہ اسی کو منزل
سمجھ کر ٹھہر جاتا ہے۔ کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں میں بھی
یہی کچھ ہے۔ منزل ملی نہیں اور منزل کی جستجو میں راستے کی
رنگینیوں نے انھیں مسحور کر لیا اور شاداب رخساروں کے نوخیز
حسن نے اداس آنکھوں کی [illegible] نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ
حسن و محبت ہی کے گیت گائیں۔ لیکن زمانے نے ادیب
[illegible] کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضہ کیا جو [illegible]
کی رنگینیوں کی بجائے زندگی کی سادہ اور [illegible] حقیقتوں کا [illegible]
ہو، جس میں فنکار کے تخیل اور شعور کی حقیقت پسندی کی [illegible]
بلکہ فکر کی گہرائی ہو، جس میں زندگی کی [illegible] سے [illegible]

ایک انسان [illegible] دنیا کی سیر کرنے یا پیچھے کی قبائلی زندگی میں لوٹ جانے کی تمنا کی جگہ زندگی کی کشمکشوں سے دوچار ہونے کی ہمت ہو۔ جہاں [illegible] زندگی سے اُلجھنے اور ان الجھنوں کی تعلیم ہے، جہاں خیالی جذبات اور احساسات کی جگہ حقیقت کی نقاب کشائی ہو۔ زمانے کی اسی طلب نے حقیقت نگاری کی تخلیق کی، ادب زمانے کے اسی تقاضے نے ادیبوں میں زندگی کا شعور پیدا کیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے ادب کا دائرہ کافی وسیع ہو چکا تھا اور مخالفتوں کے باوجود اس میں مختلف خیال کے لکھنے والوں کا اجتماع تھا جو یہ سمجھتے اور محسوس کرتے تھے کہ ادب کا ایک افادی پہلو اور سماجی مقصد بھی ہے، اور ہم اپنی تحریروں کے ذریعہ زندگی کی اصلی اور سچی تصویریں پیش کریں گے اور انسان کے دُکھ درد کو محسوس کرکے اس کی خواہشات جذبات کا اظہار کریں گے۔ کرشن چندر کے اس وقت کے افسانوں کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو ہر جگہ رومان سے حقیقت اور داخلیت سے اجتماعی مسائل تک کا یہ سفر بار بار ملتا ہے۔ ہمارے ادیب کا ذہنی اُفق آہستہ آہستہ وسیع ہو رہا تھا اور انفرادی دُکھ درد کے علاوہ اور کبھی کبھی ان کے سہارے نئی کائنات، نظر کے سامنے پھیل رہی تھی۔ کرشن چندر جو کبھی آنگی، زینی جیسی خوبصورت معصوم شہزادیوں کا عاشق زار تھا اس نے "کالو بھنگی" اور "بھگت رام" کو اپنا لیا جو سماج کے زوال کردار ہیں۔ مگر کرشن چندر نے زندگی کے تلخ تجربوں سے تلخی نہیں لی، صرف تجربے کی گہرائی لی ہے۔ زندگی کی وسعتیں اپنی تمام تر تلخیوں اور شیرینیوں سمیت ان کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "زندگی کے موڑ پر"، "بالکونی"، "ان داتا"، ان کے اس وقت کے بہترین افسانے ہیں ان کا تعلق [illegible] سے تھا۔ اس وقت انھوں نے جو چیزیں لکھی [illegible] کی ترجمانی کرتی تھیں یا اس دور کی زندگی کو [illegible] پیش کرتی تھیں، اس لیے ان کے [illegible]۔ ان افسانوں میں

ہمارے سماج کی ساری سیاہی، ہماری معاشرت کی بے رحمی اور سنگدلی اُجاگر ہے۔ کرشن چندر نے اس وقت جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں، ان میں ان کے تفکر کی بغاوت بھی ہے عجز بھی، شکستگی بھی ہے اور ہمت بھی۔ ان میں جھنجلاہٹ بھی ہے تسکین بھی۔ ان کہانیوں میں یہی غصہ، طنز اور جھنجلاہٹ ہے، یہی بے قراری، شکست اور دردمندی ہے، یہی خوبصورتی، سچائی اور غلاظت کا متضاد جذبہ نظر آتا ہے۔ یہاں میں صرف "ان داتا" کا ذکر کرنا چاہتی ہوں، کیونکہ یہ افسانہ کرشن چندر کے اُسی دور کا نمائندہ افسانہ مانا جاتا ہے —

"ان داتا" اُردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے اسلوب کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ تینوں بُعد Three Dimension کا افسانہ ہے جس کا تجربہ اس سے پہلے اُردو ادب میں نہیں ہوا تھا۔ "ان داتا" میں ایک ہی موضوع یعنی بنگال کے قحط پر تین مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی سفیر کی اس المیہ سے بے اعتنائی، طوفان سے دور ساحل پر کھڑے طبقوں کی جھوٹی ہمدردی اور آخر میں خود اُس انسان کا المیہ جو اس طوفان میں تھپیڑے کھا رہا ہے۔ لیکن افسانے میں حقیقت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب اپنے فن میں ذاتی مشاہدے سے کام لے۔ کرشن چندر نے اپنی ذہانت اور ایک نئی تکنیک کے ذریعہ "ان داتا" کو حقیقت سے قریب کر دیا ہے۔ خصوصاً افسانے کے آخری حصے میں احساس کی بڑی شدت اور گہرائی ہے۔ یہ جملے کرشن چندر کے دل سے براہِ راست آئے ہیں۔ ایک نئی اور بہتر دُنیا کی تمنا وہ اپنے ہر افسانے کے کرداروں سے کرواتے ہیں، کیونکہ وہ خود ایک نئی دُنیا کے تمنائی ہیں، ایسی دُنیا جس کی تعمیر میں ان کروڑوں بھوکے ننگے آدمیوں کا ہاتھ بھی ہوگا جن کی زندگی میں بہار نہیں، جن کے سپنے سچے نہیں جو بھوک، ظلم اور افلاس سے نفرت کرتے ہیں اور ایک نئی دُنیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ کرشن چندر، بڑا ہی حساس ادیب ہے۔ وہ سماج اور اس کے مظالم کو دیکھ کر ہمیشہ چیخ اُٹھتا ہے۔ ظلم کے خلاف غصے کا جذبہ بتدریج اس کے افسانوں میں بڑھتا گیا ہے، اور

غصے کے آگے طنز ہی طنز ہے۔ زندگی کی تلخیوں اور دردناکیوں کے اظہار میں ان کا قلم طنز سے بھرپور ہو گیا ہے۔ مگر کہیں کہیں رومان اور حسن کی ہلکی ہلکی بجلیاں اب بھی چمکتی نظر آجاتی تھیں حالانکہ انھیں خود تسلیم ہے کہ "نیا ادب نشاط انگیز نہیں۔ اس کے نشتری ادب نامہ مسرت آگیں نہیں بلکہ مغموم زندگی کے مظہر ہیں، جسے پڑھ کر قارئین کو کوفت ہونے لگتی ہے کیونکہ ادب اسے پھر اسی مکروہ دنیا میں گھسیٹ لاتا ہے۔ جب تک دنیا کی خوشیاں اور آرام ایک طبقے تک محدود رہیں گے اور انسانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ ان سے محروم رہے گا۔ نیا ادب ہر لحظہ اس محزون محرومی کی طرف توجہ دلاتا رہے گا۔"

کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں میں جو فرار اور یاسیت تھی وہ ختم ہو گئی اور ان کا شعور پختہ ہوتا گیا اور ان کی افسانہ نگاری ایک ایسے نئے موڑ پر آگئی کہ زندگی کی نشاط انگیزیوں سے زیادہ زندگی کی تلخیاں ان پر اثر انداز ہونے لگیں۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا یہ موڑ بڑا اہم تھا۔ پہلے وہ صرف حنائی انگلیوں اور گلاب کے پردوں کا خواب دیکھتے تھے لیکن اب ان کی نظریں محنت کشوں کے مضبوط ہاتھوں پر جمی ہیں جو کارخانے چلاتے ہیں، کھیت بوتے اور بہار کا انتظار کرتے ہیں۔ انسانوں سے پیار کرنے والی یہ انگلیاں ان انگلیوں سے کتنی مختلف ہیں جو دوسرے انسانوں پر ایٹم بم گراتی ہیں۔ "چاول چور" - "امن کی انگلیاں" "بالو کی دلچسپی" ان کہانیوں میں ایک نیا انسان ابھرتا گیا جو جابر، وحشی اور خون آشام قوتوں کے خلاف زندگی کے ہر محاذ پر جدوجہد کر رہا تھا۔ جو آزادی امن اور مساوات کا خواہاں تھا۔ ۱۹۴۵ء کے آخر اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں ہندوستان میں سیاسی طوفان اٹھ رہے تھے۔ ۱۹۴۵ء کی جنگ کے خاتمہ کے فوراً بعد ملک میں قومی آزادی کی جدوجہد شروع ہو گئی تھی۔ ایک طرف مزدوروں اور ڈاکیوں نے ہڑتال کی اور دوسری طرف ریلوے والوں نے۔ انھیں دنوں جہازیوں کی بغاوت کا زبردست طوفان آیا تھا۔ انقلاب کی تاریخ میں ایک بے مثال بغاوت تھی۔

جہازیوں کے ساتھ پُرجوش اور مشتعل عوام بھی انگریزوں کی گولی کا جواب گولی سے دے رہے تھے۔ ان دنوں کرشن چندر بمبئی ہی میں تھے اور ترقی پسند اور اشتراکی تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔ عوام کے انقلابی طوفان کی تند و تیز لہروں نے ان کے ذہن سے زندگی کی الجھنوں سے فرار، محبت کی ناکامی اور احساسِ شکست کے جذبے کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ منزل کی جستجو میں انھیں وہ منزل مل گئی جس کے لیے وہ اب تک بے قرار تھے۔ لاکھوں انسانوں کی ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی "تین غنڈے" ہے۔ "تین غنڈے" میں ان غنڈوں کی کہانی ہے جنہوں نے عوامی بغاوت میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا اور ہڑتالیں کرتے، آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے گولیاں کھائیں اور "جے ہند" کہتے کہتے اپنی جانیں دیں۔ "جے ہند" کا وہ نعرہ، وہ پکار، وہ آہنگ، جس میں ان غنڈوں کا خون گھلا ہوا ہے کبھی نہیں مر سکتا۔ وہ دل میں ناسور بن کے رستا ہے اور روح میں کانٹا بن کے کھٹکتا ہے۔ "تین غنڈے" ظلم کے خلاف شدید احتجاج کا ایک بے مثال افسانہ ہے۔ کرشن چندر نے اس کے بعد اور بہت سی ایسی بے مثال کہانیاں لکھیں۔ "پھول سرخ ہیں"، "بت جاگتے ہیں"، "مرنے والے ساتھی کی مسکراہٹ"۔

۱۹۴۶ء کا آغاز انقلاب کے شاندار کارناموں سے ہوا تھا مگر اس کا اختتام انتہائی دردناک ہوا۔ ہر جگہ فسادات شروع ہو گئے۔ ملک کا کوئی گوشہ ان کی زد سے بچ نہ سکا۔ ۱۹۴۷ء اسی خونیں کھیل میں گزر گیا۔ اس بربریت اور درندگی کے دور میں چند ہی مخلص ادیب ایسے تھے جو نفرت اور انتقام سے کوسوں دور تھے جو محبت اور انسانیت کا گیت گا رہے تھے۔ جن کے سامنے رنگ، نسل اور مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ ان کے پیشِ نظر صرف انسانیت تھی۔ ان ادیبوں میں کرشن چندر کی آواز سب سے بلند تھی۔ ان کے قلم نے فسادات کے جتنے بھی افسانے [illegible] اور بربریت پر شدید احتجاج کیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے

"میں نے اس دوران میں بہت کوشش کی کہ اپنے دل سے انسانی جذبے کا سارا رس نچوڑ کر پھینک دوں"

لیکن وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ انھیں انسان سے محبت ہے، جو ظالم، کمینہ اور خود غرض ہونے کے باوجود انسان ہے۔ اور یہ انسان انھیں آوازدیتے رہتے تھے۔ "لال باغ" "پشاور ایکسپریس" "اندھے" اور دوسری کہانیاں اس کی مثالیں ہیں۔ کرشن چندر نے ان ہنگاموں کے فرو ہونے کے کئی مہینے بعد تک بھی فسادات ہی پر لکھا ہے۔ کیونکہ احساس اور تاثر کی شدت جتنی گہری اور شدید ہوتی ہے اسی قدر اسے پیش کرنے میں ادیب کو تاخیر ہوتی ہے۔ اس کے افکار اور خیالات اسے فوراً ہی تخلیقی کارنامہ پیش کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ کرشن چندر نے فسادات پر جتنی چیزیں لکھی ہیں ان میں نفرت، بربریت اور ظلم کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا ہے۔ مگر ان میں مشاہدے کی گہرائی نہیں۔ اسی لیے "ہم وحشی ہیں" کی کہانیاں باوجود زبان و بیان کی خوبیوں کے سچی تصویریں نہیں۔ کرشن چندر نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر ان مناظر کو کینوس پر اتارا ہے اور اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ بہرحال ان کی یہ کہانیاں تصوراتی کیوں نہ ہوں اس سے کسی کو انکار نہیں کہ نفرت کی آندھی میں انھوں نے اخوت و محبت کا چراغ جلایا ہے اور نفرت کے زہر کو محبت و انسانیت کا امرت بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔ اپنے ایک ناول "غدار" میں جو فسادات کے کئی سال بعد لکھا گیا، انہوں نے لکھا ہے:

"میں تو ہر اس آدمی اور ہر اس خیال اور ہر اس عقیدے کا غدار ہوں جو نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ کسی بھی دو ملکوں کے درمیان جنگ چاہتا ہے۔ میں تو غدار ہوں نفرت کا، جنگ کا اور بربادی کا — اس لیے میں آج بھی نفرت کے خلاف لڑتا ہوں اور ماضی کے کھنڈر

دکھاتا ہوں۔ میں ماضی کے لیے نہیں روتا، میں مستقبل کے لیے روتا ہوں اور آنے والے خطرے سے خبردار کرتا ہوں۔"

مگر کرشن چندر جہاں مُردہ انسانیت کی کہانی سناتے ہیں وہیں وہ نئے انسان سے مایوس بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ آزادی کی راہ میں قربان ہونے والے شہید پھر سے نئے انسان میں جنم لے کر آئیں گے — "ہم پھر آئیں گے اپنی عظمتوں کا تقدس لیے ہوئے اپنی بے داغ روحوں کا عزم لیے ہوئے کیونکہ ہم انسان ہیں۔ ہم اس کائنات میں تخلیق کے علمبردار ہیں اور کوئی تخلیق کو مار نہیں سکتا، کوئی اس کی عصمت دری نہیں کر سکتا۔ کوئی اسے لوٹ نہیں سکتا، کیونکہ ہم تخلیق ہیں، ہم نہیں مریں گے انسان کبھی نہیں مرتا۔ کیونکہ وہ درندہ نہیں، نیکی کی روح ہے، خدائی کا حاصل ہے، کائنات کا غرور ہے۔"

اور کرشن چندر اس نئے انسان کی کہانی کہنے لگتے ہیں جو تار تار زندگی کے دامن میں امن، مساوات، اور سکھ شانتی کی کلیاں بھر دینا چاہتا ہے۔ اس نئے انسان کو کرشن چندر نے اپنا لیا ہے اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور کشمکشوں کو وہ اپنی کہانیوں میں ظاہر کر رہے ہیں۔ "مہالکشمی کا پل"۔ "پانچ روپے کی آزادی"۔ "برہم پترا"۔ ان کی کامیاب کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں انسانیت کے اس مستقبل کی کہانیاں ہیں جس پر امید کی کرنیں نظر آتی ہیں۔

"ایک وقت آئے گا جب انسان اپنی متحدہ کاوش سے نئی زندگی بنائے گا۔ نیا دھان اُگائے گا اور اپنے لیے خوشوں کے انبار لگائے گا۔ مگر یہ سپنا کب سچ ہوگا؟ جب اس کے لیے محنت کرنی ہوگی، اپنا خون دینا ہوگا۔ پھر کہیں جا کر اس سپنے کی فصل تیار ہوگی۔"

ان کہانیوں میں "برہمپترا" ایک عظیم کہانی ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے نظامِ حکومت سے نفرت اور بغاوت و انقلاب کا علانیہ اظہار کیا ہے۔ اس میں زندگی سے فراریت نہیں بلکہ زندگی کے لیے جد و جہد ہے۔ "برہم پترا" حالات و واقعات کے صحیح شعور کا ایک حقیقی مرقع ہے جس میں دریا کی صرف پُرسکون سطح ہی نہیں بلکہ زیرِ سطح طوفان بھی نظر آتے ہیں۔ "جیسے برہم پترا بھی ہے در طوفان بھی ہے لیکن ایک کشتی بھی ہے جو پار لے جا سکتی ہے۔"

کرشن چندر نے انقلابی لڑائیوں کے اس نئے انسان کو اپنے افسانوں میں نمایاں جگہ دی ہے جو ہر صدی میں ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا ہے۔ وہ گمنام سپاہی جو ہر محاذ پر، ہر مورچے پر، ہر میدانِ جنگ میں شہید ہوا ہے۔ جس کے محنتی ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم لہراتا ہے۔ "بُت جاگتے ہیں"، "صبح ہوتی ہے" "جب کھیت جاگے" ہر کہانی اور ناول میں ان کے بڑھتے ہوئے شعور کی جھلک ہے۔ "صبح ہوتی ہے" رپورتاژ ہے جو موضوع اور اظہارِ بیان کے لحاظ سے اُردو کا بہترین رپورتاژ کہا جا سکتا ہے "صبح ہوتی ہے" میں کیرالا کی زندگی، وہاں کی عوامی جد و جہد اور کیرالا کا ماضی، حال اور مستقبل سبھی اُجاگر ہو گیا ہے۔ اس میں کئی کردار ہیں، کئی شخصیتیں ہیں، کئی واقعات اور کئی کہانیاں ہیں مگر کرشن چندر نے ان سب کو ایسے تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کہیں بھی اکتاہٹ اور اُلجھن محسوس نہیں ہوتی اور نہ کہیں مجموعی تاثر میں فرق آتا ہے۔ یہی کرشن چندر کے فن کا اعجاز ہے۔ اسکے اسلوب و اندازِ بیان میں روانی اور شگفتگی ہے۔ جگہ جگہ نرم و نازک شگفتہ طنز ہے اور صحت مند رومانیت۔ اس رپورتاژ کا خاتمہ جو کہ امن کی جد و جہد سے متعلق ہے اتنا خوبصورت، شاندار اور عظیم ہے کہ امن سے متعلق اس سے بہتر اندازِ بیان اُردو ادب میں مشکل ہی سے نظر آئے گا۔ بعض چھوٹی چھوٹی خامیوں سے قطعِ نظر "صبح ہوتی ہے" ہر لحاظ سے ایک مکمل اور شاندار رپورتاژ ہے۔

کرشن چندر کے اس دَور کی ہر کہانی اور ناول میں ان کے بڑھتے ہوئے شعور کی جھلک ہے مگر انقلاب کی سچائی نہیں کیونکہ انھیں خود اعتراف ہے کہ وہی انقلابی ادیب سچا ادب پیدا کر سکتا ہے جو عوامی تحریکوں میں حصہ لے اور ان کے دوش بدوش لڑے باوجود ذہنی طور پر انقلاب کو قبول کرنے کے ان کے افسانوں میں وہ گہرائی اور رچاؤ نہیں ہوتا جس کا کہ انقلابی تحریر مطالبہ کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس قسم کی تحریکوں میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا ہے۔ عوام کی روزمرہ زندگی، ان کے دُکھ درد، احساسات، جذبات اور ان کے سماجی مسائل کو پورے خلوص اور سچائی سے اسی وقت لکھا جا سکتا ہے جب ان سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اسی لیے ایسی کہانیوں میں وہ خلوص، وہ شدتِ تاثر اور وہ سچا شعور نہیں ہوتا جو تخلیقی ادب کی بنیاد ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں جہاں بھی ان کے تخیل نے ساتھ نہیں دیا انھوں نے فوراً نثر میں شاعری کا رنگ تیز کر دیا تاکہ افسانے میں بے رنگی محسوس نہ ہو۔ مثال کے طور پر ان کا دوسرا ناول "جب کھیت جاگے" کو میں ان کا ناکام ناول سمجھتی ہوں۔ اس لیے کہ تخیل کی مدد سے ادیب حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ کرشن چندر نے بمبئی میں رہ کر تلنگانہ کی زبردست جد و جہد اور تلنگانہ کی عظمت و وقار کی کہانی لکھی ہے اور اس سیدھی سادی انقلابی بغاوت کو انھوں نے اپنے شاعرانہ اندازِ بیان سے رنگین بنا دیا۔ کرشن چندر نے تلنگانہ کی اس عظیم جد و جہد کو دیکھے بغیر دھرتی کے بیٹوں کے خیالات اور احساسات کو جانے بغیر ان پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس لیے یہ ناول اس زرعیہ کا جاندار مرقع نہیں بلکہ خوبصورت شاہکار ہے جس میں صرف الفاظ کی رنگینیاں ہیں۔ حقیقت و صداقت کی تلخیاں نہیں۔ مخدوم محی الدین نے دو جملوں میں بڑی مختصر اور مکمل تنقید کی ہے کہ کرشن چندر تلنگانہ کے اس نئے انسان سے واقف نہ ہو سکے جس نے خوف، ڈر، اس کا اندوہوں اور اُمیدوں شجاعت و بہادری کی منزلوں سے گزر کے اپنے آپ کو ایک نئی تحریک سے وابستہ کیا۔ انھوں نے یکھ کر ... کرشن چندر تلنگانہ کے نئے کسانوں کی کو ... اور نہ

وہ ایسا کچھ ادب پیش کرتے جو سچ مچ تلنگانہ کے کسانوں کی نمائندگی کرتا۔ کرشن چندر ایک عظیم فن کار ہیں۔ ان کے دل میں انسان کے لیئے محبت کا بے پناہ جذبہ ہے۔ ان کے فن میں خلوص ہے، مگر صرف محبت اور خلوص ہی سے وہ اپنی کہانیوں میں انقلابی حقیقت نگاری کا رنگ نہیں بھر سکتے اور جہاں وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ناکام ہوتے ہیں۔ انسان کی امر دوستی نے کرشن چندر کو وہ راہ ضرور دکھائی ہے جس پر چل کر انھوں نے اجتماعی غم کو اپنا لیا ہے۔ آج دُنیا کی اجتماعیت جس بے چینی اور کرب میں مُبتلا ہے، فراوانی کے باوجود ہر طرف بھوک ہے۔ زندگی کی تمنا کرنے والوں کو موت اور امن کی خواہش رکھنے والے جنگ سے دوچار ہیں۔ اسی حالت میں زندگی اپنے تر شحے میں انقلاب چاہتی ہے مگر انقلاب نہ ایک چانٹے کے زور سے لایا جا سکتا ہے (جوتے پیٹوں گا) اور نہ گولی کے ذریعہ (پھول سرخ ہیں)، اور نہ کہانی کو کار توس کی موٹی سی گالی بنا دینے سے (کہانی کی کہانی)، بلکہ ان تھک محنت اور عملی سرگرمیوں سے انقلاب آتا ہے۔ اور انقلاب لانے والے صرف خیالوں میں نہیں بنائے جاتے جیسا کہ کرشن چندر بناتے ہیں۔

کرشن چندر [illegible] کشمیر کی زندگی کی سب سے زیادہ تصویر کشی کی ہے۔ [illegible] میں وہاں کی زندگی، طبقاتی کشمکش [illegible] اور سماج کی نقاب کشائی کی ہے اور [illegible] کے لیئے جدوجہد کرنے عوام کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کیونکہ کرشن کشمیر کی گھاٹیوں سے ندی اور ظلموں سے بھری وادیوں کے [illegible] سے واقف ہیں۔ سیب اور بادام کے [illegible] کشمیر، [illegible] آبشاروں اور برفانی چوٹیوں کا کشمیر، [illegible] ی بھیگی بھیگی صبحوں کا کشمیر، خزاں میں [illegible] کی چناروں کا کشمیر، کشمیر جس کی ہواؤں میں [illegible] غربت کی ایک عذاب ہے جو انسان کی آرزوؤں، اُمیدوں اور جاہلوں کے دل سے تپتا رہتا ہے۔ "یادوں کے چنار"، "برف کے پھول" اور "طوفان کی کلیاں" کشمیر کے سماجی اور طبقاتی کشمکش کی بڑی دلآویز داستانیں ہیں۔ "برف کے پھول" کی ساری فضا رُومانی ہے مگر حقیقت سے دُور نہیں۔ اس رُومان کا ضمیر زندگی کی سچّی سرگذشت سے اُٹھایا گیا ہے۔ "یادوں کے چنار" میں یُوں تو کئی کردار ہیں مگر کہانی صرف ایک ہی کردار کے گرد گھومتی ہے اور وہ ہے ڈاکٹر کا کردار، جو سچ کے راستے پر چلتا ہے، جس کے لیئے کوئی گھر نہیں، کوئی جائے پناہ نہیں، کوئی سایہ دار درخت اس کی راہ میں نہیں، مگر وہ ایک عزم راسخ اپنے سینے میں لیئے اس راستے سے گزرجاتا ہے اور اپنے پیچھے "یادوں کے چنار" چھوڑ جاتا ہے جو آسمان کی طرف سر بلند ہو کر اس کی شہادت کی گواہی دیتے ہیں۔

"طوفان کی کلیاں" میں کشمیری عوام کے شعور کی جھلک ہے۔ ان کے مسائل اور ان کی جدوجہد کو کرشن چندر نے پوری ذہانت اور فنی دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی زبان میں ستاروں کی سی جھلملاہٹ کرتی تابندگی اور برسات کی پھوار کی نغمگی ہے۔ کرشن کے اظہار کا یہی خوبصورت انداز انھیں اور ادیبوں سے منفرد کرتا ہے۔ مگر ناول، حقیقتوں کی علامات چاہتا ہے، تجربات کا ذخیرہ چاہتا ہے۔ کرداروں کی نفسیات سے واقفیت چاہتا ہے۔ کردار اور ماحول کی یگانگت چاہتا ہے اور ان چیزوں کی کرشن کے پاس کمی ہے۔ ان کے ناول انداز بیان کی نُدرت اور زبان کی خوبصورتی کے باوجود انسانی ذہن پر وہ شدید تاثر نہیں چھوڑتے جو ناول کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیئے۔ ان کے ناولوں میں فکر و تخیل کی پرچھائیاں تو نظر آتی ہیں مگر حقیقت کی توانائیاں نہیں۔

کرشن چندر کے فن کی عظمت، ان کے نظریات کی عالمگیر وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے حالات اور واقعات کے تقاضوں کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے۔ آج وہ اس راستے کی طرف گامزن ہیں جس کی ابتدا "بدھم بیرا" سے

ہوئی تھی اور جس کے سنگ میل "آسمان روشن ہے" اور "قدر کی ہنر" ہیں۔ ان مجموعوں کو پڑھ کر شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جب تک دنیا میں محبت ہے تو وہ نفرت پر فتح پائے گی اور زندگی کا ہر لمحہ موت کو پیچھے ڈھکیلے گا۔

کرشن چندر ایک باشعور ادیب ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ ہی ظلم اور ناانصافی کے خلاف کہانیاں لکھی ہیں۔ مگر اب تو ان کی آنکھیں ہر وقت انقلاب ہی کے خواب دیکھتی ہیں۔ وہ حال کی مایوس کن مشکلوں سے نہیں گھبراتے۔ ان کی نظریں مستقبل کے تابناک چہرے کو دیکھ لیتی ہیں۔

" یہ کیسی جان لیوا کاہش، خواہش اور تمنا ہے جو میری روح کو ہر لحظہ اپنے مضطرب مضراب سے مرتعش کیئے جاتی ہے۔ جو میرے ضمیر سے بار بار کہتی ہے کہ ایک ایسا دن ضرور آئے گا جب انسان اپنی جان پر کھیل کر اپنی تمام خامیوں سے لڑتے ہوئے اپنی وحشی جبلتوں پر قابو پاتا ہوا، فطرت کے ہر راز کا سینہ چیر کر بلند و بالا انسانیت کی درخشاں منزل کو چھوئے گا اس دن کے انتظار میں مجھے زندہ رہنا ہوگا تاریکی کے گرتے ہوئے ملبے میں سے روشنی کی کرن کو کرید کرید کر نکالنا ہوگا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا کر حرز جاں بنانا ہوگا اور انسانیت کے وقار کی مشعل کو اپنے سینے میں فروزاں کیئے اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہوگا۔ مجھے زندہ رہنا ہوگا ـــ صرف اپنی پانچ ہزار سالہ تہذیب کو بچانے کے لیئے نہیں ـــ اپنی دس ہزار سالہ بربریت کو مٹانے کے لیئے بھی ـــ"

یہ الفاظ کرشن چندر کے دل سے آتے ہیں۔ جب تک دنیا کے کروڑوں انسان امن، روٹی اور گلاب کا پھول نہ پالیں گے، کرشن اپنے دل کا سارا درد، اپنی روح کا سارا کرب، اپنی کہانیوں میں سمو کر اس محرومی کی یاد دلاتے رہیں گے اور ان کی کہانیاں تاریخ کی آنکھ کے آنسو بن کر لرزتی رہیں گی! ▲

○

جنوں اور سعیٔ خودداری کہ توبہ
ہوئی خواری بھی وہ خواری کہ توبہ
جھکی ہیں گردنیں اٹھتا نہیں ہاتھ
ہے یہ نازِ ستمگاری کہ توبہ
چمن رنگیں، فضا دلکش، ہوا مست
ہے اب کے ایسی تیاری کہ توبہ
نگاہیں اس قدر قاتل کہ اُف اُف
ادائیں اس قدر پیاری کہ توبہ
جوانی عمر کی پاکیزہ نعمت
اور اس پر یہ سیہ کاری کہ توبہ
وفا ناآشنا سے ضد وفا کی
لگی ہے ایسی بیماری کہ توبہ
خموشی میں نہ چھیڑو دل جلے کو
اُڑے گی ایسی چنگاری کہ توبہ
نہ تھا آسان استحقاقِ رحمت
مرا ذوقِ گنہ گاری کہ توبہ
نظر ملتے ہی ساقی کی نظر سے
چلی خود کہہ کے ہشیاری کہ توبہ
یہ دو جام آرزو دو میکدے ہیں
اُن آنکھوں کی ہے سرشاری کہ توبہ

جرم محمد آبادی

بکھرے موتی

مصیبت جھیلنے والے نئی دنیا بنالیں گے
تماشا دیکھنے والے ترا انجام کیا ہوگا

جب سے ڈوبی دل کے ارمانوں کی ناؤ
پھر کبھی طوفان آیا ہی نہیں

ہے کچھ تو بھرم جائے جو چپ بیٹھے تو ہوک اٹھے
فرصت موت بن جاتی ہے غیرت دار انساں کی

اگر موجوں سے ڈر کے ہم بھی ساحل ہی پہ رہ جاتے
تو دنیا پر حقیقت حشر تک کھلتی نہ طوفاں کی

رکھتے تو ہیں نظر میں مجھے برق و باغباں
پوچھے نہ کوئی بات اگر آشیاں نہ

سمجھ جائیں اگر جینے کا مقصد
دو روزہ زندگی بھی کم نہیں ہے

دیوانہ مجھ کو کہتے ہیں اہل خرد مگر
دیوانہ کیوں ہوا یہ کوئی پوچھتا نہیں

اے جرم سچ جو پوچھو تو یہ ہے پتے کی بات
ان کا پتہ ملا تو اب اپنا پتہ نہیں

کوئی مانے نہ مانے جرم لیکن یہ حقیقت ہے
بہت پیری میں روداد جوانی یاد آتی ہے

اپنی خبر نہیں ہے تمہاری خبر کے بعد
گم ہو گیا ضیا میں ستارہ سحر کے بعد

ہستی چند روزہ پہ کیونکر ہوں مطمئن
کرنا ہے اور ایک سفر اس سفر کے بعد

شاذ تمکنت

نفس نفس ہے ترے غم سے چُور چُور اب تک
نہ شام ہے نہ سویرا قریب و دُور اب تک

چل رہی ہے کہیں جُوئے شیر اے فرہاد
کلیم سُن تو سہی جل رہا ہے طُور اب تک

سُنی سُنائی پہ مت جا، ذرا قریب تو آ
سزا نہ دے کہ محبت ہے بے قصور اب تک

ارے خدا! میں کہاں جاؤں، کس طرف ڈھونڈوں
مجھے پکار رہا ہے کوئی ضرور اب تک

نہ تو مرا نہ تری ہم نشینیاں میری
بھرم ہے، جن کو سمجھتے ہیں سب غرور اب تک

اِدھر وفورِ محبت، اُدھر مروّت تھی
جو کچھ کہا تھا بھلا دے ترے حضور اب تک

چلا گیا ہے کہیں چھوڑ کر مکاں اپنا
کوئی نہیں ہے مگر جل رہا ہے نور اب تک

وہ ایک حادثۂ روح و دل کہ بیت گیا
جسے نہ پا سکا شاذؔ کا شعور اب تک

شہریار

کس کس کا دامنِ دل کھینچے کس کس کو یہ شے نایاب لگے
بازارِ جہاں میں اب کے برس کیا دیکھئے قیمتِ خواب لگے

کیا خوب تھی راہِ تمنا بھی، تھے اپنے نشیب و فراز اس میں
کبھی دوست جو تھے دشمن سے لگے کبھی غیر جو تھے احباب لگے

دُنیا میں کہیں ہے بھی کہ نہیں وہ شکل کہ جس کی ہو یہ صفت
دن ہو تو دکھائی دے سُورج اور رات ہو تو مہتاب لگے

کچھ تشنہ لبوں کا کہنا ہے سچ جانے کس میں کتنا ہے
ساغر ہو اگر ان ہاتھوں میں تو زہر بھی بادۂ ناب لگے

رہتی ہے تعاقب میں اس کے ہر ساعت رُسوائی کی بلا!
جس شخص کو بھی اعزاز ملے جس نام میں بھی القاب لگے

نذیر بنارسی

رات کی تاک میں ہے سویرا
آگے ناگن ہے، پیچھے سپیرا
راستہ لاکھ روکے اندھیرا
اب تو منزل پہ ہوگا سویرا
اپنی گٹھری سنبھال اے مسافر!
دیکھ پیچھے لگا ہے لٹیرا
آرزوؤں سے اللہ سمجھے
رہزنوں نے مسافر کو گھیرا
ہر نظر ان کی پہلی کرن ہے
اُن سے آنکھوں پہ ہے سویرا
گھات کرتا ہوں ساتھ اپنے دل کے
میرا دشمن اور میں ہی لٹیرا
جب تلک باغ میں ہے چہک لے
جانے کس بن میں ہو پھر بسیرا
مجھ پہ گزرے گی اک رات ایسی
جاگ کر تم کروگے سویرا
سُن رہا ہوں نذیر ایسا مومن
بُت کدے کا لگاتا ہے پھیرا

متین سروش

مشتاق نگاہوں کی یہ جلوہ بداما نی
اے کاش کوئی دیکھے خوابوں کی گل افشانی
شعلہ سا لپکتا ہے آنکھوں سے تخیل تک
اُس شمعِ بہاراں کی اللہ رے تابانی
منزل ہے جوانی کی، موسم ہے محبت کا
شایانِ بہاراں ہو، سامانِ غزل خوانی
عُنوانِ بہاراں ہے، پھولوں کی جگر چاکی
کچھ کام نہیں آتی شبنم کی دُرافشانی
کس زہرہ شمائل کا شہرہ ہے گلستاں میں
ہر پھول کی پتی ہے، آئینۂ حیرانی
اسرارِ نہاں جس نے کھولے ہیں نگاہوں پر
پائی ہے مرے دل نے اُس غم کی نگہبانی
کٹ جاتی ہیں زنجیریں شمشیرِ عزائم سے
کیا چیز ہے راہوں کی دُشواری و آسانی
اس لوحِ زمانہ کا ہر نقش مٹا ڈالیں
ہاتھ آئے دوانوں کے تقدیرِ جہاں بانی
ہر داغ کو سینے کے جو رنگِ چمن دے گا
آتا ہے سروش ایسا اِک دورِ غزل خوانی

حسرت سہروردی

★

○

راستے بدلتے ہیں راہبر بدلتے ہیں
پھر بھی اپنی ہمت سے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

شاعری محبت ہے، شاعری حقیقت ہے
شاعری کے پردوں میں انقلاب پلتے ہیں

زندگی کا افسانہ خشک بھی ہے رنگیں بھی
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

ہو سکے تو آجاؤ چاک دل رفو کر لیں
چشم نم میں رہ رہ کر اشک خوں مچلتے ہیں

تیز گام سے کہہ دو، کارواں میں ہم بھی ہیں
لاکھ بار گرتے ہیں پھر بھی جو سنبھلتے ہیں

منزلوں کے دیوانے، منزلوں کی چاہت میں
رہزنوں کے بھی اکثر ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ہم نے دیکھے ہیں اکثر آفتاب ایسے بھی
جو طلوع سے پہلے خود ہی آپ ڈھلتے ہیں

"ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں"
جانے پھر بھی کیوں حسرت لوگ ہم سے جلتے ہیں

▲

کیف احمد صدیقی

★

○

فصلِ جنوں بھی اب نہ اُگے گی پیار ایسی بنجر دھرتی ہے
اب بیکار ہیں پاگل دنیا اشکوں کی کھیتی کرتی ہے

یُوں پلکوں سے یاد کسی کی پونچھ رہی ہے میرے آنسو
جیسے ایک حسیں دوشیزہ پنگھٹ پر پانی بھرتی ہے

نفرت کے بازار میں جس نے چاہت کو نیلام کیا تھا
آج وہی ظالم دنیا کیوں پیار بھری باتیں کرتی ہے

اب بھی اگر منظور ہو تجھ کو پھر سے پلٹ آئے وہ زمانہ
تیری نظر کی ہر جنبش سے گردشِ دوراں بھی ڈرتی ہے

رُوحِ چمن بھی کانپ اُٹھتی ہے موسمِ گُل بھی تھراتا ہے
دردِ نمو کی شدت سے جب کوئی کلی آہیں بھرتی ہے

جس کو چاہے جان سے مارو، جس کو چاہے زندہ کر دو
موت سے تم کیوں خوف زدہ ہو موت تو خود تم پر مرتی ہے

کیف مری ہر فکرِ پریشاں، خونِ جگر میں ڈوب کے اکثر
غزلوں کے سادہ خاکوں میں رنگِ قوسِ قزح بھرتی ہے

▲

دوسرا بچہ

پڑو، دوڑو، بھاگنے، ناچنے ...
صبح ہی صبح گھر کے پاس والے جھونپڑوں سے کچھ
...لی آوازیں سُن کر ہم لوگ وقت سے پہلے ہی جاگ
...یں نے گھبرا کر اپنے کمرے کی وہ کھڑکی کھول دی جو
...جھونپڑوں کی طرف تھا۔ میں اکثر صبح و شام اس کھڑکی
...کھڑی ہو کر جھونپڑوں کے اندر کی زندگی سے لطف اندوز
...ہوں۔ کھاتے پیتے امیر گھرانوں کی زندگی میں عام طور
...یکسانیت پائی جاتی ہے۔ صبح سے شام تک اور شام
...سے رات تک کھاتے پیتے آدمیوں کی زندگی کچھ ایک ہی جیسے
...ڈھنگ کی ہوتی ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی بیڈ ٹی کا ہونا
...جانا، غسل کرنا، ناشتہ کرنا، شوہروں اور بچوں کا دفتروں
...سکولوں کو چلا جانا، بیگمات کی گھر کے نوکروں سے ہلکی سی
...جھک جھک، درزیوں سے نئے نئے ڈیزائنوں پر تبادلہ خیالات اور
...کلب کے نام پر لنچ تک گھروں سے غائب رہنا، لنچ، پھر
پھر غسل، پھر چائے، پھر کلب، پھر گپ، پھر ڈرنک،

پھر ڈنر ــــ اور آخر تھک ہار کر بستروں پر پڑ جانا۔

بظاہر یہ زندگی عام لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے بڑی خوبصورت اور آرام دہ نظر آتی ہے۔ لیکن ذرا ان پیسے والے آدمیوں کے دل و دماغ میں جھانک کے دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی روح کی دیواروں پر جگہ جگہ تک آرام طلبی، بوریت اور یکسانیت کی مکڑیوں نے اپنے جال پھیلا رکھے ہیں ــــ دل خالی کمروں کی طرح ہوائیں سائیں سائیں کرتا ہے اور دماغ میں ریگستانی آندھیوں جیسی سائیں سائیں ہوتی رہتی ہے۔ وہسکی و شراب اور دولت بھی کبھی کبھی ان سائیں سائیں اور سائیں سائیں کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ ایسا میرا خیال ہے۔ ورنہ اگر ان چیزوں سے دل کا سونا پن اور روح کا اکیلا پن دور ہو سکتا تو پھر آخر کشمیر، دار جلنگ، نینی تال اور ڈاکنال، سوئٹزرلینڈ، ٹوکیو، اور ہانگ کانگ، نیویارک، مصر، اور ماسکو کے چکر لگانے سونا، ڈالر، گھڑی اور ٹرانسسٹر کا بیوپار کرنے اور دولت عورت اور شہرت کو سمیٹنے کی کوشش میں جی جان اور عزت آبرو

کو داؤں پر لگا دینا کہاں کی عقلمندی یا دانشوری ہے! لیکن اس دُنیا میں عقلمند اور دانشور وہی سمجھا جاتا ہے جو کھوٹے کو کھرا اور پیتل کو سونا ثابت کر سکے!

جھونپڑوں میں رہنے والے چونکہ خود ہی سماج کی ٹکسال کے کھوٹے سکے سمجھے گئے ہیں اس لیے ان کے لیے نہ صرف کھوٹے کو کھرا ثابت کرنا محال ہے بلکہ اکثر ان کے کھرے کو بھی کھوٹے کا [illegible] ہوتا ہے.... کھوٹا کون ہے اور کھرا کون ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، نیکی کہاں ہے اور بدی کدھر ہے؟ یہ سب باتیں اس وقت بہت اچھی لگتی ہیں، جب ڈرائنگ روم میں مدھم لیمپ کی روشنی میں ذہین مرد اور خوبصورت عورتیں قیمتی گاؤ تکیوں کے سہارے لذیذ کھانا کھا کے بے ڈنڈی کے پیالیوں میں کوئی چینی یا خوبصورت اور نازک ننھے منے گلاسوں میں کوئی خوشبودار وائن پی رہے ہوں اور گفتگو سوسائٹی کے تمام تر اسکینڈل کی سڑکوں، شاہراہوں، گلی اور کوچوں سے ہوتے ہوتے ادب، آرٹ، اور کلچر پہ آ رُکے ——— جھونپڑوں میں رہنے والے اپنا وقت اس طرح کی بیکار باتوں میں نہیں صرف کرتے اور کریں بھی کیوں؟..... اس طرح کے خلاف کی ضرورت تو انہیں پڑتی ہے جو کارخانے چلاتے ہیں، ٹیکس بڑھاتے ہیں، بھوک اگاتے ہیں، سونا گلاتے ہیں اور بلڈنگیں بناتے ہیں! ———

حالانکہ بلڈنگیں بنانے والے اور کارخانے چلانے والے اور کوڑا کرکٹ اٹھانے والے انہی جھونپڑوں میں رہتے ہیں، یہیں پیدا ہوتے ہیں، یہیں بیاہ رچاتے ہیں، یہیں لڑتے جھگڑتے ہیں، یہیں [illegible] ہیں، یہیں رتی بنتے ہیں اور یہیں بچے [illegible] پنپتے ہیں، [illegible] ایک طرف سبزی بکتی ہے اور ایک طرف ہنڈیا ڈوئی [illegible] یہیں زینب، روزی، ہیرا اور رکمنی [illegible] نہیں، لیکن پھولوں کی دیتی [illegible]

تو اس رات ہم [illegible] گھر لوٹنے ایک فلمی پریمیر پر گئے تھے اور تھکے ماندے گھر لوٹے تھے۔ راستے بھر میں بوجھل پلکوں میں ڈھیر ساری نیند سمیٹے کچھ سوتی جاگتی گھر آ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ گھر جاتے ہی بستر میں دراز ہو جاؤں گی...

لیکن گھر قریب آیا تو خلافِ معمول جھونپڑوں کے دیئے اور لالٹینیں جل رہی تھیں اور جھونپڑے والے کسی ڈھول کنستر یا جانے کسی لکڑی کے کھوکھے کو پیٹ پیٹ کر گا رہے تھے۔

"گر بندا آوارے.....!! اکثر سنیچر کی رات کو یا تیج تہوار کے موقعوں پر جھونپڑوں میں رات گئے تک اسی طرح چہل پہل رہتی ہے ——— رات کو آرام کے وقت اسی طرح کا شور و غل اس وقت مجھے بہت کھلا۔ لیکن نیند زیادہ تھی اور وقت کم تھا اس لیے بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب صبح ہو گئی..... لیکن روشن دانوں سے آنے والی روشنی اور کھڑکی میں رکھی ہوئی دودھ کی بوتلیں اور قریب کی بلڈنگ سے آنے والی مدھر کیرتن کی آوازیں ...یہ سب ثبوت تھیں اس بات کا.... بھور بھئی اٹھو سونے والو..... لیکن اس وقت تو ہم جو ہڑبڑا کے اٹھے تھے تو اس کی وجہ تو جھونپڑوں سے آنے والی چیخ پکار اور اس طرح کی آوازیں تھیں کہ "پکڑو، دوڑو، بھاگنے نہ پائے..... پولیس کو بلاؤ.... وغیرہ وغیرہ۔

میرا بچہ اور ملازم بھی آنکھ ملتے اٹھ چکے تھے۔ اور گھر کے برامدے میں کھڑے ہو کر جھونپڑوں کی طرف حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ میرے شوہر نے حسبِ عادت مجھے اور بچے کو اور نوکر کو اِدھر اُدھر جھانکنے اور کسی کے جھگڑے لفڑے میں دلچسپی لیتے دیکھ کے ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور بتایا کہ بمبئی میں کسی جھگڑے یا حادثے کا تماشائی بننا بھی غلط ہوتا ہے اور پھر یہ کہ آپ لوگ جا کے گھر میں بیٹھیے پرائے جھگڑے سے آپ لوگوں کو کیا دلچسپی۔ یہ کہہ کر میرے شوہر نے اپنے کمرے کی اس کھڑکی پر سے پردہ سرکا دیا، جہاں سے جھونپڑوں کا منظر زیادہ صاف نظر آتا تھا.....

[illegible] پولیس کی وین آ گئی، شور قدرے
[illegible] کے آس پاس کی بلڈنگوں کی بالکنیوں پر
[illegible] لوگ بھی آ آ کے کھڑے ہونے لگے اور سڑک
[illegible] راہگیر بھی پولیس کی وین کے آس پاس جمع ہونے
[illegible] جب [illegible] شیام ناتھ جی اور ان کی سوشل ورکر
[illegible] شام ناتھ بھی جھونپڑوں کی طرف جانے لگے تو ہم دونوں
[illegible] بھی ان کے ساتھ ساتھ اُدھر چلنے لگے.....

پولیس کانسٹیبل اِدھر اُدھر کے تماشائیوں کو ڈانٹ ڈپٹ
[illegible] دور رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ پولیس انسپکٹر ایک
[illegible] کے سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر ٹِکا ہوا تھا۔ بھگوتی دیوی
[illegible] کر کچھ لوگوں نے راستہ دے دیا اور ہم لوگ بھی ان کے
[illegible] اُس جھونپڑے کے آگے پہنچ گئے جہاں ایک چھوٹے سے
[illegible] کالا بھجنگ نوجوان آدمی کالی پینٹ اور سرخ شرٹ پہنے
سرخ اسکارف گلے میں لٹکائے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے
[illegible] میں ایک چمکتا ہوا چھرا تھا' جسے وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا

مجرم پہچان لیا گیا تھا۔ وہ بستی کا مشہور غنڈہ گلزاری تھا
[illegible] وہ جھونپڑا جیناں بائی اور سرفراز علی کا تھا۔

جیناں بائی سہمی ہوئی اپنے چھوٹے سے بچے کو اپنی چھاتی
[illegible] لگائے چپ چاپ کھڑی ہوئی اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے
[illegible] زاری کو دیکھ رہی تھی اور جب وہ چھرا اُلٹ پلٹ کرتا تو جیناں بائی
[illegible] کانپ جاتی۔ سرفراز علی حیران، پریشان، خاموش اور گمبھیر
[illegible] جیناں بائی کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے زور سے کھانس کھنکار کے تھوکا اور
[illegible] نہایت [illegible] اور [illegible] کی مناسبت سے بڑی مناسب
[illegible] سے گلزاری سے پوچھا:

"یہ کیا ہے؟"

"تم دیکھ تو رہا ہے یہ ہمارا چھرا ہے"، گلزاری نے بڑے
اطمینان سے جواب دیا۔

"تم رات سرفراز علی کے جھونپڑے میں کیوں گھسے تھے
چوری کے لیے؟"

"ارے بابا' چوری کے لیے کون سالا گھسے' ہم تو جیناں بائی
کو قتل کرنے کے لیے اُس کے گھر میں گھسا تھا۔"

جیناں نے ہلکی سی چیخ ماری اور سرفراز علی سے اور بھی
سمٹ کے کھڑی ہو گئی..... مجمع میں سے ہلکی ہلکی سی سرگوشی
کی آوازیں آئیں جو انسپکٹر کی گرجدار آواز سے فوراً ہی ساکت
ہو گئیں.....

"ہوں!" انسپکٹر نے کہا: "تو تم خود یہ بات قبول کرتا ہے
کہ تم جیناں بائی کو قتل کرنے کے لیے اُس کے گھر میں گھسا تھا؟"

"ہاں سیٹھ --- صاف صاف بولتا ہے --- اپن کبھی جھوٹ
نہیں بولتا۔"

"لیکن گلزاری! --- تم کو جیناں بائی سے کیا دشمنی تھی؟"

"ارے بابا' اپنا تو آج تک کسی سے دشمنائی نہیں ہوا۔
ہم سچا بولتا ہے۔ اپن تو مزدور آدمی ہے..... مجوری کرتا
ہے' پیٹ پالتا ہے۔"

"قتل کرتا ہے اور بولتا ہے کہ تو مجوری کرتا ہے.....
اب مجوری کرنا' اپنے باپ کے گھر جا کے....."

"ارے سیٹھ کا ہے کو اپن کا باپ کو بیچ میں لاتا ہے.....
ہم تو اپنی بات کرتا ہے' ہم سے ہمارا بات پوچھو۔"

"تو صاف صاف بیان کر دو کہ تم جیناں بائی کے گھر میں کیوں
گھسا تھا؟" انسپکٹر نے قلم اور کاغذ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ گلزاری
تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے کہا:

"اچھا سیٹھ..... صاف صاف بولتا ہے..... اپن کو کیا ڈر
ہے جو صاف صاف نہیں بولے گا..... دیکھو سیٹھ یہ جیناں بائی
کو کل پہلی بیری [illegible] پانی کے نلکے پہ دیکھا تھا۔ ہم کو [illegible]
کھاس کر کے جیناں بائی کو....."

"خانم...." سرفراز علی نے دانت پیستے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

خانم، سرفراز علی کی پہلی بیوی تھی۔ دو سال سے سرفراز علی نے اس کو چھوڑ رکھا تھا، اور خود جنیاں بائی کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ خانم کی بدزبانی، بدشوری، اور بدسلوکی کی داستانیں جھونپڑے والوں میں زبان زبان پر تھیں۔

"ہاں بابا خانم بائی ہمارے پاس پچھ جینے سے آتا تھا اور روتا تھا اور بولتا تھا کہ اس کا مرد اُسے چھوڑ کر ایک دوسری جنانی کے سنگ رہنے لگا ہے.... اور اس کو آدھا پگار دیتا ہے.... آدھا پگار تو وہ عورت کو دیتا ہے...... اس لیے خانم بائی کو بہت دُکھ ہوتا تھا۔ پہلے تو وہ بولا کہ ہم جنیاں بائی کو کچھ نہیں بولے گا اگر وہ ہم کو اپنا چاندی کا گہنا دے دے جو وہ اپنے گھر سے لایا ہے اور پھر سرفراز علی کا آدھا پگار بھی لینا بند کر دیوے تو ہم اس کو کچھ نہیں بولے گا۔ پر سرفراز علی ان باتوں پر تیار نہ ہوا اور بولا خانم بائی کو ہم آدھا پگار بھی دیتا ہے یہ بھی بہت ہے۔ وہ بہت بُرا عورت ہے۔ وہ ہمارے ماں باپ کو ہمارے بھائی بہن کو گھر سے نکال دیا ہے..... وہ ہمارا بھی خیال نہیں کرتا ہے اور پھر بُرا عورت بھی ہے ادھر اُدھر بھی آنکھیں چلاتا ہے..... پن خانم ہم سے بولی، "یہ سب جھوٹ ہے..... اصلی جھگڑا عشق کا ہے.... اب بابا عشق سے تو اپن کو بھی بڑا نفرت ہے..... سارا جھگڑا اس عشق کا ہوتا ہے.... ہم بولا، "اچھا خانم بائی اگر جھگڑا ہی عشق کا ہے تو ہم پوری تیری بات مانیں گے..... ایک عورت کا بھلا کریں گے..... خانم یہ سن کے بہت خوش ہوا اور ہم سے بولا، "تو آج سے میرا سگا بھائی ہے گلزار ی.... تو میرا کام کر دے تو جنیاں بائی کو کھلاص کر دے تو ہم تجھ کو خوش کر دیں گے ——— پھر خانم نے ہم کو دس روپیہ دیا اور بولا کام ہو جانے کا تو سو روپیہ اور دے گا ———

پھر خانم ہم سے بولا، "ہم اپنے بھتیجے سے تجھ کو ایک دوا منگوا دیں گے۔ بس کسی طرح وہ دوا جنیاں بائی کے کھانے میں ملا دینا۔ سرفراز علی، رات پالی پہ جاتا ہے۔ وہ تو شام کو کھانا کھا کے چلا جاتا ہے۔ جنیاں بائی سب کام کاج ختم کر کے رات کو کھانا کھاتی ہے۔ بس چپکے سے تو اس کے کھانے میں دوا ملا دینا۔

ہم بولا ——— خانم بائی اپن کو دوا دوا کا لفڑا نہیں چلیں گا ——— اپن تو کام صاف صاف کرتا ہے۔ تم بولتا ہے تو ہم جنیاں بائی کو ایکدم کھلاص کر دے گا۔ کیسے کریگا؟ یہ تم ہم سے مت پوچھو...... خانم بائی خوش ہو گئی۔ ڈبے سے پاؤ نکال ——، اور ہنڈیا سے مٹن نکال لائی —— کیا مجے دار مٹن بنایا تھا خانم بائی نے ——— ہم نے خوب پیٹ بھر کے مٹن اور پاؤ کھایا —— اوپر سے بالائی والا دودھ پیا ——— دو سٹا چرس کا لگایا، اپنا چھرا نکالا ——— اور اِدھر جنیاں بائی کے جھونپڑے میں آ گیا —— جنیاں بائی اس وقت اپنا سب کام ختم کر کے تھک کے لیٹا تھا —— اس کا بچہ اس کی گودی میں تھا، پر سویا نہیں تھا اور رو رہا تھا، ریں.... ریں ریں ریں ——— "ارے سو جا نا کمبخت...." جنیاں بائی بچے کو ہلکا سا دھپ مار کے بولی۔

ہم دھیرے دھیرے چپکے چپکے جھکا جھکا جھونپڑے میں گھسا، اور ایک کونے میں لگ کر بیٹھ گیا۔ ہمارے ہاتھ سے کوئی برتن لگا اور آواز آئی کھڑ کھڑ....... جنیاں بائی بولی ———

"ارے چوہے کتنے ہو گئے ہیں، کل کہوں گی منے کے ابا سے، مجھے کوئی بلی پال دے، اللہ کی مار چوہوں پہ....."

ہم چپ چپ بیٹھ گیا، چھرا ہم نے اپنا باجو میں چھپا لیا اور ہم انتظاری کرنے لگا کہ کب جنیاں بائی سوتے اور کب ہم اس کو کھلاص کرے...... پر جنیاں بائی بھی کیا کرتی اس کا بچہ سالا ہلکٹ...... روئے جا رہا تھا ریں.... ریں..... ریں ریں.... اس کو بچہ پہ بڑا غصہ آ رہا تھا.... ہم کو بھی آ رہا تھا۔ ارے ایک بری تو ہم سوچا کہ پہلے سالا بچے کو کھلاص کر دے برا

اندر

"آتی ہوں بی بی ابھی آتی ہوں
تیرے ننھے منے کو ابھی سلاتی ہوں

ورنہ ہم کو ایسا لگا' جیسا غیاں باقی کوئی دوسرا عورت
نہیں ہے ہمارا مال ہے.... اس کا بچہ ہم کھودے

[illegible]

ہم جنم جنم کے ساتھی

آج پھر مجھے تمہاری یاد آگئی ـــــ ایسے ہی جیسے کسی کو کوئی بھولی بسری کہانی یاد آجائے ـــــ یا کوئی خواب جسے دیکھے ہوئے زمانہ گزر چکا! یا کوئی خیال جو ایک آوارہ پنچھی کی طرح ذہن کی دیواروں سے اپنا سر ٹکاتا پھرے۔ حالانکہ نہ تم کوئی خیال ہو، نہ خواب ہو اور نہ ایک کہانی ـــــ تم تو ایک چلتی پھرتی زندہ حقیقت ہو۔ لیکن اس کے باوجود تم اس دنیا سے اتنی دور ہو کہ تمہیں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کوفت اپنی ناکامی پر نہیں بلکہ اس حماقت پر ہے جس کا دوسرا نام شاید تم ہو۔ مجھ میں نہیں آتا کہ تم میں یہ شانِ استغنا کیوں کر پیدا ہوئی۔ دوسروں سے بے رُخی کی توجیہ تو ممکن ہے اور بڑی آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں مفت میں دردِ دل کی دوا تقسیم کی جائے۔ بات ٹھیک ہے اور کوئی بھی اسے ماننے میں تامل نہیں کرے گا۔ لیکن یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ کوئی خود آپ اپنے سے لاپرواہ ہو جائے۔ پھر اس انداز کو بھی کوئی گوارا کر لے، کیونکہ خود ستائی یا خود نمائی کا ایک روپ نہیں ہوتا، کئی روپ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ادا اسی جذبہ کی مظہر ہو، اور اسے تسکین پہنچائے۔ لیکن کبھی تم نے غور کیا کہ یہ جذبہ جب حد سے آگے بڑھ جائے تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ کون کہتا ہے کہ تم میں خوبیاں نہیں۔ مجھ سے پوچھو۔ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہاری ان دو سیاہ نشیلی آنکھوں میں کتنے سمندروں کی گہرائی ہے۔ تمہارے سونلائے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی دھوپ جیسی چمکتی ہوئی مسکراہٹ میں کتنی آرزوؤں اور اُمیدوں کے چراغ روشن ہیں اور تمہارے ان نازک خوبصورت ہاتھوں میں گھریلو زندگی کی عظیم کہانی لکھی ہوئی ہے، بشرطیکہ تم اسے پڑھو سمجھو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمہیں زندگی سے پیار کرنا آجائے۔

یہاں مجھے اپنی پوزیشن صاف کرنا نہیں ہے اور نہ میں اس بات کی کوشش کروں گا کہ اپنے متعلق سب کچھ کہوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میں نے اب تک کوئی ایسی حرکت ہی نہیں کی، جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ سوچ سمجھ کر کیا اور اس لیے کیا کہ تمہیں جلاؤں، تڑپاؤں ـــ

ں دلاؤں کہ تمہارا ایک وجود ہے۔ ایک شخصیت ہے،
ایک حق ہے، تاکہ تم اپنی گہری نیند سے چونک کر اٹھو،
فضا سے باہر نکل کر اس زمین پر قدم رکھو جس پر میں
ین تم ــــ تم! ــــ

حیرت ہے اُس وقت بھی تم نے کچھ نہیں کہا، جب میں
ارے مِس للّیتا کا ذکر کیا اور یوں بھی مِس للّیتا ہے
ر، جس کا پیار سے ذکر کیا جائے۔ کون جانے وہ کون
ب ہے جس کے حصے میں مِس للّیتا جائے گی، یقیناً وہ
ی میں ہی جنت کا مالک بن جائے گا۔ مِس للّیتا کو
نیا کو بھول جاؤ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف
ار آگئی۔ ہنسی ایسی کہ پھول مسکرا پڑیں اور قہقہے ایسے
کر مور ناچنے لگیں۔ کوئی غم نہیں اور اگر ہے بھی تو
ی دوستی ان غموں سے لڑنا اور ان کا سامنا کرنا سکھاتی

س للّیتا کی بات کیوں؟ وہ مسز جیمس بھی تو کچھ کم
ں نہیں۔ جب بھی میں نے مسز جیمس کو دیکھا وہی شفاف
، ان کے چہرے پر تھی۔ میں پوچھتا ہوں کیا مسز جیمس
یں؟ کیا ان کے اپنے وہ مسائل نہیں ہیں، جن کی ایک
ہے۔ کیا مسز جیمس اور مِس للّیتا اس دُنیا کی
ں؟ ــــ

ہم کیوں دُور جائیں خود اپنے خاندان کی مثال
ہے۔ فریدہ دیکھنے اور سُننے میں کتنی معمولی سی لڑکی
تی تھی، لیکن شادی کے بعد وہ کتنی سنجیدہ اور باوقار
اپنے شوہر سعید کی خوشی اس کی اپنی خوشی بن گئی۔ یہی
، وہ کسی اسکول میں معلّمہ بن کر اپنے شوہر کے ساتھ معاشی

میدان میں بھی قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے۔ ایک دن اسے چھیڑتے ہوئے میں نے پوچھا:

"بھئی فرو، یہ تم نے کیا ملازمت کا جھگڑا پال رکھا ہے اچھی خاصی تھیں ــــ اطمینان سے دال بگھارا کرتیں" ــــ

مجھے یاد ہے اس پر فریدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور اس نے کہا تھا ــــ "واہ بھائی جان، ــــ یہ بھی کوئی بات ہوئی بے چارے سعید ہم سب کے لئے مصیبتیں اُٹھائیں اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے پان چبایا کریں۔ رہی دال کی بات تو وہ اب بھی ہم بگھارتی ہیں۔"

فریدہ نے جو بات کہی شاید خود اُسے پتہ نہیں تھا کہ اُس نے اپنی عُمر سے کتنی دُور جا کر ایک صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا۔ لیکن اُسے چونکہ سعید سے بے پناہ پیار ہے اس لیئے بھی اُسے اپنی مُشکلات پر قابو پانے میں دقّت محسوس نہیں ہوئی اور وہ بات کہہ دی، جو ایک جہاں دیدہ عورت ہی کہہ سکتی ہے۔

مجھے فریدہ کے خیال سے پُورا اتفاق ہے۔ اس لیئے میں اُسے پسند بھی کرتا ہوں۔ سچ پوچھو تو کسی کا کسی پر فوقیت جتانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم دو الگ الگ شخصیتیں اور دو وجود رکھنے کے باوجود بھی ایک ہیں۔ ہم جنم جنم کے ساتھی ہیں تو پھر یہ سب کیوں ــــ کیوں؟ ــــ

لیکن نہیں ــــ تم میری بات کو سمجھ نہیں سکتیں یا پھر تم سمجھ کر بھی اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتیں۔ میں تمہیں جانتا ہوں تم چُپکے چُپکے جلنا پسند کرتی ہو اور سمجھتی ہو کہ میں بھی اس آگ میں جل جاؤں گا یا تم مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ لوگی۔ لیکن یقین رکھو، تمہیں مایوسی ہوگی۔ اگر تمہیں میری پَروا نہیں تو میں تمہاری پَروا کیوں کروں۔ تم ہی بتاؤ یہ کہاں کی پاس داری ہے کہ میں تمہارے قریب آنے کی کوشش کروں اور تم مجھ سے قریب ہوتی ہوئی بھی

خود بھاگنے کی کوشش کرو۔ کیا تم کو صرف اس بات پر ناز ہے کہ تم ایک بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ لیکن نہیں، مجھے ناز کا نہیں گھمنڈ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ کیا تم اس سے انکار کرسکوگی؟ ــــ

بے رُخی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میں اسے تمہاری بے رُخی پر نہیں بلکہ بے حسی پر محمول کرتا ہوں۔ ابھی ابھی جب تمہاری سہیلی کلثوم مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی تو تم یوں انجان تھیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، اور نہ کچھ ہو رہا ہے۔ حالانکہ اپنے انداز میں، مَیں نے ہر وہ ممکنہ کوشش کی کہ تمہاری اندر کی عورت کو بھڑکاؤں۔ مگر کمال ہے تم ٹس سے مس ہوئیں میں پوچھتا ہوں آخر کہاں مرگئی تمہاری عورت؟ ــــ

ایک بات سمجھ میں آرہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے فرشتہ سمجھنے لگی ہو۔ اور فرشتہ قابلِ گرفت نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر میرے لیئے ایک اور دُکھ کی بات ہوگی، اور میں سمجھوں گا تم نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔ کیونکہ میں فرشتگی کا قایل نہیں، انسان کا قایل ہوں۔ میں انسان بننا چاہتا ہوں۔ انسان رہنا چاہتا ہوں اور شاید یہ اُسی وقت ممکن ہے جب تم مجھے آسرا دو۔ سنو، ــــ میں تم کو تم سے مانگتا ہوں۔

میں چاہوں تو ابھی چل کر تمہارے پاس پہنچ سکتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ تم حسبِ عادت مُسکراتی ہوئی دروازہ پر میرا استقبال کروگی۔ اس سے ہوسکتا ہے کہ میری رُوح کو تھوڑی بہت خوشی نصیب ہو۔ اور "اَنا" کو کچھ تسکین ملے۔ لیکن سچی مسرت اس میں نہیں۔ یہ سب فریب ہے۔ میں تمہیں دھوکہ دیتا ہوں اور تم مجھے دھوکہ دیتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ کہو جو تمہارے دل میں ہے۔ میں جس طرح تمہیں جس رُوپ میں دیکھنا چاہتا ہوں، اسی طرح تمہیں بھی یہ حق پہونچتا ہے کہ تم مجھے اس شکل میں دیکھو جیسا کہ تم چاہتی ہو ــــ میرا تم سے سارا جھگڑا یہی ہے کہ تم اپنی زبان کھولو! اور یہ ثابت کردو کہ تم مٹی کی بنی ہوئی ایک بے جان مُورتی نہیں ہو بلکہ گوشت و پوست کی ایک زندہ اور چلتی پھرتی حقیقت ہو۔

تمہیں یاد ہوگا کہ ابھی ابھی میں نے تم کو ایک بھولی بسری کہانی سے تشبیہہ دی ہے۔ اگر تم اس تشبیہہ پر جھنجلا سکو تو واقعی مجھے خوشی ہوگی۔ کیونکہ دانستہ طور پر میں نے اس تشبیہہ کے ذریعہ تمہاری توہین کی ہے اور پھر ایسی صورت میں جب مجھے اس کا احساس ہے کہ تم مجھ سے قریب نہیں بلکہ بہت قریب ہو، اور پاس کے کمرے میں سو رہی ہو۔ لیکن سوچو تو کیا یہ تشبیہہ میری نفسیاتی اُلجھنوں کی مُنصفانہ نمایندگی نہیں کرتی؟ کیا اس تشبیہہ سے تمہاری وہ عورت بے نقاب نہیں ہوتی جو صدیوں سے روتی ہوئی آئی ہے؟

مجھے ایک بار پھر یہ یاد دلانا ہوگا کہ مجھے رونے سے شدید نفرت ہے اور روتی ہوئی عورتیں ــــ تم ــــ نہیں ــــ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اب کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دوں ــــ اور پھر تمہاری آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں میں تم سے آنسو نہیں مُسکراہٹ مانگتا ہوں۔ میری تم سے یہی درخواست ہے کہ آؤ پھر سے ہم ایک دوسرے کے بہترین اور سچے دوست بن جائیں اور زندگی کی اس لمبی سڑک پر ہاتھ میں ہاتھ دیئے مُسکراتے ہوئے قدم بڑھائیں۔ اسلئے نہیں کہ تمہیں صرف اپنا رشتہ نباہنا ہے بلکہ اس لیئے کہ ہمیں زندہ رہنا ہے اور قدرت کی دی ہوئی اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرنا ہے، جسے زندگی کہتے ہیں۔ ▲

ابو

جن سعید

ریٹ اور چشمہ

ں کمرے سے نکل کر جب ڈرائینگ رُوم میں داخل ہوا
دیکھا ایک اُونچے قد کا سانولا سلونا اجنبی کرسی میں
بڑی بے نیازی سے سگریٹ کے مرغولے فضا میں
ا۔ پہلے میں قدرے جھجکا۔ اچانک مجھے یُوں لگا جیسے
سے دوسرے مکان میں داخل ہو گیا ہوں۔

معاف کیجیے گا" اس نے میرے چہرے پر آئی ہوئی حیرانی
ہوئے کہا۔

مجھے انجم آفتاب کہتے ہیں۔ مَیں آپ کے برابر والے مکان
ہوں۔ بیگم نے کہا تھا کہ ذرا میں آپ کی خبر لے آؤں وہ
ہی دیر ہی میں یہاں آکر آپ سے نیاز حاصل کریں گی"
میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ رینگنے لگی اور میں تعبیر
ہے سمجھے بوکھلاہٹ میں کہہ اُٹھا: "ضرور ضرور انھیں بھی تشریف
[illegible]

اس نے جیب سے ریڈ اینڈ وائٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک
[illegible] اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ سگریٹ کا شوق رکھتے ہیں؟"
"کبھی کبھار پی لیتا ہوں، ویسے آپ کا اصرار ہو تو پی لوں
سگریٹ پینا اچھی عادت تو نہیں، جس کے لیے میں آپ
سے اصرار کروں۔"

میرے سگریٹ پینے کا مُوڈ بھی اس کے اس جملے کے بعد
کافور ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران وہ
اچانک اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اُسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔
"اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ بیگم میرا انتظار کر رہی ہوں گی"
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔
تھوڑی دیر بعد اماں بی کے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی
تھی

"بٹیا، تجھ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے [illegible]
کہ میری زہرہ پاکستان سے آگئی ہے۔ [illegible]
دی تھی۔ تم بھی اسی طرح اس میں [illegible]
ہو گی بٹیا، بٹیا پیارا [illegible]

دُور بھاگتا

با...

"امی، مقتدر کس کلاس میں پڑھتے ہیں؟"

"ابھی ابھی تو اس نے پی۔ یو۔ سی کیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی بی۔ اے بھی کر لے گا۔ بٹیا مسرت کی بات ہے کہ تو پردہ نہیں کرتی، پتہ نہیں تجھے پردے سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"مقتدر بیٹا ــــ مقتدر ــــ" اماں بی کی آواز کمرے سے گونجی۔

"جی ــ آپا" ــــ کہتا ہوا مقتدر دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔

میں نے کنکھیوں سے انجم آفتاب کی بیگم کو دیکھا اور میرا دل دھک سا ہو کر رہ گیا۔ وہی گوٹھا سا قد، وہی کھلتا ہوا رنگ، وہی نڈھال سی خوبصورت آنکھیں۔ اتنی مشابہت کہ آدمی حیران ہو کر رہ جائے۔ مجھے یوں لگا، جیسے میں پھر ایک بار اپنی بہن زہرہ سے مل رہا ہوں۔

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے اس نے مجھے بغور دیکھا ــــ

ــــ اور ــ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اپنے گھر چلی گئی۔

مجھے وہ منحوس شام آج بھی یاد ہے۔ جب میں نے اُسے الوداع کہا تھا اور جب میں آخری بار اُسے گلے لگاتے ہوئے رخصت ہو رہا تھا تو شبلے کے ہاتھ میری آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے ... "... ایسے ... جیسے میں ... ہمیشہ

میں سوچنے لگا۔ ... پیارگی مجھے محسوس ہوا جیسے ... میرا بہنوئی بھی ہے۔ پھر یکایک اس خیال سے میرے ... کنارے کانپ گئے۔

میں سوچ کی گہری وادیوں میں بھٹک رہا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لمبے بالوں والا خوبصورت سا نو... میں چھوٹا سا بیگ تھامے پاؤں تھرکاتا ہوا باہر کھڑا تھا۔

"انجم صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"انجم صاحب، سامنے کے مکان میں رہتے ہیں" ... لہجہ میں کہا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سامنے کے ... دستک دی۔

کھڑکی کھلی۔ شیشے میں سے دو خوبصورت آنکھیں ... ہونٹ ہلے اور مہین سی پیاری آواز آئی۔

"آئندہ ماہ میں کسی طرح بھی روپے بھجوا دوں گی ... رہیئے"

آنے والے نوجوان کے چہرے پر خفگی کا دُور دُور ... نہ تھا۔ وہ بس اچھا کہتا ہوا چلا گیا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے ... ہے۔ پتہ نہیں اُسے کن مجبوریوں نے قرض لینے پر مجبور کیا ہو ... لباس سے تو وہ پریشان حال معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن اللہ جانے!!

تھوڑی دیر بعد اماں بی نے ڈرائنگ روم میں آ...

"زہرہ آئی ہوئی ہے اور تجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہے"

عوض سعید

رشتے اور چہرے

میں کمرے سے نکل کر جب ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا ایک اونچے قد کا سانولا سلونا اجنبی کرسی میں دھنسا ہوا بڑی بے نیازی سے سگریٹ کے مرغولے فضا میں بکھیر رہا تھا۔ پہلے میں قدرے جھجکا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں غلطی سے دوسرے مکان میں داخل ہوگیا ہوں۔

"معاف کیجئے گا۔" اس نے میرے چہرے پر آئی ہوئی حیرانی کو پڑھتے ہوئے کہا۔

"مجھے انجم آفتاب کہتے ہیں۔ میں آپ کے برابر والے مکان میں رہتا ہوں۔ بیگم نے کہا تھا کہ ذرا میں آپ کی خبر لے آؤں وہ بھی تھوڑی دیر ہی میں یہاں آکر آپ سے نیاز حاصل کریں گی۔"

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ رینگنے لگی اور میں بغیر کچھ سوچے سمجھے بوکھلاہٹ میں کہہ اٹھا۔ "ضرور انھیں بھی تشریف لانے کو کہئے گا۔"

اس نے جیب سے ریڈ اینڈ وائٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ خود سلگایا اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ سگریٹ کا شوق رکھتے ہیں؟"

"کبھی کبھار پی لیتا ہوں، ویسے آپ کا اصرار ہو تو پی لوں گا۔"

سگریٹ پینا اچھی عادت تو نہیں، جس کے لئے میں آپ سے اصرار کروں۔"

میرے سگریٹ پینے کا موڈ بھی اس کے اس جملے کے بعد کافور ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا جیسے اُسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔

"اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔ بیگم میرا انتظار کر رہی ہونگی۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر بعد اماں بی کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی

"بٹیا، تجھ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میری زہرہ پاکستان سے آگئی ہے۔ وہی صورت، وہی آنکھیں وہی قد۔ تم میں اور اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں [illegible] ہوگی بٹیا، بڑا پیارا لڑکا ہے، لیکن ہے [illegible]

دُور بھاگتا ہے۔ اب یہی دیکھو نا، اپنی بھابھی سے آنکھیں مِلا کر باتیں کرتے ہوئے لڑکیوں کی طرح شرماجاتا ہے۔"

کمرے میں ہنسی کی جھا جھنیں سی بج اُٹھیں اور میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اماں بی بھی عجیب ہیں۔ کیا اس قسم کی باتیں آئے ہوئے مہمان سے کرنی چاہئیں"؟ - ایک لمحہ بعد پھر میرے کانوں نے نقرئی قہقہہ کی گُونج سُنی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میری دہاں تذلیل ہورہی ہے۔

"امی، مقتدر کون کلاس میں پڑھتے ہیں؟"

"ابھی ابھی تو اس نے پی۔ یو۔ سی کیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی بی۔ اے بھی کرلے گا۔ بٹیا مسرت کی بات ہے کہ تو پردہ نہیں کرتی، پتہ نہیں مجھے پردے سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"مقتدر بیٹا ___ مقتدر ___"۔ اماں بی کی آواز کمرے سے گُونجی۔

"جی ___ آیا" ___ کہتا ہوا مقتدر دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔

میں نے کنکھیوں سے انجم آفتاب کی بیگم کو دیکھا اور میرا دل دَھک سا ہوکر رہ گیا۔ وہی بُوٹا سا قد، وہی کھِلتا ہوا رنگ، وہی نڈھال سی خوبصورت آنکھیں۔ اتنی مُشابہت کہ آدمی حیران ہوکر رہ جائے۔ مجھے یُوں لگا، جیسے میں پھر ایک بار اپنی بہن زہرہ سے مِل رہا ہوں۔

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے اس نے مجھے بغور دیکھا ___

___ اور ___ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اپنے گھر چلی گئی۔

مجھے وہ منحوس شام آج بھی یاد ہے۔ جب میں نے اُسے الوداع کہا تھا اور جب میں آخری بار اُسے گلے لگاتے ہوئے رخصت ہورہا تھا تو ضبط کے باوجود میری آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے وہ کہہ رہی تھی "بادلا کہیں کا، ایسے رو رہا ہے جیسے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تجھ سے جُدا ہورہی ہوں۔"

زہرہ سے مجھے بڑی محبت تھی۔ پھر ایسی بہن جو ماں ہو۔ ایک بھائی کے لیے متاعِ عزیز ہی تو ہوتی ہے۔ اماں وہ زندگی ہی تھی۔ زہرہ کسی بات پر خفا ہوکر پاکستان چلی گئی اس کا شوہر تھا۔ پتہ نہیں اماں بی اُسے اپنے شوہر کے پاس نہیں چاہتی تھیں حالانکہ وہ خاصہ شریف آدمی تھا اور کماؤ بھی۔

میں بستر پر بیٹھے لیٹے آفتاب اور اس کی بیگم کے بن سوچنے لگا۔ یکبارگی مجھے محسوس ہوا جیسے انجم میرا پڑوسی میرا بہنوئی بھی ہے۔ پھر یکایک اس خیال سے میرے ہونٹوں کے کنارے کانپ گئے۔

میں سوچ کی گہری وادیوں میں بھٹک رہا تھا کہ دفعتاً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لمبے بالوں والا خوبصورت سا نوجوان، میں چھوٹا سا بیگ تھامے پاؤں تھرکاتا ہوا باہر کھڑا تھا۔

"انجم صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"انجم صاحب، سامنے کے مکان میں رہتے ہیں"۔ میں نے لہجہ میں کہا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سامنے کے مکان پر جا دستک دی۔

کھڑکی کھُلی۔ شیشے میں سے دو خوبصورت آنکھیں چمکنے لگیں ہونٹ ہلے اور مہین سی پیاری آواز آئی۔

"آئندہ ماہ میں کسی طرح بھی روپے بھجوادوں گی، آپ بے فکر رہیئے"۔

آنے والے نوجوان کے چہرے پر خفگی کا دُور دُور تک نشان نہ تھا۔ وہ جی اچھا کہتا ہوا چلا گیا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے زہرہ مقروض ہے۔ پتہ نہیں اُسے کن مجبوریوں نے قرض لینے پر مجبور کیا تھا۔ ویسے لباس سے تو وہ پریشان حال معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن اندر کا حال کون جانے؟

تھوڑی دیر بعد اماں بی نے ڈرائنگ رُوم میں آکر مجھ سے کہا "زہرہ آئی ہوئی ہے اور تجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہے"۔

اچانک میرا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے کنگھے کی طرف گیا اور دوسرے لمحے میں شیشے کے سامنے کھڑا اپنے بے ترتیب بالوں کو سنوار رہا تھا... بہن سے دو چار باتیں کرنے کے لئے بال سنوارنے کی کیا ضرورت! شیشے میں سے میرے اندر کے انسان نے کہا۔

یکبارگی مجھے ایسا لگا، جیسے میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ میرا بدن کانپنے لگا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر زہرہ کو سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس نے خود پہل کر کے بڑے پیارے انداز میں مجھے سلام کیا۔

"بڑا شرمیلا ہے۔ سلام کرنے تک شرماتا ہے۔ میں نے اسے بڑے لاڈ و پیار سے پالا ہے۔ بچپن میں جتنا آرام اسے ملا، شاید بہت کم لڑکوں کو یہ نعمت نصیب ہوئی ہو۔ گو اب وہ بات نہیں رہی پھر بھی اللہ کا احسان ہے کہ زندگی اطمینان ہی سے گزر رہی ہے۔"

اماں بی کی گفتگو کی تان جب ٹوٹی تو انھیں زہرہ کو چائے پلانے کا خیال آیا اور وہ جھٹ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ پانچ منٹ تک خاموشی رہی۔

میں نے اپنے چہرے کو ذرا سے اٹھایا تو وہ میرے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ نے آج چپ کا روزہ رکھا ہے؟"

میں اس کے اس جملے سے بوکھلا گیا: "بات یہ ہے کہ میں ذرا کم آمیز قسم کا آدمی ہوں، دیر میں کھلتا ہوں۔"

"تو حضور آپ کھلتے بھی ہیں؟"۔۔۔ اس نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا" اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور لمبے لمبے سیاہ بالوں کی دو خوبصورت لٹیں اس کے شانوں پر آ کر کانپنے لگیں اور میں شرم و حیا کے بوجھ تلے دب سا گیا۔ دو منٹ پھر سناٹا طاری رہا۔

"انجم آفتاب صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد پھر دوبارہ ملاقات کیوں نہ ہو سکی؟"

میں نے گفتگو شروع کی۔

"آپ ان کے ساتھ سرد مہری سے پیش آئے ہوں گے تب ہی تو وہ آپ سے بغیر ملے لکھنؤ چلے گئے۔"

"کیا آپ مجھے اتنا غیر مہذب آدمی سمجھتی ہیں؟"

اسی دوران اماں بی چائے کی کشتی لیے آ دھمکیں اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔

"ارے تم دونوں تو ابھی تک چپ چاپ ہی بیٹھے ہو.... بیٹے، یہ ہماری مہمان ہے، کچھ تو اچھی باتوں سے دل بہلایا ہوتا۔"

"امی، اچھی باتیں تو رہیں ایک طرف، پہلے آپ ان کی زبان کے تالے تو کھولیئے۔"

"ہاں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہاں زہرہ بدل گئی ہے یا میں خود یہاں بدل سا گیا ہوں۔"

"کیا زہرہ کا خط آیا ہے بیٹا؟" اماں بی کی آواز اچانک ابھری۔

میں کچھ جواب دیئے بغیر وہاں سے اٹھ آیا اور ڈرائینگ روم میں آ کر کرسی پر دھڑام سے گر گیا۔ آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں جی بھر کر روؤں۔ لیکن آنسو پلکوں کے کنارے ہی پر آ کر ٹھہر گئے تھے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یکبارگی مجھے احساس ہوا جیسے کوئی میرے سرہانے کھڑا ہو۔ یہ بیگم انجم تھیں جو دھیرے دھیرے میرے بالوں کو اپنی نازک خوبصورت انگلیوں سے چھیڑ رہی تھیں۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ میری باتوں سے آپ کو غالباً تکلیف پہنچی ہے۔"

اس کی بڑی بڑی دراز پلکوں پر دو موتیوں جیسے آنسو چمک آئے۔

اس نے اپنے خوبصورت چہرے کو میرے بالکل قریب کر دیا۔

"مجھے اس زور سے چانٹا لگائیے کہ میں دوبارہ کبھی ہنس نہ سکوں۔ دوسری ملاقات ہی میں، میں نے آپ پر کچھ ایسا اثر چھوڑا ہے کہ آپ مجھ سے غالباً نفرت کرنے لگے ہیں۔ میں اتنی قابل نفرت شئے نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں، اس کی جھجک سے تم ناواقف ہو اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم کو ناواقف کروں۔" پھر وہ اچانک

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بے طرح اس سے لپٹ پڑا۔ اس کی گردن ڈھلک کر میرے سینے پر آگئی۔ پتہ نہیں یہ کیفیت مجھ پر کب تک طاری رہی!

جب ڈرائینگ روم میں اماں بی داخل ہوئیں تو میں نے دیکھا وہ مسکرا رہی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ میں پیار تھا۔ پاکیزگی تھی۔ اماں بی کی آنکھیں جب زہرہ سے چار ہوئیں تو وہ آہستہ آہستہ قدم ڈالتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد زہرہ پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔ اماں بی نے بھی زہرہ کے تعلق سے کوئی بات مجھ سے نہ پوچھی۔ رات اور دن پہاڑ کی طرح مجھ پر گزرنے لگے۔ میں ہر روز سوچتا تھا کہ خود ہی زہرہ کے گھر چلا جاؤں گا۔ چند قدم ہی کا تو فاصلہ تھا۔ لیکن چند قدم کے فاصلے کی ہمارے معاشرے میں بڑی اہمیت ہے اور یہ فاصلہ جس طرح میں طے کرنا چاہتا تھا بڑا ہی دشوار گزار تھا۔ اس راستے پر بھاگنے کودنے سے پہلے سماج نے انجام آفتاب کو پورا پورا حق دیا تھا اور میں اس سے محروم تھا۔

وہ رات بڑی گمبھیر تھی۔ گلی میں موت کا سا سناٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا یکایک بہتے بہتے رُک گئی ہو۔ دور بہت دور کوئی دوشیزہ پرسوز آواز میں گا رہی تھی۔

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

یہ آواز بہت دور سے دھیمی دھیمی سی آ رہی تھی۔ اس آواز میں بڑی کشش تھی۔ بڑا حسن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے گلے میں سارے جہاں کے نغموں کا حسن سمٹ آیا ہو۔ میں غیر شعوری جذبے کے تحت گھر سے نکل پڑا۔ میں جس سمت جاتا میرے کانوں سے یہ خوبصورت آواز ٹکراتی رہی۔ میں آواز کے دوش پر میلوں پیدل چلتا رہا۔ مجھے احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں اندھیری رات میں گھر سے بہت دور نکل چکا ہوں۔ قریب ہی کہیں سے جب مرغ نے بانگ دی تو نغمہ یکایک بند ہو گیا اور میرے قدم اچانک رُک گئے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ابدی خوبصورت نغمہ گونجے۔ لیکن فضا اس نغمہ سے خالی ہو چکی تھی۔ میں اُس بیہودہ مرغ کی ٹانگ توڑ دوں، جس نے صبح کر نغمے کی رات مجھ سے چھین لی۔

میں جب گھر پہنچا تو اماں بی خرّاٹے لے رہی تھیں۔ آواز پر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں:

"کیا بات ہے بیٹا؟ آج صبح ہی صبح اُٹھ بیٹھے"

میں نے رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ ماں اس ساری بستی میں جو مرغ ہوں گے میں انھیں کسی بھی قیمت پر خریدنا چاہتا ہوں"

ماں ہنس پڑی۔ "پگلا کہیں کا، تجھے مرغ پالنے ہی کا شوق ہے تو تیرے لیے کل ہی ایک ریڈ ہارن کا جوڑا لا دوں گی۔ سارے محلّے کے مرغ خرید کر بھلا تو کیا کرے گا"

"میں انھیں ذبح کرنا چاہتا ہوں ماں۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں"..... میرا گلا رندھ گیا۔ میں آگے کچھ کہہ نہ سکا۔

"میں سمجھتی ہوں بیٹا۔ جب سے بیگم نے یہاں آنا جانا بند کر دیا ہے، تب سے تو بے حد دلگیر و اُداس ہے۔ میں آج اُس کے گھر جاؤں گی اور اُسے منا لاؤں گی"

"ماں میں خود اس کے گھر جانا چاہتا ہوں"

تھوڑی دیر بعد میں چپ چاپ زہرہ کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ جی چاہتا تھا، پیار سے کہوں ..."زہرہ میں ہوں تمہارا کوکب ..... تم مجھ سے روٹھی ہوئی ہو نا۔ دیکھو تمہیں منانے کے لیے کون آیا ہے۔ یہ تم نے کل سے دروازہ کیوں بھیڑ رکھا ہے؟"

ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا اور بھڑا ہوا دروازہ خود بخود کھل گیا، جیسے ہوا کے جھونکے بھی مجھے بے خطر اندر جانے کی دعوت دے رہے ہوں۔

میں سہما سہما اندر داخل ہوا، جیسے میں چوری کرنے کا

اچانک میرا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے کنگھے کی طرف گیا اور دوسرے شیشے کے سامنے کھڑا اپنے بے ترتیب بالوں کو سنوار رہا تھا۔۔۔ ے دو چار باتیں کرنے کے لئے بال سنوارنے کی کیا ضرورت ہے شیشے ے میرے اندر کے انسان نے کہا۔

یکبارگی مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ۔ میرا بدن کانپنے لگا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر زہرہ کو سلام ئے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ اس نے خود پہل کر کے بڑے پیار سے ہیں مجھے سلام کیا۔

"بڑا شرمیلا ہے۔ سلام کرنے تک شرماتا ہے۔ میں نے اسے ے لاڈ و پیار سے پالا ہے۔ بچپن میں جتنا آرام اسے ملا، شاید کم لڑکوں کو یہ نعمت نصیب ہوئی ہو۔ گو اب وہ بات نہیں رہی ہی اللہ کا احسان ہے کہ زندگی اطمینان ہی سے گزر رہی ہے۔"

اماں بی کی گفتگو کی تان جب ٹوٹی تو انھیں زہرہ کو چائے نے کا خیال آیا اور وہ جھٹ اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ منٹ تک خاموشی رہی۔

میں نے اپنے چہرے کو قدرے اُٹھایا تو وہ میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ نے آج چُپ کا روزہ رکھا ہے؟"

میں اس کے اس جملے سے بوکھلا گیا۔ "بات یہ ہے کہ میں ذرا یز قسم کا آدمی ہوں، دیر میں کھلتا ہوں۔"

"تو حضور آپ کھلتے بھی ہیں"؟ ـــــ اس نے مجھے چھیڑتے ئے کہا۔

"جی ـــــ میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا" اور وہ بے ساختہ س پڑی اور لمبے لمبے سیاہ بالوں کی دو خوبصورت لٹیں اس کے الوں پر آ کر کانپنے لگیں اور میں شرم و حیا کے بوجھ تلے دب سا ا۔ دو منٹ پھر سناٹا طاری رہا۔

"انجم آفتاب صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد پھر دوبارہ ملاقات ہی نہ ہو سکی۔"

میں نے گفتگو شروع کی۔

"آپ ان کے ساتھ سرد مہری سے پیش آئے ہوں گے تب ہی تو وہ آپ سے بغیر ملے لکھنؤ چلے گئے۔"

"کیا آپ مجھے اتنا غیر مہذب آدمی سمجھتی ہیں؟"

اسی دوران اماں بی چائے کی کشتی لیے آ دھمکیں اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔

"ارے تم دونوں تو ابھی تک چُپ چاپ ہی بیٹھے ہو۔۔۔۔ بیٹے، یہ ہماری مہمان ہے، کچھ تو اچھی باتوں سے دل بہلایا ہوتا۔"

"امی، اچھی باتیں تو رہیں ایک طرف پہلے آپ ان کی زبان کے تالے تو کھو لیے۔"

"ماں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے وہاں زہرہ بدل گئی ہے یا میں خود یہاں بدل سا گیا ہوں۔"

"کیا زہرہ کا خط آیا ہے بیٹا۔" اماں بی کی آواز اچانک گونج گئی۔

میں کچھ جواب دیئے بغیر وہاں سے اُٹھ آیا اور ڈرائینگ روم میں آ کر کرسی پر دھڑام سے گر گیا۔ آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں جی بھر کر روؤں۔ لیکن آنسو پلکوں کے کنارے ہی پر آ کر ٹھہر گئے تھے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یکبارگی مجھے احساس ہوا جیسے کوئی میرے سرہانے کھڑا ہو۔ یہ بیگم انجم تھیں جو دھیرے دھیرے میرے بالوں کو اپنی نازک خوبصورت انگلیوں سے چھیڑ رہی تھیں۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ میری باتوں سے آپ کو غالباً تکلیف پہنچی ہے۔"

اس کی بڑی بڑی دراز پلکوں پر دو موتیوں جیسے آنسو چمک آئے۔

اس نے اپنے خوبصورت چہرے کو میرے بالکل قریب کر دیا۔

"مجھے اس زور سے چانٹا لگائیے کہ میں دوبارہ کبھی ہنس نہ سکوں۔ دوسری ملاقات ہی میں، میں نے آپ پر کچھ ایسا اثر چھوڑا ہے کہ آپ مجھ سے غالباً نفرت کرنے لگے ہیں۔ میں اتنی قابلِ نفرت شئے نہیں ہوں۔ میں جو ہنستی ہوں، اُس کی چُبھن سے تم ناواقف ہو اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم کو واقف کروں۔" پھر وہ اچانک

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بے طرح اس سے لپٹ پڑا۔ اس کی زدن ڈھلک کر میرے سینے پر آگئی۔ پتہ نہیں یہ کیفیت مجھ پر کب تک طاری رہی!

جب ڈرائینگ روم میں اماں بی داخل ہوئیں، تو میں نے دیکھا وہ مسکرا رہی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ میں پیار تھا۔ پاکیزگی تھی۔ اماں بی کی آنکھیں جب زہرہ سے چار ہوئیں تو وہ آہستہ آہستہ قدم ڈالتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد زہرہ پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔

اماں بی نے بھی زہرہ کے تعلق سے کوئی بات مجھ سے نہ پوچھی۔

رات اور دن پہاڑ کی طرح مجھ پر گزرنے لگے۔ میں ہر روز سوچا کرتا تھا کہ خود ہی زہرہ کے گھر چلا جاؤں گا۔ چند قدم ہی کا تو فاصلہ تھا۔ لیکن چند قدم کے فاصلے کی ہمارے معاشرے میں بڑی اہمیت ہے اور یہ فاصلہ جو طے کرنا چاہتا تھا بڑا ہی دشوار گزار تھا۔ اس راستے پر بھاگنے کودنے کے لیے سماج نے انجم آفتاب کو پورا پورا حق دیا تھا اور میں اس سے محروم تھا۔

وہ رات بڑی گمبھیر تھی۔ گلی پر موت کا سا سناٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا یکایک بہتے بہتے رک گئی ہو۔ دور بہت دور کوئی دوشیزہ پرسوز آواز میں گا رہی تھی۔

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

یہ آواز بہت دور سے دھیمی دھیمی سی آ رہی تھی۔ اس آواز میں بڑی کشش تھی۔ بڑا حسن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے گلے میں سارے جہاں کے نغموں کا حسن سمٹ آیا ہو۔ میں غیر شعوری جذبے کے تحت گھر سے نکل پڑا۔ میں جس سمت جاتا میرے کانوں سے یہ خوبصورت آواز ٹکراتی رہی۔ میں آواز کے دوش پر میلوں پیدل چلتا رہا۔ مجھے احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں اندھیری رات میں گھر سے بہت دور نکل چکا ہوں۔ قریب ہی کہیں سے جب مرغ نے بانگ دی تو نغمہ یکایک بند ہو گیا اور میرے قدم اچانک رک گئے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ابدی خوبصورت نغمہ پھر سے گونجے۔ لیکن فضا اس نغمہ سے خالی ہو چکی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس بیہودہ مرغ کی ٹانگ توڑ دوں، جس نے صبح کا مژدہ سنا کر نغمے کی رات مجھ سے چھین لی۔

میں جب گھر پہنچا تو اماں بی خراٹے لے رہی تھیں میری آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں:

"کیا بات ہے بیٹا؟ آج صبح ہی صبح اٹھ بیٹھے؟"

"میں نے رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی ہے ماں میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ ماں اس ساری بستی میں کل کتنے مرغ ہوں گے میں انہیں کسی بھی قیمت پر خریدنا چاہتا ہوں۔"

ماں ہنس پڑی۔ "پگلا کہیں کا، تجھے مرغ پالنے کا ایسا ہی شوق ہے تو تیرے لیے کل ہی ایک ریڈ، رن کا جوڑا خرید کر لا دوں گی۔ سارے محلے کے مرغ خرید کر بھلا تو کیا کرے گا؟"

"میں انہیں ذبح کرنا چاہتا ہوں ماں۔ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ میں..." میرا گلا رندھ گیا۔ میں آگے کچھ کہہ نہ سکا۔

"میں سمجھتی ہوں بیٹا، جب سے بیگم نے یہاں آنا جانا بند کر دیا ہے، تب سے تو بے حد دلگیر و اداس ہے۔ میں آج خود اس کے گھر جاؤں گی اور اسے منا لاؤں گی۔"

"ماں میں خود اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد میں چپ چاپ زہرہ کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ پیار سے کہوں "... زہرہ میں ہوں تمہارا کوکب ... تم مجھ سے روٹھی ہوئی ہو نا۔ دیکھو تمہیں منانے کے لیے کون آیا ہے۔ یہ تم نے کل سے دروازہ کیوں بھیڑ رکھا ہے؟"

ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا، اور بھیڑا ہوا دروازہ خود بخود کھل گیا، جیسے ہوا کے جھونکے بھی مجھے بے خطر اندر جانے کی دعوت دے رہے ہوں۔

میں سہما سہما اندر داخل ہوا، جیسے میں چوری کرنے کا

ارادہ رکھتا ہوں۔ جُوں جُوں میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے، مجھے محسوس ہو رہا تھا، جیسے پیچھے سے آکر اچانک کوئی مجھے دبوچ لے گا۔

تھوڑی دیر میں یُونہی چُپ چاپ کھڑا رہا۔ جب قدموں کی آہٹ پر بھی کسی نے جواب نہیں دیا تو میں سمجھا کہ زہرہ نیند میں غرق ہو گی۔ لیکن میرے آجانے کے بعد تو اسے جاگنا چاہیئے تھا۔ میں بے جھجک سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔ کمرہ خالی تھا، دوسرا کمرہ بھی خالی تھا، آگے بڑھا تو مجھے ڈرائنگ رُوم ملا۔ نہایت خوبصورت سا سجا سجایا۔ سامنے صوفہ دھرا تھا۔ بیچ میں، ایک خوبصورت سا ٹیک شیلف تھا۔

" زہرہ " ! میں یکبارگی پکار اُٹھا، " میں مقتدر ہوں تمہارا مقتدر " !!

لیکن آواز فضا میں ڈُوب کر رہ گئی۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں باہر گئی ہو، لیکن اس نے گھر کو تالا بھی تو نہیں لگایا ہے۔ شام ہو گئی، لیکن کوئی نہ آیا۔ صبح بھی ہو گئی لیکن زہرہ نہیں آئی۔ اسطرح ایک ہفتہ گُزر گیا۔

شام کو پٹرول پمپ کے چوراہے پر اچانک انجم آفتاب سے میری مُڈبھیڑ ہو گئی۔ بکھرے بکھرے پریشان سے بال۔ شیروانی کے بٹن کُھلے ہوئے، آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ۔ یک نظر دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی سے جھگڑ کر آیا ہے۔

انجم آفتاب نے مجھے دیکھتے ہی ہانک لگائی۔

" بتاؤ، بیگم کہاں ہے ؟ " اس کی آواز نفرت اور غصے سے بھری ہوئی تھی۔

" نہیں بتاؤ گے ؟ میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔ تم ہی نے اسے فرار کیا ہے۔ میں سوچ کی گہرائیوں میں ڈُوب کر رہ گیا۔

آفتاب چلاتا رہا۔ لیکن میں نے اس کی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ آخری بار غصّے سے چیختا ہوا مجھے عدالت کی دھمکی دے کر تیز تیز چلا گیا۔

میں گھر میں داخل ہوا تو ماں نے ایک خط میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

" زہرہ، اس ہفتے یہاں آرہی ہے بیٹا، زہرہ ـــــ میری بچی ـــــ " !

" زہرہ اب یہاں نہیں آئے گی ماں ! ـــــ وہ بہت دُور چلی گئی ہے " !!

▲▲▲

انور صابری دیوبندی

★

میر

میر اے نباضِ فطرت شاعرِ سادہ نگار
اے غزل کی آبرو کے دیدہ ور آئینہ دار

نیم باز آنکھوں کی مستی، روئے حُسنِ بے نقاب
اللہ اللہ تیرے مے خانے کے اجزائے شراب

باہمہ سرمایۂ شیرینی و لطفِ زباں
حق نے بخشی شاعرانہ دولتِ زورِ بیاں

عارضِ افکار کی تابندگی پاتا رہا
چشمکوں کے دور میں بھی زندگی پاتا رہا

دل دیا تجھ کو خدائے شعر نے جبریل کا
معتقد تھا "غالبِ دوراں" تری تخئیل کا

تیری عظمت، تیرا فن پہچاننے والوں میں تھا
ناسخ فخرِ سخن بھی ماننے والوں میں تھا

زندگانی کی فراشِ دل کے ساماں ہو گئے
"تیر و نشتر" تیرے پیوستِ رگِ جاں ہو گئے

داغ ہائے سینۂ ادراکِ غم یوں دھو گیا
"ڈوب کر غم کی فضائیں روتے روتے سو گیا"

راہِ گمنامی سے تا محشر گذر سکتا نہیں
تو نے ثابت کر دیا فن کار مر سکتا نہیں

▲

کیفی اعظمی

نذرانہ

تم پریشان نہ ہو بابِ کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا چلا جاؤں گا
اسی کوچے میں جہاں چاند اگا کرتے ہیں
شبِ تاریک گزاروں گا چلا جاؤں گا

راستہ بھول گیا یا یہی منزل ہے مری
کوئی لایا ہے کہ خود آیا ہوں معلوم نہیں
کہتے ہیں حسن کی نظریں بھی حسیں ہوتی ہیں
میں بھی کچھ لایا ہوں، کیا لایا ہوں معلوم نہیں

یوں تو جو کچھ تھا مرے پاس میں سب بیچ آیا
کہیں انعام ملا اور کہیں قیمت بھی نہیں
کچھ تمہارے لیے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے
دیکھ لو اور نہ دیکھو تو شکایت بھی نہیں

ایک تو اتنی حسیں دوسرے یہ آرائش
جو نظر پڑتی ہے چہرے پہ ٹھہر جاتی ہے
مسکرا دیتی ہو منہ پھیر کے جب محفل میں
ایک دھنک ٹوٹ کے سینوں میں بکھر جاتی ہے

گرم بوسوں سے تراشا ہوا نازک پیکر
جس کی اک آنچ سے ہر روح پگھل جاتی ہے
میں نے سوچا ہے تو سب سوچتے ہوں گے شاید
پیاس اس طرح بھی کیا سانچے میں ڈھل جاتی ہے

کیا کمی ہے جو کرو گی مرا نذرانہ قبول
چاہنے والے بہت چاہ کے افسانے بہت
ایک ہی رات سہی گرمیِ ہنگامۂ عشق
ایک ہی رات میں جل مرتے ہیں پروانے بہت

پھر بھی اک رات میں سو طرح کے موڑ آتے ہیں
کاش تم کو کبھی تنہائی کا احساس نہ ہو
ٹھیک سمجھی ہو، گیا بھی تو کہاں جاؤں گا
یاد کر لینا مجھے کوئی بھی جب پاس نہ ہو

آج کی رات بہت گرم، بہت گرم سہی
رات اکیلے ہی گزاروں گا، چلا جاؤں گا
تم پریشان نہ ہو بابِ کرم وا نہ کرو
اور کچھ دیر پکاروں گا، چلا جاؤں گا

"نور"

(ایک کشمیری نظم)

نریش کمار شاد

میری محبوبہ نور ہے، جس کا
جلوۂ رخ ہے طور کا جلوہ
جو ہے تقدیر صرف موسیٰ کی
چودھویں شب کے چاند کی مانند
روپ ہے جس کا بے پناہ سجل
اس طرح ہے سجل خدا کی قسم
جس طرح ڈل کے صاف پانی میں
سبز پتوں میں کھل رہا ہو کنول

•

میری محبوبہ نور ہے، جس کی
صاف شفاف نرم پیشانی
ایسے لگتی ہے ابر پاروں سے
روشنی آ رہی ہے چھن چھن کر
جیسے بارہ دری میں سونے کی
طشتری ہو کوئی حسین و جمیل
جس میں اِک دودھ کا پیالا ہو
اور پیالا بھی سیم گوں ہو بہت
جو گلو بند پہنے چاندی کا
چاندنی میں حجاب کے باعث
گویا تحلیل ہوتی جاتی ہے

میری محبوبہ نور ہے، جس کے
تیکھے ابرو ہیں ہو بہو ایسے
تلِّ کوہ سے ذرا اوپر
شبِ اول کا چاند ہو جیسے
پل ہو یا جوئے بار پر کوئی
جیسے بارہ دری کے دو محراب
ایک ہی جیسے اور متوازن
یا کسی بے کنار جنگل میں
کسی ندی کو پار کرتے ہوئے
کوئی آہو لگا رہا ہو چھلانگ

میری محبوبہ نور ہے، جس کی
شوخ آنکھیں ہیں جس طرح بادام
مست ہو کر سفید نرگس سے
جیسے چپٹے ہوئے ہوں دو بھونرے
یا مئے ناب کے ہوں دو ساغر
یا چمکتے ہوئے ستاروں کی
ایک جوڑی نے لے لیا ہو جنم
یا منقش سے دو پیالے ہوں
رس بھرے اور پیار سے لبریز
جن پہ کاجل کے نقش کندہ ہوں

میری محبوبہ نور ہے، جس کے
احمریں گال انار کے ٹکڑے
کسی گوہر تراش نے جیسے
پوری محنت سے چیر کر یاقوت
بھر دیا ہو جگر کا خوں اس میں

میری محبوبہ نور ہے، جس کا
تل ہے ٹھوڑی پہ اِسطرح جیسے
زلف ہی کا شریر بال کوئی
آ کے بیٹھا ہو کنڈلی مارے
جیسے جوہی کے جھنڈ میں کوئی
پھول سنبل کا مسکراتا ہو
کوئی بلبل ہو شاخ پر جیسے
بے حس و ساکت اور خموش خموش
ناگ ارجن کے ہاتھ سے جیسے
کسی پاتال میں گرا من کا

میری محبوبہ نور ہے، جس کے
رخ پہ قطرے ہیں یوں پسینے کے
جیسے ماتھے پہ کوئی جھومر ہو
جیسے چاندی کی ایک تھالی میں
بکھرے بکھرے ہوں قیمتی موتی
جس طرح چاندنی کے ٹکڑے پر
رقص کرتے ہوئے ستارے ہوں

میری محبوبہ نور ہے، جس کے
بال ایسے دکھائی دیتے ہیں
تار ہوتے ہیں جیسے سونے کے
یا گھنی چھاؤں بید زاروں کی
ایک محراب جس کے دونوں طرف
جیسے لٹکے ہوں ریشمی پردے
یا بڑے دل نشیں دھندلکے میں
کوہ کی برف پوش چوٹی سے
خوشنما آبشار گرتے ہوں

بے ستوں!

مغنی تبسم

دُوریاں کتنی حسیں ہیں!
دُوریوں سے چاند تاروں کا سماں،
سخت پتھریلی زمیں پر فرشِ مخمل
ریگزاروں پر سمندر کا گُماں
خواب گاہوں میں فُسونِ اِنتظار
قربتوں میں لذّتِ یک دو نفس
جسم ٹکراتے ہیں فرطِ شوق سے
لیکن
ایک ہو سکتے نہیں

جسم
ٹکراتے ہیں،
ملتے ہیں،
جُدا ہوتے ہیں،
نفرت سے۔
نفرتوں سے زندگی کا پیڑ ہوتا ہے ہرا۔
زندگی کے پیڑ پر اُگتے ہیں کیسے برگ و بار ـــ
فاصلوں کی قربتیں!
قربتوں کی دُوریاں،
مجبوریاں،
تنہائیاں!

▲

خُدا جاگتا ہے

مقبول منصوری

کبوتر کی آنکھوں کی مَیلی اُداسی
تمہارے نہ ہونے کے غم میں شکستہ
ابھی گھر کے کونوں سے آواز دے گی
نہ تم سُن سکو گے
نہ میں کہہ سکوں گا
اُدھر
کالے شہروں کی
بدنام سڑکوں پہ
سائے تمہارا تعاقب کریں گے
اندھیرے کی مٹّی
تم اُن کی ہتھیلی میں رکھ کر یہ کہنا
"تمہارا یہ حصّہ ہے
دُنیا میں اور آخرت میں
کوئی حُور داتن نہ ہوگی تمہارے لبوں سے"
ٹھہر جاؤ
جاتے کہاں ہو؟
مجھے غور سے دیکھ لو اور بڑلو۔
"خدا جاگتا ہے"!

▲

وامقؔ

قیامِ امن

(سامراجی طاقتیں آجکل ویٹ نام میں امن قایم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں)

مرحبا اے امنِ عالم کے نگہباں مرحبا
امن کا تُو نے نیا معیار قایم کر دیا

تیرے فیضانِ کرم سے آجکل "وِیٹنام" میں
ہو رہا ہے شانتی کا تجربے پر تجربا

امن کیا شے ہے سکون و عافیت کیا چیز ہے
ایشیا والوں پہ اب تو خُوب واضح ہوگیا

زندگی اور امن میں رہتا ہے بُعدالمشرقین
زندگی میں اور کیا رکھا ہے شورش کے سوا

زندگی کے روگ سے آزاد کرنے کے لیئے
آتش و آہن کا "ٹانک" ہے بڑی اچھی دوا

تیرے طیاروں نے بانٹی یہ دواجی کھول کر
خِطّہ وِیٹنام میں تھا زندگی کا کالرا

بڑھ رہے تھے تیز گامی سے جراثیمِ خودی
سامراجی کھیتیوں کے سُوکھنے کا خوف تھا

ایسے نازک وقت میں تُو نے بچایا ہے اُسے
زندہ و پائندہ باد اے سامراجی ناخدا

تیرے بمباروں کے گِرد و پیش با صد احترام
رقص کرتا پھر رہا ہے شانتی کا دیوتا

گولیوں نے لوریاں دیں، ٹینک تھپکاتے رہے
جو نہ سونا چاہتا تھا وہ بھی آخر سو رہا

زندگی معدُوم ہے آبادیاں مسمار ہیں
شہر پہ ہے خندہ زن ارضِ خموشاں کی فضا

مَوت سے بڑھ کر نہیں ہے امن کا کوئی سفیر
اس صداقت کا پتہ وِیٹنام میں تُو نے دیا

تیری کوشش بارور ہے تیری محنت سُرخ رُو
دو تہائی مُلک میں تو امن قایم ہو چکا

یہ جو اس کی نبض میں باقی ہے ہلکی سی دھمک
جان لے یہ بھی بڑا خطرہ ہے تیری راہ کا

فکر ایسی کر کہ اب یہ دردِ سر بھی دُور ہو
خود تری دوکان میں ملتی ہے اکسیرُ الشفا

ہے مریضِ امن کو حاجت اُسی تریاق کی
کام کب آئے گی آخر، جوہری بم کی دوا

▲

حیدرآباد
یوسف ناظم

(مزاحیہ)

چاند
ہنی مون
اور مسائل

آدمی کے چاند پر جانے میں اب صرف چند گھنٹوں کی دیر معلوم ہوتی ہے۔ باقی ہی کیا رہا ہے۔ صرف چند رسمی باتوں کا معاملہ رہ گیا ہے اور ان کی تکمیل میں زیادہ وقت تھوڑے ہی لگے گا۔ ہنی مون کا لطف تو اب آئے گا۔ جو لوگ زمین پر اپنا ہنی مون منا چکے اُن کا ذکر چھوڑیئے۔ لیکن جو لوگ اب شادی کریں گے، اُن کا ہنی مون، صحیح ہنی مون ہوگا۔ اب تک زمین پر جتنے بھی ہنی مون منائے گئے، سب کے سب غلط تھے۔ غلط نہیں تو مہمل اور بے معنی ضرور تھے۔ اسی لیئے افلاطون خود اور افلاطون کے شاگرد، کبھی ہنی مون اور شادی کے قایل نہیں ہوئے۔ افلاطون نے اپنی تعلیمات میں شادی کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دُنیا میں ہنی مون کرنے کی سہولتیں حاصل نہیں ہوں گی۔ شادی کے بعد کی بیکاری کے چند ہفتوں کو ہنی مون کہہ لینا،

م دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

سعدی شیرازی کے زمانے میں ایسی کوئی حرکت ہوتی تو وہ ضرور اس بارے میں چند فرمودات اور ارشادات سے اہلِ دُنیا کو نوازتے۔ سعدی شیرازی نے ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ فرمایا ہے ہنی مون جیسا دلچسپ اور اہم موضوع ضرور ان کی توجہ اور طبع رسا کا مرکز بنتا۔ سعدی شیرازی اگر زبان سے کچھ نہ بھی فرماتے تو ہنی مون کے کھوکھلے پن پر دو چار آنسو ضرور بہاتے۔ شادی کے بعد کے چند ہفتوں میں یہ شادی شدہ جوڑا کرتا کیا ہے؟ اس کی مصروفیات گنی چُنی ہوتی ہیں۔ شوہر، جہیز کے سامان کا شمار اور اس کی قیمت کا اندازہ کرنے میں بے حد مصروف رہتا ہے گویا بنک کے مالیاتی سال کا آخری حساب لکھ رہا ہو۔ وہ اپنی نئی نویلی رفیقہ حیات کی خُوبیوں کو جہیز اور زیور کے حساب سے جانچتا ہے اور اُسی تناسب سے رغبت اور محبت کا اظہار کرتا ہے۔ (جہیز سے تو کوئی شوہر مُطمئن ہوتا ہوا اب تک پایا نہیں گیا) دوسری طرف

دولہن سسرال کی ہر چیز پر یُوں نظر ڈالتی ہے جیسے کسی میوزیم میں آگئی ہو۔ وہ غالباً سسرال کی ہر چیز کو نقلی اور کمتر درجہ کی سمجھتی ہے۔ کیونکہ اصلی اور اعلیٰ درجہ کی چیزیں تو صرف میکے میں ہُوا کرتی ہیں۔ دولہن عام طور پر چُپکی بیٹھی رہتی ہے اور یُوں ظاہر کرتی ہے جیسے اُس کے دل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ دولھا دولہن کے ہنی مُون میں، خود دولھا، دولہن تو کم لیکن سسرال اور میکے والے زیادہ مصروف اور پُر جوش نظر آتے ہیں، جیسے کسی سیاسی مسئلہ پر طبع آزمائی کر رہے ہوں۔ دولھا والے دُلہن کی شکل وصورت، اخلاق وعادات پر بحث کرنے میں اپنا خُون پسینہ ایک کر دیتے ہیں تو دُلہن والے، نوشاہ کے مطالبات اور براتیوں کی بے تکلفی کی داستانیں بیان کرکے اپنا خُون خشک کر لیتے ہیں۔ دُلہن والوں کی متفقہ رائے یہ ہوتی ہے کہ ایسا ظُلم تو انگریزوں نے غدر کے زمانے میں بھی ہندوستانیوں پر نہ ڈھایا ہوگا۔ دولھا والے بھی اپنی مجلسِ شوریٰ میں صبح شام یہ قرار دادیں پاس کرتے ہیں کہ اتنے کنجُوس اور خسیس لوگ شاید ہی کہیں اور بستے ہوں۔ لیکن اب چند سال بعد ـــــ ہنی مُون منائے جانے کے طور طریق بدل جائیں گے۔ جو بھی شادی کریگا چند ہفتوں کے لیئے اپنی بیوی کے ہمراہ چاند پر چلا جائے گا۔ ساتھ میں صرف بیوی ہوگی اور کوئی نہیں۔ دولھا کے ساتھ بھی کوئی سی۔ آئی۔ ڈی نہ ہوگی۔ جو لوگ مین شادی کے بعد کسی وجہ سے ہنی مُون نہیں منا سکیں گے، اُنہیں اجازت ہوگی کہ شادی کے بعد تین سال کے عرصہ میں جب بھی چاہیں چاند پر جا کر اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ وقت اور موقعہ کی رعایت مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور حج وغیرہ کے لیئے ہو سکتی ہے تو ہنی مُون کے لیئے کیوں نہیں ہو سکتی۔ آگے چل کر آدمی قانون داں اور سخت گیر نہ ہوگا کہ شادی کے موقعہ کے علاوہ کسی وقت شادی شدہ جوڑے کو ہنی مُون نہ منانے دے۔

ہنی مُون آئندہ زمانے میں ایک کلچرل ذمہ داری ہوگی اور ہر شخص کے لیئے لازمی ہوگا کہ اپنی زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ ضرور ہنی مُون انجام دے۔

آج کا ہنی مُون، ہنی مُون نہیں، صرف اُس کا ایک تصوّر ہے۔ سچّا ہنی مُون تو وہی ہوگا جو سسرال اور میکے والوں سے دُور، چاند پر منایا جائے۔ اس وقت جو نسل دُنیا میں چل رہی ہے وہ آنے والی نسل کو ضرور ہنی مُون کی ساری سہولتیں بہم پہنچائے گی۔ ہنی مُون دراصل ایک آؤٹ ڈور گیم ہے اور اسی اسپرٹ کے ساتھ منایا جانا چاہیئے۔ مثلاً دولھا پینٹنگ کر رہا ہو، خواہ وہ ماڈرن پینٹنگ کیوں نہ ہو، تو دُلہن پوز دے رہی ہے۔ دُلہن شاعری کر رہی ہے تو دولھا داد دے رہا ہے یا کم سے کم گرا ہوا مصرعہ اُٹھا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ شوہر بسور رہا ہے اور بیوی ٹسوے بہا رہی ہے۔ دونوں کے رونے اور بسورنے میں تعاون اور امدادِ باہمی کی رُوح کارفرما ہے لیکن یہ شغل ہنی مُون کے وقت کا نہیں۔ اگر ان دونوں نے رونے اور بسورنے کا کام اسی وقت کر لیا تو پھر آگے چل کر کیا کریں گے۔ رونے کے لیئے تو دونوں کی عُمر پڑی ہے۔ ہنی مُون کا مزاج ہی الگ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اگر یہ دونوں بیڈمنٹن کھیلیں تو انھیں یوں معلوم ہوگا جیسے ہوا انہیں جُھولا جُھلا رہی ہے۔ لیکن شادی کے چند سال بعد یہی کھیل، کاروباری صورت اختیار کر جائے گا اور ایسا محسوس ہوگا جیسے دو کارندے ایک دوسرے کو نااہل ٹھیرانے کے موضوع پر بحث کر رہے ہیں۔

ہنی مُون کے لیئے شاید زمین کی آب و ہوا راس بھی نہیں ہے۔ زمین پر تو ہر جگہ نمک ہی نمک ہے۔ شورہ اور نمکیات کی یہ دھرتی ہنی مُون منانے والوں کی سوائے کام و دہن کی آزمائش کے اور کیا دے گی۔ زمین پر تو جو بھی اچھا کام کرو اُس پر خاک پڑ جاتی ہے، دُنیا کی کون سی چیز ہے جس پر دُھول نہیں جمتی۔ چاند پر جو ہنی مُون منایا جائے گا وہ مٹی میں نہیں رل سکے گا۔

یہ طے ہو چکا ہے کہ چاند پر کسی کو مستقل رہائش کا لائسنس نہیں دیا جائیگا۔ اگر انسان وہاں مستقل رہائش اختیار کرلے تو چند سال بعد وہاں بھی آبادی کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ آدمی اِس فن میں طاق ہے۔ چاند کو صرف ایک ہل اسٹیشن کے طور پر محفوظ رکھا جائیگا لوگ ایک اہم فریضہ کی اَدائیگی کے لیئے وہاں جائیں گے اور واپس ہو جائیں گے۔ وہاں صرف لاڈجنگ بورڈنگ کا انتظام ہوگا۔ اور ان ہوٹلوں کے مالک اور ملازم بھی ایسے شریف لوگ ہوں گے جو نئے شادی شُدہ جوڑوں کے راستہ میں حائل نہ ہوں گے۔ ضعیف اور بال بچے والے لوگ وہاں نہیں رہ سکیں گے۔ ہوٹلوں کے مالکوں اور دوسرے متعلقہ لوگوں کے اہل وعیال کی رہائش اور تعلیم کا بندوبست حسبِ معمول زمین ہی پر ہوگا۔ اتنا سارا نصاب اور اتنی ساری زبانیں وہاں منتقل بھی نہیں کی جاسکتیں۔ خود شادی شدہ لوگوں کو باقاعدہ ازدواجی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی زمین پر واپس لوٹنا ہوگا۔ ہر مُلک کا علٰحدہ کوٹہ بھی مقرر ہوگا۔ چاند کو ہنی مون اسٹیشن بنانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر مُلک اور ہر قوم کے لوگ ایک دوسرے کے ہنی مون میں حصّہ لے سکیں گے۔ چاند پر منایا جانے والا یہ تہوار ذاتی ضروریات کی تکمیل تو کریگا ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور تجارتی اغراض کی بھی تکمیل ہوسکیگی۔

چاند پر انسان کے پہنچ جانے کی وجہ سے فائدے چاہیں کتنے ہی ہوں، قوموں اور مُلکوں کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہونچے گا اور وہ ہوگا ادب اور شاعری کا نقصان۔ آدمی کے چاند پر پہنچ جانے کی وجہ سے شاعری کی تو کمر ٹوٹ جائے گی۔ چاند ہر زبان کی شاعری کا مرکز رہا ہے۔ چاند کی خوبصورتی کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں تھا، اب اس کا صرف اچار بن سکے گا۔ کیا اب ہم کسی کو چاند کی شکل کی محبوبہ کا نام دے سکیں گے۔ اب ہمیں حُسن کی علامتیں بدلنی ہوں گی۔ ہم آج علی الاعلان علامتی شاعری پر ایمان لاتے ہیں اور اُن تمام حیوث اور جاں بازشاعروں کی دُور بینی اور پیش قیاسی کی داد دیتے ہیں جنہوں نے علامتی شاعری کی فصل اگائی۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چاند کی سطح پر بھی سنگلاخ پہاڑ اور بے آب وگیاہ صحرا اور جنگل ہیں تو کون شریف لڑکی اپنے آپ کو چاند سی محبوبہ کہلانا پسند کرے گی۔ اب تو وہ زہر کھا کر سو جائے گی لیکن خود کے لیئے چاند کی تشبیہ ہرگز ہرگز پسند نہیں کرے گی۔ اِس معصوم اور سمجھدار لڑکی کے لیئے اب ہمیں نئی علامت ڈھونڈنی ہوگی۔ پھولوں اور پھلوں کی تشبیہیں تو اب محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دی جانی چاہئیں۔ مَرمَر اور مخمل کے الفاظ بھی اپنا اثر کھو چکے ہیں۔ اب جِلد کی مُلائمت کو نائیلون سے تشبیہ دیجئے یا ٹو بائی ٹو کے کاٹن سے۔

چاند نے ایک اور مسئلہ یہ کھڑا کر دیا ہے کہ وہاں سب سے پہلے کون سی چیز جائے۔ سیاست، صحافت، طب یا وکالت۔ شاعری یا دفتریت۔ ہم سے پُوچھا جائے تو ہم فیشن کے حق میں رائے دیں گے۔ بے شک رفتاری میں یُوں تو اور بھی کئی چیزیں ہیں لیکن فیشن ان سب سے آگے ہے۔ اگر آپ نے فیشن کو بھیجا بھی نہیں چاہا تو چاند پر سب سے پہلے پہنچے گا وہی۔ آدمی تو خیر بعد میں جائے گا۔

لوگوں نے ابھی سے اس بات کی تحقیق شروع کردی ہے کہ چاند پر کس قسم کا لباس موزُوں قرار پائے گا۔ لوگ یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ آیا عورتوں اور مردوں کے لیئے علٰحدہ علٰحدہ وضع کے لباس کی ضرورت ہوگی یا دونوں کے لیئے ایک ہی نمونہ کی پوشش کافی ہوگی۔ بعض اہلِ دل تو یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ چاند پر لباس کی ضرورت ہوگی بھی یا نہیں۔ ایسی صُورت میں کیلے کے پتوں اور گھانس پھونس کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہوگا۔ ▲

اعجاز قریشی

(آخری قسط)

۶۵ء کی فلمیں

چیتن آنند کی فلم حقیقت ۱۹۶۴ء کی فلموں کے لیئے ملنے والے اسٹیٹ ایوارڈس میں سے ہندی فلم کو ملنے والا سب سے بڑا ایوارڈ لے چکی ہے، لیکن اس کی نمائش ۱۹۶۵ء کے اوائل میں شروع ہوئی۔ سال کے آخر میں سرحدوں پر جارحانہ حملوں اور ہنگامی حالات کی وجہ سے اس فلم کو نئی زندگی مل گئی۔ چنانچہ اگست ۱۹۶۵ء کے بعد بمبئی اور پھر دوسرے مقامات بشمول حیدرآباد میں اسے کافی پسند کیا گیا۔ حقیقت جنگ کے پس منظر میں تیار کی گئی پہلی ہندوستانی فلم ہے جو بہ لحاظ معیار مجموعی طور پر وقت، آرزو اور مذکورہ بالا دوسری تمام فلموں سے بلند اور اونچی ہے۔ پھر بھی اسے مکمل معیاری فلم نہیں کہا جا سکتا، ایک اچھی اور مخلصانہ کوشش ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اس فلم کی بنیادی کمزوری اس کی کہانی ہے۔ دراصل اس فلم میں کہانی پیش کرنے کا انداز کہیں دستاویزی ہو کر رہ گیا ہے اور کہیں ڈرامائی۔ ایک کہانی کے اندر چھوٹی چھوٹی تین چار کہانیاں ملیں گی۔ لیکن پوری ایک کہانی میں ربط و تسلسل اور تنظیم و اتحاد کی کمی کھٹکتی ہے۔ بلیک اینڈ وہائٹ میں فلمبندی کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ یہ فلم ایسٹ مین کلر میں پیش کردہ دوسری کئی فلموں کے مقابلہ میں زیادہ موثر ثابت ہوئی ہے۔ سخت محنت اور فنکارانہ خلوص کی جھلکیاں اسے وسعتیں اور بلندیاں عطا کرتی ہیں۔ حقیقت کا اچھا بزنس کرنا ایک حوصلہ افزا بات ہے۔ 'میرے صنم'، 'مہابھارت' اور 'جب جب پھول کھلے' کو باکس آفس پر اتنی کامیابی ضرور حاصل ہوئی ہے جتنی کہ اس قسم کی فلموں کے لیئے ضروری ہوتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کے آخر میں کاجل کی نمائش بھی شروع ہوئی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ فلم باکس آفس پر مطلوبہ کامیابی حاصل کرلے۔

اداکاروں میں ۱۹۶۵ء ——— تین "کماروں" کی کامیابی کا حاصل ہے۔ ان تین کماروں میں دو بڑے کمار دلیپ اور راجندر شامل نہیں ہیں بلکہ یہ تین بڑے کماروں میں سب سے بڑا کمار اشوک سرِفہرست ہے۔ راج کمار نے اس سال وقت میں

اپنی بہترین اداکاری 'اونچے لوگ' میں اپنے پُر اثر اور جاندار کردار، اور ان دو فلموں کے علاوہ 'کاجل' اور 'رشتے ناطے' کی وجہ سے کامیاب اداکاروں کی صف میں اپنے لیئے جگہ بنالی ہے اشوک کمار، اس سال 'چترلیکھا'۔ 'اونچے لوگ'۔ 'آکاش دیپ' 'چاند اور سورج'۔ 'بہو بیٹی' اور 'بھیگی رات' میں موجود ہے مختلف کرداروں میں اس سدا بہار اداکار کی عظمت کی چھاپ ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ 'اونچے لوگ' میں اس نے اس سال کی بہترین اداکاری پیش کی ہے۔ ان دو کماروں کے علاوہ تیسرا کمار منوج کمار ہے۔ گذشتہ سال ہی منوج کافی اُبھر چکا تھا۔ لیکن اس سال 'ہمالیہ کی گود میں' کی باکس آفس پر شاندار کامیابی اور 'شہید'۔ 'پونم کی رات'۔ 'گمنام'، اور 'بے داغ' میں مرکزی رول ادا کرنے کے بعد منوج نے چوٹی کے پانچ چھ اداکاروں کے بعد اپنے لیئے کامیاب ہیرو کا مقام پیدا کر لیا ہے۔ جائے مکرجی کو اپنے باپ چچا اور دوسرے رشتہ داروں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے دھکّے دے دیکر آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ زیر تبصرہ سال کے دوران میں — 'جی چاہتا ہے'۔ 'آؤ پیار کریں'۔ اور 'بہو بیٹی' میں وہ ناکام رہا۔ پردیپ کمار نے 'چترلیکھا' میں عمدہ اداکاری پیش کی۔ اس کے علاوہ 'بھیگی رات' اور 'سہیلی' میں اس کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ بھارت بھوشن اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح وہ ختم نہیں ہوا۔ سنیل دت نے نہ صرف یہ کہ اپنے مقام اور قدر کو برقرار رکھا ہے بلکہ اچھی اداکاری اور فلموں کی، مقبولیت کی وجہ سے اپنے مقام کو کچھ اور مستحکم بنالیا ہے۔ 'وقت' میں راج کمار کے مقابلہ میں، سنیل ہی کیا دوسرے سبھی کردار دبے رہے۔ لیکن وقت نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ 'یادیں'، ایک تجرباتی فلم تھی۔ اگر یہ تجربہ یا کوشش فلمی تکنیک کے تقاضوں کو پورا کرتی تو بلاشبہ 'یادیں' ایک ناقابل فراموش فلم ہوتی، لیکن بنیادی طور پر یادیں فلمی تکنیک سے علحدہ کوئی چیز ہے۔ اس فلم میں سنیل دت نے عمدہ اداکاری کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلسل ایک ہی اداکار کو دیکھتے ہوئے لوگ اس کی اچھی اداکاری کے باوجود اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ خاندان کا شمار اداکاری کے اعتبار سے سنیل کی اچھی فلموں میں کیا جائے گا۔ سال ۱۹۶۵ء بڑے اداکاروں کے لیئے اچھا سال نہیں رہا۔ میناکماری ڈیڑھ دو سال قبل شہرت اور کامیابی کی چوٹی پر تھی۔ اسے ہندوستان کی بہترین اور کامیاب ترین اداکا[رہ] قرار دیا جارہا تھا۔ لیکن حالیہ عرصہ میں ناموزوں فلموں، ٹائپ کرداروں اور بعض دیگر افسوسناک وجوہ کی بنا پر وہ تیزی کے ساتھ رُو بہ زوال ہے۔ اگر مستقبل قریب میں اس نے کسی بڑی فلم یا اپنی چونکا دینے والی اداکاری سے ایک بار پھر متاثر نہیں کیا تو پھر وہ صف اوّل سے بھی خارج ہوجائے گی۔ سادھنا اس معنی میں کامیاب ہیروئن ہے کہ اس کی دو فلمیں 'آرزو' اور 'وقت'، اس سال کی کامیاب ترین اور تجارتی اعتبار سے بڑی فلمیں ہیں۔ لیکن سادھنا کو ان فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے کا موقع کم ہی ملا ہے۔ مالا سنہا کو اس سال کی کامیاب ترین اداکارہ قرار دینے میں کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا۔ مسلسل محنت اور جستجو کے ذریعہ بالآخر وہ چوٹی پر پہنچ ہی گئی۔ 'ہمالیہ کی گود میں'، اور 'بہو بیٹی' میں اس کی اداکاری بہت عمدہ [تھی]۔ وحیدہ رحمٰن کی صرف ایک ہی فلم 'شگون'، پیش ہوئی جو فلاپ ہو کر بنانے والوں کے لیئے منحوس ثابت ہوئی۔ ۱۹۶۴ء کی کامیاب ترین اداکارہ وجینتی مالا کی کوئی فلم نمائش کے لیئے پیش نہیں ہوئی۔ اس طرح راج کپور اور دلیپ کمار کی کسی فلم کے بغیر سال گزر گیا۔ حالانکہ دونوں اداکاروں کی کم سے کم دو فلمیں اس سال پیش ہوسکتی تھیں۔ دیوآنند نے 'تین دیویاں'، [میں] اپنی کامیابی کی نہیں صرف اپنی موجودگی کا اعلان کیا۔ مسلسل کامیاب فلموں کی شہرت رکھنے والے خوش قسمت راجندر کمار کی ایک [فلم] 'آرزو' پیش ہوئی، جس میں اس کی اداکاری عمدہ —

ڈ ایک ہی فلم جانور میں دیکھا گیا۔ ششی کپور علاوہ
وجود باکس آفس پر مسلسل فلموں کی ناکامی کی وجہ سے
ا جاتا تھا۔ 'وقت' کی غیر معمولی مقبولیت اور
، کھلے' کی معمولی کامیابی کی وجہ سے اس کے
ی کا داغ دُھل رہا ہے۔ سائرہ بانو کی صرف ایک
ں' دیکھی گئی جو 'فلاپ' ثابت ہوئی۔ کیدار شرما نے
لیکھا' پیش کر کے اپنی عظیم ترین تخلیق 'چترلیکھا' کا
ں گلا گھونٹ دیا۔ فلمساز کی حیثیت سے محمود نے
ر توبہ کر لی لیکن ہدایت کاری کا شوق ابھی ختم نہیں
ی حیثیت سے اس کا کسی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں
ر کو فینانسر اور پروڈیوسر بھولتے جا رہے ہیں۔
لیئے راجندر کمار کو ہی غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ محمود
میاب ہوتی جا رہی ہیں، جن میں وہ سب سے
ں کامیاب ہے۔ 'جانور' راجیندر ناتھ کامیاب
۔ گزشتہ سال اُبھرتے ہوئے فن کاروں کو آگے
ئے چہرے پیش کرنے کا جو رُجحان شروع ہوا تھا
رقی سے ہے۔ ہر طرف نئی اداکارائیں اور اداکار
نئے فنکار دیکھے جا رہے ہیں۔ نئے چہروں میں
ہ کامیاب سونیا سوھنی (گوا) رہی۔ دیپ مکرجی
ے ترقی کر سکتا ہے۔ 'سمی' کو 'تین دیویاں' میں
ملا۔

ہدات'۔ 'حقیقت'۔ 'زندگی اور موت'۔ اور
، زندگی' ان چار فلموں میں چار نئی ہیروئنوں کو
ہے۔ نئے چہروں اور اُبھرتے ہوئے فن کاروں کے
، ان سب سے اچھی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں
ی عرصہ سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، لیکن معاون
ت سے 'آرزو' اور 'اونچے لوگ' میں ان کی [illegible]
ماہل دیو برمن نے 'بھوت بنگلہ' میں کامیڈین کی حیثیت

سے ایک مختصر لیکن اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے فلموں میں کام کرنا چاہیئے وہ اپنی طرز کا منفرد کامیڈین ثابت ہو سکتا ہے۔ معاون اداکاروں کا ذکر اوم پرکاش کے بغیر ادھورا رہ جائے گا۔ خاندان میں اس نے معاون اداکار کی حیثیت سے نہیں بلکہ کیرکٹر ایکٹر کی حیثیت سے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ ولین کی حیثیت سے پران کا اب بھی جواب نہیں۔ وہ اپنے کردار کو دلچسپ بنانے کی کوشش میں بھی کامیاب ہے۔ چنانچہ خاندان میں وہ بیک وقت ولین بھی ہے اور کامیڈین بھی۔

ہدایت کاروں میں جیتن آنند (حقیقت)، راجہ نواتھے (گمنام)، ایس۔ چوپڑہ (وقت) اور رامانند ساگر (آرزو) نمایاں ہیں

میوزک ڈائرکٹروں۔ ایس شنکر جے کشن کی جوڑی باکس آفس پر کامیابی کیلئے ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ابتدا میں ان کی دو فلموں 'راج کمار' اور 'اپریل فول' کی سلور جوبلی ہوئی اور اس کے بعد 'جانور'۔ 'گمنام' اور 'آرزو' سال کی کامیاب ترین (۶) فلموں میں سے تین ہیں۔ اس طرح شنکر جے کشن بدستور چھائے ہوئے ہیں۔ لکشمی کانت پیارے لال کی جوڑی گزشتہ سال تیزی سے اُبھری تھی۔ لیکن اس سال اس جوڑی نے ایک بھی بڑی فلم نہیں دی۔ اس کے برخلاف کلیان جی آنند جی نے اس سال شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ سال کی نصف درجن کامیاب ترین فلموں میں سے دو فلموں 'ہمالیہ کی گود میں' اور 'گوا' میں ان کی موسیقی کامیاب رہی۔ 'ہمالیہ کی گود میں' کی دُھنیں بہت پیاری ہیں۔ 'جب جب پھول کھلے'۔ 'پورنیما' اور 'سہیلی' وغیرہ میں بھی اس جوڑی نے بعض خوبصورت دُھنیں پیش کی ہیں۔ روی نے 'وقت' اور خاندان میں اپنے مقام کو برقرار رکھا ہے لیکن انھیں کلیان جی آنند جی اور لکشمی کانت پیارے لال سے سخت چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے۔ نوشاد کی کوئی فلم اس سال پیش نہیں ہوئی۔ او۔ پی نیر نے 'میرے صنم' میں بعض پیاری دُھنیں پیش کر کے اعلان کیا کہ وہ ابھی موجود ہیں۔ روشن کی کوئی فلم